ماہنامہ

نئی دہلی

کتاب نما

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

بچوں کے لیے مکتبہ پیام تعلیم کی مذہبی کتابیں

کتاب	حصہ	قیمت
قرآن پاک ۳۰واں پارہ، مع ترجمہ و تشریح		50/
صراط مستقیم		7/50
سورہ رحمٰن (ترجمہ و تشریح)		6/
حضرت شیخ مخدوم علی مہائمی		4/50
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں		9/
نماز پڑھیے		4/50
السلام علیکم		7/50
حضرت یوسف علیہ السلام		4/50
حدیث کیا ہے؟		4/
حضرت عمر فاروقؓ		6/
نقوش سیرتؐ	(اول)	5/
نقوش سیرت	(حصہ دوم)	5/
نقوش سیرت	(حصہ سوم)	5/
نقوش سیرت	(حصہ چہارم)	5/
نقوش سیرت	(حصہ پنجم)	5/
رسالہ دینیات	(اول)	3/
رسالہ دینیات	(دوم)	4/
رسالہ دینیات	(سوم)	5/
رسالہ دینیات	(چہارم)	5/
رسالہ دینیات	(پنجم)	6/
رسالہ دینیات	(ششم)	6/
رسالہ دینیات	(ہفتم)	6/
رسالہ دینیات	(ہشتم)	6/
حضرت آدم علیہ السلام		4/
حضرت یحییٰ علیہ السلام		3/
بزرگان دین		4/
امت کی مائیں		4/50
خوب سیرت	(اول)	6/
خوب سیرت	(دوم)	6/
اچھی باتیں		4/50
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں		4/50
سلطان جی		4/50
سیرت پاک مختصر مختصر		3/
کمسن صحابی		6/
رحمان کا مہمان		6/

کتاب	حصہ	قیمت
اسلام کے جاں نثار		5/
نور کے پھول		9/
سب سے بڑے انسان رسول ﷺ		3/50
حضرت ابوبکر صدیقؓ		6/
حضرت عبداللہ بن عمرؓ		3/
حضرت طلحہؓ		3/
حضرت ابوذر غفاریؓ		3/
حضرت سلمان فارسیؓ		3/50
حضرت عبداللہ بن عباسؓ		3/
حضرت محبوب الٰہیؒ		3/50
حضرت معین الدین چشتیؒ		3/
حضرت فرید گنج شکرؒ		3/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ		3/
حضرت نظام الدین اولیاءؒ		3/
حضرت حمزہؓ		3/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ		3/
حضرت ابوہریرہؓ		4/
اللہ کے معنی		2/50
اللہ کا گھر		4/50
اللہ کے خلیل		3/50
رسول پاکؐ کے اخلاق		4/
قرآن پاک کیا ہے؟		5/
اسلام کے مشہور سپہ سالار	(اول)	6/
اسلام کے مشہور سپہ سالار	(دوم)	6/
اسلام کے مشہور امیر البحر		9/
اسلام کیسے پھیلا؟	(حصہ اول)	7/50
= =	(حصہ دوم)	6/
اسلام کیسے شروع ہوا؟		7/50
رسول پاکؐ		6/
دین حق		7/50
سرکار کا دربار		6/50
چار یار		7/50
آں حضرت	(اردو)	3/50
حضرت محمدؐ	(ہندی)	/40
منہاج القرآن		4/50

نئی مطبوعات

شمیم نیاایڈیشن (شاعری) شمیم جے پوری -/60
آسان اردو ،، (تعلیم) شکیل اختر فاروقی -/27
آسان اردو ورک بک (،،) ،، -/75
کشت غزل نما (شاعری) حنیف ترین -/150
ذکر ایڈیرا (،،) عبدالستار دلوی -/57
رقص نجات (،،) ڈاکٹر تنویر احمد علوی -/165
احتساب ڈاکٹر خالد محمود نمبر (مجلہ) ترتیب سہیل سرونجی -/300
ترجمان جنوری ۱۹۹۹ء (،،) پروفیسر جابر حسین -/100
انمول کہانیاں (کہانیاں) احتشام الدین صدیقی -/30
اردو ادب ذوق نمبر (مجلہ) اڈیٹر اسلم پرویز -/60
جگن ناتھ آزاد ایک مستقل ادارہ (مضامین) نذیر فتحپوری -/150
سلام (مراٹھی ادب) ڈاکٹر ربیعہ شبنم عابدی -/60
میر و جگر کی آزمائش (خاکے) محمد منظور احمد -/60
بے ساحل دریا (شاعری) ڈاکٹر عفت زریں -/80
لمس کا کرب (افسانے) خورشید ملک -/200
جینے والے (افسانے) عابد سہیل -/80
نشور واحدی شخصیت اور فن ڈاکٹر محمد ارشد خاں -/150
محمود دہلوی حیات و شاعری نسیم کوثری -/100
جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم -/250
اقبال حرف و معنی اسلوب احمد انصاری -/200

سرورق عاصم شہواز شبلی

تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک ۵ جلد ۶ جز پروفیسر سیدہ جعفر، گیان چند جین -/850
دیوکی نندن کھتری (سوانح) مدھوریش -/25
الفاظ (ناول) شاں مال سارتر -/80
دریا ندی کا پل (،،) ایو آندرچ -/150
تمہارے غم میرے (ناول) ریوتی سرن شرما -/175
قربتوں کے فاصلے (،،) انور نزہت -/100
رائے بہادر (،،) عارف صدیقی -/250
لفظوں کے پرندے (شاعری) شمیم فاروقی پوری -/80
کلیات ساحر (نیاایڈیشن) ساحر لدھیانوی -/150
سب خواب (شاعری) نصرت گوالیاری -/100
حیوانات کی دلچسپ دنیا (معلومات) محمد خلیل -/17
فرہنگ اصطلاحات جغرافیہ انگریزی اردو قومی کونسل -/31
فرہنگ اصطلاحات انتظامیہ انگریزی اردو قومی کونسل -/25
ٹالسٹائی نیاایڈیشن ڈاکٹر محمد یونس -/46
وضاحتی کتابیات ۱۹۹۱ء جلد اول (،،) گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی -/73
آندھی میں چراغ (،،) خواجہ غلام السیدین -/73
تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر (،،) ڈاکٹر سلامت اللہ -/65
دکن کے بہمنی سلاطین (،،) ہارون خاں شیروانی -/88
قدیم ہندستانی کی ثقافت و تہذیب (،،) ڈی۔ڈی۔ کوسمبی -/73
ہندستانی مصوری (عہد مغلیہ) (،،) پرسی براؤن -/158
بوستاں کی کہانیاں (،،) ترتیب ظفر شبلی -/15
ترقی اردو ریڈر (،،) حیات اللہ انصاری -/14
بھوت پریت (تعلیم بالغان) (،،) قومی کونسل -/10

مہمان مدیر
عاصم شہواز شبلی
صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ڈیرہ جنگ

اشاریہ

ادبی رسائل کی بقا کا مسئلہ

ادب کی مبسوط تاریخ اس وقت تک مرتب نہیں ہو سکتی جب تک اس میں عہد بہ عہد تبدیل ہوتی ہوئی کروٹوں اور حرکتوں کا احساس شامل نہ ہو اور تاریخ شاہد ہے کہ وقت کے اس اہم تقاضے کی تکمیل کا فریضہ صرف اور صرف ادبی رسائل نے ہی انجام دیا ہے۔ ادبی رسائل نے ہر عہد اور نسل کی ذہنی تربیت کی ذمے داری نبھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کی بدولت عصری حسیت سے آگاہی کا شعور ہمارے اندر پروان چڑھ سکا اور ادب کے طالب علم ہونے کے ناتے ہم نے وقت اور ماحول کے پیش نظر ادب کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر ادبی سطح پر اپنے زندہ رہنے کا ثبوت دیا۔ سخت افسوس کا مقام ہے کہ آج ادبی رسائل کی بقا کا مسئلہ اتنی سنگین صورت اختیار کر گیا ہے کہ اس سے غافل رہنے کی بھول مردہ ضمیری کی علامت سے تعبیر کی جائے گی۔ باقاعدہ اور سنجیدہ گفتگو سے ہی اس مسئلے کے بعض اہم نکات کی جانب توجہ مبذول کی جا سکتی ہے۔ ادبی رسالوں پر بقا کے تعلق سے جو سنگین دور آپڑا ہے اس کے پیچھے ہماری خود کی مفاد پرستی، کند ذہنیت، تنگ نظری اور گروپ بندی کا دخل ہے۔ بہت پیچیدہ لگ رہے اس مسئلے کی تہہ میں جھانکنے سے ہمیں جستہ جستہ تمام چیزیں واضح دکھائی دیں گی۔

موجودہ زمانے پر الیکٹرانک میڈیا کی حکمرانی ہے لیکن دنیا خواہ کتنی بھی ترقی یافتہ ہو جائے پرنٹ میڈیا کا وجود اپنی جگہ بہر حال باقی رہے گا البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس عہد میں الیکٹرانک میڈیا کی دن دوگنی رات چوگنی ترقی نے جہاں امکانات کے نت نئے دریچے وا کیے ہیں اور زمانے کو ترقی کی نئی منزلوں سے ہمکنار کیا ہے وہیں پرنٹ میڈیا کی اہمیت و افادیت میں حیرت انگیز طور پر کمی آئی ہے۔ روزناموں کی حد تک تو معاملہ پھر بھی غنیمت ہے لیکن ہفتہ وار یا پندرہ روزہ اخباروں، رسالوں یا ماہنامہ رسالوں کی بات جہاں آتی ہے وہاں صورت حال بہت مایوس کن سنائی دیتی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کرۂ ارض میں رونما ہونے والے تمام حادثات و واقعات کی بروقت تفصیل اور تشنہ پہلوؤں سے جڑے دیگر امور سے کما حقہ واقفیت

کا اتنا سیر حاصل جواز پیش کرتا ہے کہ پرنٹ میڈیا کی حیثیت محض ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یعنی اخباروں اور رسالوں کو ہم سکنڈ سورس (Second Source) کے روپ میں قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر بھی پرنٹ میڈیا کے کچھ شعبے ایسے ضرور ہیں جن کی پرائمری اور مین سورسز (Main Sources) کی حیثیت سے اپنی ایک الگ شناخت ہے۔ مثلاً کرنٹ افیرز اور کمپیٹیشن سے جڑے رسالے جو اپنے تمام تر وسائل کا خاطر خواہ استعمال کر کے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ قائم کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اس طرح کے رسالے اپنی معنویت کے لحاظ سے ایک Stable مارکیٹ بھی بناتے ہیں اور پرائیویٹ ادارہ ہونے کے باوجود (Consumption) کا مسئلہ ان کے لیے کبھی دشواریاں پیدا نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی کے رسالے ہی اس دائرہ کار میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جب ہم اردو روزناموں' ہفتہ واروں یا رسالوں کا جائزہ لیتے ہیں تو صورت حال بہت حد تک تبدیل نظر آتی ہے۔ وسائل کے نسبتاً حددرجے فقدان کے باعث اردو کا پرنٹ میڈیا ڈھیر سارے مسائل کی آماجگاہ نظر آتا ہے۔ حسب ضرورت بہتر اور بھرپور مواد کی پیشکش کے لحاظ سے اردو کے ایسے رسالے جب انگریزی یا ہندی کے رسالوں سے تقابلی طور پر استحکام حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں تو فطری طور پر ان کی اشاعت شدید متاثر ہوتی ہے۔ ویسے وقت کی اس اہم ضرورت پر اردو میں ہمیشہ سے ہی برائے نام توجہ دی جاتی رہی ہے اور جو چیز بڑی آن بان اور شان کے ساتھ اردو حلقے میں گفتگو کا موضوع بنتی رہی ہے وہ ہے اردو رسالوں کی اشاعت لیکن اس دور میں جہاں اردو کے روزناموں' ہفتہ واروں اور دیگر شعبوں سے جڑے ماہناموں کی حالت دن بدن خستہ ہوتی جارہی ہے وہاں ادبی رسالے کی بقا کا مسئلہ بہت زیادہ گمبھیر ہو چلا ہے۔

گذشتہ دس پندرہ سال کے عرصے پر ہم اگر اپنی نگاہ مرکوز کریں تو پائیں گے کہ اس وقفے میں رسائل کے ان گنت ستارے ادب کے افق پر نمودار ہوئے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کی چمک ماند پڑتی گئی اور رفتہ رفتہ ان کا وجود ہمارے ذہن کے نہاخانوں میں محفوظ ہو گیا۔ پرائیوٹ رسالوں کا ذکر ہی کیا۔ اچھی خاصی تعداد میں سرکاری رسالے تعطل کا شکار ہوتے ہوتے آخر کار دم توڑ گئے۔ یہ صورت حال جو بہت افسوس ناک ہے بدقسمتی سے ادب کے افق پر اب تک برقرار ہے اور چند کو چھوڑ کر بیشتر سرکاری رسائل بھی اپنی بقا کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرنے میں معروف ہیں۔ بہت سے رسائل ایسے ہیں جنھیں ایک عرصے سے اشاعت کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا ہے۔ بہت سارے رسائل گھٹ گھٹ کر اپنے زندہ رہنے کا ثبوت

دے بھی رہے ہیں تو ان کی حیثیت بذات خود قابل رحم ہے۔ یہ بیان ان سرکاری رسائل سے متعلق ہے جن کی باضابطہ ایک کمیٹی ہوتی ہے اور رسالے کی ترویج و اشاعت کے لیے ضمنی اقدامات بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات سنجیدگی سے غور کرنے کی ہے کہ سرکاری پشت پناہی کے بعد جب اردو کے ادبی رسائل زندگی پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر ایسے رسالوں کی بقا کا کیا جواز ہو سکتا ہے جن کا وجود چند سرپھروں کی جنونی کیفیت سے وابستہ ہے۔ جوش و خروش کی تحریک پر وقفے وقفے سے ادبی رسائل کا اجرا آج بھی جاری و ساری ہے۔ لیکن ان کے حصے میں زندگی کا تناسب کیا ہوگا یہ بات سنجیدگی سے غور کرنے کی ہے۔ واقعی یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس پر سلسلہ وار گفتگو کا صحت مند رویہ ہی کچھ حد تک کامیاب ہو سکتا ہے۔

حالانکہ جانب داری کی عینک لگا کر مطالعہ کائنات کی روش اب ہمارے خون میں سرایت کر گئی ہے اور زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے اچھوتا نہیں رہ گیا ہے لیکن گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کے بجائے اسے جلد از جلد زمین دوز کرنے کی دھن میں ہم سرے سے ہی بھول جاتے ہیں کہ اس کی حیثیت میں ہمارا اپنا وجود بھی نیست و نابود ہو رہا ہے۔ گروپ بندی کی عصبیت کا شکار ہو کر ایک صحت مند ادبی رویے کو فروغ دینے کے بجائے ہم ہر قدم پر اپنی زوال آمادہ ذہنیت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جب بھی کسی نئے ادبی رسالے کا اشاعتی سفر شروع ہوتا ہے ادبی حلقوں میں واقعی خوشی اور امنگ کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے اور نقش اول کا دیدار کرنے کے بعد بے صبری کے ساتھ نقش ثانی کا انتظار رہتا ہے۔ تجسس کی یہ کیفیت اسی شدت کے ساتھ آئندہ بھی برقرار رہے تو رسالے کے حق میں یہ رویہ کارگر ثابت ہو۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ساری خرافاتیں یہیں سے شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک رسالہ کتنی دشواریوں کے بعد اشاعت کی منزلوں سے گزر کر ہم تک پہنچا ہے۔ اس سلسلے میں غور و فکر کرنے کے بجائے ہم اپنا سارا زور اس راز کو جاننے میں صرف کر دیتے ہیں کہ آخر یہ کاوش کس گروپ سے وابستہ ہے اور اپنی بساط بھر کوششوں کا استعمال کر کے جب کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو اپنی محدود ذہنیت اور تنگ نظری کا تجزیہ مظاہرہ کر کے ہم اس رسالے کی راہ میں روڑے اٹکانے سے باز نہیں آتے۔ اگر کسی طرح ایک مخصوص گروپ سے اس کی وابستگی کا انکشاف نہیں ہوتا ہے پھر بھی اپنے خرافاتی ذہن کا سہارا لے کر ہم خلا میں ہی اس کا ایک مبسوط رشتہ اس بنا پر قائم کر کے ہی دم لیتے ہیں کہ ایسا نہ کرنا اپنے لاوارث ہونے کا ثبوت دینا ہوگا۔ ظاہر ہے جب ہمارے ذہنوں میں گروپ بندی کے تحت ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی بات ہی گردش

کر رہی ہو تو ایسی صورت میں غیر جانب دارانہ طرز فکر سے ہمارا واسطہ ہوگا بھی کیسے؟ اس نازک مقام پر ہمیں کرنا یہ چاہیے کہ تمام تر آپسی اختلافات کے باوجود گلے شکوے بھلا کر رسالے کی ترویج واشاعت میں بڑھ چڑھ کر اپنا تعاون پیش کریں لیکن ہمارے ذہن میں مفاد پرستی کا نشہ اس بری طرح حاوی رہتا ہے کہ فلاح کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہم اس بات سے جان کر بھی انجان بنے رہتے ہیں کہ گروپ بندی کی گندی سیاست خود ہماری اپنی شناخت کو مٹادے گی اور اپنی تہذیب اور کلچر کا نقصان اپنے مردہ ہو جانے کا ثبوت ہوگا۔ لیکن جہاں محسوسات کے تمام پیمانے چکنا چور ہو چکے ہیں وہاں خیال کی اس زیریں لہر میں ترنگ بھی کیسے اٹھے۔ گروپ بندی کے زعم میں ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ایک رسالہ جو گھٹ گھٹ کر سانسیں لیتا ہوا اپنے زندہ رہنے کی جستجو میں مصروف تھا ہماری ریشہ دوانیوں کے باعث ٹھنڈا اور ساکت ہو کر زندگی کی حرارت سے کب کا محروم ہو چکا۔ مفاد پرستی کے نشے میں ہم اس درخت کا وجود ہی مٹا دیتے ہیں جس کا سایہ ذرا سی ہمدردی کے باعث بہت گھنا ہو جاتا اور میٹھے میٹھے پھلوں کے ساتھ ٹھنڈی اور خوشگوار چھاؤں بھی ہمارے حصے میں آتی۔ یہی نہیں ہم اس کی جڑوں کو بہت اندر تک کھود کر بری طرح لہولہان کرنے میں بھی بالکل نہیں جھجکتے تاکہ کسی بھی طرح ادھر ادھر سے اس کی کونپلوں کے پھوٹنے کا شائبہ تک بھی دفن ہو جائے۔

ہم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اخبار ورسائل کی عمارت جن بنیادوں پر ٹکی ہوتی ہے ان میں سب سے اہم اشتہار کی دستیابی ہے۔ انگریزی اور ہندی اخبار ورسائل یہاں تک کہ ادبی مجلوں کی ترویج واشاعت کے لیے وافر مقدار میں اشتہارات کے ذریعے مالی دشواریوں کے تمام تر مسئلے بہت آسانی کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں اور نمایاں طریقے سے ان کی اشاعت کا سلسلہ تیزی کے ساتھ جاری وساری ہے لیکن اردو کے ادبی رسائل کے لیے یہ مسئلہ ہمیشہ سے ہی نہایت دقت طلب اور پیچیدہ رہا ہے۔ انگریزی اور ہندی کے اخبار ورسائل جتنی آسانی کے ساتھ من مانی اشتہارات حاصل کر لیتے ہیں اردو کے رسالوں کو اس کا دسواں حصہ خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتا۔ بے پناہ بھاگ دوڑ اور دنیا بھر کی محنتوں اور کوششوں کے بعد اگر اشتہارات کا مسئلہ کچھ حد تک حل ہوتا بھی ہے تو پیسے کے نام پر جو رقم ملتی ہے وہ اپنی توقع سے ایک چوتھائی بھی نہیں ہوتی ہے۔ اشتہار کی جو مطلوبہ رقوم ہمارے کاغذات میں درج ہوتی ہیں انھیں سرے سے ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور رسالے کے معیار اور سرکولیشن پر نت نئے سوالات کی بوچھار کر کے اپنا الو سیدھا کرنے کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ ایک عرصے تک جوتیاں چٹخانے کے بعد مالی دشواریوں کا مسئلہ کچھ حد تک حل ہوتا ہوا نظر آتا بھی ہے تو تلخ حقیقتوں کی ایک ذرا سی ٹھیس تصور کا محل مسمار کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ایسے

بقراطوں کو کون سمجھائے کہ اردو رسالوں کا انگریزی اور ہندی کے رسالوں سے موازنہ کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ معیار اور مواد کی سطح پر اردو رسالوں میں انگریزی اور ہندی رسالوں کی بہ نسبت کسی بھی طرح کی کوتاہی کا دخل ہوتا ہے لیکن مواد کی بہتر پیش کش اور رسالے کے بھرپور گیٹ اپ کے لیے پیسے کی فراوانی سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے اور اس مرحلے میں مایوسی اردو رسالوں کا جیسے مقدر بن چکی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مطلوبہ معیار کے تقاضے کس طرح پورے ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنے پر غیروں سے گلے شکوے بہت حد تک بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو خالص تجارتی ذہن رکھتے ہیں اور ایک مخصوص تہذیب و ثقافت سے پوری طرح نابلد ہیں ان سے یہ شکایت بالکل بے جا ہے کہ وہ جذباتی طور پر ہمارے محسوسات کے شریک ہوں۔ تجارتی نقطۂ نظر کے سہارے اردو رسالوں کے لیے اشتہاروں کے سلسلے میں ان کی بے اعتنائی بہت حد تک سمجھ میں بھی آتی ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ اپنے لوگ جن کے دلوں میں بظاہر قوم وملت کی فلاح و بہبودی کا دریا موجزن نظر آتا ہے وہ بھی فراخ دلی کے بجائے حد درجہ تنگ دستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اردو رسالوں کو اشتہار دینا اپنے لیے حد سے زیادہ گھاٹے کا سودا تصور کرتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اشتہار دینے میں ایسی کمپنیوں، اداروں اور لوگوں کو تجارتی طور پر کوئی فائدہ نہیں بھی پہنچ رہا ہے تو کیا ملک وملت، تہذیب و ثقافت کے نام پر ہم اتنا بھی تعاون نہیں دے سکتے۔ دنیا بھر کے غیر ضروری کاموں میں شاہ خرچی کو ہم بڑے فخر سے اپنی زندہ دلی کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن ہائے افسوس کہ اردو کے نام پر ادبی رسائل کے نام پر اپنا حقیر سا تعاون بھی ہمیں منظور نہیں۔

ادھر کچھ برسوں میں ادبی رسائل کے بیشتر مدیروں نے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ قارئین ادب کی خدمت میں بارہا یہ گزارش کی کہ اردو رسالے خرید کر پڑھیں اور دوست احباب کو بھی اس نیک کام کے لیے راغب کریں لیکن اس بنیادی نکتے کی جانب سنجیدگی سے توجہ دینا ہم نے اخلاق اور مروت کے خلاف سمجھا۔ تخلیق کاروں نے اپنا فرض پورا کرنے کے بجائے ادب کے عام قارئین سے اس ضمن میں پیش قدمی کی توقع کی۔ عام قارئین نے بہت حد تک اس یک طرفہ پیش قدمی میں پہل بھی کی لیکن تمام تر کوتاہیاں تخلیق کاروں کی محدود سوچ کے باعث دن بہ دن مزید پیچیدہ ہو گئیں اور ادبی رسائل کی بقا کا مسئلہ واقعی ایک سنگین صورت اختیار کر گیا۔ تخلیق کاروں نے اطمینان کے ساتھ ادب تخلیق کیا اور اپنے فرض کے خاتمے پر حد درجہ سکون کی سانس لی لیکن وہ یہ بھول گئے کہ قلمی تعاون کا فریضہ انجام دینے کے بعد ان کا ایک اور اہم فریضہ بچا رہ گیا۔ مالی تعاون کے سلسلے میں انھوں نے

فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا اور اعزازی کاپیوں کی طلب کو اپنے پیدائشی حق سے تعبیر کیا۔ یہ نازک مقام جتنی سنجیدگی کا متقاضی تھا ادیبوں نے اپنی کند ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اتنے ہی غیر سنجیدہ ہونے کا ثبوت دیا اور رسالے کو خرید کر پڑھنے کے بجائے مفت حاصل کرنے کی دھن میں پیش پیش رہے۔ اس سے ادبی رسائل کو بہت نقصان پہنچا اور ہنوز اس کی تلافی نہیں ہو پا رہی ہے۔ ادب کے عام قارئین جو صرف قارئین ہیں اور جن کی تعداد محدود ہے انھوں نے رسالے خرید کر پڑھنے میں تھوڑی بہت فراخ دلی تو دکھائی لیکن ادب کے خاص قارئین جو تخلیق کار بھی ہیں اور جن کی تعداد اور آمدنی اچھی خاصی ہے انھوں نے اس ضمن میں ہمیشہ ہی کنجوسی دکھائی اور بھولے سے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں ادبی رسالے کی اشاعت زبردست خسارے کا سودا کیوں نہ ثابت ہو اور جب کمر توڑ خسارے کا سلسلہ مستقل جاری رہے تو اردو کا بڑا سے بڑا ہمدرد اور بہی خواہ بھی اس ہمدردی اور فیاضی سے باز رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھے گا۔

ادب روح کی غذا ہے اور ادب کا طالب علم ہونے کے ناتے ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ اس غذا کی فراہمی اور دستیابی میں ہم دل کھول کر تعاون دیں۔ جسمانی غذا کی تلاش میں ہم دنیا بھر کی صعوبتیں ہنسی خوشی برداشت کرتے ہیں اور محنت و مشقت کے بعد اپنے جسم کو نکھرتا دیکھ کر پھولے نہیں سماتے۔ چست اور تندرست جسم کے ساتھ ایک صحت مند ذہن اور توانا روح بھی ہمارے حصے میں آئے یہی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیے۔ قارئین ادب آیئے ہم ساتھ مل کر عہد کریں کہ ادب کی سرد ہوتی ہوئی رگوں میں ہم زندگی کا تازہ اور گرم لہو بھر دیں گے اور اس کے لیے زمانے کے سرد و گرم کا مقابلہ کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکیں گے۔ ادب کے صحت مند تصور کو جلا بخشنے کے لیے ہمیں آپسی اختلافات اور رنجشوں کو بھول کر ایک صف میں آنا ہی ہوگا کہ الگ الگ خانوں میں تقسیم رہنے سے کوئی مسئلہ مشترکہ طور پر کبھی حل نہیں ہوتا۔ ہمیں گروپ بندی کی بدعت اور لعنت سے نجات حاصل کرنے کا بیڑہ اٹھانا ہی ہوگا تاکہ قدم سے قدم ملا کر ہمیں اپنی منزلوں کا سراغ مل سکے۔ ادب کے خاص قارئین یعنی تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں ادب کا عام قاری یعنی صرف قاری بھی بننا پڑے گا اور اس کے لیے رسالے خرید کر پڑھنے ہوں گے۔ عملی اقدام کے لیے نہ صرف خود پیش قدمی کرنی پڑے گی بلکہ اپنے دوست احباب کو بھی اس جانب راغب کرنا ہوگا تاکہ ادبی رسائل کی بقا کا مسئلہ کچھ حد تک حل ہو سکے اور ہماری مسلسل کوششوں سے ایسی فضا تخلیق ہو جس میں اس صورت پر بہت حد تک قابو پایا جا سکے۔

ڈاکٹر گیان چند
3262 OAK LEAF
CHINO HILLS
CA 91709 (USA)

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کا نظام خطبہ:

داستانِ امیر حمزہ[1]

میں اپنے معاصرین میں اردو کے دو چند عالموں شمس الرحمٰن فاروقی اور رشید حسن خاں کا بہت معتقد ہوں۔ شمس الرحمٰن فاروقی اردو دنیا میں بابائے جدیدیت کے طور پر داخل ہوئے لیکن بعد میں انھوں نے اردو کے قدیم ادب اور قدیم علوم کے بارے میں معلومات کے ایسے دریا بہادیے کہ انھیں ہمارے کلاسیکی ورثے کا محافظ اور وکیل سمجھا جانے لگا۔ کچھ پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے انھیں خان عبدالغفار خان چیر پر پروفیسر مقرر کرکے اپنا عزت بڑھایا۔ دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ۱۹۶۱ سے نظام خطبات کا سلسلہ قائم کیا ہوا ہے۔ پروفیسر فاروقی نے انیسواں نظام خطبہ ۲۶ر فروری ۱۹۹۸ء کو دیا جسے مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے اگست ۱۹۹۸ء میں "داستان امیر حمزہ زبانی بیانیہ 'بیان کنندہ اور سامعین" کے نام سے شائع کیا۔ فاروقی صاحب نے کمال الفت سے اس کا ایک نسخہ ۴ر ستمبر ۱۹۹۸ء کو دستخط کرکے مجھے امریکہ بھیجا۔

داستان پر پہلا اہم کام کلیم الدین احمد کی "اردو اور فنِ داستان گوئی" آزادی سے پہلے کا ہے۔ وہ خالص تنقیدی کارنامہ تھا۔ داستانوں پر پہلا تحقیقی کام میں نے ۱۹۴۳ء میں مکمل کیا۔ میری کتاب اردو کی نثری داستانیں "۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد کے دو اڈیشنوں میں میں نے معتد بہ اضافے کیے ہیں۔

فاروقی صاحب کے خطبے کی تعارفی تقریر میں ڈاکٹر امیر عارفی صدر شعبۂ اردو نے داستانوں کے سلسلے میں کہا:

"پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر گیان چند اور پروفیسر فرمان فتح پوری نے اس پر ضرور کام کیا ہے لیکن اس موضوع کے کئی پہلو ہنوز اچھوتے ہیں۔" (ص ۸)

---

[1] اشاعت: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵

انھیں سہیل بخاری کا نام بھی لینا تھا۔ ان کے مشاہدے کی سب سے مضبوط دلیل فاروقی صاحب کا یہ خطبہ ہے۔ تنقید میں ان کی ژرف نگاہی تو مسلّم ہے ہی 'داستانِ امیر حمزہ' کی تحقیق میں بھی انھوں نے نئی معلومات کا ڈھیر لگادیا ہے۔ میں نے نثری داستانیں کے ۱۹۸۷ء کے اڈیشن میں داستانِ امیر حمزہ تین بابوں میں ۱۴۰ صفحے لکھے ہیں جب کہ فاروقی صاحب کا خطبہ بڑے بسطر کے ۱۲۹ صفحات کا ہے۔ برابر ضخامت کے باوجود ان کے اور میرے کام میں نقشِ ابتدائی اور نقشِ آخر کا فرق ہے۔ ان کی تنقید جدید ترین اصولوں کے مطابق ہے اور تحقیق میں بھی انھوں نے اتنے مزید حقائق پیش کیے ہیں کہ میں یہ انکشاف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے داستانِ امیر حمزہ کے صرف بنیادی آٹھ دفتروں کا مفصل مطالعہ کیا ہے جب کہ فاروقی صاحب نے اس کی توسیعات کو بھی ذہن میں رکھا ہے۔ اپنے خطبے میں انھوں نے آفتاب شجاعت، گلستانِ باختر، طلسم فتنۂ انور افشاں اور طلسم ہفت پیکر کے اقتباسات دیے ہیں۔ میں جملہ داستانوں پر ریسرچ کر رہا تھا اس لیے ایک داستان کو' وہ کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو' بہت وقت نہ دے سکتا تھا۔ میرا طریقِ کار یہ تھا کہ حمزہ کے توسیعی دفتروں کی ایک جلد روزانہ لائبریری سے ہوسٹل لاتا اور ایک دن میں اس کی ورق گردانی کر کے واپس کر دیتا۔ لائبریری سے کتاب لے کر شعبۂ اردو میں جاتا جسے دیکھ کر استاذی ڈاکٹر اعجاز صاحب مصرع پڑھا کرتے ع "بغل میں داب کے موٹی سی اک کتاب چلے۔" فاروقی صاحب نے آفتابِ شجاعت، گلستانِ باختر اور طلسم ہفت پیکر کو جس طرح بالاستیعاب پڑھا ہے' وہ میرے بس کا نہ تھا' میرے پاس وقت نہ تھا۔

ان متون کے علاوہ انھوں نے غالب لکھنوی کی یک جلدی داستانِ امیر حمزہ کو بھی مفصل پڑھا ہے۔ مجھے اپنی ابتدائی ریسرچ کے دوران اس داستان نگار اور اس کی داستان کے وجود کا بھی علم نہ تھا۔ کسی کتب خانے یا فہرست میں اس کا پتا نہ تھا۔ خوش قسمتی سے ۱۹۵۵ء کے قریب میرے پاس محمود نقوی (سہیل بخاری) کا پنجاب یونیورسٹی لاہور کا تحقیقی مقالہ جانچنے کے لیے آیا جس سے مجھے غالب لکھنوی کے اڈیشن کا علم ہوا۔ بعد میں خطبات گارساں دتاسی میں بھی اس کا ذکر دیکھا لیکن یہ کتاب عنقا تھی۔ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک کے شعبۂ اردو کی فرانسس پریچٹ (PRITCHETT) اپنی تحقیق کے سلسلے میں دہلی گئیں۔ اردو بازار دہلی میں کتابوں کی نجی دکان انجمن ترقی اردو میں کتابیں دیکھیں۔ مولانا نے ایک بستہ کھول کر یہ کتاب بھی دکھائی۔ وہ اسے خرید کر امریکہ لے آئیں۔ ان کے علاوہ نائب حسین نقوی مرحوم کو بھی غالب کا ۱۸۶۸ء دہلی کا اڈیشن ملا۔ فاروقی صاحب نے غالباً پریچٹ سے یہ کتاب لے کر تفصیل

سے پڑھی گئی ہے جب کہ میری معلومات صرف کلیم بخاری کے مقالے سے ملی ہوئی یادداشتوں تک محدود ہیں۔

اگر میں فاروقی صاحب کے لیکچر کے جملہ محاسن کا تفصیلی جائزہ لوں تو یہ مضمون ایک رسالہ کی حدود سے آگے نکل جائے گا۔ مجھے کہیں کہیں ان کے نقطہ نظر سے اختلاف بھی ہے۔ ادب کے ساتھ اسے بھی پیش کرتا ہے۔ اس لیے اپنے جائزے کو محض کتابت کے ساتھ درج کرتا ہوں۔

فاروقی صاحب کے لیکچر "داستان امیر حمزہ" کا ذیلی عنوان ہے
زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین

بڑے سلیقے سے لیکچر کے مندرجہ بالا تین حصے کیے ہیں۔ ابتدا میں کہتے ہیں کہ داستان امیر حمزہ کے بارے میں چار باتیں ذہن میں رکھنا چاہئیں:

۱۔ یہ بیانیہ کی صنف سے ہے۔
۲۔ داستان امیر حمزہ تمام نثری یا منظوم داستانوں کی طرح بیانیہ ہے۔
۳۔ داستان امیر حمزہ داستانی مطالعات میں ایک الگ علوم یہ (discipline) قرار دیے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔
۴۔ داستان امیر حمزہ کے مطالعے کے لیے بابِ نو بہار اور فسانۂ عجائب کو نمونۂ مثال نہ قرار دینا چاہیے۔

مجھے پہلی، تیسری اور چوتھی باتیں تسلیم ہیں، دوسری کے بارے میں میرے ذہن میں کئی شکوک و سوالات ابھرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نقدِ ادب میں میرا علم اور فہم کتنے ناقص ہیں لیکن اس بے بضاعتی کے باوصف اپنے خیالات پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میری رائے میں زبانی بیانیہ صرف اس تخلیق کو کہیں گے جو لوک ادب کی طرح "تصنیفِ بے مصنف" ہو یعنی جس کے مصنف و زمانۂ تصنیف کا کوئی علم نہ ہو۔ جو زمانۂ حاضر سے پہلے، عرصے تک محض زبانوں پر رائج رہی ہو قلم پر نہیں۔ لوک ساہتیہ کی دو اہم شاخیں نظم میں لوک گیت اور نثر میں لوک کتھائیں ہیں۔ دیویندر ستیارتھی اور اظہر علی فاروقی نے گیت اکٹھے کیے۔ ان کی زبان اردو بھی کہی جا سکتی ہے، ہندی بھی۔ وہ صحیح معنی میں "ہندستانی" ہے۔ حیدرآباد ریڈیو سے عورتوں کے ڈھولک کے گیت نشر کیے جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں تیج میں جھولے کے گیت، شادی بیاہ میں تقریبات کے گیت ملتے ہیں۔ میں نے زمانۂ طالب علمی میں الہ آباد میں اپنے ہوسٹل کے سامنے ہولی کی راتوں میں دھوبیوں کی بزم سے میں خانہ ساز گیت سنے ہیں۔ ایک لائن مجھے اب بھی یاد ہے۔

پھاگ راج بڑا بھاری ملکوں ملکوں جس کی یاری

مغربی یوپی میں ہولی کے فوراً بعد گاؤں کے مزارع زمین داروں اور کھنڈ سار ی کے صنعت کاروں کے گھر طائفے کی شکل میں آکر گاتے ناچتے، کودتے اچھلتے ہیں۔ یہ تمام گیت زبانی روایت کے اجزا ہیں۔ ان سے زیادہ محترم گاؤں میں رات کو آلھا گانا ہے۔ یہ قدیم راجستھانی شاعر: جگنک کا آلھا نہیں بلکہ اس سے ماخوذ ہندستانی کا آلھا ہے جس میں سے زیادہ تر متھرولال عطار کی تصنیف ہوتا ہے۔ اسی کی طرح بریلی کے راوھے شیام نے رامائن کو عوامی بولی میں ڈھال دیا۔ ان دونوں شعرا کی تخلیقات زبانی بیانیہ کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

میرے لڑکپن میں بچوں کے اصرار کرنے پر گھریلو ملازمین گاؤں کی رعایا' تقریبات والے ہندو نائی وغیرہ لمبی لمبی کہانیاں سنا دیتے تھے۔ یہ سونی صد داستانی انداز کی ہوتی تھیں۔ میں نے ایک نوٹنکی میں "خدا دوست " کے نام کا سوانگ دیکھا۔ داستانوں کی تحقیق میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فسانہ عجائب میں شاہ یمن کی گھٹی کہانی یہی تھی۔ معلوم نہیں سرور نے ایک عوامی کہانی کو اپنی داستان میں پرو لیا یا سوانگ کے کہانی کار نے فسانہ عجائب سے استفادہ کیا۔ لوک ادب کی دوسری شکلیں کہاوتیں' پہیلیاں' بچوں کی تک بندیاں وغیرہ ہیں۔ ان میں سے کچھ گیت' کہانیاں' دوہے کہاوتیں' پہیلیاں وغیرہ ہمارے زمانے میں ضبطِ تحریر میں بھی آجائیں تو بھی بنیادی حیثیت سے یہ زبانی ادب پارے ہیں۔ فی الوقت سب سے اہم زبانی ادب ڈرامے اور فلموں کے گانے ہیں۔ ان کا استعمال زیادہ تر زبانوں پر ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ پہلے تحریر میں اور بعدہ' تقریر میں ظاہر ہوئے ہیں اس لیے انھیں لوک ادب نہیں کہا جاسکتا۔

اگر تحریر کا فن لگ بھگ چھٹی صدی قبل مسیح میں وجود میں آیا تو اس سے پہلے کی تمام تخلیقات زبانی بیانیہ ہیں۔ ویدوں اور پرانوں کی یہی کیفیت ہے۔ جو شخص دو ویدوں کو حفظ کر لیتا تھا اسے دویدی یا دوبے' تین ویدوں کو حفظ کرنے والے کو ترویدی یا ترپاٹھی اور چاروں ویدوں کو حفظ کرنے والے کو چترویدی یعنی چوبے کہتے تھے۔ ہندوؤں کا رزمیہ مہابھارت کہنے کو ویاس کی اور یونان کی ایلیڈ اور اوڈیسی ہومر کی تصنیف ہیں لیکن یہ دراصل کئی صدیوں میں متعدد گم نام شعرا یعنی بھاٹوں (bardo) کی تخلیقات کے اضافے سے متشکل ہوئی ہیں۔ مہابھارت کے موجودہ متن کو کتنے علما نے کتنے مختلف نسخوں کی مدد سے کتنے طویل عرصے میں مدون کیا۔ اس کے مدونِ اعلیٰ سنک تھنکر (Sukthankar) نے ۱۹۳۳ء میں پونا سے شائع کیا۔

انگریزی میں لوک کتھاؤں (folklore) پر بہت کام ہوا ہے۔ اردو میں لوک گیتوں کو جمع کرنے پر توجہ کی گئی لوک کتھاؤں پر بالکل نہیں۔ شیخ چلی اور عورت ذات قسم کے قصے نانیاں

زبانی لوک کتھائیں تھیں جن کو بعد میں ضبطِ تحریر میں لے آیا گیا۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس بڑھاپے میں ای لٹ کے لیے اردو اور ہندی داستانوں کے مشترک مضامین (Common motiffs) پر کام کر رہے تھے۔ یادداشتی مواد کے گٹھے کے گٹھے تیار کر لیے تھے کہ بعد میں بینائی لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئی۔ افسوس سب نقات پڑا رہ گیا اور بنیادہ لاد چلا۔ مجھے لوک کتھائیں اور بچوں کی پری کتھائیں پڑھنے سے بہت سکون ملتا ہے۔

اردو میں دکنی میں ایسی قلمی داستانیں ملتی ہیں جن کا نہ مصنف معلوم ہے' نہ زمانۂ تصنیف مثلاً قصہ ہندکان عالی قصہ ملک زبان و کام کندلا قصہ انار رانی قصہ بہروز سوداگر قصہ گل وہرمز' قصہ دلالہ مثالہ قصہ کام روپ قصہ اگر گل قصہ معظم شاہ و چتر ریکھا قصہ ملک روم وغیرہ۔ میری رائے میں ان قصوں کو ان کی بے مصنفی (anonymity) کے باوجود زبانی روایت میں شامل نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان کے بارے میں پہلا علم ایک باقاعدہ تحریری متن سے ہوا ہے' ان کے زبانوں پر رائج رہنے کا ثبوت نہیں۔ اردو کے مشہور قصوں چار درویش' حاتم طائی' گل بکاولی' گل صنوبر' اگر و گل وغیرہ کی اصل فارسی سے ہے لیکن ان کے مصنف زمانۂ تصنیف اور کسی قطعی ماخذی متن کا علم نہیں کیا یہ سب اصلاً زبانی بیانیہ رہے ہوں گے' بعد میں تحریری ادبی متن ہو گئے۔

داستانِ امیر حمزہ کی کیا کیفیت ہے؟ کیا عرصے تک زبانوں پر جاری رہی اور اس زبانی بیانیے کو بعد میں ادبی شکل دی گئی یا یہ پہلے تحریری شکل میں ظاہر ہوئی اور اس سے ماخوذ کر کے اس کے اجزا سے قصہ خوانی کی محفلیں آراستہ کی گئیں۔ ایک نظر ڈالیں کہ داستانِ امیر حمزہ کا قدیمی ذکر کہاں کہاں ملتا ہے۔

داستان کے فارسی اور اردو راویوں نے محمود غزنوی کے عہد' امیر خسرو اور فیضی کو اس کا مصنف کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ راویوں اور ناشروں دونوں کی دلچسپی اس بات میں تھی کہ داستان کو زیادہ سے زیادہ قدیم قرار دیا جائے۔ روایتوں کو قبول کرنے میں بڑے حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں رشید حسن خاں کی تنبیہ پر عمل کرنا پسند کرتا ہوں۔ مثنویاتِ شوق کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"میں ایک بات پر خاص کر زور دینا چاہتا ہوں۔ مثنوی گلزارِ نسیم کی تدوین کے دوران اس سے متعلق زبانی روایتیں میرے سامنے آئیں مثلاً یہ لکھا گیا کہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے یا یہ کہ فلاں صاحب کے بھائی' شاگرد یا والد نے خود مجھ سے یہ کہا تھا یا میرے سامنے یہ بیان کیا تھا' جانچ لینے پر معلوم ہوا کہ ایسی سبھی روایتیں خانہ ساز تھیں۔۔۔ تب سے میں زبانی روایتوں کے سلسلے

میں پہلے سے زیادہ خلط ہو گیا ہوں' خاص کر ایسی روایتیں جن پر کسی واقع کے ہونے یا نہ ہونے کا دار و مدار ہو۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ روایت کی کچھ اصل تو ہے' لیکن نقل کی روایت کے سلسلے میں اس کا چہرہ مہرہ بدل گیا ہے یا بگڑ گیا ہے۔" (ص ۷۷۔۷۶)

داستانِ حمزہ کے راویوں اور ناشروں کی تحریری روایتوں کو بھی اسی طرح پرکھنا ہوگا۔ جائزہ لینے پر معلوم ہوگا کہ یہ سب بے اصل ہیں۔ روایتوں کو قلم انداز کر کے دیکھیں کہ اس کے قدیم نسخے کب کے ہیں۔

۱۔ جیسا کہ میں نے نثری داستانیں (لکھنؤ ۱۹۸۷ء) میں فارسی کے ملک الشعرا بہار کی سبک شناسی کے حوالے سے لکھا ہے اس داستان کا ہیرو خارجیوں کا ایک سردار حمزہ بن عبداللہ (یا آزرک وغیرہ) تھا۔ فرہنگِ آصفیہ کے مطابق 'خارجی' مسلمانوں کے اس فرقے کو کہتے ہیں جو حضرت علیؓ کو خلیفہ برحق نہیں مانتا اور ان سے باغی ہو کر لڑا۔ یہ حمزہ خارجی ایک عرصے تک خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ معرکہ آرا رہا۔ ہارون کے انتقال کے بعد وہ اپنے رفقا کے ساتھ سندھ، ہند' سراندیپ' چین' ترکستان اور روم وغیرہ کا سفر کر کے سیستان واپس آیا۔ اس کے معتقدین نے اس کی جنگوں اور سیاحتوں کی تفصیل میں ایک کتاب "مغازی حمزہ" لکھی۔ بعد میں شیعہ ایرانیوں نے اس کتاب کو عام مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لیے اس میں حمزہ بن عبدالمطلب کا نام ڈال دیا اور خلفائے بنی عباس کی جگہ کفار کو حریف کر دیا۔ (نثری داستانیں۔ ص ۹۳۔ ۶۹۲)

اس حمزہ کا ذکر فارسی کی تاریخ سیستان اور تاریخ بیہقی میں ملتا ہے۔ ہارون الرشید کا عہد ۱۹۳ھ / ۸۰۸ء میں ختم ہوا۔ گیا مغازی حمزہ اس کے دس پندرہ سال کے اندر لکھ دی گئی ہوگی۔ معلوم نہیں اب یہ کتاب دستیاب ہے کہ نہیں۔ میرے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ داستانِ حمزہ کا ہیرو یہی حمزہ ہوگا۔ داستان حمزہ میں لشکرِ اسلام اور بادشاہ اسلام کا ذکر آتا ہے۔ بعثتِ رسولؐ سے پہلے ان کے چچا حضرت حمزہ لشکرِ اسلام لے کر کیوں کر گھوم سکتے تھے۔ مغازی حمزہ کی بنا پر داستانِ امیر حمزہ تعمیر کی گئی ہوگی۔

۲۔ پرسی براؤن نے اپنی کتاب Indian Painting میں لکھا ہے کہ جب ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر کابل میں پناہ گزیں ہوا تو ۱۵۵۰ء / ۹۵۶ء میں دو مصوّر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہمایوں نے انھیں داستانِ حمزہ کو مرقع کی شکل میں تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ کام سو سو صفحوں کی ۱۲ جلدوں پر پھیلنا تھا۔ اس مرقع کا ذکر عہدِ اکبر کی کئی فارسی تاریخوں میں ہے۔ اس سے طے ہو جاتا ہے کہ یہ داستان فیضی سے قبل موجود تھی۔ (نثری داستانیں۔ ص ۹۱۔ ۷۸۹)

۳۔ رموز حمزہ اس کے انتخاب زبدۃالرموز کا مولف حاجی قصہ خواں ہمدانی لکھتا ہے کہ وہ ۱۰۲۲ھ / ۱۳-۱۶۱۲ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں رموز حمزہ کے کئی نسخے لے کر گیا جس کے معنی ہیں رموز اس سے کافی پہلے کی تصنیف ہوگی یعنی ۱۶۰۰ء کے آس پاس کی۔

۴۔ زبدۃالرموز عبداللہ قطب شاہ (۷۲-۱۶۲۶ء) کے دربار میں تیار ہوئی۔

۵۔ میں نے اپنی کتاب نثری داستانیں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں لکھا ہے کہ رام پور میں ایرج نامے کا گیارھویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ ہے۔ ضرورت ہے کہ کتب خانے میں ایک بار دیکھ کر توثیق کرلی جائے۔ (طبع ۱۹۸۷ء ص ۲۷۹)

۶۔ برٹش میوزیم میں یک جلدی داستان حمزہ کے کئی نسخے ہیں جن میں سے قدیم ترین اسرار الحمزہ مکتوبہ ۱۱۱۲ھ / ۱۷۰۱-۱۷۰۰ء ہے۔

۷۔ بوستان خیال کا مصنف میر محمد تقی خیال ۱۱۴۸ھ / ۳۶-۱۷۳۵ء میں دلی گیا جہاں وہ ایک قہوہ خانے میں جابیٹھا تھا۔ وہیں ایک داستاں گو قصے سنایا کرتا تھا اور دوسروں کی تخلیقات کو اپنا بنا کر پیش کرتا تھا۔ کسی نے اس کا سرقہ پکڑ لیا جس پر داستاں گو نے کہا کہ داستان گوئی اہلِ علم کے بس کا روگ نہیں۔ اس پر تقی خیال نے بوستان خیال کے ابتدائی اوراق تصنیف کر کے وہاں سنائے اور اس کے بعد روزانہ سنانے لگے۔ بوستان خیال کی باقاعدہ ابتدا ۱۱۵۵ھ / ۴۳-۱۷۴۲ء میں ہوتی ہے۔ چونکہ بوستان خیال داستان امیر حمزہ کا جواب اور چربہ ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ داستان گو حمزہ کی داستانیں سناتا ہوگا۔ سرقہ پکڑا جانا اسی صورت میں ممکن ہے کہ کسی سامع کو داستان حمزہ کا کوئی تحریری نسخہ مل گیا ہو۔ خیال نے بوستان خیال فارسی میں لکھ کر سنائی۔ کیا وہ داستان گو بھی فارسی میں داستان سناتا تھا؟ کیا اس زمانے میں دلی میں عوام فارسی سمجھتے تھے؟ ممکن ہے وہ قہوہ خانہ ایرانیوں یا عربوں کا ہو۔ قہوہ تو عربی کا مشروب ہے ہندستان کا نہیں۔

داستان امیر حمزہ کے اتنے قدیم تحریری نسخے ہیں۔ انھیں کے اجزا کو لے کر داستان گوئی کے لیے استعمال کیا گیا ہوگا۔ ایک نحیف سا غیر مدلل قیاس ہے کہ مصنفِ بوستان خیال کا حریف داستان گو قہوہ خانے میں اسی داستان سے اپنی بزم گرماتا تھا۔ اس کے بعد ہمیں اس داستان کے زبانی سنانے کے جو تذکرے ملتے ہیں وہ وسط انیسویں صدی اور اوائل بیسویں صدی کے ہیں(۱) یعنی اس داستان کی زبانی قرأت تحریری نسخوں پر مقدم نہیں 'موخر اور بہت موخر ہے۔ اسے زبانی بیانیہ نہیں کہہ سکتے۔ کیا فاروقی صاحب اسے اس لیے زبانی بیانیہ کہہ رہے ہیں

[illegible]

کچھ یہ سنائی بھی گئی تو اردو کی بیشتر غزلیں، بیشتر قصیدے، بیشتر مرثیے مشاعروں، درباروں اور مجلسوں میں سنائے گئے۔ نئے افسانہ نگاروں کے افسانے نیز تنقیدی اور تحقیقی مقالے بھی محفلوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ ہم انھیں زبانی ادب نہیں کہہ سکتے۔ فاروقی صاحب نے اپنے خطبے میں جس داستانِ حمزہ سے بحث کی ہے وہ کلاسیکی ادبی تحریری شکل ہے، زبانی کہانی نہیں۔ جتنے نمونے دیے ہیں سب کتابوں سے ہیں، کسی کی مجمعوں میں سنائی ہوئی داستان کے نہیں۔ میں زبانی ادب کی اہمیت کا منکر نہیں۔ فاروقی صاحب نے احمد حسین قمر کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے لیے داستان نویسی کی معراج یہ ہے کہ پڑھنے پر یہ معلوم ہو جیسے داستاں گو داستان کہہ رہا ہے (ص ۳۸) لیکن ہمارے سامنے جو داستانِ حمزہ کے دفتر ہیں۔ اُن کا اسلوب بیان بات چیت کا نہیں تحریری انشا کا ہے۔ ان کے مقابلے میں باغ و بہار کا اسلوب نسبتاً تقریری ہے۔

فاروقی صاحب لکھتے ہیں

"داستان اس قسم کا بیانیہ ہے جس کا تعلق ان اصناف سے ہے جو زبانی سنائی جانے کے لیے لکھی جاتی تھیں جیسے مثنوی۔" (ص ۱۷)

یہ میرے لیے مزید حیرت کی بات ہے۔ میں نے سنا ہے کہ حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام اور شاید ایک آدھ اور کسی مثنوی کے اجزا مجمعوں میں سنائے گئے لیکن اردو کی دکن و شمال کی کسی دوسری مثنوی کے لیے نہیں سنا کہ وہ غزلوں کی طرح شعری مجلسوں میں سنائی گئی ہو یا سنانے کے لیے لکھی گئی ہو، میر کی بہت مختصر مثنوی اژدر نامہ کی دوسری بات ہے۔

فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

ہم میں سے اکثر کے ذہن میں داستان کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ نصابی کتابوں کی حد تک لفظ داستان سے ہم لوگ باغ و بہار یا فسانۂ عجائب مراد لیتے ہیں۔ یہ مشکوک ہے کہ یہ دونوں متون داستان کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔" (ص ۱۶)

"باغ و بہار فسانۂ عجائب جیسے تحریری متون کو داستان کا درجہ دے دیا گیا" (ص ۱۴۲)

میرا خیال ہے کہ اردو کے عام قارئین کے ذہن میں داستان اور ناول کا واضح امتیازی تصور ہے، فاروقی صاحب کے ذہن میں کیا تصور ہے، یہ واضح نہیں ہوتا کیونکہ وہ "باغ و بہار" جیسی چوٹی کی داستان کو داستان کہنے کے لیے تیار نہیں۔ مجھے تو باغ و بہار، فسانۂ عجائب، داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال میں بہت کچھ مشترک نظر آتا ہے۔ سب کی فضا اور ماحول یکساں ہیں۔ یہ سب داستانیں ہیں جن میں داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال ایک ذیلی نوع ہیں، باغ و بہار

اور فسانۂ عجائب وغیرہ دوسری ذیلی نوع ہے۔ اول الذکر دونوں طویل داستانیں مہابھارت، ایلیڈ، اوڈیسی اور شاہنامہ کی طرح رزمیہ (Epic) کا شکوہ اور انداز رکھتی ہیں لیکن یہ رزمیہ کے ساتھ بزمیہ بھی ہیں۔ یہ ہمارے سامنے باغ و بہار، فسانۂ عجائب، حاتم طائی، اور گل بکاؤلی وغیرہ کی طرح تحریری جامے میں آئی ہیں۔

فاروقی صاحب کے ساتھ میری جنگ زرگری بہت طول کھینچ گئی۔ میں ان سے عمر میں زیادہ اور شعور میں کم ہوں، پھر بھی عفو کا طالب ہوں۔ اس "زبانی" اختلاف کے بعد ان کے خطبے میں جو کچھ ہے وہ داد سے بالاتر ہے۔

انھوں نے ایک اصطلاح "داستان کی شعریات" استعمال کی ہے۔ میں شعریات کے معنی "شاعری کی تنقید کے اصول" سمجھتا تھا لیکن ان کی کتاب سے معلوم ہوا کہ تو دوروف (TODOROV) کی کتاب کا نام The Poetics of Prose ہے (ص ۴۷)۔ اس کے بعد کون اعتراض کر سکتا ہے۔ جو چاہے آپ کا قلم کرشمہ ساز کرے۔ اگر نثری نظم ہو سکتی ہے تو نثر اور داستان کی شعریات بھی ہو سکتی ہے۔ زمانہ ہم اگلے زمانے والوں کو کیا کیا دکھائے گا، کیا کیا سنوائے گا۔ مجھے تو اردو کی حد تک داستان یا نثر کی شعریات اٹ پٹی سی بات معلوم ہوتی ہے تاہم چہ از دوست می رسد نیکوست، خاص طور پر فاروقی صاحب جیسے جوان دوست سے۔ میں اکبر الہ آبادی کا یہ شعر نہیں پڑھ سکتا۔

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی   لغات مغربی بازار کی بھاکا میں ضم ہوں گے

کیونکہ شمس الرحمٰن فاروقی الہ آبادی میرے مقابلے میں کہیں زیادہ مشرق پرست ہیں۔

فاروقی کی طرح غالب لکھنوی کے ترجمے کے گم نام رہنے کی مجھے بھی حیرت ہے۔ غالب کی داستان کے دو اڈیشنوں کا پتا چلتا ہے، ۱۸۵۵ء کا کلکتہ کا اڈیشن اور ۱۸۶۸ء کا لندن کا اڈیشن جو نائب حسین نقوی کے ہاتھ لگا۔ نول کشور پریس سے عبداللہ بلگرامی کا اڈیشن ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا۔ میرا خیال ہے کہ غالب کے متن پر ڈاکا عبداللہ بلگرامی نے تو خود نہیں، نول کشور پریس کے ایما پر ڈالا ہوگا۔ ہندوپاک میں ایک دوسرے کی کتابوں کے قزاقی (Pirate) اڈیشن نہیں چھاپے جاتے۔ فاروقی نے شیخ سجاد حسین کے انگریزی ترجمے کی تفصیل دے کر معلومات میں اضافہ کیا (ص ۱۷)۔

انھوں نے غالب کے خط بنام سالک سے جو یہ دریافت کی ہے کہ ان کے یہاں دو داستان گو بالالتزام آتے تھے (ص ۱۹)، یہ ان کی دلچسپ تحقیق ہے۔ انھوں نے غالب کے ایک اور خط کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔ میں نے غالب کا ایک اور خط پڑھا تھا جس میں انھوں

نے اپنے پاس شراب کی بہت سی بوتلیں اور داستان امیر حمزہ کے بہت سے جزو ہونے پر اظہار شادمانی کیا تھا۔ فاروقی لکھتے ہیں کہ خلیل علی اشک اور غالب لکھنوی کے ترجموں کی فارسی اصل ناپید ہیں (ص ۲۱) وہ میری کتاب کا ص ۹۲۔ ۳۹۳ دیکھیں تو مفید ہوگا۔ ۱۹۶۷ء میں نائب حسین نقوی نے مجھے اصرار کے ساتھ لکھا کہ رضا لائبریری میں میر احمد علی کا شاہ عالم کے عہد اردو میں ترجمہ کیا ہوا نسخہ ہے جو اشک کے نسخے سے من وعن ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نقوی کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاہ عالم کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہوا۔ میر احمد علی نے فارسی میں ۱۸۵۳ء میں ایک ضخیم امیر حمزہ لکھی ہے۔ وہ شاہ عالم کے عہد میں نہیں لکھ سکتے۔ میری تحریری یادداشتوں کے مطابق نقوی میر احمد علی کے جس نسخے کا ذکر کر رہے ہیں وہ کسی اور نے "بانوئے سلطان عالم" کے حکم سے لکھا ہے۔ اس نسخے سے قطع نظر مختلف کتب خانوں میں بالخصوص انڈیا آفس اور برٹش میوزیم لندن میں داستان امیر حمزہ کے کئی یک جلدی فارسی نسخے ملتے ہیں۔ قدیم اردو نسخے بھی لندن پریس کراچی اور کلکتے میں ہیں۔ کوئی پختہ کار محقق ان کو دیکھ سکے تو اشک و غالب کے ماخذ کا پتا چل سکتا ہے۔ کبھی فاروقی صاحب لندن جائیں تو برٹش میوزیم کے فارسی نسخوں کو ضرور دیکھیں۔ ہمارے ریسرچ اسکالر تحقیق کے لیے سستے اور آسان موضوع تلاش کرتے ہیں۔ اردو کی کسی ایک داستان کو لے کر اس کے تمام اردو فارسی اور انگریزی کے نسخوں کا مطالعہ کریں تو بہت سی نئی معلومات سامنے آئیں۔

فاروقی نے اپنے مختصر رسالے میں اتنی اہم معلومات بھر دی ہیں کہ میں ان سب کی داد دوں تو مضمون ۲۵۔ ۲۰ صفحوں کا ہو جائے گا۔ ص ۲۵ پر غالب لکھنوی کا تعارف دیکھیے۔ انھوں نے نساخ کے تذکرے میں ان کا احوال ڈھونڈ نکالا۔ گلکرسٹ کی ہندی اسٹوری ٹیلر سے دریافت کیا کہ خلیل علی اشک داستان امیر حمزہ کا ترجمہ ۲۰۔ ۱۵ بڑی جلدوں میں کرنا چاہتے تھے۔ فاروقی نے سر سال یا سریال کا صلصال کے طلسم کا بیان اشک غالب لکھنوی رموز حمزہ اور زبدۃ الرموز سے نقل کیا۔ آخری دو کا فارسی اقتباس دے کر اس کا اردو ترجمہ بھی دے دیا۔ اس سے بڑی سہولت ہوگئی۔ میں ان کتابوں کی فارسی نثر کو پوری طرح سمجھ سکتا ہوں لیکن ذہن پر بار تو پڑتا ہی ہے۔ اردو ترجمہ روانی سے پڑھا جا سکتا ہے اور اس طرح چاروں کے بیان کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

فاروقی نے ص ۳۳ پر میرے لیے یہ چونکانے والی معلومات بہم پہنچائی ہے کہ آفتاب شجاعت کا اصلی نام طلسم آئینہ سلیمانی ہے لیکن اسی صفحہ کے ان کے حسب ذیل مشاہدے سے مجھے اتفاق نہیں۔

"فارسی کی جو داستان ہندوستان میں لکھی گئی اور جس پر داستان امیر حمزہ کا کوئی اثر نہیں بوستان خیال ہے" (ص ۳۳)۔

میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

"بوستان خیال پر جابجا داستان حمزہ کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ صاحب قرانوں کا وہی انداز ہے، عیار اسی قبیل کے ہیں۔ ان کے پاس اسی طرح کے تحفے ہیں۔ امیر حمزہ میں صاحبقران شہزادے اور عیار پیغمبروں کے نظر کردہ تھے۔ یہاں ستاروں کو مسخر کیے ہوئے ہیں۔ سحر جتنا اور جیسا ہے داستان حمزہ سے متاثر ہے۔ بعض طلسم اسی نقشے کے ہیں۔" (ص ۳۶-۸۳۵)

بوستان خیال میں داستان حمزہ کی طرح ساحر اسم باطل السحر (حمزہ کا اسم اعظم) کو شیشے میں بند کر دیتا ہے جسے شیشہ توڑنے پر رہا کر لیا جاتا ہے۔ یہاں کے عیاروں مبتز توفیق اور مبتز سریع السیر کے پاس دوسرے سامان سے عمرو کی زنبیل ہے۔ ان کے پاس بھی ایسے تحفے ہیں جن کی مدد سے وہ دوسروں کو نظر نہیں آتے لیکن یہاں بھی یہ قدغن ہے کہ عیار غائب ہو کر کسی کو نہ مارے۔ بوستان خیال میں جمشید داستان حمزہ کے لنڈھور کی طرح داڑھی مونچھ میں موتی پروتا ہے۔ نقل کو مکمل کرنے کے لیے عیار اس کی داڑھی مونڈ لاتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ بوستان خیال میں قدم قدم پر داستان حمزہ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، تبھی تو میں اپنی کتاب میں یہ لکھنے پر مجبور ہوا۔

"اس ضخیم داستان نے متعدد ذرائع سے اپنا چراغ روشن کیا ہے، خصوصاً امیر حمزہ کا فیض بیان کرنے کے لیے تو پوری کتاب درکار ہے۔" (ص ۸۳۸)

فاروقی نے داستان حمزہ میں بھی ایک جگہ بوستان خیال کا نقش دریافت کر لیا۔ احمد حسین قمر طلسم فتنۂ نور افشاں میں ایک پری زادو کی زبانی کہلاتے ہیں کہ ان کا طلسم ہفت پیکر جواب بوستان خیال ہوگا۔ (خطبہ ص ۳۸) یہیں وہ داستان کے بارے میں اپنا معیار ظاہر کرتے ہیں۔

"صاف ثابت ہوگا کہ محمد داستان گو داستان کہہ رہا ہے"

لیکن عملاً وہ عام ادبی کتابی زبان لکھتے ہیں۔ میرے پاس ان کی لکھی ہوئی کوئی جلد تو نہیں۔ اپنی کتاب سے ایک نمونہ دیتا ہوں۔

"مصاحب ساحری ادھر سے رہ گئے۔ روح ساحری کو صدمے پہنچے، دو دن کے اقتدار پر فرعون ثانی بن گئے۔ یہ نہ سمجھے ہر فرعونے را موسیٰ، خدا ہوا پر کیا پیدا ہوئی۔ ساری خداوندی بھولے آرزو ہے سیر باغ میں ایسے بھولے بہار کی سیر نہ دیکھ سکے۔ نہ پھولے نہ پھلے، حسرت

لے کر ہائے دنیا سے چلے۔ ایک کو ایک جانتا ہے، ہر ایک جشر رنگ دنیا کو پہچانتا ہے۔ "گفتگو میں نہ جملے منطقی ہوتے ہیں نہ فارسی اضافت کا استعمال ہوتا ہے۔ ریختی کے شاعروں نے اسی لیے فارسی اضافت کو ممنوع ٹھہرا لیا تھا۔

فاروقی نے حقیقت بیان کرنے کے طریقے کے سلسلے میں کہا ہے۔

ہندستانی مصوری میں تناظر یعنی Perspective کا وجود نہیں، اگرچہ یہ تصور ہمارے یہاں شروع ہی سے موجود رہا ہے اور فن تعمیر میں اس کا استعمال بخوبی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر ہمارے یہاں مصوری میں تناظر کا استعمال نہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہمارے مصوّروں کو حقیقت بیانی کا سلیقہ نہ تھا۔ "(ص ۳۹)

کیا عالمانہ فلسفیانہ مشاہدہ ہے یا میں بالکل نہیں جانتا کہ مندرجہ بالا جملے میں مستعمل تناظر کے کیا معنی ہیں جو ہندستانی مصوری میں نہیں ہوتا، فن تعمیر میں ہوتا ہے۔ بہر حال اس سے فاروقی صاحب کے عمقِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے ہوش رُبا کے علاوہ دوسرے دفاتر کا بھی کس گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اس کا ایک نمونہ صلصال سے متعلق شیخ تصدق حسین کی تصانیف سے پیش کیا ہے جس کے لیے نوشیر واں نامے کے پانچ حوالے، ہرمز نامہ اور آفتاب شجاعت جلد چہارم کا ایک ایک بیان درج کیا ہے۔ اس ایک کردار کے مطالعے سے انھوں نے اچھے مفید نتیجے نکالے ہیں۔ اس کے بعد زبدۃالرموز میں صلصال کے قصے کی جزئیات دیتے ہیں۔

وہ زبانی بیانیہ کی جس لچک اور وسعت پذیری کا ذکر کرتے ہیں، اس سے بڑی حد تک اتفاق کیا جانا چاہیے لیکن جب وہ کہتے ہیں "لکھے ہوئے متن میں کسی قسم کی وسعت کی گنجائش نہیں ہوتی۔" (ص ۴۴) تو ان کا یہ مشاہدہ محلِ نظر ہو جاتا ہے۔ قصہ چار درویش کا نو طرزِ مرصع حاتم طائی اور گل بکاولی وغیرہ کے مختلف لکھے ہوئے متون دیکھیے۔ کس غضب کا تنوع اختلاف اور ارتقاد کھائی دیتا ہے۔ گلزار نسیم اختصار کا اعجاز ہے لیکن اس میں بھی نسیم نے ایک رمزیہ خواب کا اضافہ کیا ہے۔

بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا آتش پہ کباب دیکھتا تھا

اپندر ناتھ اشک کے ناول 'گرتی دیواریں' کے مختلف حصوں کے ہندی اور اردو متون میں فرق ہے۔ ان کے ڈرامے تو لیے 'صبح شام' ہندی انجو دیدی اور پھر اردو انجو باجی میں ایک ہی قصے میں وسعت ہے۔ ان کا ایک اور ڈراما پہلے گرداب کے نام سے گیا پھر فرزانہ پھر ہندی میں بھنور بنا اور ہر منزل میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہے۔ فاروقی اطلاع دیتے ہیں کہ داستان [illegible]

وجہ ہے کہ مالکوں میں افراسیاب اور طلسم ہفت پیکر کے مالک ہفت پیکر کا نام سب سے اوپر رکھا جائے گا (ص ۴۸) مجھے جانی انداز کرکے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا کیونکہ میں نے طلسم ہفت پیکر کہاں پڑھی ہے۔ فاروقی لکھتے ہیں کہ ان دونوں کی موت کا بیان پڑھ کر حیرت اور مایوسی ہوئی جیسے کسی دو کوڑی کے پیادے کی موت ہو۔ میرا خیال ہے کہ افراسیاب کے آخری معرکے اور قتل کا بیان کافی محتشم بالشان ہے۔ اس سے قطع نظر ان کے ذیل کے نتائج کو نہ صرف قبول کرنا ہوگا بلکہ ان سے ان کی بلاغت نظر اور قوت استقرا و استنباط کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔

داستان کو موت سے زیادہ زندگی پر، شکست سے زیادہ فتح پر، حصول سے زیادہ تلاش پر اور حالت امن سے زیادہ جنگ پر زور دیتا ہے۔" (ص ۵۶)

"یہ بات تمام داستان گویوں میں مشترک ہے کہ وہ تکلیف دہ مناظر خاص کر موت کے مناظر کو بہت مختصر کر کے بیان کرتے ہیں ـــــ فلم اور ڈراما کی طرح یہاں بھی ایسی منظر کشی زیادہ قبول نہیں ہوتی جس میں رنج و غم، درد و کرب اور جسمانی اذیت کا بیان تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ ہو" (ص ۵۷)

میرا مشاہدہ ہے کہ امریکی اور ہندستانی فلموں میں درد و کرب، تشدد اور جسمانی اذیت بہت کافی حد تک نفوذ کر گئی ہیں۔ امریکی اور مغربی ٹی وی میں اذیت رسانی سے تفریح و تفنن کا کام لیا جاتا ہے۔ مکے بازی اور امریکی کشتی میں جب ایک ہارنے والے کو دھنا جاتا ہے تو ناظرین خوش ہو ہو کر کیسا کیسا غوغا کرتے ہیں۔ شکر ہے کہ داستانوں میں یہ رنگ نہیں۔

فاروقی نے ایرج نامے، آفتاب شجاعت اور طلسم نوخیز جمشیدی کے وہ بیانات دکھائے جب طلسم کشا لوح کے ہوتے ہوئے بھی اس کا فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اس کی کتنی معقول توجیہ کرتے ہیں۔

"جب میں داستان کا نیا نیا طالب علم تھا تو مجھے یہاں بھی بہت مایوسی اور الجھن ہوتی تھی کہ یہ لوگ اتنے احمق کیوں ہیں کہ نہ لوح دیکھتے ہیں اور نہ اس کی حفاظت ہی کر سکتے ہیں، بار بار لوح کو گنوا دیتے ہیں۔ لہٰذا اسی طلسم نوخیز جمشیدی کے صفحہ ۹۸۲ پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لوح کا نہ دیکھنا بہ وجہ کم عقلی نہیں، بوجہ عدم توفیق ہے اور توفیق بہر حال عطیۂ خداوندی ہے، انسان کا استحقاق نہیں" (ص ۷۳)

وہ داستان کے زوال کے اسباب کے سلسلے میں لکھتے ہیں

"اس کے زوال کا ایک بڑا سبب زبانی قصہ گوئی کے رواج کا ترک ہونا ہے" (ص ۷۳)

مجھے اس میں شبہ ہے۔ میری رائے میں غدر کے بعد مغربی علوم، سائنس اور صنعتی

انقلاب، علی گڑھ تحریک، انجمنِ پنجاب کی تحریک اور ناول کے ورود نے مل کر داستان گوئی اور داستان نویسی دونوں پر ضربِ کاری لگائی۔

فاروقی کا ایک اہم انکشاف بوسنیا کی منظوم داستانوں کے فارمولائی تجزیے کا ہے۔ اردو میں یہ پہلی بار نظر آتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ لمبی لمبی فہرستیں اور صفت پر صفت کے ڈھیر لگا دینا زبانی بیانیہ کی پہچان ہے۔ فہرستوں کی کثرت یک جلدی داستانوں میں زیادہ ہے داستانِ امیر حمزہ طویل میں یہ کم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی ہے۔ (ص ۶۷)

داستانِ امیر حمزہ کے بے نہایت دفتر، طلسموں کی لامتناہی کائنات سب، فاروقی صاحب کی نظر کی گرفت میں ہیں۔ وہ ان کے بارے میں جو جامع فیصلے کرتے ہیں، ان سے اختلاف کا سوال ہی نہیں۔ اس داستان میں لشکر اسلام میں دو فریق ہیں: دستِ راست کے اور دستِ چپ کے، اب فاروقی کے کچھ مفید مشاہدات:

"داستانِ امیر حمزہ میں صاحب قرانی صرف دستِ راستیوں ہی کو ملتی ہے۔ ص ۸۲ دستِ چپی کرداروں میں بعض بہت مکروہ کردار کے لوگ بھی ہیں۔۔۔ امیر حمزہ کے عیار اور چوری لازم و ملزوم ہیں۔ عمرو سب سے بڑا چور بھی ہے اور سب سے بڑا جاسوس بھی۔۔۔ عمرو کا یہ حال ہے کہ کھلے بندوں بردہ فروشی کرتا ہے اور کسی کو اعتراض کیا استعجاب بھی نہیں ہوتا۔" (ص ۸۳۔ ۸۲)

"عمرو عیار اور اس کے سب جانشینوں کی طینت میں ایک طرح کی ٹیڑھ ہے۔ ادھر امیر حمزہ اور ان کے جانشینوں کے مزاج میں کچھ احسان فراموشی کا سا شائبہ ہے۔" (ص ۸۶)

"داستان میں ذہنی وقوع یعنی Mental Events نہیں بیان ہوتے۔ کسی کے دل میں کیا گزر رہی ہے یہ ہمیں داستان میں نہیں معلوم ہو سکتا۔" (ص ۹۷)

فاروقی نے دو صفحوں میں انسانی علم کا جو مفکرانہ تجزیہ کیا ہے وہ عالمانہ ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "انسانی علم کے محدود بلکہ ناقص ہونے کا تصور داستان میں ہر جگہ کار فرما ہے۔" (ص ۹۶۔ ۹۵)

فاروقی صاحب کے لیکچر کے جزو اعظم "زبانی بیانیہ" کا جائزہ ختم ہوا۔ اگلا جزو ہے "بیان کنندہ" اس کے ابتدائی جملے یہ ہیں۔

"بیان کنندہ" اور راوی ایک ہی شے نہیں ہیں۔ سچ پوچھیے تو داستان میں راوی ہوتا ہی نہیں، صرف بیان کنندہ ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ داستان گو جب بھی داستان سناتا ہے تو وہ ہر بار اس داستان کو دوبارہ تصنیف کرتا ہے۔۔۔ اور ہر بار داستان گو ہم سے یہی کہتا

ہے کہ وہ کسی اور کی بنائی ہوئی یا تصنیف کی ہوئی داستان سنا رہا ہے" (ص ۹۹)

بیان کنندہ ترجمہ ہے انگریزی لفظ Narrator کا۔ راوی کا لفظ انھوں نے مصنف کے معنی میں لیا ہے۔ دراصل یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں' بیان کنندہ' فارسی لفظ ہے، راوی عربی۔ حدیث کو بیان کرنے والے اشخاص راوی کہلاتے تھے۔ وہ مصنف نہیں تھے۔ اس لیے فاروقی صاحب مندرجہ بالا بیان کو یوں کہہ سکتے تھے "راوی اور مصنف ایک ہی شے نہیں ہیں۔ سچ پوچھیے تو داستان میں مصنف ہوتا ہی نہیں، صرف راوی ہوتا ہے" بہر حال میں ان کی اصطلاحوں کو قبول کر کے یعنی راوی بہ معنی مصنف لے کر بات کرتا ہوں۔ جو داستانیں فارسی سے ترجمہ ہوئیں مثلاً باغ و بہار' آرائش محفل' مذہب عشق (گل بکاولی) ان کے لکھنے والوں کو فرطِ احتیاط سے مولف یا مترجم کہہ سکتے ہیں لیکن قصہ مہر افروز و دلبر کا مصنف عیسوی خاں، عجائب القصص کا مصنف شاہ عالم' رانی کیتکی کی کہانی کا مصنف انشا' فسانۂ عجائب کا مصنف رجب علی بیگ سرور' سروش سخن کا مصنف فخر الدین حسین سخن اور طلسم حیرت کا مصنف جعفر علی شیون ہے۔ یہ سب داستانیں ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ عمومی لفظ داستان (ایک صنف نثر) کہنے کے باوجود فاروقی اس سے صرف داستانِ امیر حمزہ اور وہ بھی اس کی غیر موجود زبانی شکل مراد لیتے ہیں۔ اسی کے انداز کی اور اسی کی ہم وزن داستانِ بزرگ بوستانِ خیال بھی ہے جس کا ایک قطعی مصنف (فاروقی کے مفہوم میں' راوی') ہے۔

انھوں نے داستانِ امیر حمزہ کے مصنف کے تعین کے بارے میں مختلف اہل قلم کے بیانات دیے ہیں (ص ۱۰۱ تا ۱۰۶) جب انھوں نے اس موضوع کو اٹھایا ہی ہے تو اس کو چھان پھٹک کر اپنی رائے بھی دے دیتے تو رہنمائی ہوتی۔ بہر حال میں نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ داستانِ امیر حمزہ فیضی و ابوالفضل سے پہلے عہد ہمایوں میں موجود تھی، نیز اکبر کے دربار میں کوئی ادیب امیر خسرو نہیں تھا (نثری داستانیں ص ۹۱۔ ۶۸۸)

فاروقی صاحب نے اس سلسلے میں نول کشوری دفتر کے تین داستان نویسوں بالخصوص احمد حسین قمر کے دعووں اور بیانات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ (ویسے ان کی زبانی روایات کو پرکھتے ہوئے رشید حسن خاں کی تنبیہ کو ذہن میں رکھنا چاہیے اور ان کے ہر دعوے اور بیان کو درایت کی کسوٹی پر جانچنا چاہیے) ان میں احمد حسین قمر کے اس لاف و گزاف آمیز کشمکش کا پردہ چاک کیا ہے کہ ایک طرف وہ اپنی داستان کو قدیم علما فیضی و خسرو کی تحریر قرار دے کر اسے قدامت کی عظمت میں ملبوس کرنا چاہتے ہیں دوسری طرف خود کو اس کا مصنف بھی قرار دیتے ہیں (ص ۱۳۔ ۱۰۹)۔ چونکہ فاروقی صاحب نے مختلف دفتروں کا جس طرح ڈوب کر مطالعہ کیا ہے اتنا کسی

اور نے بہ شمول من سرسری خواں، نقل کیا اس لیے ان کے اس واقعاتی فیصلے کو تسلیم کرنا ہوگا۔

"ایسی صورت میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ آفتاب شجاعت، طلسم زعفران زار سلیمانی، گلستان باختر جیسی داستانوں کی جلدیں سراسر تصدق حسین کی اور طلسم ہفت پیکر، طلسم نوخیز جمشیدی جیسی داستانوں کی جلدیں سراسر احمد حسین قمر کی ایجاد نہ ہوں گی، بلکہ ان کا بھی کوئی نہ کوئی ڈھانچہ پہلے سے موجود رہا ہوگا" (ص ۱۱۷)

ان کی ایک غیر معمولی دریافت یہ ہے کہ شیخ تصدق حسین سے منسوب آفتاب شجاعت جلد پنجم حصہ اول کے صفحہ ۹۰۳ پر سید انور حسین نے بطور مصنف طلسم اسرار باطنی تتمۂ نہ طاق کے نام سے لکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے (خطبہ ۱۱۸)۔ اس سے فاروقی صاحب نے صحیح نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سید انور حسین آرزو ہیں ممکن ہے وہی آفتاب شجاعت کے مصنف اصلی ہوں یا تصدق حسین نے ان سے داستان املا کرائی ہو اور انھوں نے تصدق حسین کے علم میں لائے بغیر یا ان کو بتا کر اپنا نام داستان میں ڈال دیا ہو۔

اس پوری فصل میں فاروقی صاحب نے نول کشور پریس کے تینوں داستاں نویسوں کے تحریری بیانات اور دعووں کو جس تفصیل اور جامعیت سے تلاش کیا ہے ان کا تجزیہ و تبصرہ کیا ہے اور معتبر نتائج نکالے ہیں یہ ان کی قابلِ فخر اولیات میں ہیں۔

آخری فصل ہے "سامعین"۔ اس میں وہ ہوشربا جلد ہفتم سے رتن ناتھ سرشار کی تقریظ کا اقتباس درج کرتے ہیں "داستاں گو صاحب کا دماغ عرشِ بریں سے گزر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے۔ مگر داستان کو اس طرح سننا اور بات ہے اور فرصت کے وقت مطالعہ کرنا، اور کتاب سے کہ صنم لطیف و رعنا کہلاتی ہے، دل بہلانا اور بات ہے" (ص ۱۳۲)

فاروقی صاحب توجہ دیں۔ داستانِ امیر حمزہ مجمعوں میں ضرور سنائی گئی۔ وہ دلچسپ بھی ہوتی ہوگی لیکن وہ ہمارے سامنے ہے کہاں؟ صرف میر باقر علی داستان گو کے طریقِ قصہ خوانی کی تفصیل ملتی ہے۔ ہمارا اصلی سرمایہ اس داستان کے تحریری دفتر ہیں۔ قصہ خوانی کا دائرہ محدود و ہنگامی ہوتا ہے۔ کتاب مستقل پائدار اور دوررس ہوتی ہے۔ فاروقی صاحب ایک موہوم اور مجمل زبانی قصہ خوانی کے مداح و گرویدہ ہیں۔ میں اپنی دیکھی ہوئی کتابوں کو نصِ جلی مانتا ہوں

ع شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ

فاروقی صاحب نے داستان نویسوں کے یہاں سے ایسے بیانات تلاش کیے جو انھوں نے سامعین (دراصل قارئین) کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لکھے تھے۔ حیرت ہے کہ شیعہ احمد حسین قمر نے چند اشعار میں سنیوں کے لیے کلمات خیر استعمال کیے۔ ع

نماز قبل سلطان کا بعد میں جماعت سے (ص ۳۶)

یہاں بھی فاروقی نے بوستانِ خیال کی منظوم داستانوں کی مثالوں کا بیان کیا ہے۔ مثلاً رمضان کے مہینے میں ہر رات داستان سرائی ہوتی تھی (ص ۳۷)۔ اس کے آگے انھوں نے حمزہ اور اولاد حمزہ کی شراب نوشی کے بارے میں داستان حمزہ کے منشیوں کا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔

ان کی آخری دریافت۔ ۵۹-۱۸۵۸ء میں باغ و بہار کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کی گئی۔ ہدایت دی گئی کہ اس میں سے عریاں حصے حذف کر دیے جائیں۔ باغ و بہار کے انگریزی مترجم ڈنکن فاربس نے لکھا کہ انھوں نے ایسے قابلِ اعتراض بیج سے حذف کر دیے ہیں جیسے کہ تمام مشرقی متون میں ہوتے ہیں۔ فاروقی بجا افسوس کرتے ہیں کہ انگریزی ادب کی تاریخ میں انیسویں صدی سے بڑھ کر فحش پرست اور فحش نگر کوئی صدی نہیں ہوئی (ص ۳۳-۳۴)

کتاب کے آخری صفحات میں فاروقی صاحب نے اس خیال کی تردید کی ہے کہ داستانوں کی تخلیق اور اس سے لطف اندوزی خام ذہنوں کا خاصہ ہیں۔ اس دعاج سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ داستان ناول کے ہم پلہ صنف ادب ہے۔ فکشن میں فوق الفطرت کرداروں اور محیر العقول واقعات کا آنا اس کی کمزوری کی دلیل نہیں۔ کیا آج بھی فوق الفطرت میں بھرپور دلچسپی نہیں۔ ہندستان کی دوردرشن ٹی وی پر الف لیلہ، حاتم طائی، طلسم ہوشربا، چتال پچیسی (سنسکرت والی اور چتال پچیسی نام کا ایک جدید سیریل) دکھائے جاتے ہیں۔ متعدد مذہبی سیریل رامائن، مہابھارت، ہنومان، شری کرشن اور شیوجی سے متعلق دو سلسلوں میں دلچسپی محض ان کے مذہبی تقدس کے سبب نہیں ان کے محیر العقول عناصر کی وجہ سے بھی ہے۔ مغربی ممالک میں کیا حال ہے۔ بچوں کو شروع سے فوق الفطرت میں دلچسپی سکھائی جاتی ہے۔ پریوں اور راجکماروں کی کہانیاں کتنی مقبول ہیں۔ Super Man اور Spider Man وغیرہ کے کامک نہ صرف بچے دیکھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی بالغ بھی ان کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ بعض فلموں اور ڈزنی لینڈ کے تماشوں میں حیوانات کو انسانی کردار عطا کرنا عام ہے۔ ڈزنی لینڈ میں فوق الفطرت والے کئی شو ہیں۔ ایک شو میں مائکل جیکسن ہیرو بن کر کسی دوسرے کرۂ آسمان کی شہزادی اور اس کی سپاہ پر فتح حاصل کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہاتھوں سے بجلی کی سی شعاعیں جاری کرنا ہیں۔ دو تین سال پہلے ڈزنی لینڈ میں الف لیلہ کے الٰہ دین اور ایک شہزادی یاسمین کا پُرشکوہ جلوس نکالا گیا۔ ان دو کرداروں کو لے کر اشتہار بازی کا وہ طوفان برپا کیا گیا کہ

گھر گھر میں پردوں، چادروں، پلنگ پوشوں، پیالوں، پلیٹوں، کھلونوں، ہر چیز میں الہ دین اور یاسمین ہی دکھائی دیتے تھے۔

داستانیں بالیقین جدید افسانوی ادب سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہیں۔ ان سے ذہن اور اعصاب میں تناؤ نہیں آتا۔ کچھ سال پہلے جب میں حیدر آباد دکن کی یونیورسٹی میں تھا تو ایک بار مجھے طلسم ہوشربا پڑھنے کی تڑپ، شدید خواہش، پرانے محاورے میں چینک ہوئی۔ میں یونیورسٹی لائبریری سے ہوشربا جلد ہفتم لایا اور حجرہ ہفت بلا پڑھا حالانکہ میں اس کی تفصیلات سے واقف تھا۔ داستانیں اب بھی پڑھنے کی چیز ہیں گو اب تخلیق کرنے کی نہیں۔ ایک بار میں نے نیاز صاحب سے کہا کہ آپ کے ادب لطیف کے افسانے اتنے دلکش ہیں اب کیوں نہیں لکھتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اب ان کا زمانہ نہیں رہا۔ یہی کیفیت داستان کی ہے۔ ہم اسے اب تخلیق نہیں کریں گے لیکن ہمارے پاس ان کا جو بیش بہا سرمایہ ہے اس سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔ یہ طے ہے کہ آج داستانِ امیر حمزہ کے جملہ قصوں اور ان کی باریکیوں کا کوئی ایسا عارف نہیں جیسے شمس الرحمٰن فاروقی ہیں۔ داستان کی تنقید و تحسین میں جیسی نظر ان کی ہے ویسی کسی اور کی نہیں۔ ان جیسے مغربی اور جدید ادب کے جانکار نے اس صنف کی قدر کر کے اس کا پایہ اعتبار مضبوط کیا ہے۔ ان کے کتابچے سے مجھے داستانِ حمزہ کے بارے میں جو گوناگوں نئے حقائق ملے اس کے انتقاد کے جو زاویے سامنے آئے، وہ اور کسی کتاب سے نہ ملے۔ ان سے میرا اختلاف صرف ناموں اور الفاظ کا ہے۔ فارسی کی ایک مثل ہے گندم نمائی وجو فروشی۔ فاروقی صاحب اس کے برعکس جو نمائی و گندم فروشی کر رہے ہیں۔ وہ نام لیتے ہیں زبانی بیانیہ کا لیکن پوری تفسیر و تحسین تحریری نسخوں کی کر رہے ہیں۔ داستانِ حمزہ کی ساکھ انھیں تحریری ادب پاروں کی بدولت ہے، موہوم زبانی قصہ خوانی کے سبب نہیں۔

اردو ادب کا سرمایہ فخر داستانوں کے تمام کلاسکی شاہکار ہیں، نہ صرف داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال بلکہ باغ و بہار، آرائش محفل، فسانہ عجائب، گل بکاولی وغیرہ بھی۔ واضح ہو کہ اردو نثر کے سب سے بڑے آقا میر امّن دلی والے ہیں، جاہ و قمر و تصدق حسین سے کہیں بڑے۔ بہر حال یہ سب ایک قبیلے کے فرد ہیں جن کے سبب این خانہ تمام آفتاب است۔ شمس الرحمٰن فاروقی جیسے صاحب فکر و نظر نے داستانِ امیر حمزہ کو اپنا نظر کردہ کیا۔ دلی والے کی باغ و بہار بھی ان کی نظرِ کیمیا اثر کی امیدوار ہے۔

ڈاکٹر سید حامد حسین
۵۔ سلور لائن اپار ٹمنٹس۔ اے سیکٹر
(بی۔ ڈی۔ اے) کوہ فضا،
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

"پانچ" کی پنچ میل دُنیا

پنچ میل سے مراد وہ چیز ہے جو پانچ چیزوں سے ملا کر بنائی گئی اور پانچ چیزوں کے ایسے مجموعوں کی ہمارے سماج میں کمی نہیں ہے۔ خود قدرت نے یہ سہولت پیدا کی ہے کہ انسان کے ہر ہاتھ اور پیر میں پانچ، پانچ انگلیاں ہیں اور بلا کسی اور پیچیدہ علمی تربیت کے پانچ، تک گنتی گنی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ کے کرشمے ہمیں مذہبی عقائد و روایات، رسم و رواج، فلسفہ و طب، جادو ٹونے، تنتر منتر، ادب، کہاوتوں اور محاوروں نجانے کہاں کہاں نظر آتے ہیں۔

پنجگانہ نماز سے ہم واقف ہی ہیں۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں پانچ فرائض میں سے ایک ہیں جبکہ پانچ فرائض یا پنج ارکان میں کلمۂ طیبہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ شامل ہیں۔ فاتحہ میں آیات پڑھی جاتی ہیں جن میں سورۂ فاتحہ (سورۂ الحمد) اور چاروں قل (یعنی سورۂ کافرون جو قل یا ایہاالکافرون، سورۂ اخلاص جو قل ہو اللہ احد، سورۂ فلق جو قل اعوذ برب الفلق اور سورۂ ناس بھی جو قل اعوذ برب الناس سے شروع ہوتی ہیں) شامل ہیں۔ پھر پنجتن پاک کا ذکر بھی بابرکت ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؓ آپؐ کے داماد حضرت علی کرم اللہ وجہہ، آپ کے دونوں اسے حضرت، حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی طرف کنایہ ہے۔ پنجہ یوں تو ہاتھ، اس کی چار انگلیوں اور انگوٹھے کا نشان ہے، لیکن اُسے بھی پنجتن پاک کا نشان اور رسول خداؐ کے علم کی طرف کنایہ سمجھا جاتا ہے۔

پنج عیب شرعی، چوری، زناکاری، جوا کھیلنا، شراب خوری اور جھوٹ بولنا سمجھے جاتے ہیں (جب کہ مسیحی روایت کے مطابق سنگین گناہوں کی تعداد سات مانی جاتی ہے۔ یہ SEVEN DEADLY SINS غرور، غصہ، حسد، ہوس، پیٹو پن، لالچ اور کاہلی ہیں۔

کسی گھوڑے کے بھی پانچ عیب مانے جاتے تھے (۱) منہ زور ہونا (۲) رات کو اندھا ہونا (۳) پرانا لنگڑا پن ہونا (۴) دوسرے گھوڑوں کے ساتھ نہ رہ سکنا اور (۵) بوجھ اٹھاتے وقت کمر کو کبڑا کر کے یاد با کر چلنا۔ جہاں تک خوش بختی لانے والے گھوڑوں کا سوال ہے تو یہ سمجھا جاتا تھا جو گھوڑا پانچ جگہ سفید رنگ رکھتا ہو وہ پنچ کلیان ہے۔ پنچ کلیان گھوڑا وہ ہے جس کی چاروں ٹانگیں سفید ہوں اور ماتھے پر سفید داغ ہو۔

بادشاہوں اور امیروں کی طاقت جہاں ان کے لشکر اور لشکر میں شامل گھوڑوں پر منحصر سمجھی جاتی تھی، وہیں ان کی شان و شوکت کا اندازہ ان کے دروازے پر بجنے والی نوبت سے لگایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے صرف تین وقت نوبت بجتی تھی لیکن سلطان سنجر کے حکم سے پانچ بار بجائی جانے لگی، اور اسے پنچ نوبت کا نام دیا گیا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ پنچ نوبت میں جو پانچ باجے بجائے جاتے تھے وہ ڈھول، دف، طاسہ، نفیری اور دمامہ ہوتے تھے۔

لوگوں کے عام مقدموں میں سے ہر ایک کو بادشاہ کے پاس پہنچانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ روزمرہ کے قضیے پنچایت کے ذریعے نپٹائے جاتے تھے۔ کسی بستی کے پانچ بزرگوں پر مشتمل پنچایت کو انصاف کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ ہندستان میں پنچ کو پنچ پرمیشور کی عزت دی جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے پنچ کے لفظ کا اطلاق پورے سماج پر ہونے لگا اور قضیوں کی سماعت اور فیصلے کے لیے مقررہ ارکان کی تعداد صرف پانچ تک محدود نہیں رہی۔ ہندستان کے سماجی نظام میں پنچایت اور پنچ اس طرح گھر کر گئے کہ کئی محاوروں اور کہاوتوں میں ان کا اثر دکھائی دیتا ہے، جیسے "پنچ بلی کہیں تو بلی ہی سہی" اس کے پیچھے یہ کہانی بتائی جاتی ہے کہ کوئی دکاندار اپنی دکان بند کر کے دکان کے سامنے ہی چارپائی ڈال کر سو گیا۔ ایک چور موقع پا کر اس کی دکان میں گھس گیا۔ دکان کے اندر کھٹ پٹ ہوئی تو دکاندار اٹھ آیا اور لپک کر دروازہ پر باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ چور نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اندر کوئی آدمی نہیں بلکہ چوہے پکڑنے کے لیے کوئی بلی گھس گئی ہے۔ بلی کی آواز نکالنا شروع کی۔ دکاندار اصلیت سمجھ گیا اور بولا ابھی تو بند رہ۔ صبح پنچوں کے سامنے معاملہ پیش کروں گا اگر پنچ بلی کہیں گے تو پھر بلی ہی سہی۔

اسی طرح اپنی ضد پر قائم رکھنے کے لیے یہ کہاوت مشہور ہے۔ "پنچوں کا کہا سر آنکھوں پر مگر پرنالہ تو یہیں گرے گا۔" کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کے گھر کی چھت پر سے بارش کا سارا پانی اس کے پڑوسی کے گھر میں گرتا تھا۔ پڑوسی نے اس سے تنگ آکر معاملہ

پنچوں کے سامنے رکھا۔ پنچوں نے یہ فیصلہ کیا کہ پرنالے کو اپنی جگہ سے ہٹا کر اس جگہ لگایا جائے جو پڑوسی کو تکلیف نہ دے لیکن مکان دار کو یہ فیصلہ منظور نہیں تھا۔ پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا اس پر پنچایت کے حکم کی خلاف ورزی کا الزام لگایا جائے چنانچہ اس نے بڑی ہوشیاری سے یہ بیان دیا کہ پنچایت کا فیصلہ تو پوری طرح قابل احترام ہے لیکن پرنالہ جہاں ہے وہ وہیں رہے گا۔ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے گا۔

مختلف علمی مسائل میں بھی پانچ کا کئی طرح استعمال کیا گیا ہے۔ زندگی کو بعض اوقات پنج روزہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ سمجھا گیا کہ اگر زندگی کا پورا عرصہ ایک ہفتہ ہے تو اس میں سے ایک دن تو پیدائش کی مصیبت میں گزر جاتا ہے اور ایک دن موت کی تکلیف میں۔ اب انسان کے پاس اپنی زندگی کے بکھیڑوں کے لیے صرف پانچ دن باقی رہتے ہیں جو بظاہر بہت کم ہیں۔

اطالوی مصور و مفکر لیونارڈو داونچی نے چاروں ہاتھ پیر پھیلائے ہوئے اور پانچواں نقطہ سر کو تصور کرتے ہوئے ایک دائرے کے اندر انسانی شکل بنا کر یہ ظاہر کیا تھا کہ کائنات کے نظام میں ایک بنیادی باقاعدگی ہے۔ دائرے کے اندر کھینچے گئے خطوط اور اشکال کی مدد سے داونچی نے انسانی شکل کو کائنات صغرا کے ایک علامتی اظہار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ کائنات صغریٰ کا یہ تصور قرون وسطیٰ کے دوران یورپ میں رائج پانچ عناصر پر مشتمل فلسفہ کائنات کا عکس تھا۔ داونچی نے دائرے کے اندر انسانی شکل کی مدد سے جو یکساں دوری پر پانچ نقطے مقرر کیے تھے اس سے ایک پنج گوشہ ستارے کی شکل بنتی تھی۔ ستارے کی اس شکل کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انہیں قلم کو سطح پر سے اٹھائے بغیر پورا ستارہ ایک کشش سے بنایا جا سکتا تھا۔ اس خصوصیت کی بنا پر ستارے کی یہ شکل بعد میں ایک طلسمی تاثیر سے منسلک سمجھی جانے لگی۔ اسرائیلی روایت میں چھ گوشہ ستارے کو مقبولیت حاصل تھی۔ جب اسلامی ریاست میں توسیع ہوئی تو ستارے کی علامت کو بھی اپنایا گیا اور اس کے لیے پنج گوشہ ستارے کا انتخاب کیا گیا چنانچہ چاند کے ساتھ جو ستارہ دنیائے اسلام سے وابستہ ہوا اس میں پانچ گوشے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب بیشتر حالات میں ستارے کا تصور اس کی پنج گوشہ شکل میں کیا جاتا ہے اور اس وقت چالیس کے قریب ایسے ملک ہیں جن کے قومی پرچم میں بھی پنج گوشہ ستارے شامل ہیں۔ مثلاً الجیریا، انگولا، بے نن، بلغاریہ، چلی، عوامی جمہوریہ چین، کوموروز، کانگو، کیوبا، جبوتی، گھانا، گنی بساؤ، ہانڈوراس، عراق، اردن، شمالی کوریا، لائبیریا، ماریطانیا، مانگرونیشیا، مراکو، موزمبیق،

پاکستان، پنما، سینیگال، سنگاپور، جزائر سالومن، صومالیہ، سوری نام، ٹوگو، ٹیونس، بُرکینا فاسو، ہونے زویلا، یمن، یوگوسلاویہ وغیرہ۔

قدیم فلکیات میں سات اجرام فلکی میں سے دو سورج اور چاند بھی تھے جنھیں بعض اوقات خصوصی حیثیت دی جاتی تھی۔ باقی پانچ ستاروں، عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل کو خمسۂ متحیرہ کہا جاتا تھا، متحیرہ اس لیے کہ یہ مانا جاتا تھا کہ یہ ستارے کبھی اپنی معمول کے مطابق چال کے خلاف بھی چلنے لگتے ہیں۔ پنج وچہار سے نو آسمانوں کو مراد لیا جاتا تھا۔ ان نو آسمانوں میں سے سات متحرک ستاروں یعنی سیاروں سے منسوب تھے۔ آٹھواں فلک ثوابت، غیر متحرک ستاروں کا اور فلک الافلاک (جسے فلک اطلس اور عرش سے بھی موسوم کیا جاتا تھا) نواں آسمان تھا۔

ہندستان کی قدیم روایات وعقائد، رسم ورواج، فکر وفلسفہ، طب اور علم الادویہ، تنتر اور منتر، ادب اور فنون لطیفہ میں پانچ کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔ جیسے مذہبی عقائد میں پنج دیو (یعنی پانچ عظیم دیوتا) وشنو، شیو، گنیش، سوریہ اور دُرگا، مانے جاتے تھے۔ پنج کنیائیں جن کا نام لینے سے پاپ دُھل جاتے ہیں۔ اہلیا، مندودری، تارا، کنتی اور دروپدی ہیں جن کے بارے میں یہ مانا جاتا ہے کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود ان کا کنوارپن زائل نہیں ہوتا۔ پنج ناتھ یعنی بدری ناتھ، دوار کا ناتھ، جگن ناتھ، رنگ ناتھ اور شری ناتھ، بھی پانچ دیوتا ہیں۔ پنج مہاپاتک یعنی پانچ بڑے گناہ (۱) برہمن کی ہتیا (۲) شراب خوری (۳) چوری (۴) گرو کی بیوی کے ساتھ زنا (۵) اس قسم کے گناہ گاروں کی صحبت ہیں۔ پنج مہا برت یعنی پانچ بڑی ریاضتیں (۱) عدم تشدد (۲) سچائی (۳) چوری سے پرہیز (۴) برہم چاریہ اور (۵) کسی سے کچھ نہ لینا ہیں۔ پنج گویہ یعنی گائے سے حاصل ہونے والی پانچ چیزیں یعنی دودھ، دہی، گھی، گوبر اور پیشاب ہیں جنھیں پرا شچت کرنے والے کو پلایا جاتا ہے اور مورتیوں کو بھی ان سے نہلاتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں جب کیرالا میں موپلاؤں نے بغاوت کی تھی اس وقت جن لوگوں کو کلمہ پڑھوا کر مسلمان بنالیا گیا تھا ان کی شدھی بھی اسی طرح کی گئی تھی اور انگریز سرکار نے اس پر آنے والے اخراجات کو اٹھانے کا وعدہ کیا تھا۔

مختلف نظریات میں بھی اصولوں کی ترکیب کے لیے پانچ پانچ پہلوؤں کو شامل کیا گیا ہے۔ جینی فلسفہ کے مطابق کسی کام کی ابتدا پنج کارن سے ہوتی ہے۔ یہ اسباب ہیں۔ زمانہ، ذاتی وصف مقدر، فاعل اور فعل۔ ایشوریا شیو کے پانچ قسم کے افعال مانے جاتے

ہیں، تخلیق، وجود، تخریب، نظام اور رحم۔ یوگ شاستر میں پنچ کلیش یعنی تکلیف پہنچانے والے جن پانچ اسباب کا ذکر ہے وہ ہیں جہل، غرور، حسد، بغض، اور موت کا خوف۔ تانترکوں کے لیے "میم" سے شروع ہونے والی پانچ باتیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ مدیہ (شراب) مانس (گوشت)، متسیہ (مچھلی)، مندرا (دولت) اور میتھن (جماع)۔ سکھ مذہب کے پیروؤں کے لیے "کاف" سے شروع ہونے والی پانچ چیزیں پہچان کا کام کرتی ہیں، کنگھا، کچھا، کیش، کڑا اور کرپان۔

رسم ورواج، علاج معالجے، فلسفہ و نجوم، فال و شگون میں بھی پانچ کا بول بالا نظر آتا ہے۔ پنچ رتن، ہیرا، موتی، نیلم، مونگا اور لعل ہیں تو پانچ دھاتوں یعنی سونا، چاندی، تانبا، سیسہ اور رانگا سے "پنچ لوہ" بنتا ہے۔ چمپا، آم، شمی، کنول اور کنیر کے پھول پنچ پشپ کہلاتے ہیں تو پیپل، گولر، برگد، آم اور جامن کے پتے "پنچ پلو" کہلاتے ہیں اور اچھے موقعوں پر انھیں پوجا میں شامل کیا جاتا ہے۔ کشمش، کھوپرا، چرونجی، چھوہارا اور بادام "پنچ میوے" کہلاتے ہیں۔ اور دودھ دہی، گھی، شکر اور شہد ملا کر پنچ امرت بنایا جاتا ہے جس سے رام کرشن اور ستیہ نارائن وغیرہ کی مورتیوں کو نہلاتے ہیں۔ پنچ موتر گائے، بکری، بھیڑ، بھینس، اور گدھی کے پیشاب کو ملا کر بنایا جاتا ہے۔ پھر پانچ کڑوی، پانچ کسیلی دواؤں پانچ نمکوں وغیرہ سے آیورویدک دوائیں الگ بنتی ہیں۔ طرح طرح کے رنگ رکھنے والی چیزوں کو پنچ رنگی کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ پانچ رنگ مہندی کا چورا۔ عبیر، بکا، ہلدی اور سرہالی کے بیج ہوتے ہیں، جنھیں ملا کر خوشی کے موقعوں پر گھر کے چوک میں ڈزائن بناتے ہیں۔

ان کے علاوہ پانچ چکنا ہٹوں (پنچ سنیہ) یعنی گھی، تیل ہڈی کا گودا، چربی اور موم، پانچ باجوں (پنچ شبد) یعنی تنتری، تال، جھانجھ، نقارہ اور ترہی جو خوشی کے موقع پر بجائے جائیں، کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ پانچ لڑیوں کا ہار "پچلوا کہلاتا ہے۔ پانچ ہتھیاروں میں ڈھال، تلوار، برچھی، تیر اور کمان شامل کیے جاتے ہیں۔

محسوسات کو ان کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے پانچ حواسوں کی شکل میں پہچانا گیا ہے۔ ان حواس خمسہ کو بھی دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی حواس خمسہ ظاہری اور حواس خمسہ باطنی۔ حواس خمسہ ظاہری ہیں۔ باصرہ (دکھائی دینا) سامعہ (سنائی دینا) شامہ (سونگھنا)، لامسہ (چھونا) اور ذائقہ (چکھنا) جب کہ حواس خمسہ باطنی کے تحت (۱) حس مشترک (۲) خیال (۳) وہم (۴) حافظہ اور (۵) متصرفہ آتے ہیں۔ ان میں سے حس

مشترک محسوس کرنے کی وہ مجموعی قوت ہے جس میں دیکھنے، سننے، سونگھنے وغیرہ ہر قسم کے احساسات شامل ہوتے ہیں۔ خیال وہ طاقت ہے جو محسوس کی جانے والی صورتوں کو اس وقت موجود نہ ہونے کی حالت میں بھی اس کا تصور کر سکے۔ وہم وہ قوت ہے جو دیکھی ہوئی یا ان دیکھی، حقیقی یا غیر حقیقی چیز کا تصور کر سکے۔ یہ قوت دوسری قوتوں کے مثل عقل کے تابع نہیں ہوتی۔ حافظہ وہ قوت ہے جو ظاہری اور باطنی احساس کو یاد رکھے متصرفہ کی قوت بعض صورتوں کو بعض معانی کے ساتھ ترکیب دیتی ہے۔

جب کہ یونانی فلسفے میں چار عناصر مٹی، ہوا، پانی اور آگ بتائے جاتے ہیں، ہندو فلسفے میں پنچ مہابھوت یا پانچ بھوت، آسمان ہوا، آگ، پانی اور زمین مانے جاتے ہیں۔

فن و ادب میں بھی پانچ کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ہندستانی سنگیت شاستر کے مطابق سات سُروں میں سے پانچواں سُر (جسے سارے گاما پا دھانی میں "پا" ظاہر کرتا ہے) پنچم کہلاتا ہے۔ اس کی ادائیگی میں انسانی جسم میں موجود پانچوں قسم کی ہواؤں (یعنی پران، اپان، سمان، اُدان اور ویان) کا استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ہندستانی موسیقی میں رائج "تال" کی ایک قسم کو مخمس کہتے ہیں۔

مخمس، اصناف نظم میں سے ایک صنف کا بھی نام ہے جس میں پانچ پانچ مصرعوں کے بند ہوتے ہیں۔ پہلے بند کے پانچ مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور بعد کے تمام بندوں کا پانچواں مصرع بھی یہی قافیہ رکھتا ہے۔ دوسرے اور اس کے بعد کے بندوں میں پہلے چار مصرعے الگ قافیے کے ہوتے ہیں۔ یہ مخمس اشعار کی تضمین کے لیے اکثر استعمال کی جاتی ہے۔ اس صورت میں بند کے پہلے تین مصرعے تضمین کیے جانے والے شعر کے پہلے مصرع کے ہم قافیہ ہوتے ہیں چوتھے اور پانچویں مصرعے تضمین شدہ شعر کے پہلے اور دوسرے مصرعے ہوتے ہیں۔

ہندستانی شاعروں میں پانچ سے سب سے زیادہ کبیر نے فائدہ اٹھایا ہے جن کی بانی میں اکثر ایک بلیغ استعارے کی شکل میں پانچ کا ذکر ملتا ہے۔ ادبی دنیا میں "پنچ تنتر" کو بھی ایک لازوال مقبولیت حاصل ہے۔ وشنو شرما نے سنسکرت میں جانوروں، پرندوں وغیرہ کی یہ سبق آموز حکایتیں، ۳۰۰ سے ۵۰۰ عیسوی کے درمیان کسی وقت تحریر کی تھیں۔ انھیں "پنچ تنتر" کا نام اس لیے دیا گیا تھا کہ یہ کہانیاں ان پانچ موضوعات پر ترتیب دی گئی تھیں۔ (۱) دوستوں کی پہچان (۲) دوستی کا فائدہ (۳) دوستوں کا بچھڑنا (۴) مقصد کے حصول کی تلاش اور (۵) بلا سوچے سمجھے کام کا انجام۔

پانچ پر بھی بعض کہاوتیں اور محاورے بھی رائج ہیں، جیسے: "پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں" یعنی جس طرح انسان کے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں اسی طرح ہر شخص میں دوسرے سے کچھ نہ کچھ اختلاف ہوتا ہے۔ "پانچوں انگلیاں گھی میں" بھی ایک عام محاورہ ہے۔ گھی ایک مہنگی چیز سمجھا جاتا ہے۔ غرض غذا یا روٹی کو گھی میں تر کر کے کھانا امیری اور فراغت کی نشانی مانی جاتی ہے۔ اسے مال کو اناپ شناپ ڈھنگ سے اڑانے کا ہم معنی بھی سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس محاورے میں "اور سر کڑھائی میں" بھی جوڑ دیا جاتا ہے جو اس گھی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کڑھائی میں کوئی پکوان تلنے کے لیے ڈالا گیا ہے۔ اس طرح محاورے کے دونوں ٹکڑوں کو جوڑ کر یہ بتایا جاتا ہے کہ جس شخص کو کسی دوسرے کی دولت پر الٹے تللے کرنے کا موقع ملا ہے وہ نہ صرف گھی کے تر نوالے کھا رہا ہے بلکہ بجائے پانی کے کڑھائی میں منہ ڈال کر گھی پی رہا ہے۔

"پانچویں سواروں میں ہونا" کی کہاوت اب صرف پرانی کتابوں میں رہ گئی ہے۔ اس کہاوت کا مطلب خود کو عزت داروں میں شامل بتانا ہے اور اس کا تعلق اس کہانی سے ہے کہ چار سپاہی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر دکن جا رہے تھے۔ ایک کمہار بھی گدھے پر ان کے پیچھے پیچھے لگ گیا۔ کسی نے سپاہیوں سے پوچھا کہ چار سوار کہاں جا رہے ہیں، کمہار جھٹ سے بولا کہ ہم پانچوں سوار دکن جاتے ہیں اور اس طرح اس نے خود کو بھی سپاہیوں میں شامل کر لیا۔

عورتوں کے محاوروں میں ایک کہاوت "وہ تو پانچ پھلوں رانی بنی ہوئی ہے" بھی ہے۔ پرانی کہانیوں میں بعض اوقات کسی نہایت نازک اندام شہزادی کا ذکر کیا جاتا ہے جس کی نزاکت کا یہ حال تھا کہ اسے صرف پانچ پھولوں میں تولا جا سکتا تھا۔ بعض اوقات پانچ کا عدد محض زیادتی یا کثرت کو بتانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جیسے "پانچ ہاتھ کی زبان ہونا" یعنی بہت لمبی زبان ہونا جس کا مطلب ہے بہت زیادہ بد زبانی کرنا، گالی گفتار کرنا۔

دور حاضر میں ہمیں جن اصطلاحات وغیرہ میں پانچ سے معاملہ پڑتا ہے، ان کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

"پنچ شیل" کی اصطلاح غیر وابستہ ممالک کی تحریک کے ساتھ عام ہوئی۔ "پنچ شیل" جس کا لفظی مفہوم "پانچ نیک اعمال" ہے اولاً مہاتما بدھ نے مقرر کیے تھے۔ یہ اصول تھے۔

(۱) مقررہ وقت پر کھانا کھانا (۲) ناچ گانے وغیرہ سے دور رہنا (۳) مرغن اور لذیذ غذاؤں سے پرہیز (۴) نرم بستر ترک کرنا (۵) سونا چاندی استعمال نہ کرنا۔

مہاتما بدھ کے نصائح کے مجموعے "ترپ تک" میں یہ پانچ اصول مذکور ہیں۔
(۱) کسی جاندار کو زخم نہ پہنچانا (۲) جو چیز دی نہیں گئی ہو اسے نہ لینا (۳) ناجائز جنسی تعلقات سے دور رہنا (۴) جھوٹ سے پرہیز کرنا اور (۵) نشہ آور چیزوں سے دور رہنا۔

۱۹۵۴ء میں جب چینی وزیر اعظم چاؤ این لائی ہندستان آئے تو پنڈت جواہر لال نہرو نے "پنچ شیل" پیش کیے جس پر دونوں ممالک نے اپنی منظوری کا اظہار کیا۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں انڈونیشیا کے شہر بانڈونگ میں ایشیائی ممالک کی کانفرنس منعقد کی گئی ایشیائی ممالک کے درمیان اتفاق و اتحاد کے لیے پانچ بنیادی اصول "پنچ شیل" کے نام سے پیش کیے گیے۔ یہ اصول تھے۔

(۱) ملکوں کے درمیان ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت کو برقرار رکھنا اور اختیار اعلا کا احترام کرنا (۲) ایک دوسرے کے خلاف جارحیت سے کام نہ لینا (۳) ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا (۴) باہمی فائدے اور برابری کے اصول پر عمل کرنا اور (۵) پُر امن بقائے باہمی پر یقین رکھنا۔

"پنچ شیل" کے ان اصولوں پر ہندستان اور چین کے رہنماؤں کے بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا، جب تک ۱۹۶۲ء میں چین نے ہندستان کو اپنی جارحیت کا نشانہ نہیں بنایا۔

۱۹۵۶ء میں جب یوگوسلاویہ کے شہر برونی میں پنڈت نہرو، مصر کے صدر جمال عبدالناصر اور یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو نے غیر وابستہ تحریک کی بنا ڈالی تو "پنچ شیل" کے اصولوں کو اس تحریک میں کلیدی حیثیت دی گئی۔

ہندستان کی آزادی کے بعد ملک کی اقتصادی حالت کو مضبوط کرنے کے لیے منصوبہ بند ترقی کا پروگرام بنایا گیا۔ پنج سالہ منصوبوں کا طریقہ سب سے پہلے سوویت روس میں اسٹالن نے اختیار کیا تھا اور وہاں پہلا منصوبہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ ہندستانی رہنما، خاص طور پر مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو، کمیونسٹ روس کے تجربوں کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ہندستان میں قومی منصوبہ بندی کمیٹی بنائی گئی جس کا صدر پنڈت نہرو کو بنایا گیا۔ ہندستان کو آزادی مل جانے کے بعد پنڈت نہرو نے ۱۵ / مارچ ۱۹۵۰ء کو منصوبہ بندی کمیشن قائم کیا اور یکم اپریل ۱۹۵۱ء سے پہلا پنج سالہ منصوبہ جاری کیا گیا۔

آج کل ہر چار سال کے بعد اولمپک کھیل منعقد ہوتے ہیں۔ اولمپک کھیلوں کے جھنڈے میں پانچ کڑوں کی ایک زنجیر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جدید اولمپک کھیلوں

کے بانی پیئر دکوبرتن PIEERE DE COUBERTIN نے سفید کپڑے پر یہ جھنڈا ۱۹۱۳ء میں تیار کیا تھا۔ جھنڈے کے درمیان پانچ کڑے دائیں سے بائیں سرخ سبز سیاہ زرد، اور نیلے رنگوں میں بنائے گئے تھے۔ یہ پانچ رنگ ایسے ہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی اولمپک کھیلوں میں شرکت کرنے والے ہر ملک کے قومی پرچم میں پایا جاتا ہے۔ پانچ کڑے پانچ براعظموں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے تو براعظموں کی تعداد سات ہے لیکن قطب جنوبی کے علاقے (انٹارکٹا) سے وہاں کوئی مستقل آبادی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کھلاڑی شرکت نہیں کرتا اور جنوبی اور شمالی امریکہ کو ایک ہی براعظم کی حیثیت دیتے ہوئے اس جھنڈے میں براعظموں کی تعداد پانچ مانی گئی۔

جہاں تک کھیلوں کی ٹیموں کا سوال ہے، باسکٹ بال ایک ایسا کھیل ہے جس کے مقابلے میں کسی ایک طرف کی ٹیم میں پانچ کھلاڑی کھیلتے ہیں کھیلوں میں ایتھلیٹکس کے مقابلوں میں عورتوں کے لیے یکجائی مقابلے مرد کھلاڑیوں سے کم ہوتے ہیں۔ پہلے ان یکجائی کھیلوں کی تعداد پانچ ہوتی تھی اور اونچی کود، لمبی چھلانگ، گولا پھینکنے اور دو قسم کی دوڑوں کو پنٹتھلان (PENTATHLON) کہا جاتا تھا۔ ۱۹۸۱ء سے عورتوں کے لیے مقابلوں کی تعداد سات کر دی گئی ہے جب کہ مرد کھلاڑی دس مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں واقع پنج گوشہ عمارت دنیا کی سیاست اور جنگ وامن کے معاملات میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ورجینیا میں بنی یہ عمارت جو اپنی شکل کی بنا پر پینٹاگن (PENTAGON) کہلاتی ہے ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء کے درمیان تعمیر ہوئی تھی۔ دنیا کی یہ سب سے بڑی دفتری عمارت امریکہ کے محکمۂ دفاع کا صدر دفتر ہے اور اس میں امریکہ کے بری، بحری اور فضائی تینوں فوجی شعبوں کے دفاتر ہیں۔

فوجی کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے بعض اوقات ففتھ کالم FIFTH COLUMN کارروائیوں کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو جو ملک کے اندر رہ کر ملک کے دشمنوں کے لیے کام کرتے ہیں اور ان کے تخریبی کاموں کو کامیاب بنانے میں مدد کرتے ہیں انھیں ففتھ کالسٹ کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح اسپین کی خانہ جنگی کے دوران وجود میں آئی تھی جب قوم پرست جنرل ایمیلو مولانے کہا تھا کہ میں اسپین کی راجدھانی میڈرڈ پر حملہ کرنے والے پانچ دستوں کی قیادت کر رہا ہوں۔ ان میں سے چار دستے میڈرڈ کی جانب چاروں طرف سے بڑھ رہے ہیں۔ اور پانچواں دستہ ٹھیک شہر کے بیچ میں ہے۔ مشہور امریکی مصنف ارنسٹ ہمنگ وے

نے ایک ڈرامہ "قصہ کالم" کے عنوان سے لکھا تھا جس نے اس اصطلاح کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ہندستانی لفظ "پانچ" اب نشہ بن کر شوقین مزاج انگریزوں پر چھا چکا ہے۔ سترھویں صدی کے شروع میں جب انگریز سیاح ہندستان سے اپنے وطن لوٹے تو اپنے ساتھ مشروب تیار کرنے کا ایک نسخہ بھی لیتے گئے جس میں عرق کے ساتھ ساتھ نیبو، چائے، شکر اور پانی شامل ہوتا تھا۔ ان پانچ چیزوں کی شمولیت کی وجہ سے انھوں نے اس مشروب کو پنچ (PUNCH) کہنا شروع کیا اور یہ لفظ اب بھی انھیں سرور بخشتا ہے۔

جب قیام وطعام کے معاملے میں ٹھاٹ باٹ کی بات ہو تو پانچ ستارہ ہوٹلوں کی بات اپنے آپ ذہن میں آتی ہے۔ آسمان پر چمکنے والے ستارے کے ساتھ ہمیشہ سے بلندی اور شان وکشش کا تصور وابستہ ہے۔ قرون وسطیٰ میں "مسیحی" سنتوں کی تصویروں میں اکثر کوئی ستارہ بطور علامت شامل کیا جاتا تھا۔ قرون وسطیٰ کے سورماؤں (KNIGHTS) کے درمیان یہ رواج تھا کہ وہ کسی قسم کا ستارہ اپنے نشان میں شامل کرتے تھے۔ یہ علامت ان سورماؤں کے فوجی منصب سے مطابقت رکھتی تھی۔ اس رواج سے فوجی افسروں اور پولس کے افسروں کے کاندھوں پر ستاروں کو لگانے کی رسم نے جنم لیا اور ستاروں کی تعداد کو منصب یا وقعت کی بلندی یا پستی سے وابستہ کیا گیا۔ اب یہ وقعت ایک ستارے سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ پانچ ستاروں کی شکل میں بلند ترین درجے پر ظاہر کی جاتی ہے۔ سیاحت کے فروغ کے لیے تیار کیے گئے کتابچوں میں جب کسی مقام پر موجود ہوٹلوں یا ریستورانوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے معیار کو ستاروں کی تعداد سے بتایا جاتا ہے۔ بعض اخبارات ورسائل وغیرہ میں فلموں اور ڈراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے معیار کو ستاروں کی تعداد سے بتایا جاتا ہے۔ پٹرول میں آک ٹن (OCTANE) کی زیادہ مقدار بتانے کے لیے زیادہ ستاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

پانچ کی عملداری اس طرح زندگی کے لاتعداد شعبوں میں پھیلی ہوئی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ ریاضی کی ایک عام اکائی ہے۔ قدرت کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ گنتی کا وہ اعشاری نظام جسے اب انسان نہایت کارآمد اور باسہولت سمجھتا ہے اسے قدرت نے شروع سے ہی انسان کی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی گرفت میں دے دیا تھا اور پانچ اور دس کے اعداد ہی ہمارے شمار میں تقریباً مکمل تعداد (ROUND FIGURE) کو ظاہر کرنے کے کام نہیں آتے بلکہ نصف کے لیے بھی اعشاریہ پانچ کا بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ جس کثرت کے ساتھ ہمارے گننے اور حساب رکھنے میں اعشاریہ پانچ کام آتا ہے وہ کثرت کسی بھی دوسرے اعشاری عدد کے استعمال میں نہیں دیکھی جاتی۔

ڈاکٹر شکور جانبائیف (ازبکستان)
ترجمہ: انصار الدین ابراہیم

لغت اتراکیہ — علی شیر نوائی کی تصانیف کے لیے نئی لغت

اگر عربی زبان میں معجم اور قاموس کثرت سے ملتے ہیں' فارسی اپنے فرہنگوں کے لیے مشہور ہے تو ترکی زبانیں اپنی ذولسانی لغات کے لیے شہرت رکھتی ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نوائی کی تصانیف میں ملنے والے الفاظ کو فارسی میں تشریح کرنے والی ذولسانی لغات کو ازبیک لغت نویسی میں ہی نہیں بلکہ سارے مشرق اور دنیا میں لغت نویسی کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے کیونکہ کسی ایک تخلیق کار کی تصانیف کی زبان پر بنی لغات عربی اور فارسی لغت نویسی میں بھی جو کہ اس میدان میں کافی تجربہ رکھتی ہے' شاذ و نادر ملتی ہیں۔

نوائی کی تصانیف میں ملنے والے ترکی (ازبیکی) الفاظ پر بنی چند لغات موجود ہیں اور ان پر تحقیقی کام کافی عرصہ سے ہو رہا ہے۔ اس بات کا واضح اندازہ لگانے کے لیے کہ اس سلسلے میں کس کس قسم کے کام سرانجام پائے ہیں' بات شائع شدہ لغات سے شروع کی جائے۔

ابو شقاوہ پہلی لغت ہے جس پر عالمین شرقیات کی توجہ مبذول ہوئی ہے' اس کو سب پہلے جی۔ واسیری (سنکٹ پٹر سبرگ' ۱۸۶۲ء) نے مختصر شکل میں شائع کیا تھا۔ چھے سال بعد وی۔ وی۔ ویلیا مینوف۔ زیرنوف نے ابو شقا کا مکمل اڈیشن (سینٹ پٹر سبرگ' ۱۸۶۸ء) شائع کیا اور اس کے لیے ایک مبسوط پیش لفظ بھی لکھا۔ یہ لغت کافی عام تھی اور اس کی ضخامت زیادہ بڑی نہیں تھی ہم سمجھتے ہیں کہ اسی وجہ سے اس کو سب سے پہلے علمی استعمال میں لایا گیا ہے۔

فضل الله خان نے جو چغتائی فارسی لغت ۱۸۲۵ء میں کلکتہ سے شائع کرائی تھی اب بھی اس کی اہمیت برقرار ہے۔ اس کے چوتھی صدی بعد شیخ سلیمان بخاری کی چغتائی ترکی لغت (استنبول ۱۸۸۰ء) شائع ہوئی۔ آئے۔ کونوش نے اس پر دوبارہ کام کیا اور ۱۹۰۲ء میں بوداپست

میں اسے چھاپ دیا۔ سینکیر اور پاوے ڈے کرٹیلی لغات کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے متذکرہ بالا لغات کے علاوہ سنگ لاخ اور خلاصہ عباسی سے بھی مواد یکجا کیے ہیں۔

نوائی کے دور حیات میں ان کے دیوانوں میں ملنے والے ترکی الفاظ کی بنی لغات جو آج تک پہنچی ہیں، ان میں سب سے پرانی بداء الغت ہے۔ پروفیسر اے۔ کے۔ بوروکوف نے اس لغت کے نقل مطابق اصل کو اپنے ترجمے اور پیش لفظ کے ساتھ چھپوایا تھا (ماسکو، ۱۹۶۱ء) یہ ایڈیشن اب تک ترک شناسوں، ازبیک کلاسک ادب کے ماہرین اور خاص کر نوائی شناسوں کے لیے رہنمائی کتاب کا کام دے رہی ہے۔ نوائی کی تصانیف میں ملنے والے ترکی (ازبیکی) الفاظ کو ان کے معنی کے ترجمے کے ساتھ شائع شدہ پہلی اور واحد لغت بداء اللغت کو مانا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی علمی اور علمی اہمیت اب بھی کوئی کم نہیں ہوئی ہے۔ پرانی ازبیک زبان کی لغتا ایسے منبع ہیں جو بڑی تہذیبی اور تاریخی قیمت رکھتی ہیں۔ آج تک پہنچنے والی اہم ترین لغات میں سے سنگ لاخ، لغت اتراکیہ، 'ابوشقا' بداء الغت کا ترتیب دیا جانا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ نوائی کے تخلیقی عمل کے لیے ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ ان لغتا میں نوائی کی تصانیف میں ملنے والے اصل الفاظ ہی شامل کیے گئے ہیں۔

ایک بات باعث تعجب ہے لیکن پھر بھی کہنا ضروری ہے کہ یہی اصل ترکی (ازبیکی) الفاظ آج کل بیشتر ازبیک قارئین کی سمجھ نہیں آتے۔ کیونکہ ان دنوں نوائی کی تصانیف کی جو لغات بنی ہیں ان میں بھی الفاظ نہیں ملتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سنگ لاخ اور لغت اتراکیہ شائع نہیں ہوئی ہیں۔ اگرچہ سنگ لاخ چھپ گئی ہے لیکن ماہرین کا ایک محدود حلقہ ہی اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ کلاسن اڈیشن (لندن، ۱۹۶۰ء) کے ناپید ہونے کے سبب ماہرین کو مشکل پیش آتی ہے۔ اے عمروف اور بے۔ حسن اف نے سنگ لاخ پر سنجیدہ تحقیقی کام کیا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی یہ بات ازبیک لغت نویسی کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ بے۔ حسن اف اپنی کتاب جواہرات خزائن (تاشقند، ۱۹۸۹ء) میں لغت نویسی کی نقطۂ نظر سے دلچسپ ۱۲۵۴ الفاظ کے تراجم سے نوائی کی تصانیف میں دلچسپی لینے والوں کو بہرہ مند کیا ہے۔ ثبوت کے طور پر اور اس بات کا واضح اندازہ پیدا کرنے کے غرض سے کہ نوائی کی تصانیف کی لغتوں میں لفظوں کے معنی کس طرح تشریح کیے جاتے ہیں، ہم مذکورہ کتاب سے دو مثالیں پیش کر رہے ہیں:

ا۔ تمگہ (Tumaga)۔ مشک موش کی پوستین کی بنی ٹوپی۔ اس کو عربی میں کالان

کبت الالائر کہتے ہیں۔ اپنی تصنیف لسان الطیر میں نوائی اس لفظ کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن رومی نے اس لفظ کا مفہوم غلط سمجھا ہے۔

۲۔ گرر۔ کرر کی شکل میں بھی ملتا ہے۔ تصنیف برہان قاطع کے مؤلف نے اس کو فارسی لفظ سمجھ رکھا ہے اور اسے 'غ' سے لکھا ہے۔ کرر بگڑی ہوئی شکل ہے اور گرر ترکیات لفظ۔ اسکے متعلق کتاب کے باب کاف میں بتایا جاتا ہے۔ طالع خراوی نے اس لفظ کا ترجمہ 'صندوق' دیا ہے جو کہ غلط ہے۔

سنگ لاخ اور لغت اترا کیہ نہ صرف علیشیر نوائی کی تصانیف کی زبان بلکہ پرانی ازبیکی زبان سیکھنے کے لیے بھی بنیادی منبع سمجھی جاتی ہے۔ یہ بتانا کافی ہوگا کہ ۱۹ویں صدی کے اواخر اور ۲۰ویں صدی کے شروع میں شائع شدہ بہترین لغتوں کے لیے مذکورہ لغات بنیاد ہیں۔ یہ ایل۔ بوداگوف اور وی۔ اے۔ رادلوف کی لغات ہیں۔ ان دونوں لغتوں کے لیے ابوشقا' فضل الاخان کی چغتائی فارسی اور دیگر تمام شائع شدہ لغات سے الفاظ لیے گئے ہیں لیکن اس بات کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا کہ یہ مواد بغیر کسی غلطی کے ہیں۔ کیونکہ ان لغتوں پر آج تک کسی نے تنقید کام نہیں کیا ہے۔ اس بات کے ثبوت کے طور پر اے۔ کے۔ بوروکوف کی ان باتوں پر توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں "مثلاً ابوشقا میں نوائی کی داستان لیلیٰ مجنوں میں ایک شعر کی بنیاد پر Yig لفظ کا معنی تیار دیا گیا ہے۔ ایل۔ بوداگوف نے ابوشقا سے بھی لفظ لیا ہے اور اس سے ایک خاص فعل Yig' mak 'تیار کرنا' کے معنی میں بتایا۔ پاوے ذے کرتیل نے اپنی لغت میں Yig لفظ کا معنی Dispose Prepare دیا ہے۔ سنگیر نے اور رادلوف نے بھی یہی کیا ہے۔ (لغت' جلد ۳' صفحہ ۵۰۴) دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے میں غلطی ہوئی ہے اور وہ لفظ Yig نہیں 'Big ہے جس کے معنی تیار' تیار کیا ہوا ہے جو فتح علی خان کاچار کی لغت میں اسی طرح دیا گیا ہے۔ مذکورہ لغتوں میں اس قسم کی غلطیاں کافی ملتی ہیں۔

نوائی کی تصانیف کی لغتوں میں سے ہر ایک کا فارسی لغت نویسی اور نوائی کی زبان سیکھنے میں علاحدہ مقام ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان لغات کے آپسی تعلق کا مسئلہ بھی موجود ہے جس پر اے۔ اے۔ رومسکیوچ اور اے۔ کے۔ بوروکوف نے اپنی قیمتی آرا دی ہیں۔ انھوں نے فتح علی خان قاچار کی لغت اترا کیہ کو فارسی لغت نویسی اور نوائی کی زبان سیکھنے میں ایک الگ اہمیت دی ہے۔ اے۔ کے۔ بوروکوف بدا الملغت (۱۹۶۱ء) کے پیش لفظ میں لکھتا ہے! بدا الملغت

شائع [illegible] وقت یہ طے کرنا کہ تمام مسائل حل ہو چکے ہیں۔ قبل از وقت ہے۔ اس کے لیے بہتر یہ ہوگا [illegible] سنگ لاخ اور فتح علی خان قاجار کی لغت کو بھی شائع کیا جائے اور تمھیان کو ملا کر ایک لغت بنائی جائے اور اس پر علی شیر نوائی کی تصانیف کا تنقیدی ٹیکسٹ سے لازمی طور پر استفادہ کرنا چاہیے۔"

نوائی کی تصانیف کی بنی ہوئی لغات میں فتح علی خان قاجار کزوینی کی لغت اتراکیہ کا الگ ذکر ہونا چاہیے۔ اس میں آٹھ ہزار سے زائد الفاظ اور صورتیں موجود ہیں۔ اسی لیے اس لغت کو شائع کرنا ازبیک لسانیات اور نوائی شناسی کے لیے بڑا اہم ہے۔ اس کے لیے ہم سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے اس کے فارسی حصے کا ازبکی میں ترجمہ کرنا اور خود لغت کی اصل شکل شائع کرنا چاہیے یہ کام بداء اللغت' ابو شقا اور سنگ لاخ سے موازنہ کرتے ہوئے انجام دینا چاہیے۔

چند الفاظ لغت اتراکیہ کے مؤلف کے متعلق اس لغت کا قلمی نسخہ جو آج کل سینٹ پٹرسبرگ کی سالتکوف شیڈرین لائبریری میں محفوظ ہے ۱۹۱۴ء میں اے۔ اے۔ راموسکیوچ نے ایران میں خریدا تھا۔ فتح علی قاجار کی سوانح عمری کے چند باتیں اسی قلمی نسخے سے معلوم ہوتی ہیں۔ مؤلف کا پورا نام ہے فتح علی ابن کلب علی ابن مرشید کلی ابن فتح علی قاجار کزوینی۔ وہ قبیلہ قاجار کے قاراکوئلی گروپ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی پیدائش اور سکونت شہر کزوین میں رہا ہے۔ فتح علی شاہ (۱۸۳۴۔۱۷۶۲ء) کے دور اقتدار میں (۱۸۳۴۔۱۷۹۶ء) فتح علی قاجار کو فوجی خدمات انجام دینے کے لیے آذربائجان بھیجا جاتا ہے۔ اس نے ۱۷ سال تک بڑی جانبازی سے خدمت کی' ترکوں اور روسیوں کے خلاف ایران کی جنگوں میں حصہ لیا۔ وہ خراسان میں دو سال کی فوجی خدمت کے دوران پلنگ توشخان سے ملتا ہے جس کو علی شیر نوائی کی تصانیف اور چغتائی زبان (ازبکی) کا خوب اچھی طرح علم تھا۔ انھوں نے اس شخص سے سبق لیے۔ فتح علی قاجار ایران کے علاقہ میں بھی نہ گئے فرصت کے اوقات وہ چغتائی میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔ وہ یہ زبان دوسروں سے سیکھتا بھی تھا' سکھاتا بھی۔ مثلاً ایران کے معروف شاعر مرزا حبیب اللہ کانی کو چغتائی (ازبکی) زبان کے سبق دیے۔ فتح علی قاجار عمر رسیدہ میں خراسان کے وزیر مرزا محمد کی مدد اور تعاون سے سن ۱۸۵۷ء میں اپنی یہ کتاب مکمل کرتا ہے اور اس کا نام لغت اتراکیہ رکھتا ہے۔

مذکورۂ بالا لغت میں فتح علی قاجار نے اپنے متعلق چند معلومات بھی دی ہیں۔ ان کے مطابق وہ ۱۸ویں صدی کے اواخیر اور ۱۹ویں صدی کے دوسرے نصف میں زندہ رہا۔

باقر مہدی
ای۔1 ردی ورشن کار روڈ
باندرہ (ویسٹ) ممبئی۔50

ایک کالی غزل

(یگانہ کے نام)

ایک الجھن کے سوا دشوار و مشکل کچھ نہیں!
گمرہی خود اپنی منزل ہے یہ منزل کچھ نہیں!
ہاتھ میں کشکول باقی ہے نہ آنکھوں میں چراغ
صرف اک حرفِ دعا ہے اور سائل کچھ نہیں!
ایک طوفاں کا سہارا ناخدا کی جان ہے
ورنہ موجوں کا تلاطم اور ساحل کچھ نہیں!
سر پٹکتا ہے در معنی پہ عالم رات دن
مت کہو یہ بے زباں معصوم جاہل کچھ نہیں!
اس طرح بیٹھے ہیں جیسے سب ہیں رندِ یار باش
اک انا کی خود نمائی ہے یہ محفل کچھ نہیں!
کون کس کو پوچھتا ہے شہرِ ناؤ نوش میں
ایک رقصِ بے نوا ہے اور بسمل کچھ نہیں!
ڈھونڈتا رہتا ہے بچنے کے طریقے دم بدم
ظلم کے بازار میں سرکش سا عاقل کچھ نہیں!
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے ترسے گا خود اپنے جسم کو
ایک شب کی بات ہے پھر ماہ کامل کچھ نہیں!
جانتا ہوں شعر کہنے سے خلش بڑھ جائے گی
درد کی پیہم کشش اور غم کا حاصل کچھ نہیں!

مخمور سعیدی
دہلی اردو اکیڈمی
گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، دہلی ۔ ۲

دھند

دھند، گہری دھند پر پھیلا رہی ہے
از زمیں تا آسماں یوں چھا رہی ہے
خود زمین و آسماں جیسے کہیں گم ہو گئے ہیں
سارے منظر ---
عالم بے منظری میں کھو گئے ہیں

دھند، گہری دھند بڑھتی آ رہی ہے
جنگلوں سے بستیوں تک قہر اپنا ڈھا رہی ہے
بام و در، شاخ و شجر سب بے نشاں ہیں
دھند کے بادل خلا میں حکمراں ہیں

دھند، گہری دھند اپنی فتح مندی کا علم لہرا رہی ہے
کائناتی وسعتوں کو ---
زیر کرتی جا رہی ہے
ہے کمر بستہ کہ آخر
روشنی کی منتظر آنکھوں کو تاریکی سے بھر دے
روشنی کی واپسی کے ---
راستے سب بند کر دے

محمد صغیر صدیقی
A-102 مرینا
کمپلکس گلشن اقبال 13-B کراچی

غزل

طریقوں کی تازہ بنا ڈالیے
پرانے میں بالکل نیا ڈالیے

اگر کچھ اٹھانے سے اٹھتا نہیں
تو سب کچھ کسی دن گرا ڈالیے

کرایا نہیں ہے ابھی تک وجود
کوئی بوجھ اس پہ بڑا ڈالیے

بلاکا ہر اک سمت سناٹا ہے
اب اک نعرہ ہو لگا ڈالیے

سمندر میں صحرا پلٹ دیجیے
پھر اس میں گلستاں کھلا ڈالیے

کہاں کی انا اور کیسی انا
خسارے میں کچھ فائدہ ڈالیے

ضروری ہے کچھ کام کرتے رہیں
بڑھا ڈالیے کچھ گھٹا ڈالیے

کسی کو جو کہنا ہے' کہتا رہے
سنانا ہے جو کچھ سنا ڈالیے

ڈاکٹر ظفر حمیدی
آم گولا روڈ، مظفرپور

غزل

آنسو مری آنکھ سے بہے گا
دل اس کا بھلا کیا دکھے گا

جس پہ میں بھٹکتا پھر رہا ہوں
اس رہ پہ کیا کوئی چلے گا

جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں
وہ بات کوئی نہیں کہے گا

ہر دریچہ ہے اختیاری منتی
امید ہے ایک در کھلے گا

نوک قلم دل میں چبھ کے نکلی
نادر سا نقش کوئی بنے گا

خالی جسم کا مکان میرا
کوئی تو کبھی یہاں رہے گا

پتھر پہ کھینچا نشان ہو تم
افسوس ہے وہ مگر مٹے گا

پتھر مارو یا گلاب پھینکو
دیوانہ ہر وار کو سہے گا

روداد اپنی ظفر نہ لکھو
کون اس کو کبھی پڑھے گا

عاصی کاشمیری
788-Wood Borough Road.
Nothingham Na3 5QJ
(ENGLAND)

غزل

معرکہ عقل و جنوں کے درمیاں ہونے کو ہے
کوئی فرزانہ چمن میں سرگراں ہونے کو ہے

اوڑھ کے نکلے گا اب وہ چاند سورج کا لباس
ذرہ ذرہ اس زمیں کا آسماں ہونے کو ہے

زخمِ فرقت کھل اٹھے ہیں تازہ پھولوں کی طرح
دل مرا چند روز میں ہی گلستاں ہونے کو ہے

چھوڑ کر جانے لگا ہے وہ بھی میرے جسم کو
مجھ سے تو سایہ مرا بھی بدگماں ہونے کو ہے

اب زباں جذبوں کو دینے کی ضرورت ہی نہیں
دل کی ہر دھڑکن ہی اس کی ترجماں ہونے کو ہے

اضطرابی کیفیت ہے ہر طرف چھائی ہوئی
وہ حسیں صورت تصور میں عیاں ہونے کو ہے

فرقِ عمروں کا مری جاں خود بخود مٹ جائے گا
تیرا عاصی تیری خاطر پھر جواں ہونے کو ہے

اختر ضیائی
13E Hoe Street
London. E17 4SD
(U.K.)

غزل

تھی جوانی کچھ تو دیوانی بہت
ہم نے لیکن دل کی بھی مانی بہت

محفلِ یاراں ہمیں برہم لگی
اور نگاہِ ناز بیگانی بہت

حسن کو جلوہ گری مقصود تھی
عشق نے کی حشر سامانی بہت

شکر ہے بارگراں سے بچ گئے
کام آئی تنگ دامانی بہت

کاش مل جاتی کوئی راہِ نجات
خاک دشتِ ذات کی چھانی بہت

در بدر پھرتے ہے نیلِ مرام
تھا جنہیں زعمِ ہمہ دانی بہت

سچ تو ہے جاں کے زیاں کا کاروبار
جھوٹ میں رہتی ہے آسانی بہت

بادیہ گردی کی تنہا شام کو
یاد آئی خانہ ویرانی بہت

چھوڑ بھی اختر گئے وقتوں کا سوگ
ہو چکی اب مرثیہ خوانی بہت

ڈاکٹر محبوب راہی
جی۔ این۔ اے۔ کالج
بارسی ٹاکلی

غزل

قطرہ، جھرنا، دریا، ابر سمندر میں
ایک سلگتی جلتی پیاس سراسر میں
ایسے برتیں مجھ کو میرے اپنے لوگ
جیسے کوڑا کرکٹ کنکر پتھر میں
ایک درندہ ہوں خواہش کے جنگل کا
ہے سادھوسنت کہاں کا ہی پیمبر میں
منافقوں سے بھرے ہیں سجدہ گاہیں سبھی
کہاں جھکاؤں بالآخر اپنا سر میں
وقت کا دھارا مجھ سے ہو کر بہتا ہے
کتنا رہتا ہوں اندر ہی اندر میں
قد آوروں میں پست قامت ہوں کتنا
بونوں میں تھا کس درجہ قد آور میں
خود غرضوں، ابن الوقتوں کی یہ دنیا
اور سرتا پا اک خلوص کا پیکر میں
میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے
کتنا بہتر ہوں اور کتنا کمتر میں
جب تک اردو زندہ ہے راہی صاحب
جھلکوں گا شعروں میں منظر منظر میں

بشیر فاروقی
۵۱۵، سرو علی لین، بی عقب رائل ہوٹل
وودھان سبھا مارگ، لکھنؤ

غزل

کیا دشت کیسی ریت جدھر ہم نکل پڑے
ٹھوکر سے اپنے پاؤں کی چشمے ابل پڑے
دیکھا جو شادماں رخ عالم پناہ کو
خدامِ جاں نثار خوشی سے اچھل پڑے
چاہو مجھے ضرور پہ تنہائیوں میں تم
سوچو نہ یوں مجھے کہ سکوں میں خلل پڑے
کیسی یہ بے بسی ہے کہ چاندی کو بیچ کر
نیزے خریدنے کے لیے لوگ چل پڑے
سرزد ہوئی ہیں مجھ سے بھی ایسی کرامتیں
برفاب جسم لمس نظر سے پگھل پڑے
جب راکھ ہو چکے تو ہمیں یہ خبر ہوئی
اپنی ہی تھی وہ آگ کہ ہم جس میں جل پڑے
اس سیم تن نے جھیل کا منظر بدل دیا
لہرائے بادبان سفینے مچل پڑے
وہ خوشبوؤں کا خط مجھے دے کر چلا گیا
بجھتی ہوئی نظر کے دیے پھر سے جل پڑے
اک نام یونہی میری زباں سے نکل گیا
سو بار اس غزال کے ماتھے پہ بل پڑے
منزل پہ اب رکیں گے ہمارے قدم بشیر
پتھر ملیں کہ پھول ملیں ہم تو چل پڑے

ڈاکٹر شاداب رضوی
پی جی ڈیپارٹمنٹ آف اردو
ٹی ایم بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور۔

غزل

(نذر افتخار عارف)

یہ کیا کہ بعد سفر پھر سفر میں رکھا جائے
ہمیں بھی چار پہر مستقر میں رکھا جائے

چراغ پچھلے پہر تھک کے ساتھ چھوڑ گئے
تیری طلب کو غبارِ سحر میں رکھا جائے

فروغ فصلِ ریا، مصلحت کی آب و ہوا
فضا کا رنگ نواحِ نظر میں رکھا جائے

وہ تاکہ دیکھ سکے سارے موسموں کا جلال
حویلیوں کے خدا کو کھنڈر میں رکھا جائے

یہ چیخ چیخ کے اعلان کر رہی تھی ہوا
کوئی چراغ دریچہ نہ در میں رکھا جائے

ہے یہ بھی ایک سبق وقت کے پیمبر کا
جو تیر آئے حفاظت سے بر میں رکھا جائے

ہوا کے رخ کو سمجھ کر بھی جو خلاف چلے
وہ شخص کیوں نہ دیارِ دگر میں رکھا جائے

میں جس کو ہاتھ لگاؤں وہ لفظ بول اٹھے
یہ معجزہ بھی کفِ کم ہنر میں رکھا جائے

ہزار پاسِ مراتب کا لحاظ ہو شاداب
رہا ہے فرق جو زیر و زبر میں رکھا جائے

زبیر شفائی

غزل

انتہائے مستی میں ایک آنکھ سوتی .
اور جاگنے والی آنکھ خون روتی .

دھوپ کا مقدر ہے دربدر جبیں سا
آفتاب ڈھوتی تھی آفتاب ڈھوتی ۔

کائنات میں تنہا، منفرد ہے وہ
زرنگار پر چھائیں' تن سفید موتی ۔

اب بکاؤلی ویسی پرکشش کہاں
قطرہ قطرہ شبنم سے خشک لب بھگوتی

اشتعال دیتا ہے اضطراب دریا
موج ورنہ، کاغذ کی ناؤ کب ڈبوتی

زندگی کے دامن میں پھول بھی ہیں پتھر بھی
خون و خاک میں فصلیں لاجواب بوتی

دیر سے پہنچتا ہے جب زبیر گھر اپنے
چاندنی دریچے کے آس پاس ہوتی

ملک زادہ جاوید
بی۔۲۵، سیکٹر۔۱۱، نوئیڈا

غزل

(غالب کی زمین میں)

اس کی غزلیں، اس کی باتیں، اس کا لہجا آشنا
اک اسد اللہ غالب جس سے دنیا آشنا

توڑ کر لے جائے گی اس کو ہوا جب شاخ سے
تب خزاں کی رُت سے ہوگا سبز پتا آشنا

بھیڑ کو وہ کاٹ کر آیا، ملا، اور ہنس دیا
کون ہے، کیا نام ہے، لگتا ہے، چہرا آشنا

میری غیبت تو کرے اور تیری غیبت میں کروں
اس شناسائی سے بہتر ہے رہیں نا آشنا

مرثیہ پڑھنے لگیں تازہ ہوائیں شہر کی
جب اُدھر سے ہو کے گزرا کوئی اپنا آشنا

اے خدا اس دور میں اتنی دعا کر لے قبول
دھوپ سے ہو جائے جلدی میرا اپنا آشنا

اقبال ردولوی
درگاہ ردولی

غزل

اہلِ جنوں کو اہلِ خرد کی ہوا لگی
میں سوچتا ہوں کون کہے گا خدا لگی

تنگ آ گئے تھے صرصرِ دوراں کی آگ سے
کوچے میں تیرے پہنچے تو ٹھنڈی ہوا لگی

تم اور اہلِ درد پہ یوں مہرباں ہو
شاید کسی فقیر کی تم کو دعا لگی

کس کی نگاہِ ناز کے مارے ہوئے ہیں لوگ
خلقت تمھارے شہر کی درد آشنا لگی

وہ خوف وہ ہراس تھا بس کچھ نہ پوچھیے
مقتل کی طرح شہر کی ہم کو فضا لگی

تیری صدا سنی تھی زمانہ گزر گیا
پھر اس کے بعد تیری صدا ہر صدا لگی

ایسے بھی لمحے آئے ہیں اقبال زیست میں
عمرِ عزیز بھی ہمیں جیسے سزا لگی

رفیق عادل
مدار محلہ۔ فیض پور۔
مہاراشٹر ۴۲۵۵۰۳

غزل

تہی دست، سوکھے شجر کی طرح
ہوں گویا کفِ بے ہنر کی طرح
تمسخر نہیں ہے سخن میں مرے
تو لگتا ہے شمس و قمر کی طرح
نہیں میرے ظاہر سے باطن جدا
میں باہر بھی رہتا ہوں گھر کی طرح
بھٹک جاؤگے میرے ہمراہ تم
میں روشن ہوں لیکن شرر کی طرح
ہے شانے پہ اس کے رواجوں کا بوجھ
وہ لگتا ہے شاخِ ثمر کی طرح
عروج اپنا، موسم کے جیسا ہی تھا
زوال آیا شام سحر کی طرح
چلو آج عادل کے گھر جائیں گے
ملے گا وہ دیوار و در کی طرح

شبیر احمد قرار
انجمن اسلام ہائی اسکول
سی۔ایس۔ٹی۔روڈ
کرلا۔ ممبئی ۷۰

غزل

اندھیرے میں جلوے ٹٹولے گئے
چکا چوند اسرار کھولے گئے
مری چھانو کو دھوپ لکھا گیا
کہاں تک دلوں کے پھپھولے گئے
ستم، تیرونشتر، کٹاری، ہنسی
کئی زہر شربت میں گھولے گئے
بہت کچھ تو چھانا پچھوڑا گیا
مگر ہم تو کم کم ہی رولے گئے
چلو سجدۂ شکر واجب ہوا
وہ ہچکولے، جھولے جھکولے گئے
نئی الف لیلیٰ نے پھیلائے پر
وہ پریاں گئیں وہ کھٹولے گئے
خموشی کنارے پہ لے آئی تا
جنھیں ڈوبنا تھا وہ بولے گئے

عزیز احمد عزیز
57۔ تحصیلدار ہاؤس، نئی آبادی
باپوڑ۔ یو۔ پی

غزل

کہنے کی بات ہے کوئی دلجو نہیں رہا
وہ دل نہیں رہا ہے وہ پہلو نہیں رہا

شب تیرگی کے ساتھ سحر روشنی کے ساتھ
اس عاشقی میں دل کبھی یکسو نہیں رہا

ہم ڈھونڈتے ہی رہ گئے خود کو ہجوم میں
حد یہ ہے اپنے دل پہ بھی قابو نہیں رہا

ہم کو نہ راس آئے کبھی زندگی کے پیچ
شانہ اگر ہوا تو وہ گیسو نہیں رہا

اب دور جا چکی ہے بہت رقص جاں کی بات
پایل میں دل کی ایک بھی گھنگھرو نہیں رہا

ناکامیوں سے دل کا دیا بجھ گیا، نہ خیر
آنکھوں میں اپنی کب وہ پری رو نہیں رہا

پروفیسر حفیظ [illegible]
مٹی محلہ۔ آرہ

غزل

دل شکن صورت ہستی کبھی ایسی تو نہ تھی
زندگی آج ہے جیسی کبھی ایسی تو نہ تھی

جاگنے والے سر شام ہی سو جاتے ہیں
مرے خوابوں کی یہ نگری کبھی ایسی تو نہ تھی

جس طرف دیکھیے راون کی عمل داری ہے
لچھمن ورام کی دھرتی کبھی ایسی تو نہ تھی

پی کے بھی تشنہ دہانی کا ہے احساس شدید
غم دوراں تری تلخی کبھی ایسی تو نہ تھی

پہلے بھی کون سی خوبی تھی زمانے میں، مگر
آج ہے جیسی خرابی کبھی ایسی تو نہ تھی

کوئی ارماں کوئی حسرت بھی نہیں دل میں حفیظ
غیر آباد یہ بستی کبھی ایسی تو نہ تھی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی اہم کتابیں

کتاب		مصنف	قیمت
داستان امیر حمزہ	(نظام اردو خطبات)	شمس الرحمٰن فاروقی	60/-
فکرِ انسانی کا سفر ارتقا	(نظام اردو خطبات)	پروفیسر خواجہ غلام السیدین	45/-
اقبال کا نظریۂ شعر اور ان کی شاعری	(//)	پروفیسر آل احمد سرور	65/-
غالب کی شخصیت اور شاعری	(//)	پروفیسر رشید احمد صدیقی	45 /-
ماضی کے دریچے سے	(تاریخ)	ڈاکٹر شوکت اللہ	75/-
بازار میں نیند	(ڈرامے)	پروفیسر حنفی	75/-
اردو افسانہ فن اور تجزیہ	(افسانوں کا تجزیہ)	پروفیسر حامدی کاشمیری	(زیرِ طبع)
پانچ جدید شاعر	(تنقیدی مضامین)	حمید نسیم	210/-
قاری سے مکالمہ	(تنقیدی مضامین)	پروفیسر شمیم حنفی	150\-
اعلا تعلیم	(خطبات)	ڈاکٹر ذاکر حسین	120/-
قلم اور قدم		سید حامد	75/-
اردو زبان و ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ		مرتبہ: صغرا مہدی	75/-
ڈسپلن کی تعلیم و تربیت		ڈاکٹر محمد اکرام خاں	90/-
جو رہی سو بے خبری رہی		ادا جعفری	200/-
خامہ بگوش کے قلم سے		مرتبہ: مظفر علی سید	80/-
		(مجلد)	150/-
طب یونانی اور چیلنجز		حکیم اشہر قدیر	60/-
محبوب حسین جگر	(کتاب نما کا خصوصی شمارہ)	مرتبہ: پروفیسر نثار احمد فاروقی	75/-
فراق: دیارِ شب کا مسافر		مرتبہ: شمیم حنفی	150/-
بیاں اور		اختر سعید خاں	144/-
لفظوں کی انجمن میں		ڈاکٹر سید حامد حسین	135/-
فرہنگ اصطلاحات طب		مسعود احمد برکاتی	45/-
تعبیر و تفہیم		خلیق انجم	135/-
معاصرین و متعلقات مولانا آزاد		عبد القوی دسنوی	60/-
مجملہ		یوسف ناظم	51/-
تصوف رسم اور حقیقت		خواجہ حسن ثانی نظامی	90/-
اخلاقیات طبیب		حکیم محمد سعید	20/-

شمس الحق عثمانی
۱۸۹ الف علیہ مارکن دہلی۔ ۶

ایک کتاب

"اعلا تعلیم" از ڈاکٹر ذاکر حسین

ان ساعتوں میں جس ایک کتاب پر تبصرہ پیش کیا جارہا ہے ' اس کا نام ہے اعلا تعلیم ـــــ یہ کتاب ڈاکٹر ذاکر حسین (۸ر فروری ۱۸۹۷ء تا ۳ر مئی ۱۹۶۹ء) کے چودہ تعلیمی خطبات کا اردو ترجمہ ہے۔

اس میں بارہ خطبے وہ ہیں جو ۱۹۶۹ء میں (Dynamic Univereity) کے نام سے اور پروفیسر محمد مجیب کے پیش لفظ کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ آخری دو خطبے (Prereident Zakir Husin Speeches) نامی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

تعلیم اور خاص طور پر اعلا تعلیم کے بارے میں ذاکر صاحب کا دائرہ فکر کتنا وسیع اور بامعنی تھا۔ اس کا کچھ اندازہ خطبوں کے عنوانات سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ عنوانات سنیے قومی تعلیم۔ قومی کنٹرول میں ' تعلیم اور اس کے مسائل ' فرد کی روحانی حیات نو ' نوجوانوں کے لیے چار مقاصد ' دماغ کی بے مہار آزادی ' مقتدی نہیں ہراول ' تعلیم کا عظیم ترین کام 'اکام: تعلیم کا ایک آلہ ' تکنیکی تعلیم: سماجی بہبود کے لیے ' مستقبل کی تشکیل کے لیے ایک صحیح یونی ورسٹی ' تحقیق اور زراعت میں موثر رابطہ ' بامقصد تعلیم یونی ورسٹیاں اور سماج اور گاندھی جی: شمع ہدایت۔ یہ تمام خطبے ۲۴ر دسمبر ۱۹۵۷ء سے ۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۷ء تک کے ان دس برسوں میں دیے گئے جن کے دوران ڈاکٹر ذاکر حسین بہار کے گورنر بھی رہے ' نائب صدر جمہوریہ بھی اور پھر صدر جمہوریہ ہند بھی۔

ان خطبوں کا ترجمہ جناب مسعود الحق نے کیا ہے۔ جو ذاکر صاحب کے شاگرد بھی ہیں ' جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں عرصہ دراز تک استاد بھی رہے ہیں اور اس فلسفہ

تعلیم کے مویدو عامل بھی جس کی ترویج و اشاعت ڈاکٹر ذاکر حسین کا مقصد حیات تھا۔

مصنف سے مترجم کی ذہنی قربت نے تراجم میں بھی وہی لب و لہجہ پیدا کردیا ہے جو ذاکر صاحب کے اردو خطبات کی پہچان ہے: ایک باوقار معلم کا ایسا پر مغز اور شگفتہ خطاب جو بہ آواز بلند خود کلامی بھی محسوس ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب نے اپنی عمر کے ۷۲ برسوں میں سے تقریباً پچاس برس، تعلیم، تعلیمی اسکیموں اور تعلیمی اداروں کی خدمت پر صرف کیے اور اپنے آپ کو ہمیشہ ایک معلم کی طرح زندہ رکھا۔ مئی ۱۹۶۷ء میں جمہوریہ ہند کا صدر منتخب ہونے پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک بیان میں کہا تھا:

"دراصل یہ ایک بڑا اعزاز ہے جسے قوم نے ایک ایسے شخص کو عطا کیا ہے جو محض ایک معلم ہے۔ جس نے آج سے کوئی ۴۷ سال پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے بہترین ماہ و سال قومی تعلیم کے کام میں کھپادے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کر کے میری قوم نے صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ تعلیم کا قوم کی زندگی کی اصل کیفیت سے ایک اٹوٹ رشتہ ہے یعنی تعلیم ہی قومی مقاصد کے حصول کا اصل ذریعہ ہے۔"

("شہید جستجو" از ضیاء الحسن فاروقی صفحہ ۵۳۶)

ذاکر صاحب کی تعلیم سے گہری وابستگی اور خطبات میں برتے گئے اسلوب کے بارے میں پروفیسر محمد مجیب نے "اعلا تعلیم" کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"بنیادی تعلیم کے جو اصول ڈاکٹر ذاکر حسین نے بیان کیے ہیں وہ ساری تعلیم کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یونی ورسٹی ایجوکیشن سے متعلق رادھا کرشنن کمیٹی کے ایک رکن ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین کو آموزش اور ذہنی ارتقا کے مراکز کی حیثیت سے ہندستانی یونی ورسٹیوں کی خوبیوں اور کمیوں کا ذاتی اور براہ راست علم تھا۔ تہذیب و اخلاق کے مطالبات کے پیش نظر انتہائی تحمل کا ڈھنگ سے بیان کیے ہوئے ان کے خیالات ان خطبات میں نہایت واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ انھیں پورے طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں بالواسطہ طرز اظہار کو بلاواسطہ میں 'تعریف کو ایک مہذب شکل میں 'امید کو افسوس' میں 'کیا ہونا چاہیے کی بصیرت کو ممکن الحصول کی عدم حصولی کے رنج و الم میں تبدیل کرنا ہوگا۔ (صفحہ ۱۳-۱۴)

"ملا تعلیم" میں شامل خطبات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ معاشیات کے ڈاکٹر لیکن تعلیم و تعلم کے نبض شناس ڈاکٹر صاحب پر عرصہ دراز سے یہ حقیقت منکشف تھی کہ تعلیم کا مقصد طلبہ میں: اپنے اوپر بھروسا، دوسرے سے سیکھنے پر آمادگی، وسعت نظر اور بے تعصبی پیدا کرنا ہے۔

ان چار خوبیوں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے تصور تعلیم کا مرکز و محور ایسے افراد کی تعمیر و تربیت تھا جو خود اعتمادی کے بل بوتے پر اپنے سماج کا جزو بن سکیں ایسا جزو جو کل میں شامل تو ضرور ہوتا ہے مگر صرف اس پر مطمئن نہیں ہوتا کہ میں کل کا جزو بن گیا ہوں۔ بلکہ وہ اپنے وجود کو کل کے لیے زیادہ سے زیادہ با معنی بنائے رکھنے کے لیے ذہن و دل کی کھڑکیاں کھلی رکھنا بھی لازمی جانتا ہے تاکہ تازہ ہوائیں آتی رہیں اور وہ یک رنگی اور ٹھہراؤ سے محفوظ رہے۔ یعنی ڈاکٹر صاحب کا تصور تعلیم سب سے پہلے 'فرد' کو ایک مکمل و متحرک فرد بنانے کی سعی کرتا ہے تاکہ مکمل و متحرک افراد کے مجموعے پر مشتمل سماج کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔ لہٰذا اس تصور کی رو سے قطرے کو حصول عشرت کے لیے ایک انتہائی منضبط سفر کی صعوبت سے گزرنا ضروری ہے اور اس سفر کا مقصود صرف اور صرف دریا ہی ہونا چاہیے۔ منضبط سفر کی تہذیب سے آراستہ قطروں کا وسیع و خوش خرام دریا۔

"نوجوانوں کے لیے چار مقاصد" نامی خطبے میں ایک جگہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

"اگر یونی ورسٹی تعلیم نے خود آموزی کے عمل کی ابتدا نہیں کی ہے 'ضرورت کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے طالب علم میں ایک آزاد اور بااخلاق فرد بننے اور اس سماج کو جس کا وہ خود ایک ممبر ہے اخلاقی طور پر ایک بہتر سماج بنانے کی خواہش پیدا نہیں کی ہے تو ہم کسی حد تک تاسف کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کا تو ابھی وقوع ہی نہیں ہوا کیونکہ طالب علم کے اندر خود آموزی کا پیدا ہونا ہی یونی ورسٹی کی اچھی تعلیم کی بہترین علامت ہے۔ یہی میرے خیال میں 'تعلیم میں اقدار و آزادی کی اہمیت اور طالب علموں کے نظم و ضبط کے مسائل کے تجزیے کا بہترا طریقہ ہے۔" (صفحہ ۶۰)

اسی خطبے میں ایک جگہ یونی ورسٹی کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ آج اپنے طالب علموں کو دوسروں کے طے کیے ہوئے مقاصد کے حصول کے لیے تھوڑی سی معلومات دے کر یا ان میں تھوڑی سی مہارتیں پیدا کر کے مطمئن نہیں

ہو سکتیں، انھیں تو ان افراد کو تعلیم دینا ہے جو اپنی منزلوں کا تعین خود کریں گے۔ نوجوان نسل کو اب یہ بتانے کے بجائے کہ وہ کیا سوچیں انھیں یہ بتانا ہو گا کہ وہ کیسے سوچیں۔ اس کا مطلب اپنے خیالات اور نظریات کو ان پر تھوپنا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب صحت مند فیصلے لینے کی صلاحیت کو فروغ دینا ہے۔ ہمیں شاید یونی ورسٹی کے کاموں کی طرف اپنے رویوں میں تبدیلی لانا ہو گی۔ مجہول تاثر پذیری کے طریقوں کو ترک کر کے بامقصد عقلی تعلیم کے طریقے اپنانے ہوں گے، نصاب کی انتہائی سخت گیری کے ساتھ جانچ پڑتال کرنا ہو گی اور غالباً اسے یکسر تبدیل کرنا ہو گا۔" (صفحہ ۵۷)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کلکتہ یونی ورسٹی میں اپنے خطاب کے دوران اعلا تعلیمی اداروں پر ایک ایسی حقیقت کا نہایت متنوع اظہار کیا تھا جو نہ صرف ہندستان بلکہ پورے مشرق کے اعلا و ادنا تعلیمی اداروں میں از کار رفتہ سمجھی جانے لگی ہے۔ اس خطبے کا عنوان ہے: فرد کی روحانی حیات نو۔ اس کا ایک اقتباس سنیے، واضح ہو گا کہ ذاکر صاحب نے فرد کی روحانی قوت کی بیداری کو آج کی ترقی یافتہ دنیا کے لیے کس درجہ پر افادیت قرار دیا ہے:

طلوع ہوتی ہوئی اس نئی زندگی میں یونی ورسٹی کیا بنیادی غرض کی ہونی چاہیے؟ پہلی بات جو میرے دماغ میں آتی ہے وہ ہے فرد اور روحانیت سے اس کے تعلق کی بات۔ میری یہ بات شاید عام چلن سے ذرا الگ سی معلوم ہوتی ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اہم اور ضروری بات ہے۔ میں زندگی میں سماجی اور مادی کی اہمیت کو ذرا بھی کم نہیں کرنا چاہتا مگر اس پر اصرار کرنا چاہتا ہوں کہ تعلیم کا اور اس لیے یونی ورسٹی کا تعلق فرد اور روحانیت سے ہے اور یونی ورسٹی اس سلسلے میں اپنی ذمے داریوں کی تکمیل کے لیے جو کچھ بھی کرے وہ کم ہو گا۔ تعلیم کا حقیقی جواز انسان کی انفرادی زندگی کی بہتری اور اس کی صلاحیتوں کا مکمل ارتقا ہے۔ اعلا تعلیم کا مقصد دماغ کا نشوونما کرنا ہوتا ہے اور دماغ کوئی اجتماعی مظہر نہیں ہوتا، یہ ہمیشہ ایک انفرادی دماغ ہوتا ہے۔۔۔۔ تعلیم عمل ہے انفرادی ذہن کی امکانی نشوونما کے مواقع کی فراہمی کا۔ ذہن کا یہ ارتقا ممکن ہے صرف ان تمدنی اشیا کے رابطے سے جو ایسے ہی ذہنی ڈھانچوں کی ذہنی کاوشوں کا ثمر ہوتی ہیں۔ طالب علم جب یونی ورسٹی میں آتا ہے اس وقت اس کے نمو پذیر دماغ میں ذہن انسانی کے اہم اور بنیادی جسمانی اور نفسی محرکات کے علاوہ ترقی یافتہ عقلی اور روحانی

محرکات بھی ہوتے ہیں جن کی تسکین ہی اسے مطلق وخالص' ابدی اور معروضی اقدار یعنی حق' حسن' خیر اور مقدس کا تجربہ کراتی ہے۔ ان اقدار کا تجربہ اپنے ساتھ استقلال وپائنداری' معقولیت اور جوہر حقیقی کا ایک نہایت اطمینان بخش احساس بھی دلاتا ہے۔ فرد ان کے لیے اپنے آپ کو وقف بھی کرتا ہے اور ان کے حصول کی سعی بھی۔ یہ سب چیزیں اس کی زندگی کے خاکے میں اس کی اقدار کے خدوخال اس کی پسند اور اس کی ترجیحات کے تعین میں ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت اختیار کرلیتی ہیں۔ تعلیم حقیقی معنوں میں انفرادی ذہن کو ان ہی اخلاقی اور روحانی اقدار مطلقہ کا تجربہ کرانے میں مدد دینے کا کام ہے۔ بدلے میں یہی اقدار فرد کو اپنی زندگی اور کام میں امکانی حد تک انھیں حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہیں اور اکساتی ہیں۔ یونی ورسٹی کچھ اور کرے یا نہ کرے تعلیم' اپنے ان ہی معنوں کے ساتھ اس کی اولین دلچسپی ہونا چاہیے۔" (صفحہ ۴۷ تا ۴۸)

وشوابھارتی میں دیے گئے اپنے خطبے "مقتدی نہیں ہراول" میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے حاضرین کو شاعر ہندی رابندرناتھ ٹیگور کا فلسفۂ جمال وروحانیت اپنے مخصوص اسلوب میں یاد دلایا ہے اور اس خطبے کا اختتام ٹیگور کی ایک دعائیہ نظم پر کیا ہے۔ کتاب "اعلا تعلیم" پر تبصرے کا اختتام بھی اسی دعا پر کیا جارہا ہے کیونکہ ٹیگور وذاکر نے اپنی حقیقی اعلا تعلیم کے تخیل میں یہ دعا مانگی اور دہرائی ہے

"اے خدا تجھ سے میری یہی دعا ہے۔"
ضرب ایک اور ضرب میرے دل میں خست کی جڑوں پر
مجھے توانائی بخش' اپنی خوشیوں اور اپنے دکھوں کو سبک سری کے ساتھ سہنے کی
مجھے توانائی بخش' خدمت میں اپنی لگن کو بار آور بنانے کی
مجھے توانائی بخش' مفلس سے کبھی نہ بے تعلق ہونے کی۔
تحقیر آمیز قوت کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکنے کی
مجھے توانائی بخش' اپنے ذہن کو روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اوپر اٹھنے کی
مجھے توانائی بخش' اپنی تمام توانائیوں کو محبت کے ساتھ تیری رضا میں لگا دینے کی۔" (صفحہ ۹۴)

ڈاکٹر شہپر رسول
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی-۲۵

آنند نرائن ملا کی غزل

آنند نرائن ملا کا شعری کردار نہر و زیست اور ذاتی واردات کے اختلاط سے عبارت ہے۔ وہ داخلی اور خارجی منظر نامے اور انفرادیت و اجتماعیت میں ہم آہنگی کے قائل ہیں۔ ان کی غزل میں عشقیہ جذبات اور جمالیاتی احساس کی مہذب پیشکش کے ساتھ ہی سیاسی سماجی اور قومی جہات کا بھی جذبے کی آمیزش کے ساتھ اظہار ہوتا ہے۔ وہ آسودگی فرد پر مفادِ افراد کو ترجیح دیتے ہیں، بنی نوع انسان سے بے پناہ محبت بھی کرتے ہیں، محبوب کے جلوؤں میں زندگی کے مختلف رنگوں کو رواں دواں بھی دیکھتے ہیں اور زیست کے مثبت اور عملی پہلو پر زور بھی دیتے ہیں لیکن نظریاتی وابستگی کے شعری اظہار اور حقائق سے فرار کو سم قاتل تصور کرتے ہیں اسی لیے ان کے یہاں تصویر کے دونوں رخ نظر آتے ہیں۔ جہاں وہ زندگی کے اثبات اور جہدِ مسلسل کی بات کرتے ہیں وہیں بے باکی و حق گوئی کے ساتھ محرومی، بے انصافی، حق تلفی اور ریاکاری جیسے انسانی سماجی مسائل کی نقاب کشائی بھی کرتے ہیں۔ اردو زبان کے سلسلے میں ملاّ صاحب کے موقف کو یہاں بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آنند نرائن ملا اردو کے عاشق بلکہ مجاہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو زبان کے خلاف ہونے والے ہر عمل پر ہمیشہ شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔

بالائی نظریات و موضوعات کے شعری اظہار کے لیے ملا صاحب نے قوت بصارت کا سہارا لیا ہے۔ آنکھ ان کے یہاں ایک ایسے سرچشمہ کور اک و امکان کا درجہ رکھتی ہے جس کی وساطت سے ظاہر کی وسعتوں اور باطن کے نہاں خانوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان کے بصری پیکروں کی تعمیر و تشکیل میں کلاسیکی شاعری کے روایتی الفاظ و تراکیب مثلاً جمال روئے دوست، نقاب، ہونٹ، سوزِ نہاں، شعلہ، دھواں، نظر، خواب پھول، بستر، ظالم، آرام، پلکیں، سایے، جھنڈ، درخت، دھوپ، دل، مصلحت، طائر،

امن، قسم، لب، اطلس، ہنسی، ظرف، تن خاکی، چنگاری، دور گل، ہوا، کانٹے، بند قبائے گل، آنسو، آنکھیں، وزیاں، صبح کی راہیں، کرنیں، دور خشاں، چشم شاعر، عرض نا تمام، اشک بے کلام، اشک مژگاں رسیدہ، سحر قسم، عشق چشم، مریض غم، تسلی، تسکین اور دیدۂ چارہ ساز وغیرہ کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ ملا کا لہجہ رازداری کا لہجہ نہیں ہے، وہ کہیں کہیں اشاروں سے ضرور کام لیتے ہیں لیکن وہ اشارے بھی روشن اور واضح ہوتے ہیں۔ ندرت بیان کے لیے انھوں نے کہیں کہیں تشبیہ کے ساتھ ساتھ استعارے کا استعمال بھی کیا ہے لیکن ان کے استعارے بھی براہ راست اور سریع الفہم انداز میں تجربے تک رسائی کراتے ہیں۔ چنانچہ ان کے پیکروں میں ان کی شخصیت کا کھرا پن اور نظریات کی شفافیت مترشح ہوتی ہے۔ اور پیچیدگی، پر اسراریت نیز متنوع و متضاد کیفیات کی نقش گری کے بجائے ایک طرح کی پرکار سادگی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر

کس نے دیکھا ہے جمال رخِ دوست
سب نقابوں میں الجھ کر رہ گئے

دیکھ کر اس کو نظر کھو سی گئی یوں جیسے
خواب دیکھے کوئی اور خواب ہی دیکھے جائے

اس نظر پہ پلکوں کے چھار ہے ہیں یوں سائے
جھنڈ میں درختوں کے جیسے دھوپ کھو جائے

دل جیے ایسی نظر ہی کے سہارے کب تک
جو توجہ بھی نہیں اور تغافل بھی نہیں

بڑھ گیا دو دلوں میں شاید ربط
گفتگو ہوتی جاتی ہے کم کم

ہونٹ سینے سے سوا سوز نہاں ہوتا ہے
شعلہ دبتا ہے تو کچھ اور دھواں ہوتا ہے

پھولوں سے لدا بستر ظالم کو میسر ہے
اور پھر بھی کسی پہلو آرام نہیں ملتا

دل کی گزری یوں اکثر مصلحت کی دنیا میں
جیسے اپنے پر طائر کھولے اور رہ جائے

وہ نور ہی کیا بلندیوں ہی کو جو فقط زر نگار کر دے
جمالِ خورشید کی حقیقت شعاعِ ذرہ نواز میں ہے

وادیٔ نور بنے گی یہی شعلوں کی زمیں
ابھی مٹی کے فرشتے سے میں مایوس نہیں

جب کبھی امن کی انساں نے قسم کھائی ہے
لب ابلیس پہ ہلکی سی ہنسی آئی ہے

یہ دل کیا ہے کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا
تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی

وہ دور گل رہا نہ رہی وہ ہوائے گل
کانٹوں کی انگلیوں میں ہیں بند قبائے گل

پہلے پانچ اشعار میں حقیقت حسن اور مختلف النوع جمالیاتی کیفیات کی نقش گری کے لیے بصری پیکروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ پیکر ملا کے عاشقانہ جذبات اور محبوب سے ان کے ربط و تعلق کی سطحوں کو اجاگر کرتے ہیں، بعد کے اشعار میں شعلے کے دبنے سے جس طرح دھویں میں اضافہ ہو جاتا ہے اسی طرح ہونٹوں کے سی دینے سے سوز کا فزوں ہو جانا، پھولوں سے لدے بستر پر بھی ظالم کو کسی پہلو آرام نہ آنا، مصلحتوں کے باعث طائر مجبور کی طرح پر کھول کر رہ جانا، بلندیوں کو زر نگار کرنے کے بجائے جمال خورشید کی

حقیقت کا شعاع ذرہ نواز میں پنہاں ہونا، مٹی کے فرشتے یعنی انسان سے مایوس نہ ہونے کی وجہ سے شعلوں کی زمین کے وادیٔ نور میں تبدیل ہونے کی امید کرنا، انسان کے امن کی قسم کھانے پر ابلیس کے ہونٹوں پہ بجلی سی ہنسی کا آنا، دل کو امتحان ظرف انساں کے پیش نظر تن خاکی میں چھپی ہوئی چھوٹی سی چنگاری تصور کرنا اور دور گل اور ہوا کے گل کے بدل جانے پر کانٹوں کی انگلیوں میں بند قبائے گل کا ہونا ایسا بصارت نامہ ہے جو ملا صاحب کے شعری اظہار میں انسان کی مرکزیت کو ظاہر کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کو مظاہر فطرت کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ انسانی مصائب ومسائل، دکھ سکھ، جبر واختیار، مصلحت ومنافقت اور انفرادی واجتماعی حصول ومحرومی کے احساس نے حسی پیکروں کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ان پیکروں کی تشکیل میں رنگ اور روشنی کے محرکات نے خصوصی کردار ادا کیا ہے۔

اس کے علاوہ ملا صاحب کے اشعار میں بکثرت استعمال ہونے والا آنسو کا استعارہ بھی توجہ کا مستحق ہے۔ انھوں نے اپنے احساس وادراک اور تجربات کی بعض جہات کا اظہار اسی استعارے اور اس کے تلازمات کی بنیاد پر صورت پذیر ہونے والے پیکروں میں کیا ہے۔ ان تمام پیکروں میں بھی بصری حس کو متحرک کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔

صبح کی راہیں درخشاں ہیں انھیں کرنوں سے
چشم شاعر میں جو کل رات چمکے آنسو آئے

نظر خموش ہوئی عرض نا تمام کے بعد
کچھ اور کہہ نہ سکے اشکِ بے کلام کے بعد

آنکھیں یونہی نہیں بنی ہیں زباں
کتنے آنسو نظر میں ڈھالے ہیں

کیا جانے کب ٹوٹ جائے یہ تارا
ملا ہے اک اشکِ مژگاں رسیدہ

مریضِ غم کو تسلیوں سے کہیں سوا دے رہا ہے تسکیں
وہ اک چمکتا ہوا سا آنسو جو دیدۂ چارہ ساز میں ہے

محولہ بالا اشعار میں شب کو چشم شاعر میں آنے والے آنسوؤں کی کرنوں سے صبح کی راہوں کا درخشاں ہونا، عرضِ ناتمام کے بعد نظر کے خاموش ہو جانے پر اشک بے کلام کا عرضِ حال کر دینا۔ نظر میں بے شمار اشکوں کے ڈھلنے سے آنکھوں کا زبان بن جانا، شاعر کا خود کو اشک مژگاں رسیدہ تصور کر کے تارے کی طرح ٹوٹ جانے کی بات کرنا اور دیدۂ چارہ ساز میں چمکتے ہوئے آنسو کا مریض غم کے لیے تسلیوں سے بھی کہیں زیادہ باعث تسکین ہونا ایسا مجازی شعری بیان ہے جو ان کی شخصی واردات اور محبت کے جذبات کو آنسو کے استعارے اور اس کے انسلاکات کی مدد سے تصویر کرتا ہے۔ یہ شعری تصویریں شاعر اور اس کے محبوب کے مابین ربط و تعلق کی نوعیت اور نفسیاتی وفور کی عکاسی کرتی ہیں۔

آنند نرائن ملا کا ذہن حسن و عشق کی محدود فضا سے آگے بھی بڑھتا ہے اور زندگی کے گوناگوں مصائب و مسائل کو بھی اپنی گرفت میں لیتا ہے لیکن جذبے کی گہرائی، خیال کی رفعت اور اظہار کی تہہ داری کے بجائے احساس کی شدت ان کے یہاں تجربے کی اساس بنتی ہے۔ اسی لیے ان کے پیکروں میں وہ تخلیقی رمزیت اور پیچیدگی نہیں ہے جو استعارے وعلامت کے پرپیچ عمل اور تجربے کے وسیع و عمیق ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسری اہم بات جو ان کی پیکر تراشی کے یک رخے پن کو ظاہر کرتی ہے وہ یہ کہ انھوں نے محض بصری پیکر تراشی پر اکتفا کیا ہے۔ بصارت کے علاوہ دیگر حواس انسانی کو متاثر و متحرک کرنے کا عمل ان کے یہاں تقریباً ناپید ہے۔ لیکن آخر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آنند نرائن ملا نے واردات ذات اور مسائل حیات کو غزل کے روپ میں نہایت فنکارانہ پختگی اور روایتی پرکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محبوب کے جلووں میں زندگی کے مختلف رنگوں کو دیکھنا، بنی نوع انسان سے بے پناہ محبت کرنا، زیست کے مثبت اور عملی پہلو پر زور دینا، نظریات کا آئینے کی طرح واضح ہونا اور ان سے پوری ایمانداری کے ساتھ وابستہ رہنا نیز ناانصافی اور ریاکاری کے خلاف کھرے اور سخت ردِ عمل کا اظہار کرنا ان کی غزل کا مخصوص مزاج رہا ہے۔ چنانچہ ملا صاحب کے بصری پیکر تشبیہی شفافیت کے باوجود بھی ان کی شاعرانہ حق گوئی اور جمالیاتی فکر کی تخلیقی پیشکش میں معاون رہے ہیں نیز ان کے شعری تجربات کے دلکش نقوش ذہن و دل پر ثبت کرتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۰-۱۴ گورپار منشنس
پٹ پڑ گنج۔ ۱۱۰۰۹۲

راج نارائن راز کی یاد میں

اب تو ایک معمول سا بن گیا ہے کہ ادھر حیدرآباد میں ہمارا کوئی دوست دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو جواباً ادھر دلی میں بھی ہمارا کوئی دوست اس دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے ان دونوں شہروں میں ہمارے دوستوں کی تعداد کو کم کرنے اور یوں خود ہمارے عرصۂ حیات کو تنگ کرنے کا کوئی مقابلہ شروع کر رکھا ہے۔ وقار خلیل کے انتقال کی خبر "سیاست" کے جس شمارے میں چھپی تھی وہ ہمیں ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے پورے آٹھ دنوں بعد ملا۔ اخبار میں وقار خلیل کی تصویر نظر آئی تو دل دھک سا رہ گیا۔ جو لوگ لمبے عرصے سے ادب میں سرگرم عمل ہیں ان کی تصویریں ان کی تخلیقات کے ساتھ ذرا کم ہی چھپتی ہیں۔ البتہ ان کی تصویر اسی وقت چھپتی ہے جب وہ ہمیشہ کے لیے ادب اور دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ چنانچہ خبر پڑھی تو پتہ چلا کہ وقار خلیل بھی اپنا دامن جھاڑ کر دنیا سے نکل گئے۔ وقار خلیل کو برسوں پہلے جس حالت میں دیکھا تھا اسی حالت میں انھیں پانچ چھ مہینے پہلے بھی دیکھا تھا۔ مخلص، بے لوث، محنتی، منکسر المزاج، سنجیدہ، بردبار اور خوددار۔ ہمیں ان کی باتیں یاد آ ہی رہی تھیں کہ ہمارے دوست امیر قزلباش کا فون آیا کہ ہمارے دوست راج نارائن راز کا ۱۶ر نومبر کو امریکہ میں انتقال ہو گیا جہاں وہ اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے دو دن پہلے ہی دلی سے گئے تھے۔ کیسے بتائیں کہ ان دونوں دوستوں کے گزر جانے کی اطلاع نے دل کو کتنا ملول کیا۔ اب ہم عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ایک طرف تو نئے دوستوں کی گنجائش کم سے کم نکلنے لگی ہے اور دوسری طرف پرانے دوست ہیں کہ ہاتھ سے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے دوست حیات لکھنوی کا ایک سیدھا سادا سا شعر ہے۔

وہ گئے، ہائے کہ جتنے بھی ہمیں پیارے ہیں
اب نیا دوست کوئی ہم تو بنانے سے رہے

راج نارائن راز سینیارٹی کے اعتبار سے ہمارے دہلی کے اولین دوستوں میں سے تھے۔ کمار پاشی ہمارے پہلے دوست تھے اور راج نارائن دوسرے نمبر کے دوست تھے۔ دہلی آنے کے دو تین دن بعد ہی ہماری ملاقات راج نارائن راز سے شاستری بھون میں ہو گئی تھی جہاں ہم دونوں کام کرتے تھے۔ وہ وزارت اطلاعات میں علی جواد زیدی سے منسلک تھے اور اگرچہ ہم تھے تو وزارت تعلیم میں لیکن ہمارا سرکاری سروکار بھی علی جواد زیدی سے تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ علی جواد زیدی کے کمرے میں ہی ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ہم نئے نئے دہلی آئے تھے لہذا ہماری غریب الوطنی اور مفلوک الحالی کے پیش نظر راج نارائن نے ہم سے کہا" میاں! کل سے تم دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ہی کھالیا کرنا۔ جہاں میں اپنے لیے دو چپاتیاں لاتا ہوں وہیں تمھارے لیے بھی دو چپاتیاں آجائیں گی۔" ہم نے کہا" گھر میں تو تین چپاتیاں کھاتا ہوں۔" بولے" اوہو! تو تین چپاتیاں آجائیں گی۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔" ہم نے تو یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن راج نارائن سنجیدہ ہو گئے اور ہمارے لیے کھانا لانے لگے۔ ہم نے انھیں لاکھ منع کیا کہ وہ یہ تکلیف نہ کریں لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ چنانچہ ہم اکثر دیر سے ان کے کمرے میں پہنچتے تھے تو وہ ہمارے انتظار میں اپنا ہاتھ روکے بیٹھا کرتے تھے۔ ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا تھا اور ہم کسی نہ کسی بہانے کھانے کی اس پابندی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور ایک دن ہمیں یہ بہانہ ہاتھ آگیا۔ دو مہینوں تک ان کے ساتھ کھانا کھا چکے تو ایک دن راج نارائن راز نے کہا" میاں مجتبیٰ! آج ہم تمھیں اپنی تازہ غزل سناتے ہیں جو کل رات ہی ہوئی ہے۔" انھوں نے غزل سنائی۔ بہت اچھی تھی اور ہم نے داد بھی بہت دی۔ اس کے بعد ہم اچانک سنجیدہ ہو گئے تو راج نارائن نے پوچھا" کیا بات ہے۔ تم اچانک سنجیدہ کیوں ہو گئے؟" ہم نے کہا "راز صاحب! میں کل سے آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گا۔" پوچھا" وہ کیوں؟۔" ہم نے کہا" بات دراصل یہ ہے کہ دو مہینوں سے آپ کا نمک کھا رہا ہوں اور آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ نمک کتنی بری چیز ہے۔ یہ اتنی بری چیز ہے کہ مجھے آپ کے شعر بھی اچھے لگنے لگے ہیں۔ میں اپنی ادبی دیانت داری کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔" اس پر وہ ہنسنے لگے۔ حالانکہ وہ ہنستے بہت کم تھے۔

راج نارائن پستہ قد تھے۔ اوپر سے شخصیت بھی چھوٹی موٹی سی تھی۔ آواز بھی اتنی باریک اور منحنی سی تھی کہ اگر وہ برابر والے کمرہ میں بول رہے ہوں تو لگتا تھا کوئی خاتون باتیں کر رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جس دفتر سے بھی وابستہ رہے وہاں ان کے ماتحتین ان کے

رعب ودبدبہ سے خوفزدہ ہی رہے۔ ہم اکثر کہا کرتے تھے کہ ایسی چھوٹی موٹی سی شخصیت کی مدد سے ایسا گفتار عب اور دبدبہ پیدا کرنا آدمی کے بس کی بات نہیں، سائنس کا کمال تو ہو سکتا ہے۔ ان کے بیشتر دوست بھی ان سے بہت محتاط اور خائف رہتے تھے۔ جھٹ خفا تو تھے ہی۔ اپنے مزاج کے خلاف کسی بات کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ سنجیدگی، بردباری اور متانت کے معاملہ میں وہ فرشتوں کو بھی شرماتے تھے، ہم غالباً ان کے اکیلے دوست تھے جسے انھوں نے اپنے ساتھ مذاق کرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ (پتہ نہیں کیوں)۔ ایک بار ہم نے ان کے گھر فون کیا۔ راج نارائن نے جیسے ہی فون کا ریسور اٹھا کر اپنی نسوانی آواز میں "ہیلو" کہا۔ ہم نے کہا "بھابی! ذرا راز صاحب سے بات کرادیجیے۔" ہماری آواز کو پہچان کر بولے۔ "میاں مجتبیٰ! کیا میں نہیں پہچانتا کہ ایسی بیہودہ شرارت کون کر سکتا ہے۔" دوسرے دن خود ہی دوستوں کو شکایت کے لہجہ میں یہ واقعہ سنایا۔ جب ایک دوست اسے سن کر ہنسنے لگا تو اس سے ناراض ہو گئے۔ دیکھا جائے تو انھیں ہم سے ناراض ہونا چاہیے تھا مگر وہ خواہ مخواہ ایک معصوم دوست سے ناراض ہو گئے۔ یہ بھی ان کا ایک اسٹائل تھا۔ یہ سچ بھی ہے کہ لوگوں نے ان کے ہونٹوں پر ہنسی کم ہی دیکھی۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ غلطی سے کسی بات پر مسکرا دیتے تو ہنسی ان کے ہونٹوں پر نہیں بلکہ ان کی مونچھوں پر صاف دکھائی دیتی تھی۔ یہ ہمارا مشاہدہ تھا اور ایک بار ہم نے اس مشاہدے کا ذکر ان سے کیا تو بولے "مجھے حیرت ہے کہ کبھی کبھی تم کیسی نان سنس (Non Sense) باتیں کرتے ہو" (حالانکہ ہماری صحبت میں وہ ایسی نان سنس باتوں کو پسند کرنے لگے تھے) جب وہ ماہنامہ "آج کل" کے ایڈیٹر بنے تو ان میں اور بھی سنجیدگی آ گئی "یوں بھی وہ جوش ملیح آبادی کے جانشین بن گئے تھے۔ اسی کرسی پر بیٹھتے تھے جس پر کبھی جوش ملیح آبادی بیٹھا کرتے تھے۔ جوش صاحب کی یہ کرسی ان کے تن و توش اور جسامت کے اعتبار سے بنائی گئی تھی۔ مخنی سے راج نارائن جب اس کرسی پر بیٹھتے تو کرسی کا بیشتر حصہ خالی ہی رہ جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کرسی پر نہیں بلکہ چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ (آج کل کے موجودہ مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی نے اس کرسی کو اب ہٹا کر ایک کونہ میں رکھ دیا ہے۔ یوں بھی ہر کس و ناکس اس کرسی پر بیٹھنے کا اہل تھوڑا ہی ہو سکتا ہے) راج نارائن بے حد محنتی آدمی تھے۔ کام کرنے کی لگن اور جذبے سے بھرپور۔ انھوں نے "آج کل" کے کئی ایسے یادگار نمبر نکالے جو شاید جوش ملیح آبادی بھی مرتب نہیں کر سکتے تھے۔ مضامین کے انتخاب کے معاملہ میں وہ بہت سخت گیر تھے (غالباً یہی وجہ ہے کہ ہماری کوئی تحریر ان کے دور ادارت میں میں آج کل میں شائع نہ ہو سکی) اردو کے کلاسکی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ نثر بھی بہت

اچھی لکھتے تھے۔ اچھے شاعر تو وہ تھے ہی۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے ان کے ماتحتین ان سے بے حد گھبراتے تھے۔ البتہ ان کے منہ بولی بیٹی مدیرہ عثمانی کے کام سے جو ان کی اسسٹنٹ بھی تھی، بہت خوش رہا کرتے تھے۔ بات بات پر بیٹی مدیرہ، بیٹی مدیرہ کی رٹ لگائے رہتے تھے۔ (مدیرہ عثمانی کے ذریعہ ہی اردو والوں کو امریکہ میں ان کے انتقال کی خبر ملی ایک دن ہم نے کہا" راز صاحب! آپ ہمیں اور تو کچھ نہیں بنا سکتے۔ ہمیں کم از کم اپنا منہ بولا مداح ہی بنا لیجیے۔" منہ بنا کر بولے "یہ منہ بولا مداح کیا ہوتا ہے؟" ہم نے کہا" جیسے آپ ہمارے منہ بولے شاعر ہیں۔" منہ پھیر کر بولے" نان سنس" راز صاحب نے بہت اچھے شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ مشاعروں میں کم ہی جاتے تھے۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے "چاندنی اسارہ کی"، "لذت لفظوں کی" اور" دھنک احساس کی" شائع ہو چکے ہیں۔ شعر فہمی کے معاملہ میں ہماری بے بضاعتی سے واقف ہونے کے باوجود ہمیں اپنے شعری مجموعوں سے ضرور نوازتے تھے۔ جب انھوں نے اپنا تیسرا مجموعہ "دھنک احساس کی" ہمیں دیا تو ہم نے کہا" راز صاحب! ہر شاعر کی شاعری میں ایک کلیدی لفظ (Key Word) ہوتا ہے۔ اتفاق سے آپ کی شاعری کا "کی ورڈ" "کی" ہے۔"

پوچھا" وہ کیسے؟"

ہم نے کہا" آپ خود دیکھ لیجیے۔ آپ کے ہر شعری مجموعہ کا نام "کی" پر ختم ہوتا ہے۔ جیسے "چاندنی اسارہ کی"۔ "لذت لفظوں کی" اور "دھنک احساس کی" بلکہ اس کے آگے ڈیش (Dashes) لگا دیں تو کوئی گالی بھی بن سکتی ہے۔"

منہ پھیر کر بولے" نان سنس"۔

ہمیں ان کا نان سنس کہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ہمارے ایسے دوست تو بہت سے ہیں جن سے ہم بے تکا مذاق بھی کر لیتے ہیں لیکن اب ایسا کوئی دوست اس دنیا میں باقی نہیں رہا جس سے مذاق کرنے کی کوئی دوسرا شخص ہمت نہیں کر سکتا تھا مگر ہم کر لیتے تھے۔ یہ ایک ایسا ناقابل تلافی نقصان ہے جس کی کمی ہمیں ہمیشہ شدت سے محسوس ہوتی رہے گی۔ راج نارائن ہم سے عمر میں پانچ چھ برس بڑے تھے۔ لیکن ملتے تو برابری کا درجہ دیتے تھے۔ بے حد مخلص، شریف، وضعدار اور محبت والے آدمی تھے جس سے محبت کرتے تھے اس کے لیے سات خون بھی معاف کر دیتے تھے۔ ان کی پیدائش بلوچستان میں ہوئی تھی اسی لیے اپنی پسند ناپسند کے معاملہ میں بلوچیوں کا سا رویہ رکھتے تھے بعض اشخاص سے ناراض رہے تو زندگی بھر ناراض ہی رہے کبھی مصالحت نہیں کی۔ وہ سانچے اب ٹوٹ گئے ہیں جن سے راج نارائن راز جیسے لوگ بن کر نکلا کرتے تھے۔

رفعت صدیقی
فلیٹ نمبر ۱۰۳، بی بلاک
پریمیر انکلیو، ہمایوں نگر، حیدر آباد

سردار الہام۔ ایک ہمہ پہلو شخصیت

جناب سردار الہام ۲۰ر ستمبر ۹۸ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ چند مہینوں سے علیل تھے۔ علاج بھی ہوتا رہا۔ کئی ہسپتالوں میں شریک رہے لیکن ان کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ بہر حال قضاء و قدر کے معاملوں سے مفر کیسے ممکن ہے۔

اک مسافر کے سفر جیسی ہے ساری دنیا
کوئی جلدی تو کوئی دیر میں جانے والا

الہام صاحب نے، بڑے Low-Profile انداز میں اپنی زندگی گزاری اور اسی Low-Profile انداز میں اس دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔ ان کے کئی دوستوں اور بہی خواہوں تک کو ان کی علالت کا پتہ نہیں تھا۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ ان کی رحلت سے بھی، حیدر آباد کے ادبی و ثقافتی حلقوں میں ذرا سی بھی ہلچل پیدا نہیں ہوئی بقول عزیز قیسی۔

نہ شمع کانپی، نہ گیت ڈوبے، اٹھے جو ہم تیری انجمن سے
چلو بس اچھا ہوا کہ ایسے کہاں کے محفل فروز تھے ہم

حقیقت تو یہ ہے کہ الہام صاحب نے کئی جہتوں میں اپنی گوناگوں تخلیقی صلاحیتوں کے، بے حد گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور جیتے جی انھوں نے کبھی اپنے کارناموں کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔

وہ نہ صرف ایک ممتاز اور صاحب طرز ترقی پسند شاعر تھے بلکہ ایک اعلا درجہ کے صحافی، بلند پایہ ادیب، معتبر فلمی مصنف اور ہدایتکار، ایڈیٹر بلٹز کا سفر رہے ہیں لیکن وہ طبعاً

اتنے منکسر المزاج تھے کہ کبھی انھوں نے اپنے آپ کو Project نہیں کیا۔ ان کی زندگی اور فن کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی کہا، دل و جان سے کہا اور اپنی کاوشوں کی، اپنے خون جگر سے آبیاری کی ہے۔

سردار الہام، بنیادی طور پر شاعر تھے۔ کلاسیکل اردو شاعری کا انھوں نے مطالعہ کیا تھا، پھر بھی انھوں نے شعر کہنے کے معاملے میں، روایتی شاعری سے گریز کیا۔ ۱۹۴۵ء کے بعد، ابھرنے والے ان پر جوش اور جدت پسند شعراء کے گروہ میں، جن میں، سلیمان اریب، نذر حیدر آبادی، شاہد صدیقی، لطیف ساجد وغیرہ شامل تھے اور جس گروہ کے سر خیل، مخدوم محی الدین تھے، سردار الہام نے اپنا منفرد مقام بنایا۔ ابتدا میں وہ لمار کسی آئیڈیا لوجی سے بے حد متاثر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہو گئے۔ اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار میں جب انھوں نے تنگنائے غزل میں گھٹن محسوس کی تو انھوں نے نظم کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ اس زمانے میں ان کی پُر جوش نظموں نے ادبی فضا میں ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ حیدر آباد کے ترقی پسند شعرا میں غالباً وہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے بلینک ورس (Blank Verse) میں نظم کہی۔ اس زمانے میں ان کی تخلیقات بے حد نمایاں انداز سے، ہندستان کے معروف رسائل جیسے بھوپال کے "جادہ" اور "افکار" حیدآباد کے "سب رس" آگرے کے "شاعر" اور لاہور کے "نرگس" میں برسوں تک شائع ہوتی رہیں اور ہندستان بھر میں ایک مقبول و معتبر شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس زرخیز دور کے اپنے کلام کا بیشتر حصہ سنبھال کر نہیں رکھا اور یہ رشحات، ان رسائل کے اوراق میں دفن ہو کر رہ گئے۔

اپنی عمر کے آخری برسوں میں ہی، کچھ احباب، (جن میں یہ خاکسار بھی شامل تھا!) کے اصرار پر اپنے مجموعہ کلام کو شائع کرنے پر مائل ہوئے اور نتیجتاً ان کا ایک مختصر مجموعہ کلام "شعلۂ گل" منظر عام پر آسکا۔

زیادہ تر حیدر آبادیوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سردار الہام نے اپنی طالب علمی کے دوران، حضور نظام کے دور میں، کمیونسٹوں کی تلنگانہ تحریک میں بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔ انہی دنوں میں انھوں نے، سری نواس لاہوٹی مرحوم کی معیت میں کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان "سنگم" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ اسی رسالے کے ایک شمارے

میں تحریر کردہ ان کے ایک اداریے کی بنا پر، ارباب حکومت کا عتاب ان پر نازل ہوا تھا۔ الہام صاحب اتفاقاً بچ گئے لیکن سری نواس لاہوٹی گرفتار ہو گئے اور انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ سردار الہام گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوش ہو گئے اور انھیں اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

۱۹۴۵ء میں جب حیدر آباد میں ترقی پسند تحریک کی پہلی تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی تھی تو الہام صاحب نے مخدوم محی الدین، عابد علی خان، محبوب حسین جگر، سلیمان اریب، شاہد صدیقی وغیرہ کے ہمراہ اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے شب و روز محنت کی۔ وہ مخدوم کی شخصیت اور فن سے بے حد متاثر رہے بلکہ مخدوم سے ان کے تعلق خاطر کو عقیدت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں، وہ کبھی مخدوم یا ان کی شاعری کے بارے میں کوئی ناروا بات سننے کے متحمل نہیں تھے۔

تلنگانہ تحریک کے اختتام اور سقوط حیدر آباد کے بعد الہام صاحب نے اپنی تعلیم کا دوبارہ آغاز کیا اور عثمانیہ یونی ورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ ان کے ہم عصروں میں ڈاکٹر حفیظ قتیل، ہاشم علی اختر، اقبال متین، منوہر راج سکسینہ، اور جہاں دار افسر جیسی معتبر ہستیاں شامل تھیں۔

گریجویشن کی تکمیل کے بعد ہی انھیں ایک فلم "بسیرا" میں نغمے تحریر کرنے کا موقع ملا۔ یہ فلم، حیدر آباد کے شاہی خاندان کی ایک باشعور خاتون پروڈیوس کر رہی تھیں اور اس فلم کی موسیقی، حیدر آباد کے مشہور مغنی۔ ایم۔ اے۔ رؤف ترتیب دے رہے تھے لیکن تکمیل کے بعد یہ فلم باکس آفس پر ناکام ہو گئی۔

سردار الہام اپنی طالب علمی کے دور میں ہی صحافت سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز "روزنامہ" صبح دکن" سے ہوا۔ بعد میں جب اختر حسن صاحب نے قاضی عبدالغفار سے ان کے مشہور روزنامے "پیام" کی ملکیت اور ادارت حاصل کی تو الہام صاحب "پیام" میں کام کرنے لگے۔ ان کے ساتھیوں میں معروف صحافی، احسن علی مرزا بھی تھے۔ "پیام" سخت مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا اس لیے جلد ہی اس کی اشاعت موقوف ہو گئی۔ سردار الہام نے پھر سوامی رامانند تیر تھ کے ایک اردو رسالے "نئی زندگی" سے وابستگی اختیار کر لی۔

فلم "بسیرا" کی شوٹنگ کے دوران سردار الہام اکثر بمبئی جایا کرتے تھے۔ جب

"بمبیرا" ناکام ہوئی تو انھوں نے بمبئی کے مشہور روزنامے "انقلاب" میں کام کرنا منظور کر لیا۔ دو برس تک وہ "انقلاب" میں سب اڈیٹر کی حیثیت سے بڑی تندہی سے کام کرتے رہے۔ "انقلاب" جس کے مدیر اعلا عبدالحمید انصاری تھے، یو۔پی سے تعلق رکھتے تھے اور انقلاب روزنامے کے عملے میں بھی، زیادہ تر یو۔پی کے صحافی تھے جنھیں اپنی اردو دانی پر بڑا ناز تھا۔ الہام صاحب چونکہ حیدرآبادی تھے اس لیے ان کی اردو دانی کے بارے میں ابتدا میں یہ لوگ کچھ ذہنی تحفظات رکھتے تھے لیکن جلد ہی الہام صاحب نے اپنی قابلیت، محنت اور فرض شناسی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ وہ انصاری صاحب کے منظور نظر بن گئے اور انھوں نے الہام صاحب کو انقلاب پبلیکیشنز کے شام نامے "شام" کی ادارت سپرد کر دی۔ اس منصب کو انھوں نے چار سال تک خوبی سے نبھایا اور "شام" نے بمبئی کی صحافتی دنیا میں بڑا نام کمایا۔

"شام" کی ادارت سے سبکدوشی کے بعد، سردار الہام نے ایک بالکل ہی نئی ڈگر کی راہ لی۔ یہ تھی۔ کمرشیل ریڈیو پبلیسٹی۔ مشہور براڈکاسٹر امین سیانی نے جو ریڈیو سیلون (آب ریڈیو سری لنکا) کے تجارتی شعبے کے لیے کئی پروگرام بناتے اور پیش کرتے تھے۔ بحیثیت ادیب اور شاعر ان کی صلاحیتوں کو پہچانا۔ امین سیانی کی مادری زبان گجراتی تھی اور وہ عام طور پر انگریزی میں ہی پروگرام لکھا کرتے تھے۔ فلموں کی زبان پر اردو کا غلبہ تھا اسی لیے امین سیانی نے اپنے پروگراموں کے اسکرپٹ لکھوانے کے لیے سردار الہام کی خدمات حاصل کیں۔ ریڈیو سیلون چونکہ ایک تجارتی ہندی سروس چلا رہا تھا اس لیے تجارتی اشیا اور بعد میں فلموں کی پبلیسٹی بھی تجارتی بنیاد پر کی جاتی تھی۔ پبلیسٹی کے لیے ریڈیو اسپاٹس (Radio Spots) اور ریڈیو جنگلس (Radio Jingles) بنائے جاتے تھے جن کے لیے موزوں "پرکشش اور معنی خیز جملے اور گیت لکھے جاتے تھے۔ یہ بذات خود ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کام کو کئی برس تک الہام صاحب نے بڑی محنت اور مہارت سے انجام دیا اور بڑا نام کمایا۔ امین سیانی کے بعد وہ ایک اور مشہور، ریڈیو براڈکاسٹر، حسن رضوی کے ساتھ کام کرنے لگے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۸۰ء تک، الہام صاحب نے بے شمار، اسپاٹس اور جنگلس (Jingles) ریڈیو کے لیے لکھے اور کئی فلموں جیسے "مدر انڈیا" دل اپنا اور پریت پرائی "سن آف انڈیا" "پاکیزہ" "پالکی" وغیرہ کے مؤثر اور کامیاب پبلیسٹی اسکرپٹ لکھے جو ریڈیو کی دنیا میں دھوم مچاتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے کچھ اردو ناول بھی تحریر کیے جیسے۔ "بھیگی پلکیں" "بہاروں سے پہلے" وغیرہ۔ ان کا تحریر کردہ ایک ناول "آنچلوں کے

سائے" کے لاہور سے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی ہوئی روسی کہانیوں کا انگریزی سے اردو میں بڑا کامیاب ترجمہ بھی کیا جو اقتدار ہی کی شکل میں "سرخ پرچم تلے" کے عنوان سے چھپا تھا۔

اس دوران میں انھیں کئی فلموں کی کہانی منظرنامہ اور مکالمے لکھنے کے آفر ملے۔ انھوں نے کافی کام بھی کیا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے یہ فلمیں یا تو مکمل نہ ہو پائیں یا ریلیز نہ ہو سکیں۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس وشرام بیڈیکر کی فلم "رستم سہراب" انھیں آفر کی گئی۔ اس فلم میں پرتھوی راج کپور، ثریا، پریم ناتھ اور ممتاز نے اداکاری کی تھی۔ اس فلم کے پُر زور مکالمے، سردار الہام نے لکھے تھے۔ ان مکالموں کی برجستگی اور خوبصورتی کی فلمی حلقوں میں بڑی تعریف ہوئی تھی۔ دراصل اس فلم کے گیت بھی جن کی دھنیں مشہور موسیقار سجاد حسین نے بنائی تھیں، الہام صاحب ہی لکھنے والے تھے لیکن جب انھیں پتہ چلا کہ جان نثار اختر بھی اس فلم کے گانے تحریر کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

فلمی دنیا کے بحرِ بے کنار میں تیس برسوں تک تھپیڑے کھانے کے بعد سردار الہام صاحب نے اپنے وطنِ عزیز میں پھر سے بس جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنے خاندان کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل کریں اور ایک پُرسکون زندگی گزار سکیں لیکن حیدر آباد آنے کے چند ہی مہینوں کے بعد حیدر آباد سے شائع ہونے والے فلمی و ادبی رسالے "فلمی تصویر" کی ادارت کی انھیں پیش کش کی گئی جو کسی قدر تامل کے ساتھ انھوں نے قبول کر لی۔ اس قبیل کے کسی بھی رسالے کی ادارت کے لیے سردار الہام سے بہتر شاید ہی کوئی اور شخصیت مل سکتی تھی کیونکہ وہ نہ صرف ایک معتبر شاعر و ادیب تھے بلکہ فلمی بحرِ ذخار کے دیرینہ غواص بھی تھے۔ الہام صاحب کے ذہن میں "فلمی تصویر" کو مشہور رسالے "شمع" کے طور پر فلم اور ادب کا ایک خوبصورت امتزاج بنا کے پیش کرنے کے لیے ڈھیر ساری تجاویز اور منصوبے تھے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد انھیں یہ ناگوار احساس ہونے لگا کہ "فلمی تصویر" کے مالکین محض اپنی سستی شہرت کے خواہش مند ہیں اور اپنے رسالے میں سطحی، سنسنی خیز اور من گھڑت فلمی اسکینڈلوں سے ہٹ کر کوئی معیاری مواد کو جگہ دینا نہیں چاہتے۔ اگر الہام صاحب ابن الوقت ہوتے تو مالکین کی ہاں میں ہاں ملا کر، جیسے تیسے مدیر بنے رہتے لیکن اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کرنا ان کے خمیر میں نہیں تھا۔ اس لیے

انھوں نے "فلمی تصویر" سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ "فلمی تصویر" کا بعد میں جو کچھ حشر ہوا۔ اس سے لوگ بخوبی واقف ہیں۔

سردار الہام نے بعد میں اپنے آپ کو معروف رکھنے کے لیے اپنی ذاتی ایڈورٹائزنگ ایجنسی "ایلیا ایڈورٹائزنگ" کا آغاز کیا جس کے ذریعے وہ محدود طور پر ریڈیو اسپاٹس اور جنگلس اور اشتہاری فلمیں بناتے رہے اور اخباروں میں پبلیسٹی کا کام بھی کرتے رہے۔

جیسا کہ میں نے قبل ازیں تذکرہ کیا ہے کہ سردار الہام بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اسی لیے ان کی شخصیت میں اردو شاعری کا رچاؤ بسا ہوا تھا۔ خود داری، کم گفتاری اور وضعداری ان کے بنیادی وصف تھے۔ جن لوگوں نے ان کا کلام پڑھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ بڑے قادرالکلام شاعر تھے اور ان کی شاعری شدت احساس سے مملو ہے۔ ان کا اسلوب بھی منفرد تھا۔ وہ شاعروں میں اقبال، انیس، جوش، فیض اور مخدوم سے متاثر تھے۔ گو ان کا خمیر ترقی پسند تحریک سے اٹھا تھا لیکن وہ ادب و شاعری میں جدیدیت کے مخالف نہیں تھے در حقیقت وہ جدیدیت کو ترقی پسند تحریک کا ہی تسلسل گردانتے تھے۔ لیکن جدیدیت کے عنوان سے تجریدیت اور بے معنی الفاظی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس مضمون میں ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ نہ تو ممکن ہے اور نہ میرا مقصد۔ یہ کام اردو ادب و شاعری کے نقادوں کا ہے۔

اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ بمبئی کی فلمی دنیا میں گزارنے کے باوجود، سردار الہام صاحب نہ تو فلمی ماحول کی زبردست چکاچوند اور گلیمر (Glamour) سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اس بناوٹی طور طریق کو اپنایا جو زیادہ تر فلمی شخصیتوں کا عادت ثانی بن جاتا ہے۔ فلمی دنیا کی Rat Race سے وہ ہمیشہ دور رہے۔ کام حاصل کرنے کے لیے اپنی شخصیت کو Push کرنا انھوں نے کبھی سیکھا ہی نہیں۔ یہی شاید ان کے اپنے کیریئر میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرنے کی ایک وجہ ہو۔ فلمی دنیا کا ادنا سے ادنا فنکار بھی اپنے نام نہاد کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہے لیکن الہام صاحب ان باتوں سے دور رہے۔ فلمی دنیا کے بہترین فن کاروں، ادیبوں اور شاعروں سے ان کے بڑے پر خلوص تعلقات رہے ہیں لیکن کبھی بھی ذاتی تعلقات کو Cash کروانے کا خیال ان کے دل میں نہ آیا۔ کام، نام اور شہرت کے حصول کے لیے نیچے اتر آنا اور اپنے اصولوں سے سمجھوتہ

کرنا، ان کی فطرت سے بعید تھا۔ ان کی یادداشت غیر معمولی تھی اور ان کے دماغ کے نہاں خانے میں ماضی کے بے شمار تجربوں اور ہر طرح کی شخصیتوں کے بارے میں واقعات کا ایک ایسا خزانہ پوشیدہ تھا جس کی کبھی کبھی صرف جھلک نظر آجاتی تھی۔ اگر وہ ان تمام واقعات اور تجربوں کو ضبط تحریر میں لے آتے تو یہ باشعور لوگوں کے لیے ایک انمول تحفہ ثابت ہوتا۔ میں نے کئی بار ان سے گزارش کی تھی کہ وہ اپنے Memoirs تحریر کرنے کی جانب سنجیدگی سے توجہ کریں لیکن اپنی فطری انکساری اور بے نیازی کے سبب شاید وہ یہ اہم کام سرانجام نہ دے سکے جبکہ بے شمار افراد نے جنگی زندگی Un-eventful ساری ہے بڑے دھڑلے سے اپنی خودنوشت چھپوالی ہیں۔

بہرحال سردار الہام صاحب کی رحلت سے یہ دنیا ایک وضعدار اور شریف النفس انسان اور ایک ہمہ پہلو شخصیت سے محروم ہوگئی ہے۔ اور میں نے ایک مہربان و مشفق بزرگ کھودیا ہے ع

جانے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

قیوم راہی
بی۔ ۹ گلشن زبیدہ۔ ایف ایل۔ ۳ بلاک "تونی"
نمبر ۴ ناظم آباد، کراچی

راندۂ درگاہ

عشرت کے لیے تو جیسے ساری کائنات رنگ و نور سے خالی ہو گئی ہو اور ہر طرف اداسیاں سسکیاں بھرتی پھر رہی ہوں۔

صبح سے اپنے کمرے میں منہ لپیٹے پڑی تھی۔ روتے روتے آنکھیں لال ہو گئی تھیں اس کی، حالانکہ بڑی بیٹی حسینہ اور دونوں بیٹے طرح طرح سے سمجھا کر دلاسے دے دے کر صبر کی تلقین کرتے رہے تھے۔ اس کے شوہر مراد نے نہ جانے کیوں چھوٹی بیٹی نوشابہ کی اس گری ہوئی حرکت بلکہ رسوا کن بغاوت پر کسی گھن گرج کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ جیسے بپھری ہوئی موجیں کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی ہوں۔

حسینہ اور اس کے بھائی ماں کو اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور عشرت کبھی آنکھیں میچ لیتی تو کبھی سرد آہیں بھر کر کفِ افسوس ملنے لگتی۔ یکایک وہ ایک اضطراری کیفیت میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر برآمدے میں جا کر دیوار پر لگے واش بیسن کے اوپر آویزاں آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ خشک کھچڑی بال الجھے الجھے سے، چہرہ زردی مائل کمہلایا ہوا سا، اور آنکھیں بے نور سی، کتنی جلدی بوڑھی لگنے لگی تھی وہ، حالانکہ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ پنتالیس برس کی عمر کو بڑھاپے کا نام تو ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔

پہلے ماں باپ، بہن بھائیوں سے بچھڑنے کا غم۔ پھر جیسے رگ رگ میں نفرت کا زہر اتر گیا ہو۔ برسوں ایک جنون، ایک پاگل پن کی سی حالت اور اب نوشابہ نے بھی دہلیز پار کر لی۔ وہ مسلسل سوچ کے تابوت میں بند تھی۔ اس طرح بدحواس ہو رہی تھی جیسے اس دکھ کو سہار نہ پا رہی ہو۔ سہمی ہوئی کمزور عورت۔

پچیس برس قبل ایک پُر فضا چمکیلی صبح کو مراد کے لیے اس نے بھی اپنے گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ اور اس پر اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے تھے۔ انا کی مضبوط کیلوں سے۔

[illegible] میکے والوں سے [illegible] تو اس نے بھائی کو ایک خط لکھا جس میں سب سے ملنے کی تڑپ کا اظہار کیا گیا تھا۔ بعد میں اپنی ساس خورشید بیگم کی ہدایت کے مطابق دوسرے خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ اپنی پسند کی شادی کر کے اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور ایسا کرنے کا اُسے حق حاصل تھا۔ لیکن جب یہ دونوں خط صدا بہ صحرا ثابت ہوئے تو ایک دن وہ بھائی کے دفتر پہنچ گئی لیکن بھائی نے اسے نظر بھر کے دیکھنا تک گوارہ نہیں کیا بلکہ بڑی درشتی کے ساتھ آئندہ ملنے سے منع کر دیا، بلکہ ایک طرح سے دھتکارنے کی بعد یہ کہہ دیا کہ وہاں سب کے لیے مر چکی ہے۔

اتنی کوئی بھی کیل وہ اکھاڑ نہ سکی۔ پھر کوئی دروازہ بھلا کیسے کھلتا۔

خورشید بیگم کو جب اس بات کا علم ہوا اس نے ایک بار پھر جلتی پر تیل ڈال دیا۔ عشرت کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ رخساروں کو چوما اور کہا "میری بچی دل تھوڑا مت کر۔ وہ تو خود تجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ تو نے تو ان کی مشکل آسان کر دی۔ توبہ توبہ "خورشید بیگم نے اپنے کان پکڑ لیے "ایسے ماں باپ نہ کہیں دیکھے نہ سنے۔ ارے تو انھیں بھاتی ہی کب تھی۔ ان کی چہیتی تو بڑی بیٹی ہے بڑی بیٹی جس کی شادی انھوں نے اتنی دھوم دھام سے کی تھی کہ خالی ہو کر رہ گئے تھے۔ تیری شادی کے لیے ان کے پاس بچا ہی کیا تھا۔ اب دیکھ محلے ہی میں دیکھ لے۔ رخشی نے ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کر لی۔ کیا ہوا۔ چند ہی مہینوں میں ماں باپ اس کی جدائی کے غم میں تڑپ اُٹھے۔ بیٹی داماد کو دعوت پر بلایا اور صلح صفائی ہو گئی۔ تو نے بھی تو شادی ہی کی ہے کوئی برا کام تو نہیں کیا۔ تیری کیا درگت بنا ڈالی ہے تیرے گھر والوں نے "خورشید بیگم نے تھوڑے توقف کے بعد گویا اپنے ترکش کا آخری تیر پھینکا "توبہ توبہ۔۔۔ ایسے پتھر دل۔ قطع تعلق کر لیا ہمیشہ کے لیے۔ اپنے جگر کے ٹکڑے سے۔۔۔ سمجھتی کیوں نہیں۔ ظالم ہیں تیرے ماں باپ۔ تیری خوشیوں کے قاتل۔ کبھی بھول کر بھی خبر نہ لی کہ عشرت جیتی ہے یا مر گئی۔"

خورشید بیگم آئے دن کسی نہ کسی مثال، کسی نہ کسی بہانے عشرت کو ورغلاتی اور بھڑکاتی رہتی تھی اور اس کا یہ حربہ خاصا کامیاب رہا۔ کیونکہ پھر عشرت نے بھی مدتوں ان لوگوں کا حال معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تو ان کا ذکر کرنا تک ترک کر چکی تھی۔ گویا بھولا بسرا خواب بن گئے ہوں۔

لیکن ان سب دلائل اور فیصلوں کے باوجود وہ خوف زدہ سی رہنے لگی تھی۔ گھبرائی ہوئی، وحشت زدہ سی۔

خورشید بیگم جو اپنے دو منزلے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی اس منحوس خبر کو سن کر عشرت کو دلاسہ دینے آئی تھی۔ لیکن کہہ کچھ بھی نہ سکی بس وقتے وقتے کے بعد آہیں ہی بھرتی رہی۔ اب کی بار اس گھر میں وہ بہت چپ چپ رہی اور دوسرے ہی دن اپنے مسکن کی طرف لوٹ گئی۔

مراد نے مسلسل خاموشی کے حجرے میں پناہ لے رکھی تھی۔ عشرت اور خاص طور پر اولاد سے یوں منہ چھپائے رہتا تھا جیسے اس سانحے کی ساری ذمے داری اسی پر عائد ہوتی تھی۔ جیسے سارا قصور ہی اس کا ہو۔ سارے کس بل نکل گئے ہوں اس کے۔

عشرت نے واش بیسن کا نلکا کھولا۔ مسلسل رونے کے باعث آنکھیں گدلی سرخی مائل ہو گئی تھیں۔ اس نے ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پھینکے۔ پھر چہرے کو صابن سے دھو کر تولیہ سے خشک کیا۔ بالوں میں کنگھا کیا اور آئینہ دیکھنے لگی۔ وہاں کی عورت اس کی ماں جیسی تھی۔ مشابہت بھی تو خاصی تھی اس کے اور ماں کے چہرے میں، کتنے ہی پل وہ ٹکٹکی باندھے اودھر دیکھتی رہی۔

اپنے کمرے میں گئی اور مسہری پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے پیشانی کو تھام لیا۔ آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر بعد پھر کھول لیں۔

پھر وہ تیزی سے اٹھی۔ الماری سے اس نے پرس نکالا اور چادر اوڑھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں دونوں بیٹے اور بیٹی ایک دوسرے سے بے خبر بیٹھے تھے اپنی اپنی سوچوں کے تہہ خانوں میں اترے ہوئے۔ قدموں کی آہٹ سن کر ماں کو اس حالت میں دیکھا تو حیران رہ گئے۔

"حسینہ بیٹی!"

"جی امی"

"میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہی ہوں۔ تمہارے باپ آئیں تو بتا دینا دو تین گھنٹوں میں لوٹ آؤں گی۔"

"اچھی بات ہے امی۔"

عشرت باوقار انداز میں چلتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔

رکشا اس نے ہوٹل کے قریب رکوالیا اور وہیں اتر گئی۔

رات کا سیاہ دامن پھیل چکا تھا۔ اوپر لاتعداد ستارے تھے چمکتے دمکتے لیکن اس کی قسمت کا ستارہ؟ وہاں کہاں ہے۔؟۔ وہ سوچ کی لہروں پر بہتی رہی۔

چیختی چلاتی ہواؤں کا ایک ریلا آیا اور گزر گیا۔
اس نے آہستہ آہستہ قدم بڑھا دیے۔ مضبوطی سے چادر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ڈانواڈول قدموں کے ساتھ آس پاس سے لاتعلق سی وہ اس گھر کی طرف بڑھ رہی تھی جس کی پیشانی پر پچیس برس پہلے کالک مل کر چلی گئی تھی۔ موڑ مڑنے کے بعد سڑک سنسان تھی اور اس کے دونوں جانب ایستادہ کھمبوں پر جو بلب روشن تھے ان کی روشنی زرد زرد سی تھی۔ کمزور۔ بیمار روشنی
گھر کے قریب پہنچ کر اس نے سینے پر دل کی جگہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کئی لمبے لمبے سانس لیے جیسے کھلی فضا اور سرسراتی ہواؤں میں بھی اس کا دم گھٹا جا رہا ہو۔
گھر کے بے رونق در و دیوار جیسے کسی آسیب میں لپٹے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔
اور وہ ـــــ دم بخود کھڑی تھی۔ قدم آگے بڑھ ہی نہیں رہے تھے۔ ہجر اس کے ڈنک نے جیسے چہرے کا رنگ اڑا دیا ہو ـــ آنکھوں کی کھڑکیوں میں ہلکا ہلکا دھواں سا اٹھ رہا تھا جیسے دل کے آتش دان میں سیلی ہوئی لکڑیاں آہستہ آہستہ جل رہی ہوں۔
اسی حالت میں کتنے سال گزر گئے۔ کتنی ہی صدیاں بیت گئیں۔
یکایک وہ دیوانہ وار آگے بڑھی اور گیٹ کے بلر کو اس نے کچھ اس اندز سے بانہوں میں لے لیا جیسے کسی عزیز ترین ہستی سے لپٹ رہی ہو۔ "معاف کردو مجھے ـــ معاف کردو" ایک لرزتی ہوئی رندھی ہوئی سی آواز اس کے لبوں سے نکلی اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔
ایک دم پسینے میں شرابور ہو گئی وہ۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اس طرح جیسے نگاہیں دھندلا گئی ہوں۔
پھر وہ لڑکھڑا کر دھڑام سے سیمنٹ کے فرش پر گری اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔

انجمن عظامد
۲۳۔ خوتی مسجد بھوپال

کمیشن

ساری زندگی گزر گئی کمیشن ٹکٹ سے فیض اٹھاتے۔ طالب علمی کا سنہرا دور، اس رعایت سے فائدہ اٹھانا اپنا پیدائشی حق جانتے تھے۔ سینما دیکھتے، آئیڈنٹٹی کارڈ بڑا کام آتا۔ لمبے لمبے کیو میں لگتے، گھنٹوں انتظار کرکے، یوں بھی ہوتا کہ جب ٹکٹ کی کھڑکی تک پہنچتے تو اطلاع ملتی کہ ہاؤس فل ہو چکا ہے۔

بارہا ایسا بھی ہوا کہ کسی فلم کا پہلا شو دیکھنے ہماری ساری سہیلیاں پہلے ہی دن پہنچیں حسب روایت ہاؤس فل ہو چکا تھا۔ ٹکٹ چیکر تھا ہمدرد اور منیجر اس کا ہم خیال، چنانچہ ہم سبھی خوش ذوقوں کے لیے بازو میں چھوڑی گئی جگہ پر خالی بنچیں ڈالی گئیں۔ آخر کو ہر فلم دیکھتے تھے۔ روز روز کی ملاقات نے اس کے دل میں بھی نرم گوشے پیدا کر دیے تھے۔

کمیشن کا کوئی موقع ہم ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ پھر دیکھتے دیکھتے بلکہ پلک جھپکتے بڑھاپا آ پہنچا۔ سینما تو خیر اب دیکھنے نہیں جاتے۔ ہر گھر ٹی۔وی نے کمیشن ریٹ پر رنگا رنگ کاریہ کرم دکھانا شروع کر دیا ہے۔ جو دیکھے اس کا بھی بھلا، جو نہ دیکھے اس کا بھی۔۔۔!!

میر کی عزت سادات، عاشقی میں جاتی تھی، ہماری پروفیسری میں ایک زمانہ تھا کہ ہمارے منہ سے نکلا ہر بول، سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہوتا تھا اب طالبات کی سمع خراشی کرتا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ اسے سماں خراشی کہتی ہیں، اور بضد ہیں کہ معمولی سی املا کی غلطیوں پر حرف گیری نہ کی جائے اور تو اور آج کے دور کی نئی پروفیسر ان بھی انھیں کی ہم خیال ہیں کیونکہ زبان سے دلچسپی رکھنے کے لیے پڑھنے والیوں کو زیادہ اور پڑھنے والوں کو اور زیادہ کمیشن دینا پڑتا ہے۔

یہ ہم جانتے ہیں کہ زبان کی ترویج واشاعت میں آج کی خواتین کا اور آنے والی کل کی خواتین کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔ اس ہاتھ کو اور بڑا کرنے کے لیے گاڑی کے دوسرے پہیے سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

سو ہم نے آنے والے کل کے لیے قوم کے معماروں کو تیار کرنے کا کام اپنے ذمے لیا۔

وہ کسی طرح یہ سیکھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ زبان سیکھنے کے لیے زبان کا مطالعہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ ان کے حساب سے زبان سیکھنے سکھانے کا فریضہ صرف لڑکیوں اور ملاؤں کے لیے ہی واجب ہے۔ لڑکا یا تو سائنس پڑھے گا یا کامرس اور زیادہ ہی سمجھدار ہوا تو کمپیوٹر سیکھے گا۔

تو پھر اس غریب زبان کا کیا ہوگا۔ ابھی تو رسم خط سے پہچان جاتے ہیں کچھ دن بعد تو یہ بھی دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ نہ کسی گھر پر اردو میں نام کی تختی پائی جائے گی نہ کسی دکان، اسکول، ادارے یا دفتر پر اردو میں بورڈ لکھا ہوگا۔ حکم کے نیچے ہی میں لکھا جائے گا تو سوا عطار کے کوئی پڑھنے والا نہ ہوگا۔ ٹی وی اور ریڈیو پر اردو بولی جاتی تو ہے لیکن اسے ہندی ہی لکھا جائے گا۔ جب انیس سلطانہ کو ایس سلطانہ کہہ کر سلطانہ ڈاکو کی انیسویں پشت میں شمار کیا جائے گا۔ ۔۔تب، تب کیا ہوگا؟؟

یہ کیا ہوگا؟ ....بہت بڑا سوالیہ نشان بن جاتا اگر فلشا کرمیوں کو تقرری کے پروانے نہ ملتے۔ وہاں بھی کمیشن ہے، ان کے لیے جو صرف ہائر سیکنڈری ہیں۔ ان سے کم تعلیمی صلاحیت رکھنے والے یعنی بی۔ اے اور بی۔ ایڈ کو بھی نوازا جائے گا۔ لیکن ایم۔ اے اور پی۔ ایچ ڈی کو سب سے زیادہ ناکارہ سمجھا جانے لگا۔ کیوں ــ؟ آخر کیوں.... اس لیے ہزار بارہ سو کی تنخواہ پر ہائر سیکنڈری یا بی۔ اے پاس کا تقرر ہو تو قابل برداشت ہو.... لیکن ایم۔ اے اور وہ بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کا طوق بدنامی جس کی گردن میں پڑا ہو وہ اس عہدہ جلیل کے حقدار کیونکر ہو سکتے ہیں۔

کالجوں میں انھیں اس لیے جگہ نہیں ملتی کہ اب ہوس فل ہو چکا ہے۔ کبھی کبھی کمیشن ریٹ پر گورنمنٹ کو ایسے اساتذہ مل جاتے ہیں جو برائے نام مشاہرہ لے کر کالج کی عزت آبرو بچاتے اور زبان کا بھرم قائم رکھتے ہیں۔ مستقل اساتذہ نہ ہونے پر سرکار کو کمیشن ریٹ پر نت نئے بیروزگار مہیا ہو جاتے ہیں۔ نئی تقرریاں نہ ہونے تک انھیں سے فیض اٹھایا جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ صرف چندروزہ ہیں اور چندروزہ زندگی میں کون اپنا جی لگائے، بلکہ جی کڑھائے۔۔ چنانچہ ۔۔؟؟ کمیشن کا یہ زہرا فائدہ جسے پرانے زمانے کی بیبیاں ایک پنتھ دو کاج کہتی تھیں۔ سرکار کا بھی بھلا کہ باقاعدہ تقرری پر زیادہ زر مبلغ خرچ ہوتا ہے۔ طالب علم کا بھی بھلا، کہ کوئی نہ کوئی تو اسے پڑھاتا ہی ہے اور کہ اسے معلوم ہے کہ نہ نو نے نہ سو بلکہ نو ای دن کے لیے یہ عارضی استاد معروف بکار رہے گا، نہ یہ دل لگائے نہ وہ لگائیں گے۔ نصابی کتب پڑھانے کا کام مستقل اساتذہ کے ذمے، وہ بھی کب جب شعبہ میں ایک سے زیادہ لوگ ہوں ورنہ طلبہ بھی کنسیشنل ایجوکیشن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کم سے کم پڑھنے کے لیے متعلقہ نصاب کی شرحیں، جنھیں وہ کی (Key) کہتے ہیں، ان پر علم کے خزانوں کے قفل کھول دیتی ہیں۔

تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

مجھے بھی کچھ کہنا ہے

مصنف: خیر النساء مہدی
مبصرہ نگار: انور خان
قیمت: سو روپے صفحات: ۱۲۸
ناشر: قلم پبلی کیشنز، ممبئی ۳

خیر النساء مہدی کی یہ دوسری کتاب ہے بائیس مضامین پر مشتمل جن میں سے بیشتر ریڈیو کے لیے لکھے گئے ہیں۔ بعض تاریخی، کچھ معلوماتی اور چند محض تفنن طبع کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں "مرزا ظاہر دار بیگ ممبئی میں" خوبصورت ڈرامائی خاکہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول توبتہ النصوح کا مشہور کردار ظاہر دار بیگ آج کے عہد میں ایک رپورٹر کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور رپورٹر کے چبھتے ہوئے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے اپنے کردار اور افعال کا دفاع کرتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ دراصل ڈپٹی صاحب کا یہ پہلا ناول تھا اور وہ ایک منفی کردار رکھنا چاہتے تھے اور اس کی شخصیت کو جاذب نظر بھی نہیں بنانا تھا۔ اگر مجھے شیطان ہی بنانا تھا تو وہ مجھ میں وہ قوت پیدا کرتے جو بعد میں ڈاکٹر اقبال نے پیدا کی یعنی میرے طوفاں یم بہ یم' دریا بہ دریا' جو بجو۔ انھوں نے تو مجھے ایک چھوٹا سا حباب بنا کر لمحے بھر میں توڑ دیا۔ خاکہ دلچسپ ہے اور خیر النساء مہدی کے ادبی مطالعے اور قوت اظہار کا جان دار ثبوت۔

ایسے ہی ایک اور اچھا مضمون "میرے شوہر کے چند دوست" ہے۔ اس مضمون میں باقر مہدی کے دوست شام لال' راجندر سنگھ بیدی' جاں نثار اختر' قاضی سلیم' ظ۔ انصاری' عادل منصوری اور ان کے ایک قریبی دوست دامودر کا مختصر مگر دلچسپ تذکرہ ہے۔ چند دلچسپ واقعات' باقر مہدی اور ان مشہور شخصیات کے ذکر کے ساتھ مصنفہ کے سادہ مگر

پر کار بیان نے اسے ایک عمدہ مضمون بنادیا ہے۔ شاید باقر مہدی کی شخصیت میں ہی کوئی بات ہے جو ان پر لکھے گئے ہر مضمون کو دلچسپ بنا دیتی ہے چاہے اسے یوسف ناظم نے لکھا ہو، حماد عباسی نے لکھا ہو یا کمر قلام رضوی گردش نے تحریر کیا ہو۔

اسی کے علاوہ دوسرے مضامین جیسے "غالب کی گھریلو زندگی کے بارے میں" موجودہ عہد کے مسائل اور خواتین' شہر اور شور اور صفیہ اختر کی یاد میں" بھی دلچسپ ہیں۔ آخری مضمون "کلاسیکی فارسی شاعری کی چند اہم جھلکیاں" میں انھوں نے رودکی' فردوسی' عمر خیام' سعدی اور خواجہ حافظ کی شاعری کا بڑا دلچسپ تعارف پیش کیا ہے۔

اپنے پہلے مضمون "دھندلی یادوں کے نقوش" میں انھوں نے اپنے بچپن کا ماحول پیش کیا ہے۔ میرا بچپن بھی اسی ماحول میں گزرا ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے اپنی بہن کا تعلیمی ماحول یاد آگیا اور اندازہ ہوا کہ اس ماحول میں تعلیم حاصل کرنا لڑکیوں کے لیے کتنا مشکل تھا اور ایسے ماحول میں اپنی شخصیت کی نشوونما کتنی بڑی بات تھی۔ اس مضمون میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ "مجھے اپنی پہلی خوشی یاد ہے جب مجھے کوین میری اسکول میں اردو اور فارسی پڑھانے کی ملازمت ملی تھی۔ پہلی تنخواہ پانے کی خوشی میں وہ داغ بھی روشن تھا جو والد کی مفارقت سے ہوا تھا۔" اس عہد کے متعلق سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اس دور میں بلکہ آج بھی اکثر مسلم خواتین کو اسی لیے ملازمت کرنی پڑی کہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی کفالت کر سکیں اور اس ذمہ داری کو انھوں نے جس طرح پورا کیا اور ملامتوں اور رنجشوں کا سامنا کیا وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے اگرچہ اس کی داد انھیں کبھی نہیں ملی بلکہ اکثر تو بیداد کا شکار ہی ہوئیں۔ اس کتاب کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے بھی کرنا چاہیے کہ بیشتر مضامین میں ہمیں اس کی ایک دھیمی' حزن انگیز آواز سنائی دیتی ہے۔

مصنف: یعقوب یاور
مبصر: ڈاکٹر کاظم جعفری
قیمت ۱۵۰/ روپے

دل من (ناول)

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵

یعقوب یاور ایک معروف شخصیت ہیں۔ ان کے کئی ترجمے انگریزی اور جرمن زبان کی کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہرمن ہیں کا مشہور ناول "سدھارتھ" کا ترجمہ بھی یعقوب یاور نے غالباً ۱۹۸۲ء میں کیا تھا۔ زیر تبصرہ ان کا اپنا ناول "دل من" ان کی فکر اور تخلیقی مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔ ناول کا نام دل من رکھ کر

انھوں نے اپنی تلاش و جستجو کا اظہار کیا ہے۔ دل میں اصل یعنی موہن جودڑو کا نام ہے جو قبل مسیح تقریباً تین ہزار سال پہلے موجود تھا۔ بیسویں صدی نے اس کی تلاش اس طرح کی کہ وہاں کی رہائشی زندگی، سماجی اور اخلاقی پابندیاں سب کی سب ظاہر ہونے لگیں۔ مگر کوئی تحریری ثبوت بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے اس عہد کے خدوخال زیادہ نمایاں نہ ہو سکے۔ موہن جودڑو یعنی مردوں کا ٹیلا اس صدی کی دین ہے مگر یعقوب یاور کی تحقیق نے اسے اصل نام دینے کے لیے ناول کا نام بھی وہی رکھا ہے۔

تین ہزار سال قبل مسیح سماجی اور اخلاقی اقدار کا خاکہ پرانی روایتوں اور کتابوں کے سہارے تیار تو کیا جاسکتا ہے مگر اس کی تصدیق تقریباً ناممکن ہے۔ کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت کا ماحول کیا رہا ہوگا۔ بھائی بہن کے درمیان شادی کوئی بہت اہم مسئلہ نہیں ہے۔ انسانی ذہن اپنے ارتقائی دور سے گزرتا رہا ہے۔ اس وقت رشتوں کی اہمیت نہیں معلوم تھی۔ جانوروں کا اصول انسانی زندگی پر بھی حاوی تھا۔ یعقوب یاور کا ناول قدیم روایات کے ساتھ پرانے سماجی مدفن کو پھر سے کھود کر پہچاننے کا ایک دلچسپ عمل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یاور صاحب کے قلم نے جولانی طبع کا پورا پورا اظہار کیا ہے۔ شروع کرنے کے بعد ناول ختم کیے بغیر سکون نہیں ملتا اور یہ ایک مصنف کی بڑی کامیابی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس ناول کی کئی خصوصیتیں ہیں جیسے۔

☆ تین ہزار سال قبل مسیح وادی سندھ کے تمدن کی عکاسی۔

☆ قدیم رسومات ان کی پابندیاں اور سزا کا انداز۔

☆ پرانے زمانے میں علم علاج و معالجہ کی تلاش۔

☆ چھوٹے چھوٹے قبیلے ان کی رہائش کا انداز۔

☆ اس وقت کا چھوٹا شہر بھی حصار بند ہوتا تھا۔

☆ عورتوں کو اس عہد میں بھی حقیر جانا جاتا تھا۔ مگر اسی ماحول میں رہ کر دیوانتی نے اپنے وقار کو کس طرح سربلند کیا۔ یہ ایک انتہائی نازک مرحلہ تھا۔ ایک ایسا گناہ جس کی ذمے داری پوری طرح دیوانتی پر نہیں تھی اور جس کے پھل کے بطور اسے اس کا بیٹا ملا تھا۔ اس نے اپنی عزت و عصمت کو کس طرح سنبھال کر رکھا کہ آخر آخر تک اس نے کسی دوسرے مرد کو قریب نہیں آنے دیا جب کہ اسے چاہنے والا خودکشی کر لیتا ہے۔ اس ناول کو پڑھتے وقت جہاں یہ بات ہے کہ دلچسپی بڑھتی جاتی ہے وہیں کچھ ایسی بات بھی ہے جو مستقل کھٹکتی رہتی ہے۔

☆ ناول کی زبان تقریباً ہندی ہے۔ پڑھتے وقت یہ احساس ختم ہو جاتا ہے کہ ہم اردو کا

ناول پڑھ رہے ہیں۔ لیکن ہزار سال قبل سچ ہندی تو نہیں رہی ہوگی۔ پھر اس زبان کی کیا ضرورت تھی۔

☆ ناول کا پورا ماحول قدیم ہندو روایات سے ملتا جلتا ہے۔ اس لیے رامائن اور مہابھارت کا پس منظر جھلکتا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں شکنتلا کی بھی یاد آنے لگتی ہے۔

☆ جنسی استحصال کے تذکرے کے وقت یاور صاحب کا قلم لڑکھڑا گیا ہے۔ اسے وقت کی ضرورت کہا جائے یا اس عہد کی عکاسی' یہ بات دونوں صورتوں میں معیوب لگتی ہے۔

☆ یاور صاحب نے اپنے ناول کو نیم تاریخی ناول لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کثرت مطالعہ نے ان کے ذہن کو اس طرف متوجہ کیا ہے ورنہ یہ تاریخی یا نیم تاریخی ناول نہیں ہے۔

ناول کا انجام بہت خوبصورت ہے۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل ذہنی طور پر کیسا بدلتی ہے اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ناول بہت مقبول ہوگا۔ اگر یہ ہندی میں بھی شائع ہو جائے تو اس کی مقبولیت آسمان پر نظر آنے لگے گی کیونکہ ہندی پڑھنے والے اس دور میں بہت ہیں اور پھر ناول کی زبان بھی مددگار ثابت ہوگی۔

یاور صاحب کا قلم پڑھنے والوں کا مزید سوچنے کا موقع بہت کم دیتا ہے۔ یہ زور تحریر کا کمال ہے۔ چونکہ ایسے ناول لکھنے والے فی زمانہ بہت کم ہیں پھر اگر کسی ناول کا پلاٹ نیا ہو' انداز بیان اچھوتا اور اظہار فکر میں ندرت ہو تو ایسے ناول کو اچھا ناول کہنے میں کوئی دشواری نہیں۔

دل من ایک خوبصورت اور انتہائی دلچسپ ناول ہے۔ اس کی مقبولیت یقینی ہے۔ یعقوب یاور صاحب قابل مبارک باد ہیں۔ ان سے آئندہ بھی بہتر سے بہتر ناول کی امید کی جاسکتی ہے کیونکہ ان میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

اللہ

مصنف: محمد یونس سلیم
مبصر: کوثر مظہری
قیمت: ۲۵۰ روپے صفحات: ۳۴۰
ناشر: فرید بک ڈپو' اردو بازار' دہلی۔ ۶
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' نئی دہلی۔ ۲۵

اللہ کی عظمت و جلالت اور ذات و صفات کا ذکر علمائے کرام نے بارہا اور جابجا اپنی تصانیف و تقاریر میں کیا ہے لیکن ان کے علاوہ ایسے لوگوں نے بھی پر خلوص جذبے کے ساتھ اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کا تعلق براہ راست مذہبی اور دینی کتب کے مطالعے سے نہیں رہا ہے۔ جناب محمد یونس سلیم بھی ایسے ہی مخلص اور عقیدت مند لوگوں

میں سے ایک ہیں۔

زیر مطالعہ کتاب میں انھوں نے قرآن کریم سے ایسی آیات مقدسہ کا انتخاب کیا ہے جن سے اللہ کی ذات وصفات پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کے سرورق پر قرآنی آیت (پارہ ۱۸) لکھی گئی ہے: اللہ نور السموات والارض، یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ مصنف نے بڑی دقت نظری اور جاں فشانی سے قرآن کی کل ۱۱۴ سورتوں میں سے ۱۰۶ سورتوں سے ایسی آیات مقدسہ کا انتخاب کیا ہے جن میں اللہ کی ذات وصفات کا ذکر ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ جن نکات کی صراحت ناگزیر تھی، جناب یونس سلیم صاحب نے اس امر کا خیال رکھا ہے۔ قرآن پڑھنا اور قرآن فہمی دونوں دو چیزیں ہیں۔ یونس سلیم صاحب کو بچپن سے قرآن پڑھنے کی ایک طرح سے عادت سی رہی جس کے سبب ان کے لیے یہ کام آسان ہو گیا۔ گرچہ یہ ایک (Challenging) تھا جسے یونس سلیم صاحب نے منصۂ شہود پر لاکر ایک اہم فریضہ انجام دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایسی آیات کریمہ کا انتخاب بھی کیا ہے جن سے منصب نبوت، سیرت رسول پاکؐ اور نبوی مشن پر روشنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی تیسرا اہم کام یہ بھی کیا ہے کہ خود قرآن اپنے بارے میں کیا کہتا ہے اور اللہ نے جبرائیلؑ امین کے ذریعہ قرآن کے بارے میں آخری پیغام کی حیثیت سے کیا ارشاد فرمایا ہے۔ ان امور سے متعلق یونس سلیم صاحب آیات مقدسہ کا انتخاب کرکے اور ترتیب وتہذیب کے بعد ہمارے سامنے پیش کرنے کا عزم کر چکے ہیں جو انشاءاللہ جلد ہی منظر عام پر آجائیں گی۔ گرچہ یہ کام بڑے مفسر عالم دین کا تھا مگر اس کو کیا کریں گے کہ اللہ جسؐ سے دین کی خدمت لے لے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"اس طرح یہ کتاب معرفت الٰہی (بذریعہ قرآن) اور معرفت رسالت وحامل رسالت کا ایک آسان اور سہل الاستفادہ ذریعہ بن جاتی ہے۔"

آج اس بحرانی اور پر آشوب دور میں یہ کتاب عوام الناس اور غیر عربی داں حضرات کے لیے بلاشبہ مفید ثابت ہوگی۔ ہر کس وناکس قرآن کے اصل متون کے معانی ومطالب تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ جناب یونس سلیم صاحب کی یہ کتاب ایسے لوگوں کی رہنمائی کرنے میں معاون ہوگی۔ کتاب دیدہ زیب اور لائق توجہ ہے۔ اللہ کرے اس کتاب کی پوری طرح پذیرائی ہو۔ آمین!

فخر نامہ

مرتبین: عبد القوی دسنوی، محمد نعمان
مبصر: جاوید عالم
قیمت: درج نہیں صفحات: 300
ناشر: سیفیہ کالج بھوپال

"فخر نامہ" سرزمین بھوپال کے مایہ ناز فرزند ملا فخر الدین عرف فخرو بھائی (مرحوم) کی زندگی اور ان کی خدمات پر مشتمل کتاب ہے۔ بھوپال کے سماجی خدمت گزاروں میں فخرو بھائی کا شمار ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ بانیٔ سیفیہ ملا سجاد حسین نے ۱۹۴۶ء میں سیفیہ پرائمری اسکول کی شکل میں ایک چھوٹا سا پودا لگایا تھا۔ اسے سیفیہ کالج جیسا شجر ثمردار بنا دینے میں فخرو بھائی کی سعیٔ مسلسل و جہد پیہم کا بڑا ہاتھ ہے۔

"فخر نامہ" کا ابتدائی حصہ منظوم نذرانۂ عقیدت پر مبنی ہے۔ اس میں دیگر شعرا کے کلام خراج و تحسین کے ساتھ ڈاکٹر خالد محمود کی موثر و دلپذیر نظم "نذر سیفیہ" بھی شامل ہے۔ ان کی یہ نظم اپنی مادر علمی سے بے پناہ لگاؤ کی مظہر ہے۔ فخرو بھائی کی ذات و صفات سے متعلق معتدبہ ادیبوں کے مضامین ہیں۔ یہ مضامین فخرو بھائی کی شخصیت اور ان کے فکر و عمل کے سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ فخرو بھائی کی زندگی، ان کا کردار، افکار و خیالات نیز ان کے عمل سے متعلق مختلف گوشے کھل کر سامنے آئے ہیں۔ فخرو بھائی کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ بیک وقت ایک مصلح قوم و ملت، سیاسی و سماجی رہنما، ماہر تعلیم اور کامیاب تاجر تھے۔ ان صفات کے علاوہ ان میں سادگی، انکسار، شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان مضامین سے ان کی انسان دوستی، کسر نفسی نیز علمی معاملات سے ان کے بے پناہ شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔

ذیلی عنوان "انداز فکر" کے تحت فخرو بھائی کے چندہ مضامین و خطبات شامل ہیں۔ اعلا مقاصد کی تکمیل کے لیے سنجیدہ فکر و عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ باعمل لوگ عموماً اپنے مقصد سے روگردانی نہیں کرتے۔ یہ صفات فخرو بھائی کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ کتاب میں شامل ان کے خطبات و تحریرات کا محور و مرکز عموماً سیفیہ کالج اور اس سے متعلقہ معاملات ہیں۔ البتہ مضمون "یادوں کے دریچوں سے" ان کے والد بزرگوار بانیٔ سیفیہ ملا سجاد حسین سے متعلق یادداشتوں پر مبنی ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی "محمد کمال پاشا زلفی" کا انٹرویو ہے۔ جس سے فخرو بھائی کی زندگی اور ان سے وابستہ اہم واقعات کا علم ہوتا ہے۔
دارالاقبال بھوپال کی علمی و ادبی تاریخ مرتب کرنے نیز وقت گذشتہ کے اوراق کراں

بہا محفوظ رکھنے میں سیفیہ کالج نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ زیر نظر کتاب کا چوتھا اور آخری حصہ "دارالاقبال بھوپال" اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں بھوپال اور متعلقات بھوپال پر اردو کے معتبر ادیبوں و ناقدوں کے مضامین ہیں۔ "بھوپال سو سال قبل ایک جائزہ میں" از یونس حسنی "راجکماری سورج کلا سہائے سرور" از عبدالمجید خاں "بھوپال میں اردو تنقید" از محمد نعمان وغیرہ تحقیقی نوعیت کے مضامین ہیں۔ یوسف ناظم زہرہ جمال نزہت سروش عظیم الشان صدیقی فرحت جہاں وغیرہم نے بھوپال کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ بلاشبہ یہ مضامین بھوپالیات میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے "سرگذشت معمار سیفیہ" کے عنوان سے فخرو بھائی کی زندگی کے اہم واقعات مع سنین درج کیے ہیں۔ یہ ایک حوالہ جاتی کام ہے۔ اس میں فخرو بھائی کی خدمات کا اعتراف اور انھیں ملنے والے اعزازات کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ نیز ان علمی و تکنیکی اداروں کے نام بھی جو فخرو بھائی کی نگہداشت میں منازل ترقی طے کرتے رہے۔ کتاب کے آخر میں "سیفیہ کالج اور بھوپالیات" کے عنوان سے دیا گیا اشاریہ نہایت اہم اور بھوپال کے لیے سیفیہ کالج کی خدمات بے بہا کا مظہر ہے۔

اس دور بے حسی میں محسنین کو بھلا دینا ان کی خدمات کو پس پشت ڈال دینا ایک عام بیماری ہو گئی ہے۔ علی الخصوص اردو داں طبقہ اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ کارہائے نمایاں سرانجام دینے والے بے لوث خدمت گزاروں کی موت کے بعد ان کے نام پر چند جلسے چند تقاریر اور قصہ ختم۔ بقیہ معاملات وقت کے بے رحم ہاتھوں کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ سیفیہ کالج اور سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی قابل تحسین ہیں کہ انھوں نے زمانے کی اس روش سے نہ صرف اجتناب کیا بلکہ محسنوں کو یاد کرتے رہنے کے علمی اور قابل قدر طریقے کو اختیار کر رکھا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا سرورق سادہ مگر دیدہ زیب ہے۔ آسمانی پس منظر میں سفیدی مائل آسمانی رنگ سے بنی فخرو بھائی کی سادہ سی تصویر ہے۔ جو فخرو بھائی اور سیفیہ کے مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ ایک علمی اور ادبی دستاویز کی مناسبت سے یہ سرورق نہایت موزوں ہے۔

"فخر نامہ" پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب اور ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے مرتب کیا ہے۔ ہر دو حضرات کی علم دوستی اور تعلیم و تعلم سے وابستگی مختلف شکلوں میں رونما ہوتی رہتی ہے۔ اردو ادب نیز ملک و ملت کے خدمت گزاروں سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

انوار ضوری 10-CIA/128 لاکٹی کلیمن، نئی دہلی ۱۹۔

☆میرے مضمون' غالب کے تین شعر، مطبوعہ کتاب نما دسمبر ۹۸ کے شمارہ میں دو غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں جو سراسر میری ہی ہیں۔ اول تو یہ کہ تیسرا شعر حصہ اول دیوان غالب میں موجود ہے۔ دوم حصہ اول دیوان میں فردیات ۱۷ نہیں ۱۸ ہیں۔ میں دونوں غلطیوں کی نشاندہی کے لیے بزرگ دوست جناب کمال احمد صدیقی کا شکر گزار ہوں اور کتاب نما کے مدیر و قارئین سے اپنے سہو و کم توجہی کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

۱۰ النز مناظر عاشق ہرگانوی بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور

قمری کفِ خاکستر

☆دسمبر ۱۹۹۸ء کے "کتاب نما" میں انوار ضوری نے غالب کے جن تین اشعار سے بحث کی ہے ان میں درج ذیل شعر بھی ہے ۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

یادگار غالب، میں اس شعر کی جو تشریح دی گئی ہے اس سے قمری کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ لفظ "قمری" کے معنی الگ الگ لغات میں مختلف ہیں، کئی ناقدوں نے اس لفظ کی تحقیق کے بعد اپنے آرا پیش کیے ہیں مگر اس کی روح تک علامہ سید سلیمان ندوی کے علاوہ شاید ہی کوئی پہنچا ہو۔

لغت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنی بتانا سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی طرح قوموں سے متعلق ہر چیز ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے۔ زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اہم جز ہے اس لیے زبان اور اس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ تاریخ ہمارے لغت کا اہم باب ہے۔

قومیں اپنی تاریخ میں کتنی ہی خیانت کریں اور ان کے واقعات کو کتنا ہی الٹ پلٹ ڈالیں مگر زبان اور اس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچے دیانتدار کی طرح پچھلی روداد کا ریکارڈ ہمارے لیے تیار رکھتا ہے جس سے اس زبان کے محقق ضرورت کے وقت پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اب اس لفظ قمری کو لیجیے۔

ہماری زبان میں ایک خوش نوا پرندے کا نام قمری ہے۔ یہ نام عربی اور فارسی سے آیا ہے۔ مگر اس کی اصلیت کے بتانے سے یہ دونوں زبانیں قاصر ہیں۔ فارسی کے لغتوں میں یہ لفظ سرے سے نہیں ہے۔ "مؤید الفضلاء" میں جو عربی آمیز فارسی الفاظ کا پرانا لغت ہے یہ لفظ ملتا ہے اور تاج نام کے کسی لغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں۔ پھر اس سے اختلاف کیا ہے کہ فاختہ اور چڑیا ہے اور قمری

دوسری۔ فاختہ کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اور اس کی آواز "یکی تو" یا "کوکوکو" کی ہوتی ہے۔ گلے میں طوق ہوتا ہے۔ اور قمری کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک سفید کافوری اور دوسری صندل اور اس کی آواز سے "یا غفور" کی صدا نکلتی ہے۔

'تاج' کے مشہور نام سے جو ہری کی "تاج اللغت" کی طرف خیال جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جوہر نے قمری کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ نہیں لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں۔ بہر حال یہ فارسی نہیں؛ عربی بھی نہیں۔ کیونکہ اول تو عرب اس سے واقف نہ تھے۔ ان کے شعروں میں اس کا ذکر نہیں۔ قدیم عربی لغت میں یہ مذکور نہیں۔ اس کی ساخت اصل عربی لفظ کی نہیں۔ اس کے آخر میں جو یائے مشدد ہے وہ نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اور اسی نسبت کی طرف اکثر اہل لغت گئے ہیں۔ جوہری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قمر سے مشتق ہے جس کے معنی سپیدی کے ہیں اور اس سے صفت اقمر بنی بمعنی سپیدہ۔ اس اقمر کی جمع قمر ہوئی۔ جیسے احمر سے حمر۔ اور اب یہ ہوا کہ سپید پرندوں کو جمع کے ساتھ یوں بولے "طیر قمر" اور اس جمع کا واحد جب مراد ہوا تو جمع کی طرف یائے نسبت لے کر قمری کو واحد بنالیا ہے۔ جیسے روم سے رومی۔ زنج (زنگ) سے زنجی (زنگی) مگر اس تحقیق میں بڑی کھینچ تان ہے۔ عربی میں اسی نسبت سے کسی اور پرندہ کا نام نہیں رکھا گیا۔

امجد فیروز آبادی نے "قاموس" میں "قمریا" لکھا ہے اور بتایا ہے کہ کبوتر کی ایک قسم ہے۔

مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) نے "تاج العروس" میں لکھا ہے کہ اسد بنے یہ "محکم مختصری سے لیا ہے۔

بعضوں کا دعوا ہے کہ "قمری" عربی کا قدیم لفظ ہے۔ اس کی جمع قمر ابو عامر نام کے ایک جاہل عرب شاعر کے کلام میں ہے ع

ماقر قر قمر یالو لو الشاہق

مگر اس کا کوئی دوسرا شاہد نہیں ہے۔

قمری کے آخر میں جو "ری" ہے اسے کسی نے "یائے مبالغہ" سمجھا ہے۔ مگر اکثر کی رائے یہی ہے یہ یائے نسبت ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کس طرف نسبت ہے تو بعض لوگ اسے اس نام کے ایک پہاڑ کی طرف نسبت سمجھتے ہیں۔ اور بعض اس نام کے کسی مقام کا ذکر کرتے ہیں۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی نے "تاج العروس" میں اوپر کی تفصیل بتا کر لکھا ہے کہ ان کے استاد نے "مشرح کفایہ" میں اس کی تحقیق کی ہے۔

اب آیئے لغت نویسوں سے ہٹ کر جغرافیہ داں کی طرف رجوع کریں یاقوت رومی "معجم البلدان" میں قمر نام کے ایک مصری شہر کا ذکر کرتا ہے اور ابن الفارس سے نقل کرتا ہے کہ قمری پرندہ اسی شہر کی طرف منسوب ہے۔

مقریزی خطۂ مصر میں دریائے نیل کے منبع کی

تلاش میں نکلتا ہے اور بحر ہند کے جزیروں کو . یکتا ہوا چلتا ہے۔ اور اسی اثنا میں جزیرہ قمر کا . کر کرتا ہے۔ اس کا دوسرا نام جزیرہ ملائی بھی بتایا ہے جسے آج ہم ملایا کہتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک جزیرہ کا نام "قمریہ" بتایا ہے اس کے بعد کہتا ہے۔

"والیها نیسب الطائر القمری (ص ۸۱ مصر)

اور اسی جزیرے کی طرف قمری پرندہ منسوب ہے۔

البیرونی نے "کتاب الہند" میں ملایا کے کچھ جزیروں کا نام قمر لکھا ہے۔ (ص ۱۰۳)

پرندوں کے نام ان مقامات کی نسبت سے رکھنا، جہاں پہلے پہل وہ پرندے خوش مذاق کو ہاتھ آئے ہوں، عام بات ہے۔ ترکی، چینی، شیرازی وغیرہ اس کی مثال ہیں۔

اس تفصیل کی روشنی میں غالب کے مندرجہ بالا شعر کا مطلب تلاش کیا جائے۔ ویسے فارسی شاعروں نے گل وبلبل کی طرح سرو و قمری میں محبت کا رشتہ جوڑا ہے۔

قمریاں پاس غلط کردۂ خودی دارند
ورنہ یک سرو رین باغ بہ اندام تو نیست

ڈاکٹر محمد افتخار احمد خاں، واٹ گنج اسٹریٹ، کلکتہ

☆ دسمبر کے مہمان اداریے میں جناب عبدالحق صاحب تحریر کرتے ہیں۔

"اس آشوب میں کسی بھی فرد کی کج روی ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اپنی احتساب کے چراغ کو روشن رکھیں اور فرد کے غیر مناسب فیصلہ کا اعادہ نہ ہونے دیں۔ کسی پر شبہ نہ کریں اور نہ بغیر تصدیق کے الزام لگائیں۔ یہ اخلاقیات کے منافی ہے کہ بدعنوانی کی باتیں کسی سے منسوب کی جائیں اور شکوک کو ہوا دی جائے۔ بعض ذمے دار اساتذہ پر پیسے کے لین دین کی باتیں اخبارات میں بھی شائع ہونے لگی ہیں۔ یہ اردو برادری کے لیے لعنت ہے جس کی ہر پہلو سے مذمت کی جانی چاہیے۔ الزام تراشنے والوں کو کاذبوں کی صف میں کھڑا کرکے بازپرس ہونی چاہیے۔"

ڈاکٹر عبدالحق نے بڑی مناسب بات کہی ہے لیکن افسوس ایسا لکھنے کے بعد پورے اداریے کی ہر سطر میں تمام یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو مختلف قسم کی بدعنوانیوں کا مرتکب بتاتے ہیں لیکن کہیں بھی ان کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ کسی یونیورسٹی کے کسی استاد کا نام لے کر ان پر انگلی اٹھا سکیں۔ ایسے میں وہ خود ہی تحریر کر رہے ہیں کہ شعبہ اردو کے اساتذہ ہر طرح کی بدعنوانیوں میں مبتلا ہو رہے ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ان بدعنوانیوں کی قطار میں پیسے کا لین دین بھی شامل ہو اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آج تک رشوت کے کسی بھی معاملے میں رشوت کے لین دین کو عدلیہ میں بھی ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ لہٰذا وہ کس کو کاذبوں کی صف میں کھڑا کرکے اور کیسے بازپرس

کریں گے جبکہ بقول ان کے اب اردو کے اساتذہ میں دودھ کا دھلا ہوا شاید کوئی بھی نہ مل سکے جس میں وہ خود بھی شامل ہیں۔

اپنے اداریے میں انھوں نے ایک انٹرویو کا تذکرہ کیا ہے جس میں وہ خود بھی شامل تھے اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ان کے اختلافی نوٹ کے بعد بھی ایک امیدوار کی تقرری ہو گئی۔ عبدالحق صاحب اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ امیدوار کے انٹرویو کے وقت بورڈ میں کئی لوگ بیٹھتے ہیں اور اگر اکثریت کسی ایک امیدوار کے بارے میں فیصلہ کر دیتی ہے تو پھر کسی واحد ممتحن کے اختلافی نوٹ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کیا عبدالحق صاحب اس بات کی بھی وضاحت کریں گے کہ انھوں نے جس امیدوار کے لیے اختلافی نوٹ دیا تھا کیا وہ اس عہد کے لیے بالکل نااہل تھا یا انھوں نے "برینائے بغض" یہ اختلافی نوٹ دیا تھا۔ کیونکہ انٹرویو بورڈ میں ان کے علاوہ دیگر پروفیسر حضرات بھی شامل ہوئے ہوں گے۔ جنھوں نے یقیناً اس امیدوار کا انتخاب اس کی صلاحیت کی بنا پر کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے امیدوار کا انتخاب کرنا چاہتے ہوں جو اوروں کی نظر میں نااہل ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن شکوک کا انھوں نے اپنے اداریے میں تذکرہ کیا ہے اس کے دائرے میں وہ خود بھی آتے ہوں۔

عبدالحق صاحب کا یہ جملہ بھی عجیب معنی خیز ہے کہ اساتذہ کو نہ شاعر ہونا چاہیے نہ افسانہ نگار اور نہ ہی نقاد۔ اسے تو بس رٹے رٹائے طوطے کی طرح ہونا چاہیے کہ جو اس نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں رٹ لیا تھا اسے کلاس میں اگل دیں۔ بھلا کیا کہنا۔ ایسے خشک مولوی ادب کیا پڑھائیں گے جو یہ سمجھتے ہوں کہ ادب کے پروفیسر کو ادب سے کوئی شغف نہیں ہونا چاہیے۔

امید ہے کہ عبدالحق صاحب اپنے اندر ہمت جٹائیں گے اور ایسے تمام اساتذہ کے ناموں کا آشکار کریں گے جنھیں وہ طرح طرح کی بدعنوانیوں میں ملوث پاتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ خود اپنے کو دودھ کا دھلا سمجھتے ہوں اور اس کا اہل سمجھتے ہوں کہ پہلا پتھر وہ خود پھینک سکیں۔

بات یہ ہے کہ عبدالحق صاحب یہ سوچتے ہوں گے کہ دیر آید درست آید۔ لیکن اگر یہی باتیں وہ اس وقت تحریر کرتے جب وہ خود دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر تھے تو بات کچھ اور ہوتی۔

اس شمارے میں نرگس سلطانہ کا مضمون بھی دلچسپ ہے اور امید ہے کہ آپ اس طرح کے دلچسپ اور معلوماتی مضامین اکثر شائع کرتے رہیں گے تاکہ عبدالحق صاحب جیسے لوگوں کی خشک تحریروں سے محفوظ رکھا جا سکے۔ طنزیہ مزاحیہ مضامین کی اشاعت میں کچھ معیار قائم کریں یہ نہیں کہ لوگوں کے چھپے ہوئے اخباروں کے کالم کو بار بار شائع کرتے رہیں۔

ادبی تہذیبی خبریں

ڈاکٹر حامد حسین کی کتاب کا اجراء

ڈاکٹر سید حامد حسین کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "موج در موج" کے عنوان سے حال میں شائع ہوا ہے۔ ایک سادہ مگر پر وقار تقریب میں مدھیہ پردیش کے وزیر اعلا جناب دگ وجے سنگھ نے اس کتاب کا اجراء کیا۔ بھوپال کے بزرگ صحافی جناب صغیر بدار صاحب نے تصنیف اور مصنف کا تعارف کرایا۔ ۱۷/اکتوبر کو "سر سید ڈے" کے موقع پر اس تقریب کا مدھیہ پردیش کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے اہتمام کیا تھا۔

صدر مسلم لائبریری ناگپور میں چوبیسواں جلسہ مباحثہ

ناگپور۔ گذشتہ روز صدر مسلم لائبریری ناگپور میں چوبیسواں منشی عبدالجبار خاں بین المدارس مقابلہ مباحثہ میر صدارت محترمہ قمر بانو کریم صاحب، ڈائرکٹر، آئی۔ اے۔ ایس کوچنگ سینٹر ناگپور منعقد ہوا۔ جس کا آغاز مولانا عمیر خاں صاحب نے تلاوت کلام مجید سے کیا۔

لائبریری کے صدر پروفیسر سید یونس نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور سکریٹری محمد نسیم الدین صاحب نے گذشتہ سال کے مباحثہ کی رپورٹ پیش کی۔ مباحثہ کا عنوان تھا۔ "موجودہ زمانے میں مغرب کی تہذیب کی تقلید کے سوا چارہ نہیں۔" اس مباحثہ میں ناگپور و کامٹی کی اردو میڈیم اسکولوں کی دس ٹیموں نے شرکت کی۔ مقابلہ میں گلن سیٹھ ہائی اسکول کی طالبات روبینہ ممتاز اور روحینہ ممتاز کو اول مقام ملا اور حسامیہ گرلز ہائی اسکول ناگپور دوسرے مقام کی مستحق قرار پائی جس کی نمائندگی صائمہ منظور کمال اور ظہور صباحت نے کی۔ انفرادی طور سے گلن سیٹھ ہائی اسکول کامٹی کی طالبہ روبینہ ممتاز کو اول اور اسلامیہ ہائی اسکول ناگپور کی طالبہ توصیہ جمال کو دوسرا انعام دیا گیا۔

صدر جلسہ نے سامعین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلم طلبا کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنا چاہیے والدین، سرپرست اور اساتذہ کو متوجہ کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ بچوں میں ابتدائی تعلیم ہی سے مقابلہ کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ آپ نے شرکاء مباحثہ کو مبارکباد دی اور ان کی کوششوں کو سراہا۔

محترمہ تزئین فاطمہ نقوی صاحب، محمد فصیح الدین صاحب، اور محمد یوسف صاحب نے جج کے فرائض انجام دیے۔ مکرم حسین خطیب صاحب نے جلسہ کی نظامت فرمائی اور لائبریری کے مشیر قانون جناب ایڈوکیٹ حبیب الدین احمد صاحب نے

مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

محمد نسیم الدین، معتمد

مولانا علی میاں کو اسلامی شخصیت ایوارڈ

دوبئی، ۱۴؍ دسمبر ہندستان کے ممتاز اسلامی اسکالر ابوالحسن علی ندوی عرف علی میاں کو دوبئی کی اسلامی شخصیت ایوارڈ برائے ۱۹۹۸ء کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ دوبئی انٹر نیشنل قرآن ایوارڈ کی کمیٹی یہ ایوارڈ ہر سال ایک اسلامی اسکالر کو اسلام اور انسانیت کی خدمت کے اعتراف کے طور پر دیا کرتی ہے۔ ۸۵ سالہ علی میاں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سربراہ ہیں۔ کمیٹی کے ترجمان مسٹر ابراہیم بوملحہ نے اخبار نویسوں کے سامنے یہ اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ علی میاں کو ۷۰ اسکالروں کی فہرست میں سے چنا گیا ہے۔ اس سے پہلے علی میاں کو سعودی عرب نے شاہ فیصل ایوارڈ دیا تھا۔ اردو اور عربی میں ۲۰۰ سے زائد کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ جن میں سے بیشتر کے تراجم انگریزی، ترکی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔

شکیلہ خاتون کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض

محترمہ شکیلہ خاتون کو ان کے تحقیقی مقالہ بہ عنوان " اردو لغت کا صنفی و ہیئتی مطالعہ" پر کانپور یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ موصوفہ مسلم انٹر کالج فتح پور کے گرلس سکیشن کی انچارج ہیں۔ اس گراں قدر تحقیقی مقالے کو انھوں نے ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری (ریڈر صدر شعبہ اردو، مہاتما گاندھی پوسٹ گریجویٹ کالج فتح پور) کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔

"ادارۂ فن و ادب" الہ آباد کے زیر اہتمام غزلوں کے تین مجموعوں کی رسم اجرا

گزشتہ ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو ادارۂ فن و ادب کی جانب سے الہ آباد میں ایک ادبی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں الہ آباد کے تین جدید غزل گو شعرا سہیل احمد زیدی، فرخ جعفری اور عبدالحمید کے مجموعوں بالترتیب "وادیٔ طویٰ"، حرف آغاز" اور "سبز ہوا روشن ہے" کی رسم اجرا جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقع پر جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ یہ بات اہل الہ آباد کے لیے قابل فخر ہے کہ سہیل احمد زیدی جیسے عمدہ شاعر کا تعلق اس شہر سے ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادبی دنیا میں بالخصوص جدید غزل کے تعلق سے لوگ الہ آباد کو سہیل زیدی کے حوالے سے جانتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے فرخ جعفری اور عبدالحمید کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھی اعتراف کیا اور ان کے کرم کو مزید روشن امکانات کا حامل قرار دیا۔ اس جلسے میں تینوں شاعروں سے متعلق مقالے بھی پڑھے گئے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ابواللیث، چودھری ابن النصیر، عبدالحمید، احمد محفوظ، اور محمود کاظمی شامل تھے۔ اس موقع پر تینوں

شاعروں کی چند غزلیں دوسروں نے بھی پڑھ کر سنائیں۔ جلسے کی نظامت الہ آباد ہائی کورٹ کے وکیل اور شاعر جناب ایم۔ اے۔ قدیر نے کی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ساقی فاروقی اور صلاح الدین پرویز کے اعزاز میں جلسہ

نئی دہلی ۳۰ر نومبر: لندن سے تشریف لائے مہمان شاعر ساقی فاروقی اور صلاح الدین پرویز کے اعزاز میں شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک شاندار استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت جناب محمود ہاشمی نے فرمائی۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے محمود ہاشمی نے ساقی فاروقی اور صلاح الدین پرویز کی شاعری کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کیا اور انھیں فی زمانہ اپنی منفرد شناخت رکھنے والے شاعر کہا۔ ساقی فاروقی اور صلاح الدین پرویز کا استقبال کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ ساقی ان جدید شاعروں میں ہیں جن کی غزلیں اور نظمیں اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔ صلاح الدین پرویز کی شاعری کے بارے میں پروفیسر ہاشمی نے کہا کہ پرویز کی شہرت و مقبولیت دراصل ان کی شاعری کے نئے پن کی وجہ سے ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ساقی فاروقی اپنی شاعری میں زندگی اور انسانی ہستی کے مسئلوں کو جس طرح پیش کرتے ہیں وہ ہمارے زمانے میں بہت کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے ساقی کی شعر خوانی کی جانب بھی توجہ دلائی۔ ساقی فاروقی اور صلاح الدین پرویز نے متعدد نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ ساقی فاروقی کی نظمیں، خالی بورے میں زخمی بلا" اور "مستانہ ہیجڑا" اور صلاح الدین پرویز کی نظمیں "میر کے لیے چند نظمیں" کافی پسند کی گئیں۔

اس موقع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مختلف شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ آخر میں ڈاکٹر صادقہ ذکی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

غالب کا دور اردو شاعری کا عہد زرین

غالب صدی میں ڈاکٹر ظہیر صدیقی کی تقریر

بھوپال" حلقہ ارباب ادب " کے زیر اہتمام غالب کی دوسری صدی تقریبات کے تعلق سے منعقد ایک نشست میں اظہار خیال کرتے ہوئے ممتاز ناقد و معلم اور غالب اعزاز سے سرفراز ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اس ضرورت پر زور دیا کہ غالب صدی تقریبات کے دوران ہمیں ان کے ممتاز معاصرین کو بھی یاد کرنا چاہیے۔ آپ نے خاص طور سے مومن کا ذکر کیا جن کے ایک شعر کو سن کر غالب نے کہا تھا کہ "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھے دے دیتا۔"

مومن کا وہ شعر تھا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس نشست میں آپ نے مومن کی شاعرانہ سر بلندی کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہوئے غالب کے دیگر معاصرین خاص طور سے ذوق، ظفر، شیفتہ اور داغ کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ غالب کا دور اردو شاعری کا عہد زرین تھا۔

اس نشست میں چندر کوٹ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نریندر ورمنی، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، پروفیسر حسن مسعود، ڈاکٹر ونے دوبے، پرنسپل سید ناصر علی، عنایت حسین، ڈاکٹر بلقیس جہاں وغیرہ نے گفتگو میں حصہ لیا۔ پروفیسر آفاق احمد نے معزز مہمان کا استقبال کیا اور شرکا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں ظہیر صاحب جیسے معتبر ناقد کے خیالات سُننے کا موقع ملا۔

بزم ہم قلم کے زیر اہتمام علی سردار جعفری کے نام ایک تاریخی شام کا انعقاد

اور جامعہ اردو ریسرچ اسکالر ایسوسی ایشن

نئی دہلی ۱۹ اکتوبر۔"اردو بڑی ہی طاقت ور اور حسین زبان ہے۔ لیکن یہ روپ بدل رہی ہے اور ہمیں تبدیلی کو خوش آمدید کہنا چاہیے۔ کوئی زبان مرتی نہیں ہے۔ زبان کی فطری موت ہوتی ہے تقریباً ۲۔۵ ہزار برس میں زبان مرتی ہے۔ لیکن حکمراں زبان وہ ہوتی ہے جو اپنے عہد کی جدید ٹکنالوجی سے جڑی ہوتی ہے۔ اور وہ زبان کبھی نہیں مرتی۔ اردو ایسی ہی ایک زبان ہے۔" یہ الفاظ عہد ساز شخصیت، گیان پیٹھ انعام یافتہ شاعر محترم علی سردار جعفری کے تھے۔ وہ بزم ہم قلم اور جامعہ اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کے مشترکہ اہتمام میں منعقدہ "ایک شام علی سردار جعفری کے نام" سے خطاب کر رہے تھے۔

علی سردار جعفری نے مزید کہا "مجھے نئی نسل سے مل کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ آج کی شام مجھے بے حد یاد رہے گی۔ ایک بار ایک اخبار نویس نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ آپ مایوس کیوں نہیں ہوتے۔؟ میں نے جواب دیا تھا کہ میں مایوس اس لیے نہیں ہوتا کہ میں جس زبان کا نمائندہ ہوں اس کا ہندستان کی تاریخ میں وہ مقام ہے جو خود اردو والوں کو بھی پتہ نہیں۔ ہندستان کی کئی ہزار سالہ تاریخ میں جن چار زبانوں نے پورے طول و عرض پر ہندستانی ثقافت کو قائم رکھا ہے ان میں ایک اردو بھی ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ اردو والوں کا فرض ہے کہ وہ اتحاد کے علمبردار بن کر انھیں کہ اردو کے پاس یہی ایک بیش قیمتی سرمایہ ہے۔ علی سردار جعفری نے اظہار خیال کے بعد کیے بعد دیگرے نصف درجن نظمیں سنائیں۔ ان کی نظمیں سن کر سامعین بہت محظوظ ہوئے۔

خطبہ صدارت دیتے ہوئے جناب جوگندر پال نے کہا۔ "علی سردار جعفری صاحب ہمارے دور کے بے حد اہم اور بڑے دانشور اور نہایت اہم شاعر ہیں ان کے یہاں جرأت

اظہار بہت ہے۔ دراصل وہ ہر دور میں موجود رہنے والے شاعر ہیں اور جو شاعر موجود رہنا چاہتا ہے۔ اسے شعور کے بغیر تخلیق کے سوا چارہ نہیں ہے۔

جناب محمود ہاشمی نے علی سردار جعفری کی شخصیت اور فن پر اظہار کرتے ہوئے کہا۔ " علی سردار جعفری اپنے عہد کے سب سے معتبر، سب سے محترم مستند شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کو بین الاقوامی تناظر میں روشناس کرایا۔ انھوں نے اردو سے وابستہ رہتے ہوئے اپنے فلسفے کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ تمام حلقوں میں ان کی شاعری کو قبول کیا گیا۔ انھوں نے اردو کو بے شمار اچھی اور خوبصورت نظمیں دی ہیں۔ ان کی نظم "ہاتھوں کا ترانہ" اردو کی ایک لازوال نظم ہے۔ جعفری صاحب ہمارے عہد کی تاریخ ساز شخصیت ہیں۔

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے علی سردار جعفری کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ تو سردار جعفری کی شاعری کے ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ ان کی شاعری نے ہمیشہ ایک نیا پیغام زندگی دیا۔ سردار جعفری ہماری ادبی تحریک (ترقی پسند تحریک) کے سب سے اہم رکن ہیں۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کو نہ صرف ادبی اور تخلیقی حیثیت سے وجود دیا بلکہ اسے عملی طور پر بھی کافی فروغ دیا۔ جعفری صاحب نے شاعری ہی نہیں نثر میں بھی [illegible] وہ بھی کافی اہم ہے۔

هلہ ہاؤس، نئی دہلی میں منعقدہ اس محفل میں اردو کی ممتاز ادبی شخصیتوں اور ریسرچ اسکالرز نے خاص تعداد میں شرکت کی۔ نظامت کے فرائض اسلم جمشید پوری نے ادا کیے جبکہ ڈاکٹر نثار عظیم نے اپنے مخصوص انداز میں مہمانوں کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ محترمہ انور نزہت صاحبہ نے جناب علی سردار جعفری کا پھولوں کے تحفے سے استقبال کیا۔ جامعہ اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کے صدر جناب کوثر مظہری نے علی سردار جعفری کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا۔ آخر میں ڈاکٹر شیخ افروز زیدی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

جناب نذیر احمد اور ٹیل گریجویٹ ایسوسی ایشن کو مدینہ گولڈ میڈل ایوارڈ

مدیر اعلا اور ٹیل گریجویٹ اردو ہفت روزہ و صدر اور ٹیل گریجویٹ ایسوسی ایشن آندھرا پردیش جناب نذیر احمد کو ان کی تعلیم کی ترقی کے لیے کی گئی بے مثال خدمات کے اعتراف میں انھیں مدینہ گولڈ میڈل ایوارڈ پیش کیا گیا ہے۔

نجم النساء کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری

برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال نے محترمہ نجم النساء کو ان کے تحقیقی مقالے پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا "بھوپال میں اردو ادارے کا تحقیقی

وتنقیدی مطالعہ۔" آپ نے یہ مقالہ پروفیسر آفاق احمد سابق صدر شعبہ اردو بھوپال گلشنی بائی گرلز (پی جی) کالج کی زیر نگرانی پیش کیا تھا۔ اس مقالہ میں بھوپال میں اردو ڈرامے کی تاریخ میں بھوپال کا مقام متعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

علی سردار جعفری کا اعزاز اور ان پر کل ہند سیمنار

اردو ساہتیہ اکاڈمی گجرات کے زیر اہتمام اردو کے مشہور شاعر جناب علی سردار جعفری کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے کی خوشی میں ایک جلسہ اعزاز اور ان کی شاعری اور ادبی خدمات پر ایک دوروزہ سیمنار کا انعقاد ۸ر اور ۹ر نومبر ۹۸ء کو احمد آباد میں اکاڈمی کے چیرمین جناب وارث علوی کی زیر صدارت کیا گیا۔ افتتاح گجرات کے مشہور ادیب بھولا بھائی پٹیل نے کیا جناب اکبر ترمذی صاحب مہمان خصوصی تھے۔ گجرات کے وزیر کلچر جناب مہندر ترویدی نے اعزازی شال پیش کی۔ شہر کے مختلف اداروں نے بھی اپنی طرف سے شال اور یادگاری تحفہ پیش کر کے ان کو تہنیت پیش کی۔ ان میں گجراتی ساہتیہ اکاڈمی، ہندی ساہتیہ اکاڈمی، سندھی ساہتیہ اکاڈمی، سنسکرت ساہتیہ اکاڈمی، گجرات ساہتیہ پریشد جو گجرات کا سب سے قدیم اور عظیم ادبی ادارہ ہے، سندھی ساہتیہ سبھا، ہندی ساہتیہ پریشد، گجرات اردو بورڈ، گجرات یونیورسٹی شعبۂ اردو فارسی، بزم ادب انجمن اسلام ہائی اسکول اور فلاح دارین کالج برائے خواتین خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

سیمنار میں سردار جعفری کی شاعری اور تنقید پر شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی، نقی حسین جعفری، انیس اشفاق، اسلم پرویز، زاہدہ زیدی، رفیعہ شبنم عابدی، عبدالاحد ساز، شفاعت قادری اور وارث علوی نے اپنے مقالات پیش کیے جو اکاڈمی کی جانب سے جلد ہی شائع کیے جائیں گے۔ سردار جعفری سیمنار کے تمام جلسوں میں حاضر رہے اور مباحث میں بھی حصہ لیا۔ اس پروگرام میں گجراتی ہندی اور سندھی کے ادیبوں اور سامعین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ایک مختصر شعری نشست میں سردار جعفری نے اپنی خوبصورت نظمیں سنا کر سامعین پر گہرا نقش چھوڑا۔

صغرا ابراہیم بخاری، نائب رجسٹرار

اردو گھر میں اردو اور پنجابی ادیبوں کا اجتماع

"ادبی ملاقات" کے پروگرام کے تحت ۲۷ر نومبر کو اردو گھر انجمن ترقی اردو ہند میں اردو اور پنجابی کا مشترکہ ورثہ۔ حال اور مستقبل" کے عنوان سے ایک مذاکرہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت پنجابی کے مشہور اہل قلم جناب بیدل ہوشیارپوری نے فرمائی۔ جناب ابوالفیض سحر نے اردو گھر میں پنجابی ادیبوں اور شاعروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے، اردو اور پنجابی کی تاریخی، تہذیبی اور لسانی وراثت کا ذکر کیا اور کہا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ باہمی اشتراک و تعاون کو ہر سطح پر مضبوط بنیادوں پر استوار کر کے، قومی

تہذیب ملک کے سیکولر کردار اور قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دیا جائے۔ پنجابی ادیبوں کی طرف سے جناب پیارے سنگھ، جناب اندر جیت سنگھ پنچھی اور جناب بیدل ہوشیار پوری نے، "ادبی ملاقات" کے اس پروگرام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ایسی تعمیری کوششوں سے خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے اور لسانی تخلیقی دائروں میں ہمارے مشترکہ ورثے کی پروردہ اقدار کو بڑھاوا ملے گا۔ ممتاز ادیب جناب پریمپال اشک اور ڈاکٹر مسعود ہاشمی نے اظہار خیال کرتے ہوئے ایسی ملاقاتوں اور مذاکروں کو صحت مند اور تعمیری ادب کی تخلیق اور مشترکہ تہذیب کے استحکام کے لیے خوش آیند بتایا۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے اپنا تازہ افسانہ "تکمیل" سنایا جسے بے حد پسند کیا گیا۔

آخر میں جناب رام پرکاش راہی، جناب رمیش مہتا، جناب فرحت قمر، جناب انوار رضوی، جناب پیارے سنگھ اور جناب بیدل ہوشیار پوری نے اپنا کلام سنایا۔ جناب ابوالفیض سحر کنوینر کے شکریے پر پنجابی اور اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی یہ محفل، خیر سگالی کے پر خلوص احساسات و جذبات کے خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوئی۔

حکومت کا ضلع اردو مشاورتی کمیٹیوں کی تشکیل کا تاریخ ساز فیصلہ

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیرمین عزیز قریشی کی محنت بار آور

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیرمین جناب عزیز قریشی کی کوشش سے حکومت مدھیہ پردیش نے ایک انقلابی قدم اٹھایا ہے جو پورے ملک میں اولیت کا حامل ہے۔ اس کے تحت اضلاع میں اردو مشاورتی کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ جس کا چیرمین ضلع کلکٹر ہوگا۔ واضح رہے کہ جناب عزیز قریشی نے اردو اکادمی کے چیرمین کا چارج لینے کے بعد سے ہی اس ضمن میں کارروائی شروع کردی تھی۔ اس سلسلے میں تین ماہ قبل ایک نوٹ بنا کر وزیر اعلا دگ وجے سنگھ کو بھیجا تھا اور بعد میں تفصیلی گفتگو بھی کی تھی۔ مذکورہ کمیٹیوں کا مقصد حکومت کے ذریعہ اردو تعلیم، اردو اساتذہ کی تقرری۔ اسکولوں نیز محکمہ تعلیمات کے دفاتر میں اردو افسر کی تعیناتی وغیرہ کے سلسلہ میں جاری سرکاری احکامات کے نفاذ کی مانیٹرنگ کرنا ہے۔ اس کی میٹنگ ہر ماہ منعقد کی جائے گی۔ کمیٹی کے ممبران کے ناموں کی تجویز مدھیہ پردیش اردو اکادمی کرے گی اور حکومت ان کو نامزد کرے گی۔

مدھیہ پردیش کے فعال وزیر اعلا دگ وجے سنگھ صاحب نے شری عزیز قریشی کی تجویز پر غور کرنے کے لیے ۱۹ر اگست ۹۸ء کو چیف سکریٹری اور دیگر حکام کی میٹنگ بلا کر اس پر چرچا کی۔ کمیٹی کا چیرمین کلکٹر ہو یا نہیں اس پر کافی بحث کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ضلع کلکٹر اردو مشاورتی کمیٹی کا چیرمین ہوگا۔ چنانچہ اسی دن احکام صادر کردیے گئے۔ اس کے تحت مدھیہ پردیش کے ۶۱ اضلاع میں کمیٹیاں تشکیل دی جائیں گی۔

جن کے نام اس طرح ہیں۔ بھوپال، دانتہ سین، سیہور، ودیشہ، شاجاپور، دیواس، اندور، مندسور، رتلام، رائے گڑھ، اجین، درگ، بالاگھاٹ، جبل پور، کھنڈوہ، دھار، راجگڑھ اور گوالیار ہیں۔

اردو اکادمی کے ذریعہ ضلع وار کمیٹیوں کی تشکیل میں تعاون اور فکر ی تحریک معین ہوتا اردو سماج کے لیے دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوگا۔

افسر کاظمی کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض

رانچی یونیورسٹی (بہار) نے کریم سٹی کالج، جمشید پور کے شعبے اردو کے استاد جناب افسر کاظمی کو ان کے تحقیقی مقالہ "مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے، موصوف کے نگراں مقامی کریم سٹی کالج کے پرنسپل اور معروف افسانہ نگار ڈاکٹر منظر کاظمی تھے جبکہ ممتحن ڈاکٹر فصیح الزماں، مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا تھے۔ افسر کاظمی، جو خود بھی ایک اچھے طنز و مزاح نگار ہیں پچھلے چار پانچ برسوں سے اس تحقیقی مقالہ پر کام کر رہے تھے۔

پروفیسر وہاب اشرفی کا نیا پتہ

اشرف ہاؤس۔ ایچ ۱۲۹۲، ہارون کالونی سیکٹر ۱۱

پھلواری شریف پٹنہ ۸۰۱۵۰۵

پروفیسر حفیظ بنارسی کا نیا پتہ

۱۱۴/۳۳ بازار سید اننت پورا، کسی

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا نیا پتہ

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ۱۹۷۔ عمران بلاک،

علامہ اقبال ٹاؤن لاہور (پاکستان)

ڈاکٹر عبدالمغنی کا نیا پتہ

منزل گھر ۔ نو عظیم آباد کالونی

پوسٹ مہندرو، ضلع پٹنہ ۶

ہم غم میں برابر کے شریک ہیں
اشرف قادری کا انتقال پر ملال

اردو کے بزرگ شاعر، ادیب اور مجاہد آزادی جناب شرف الدین احمد اشرف قادری کا مختصر علالت کے بعد ان کے آبائی وطن شہر بتیا، مغربی چمپارن (بہار) میں گذشتہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۸ء کو ۷۶ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کا پہلا شعری مجموعہ "دیوان" ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا چمپارن ضلع کے مجاہدین آزادی کی خدمات پر مشتمل اردو اور ہندی میں ان کی تین کتابیں شائع ہوئیں۔ انھوں نے اپنے پیچھے اہل خاندان میں قمر امام، منور امام قادری (صاحب زادگان) کے علاوہ پروفیسر تاج قادری (داماد) اور بیاز یند (بہو) جیسے اہل قلم کی ایک بڑی جماعت چھوڑی ہے مرحوم پیشے سے وکیل تھے۔ نظم و نثر کے کم از کم دس مسودات غیر مطبوعہ ہیں جن کی اشاعت کا پس ماندگان اہتمام کر رہے ہیں۔

مولانا وہاب صدیقی نہیں رہے

بہار میں اردو تحریک کے فعال اور سرگرم رکن اور ریاستی انجمن ترقی اردو بہار کے سابق جنرل سکریٹری مولانا وہاب صدیقی کا پچھلے دنوں پٹنے میں تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ وہ کافی دنوں سے بیمار چل رہے تھے۔

ادارہ کتاب نما مرحومین کے لیے دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

سونے کی چوری
مکتبہ
پیام تعلیم
کی نئی اور
دلچسپ
کتابیں
خلائی
طبیب
سنہری جھیل
جلتا ہوا مکان
بونوں کا جزیرہ
جادو نگری

Regd. with R.N.I. at No 4967/60 JANUARY 1999.
Regd. No. DL 16016/98
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

ماہنامہ
کتاب نما
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر سید عبدالباری
ریٹائرڈ ریڈر، ہیڈ آف اردو
جی ایس پی جی کالج سلطان پور (یو پی) ۲۲۸۰۰۱

اشاریہ

اکیسویں صدی میں ادیب کا رول

موجودہ صدی کے ہنگامہ و آشوب، دو عالمگیر جنگوں اور پھر جنگ کے بعد کی افسردگی و اضمحلال، سرد جنگ کے طول طویل سناٹے، اشتراکیت کے جبر و قہر، برطانوی استعمار کے مظالم، مغربی قوموں کی فتنہ سامانیاں، مغرب کے زہر آلود نظریات اور ثقافتی سیہ کاریاں، مشرق کے اندر انقلاب آفریں بیداری اور مغربی ایجنٹوں و ظالم ڈکٹیٹروں کے لائے ہوئے مصائب، اسلامی تحریکوں کا فروغ اور پھر امتحانات و آزمائشوں کے سنگین مراحل، صنعتی تہذیب اور مشینی تمدن سے تھکی ہاری انسانیت کی ایک نئی صبح کی جستجو اس صدی کے آخری دہائیوں میں اشتراکیت کا عبرتناک زوال، اسلامی تحریکوں کی ناکامیاں اور امریکہ کے غلبہ و استحصال کی منزلوں سے گذرتے ہوئے اب نئی صدی کے دروازے پر بنی نوع انسان دستک دے رہا ہے تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی منظر نامہ پر نئی قوتوں، نئے رجحانات اور نئے میلانات کی آمد آمد ہے ٹکنالوجی ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے اور خبروں کی ترسیل کا ایک برق رفتار عہد شروع ہو رہا ہے۔ علوم و فنون کی نشر و اشاعت سطح ارضی پر ایک دوسرے سے استفادہ کے نئے برق آسا نظام نے آفاقیت (Clobaluation) کی فضا پیدا کر دی ہے۔ لیکن ان ساری حیرت انگیز تبدیلیوں کے باوجود ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آنے والے ایام غیر معمولی خلاء انتشار، لامستی، غیر یقینی صورت حال اور ذہنی انتشار کا پیغام لے کر آئیں گے۔ کسی نظم و ترتیب اور کسی سلسلہ اور ربط و ضبط سے آنے والی صدی محروم ہوگی اور شاید یہ انسانی تہذیب کے قافلوں کے سفر کا آخری مرحلہ ہوگا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ نئی صدی میں ہر شعبہ حیات اور ہر گوشہ علم و فن کو سفر جاری رکھنے کے لیے نئے قسم کی سواریاں درکار ہوں گی۔ ادب کی جولانگاہ میں فنکار

کے لیے دو بنیادی وسائل ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے تخلیقی کرشمے دکھاتا ہے۔ اول تو زبان وقت بہ دوسرے فکر و احساس۔ زبان و فن کے اندر اختراع کے امکانات ختم ہو چکے ہوں اس کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا البتہ ہر معاشرہ اور ہر دور اپنے ذوق اور احوال کے اعتبار سے اپنے اظہار کے طریقے یا فارم اختیار و اختراع کرتا ہے۔ آنے والی صدی کس طرح کے فارم اور ادبی ہیئتوں کی طالب ہوگی، یہ بات پوری طرح واضح نہیں البتہ اس کے اشارے ضرور مل رہے ہیں۔ دنیا میں علم و خبر کی ترسیل و اشاعت کی جو نئی برق رفتار ٹکنالوجی فروغ پذیر ہے اور جس طرح علوم کے سرمایہ کو کمپیوٹر اور ای میل کے ذریعہ دنیا کے کسی گوشے میں پلک جھپکتے پہنچانے کے وسائل منظر عام پر آرہے ہیں شاید اس کا تقاضا ہو کہ اب بات کو مختصر سے مختصر پیرایے میں کہیے، ہر طرح کی آرائشوں اور صنعت گری کے کرشموں سے مبرا رکھیے اور رمز و کنایہ کی بھول بھلیوں سے بچا کر راست منزل تک لے جانے والا انداز بیان پسند خاطر ہوگا۔ اب شاید برائے ادب اور فن برائے فن کے وہ مشغلے پسند خاطر نہ ہو سکیں جب لوگوں کے پاس خاصا وقت تھا اور معمے حل کرنے اور پیچیدہ لفظی گرہیں کھولنے میں صرف ہو سکتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد نئے صنعتی اور سائنٹفک دور کے تقاضوں کو سر سید احمد خاں نے سمجھا تھا اور فسانۂ عجائب، داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا تک جو مذاق اظہار و ابلاغ کا رائج تھا اس کے دلدل سے نکال کر اردو نثر نگاروں کو ایک صاف ستھری اور روشن و کشادہ شاہراہ پر محو سفر بنایا تھا۔ اب دنیا بہت آگے نکل چکی ہے اور انسانی زندگی کے تقاضے اور زیادہ صاف گوئی، تیزی و طراری کے طالب ہیں۔ اب زندگی کو ٹکڑوں میں بانٹنے اور بنی نوع انسان کو خانوں میں تقسیم کرنے کا عہد بھی ختم ہو چکا ہے۔ شاید علم و فن کی گذرگاہ پر بھی آفاقی ذوق رکھنے والے مسافر تیز رفتاری سے محو سفر نظر آئیں گے۔ جس فن میں خون جگر کی نمود نہ ہوگی اور جو ادب پارے سے حیات و کائنات کی گتھیاں صاف طور سے سلجھانے کی راہیں نہ کھلیں گی اسے شاید قدر کی نگاہ سے دیکھا جا سکے۔ اب فن کو فکر سے جدا رکھنے اور نظریہ و نقطۂ نظر کو کابوس تصور کرنے والے شاید خال خال ملیں گے۔ آنے والی صدی میں برصغیر میں شاید ایک منصفانہ معاشی و معاشرتی نظام اور ایک صحت مند معاشرہ کی طلب و تمنا کو جو پورا کر سکے گا خواہ سیاست داں ہو خواہ مذہبی رہنما، خواہ فنکار، لوگ اس کے لیے آنکھیں بچھانے کو تیار ہوں گے۔ آزادی اظہار کے ساتھ ساتھ دوسروں کے احساسات و جذبات کے احترام کو فوقیت حاصل ہوگی۔ اس صدی کے تلخ تجربات یہ ہیں کہ فرد اور معاشرہ دونوں کا ضمیر [illegible] ہم

ہو چکا ہے۔ اس بکھراؤ (Fragmentaton) کے مداوا کی سب کو فکر ہے۔ انسانوں کو
جوڑنے والی سب سے بڑی قوت عقیدۂ توحید ہے اور ایک خالق پر پختہ یقین کے بغیر حقیقی
مساوات اور انسانی احترام وجود میں نہیں آسکتا۔ آنے والے عہد میں شخصیتوں سے زیادہ
محکم اصولوں کو اہمیت حاصل ہوگی۔ شخصیتوں کی انانیت سے نوع انسان تھک کر چور چور
ہے۔ دوسری طرف ملک کے مختلف حلقوں اور اجتماعی اداروں میں چھوٹے چھوٹے
اختلافات کے سبب ایک دوسرے کی تذلیل و توہین کرنا ایک عام بات ہوگئی ہے۔ انسانی
احترام اور بنیادی حقوق کی گفتگو خوب ہوتی ہے لیکن ہمارا مزاج مدتوں تک سامراجی
شکنجوں میں دبے رہنے کے سبب غلامانہ ہوگیا۔ غلام اپنے ہم جنسوں سے لڑنے
جھگڑنے میں بہت تیز ہوتا ہے۔ سماجی انصاف اور حقوق انسانی کے لیے صدائے تحسین
آفریں بلند ہوتی رہتی ہے مگر دانشوروں اور قلم کاروں کا طبقہ اس کو اپنی تخلیقات کا
موضوع کم کر نہیں بنا رہا ہے۔ آنے والی صدی میں شاید فرد اور معاشرہ کا اپنے ہنر
مندوں اور فنکاروں سے یہ اولین مطالبہ ہوگا کہ وہ سماجی انصاف اور حقوق انسانی کے لیے
پر زور بلند کریں۔ اس ملک کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ یہاں کہ فکر اور نفرت و انتشار سے لو
لگانے والے صحافیوں اور قلمکاروں کی ایک بڑی تعداد اس تخریبی عمل میں مصروف ہے کہ
ملک میں کمزور طبقات اور اقلیتوں کی تصویر نہایت بھونڈے انداز میں پیش کی جائے اور
تصادم و تفریق کا ماحول گرم کیا جائے۔ شاید اکیسویں صدی میں اس سرزمین کے سچے فنکاروں
کی سب سے بڑی ذمے داری یہ ہوگی کہ وہ اس ملک کی ثقافتی رنگارنگی کو ختم کرنے والی
طاقتوں کو بے اثر بنانے کے لیے ایسے افکار و خیالات سے ماحول کو معطر و منور کریں جو
کثافتوں اور تاریکیوں کو ختم کرسکیں۔

اکیسویں صدی میں ملک کو لسانی، نسلی، مذہبی اور ثقافتی شکست و ریخت سے بچانے میں
ملک کا قلم کار اہم رول ادا کرسکتا ہے۔ ملک کی وحدت اس سرزمین پر آباد انسانوں کی وحدت پر
منحصر ہے۔ انسانی وحدت جارحانہ قوم پرستی یا اکثر واد سے جنم نہیں لے سکتی۔ انسانی وحدت
اس ملک میں کسی طبقے یا گروہ کی غیر ملکی اور کچھ لوگوں کو اس سرزمین کا حقیقی باشندہ قرار دے
کر قائم نہیں کی جاسکتی۔ انسانی وحدت اس طرح بھی وجود میں نہیں آسکتی کہ ہم توحید کے
بالمقابل شرک اور زندگی وکائنات کے بارے میں سائنٹفک اپروچ کے بجائے توہمات اور دیومالا کو
اس ملک کے کلچر کا لازمی جز قرار دیں اور اپنے زور زبردستی سے دوسروں پر تھوپنے کی کوشش
کریں۔ ہندوستان شکست و ریخت اور انتشار و بغاوت کے جن مراحل سے گزر رہا ہے اس میں

کامل انسان دوستی اور بنی آدم کے درمیان اخوت و مساوات کے عالمگیر اصولوں کو جسے اسلام نے پیش کیا ہے اختیار کیے بغیر ملک کی وحدت و سالمیت کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ اس بات کو پورے اعتماد سے اہل وطن کے سامنے رکھنے اور ان اقدار کے سانچے میں ماحول کو ڈھالنے کی کوشش جو قوتیں کر رہی ہیں ان کی حوصلہ افزائی اور انھیں تقویت پہنچانا ایک صاحب بصیرت فنکار کی اوّلین ذمہ داری ہے۔ وہ بسم اللہ کی گنبد میں خود کو بند کر کے اور خوش فہمیوں کی انجمن سجا کر بہت دن خوش و خرم اور صحیح سلامت نہیں رہ سکتا۔ فنکار کے پاس جو نظریاتی و تہذیبی ورثہ ہے اسے خود اعتمادی کے ساتھ آنے والی نسلوں تک اسے منتقل کرنا ہوگا تاکہ وہ آنے والی اقدار سے کھوکھلا ثابت ہوگا تو خواہ اس کی تخلیقات میں الفاظ کی کیسی ہی طلسم بندی کی گئی ہو وہ اپنا وقار و اعتبار قائم نہ کر سکے گا۔ فنکار کو ماحول کا رہنما، قائد، معمار، مصلح اور مقدر ساز بن کر سامنے آنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی ذہنی برتری کا ثبوت پیش کرے۔

آنے والی صدی میں ایک فنکار کی کامیابی اس بات میں مضمر ہوگی کہ وہ اپنی حیات بخش کاوشوں سے پست ہمت اور درماندہ گروہوں اور افراد کی شریانوں میں خون کی گردش تیز بنائے اور عزم و ولولہ اور یقین کا حرارت پیدا کر دے تاکہ وہ فسطائی طوقتوں کے بالمقابل اپنے قدم جما سکیں۔ شاید کسی قوم کے گرتے ہوئے حوصلہ (Morale) کو سنبھالا دینے میں ایک فنکار فیصلے کن اور فعال رول ادا کر سکتا ہے۔ اکیسویں صدی کا اپنے فنکار سے ایک اہم مطالبہ یہی ہوگا کہ وہ اس سرزمین اور دیگر سرزمینوں کے تمام انسانوں کو غلامی کی نفسیات سے نجات دلائے اور انھیں ایک آزاد اور خود مختار شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا شعور و سلیقہ عطا کرے۔ جمہوریت کے تمام نعروں کے باوجود اس کے حقیقی مفہوم سے لوگ ناآشنا ہیں۔ اس کے تقاضوں سے روشناس کرانا بھی ایک فنکار ہی کا فریضہ قرار پائے گا۔ اس وقت کچھ لوگ جمہوریت کا یہ مفہوم بیان کر رہے ہیں کہ تعداد کے اعتبار سے جو تہذیبی گروہ کم ہے وہ ذلت شکست خوردگی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جائے، ملک کے اقتدار میں شرکت اور ملک کے مقدر کی تعمیر نو کا خیال ترک کر دے اور ان فسطائی قوتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے جن کے پس اپنی دیو مالائی توہمات کے سوا کچھ نہیں اور جو یہ چاہتی ہیں کہ جو بھی اس کلچرل فاشزم کے آگے، جسے یہ قوم پرستی قرار دیے ہیں، سر اطاعت خم نہ کرے اُسے اس ملک میں قیام کے حق سے محروم کر دیا جائے۔

آنے والی صدی میں ایک اور اہم کام اہل قلم کو انجام دینا ہوگا کہ وہ ظلم سے مقاومت اور مظلوموں کی حمایت کا ولولہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ پیدا کریں اور اس سرزمین ان پر انصاف کے قیام کو اپنی فکر و تخلیق کا محور بنائیں، تشدد کی مذمت کریں اور محبت و خیرسگالی کے جذبات کو توانائی

ساکر سکے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ فنکار اپنے قارئین کو معمول اور روایت پرستی کے تنگ دائرے سے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کرتے اور ان کے اندر اقدامی اسپرٹ نہیں پیدا کرتے۔ آنے والی صدی کی آواز ہوگی کہ انسانوں کے دلوں کی دنیا میں ہلچل پیدا کرنے کی صلاحیت رکھنے والا ہر ادیب اپنے ہم جنسوں کو خوف و افسردگی کے دلدل سے نجات دلائے۔ خوف کی نفسیات انسانوں کو اس قدر مغلوب و معطل بنا دیتی ہے کہ قوموں کے دلوں سے احساس زیاں تک ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی زبوں حالی کے بارے میں غور کرنے کے لائق نہیں رہ جاتیں۔ اللہ کی کتاب اس معاملہ میں انسان کی بہترین دستگیری کرتی ہے۔ اس کے ذریعہ ایمان و یقین کی وہ چنگاریاں ابھرتی ہیں جو منجمد و ساکت شریانوں میں خون کی گردش تیز کر دیتی ہیں۔

شاید آنے والی صدی میں ثقافتی تصادم اور تہذیبی کشمکش کی لہریں اور شوریدہ سر ہو جائیں گی۔ یہ کشمکش ازل سے انسان کے مقدر رہی ہے اور خیر و شر کے انھیں کرکوں کے درمیان انسانی قافلے محو سفر رہے ہیں لیکن فنکار نے جب درباری مصالحت اختیار کیا ہے تو اس کی قدر و منزلت کا چراغ ٹمٹمانے لگا ہے۔ اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ موجودہ صدی میں اہل قلم کی ایک معتد بہ تعداد اقتدار وقت کے چشم و ابرو کے اشارے پر کار تخلیق انجام دیتی رہی ہے۔ لالچیوں نے ماضی کے بعض ادوار کی طرح اس صدی میں بھی درباری داری کی روایت کو زندہ رکھا ہے اور اہل قلم کے معاشی استحصال کا ارباب اقتدار و اہل ثروت کو موقع دیا ہے۔ کیا آنے والی صدی میں اس قلم فروشی کے دروازے بند ہو سکیں گے کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس بات کے امکانات ضرور موجود ہیں کہ اہل قلم کی ایک معتد بہ تعداد درباری نفسیات کی گرفت میں نہ آسکے گی اور وہ حقیر مفادات سے اوپر اٹھ کر عالم انسانیت کی بہی خواہی اور بلند مقاصد کے احترام کو مد نظر رکھے گی۔

آنے والی صدی بڑی حد تک جہالت سے نجات، آفاق گیر خواندگی اور علم کے پھیلاؤ کی صدی ہوگی۔ اس صدی میں قلم کار کو بیدار اور زیادہ باخبر قارئین سامعین سے واسطہ ہوگا۔ اسے ہر بات تول کر کہنی ہوگی اور اس کے ہر لفظ کے لیے اس سے محاسبہ کیا جائے گا۔ اس لیے زبان و بیان کے ساتھ اس کو اپنے مشاہدات و تاثرات کے اظہار میں بھی بڑی احتیاط کا ثبوت دینا ہوگا۔ حقیقت دری کی منزلیں اب پہلے کی طرح دشوار نہیں رہیں اس لیے تشکیک صداقت اور صحیح نتائج تک رسائی کے معاملہ میں فنکار کی ذمے داری ماضی کے فنکاروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ اب شاید قاطب اس واشگاف لن ترانی اور مبالغہ آرائی کا دور رخصت ہو جائے گا۔ آنے والے دور میں فنکار کا قاطب اس سے ذمے دارانہ رویہ کی توقع کرے گا۔ کسی طرح کے نفاق اور فکر بندی کی گنجائش نہ رہ جائے گی۔ اگر وہ انسانیت کے ذہن و ضمیر کو بیدار

کرنے کے بجائے اسے سلانے کی کوشش کرتا ہے تو تقاضائے جاوی کا سامنا کرنا ہوگا۔ اب شاید اپنے فنکاروں کو معاشرہ سختی سے نظر انداز کرے گا جو حقیر مفادات کے لیے وقت کی سرکش قوتوں کے سامنے خمیدہ سر رہنے کے عادی ہوں گے۔

مستقبل میں گہری نگاہ اور تہہ دار علم و فکر کی قدر دانی کے دروازے کھلنے کے آثار ہیں۔ وہ فنکار جس کا علم سطحی اور جس کی معلومات فرسودہ ہوں گی اور جو اپنے تجربات سے دلچسپی انہماک اور خلوص سے محروم ہے اس کے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا۔

آنے والی صدی میں بین العلومی مطالعہ کی صدی ہوگی بالخصوص ادیب علم کے کسی ایک شاخ تک محدود نہ ہو کر مختلف انسانی علوم تک اپنی فکر نظر کے دائرہ کو وسیع کرے گا بالخصوص معاشرتی علوم سے اس کا تعلق اور گہرا ہو جائے گا۔ اس لیے ہر زبان کے فنکار سے شاید یہ توقع کی جائیگی کہ وہ بند خانوں میں قید رہنے کے بجائے وسعت فکر و نظر کا ثبوت دے۔ سائنس اور الیکٹرانکس کی ترقیات کے اس دور میں الفاظ و حروف سے بھی برقی لہروں اور قطعی و حتمی نتائج تک پہنچانے والے آلات جیسا کام لیا جائے گا۔ لکھنؤ کے دو دہ بیخ کا عہد اب واپس نہیں آسکتا جب علی گڑھ تحریک کے علمبرداروں کی باتیں ہنسی ٹھٹھے میں اڑا دی جاتی تھیں۔ اب تصور و عمل کے فاصلے کو کم از کم کر کے اور انسانی وسائل سے بہتر سے بہتر طور سے کام لینا ایک اچھے معاشرہ اور کامیاب انسان کی اولین پہچان ہوگی۔ یہی توقع ادیب سے بھی کی جائے گی کہ وہ زیادہ سے زیادہ قطعیت سے زور دار اسالیب میں اپنی بات قارئین تک پہنچائے۔ اس میں شک نہیں کہ اب بھی خواب دیکھے جائیں گے لیکن ان خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کا جذبہ اور طور طریقہ بھی فنکار کے پاس موجود ہوگا۔

آنے والے عہد میں شاید روح اور جسم کی دوئی برقرار نہ رہے اسی طرح قالم اور مواد کے درمیان گہرے ربط اور باہمی توازن کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔ کسی نے کتنی اچھی بات کہی کہ آنے والے دور میں الفاظ و لغات اور ہیئت کے مختلف تجربوں کے ساتھ ادیب کو سماج کے ساتھ جینا پڑے گا۔ وہ کتابوں سے اطلاعات لے گا۔ تو کامیاب نہ ہوسکے گا۔ اسے تاریخ ساز نظریات اور اقدار کی دریافت تو کرنی ہوگی۔ وہ محض احتجاج رد عمل اور ایکشن تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس دشت ظلمات سے نکل کر تعمیر تخلیق اور ہم آہنگی وحدت فکر عمل کی روشنی شاہراہ پر قدم بڑھاتا ہوگا۔ شاعری کو پیغمبری کا جزو ماننے والا اور ادیب کو زندگی کی راہنمائی کے منصب پر فائز کرنے کا شاید آنے والی صدی میں زیادہ امکان ہوگا۔ آفاق گیر نظریہ اور آفاق گیر فن کے ایک نئے طلوع ہوگی اور ادب و شاعری کو کھیل تماشا بنانے والے مدعیوں کا دور ختم ہو جائے گا۔

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر شائع ہو گیا ہے

شاعر کا نیا معرکتہ الآرا ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبر (معاصر اردو شعر و ادب کا جدید ترین عالمی جائزہ جلد اول) شائع ہو گیا ہے۔ ایک مدت سے پوری اردو دنیا کو اس تاریخ ساز ادبی دستاویز کا شدت سے انتظار تھا۔ کسی بھی زبان کے ادبی رسائل کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ واحد کارنامہ ہے۔

اس خاص نمبر میں تقریباً ایک ہزار قلم کار شامل ہیں۔ ۲۲۵ قلم کاروں کا تصویری البم۔ ۲۰ مکاتیب مشاہیر کے عکس مع حواشی 'معاصر ادبی مذاکرے' جن میں ۷۱ نئے پرانے قلم کاروں نے حصہ لیا ہے۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین، ۲۳ مختصر مختصر تنقیدی و تحقیقی شذرات، چھ سو سے زائد غزلیں نظمیں، تضمین غزلیں بنام شاعر، ۲۲ مرحوم مشاہیر قلم کاروں کا تعارف مع حواشی 'آگرہ اسکول (ایک متنوع تنقیدی و تحقیقی کتاب) اردو افسانے پر ایک مکمل کتاب جس میں: معاصر اردو افسانے پر ورقی شذرات، معاصر اردو افسانے پر ۴ تنقیدی مضامین۔ اردو افسانے پر ۲۳ تنقیدی شذرات، ۳۶ مختصر و طویل غیر مطبوعہ کہانیاں، ہر افسانہ نگار پر مختلف ناقدین و مبصرین کی آرا جن کی مجموعی تعداد ۲۳۱ ہے۔ ۵ مرحوم مشاہیر افسانہ نگاروں کے غیر مطبوعہ خطوط کے عکس مع حواشی، معاصر اردو افسانے پر ایک اہم مذاکرہ جس میں ۲۱ نئے افسانہ نگار و ناقدین شامل ہیں۔ اوپندر ناتھ اشک اور رام لعل پر بھرپور گوشے۔ افسانہ کہانی کے ماہ و سال کے تحت اردو افسانے پر تنقیدی کتابیں۔ افسانہ نگاروں پر کتابیں، افسانوں کے انتخابات کا تعارف، خاص نمبر کی جلد اول کے فن کاروں پر مشتمل شاعر کے خصوصی ابواب کے تحت سوانحی لغت، ۳۸۶ عالمی اردو قلم کاروں کے مستند سوانحی اشاریے، شاعر ڈائرکٹری (انگریزی میں) جس میں ۲۸۰ عالمی اردو قلم کاروں کے پتے اور ذاتی فون نمبر دیے گئے ہیں۔ نئی صدی کے دستخط کے تحت ۲۶۸ عالمی اردو قلم کاروں کے آٹوگراف چھپے ہوئے ہیں۔ ہر باب اپنے آپ میں ایک مکمل کتاب ہے۔ موجد (پاکستان) کا بنایا ہوا چار رنگ کا دیدہ زیب سرورق، سلطان سبحانی اور حامد اقبال صدیقی کے بنائے ہوئے اندرونی ابواب کے سرورق، ۲۹ مشاہیر قلم کاروں کے کیری کیچر جینت پرمار کے قلم سے۔ اتنا کچھ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ جلد اول سمندر کو کوزے میں سمونے کا ایک نادر تجربہ ہے۔

اس فقید المثال تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی، سوانحی اور دستاویزی ہم عصر اردو ادب نمبر جلد اول کی ضخامت ۷۵۰ صفحات اور قیمت دو سو پچاس روپے ہے (ممالک غیر سے ۱۹۵ [illegible] کے لیے [illegible]) اپنے شہر کے کتب فروش سے شاعر ہم عصر اردو ادب نمبر [illegible] طلب کیجیے۔

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ [illegible]

فیکس e-mail:-maktaba@ndf.vsnl.net.in

سید قدرت نقوی
۱۰۴/۱۵۔اے۔ابا قرزون
کراچی، پاکستان

لغت نگاری

تاریخ لغت نگاری

اردو کے ابتدائی دور میں کسی باقاعدہ لغت کا سراغ نہیں ملتا غالباً اس زمانے میں اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی، کیونکہ اکثر امور فارسی میں انجام دیے جاتے تھے ابتدا میں فارسی کے بعض الفاظ کی وضاحت اردو الفاظ سے ضرور کی جاتی رہی ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب کہ اردو کو ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ فارسی کی کئی تصنیفیں ایسی ہیں جن میں اردو کے الفاظ کو ہندی کے نام سے لفظوں کے معنی کے طور پر لکھا گیا ہے۔ یہ سلسلہ ابتدا میں عربی کی بعض کتابوں میں اردو الفاظ کی شمولیت سے بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ اردو کے وجود پر بطور دلیل کام دے سکتا ہے۔ لغت کے متعلق نہیں ہے۔ یہی حال فارسی شعرا کے دواوین وغیرہ میں اردو الفاظ و محاورات کی شمولیت کا ہے۔ اسی طرح فارسی کی تصنیفوں میں بھی بہت سے اردو الفاظ درج کیے گئے جو اردو کی قدامت پر دلیل بن سکتے ہیں۔

ہم یہاں ان فارسی لغات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں جن میں اردو الفاظ بطور معنی یا بطور مترادف درج ہوئے ہیں۔ ہم نے ان لغات میں مندرج الفاظ کو اردو کہا ہے۔ اسی سلسلے میں پہلے حافظ محمود شیرانی کا یہ بیان قابل غور ہے جس میں انھوں نے ان الفاظ کو اردو بتلایا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اردو کو ہندوی کہا جاتا تھا اور اسے اسی نام سے ان لغت نگاروں نے یاد کیا ہے:

"یہ امر پایہ ہے کہ یہ فرہنگ نگار جس چیز کو ہندوی کہتے ہیں، وہ نہ برجی ہے نہ پنجابی، نہ راجستھانی اور نہ بنگالی و گجراتی۔ ہندی سے ان کی مراد یہی اردو ہے جو اس عہد کے مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی۔ اس لیے ان بعید زمانوں میں بھی اسی قدر ترقی اور وسعت اختیار کرلی گئی تھی کہ پنجاب، بنگالہ، گجرات اور ہندستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس کی دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ مذکورہ بالا فرہنگ نویس باوجودیکہ مختلف مقامات ہند سے تعلق رکھتے ہیں، کوئی مالوہ کا ہے، کوئی بنگالہ کا اور کوئی پنجاب کا، جہاں مختلف زبانیں

بولی جاتی ہیں اور ان لوگوں کا اپنے اپنے وطن کی زبانوں سے واقف ہونا بھی لازمی ہے لیکن اپنے لغات میں وہ وطنی زبانوں کے الفاظ نہیں دیتے بلکہ اسی عام زبان کے جو تمام ملک کے مسلمانوں میں مشترک ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ الفاظ ان تمام لغات میں عام ہیں۔ ۔ ان ہندی الفاظ کے ذخیرہ میں بعض ایسے بھی نظر آتے ہیں جو اگرچہ اصلاً فارسی ہیں لیکن فارسی والوں نے ان کو متروک قرار دے دیا ہے، مگر چونکہ اردو میں برابر استعمال ہوتے رہے ہیں، اس لیے فارسی خوانوں نے ان کا شمار ہندی الفاظ میں کر لیا ہے۔ اس لیے ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ اردو ان ایام میں موجود تھی اور ہندستان کے ہر صوبہ میں جہاں جہاں مسلمانی اثرات تھے بولی اور سمجھی جاتی تھی اور تغلقوں کے دور سے پیشتر ہی مکمل ہو کر ایک حالت پر قائم ہو گئی تھی۔ سیدوں اور پٹھانوں کے دور میں جب دیسی زبانوں میں شاعری کا چرچا ہوا، اردو میں بھی گجرات و دکن میں شاعری شروع ہو گئی۔" (پنجاب میں اردو ۳۵۔۲۳۲) مذکورہ بالا بیان سے یہ بات صاف ظاہر ہو گئی کہ قدیم زمانے میں جس کو ہندوی کہا گیا وہ موجودہ دور کی اردو ہے، پورے برصغیر پاک و ہند میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اب بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا قدیم کتب میں جہاں کہیں بھی ہندی کا لفظ ملے اسے اردو خیال کیا جائے۔

فارسی کی ایسی لغتوں کا سلسلہ دریافت شدہ لغتوں کے حوالے سے علاؤالدین خلجی کے دور سے قائم ہوتا ہے اور غالب کے زمانہ تک چلتا ہے۔ ایسے لغات کے نام، مصنف اور معلومہ حد تک ان کے سنین تالیف لکھے جاتے ہیں۔

اصل لغات:

۱۔ فرہنگ نامۂ قواس: فخر الدین مبارکؒ غزنوی قواس (کمانگر) شاعر عہد علاؤالدین خلجی

ابتدائی فارسی کے بعض الفاظ کی
وضاحت اردو الفاظ سے کی جاتی تھی

(۶۹۰ تا ۷۱۵ھ)۔ یہ پہلی لغت ہے جس میں اردو مترادفات درج ہوئے۔ گو تعداد کم ہے مگر ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔

۲۔ دستور الافاضل: مولانا رفیع المعروف بہ حاجب خیرات دہلوی (۷۴۳ھ)۔ اس میں بھی اردو الفاظ بطور معنی درج ہوئے ہیں۔ فرہنگ نامہ قواس کی اس نے بڑی تعریف کی ہے بطور ماخذ اسے سامنے رکھا ہے۔

۳۔ ادات الفضلاء: قاضی خاں بدر الدین محمد دہلوی المعروف بہ دھار والی (۸۲۲ھ یا

۸۲۲ھ)۔ فرہنگ نامہ قواس اور دستور الافاضل کے بعد یہ لغت اس لیے اہم ہے کہ اس میں اردو الفاظ کافی تعداد میں بطور تشریح و معنی درج ہیں۔

۴۔ زفان گویا: بدر ابراہیم برادر جد جامع شرف نامہ (۸۲۲ھ تا ۸۳۷ھ)۔ مذکورہ تین لغتوں کے بعد اسی لغت میں اردو الفاظ کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہ تمام بطور معنی و تشریح استعمال ہوئے ہیں۔

۵۔ بحر الفضائل: محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمد بدر خزانۂ البلخی المعروف بہ کری (۸۳۷ھ)۔ اس میں اردو الفاظ بطور مترادف اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔

۶۔ مفتاح الفضلا: محمد بن داؤد شادی آبادی (۸۷۳ھ) اس میں بھی اردو الفاظ پائے جاتے ہیں۔

۷۔ شرف نامۂ منیری: مولانا ابراہیم بن قوام فاروقی بنگالی (۸۶۴ھ تا ۸۷۹ھ)۔ اس میں اردو الفاظ بطور معنی و تشریح درج ہوئے ہیں۔

۸۔ قنیۃ الطالبین: قاضی شاہ ابن باب۔ اس کا سن تالیف معلوم نہیں۔ اس میں بھی اردو الفاظ بطور مترادف لکھے گئے ہیں۔

۹۔ تحفۃ السعادت: مولانا محمود بن شیخ ضیا (۸۱۶ھ) یہ سکندر لودھی کے نام معنون ہے اس میں بھی اردو مترادف الفاظ ملتے ہیں۔

۱۰۔ مؤید الفضلا: شیخ دہلوی (۹۲۵ھ)۔ اس میں بھی اردو مترادفات درج ہیں اور اس کی بدولت دوسری لغتوں کے مندرجات کا بھی علم ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ ریاض الادویہ: حکیم یوسفی (۹۴۶ھ) اس میں ادویات، اجناس، امراض اور جڑی بوٹیوں کے اردو نام پائے جاتے ہیں جو فارسی الفاظ کے معنی میں ظاہر کیے گئے ہیں۔

۱۲۔ مدار الافاضل: شیخ اللہ داد فیضی سرہندی (۱۰۰۱ھ) ماخذات میں اس کا نمبر آخر میں آتا ہے۔ اس میں مذکورہ بالا لغات بطور ماخذ آئے اور ہندوی یعنی اردو مترادفات دیے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا بارہ لغات کا مطالعہ و جائزہ اس بات کا شاہد ہے کہ ان میں اردو الفاظ کی ایک معتدبہ تعداد بطور معنی استعمال ہوئی ہے۔ ان میں بہت سی لغتوں کے حوالوں سے اردو معنی کی تصدیق کی گئی ہے۔ ان کو ہم معاون لغات کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ معاون لغات سے مدد دو طرح لی گئی ہے۔ ایک تو فارسی لفظ کے تلفظ و تشریح کے لیے۔ دوسرے فارسی لفظ کی تشریح میں اردو لفظ کی نشاندہی کے لیے۔ کیونکہ ان لغتوں کے نام درج ہوئے ہیں اس لیے ہم بھی ان کے نام گنا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ چند نام خصوصیت کے حامل ہیں۔

لغت فرس اسدی، صحاح الفرس، فرہنگ رشیدی، فرہنگ سروری، فرہنگ شیخ زادہ عاشق، رسالہ النصیر، ناظم الاطباء، لسان الشعراء، حقائق الاشیاء وغیرہ۔

مذکورہ بالا لغات میں جو ہندی یعنی اردو الفاظ آئے ہیں ان کا تلفظ فارسی صوتیات کے تحت درج کیا گیا ہے۔ اس لیے ان کو اخذ کرتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ بہت حضرات نے غلط پڑھا اور ان کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ بہر حال ان لغات سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ اردو بہت قدیم سے موجود مروج تھی۔ بچوں کی فارسی تعلیم کے لیے سب سے پہلے شاید حضرت امیر خسروؒ نے خالق باری لکھی یہ ذو جہت ہے یعنی فارسی مادری زبان رکھنے والے بچوں کو اردو پڑھانے کے لیے اور اردو مادری زبان والے بچوں کو فارسی سکھانے کے لیے مفید ہے۔ اس کو پہلی ذیلی فرہنگ کہا جا سکتا ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ پاک و ہند کے مختلف مقامات پر یہ کتاب رائج تھی۔ ہر مدرسہ کے مدرس نے اپنے ماحول اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلی کی اور اپنے شاگردوں کو پڑھلیا۔ اس طرح اس میں بعض تبدیلیاں ایسی آگئیں کہ بعض محققین نے ان کو نشانہ تنقید بنایا اور کہہ دیا کہ یہ امیر خسروؒ کے عہد سے متعلق نہیں۔ اس لیے یہ امیر خسروؒ کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے مدرسین کے تصرفات کو یکسر نظر انداز کر کے فیصلہ صادر فرمایا جو بداہتہ غلط ہے۔

(خالق باری ضیاء الدین خسرو کی تصنیف ہے)

امیر خسرو کی طرز پر بہت سی خالق باریاں لکھی گئیں۔ کچھ کے نام بدل کر رکھے اور کچھ کو خالق باری کہا گیا مگر ساتھ ہی مصنف کا نام بھی ظاہر کر دیا گیا۔ اس سلسلہ کی آخری کتاب غالبًا قادر نامہ غالب ہے۔ اب تک صرف درسی ضروریات کے پیش نظر اسی قسم کی کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ کسی مبسوط لغت کا پتہ نہیں چلا اس کی وجہ یہ تھی کہ پاک و ہند کی سرکاری زبان فارسی تھی۔

سب سے پہلے عبدالوسع ہانسوی نے خالص اردو الفاظ کی ایک فرہنگ غرائب الالفاظ لکھی، اس میں الفاظ کی تشریح فارسی میں کی گئی ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے اس کے اسقام و تسامحات بتائے اور نوادر الالفاظ نام رکھا۔ یہ اردو الفاظ کے معنی فارسی میں بیان کرنے کی کوشش تھی جو آج بھی کار آمد اور مفید ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندستان میں اپنے قدم جما رہی تھی اور بڑی حد تک ملکی حکومت میں اپنے شاطرانہ رویہ سے دخیل ہو چکی تھی۔ کئی مقامات پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ کاروبار حکومت چلانے کے لیے اسے یہاں کی ملک گیر زبان اردو اپنے افسروں کو

سکھانے کی ضرورت پیش آئی تاکہ عوام سے اپنا رابطہ استوار کر سکے۔ جب حدود سلطنت میں وسعت ہوئی تو مقامی لوگوں کو انگریزی سکھانا ضروری سمجھا، تاکہ وہ ملازمت کر سکیں اور حکام بالا کو پیش آمدہ حالات و واقعات انگریزی میں بتا سکیں۔

امور مذکورہ کے پیش نظر انھوں نے ذو لسانی لغتیں تیار کیں۔ اردو انگریزی اور انگریزی اردو کی لغتیں انگریزوں نے لکھیں اور ان کی دیکھا دیکھی اہل ہند نے بھی ایسی لغتیں کافی تعداد میں لکھیں۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں بہت کچھ کام ہوا۔ بعض انگریزوں نے ذاتی دلچسپی کے تحت بھی یہ کام کیا۔ سب سے پہلے گلکرسٹ ایسے کاموں کے محرک ہوئے۔ گلکرسٹ نے خود بھی بہت کچھ لکھا۔ گریرسن، ڈنکن فاربس، شیکسپیئر اور پلیٹس نے اردو انگریزی لغتیں لکھیں مگر سب سے زیادہ جامع پلیٹس کی لغت ہے۔

ان مستشرقین کے ساتھ سب سے پہلے مولوی سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ لکھی جو شروع میں ارمغان دہلی کے نام سے چھپی تھی۔ اسے دیکھ کر منشی امیر احمد امیر مینائی نے امیر اللغات حصہ اول و دوم مرتب کی۔ ان کی وفات کے بعد مولوی نور الحسن کاکوروی نے امیر اللغات کے کام کو آگے بڑھایا اور نور اللغات کے نام سے ایک لغت چار جلدوں میں مرتب کی جس میں یورپ کے مخصوص الفاظ بھی شامل کیے۔ اس کے تسامحات جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے بیان کیے اور یہ جائزہ فرہنگ اثر کے نام سے چھپا۔

نور اللغات کے بعد خواجہ عبدالمجید نے جامع اللغات چار جلدوں میں مرتب کی۔ انھوں نے مستشرقین کی تمام لغتوں کو سامنے رکھا اور ان سے استفادہ کیا۔ محاورات و ضرب الامثال کی بھی بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ سب سے زیادہ الفاظ پلیٹس سے لیے ہیں۔ مستشرقین کی لغات میں اردو الفاظ و محاورات کی شرح انگریزی میں کی گئی ہے۔ ان لغتوں سے استفادہ میں سب سے بڑی وقت ترجمہ کی ہے۔ ان لغتوں میں اردو الفاظ کی شرح میں جو انگریزی الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے متعدد معنی ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت اس لفظ کے سارے معنی درج کر دیے جو اردو لفظ کے مطابق ایک معنی کے

علاوہ اور سب بیکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض اصطلاحات کا مطلب غلط لیا گیا ہے۔ بالخصوص ان مستشرقین نے بعض اسلامی اصطلاحات و روایات کو غلط طور پر پیش کیا۔

مترجمین نے بھی نا کمی کی وجہ سے جوں کا توں رکھا۔

جامع اللغات سے پہلے اور بعد میں بہت سی عام لغتیں مرتب ہوئیں جو زیادہ تر فرہنگ آصفیہ کی نقل و تلخیص قرار دی جاسکتی ہیں۔ البتہ فرہنگ عامرہ قابل لحاظ ہے۔ مروجہ لغات میں فیروز اللغات کو کافی شہرت اور رواج حاصل ہوا۔ اس کے کئی ایڈیشن بھارت میں بھی چھپ چکے ہیں کیونکہ لفظوں کے معنی کی حد تک اس میں کافی ذخیرہ ہے۔ اگرچہ اس میں بھی تسامحات واسقام ہیں مگر عوامی ضرورت اس سے اچھی طرح پوری ہو جاتی ہے۔

ترقی اردو بورڈ جسے اب اردو ڈکشنری بورڈ کا نام دے دیا گیا ہے، یہ ادارہ آکسفورڈ ڈکشنری کے نمونے کے طور پر ایک مبسوط لغت مرتب کر رہا ہے۔ اس کی تکمیل میں کافی مدت لگے گی۔ اس میں قدیم دور سے لے کر موجودہ دور تک کی مثال ہر لفظ کے لیے مہیا کی گئی ہے اور لفظوں کا اشتقاق بھی درج کیا گیا، لفظوں کے معنی کی جہات بھی متعین کی گئی ہیں۔

اردو لغات کے سلسلے میں یہ مختصر کوائف بیان کیے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کی لغت جیسی لکھی جانی چاہیے تھی ویسی تاحال نہیں لکھی گئی۔ یہی حال قواعد اردو کا بھی ہے کہ وہ اردو کے تقاضوں کے مطابق نہیں لکھی گئی۔ یہ دونوں ایک زبان کے لیے بہت اہم ہیں۔

اقسام لغت

"لغت" وہ کتاب ہے کہ جس میں الفاظ کی حیثیت و معنی پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں کی یہ اقسام ہیں:

۱۔ محدود لغت ۔۲۔ مختصر لغت۔ ۳۔ جامع لغت۔ ۴۔ کامل لغت ۔۵۔ ذولسانی لغت۔ ۶۔ لغت الاعلام۔ (انسائیکلو پیڈیا)

۱۔ محدود لغت یہ لغت عموماً موضوعی لغت ہوتی ہے۔ اس کی اقسام درج ذیل ہیں:

(الف) فرہنگ اصطلاحات: کسی علم یا فن کی اصطلاحات پر مبنی لغت، جس میں اصطلاحات کے معنی و تشریح درج ہوتی ہیں۔ ایسی لغت اس علم و فن کے شعبوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔

(ب) فرہنگ کتاب: بہت سی کتابوں کے آخر میں مشکل الفاظ کے معنی بعنوان "فرہنگ الفاظ" شامل ہوتی ہے۔ اس میں مشکل الفاظ کے معنی ضرب الامثال، اقوال، تلمیحات وغیرہ کی تشریح درج ہوتی ہے۔

(ج) محاوراتی لغت: اس میں صرف محاورات اور ان کی تشریح درج ہوتی ہے جو زبان میں

مستعمل ہوتے ہیں اور طبقات کی نشاندہی بھی درج ہوتی ہے۔

(د) کہاوتی یا ضرب الامثالی لغت: ضرب الامثال کے معنی، محل استعمال، پس منظر، کس طبقے سے متعلق ہے، یہ امور اس لغت میں درج ہیں۔

(د) گنجینۂ محاورات وضرب الامثال: وایسی لغت میں محاورات وضرب الامثال کو یک جا کر کے ان کی تشریح اور معلومات درج کی جاتی ہیں۔

(د) فرہنگ موسومی: کسی خاص کتاب، شاعر، ادیب، علاقہ یا شہر یا طبقے میں موضوع مستعملہ، الفاظ و محاورات کے معنی و مطالب درج کیے جاتے ہیں۔ ایسی لغت کو ان سے موسوم کر دیتے ہیں جیسے "لغات القرآن" وغیرہ۔

(ز) خفتہ الفاظ: یہ فرہنگ یا لغت ایسی ہوتی ہے، جس میں ان الفاظ کو جمع کیا جاتا ہے، جن کا چلن نہیں رہا۔ ایسے الفاظ کا پھر سے مستعمل ہونا یا نئے مفہوم میں استعمال کیے جانے کا امکان پوشیدہ ہوتا ہے۔

(ح) تجزیاتی یا اشتقاقی لغت: اس میں لفظوں کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ یا ایک ہی مادّہ سے بننے والے مختلف الفاظ کو بتایا جاتا ہے۔

(ط) رسالہ تذکیر و تانیث: اس میں لفظوں کے مذکر و مؤنث یا مختلف فیہ ہونا بتایا جاتا ہے۔ معنی بھی بیان کیے جاتے ہیں اور مثال و سند میں اساتذہ کے اشعار بھی درج ہوتے ہیں۔

(ی) لغت مترادفات: اس لغت میں مترادف الفاظ جمع ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ایک لفظ کے مترادف کون کون سے الفاظ ہیں۔

(ک) منظوم لغات: یہ بچوں کی تدریس کے لیے ہوتے ہیں جن کا سلسلہ امیر خسرو کی خالق باری سے شروع ہوتا ہے اور غالب کے قادر نامہ پر ختم ہوتا ہے۔ ان میں فارسی وعربی الفاظ کا اردو مترادف نظم ہوتا ہے۔

(ل) منظوم لغات: یہ بچوں کی تدریس کے لیے ہوتے ہیں جن کا سلسلہ امیر خسرو کی خالس باری سے شروع ہوتا ہے اور غالب کے قادر نامہ پر ختم ہوتا ہے۔ ان میں فارسی وعربی الفاظ کا اردو مترادف نظم ہوتا ہے۔

(ل) آمد نامہ: اس میں فارسی مصادر کا اردو ترجمہ ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے اس قسم کی کتابیں مختلف ناموں سے مرتب ہوئی ہیں۔
(م) تلفظی لغت یا فرہنگ تلفظ: ایسی لغتوں میں لفظوں کا صحیح تلفظ بتایا جاتا ہے بالخصوص عربی الفاظ یا عربی تلفظ، اور زور دیا جاتا ہے کہ اردو میں بھی یہی تلفظ اختیار کیا جائے۔
(ن) عدد الالفاظ: اس لغت میں لفظوں کی بحساب ابجد عددی قیمت کے مطابق ہم عدد الفاظ کو جمع کر دیا جاتا ہے۔ یہ تاریخ گوئی کے لیے مفید و کار آمد ہوتی ہے۔ اس میں لفظوں کے معنی درج نہیں ہوتے۔
۲۔ مختصر لغت: ایسی لغت میں محدود لغت سے زیادہ ذخیرہ الفاظ ہوتا ہے۔ اس کے درج ذیل اقسام میں اس میں نصابی کتب میں مستعملہ الفاظ، محاورے، کہاوتیں، تلمیحات وغیرہ کی تشریح درج ہوتی ہے۔ اس میں اردو نصاب کے علاوہ فارسی نصاب کے الفاظ وغیرہ کے معنی بھی شامل ہوتے ہیں۔ بازار میں عام طور پر ملتی ہے۔
(ب) عمومی لغت: اس میں درسی وغیر درسی یعنی عام استعمال کے الفاظ، محاورات و ضرب الامثال، تلمیحات کی تشریح درج کی جاتی ہے۔ اس میں دفاتر وغیرہ میں استعمال ہونے والے الفاظ بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس کا چلن عام ہے اور مختلف ناموں سے دستیاب ہے۔
۳۔ جامع لغت: یہ لغت عموماً زبان کے وافر ذخیرہ الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے۔ محاورے، کہاوتیں، تلمیحیں وغیرہ بھی شامل ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں مثال بھی دے دی جاتی ہے۔ ایسی لغت زبان صرف چند ہی ہوا کرتی ہیں کیونکہ ان کا مرتب کرنا وقت طلب کام ہے۔
۴۔ کامل لغت: یہ لغت جامع لغت کی توسیعی صورت ہے کہ اس میں قریب قریب تمام الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ لفظوں کے ہر پہلو کو اس میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسناد و امثال بھی درج ہوتی ہیں۔ زبان کے ادوار کے مطابق الفاظ وغیرہ کا اندراج کیا جاتا ہے۔ لفظوں کے ماخذوں اور ان سے بننے والے لفظوں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ اردو کی بعض لغات اس انداز پر بعض ادارے مرتب کر رہے ہیں۔ اب تک ایسی لغت کی کمی کو فرہنگ آصفیہ اور جامع اللغات کچھ حد تک پورا کرتی ہیں مگر ان کو کامل لغت نہیں کہا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ جامع لغت سے افضل و برتر ہیں۔
۵۔ ذولسانی لغت: ایسی لغت جن میں بنیادی زبان اور تشریح زبان الگ الگ ہو، اس کی یہ اقسام ہیں۔
(الف) وہ لغت جس میں اردو الفاظ کی تشریح کسی اور زبان میں کی گئی ہو۔ اردو الفاظ کے

معنی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، ہندی، پشتو، بلوچی، سندھی وغیرہ میں بیان کیے گئے ہوں۔ ایسی بہت سی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔
(ب) وہ لغت جس میں کسی اور زبان کے معنی اردو میں لکھے گئے ہوں۔ ایسی لغتیں بھی متعدد زبانوں کی موجود ہیں۔
(ج) فارسی وانگریزی کی بعض درسی لغت بھی لکھی گئی ہیں۔ انگریزی میں تو طلبہ کے لیے خصوصی ایڈیشن بھی تیار کیا جاتا رہا ہے۔
۶۔ لغت الاعلام: اس میں مشہور ومعروف شخصیات تاریخی مقامات، جغرافیائی مقامات، پہاڑ، دریا وغیرہ کا ذکر بالتفصیل کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا ہے۔ جس کا ترجمہ دائرۃ المعارف کیا گیا ہے۔ اس کی ذیلی شاخیں بھی کی جاسکتی ہیں۔
(الف) لغت الادویہ: جس میں طب میں استعمال ہونے والی دواؤں کے نام، مقام، خواص، امراض جن کے لیے وہ مفید ہیں، فوائد بدرقہ وغیرہ کا بیان بالتفصیل کیا جاتا ہے۔ اس کو طبی انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے یعنی جڑی بوٹیوں وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے۔
(ب) لغت المعدنیات: اس میں دھاتوں، پتھروں وغیرہ کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ صرف دھاتوں یا صرف پتھروں کے متعلق الگ الگ بھی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں نام، مقام، خاصیت، اقسام، اثرات وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔
(ج) لغت الاشجار: اس میں درختوں کے نام، ان کی اقسام، افادیت، ثمرات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کہاں کہاں پایا جاتا ہے یہ بھی بتادیا جاتا ہے۔
(د) محدود انسائیکلوپیڈیا: اس میں کسی فرقے، گروہ یا مذہب وغیرہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات، ممالک، تاریخی مقامات وغیرہ کا ذکر بالتفصیل ہوتا ہے۔ جیسے "اسلامی انسائیکلوپیڈیا" وغیرہ۔

متن لغت

ایک لغت میں ان امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:۔
۱۔ زبان میں مستعمل تمام قدیم وجدید الفاظ کا احاطہ کیا جائے۔
۲۔ جہاں تک ہوسکے قدیم ماخذات سے تمام الفاظ اخذ کیے جائیں خواہ وہ آج کل مستعمل ہوں یا نہ ہوں۔
۳۔ قدیم الفاظ کے املا کا اختلاف، جدید املا کو بطور مترادف لکھ کر واضح کیا جائے۔
۴۔ ضبط الفاظ میں، اسماء، صفات اور حروف کو بحالت مفرد اولیت دی جائے۔

۵۔ مرکبات میں صرف ان مرکبات کو لیا جائے جو کسی خاص معنی کو ظاہر کرتے ہوں۔
۶۔ مستند و غیر مستند، فصیح و غیر فصیح، متروک و مقبول سب قسم کے الفاظ کا اندراج کیا جائے کیونکہ مذکورہ امور کے متعلق کوئی حتمی رائے یا قطعی معیار مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ذاتی ذوق و پسند و ناپسند کا مسئلہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔
۷۔ عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ سے بھی گریز و اجتناب نہ کیا جائے۔ یہ بھی متنازعہ مسئلہ ہے، نشاندہی کی جاسکتی ہے۔
۸۔ مخصوص طبقوں سے مختص الفاظ بھی لیے جائیں اور بتا دیا جائے کہ یہ اس طبقے سے متعلق ہیں۔
۹۔ عورتوں میں مستعمل مخصوص الفاظ و محاورات پر خاص توجہ دی جائے اور تخصیص واضح کردی جائے۔
۱۰۔ پیشہ ورانہ اصطلاحات کا احاطہ کیا جائے۔ پیشہ کی صراحت کی جائے۔
۱۱۔ پیشہ وروں، مزدوروں میں مروج بگڑے ہوئے الفاظ کو درج کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ وہ الفاظ آج کل افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں مستعمل ہیں۔ ان کا اصل روپ ظاہر کردیا جائے۔
۱۲۔ علمی و ادبی اصطلاحات قدیم و جدید درج کی جائیں۔ علم و اصناف سخن کی نشاندہی کردی جائے۔
۱۳۔ قانونی اصطلاحات بھی درج کی جائیں کیونکہ ان سے عوام کو واسطہ پڑتا رہتا ہے۔
۱۴۔ سیاسی اصطلاحات رموز و کنایات کے الفاظ کا اندراج ناگزیر ہے۔
۱۵۔ صحافیانہ الفاظ بھی درج ہوں تاکہ اخبار بینی میں ان سے مدد لی جاسکے۔
۱۶۔ جدید علوم کی نئی اصطلاحات اس طرح درج ہوں کہ بآسانی سمجھ میں آجائیں۔ یہ اصطلاحات عموماً ترجمہ ہوتی ہیں اس لیے دیکھا جائے کہ ترجمہ تحت اللفظی ہے یا فنی۔ اکثر تحت اللفظی ترجمہ اصطلاح نہیں بنتا اس لیے وہ لغت میں درج نہیں کیا جائے۔ فنی ترجمہ دیا جائے۔
۱۷۔ جدید الفاظ، جدید ادب اور نئی ایجادات کی بدولت زبان میں داخل ہوتے رہتے ہیں ان کو درج کیا جائے۔ یہ نہ سوچا جائے کہ ابھی ان کا چلن نہیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلن بڑھنے کے امکان کو نظر انداز نہ کیا جائے۔
۱۸۔ دخیل الفاظ کا اندراج ضروری ہے۔ اس کے لیے زبان کی نشاندہی ضروری ہے کہ فلاں زبان کا لفظ ہے۔ اس کی اصل یہ ہے اور اس میں املائی عرفی یا صوتی تغیر واقع ہو کر یہ

شکل بنی ہے۔ اصل میں یہ معنی ہیں مگر معنوی تغیر ہو کر یہ معنی مستعمل ہیں۔
۱۹۔ جن لفظوں کو مردہ قرار دے دیا گیا ہے ان کا اندراج ضروری ہے۔ اول تو اس دور کے ادب و زبان کی تفہیم کے لیے ہو دوسرے ان کے پھر زندہ ہونے اور نئے معنی میں مستعمل

ہونے کے امکان کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ دراصل الفاظ مردہ نہیں ہوتے ان کا استعمال رک جاتا ہے۔ ان کو خفتہ الفاظ کہنا چاہیے۔
۲۰۔ ایک لفظ سے بننے والے مختلف مرکبات کو اس لفظ کے تحت بطور تحتی مرکبات درج کیا جائے۔
۲۱۔ بعد و فصل زمانی و مکانی سے معنی میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان کو ظاہر کیا جائے۔
۲۲۔ تحتی مرکبات میں سے وہ مرکبات جو بلحاظ ترتیب بھی قابل اندراج ہوں انھیں اپنے ترتیبی مقام پر درج کیا جائے۔
۲۳۔ بعض مادے ایسے ہیں جو صرف مرکبات میں مستعمل ہیں۔ تنہا نہیں۔ ایسے مادوں کی نشاندہی بحیثیت لفظ کر دی جائے تو بہتر ہے ورنہ ہر مرکب کے ساتھ اس کے اجزا میں بتا دیا جائے کہ مادہ اصلی یہ ہے اور لاحقہ یا سابقہ یہ ہے۔ یہ عمل اشتقاق میں ہوں۔
۲۴۔ بعض لاحقے اور سابقے کسی لفظ کے ساتھ ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ان کو الگ

کرنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن تجزیہ کرتے وقت ان کو ظاہر کر دینا چاہیے۔
۲۵۔ لاحقوں اور سابقوں کی نشاندہی کرنی ضروری ہے اور یہ بھی کہ ان کی وجہ سے معنی میں کیا تبدیلی ہوئی۔
۲۶۔ ہر لاحقہ اور سابقہ ابتدا میں ایک مستقل اور بامعنی لفظ تھا لیکن کثرت استعمال سے تخفیف پا کر اس کی اصل اب نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اصل تلاش کر کے بتا دی جائے۔
۲۷۔ ہر لفظ کے متعلق یہ بھی بتا دیا جائے کہ وہ مورد، مفرس، معرب، مہند یا مولد ہے۔ اسم، صفت، فعل، متعلق فعل، حرف یا ظرف ہے۔ واحد، جمع یا مذکر و مونث کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔

۲۸۔ ہر لفظ کی قواعدی حیثیت متعین کی جائے۔
۲۹۔ اعلام میں سے صرف وہ لیے جائیں جو کسی خاص وصفی معنی میں یا بطور تلمیح یا ان سے نسبتی معنی میں مستعمل ہیں۔
۳۰۔ فعل یا مصدری صورت میں، لازم، متعدی، حقیقی، جعلی، طور مجہول، مفرد یا مرکب حیثیت ظاہر کر دی جائے۔
۳۱۔ مصدری مادّہ یا اجزا بتا دیے جائیں۔
۳۲۔ افعال لغت میں درج نہیں کیے جاتے جو کسی مادّہ یا مصدر سے مشتق ہوتے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل کے صیغے درج نہیں ہوں گے۔

۳۳۔ افعال کی وہ اشکال درج ہوں جو بطور صفت بھی مستعمل ہوں۔ ایسی اشکال عموماً صفت کی تحقیقی صورت سے وجود میں آتی ہیں۔
۳۴۔ لغوی تحلیل و ترکیب کی نشاندہی کر دی جائے ۳۵۔ ہر لفظ کے معنی کی ارتقائی منازل اور مدارج بتائے جائیں۔ قدیم معنی، اصل معنی میں تبدیلی موجود معنی، وہ معنی جو ترک کر دیے گئے۔ سب کا احاطہ کیا جائے۔

۳۶۔ ہر لفظ کے حقیقی، مجازی، اصطلاحی، تلمیحی معنی ظاہر کیے جائیں۔
۳۷۔ ایک ہی لفظ متعدد قواعدی حیثیت میں مستعمل ہوتا ہے۔ ایسے لفظ کی ہر حیثیت جدا گانہ قائم کر کے اس کے معنی بتائے جائیں۔
۳۸۔ بعض الفاظ معنوی ارتقا کے برعکس معنوی تنزل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یعنی ابتدا میں وہ اچھے معنی میں استعمال ہوئے مگر فصل زمانی اور بعد مکانی کی بدولت اور طبقاتی کشمکش کی زد میں آکر بہت نچلی سطح پر معنوی حیثیت کے حامل ہو گئے۔ اس تنزل کا تدریجی جائزہ لینا چاہیے۔

۳۹۔ محاورات اردو زبان کا ایک عظیم سرمایہ ہیں لیکن یہ محاورہ ایک مرکب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر مرکب لغت میں درج نہیں ہو سکتا۔ اس لیے محاورات کے اندراج میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہیں محاورہ کی جگہ مرکب درج نہ ہو جائے۔

۴۰۔ روز مرہ کا درج لغت ہونا ضروری ہے، لیکن روز مرہ کا صحیح علم ہو جب درج کیا جائے۔
۴۱۔ ہر مرکب فعلی، قابل اندراج نہیں ہوتا۔ صرف ان مرکبات فعلی کو درج کیا جائے جو کسی خاص معنی میں مستعمل ہوں۔

۴۲۔ کہاوتیں یعنی ضرب الامثال ضرور درج کی جائیں۔ جہاں تک ہوسکے ان کا پس منظر بھی بیان کر دیا جائے۔
۴۳۔ کہاوتوں کا اندراج کرتے وقت ان میں مستعمل الفاظ کو بھی ان کی ترتیب کے لحاظ سے درج کیا جائے۔
۴۴۔ مقولے بھی درج لغت کیے جائیں کیونکہ یہ ایک خاص مفہوم کو ادا کرتے اور کسی تجربے کا نچوڑ ہوتے ہیں۔
۴۵۔ کسی لفظ کے معنی لکھتے وقت پہلے اس کی تشریح یا تعریف کی جائے پھر مترادف الفاظ لکھے جائیں۔
۴۶۔ معنی میں مترادف یا قریب المعنی الفاظ میں امتیاز قائم کیا جائے۔
۴۷۔ جو لفظ مختلف معنی میں مستعمل ہو تو اس کی معنوی تقسیم کی جائے۔ لغوی، اصطلاحی، مجازی معنی بتائے جائیں۔ ان کا فرق اور ذیلی تقسیم بھی کی جائے۔
۴۸۔ مجازی اور لغوی معنی میں فرق کے ساتھ معنوی پہلوداری بھی ظاہر کی جائے ساتھ ہی معنی کا خفیف سے خفیف فرق الگ بتا دیا جائے۔
۴۹۔ بشرط امکان و ضرورت لفظ سے متعلق کوئی تصویر ہو تو اس کو بھی شامل کر لیا جائے۔
۵۰۔ جغرافیائی اعلام درج لغت نہیں ہوں گے لیکن اگر کوئی تلمیح وغیرہ کسی سے وابستہ ہے تو وہ درج ہوگا۔
۵۱۔ تاریخی اعلام بھی قابل اندراج نہیں۔
۵۲۔ تاریخی القاب و خطابات جو عمومی ہوں ان کو درج کیا جائے۔
۵۳۔ وہ القاب و خطابات جن کا اطلاق مخصوص شخصیات پر ہوتا ہو درج کیے جائیں۔

۵۴۔ عہدوں کے نام قابل اندارج ہیں کہ وہ کسی کے لیے مخصوص نہیں ہوتے۔

۵۵۔ ایسے مرکب و مفرد الفاظ جو کسی عہدے یا کسی لقب و خطاب کے ساتھ ساتھ اور معنی بھی رکھتے ہوں قابل اندراج ہوں گے۔

۵۶۔ کتابوں کے نام بھی قابل اندراج نہیں۔ وہ لغوی یا اصطلاحی یا تلمیحی معنی رکھتے ہوں تو درج کیے جائیں۔

۵۷۔ لغتوں کے انضباط میں ترتیب تہجی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

۵۸۔ حروف مفرد، مرکب، مخلوط، ہلکے، بھاری بلحاظ اصوات ہوتے ہیں۔ ان کو بڑی ترتیب میں ممتاز کرنا ضروری ہے۔

۵۹۔ ہر لفظ پر اعراب لگائے جائیں۔

۶۰۔ اعراب بالحروف یعنی ہر لفظ کے ہر حرف کی حرکت نام لے کر ظاہر کی جائے کہ فلاں حرف پر فلاں حرکت ہے۔

۶۱۔ تلفظ ظاہر کرنے کے یہ دو طریقے ہیں، ان میں سے کسی ایک کی پابندی کو لازمی قرار دیا جائے۔

۱۔ کسی ہموزن معروف لفظ سے اظہار تلفظ کیا جائے۔ غیر معروف لفظ غیر مفید ہوگا۔

۲۔ لفظ کے ہجائی جوڑ الگ کر کے تلفظ کر کے تلفظ ظاہر کیا جائے۔

۶۲۔ زبانوں کے ناموں کے مخففات کا اظہار ابتدا ہی میں کر دیا جائے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ لفظ فلاں زبان کا ہے۔

۶۳۔ معروف حرکات و اعراب کی علامتوں کے ساتھ ساتھ نئی علامات کی نشاندہی اور وضاحت ضروری ہے۔

ایک عمدہ لغت میں مذکورہ بالا اُمور کا پایا جانا ضروری ہے۔ قدیم لغتوں میں بہت سی باتیں فصل رسانی کی وجہ سے نہیں ہیں۔ وہ جس دور میں مرتب ہوئیں، اس دور میں اتنا لسانی اور لغوی شعور نہیں تھا جتنا اب ہے۔ آئندہ لغت مرتب کرتے وقت پیش کردہ امور کو مدنظر رکھا جائے گا تو ایک اچھی لغت تیار ہو سکے گی۔ (بہ شکریہ ' اخبار اردو)

احمد صغیر صدیقی
102-A Marjina Complex
Gulshan-e-Iqbal-13-B
Karachi-Pakistan

غزل کے مزید جدید رجحانات

مشفق خواجہ صاحب کے لاغر مراد آبادی کی طرح ہمارے بھی ایک دوست ہیں مجبر بغدادی۔ یہ بغداد کے رہنے والے نہیں ہیں اور نہ ہی "قاعدہ بغدادی" ان کی تصنیف ہے بلکہ سرے سے ان کی کوئی تصنیف نہیں۔ البتہ مسودے بہت سے ہیں جن میں کئی عدد دیوان اور تنقیدی مضامین کے مجموعے شامل ہیں جو ابھی تک کہیں نہیں چھپے۔ وجہ انھوں نے اس کی یہ بیان کی ہے کہ یہ چیزیں اس ملک کے لیے نہیں ہیں۔ ان کی مارکیٹ دوبئی اور امریکا میں ہے۔ انھیں وہاں اپنے رسالے میں چھاپیں گے اگر کبھی وہ نکل سکا۔

ایک روز ملنے آگئے۔ کافی جوش میں تھے۔ کہنے لگے۔ تم نے رفیق احمد کا نکالا ہوا نیا چہار رہ روزہ دیکھا؟"

میں نے کہا "ایک جگہ دیکھا تو تھا"

بولے۔ "اس میں دو عدد مضامین غزل کے جدید رجحانات پر ہیں۔ ایک مضمون ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ہے اور دوسرا جناب سحر انصاری کا۔"

میں نے کہا۔ "پھر؟"

بولے۔ "یار بہت خیر ہوئی۔ میں نے بھی اسی موضوع پر ایک مضمون لکھ رکھا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اس میں خیر کی کیا بات ہے؟"

کہنے لگے۔ "دراصل ان دونوں مضامین میں وہ تینوں رجحانات کا ذکر موجود نہیں جن کا ذکر میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "واہ۔ اور کیا ہیں وہ رجحانات؟"

بولے۔ "مضمون تو پاس نہیں کہ سناؤں۔ تم موٹی موٹی باتیں سن لو۔"
میں نے کہا "سنائیں۔"
بولے۔ "اب دیکھو دراصل ان دنوں بس یہی تین رجحانات اہم ہیں جو میں نے لکھے ہیں۔ یعنی ایک خاص قسم کی غزل وہ ہے جس میں گھوڑے، سپاہی، تاج، لشکر، سلطنت، محل سرا، سازش اور اسی طرح کی لفظیات اور تراکیب کے سہارے غزل کی فضا بنائی جاتی ہے۔ چند شاعر خالصتاً ایسی غزلیں کہہ کر ایک دم "منفرد" قرار دیے گئے ہیں یار۔ میں نے بھی اسی طرز کی غزلیں کہہ رکھی ہیں۔ کہو تو ایک آدھ شعر سناؤں"
میں نے کہا ضرور سنائیے۔"
"سنو" انھوں نے کہا۔

عجب ہی شان سے نکلا تھا وہ شغلی میں لڑنے
نیام اس کی کمر میں تھی اور شمشیر غائب

انھوں نے دوسرا شعر سنایا۔

وہ کب سے تخت پر بیٹھا ہوا تھا
اگرچہ سلطنت اسکی نہیں تھی

اس سے قبل کہ وہ تیسرا شعر سناتے میں نے ہاتھ اٹھا کر انھیں روک دیا اور بھرپور انداز میں ان کے انفرادی انداز کی داد دی۔ میں نے کہا "نہ ہوا میں کوئی وزیر کبیر ورنہ ایک رسالہ نکال کر تمھیں اپ کا چیف ایڈیٹر بنا دیتا" وہ مسکرائے اور بولے۔
"اب دوسرے رجحان کی سنو۔ اس غزل میں، فرشتے ہوتے ہیں، بارہ دریاں ہوتی ہیں۔ زیتون کے باغ ہوتے ہیں۔ یمن اور بخارا ہوتے ہیں اور کوہ قاف وغیرہ۔ میں نے اس قسم کی بھی بہت سی غزلیں کہہ رکھی ہیں۔ چلو سنو چند اشعار نمونے کے۔"
پھر وہ کھنکار کر گویا ہوئے۔

پتا کیا تھا کہ اپنا منہ بخارا کی طرف ہے
کہ ہم تو گھر سے کوہ قاف کی جانب چلے تھے

میں نے کہا۔ "واہ"

بولے۔۔۔۔ غزل تھی سرخ اور اشعار نیلے
اگرچہ اس میں الحمرا نہیں تھا

"کیا کہنے ہیں" میں نے نعرہ لگایا۔

بولے "اور سنو۔

فضا میں دور تک پھیلی تھی اک خاکستری بو

فرشتوں کے سبھی پر جھڑ گئے تھے جھاڑنے میں

"آہ۔ واہ" میں زور سے چیخا۔ "بس بس"

"ابھی ایک اور طشتری والا شعر باقی ہے" وہ بولے۔

میں نے کہا۔ "نہیں ہرگز نہیں۔ مجھے ابھی سے لطف اندوز ہونے دو۔"

میرا negative انھیں اچھا لگا۔ وہ ذرا دیر چپ رہے۔

پھر بولے۔ "کیسے شعر تھے؟"

میں نے کہا۔ ایکدم لاجواب۔ بقول ناقد ڈاکٹر مرزا صاحب کے میں کہتا ہوں تمہارے ان اشعار میں غزل کی مختلف روایات کے گمشدہ شعور کی بازیافت بھی ہے اور اس کے تمام منطقہ حارہ کے احوال بھی۔ اللہ اللہ۔"

وہ بہت خوش ہوئے۔ بولے۔ میرا ارادہ ہے ذرا ایسی سو پچاس غزلیں کہہ لوں تو دیوان لے آؤں گا اور اگلا آدم جی انعام میرا ہی ہوگا۔

میں نے حیرت سے انھیں دیکھا اور کہا۔ کیا کہہ رہے ہو۔ آدم جی ایوارڈ اب کہاں ہے؟

انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ بولے۔

"پہلے ہی کہاں تھا"

مجھے مذاق سوجھا۔ میں نے کہا۔ "تم خود ہی اپنے نام کا کوئی ایوارڈ جاری کر کے خود ہی اسے وصول کر لیتا"

وہ سنجیدہ ہو گئے۔ اور سر کھجاتے ہوئے بولے۔

"آئیڈیا تو اچھا ہے"

میں نے کہا۔ "اچھا غزل کا تیسرا رجحان رہ گیا" کہنے لگے۔ "یہ رجحان دونوں سے الگ ہے۔ اس میں غزل ایسی ہوتی ہے کہ ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہوتی۔"

میں نے بھویں سکوڑتے ہوئے پوچھا۔

"وضاحت کرو"

بولے۔ "اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں کہ سوائے شاعر کے انھیں اور کوئی

نہیں سمجھ پاتا اور جو سمجھ لیتا ہے اسے مضمون لکھنا پڑ جاتا ہے۔"

"اوہ"۔ میں نے کہا۔ "کچھ مزید وضاحت کرو"

بولے۔ "میں نے وضاحت کے لیے اس قسم کے متعدد شعر کہہ لیے ہیں اور مضمون میں انہی کے ذریعے اپنی بات واضح کی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے شعر سنانے شروع کر دیے۔

نشاط کار ہے بے کار پھرنا

جہاں پھرنا ادھر ہر بار پھرنا

مقصود ازدہام ہے وحشت گزیدگی

سر ہو جنوں میں ہمارے دیوار کھینچ کر

میں نے کہا۔ "سبحان اللہ"

انھوں نے ایک شعر اور سنایا۔

وفور شوق میں تعمیل کردے

کے منظور ہے تسلیم کرنا

میں نے کہا۔ "یار تم تو کمال کر رہے ہو"

خوش ہوئے۔ کہا۔ "بولو کچھ سمجھے۔ کہو تو اور سناؤں"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ اب مجھ سے سنو"

کہنے لگے۔ "اچھا تو یہ انداز غزل تمھیں بھی پسند آیا ہے۔؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ میں تمھیں غزل کے ایک چوتھے رجحان سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسے بھی اپنے مضمون میں ڈال لو۔"

وہ سنجیدہ ہو گئے۔

بولے۔ "اچھا تو کوئی رجحان مجھ سے چھوٹ گیا ہے؟؟ میں نے کہا۔ "ہاں۔ اور وہ ایک اور قسم کی غزل کا ہے۔ کہو تو نمونۃً ایک مصرع سناؤں؟"

ہاں بھئی۔ بالکل" ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولے۔

میں نے کہا۔ "مصرع ہے۔ ہماری ٹانگ میں دردِ جگر ہے۔"

وہ بڑے زور سے ہنسے۔ بولے۔ "کیا بات کہی ہے۔ بچپن میں سنا ہوا ایک مصرع یاد آگیا۔ "کوا اندھیری رات میں دن بھر اڑا کیا"

وہاب اشرفی
ہارون کالونی، سکٹر-۲، پٹنہ

جابر حسین کی افسانہ نگاری

اردو افسانے کے ارتقائی سفر میں کئی منزلیں آئیں۔ ہر منزل پر کچھ ایسے نقوشات مرتب ہوئے کہ ان کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ اس صنف نے کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ جیسے اور جتنے نقوشات ہے سب آگے کے سفر کی گواہی بن کر ابھرے۔ صاف لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں افسانے کا سرمایہ بہت وسیع ہے، وسیع ہی نہیں، متنوع بھی ہے۔ چنانچہ آج اردو افسانہ دنیا کی کسی زبان کے افسانے سے پیچھے نہیں ہے۔ اس صنف سے وابستہ فنکاروں نے ایسے امتیازات پیدا کئے جن کی مثالیں اس فن کے فروغ اور ارتقا پر دال ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب اس صنف کو عشق و محبت کی بالائی سطحوں کی صف میں رکھ کر دیکھنے اور برتنے کی کوشش کی گئی۔ عشقیہ اور رومانی افسانوں کی بھرمار میں چند ایسی بھی تخلیقات سامنے آئیں جو ایسے موضوع کو سمیٹنے کے باوجود کل بھی اہم تھیں اور آج بھی۔ لیکن جلد ہی لوگوں نے محسوس کیا کہ افسانے کا موضوع عورت محض نہیں ہے۔ زندگی کے دوسرے مطالبات بھی ہیں جن سے اسے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ بات قابل اعتنا نہیں رہی کہ

"لٹریچر سے عورت اور اس کے ذکر کو نکال دینے کے بعد آپ کے پاس کیا رہ جائے گا۔ کائنات میں کون سی دوسری چیز ایسی ہے جس سے آپ اس کی رونق کو قائم رکھ سکیں۔"

خیال درست ہے لیکن عورت محض محبوبہ نہیں ہے۔ اس کی شخصیت محض اکہری نہیں ہے۔ اس کو برتنے کے لئے اس کو اوپر سے دیکھنے کی بجائے اس کے رگ و پے میں اترنے کی ضرورت پڑے گی جو بعد کے افسانہ نگاروں کا مقدر تھا۔ دوسرے دور میں افسانہ زندگی کے وسیع تر امکانات سے وابستہ ہو گیا۔ چنانچہ 'سوز وطن' سے لے کر 'کفن' تک اس صنف میں سماجی مسائل آئینہ ہونے لگے۔ مارکسی اور اشتراکی تصورات کے بیچوں بیچ جنسی پیچیدگیاں افسانے کے قوام میں اس کی شقوں کی وسعت میں افسانہ کا سبب بنیں۔ سے عہد میں وجودی افکار کے تحت افسانہ قدرے فنی، داخلیت پسند، علامتی اور استعاراتی کیف سے ہم آہنگ ہو گیا۔ اس کا عمومی مزاج تنہائی، غم و الم، قدروں کی شکست و ریخت، زندگی کی بے کلی، لایعنیت وغیرہ

ظہور۔ لیکن اس کا زور بھی ٹوٹا۔ مگر یہ بڑے اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ افسانے کی یہ منزل بھی کئی اہم تخلیقات سے اردو افسانے کے سرمائے کو مزید گرانبار کر گئی۔

اس پس منظر میں جابر حسین کا افسانوی مجموعہ "سن اے کاتب" روایت سے وابستہ بھی ہے اور اس سے الگ بھی۔ روایت سے اس کی وابستگی اس لئے ہے کہ اس کے مزاج میں پریم چند کے تیور کی نشاندہی کی جا سکتی ہے اور الگ اس طرح ہے کہ نیر مسعود حرف نہ گفتن' کے خلاف جابر حسین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سچائیوں کو فکشن بننے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ تصور یہ ہے کہ فکشن میں جھوٹ کی آمیزش سچ سے زیادہ ہوتی ہے اور یہ بھی کہ کبھی جھوٹ فکشن میں کے سچ سے زیادہ تابناک ہو جاتا ہے۔ لیکن جابر حسین اپنی کہانیوں کو سچی کہانیاں کہتے ہیں لہذا ان میں دہری آنچ محسوس کرنی چاہئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ خالق کا سچ اتنا کھرا ہوتا ہے کہ ذرا بھی آرائش کو برداشت نہیں کرتا۔ نتیجے میں آراستگی سے ماورا ان کے سارے افسانے وارفتگی کی سرحد پر نظر آتے ہیں۔ ادب میں مختلف ہونا بڑی بات ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ کوئی بڑی تخلیقی قوت یا خود بڑی تخلیق سامنے ہو اور اسے مثال بنا کر اگر خالق کچھ کہنا چاہے تو وہ ہمیشہ اس آئیڈیل سے کمتر کی کوشش ہوگی۔ ظاہر ہے فنکار جو آگے بڑھنا چاہے گا وہ بندھے ٹکے ملال کو توڑنے پر مجبور ہوگا۔ غالباً یہ فکر جابر حسین کے ہر تخلیقی رویے میں جاری و ساری رہتی ہے۔ ورنہ انگریزی کا ایک اچھا طالب علم اور استاد ہونے کے باوجود کیا جابر حسین کو اس کی خبر نہیں ہے کہ استعارہ سازی تخلیق کے جوہر کو مزید صیقل کرتی ہے؟ لیکن نہیں' یہ سب کچھ جاننے کے باوصف ایک نئی راہ اختیار کرنے کا عزم وہ طلب بھی ہے اور challenging بھی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ عمومی طور پر جابر حسین اپنے تمام افسانوں میں ایک protest کی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہر سطح کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانا چاہتے ہیں۔ ننگے بھوکے دلتوں کی مزاج پرسی کرتے ہوئے استحصال کرنے والوں کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں اور انسانیت کی شیرینی کو ہر سطح پر پہنچانا چاہتے ہیں۔

جابر حسین کا افسانوی مجموعہ "سن اے کاتب" کا پہلا افسانہ "بند دکان" ہے۔ اس مضمون سے افسانہ کی ہیروئن ایک چائے کی دکان کرتی ہے۔ وہ کبھی فکر مند اور تفکر کی حالت میں نہیں دیکھی جاتی۔ دیکھئے اس کی دکان پر آنے والے لوگ کیسے ہیں۔

> "قسم قسم کے لوگ آتے اس کی دکان پہ۔ ہنستے گاتے لوگ۔ غمگین اور اداس لوگ۔ تھکے ہارے لوگ اور ترو تازہ لوگ۔ ہر کوئی اپنے حصے کی چائے پی کر وہاں سے چل پڑتا۔ میں نے آج تک کسی چائے پینے والے کو اس سے چائے کی طلب کے علاوہ اور کوئی بات کرتے نہیں سنا۔"

نہ جانے کیوں وہ نفسیاتی طور پر افسانہ نگار کے سیاسی نظریے کے ساتھ ہے اور وہ اسے ہی ووٹ

کے استحصال سے آزاد کرانا۔ اپنی خواہوں کے ساتھ وہ گاؤں سے شہر آئی لیکن جنتی ان کے ساتھ مل کر کام کا کوئی منصوبہ نہیں بنا پائی۔ وہ جہاں گئی جس سے ملی اسے ایک ہی جملہ سننے کو ملا "آلوم لا جاؤ" (شرم مت کرنا) اور آخرش اس نے گاؤں کے پردھان اور راجدھانی میں اپنے شوہر کے دوستوں کا کہنا مان لیا ہے۔ اب وہ شرم نہیں کرے گی لیکن اس کا عزم ہے کہ شہر کے پردھانوں سے پیسہ بھی نہیں لے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گاؤں کے مہاجنوں اور شہر کے انقلابی نیتاؤں کے بیچ کا رشتہ سمجھ چکی ہے اور اس پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ اسے آگے کی زندگی کا راستہ اکیلے ہی طے کرنا ہے اور یہ بھی کہ جو لوگ اس کے جسم کی قیمت لگانے کو تیار ہیں اس کی زندگی کے ساتھی نہیں بن سکتے۔ آخری مرحلے میں افسانہ نگار جنتی کے چہرے پر سورج دیکھ رہا ہے جو دور سنتھالوں کی ایک بستی کے آسمان پر آہستہ آہستہ اگ رہا ہے۔

پسپائی کے بعد حوصلے اور عزم کی یہ کہانی زندگی کی نئی تعبیر کا شاخسانہ بن جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے جنتی اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہو لیکن اس کے چہرے کی تابندگی ایک ایسا protest ہے جو دیرپا بھی ہے اور گہرے اثرات قائم کرنے کی متحمل بھی۔ چہرے پر چمک کی کیفیت شکست کو فتح میں مبدل کر دیتی ہے۔ دراصل افسانہ نگار داخلی جرات کو جس کی نمو پذیری پر شک کرنے کی گنجائش ہو سکتی ہے بڑی اہمیت دے رہا ہے اور دینا بھی چاہیے اس لئے کہ دبا ہوا بیج ہی تناور درخت بن سکتا ہے۔ جنتی کے جھکنے میں ٹوٹنے کا عنصر غائب ہے اور یہی اس افسانے کی روشن لکیر ہے اور افسانہ نگار کا مشن بھی۔ افسانہ کا اکہرا بیانیہ بہتوں کو بہت خشک معلوم ہو سکتا ہے لیکن جو زندگی پیش کی جا رہی ہے اس میں کسی طرح کی آرائش، حسن کو قبح میں بدل سکتی ہے۔ اس لئے ایسا بیانیہ معصومیت کے ساتھ نئی عزم اور کیف و کم کو احاطہ میں لے لینے پر قادر ہے۔

جابر حسین کبھی کبھی topical موضوعات سے بھی رجوع کرتے ہیں۔ "چھوڑ دو" ایک ایسے گاؤں کی کہانی ہے جس کے مفلس اور ناتواں لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ ایسی قتل و غارت گری کا ایک منظر دیکھئے:

> "گاؤں کی کیچڑ کادو بھری گلی کے ایک سرے پر بنی جھونپڑی کی دہلیز پر بیٹھی خاموش عورت کو نہیں معلوم تھا کہ دردھانڈی کے کنارے سنگینوں کے سائے میں جو لاشیں آگ کے سپرد کی گئیں ان میں اس کے کمسن بیٹے کی لاش بھی شامل تھی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا آدمی قاتلوں کی گولی کا شکار ہو کر اسپتال میں پڑا ہے، اور زندگی و موت کے بیچ جھول رہا ہے۔ جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی بیٹھی وہ جھونپڑی کے باہر والی گلی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے، جہاں آنے والوں کا تانتا لگا ہے اور جدھر سے اس کے آدمی کی موت کی خبر آنے والی ہے۔"

پولس، ضلعی حاکم اور صوبائی حاکم حادثے کی تفصیل کے لئے آتے ہیں، لیکن وہ عورت خاموش ہی

رہتی ہے اور اسے آدمی کی موت کی خبر کا انتظار کرتی ہوتی ہے۔ دراصل قتل و غارت گری سے متعلق افراد کی جو سائیکی بنتی ہے نہ صد در جہ پیچیدہ ہوتی ہے' لیکن اس میں ایک عنصر بہت واضح ہوتا ہے' اور وہ ہوتا ہے Indifference کا۔ ایسا Indifference جو متعلق فرد یا افراد کو بے تعلق بنا دیتا ہے۔ لیکن' جوڑ دو میں کمال فنکاری سے یہ عنصر کہانی حصول تاثر کی عجیب گھمبیر فضا پیدا کرتی ہے اور وہ یوں کہ گاؤں سے تھوڑی دور بہت کر بہنے والی دردھاندری خطرے کے نشان کو چھو رہی ہے۔ پولس کے نوجوان اپنی سنگینیں سنبھالے ندی کنارے کھڑے ہیں اور ڈھیر سے اور جلی لاشوں سے اٹھنے والا دھواں ان کے چہروں پر پھیل رہا ہے۔ افسانہ نگار نے ایسے موقع پر پولس کا رول کیا ہوتا ہے' اسے expose کرنے کی کوشش کی ہے۔ تحریر کرنے والے عام افراد کی معصومیت ایک مضحکہ خیز صورت پیدا کرتی ہے۔ گویا جو صورت واقعہ ہے وہ شدید بن کر ابھرتی ہے اور ایسے تشدد کے بعد عمل اور رد عمل کی جو کیفیت ہے وہ بھی ابھرتی ہے۔ اس جملے کی معنویت بہت غور طلب ہے۔

"گاؤں سے تھوڑی دور بہت کر بہنے والی دردھاندری خطرے کے نشان کو چھو رہی ہے۔"

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اور اس کا تعلق افسانے سے کیا ہے؟ یہ اور بہت گہرا ہے۔ اس میں خاموش سا protest ہے اور یہ protest ردعمل پر آمادہ کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ افسانہ نگار نے کہیں اس کی نشاندہی نہیں کی ہے' لیکن پولس جس کے چہرے پر لاشوں سے اٹھنے والا دھواں سیاہی بن کر پھیل رہا ہے' ان کی کارکردگی کو بھی واضح کر رہا ہے اور ناہلی کو بھی۔ اس طرح متذکروں کا استحصال کیوں کر جوابی کارروائی میں بدل سکتا ہے ایک چھپا ہوا اشاریہ ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

"کرچیں" جابر حسین کے تمام افسانوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں نفسیاتی گرہ جو ہیرو کے دل و دماغ میں پڑ چکی ہے' وہ کھلتی نہیں۔ کھل بھی نہیں سکتی۔ مسز جمیل جو گھر میں آئی ہیں' اس شخص سے متعلق جس کی آنکھوں میں کرچیاں بھری ہوئی ہیں' کے انتظار میں ہیں۔ لیکن وہ سامنے نہیں آتا۔ اس لئے کہ وہ اپنی آنکھوں سے کرچیاں نکالنے میں محو ہے' لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا اور اپنی کالی کوٹھری میں سمٹ جاتا ہے۔ کرچیاں آنکھ میں بھری رہتی ہیں۔ وہ آنکھیں کیسی تھیں۔ آخری جملے ہیں:

"اس جال میں میری آنکھیں پوری طرح بندھ گئی ہیں۔ میری آنکھیں' جو کبھی جھیل کے آنچل کی طرح صاف شفاف تھیں۔ جو کبھی بولتی تھیں۔"

ان دونوں جملوں میں آنکھ کا لفظ خاصا بامعنی ہے۔ اس کی تفصیل میں جائیے تو افسانے کا شاعرانہ انداز از خود سامنے آجاتا ہے۔ ہیرو کی ناکام محبت آئینہ بن کر ابھرتی ہے۔ جس میں شخص متعلق کچھ اور نہیں کر سکتا۔ بس اپنی آنکھوں کی کرچیاں نکالنے کے عمل میں مصروف رہ سکتا ہے اور اس میں بھی کامیاب نہیں

ہو سکتا اس لئے کہ مسز جسل اب ضعیف ہو چکی ہیں یا وہ اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکی ہے جس سے مسز جسل آگاہ ہیں۔ اس کا سامنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ افسانہ نگار نے کہیں اس کا اشارہ نہیں کیا کہ مسز جسل سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟ اگر اس کی تفصیل بیان ہوتی تو یہ افسانہ بہت معمولی بن جاتا۔ لیکن اس افسانے کی تعمیر میں وہ فنکاری ہے جو اسے بے حد جدید افسانوں سے ہم کنار کرتی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہر فن کی غایت ہوتی ہے کہ وہ شاعری بن جائے۔ اسی غایت کی طرف یہ لپک ہے۔ ممکن ہے افسانہ نگار کو اس کا احساس بھی نہ ہو۔

اس کے برخلاف اگر "رودلی" کو پڑھیے تو دونوں افسانوں کا فرق واضح ہو جائے گا۔ اس میں پیغام یہ ہے کہ پربھو کی عورت رودلی یقین کے ساتھ بچے کو کلیجے سے لگائے آج بھی افق کی طرف دیکھ رہی ہے' جہاں تال کی لہلہاتی فصلیں آسمان چھوتی نظر آرہی ہیں اور جہاں نیا سورج ایک نئی صبح کی دلیل بن رہا ہے۔ یہ سب اس لئے کہ پربھو کا قتل ہو چکا ہے۔ رودلی کی عمر اس وقت صرف ۱۶ برس تھی' جب اس کے پیٹ میں چھ مہینے کا بچہ تھا۔ گولی مار کر اس کے آدمی کا قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ نڈر تھا' بہادر تھا وغیرہ۔ چنانچہ وہ استحصال کرنے والے کے چنگل سے نکلنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ ہر چیز کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ پربھو جب آتا تو عورتوں کی مانگ میں عزت کا سیندور پڑ جایا کرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ سب ایسا بیانیہ ہے جس میں وہ لپک نہیں ہے جو کسی خیال کو فن بناتی ہے۔ یہاں protest ہے لیکن واضح۔ پربھو کی عورت اپنے بچے سے وہ کام لینا چاہتی ہے جو پربھو ادھورا چھوڑ گیا ہے۔ غالباً پربھو کے حادثے اور اس کی کارکردگی کی تفصیلات اس طرح نہ پیش کی جاتیں تو افسانے کا قوام بگڑتا نہیں۔ تو جابر حسین نے ایسا کیوں کیا۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ پربھو کی کہانی نہیں ہے' رودلی کی ہے اور رودلی پر ظلم کے جو نتائج مرتب ہوئے تھے وہ شکست کے روپ میں نہیں ہیں بلکہ عزم و استقلال کی دلیل بن کر ابھرے ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ موصوف نے پربھو کی اتنی تفصیلات پیش کی ہیں' لیکن عنوان رودلی رکھا' پربھو نہیں۔ بس اس افسانے کی اہمیت اتنی ہے اور یہاں پہنچ کر وہ رائے قدرے بدلنی پڑتی ہے جو میں نے ابھی ابھی اوپر رقم کی ہے۔

اسی طرح دوسری کہانیاں مثلاً "ایک کوہ کاؤں کی کہانی" داروغہ جی کی سواری' مردہ بستی' "کالے چمڑے کی بیلٹ' ترنگی' صبو' کپا' معاوضہ وغیرہ تفصیلی تجزیہ چاہتے ہیں۔ میں ایسی تفصیل کو ابھی بالائے طاق رکھتا ہوں کہ مزید صراحت میں طوالت مانع ہے۔ "سن اے کاتب" کے سرورق پر کسی نے یہ ٹھیک ہی لکھا ہے:

"چمرٹولی کی بچی ہو یا چل کی مرنی' کرکری گاؤں کی شانتی ہو یا ستیہ' رودلی ہو یا تتری' مالن مائی ہو یا کپا' رام سکھی کی عورت ہو یا ممتی' جگنی ہو یا جنتا ٹولی کی عورت' سب بہار کے سماجی المیے کی

زندہ مثالیں ہیں۔ لیکن ان تحریروں میں ان حالتوں کا مقدر بدلنے اور انہیں ایک نئی زندگی دینے کی چاہت بھی ہے۔"

Arjun Dangle کی ایک مرتبہ کتاب Poisoned Bread ہے اس میں جدید مراٹھی دلت لٹریچر کے ترجمے درج کئے گئے ہیں۔ Tryambak Sapkale کی ایک مراٹھی نظم کا ترجمہ Priya Adarkar نے That Single Arm کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ نظم دیکھئے :

I was looking through a book of pictures
My small son Raja came, looked through them too.
In one picture a rich man was beating a poor one.
Raja asked, 'Why is the man beating the other?'
Because he is rich.
As I turned the page......
There again was the rich man,
weapon in right hand,
about to kill the poor man.
My son looked at this.
He said, 'Father, wait a moment.'
He hurried to the table and took out
a razor blade from a drawer.
Once back, he sliced off
the attacker's arm from the shoulder.
Then looked at me triumphantly.
I said, 'There are people to help him,
No, they cannot attack him
for the vision of that single arm
will remain before them.

میں تصویروں کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ میرا چھوٹا بیٹا راجا آیا اور انہیں دیکھنے لگا۔ ایک تصویر میں ایک امیر شخص ایک نادار کو پیٹ رہا تھا۔ راجا نے پوچھا "وہ آدمی دوسرے شخص کو کیوں پیٹ رہا ہے؟" کیونکہ وہ امیر ہے۔ جیسے ہی میں نے صفحہ الٹا، پھر امیر آدمی موجود تھا۔ اس کی دائیں ہاتھ میں ایک ہتھیار (تھا) اور وہ غریب کو قتل کرنے والا تھا۔ میرے بیٹے نے اسے دیکھا۔ اس نے کہا "ابا جی، تھوڑی دیر رکئے"۔ وہ تیزی سے ٹیبل کے پاس گیا اور دراز سے ایک بلیڈ نکال لایا اور پھر اچانک اس نے حملہ آور کے بازو کو اس کے کندھے سے الگ کر دیا۔ پھر اس نے فتح مندانہ انداز سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا اس کی مدد کرنے کے لئے لوگ ہیں۔ نہیں، لوگ اس پر حملہ آور نہیں ہوں گے، کیونکہ اس تنہا بازو کا نظارہ ان کے سامنے ہوگا۔

محسوس کر سکتے ہیں کہ بچے کی معصومیت کے ساتھ ظلم و تشدد کے خلاف اس کا معصوم جارحانہ انداز اور اس کے باپ کا سچ' بھی ان امکانات کی طرف بڑھ رہے ہیں جنھیں جابر حسین افسانوی انداز میں گرفت میں لینے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ دونوں کا ذہنی رشتہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ محض اضطراری طور پر نہیں بلکہ شدت احساس کے ساتھ۔ میں نے بیس بائیس سال پہلے، جب میں مظفرپور میں تھا ایک نشست میں پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی (جن سے میں بہت قریب تھا) سے غالب کے بارے میں ایک سوال کیا تھا۔ وہ سوال یہ تھا کہ غالب کی عظمت کا راز کیا ہے؟ انہوں نے تفصیل کی بجائے ایک جملہ پر بس کیا، وہ بھی تین الفاظ پر مشتمل ــــ 'He is unusual' ــــ مجھ پر غالب کی ایک کائنات روشن ہو گئی، تب سے ادب کے مطالعہ کی ایک راہ بھی ہموار ہو گئی۔ میں نے پہلے ہی جابر حسین کے افسانے کو مختلف کہا ہے۔ آج ساختیات کی بہت ساری بحثیں Difference اور Differance کو الگ کر کے آگے نہیں بڑھ سکتیں، لیکن یہ صحیح ہے کہ unusual ہونا آسان کام نہیں ہے۔ جابر حسین کے افسانوں کی اہمیت اس لئے بھی از خود واضح ہوتی ہے۔

••

مجتبیٰ حسین
۱۲۰۰ اکوراپارٹمنٹس
پٹ پڑگنج، نئی دہلی۔ ۹۲

غالب ــ "مست مولا شاعر"

غالب کے دو سو سالہ جشن پیدائش کی تقاریب یوں تو رسمی طور پر ۲۷ دسمبر کو ختم ہونی چاہیے تھیں لیکن رمضان المبارک کی آمد کی وجہ سے ادبی حلقوں اور اداروں نے ان تقاریب کو عملاً دس پندرہ دن پہلے ہی سمیٹ لینا ضروری سمجھا۔ رمضان کا مہینہ برکتوں کا مہینہ ہوتا ہے۔ اگر یہ جلد نہ آتا تو ادبی حلقوں کے ہاتھوں ہم جیسوں اور خود مرزا غالب کی اتنی جلدی جاں بخشی نہ ہو پاتی۔ دہلی میں ۱۱ دسمبر سے ۱۵ دسمبر تک دو اداروں کی جانب سے غالب کے بارے میں دو بین اقوامی سیمینار کسی وقفہ کے بغیر یوں منعقد ہوئے کہ پہلے سیمینار کے اختتام اور دوسرے سیمینار کے آغاز میں چند منٹوں کی مہلت کی بھی نہیں رکھی گئی۔ دونوں سیمینار ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے پائے گئے۔ لوگ یہاں سے وہاں بھاگتے اور وہاں سے یہاں بھاگنے میں نیم جاں سے ہو گئے۔ غالب کا جو حشر ہونا تھا سو وہ ہوا ادب کے پرستاروں کا حشر بھی کچھ اچھا نہیں ہوا۔

غالب کی شاعرانہ عظمت سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن عظمت کا مطلب یہ بھی تو نہیں کہ آدمی کوئی اور کام نہ کرے اور پورے ایک ہفتہ تک غالب کے نام کی مالا ہی جپتا رہ جائے۔ بلاشبہ غالب ہمارے ادب کا سب سے بڑا نام ہے لیکن ہم نے غالب کے ساتھ وہی رویہ اختیار کر رکھا ہے جو خود غالب نے ستم پیشہ ڈومنی کے سلسلہ میں اختیار کیا تھا۔ غالب نے اس ڈومنی کے سلسلہ میں اپنے ایک خط میں لکھا تھا "مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں۔ میں نے بھی ایک ڈومنی کو مار رکھا ہے" ہم لوگ بھی غالب پر کچھ اس طرح مرنے لگے ہیں کہ یہ پتہ چلانا دشوار ہے کہ ہم غالب پر مر رہے ہیں یا خود غالب کو مارے جا رہے ہیں۔ اس رویہ کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے غالب کے دوسرے بین اقوامی سیمینار کا افتتاح کیا تو ایک مشہور ٹیلی ویژن چینل نے اپنی خبروں میں اس سیمینار کے افتتاح کا ذکر

ان شبدوں میں کیا۔ "وزیر اعظم نے آج اردو کے مست مولا شاعر مرزا غالب کی
دوسری جنم شتابدی کے سیمینار کا اودگھاٹن کیا"۔ یقین مانئے ہمیں یوں لگا جیسے یہ جملہ غالب
تہذیب کے تابوت میں آخری کیل کا درجہ رکھتا ہے اور یہ کہ "ساغر کو مرے ہاتھ سے
لینا کہ چلا میں" والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ کوئی بات یا حرکت جب اعتدال کی حدوں سے
تجاوز کر جاتی ہے تو یہی حشر ہوتا ہے۔ غالب کی "مست مولائی" غالب فہمی اور غالب
شناسی کے باب میں ایک نئی دریافت کا درجہ رکھتی ہے۔ غالب جیسے بے حد ذہین، وسیع
النظر دور بین اور باشعور شاعر کو "مست مولا شاعر" بنا دینا ہمارے اس میڈیا کا کمال ہے جو
پچھلے چالیس پچاس برسوں سے فلموں اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ غالب کی ایک نئی تصویر کو
پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یقین مانیے اگر غالب کو دو سو سال پہلے کسی طرح پتہ چل
جاتا کہ دو سو برس بعد اسے "مست مولا" قرار دیا جانے والا ہے تو وہ ہرگز اس دنیا میں
آنے کی کوشش نہ کرتا۔ آج سے ۴۲ برس پہلے سہراب مودی نے مرزا غالب کے
بارے میں ایک تاریخ ساز فلم بنائی تھی۔ اس زمانہ کی مشہور اداکارہ اور مغنیہ ثریا نے اس
میں ڈومنی کا کردار ادا کیا تھا اور بلاشبہ بہت اچھا ادا کیا تھا۔ غالب کی شراب نوشی کا حوالہ
بھی اس فلم میں ضرور موجود تھا لیکن ان کی شراب نوشی کو اس طرح پیش نہیں کیا گیا تھا
جیسے شراب غالب کی زندگی کا سب سے اہم جز ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس فلم کی کہانی
سعادت حسن منٹو جیسے ادیب نے لکھی تھی جو اگرچہ خود بھی شراب کا بے حد رسیا تھا لیکن
یہ بھی جانتا تھا کہ شراب ایک فنکار کی شخصی زندگی کا حصہ تو بن سکتی ہے لیکن اس کے
تخلیقی عمل سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لیے غالب کی شراب نوشی کو
اس فلم میں اس کی زندگی کے ایک ضمنی پرتو کے طور پر ہی پیش کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ
کمال منٹو جیسے اہل قلم کا تھا۔ چونکہ منٹو غالب کی عظمت اور اس کی شاعری کی تہہ داریوں
اور معنی آفرینی سے بخوبی واقف تھا اسی لیے اس نے غالب کی شراب نوشی کو اس کی
شاعری پر غالب آنے کا موقع نہیں دیا۔ مگر اس فلم کے بعد ہمارے گلوکاروں اور ٹیلی
ویژن پر غالب کو پیش کرنے والوں نے موجودہ حالات اور تقاضوں کے پس منظر میں
غالب کی شراب نوشی کو کچھ اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی کہ لگتا ہے غالب شراب
زیادہ پیتے تھے۔ اور شاعری کم کرتے تھے چنانچہ ہمارے اکثر گلوکار غالب کی غزلیں سنانے
سے پہلے کچھ ایسی تمہید باندھتے ہیں اور کچھ ایسے جملے بولتے ہیں جن سے یہ گمان گزرتا
ہے کہ غالب چوبیسوں گھنٹے شراب کے نشہ میں دھت رہا کرتا تھا۔ بلکہ بعض تو اسے

مجاز اور زلیل کمار شادی کی فکر کا شاعر بھی ثابت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

ہم جگجیت سنگھ کی آواز کے سحر کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس میں کئی بار ڈوب بھی چکے ہیں۔ پچھلے ایک بین اقوامی سیمینار میں جگجیت سنگھ نے پورے ڈیڑھ گھنٹہ تک نہایت خوبصورت ڈھنگ سے غالب کا کلام گایا لیکن غالب کے دو ایک شعر سنانے سے پہلے یہ بھی کہا کہ غالب کو میرٹھ سے اسکاچ وہسکی مل جایا کرتی تھی۔ جگجیت سنگھ کی اس تحقیق پر ماہرین غالبیات کو ضرور غور کرنا چاہیے کیونکہ غالب کی خود اپنی اور اس کے معاصرین کی تحریروں میں کہیں بھی اسکاچ وہسکی کا ذکر نہیں ملتا البتہ ایک پرتگیزی شراب "OLD TOM" کا حوالہ ضرور موجود ہے۔

مبادا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم غالب کی شراب نوشی کی حمایت میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ جو ہمارے گلوکار اور فلم ساز آئے دن غالب کو "شراب، شباب اور کباب" کا شاعر ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو اس پر کچھ روک لگنی چاہیے ورنہ عام آدمی غالب کو سچ مچ "مست مولا شاعر" ہی سمجھ بیٹھے گا۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اس سیمینار کے کلچرل پروگرام میں سامعین کی اکثریت غالب کی وجہ سے نہیں بلکہ جگجیت سنگھ کی وجہ سے آئی تھی لیکن بنیادی حوالہ تو غالب کی ذات ہی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جگجیت سنگھ نے غالب کی مشہور غزل "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" کو سناتے سناتے اچانک یہ شعر بھی سنا دیا۔

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

اس پر داد کا وہ شور برپا ہوا کہ ہم دنگ رہ گئے۔ ہمارے دنگ رہنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہماری دانست کے مطابق یہ شعر غالب کا نہیں ہے اور دوسری وجہ یہ کہ غالب کو آپ لاکھ مست مولا شاعر کہہ لیں وہ اپنی شاعری میں ایسا غیر محتاط لہجہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ پروگرام سے واپس آتے ہی ہم نے غالب کا دیوان نکالا اور جب اس شعر کو اس کے دیوان میں نہ پایا تو ہمیں یوں لگا جیسے ایک بوجھ غالب کے سر سے نہیں بلکہ خود ہمارے سر سے اترا ہے۔

ہم یہ کالم صرف اس لیے لکھ رہے ہیں کہ غالب فہمی اور غالب شناسی کی علمی قدریں بہت اہم ہیں اور انھیں بہر حال برقرار رہنا چاہیے۔ میڈیا اور گلوکاروں کو خدارا یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ غالب کو مزید "مست مولا شاعر" بناتے چلے جائیں۔

غالب سے اسی ایک حالیہ سیمنار میں ان فلمی شخصیتوں کو بھی اعزازات سے نوازا گیا جنھوں نے غالب کی زندگی کو فلم کے پردہ پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جیسے ثریا، گلزار اور نصیر الدین شاہ اور خود تجلیت سنگھ۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پرانے زمانہ کی اداکارہ ثریا نے سہراب مودی کی فلم "مرزا غالب" میں ڈومنی کا کردار ادا کیا تھا اور باقی کے تین فنکار ٹیلی ویژن کے حالیہ سیریل "مرزا غالب" سے متعلق تھے۔ ہمیں مذاق میں یہ بات سوجھی کہ سہراب مودی کی فلم کی ڈومنی (ثریا) کو تو اس سیمنار میں بلایا گیا لیکن غالب کی بیوی (نگار سلطانہ) کو نظر انداز کر دیا گیا۔ شاعروں اور فنکاروں کی بیویوں کے ساتھ ہمیشہ ایسی ہی زیادتی ہو جاتی ہے۔

غالب ہمارے ادب کا سب سے محترم نام ہے۔ اس کی شاعری اور اس کی تحریروں میں اتنی تہہ داریاں ہیں کہ اس کی بات کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ اکثر مقامات پر جہاں رونا چاہیے وہاں وہ ہنس دیتا ہے اور جہاں ہنسنا چاہیے وہاں وہ رو دیتا ہے۔ اس نے زندگی کو جس طرح جھیلا تھا وہ اسی کا حصہ تھا۔ بہت سی باتیں وہ مذاق میں بھی کہہ جاتا ہے (بالخصوص اپنی ذات کے بارے میں) حد تو یہ ہے کہ اس نے تفنن طبع کی خاطر اپنا ایک فرضی استاد بھی مقرر کر رکھا تھا جس کا نام اس نے ملا عبدالصمد رکھا تھا۔ ماہرین غالبیات اب تک اس فرضی استاد کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ غالب کو اپنی زندگی میں کچھ بھی نہیں ملا سوائے نامساعد حالات کے۔ ۶۲ روپیہ کی حقیر سی پنشن کے لیے، جس پر بلا شبہ اس کا حق تھا، وہ صاحبانِ اقتدار کے نام عرضیاں بھی لکھتا رہا لیکن اس سے اس کی شاعرانہ عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ غالب سیمناروں میں شرکت کے ذریعہ ہمارے موجودہ ماہرین غالبیات جتنا کما رہے ہیں اس کا عشر عشیر بھی غالب کو نہ مل سکا۔

یادش بخیر! پندرہ برس پہلے ہم نے دہلی کی ایک ادبی محفل میں اپنے نام غالب کے ایک خط کی پیروڈی پڑھی تھی جس میں ہم نے غالب کی زبان سے یہ جملے کہلوائے تھے۔ "میاں!! اگر دنیا میں دوبارہ پیدا ہونے کی کوئی صورت نکلے تو اب کی بار پھر سے غالب بن کر ہرگز پیدا نہیں ہوں گا۔ ماہر غالبیات بن کر پیدا ہونا پسند کروں گا کیونکہ اس میں فائدے بہت ہیں"۔ مشہور ماہر غالبیات آنجہانی مالک رام جو اس محفل کی صدارت کر رہے تھے ان جملوں پر لوٹ پوٹ ہو گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غالب اور ایک ماہر غالبیات میں کیا فرق ہے۔

غالب ایک مکمل انسان اور ایک مکمل شاعر تھا۔ خدا اسے [illegible]

نصرت ظہیر
4/15 گھوری پور، دلی۔91

ایک یادگار استقبالیہ

پچھلے دنوں ایک اردو اکادمی کی طرف سے برصغیر کے ادیبوں کو ایسا یادگار استقبالیہ دیا گیا جسے ادبی و غیر ادبی حلقوں میں عرصہ تک یاد رکھا جائے گا۔

استقبالیہ اتنا سبق آموز اور عبرت آمیز تھا کہ بقول عبدالقدوس کم از کم اس صدی میں تو اردو کا کوئی ادیب دلی میں ایسا استقبال کرانے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔

"صدی نہیں عشرہ کہیے۔ اب تو اس صدی میں دو سال ہی باقی رہ گئے ہیں۔" ہم نے تصحیح کی کوشش کی۔

"ایک ہی بات ہے، صدی کہیا عشرہ! اگلے برسوں میں جو کچھ ہوگا اور جو کچھ نہیں ہوگا اس کا کریڈٹ اس عشرے کو نہیں پوری صدی کو ملے گا۔" انھوں نے کہا اور ہم ہمیشہ کی طرح اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

عزیزو! مشکل یہ ہے کہ دلی میں دل تو بڑے مل جاتے ہیں مگر جگہ کی ہر جگہ اتنی تنگی ہے کہ اس میں آدمی کی سمائی مشکل ہے۔ چنانچہ استقبالیہ کی تقریب میں جو کچھ ہوا وہ اسی تنگی جگہ کا نتیجہ تھا اور ہم نے یہ نتیجہ اس لیے نہیں نکالا کہ ہمارا استقبال ہو رہا تھا۔ بفضل ربی ہمارا شمار نہ کبھی ایسے ادیبوں میں ہوا نہ انشاء اللہ کبھی ہوگا جن کا استقبال ضروری ہے۔ ہم تو خیر سے ان میں شامل ہیں جو نہ تین میں ہوتے ہیں نہ تیرہ میں۔ یعنی حاضرین، ناظرین، سامعین، قارئین اور مدعوئین وغیرہ!

استقبالیہ میں جس وقت ہم پہنچے تو وہ مختصر کانفرنس ہال لگ بھگ پوری طرح بھر چکا تھا جہاں پروگرام رکھا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ایک کونے میں اسٹول پر رکھے بڑے سے گلدان کے قریب ایک کرسی خالی دکھائی دے گئی۔ ہم تیزی سے اس طرف لپکے اور جیسے ہی کرسی کے

قریب پہنچے میاں عبدالقدوس نے فوراً اس پر قبضہ جمالیا اور ہمیں گھڈان بنا کر اسٹول رکھ دیا۔
ایک منتظم سے ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کن کن ادیبوں کا استقبال ہو رہا ہے
اور وہ کہاں کہاں بیٹھے ہیں۔ اس نے یہ بتا کر حیرت میں ڈال دیا کہ ہال جن لوگوں سے بھرا ہوا
ہے وہ سب استقبال کرنے والے ہیں اور جن کا استقبال ہونا ہے ان کے آنے میں پندرہ منٹ
باقی ہیں!

"یا اللہ! استقبال والے ادیب کہاں بیٹھیں گے؟" ہم بہ آواز بلند سوچنے لگے اور میاں
عبدالقدوس نے منہ پر انگلی رکھ کر ہمیں "شش" کر دیا۔

اگلے پندرہ منٹوں میں بیس اشخاص اور اندر آگئے۔ لیکن وہ سب بھی استقبال کرنے والے ہی
تھے۔ یعنی میزبان آگئے تھے اور مہمانوں کا انتظار تھا۔

"کافی بھیڑ ہو گئی ہے۔" ہم نے رومال سے پنکھے کا کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" خاں صاحب نے تصدیق کی۔ "ہال اور چھوٹا ہوتا تو اور زیادہ بھیڑ ہوتی۔"

"ذرا وضاحت فرمائیے۔" ہم نے کہا۔

"مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ہال مزید چھوٹا ہوتا تو اس میں موجود حاضرین کا فی مکعب انچ
تناسب اور زیادہ ہوتا۔"

تبھی کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں ہلچل مچ گئی۔ داخلی دروازے پر ہٹو بچو کا شور ہونے لگا۔
معلوم ہوا کہ جن ادیبوں کا استقبال کے لیے استعمال ہونا تھا وہ آگئے تھے اور یہ ان ہی کی آمد کا
غلغلہ تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر جم کر بیٹھ گئے کہ کسی زیر استقبال ادیب کو بٹھانے کے
لیے کوئی ان سے کرسی نہ خالی کرالے۔

تقریباً دو درجن اردو ادیبوں کا استقبال ہونا تھا جن میں ایک خوبصورت روسی خاتون بھی
شامل تھیں۔ انھیں دیکھ کر کئی لوگ کرسیوں کی حدود میں پہلو بدلنے لگے۔

سب ادیبوں کو ایک ایک کر کے کسی نہ کسی طرح ہال میں داخل کیا گیا اور بے چارے ادیب
خفیف و شرمسار سے ہو کر جہاں بھی ممکن تھا وہاں پھنس گئے یا اٹک گئے۔

لیکن روسی خاتون ابھی باقی تھیں۔

انھوں نے جھجکتے ہوئے قدم آگے بڑھائے تو مجمع کائی کی طرح پھٹتا گیا۔ کئی جگہ اس کائی
نے دوبارہ جڑنے کی کوشش کی۔ لیکن روسی خاتون ہوشیار تھیں۔ وہ کسی ماہر "بیلے رینا" کی

طرح بڑی صفائی سے بھیڑ کو کاٹتی ہوئی کائی پار کر گئیں اور ایک سر سفید بزرگ کی کرسی کی نسبتاً محفوظ بغل میں پارک ہو گئیں۔

تقریباً سبھی زیر استقبال ادیب اندر آچکے تھے اور پورا ہال جامع مسجد سے سیلم پور جانے والی ڈی ٹی سی بس میں تبدیل ہو چکا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ ڈی ٹی سی کی بس میں پکڑنے کے لیے ڈنڈے بھی ہوتے ہیں۔ کچا کچ ہال میں اب سب لوگ اس بری طرح ایک دوسرے سے سٹ کر بیٹھے اور کھڑے تھے کہ ہلنے تک کی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ایک صاحب نے جماہی لی تو جماہی کی واپسی میں دوسرے صاحب کی ناک اور تیسرے کا کان ان کے دانتوں میں آتے آتے رہ گیا۔

اب جلسے کی کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ کئی لوگ ناظم جلسہ کو اپنی اپنی جگہ کھڑے کھڑے ڈھونڈ رہے تھے جو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اسی دوران ایک لحیم شحیم ادیب کی بغل میں کچھ حرکت پیدا ہوئی اور حرکت کے بعد اس میں سے ایک گردن نمودار ہوئی جس نے اعلان کیا۔۔۔

"صاحبو! میں ہی ناظم جلسہ ہوں۔"

یہ اکادمی کے سکریٹری تھے۔ انھوں نے بڑے شستہ اور شایستہ لہجے میں تمام شرکائے جلسہ سے اس بد نظمی اور استقبال دونوں کے لیے اتنا مختصر ہال چننے کی معذرت چاہی اور گزارش کی کہ تنگیٔ جگہ کی وجہ سے جو لوگ جونیئر اور کم عمر ہیں وہ ہندستانی روایات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی نشستوں سے اٹھ کر اپنے بزرگوں کو جگہ دے دیں تو بد نظمی بڑی حد تک دور ہو جائے۔

اس دردمندانہ اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ جو لوگ بیٹھے تھے وہ اپنی کرسیوں پر پہلے سے زیادہ جم کر بیٹھ گئے اور جو کھڑے تھے وہ بیٹھے ہوؤں کو غور سے گھور گھور کر ان کی عمروں کا اندازہ لگانے لگے۔

تاہم ایک دو شریف الطبع نوجوان احتراماً اپنی کرسیوں سے اٹھ گئے اور وہاں اتنے ہی بزرگ ادیبوں کو جگہ مل گئی۔ یہ دیکھ کر ایک بزرگ خاتون اچانک اپنی کرسی سے اٹھ گئیں اور اس پر ایک نسبتاً کم عمر ادیبہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگیں۔ لیکن موخر الذکر نے اس پر اظہار تشکر کی بجائے بے رخی سے رخ پھیر لیا۔

"یہ کیا بات ہوئی خاں صاحب؟" اپنی حیرت دور کرنے کے لیے ہم میاں عبدالقدوس کے کان میں پھسپھسائے۔

"کوئی خاص بات نہیں؟" انھوں نے ہمارے کان کو جواب سے نوازا۔ "ارسطو نے یا شاید اس کے کسی شاگرد نے بہت پہلے کہا تھا کہ عورت چاہے اچھے حال میں ہو یا برے حال میں یا ایسے کسی مختصر ہال میں اس کی کوشش ہمیشہ یہ ہی رہتی ہے کہ دوسروں سے کم عمر نظر آئے۔ بزرگی کو عورت کبھی خوشی سے قبول نہیں کرتی۔"

زیر استقبال ادیبوں میں کئی نقاد بھی تھے۔ ان میں جو سب سے زیادہ نقاد تھا ناظم جلسہ نے سب سے پہلے اسی کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور جدید عصری وغیر عصری حسیات پر روشنی ڈالنے کی دعوت دی۔

متعلقہ نقاد نے جو کہ بھیڑ میں بری طرح پھنسا ہوا تھا' بائیں ہاتھ سے اپنا دایاں ہاتھ تلاش کیا جو ایک نقاد کے زانو کے نیچے دبا پڑا تھا' پھر دائیں ہاتھ سے بدقت تمام اپنی ناک دریافت کی اور بالآخر اس پر ٹکی ہوئی عینک کو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں پکڑنے میں کامیاب وسرخرو ہونے کے بعد یوں گویا ہوا۔

"عزیز دوستو! بالزاک نے اپنی مشہور کتاب کے صفحہ تین سو بیس کی آٹھویں سطر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جو لوگ کسی رسمی استقبال یا اعزاز سے بہت خوش ہوتے ہیں مجھے ان کے ادیب ہونے میں شبہ ہے لیکن جو ادیب پرجوش اور گرم جوش استقبال کا شکریہ بھی ادا نہ کرے میرے نزدیک اس کا انسان ہونا مشکوک ہے ادیب ہونا تو دور رہا۔۔۔"

جواب میں ناظم جلسہ کی پرجوش تالیاں سنائی دیں۔ دیگر منتظمین جلسہ بھی اس حوالہ کا پرجوش تالیوں سے جواب دیتے مگر طبیعیاتی اصولوں کے مطابق تالی بجانے کے لیے کم از کم بالشت بھر خلا ضرورت ہوتی ہے جو بدقسمتی سے اس بھیڑ بھرے ہال میں بہت کم لوگوں کو میسر تھی۔

نقاد کہہ رہا تھا۔

"اسی طرح کافکا نے بھی اپنی عظیم تصنیف کے چوتھے باب میں اٹھارہویں صفحہ کی آٹھویں سطر میں کہا ہے کہ۔۔۔"

"کیا واقعی؟ کافکا نے بھی؟" ایک آواز آئی۔

"جی ہاں اس نے کہا ہے۔۔۔"

"آٹھویں سطر میں؟" آواز نے پوچھا۔

"جی ہاں آٹھویں سطر میں اس نے ـــــ"

"سوچ لیجیے۔ ایک موقع اور ہے۔ ہو سکتا ہے کہا ہو جی نہیں۔ جناب میرا حافظہ درست ہے۔ یہ بات اس نے آٹھویں سطر ہی کہی ہے ساتویں ـــــ بلکہ ـــــ بلکہ میں نے احتیاطاً ڈائری میں بھی نوٹ کر لیا ہے۔ میں جب بھی کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس کی سطروں کے نمبر ضرور نوٹ کر لیتا ہوں لیکن ـــــ لیکن ـــــ لیکن آپ ہیں کون۔ ذرا سامنے تو آیئے ـــــ؟" نقاد نے چاروں طرف گردن گھماتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن حضور کا لا تو آٹھویں سطر لکھتا ہی نہیں تھا۔ آٹھ کے ہندسے کو وہ بے حد منحوس مانتا تھا۔ اس لیے ہمیشہ آٹھویں سطر خالی چھوڑ کر نویں سطر پر چلا جاتا تھا۔ اپنے گھر کے زینے میں اس نے آٹھویں پائدان خالی چھوڑ دیا تھا۔ ہمیشہ اسے پھلانگ کر گزر جاتا تھا اور تو اور اس نے اپنی کتاب کا آٹھواں اڈیشن بھی نہیں چھپنے دیا۔ ساتویں کے بعد نواں اڈیشن ہی چھپوایا نتیجتاً اس کے پبلشر کو ایک اڈیشن کا خسارہ جھیلنا پڑا۔ کیا آپ جانتے ہیں آٹھویں ہندسے کو وہ کیوں منحوس جانتا تھا" گمنام آواز نے پوچھا۔

لیکن نقاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھ کر رہ گیا اور پھر بے اختیاری میں دائیں ہاتھ سے بایاں کان کھجانے لگا جس پر اس کے قریب کھڑے نقاد نے سخت اعتراض کیا اور اسے بتایا کہ جناب یہ میرا کان ہے۔ کھجانا ہے تو اپنا کھجایئے۔ ہال میں دھیمی دھیمی "کھی کھی" کی آواز گردش کرنے لگی۔

"آٹھ کو وہ اس لیے منحوس سمجھتا تھا کہ اس کی پہلی شادی آٹھویں مہینے کی آٹھویں تاریخ کو صبح آٹھ بجے اس خاتون سے ہو گئی تھی جو ـــــ"

"جو!؟" مجمع نے یک آواز بے تابی سے پوچھا۔

"جو اس کی آٹھویں محبوبہ تھی۔" آواز نے جملہ پورا کر دیا۔

اس پر کئی حاضرین نے "اوہ!" کہہ کر ایک لمبی سانس لی جس کے بعد "کھی کھی" کی آواز "فی فی" کے شور میں بدل گئی۔

"حاضرین۔ حاضرین۔ براہ کرم سنجیدگی اختیار کیجیے۔" ناظم جلسہ نے التجا کی "یہ ادیب حضرات ہمارے مہمان ہیں۔ لہٰذا ان کا احترام ہمارا فرض ہے۔ مہمان نقاد سے میری گزارش ہے کہ وہ اپنا بیان جاری رکھیں۔"

مہمان نقاد نے رومال سے چہرے کا پسینہ دوبارہ پونچھ کر گلا صاف کیا (موخر الذکر کو کھنکھار کر صاف کیا۔ واضح رہے) اور فرمایا۔۔۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کافکا نے بھی بالزاک کے بیان سے اتفاق کیا ہے۔ البتہ بریخت نے اس نظریہ میں کچھ ترمیم کی ہے۔ اس نے کہا ہے۔۔۔"

"کون سی سطر میں؟" اسی آواز نے پوچھا۔

نقاد نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ "آخر آپ ہیں کون؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟"

"پہلے سطر بتایئے۔"

"مگر یہ بات کتاب میں نہیں لکھی گئی۔ ایک تقریر میں کہی گئی تھی۔" نقاد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ تقریر کی بھی تو سطر ہوتی ہے۔ خیر اگر آپ بریخت کی سطر پوشی کرنا چاہتے ہیں تو تقریر کا مقام وقت اور تاریخ ہی بتا دیجیے۔"

ہال میں پھر "کھی کھی" کا دور شروع ہو گیا۔

تبھی ناظم جلسہ نے مداخلت کی۔ "معاف کیجیے حضرات ایسا لگتا ہے محفل کچھ غیر سنجیدہ ہو چلی ہے۔ لہٰذا اب میں مہمان نقاد سے گزارش کروں گا کہ وہ جدید حسی عصریات۔۔۔ اوہ معاف کیجیے جدید عصری حسیات پر کچھ روشنی ڈالیں جو ان کا خاص موضوع۔۔۔"

یہ سنتے ہی نقاد کی باچھیں کھل گئیں۔ عینک کو دوبارہ ناک پر اچھی طرح جما کر اس نے سینہ پھلایا اور کئی مرتبہ کھانس کر گلا صاف کرنے کے بعد کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بجلی چلی گئی اور ہال میں اندھیرا ہو گیا۔

"اوفوہ! ارے بھئی جلدی سے روشنی ڈالیے۔ اسی آواز نے کہا اور پورا ہال قہقہوں کے دھماکوں سے گونج اٹھا۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ آواز اور کسی کی نہیں خود میاں عبدالقدوس کی تھی جو اپنے چاروں طرف کھڑے لوگوں کی وجہ سے سنائی تو سب کو دے رہے تھے مگر نظر کسی کو نہیں آرہے تھے۔

"اب بس بھی کیجیے خاں صاحب۔" ہم نے ان کے کان میں کہا۔

"چپ رہو یار۔ مجھے اس وقت ان کی فکر ہے۔" انھوں نے کہا۔

"کن کی؟"

"روسی محترمہ کی۔ اگر کچھ دیر اور اندھیرا رہا تو ڈر ہے کہ کوئی انھیں اپنی کرسی نہ آفر کر دے۔"

"توبہ توبہ خاں صاحب۔ اندھیرے میں بھی کیسے کیسے خیالات آپ کے دماغ میں آتے ہیں۔"

"روشن خیالات اکثر اندھیرے میں ہی تشریف لاتے ہیں میرے عزیز۔ لہٰذا اب خاموش رہو مجھے روسی ادیبہ کے بارے میں متفکر و متشوش ہونے دو۔"

"ارے بھئی کوئی موم بتی جلائیے۔" کسی نے زور سے کہا۔ اور تبھی بجلی آ گئی۔

لوگوں نے دیکھا وہ فقادو موقعہ غنیمت جان کر اپنے ارد گرد کے حاضرین میں غوطہ لگا گیا تھا اور اب کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔

میاں عبدالقدوس نے اپنی کرسی کے اوپر کھڑے ہو کر روسی ادیبہ کو دیکھا اور اسے سفید سر والے بے ضرر ادیب کی کرسی کے قریب پہلے کی طرح کھڑی پا کر اطمینان سے اپنی کرسی میں بیٹھ گئے۔

ناظم جلسہ نے جلسہ کو جلد ختم کرنے کی نیت سے روسی ادیبہ سے بھی درخواست کر دی کہ وہ اس موقعہ پر کچھ کہیں۔

ادیبہ کچھ شرمائی اور کچھ جھجکتی ہوئی صدر جلسہ کی کرسی کے آگے آئیں اور نا شستہ لہجہ میں کہنے لگیں۔

"آپ لوگوں نے اتنا پیار اور اتنی عزت دی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں!"

"کہنے کی ضرورت نہیں۔ بس کچھ دیر یوں ہی کھڑی رہیے۔" میاں عبدالقدوس نے کہا۔

"کمال ہے خاں صاحب۔ آپ ایسی بھیڑ اور گھٹن بھرے ماحول میں بھی رومانٹک ہو سکتے ہیں۔" ہم نے ان کے حوصلہ کی داد دی۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" رومانٹک ہونے کے لیے کیا اٹلانٹک کی آب وہوا ہونی چاہیے!"

تبھی مہمانوں کا استقبال شروع ہو گیا۔ اعلان کیا گیا کہ غیر ملکی ادیبوں کو بطور اعزاز شال اور ملکی ادیبوں کو بطور تحفہ کتابیں نذر کی جائیں گی۔ ایک صاحب ادیبوں کے نام پڑھنے

لگے۔ نام کا اعلان ہوتے ہی حلقۂ ادیب کرسیوں، ٹانگوں اور کندھوں کو دھکیلتا ہوا مہمان خصوصی کے پاس جاتا اپنا استقبال کراتا، فوٹو کے لیے پوز بناتا اور فوٹو کھنچنے کے بعد خود باہر نکل جاتا یا قریب کھڑے ہوئے لوگوں کی مدد سے باہر نکال دیا جاتا۔ مہمان خصوصی کوئی بزرگ آدمی تھے جو غالباً کرسی میں بیٹھے تھے اس لیے کسی کو نظر نہیں آرہے تھے۔ صرف ان کا شال یا کتابیں دیتا ہوا بوڑھا ہاتھ کبھی کبھی سروں کے بیچ سے ابھرتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔

ناظم جلسہ نے ایک دبلے پتلے منحنی سے ادیب کا نام لیا جو دور کسی کونے میں پھنسا ہوا تھا۔

"واہ! اسے کہتے ہیں جینوئن ادیب" کسی نے پھبتی کسی۔ "چاہیں تو کھونٹی پر ٹانگ لیجیے۔"

بھلا خاں صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے۔ بولے "ارے صاحب ٹانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑی کوشش کریں تو دیوار پر چپکا بھی سکتے ہیں۔ لوگ سمجھیں گے پکاسو کا شاہکار ہے۔"

ناظم جلسہ نے ایک بار پھر حاضرین سے سنجیدگی اختیار کرنے کی درخواست کی اور منحنی ادیب اور مہمان خصوصی کے درمیان دشوار گزار فاصلے کو مد نظر رکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ مہمان ادیب کو بلا کر استقبال کرنے کی بجائے وہیں کھڑے کھڑے اس کا استقبال کرا دیا جائے اور ان کا تحفہ وہیں پہنچا دیا جائے۔

مگر اس مشورہ سے مطمئن ہونے کے بجائے منحنی ادیب اس فوٹو گرافر کی طرف بے چارگی سے دیکھنے لگا جو ہر ادیب کے استقبال کی تصویر کھینچ رہا تھا۔

ناظم جلسہ بڑے کھاگ تھے۔ انھیں فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ مشورہ جیسے دیا تھا ویسے ہی واپس لے لیا۔

منحنی ادیب نے قدم آگے بڑھانے اور حصار جم غفیر کو توڑنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ بالآخر کچھ لوگوں کو اس کی حالت پر ترس آگیا۔ انھوں نے ادیب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور لوگوں کے سروں کے اوپر سے مہمان خصوصی تک پہنچا دیا اور پھر وہاں سے اسی طرح ہال کے باہر پہنچا کر ڈمپ کر دیا جہاں استقبال شدہ ادیب پہلے ہی گھاس کے میدان میں پڑے اپنے جوڑ سہلا رہے تھے۔

مومن خان شوق
اشرف ولا، ۲۲۳-۳-۱۱، ملے پلی، حیدرآباد

غزل

پتھر ہوا کبھی تو کبھی آئینہ ہوا
کوئی تو یہ بتائے مرے دل کو کیا ہوا

اچھا ہوا، برا ہوا جو بھی ہوا ہوا
ہر شخص جی رہا ہے یہی سوچتا ہوا

یہ وہ جگہ نہیں ہے، کہاں لے کے آئے ہو
یادوں نے ایک شہر بسایا تھا۔ کیا ہوا

جس سے بھی ملیے اپنی انا کا اسیر ہے
اس سوچ میں ہوں، آج کے انساں کو کیا ہوا

اب فصل گل کی کس سے یہاں گفتگو کریں
ہر شخص ہے وجود کا صحرا بنا ہوا

یادوں کی انجمن میں وہ ہلچل مچی ہے شوق
جیسے کتاب دل ہو، کوئی کھولتا ہوا

منصورہ احمد
اساطیر- 45 کے مزنگ روڈ لاہور

لتا منگیشکر

اسے میں نے نہیں دیکھا
مگر وہ میری محسن، میری رہبر ہے
مجھے اس نے نہیں چھوا
مگر میرے لیے آغوش مادر ہے
بہت بے خواب راتوں میں مجھے اس نے
سلایا ہے
مدھر آواز کا جھولا جھلایا ہے
میں جب ماحول کے صحرا میں رستہ بھول
کر بھٹکی
مجھے انگلی سے تھامے
میرے گھر آنگن تلک رستہ دکھایا ہے
مرے پیروں کے چھالوں پر
ہری آشاؤں کا مرہم لگایا ہے
وہ فن کا اک سمندر ہے
کسی نے ان سریلے پانیوں کا دوسرا ساحل
نہیں دیکھا
کوئی گہرائیوں میں ڈوب کر واپس نہیں آیا

میں کب سے بادباں کھولے
مچلتی موج کے رخ پر کھڑی ہوں
مجھے اذن سفر، اسم سفر دے
کہ میرا حرف مجھ پر منکشف ہو
مجھے اتنا بتا دے
درد کیسے گیت بنتا ہے!
اک ان بجھ پیاس کا صحرا
ترے اندر اتر کر
کس طرح نغمے میں ڈھلتا ہے
ہزاروں گم شدہ رستوں میں
کس رستے پہ اپنا بھید کھلتا ہے
مجھے حرف تمنا تک رسائی دے
مجھے اپنی تمنا تک رسائی دے
میں تیری پیاس اپنی پیاس میں بھر لوں
مری ہر نظم کے لہجے میں تیری لے مچلتی ہو!
ترے گیتوں کا ہر سر دھڑکتا ہو!!

سید انوار حسین محور
رائل ہوٹل بس اسٹینڈ
چھولا روڈ بھوپال ۔۱

غزل

منجمد ماحول میں تھوڑی سی ہلچل بھیج دے
جنگلوں میں بستیاں بستی ہیں جنگل بھیج دے

رحمتوں کی پھر کوئی لبریز چھاگل بھیج دے
اے خدا دھرتی بہت پیاسی ہے بادل بھیج دے

ہو گئے سنجیدہ بچے اب شرارت بھول کے
سونی گلیوں میں مری کوئی تو پاگل بھیج دے

پھول پھل والے شجر لفظوں کے مرجھانے لگے
اے خدا ان کے لیے فکروں کے بادل بھیج دے

آج کے ماحول میں تو دم مرا گھٹنے لگا
التجا تجھ سے یہ ہے گزرا ہوا کل بھیج دے

مصلحت بینی کہیں سے میری فطرت میں نہیں
یہ روش محور کہیں مجھ کو نہ مقتل بھیج دے

کریم مودھوی
کتاب خانہ حسین گنج
قصبہ مودہا پوسٹ دگول ہمیر پور

غزل

نیک ہے آغاز، تو ہوگا حسیں انجام بھی
دیکھنا! آسان ہو جائے گا مشکل کام بھی

منزل مقصود کی جانب بڑھائے چل قدم
مات کھا جائے گی تجھ سے گردش ایام بھی

جھریاں چہرے پہ اپنے دیکھ کر کیوں ہو اداس
صبح دیکھی جس نے وہ دیکھے گا اک دن شام بھی

تم وہاں سے آئے ہو، یہ تو بتاؤ دوستو!
کیا کوئی اس بزم میں لیتا ہے میرا نام بھی

اضطراب دل جو بڑھتا ہے تو بڑھنے دیجیے
بڑھتے بڑھتے ایک دن آجائے گا آرام بھی

دل مگر دلدار کی جانب نہیں مائل ہوا
ہاتھ میں تسبیح بھی ہے، جسم پر احرام بھی

کامیابی کا بندھا سہرا مرے سر پر کریم
مجھ پر ہی غدار ہونے کا لگا الزام بھی

قاضی فراز احمد
ساگرے، ضلع رتناگیری

غزل

تیرا ستم بھی مجھے خوش خیال کر دے گا
ہر ایک غم کو مرے لازوال کر دے گا

یہ امتحان خودی ہے کوئی مذاق نہیں
جو ڈوب جائے گا وہ بھی کمال کر دے گا

طلب کروں بھی اگر میں دوا مسیحا سے
علاج دل میرا جینا محال کر دے گا

وفا کا حکم نہیں ورنہ میں جو کہہ دوں تو
وہ اپنے سینے سے دل بھی نکال کر دے گا

ناصر مجیبی
نزد ہوٹل راج محل
گدری محلہ نیا بازار، دھنباد۔۱

غزل

میرے حصے کا نہ سایہ نہ شجر باقی ہے
دھوپ ہر راہ میں تاحد نظر باقی ہے

کس کے منصوبے کا آخر یہ نتیجہ نکلا
میرے حق میں کوئی دیوار نہ در باقی ہے

خون کے آنسو رلائے گا اسے بھی پہروں
پچھلے موسم کا اگر کچھ بھی اثر باقی ہے

غم کی تصویر بناتا ہوں لہو سے اپنے
اب تو لے دے کے یہی ایک ہنر باقی ہے

اپنے ہاتھوں سے گنواں بیٹھا ہوں اپنا سب کچھ
یوں سمجھیے کوئی سودا نہیں، سر باقی ہے

گرچہ سیلاب اذیت میں گھرا ہوں کب سے
غرق ہو جاؤں نہ کیسے کہ بھنور باقی ہے

زندگی یوں تو مسافت میں کٹی ہے ناصر
جادۂ زیست میں بس ایک سفر باقی ہے

کوثر مظہری
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

دشت تخیل کی نفی

مجھے دشت تخیل کا سفر کرنا اگر آتا
طواف کعبہ کرتا زندگی کو سمت مل جاتی
صحیفے دل کے سب بکھرے ہوئے میرے سنور جاتے
غم و آلام میرے بھی
غبار راہ بن جاتے
مجھے دشت تخیل کا سفر کرنا اگر آتا
تضادات اب جو پیدا ہیں
وہ پیدا ہی نہیں ہوتے
کہیں کنج سکوں مثل مدینہ مجھ کو مل جاتا
مجھے دشت تخیل کا سفر کرنا اگر آتا
جنہیں دشت تخیل کا سفر کرنا بھی آتا ہے
ہوا کے دوش پر اڑتے ہیں مثل گرد آوارہ
گدھوں کا جھنڈ یا منڈلا رہا ہو جیسے مردوں پر
مجھے دشت تخیل کا سفر کرنا نہیں آتا
نہیں آتا تو اچھا ہے، نہیں آئے تو اچھا ہے

امیر حمزہ ثاقب
322 شانتی نگر دھامنکر ناکہ
بھیونڈی ضلع تھانہ

غزل

قیامت کا سا ہنگامہ نہیں ہے
جو لکھنا تھا مجھے لکھا نہیں ہے

اچھالوں کس دکاں پر جذبۂ دل
یہ وہ سکہ ہے جو چلتا نہیں ہے

نفس کی لے پہ رقصاں ہے تفکر
مرا شاعر کبھی مرتا نہیں ہے

اُڑا دو سر مرا ظل الٰہی
مری زنبیل میں قصہ نہیں ہے

ہر اک جانب محرم ہی محرم
نوید عید کا چرچا نہیں ہے

تمنا، بھوک، بیکاری، مسائل
مرے دامن میں ثاقب کیا نہیں ہے

غـزلـیں

معین شاداب
روانہ شکارپور، بجنور (یوپی)

ہمیں بھی ان چھوٹی منزل کی چاہتیں تھیں بہت
ہماری راہ میں لیکن روایتیں تھیں بہت

کسی کا لہجہ یقیناً فریب لگتا تھا
مگر فریب کے پیچھے صداقتیں تھیں بہت

کہیں بھی آگ لگے اس کا نام آتا ہے
اسے چراغ جلانے کی عادتیں تھیں بہت

اندھیرے، زخم، مسائل، دھواں، لہو، آنسو
گنواتے ہم بھی کہاں تک وراثتیں تھیں بہت

وہ جس کی گفتگو پھولوں کا استعارہ تھی
خموشیوں میں بھی اس کی فصاحتیں تھیں بہت

اتارا جاتا تھا صدقہ ہماری جان کا بھی
ہمارے دم سے بھی منسوب چاہتیں تھیں بہت

کتابیں، لمس کی خوشبو، خطوط، تصویریں
ہمارے پاس کسی کی امانتیں تھیں بہت

بہت سمجھتے ہیں تھوڑے لکھے کو ہم شاداب
ہمارے واسطے اک دو شکایتیں تھیں بہت

روشن لال روشن بنارسی
D66/1DB میر باغ، وارانسی

سرخرو خود کو کر رہا ہوں میں
زندگی دیکھ مر رہا ہوں میں

ذرہ ذرہ سنور رہا ہوں میں
قطرہ قطرہ بکھر رہا ہوں میں

گرد سوغات ہر قدم سر پے
یہ کہاں سے گزر رہا ہوں میں

کچھ کہو یہ عروج ہے کیا ہے
سیڑھیوں سے اتر رہا ہوں میں

ہر سخن ہر قدم ترا مرہون
اور جرمانہ بھر رہا ہوں میں

میں کہیں تھا بھی؟ تو پھر روشن
آئینوں سے جو ڈر رہا ہوں میں

انیس سلطانہ
13۔ موتی مسجد کے پیچھے بھوپال

ایسا بھی ہوتا ہے

جہاں خود روشنی آہنگ فطرت بن کے ڈھلی ہے
وہاں تارے جھجکتے ہیں
نہ ذرّے ڈگمگاتے ہیں
وہاں ہستی کے پیچ و خم
فرازِ خاک کے ذرّے
کبھی کروٹ نہیں لیتے
وہاں نغمے اُبلتے ہیں
وہاں گیسو سنورتے ہیں
وہاں بھی کلی کوئی
کبھی مسلی نہیں جاتی
وہاں معصوم مسکانیں
کبھی نوچی نہیں جاتیں
مگر ایسا بھی ہوتا ہے
کہ جب خود روشنی اپنا وجود نور کھو دیتی
گھٹاؤں میں کبھی گھٹتی
اندھیروں سے کہیں ڈرتی
جھجکتی ڈگمگاتی لڑکھڑاتی
کانپتی کرنیں
لرزتی سسکتی
اندوہِ غم سے اشک برساتی
تو خود سورج
ردائے نیلگوں میں منہ چھپا کر بیٹھ جاتا ہے

ڈاکٹر صغریٰ عالم
عالم بلڈنگ شاہ بازار گلبرگہ

غزل

ہر لمحۂ ہجراں کو چھپائے ہوئے رکھنا
خودی کو کتابوں میں الجھائے ہوئے رکھنا

یادوں کی بہاروں کو اپنائے ہوئے رکھنا
کیوں پھول کتابوں میں کمھلائے ہوئے رکھنا

ماضی کے جھروکوں سے اک برق اترتی ہے
اس پردۂ سیمیں کو سرکائے ہوئے رکھنا

سامان تعیش کا بازار سجا ہو تو
اقدار کے آئینے چمکائے ہوئے رکھنا

ہم پاک زمینوں پہ سجدوں کو سجاتے ہیں
کس کس کے خداؤں کو سمجھائے ہوئے رکھنا

مغل فاروق پرواز
ریسرچ اسکالر، آئی پی آر سی
میڈیکل کالج، اے ایم یو۔ علی گڑھ

غزل

نقوشِ عہدِ گزشتہ مٹانے والی ہے
یہ زندگی جو مجھے راس آنے والی ہے

میں اپنے ذہن کی سرگوشیوں سے واقف ہوں
کہ میری ذات کوئی گل کھلانے والی ہے

نہ جانے کیوں مجھے ہر لمحہ ایسا لگتا ہے
کہ کوئی بات میرا دل دُکھانے والی ہے

مجھے بس آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا بتلادو
یہ راہ کون سی منزل کو جانے والی ہے

جو ایک موڑ پہ خود کو بھلائے بیٹھے ہیں
سنا ہے ان کو مری یاد آنے والی ہے

ایس، ایس بھٹناگر شاداب
۸ سہلی، ایم، کمپاؤنڈ
جی ٹی روڈ، غازی آباد

غزل

(نذرِ غالب)

راہِ الفت میں ہمیشہ کون ہوگا آشنا
"عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا"
ان کے مصرع پر غزل ہے آج فخرِ انجمن
حضرتِ غالب سے تو ہے ساری دنیا آشنا
جام نظروں سے پلا دو یا صراحی سے مجھے
اس طرف بھی ہے یہاں پر اک تمھارا آشنا
ایسی تاثیرِ محبت تونے بخشی ہے مجھے
جس پہ بھی نظریں پڑی ہیں وہ ہی لگتا آشنا
وقت کے حالات سے میں ہوگیا مانوس کچھ
ہوگیا انجان مجھ سے جو تھا اپنا آشنا
خوف کیوں مجھ کو لگے اب دیکھ زاہد جام سے
اب تو تونے کہہ دیا ہے جام تیرا آشنا
وقت پر جو کام آیا بس اسی کو تو سمجھ
یوں تو کہنے کے لیے ہے ایک دنیا آشنا
عمر بھر مجھ کو رہا ہے اس کی الفت سے شغف
کاش میرے اس سبب سے وہ بھی ہوتا آشنا
کیا کہوں شاداب میں اب اس زمانہ کے لیے
اس زمانہ میں ہوا ہے کون کس کا آشنا

(مراٹھی کہانی)

دلیپ سیتارام کاسلے
مترجم: اکبر رحمانی
مدیر اعلیٰ ماہنامہ آموزگار
۷-۳ بھوانی پیٹھ، جلگاؤں

ایک تھی سائنی

سڑک پر گہما گہمی نہیں تھی۔ لوگوں کی آمد ورفت بھی کم تھی اور کاریں بھی اکا دکا آجا رہی تھیں۔ میں اسٹاپ پر کھڑا ایس ٹی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے علاوہ چار پانچ لڑکے اور دو چار لڑکیاں بھی کالج جانے کے لیے ایس ٹی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ یہ میرے لیے اجنبی تھے۔ شاید کالج میں وہ بھی ابھی داخل ہوئے تھے۔

اسٹاپ شیڈ کا بنا ہوا تھا۔ ایک سرے پر ایک چھوٹا سا کیبن تھا جس میں اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کے چند ملازمین بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایس ٹی آنے کا جو ٹائم تھا اس سے دس منٹ زیادہ ہو چکے تھے مگر ایس ٹی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اچانک شیڈ کی دائیں جانب سے ایک عورت نمودار ہوئی اور اس نے کالج کے لڑکوں کو دیکھ کر گالیاں بکنا شروع کر دیں ——— "کیوں رے بھڑ وؤں ——— اب تم یہاں بھی جمع ہو گئے۔ بھاگتے ہو یا ———" اس نے زمین پر سے ایک پتھر اٹھالیا۔ لڑکے گھبرا کر ادھر ادھر ہو گئے۔ میں حیران تھا اور اسی عالم میں اس عورت کی حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے مجھے بھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ "او بھڑوے! مجھے اس طرح کیوں گھور رہا ہے؟" میں تو پانی پانی ہو گیا ——— گالی سنتے ہی میں نے اپنی نظریں ہٹالیں ——— پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ شیڈ کے ایک گوشے میں لڑکیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ عورت جب ان کے پاس سے گزری تو ٹھہر گئی اور کہنے لگی۔ "اری دیوانیو کہاں جانے کے لیے کھڑی ہو؟" شاید لڑکیاں اس عورت کو اچھی طرح جانتی تھیں اس لیے کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ پھر وہ عورت بڑبڑاتے ہوئے دوسری جانب چلی گئی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"کیا پاگل عورت ہے!" میں اپنے آپ بڑبڑایا۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ ایس ٹی کے نہ آنے سے طبیعت بور ہو رہی تھی۔ پھر اس پاگل عورت نے موڈ خراب کر دیا تھا۔ دس پندرہ

منٹ گزرے تھے کہ وہ پاگل عورت پھر دکھائی دی۔ مگر اس بار وہ شیڈ کی طرف نہیں آئی۔ وہ ایک جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ وہ ایسی جگہ بیٹھی تھی جو بالکل میرے مقابل تھی اور میں اس کی ہر حرکت کو بغور دیکھ سکتا تھا۔

اس کی عمر بھی کوئی تیس پینتیس سال تھی۔ گورا رنگ' متناسب بدن' بیضوی چہرہ' ستواں ناک اور ناک میں نتھ لگی ہوئی۔ کمر تک لمبے لمبے بال جو پشت پر ہر قسم کے بندھن سے آزاد۔ آسمانی رنگ کی ساڑی پر رنگ برنگ پھولوں کی بہار۔ چاکلیٹی رنگ کا بلاؤز۔ پاؤں میں چپل' پاس ہی ایک گٹھری اور وائر کی بنی ہوئی تھیلی رکھی ہوئی۔ وہ کچھ اس انداز سے بیٹھی تھی کہ سینے کا ابھار صاف نظر آرہا تھا۔ واقعی وہ حسین تھی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اگر وہ پاگل نہ ہوتی تو ـــــ تھوڑی دیر بعد اس نے تھیلی میں ہاتھ ڈال کر دو پڑیاں باہر نکالیں۔ انھیں کھولا۔ دراصل ان پڑیوں میں پکوڑے تھے۔ پھر اس نے ایک ایک کر کے پکوڑے کھانا شروع کیے۔ وہ خوب چبا چبا کر کھا رہی تھی۔ اس کے کھانے کی آواز' چاؤں' چاؤں' میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اچانک پکوڑے کھانا بند کر دیا۔ بچے کچھ پکوڑے کاغذ میں باندھ کر تھیلی میں ڈالا اور اپنی گٹھری اٹھائے تیزی سے وہاں سے چل دی۔ اسی وقت ایس ٹی آپہنچی۔ پھر سب لوگ ایس ٹی کی طرف دوڑے اور کسی نے اس پاگل عورت کی طرف دھیان نہ دیا۔

اس پاگل عورت کا نام تھا ساکی! پہلی بار اسے میں نے اسٹاپ پر دیکھا تھا۔ یہ پہلا تعارف تھا۔ اس کے بعد ساکی کہیں نہ کہیں نظر آجاتی' مگر ہر بار وہ مختلف رنگ وروپ میں دکھائی دیتی جس کی وجہ سے اس میں میری دلچسپی انجانے طور پر بڑھتی گئی۔

ساکی سچ مچ پاگل تھی۔ اس کی گفتگو چال ڈھال' اٹھنے بیٹھنے' کھانے پینے غرض ہر چیز سے اس کا پاگل پن ظاہر ہوتا تھا۔ وہ بھانگ باڑے میں رہتی تھی۔ وہیں چکر لگاتی رہتی تھی۔ قریبی علاقے کے لوگوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ کوئی پاگل عورت بھانگ باڑے میں رہنے آئی ہے۔ ساکی سیلانی طبیعت کی مالک تھی۔ وہ باڑے میں کم اور سڑکوں پر گھومنے پھرنے میں زیادہ وقت گزارتی تھی۔ سڑکوں پر اس حالت میں گھومتی دکھائی دیتی تھی کہ ساڑی کا پلو کبھی سر پر ہوتا تو کبھی کندھے پر اور کبھی کمر سے بندھا ہوا۔ گٹھری اور تھیلی ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی۔ اپنی اس چھوٹی کائنات کو کبھی اپنے سے جدا نہ کرتی۔ پاگل تو تھی ہی جب چلتے چلتے تھک جاتی تو سڑک پر ہی بیٹھ جاتی۔ ٹریفک کا مطلق خیال نہ رکھتی۔ کاریں' اسکوٹر' گھوڑا گاڑیاں' بیل گاڑیاں وغیرہ سواریاں اس کے قریب سے گزرتیں لیکن اسے اپنی جان کے خطرے میں پڑنے کا

ذرا خوف نہ ہوتا۔ وہ عالم بے ہوشی میں ہوتی۔ کسی تیز سواری سے کچلے جانے یا زخمی ہونے سے بے نیاز رتناگری کی سمت سے آنے والی بسیں اور تیز رفتار ٹرک ساکی کو بچانے کے لیے اتنی زور سے بریک دابتے کہ ٹائروں کے چرچرانے کی آواز دور تک سنائی دیتی۔ راہ گیر چونک جاتے لیکن ساکی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔ ڈرائیور لال پیلے ہو جاتے۔

"اندھی ہو گئی ہے کیا ـــــ دکھائی نہیں دیتا ـــــ کیا بہری ہے۔ ہارن کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی ـــــ ؟ کیا مرنے کا ارادہ ہے ـــــ ؟ چل اٹھ یہاں سے ـــــ معلوم نہیں کہ اس ہائی وے پر کتنا ٹریفک ہوتا ہے ـــــ ! چل اٹھ! سڑک سے دور بیٹھ ـــــ !!"

مردوں کی اتنی کڑوی باتیں سننے کے بعد ساکی چپ کیسے رہتی۔ وہ بھی لال بھبھوکا ہو کر گالیاں بکنے لگتی۔ "تو بھڑوے۔ کیا یہ سڑک تیرے باپ کی ہے؟ مجھے یہاں سے اٹھ کہنے والا تو کون ہوتا ہے رے؟ او بھڑوے کہاں سے آیا رے تو؟" گالیوں کی بوچھار سے ڈرائیور وہاں سے کھسک جاتے اور اپنی گاڑیوں کو جلدی سے نکال لے جاتے۔ کوئی ڈرائیور ساکی کو جواب دینے کی ہمت نہ کرتا۔

مجھے اس قسم کے واقعات دیکھنے کا کئی بار اتفاق ہوا۔ سچ کہتا ہوں ایسے وقت ساکی پہلے سے زیادہ حسین نظر آتی تھی۔ راستہ چلنے والے تھوڑی دیر کے لیے رک جاتے اور للچائی نظروں سے اسے دیکھتے۔ اب لوگوں کی نظروں میں ہوس بھی دکھائی دینے لگی تھی۔ لوگ اس موقع کی تاک میں رہتے جب وہ کسی جگہ اپنے آپ سے بے خبر بیٹھی ہوئی ہوتی۔ جب نہ سر پہ پلو ہوتا نہ ساڑی ٹھیک ٹھاک پہنی ہوئی ہوتی۔ سینے کی گولائیاں نمایاں نظر آتیں اور گورا بدن جھانکتا ہوا دکھائی دیتا۔ کچھ اس انداز سے بیٹھی ہوتی کہ ساڑی گھٹنے کے اوپر کھسک جاتی اور گوری گوری پنڈلیاں صاف دکھائی دیتیں۔ اس منظر میں ایسی کشش تھی کہ ہر راہ گیر اور سائکل سوار اسے دیکھنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا۔ آس پاس کی دکانوں اور ہوٹلوں کے لوگ بھی سب کام چھوڑ کر اسے گھورنے لگتے۔ میں نے بعض ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جن کا ایک بار دیکھنے سے جی نہ بھرا تو تھوڑی دور جا کر پھر پلٹ آئے اور ساکی کو پھر سے دیکھنے لگے۔ ساکی ان بوالہوسوں کی نظروں سے بے پروا اپنے خیالوں میں گم رہتی۔ اسے احساس تک نہ ہوتا لیکن جب وہ اپنے خیالات کی دنیا سے باہر نکل آتی اور جب اسے احساس ہوتا کہ کوئی اسے بھوکی نظروں سے دیکھ رہا ہے تو نہ پوچھیے وہ کیسی بگڑتی۔ جیسے ایک بپھری ہوئی شیرنی!

ایک بار اس نے ایک شخص کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ لیا۔ پھر وہ ایسی بپھری کہ پورا بدن تھرانے لگا۔ آنکھیں لال پیلی ہو گئیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ گندی گالیوں کی وہ بوچھار

کر توبہ توبہ ہی کرتے بنے۔ "تو بھڑوے! کیا دیکھتا ہے رے ـــــ او حرام کے پلے ـــــ کیا تجھے ماں بہن نہیں ہے کیا رے ـــــ او بھڑوے او حرامی" گالیوں کی بوچھار کے ساتھ اس نے پتھر برسانے شروع کر دیے۔ وہ شخص بھاگا۔ ساکی اسے مارنے کے لیے دوڑی۔ اس واقعہ کا گاؤں والوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ ساکی سے خوف کھانے لگے۔ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرنے لگے۔

ساکی کھانے پینے کے معاملے میں بھی بے پروا تھی۔ کسی بھی ہوٹل' دکان اور پھل فروش کی گاڑی کے سامنے کھڑی ہو کر ہاتھ پھیلا دیتی۔ زبان سے کچھ نہ بولتی۔ کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا۔ جو کچھ ملتا اسی پر قناعت کرتی۔ ایک جگہ بیٹھ کر کھا پی لیتی اور پھر اپنی گٹھری اور تھیلی اٹھائے گھومنے پھرنے نکل جاتی۔ شام ہونے پر اپنے ٹھکانے آ جاتی۔ اس کا کوئی گھر نہ تھا۔ اس کا ٹھکانا ایک بند دکان کا اوٹا تھا۔ یہ دکان کسی عدالتی تنازعہ کی وجہ سے برسوں سے بند پڑی تھی۔ ساکی نے وہیں ڈیرہ جما لیا تھا۔ بیٹھنے' آرام کرنے اور سونے کے لیے اوٹا کافی تھا۔ پاس میں چادر تھی نہ بستر۔ گٹھری کو تکیہ بنا لیتی اور تھیلی ہاتھ کے نیچے دبا لیتی۔

گٹھری میں دو تین ساڑیاں اور بلاؤز کے سوا کچھ نہ تھا۔ ساکی پاگل ضرور تھی۔ لیکن وہ ان پاگل عورتوں کی طرح نہ تھی جو اپنے بالوں کو بکھرائے' پیلے و گندے دانت لیے۔ پھٹے' پرانے اور غلیظ کپڑے پہنے پھرتی ہیں اور جن کے بدن سے بدبو کے بھبکے اٹھتے رہتے ہیں۔ ساکی کو گندگی بالکل پسند نہ تھی۔ وہ ہمیشہ صاف ستھری رہتی تھی۔ ایک دن آڑے ساڑی بدلتی تھی۔ وہ اپنے گورے بدن کی صفائی کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ ساکی روز صبح قریبی گاؤں جھوڑ کے نالے پر نہانے جاتی تھی۔ یہ نالہ پانچ سات فٹ چوڑا تھا اور اس میں ہمیشہ صاف و شفاف پانی رہتا تھا۔ اس نالے پر ایک چھوٹا سا پل بھی بنا ہوا تھا۔ نہاتے وقت یہ پل ساکی کے لیے ایک پردے کا کام دیتا تھا۔ صبح صبح کوئی ادھر نہ آتا تھا۔ اس لیے بلا خوف و خطر یہاں نہاتی تھی۔ کبھی کپڑوں کے ساتھ' کبھی بلاؤز اتار کر اور کبھی سارے کپڑے اتار کر ننگے بدن نہاتی تھی۔ نہانے کے بعد گٹھری میں سے ساڑی اور بلاؤز نکال کر پہن لیتی اور پھر سورج کی طرف رخ کر کے بال سکھانے اور نرم دھوپ کھانے بیٹھ جاتی۔ وہ ایسے اسٹائل میں بیٹھی ہوتی جیسے کوئی دیوی کسی دھیان میں مگن ہو۔

روز صبح میں کالج جاتے ہوئے یہ حسین نظارہ دیکھتا تھا۔ پل نزدیک آتے ہی سائکل کی رفتار دھیمی کر دیتا اور ترچھی نظروں سے ساکی کے سنگ مرمر جیسے بدن کو دیکھتا ـــــ اور پھر جلدی جلدی پیڈل مار کر اس کی نظروں سے او جھل ہو جاتا۔ اسے احساس بھی نہ ہونے دیتا کہ میں نے اسے گھورا ہے۔ اس طرح ساکی مجھے ہر روز الگ الگ رنگ و روپ میں دکھائی دیتی۔

جہاں وہ نہاتی تھی وہاں آس پاس گھنی جھاڑی تھی۔ اس لیے کوئی شخص ادھر جاتا نہیں تھا۔ صرف ساکی روز نہانے یہاں آتی تھی۔ بھانگ باڑے کے رہنے والوں کو بھی اس کا علم نہیں تھا مگر یہ بات زیادہ عرصہ چھپی نہ رہ سکی۔ آخر باڑے کے ایک شخص کو اس کا پتا چل گیا۔ ایک دن اتفاق سے وہ ادھر آنکلا اور اس نے ساکی کو عریاں بدن نہاتے ہوئے دیکھ لیا۔ پھر وہ اجنبی شخص روز وہاں آنے لگا۔ وہ آتا اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو کر ساکی کو نہاتے ہوئے دیکھتا۔ اس طرح پندرہ دن گزر گئے۔ ساکی اس اجنبی شخص کے اس طرح چھپ کر دیکھنے سے بے خبر تھی مگر ایک دن ساکی نے اسے دیکھ لیا اور پھر اس دن اس کا جو روپ دکھائی دیا اس نے مجھے بے چین کر دیا۔

وہ اجنبی شخص پندرہ دن سے مسلسل وہاں آرہا تھا۔ ایک دن بھی ناغہ نہ ہوا۔ سولہویں دن وہ پھر آیا اور درخت کی آڑ میں کھڑا ہو کر ساکی کے نہاتے دیکھنے لگا۔ اس دن ساکی نے اپنے تمام کپڑے اتار دیے تھے۔ نہانے کے بعد اس نے گٹھری میں سے نئی ساڑی اور بلاؤز نکالا اور انھیں پہننے لگی۔ اچانک اس کی نظر اس اجنبی شخص کی طرف اٹھ گئی۔ پھر ساکی کی حالت ایسی متغیر ہوئی اور اس نے ایسا بھیانک روپ اختیار کیا کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ حیا، شرم اور غصہ کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ منہ سے نہایت گندی اور فحش گالیاں نکلنے لگیں ـــــ "تو بھڑوے تو سالے تو حرامی مادرے تیری مائی چا ـــــ کیا دیکھ رہا ہے رے او بھاڑ کھاؤ ـــــ کیا تیری ماں بہن نہیں ہے کیا رے ـــــ او رنڈوے او بھڑوے ـــــ جاتا کہ نہیں یہاں سے ـــــ جا نہ اپنی ماں بہن کو دیکھ نا ـــــ" اور پھر ساکی نے ہاتھوں میں پتھر اٹھا لیے اور اس شخص کو مارنے دوڑی۔ وہ اجنبی شخص وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اب یہ عالم تھا کہ وہ اجنبی سرپٹ بھاگا جا رہا تھا اور ساکی پتھر اٹھائے گندی گالیاں دیتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ کبھی دونوں کے درمیان فاصلہ کم ہو جاتا اور کبھی بڑھ جاتا۔ جب فاصلہ کم ہوتا تو وہ زور سے پتھر مارتی۔ اس طرح اس نے کئی بار پتھر مارے لیکن کوئی نشانے پر نہ لگا۔ وہ اجنبی شخص تیز دوڑ رہا تھا۔ ساکی نے دوڑتے دوڑتے نیچے جھک کر ایک بڑا پتھر اٹھا لیا۔ اب ساکی کے دوڑنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور اس اجنبی کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ فاصلے آہستہ آہستہ سمٹ رہے تھے۔ جوں ہی وہ اجنبی بھانگ باڑے کے پاس پہنچا، ساکی نے پوری قوت سے اس کی سمت بڑا پتھر پھینکا۔ اس بار وار خالی نہ گیا تھا۔ پتھر سیدھا جا کر گھٹنے پر لگا تھا۔ وہ چیخ پڑا۔ تلملا کر رہ گیا۔ اب وہ لنگڑانے لگا تھا۔ باڑے میں داخل ہو کر وہ ایک گلی میں گھس گیا اور پھر وہ نظر نہ آیا۔ ساکی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس گلی میں پہنچی۔ جب وہ اجنبی نظر نہ آیا تو وہ باوری سی ہو گئی۔ اس

نے بال نوچنا شروع کر دیے۔ چیخنے چلانے لگی۔

"تو بھڑوے۔۔۔ باہر نکل ۔۔۔ کہاں چھپ گیا رے بھاڑ کھاؤ حرامی۔۔۔ باہر آرے۔۔۔ تجھی آئی چا۔۔۔" اور پھر اس نے گندی گندی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس اجنبی شخص کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ ڈر کے مارے کہیں دبکا بیٹھا تھا۔ جب وہ اجنبی دکھائی نہ دیا تو ساکی نے دونوں ہاتھوں سے چھاتی پیٹنا اور جھومنا شروع کر دیا۔ "چل باہر نکل۔۔۔ چل باہر نکل۔ بس یہی رٹ وہ لگائے جا رہی تھی۔ ابتدا میں آواز دھیمی تھی۔ پھر یہ لے تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اب پوری فضا میں یہ آواز گونج رہی تھی۔ آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں سے نکل کر جمع ہونا شروع ہوئے۔ گویا تماشا ہو رہا تھا۔ واقعی دیکھنے لائق منظر تھا۔ ساکی جھوم رہی تھی وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ انگ انگ تھرک رہا تھا۔ اپنی جگہ اچھل کود کر رہی تھی جس سے اس کی بے چینی کا اندازہ ہوتا تھا۔ سینے کی گولائیاں نیچے اوپر ہو رہی تھیں۔ ساڑی کے پلو اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ بلاوز ڈھیلا ہو چکا تھا۔ چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ ایک اجنبی مرد کا ساکی کو ننگے بدن نہاتے دیکھ لینا بڑا غضب ڈھا رہا تھا۔ اس کے تن بدن میں لگی آگ نے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔۔۔ اس کے اضطراب و بے چینی کو میں سمجھ رہا تھا۔ ساکی تھی تو پاگل لیکن غیور اور پاک دامن تھی۔ یہ نیا روپ مجھے اچھا لگا، اس سے میری بے چینی بھی بڑھی۔ بھانگ باڑے کے مکین تماشائی بنے ساکی کے گورے بدن کو گھور رہے تھے۔ کسی نے ساکی کے درد کو جاننے کی کوشش نہ کی۔ مجھ سے ساکی کی یہ بے قراری دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں دل میں بھگوان سے پرارتھنا کر رہا تھا "اے بھگوان! ساکی کی بے قراری کو قرار دے، اس کے تن بدن میں لگی آگ کو ٹھنڈا کر دے۔۔۔" بھگوان نے میری پرارتھنا سن لی۔ ساکی کا اچھلنا کودنا، جھومنا اور بڑبڑانا کم ہوتا گیا۔ وہ تھک کر وہیں بیٹھ گئی۔ سر گھٹنوں پر رکھے کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔۔۔ پورے ماحول پر سکوت طاری تھا۔۔۔ چند منٹوں بعد ساکی نے آہستہ آہستہ اپنا سر اٹھایا۔ لوگوں کی طرف نفرت اور غصہ بھری نظروں سے دیکھا۔ تماشا دیکھنے والے ساکی کی نظروں کی تاب نہ لا سکے اور ڈر کے مارے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ میں بھی وہاں سے کھسک گیا۔ سیدھا اسٹاپ پر آیا اور ایس ٹی پکڑ کر کالج چلا گیا۔ دوپہر واپسی ہوئی تو اسٹاپ کے پاس ساکی بیٹھی دکھائی دی۔ پرسکون حالت میں تھی۔ ساڑی ٹھیک پہنی ہوئی۔ بال جمے ہوئے۔ پاس گٹھری اور تھیلی۔ اسے دیکھ کر دل کو اطمینان ہوا۔

بھانگ باڑے میں جمعہ کے دن ہفتہ وار بازار لگتا تھا۔ آس پاس کے چھ سات گاؤں کے لوگ خرید و فروخت کے لیے آتے تھے۔ کافی بھیڑ ہوتی تھی۔ اس روز ساکی صبح سے لے

کر شام تک بازار میں گھومتی پھرتی تھی۔ وہ ایک ایک دکان کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور تھیلی سامنے کر دیتی۔ ہر دکاندار کچھ نہ کچھ اس کی تھیلی میں ڈال دیتا۔ اس طرح ساکی کی تھیلی مختلف پھلوں، مٹھائیوں اور نمکین چیزوں سے بھر جاتی۔ غرض بازار کا دن ساکی کے لیے مصروفیت کا ہوتا تھا۔ اس دن اسے آرام نہ ملتا۔ تھک کر چور ہو جاتی۔ شام ہونے پر وہ اپنے ٹھکانے پہنچ جاتی اور نہایت سکون اور آرام سے ایک ایک چیز تھیلی میں سے نکال کر کھاتی جاتی۔ خوب سیر ہو کر کھاتی اور وہیں سو جاتی۔

ایک دن بڑا عجیب سماں دیکھنے کو ملا۔ وہ بازار ہی کا دن تھا۔ ساکی نے بازار گھوم پھر کر کھانے پینے کی کئی چیزیں جمع کر لی تھیں۔ شام کے وقت اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر اس نے پیٹ بھر کھانا کھایا۔ قریب کے ہوٹل جا کر پانی پیا۔ وہاں سے وہ پیدل مشن مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ راستہ چلتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ ابتدا میں آواز مدھم تھی پھر تیز ہوتی گئی۔ اب وہ گردن کو بھی جھٹکے دے رہی تھی اور ہاتھوں کو بھی نچا رہی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات سے غم و غصہ اور نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ماضی کا کوئی زخم ہرا ہو گیا ہو۔ کبھی وہ "آخ تھو" کہہ کر تھوکتی بھی جاتی تھی مگر اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ اب تو آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔۔۔ "مگر وہ وہاں نہیں آیا۔ میں تو ٹائم پر وہاں پہنچی تھی۔۔۔ پھر اس نے اپنا وعدہ پورا کیوں نہ کیا۔۔۔؟ پاجی کہیں کا۔۔۔ آخ تھو۔۔۔ اب وہ میرے سامنے کیا منہ لے کر آئے گا۔ اگر آیا بھی تو میں چپل ہی سے اس کا منہ لال کروں گی۔ پاجی کہیں کا۔۔۔ جب نہیں آنا تھا تو مجھے وہاں کیوں بلایا تھا۔۔۔ آخ تھو" اس طرح بڑبڑاتے ہوئے ساکی نے مشن مارکیٹ سے گلگرنی کے آرا مشین (Saw Mill) تک دو تین چکر لگائے اور جب تھک گئی تو اپنے ٹھکانے پر آکر گہری نیند سو گئی۔

ساکی کی بڑبڑاہٹ کا اس کے ماضی سے گہرا رشتہ تھا۔ جس دن وہ بڑبڑاتی نہیں تھی اس دن وہ جھومتی اور ناچتی۔ ایسا لگتا جیسے 'گوری' اپنے میکے آکر خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔ ساکی بھی اچھل کود کرتی اور 'جھما جھگڑی' کھیلتی پسینہ پسینہ ہو جاتی۔ چہرہ سرخ ہو جاتا۔ ساڑی ڈھیلی ہو جاتی۔ جب تھک جاتی تو اسی جگہ بیٹھ کر چہرے سے پسینہ پونچھتی۔ ساڑی ٹھیک سے باندھتی۔ کچھ دیر سستانے کے بعد بھی دل میں اٹھا طوفان کم نہ ہوتا تو پھر وہ تازہ دم ہو کر سڑک پر آجاتی اور تالیاں بجاتے ہوئے ایک دائرے کی شکل میں اچھل کود اور ناچنا شروع کر دیتی۔ تالیاں بھی بجاتی جاتی اور ایک عالم مستی میں گانے لگتی:

پی نے میرے 'پی نے میرے
سکھارے ہائی انگریزی انگریزی
ساس نے میری ٹیکا لگایا ماتھے پہ میرے
میں تو شوقین بندیا کی 'بندیا کی
بندیا کیوں نہ لگاتی رے ہائی
پی نے میرے 'پی نے میرے
ساس نے میری لہنگا پہنایا 'لہنگا پہنایا
میں تو شوقین ساڑی کی 'ساڑی کی
ساڑی کیوں نہ پہنتی رے ہائی
پی نے میرے 'پی نے میرے

کافی دیر تک ساکی جھوم جھوم کر یہ گیت گاتی رہی۔ اسے آگے کے بول یاد نہیں آرہے تھے۔ اس لیے بار بار پہلے کہے ہوئے بول دہراتی جاتی تھی۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ اچانک اس نے جھومنا بند کر کے ساڑی کو ذرا اوپر کس کر باندھا اور 'پھگڑی' کھیلنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے 'پھو۔۔۔ پھو۔۔۔ پھو کی آواز آرہی تھی۔ پورا بدن رقص کر رہا تھا۔ ساڑی کا پلو سینے سے پھسل کر نیچے لٹکنے لگا تھا۔ جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ دکانوں اور ہوٹلوں سے لوگ آ آکر جمع ہو رہے تھے۔ ساکی کا یہ نیا روپ تھا جو انھوں نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ تماشائیوں کی نظروں سے بے خبر ہو کر ساکی بے خودی کے عالم میں ناچ رہی تھی۔ پانچ منٹ ہوئے 'دس منٹ ہوئے لیکن اس کے جوش میں کمی نہ آئی۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ناچنا بند کر دیا۔۔۔۔ شاید وہ ہوش میں آچکی تھی۔ اپنی ساڑی کو ٹھیک کیا' بکھری ہوئی زلفوں کو باندھا' ساڑی پر لگی دھول جھٹکی' چہرے سے پسینہ پونچھا۔۔۔۔ اور پھر اپنی گٹھری اور وائر کی تھیلی اٹھا کر چل دی۔ مٹن مارکیٹ سے آگے نکل گئی اور پھر دکھائی نہ دی۔ یہ مستی کی لہر کبھی کبھار اسے آتی تھی اور اس وقت اس کا حسن اور نکھر جاتا تھا۔

بھانگ باڑے میں سکونت اختیار کیے ساکی کو دو سال ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں اس کے پاگل پن میں ذرہ بھر بھی فرق نہ ہوا تھا۔ پاگل پن کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا تھا۔۔۔۔ لیکن جسمانی ساخت میں کوئی فرق نہ ہوا تھا۔ اس کا ڈیل ڈول وہی تھا جب وہ یہاں آئی تھی۔

لیکن ایک دن۔۔۔۔

میں اس دن گھر میں اکیلا تھا۔ گھر کے سب لوگ کھیت پر گئے ہوئے تھے۔ میں مطالعہ

میں غرق تھا۔ پڑوس میں شانتا کاکو کا گھر تھا۔ کاکو کی بہو زچہ ہوئی تھی۔ یہ اس کی پہلی ڈلیوری تھی۔ دوپہر کے خالی وقت میں پاس پڑوس کی عورتیں گپ شپ کے لیے کاکو کے گھر آتی تھیں۔ میرے اور کاکو کے گھر کے درمیان میں صرف ایک اینٹ کی پتلی سی دیوار حائل تھی۔ دونوں طرف کی آوازیں ایک دوسرے کو صاف سنائی دیتی تھیں۔ دھیمی آواز میں کہی ہوئی بات بھی سنائی دیتی۔ اس دن دوپہر کے وقت عورتوں میں خوب باتیں ہوئیں۔ اگرچہ میں مطالعہ میں غرق تھا لیکن کان عورتوں کی باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اچانک کسی نے ساکی کا نام لیا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے کتاب بند کر دی اور دیوار سے کان لگا دیے۔

کملا پھوپھی کہہ رہی تھی۔ "اری کچھ سنا تم نے ـــــ اس پاگل عورت ساکی نے کیا کام کیا؟"

"کیا بات ہے؟" جنا چاچی نے دریافت کیا۔

"اری وہ پاگل ساکی حاملہ ہو گئی ہے۔"

"کیا کہا؟" سب عورتوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

کملا پھوپھی آہستہ سے بولی۔ "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں۔ پورے باڑے میں اس کا چرچا ہے۔ یہ خبر سن کر میں خود بھی حیران ہوں۔"

یہ خبر میرے لیے بھی حیران کن تھی۔ میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات آ نہیں سکتی تھی۔ ساکی پاگل ضرور تھی لیکن غیرت مند اور پاک دامن تھی۔ ممکن ہے کسی نے افواہ اڑائی ہو۔ یقین کرنے کو طبیعت آمادہ نہ تھی۔ مگر پورے گاؤں میں اس کا چرچا ہے تو پھر لوگ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہوں گے۔ مگر یہ ہوا کیسے ـــــ؟ کون پاپی ہے جس نے ساکی جیسی معصوم اور پاک دامن بیوہ کے ساتھ بلات کار (زنا بالجبر) کیا ـــــ؟ اور پھر یہ حادثہ کب ہوا ـــــ؟ کاش! یہ خبر افواہ ثابت ہو۔

رات بے چینی میں گزری۔ دوسرے دن صبح کالج کے لیے نکلا۔ ساکی کے بارے میں جو خبر سنی تھی اس کے سچ یا جھوٹ ہونے کا پتا چلانے کے لیے پہلے بھانگ باڑا گیا۔ ساکی اپنے ٹھکانے پر دکھائی دی۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر اندازہ نہ لگا سکا۔ اسے بغور دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے غصہ سے ڈر لگتا تھا۔ مزید وہاں رک کے کالج کے لیے اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کالج کی مصروفیات میں چند ماہ ایسے بیتے کہ ساکی کا خیال تک نہ آیا۔ اسے دیکھنے کی تمنا انگڑائی لینے لگی تھی۔

ایک دن وہ نظر آ گئی۔ دور سے دیکھنے پر بھی وہ حاملہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کا پیٹ کافی آگے نکل چکا تھا۔ ایک ایک قدم بھاری پڑ رہا تھا۔ جو بھی دیکھتا کالی دیتا، تھو تھو کرتا، بھیانک رہا تھا

جیسے لوگوں کی حمیت اور غیرت جاگ گئی ہو اور اب وہ ایسی بدکردار عورت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ کل تو جو اس کے گورے بدن کو گھورتے تھے وہی آج ساگی کو آوارہ، بد چلن اور فاحشہ کہہ رہے تھے۔

"جناب وہ تھی ہی بدچلن۔۔۔ اسی لیے تو اس نے شوہر کو چھوڑ دیا تھا؟"

"وہ بے حیا تھی، بدکردار تھی، آوارہ اور بدمعاش لڑکے اس کے ساتھ رہتے۔ جبھی تو حاملہ ہوئی۔" چھوٹا سا گاؤں جتنے منہ اتنی باتیں۔ کسی کی زبان سے یہ نکلا کہ جو عورت کسی اجنبی مرد کا اپنی طرف گھور کر دیکھنا پسند نہ کرتی تھی وہ حاملہ کیسے ہو گئی؟ ضرور کسی نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہو گی؟ مظلوم سے ہمدردی کرنا تو دور رہا، بس گالیاں دیئے جا رہے تھے۔ برا بھلا کہے جا رہے تھے۔ کسی نے ظالم کی طرف اشارہ تک نہ کیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ ساگی پاگل تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ دنیا میں اس کا رشتہ دار نہ تھا۔ پھر یہ سب کیسے ہوا؟ یہ ایسا معما تھا جو حل نہیں ہو رہا تھا۔ بعض ساتھیوں سے گفتگو کی مگر وہ بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ میری نگاہ میں ساگی معصوم اور بے گناہ تھی۔ سماج اس کے ساتھ جو سلوک کر رہا تھا اس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ میں کھل کر اظہار ہمدردی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ ساگی سے نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اب کوئی دکان اور ہوٹل والا بھی اسے بھیک نہیں دیتا تھا۔ گالیاں دے کر بھگا دیا جاتا تھا۔ مجھ سے جو بن پڑتا اس کی مدد کرتا۔

گاؤں میں سب کا ضمیر مردہ نہیں ہوا تھا۔ چند ایسے تھے جن کا ضمیر زندہ تھا اور وہ بھی میری طرح سوچتے تھے۔ انھیں بھی ساگی سے ہمدردی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ساگی پاک دامن تھی۔ دراصل اس کے پاگل پن سے کسی نے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ ظالم، وہ پاپی کون ہے؟ اسی بات کی تفتیش میں وہ لگے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے اندھیرے میں روشنی کی کرن دکھائی۔

ساگی کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے سڑکوں اور بازار میں گھومنا پھرنا کم کر دیا تھا۔ ناچنا، اچھلنا اور کودنا کب کا بند ہو چکا تھا۔ جسمانی حالت ان حرکات کی اجازت بھی نہ دیتی تھی۔ دن بہ دن پیٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ ساگی کے حاملہ ہونے کی خبر باڑے سے نکل کر آس پاس کے دیہاتوں میں پھیل چکی تھی۔ ہفتہ وار بازار کو آنے والے تجسس بھری نگاہوں سے ساگی کو دیکھتے تھے۔ یہ بات گاؤں والوں میں دھیرے دھیرے کھلتی گئی کہ ساگی کے ساتھ کسی پاپی نے زیادتی کی؟ اب ہر کوئی یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ پاپی کون ہے؟ کچھ لوگ کالج کے بعض جوانوں پر شک کا اظہار کر رہے تھے تو کچھ بعض لفنگوں اور بدمعاشوں

کا ذکر کر رہے تھے مگر یقینی طور پر کوئی نہیں کہہ رہا تھا۔

چند دنوں بعد بھانگ باڑے کے ایک معتبر شخص نے اس راز سے پردہ اٹھایا۔ اس نے کسی کا نام نہ لیا۔ اشارتاً کہا کہ "ساکی کی خراب حالت کے ذمہ دار باڑے ہی کے چند آوارہ اور بدمعاش لڑکے ہیں۔ وہ آدھی رات گزرنے کے بعد ساکی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے، اچھے کھانے کھلاتے اور پانی کے بجائے شراب پلاتے۔ وہ کھانوں میں یا شراب میں خواب آور گولیاں ملا دیتے تھے۔ ساکی تو پاگل تھی ہی کھانا کھانے اور خوب شراب پینے کے بعد وہ مدہوش ہو جاتی۔ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتی اور پھر ان بدمعاشوں کی بن آتی۔ ایک کے بعد ایک اس کی عزت لوٹتے۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ بدمعاش لڑکے کون تھے؟"

"نہیں ـــــ میں بالکل نہیں جانتا۔ میں ان کا پتا لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجرموں کے نام سے واقف ہے لیکن ڈر کے مارے نہیں بتا رہا ہے۔

اب گاؤں والے بھی اس حقیقت سے واقف ہو چکے تھے۔ ایک دن کالج سے واپسی پر اسٹاپ پر اترا تو بائیں طرف لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ کیا حادثہ پیش آیا۔ یہ جاننے کے لیے بھیڑ میں گھسا تو سامنے جو منظر دیکھا وہ دردناک اور روح فرسا تھا۔ اس منظر نے سوچنے کی قوت مجھ سے چھین لی تھی۔ سامنے ساکی کی لاش تھا۔ زبان باہر نکلی ہوئی۔ زمین پر خون کے دھبے۔ اس کی لاش پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ لوگ آتے، لاش دیکھتے، افسوس کرتے اور چلے جاتے، طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کافی دیر بعد دو پولس کانسٹبل، سرنج، پولس پاٹل اور ان کے ہمراہ چار گواہ آئے۔ لاش کا پنچ نامہ کیا گیا۔ موت کا سبب حرکت قلب کا بند ہونا تحریر کیا گیا۔ گواہوں نے دستخط کیے۔ پھر لاش کو بھانگ باڑے کی شمشان بھومی میں جلا دیا گیا۔ اس طرح ایک نہیں دو جانیں جلائی گئیں۔ ساکی کا اچانک مرنا بھی لوگوں میں موضوع بحث بن گیا تھا۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"کسی نے ساکی کو چھیڑا۔ اسے غصہ آیا اور پھر ایسا زور کا جھٹکا لگا کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔"

"نہ جانے پیٹ میں کیا گڑبڑ ہوئی کہ وہ برداشت نہ کر سکی۔"

"جن بدمعاشوں نے ساکی کے ساتھ بلاتکار (زنا بالجبر) کیا تھا انھوں نے بدنامی اور سزا کے ڈر سے اسے زہر دے کر مار ڈالا۔"

مرنے کی چاہے جو وجہ رہی ہو۔ دکھ کی بات یہ تھی کہ ایک معصوم عورت کی عزت، عصمت اور پاک دامنی چند پاپیوں کے ہاتھوں خاک میں مل چکی تھی اور سماج خاموش تھا۔

ڈاکٹر وہاب قیصر
پرنسپل، ممتاز کالج
ملک پیٹ، حیدرآباد۔۵۰۰۰۳۶

دھماکو اشیاء برائے امن

دھماکو اشیاء کے تصور سے ہی ہم کانپ جاتے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں ان کے ذریعہ کی گئی تخریبی کارروائیاں یاد آجاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح، جس طرح کہ ایٹمی توانائی کے نام سے ہمارے ذہن کے پردے پر ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہ کاریاں ابھر آتی ہیں، جہاں دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹم بم گرائے گئے تھے۔ حالانکہ ایٹم بم، ایٹمی توانائی کا صرف ایک ہی جنگی استعمال ہے۔ جب کہ "ایٹمی توانائی برائے امن" میں یہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے بیسیوں اغراض کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اسی طرح تخریبی کاموں کے لیے دھماکو اشیاء کا بم کی شکل میں صرف ایک استعمال ہے۔ ان اشیاء کے اچھے مقاصد کے لیے استعمال کی بنا پر "دھماکو اشیاء برائے امن" جیسا نیا محاورہ وضع کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک سائنسی اور صنعتی ترقی کا تعلق ہے، وہ نہ صرف دھماکو اشیاء پر انحصار کرتی ہے، بلکہ معاشی استحکام میں بھی یہ اشیاء ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہیں۔

یورپ کے صنعتی انقلاب میں دھماکو اشیاء کا استعمال زمین سے معدنی ذخائر کو حاصل کرکے انھیں صنعتوں کے فروغ دینے میں کلیدی رول انجام دیا تھا۔ آج بھی انجینئرنگ کے بڑے بڑے پروجکٹ اور خلائی کھوج انہی اشیاء کی مرہون منت ہیں۔ دھماکو اشیاء کی ٹکنالوجیوں میں ترقی اور ان کے صحیح سمت میں استعمال نے کئی ایک دشوار امور کو سہل بنادیا ہے۔ دریاؤں کا رخ موڑنے، پہاڑوں کو کاٹ کر راستوں سے ہٹانے یا ان میں سرنگیں بنانے، گہری کانوں سے معدنی دولت حاصل کرنے اور براعظموں اور ملکوں کو سڑکوں اور ریلوے لائنوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے منسلک کرنے میں دھماکو اشیاء کلیدی رول ادا کرتی ہیں۔ ان اشیاء کے مفید استعمال کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح تخلیقی قوت کو تخریبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح تخریبی قوت کو تخلیقی اغراض کی تکمیل میں بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

دھماکو اشیاء کیمیائی مرکبات یا مرکبات کے آمیزے پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان اشیاء میں جب مناسب طریقہ سے خلل پیدا کیا جاتا ہے تو وہ آن واحد میں بھڑک اٹھتی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں زوردار دھماکے کے ساتھ دھویں اور ذرات کا غبار اٹھتا ہے علاوہ ساتھ ہی ساتھ بہت

زیادہ مقدار میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو دھماکو اشیاء کے بھڑک اٹھنے کا وقت ایک سکنڈ کا دس ہزارواں حصہ ہوتا ہے اور پیدا ہونے والے گرد و غبار کی رفتار ۸ ہزار ے ۲ کلو میٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جو پھیل کر اپنے اصلی حجم سے ۱۰ ہزار تا ۱۵ ہزار گنا زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ دھماکے کی وجہ سے اتنی زیادہ توانائی پیدا ہوتی ہے کہ دھماکے کے مقام پر کی تپش ۳۰۰۰ تا ۵۰۰۰ ڈگری سیلسیس ہو جاتی ہے۔

زمانۂ قدیم ہی میں کئی دھماکو اشیاء دریافت ہو چکی تھیں۔ جن میں ٹرائی نائٹرو ٹالوین (TNT)، ٹرائی نائٹرو گلیسرین (TNG)، ٹرائی نائٹرو سیلولوز (TNG) اور نائٹرو اسٹارچ (NS) شامل ہیں۔ نائٹرو گلیسرین اور نائٹرو سیلولوز، ایسی دھماکو اشیاء ہیں، جو آسانی سے بھڑ اٹھتی ہیں۔ ان کی تیاری میں خود بخود بھڑک اٹھنے کا خدشہ لگا رہتا ہے اس لیے ابتداء ہی ان انھیں بہت کم استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے مشہور سائنس داں الفریڈ نوبل نے چند ہی سال کی تحقیق کی بدولت ۱۸۶۷ء میں ان دونوں مرکبات کے آمیزے پر مشتمل دھماکو شئے کی محفوظ طریقے سے تیاری کا طریقہ دریافت کیا۔ اس دھماکو شے کو نوبل نے ڈائنا مائٹ کا نام دیا۔ ڈائنا مائٹ کو اس نے مزید ترقی دے کر Gelatinur Dynamite جیسی پلاسٹک دھماکو شئے تیار کی۔ جس کو عام طور پر Blerting Gelatin کہا جاتا ہے۔

آج دنیا میں، مختلف اغراض میں استعمال کی جانے والی مختلف طاقتوں کی حامل دھماکو اشیاء دستیاب ہیں۔ انھیں عام طور پر دو قسموں میں بانٹا جاتا ہے۔ ادنیٰ دھماکو اشیاء یا Deflagrading Type اور اعلا دھماکو اشیاء Detonating Type۔ وہ اشیاء جو کسی شعلے سے یا حرارت کے کسی ماخذ سے بھڑک اٹھتی ہیں، ادنیٰ دھماکو اشیاء کہلاتی ہیں۔ یوں تو یہ اشیا بھی تیزی سے جل اٹھتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے جلنے کی رفتار ۴۰۰ میٹر فی سکنڈ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ادنیٰ دھماکہ کو اشیاء کو بندوق سے گولیوں اور توپوں سے گولوں کو داغنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ داغے جانے میں استعمال ہونے والی اشیا Propellants کہلاتی ہیں۔ چنانچہ راکٹ، میزائل اور سٹیلائٹ کو داغنے کے لیے Propellangr ہی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے ٹھوس اور سیال دونوں ہی دھماکو اشیاء استعمال کی جاتی ہیں۔ اعلا دھماکو اشیاء جب بھڑک اٹھتی ہیں تو ان میں Shock Wave پیدا ہوتی ہیں، جن کی رفتار Supersonic ہوتی ہیں۔ یعنی ان لہروں کی رفتار، آواز کی رفتار سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ لہریں دھماکے کے مقام سے پوری شئے میں پھیل جاتی ہیں۔ جس پر زوردار دھماکے کے ساتھ بہت زیادہ مقدار میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اور تپش اور دباؤ میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد نئی اقسام کی دھماکو اشیاء کو فروغ دیا گیا، جو Slurry دھماکو اشیا اور Gel دھماکو اشیاء کہلاتی ہیں۔ آج کل یہ دھماکو اشیاء ڈائنا مائٹ کا نعم البدل ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ

دونوں ہی اقسام کی اشیاء، میکانی اثرات سے محفوظ دھماکو اشیاء میں شمار کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ رائفل سے داغی گئی گولی بھی بعض صورتوں میں انھیں بھڑکانے میں ناکام ثابت ہوتی ہے۔ انھیں بھڑکانے کے لیے Detonatong Cap اور فیوم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ سلری دھماکو اشیاء Rdx, Edna, Petn, Pentolite اور Tetryl شامل ہیں۔ Rdx عصر حاضر میں استعمال ہونے والی طاقتور ترین دھماکو اشیاء میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ سفید نمکی پاؤڈر پر مشتمل Cyclonite Hexogen مرکب ہوتا ہے۔

انسانی فلاح و بہبود کے لیے دھماکو اشیاکے استعمالات میں دو دھاتوں کی Metal Cladding جیسی تکنیک ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس تکنیک کو کیمیکل پلانٹس کی تنصیب، پانی کے جہاز بنانے کی انڈسٹری کے Heat Exchangers بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ دھماکو اشیاء دھاتی صنعتوں میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ جیسے ہوائی جہاز اور میزائل کی صنعتیں، جنگلو بھٹی (Blast Furnag) کی تیاری اور دھاتوں میں سختی پیدا کرنے کی صنعتیں وغیرہ۔ پٹرول کی کھوج اور اس کے حصول کے لیے کنوؤں کی کھدوائی دھماکو اشیاء کی مرہون منت ہوتی ہے۔ اگر کسی پٹرول کے کنویں میں آگ لگ جائے تو اس کو بجھانے کے لیے ان اشیاء کے ذریعہ دھماکے کیے جاتے ہیں۔ کوئلے کی کانوں کی کھدوائی میں بھی انھیں استعمال کیا جاتا ہے، جنھیں تکنیکی زبان میں Permttad explosives کہا جاتا ہے۔ پتھر کی کانوں Quarry میں پتھروں کی Drilling, Blasting, Loading اور Crushing کر کے انھیں صحیح شکل میں ڈھالنے میں دھماکو اشیاء معاون ثابت ہوتی ہیں۔ سیول انجینرنگ میں ڈیم، ہائڈرو الکٹرک پروجکٹس اور سڑکوں کی تعمیر میں ان اشیاء سے مدد لی جاتی ہیں۔ ان کے ذریعہ غیر ضروری تعمیرات اور اسٹر کچروں کو گرا کر زمین دوز کیا جاتا ہے۔ زرعی اغراض کے لیے یہ اشیاء ایک الگ ہی رول نبھاتی ہیں۔ بنجر زمین کو زراعت کے قابل بنانے کے لیے چٹانوں، درختوں اور اس میں پھیلی ہوئی درختوں کی جڑوں کا چند لمحوں میں صفایا کرنے میں یہ اشیا مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

ہمارے ملک میں دھماکو اشیاء بنانے والی کئی خانگی کمپنیاں قائم ہیں۔ لیکن حیدرآباد میں قائم پبلک سیکٹر کمپنی، انڈین ڈیٹونیٹرس کیمیکلس لمیٹیڈ (IDCL) سارے ملک میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ یہ کمپنی سلری دھماکو اشیاء، Detonating Fuse, Safety Fuse, Exploders, Explosive Clad Metals جیسی دھماکو اشیاء کی ٹکنالوجی میں مہارت رکھتی ہے اس کو اس بات کا اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی کمپنی ہے جو Small Diameter Cap Sensitive Slurry دھماکو اشیاء بناتی ہے۔ اور اس کی سلری ٹکنالوجی دوسرے ممالک کے ساتھ ساتھ یورپی ممالک کی کمپنیوں کو بھی منتقل ہو رہی ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی اہم مطبوعات

شاعر از: تارا شنکر بندوپادھیائے مترجم: پریمپال اشک

اس ناول میں محبت اور فرقت کی داستان بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ بنگلہ زبان میں اس ناول کی شہرت آج بھی ماند نہیں پڑی ہے۔ قیمت: 8/75

اڑیا افسانے از: پٹنائک مترجم: مظفر حنفی

یہ اڑیا زبان کے ۲۱ منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت: 11/25

آدھی گھڑی از: پاریہ تو مترجم: سیلی پریمی

یہ ناول ملیالم زبان کے نامور قلمکار شری پاریہ تو کی تخلیقات میں سب سے زیادہ پر اثر اور مقبول عام ناول ہے۔ قیمت: 15/-

آئینہ از: کیشو دیو مترجم: کنہیا لال گاندھی

ملیالم زبان کے ناول نگار کیشو دیو کی تخلیقی کارناموں کا مقصد سماج کی تعمیر نو ہے۔ یہی مقصد اس ناول کا بھی ہے۔ قیمت: 9/50

بادل چھٹ گئے از: یوگیش داس مترجم: رضوان احمد

بادل چھٹ گئے' آسامی زبان کا وہ ناول ہے جو آسام کے عوامی اندرون کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ قیمت: 10/50

ہنگرواڑی از: وی۔ایس کھانڈیکر مترجم: عرش ملسیانی

ایک ایسا عظیم ناول جس میں مہاراشٹر کی دیہاتی زندگی اپنی تمام دلچسپیوں اور تلخیوں کے ساتھ موجود ہے۔ قیمت: 5/25

پنجابی کے یک بابی ڈرامے از: عطر سنگھ مترجم: ایس۔ایم۔شاہنواز

پنجابی زبان میں ہر صنف ادب میں بھرپور مواد موجود ہے۔ یہ انتخاب یک بابی ڈراموں کی نمائندگی کرتا ہے۔ قیمت: 12/-

پورن کمبھ از: رانی چندا مترجم: شانتی رنجن بھٹاچاریہ

پورن کمبھ ایک تیرتھی (زیارتی) سفر نامہ ہے جس میں ہمالیہ اور اس کے مقدس مقامات کی ایک دلکش تصویر پیش کی گئی ہے۔ قیمت: 8/75

پہلا راجا اور آدھے ادھورے از: جگدیش چندر ماتھر اور موہن راکیش مترجم: قیصر قلندر

اس مجموعے میں دو ناٹک شامل ہیں۔ جگدیش چندر ماتھر کا پہلا راجا ویدک زمانے کا مطالعہ ہے اور جو

موہن راکیش کے آدھے ادھورے میں عصری زندگی کے تضاد کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح آدھے ادھورے عورت مرد کے تعلقات ان کی ضرورتوں اور اختلاط کو پہچاننے کی دلچسپ روداد ہے۔ قیمت: 11/-

جے کانتن کی کہانیاں مترجم: زکی انور

یہ مجموعہ مشہور و معروف تامل قلم کار جے کانتن کی اہم کہانیوں کا انتخاب ہے۔ ان کہانیوں میں آپ کی عجیب و غریب تخلیقی صلاحیتوں کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ قیمت: 11/50

چک ویر راجندر از شری نواس مترجم: راشد سہوانی

کنڑ زبان کے ممتاز قلم کار شری نواس کا یہ تاریخی ناول ہے جو جنوبی ہندستان کی میسور ریاست کے ایک چھوٹے سے حصے 'کوڈگو' کی تاریخ سے متعلق ہے۔ چک ویر راجندر کے دور حکومت میں ہی انگریزوں نے اس پر قبضہ جمایا تھا۔ اس ناول کے سب کردار تاریخی ہیں جو اس دور کے زندگی پیش کرتے ہیں۔ قیمت 22/50

دود چراغ محفل از: بچی بابو مترجم: ابوالفیض سحر

انجہانی بچی بابو تلگو زبان کے ان کامیاب قلم کاروں میں تھے جنھوں نے تیلگو ادب کو نکھار اور فن کو بلندی عطا کی ہے۔ دود چراغ محفل' بچی بابو کا ایک نفسیاتی ناول ہے جس میں ایک نوجوان ڈاکٹر کی زندگی پیش کی گئی ہے۔
قیمت 16/25

دیمک از: شریشندر رکھو پادھیائے مترجم رفعت سروش

آج کا نوجوان زندگی سے بری طرح خوف زدہ ہے۔ اس کی امید 'سوچ' درد اور صلاحیت اس خوف سے بے حد متاثر ہوئی ہیں۔ اس ناول میں ایک عظیم شہر میں انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ منفرد اسلوب اور بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ قیمت 7/75

راگ درباری از: شری لال شکل مترجم: راشد سہوانی

جدید ہندستانی سماج پر تیکھا طنز! راگ درباری کو ہندی میں بامقصد طنز نگاری کی شروعات بھی کہا گیا ہے۔
قیمت 15/50

ریل گاڑی از: چندرودن چمن لال مہتہ۔ مترجم سید آل رسول

ریل گاڑی ۱۹۳۰ میں لکھا گیا گجراتی زبان کا ایک کامیاب ناٹک ہے۔ اس کا ہیرو ریل گاڑی کے انجن میں کوئلہ جھونکنے کا کام کرتا ہے۔ اس کی خطرات سے بھرپور زندگی اور اونچے عہدیداروں کا ظلم و ستم ہی اس ناٹک کی اساس ہے۔ قیمت 7/75

سفر تمام ہوا از: نیل پدمنابھن مترجم: مخمور سعیدی

سفر تمام ہوا' ایک ہندستانی گھر کے ٹوٹنے کی بڑی جذباتی کہانی ہے اور ساتھ ہی تریوندرم شہر کی بڑی بھرپور تصویر کشی بھی ہے۔ اس ناول کے مصنف شری نیل پدمنابھن تامل زبان کے ان قلم کاروں میں سے ہیں جنھوں نے تامل ادب کو نئی وسعتوں سے روشناس کرایا ہے۔ قیمت 11/75

سورٹھ تیرا بہتا پانی از: جھویر چند میگھانی مترجم: مظہر الحق علوی ۱۳/-

کھلے خطوط

☆رام پرکاش کپور ۱۸/۱۷۔ ایم آئی جی۔
پدم نابھ پور درگ۔ ۴۹۱۰۰۱

"کتاب نما" کے دسمبر ۹۸ء کے ارہ میں نرگس سلطانہ صاحبہ کا مضمون "ادی کی تقریبات اور مختلف رسومات" کافی لچسپ اور معلوماتی ہے، لیکن لگتا ہے کہ ان تحقیق میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ کیونکہ ان کی ی ہوئی کچھ اطلاعات حقائق کے بالکل رعکس ہیں۔ مثلاً انھوں نے لکھا ہے:

"سکھ اور پارسی شادیوں میں مقدس گ کا بہت اہم رول ہے۔ سکھ شادیوں میں لہا دلہن مقدس آگ کے سامنے بیٹھتے ہیں، تب گرنتھی لڑکی کے اوپر پڑی ہوئی چادر لڑکے کے کندھے پر پڑے ہوئے کپڑے ے کا تھ باندھ دیتا ہے پھر دونوں چار مرتبہ گ کا پھیرا کرتے ہیں۔ اس دوران گرنتھی ورو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتا رہتا ہے۔ چکر کے پورا ہونے پر شادی کی رسم پوری ہو جاتی ہے...."

یہ صحیح نہیں ہے۔ سکھ شادیوں میں آگ کا کوئی بھی اہم یا غیر اہم رول بالکل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آگ سکھ شادی کے منڈپ کے اندر یا کہیں آس پاس بھی نظر نہیں آتی ہے۔ زیادہ تر سکھ شادیاں گوردواروں میں ہوتی ہیں اور جو گھروں یا دوسری جگہوں پر ہوتی ہیں، وہاں بھی آگ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ دولہا دلہن گورو گرنتھ صاحب کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ "مقدس آگ کے سامنے" نہیں بیٹھتے۔ اور چار مرتبہ "آگ کا پھیرا" نہیں کرتے۔ جیسا کہ نرگس سلطانہ صاحبہ نے لکھا ہے۔ بلکہ گورو گرنتھ صاحب کے اردگرد چکر لگاتے ہیں۔ گرنتھی گورو گرنتھ صاحب سے ایک شبد پڑھتا ہے اس کے بعد "راگی" صاحبان اسی شبد کا کیرتن کرتے ہیں۔ اور اسی کیرتن کے دوران دولہا دلہن ساتھ ساتھ گورو گرنتھ کے اردگرد ایک چکر لگاتے ہیں۔ اور چکر پورا کرکے گورو گرنتھ صاحب کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر گرنتھی دوسرا شبد پڑھتا ہے اور "راگی" صاحبان اس شبد کا کیرتن کرتے ہیں۔ اور دولہا۔ دلہن اس دوران گورو گرنتھ صاحب کے اردگرد چکر لگاتے ہیں۔ یہ سب چار مرتبہ کیا جاتا ہے۔ گورو گرنتھ صاحب کے ان شبدوں کو چار "لاواں" کہتے ہیں۔ "لاواں" کی رسم سے پہلے گرنتھی دولہا کی پگڑی کا ایک سرا دلہن کے دوپٹے کے ایک سرے سے باندھ دیتا ہے۔

دراصل آگ کا اہم رول سکھ شادیوں میں نہیں بلکہ پارسی شادیوں کے

علاوہ ہندو شادیوں میں بھی نہایت اہم ہوتا ہے۔ شادی کے منڈپ میں ایک "ہون کنڈ" میں آگ جلائی جاتی ہے۔ اور پہلے پنڈت ویدک منتر پڑھتے ہوئے اگنی دیوتا کی پوجا کرتا ہے۔ پھر "ہون" کے منتر پڑھے جاتے ہیں۔ "ہون" کے بعد ویدک منتروں کے ساتھ "کنیادان" کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ یہ رسم دلہن کے ماں باپ یا اگر ماں باپ زندہ نہ ہوں یا کسی اور وجہ سے موجود نہ ہوں تو بھائی، بھابی یا دلہن کا اور کوئی گارڈین ادا کرتے ہیں۔ "کنیادان" کی رسم کے بعد دولہا دلہن مقدس آگ کے اردو گرد سات چکر لگاتے ہیں۔ اور اس دوران پنڈت منتر پڑھتے جاتے ہیں۔ پنجاب میں ان منتروں کو بھی "لاواں" کہا جاتا ہے تین چکروں میں دولہا آگے ہوتا ہے۔ اور دلہن پیچھے اور تین چکروں میں دلہن آگے ہوتی ہے اور دولہا پیچھے۔ ساتویں اور آخری چکر میں دولہا آگے ہوتا ہے۔ اس میں بھی کوئی خاص مقصد ہے۔ جس کی پنڈت جی تشریح کر کے دولہا دلہن کو بتاتے ہیں۔

پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی اس شادی کی رسم کو "لاواں پھیرے" بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں سات "لاواں" ہوتی ہیں۔ اور سکھوں میں چار۔ ہندوؤں میں مقدس آگ کے اردگرد چکر لگائے جاتے ہیں۔ اور سکھوں میں گورو گرنتھ صاحب کے اردو گرد۔

☆ کلیم اختر، لہریا ٹولہ، گیا (بہار)

دسمبر ۹۸ء کا ماہنامہ "کتاب نما" پڑھا یوں تو سبھی مضامین پسند آئے لیکن ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون "تہذیبِ خاور اور مسرتِ ثانی" اور محترم وہاب قیصر کا مضمون "شور، مخصوص" کا حامل ہے۔ شعری انتخاب بھی پسند آیا۔ شاکر رامپوری کی نظم "شہیدِ وطن۔ ٹیپو سلطان" ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن پروفیسر حفیظ بنارسی کا یہ شعر سے پن کے ساتھ عصری حقیقت کی چادر اوڑھے ہوئے ہے۔ جو مجھے بے حد پسند ہے۔

ٹیپو دیکھو کل بدلوا خیر تمہاری
موسم بڑی زہریلی ہوا اوڑھے ہوئے ہے

☆ عبد القوی دسنوی، بھوپال

دسمبر ۹۸ء کے کتاب نما میں پروفیسر عبد الحق کا اشاریہ "اردو اساتذہ اور احتساب" پڑھا انھوں نے اردو اساتذہ کی بعض کمزوریوں کی طرف نہایت جرات، بے باکی اور دردمندی کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ خدا ان میں اس طرح کے کاموں کے لیے اور زیادہ حوصلہ پیدا کرے۔ ان کے خاص طور سے ان جملوں نے دل و دماغ کو بے حد مضطرب کیا۔ جنھیں میں یہاں اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ اہل اردو ان پر غور کریں اور کچھ کریں۔

(۱) "الزام تراشنے والوں کو، کاذبوں کی صف میں کھڑا کر کے باز پرس ہونی چاہیے"

(۲) "ہم نیاز مندی میں بااختیار افسروں سے متواترات کھا رہے ہیں اور اپنی عجز سے اپنی ہلاکت کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔"

(۳) اس کی تمام تر ذمہ داری باختیار اور بزرگ اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔"

(۴) "خاکسار کا بہت ہی مخلصانہ معروضہ ہے کہ اردو اساتذہ تقررات میں دیانتداری کے ساتھ اپنی ذمہ داری کا ثبوت پیش کریں اور کم سے کم تعلیمی محاذ پر اردو کو مستحکم بنائیں۔"

(۵) "یہ واقعات مجبور کرتے ہیں کہ ایسے غلط فیصلوں کے خلاف اجتماعی احتساب کی آواز کو صلیب و دار تک پہنچایا جائے۔"

(۶) "ایک مرحوم پروفیسر کا تکیہ کلام تھا کہ پڑھنے لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے، دیکھو مجھے ریڈر اور پروفیسر سب کچھ ہو گیا۔"

(۷) آخر اس طرز فکر کے خلاف کب آواز اٹھے گی اور کیسے نجات حاصل ہوگی؟"

بلاشبہ بہت اچھا اداریہ ہے۔ نہایت مخلصانہ ساری باتیں پیش کی گئی ہیں۔ لیکن نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

ہماری اردو کے کچھ (جو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں) اساتذہ "انتخاب" تک میں بے راہروی کے شکار نہیں ہیں، بلکہ طلبہ کو پڑھانے میں بھی کوتاہی برت رہے ہیں اور ستم یہ کہ اکثر امتحانات میں ان کے ہاتھوں "جو ہیں کم سے کم وہ ہیں وہ دم بدم" نظر آتے ہیں۔ عام طور سے اپنے اساتذہ کا مزاج علمی، ادبی نہیں سیاسی جوڑ توڑ کا ہوتا ہے۔ ذاتی فائدے کے لیے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اساتذہ پر جھوٹے الزام لگا سکتے ہیں اونچی کرسیاں حاصل کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ "پڑھنے لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

تعلیم گاہوں سے ہٹ کر ان کا گزر جہاں جہاں ہوتا ہے وہاں وہاں وہ افشانیاں کرتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔ خاص طور سے اکادمیوں اور اداروں میں کتابوں کی اشاعت ہو یا تقسیم انعامات ہو یا سیمیناروں اور مشاعروں کا انعقاد ہو، ہر جگہ ایسے اساتذہ کی خود غرضی اور کم نظری رنگ لا رہی ہے۔

الزام تراشیاں تو عام بات ہے افسوس ناک بات یہ ہے کہ بغیر تحقیق کے ہمارے اساتذہ اخبارات اور رسائل کے مدیران کا ساتھ دیتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں ورنہ جھوٹی باتیں شائع کیوں ہوں اور ان کی گونج سنائی کیوں دے؟

ساتھ ساتھ اردو کے اساتذہ، مدیروں، صحافیوں اور اردو سے محبت کرنے والوں کو خاموش رہ کر ایسے حضرات کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر اہل اردو ان برائیوں کی طرف توجہ نہیں کریں گے تو ہماری زبان اردو کو آئندہ اور زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا اور پھر اگر کوئی کہے کہ اردو کو سب سے زیادہ نقصان خود اہل اردو پہنچا رہے ہیں تو ہمیں خاموشی کے ساتھ سن لینا پڑے گا۔

میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس طرح کے سیمینار بھی منعقد کرنے چاہیے جن میں اردو کے زوال کے اسباب اس کی حفاظت کے طریقوں پر غور کرنا چاہیے اور اس بات پر بھی

غور کرنا چاہیے کہ اس زبان کو مفاد پرستوں سے کس طرح محفوظ رکھا جائے۔

خدا کرے کتاب نما میں اس طرح کے فکر انگیز اداریے بار بار شائع ہوں تاکہ اہل اردو اپنی پوری زبان کی طرف متوجہ ہوں۔ اور اس کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہوں۔

☆عبدالحق دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

اپنی بدتوفیقی پر نادم ہوں کہ حاضر ہو کر آپ کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر رہا۔ آپ نے ناچیز کی چند گزارشات کو اپنے موقر جریدے میں جگہ دے کر میری عزت افزائی فرمائی۔ اور اردو سے پیار و وقار رکھنے والوں کو سنجیدہ فکر کے لیے ملتفت کیا۔ خاص طور پر نوجوانوں کا ردعمل دیکھ کر حیرت ہوئی اور خوش گوار طمانیت بھی حاصل ہوئی۔ ذاتی گفتگو اور فون کے علاوہ بیسیوں خطوط میں ان دل آزار امور پر اظہار خیال دیکھ کر بے رحمانہ رویے کی سنگینی اور کارپردازوں کے قابل مذمت فیصلوں کے باعث اردو کی لاحق زیاں کا احساس برداشت سے باہر نظر آیا۔ اپنے محترم اور مخدوم اساتذہ کی خدمت میں بڑی درد مندی سے درخواست گزار ہوں کہ انھیں نئی نسل کی تربیت اور ذمہ داری سوچنے میں اپنی حکمت و بینش کا عشر عشیر ضرور بروئے کار لانا چاہیے۔ نوجوانوں کا عام احساس ہے کہ انتخاب کیا ان کی عزت علمی کو انٹرویو میں چیلنج کرنے کا رویہ شرم ناک ہے۔ ان کی عزت نفس پر وار کیا جاتا ہے اور کم علمی کو جہل اور حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ جب کہ سوال و جواب کے بارے میں اساتذہ کا طریقہ کار ہمت افزائی یا دل داری کے ساتھ انھیں مزید مطالعے کی تشویش کا ہونا چاہیے۔ ہم اپنے ساٹھ سالہ تجربے کو پچیس سالہ طالب علم پر آزماتے ہیں اور برتری پر مغرور ہوتے ہیں نام لیے بغیر میں صرف اشارے میں عرض کروں ایک انٹرویو میں دوسرے استاد سے میں نے گزارش کی کہ طلبا سے اس طرح نہ پیش آیا جائے یہ سب ہمارے ہی طالب علم ہیں موصوف نے سرگوشی کے لہجے میں فرمایا کہ "کھنچائی میں مزہ آتا ہے" یہ بھی دیکھا کہ جو امیدوار محبوب یا مطلوب ہوتا ہے اسے سوال جواب کا ریہرسل کرا لیا جاتا ہے۔ اساتذہ کے ترقی والے انٹرویو میں بھی یہ منظر مشاہدے میں آیا۔ ایک صوبے کی مرکزی یونی ورسٹی میں اکسپرٹ نے اپنے چہیتے کو توتے کی طرح دس سوال یاد کرائے۔ ان کے سوالوں کا جواب صد فیصد صحیح ملا۔ وہ میرے کسی سوال کا جواب نہ دے سکے۔ میں نے اندازہ ہی نہیں یقین کر لیا کہ معاملات کچھ اور ہیں۔ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر بھی اس نزاکت کو سمجھ گئے انھوں نے میرا ساتھ دیا۔ اب آپ فرمائیں۔ ان کے امیدوار مسترد کر دیے گئے۔

چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

دار الخلافہ دہلی میں بھی اس نکتہ ناز کی سرمہ سائی دیکھتا ہوں یک طرفہ طرف داری کی یہ طرح بزرگوں سے ہم تک دست بدست

آتی ہے۔ سنتے ہیں مولوی عبدالحق مرحوم نے
دلی کالج کے انٹرویو میں ایک امیدوار سے
Matters کا ترجمہ مواد سن کر اپنی برہمی کا
اظہار کیا اور اسے پیپ و مواد سے جوڑ کر پوری
کمیٹی پر غلط تاثر پیدا کیا کیوں کہ انھیں نہیں لینا
تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ پروفیسر حضرات اکثر
اپنی کم علمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ایک پروفیسر
ایک امیدوار سے زلف، گیسو اور کاکل کا فرق
پوچھ کر انھیں ترقی سے محروم کرنے پر مصر
تھے۔ بھلا ہو استاذ محترم پروفیسر محمود الہی
صاحب کا کہ انھوں نے میری سرپرستی اور مدد
کرکے حق دار کو حق رسائی میں مکمل تعاون دیا
اور دبے لفظوں میں دوسرے پروفیسر کو اس
کمیٹی کے دوران تنبیہ بھی کی۔ خود اس خاکسار کو
شعبے کے دو انٹرویو میں پروفیسر قمر رئیس
صاحب نے اقبال کے مذہبی تصورات پر سوال
کرکے میری کم علمی کا مذاق اڑا کر کمیٹی پر ایک
غلط تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ انھیں
اقبال کی یا میری مذہبیت ان کے ترقی پسندانہ
خیالات سے کریہاں کر نظر آتی ہے۔ اس کے
برعکس پروفیسر محمد حسن جیسے مخلص اور سچے
مارکسی صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر
نے ۱۹۷۳ء میں ریڈر شپ پر میرا انتخاب
کیا۔ اس انتخاب میں میرے عقائد حائل نہ
تھے۔ پٹیالہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر ناصر نقوی کے
انتخاب میں خاکسار نے سفارش کی۔ فقط نظر کا
اختلاف میرے لیے [illegible] تھا۔ [illegible] مرحوم
کرواتا ہوں۔ اردو سے تعلق رکھنے والوں کی
ذات، برادری اور عقیدہ ایک ہے۔ باقی فریب
دھوکہ ہے۔

یو۔پی۔ایس۔سی۔ کے انتخاب میں
پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مرحوم نے ڈاکٹر ملک
زادہ منظور احمد سے "غبار خاطر" کا انگریزی ترجمہ
پوچھا ان کے پیچھے آگئے۔ اور نہیں لئے گئے۔
گو ڈاکٹر ملک زادہ صاحب نے مولانا آزاد
پر پی۔ایچ۔ڈی بھی کیا تھا۔ اور اردو کے ساتھ
انگریزی میں بھی ایم۔اے۔ تھے۔ مدعا یہ ہے کہ
امیدواروں کو ہراساں کرکے ان کی دل جوئی کی
جانی چاہیے اور ان کی صلاحیت تو خود ان کے
مخصوص موضوعات سے بھی نمایاں ہو جاتی
ہے۔ بشرطیکہ کارشناسوں کی نظر حقیقت بینی اور
علمی آگہی سے معمور ہو۔ ایک نوجوان استاد نے
لکھا ہے کہ الہ آباد سروس کمیشن کے ایک
انٹرویو میں اردو کے دو پروفیسروں نے انگریزی
میں سوالات کی بوچھار کر دی حالانکہ ان کی
انگریزی آج بھی مشتبہ ہے۔ وہ امیدوار
جو میرٹ لسٹ پر نمبر ایک پر تھا مسترد کر دیا گیا۔

بھائی شاہد صاحب احتساب کی آنچ کو
تیز کرنے میں آپ اپنے تعاون سے نوازیں۔
مجھے تنگی اور برہمی سے بھی یاد کیا جائے گا اور
رشک و رقابت سے بھی۔ میری معروضات
درد مندانہ ہیں۔ انھیں میری خلوص نیت پر
محمول کیجیے۔ میں اپنا بھی احتساب کرتا رہتا
ہوں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ابھی دسمبر میں

ایوانِ غالب کے غالب مذاکرے میں ایک پروفیسر نے دوسرے پروفیسر سے جو ایکسپرٹ بن کر گئے تھے حساب کتاب کرنا شروع کیا تو ایکسپرٹ پروفیسر منہ چھپا کر مجلس سے دبے قدم نکل گئے۔ وہ دن دور نہیں کہ نوجوان بزرگوں کے احترام کو بالائے طاق رکھ کر سرِ بازار ان سے احتساب کریں گے عالم کی موت کو عالم کی موت قرار دیا گیا ہے۔ تو استاد کی اہانت کو کیا کہا جائے گا؟

ڈاکٹر گیان چند ۲۳ نوولا، ارواین، کیلی فورنیا
۹۲۶۰۶ یو ایس اے

دسمبر ۱۹۹۸ء کے کتاب نما میں ڈاکٹر عبدالحق کا اشاریہ یا اداریہ "اردو اساتذہ اور انتخاب" نظر سے گزرا۔ انھوں نے بہت جرأت کرکے اساتذہ کے انتخاب کے خطرناک موضوع پر لکھا ہے۔ میں اس پر کوئی تبصرہ نہ کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ مضمون میں میرا ذکر آیا ہے اس لیے میں نے سوچا کہ مجھے بات صاف کر دینی چاہیے۔

میری معلومات کم ہیں لیکن مجھے ایسے ایک بھی واقعہ کا علم نہیں کہ کسی یونیورسٹی میں سیلیکشن کے موقع پر کسی رکن نے پیسے کا لین دین کیا ہو۔ پبلک سروس کمیشن یا یونیورسٹی کمیشن میں کالجوں کے اساتذہ کے انتخاب میں رشوت ستانی کی بات سنی ہے لیکن یونیورسٹی کی سطح پر نہیں۔ اتفاق سے میں ایسے کسی کیس سے بھی ناواقف ہوں جس میں کسی خاتون کا انتخاب اس کے حسن صورت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود میرا اندازہ ہے کہ مختلف وجوہ سے تقریباً ۷۰ فیصد صورتوں میں سب سے اہل امیدوار کا انتخاب نہیں ہوتا۔ تقریباً ۳۰ فیصد ہی میں ہوتا ہوگا۔ ہر یونیورسٹی میں حتی الامکان مقامی امیدوار کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اہلیت کو نظر انداز کرنے کے معاملے میں سب سے بڑی خاطی وائس چانسلر اور صدر شعبہ ہوتے ہیں۔ معاشرے اور درس گاہوں کے حالات دیکھ کر میرا خیال ہے کہ محض اہلیت کی بنا پر انتخاب کی توقع کرنا خیالی جنت میں رہنا ہے۔ یہ تقریباً ناممکن ہے۔

عبدالحق کھل کر نام بتا کر وضاحت کرتے تو بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی۔ انھوں نے ص ۸ پر عصر حاضر کے لائق ترین پروفیسر کو دوسرے نمبر پر رکھنے کی جو بات کی ہے وہ شاید ڈاکٹر حنیف نقوی کے بارے میں ہے۔ ص ۷ پر انھوں نے مجھ کم سواد کے مقابلے میں ان صدر شعبہ کے انتخاب کا ذکر کیا ہے جو پانچ سال کے ریڈر بھی نہ تھے۔ میں کھل کر بات کرتا ہوں۔ یہ لکھنؤ یونیورسٹی میں میرا اور ڈاکٹر شبیہ الحسن کا معاملہ ہے۔ شبیہ الحسن اس وقت شاید کارگزار ریڈر تھے۔ پہلے دن ان کی پروفیسری کی سلیکشن کمیٹی ہوئی اور اس سے اگلے دن ریڈری کی۔ یہ غیر معمولی

رت حال ہے کہ ایک شخص پروفیسر منتخب
نے کے بعد ریڈر کے سلیکشن میں بھی پہنچے۔
حال بات ظاہر کرنے کے لیے میں یہ کہتا
ں کہ میں جہاں جہاں بھی پروفیسر منتخب
ں ہوا، وہ میرے مفاد میں اور حق میں تھا۔
ں میں منتخب ہوا ہوں وہی میرے لیے
تر ین تھا۔

لکھنؤ کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں
فیسر ہونے کے بعد میرے ڈاکٹر شبیہ الحسن
ے خوشگوار تعلقات رہے۔ ایک بار انھوں نے
کھنؤ یونیورسٹی کے لیے کہا کہ یہ سب سے
راب یونیورسٹی ہے۔ میں نے اس وقت کی الہ
آباد یونیورسٹی کو نظر میں رکھ کر کہا کہ "نہیں،
میری الہ آباد یونیورسٹی زیادہ خراب ہے"۔ شبیہ
الحسن مصر رہے کہ ان کی یونیورسٹی بدتر ہے۔
میں ۱۹۹۰ء میں لکھنؤ جاکر بس گیا۔ وہاں کی
یونیورسٹی کو تفصیل سے دیکھا اور اس کے بعد
محسوس کیا کہ لکھنؤ یونیورسٹی الہ آباد یونیورسٹی
سے بدرجہا خراب ہے۔ یہ میں اساتذہ کی اہلیت
کی بنا پر نہیں کہہ رہا بلکہ یونی ورسٹی کے
انتظامیہ، دفتر شاہی کے پیش نظر کہتا ہوں کہ
لکھنؤ یونی ورسٹی نہایت تھرڈ کلاس یونیورسٹی
ہے۔ اگر میرا وہاں تقرر ہو جاتا تو میں وہاں ہمیشہ
کے لیے پھنس جاتا کیونکہ وہاں میرے کئی
قریبی عزیز ہیں، جن میں میری بیوی کی بڑی
بہن کا خاندان بھی ہے۔ میں لکھنؤ میں لے لیا
جاتا تو کبھی حیدر آباد نہ جاسکتا اور یہ میرا سب
سے بڑا نقصان ہوتا۔ لکھنؤ اور الہ آباد دونوں
یونیورسٹیوں میں سلیکشن میں ڈاکٹر خورشید
الاسلام اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ماہرین تھے۔
انھوں نے مجھے لکھنؤ میں نہیں لیا اور الہ آباد میں
لیا۔ الہ آباد کے معاملے میں میں ان کا مشکور
نہیں، لکھنؤ میں مجھے رد کر کے ان دونوں نے
مجھ پر جو احسان کیا ہے، میں کبھی اس کا بدلہ نہ چکا
سکوں گا۔ اس وقت مجھے افسوس ہوا لیکن اب
سوچتا ہوں کہ مجھے لکھنؤ میں نہ لے کر خورشید
الاسلام اور رفیعہ سلطانہ میرے عظیم محسن
ہیں۔ مجھے ایسی کوئی اور مثال معلوم نہیں جہاں
کسی کو مسترد کر کے اس کی اس قدر بہی خواہی کی
گئی ہو۔ کاش یہ دونوں ہمیشہ خوش و خرم رہیں۔
مدارس کی سلیکشن کمیٹی میں، میں اور خورشید
الاسلام دونوں ماہرین تھے۔ خورشید صاحب
نے مجھ سے اصرار کیا کہ مجھے حیدر آباد جانا
چاہیے اگر میں نہیں گیا تو اردو دنیا مجھے کبھی
معاف نہیں کرے گی۔ ان کے اس اصرار کے
بعد ہی میں نے حیدر آباد اپنی رضامندی بھیجی
یعنی تقرر نامہ ملنے کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن غالباً ۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہوئے۔
ان کی وداعی تقریب میں میں بھی گیا اور ان کی
مدح و ستائش کی۔ بعض اوقات انسان خود اپنی
فلاح کو نہیں پہچان سکتا۔ جامعہ ملیہ اور لکھنؤ
یونیورسٹی میں مجھے جن اصحاب نے نہیں لیا،
انھوں نے مجھ پر احسان عظیم کیا ہے۔ مجھے
کسی سے شکایت نہیں۔

تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

نایاب ہیں ہم

مصنف: آوارہ سلطانپوری
مبصر: انور خان
ناشر: اردو قبیلہ۔ ممبئی قیمت: سو روپے
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اردو میں تذکروں کی روایت خاصی قدیم ہے۔ تذکرے عموماً خشک اور معلوماتی ہوتے ہیں آوارہ سلطانپوری کی یہ کتاب ان معنوں میں اہم ہے کہ اس میں ممبئی کے شعرا کا تذکرہ تو ہے انداز بیان ایسا دلچسپ کہ آپ کسی مختصر ناول کی طرح پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسے آپ ممبئی کے شعرا کا آب حیات کہہ سکتے ہیں کہ شاعروں سے ملاقات تو ہوتی ہی ہے ان کے طرز گفتگو، رہن سہن اور بانک سے بھی دعا سلام ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے گزشتہ پچاس سالوں کی ممبئی کی محفلیں یاد آجاتی ہیں گویا کل ہی کی بات ہو۔ ممبئی کے چھوٹے بڑے نئے پرانے سبھی شاعروں کا مختصر مگر دلچسپ انداز میں ذکر ہے ہر شاعر و ادیب کی کوئی خصوصیت ہے، کوئی ادا جسے آوارہ سلطان پوری نے چند فقروں میں اپنے مو قلم سے روشن کر دیا ہے۔ جیسے منتخب جارچوی کے ذکر میں لکھتے ہیں "زینت بنانے کے بعد منتخب چپ ہو گئے تھے اور چپ بھی ایسے کہ زبان سے آہیں بھرنے کی کاریگری بھول گئے لیکن اللہ مسبب الاسباب ہے۔ ان کے دل میں خیال آیا اور یوم میر تقی میر کا اعلان کر دیا۔ ہندستان اور پاکستان کے مشاہیر شعرا مدعو ہوئے۔ قد آدم پوسٹر لگے۔ ہینڈ بل تقسیم ہوئے۔ اخبارات نے اودھم مچایا۔ گلی گلی چرچے ہوئے۔ ولبھ بھائی پٹیل اسٹیڈیم میں مشاعرہ ہوا۔ جگر مراد آبادی اور جوش ملیح آبادی مہمان خصوصی تھے۔ مقامی شاعروں کو منتخب نے نظر انداز کیا تھا۔ شمیم بریلوی مشاعرے سے دو گھنٹہ قبل شاعروں کی فوج لے کے مظاہرے کے لیے گیٹ پر پہنچے۔ منتخب صاحب نے دوسرے گیٹ سے مہمانوں کو اسٹیج پر پہنچا دیا لیکن ان کے پاس پرچہ پہنچ گیا۔ پرچہ

پرچہ پڑھتے ہی جگر صاحب نے مخشب کو بلایا اور پوچھا۔ مخشب خاموش! جگر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے میں جارہا ہوں آپ مشاعرہ کر لیجیے۔ مخشب صاحب نے ہاتھ جوڑ کے معذرت کی اور تمام شاعروں کو لا کے عزت سے جگہ دی جگر کے کلام میں ایسا، گیتا ڈھونڈھنے والے ان کے کردار کے ان گوشوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کی مشہور نظم "کیا گلبدنی گلبدنی گلبدنی ہے" اسی مشاعرے کے دین ہے جو میر تقی میر کے اس مصرعے پر منعقد ہوا تھا۔

مشہور چمن میں تری گل پیرہنی ہے

ایسے پچاسوں واقعات، شاعروں، ادیبوں اور ادب دوستوں کا ذکر اس کتاب میں ایسے دل نشیں انداز میں کیا گیا ہے کہ لائبریوں کے لیے ایک بیش بہا حوالے کی کتاب بن گئی ہے۔

آرپار کا منظر

شاعر: ظفر گورکھپوری

تبصرہ نگار: ڈاکٹر سعید عارفی

صفحات: ۱۶۸　　قیمت: ۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: ۳۰۲-A، فلوریڈا، شاستری نگر ممبئی۔ ۵۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

غزل مختلف مثبت اور منفی تخلیقی رجحانات ورویے کی سرحدوں کو عبور کرتی ہوئی آج ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں وہ فکری، نظریاتی اور تجرباتی پابندیوں سے آزاد ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اصل مرکز اور محور سے قریب ہے، ایک زمانے تک غزل روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت کے علاوہ آزاد غزل اور اینٹی غزل کے تجرباتی حصار میں رہی۔ میں ادب میں تجربات کا منکر نہیں ہوں، تجربات کسی بھی صنف ادب کے لیے وسیع تر امکانات کے دروازے وا کرتے ہیں، میں یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہیئت اور ساخت کے اعتبار سے غزل میں تجربے کی گنجائش نہیں ہے۔ اور غزل کی ہیئت ہی اس کے تشخص کی ضامن ہے۔ اپنی ہیئت ہی کی وجہ سے غزل مسلسل متضاد حالات سے گزرنے کے باوجود غزل بنی رہی۔ یہ اس کی کامیابی اور کامرانی کا سب سے نمایاں اور اہم وصف ہے۔ ہاں غزل میں فکر، اظہار، اسلوب، بیان، احساس اور لفظیات کی سطح سے پر تجربات کی گنجائش ضروری ہے۔ غزل کا ایک اہم اور بنیادی وصف یہ بھی ہے کہ وہ عہد بہ عہد عصری ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق خود کو برابر تبدیل کرتی رہی ہے۔

غزل میں اشاریت، رمزیت، ایمائیت، اختصار اور نغمگی کے جو عناصر ہیں وہ کسی بھی دوسری صنف سخن میں نہیں پائے جاتے، بہت سی دوسری اصناف سخن کی طرح غزل میں ابہام و تفہیم کی وہ ژولیدگی بھی نہیں ہے کہ قاری ترسیل کی الجھنوں میں مبتلا ہو کر رہ جائے۔ غزل کا استعاراتی اور علامتی اسلوب اس کی روح ہے۔ غزل کی اس روح کو او هر جن شعراء نے برقرار رکھا

ہے ان میں ایک اہم نام ظفر گورکھپوری کا بھی ہے۔ وہ غزل کی کلاسیکی روایات کو نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری آہنگ ان کے عہد کی علامت بن گیا ہے۔ ان کے یہاں دل سے نکل کر دل پر اثر کرنے والی کیفیت ہے میرے خیال سے اس کیفیت کے بغیر غزل کا وجود بے روح کے جسم جیسا ہو کر رہ جاتا ہے۔

"آر پار کا منظر" ظفر گورکھپوری کی غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں وہ سب کچھ ہے جس کی ایک اچھے شاعر سے توقع کی جاتی ہے۔ وقت اور حالات کی جن زہر آشامیوں نے ظفر گورکھپوری کو مسلسل جس زہر آب کو پینے پر مجبور کیا اسے انھوں نے شنکر کی طرح اپنے وجود میں تو سمیٹ لیا مگر جب اپنی غزلوں میں اس زہر کی شدت اور تلخی کا اظہار کرتے ہیں تو وہ زہر کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ قند بن کر ہمارے دل و دماغ اور جدان کو سرشاریاں عطا کر جاتا ہے۔ ظفر گورکھپوری کی غزلیہ شاعری کا یہ ایک اہم اور بڑا وصف و کمال ہے۔ یہ بات ان کی تخلیقی ہنرمندی اور فن کارانہ بلندی کی بھی علامت ہے۔

"آر پار کا منظر" کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاعری ظفر گورکھپوری کے لیے اپنے باطن اور اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ ہے، وہ شاعری کے ذریعہ اپنے خالی پن کو بھرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور خود کو تلاش بھی کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں خود احتسابی کا عمل بھی ہے ظفر گورکھپوری کی غزلیں ہماری عصری زندگی کا آئینہ ہیں۔ ان میں اس عہد کے عام آدمی کی زندگی، محسوسات، حالات، کشمکش اور تضادات و تصادمات کی کی نقش آرائیں ہیں۔ ظفر گورکھپوری کی غزلیں حسن و عشق کی روایتی اور پامال وادیوں سے نکل کر ایک ایسی وسیع تر کائنات میں پہنچ گئی ہیں جہاں وہ زندگی کی صعوبتوں اور تلخیوں سے ہم کلام ہیں، ان کی غزلوں میں ایک فکری تہذیب ہے اور وہ اس عہد کے عام آدمی سے مکالمہ کرتی نظر آتی ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر پروفیسر کلیم الدین احمد کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے، غزل کا یہی نیم وحشی پن آج اسے زندہ رکھے ہوئے ہے، ورنہ غزل کا شمار بھی مردہ اصناف سخن میں ہوتا۔ ان کی اس رائے میں غزل کی مخالفت نہیں بلکہ دفاع ہے۔ وحشت میں بھی ایک حسین تہذیبی اور احتجاجی عمل مضمر ہوتا ہے۔ ظفر گورکھپوری کی شاعری اور شخصیت میں اس وحشت کا بہت عمل دخل ہے، الفاظ، خیال، فکر اور تہذیب و ترتیب کے لحاظ سے ظفر گورکھپوری کی غزلیں اس کی مظہر ہیں۔ یہ وحشت ہی کا کارنامہ ہے کہ ظفر گورکھپوری کی غزلوں میں رکھ رکھاؤ، سنجیدگی اور وقار کے عناصر پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ظفر گورکھپوری کے یہاں وحشت کسی خوف زدگی کی علامت نہیں ہے بلکہ زندگی کی محرومی، مایوسی اور نامرادی کی عطا کردہ ہے۔ اس کے باوجود ظفر گورکھپوری کے یہاں کسی بھی سطح پر فرار کا رویہ نہیں ہے بلکہ زندگی سے گہری وابستگی کا

رجحان ہے۔ وہ جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں وہیں خیر و برکت اور رشتوں کی تقدیس کے سارے آداب پامال ہو چکے ہیں، ہر سمت بے چینی اور بے ثباتی کا عالم ہے، ہر شخص اپنی ذات میں سمٹا ہوا ہے، مصلحت پسندی شیوہ بن چکی ہے، سب نے چہرے بدلنے اور وفاداریاں تبدیل کرنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ ان عوامل نے ظفر گورکھپوری کی غزلوں میں ایک حزینہ لے، پیدا کر دی ہے۔ جو دل موہ لیتی ہے۔ جذبے کی سچائی اور لہجے کے کھرے پن نے ظفر گورکھپوری کی غزلوں میں فکر و خیال کے بے شمار چراغ روشن کر دیے ہیں، جن کی روشنی دور تک جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں حالات کے جبر کی جلوہ گری بھی ہے اور اخلاقی، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی اقدار کے مسلسل زوال کا نوحہ بھی ہے۔ "آرپار کا منظر" ہر اعتبار سے غزل کے شائقین کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔ ادبی حلقوں کی جانب سے اس کی جس قدر پذیرائی ہو کم ہے۔ کچھ منتخب اشعار پیش ہیں، ان اشعار کے مطالعہ سے آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ظفر گورکھپوری کی غزلوں میں مسلسل زخموں اور غموں سے نڈھال، رنجور، شکستہ اور سسکتی ہوئی انسانیت کے دل پر مرہم رکھنے کی کیفیت بھی ہے اور کرب و اذیت سے تار تار اس کے پیراہن کی بخیہ گری کا عمل بھی ان کے یہاں ہے ساتھ ہی ساتھ ان کی غزلوں میں بکھرتے ہوئے خوابوں کی شیرازہ بندی کا جذبہ بھی ہے:

اک سانس کا خیمہ ہے اقامت بھی بہت کم ۔۔۔ سو کام بھی درپیش ہیں مہلت بھی بہت کم

یہ بھی ٹوٹا تو کہاں جائیں گے ہم ۔۔۔ اک تصور ہی تو ہے گھر آخری

سروں کی بھیڑ پر تو راستوں کے نام لکھے ہیں ۔۔۔ گلی کے موڑ پر بیٹھی ہوئی تنہائی کس کی تھی

کوئی غم ٹوٹ کے برسا ہے شب بھر ۔۔۔ ہمارے صحن میں پانی بہت ہے

طلب بھی کرتے جو ہم خوں بہا تو دیتا کون ۔۔۔ گلا بھی اپنا تھا، تلوار بھی ہماری تھی

خدایا لوٹ کے جائیں تو گھر رہے موجود ۔۔۔ ابھی تو خوش ہیں کہ تالا لگا کے آئے ہیں

یہ آندھیاں یونہی پھوڑیں گی سر چٹانوں سے ۔۔۔ اکھڑتے، گرتے درختوں نے بد دعا دی ہے

کبھی بسنت میں پیاسی جڑوں کی چیخ تو سن ۔۔۔ لٹے شجر سے ہرے پات مانگنے والے

یوں قریب آ کہ کوئی فاصلہ باقی نہ رہے ۔۔۔ یوں مجھے توڑ کہ صدیوں کی تھکن مر جائے

مرے لیے کسی قاتل کا انتظام نہ کر ۔۔۔ کریں گی قتل خود اپنی ضرورتیں مجھ کو

مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر امام اعظم
مبصر: پروفیسر نظیر صدیقی
ناشر: اردو ادبی سرکل قلعہ گھاٹ۔ دربھنگہ، بہار
قیمت: ایک سو پچاس روپے

یہ کتاب ڈاکٹر امام اعظم کی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں للت نرائن متھلا

یونیورسٹی دربھنگا (بہار) ۷/ جون ۱۹۸۹ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ ڈاکٹر امام اعظم ہندستان کی نئی نسل کے ابھرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں ان کی شعری مجموعہ 'قربتوں کی دھوپ' اور اس سے پہلے ۱۹۹۴ء میں مظہر امام کے نام مرحوم مشاہیر ادب کے خطوط کا مجموعہ "نصف ملاقات" منظر عام پر آچکے ہیں۔ علم و ادب سے ان کی دل چسپی کئی سمتوں میں ہے۔ ہمہ جہت ہونا مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات آدمی اتنی سمتوں میں بکھر جاتا ہے کہ اس کی کوئی ایک مضبوط اور دیرپا شناخت نہیں بن پاتی۔ بہرحال ڈاکٹر امام اعظم کی کامیابی کے لیے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

مظہر امام کو اپنے زمانے کا بہترین ادبی ماحول ملا۔ ان کے ذہن و ذوق کی تربیت اور نشو و نما گزشتہ ساٹھ سال کی بڑی قد آور شخصیتوں کے درمیان ہوئی۔ اس سے بھی بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے تقریباً تمام ممتاز اہل قلم سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ان کی کارکردگی کی اہمیت کا اعتراف کرنے والوں میں نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، فراق گورکھپوری، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، جمیل مظہری، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، نشور واحدی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر حامدی کشمیری، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر احتشام حسین، غرضکہ کلکتہ سے ممبئی تک، ممبئی سے دلی تک اور دلی سے کشمیر تک وہ کون سا ادبی مرکز ہے جس کے ممتاز ترین نمائندوں نے ان کے مختلف النوع کاموں کی طرف توجہ نہ کی اور ان کی امتیازی خوبیوں کا اعتراف نہ کیا۔ ڈاکٹر امام اعظم نے بڑے سلیقے سے یہ کتاب لکھی ہے۔ ان کا طرز تحریر سادہ اور دلکش ہے۔ ہندستان سے پاکستان تک کے ادب دوست اور ادب شناس مظہر امام کو جانتے اور مانتے ہیں۔ سردست یہ کتاب ان سے بہتر واقفیت کا بہتر وسیلہ ہے۔

صحرا کی گونج

• شاعر: سید قمر منثو
تبصرہ نگار: ڈاکٹر فرحت فاطمہ
قیمت: بیس روپے، سنہ اشاعت اول: ۱۹۹۸ء
ناشر: پرنٹ آرٹ، امین منزل سبزی باغ پٹنہ۔ ۴

"صحرا کی گونج" سید قمر منثو کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے اس مجموعہ میں سید قمر منثو کی دلکش غزلیں، قطعات اور نظمیں شامل ہیں۔ غزلوں اور قطعات کے مقابلے میں نظموں کی تعداد کم ہے۔

تعارفی تاثرات قمر اعظم ہاشمی بہار یونیورسٹی مظفرپور کے لکھے ہوئے ہیں۔ جس میں "صحرا کی گونج" کی شاعری کی جملہ خصوصیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

تعارف سید منثو نے خود لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنی اس پہلی شعری کوشش پر ناقدین کی رائے طلب کی ہے۔
گرد پوش کے پہلے صفحہ پر نور پرکار صاحب کی رائے ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"سید قمر مثنو نے شعر کو اپنی شناخت کا وسیلہ بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ مین اسٹریم سے الگ ایک نئی بستی میں آباد سید قمر مثنو کاروبار حرف وہنر کو اپنی زندگی کا محور و مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ آگے چل کر نور پرکار صاحب لکھتے ہیں سید قمر مثنو کے لیے شاعری شوق نہیں زندگی ہے۔"

اسی لیے شاعر نے زندگی سے مربوط خارجی تجربات و معاملات، مسائل کی تلخیاں، درد دل اور احساس تصور کو شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

پیکر شعر میں لفظوں کا وسیلہ لے کر اپنے احساس ہی کو ڈھال دیا ہے اس نے

نفرتوں کے گھنے اندھیرے میں شاعر شمع الفت جلاتے ہوئے کہتا ہے۔

نفرتوں کے گھنے اندھیر میں شمع الفت جلانے آیا ہوں
اے ہواؤ ذرا ٹھہر جاؤ اپنے نغمے لٹانے آیا ہوں

قلبی کیفیات اور جذبات و احساسات کو شعری پیکروں میں منتقل کرنے کے دوران شاعر نے کسی تصنع اور بناوٹ کا سہارا نہیں لیا ہے بلکہ بڑی خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ الفاظ شعر کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔ اشعار میں تعلّی کا رنگ بھی نئے انداز سے نمایاں ہے۔ ساتھ ہی شاعری کے تابناک مستقبل کی نشاندہی بھی ان الفاظ میں کی ہے۔

ڈوب کر بحر سخن سے تو ابھرنے دو اسے لیکے وہ شعروں کے تابندہ گہر نکلے گا

سید قمر مثنو کی شاعری کسی تحریک، کسی ازم اور کسی پروپیگنڈے کا شکار نہیں ہے۔ انھوں نے جو کچھ زندگی کے تجربات سے سیکھا اور جو کچھ دیکھا، سوچا اور محسوس کیا اسے اسی طرح سچائی اور سادگی کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیا۔

پھولوں کی طرح کبھی خود کو بکھر جانے دو اپنی خوشبو کو مرے دل میں اتر جانے دو
وہ ایک بات کبھی بھی نہ ان کہی رہتی مری نگاہوں کو تم نے اگر پڑھا ہوتا

اس شعری مجموعہ میں زندگی کے گہرے تجربات و مشاہدات بھی ہیں اور عصری احساسات کی پرچھائیاں بھی ہیں۔ خیالات اور انداز بیان میں کسی طرح کا الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہے۔ زبان و بیان کی سادگی اور شگفتگی نے اشعار کو اچھوتا اور دلنشین بنا دیا ہے۔

توقع ہے کہ یہ کتاب ادبی دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور نئی نسل کا یہ شاعر اپنی شاعری کی صدائے نو سے ادبی حلقوں کو ضرور متاثر کرے گا۔

صدائے موسم گل

شاعر: طارق بٹ
مبصر: کوثر مظہری

قیمت: ۱۰۰ روپے پتہ: ۸۸/۳ اسیلہ ہاؤس، کراچی، ۷۴۵۵۰

طارق بٹ کی شعری کائنات کی وسعت جو ہمارے پیش نظر ہے، وہ ۱۹۹۱ سے لے کر ۱۹۹۷ء

تک ہے۔ اس سے پہلے بھی انھوں نے چھپ چھپ کر محض تفنن طبع کے لیے اشعار کہے ہیں۔ مگر اِدھر چھ سات سالوں میں ان کے اندر رودیعت کی ہوئی شعری صلاحیت بیدار ہوگئی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں لکھا ہے: "شعر میرے لیے تکمیل احساس و جذبات کا نام ہے۔" اس میں ایک اہم نکتہ ہے جس پر بحث ہو سکتی ہے کہ کیا شعر احساس اور جذبے کی تکمیل ہے؟ یا اس کی دنیا سماجی اور انسانی زندگی سے بھی کچھ رشتہ رکھتی ہے؟

طارق بٹ فلسفانہ اور ادق موضوعات کو شاعری کے نازک کندھوں پر بار نہیں بناتے بات سیدھی کہتے ہیں جہاں ترسیل کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

ہر شکستہ آرزو نے یوں صدا دی رات کو نیند میں چونک اٹھا آدمی آدھی رات کو

بھٹک رہے ہیں خواہشوں کے دشت بے کنار میں ازل سے تا ابد ہے ایک سلسلہ سراب کا

کبھی کبھی طارق بٹ کی فکری جست ان کے تجربے کو فن کے اونچے مقام پر لے جاتی ہے اور پھر یہ شعر کہتے ہیں۔

دن میں راتوں کی کہانی نہیں کہتے طارق آنکھ میں آتا ہو خواب بھٹک جاتا ہے

ترس نہ جائے سماعت کسی کے لہجے کو جواب دیتے رہو آشنا صداؤں کا

اور پھر معصوم جذبے کا عکس لیے یہ شعر۔

ہوں لاکھ مشکلیں، آسان ہو ہی جاتی ہیں جو سر پہ ہاتھ ہو ماں باپ کی دعاؤں کا

طارق بٹ نے حسن و عشق اور اس کے لوازمات سے بھی سروکار رکھا ہے۔ اگر غور کریں تو حسن و عشق کی اعلا قدروں کی پاسداری بھی فنی ذمہ داری ہے۔ دو شعر دیکھیں۔

لگتا ہے جیسے جھوم رہی ہو فضا تمام کچھ ایسا قرب یار نے سرشار کر دیا

اک بار اس کو دیکھ کے اٹھی نہ پھر نگاہ وہ حسن تھا کہ آپ ہی اپنا حجاب تھا

حلف نامہ

شاعر: پروفیسر ڈاکٹر شیتل او ستھی
تبصرہ نگار: ایس۔ ایس۔ بھٹناگر شاداب
صفحات: ۲۰۷ سنہ اشاعت: چالیس روپے (۔/۴۰ روپے)
ناشر: شنکر لال تیواری جگموہن ملک روڈ، کلکتہ ۔ ۷

اردو شاعری نے ہندی شاعری کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شیتل او ستھی کا "حلف نامہ" اسی کی ایک مثال ہے، جو ان کی ہندی کویتاؤں کا مجموعہ ہے، اور اسے ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے فرائض جناب عاشق ہرگانوی نے انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹر او ستھی ہندی میں شاعری کرتے ہیں لیکن اس میں اردو زبان کے الفاظ کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور ہندی کے ثقیل الفاظ

سے گریز کیا ہے۔ اس وجہ سے ان کا کلام سبھی کی سمجھ میں بہ آسانی آجاتا ہے۔ اسے اردو رسم خط میں دیکھ کر ایسا التباس نہیں ہوتا کہ یہ ہندی کا کلام ہوگا۔ اس مجموعہ میں رباعیات، قطعے اور مکتک یا چوپاے شامل ہیں۔ انھوں نے ایسی بحور نیز ہندی چھندوں کا استعمال کیا ہے جو عام طور پر رائج ہیں۔ کلام میں ہندی اور اردو کے الفاظ کا مناسب استعمال کیا گیا ہے یعنی ان دونوں زبانوں سے انھوں نے موزوں الفاظ کا انتخاب کیا ہے، جو عام فہم ہیں۔ ان دو مثالوں سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہندی کے کوی نے اردو الفاظ کا بے جھجک استعمال کیا ہے اور یہی اسلوب ان کے باقی کلام میں نمایاں ہے، ملاحظہ فرمائیں ۔

زندگی تو آخر کب کی کٹ جاتی ہے　　خدا کی بھیک ہے، سب میں بٹ جاتی ہے
یہ دیگر بات ہے، کس کے حصے میں کتنی ہے　　کسی میں بڑھ جاتی ہے، کسی میں گھٹ جاتی ہے

زیر تبصرہ مجموعہ میں ڈاکٹر اوستھی نے مبالغہ آرائی کو اپنے کلام سے دور ہی رکھا ہے۔ انھوں نے قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے، اپنے خیالات کو عام فہم زبان میں بیان کیا ہے اور ہندی کے ادب کے مشکل الفاظ کے استعمال نہ ہونے کے سبب ان کے کلام کا اردو رسم خط میں پڑھتے وقت قاری کو کسی قسم دشواری سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو ۔

آدمی غریب ہوتا ہے، آدمی امیر ہوتا ہے　　آدمی بادشاہ ہوتا ہے، آدمی فقیر ہوتا ہے
ایک اور فرق ہے آدمی آدمی کے بیچ　　کسی میں غیرت نہیں، کسی میں ضمیر ہوتا ہے

ڈاکٹر اوستھی نے گو اپنی کویتا کو ہندی رسم خط میں قلم بند کیا ہے اس کے باوجود اس میں اردو زبان ہی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اردو کے ادبی حلقہ میں یقیناً اس کا استقبال کیا جائے گا۔ اس کی کویتا میں انسان کے درد و الم، حق تلفی، مسائل وغیرہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مندرجہ ذیل شعری کلام میں قاری کو اس کا احساس ہو جائے گا ۔

نہ کوئی آدمی ہے، نہ گھر ہے　　ذلت ہے، ظلم ہے، قہر ہے
سب لوگ پوچھتے ہیں کہاں جا کر بسیں　　گاؤں میں دھواں ہے، آگ میں شہر ہے
ماں، بہن، بیٹی، دلہن، بنا لیتے ہو　　وحشت میں اسے کوٹھے پہ بٹھا دیتے ہو
کبھی مرنے پر پوجتے ہو دیوی کی طرح　　کبھی دیوی سی عورت کو زندہ جلا دیتے ہو

اردو والے ڈاکٹر اوستھی کے شعری کلام کو ہندی ادب کے پس منظر میں پڑھیں گے تو انھیں ہندی کے چھندوں کا بھی لطف اٹھانے کا موقع فراہم ہوگا۔

پارہ عم۔ مع اردو انگریزی ترجمہ و تخریج 45/-
صراط مستقیم 7/50
سورہ رحمٰن (ترجمہ مع تخریج) 6/-
حضرت شیخ مخدوم علی فقیہ مہائمی۔ 4/50
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں 9/-
نماز پڑھیے 4/50
السلام علیکم 7/50
حضرت یوسف علیہ السلام 4/50
حدیث کیا ہے 4/-
حضرت عمر فاروقؓ 6/-
نقوش سیرتؐ اول 5/-
نقوش سیرتؐ حصہ دوم 5/-
نقوش سیرتؐ حصہ سوم 5/-
نقوش سیرتؐ حصہ چہارم 5/-
نقوش سیرتؐ حصہ پنجم 5/-
رسالہ دینیات اوّل 3/-
رسالہ دینیات دوم 4/-
رسالہ دینیات سوم 5/-
رسالہ دینیات چہارم 5/-
رسالہ دینیات پنجم 6/-
رسالہ دینیات ششم 6/-
رسالہ دینیات ہفتم 6/-
رسالہ دینیات ہشتم 6/-
حضرت آدم علیہ السلام 4/-
حضرت یحییٰ علیہ السلام 3/-
بزرگان دین 4/-

امت کی مائیں 4/50
خوب سیرتؐ اوّل 6/-
خوب سیرتؐ دومؐ 6/-
اچھی باتیں 4/50
رسول اللہ کی صاحبزادیاں 4/50
سلطان حق 4/50
سیرت پاک مختصر مختصر 3/-
کمسن صحابی 6/-
رحمان کا مہمان 6/-
اسلام کے جاں نثار 5/-
نور کے پھول 9/-
سب سے بڑے انسان 3/50
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
حضرت ابوبکر صدیقؓ 6/-
حضرت عبداللہ بن عمرؓ 3/-
حضرت طلحہؓ 3/-
حضرت ابوذر غفاریؓ 3/-
حضرت سلمان فارسیؓ 3/50
حضرت عبداللہ بن عباسؓ 3/50
حضرت محبوب الٰہیؒ 3/50
حضرت معین الدین چشتیؒ 3/-
حضرت فرید گنج شکرؒ 3/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکی 3/-
نیک بیٹیاں 3/50
حضرت نظام الدین اولیاءؒ 3/-
حضرت حمزہؓ 3/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ 3/-
حضرت ابوہریرہؓ 4/-

اللہ کے صفی 3/-
اللہ کا گھر 4/50
اللہ کے خلیل 4/-
رسول پاک کے اخلاق 4/-
قرآن پاک کیا ہے؟ 7/50
اسلام کے مشہور سپہ سالار اول 6/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار دوم 6/-
اسلام کے مشہور امیر البحر 9/-
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل 7/50
اسلام کیسے پھیلا حصہ دوم 7/50
اسلام کیسے شروع ہوا 7/50
رسول پاکؐ 7/50
دس جنتی 7/50
سرکار کا دربار 7/50
چار یار 9/-
آں حضرتؐ (اردو) 3/50
ہمارا دین حصہ اوّل 8/50
ہمارا دین حصہ دوم 8/50
ہمارا دین حصہ سوم 8/50
ارکان اسلام 4/-
عقائد اسلام 4/50
خلفائے اربعہ 12/-
نبیوں کے قصے 7/50
ہمارے رسولؐ 7/50
مسلمان بیبیاں 6/-
ہمارے نبیؐ (اردو) 4/-
سرکار دو عالمؐ 9/-
پیارے رسولؐ 4/50

ادبی خبریں

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ۹۸ء ندا فاضلی کو

نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ برائے سال ۹۸ء اردو کے ممتاز شاعر جناب ندا فاضلی کو ان کے شعری مجموعے "کھویا ہوا سا کچھ" کے لیے دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں مدھیہ پردیش کے شہر گوالیار میں پیدا ہوئے۔ جناب ندا فاضلی جدید نسل کے اردو شعرا میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان دنوں وہ ممبئی میں رہ کر فلموں میں گیت لکھنے کے ساتھ ساتھ کئی ٹی وی سیریل بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کی شاعری پر مشتمل دو کتابیں ہندی میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

وزیر اعظم ادبی انعامات ۱۹۹۷ء کا اعلان کر دیا گیا

احمد ندیم قاسمی کو "وزیر اعظم کمال فن ایوارڈ" کا حق دار ٹھہرایا گیا

اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین نذیر ناجی نے نامور شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی کو ادب کے شعبہ میں قابل قدر خدمات انجام دینے پر وزیر اعظم کا کمال فن ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وزیر اعظم کا کمال فن ایوارڈ اس سلسلے کا پہلا ایوارڈ ہے جو کسی شخصیت کو اس کی تمام زندگی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وزیر اعظم کا ایک ایک لاکھ روپے کا ادبی انعام مستنصر حسین تارڑ کے ناول "راکھ" اشرف شاد کے ناول "بے وطن" منصورہ احمد کی شاعری "طلوع" اور سعود عثمانی کی شاعری "قوس" کو دیا گیا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے "اردو ناول آزادی کے بعد" اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے "اقبال چند نئے مباحث" کو تحقیق و تنقید پر ۵۰،۵۰ ہزار روپے کے انعامات دینے کا اعلان کیا گیا جبکہ متفرق اصناف کے ذیل میں ڈاکٹر آفتاب احمد خان کی کتاب "بیاد صحبت نازک خیالاں" (خاکے) پر ایک لاکھ روپے اور الطاف گوہر کی کتاب "لکھتے رہے جنوں کی حکایات" (کالم) پر ۵۰ ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔ آصف فرخی کو "موت اور قطب نما" (ترجمہ) پر پچاس ہزار روپے جبکہ توفیق رفعت کو A Slection پر ایک لاکھ روپے کا انعام دیا گیا۔

گلزار دہلوی اور ملک زادہ جاوید کو ایوارڈ

انجمن شاخ ادب کے زیر اہتمام ۷ اردسمبر برج پوری (کھوریجی) میں ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرے میں دلی سرکار کے ہیلتھ منسٹر جناب اشوک کمار والیا نے اردو زبان و ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں

اردو کی دو نسلوں جناب پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی اور نئی نسل کے جدید لب ولہجے کے شاعر ملک زادہ جاوید کو ایوارڈ پیش کیا اس مشاعرے کی صدارت چودھری متین صاحب ایم ایل اے نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب اشوک کمار والیا نے شرکت کی جن شعراء نے اپنا کلام سنایا اس میں گلزار دہلوی ' ملک زادہ جاوید' ملکہ نسیم' ریحانہ شاہین' ناز دہلوی' وصی احمد وصی' انداز دہلوی' ظہیر دہلوی' اقبال اشہر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اس مشاعرے کی نظامت ملک زادہ جاوید نے کی۔

ٹیپو شہید پر تحقیقی کتاب مفت

مشہور شاعر صحافی اور مقالہ نگار جناب شمیم طارق نے سالار حریت ٹیپو سلطان کی مزار پر حاضری کے بعد اپنے تاثرات قلمبند کیے تھے اور ممبئی کے روزنامہ اردو ٹائمز میں جس کے وہ اس وقت اڈیٹر تھے ان تاثرات کی قسط وار اشاعت کو قارئین نے بہت پسند کیا تھا۔

اقرا ایجوکیشن سوسائٹی جلگاؤں نے جو ایک تعلیمی اور ثقافتی ادارہ ہے ان قسطوں کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اور اس کتاب کو اہل علم کو مفت مہیا کرا رہی ہے۔ اس خوبصورت تحقیقی اور انتہائی قابل قدر کتاب کو آپ محض ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر ہم سے طلب کر سکتے ہیں۔

عبدالکریم سالار
صدر اقرا ایجوکیشن سوسائٹی
حاجی غلام نبی نگر' مہرون' جلگاؤں

"بزم اقبال" کی تشکیل جدید

۹ر دسمبر کو فعال ادبی تنظیم "بزم اقبال" بھوپال کی تشکیل نو عمل میں آئی جس میں نگراں رضا رام پوری' صدر رہبر جونپوری' جنرل سکریٹری اقبال بیدار' بالاتفاق رائے منتخب کیے گئے۔ بقیہ عہدیدار حسب سابق ہی رہے۔

اردو گھر میں نہال رضوی کے مجموعہ کلام "مجھ کو سمجھو" کا اجراء

نئی دہلی' ادبی ملاقات کے زیر اہتمام ۱۹ر دسمبر کی شام اردو گھر میں ڈاکٹر خلیق انجم کی صدارت میں منعقدہ ایک تقریب میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے نئے چیئرمین اور جواں فکر شاعر' نہال رضوی کے پہلے مجموعہ کلام "مجھ کو سمجھو" کی رسم اجراء سابق گورنر ہریانہ اور ممتاز ماہر اقبالیات جناب سید مظفر حسین برنی نے انجام دی۔ ابتدائی کلمات جناب ابوالفیض سحر نے ادا کیے۔ سینئر صحافی جناب پروانہ ردولوی اور اردو کے آبرومند استاد و نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے نہال رضوی کی شخصیت اور ان کی شاعری کا بھرپور تعارف پیش کیا۔ ممتاز شاعر جناب بلراج کومل نے نہال رضوی کو ایک باصلاحیت غزل گو قرار دیا۔ ادیب اور شاعر جناب رفعت سروش نے نہال رضوی کی شعری جمالیات پر جامع انداز میں روشنی ڈالی۔ جناب کوثر مظہری نے پروفیسر عبدالرحمن ہاشمی صدر شعبہ اردو جامعہ

ملیہ اسلامیہ کا مقالہ پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر خلیق انجم، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نے صدارتی تقریر کے دوران فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے لیے نہال رضوی کو صحیح اور مناسب سربراہ قرار دیتے ہوئے مشورہ دیا کہ اتر پردیش کے اس اہم ادارہ کا احاطہ اور دائرہ کار وسیع ہونا چاہیے ساتھ ہی کمیٹی کو اردو کے حقیقی کارکنان اور خاموش فنکاروں پر خصوصیت سے توجہ کرنی چاہیے۔ آخر میں جناب ذکی طارق نے مہمانوں، مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

زبیر رضوی کو اردو ادب کی فیلوشپ

نئی دہلی، مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے ایک مشتہر اسکیم کے تحت اردو کے ممتاز و منفرد شاعر اور رسالہ "ذہن جدید" کے مدیر مسٹر زبیر رضوی کو ادب کے زمرے کی واحد اردو سینئر فیلوشپ منظور کی ہے۔ اس فیلوشپ کے تحت مسٹر زبیر رضوی "ہندوستانی فنون لطیفہ سے اردو کا رشتہ" موضوع پر اپنے ادبی منصوبے کی تکمیل کریں گے۔

اس فیلوشپ کی مدت دو برس ہوگی اس دوران مسٹر زبیر رضوی کو ۶ ہزار روپے ماہانہ بطور وظیفہ دیا جائے گا۔ جدید اردو شاعری میں مسٹر زبیر رضوی اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کے چار مجموعے "لہر لہر ندیا گہری" "خشت دیوار" "پرانی بات ہے" اور "دھوپ کا سائبان" شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ نیا مجموعہ کلام "انگلیاں فگار اپنی" جلد ہی منظر عام پر آئے گی۔ مسٹر رضوی آل انڈیا ریڈیو میں ڈائرکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد دو برس تک دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری رہے۔ رسالہ ذہن جدید کی ترتیب اور اس کی مسلسل اشاعت ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اردو رسائل سے قطعی مختلف ذہن جدید نہ صرف عالمی ادب کا بھرپور عکس ہوتا ہے بلکہ فائن آرٹس کے موضوع اور ان کی سرگرمیوں سے متعلق بھرپور معلومات ہوتی ہیں۔ دہلی اردو اکادمی کی سکریٹری شپ کے زمانے میں "ہندی فلموں اور تھیٹر میں اردو زبان کے رول پر ایک مخصوص سیمینار کا انعقاد کر کے انھوں نے اردو کے لیے ایک نئے تعمیری قدم اٹھایا تھا۔

ضلع فرخ آباد میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کا قیام

راجیندر بہادر سوج رکن انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کی سرپرستی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کا قیام ہوا اور مندرجہ ذیل عہدیداران کی ڈہاک کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ صدر محمد شمیم خاں (فرخ آباد) نائب صدور: ڈاکٹر قیصر خاں (فرخ آباد) انیس احمد خاں ایڈوکیٹ (فرخ آباد) جاوید اقبال امروہوی (فرخ آباد) زاہد یار خاں ایڈوکیٹ (فرخ آباد)، صادر شاہ (قائم گنج)، محمود علی، محمود (کمال گنج)،

ضیاء الدین (کمال گنج)' جنرل سکریٹری ڈاکٹر شفیق احمد انصاری (فرخ آباد) جوائنٹ سکریٹری رئیس احمد خاں (فرخ آباد)' رکن الدین انصاری (شمس آباد)' خازن: حاجی چھوٹے میاں' سکریٹری نشر و اشاعت: عبدالکلیم وارثی' اراکین: اظہر الدین ایڈوکیٹ، محمد رئیس خاں' جاوید انصاری' خورشید علی خاں' عبدالمجیب خاں' محمد نسیم خاں' قاضی مظہر علی' فصیح مجیبی' افروز علی خاں' محمد احمد انصاری' محمد صابر انصاری' افروز عالم خاں' نعیم انصاری' اسرار احمد منصوری' سلیم دانش' محمد رفیع انصاری' سید باقر علی' فرحت علی خاں ایڈوکیٹ' راکیش چوہان ایڈوکیٹ ' حسین احمد' ستیش سکسینہ' محمد فرقان' محمد علیم انصاری' عادل کامران ایڈوکیٹ' حسین اشرف' سرور حسین سرور' راجندر نرائن سکسینہ، بسل فتح گڑھ' شاہد حسین انجینئر اور محمد محسن شمشی۔

مولانا آزاد میموریل ایوارڈ

حیدر آباد' مولانا ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی کی جانب سے اردو گھر میں منعقدہ ایک تقریب میں جناب محمد فہیم الدین سکریٹری کریسانڈنٹ مدینہ مشن اسکول جہاں نما کو ان کی تعلیمی خدمات کے لیے مولانا آزاد میموریل ایوارڈ جناب سدھاکر ریڈی (ایم پی) نے پیش کیا۔

علی صدیقی کا نیا پتا

جناب علی صدیقی (بانی عالمی اردو کانفرنس) کا پتا تبدیل ہو گیا ہے۔اب ان سے درج ذیل پتے پر خط کتابت کی جا سکتی ہے۔

عالمی اردو کانفرنس

۹۹ گگن وہار' دہلی۔۵۱

فون:۲۲۳۱۱۹۷' موبائل:۹۸۱۰۰۵۶۷۷۱

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کا پتا

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم (سابق ڈائریکٹر ترقی اردو بورڈ) کا پتا حسب ذیل ہے' اب ان سے اس پتے پر خط کتابت کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

152/A iv Stage

Douple Road

B.E.M.L, Layout

راجیشوری نگر' بنگلور۔۵۶۰۰۳۹ (کرناٹک)

فون نمبر۔(آفس)۳۲۱۴۰۰۱

(رہائش):۸۶۰۱۷۴۷

ڈاکٹر ساحل کو سر سید ایوارڈ

ناگپور (ڈاک سے) گذشتہ دنوں سر سید احمد اکیڈمی کے زیر اہتمام سر سید احمد خاں کی صد سالہ برسی' سر سید احمد لائبریری' بھالدار پورہ' ناگپور کے میدان میں منائی گئی۔ دو روزہ پروگرام میں طلبہ کے تقریری مقابلے' خواتین کے اجلاس اور سیمینار وغیرہ ہوئے۔اس موقع پر ڈاکٹر شرف الدین ساحل کو اردو ادب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کے لیے حلقہ' ودربھ کے پیمانے پر سر سید ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ انھیں یہ ایوارڈ ناگپور کارپوریشن کے

ممبران کونسل جناب دیویندر فرتولیں کے ہاتھوں دیا گیا۔

ایک شام جوش ملیح آبادی کے نام

نوئیڈا (ڈاک سے) جوش ملیح آبادی کی پیدائش کے صد سالہ تقریبات کا سال ہے۔ اس صدی کے عظیم شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اردو فاؤنڈیشن نوئیڈا کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت بزرگ صحافی جناب پروانہ ردولوی نے فرمائی۔ جناب رفعت سروش نے جلسے کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی اور پروانہ صاحب اور دیگر دانش وروں کا استقبال کرتے ہوئے سب سے پہلے جناب ابوالفیض سحر کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "جوش کی نثر۔ ایک تجزیاتی مطالعہ"۔ انھوں نے اردو نثر نگاری کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈالتے ہوئے جوش کو صاحب طرز نثر نگار تسلیم کیا اور کہا کہ انھوں نے اردو زبان کو بہت سے نئے الفاظ سے مالا مال کیا۔ پھر رفعت سروش نے اپنا مقالہ پڑھا۔ عنوان تھا "دریائے سخن جوش ملیح آبادی" جوش کی قادر الکلامی اور ان کی منظومات کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جوش ایسے دریائے سخن تھے جو اپنی بے پناہ قوت کے باعث پوری شان سے رواں دواں رہے، کئی نسلوں کو سیراب کیا اور تنقید اور تنقیص کرنے والے عناصر کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گئے۔ جناب ارشد غازی نے "آپ کا شاعر جوش" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جس میں جوش کے زور کلام پر جو نظمیں کیں زبان کی غلطیوں کی گرفت کی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جوش اس قابل ہی نہیں کہ ان کو یاد کیا جائے۔ آخری مقالہ ڈاکٹر محمود کا تھا "جوش کا مرثیہ حسین اور انقلاب ایک تجزیہ" خالد محمود صاحب نے مرثیہ نگاری کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے حسین اور انقلاب کا بھرپور جائزہ لیا اور اس اہمیت کو واضح کیا کہ جوش نے شہادت امام حسین کے اہم مقصد پر روشنی ڈالی ہے نہ کہ گریہ وزاری کی ہے۔ ان چاروں مقالات پر کھل کر بحث ہوئی خاص طور پر ارشد غازی کا مضمون تنقید کا نشانہ بنا۔ انور نزہت نے عصمت چغتائی کے حوالے سے جوش کے رہن سہن کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر نے کہا کہ جوش صاحب کے بچپن کے نفسیاتی مطالعہ پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شہپر رسول نے گفتگو کی اور انھیں اردو شاعری کا ایک ستون قرار دیا۔ گلزار دہلوی نے اپنی طویل جذباتی تقریر میں جوش سے اپنی قربت کا ذکر کرتے ہوئے محاسن جوش پر بھرپور روشنی ڈالی۔ صدر جلسہ پروانہ ردولوی نے کہا کہ یہ مذاکرہ وقت کی اہم ضرورت ہے اور جوش پر غیر جذباتی انداز میں علمی سطح پر کام کی ضرورت ہے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر سجاد سید، زبیر جونپوری، شبانہ نذیر اور شہپر رسول نے اپنا کلام سنایا۔

(ناصر زیدی)

ہندستانی یونی ورسٹی کی تنظیم

پروفیسر علاء الدین احمد صدر بنے

نئی دہلی، جامعہ ہمدرد (ہمدرد یونی ورسٹی) کے وائس چانسلر پروفیسر علاء الدین احمد کو سال ۱۹۹۹ء کے لیے ہندستانی یونی ورسٹیوں کی تنظیم کا صدر چنا گیا ہے۔ جامعہ ہمدرد کے جاری کردہ ایک بیان کے مطابق پروفیسر احمد فروری ۹۵ء میں جامعہ میں آنے سے قبل شیر کشمیر یونی ورسٹی آف ایگریکلچر سائنسز کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں اس کے علاوہ وہ اور بھی کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔

رضوی کالج میں محمود سروش

لائبریری اور ریسرچ سینٹر کا قیام

ممبئی باندرہ میں واقع رضوی کالج میں محمود سروش لائبریری اور ریسرچ سینٹر کا افتتاح گذشتہ روز اردو کے مشہور شعرا اور ادبا کی موجودگی میں عمل میں آیا۔ جن میں بزرگ شاعر علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کالی داس گپتا رضا اور حسن کمال شامل ہیں۔ اس موقع پر مجروح سلطان پوری نے "نوائے سروش" نامی کتاب کی رونمائی کی جس کو ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ترتیب دیا ہے۔

سردار جعفری نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اس تقریب میں مرحوم محمود سروش کی وجہ سے حاضر ہوا ہوں کیونکہ مرحوم کے پاس علم کا خزانہ تھا۔ اس کتب خانہ کو انھوں نے ایک یادگار علمی مرکز بنانے کے لیے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ جعفری صاحب نے رکن راجیہ سبھا ڈاکٹر اختر حسن رضوی کو اردو اور ہندی میں جعفری صاحب کے ذریعہ تیار "دیوان غالب" کی ایک کاپی پیش کی۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے مجروح سلطانپوری نے کہا کہ محمود سروش کے پاس تیس ہزار کتابیں تھیں اور رضوی صاحب نے کتب خانہ اور ریسرچ سینٹر بنا کر محمود سروش کو ایک یادگار شخصیت بنا دیا ہے۔

انھوں نے اعلان کیا کہ اس لائبریری کو وہ اور سردار جعفری اردو کی ایک ایک ہزار کتابیں بطور عطیہ دیں گے۔ جناب کالی داس گپتا رضا نے بھی ایک ہزار کتابیں دینے کا اعلان کیا۔

حلقۂ ادب جرمنی کا ماہانہ اجلاس

حلقۂ ادب جرمنی کا ماہانہ اجلاس لاہور پیلس ریستوران فرینکفرٹ میں منعقد ہوا۔ ثریا شہاب نے اپنی دو نظمیں "میرے دیس کی دھول" اور "ترکین" پڑھ کر سنائیں۔ پہلی نظم میں اپنے وطن کی یاد اور دوسری نظم میں اپنے ماضی کی یاد نے حاضرین کو یادوں کے سحر میں باندھ دیا۔ نظم "ترکین" کی چند لائنیں دیکھیں۔

وہ دن جب تتلیوں پھولوں سے ہم
بھی راز دل کہتے تھے، کتنے خوبصورت تھے، کبھی
چلتی ہوا سے شوخیاں کرتے، دوپٹے کو اڑاتے

رنگ بکھرتے رہے کبھی بہتے ہوئے پانی میں دونوں پیر ڈالے کنکروں سے کھیلتے رہتے رہ وہ ان جب خواب بنتے تھے نگاہوں میں "یوم اقبال کی نسبت سے امجد علی نے مضمون "اقبال اور تصوف" پڑھ کر سنایا۔ جس پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ حیدر قریشی نے اپنی زیر تحریر کتاب "کھٹی میٹھی یادیں" کا ایک حصہ اور ایک غزل پیش کی۔ غزل کا مطلع تھا:

یہ آنکھ کے آنسو کہ ساون کی جھڑی ہے
قابو میں نہیں دل کہ حضوری کی گھڑی ہے

طارق پرویز اختر نے اپنے اردو ماہیے پیش کیے۔ حلقہ کا یہ اجلاس باقاعدہ تنقیدی اجلاس نہیں تھا۔ تاہم حاضرین نے جملہ تخلیقات پر اپنے جذبات اور خیالات کا برملا اظہار کیا۔ حاضرین میں ارشاد ہاشمی، سید مرغوب حسن، صابر انجم، سلیم اللہ لودھی، امجد علی، ڈاکٹر نظام الدین، چوہدری سعید اختر اور شبیر احمد قابل ذکر ہیں۔ اس تقریب کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ "موفن کنال" جرمن ٹی وی چینل نے اس پروگرام کو ریکارڈ کیا اور اس کے حصے تین دن تک مذکورہ چینل پر دکھائے گئے۔

حیدر قریشی
سیکریٹری حلقہ کوب۔ جرمنی

بہار قانون ساز کاؤنسل

بہار قانون ساز کاؤنسل کے چیئرمین جابر حسین نے موجودہ مالی سال میں بہار اردو اکادمی کو دیے جانے والے ایک کروڑ کے گرانٹ میں تاخیر کے اسباب کو فوری طور پر دور کرنے کی ہدایت دی۔ پروفیسر حسین آج اپنی رہائش گاہ پر بہار میں اردو تعلیم کی صورت حال اور بہار اردو اکادمی کے مالی مسائل پر ایک اعلیٰ سطحی نشست کی صدارت کر رہے تھے۔ نشست کے مہمان خصوصی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان نے تبادلہ خیال کے دوران حکومت سے اردو تعلیم اور بہار اردو اکادمی سے وابستہ مسائل کے فوری حل کے لئے کارگر قدم اٹھانے کی اپیل کی۔ نشست میں ڈاکٹر شنکر پرساد نیگر یوال، وزیر مالیات، ڈاکٹر چندر پوروے، وزیر پارلیمانی امور، جناب لطف الرحمٰن، وزیر اقلیتی فلاح، جناب رام نریش پرساد، وزیر محکمہ رجسٹریشن، جناب بدری نارائن لال، رکن قانون ساز کاؤنسل، محمد شمیم، رکن قانون ساز کاؤنسل، پرمانند سنگھ مدن، جناب سہیل احمد خاں، چیئرمین بہار اقلیتی کمیشن، ڈاکٹر عبدالصمد، چیئرمین اردو مشاورتی کمیٹی، ڈاکٹر رام وچن رائے، چیئرمین ہندی پرگتی سمیتی، محترمہ نیلم ناتھ، ایڈیشنل کمشنر مالیات جناب رضوان احمد، سکریٹری بہار اردو اکادمی جناب اشوک وردھن، سکریٹری محکمہ پارلیمانی امور، ڈاکٹر ودیا ساگر یادو، ڈائرکٹر اعلیٰ تعلیم، کمار گوری شنکر، اسپیشل ڈائرکٹر پرائمری تعلیم، جناب ایس کے نیگی، سکریٹری پرائمری سکنڈری اور

تعلیم بالغان' جناب نسیم احمد' نائب سکریٹری
بہار اردو اکادمی نے بھی حصہ لیا۔

نامور محقق عبادت بریلوی کا انتقال

نامور محقق، نقاد اور استاد ڈاکٹر عبادت
بریلوی حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ وہ
۷۸ برس کے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۱۹۲۰ء میں پیدا
ہوئے انھوں نے تدریسی زندگی کی ابتدا اینگلو عربک
کالج دہلی سے کی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پنجاب
یونیورسٹی اور ینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ وہ شعبۂ
اردو کے صدر، ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور ینٹل کالج کے
پرنسپل رہے اور ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ ڈاکٹر عبادت
بریلوی نے انقرہ یونیورسٹی ترکی اور اسکول آف افریقن
اینڈ اور ینٹل اسٹڈیز لندن میں بھی بطور استاد خدمات سر
انجام دیں وہ سو سے زائد علمی و ادبی کتابوں کے مصنف
تھے۔ مقتدرہ کے صدر نشین، افتخار عارف نے ایک
تعزیتی اجلاس میں عبادت بریلوی کی وفات پر گہرے رنج
کا اظہار کرتے ہوئے انھیں زبردست خراج عقیدت
پیش کیا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے
کارکن رگھپال سنگھ کی وفات

نئی دہلی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے
کارکن رگھپال سنگھ کا ۲۰ر نومبر ۱۹۹۸ء کی رات ڈھائی
بجے پرکاش نرائن اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ انتقال
کے وقت مرحوم کی عمر ۲۶ سال تھی۔

مرحوم رگھپال سنگھ بہت محنتی، ایمان دار
اور خود دار انسان تھے۔ دفتر میں کبھی کسی کو شکایت کا
موقع نہیں دیتے ہر کام بڑی ذمے داری سے انجام
دیتے تھے۔ انتقال کی خبر ملتے ہی دفتر میں جنرل
سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی صدارت میں ایک تعزیتی
میٹنگ ہوئی جس میں پس ماندگان سے اظہار ہمدردی
کیا گیا اور ایک دن کے لیے دفتر بند کر دیا گیا۔

اردو کی مشہور معلمہ
مسرت زمانی کا انتقال

علی گڑھ ۹ر دسمبر شام پانچ بجے مسرت
زمانی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں ۱۰ر دسمبر
۹۸ء صبح ۱۱ بجے یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک
ہوئیں۔ محترمہ مسرت زمانی یونیورسٹی کی طالبہ تو
تھیں ہی اور ان کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ نویں کلاس
سے لے کر ۱۲ ویں کلاس تک اردو میں ہوم سائنس کی
کورس کی کتابیں تصنیف کیں جو کہ مسلم یونیورسٹی
اور یونیورسٹی کے علاوہ ہندستان کے دوسرے تعلیمی
اداروں میں بہت مقبول ہوئیں اور ان کتابوں کی وجہ
سے مسرت زمانی طالبات کے لیے انتہائی ہر دلعزیز
ہوئیں۔ مرحومہ کا ایک کتب خانہ ہے جو ایجوکیشنل
بک ہاؤس کے نام سے مشہور ہے اور یونیورسٹی مارکیٹ
میں تقریباً ۷۵ سال سے تعلیمی خدمات انجام دے رہا
ہے جس کی دیکھ بھال ان کے بیٹے اسد یار خاں اور
احمد سعید خاں کر رہے ہیں۔ ان کی تقریباً پانچ سو
کتابیں اپنی شائع کی ہوئی ہیں جو کہ ہندستان اور بیرونی
ممالک میں بہت مقبول ہیں۔

ادارہ "مکتبہ جامعہ" "کتاب نما" و "پیام
تعلیم" مرحومہ کے لیے دعا گو ہے کہ اللہ تعالی انھیں
جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین اور
متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

Regd. with R.N.I. at No. 4967/60 FEBRUARY, 1999.
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025

نظریاتی تلاطموں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

مارچ ۱۹۹۹ء	جلد ۳۹	شمارہ ۳

فی پرچہ 8/
سالانہ 80/
سرکاری تعلیمی اداروں سے 125/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
e-mail maktaba@ ndf. vsnl. net.in
Tele Cum Fax No (011)-6910191
ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ممبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

کہانی

طنز و مزاح

جائزے

نئی مطبوعات

فکر تازہ (ادبی) ڈاکٹر عبدالباری 100/-

اردو رسم الخط اور املا ڈاکٹر ابو محمد سحر 130/-

تلوک چند محروم۔ شخصیت اور فن (تحقیق)۔
ڈاکٹر زینت اللہ جاوید 150/-

جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی (تحقیق) سی جوہ ریڈی 150/-

وائے سروش شخصیت، شاعری (مجموعہ مضامین)
مرتبہ عبدالستار دلوی 75/-

اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (تحقیق) سید تنویر حسین 170/-

ضمیر کی آواز (شعری مجموعہ) انجم دیناوی 50/-

خیموں کے شہر میں۔ (سفرنامہ حج) ڈاکٹر صادق دکی 39/-

صحرا میں گم نامی (شعری مجموعہ) فاروق انجینیر 100/-

شاعری حصے میں آئی (شعری مجموعہ) شاغل ادیب 66/-

سرمستی تمکین (شعری مجموعہ) مرتبہ قیصر سرمست 80/-

کہکشیں (شعری مجموعہ) شیدا اناوی 50/-

دانشور گیتا رصد ایک مطالعہ (تحقیق) اعجاز سیمابی 100/-

سوتیلی بیوی (مزاحیہ شاعری) قیس قمر نگری 60/-

قافلے والوں کے نام (افسانے) عارف خورشید 150/-

محل میں روشنی کی تلاش (آمد نامہ) سالک لکھنوی 70/-

سوالیاں (انشائیے طنز و مزاح) محمد اسد اللہ 60/-

جسوندر شرما کے منتخب افسانے مترجم سعید احمد سندیلوی 100/-

تیر و تفکر کی آزمائش (خاکے) محمد منظور احمد 60/-

منفرد (افسانے) شمیم ضیاء الدین 160/-

کرن کرن اجالا (شعری مجموعہ) مومن خاں شوق 60/-

رسائل

ماہنامہ شفق (ٹونک) (قرآن نمبر) مدیر اعلیٰ ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی 20/-

ماہنامہ انشاء۔ کلکتہ مدیر ف۔ س۔ اعجاز۔ فی شمارہ 8/-

ماہنامہ حجاب۔ رامپور (حیدر علی نظامی نمبر) نگراں ڈاکٹر انیس فرید 12/-

دو ماہی گلبن۔ احمد آباد منیجنگ ایڈیٹر۔ سید ظفر ہاشمی فی شمارہ 8/-

ماہنامہ تہذیب الاخلاق مدیر پروفیسر ابوالکلام قاسمی فی شمارہ 6/50

ارمغان (سہ ماہی) کراچی مدیر سید محمد رومی فی شمارہ 8/-

سرورق ۔ عبد المتین جامی

اقبال کا نظریۂ شعر اور ان کی شاعری

پروفیسر آل احمد سرور

اردو کے ممتاز نقاد اور دانش ور پروفیسر آل احمد سرور کا مایۂ ناز خطبہ جو دہلی یونیورسٹی میں نظام خطبات کے تحت ۷۷۔۱۹۷۸ میں پیش کیا گیا۔ اس خطبے میں سرور صاحب نے اقبال کے نظریۂ شعر کے بارے میں نہایت فکر انگیز خیالات پیش کیے ہیں۔ قیمت 45/-

نظام اردو خطبات کا 19 واں خطبہ

داستان امیر حمزہ

" داستان، زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین" کے عنوان سے اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں پیش کیا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کردیا ہے۔ قیمت 60/-

ماضی کے دریچے سے　　ڈاکٹر شوکت اللہ

اس کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین ان قدیم تاریخی عمارتوں سے تعلق رکھتے ہیں جو اب ہمارے لیے ایک عظیم تاریخی سرمایے کی حیثیت حاصل کرچکی ہیں، ان میں کچھ عمارتیں World Heritage کی فہرست میں بھی شامل کی جا چکی ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں اور تاریخ کے طلبہ کے لیے ایک نہایت اہم کتاب　　قیمت 75/-

مہمان مدیر
عبدالمتین جامی
میڈیکل بازار پدمپور
کٹک۔اڑیسہ

(اشاریہ)

مابعد جدیدیت یا[2] (مابعد جدیدیت)

میرے خیال میں اردو ادب میں لفظ "جدیدیت" انگریزی لفظ MODERNISM کا ترجمہ ہونے کے باوجود ان دونوں کے اصطلاحی معنوں میں بہت فرق ہے۔اسی طرح مابعد جدیدیت کی اصطلاح اور انگریزی اصطلاح POST-MODERNISM بھی کلی طور پر ہم معنی نہیں ہوتیں۔خود ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مغربی جدیدیت کی صحیح ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے۔" مغرب میں جدیدیت روشن خیالی پروجکٹ ENLIGHTEN MENT PROJECT کا حصہ تھی اور مارکسزم اور ہیومنزم سے الگ نہیں تھی۔ مغرب کا روشن خیالی پروجکٹ انسان کی تاریخی اور سائنسی ترقی کے خواب سے عبارت تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ خواب پاش پاش ہو گیا" (ایوان اردو، دہلی شمارہ جولائی ۱۹۹۳ء)

ڈاکٹر موصوف کا یہ قول مبنی بر حقیقت ہے کہ ، ہمارے یہاں جدیدیت دراصل ترقی پسندی کے رد عمل کے طور پر آئی لہٰذا مغرب میں POST-MODERNISM کے نام سے جو ادب سامنے آیا (یعنی جو ادب زندگی سے مایوسی اور بے یقینی کے علاوہ اخلاقی بے راہ روی اور اقدار کے زوال سے عبارت تھا) اسی سے ہماری جدیدیت مشابہ ہے۔ چونکہ ۱۹۶۰ء کے بعد کی تحریروں میں روایت سے انحراف کلیدی حیثیت رکھتا تھا، اس لیے اسے ہمارے ادب میں 'جدیدیت' کا نام دے دیا گیا۔اس ضمن میں میرا موقف یہ ہے کہ ہم ایک ہی چھلانگ میں MODERNISM سے گزر کر POST MODERNISM کی اس سطح تک پہنچ گئے جہاں مغربی تہذیب و تمدن کو پہنچنے کے لیے کئی مدارج سے ہو کر گزرنا پڑا۔یہاں مجھے اس امر کے اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ ہمارے یہاں ۱۹۶۰ء کے بعد جو رجحان ظاہر ہوا تھا وہی رجحان آج بھی (یعنی بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بھی) نظر آرہا ہے۔دہلی اردو اکادمی کی طرف سے منعقدہ شدہ مابعد جدیدیت پر سیمینار منعقدہ ۸ء

کے بعد ابھرنے والے نئی پیڑھی کے شعرا و بعض پرانے نقادوں کی پشت پناہی میں اپنے آپ کو "مابعد جدید ادیب" کہلانے پر مصر تھے لیکن ان حضرات کے ہزاروں بلند بانگ دعووں کے باوجود کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ ۶۰ء کے بعد سے لے کر آج تک کے ادبی اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے کوئی ایسی چونکا دینے والی تبدیلی رونما ہوئی ہے جس کی مدد سے ہم ۸۵ء کے بعد کی تخلیقات اور اس سے پہلے کی تخلیقات کے درمیان حدِ فاصل یا امتیازی لکیر کھینچ سکیں۔

نئی نسل کے قلم کاروں پر گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل ساختیات، پسِ ساختیات جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے موضوعات پر تفصیلی گفتگو کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے بڑی حد تک باہم منسلک INTERRELATED ہیں۔ دراصل ساختیات جیسا تنقیدی نظریہ چند مغرب زدہ مفکروں کی دین ہے۔ اس نظریہ پر مغربی ممالک میں عرصہ دراز تک مباحثوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ وہاں اب اس نظریہ نے دم توڑ دیا ہے۔ مغربی تنقید ساختیات کے بعد پسِ ساختیات مثلاً تشکیل ثانی RECONSTRUCTION، ردِ تشکیل DE-CONSTRUCTION اور تانیثیت FEMINISM سے گزر کر نیو کلیائی تنقید تک پہنچ چکی ہے لیکن افسوس کہ اردو کے ادباء تک ساختیات اور پسِ ساختیات کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکے۔ ان لوگوں نے مابعد جدیدیت کی اصطلاح کو انگریزی لفظ POST- MODERNISM کے لفظی ترجمے کے طور پر قبول کیا ہے۔ مابعد جدیدیت دراصل ساختیات یا پسِ ساختیات جیسے نظریوں کی طرح کوئی مخصوص تنقیدی نظریہ نہیں، بلکہ ایک ثقافتی رجحان ہے جس کو بعض لوگوں نے غلط طور پر نظریہ ادب کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو ادب میں (خصوصاً ہندستان میں) جدیدیت کی تاریخ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ہے لیکن مغربی ثقافت و تہذیب میں جدیدیت کی داغ بیل بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پہلی جنگ عظیم کے بعد پڑی۔ اس مفروضہ کے برخلاف MODERNISM اٹھارہویں صدی عیسوی کے مغربی مفکرین کے روشن خیالی کے پروجکٹ سے جڑا ہوا ہے۔ روشن خیالی کا وہ پروجکٹ کلچرل موڈرنزم کا حصہ تھا۔ مغربی مفکرین نے انسان کی سائنسی ترقیوں کی مدد سے انسان کی فلاح و بہبود کا خواب دیکھا تھا۔ انھوں نے سوچا تھا کہ انسان کو درس اخلاقیات، نفاذ قانون اور خود مختاری فنون وادب کے ذریعہ ایک ڈور میں باندھا جا سکے گا۔ عدل وانصاف کی بالادستی ہو گی اور دنیا بھر میں امن وامان کا دور دورہ ہو گا، لیکن افسوس کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے ان مغربی

دانشوروں کا خواب پارہ پارہ ہو گیا کیونکہ جدید ترین ٹکنالوجی کی ترقی نے اس کے برخلاف ہی نتیجے نکالے۔ یوں تو مادی آرام اور آسائشوں کا دور دورہ ہوا لیکن اقوام عالم کے درمیان ذہنی فاصلے بڑھنے لگے۔

عہد جدید نے انسانوں کے اندر خود غرضیوں کے علاوہ حرص وہوس کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا۔ ہر چیز تجارتی مال میں تبدیل ہو گئی۔ ادھر انسانوں میں علمی کارنامے انجام دینے کی دوڑ شروع ہو گئی اور اس کے نتیجے میں علمی دھماکہ KNOWLEDGE EXPLOSION شروع ہو گیا۔ یہ علم انسانوں کے اندر کی "انسانیت" کو فروغ دینے کی غرض سے حاصل نہیں کیا جارہا تھا اور اس علم کا انسان نوازی سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ ان جدید ایجادات کے ذریعہ مادی ترقی کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ کار فرما تھا جس نے لوگوں میں مایوسی اور بے یقینی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا۔ گویا انسان اپنی ترقی کی کوشش میں بھلے اور برے کی تمیز کو فراموش کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اسے اب کسی طرح کی پابندی میں رکھنا محال ہو گیا تھا۔ ہر طرح کے آدرش اس کے آگے بے معنی تھے۔ پرانی قدریں پامال ہو گئیں۔ اقدار کی پامالی نے پورے معاشرے کو ہی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ روحانیت کی وقعت خواب وخیال سے زیادہ کچھ نہیں رہ گئی۔ یہی وہ صورت حال تھی جسے مغرب میں POST MODERNISM کا نام دیا گیا یعنی سماج میں آنے والی خوش آیند تبدیلیوں کا جو خواب MODERNISM نے دیکھا تھا اس کے چکنا چور ہونے ہی کو POST-MODERNISM کہا گیا جو درحقیقت معاشرتی تبدیلیوں کے رجحانات سے عبارت ہے۔ سماج میں در آئے بحرانوں کے پیش نظر انگریزی میں جس کو ماڈرنزم یا پوسٹ ماڈرنزم کہا گیا، ہمارے یہاں اس کے بالکل برعکس صورت حال تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے معاشرے پر جدیدیت کی یلغار بہت تاخیر سے ہوئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مغربی معاشرے میں جدیدیت کے بعد والا دور آچکا تھا۔ مغربی معاشرے میں جدید دور کا آغاز مختلف سائنسی ایجادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کے بعد ہوا۔ اشتراکیت نے جب یورپ کے اکثر ممالک پر اپنا تسلط جمالیا تو لوگوں نے اطمینان کا سانس لے کر یہ سوچا کہ چلیے اب استبدادی قوتوں سے نجات ملی مگر مشرقی ممالک میں ایسی کوئی بات رونما نہیں ہوئی۔ یہاں تو عوام غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ خوش آیند مستقبل کا خواب ان کے یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا لہذا جدیدیت کیا اور مشرقی عوام کیا؟ اس لیے مغرب کے تناظر میں ہمارے یہاں کے خیالات

کو پر کھنا غلط ہو گا، بطور خاص جب ہند وپاک میں بنیاد پرستی FUNDAMENTALISM سر ابھار رہی ہے، باتوں باتوں میں فرقہ وارانہ تصادم عام ہوتا جارہا ہے؟ ہر طرف دہشت پسندی TERRORISM کا دور دورہ ہے، اشیائے خوردنی کی مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے، جہیز کی چتا میں لڑکیوں کا جلنا عام ہو چکا ہے، نیز روٹی کپڑا اور مکان سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے، ایسے میں مغربی ممالک کی کمپیوٹر ٹکنالوجی سے یہاں کے عوام کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یہاں کے عوام کو غیر ملکی دشمنوں سے زیادہ خود اپنے ہم وطنوں سے خطرہ لاحق ہے۔ ایسے میں یہاں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا اختلاف بے معنی ہے۔ اگر لفظ "جدیدیت" کو انگریزی لفظ MODERNISM کے مفہوم میں استعمال کیا جائے تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ دراصل ترقی پسندی ہی اصل جدیدیت تھی کیوں کہ اس میں نئے سورج کا خواب دیکھا اور دکھایا گیا تھا البتہ اس جدیدیت کا خاتمہ جلد اس لیے ہوا کہ بیشتر ترقی پسند شعرا نے نعرہ بازی ہی کو ترقی پسندی سمجھ لیا تھا۔ ترقی پسندی سے انحراف کے نتیجے میں جو ادب تخلیق ہونے لگا، وہ بھی مغربی ادب سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر تھا۔ اس پر مغربی اثرات اس قدر جلد اس لیے پڑے کہ وسائل و ذرائع کی عمومیت کی وجہ سے دنیا سکڑ چکی تھی اور یہاں کے ادبا بھی اسی انداز سے سوچنے لگے تھے جس انداز سے ان کے ہم عصر مغربی ادبا سوچ رہے تھے۔

ڈاکٹر نارنگ کے بموجب "مغرب میں جدیدیت کا زمانہ پہلی جنگ عظیم سے دوسری جنگ عظیم تک کا ہے جب کہ ہمارے یہاں ۱۹۶۰ء کے بعد دو دہائیوں کا ہے۔ مغرب کا روشن خیالی پروجیکٹ انسان کی تاریخی اور سائنسی ترقی کے خواب سے عبارت تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ خواب پاش پاش ہو گیا ..... بعد کے دور کو گمشدگی اور بدعقیدگی کا دور کہا جاتا ہے" (ایوان اردو، نئی دہلی جولائی ۱۹۹۳ء)

یعنی ۱۹۴۵ء کے بعد والے دور میں مایوسی، بے یقینی اور بے گھری کا احساس فنکاروں پر حاوی ہو گیا۔ مغرب میں اسی دور کو POST-MODERNISM سے گردانا گیا۔ لیزلی فیڈلر نے ۱۹۶۵ء میں، آداب حسن نے ۱۹۷۶ء میں ژاں فرانکو لیوتارڈ نے ۱۹۸۴ء اور ۱۹۹۲ء میں ..... POST-MODERNISM کو فروغ دیا۔ اس عہد میں جس شاعری یا ادب کی تخلیق ہوئی اسے POST-MODERNISM کہا گیا۔ ہمارے یہاں بھی اسی نوعیت کی ادبی تخلیقات ہونے لگیں لیکن ہمارے ادبا نے انھیں "جدیدیت" کا نام دیا یعنی ایک ہی چیز کو مغرب اور مشرق میں الگ الگ طریقے سے دیکھا جانے لگا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ہمارے یہاں ۱۹۶۰ء کے بعد شروع ہونے والے جدید دور کو صرف دو

دہائیوں تک محدود کر دیا اور اس کے بعد والے دور کو مابعد جدید دور سے تعبیر کیا ہے لیکن یہ بات بھی بعید از فہم ہے کہ گزشتہ ۱۵ سالوں کے درمیان ہمارے ادب میں کون سی ایسی نئی بات پیدا ہو گئی کہ اسے جدیدیت کے علاقے سے ہٹا کے مابعد جدیدیت کے دائرے میں لایا جا سکے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہمارے ادب کو مغرب کے پیمانے پر ناپ کر دیکھا جائے تو یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جائے گی کہ برصغیر ہند و پاک میں ایسا کوئی دور آیا ہی نہیں جس کو "خالصتاً جدید" کہا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۸ء۔ ۱۹۴۵ء کے بعد ساری دنیا کے معاشرے میں جو بے یقینی اور مایوسی کا دور آیا اس کی زد میں ہمارا برصغیر بھی آ گیا، لہذا ہمارے یہاں ۱۹۶۰ء کے بعد والی شاعری یا دیگر اصناف ادب کو مابعد جدید کہنا ہی زیادہ مناسب ہو گا نہ یہ کہ صرف ۱۹۸۵ء کے بعد والی شاعری کے لیے یہ لفظ مختص ہو۔ یوں بھی مابعد جدیدیت کے بانی کہلانے والے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ POST MODERNISM کی صاف تصویر سامنے آئی ہے یا نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مابعد جدیدیت کا تصور ابھی واضح نہیں ہے اور پس ساختیات میں جو رشتہ ہے اس کے بارے میں بھی معلومات عام نہیں۔

(مابعد جدیدیت کیا اور کیوں، ایوان اردو جولائی ۱۹۹۳ء)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے اس مضمون میں رقم طراز ہیں "پس ساختیات ایک تھیوری ہے، فلسفیانہ قضایا سے بحث کرتی ہے جبکہ مابعد جدیدیت تھیوری سے زیادہ صورتِ حال ہے" وہ صورت حال کیا ہے اس پر میں نے پہلے ہی روشنی ڈال دی ہے۔ دراصل ساختیات یا وضعیات STRUCTURALISM! "شعریات" ہی کی ایک شاخ کہلا سکتی ہے۔ اس میں تخلیق کے TEXTURE سے زیادہ اس کی وضع یا ساخت STRUCTURE ترجیح دی جاتی ہے، اس لیے ساختیاتی نقادوں کو اس بات سے دلچسپی رہتی ہے کہ تخلیق میں وہ کون سی چیز ہے جس نے قاری کے اندر تجسس، کرید اور اکساہٹ کو بیدار کیا یعنی تخلیق کو سمجھنے کے لیے قاری کے یہاں کون سا اصول کام کر گیا جس کی مدد سے قاری کو سخن فہم ہونے کا رتبہ ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ "ساختیات" "شعر فہمی کے قواعد اور اصولوں کی تلاش کرتی ہے۔ اس کے اصول کے مطابق شعر کے متن ہی کو اہمیت حاصل ہے، باقی معنویت کی تلاش بے معنی فعل ہے، یعنی فنکار کے فن میں پوشیدہ معنوں سے ساختیات کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہوتی، بلکہ فنکار نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کس اسلوب کو اپنایا ہے اور اس اسلوب کو کس کامیابی سے برتا ہے، اس

سے بہتر طریقہ اپنایا جاسکتا تھا یا نہیں اور اگر اپنایا جاسکتا تھا تو اس کی صورت کیا ہونی چاہیے تھی، ساختیاتی نقاد اسی نہج پر بحث کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی انسان کی جانچ کرتے ہوئے کوئی شخص صرف اس کی شکل و شباہت کا مشاہدہ کرے لیکن اس کے عادات واخلاق کو یکسر نظر انداز کردے۔ اس بات سے قطع نظر کہ جانچ کرنے کے یہ طریقے بہت ناقص ہوتے ہیں۔ مغربی ممالک میں اس نئے طریقہ کار کی بہت پذیرائی ہوئی۔ ساختیات کے اصول کے مطابق شعر کی لسانی حیثیت پر ہی گفتگو ہوسکتی ہے۔ ساختیات کے ایک مفکر تامروپ قرائی کہتا ہے کہ وہ چیز جس کی بدولت شاعری کو بطور شاعری پڑھا جاتا ہے حقیقتاً شاعری نہیں اور نہ ہی اس کو پڑھنے کا تجربہ بلکہ شاعری کے بارے میں وہ علم ہے جو شعری ذوق کو جلا دیتا ہے "گوپی چند نارنگ صاحب کے خیال میں شعریات کا تصور ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ بے شک ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو کسی بھی طرح کے نظم وضبط کو ادب کی تخلیقی آزادروی یا بے روک ٹوک تخلیقیت کے منافی سمجھتے ہیں۔"

(ساختیات اور بوئے گل کا سراغ کتاب نما جولائی ۱۹۹۰ء شمارہ ۷)

بہر حال ساختیاتی تنقید پر مختلف مفکروں نے مختلف باتیں کہیں لیکن سبھوں نے متن ہی پر زور دیا۔ ساختیات کی اس بحث کو فروغ ملنے کا یہ بھی سبب رہا کہ مادہ پرستوں کے نزدیک مادی دنیا ایک متن ہے جس کے پیچھے کوئی معنی یا مقصد پوشیدہ نہیں، جو کچھ بھی حاصل کرنا ہے دنیا ہی میں حاصل کرلیا جائے۔ اس مادی دنیا کو دیکھنے یا سمجھنے کے لیے کچھ ماورائی نظام روز ازل سے ہی چلے آرہے ہیں اور اس نظم ونسق کی تلاش انسان کا نصب العین ہے، اس بات پر نہ مادہ پرستوں کا یقین ہے اور نہ حامیان ساختیات کا۔

مغرب میں ساختیات کے دور کے بعد پس ساختیات POST- STRUCTURALISM دور آیا جس میں رد تشکیل DE-CONSTRUCTION، ٹیکنک نے تنقیدی تھیوری کے طور پر خاصی مقبولیت حاصل کی۔ بالفاظ دیگر پس ساختیات، ساختیات ہی کا بغلی بچہ ہے بالکل الگ رنگ، روپ اور فطرت کا بچہ۔ مابعد جدیدیت اور پس ساختیات کے درمیان مماثلت اس قدر ہے کہ بقول ڈاکٹر نارنگ دونوں ایک دوسرے کے بدل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ جن مغربی مفکرین نے پس ساختیات کو فروغ دیا انھیں لوگوں نے مابعد جدیدیت کے تصور کو مقبولیت بخشی۔

پس ساختیات میں ساختیات کے برعکس قاری کو اس بات کی آزادی دے دی گئی ہے کہ وہ کسی بھی فن پارے کے معنی کی تشکیل یا ردتشکیل خود ہی کرے۔ اس پر کسی بھی طرح کی

پابندی عائد کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے کہ وہ "یہ" سمجھے یا "وہ" سمجھے یا شعر کی تشریح کے وقت دعویٰ کرے کہ اس شعر میں شاعر نے یہ کہا ہے یا وہ کہا ہے۔" ساختیاتی نقادوں کے بموجب متن اور معنی کیلئے الگ اشیا ہیں۔ آدمی کسی بھی بات کا حوالہ دیتے وقت حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کو اس کے علاوہ بھی کوئی اور بات ہے کہ نہیں۔ پس ساختیاتی نظریہ کی رو سے کسی بھی خیال کی صداقت کسی ایک مخصوص مرکز پر نہیں ٹھہرتی بلکہ لامرکزیت کا شکار ہوتی ہے۔

خیال کی اس لامرکزیت کے نتیجے میں معنی کی کثیر الجہتی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ قاری کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں خود سوال بھی پیدا کرے اور اس کا جواب بھی دے۔ متن سے معنی کشید بھی کرے اور اس کی تردید بھی کرے۔ تنقیدی ادب کا یہ نیا نظریہ جدیدیت کے بعد والے اسی دور کی پیداوار ہے جسے مابعد جدیدیت سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ مابعد جدیدیت اور مابعد ساختیات کو گڈمڈ کر دیتے ہیں حالانکہ مابعد جدیدیت مابعد ساختیات کے برخلاف کوئی ادبی نظریہ نہیں بلکہ جدیدیت کے بعد والی ثقافتی صورت حال ہے۔ اسے زبردستی ادبی نظریہ کے بطور پیش کرنے کی کوشش لاحاصل ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس معاشرتی اور ثقافتی صورت حال نے شاعروں کو POST-MODERN شاعری لکھنے پر مہمیز کیا وہی صورت حال آگے چل کر تنقید میں ساختیات اور پس ساختیات کے فروغ کا موجب بنا۔

مابعد جدیدیت سے متعلق دیوندر اسر نے کئی دلچسپ سوالات اٹھائے ہیں۔ ان سوالات میں ایک سوال مابعد جدیدیت کے بعد والے دور سے ہے۔ انھوں نے پوچھا ہے کہ "کیا کمپیوٹری مصنوعی ذہانت اور دماغ سازی کی مساعی سے پس انسانی سماج کی نمو ہوگی یا انسان کی تخلیقی فکر و تخیل پس سائنسی سماج کی پرورش کریں گے یعنی پس مابعد جدیدیت کا دور انسانی ہوگا یا پس سائنسی"

(ایوان اردو، دہلی ستمبر ۱۹۹۵ء)

"پس سائنسی" سے مراد کیا ہے، چاہے کمپیوٹر ٹکنالوجی اور سیٹلائٹ کا دور ہو یا کلوننگ اور بایو انجینیئرنگ کا دور، کیا یہ ان سائنسی انکشافات کا تسلسل نہیں ہے جن سے انسان نے جوہری توانائی کو مسخر کر کے کل کائنات بلکہ اپنی موت پر بھی قابو پانے کا خواب دیکھا تھا؟ آگے جو بھی دور آئے گا وہ سائنسی دور ہی کہلائے گا، پس سائنسی نہیں۔ اس لیے پس سائنسی سماج کا تصور ہی بے معنی ہے۔ البتہ یاجوج ماجوج کی قوم نکل آئے اور ادبی تخلیق

کی طرف مائل ہو تو کسی نئے رجحان کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ کمپیوٹر ہو یا روبوٹ، انسانی جذبات سے عاری ہوگا اور انسان کا غلام ہی رہے گا۔ اسی لیے اسے انسانی دماغ کا بدل ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

بہر کیف پھر سوال ہے کہ روایت کے بعد جدیدیت پھر جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت، پھر اس کے پسِ مابعد جدیدیت، پھر اس کے بعد؟ کیا ۲(مابعد جدیدیت) پھر ۳(مابعد جدیدیت)؟ اس طرح کیا ہمارے ادب میں ہر دس بیس سال میں نیا نام دینے کا سلسلہ جاری رہے گا؟ میرے خیال میں بہتر ہے کہ مغربی فلسفہ طرازوں سے پرے ہٹ کر ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ ہم نے جسے اولاً جدیدیت کا نام دیا تھا اسے جاری رہنے دیا جائے یا پھر موجودہ صورت حال کے پیشِ نظر اسے مابعد جدیدیت ہی کہا جائے یا پھر اس کے لیے کوئی اور بہتر نام تجویز کیا جائے۔

تاہم اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ واقعی پچھلے ایک ڈیڑھ دہائی میں ہمارے ادب میں کوئی پیش قدمی ہوئی ہے یا نہیں؟ میری نظر میں گزشتہ پندرہ سالوں کے درمیان جو بھی ادب ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی ہے جس کے پیشِ نظر ہم یہ دعویٰ کر سکیں کہ یہ بات آج سے چالیس سال قبل نہیں تھی۔ ہمارے شعراوادبا کی تخلیقات میں کم از کم موجودہ سائنسی ایجادات اور دریافتوں کا تھوڑا بہت ذکر فنکارانہ انداز میں آجائے تو غنیمت ہے مثلاً خلائی سفر مریخ اور مشتری پر کمنڈ ڈالنے کی کوشش کلوننگ وغیرہ)۔ ان باتوں کے علاوہ ہمارے معاشرے میں در آئی بے راہ روی اعلیٰ انسانی اقدار کی زوال آمادگی نیز روحانیت واخلاقیات سے ہمارے نوجوانوں کی بے رخی کا تذکرہ بھی اگر تخلیقی انداز سے کیا گیا تو وہی بہت کچھ ہے۔ بفرضِ محال اگر نئی نسل کے دو چار فنکاروں کے یہاں مذکورہ تمام باتیں مل بھی جائیں تو اسے اس دور کا عمومی رجحان نہیں کہا جائے گا جب تک یہ باتیں "بیشتر تخلیق کاروں" کے یہاں پائی نہ جائیں۔ اگر ایسا ہوا بھی تو اسے ہم ہرگز "مابعد جدیدیت" نہیں کہہ سکتے، بلکہ جدیدیت کا تسلسل ہی کہیں گے۔

اوپر جو بحث کی گئی ہے اس کا لُبِ لباب یہ ہے

(I) ادبی تنقید میں اردو کی اصطلاح "جدیدیت" انگریزی اصطلاح MODERNISM کی مساوی نہیں ہے۔

(II) اردو کی اصطلاح "جدیدیت" انگریزی اصطلاح POST MODERNISM سے قریب ہے۔

(III) لہٰذا ترقی پسندی MODERNISM مادہ پرستی کے سنہرے خواب سے

عبارت ہے۔اس کے تحت مرکزم بھی آتا ہے جبکہ POST-MODERNISM بے مایوسی اور بے معنی کا عنصر حاوی ہے۔

(iv) لہذا ترقی پسندی MODERNISM ہی کا حصہ ہے ، جبکہ ہماری جدیدیت POST MODERNISM ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

(v) مغربی ادب کو POST MODERNISM تک پہنچنے کے لیے کئی مختلف مدارج سے گزرنا پڑا جبکہ ہمارے ادب نے ایک ہی جست میں اس سطح تک رسائی حاصل کرلی ہے۔

(vi) ۶۰ء کے بعد ہمارے ادب کو یا تو جدیدیت سے تعبیر کیا جائے یا POST MODERNISM کے نام سے لیکن چونکہ اس کے لیے "جدیدیت" کا نام چل نکلا ہے اس لیے وہی نام رہنے دینا چاہیے۔

(vii) ۸۰ء کے بعد مجموعی طور پر کوئی ایسا ادبی یا ثقافتی تجربہ رونما نہیں ہوا جس کی وجہ سے اسے ۶۰ء کے بعد کی جدیدیت سے الگ کوئی نام دیا جائے۔

(viii) ہر دس بیس سال میں ایک پیڑھی آئے اور یہ دعویٰ کرے کہ ہم "مابعد جدیدیت ۲ (مابعد جدیدیت) ۳ (مابعد جدیدیت) ۴ (مابعد جدیدیت) ۵ (مابعد جدیدیت) سے تعلق رکھتے ہیں" بے معنی ہے۔

(ix) ۸۵ء کے بعد جس پیڑھی نے میدان ادب میں قدم رکھا ہے، اس نے اپنے پیش رووں کی ٹھوکروں سے سبق لیا ہے، لسانی شکست وریخت سے گریز کیا ہے اور اس کے اندر امید کی کرنیں پھر سے پھوٹنے لگی ہیں، ترقی پسندی اور سماجی کوائف کی طرف اس کا ذہن پھر سے مبذول ہوتا ہوا نظر آنے لگا ہے۔

(x) حالانکہ ترقی پسندی کی بازیافت کا رجحان ساتویں دہائی ہی میں پنپنے لگا تھا (جس کا ذکر اس وقت کرامت علی کرامت نے اپنی تصنیف افسانی تنقید (۱۹۷۷ء) میں کیا تھا) لیکن اب یہ رجحان واضح طور پر ہمارے سامنے آنے لگا ہے۔ اس اعتبار سے اس پیڑھی کو اپنے پیش رووں سے الگ کرنے کے لیے مابعد جدیدیت یا POST MODERNISM جیسے مخصوص نام سے منسوب کرنے کی بجائے کسی اور نام سے وابستہ کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ صورتِ حال جو بھی ہو، اسلوب اور شعری رنگ و آہنگ کے اعتبار سے اس نئی روش کو "جدیدیت" سے ہٹ کر کوئی الگ شے تصور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اسی جدیدیت کی ایک شاخ تصور کرنا چاہیے۔

اردو اکادمی، دہلی کی چند اہم مطبوعات

گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج دہلی۔ ۲

اردو مابعد جدیدیت: ایک مکالمہ
مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ
قیمت: ۱۸۰روپے، صفحات ۵۴۴

اٹل بہاری باجپئی کی نظمیں
پیش کش: اردو اکادمی، دہلی
قیمت: ۵۰روپے، صفحات: ۱۳۲

ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت اور کارنامے
مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ
قیمت: ۷۰روپے، صفحات ۲۳۲

میلوں لمبا پل
مصنف: راجی سیٹھ، قیمت: ۳۰روپے، صفحات: ۱۲۶

اس آباد خرابے میں
(خود نوشت سوانح عمری اخترالایمان)
قیمت: ۶۰روپے، صفحات ۲۴۴

زمستاں سرد مہری کا
اخترالایمان کا آخری مجموعہ کلام
قیمت: ۳۵روپے، صفحات ۱۲۸

فراق گورکھپوری: ذات و صفات
مرتب: مخمور سعیدی
قیمت: ۶۰روپے، صفحات: ۲۰۸

ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعرا
مرتبین: پروفیسر گوپی چند نارنگ، عبداللطیف اعظمی
قیمت: ۱۰۰روپے، صفحات ۷۱۴

کلیات مکاتیب اقبال (جلد چہارم)
مرتب: ڈاکٹر سید مظفر حسین برنی
قیمت: ۱۵۰روپے، صفحات ۱۲۰۸

مضامین نہرو
مرتب اور مترجم: آنند نرائن ملا
قیمت: ۳۰روپے، صفحات ۱۸۰

رسوم دہلی
مصنف: سید احمد دہلوی، مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم
قیمت: ۸۰روپے، صفحات ۲۰۸

واقعات دارالحکومت دہلی (تین جلدوں میں)
مصنف: مولوی بشیر الدین احمد قیمت: ۶۰۰روپے (مکمل سیٹ)
صفحات ۲۸۷۶ (دوسرا ایڈیشن)

ہندی اسلامی فن تعمیر (دو جلدوں میں)
مرتب: صہبا وحید، قیمت: ۳۰۰روپے، صفحات ۵۷۸

حواشی ابوالکلام آزاد
مرتب: سید مسیح الحسن، قیمت ۱۶۵روپے، صفحات ۵۷۹

عالم میں انتخاب دلی
مصنف: مہیشور دیال
قیمت: ۷۰روپے، صفحات ۱۵۲ (تیسرا ایڈیشن)

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین
مرتب: ڈاکٹر اسلم پرویز، قیمت: ۳۰۰روپے
صفحات ۲۷۵۰ (تیسرا ایڈیشن)

مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب
مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی، قیمت: ۳۱روپے، صفحات ۲۹۶

داغ دہلوی حیات اور کارنامے
مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی، قیمت: ۵۰روپے
صفحات ۲۳۷ (دوسرا ایڈیشن)

باقر مہدی

پہلی کتاب کا پہلا صفحہ

کون پڑھ پایا ہے
زندگانی کی۔ان لکھی۔ پہلی کتاب؟
کیسے سیکھے گا کوئی
زندہ رہنے کا چلن؟
کون معصوم ہے ظالم کی طرح
اور ناکردہ گناہی کی سزا کیا ہوگی؟

نام اور ذات -- بھلا کیسے ملے؟
مفت میں -- بھول ہوئی
پوچھ لیا ایک -- بے معنی سوال

"سچ کی بنیاد پہ جھگڑا کیوں ہے؟"
بٹ گئی -- ٹوٹ کے -- ٹکڑوں میں زمیں
اور کب دوست / دشمن سے الگ ہو کے رہے؟
پھر بھی دھرتی کے سبھی باسی ہیں
رنگ کچھ بھی ہو مگر ہم سب لوگ
ایک ہونے پہ -- نہیں راضی ہیں
زندگی -- موت کے سارے مسئلے

ایک بے نام سی جنگ
کب سے جاری ہے۔ خدا ہی جانے؟
عمر تو ساری تصادم میں کٹی ہے لیکن
زخم کھا کھا کے -- جیا مر نہ سکا؟
اور اب وقت دعاؤں کا نہیں
قہر ہی -- ایک پناہ گاہ ہے
دیکھیں کیا ہو۔؟

کے لیے

ڈاکٹر سید حامد حسین
۵۔ سلور لائن اپارٹمنٹس، اے سیکٹر
(بی ڈی اے) کوہ فضا بھوپال۔۱

چھے کی پھیلتی چھایا

"چھے" (۶) کے عدد کو مقبول بنانے میں علم و طلسم دونوں کا ہاتھ ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ قدرت نے انسان کے ہاتھ میں جو پانچ انگلیاں دیں تھیں اُن کو کام میں لیتے ہوئے شروع شروع میں انسان نے اپنے گننے کے کام کو پانچ تک محدود رکھا۔ چھے اور اس کے بعد عددوں سے اس نے اس وقت کام لینا شروع کیا جب اس کی ذہنی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا اور اس کے علمی مشاغل کی ابتدا ہوئی۔ جن چیزوں کو وہ اپنی عقل سے حل نہ کر سکا ان میں اس نے روحانی اور طلسمی مسائل سے وابستہ کر کے سمجھنا چاہا۔ چنانچہ "چھے" کے طلسمی پہلو نے بھی فروغ پایا۔

ایک ہاتھ کی پانچ انگلیوں نے تعداد کے لیے ایک طرح پانچ کی حد مقرر کردی تھی۔ چنانچہ قدیم انسان کے لیے پانچ سے تجاوز کرنا کبھی لامحدود کی علامت بنا تو کہیں وہ خلاف معمول (Abnormality) کا اظہار۔ آپ نے "کھٹ راگ" کا لفظ سنا ہوگا جس کا مطلب بے معنی یا بے سرا شور شرابہ ہوتا ہے۔ ایک طریقے سے پانچ راگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ چھٹا راگ وہ ہوا جو کوئی راگ نہیں، محض شور وغل ہے۔ ہندی میں "سازش" کے لیے "شڈ نیتر" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی "چھٹا ہتھیار" اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ایک ایسا ہتھیار جو پانچ معروف ہتھیاروں کے برخلاف ایک الگ ہی قسم کا ہتھیار ہو جس میں عقل کے زور پر دشمن کو شکست دینے کی تدبیر نکالی جائے۔

شکلوں اور سمتوں کے مشاہدے نے "چھے" کے شمار کے لیے ضروری گنجائش پیدا کی۔ انسان نے جب اپنے گردوپیش کو سمجھنے کی کوشش کی تو رفتہ رفتہ اس کو اس کا شعور بھی حاصل ہوا کہ اس کا صرف دایاں اور بایاں اور آگا اور پیچھا ہی نہیں بلکہ اس کے سر کے اوپر اور پیروں تلے کی بھی سمتیں ہیں۔ اس طرح شش جہت یعنی چھ سمتوں (شمال، جنوب، مشرق، مغرب، تحت اور فوق) کا علم ہوا۔ جب اس نے رات کے وقت

آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تو اسے لاتعداد ایسے ستاروں کے بیچ جو اپنی اپنی جگہ آسمان میں جڑے ہوئے تھے۔ چھے ایسے ستارے بھی نظر آئے جو چلتے تھے۔ چھے چلنے والے ستاروں یعنی سیاروں کا علم بہت پرانا ہے۔ سب سے پہلے مصریوں نے چاند' زہرہ' مشتری' مریخ' زحل اور عطارد کا شعور حاصل کیا اور ان میں سورج کو شامل کر کے اپنا نظام فلکی بنایا۔ ان سے یہ علم بابلیوں اور آشوریوں نے لیا اور اسے مزید فروغ دیا لیکن بابلیوں کی خاص دین شمار و پیمائش کے ایسے پیمانے تھے جو ساٹھ کی تعداد پر مبنی تھے۔

پیمائش کے علم کو مرتب کرنے کے دوران ایک اہم دریافت یہ تھی کہ دائرے کو اپنے نصف قطر (Radius) سے چھے برابر حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسے کچھ نے طلسم سمجھا اور اس کو روحانی اثرات کا حامل جانا اور کچھ نے اسے وقت' فاصلے اور دوسری قسم کی پیمائش کے لیے استعمال کیا۔ بعد میں جب وقت کی زیادہ باریک پیمائش کی مہارت پیدا ہوئی تو ایک گھنٹے کو ساٹھ منٹوں اور ہر منٹ کو ساٹھ سکنڈوں میں تقسیم کرنے کا رواج ہوا۔ زاویے کی پیمائش میں بھی ایسی ہی تقسیم کو اپنایا گیا اور جب نقشوں میں طول البلد اور عرض البلد کے ذریعے مقامات کے محل وقوع اور پھیلاؤ کو دکھانے کی ضرورت ہوئی تو اسی ساٹھ درجوں پر یعنی طریقۂ پیمائش سے مدد لی گئی اور اس وقت جب کہ دوسرے سارے پیمانے اعشاری نظام میں منتقل ہو چکے ہیں' وقت اور زاویے کی پیمائش میں یہ ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

چھے کے طلسمی اور روحانی اثرات کا اظہار بھی دنیا کے مختلف حصوں میں ملتا ہے۔ ہندو روحانی فلسفے میں بشش پہلو علامت کو روحانی تکوین کی ایک شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مشرق وسطی اور یوروپ میں چھے گوشہ ستارہ زمانۂ قدیم سے طلسمی طاقت کے حامل زیور کی حیثیت سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ سترہویں صدی سے اسے یہودیوں کی علامت کی حیثیت سے اپنایا گیا اور اسے ستارۂ داؤد یا مہر سلیمان کا نام دیا گیا۔ ستارۂ داؤد بعد میں اس حد تک یہودیوں کے ساتھ وابستہ ہو گیا کہ ۱۸۹۷ء میں اسے صیہونیت کی علامت کے طور پر تسلیم کیا گیا اور دوسری عالمی جنگ کے دوران ہٹلر نے اس نشان کو "شرم کے نشان" کی حیثیت سے ہر یہودی کو پہننے کے لیے مجبور کیا گیا۔ اسرائیلی حکومت کے وجود میں آنے کے بعد "ستارۂ داؤد" کو اسرائیل کے قومی جھنڈے پر جگہ دی گئی ہے۔

ہندو فلسفے میں چھے حواس مانے گئے۔ ان میں دیکھنے' سننے' سونگھنے' چکھنے اور چھو کر

محسوس کرنے کے پانچ حواس کے ساتھ ساتھ "من" یعنی ذہن بھی شامل ہے۔ اسی بنیاد پر کئی ہندی محاورے رائج ہیں۔ جیسے "چھکے چھڑانا" یعنی حریف کو ایسی شکست دینا کہ وہ ساری سدھ بدھ بھول جائے۔ "چھکے چھوٹنا" یعنی ہوش و حواس جاتے رہنا۔

اطبا نے ستہ ضروریہ یعنی انسانی صحت کے لیے چھے ضروری افعال کا ذکر کیا ہے۔ (انھیں شش ارکان بھی کہا جاتا ہے) یہ ہیں۔ (۱) ہوا (۲) کھانا پینا (۳) جسم کی حرکت اور سکون (۴) نفسیاتی حرکت و سکون (۵) نیند و بیداری اور (۶) پیشاب پاخانہ۔

ہندو راج کے مطابق برہمنوں کے لیے شٹ کرم (چھے فعل) نہایت ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ (۱) پڑھنا (۲) پڑھانا (۳) یگ کرنا (۴) یگ کرانا (۵) دان دینا (۶) دان لینا۔ چھے تیرتھ ایسے مانے جاتے ہیں جن کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا۔ (۱) بھگت تیرتھ 'دل موہ لینے والے دیوتا کی بھگتی (۲) گرو تیرتھ (۳) ماتا تیرتھ (۴) پتا تیرتھ (۵) پتی تیرتھ اور (۶) پتنی تیرتھ۔ ہندو فلسفہ میں چھے قسم کے نظریات کو اہمیت دی جاتی ہے (۱) نیائے۔ اس کو گوتم نے پیش کیا' (۲) ویشے شک۔ اس کو کناد نے پیش کیا (۳) سانکھیہ۔ اسے پیش کرنے والے سانکھیہ تھے (۴) یوگ جسے پتن جلی نے پیش کیا (۵) ما قبل میمانس جسے جیمنی نے پیش کیا اور (۶) ویدانت جسے داوراین نے جاری کیا۔ اسی طرح یہ مانا جاتا ہے کہ ماگھ مہینے میں شٹ تلا ایکادشی پر تلوں کو چھے طرح استعمال کرنے سے سارے جسمانی' ذہنی اور لفظی گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہ چھے طریقے ہیں (۱) تل ملے پانی سے غسل (۲) تلوں کا ابٹن (۳) تلوں کا ہون (۴) تل ملا پانی پینا (۵) تلوں کا دان اور (۶) تل کے لڈو کھانا۔

عمر کے معاملے میں بھی ساٹھ اور چھے کی خاص اہمیت ہے۔ ساٹھ سال پورے ہونے پر خاص تقریب منائی جاتی ہے اور پوجا ہوتی ہے۔ اسی طرح بچے کی پیدائش کے چھٹے دن زچہ کو نہلایا جاتا ہے اور خاص تقریب منائی جاتی ہے۔ اس موقع پر رشتہ داروں کی طرف سے تحفے تحائف پیش کیے جاتے ہیں۔ سید احمد دہلوی نے "رسوم دہلی" میں بتایا ہے کہ چھٹی بدھ یا پیر کے دن منانا خاص طور پر مبارک سمجھا جاتا ہے۔ بدھ کو اس لیے کہ بدھ کو مانا جاتا ہے کہ ہر کام سدھ ہوتا ہے اور پیر کو اس لیے کہ وہ پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم پیدائش ہے۔

چھٹی سے متعلق کئی محاورے رائج ہیں جیسے "چھٹی کا دودھ یاد لانا" یعنی اتنی مار پیٹ کرنا کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے سارے عیش بھول جائے۔ یاد رہے تو بس وہ

دودھ جواسے چھٹی کے دن اس کی ماں نے بہترین غذا کھا کر پلایا تھا۔ اسی طرح "چھٹی کا کھانا نکلنا" یعنی چھٹی کے دن جو غذائیں تیار ہوئی تھیں اور عیش و عشرت کا سامان ہوا تھا اس کے بدلے میں شدید زحمت میں پڑنا اور نہایت تکلیف اٹھانا۔ "چھٹی کا [illegible] کہلاتا تھا جس نے کبھی خود کچھ نہ کمایا ہو بلکہ اس کی چھٹی میں نانا کے گھر سے اس قدر دولت آئی ہو کہ اس نے عمر بھر عیش کیا ہو یعنی جو خاندانی امیر ہو۔

بعض کھیل پانسا یا کوڑیاں پھینک کر کھیلے جاتے ہیں۔ پانسے کے چھے پہلو ہوتے ہیں جن پر ایک سے چھے تک نشانات بنے رہتے ہیں۔ جب پانسا پھینکنے پر چھے آتا ہے تو اسے چھکا کہتے ہیں۔ چھکا چھے کوڑیوں کے چت پڑنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ چھکا سب سے بڑھیا داؤ ہوتا ہے اور بعض کھیلوں میں چھکا آنے کے بعد ایک داؤ اور ملتا ہے۔ جوا کھیلنے والے بعض اوقات چھکا لانے کے لیے بڑی چال بازی کرتے ہیں اور پانسا یا کوڑیاں ایسے پھینکتے ہیں کہ چھکا یا پنجا آئے۔ اس لیے "چھکے پنجے کرنا" کا مطلب چال بازی کرنا سمجھا جاتا ہے۔ اور "چھکے باز" کوئی عیار آدمی کہلاتا ہے۔ "چھکا پنجا بھولنا" سے مراد ہے کہ چھکا یا پنجا لانے کے لیے کیا چال چلی جاتی ہے وہ بھول جانا یعنی تدبیر کا کام نہ کرنا۔ یہی معنی "شش و پنج میں ہونا" کے ہیں۔ جو شخص اس ادھیڑ بن میں ہو کہ صحیح پانسا کیسے پڑے۔ اس کی فکر و تردد کو شش و پنج میں پڑنا کہتے ہیں۔ یہی مفہوم "ششدر ہونا" سے نکلتا ہے۔ اس سے دراصل چوسر کے کھیل کے چھے گھر مراد ہیں۔ یہ بازی دو تختوں پر کھیلی جاتی ہے جن میں سے ہر تختے پر بارہ بارہ گھروں میں سے چھے دائیں جانب اور چھے بائیں طرف واقع ہوتے ہیں۔ جب بازی تختے کے آخری گھر میں پہنچ کر بند ہو جاتی ہے تو کوئی حریف کی اجازت کے بغیر اپنی طرف کے چھے گھروں میں سے کسی گھر میں نہیں جا سکتی اور کھلاڑی عاجز و حیران ہو جاتا ہے۔ اب چوسر کا کھیل پہلے کی طرح مقبول نہیں رہا لیکن چھکے کی اصطلاح ابھی بھی تاش کے پتوں میں محفوظ ہے۔ کسی رنگ کی چھے بوٹیوں والے پتے کو چھکا کہا جاتا ہے۔

لمبی چوڑی گپیں ہانکنے کے لیے "چھکے چوکے مارنے" کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ محاورہ کرکٹ کے کھیل سے آیا ہے جہاں گیند کو بلے سے مار کر چار یا چھے رن کے لیے حد سے باہر پھینکا جاتا ہے اور رن روکنے والے کھلاڑی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کرکٹ کے کھیل میں کوئی گیند پھینکنے والا ایک سرے سے ایک بار میں چھے گیندوں کا اوور پھینکتا ہے۔ شروع میں پانچ گیندوں کا اوور رکھا جاتا تھا لیکن ایک گیند اور بڑھا کر اوور کی

گینڈوں کو دو دے تقسیم کیے جانے کے لائق بنالیا گیا۔

چھکڑی ایک بگھی سواری کی گاڑی کہلاتی تھی۔ شروع میں اس میں تیز رفتاری لانے کے لیے چھے گھوڑے جوتے جاتے تھے لیکن بعد میں اسے کھینچنے کے لیے صرف دو بیلوں یا دو ٹٹوؤں پر اکتفا کی جانے لگی۔ ایسی پالکی کو بھی چھکڑی کہا جاتا تھا جسے چھے کہار اٹھاتے تھے۔

"چھٹی حس" کی بات تو رہ ہی گئی۔ دیکھ کر سن کر سونگھ کر چکھ کر یا چھو کر محسوس کرنے کی پانچ صلاحیتوں کے بارے میں تو ہم جانتے ہی ہیں لیکن یہ مانا جاتا ہے کہ بعض افراد میں ان پانچ صلاحیتوں سے بالاتر بھی ایک صلاحیت ہوتی ہے جس سے وہ ایسے محسوسات کا تجربہ کرتے ہیں جو پانچ صلاحیتوں کے دائرے میں نہیں آتیں۔ چھٹی حس کو ایک وجدانی صلاحیت کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے یہ ایک خاص قسم کی روحانی طاقت کی بھی مظہر ہوتی ہے۔

تخلیق کائنات کے سلسلے میں بھی چھے دن کا اکثر حوالہ ملتا ہے جیسے قرآن حکیم میں سورۂ اعراف (رکوع ۷) میں ذکر ہے ان ربّکمُ اللهُ الذی خلق السموات والارض فی ستّه ایام (درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا)۔ سورۂ یونس (رکوع ۱) میں بھی یہی ارشاد ہوا ہے۔ ان ربکم الله الذی خلق السموات والارض فی ستته ایام۔ سورہ ہود (رکوع ۱) میں پھر یہی فرمایا گیا ہے۔ وهو الذی خلق السموات والارض فی ستته ایام۔ سورۂ حدید (رکوع ۱) میں بھی یہی ارشاد الٰہی ہے۔ هو الذی خلق السموات والارض فی ستته ایام۔ سورۂ فرقان (رکوع ۵) میں یہ آیت شامل ہے۔ الذی خلق السموات وَالارض وما بینهما فی ستته ایام۔ سورۂ سجدہ (رکوع ۱) کی اس آیت میں بھی یہی مضمون ہے۔ الله الذی خلق السموات والارض وما بینهما فی ستته ایام۔ سورہ ق (رکوع ۳) میں فرمایا گیا ہے۔ ولقد خلقنا السموات والارض وما بینهما فی ستته ایام۔

انگریزی بائبل میں "اخراج" (Exodus) کے باب ۳۱ میں بھی یہی ذکر ہے کہ چھے دن میں خدا نے آسمان و زمین کو بنایا۔ اس طرح چھے دنوں کے عرصے کو نظام کائنات میں ایک خاص حیثیت دی گئی اور ہفتے میں چھے دن کام کے اور ایک دن کے آرام کا تصور عام ہوا۔

گنتی اور حساب کتاب میں چھے کو ایک مکمل عدد کی حیثیت حاصل ہوئی۔ شروع میں انسان تعداد کو آدھا یا دوگنا کرکے حساب لگاتا تھا جس کے لیے جفت (Even) اعداد بڑے کام کے تھے۔ لیکن جہاں تین سے تقسیم کرنے کی ضرورت پڑتی تھی وہاں بعض اوقات مشکل پیش آتی تھی۔ چنانچہ چھے کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ دو سے بھی تقسیم کیا جاسکتا تھا اور تین سے بھی۔ اسی سہولت کے مد نظر چھے سے تقسیم ہونے والے دوسرے عدد بھی مقبول ہوئے جیسے ۱۲، ۲۴، ۳۰، ۶۰ وغیرہ۔

قدرت نے بھی چھے کی افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ شہد کی مکھی شہد کا ذخیرہ کرنے کے لیے جو موم کے خلیے اپنے چھتے میں بناتی ہے وہ چھے گوشہ ہوتے ہیں۔ کم جگہ میں زیادہ گنجایش چھے گوشہ شکلوں کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے جہاں ایک خلیے کے چھے پہلوؤں میں سے ہر پہلو پر نئی چھے گوشہ شکل کھڑی کی جاسکتی ہے۔ قدرت نے شہد کی مکھی پر یہ راز منکشف کیا ہے اور وہ اپنے چھتے کو بنانے کے لیے ایک چھے گوشہ شکل کو مرکز بناکر ہر پہلو پر نئے نئے چھے گوشہ خلیے بناتی چلی جاتی ہے۔

ادب بھی چھے کے اثر سے اچھوتا نہیں۔ پچھلی ڈیڑھ صدی کے دوران جس صنف سخن نے اردو شاعری میں بڑی مقبولیت حاصل کی وہ چھے مصرعوں کے بندوں کی ہیئت مسدس رہی ہے۔ مرثیے کے زریں عہد کے دوران مسدس کی ہیئت مرثیے کے ساتھ مخصوص ہوگئی۔ بعد میں جب اردو شاعری نے انگریزی بیانیہ شاعری سے اثر قبول کیا تو مسدس کے وسیلے سے اظہار بیان کی نئی گنجایشیں دریافت کی گئیں۔ جہاں تک مسدس کے اشعار میں ترتیب قافیہ کا تعلق ہے پہلے یہ مانا جاتا تھا کہ پہلے بند میں چھے مصرعے ایک قافیے میں لکھے جائیں اور بعد کے بندوں میں پانچ مصرعے تو دوسرے قافیے میں لکھے جائیں اور چھٹا مصرع اسی قافیے میں ہو جو پہلے بند میں اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن سودا کے زمانے سے دوسرا طریقہ رواج میں آیا ہے۔ اس میں پہلے چار مصرعے ایک قافیے میں کہے جاتے ہیں اور بند کے باقی دو مصرعے جداگانہ قافیے میں ہوتے ہیں۔ یہی ترتیب نظم کے باقی بندوں میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ بند کے پانچویں اور چھٹے مصرعے بیت کہلاتے ہیں۔ بعض اوقات نظم کے سارے بندوں میں ایک ہی بیت سے کام چلایا جاتا ہے اور ایسی نظم ترجیع بند مسدس کہلاتی ہے۔

اس طرح چھے کی عملداری کئی میدانوں میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کا جادو کئی انداز میں ہم پر چل رہا ہے۔

امیر زہرا حسین

اردو کا ایک قدیم مخطوطہ

برٹش لائبریری کے نادر مخطوطات میں سے ایک مخطوطہ "پیم نیم" ہے جس کو برٹش میوزیم کے ایک حصے میں شیشے کی مقفل الماری کے اندر نمائش کے لیے رکھا گیا ہے اور ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔ سولھویں صدی عیسوی کی یہ تصنیف ۱۵۸۰ء اور ۱۵۸۸ء سے ۱۴۷۲ء ۔ ۳۴ھ علی عادل شاہ ثانی کے عہد کی ہے۔ عنوان "پیم نیم" (قانون محبت) ہے۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے جس کے اشعار کی تعداد چار ہزار سے بھی اوپر ہے۔ مثنوی کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علی عادل شاہ ثانی کے زمانے میں حسن منجو خلجی نامی شاعر کی تصنیف ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ مخطوطہ نادر ہے اور اس کی کوئی دوسری نقل نہیں ہے۔

"پیم نیم" کا سب سے پہلے تعارف بلوم ہارٹ نے کرایا۔ بلوم ہارٹ نے "پیم نیم" کو ہندی، پنجابی اور ہندستانی مخطوطات کی فہرست میں شامل کردیا تھا جس کی وجہ سے ہماری دکنی اردو کے محققین (نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر زور) کی نظر سے نہ گزرا۔ بلوم ہارٹ کا کام بلا شبہ بڑا ضخیم تھا۔ کیٹلاگ جلدی میں مرتب کیا گیا تھا اس لیے وہ اس غلطی کے لیے قابل معافی ہیں۔ بلوم ہارٹ نے اس کو "رتن سین اور پدمنی کی عشقیہ داستان" کہا ہے ایک شعر جس سے بلوم ہارٹ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہوگا اختلافیہ ہو سکتا ہے۔

نیم پہ استت شہ جی جان دھن کن ساگر رتن کہان

(ص ۴۲)

مخطوطے میں آخری لفظ کی کتابت "کہان" ہے جس کو بلوم ہارٹ نے "(رتن کہان)" ذہن میں رکھ کر "رتن" سے رتن سین اور کہان یا کہان" سے کہانی مراد لی ہو۔ "رتن کہان" کی ترکیب اس دور کی دوسری تصنیفات میں بھی ملتی ہے۔ یہ عام مروجہ

فقرہ ہے جس کا مطلب "ہیروں کی کان" ہے۔ شاعر اپنے ممدوح کے لئے جملہ اوصاف کے ساتھ ساتھ اسے ہیروں کی کھان بھی بتاتا ہے۔ "رتن کھان" کے معنی ہیروں کے مول کی کھانی بھی ہو سکتا ہے۔

"پیم نیم" سے متعلق یا تو کوئی معلومات ملتی نہیں یا پھر جو ملتی ہیں وہ غلط ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ چیزوں کی نشاندہی کی ہے جس کا ذکر ابراہیم عادل شاہ ثانی کی "کتاب نورس" اور عبدل کے "ابراہیم نامہ" مین بھی آیا ہے۔ موتی خاں (طنبورہ) اور آتش خاں (بادشاہ کا ہاتھی) کی مدح "پیم نیم" میں بھی ملتی ہے۔ ڈگلس بیرٹ۔۲ "بیجاپور کی پینٹنگس" کے بارے میں لکھتے ہیں وہاں موتی خاں اور آتش خاں کا بھی ذکر کیا ہے۔ موتی خاں کو ڈگلس بیرٹ طنبورہ کے بجائے "لکڑی کا آدمی" سمجھتے ہیں۔ "پیم نیم" کی ابتدا مین جہاں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تعریف ہے وہاں اس کے شہر "بیجاپور" اس کے ہاتھی "آتش خاں" اور طنبورے "موتی خاں" کا بھی تفصیلی بیان ہے۔

شاعر نے اپنے پیرو مرشد شاہ میراں جی شمس العشاق اور برہان الدین جانم کا بڑا عقیدتمندانہ ذکر کیا ہے۔ اپنا نام حسن منجھو خلجی تخلص بنس یا بنس شاہ بتایا ہے۔ تصنیف کا عنوان پیم نیم اور اس کے لکھنے کی تاریخ ۹۹۹ھ بیان کی ہے۔

اتنا جان پچھن کہیا کا سن حسن منجھو خلجی جان
بنس نام راکھیا پیم نیم آکھیا پڑھ کر مانگو کھ ہر دان
نو سو نیانوے بدہ سال ہجرت دیں گردن کسان
(ص ۸۔۳۶)

مخطوطہ نہایت نفیس، خوشخط اور دیدہ زیب مصوری سے آراستہ ہے جیسا کہ دکن میں قرون وسطی کے قلمی اور طلائی مخطوطات کی شان تھی۔ "پیم نیم" کے طلائی حاشیے جاندار رنگ، نفاست اور اہتمام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یقینی طور پر یہ شاہی سرپرستی میں اور شاہی کتب خانے کے لیے تیار کیا گیا ہوگا مگر اس کا اشارہ مخطوطے میں کہیں نہیں ملتا نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطاط کون ہے اور مصور کون ہے جس نے اس مصورانہ کمال کے ساتھ "پیم نیم" کی تشریح کی ہے۔

ابھی تک سب سے پہلا ادبی مرقع ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کا "ابراہیم نامہ"

تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اب " پیم نیم " کو اولیت کا شرف حاصل ہو گیا ہے۔ اسی طرح شہر بیجاپور کے لیے لفظ " بدیاپور " کا استعمال بھی پیم نیم میں پہلی مرتبہ ہوا۔

" پیم نیم " کی ایک خصوصیت اس کا " بارہ ماسہ " بھی ہے۔ ادبی اعتبار سے یہ اس مثنوی کی خوبی ہے ورنہ بیجاپور کی شاعری میں علی عادل شاہ کے بربن مخمس جس میں بارہ بند ہیں اس کے علاوہ کوئی دوسری روایت نہیں ملتی۔ " پیم نیم " میں " بارہ ماسہ " چھ سو سے زائد اشعار پر پھیلا ہوا ہے۔

سب سے بڑا مسئلہ مخطوطے کی زبان کا تھا اگرچہ یہ نہایت صاف خط میں لکھا ہے مگر جہاں کاتب نے زیادہ سے زیادہ حرکات مخطوطے کی خوشنمائی کے لیے صرف کی ہیں وہاں پڑھنے اور سمجھنے والے کے لیے ایک دشواری بھی پیدا کردی ہے۔ کہیں پر ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے صرف لفظوں کی موسیقی کا خیال رکھا ہے ان کے معنی کا نہیں۔ مثلاً

کرک کریجن کرری کرگت کاری کھن کھن کھر کھر کھرگت

(ص ۴۹)

" کتاب نورس " کی طرح پیم نیم کی زبان بھی اس وقت کی مروجہ دکنی سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ مشکل بھی ہے۔ اس میں قرآنی تلمیحات کے ساتھ ساتھ ہندو دیو مالا کے حوالے بھی ہیں۔

دکنی اردو کا یہ اسلوب مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں بھی نمایاں ہے۔ فن پارے کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ ماضی بن جائے اپنے عہد کے سیاسی، معاشی، ثقافتی اور ادبی عوامل کا آئینہ دار بن سکے۔ بلا شبہ " پیم نیم " ہماری قدیم دکنی اردو کا ایک نادر اور قیمتی سرمایہ ہے۔

۱۔ جی۔ ایف۔ بلوم ہارٹ
Catalogue of the Hindi, Panjabi and Hindustani Manuscripts No. 83, Add 1680 in the library of the B.M. 1899

2. Paintings from Islamic lands" P 138 ed R. pinder wilson Brune Cassires 1969 oxford.

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے۔

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کریں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت پندرہ روپے (Rs. 15/-) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون 80/- روپے ہے) صرف 75/- روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25% اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر 15% کمیشن دیا جائے گا۔ (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)۔

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جاسکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہوجانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کردیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کرسکتے ہیں۔

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ 202002

مسعود احمد برکاتی
ایڈیٹر ماہنامہ نونہال
ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی

خواجہ حسن نظامی

تصوف، ادب، صحافت، سیاست، تجارت، تبلیغ، تشہیر، تعلقات عامہ، تنظیم، تقریر، قدامت پرستی، جدت طرازی --- اگر آپ کو ان سب میدانوں کا کوئی مرد ڈھونڈنا ہو تو زیادہ تگ و دو کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ کو اپنے ہی زمانے میں ایک شخصیت مل جائے گی جس میں یہ اور ان کے علاوہ بہت سی خصوصیات جمع تھیں۔ جس نے ان میں سے اکثر صلاحیتوں کا استعمال کیا اور بعض کو تو اعلا درجے کا فن بنا دیا۔ اس شخصیت کو خواجہ حسن نظامی کہتے ہیں۔ شمس العلما خواجہ حسن نظامی دہلوی، خواجہ زادۂ حضرت نظام الدین اولیا۔ یہ وہ شمس العلما تھے جن کی باقاعدہ تعلیم بھی نہیں ہوئی تھی۔ بلاشبہ انھوں نے کئی علما سے کسب فیض کیا تھا، لیکن تکمیل انھوں نے خود زندگی کے استاد سے کی اور تعلیم سے زیادہ تربیت سے فیض پایا۔ غریب تھا یہ پوت اگر بے جوہر ہوتا تو دوسروں کی طرح در گاہ کا درویش بن کر رہ جاتا اور ہم آج اس کا نام بھی نہ جانتے۔

خواجہ حسن نظامی نے آنکھیں ایک بے وسیلہ گھر میں کھولیں اور لڑکپن بستی نظام الدین اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گزارا۔ اکثر بے خواب راتوں کا مزہ بھی چکھا، لیکن اپنی صلاحیتوں کا احساس جس کو ہو جائے اس کو کون آگے بڑھنے سے روک سکتا ہے۔ پھیری لگا کر کتابیں بیچنے والے خواجہ حسن نظامی نے بہت جلد کتابوں کے اندر بھی جھانکنا شروع کر دیا۔ جو آدمی کتاب کھولے اس پر دین و دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ آج خواجہ حسن نظامی کے جسمانی وجود کو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوئے ربع صدی سے زیادہ ہو چکی ہے، ان کی تجارت ختم ہو چکی ہے، انھوں نے جو مال و متاع فراہم کیا تھا، اس سے کسی کو سروکار نہیں رہا، ان کی پیری مریدی قصہ ماضی بن چکی ہے، ان کے تعلقات عام اور تعلقات خاص لوگوں کے حافظے سے محو ہونے شروع ہو گئے ہیں، لیکن ایک چیز ایسی ہے جو فراموش نہیں ہو سکتی، مٹائے نہیں مٹ سکتی اور وہ ہے ان کی تحریریں۔ خواجہ حسن نظامی اردو ادب کا ایک اہم عنوان ہیں۔ اردو زبان کا ایک معتبر اور مستند نام ہے۔

خواجہ صاحب نے ابتدا ہی سے قلم کی طاقت کا ادراک کر لیا تھا اور جب سے قلم پکڑنا سیکھا تھا اس وقت سے دمِ آخر تک قلم ہاتھ سے نہیں رکھا۔ اس سے کام لیا اور خوب لیا۔ اردو ادب کو کئی خوب صورت اور زندہ کتابیں دیں۔ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے تو اردو کا کوئی دوسرا مصنف ان کا حریف نہیں ہو سکتا۔ کئی سو چھوٹی بڑی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، ان میں سے متعدد ان کے قلم کے بجائے زبان سے نکلیں۔ اپنے اس جملے کی تفسیر بھی میں خود ہی کر دوں۔ مصروفیات بڑھنے اور وسائل حاصل ہونے کے بعد خواجہ صاحب نے بول کر لکھوانا شروع کر دیا تھا۔ ملا واحدی صاحب بتاتے تھے کہ صبح کی نماز کے بعد خواجہ صاحب بیٹھ جاتے تھے اور منشی کو لکھوانا شروع کر دیتے تھے۔ یہ منشی آج کل کے اسٹینو گرافر کے پیشرو تھے۔ ان کے منشی بے چارے مختصر نویس نہیں ہوتے تھے، لیکن زود نویسی کی مشق ضرور ہو جاتی ہوگی۔ خواجہ صاحب پہلے خطوط لکھواتے تھے اور اس کے بعد کوئی کتاب لکھوانا شروع کر دیتے تھے، یہاں تک کہ دوپہر ہو جاتی تھی اور منشی کی انگلیاں جواب دینا شروع کر دیتی تھیں۔ دیکھنے والے اس پر ترس کھا کر اس کو چھٹی دلوا دیتے تھے۔ اس دوران خواجہ صاحب کا کوئی ملاقاتی آ جاتا تو اس سے باتیں بھی کر لیتے۔ اگر آج ٹائپ رائٹر اور اسٹینو گرافر کے دور میں اس طرح املا یا ڈکٹیٹ کرائی ہوئی کتابوں کے تصنیف ہونے میں کوئی شبہ نہیں کرتا تو خواجہ صاحب کی یہ کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلی ہوئی کہی جائیں گی۔ واحدی صاحب نے خواجہ صاحب کی تصانیف کی تعداد لگ بھگ پانچ سو بتائی ہے۔

کتابوں کی یہ کثیر تعداد خواجہ صاحب کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ "خواجہ حسن نظامی" آج کے اہل تحقیق اور اہل تنقید کی توجہ سے تقریباً محروم ہی ہیں۔ بھلا کون پڑھے اتنی کتابیں! خواجہ صاحب دور اندیش آدمی تھے، لیکن ان کو بھی شاید اپنے بعد آنے والے نقادوں کی سہل انگاری کا اندازہ نہیں ہوا۔

کتابوں کے علاوہ رسائل بھی خواجہ صاحب کی تحریروں میں حصے دار تھے۔ کئی رسائل تو انھوں نے خود نکالے۔ "منادی" تو ان کے اسلحہ خانے کا سب سے مضبوط ہتھیار تھا۔ زود رنج تھے، اس لیے علامہ اقبال کے الفاظ "جلد آ جاتا ہے غصہ جلد من جاتا ہوں میں" کی تصویر تھے۔ مولانا محمد علی جوہر ہوں، سردار دیوان سنگھ مفتوں ہوں یا علامہ اقبال --- پیار اور ناچاقی کے دور سے سب گزرے۔ منادی کے جواب بھی نکلے اور خواجہ صاحب نے بھی جواب الجواب نکالے۔ خواجہ صاحب کا اشہب قلم رکتا نہیں تھا۔ محنت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ تھکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ملا واحدی نے کیا عمدہ بات لکھی ہے:

"ان (خواجہ صاحب) کا بس چلتا تو رات کا سونا بھی ترک کر دیتے۔ ان کے کاموں کو میں میر تقی میر اور مرزا غالب کے کلیات سے تشبیہ دیا کرتا ہوں۔ اتنا کام کرنے والے کے سارے کام ایک معیار پر نہیں اتر سکتے۔ جس طرح میر تقی اور مرزا غالب کا سارا کلام ویسا نہیں تھا جیسا ان کا منتخب کلام ہے۔ اسی طرح خواجہ صاحب کے کاموں کے کلیات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ انتخاب میں اس قدر کام باقی رہ جائے گا کہ عصر حاضر میں اس قدر کام کرنے کی مثال دستیاب نہیں ہوگی۔ خواجہ صاحب کو کام کرنے کا ہوکا تھا۔ چاہتے تھے کہ یہ بھی کرلوں اور وہ بھی کرلوں۔ خواجہ صاحب اسے نہیں سوچتے تھے کہ کون سا کام ان کے کرنے کا ہے اور کون سا ان کے کرنے کا نہیں ہے۔"

(میرے زمانے کے ولی)

"ملا واحدی نے ان چند الفاظ میں خواجہ حسن نظامی کی زندگی اور شخصیت کا ست نکال کر رکھ دیا ہے نصف صدی کی دوستی اور مریدی، لیکن واحدی صاحب معتقد ہونے کے باوجود بے بہرہ نہیں تھے۔ کم آمیز، کم گو تھے لیکن اتھلے نہیں تھے۔ کیڑے نکالنے کی عادت نہیں تھی، اعتراف و تعریف شیوہ تھا، لیکن نظر میں گہرائی تھی۔ ذرا یہ چند الفاظ اور ملاحظہ کیجیے:

خواجہ صاحب کو اپنے کام سے کام رہتا تھا۔ انھیں اس سے بحث نہیں تھی کہ کوئی کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ یہ وصف خواجہ صاحب نے آخری عمر میں کھو دیا تھا۔ آخر عمر میں وہ کانٹوں سے الجھنے لگے تھے۔ پہلے خواجہ صاحب کو دوسروں کے کانٹوں سے واسطہ تھا اور نہ پھولوں سے، دوسروں سے مقابلہ کرنے میں وقت نہ کھو کر خواجہ صاحب نے ترقی کی تھی اور دوسروں کے پھولوں میں نہ پھنس کر اس ترقی نے استحکام پایا تھا۔ پھولوں میں پھنسنے کے بجائے خواجہ صاحب کی توجہ کام کی طرف اور بڑھ جاتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پھول کام کی وجہ سے برسائے جاتے ہیں۔ میں کانٹا چھوڑ دوں گا تو پھول مجھے چھوڑ دیں گے۔"

(میرے زمانے کے ولی)

واحدی صاحب نے اس خوب صورتی کے ساتھ خواجہ حسن نظامی کا عکس پیش کیا ہے کہ دوسرا کوئی کیا کرے گا۔ مدح و قدح کیا مشکل کام ہے۔ تعریفوں کے پل باندھنے اور عیب چینی کے لیے زبان میں الفاظ کی کمی نہیں، لیکن احساس ذمہ داری، توازن اور صداقت کے ساتھ کسی شخصیت کو تاریخ کے حوالے کرنا نہایت شریفانہ کام ہے۔ اگر کسی شخصیت کی محبت معاشرے کی محبت پر غالب نہ آنے تو یہ شرافت کی نہایت بلند سطح ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ واحدی صاحب، خواجہ صاحب کے مداح، معتقد اور مرید تھے، بلکہ اگر ایک لفظ میں واحدی صاحب کے تعلق کو بیان کرنا ہو تو ان کو شاگرد کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ خواجہ صاحب کی سب سے پہلی سوانح عمری واحدی صاحب نے لکھی، جواب تک واحد ہونے کا شرف بھی رکھتی ہے۔ اس کتاب کے لفظ لفظ سے خواجہ صاحب کی محبت پھوٹی پڑتی ہے۔ واحدی صاحب نے خواجہ صاحب کی زندگی کو موجودہ دور میں ایک طرح سے نمونہ بنا کر پیش کیا ہے اور پھر زبان کا جو حسن اور معیار واحدی صاحب کے ہاں تھا اس کی تو اب کوئی مثال ہی نہیں مل سکتی۔ خواجہ صاحب کی زبان کی لوگ مثالیں دیا کرتے ہیں اور بالکل صحیح دیتے ہیں۔ جو عبور دلی کی ٹکسالی زبان پر ان کو تھا وہ کتنوں کو ہوگا۔ مولانا حسرت موہانی، خواجہ صاحب کو نثر کا شاعر کہتے تھے۔ ہزاروں لوگ تو صرف خواجہ صاحب کی البیلی تحریری کے شیدا تھے، لیکن میری طالب علمانہ رائے میں ملا واحدی کی زبان میں جو سلاست، نفاست، صحت، سادگی اور شائستگی و شرافت ہے اس کا مقابلہ خواجہ صاحب کی زبان بھی نہیں کر سکتی۔ ایک بار میں نے جرات کی کہ یہ خیال واحدی صاحب کے سامنے بھی ظاہر کر دیا۔ واحدی صاحب اس سے خوش نہیں ہوئے بلکہ منہ کچھ برا سا بنایا۔ اور جسے ہڑبڑانا کہتے ہیں نا، وہ کیفیت ان کی ہوئی۔ میں صرف یہ الفاظ سن سکا کہ "میری زبان خواجہ صاحب کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے۔"

خواجہ حسن نظامی کے آخری زمانے کی ایک کتاب "یادِ ہم درد" ہے جو ۱۹۵۰ء میں خود خواجہ صاحب نے شائع کی تھی۔ یہ بڑی دل چسپ کتاب ہے۔ اس میں پونے دو سو افراد کا تذکرہ ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جن کی ترقی اور خوبی کی وجہ مادری تربیت ہے۔ اس میں مشاہیر کے علاوہ عام اور بے نام لوگوں کے حالات بھی ہیں۔ حالات مختصر ہونے کے باوجود شخصیت کی پوری تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس کا نیا ایڈیشن حکیم محمد سعید صاحب نے اپنے پیش لفظ کے ساتھ حال ہی میں شائع کیا ہے۔

خواجہ صاحب کی اس کتاب میں ہمدرد برادران کا ذکر بھی بڑا دل چسپ ہے۔ لکھتے ہیں:

"دواخانہ ہمدرد کے مالک اور بانی حافظ عبدالمجید صاحب کی اولاد ایسی لائق پیدا ہوئی کہ نہ کبھی میں نے ان کو تھیٹر اور سینما میں دیکھا نہ کبھی سگرٹ پیتے اور پان کھاتے دیکھا۔ حالانکہ میں پیرزادوں کے خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود تھیٹر بھی دیکھتا ہوں، سینما بھی دیکھتا ہوں اور پان بھی کھاتا ہوں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ حکیم عبدالحمید کی ترقی اور کامیابی اور نیک چلنی اچھی صحبت اور ماں باپ کی اچھی تربیت کی وجہ سے ہے۔"

آگے چل کر مادر ہمدرد یعنی رابعہ بیگم حکیم عبدالمجید صاحب مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مادر ہمدرد کی ابتدائی زندگی صدیوں پہلے کی مشہور خواتین کی سی زندگی تھی۔" اس کے بعد خواجہ صاحب ان کی اولاد کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مادر ہمدرد کو آخری فرزند عطا ہوئے تو محمد سعید نام رکھا گیا، جو حکیم بھی ہیں، حاجی بھی ہیں اور حافظ بھی ہیں اور کمالاتِ طب یونانی کے علاوہ ویدک اور ڈاکٹری بھی خوب جانتے ہیں۔"

خواجہ حسن نظامی بڑے گھرانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن ترقی کرنے اور نام پیدا کرنے کے لیے جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے وہ لے کر پیدا ہوئے تھے اور ان صفات کو پروان چڑھانے میں خواجہ صاحب نے بے پناہ محنت کی۔ اگر ایک جملے میں خواجہ حسن نظامی کو بیان کرنا ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ "زبردست" آدمی تھے۔ وہ اپنی زندگی میں ایک متنازعہ شخصیت ہونے کے باوجود نہایت باثر، کامیاب اور مقبول انسان تھے۔

ظ۔ انصاری (مرحوم)

مصرعہ اُولیٰ

شجاع خاور غالباً قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور بیان کے ترچھے' البیلے' چونکا دینے والے اور بعض اوقات کچو کے دینے والے انداز سے یوں داد شجاعت دیتے ہیں گویا شعری مردانگی کے ہاتھوں وہ ہر ہفتے ایک دیوان یا دیوان زادہ خلقِ خدا کے حوالے کردیں گے مگر جب آگے پڑھیے' دوبارہ' سہ بارہ پڑھیے تو کھلتا ہے کہ اس نسبتاً کم عمر میں جہاں دیدہ لوگوں جیسی تجربے کی رنگا رنگی اور گہرائی' ڈیرہ دار استادوں کی سی مشاقی' کھلنڈرے نوجوانوں کی سی بے باکی اور ایک قلندر کی "بر پاپوشِ قلندر" والی بے نیازی ان کی شخصیت میں ایسی رچی بسی ہے کہ اکثر شعر ان پر وارد ہوتا ہے اور ان سے صادر ہوتا ہے۔ ان کا کام تخیل کی پرواز کو لفظوں کے کنٹرول میں لاتے وقت بس اتنا ہی رہ جاتا ہے جتنا خلا باز کا' خلائی پرواز کے وقت یہاں وہاں کوئی ڈھبری کس دی۔" رموٹ کنٹرول" سے پیغام وصول کرلیا۔ کمپیوٹر کا کوئی بٹن دبا دیا اور کانوں پر سے ہیڈ فون اتار کر ذرا ہنس بول لیے۔

مجھے یقین ہوگیا ہے کہ وہ کاموں اور مصروفیتوں کے ہجوم میں رہ کر کاغذ کے [illegible] پرچوں پر کوئی ردیف۔ کوئی قافیہ کوئی ناہموار سی زمین نوٹ کر لیتے ہیں اور جب [illegible] ورق کو پھر کھولتے ہیں۔ تو پوری غزل کاغذ پر اترتی چلی آتی ہے لیکن ان کے مشاہدوں [illegible] اتنی رنگا رنگی ہے' ان کی روح میں اس قدر بے قراری بھری ہے' "الفاظ اور تراکیب [illegible] مجرموں کی طرح دست بستہ یوں ان کے حضور کھڑے رہتے ہیں کہ بے اختیار ان کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے اور وہ جسے اور جس قدر چاہتے ہیں لفظوں میں بند کردیتے ہیں اور کبھی تو قلم کو بھرے ریوالور کی طرح داغتے چلے جاتے ہیں۔ چند تجربے اور ان کے نقوش کو تو انھوں نے اتنی بار نشانہ بنایا ہے کہ چھلنی کر ڈالا ہے مثلاً رقیب کی چالبازی' دوست نما دشمن کی حرمزدگی' ریاکاری کے خوشنما پیکروں کی دلفریبی' ٹکسالی اداروں کی آبرومندی۔

آج تک ہم نے ان کی صورت نہیں دیکھی' آواز سُنی تو فون پر سُنی۔ کلام دیکھا تو ادھر ادھر' کبھی کبھار' مگر جب پہلی بار آج سے کوئی پندرہ بیس برس پہلے چند نظمیں

غزلیں پڑھی تھیں تو چونک اٹھے تھے کہ اگر اس نونہال کو بھیڑیے نہ اٹھا لے گئے تو ایسا رنگ روپ نکالے گا ایسے نباہ کے در کھلے ملنے کا ایسا جیتا جاگتا طربیہ ترنم پھیلائے گا جو کسی خاص دور اور کسی ترقی یافتہ زبان کی تندرستی کی علامت ہوا کرتا ہے اور جس علامت یا آثار سے آج کل کی ہماری اردو شاعری محروم چل رہی ہے۔

☆

شاعری کبھی بات کا پردہ ہوتی ہے کبھی حالات کی پردہ دری ——

شجاعؔ نے "اپنے کلام میں (۱۰۰ سے اوپر غزلوں کے اس مجموعہ میں اس سے پہلے "دیوان" میں اور اس سے بھی پہلے نظم و نثر کی تحریروں میں) بالارادہ اور بلا ارادہ خود کو اس قدر ظاہر کر چکے ہیں کہ انھیں ذاتی طور سے جانے بغیر بھی موٹے لفظوں میں یا دو گرافی مرتب کی جاسکتی ہے۔ یوں سامنے سے دیکھو تو لفظوں کا مزا ہے، قافیوں کی چمک ہے، ردیفوں کی چٹکیاں اور چہلیں ہیں، لیکن اچانک آپ ٹھٹکتے ہیں اور سوچ میں پڑتے ہیں کہ بظاہر سامنے کی بات اتنی سامنے کی بھی نہیں ہے، اس تجربے سے آپ گزر سے ہیں، عملی ورنہ خیالی زندگی میں —— یا کسی اور کے افسانے میں سن یا پڑھ چکے ہیں، فورا کوئی شعر یا مصرعہ پھانس کی طرح یاد داشت میں کھٹکنے لگتا ہے اور بے خیالی میں پڑھا ہوا شعر پلٹ کر پھر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ دو ایک مثالیں:

ذہن کو حالانکہ پختہ کردیا ہے تجربوں نے　　باوجود اس کے مری آنکھوں کی حیرانی وہی ہے

بازار میں ہر شخص قصیدے کا طلب گار　　ہم ہیں کہ لیے پھرتے ہیں اشعار غزل کے

جیسا منظر ملے گوارا کر　　تبصرے چھوڑ دے نظارا کر

وصل کس کو نصیب ہوتا ہے　　داغؔ کے شعر پہ گزارا کر

ڈوبنے سے فائدہ بھی ہوگا اور نقصان بھی　　ذہن سے طوفان باتھوں سے کنارہ جائے گا

بظاہر یہ سپاٹ کلامِ موزوں ہے لیکن وہ آنکھیں جن کی حیرانی تجربوں کی پختگی سے پگھل کر بہہ نہیں گئی —— وہ آنکھیں ان اشعار کی سادگی پر اور تہہ داری پر حیران ہوں گی۔ ان میں زندگی کے ساتھ بچوں کا سا معصومانہ برتاؤ اور جوانوں کا سا عملی حوصلہ نظر آئے گا —— "گوارا کر" مجموعے کے ہر ورق سے اس بیان کی تصدیق ہوگی۔

کیا شجاع خاور لمحہ حاضر کا شاعر ہے؟ ماضی سے بے زار، مستقبل سے بے پروا؟ کیا شجاع خاور ایک ایسے خوش باش نوجوان کا روپ دھارے رہتا ہے جسے ہر وقت مصاحب اور ہم نشیں میسر ہیں؟ جب دیکھو وہ اس طرح زبان کھولتا ہے جیسے سامنے والے سے کچھ کہنا ہے، کوئی تبصرہ، کوئی حاشیہ، کوئی ریمارک اہل محفل کو یا مشتاق سننے والے کو جتاتا ہے؟ ــــــ کیا شجاع خاور لفظوں اور استعاروں، علامتوں اور محاوروں پر اپنی گرفت یا چابک دستی دکھانے اور منوانے کی خاطر بعض شعر نکالتا ہے؟ کیا اس نے غزل کی بعض ایسی زمینیں خصوصیت سے چنی ہیں جن میں لگے "مر زبان" بل نہیں چلا گئے؟ مثلاً

بس ہونے والا ہے دھاکا دیکھیے	اب قہر بھی میرے خدا کا دیکھیے
آؤ میری چارپائی کا شکستہ بان دیکھو	کیسے تنہائی کے ہاتھوں لٹ گیا انسان، دیکھو
غزل کے شعر کہہ کے یوں ہی کر رہے ہیں غم غلط	صحیح بات تو یہ ہے کہ تم غلط نہ ہم غلط
حالانکہ اس میں ہو گئے دل کے مریض ہم	رکھتے ہیں اپنے خوابوں کو اب تک عزیز ہم
غم کو سمجھ رہے تھے چھپانے کی چیز ہم	اس کے بیان سے ہوئے ہر دل عزیز ہم
ہم نے اک گھر شہر کے اندر لیا ہے	دشت گردی کا ارادہ کر لیا ہے
یہ تو تجھ سے چھوٹ جانے پر لیا ہے	اپنے ذمے کار دنیا ہم نہ لیتے

کیا شجاع خاور کسی غزل میں بھی اپنے اندر گم نہیں ہونے پاتا؟ اپنے گرد و پیش سے بے خبر، اصل موضوع یا خیال میں گم، اوروں کے وجود اور ان کے ری ایکشن سے بے خبر ــــــ گم شدہ؟ ــــــ کبھی نہیں! جب دیکھو کسی نہ کسی سے بات ہو رہی ہے، بے تکلفی برتی جارہی ہے، ارے میاں (لالہ)، بھائی، دوستو، میاں، ارے صاحب قسم کے خطابیہ الفاظ جو یقیناً بھرتی کے نہیں ہوتے (جیسے چار پائی کی چول میں ــــ میخ ٹھونک دیتے ہیں) ــــــ جہاں وہ آتے ہیں ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ انھیں یہیں ہونا چاہیے تھا:

اور اس پہ یہ اندازِ لالہ کون سنے گا	موضوع بھی یوں کون سا اچھا ہے ہمارا
اشعار سے کیا دنیا بدلے گی؟ لالہ چھوڑو	کون آپ کی باتوں میں آئے گا شجاع صاحب

یہ اور ایسے ہی چند سوال اس مجموعے کی ورق گردانی کرتے وقت ابھرتے ہیں اور صاف کہوں کہ خود یہ کلام ان سوالات کے اٹھانے کا ذمہ دار ہے، اسی لیے تائید بھی،

ہوجاتی ہے — مگر یہ معاملے کا ایک پہلو ہوا معاملے کا دوسرا پہلو "اسی چھوڑو" والی سادہ سی بے تکلف سی غزل میں یوں ابھرتا ہے:

تاریخ کی خاطر بھی دو ایک نشاں چھوڑو — اندر ہی جلو لیکن باہر تو دھواں چھوڑو
کہتے ہیں کہ تب آتا جب آہ و فغاں چھوڑو — اس بزم میں جاؤ تو اس دل کو کہاں چھوڑو
ہر بات کہو کھل کر ذو معنی زباں چھوڑو — یا کعبے سے منہ پھیرو یا کوئے بتاں چھوڑو
اظہار کی خوبی کا اس پر نہ اثر ہوگا — ملنے کا سبب ڈھونڈو فرقت کا بیاں چھوڑو

یہ اس شاعر کا نمائندہ رنگ ہے۔ اوپر سے دیکھو تو خواہ مخواہ — اندر جھانکو تو ایک جہاں دیدہ، مردم گزیدہ اور سرد و گرم چشیدہ شخص کے 'ملفوظات' کا مزہ پائیے۔ ہر غزل میں چٹخارہ زبان و محاورے کا، ویسا نہیں جیسے دہلی اسکول کے شاہ نصیر و شیخ ابراہیم ذوق کے ہاں تھا، نہ ویسا جو داغ اسکول کی پہچان ہے، ویسا بھی نہیں جیسا بعض جدید غزل گویوں اور غزل گروں نے چند گنی چنی علامتوں کو نچوڑ کر، اجنبی اور تازہ ولایت اصطلاحیں بگھار کر ڈالا تھا اور اشتہار کر دیا تھا کہ جدید غزل نے غزل میں روح تازہ ڈال کر اس کی آبرو رکھ لی ہے، یہ اگلوں سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ ان سو سے اوپر غزلوں میں وہ سارے مسالے بھی پڑے ضرور ہیں۔ ریت، پتھر، صحرا، کنکر، روٹی، شعور، شہر، اجنبی، سبھی کچھ ہے۔ قافیہ بندی بھی کہیں کہیں تو کمال کی ہے جس کی داد "لکیر پیٹا کر" والے شاہ نصیر بھی دیتے لیکن ایک صفت جو اس کلام کو بیک وقت کلاسیکی، موڈرن اور انفرادی بناتی ہے — وہ ہے شاعر کا شاعرانہ خلوص، جسے فن کارانہ صداقت بھی کہہ سکتے ہیں۔ شجاع خاور کو اردو کے کلاسیکی سرمائے پر خوب عبور ہے، وہ اگلوں کے لہجے میں بات کرنے کو نہ نقالی سمجھتا ہے نہ اس سے شرماتا ہے، وہ عہدِ حاضر کے رنگ سخن سے اور ٹھوس بات کو ٹھوس لفظوں میں کہنے سے نہ جھجکتا ہے، نہ اسی کو اپنی شناخت بناتا ہے، نہ وہ نثری جملوں کی موزونیت کو شعر سے کاٹ کر نکالتا ہے اور نہ لفظوں کی ذات برادری پوچھتا ہے۔ قدرت کلام اور فنی مشاقی اس کلام کی مقدار سے نہیں، اس صفت سے ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں کوئی استعارہ یا اظہار جبہ و دستار پہنے بڑے تکلف سے جلوہ افروز ہے، وہیں ایک جاٹ اپنا پگڑ جمائے بیٹھا ہے — اور دونوں پہلو بہ پہلو ہیں اور دونوں کی یکجائی شاعری کی فن کاری میں سرکشی کو ابھار کر دکھاتی ہے۔ یہ جدت بھی ہے ندرت بھی ہے، شاعری کی شناخت بھی ہے اور اس کے شاعرانہ حوصلے کا کارنامہ بھی جو رائگاں نہیں جائے گا، اپنے ماننے والے پیدا

کرکے رہے گی دو ایک مثالیں:

پار اترنے کے لیے تو خیر بالکل چاہیے　　بیچ دریا ڈوبنا بھی ہو تو اک پل چاہیے

شخصیت میں اپنی وہ پہلی سی گہرائی نہیں　　پھر تری جانب سے تھوڑا سا تغافل چاہیے

جن کو قدرت ہے تخیل پر انھیں دکھتا نہیں　　جن کی آنکھیں ٹھیک ہیں ان کو تخیل چاہیے

نقاد تم کو پوچھتے آئے تھے کل شجاع　　کہتے تھے شاعروں میں تمھارا بھی نام ہے

شاعری میں گفتگو کے لفظ ہم لائے، مگر　　پھول جو اصلی تھے مصنوعی لگے گلدان میں

آپ کا انداز رہنا چاہیے تھا آپ تک　　غیر بھی کرتا ہے گستاخی ہماری شان میں

شدتِ تنہائی کی تاریخ گویا دفن ہے　　میری تنہا چارپائی کے شکستہ بان میں

شجاع خاور جیسے ہمہ وقت 'واحد متکلم' کی زبان سے بار بار تنہائی کا لفظ اول اول کھٹکتا ہے آخر آخر لو کی طرح معنی دینے لگتا ہے — اس پر دھیان جاتا ہے۔ یہاں وہ اس طرح سے نہیں جیسے ریاض خیر آبادی جیسے ہوش مند اور پارسا کے کلام میں خمریات کا چرچا، بلکہ اس کے پس پردہ کہیں تنہائی کا درد، لذت اور تنہائی کا خوف ملا جلا ہے۔ یہ صرف جسمانی تنہائی یا ایک جلوت پسند کی خلوت نہیں بلکہ اس کے سوا کچھ اور بھی ہے — ذہنی خلوت، عالم بے رفاقت، پانچ غزلیں تو 'مسلسل تنہائی' کی ردیف کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ ایک بار میں شاعر کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ اس لفظ سے ذاتی برتاؤ جتانا چاہتا ہے، پہلو بدل بدل کر اپنے سننے پڑھنے والے کو اس کیفیتِ تنہائی کے مختلف پہلوؤں سے باخبر کرنا چاہتا ہے۔ تبھی تو کہتا ہے:

شجاع اس کو سمجھتے ہیں آپ ہی، ورنہ　　کسے نصیب نہیں ہے جناب تنہائی!

اور بولی کے موٹے روز مرہ کے ساتھ ملاحظہ ہو:

جہاں پہ سلسلہ بنتا ہے کچھ رفاقت کا　　نکالتی ہے وہیں آرجار تنہائی!

اور یہ نکتہ:

عذابِ جاں بھی جہاں میں نہیں کوئی ایسا　　رفیق بھی ہے بڑی بے مثال تنہائی

اگر چہ شہر میں بکھری ہے جا بجا، پھر بھی　　شجاع اپنے لیے گھر میں پال تنہائی

میاں شجاع یہ خاموشی تھوڑی دیر کی ہے　　ابھی سنائے گی قصے ہزار ہا تنہائی

عقب میں اس کے خیالوں کا قافلہ ہے شجاع　　ہجومِ غم کی ہے گویا نقیب تنہائی

شجاع خاور کے اس کلام میں ہم اس فن کار سے اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں جو ہمہ وقت "واحد متکلم" رہنے کے باوجود اندر سے بڑا تنہا ہے اور جس نے تنہائی کی نوحہ گری نہیں کی، اسے پال لیا، اپنا لیا، اس سے کام لیا، ادب اور فلسفے کی کتابوں نے جو شعور بخشا ہوگا اسے ذاتی غور وفکر کی بھٹی میں ڈالا اور اس سے ایک لہجہ ڈھالا۔ وہ لہجہ جو دہلی کے لال کنویں کے کرخندار سے جے این یو کے سیمینار تک بل کھاتا لہراتا چلا گیا ہے۔ کوئی شخص جسے لفظ و معنی پر ماہرانہ قابو نہ ہو جس نے اصولوں اور فارمولوں کو اپنے طور پر جانچا پرکھا نہ ہو اور جسے پھکڑپن کی پھبتی سننے سے عار آتا ہو، وہ یہ شاعرانہ جرأت نہیں کرے گا جو "مصرعہ ثانی" میں ہر ایک صفحے پر بکھری ہوئی ہے۔۔۔ یہ شاعر آمدو آورد، فن کاری اور استادی، غزل اور ہزل، مصنوعی تکلفات کے پوز، خود سازی کے آداب اور بے تکلفانہ جملہ بازی کا فرق خوب سمجھتا ہے مگر اس نے بے تکلفی کی بات چیت کو، جو مصرعوں کے بجائے نثری جملوں کی ساخت رکھتی ہے خاص اس غرض سے اختیار کیا ہوگا کہ اظہار کا حسن میکس فیکٹر کی مہربانی سے آزاد رہے، اس نے بھکو، کلو جیسے قافیے اور الفاظ ادبی ذوق رکھنے والوں کو چونکانے کے لیے نہیں، مہذب محفلوں کے چٹکی بھرنے کے لیے اور سستی شہرت کمانے کی خاطر نہیں اپنائے بلکہ کچھ تو اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں اور بیشتر اس نیت سے یہ لب و لہجہ اور انتخاب الفاظ اختیار کیا ہے کہ جب وہ "نبدِ یبائی" یا اپنا امیج بنانے اور جھنڈے پر چڑھنے اور چڑھانے والوں کی پگڑی اچھالے، ان پر پھبتی کسے تو یہ بنے ہوئے لوگ اسے ایک بھکو کہہ کر اپنا جی ٹھنڈا کرلیں۔ وہ تو شاعر سے ظاہرا درگزر کریں مگر اس کا بھکوپن ان پر چپک جائے، جان کا لاگو ہو جائے۔

قلم نے خوب غزل گوئی کی شجاع، مگر　　غزل سرائی نہیں کر سکا گلا میرا

کب تلک خود ہی نکالو گے شجاع اچھی زمینیں　　ایک دن تم بھی کسی استاد کا دیوان دیکھو

شعر پر تو آپ کی قدرت مسلم ہے شجاع　　اس زمانے کا بھی کچھ اچھا برا معلوم ہے؟

صرف تھوڑی سی سخن فہمی اگر دے دے خدا　　زندگی کا لطف غالب کی طرفداری میں ہے

نام جس کا پڑگیا ہے خواب کی بستی شجاع وہ علاقہ آج کل اپنی عملداری میں ہے

چرچا حقیقتوں کا بہت ہوچکا شجاع گلفام اورپری کی کہانی سنایئے

لیکن شجاع خاور کے کلام میں کہیں بھی گلفام اور پری کی کہانی نہیں ہے' نہ وہ اس کام کے آدمی ہیں۔ البتہ ایسی کہانی سنانے کے لیے پریوں کے جس دیس میں آمد ورفت ضروری ہے وہ انھوں نے ضرور رکھی ہوگی اور جیسی لوچ دار' نمکین' چٹپٹی زبان درکار ہے وہ ان کے پاس وافر مقدار میں ہے اور اس کا زبردست اسٹاک ہے۔ ان کے تازہ پیشے کی مصروفیات اورماحول نے بھی ان سے بعض اشعار کہلوائے ہیں (جو ہماری رائے میں قابل تعریف ہے) وہ شعر میں گفتگو کی اور عام سے محاورے میں فلسفے کی جوٹ ملا دیتے ہیں ــــ وہ خاص انھی کا صدری نسخہ ہے۔ اب تک کسی کے ہاتھ نہیں لگا مگر وہ شے جو خود شجاع خاور کے ہاتھ نہیں لگی' وہ استادی گر آسانی سے نصیب نہیں ہوتا۔ شجاع خاور جیسی قدرتِ کلام کا شاعر جب موج میں ہو اور الفاظ و استعارات کے گھوڑے پر چڑھے تو بعض اوقات وہ راکب نہیں مرکب ہوجاتا ہے۔ باگ پر ہاتھ اور رکاب میں پاؤں شاعر کا نہیں' اس کی سواری کا ہوتا ہے اور دیکھنے والوں کو یہ طرفہ تماشا بھی خوب لطف دیتا ہے:

آب؟ وہ آئی جو چہرے پر عدو کے بعدِ وصل اور پانی؟ وہ جو میری آرزوؤں پر پھرا

ویسے ہر غزل میں ایک دو ایسے شعر ضرور ملیں گے جو خاص اس شاعر کی ترجمانی یا نمایندگی کرنے والے ہوں لیکن بعض غزلیں کی غزلیں شجاع خاور کے رنگِ سخن میں رنگی ہوئی اور اپنے اسی عہد کی' اس کے شعری تجربے کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ پوری غزل جس کا مطلع ہے:

اس اعتبار سے بے انتہا ضروری ہے پکارنے کے لیے اک خدا ضروری ہے

اور مقطع تو بس وہی کہہ سکتے تھے:

شجاع موت سے پہلے ضرور جی لینا یہ کام بھول نہ جانا' بڑا ضروری ہے

ان کے بزرگوں اورمعاصرین میں کسی نے یہ باتیں اس ڈھب سے نہیں کہی تھیں' خیر آیندہ کہی جائیں گی۔

☆☆☆

مراٹھی کہانی

مدھو منگیش کرنک

ترجمہ۔ نور پرکار

پڑوسن ٹھمکرن کے ساتھ پچھلی رات تک اگلے دن کے بازار سے متعلق گفتگو کرتی ہوئی سکھو مرغ کی پہلی ہی اذان پر جاگ پڑی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا سودا اب تک باقی تھا۔ بازار جانے کی جلدی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ تکیے کے نیچے سے دیا سلائی نکال کر اس نے دیا جلا دیا اور ٹین کا بنا ہوا چھوٹا سا دیا جل اٹھا۔ اس کی روشنی میں سکھو نے دیکھا کہ اس کے بچے نیند میں بستر سے باہر آگئے تھے۔ اس نے انھیں پھر سے قرینے سے سلادیا۔ سب سے بڑی لڑکی سندرا اب پندرہ سال کی ہو رہی تھی لیکن چار سالہ بچے کی مانند وہ بھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے کی عادی تھی۔ کیا کہا جائے کیسے اسے سمجھایا جائے۔ اب تک وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ گوٹیوں سے کھیلا کرتی ہے۔ اور کبھی کبھار تو اس کھیل میں اتنی مگن ہو جاتی ہے کہ کھانے پینے تک کا ہوش باقی نہیں رہتا۔ سکھو کے من میں عجیب سے خیالات کروٹ لے رہے تھے۔ اس نے سندرا کے جسم پر کی گودڑی برابر کر کے اس کے جسم کو ڈھانپ دیا اور پھر اس کا چہرہ تکنے لگی۔ بالکل باپ کے چہرے پر گئی تھی۔ وہی روپ، وہی نقشہ، گورا گورا رنگ اور وہی مضبوط بانہیں۔ پندرہ سال کی یہ لڑکی بیس سے کم کی نہیں لگتی تھی۔ اب تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ آج کے اس بازار کو اس کے لیے ایک ساڑی خریدنی ضروری ہے لیکن ساڑی کے لیے روپے کہاں سے آئیں گے؟ جب اس کے پتا تھے تب کی بات اور تھی لیکن اب ـــــ! واقعی اس وقت کی بات ہی نرالی تھی۔ اس وقت سندرا کی ماں کا اس قدر چنتا نے کبھی بھی من نہ کھلایا تھا۔ کپڑے پھٹ جاتے۔ بمبئی شوہر کو خط لکھ دیا جاتا۔ اور ہفتے بھر کے اندر کپڑوں کا پارسل موصول ہو جاتا۔ صرف کپڑے ہی کی بات نہیں تھی۔ جس وقت سکھو کا شوہر زندہ تھا، اسے کسی بھی بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ہر مہینے کی دس تاریخ کو منی آرڈر آجاتا۔ سکھو گردن اونچی کیے سکھے بندھوں میں گھومتی رہتی۔ پر چھ ماہ قبل سکھو کے

شوہر کابل ہی میں یکایک ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ پھر کبھی گھر لوٹ کر نہ آسکا۔ سکھو کی کایا پلٹ گئی۔ دن بدل گئے۔ وقت بدل گیا۔ اور اب سکھو کو پیسے پیسے کے لیے دوسروں کا محتاج ہونا پڑا۔ ہر بار مدد کے لیے اوروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت آجاتی۔ وہ کام کرتی، برتن مانجھتی، کپڑے دھوتی لیکن اب تو بازار جاکر لکڑیاں بیچنے کی باری آگئی تھی۔ چونکہ یہ ٹیمبکرن کا مشورہ تھا کہ ہماری طرح لکڑیاں بیچو اور اسی پر گذارا کرو۔ سندرا کی ماں! اکیلی ایسے کب تک یہ بوجھ ڈھوتی رہوگی۔ ہمارے ساتھ بازار کیوں نہیں آجاتیں؟ روز مٹھی بھر لکڑیوں کا روپیہ ڈیڑھ روپیہ تو مل ہی جاتا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ لکڑیوں کے اس گٹھے کو بڑی چالاکی سے باندھنا پڑتا ہے۔ درمیان میں بالکل خالی اور چاروں طرف سے بھرپور، پھولا ہوا۔ بس یہ گٹھا ذرا موٹا دکھائی دینا چاہیے۔ ایک اور پڑوسن بھی اسی دھندے کی چالاکیوں پر روشنی ڈال رہی تھی۔ ایک بار دھندے کی ابتدا تو کرو۔ دھیرے دھیرے سبھی باتیں تمھارے دھیان میں آجائیں گی اور کوئی بھی راز چھپا نہ رہ سکے گا۔ سکھو کنکولی کے اس بازار میں کئی بار گئی تھی لیکن اس وقت کچھ بیچنے کے لیے نہیں، صرف خریدنے کے لیے۔ آج تک اس نے کوئی بھی چیز بازار پیٹھ میں فروخت نہیں کی تھی۔ گھاس کی گٹھیاں، لکڑیاں، اور ترکاریاں بیچنے والی عورتوں سے سکھو اچھی طرح واقف تھی لیکن جس راہ سے ہمیں گذرنا ہی نہیں ہے اس راہ کی چھان بین کس کام کی؟ بازار پیٹھ میں چیزیں بیچنا بھی ایک فن ہے۔ اور اس فن کی وضاحت ٹیمبکرن اور اس کی پڑوسن نے کردی تھی۔ کل سے بازار پیٹھ میں لکڑیاں بیچنے کا ارادہ سکھو نے کرلیا تھا۔ چار آٹھ چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے باندھنے سے روپیہ ڈیڑھ روپیہ تو مل ہی جاتا ہے۔ گھر سنسار چلانے مین کتنی مدد ہوگی۔ بچوں کو اسکول جانے کے لیے تختیاں خریدنی تھیں۔ سریش تیسری سے اب چوتھی جماعت میں داخل ہو گیا تھا۔ مدھو پنجم میں تھی اور سب سے چھوٹے لڑکے کو بھی اس سال اسکول کا منہ دکھانا ضروری ہو گیا تھا۔ سندری کے لیے کپڑا اور خود کے لیے——! اب کیا لیا جائے لیکن بچوں کے لیے اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔ اگر اب بھی اس دھندے پر راضی نہ ہوئی تو یقیناً بھوکوں مرنے کی نوبت آجائے گی۔ بس ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سکھو نے بازار جانے کی بات پکی کرلی تھی۔ سر پر لکڑیوں کا گٹھا لیے ہر دکاندار کے پاس زیادہ داموں کے لیے حجت اور تکرار کرنی تھی۔ روپیہ یا بارہ آنے، اٹھنی یا دس آنے، لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ لیکن

جونہی اس کو اپنے بچوں کا خیال آگیا اس نے ان تمام شک و شبہات کو پرے دھکیل دیا اور کام کرنے میں مصروف ہو گئی۔

صبح ہو گئی بچے ایک ایک کر کے بیدار ہونے لگے۔ رات کی بچی ہوئی روٹی سکھو نے ان کے سامنے رکھی اور بازار جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ دس بارہ آم کی موٹی لکڑیاں سمیٹ کر اس نے گٹھا تیار کرلیا۔ آج کا یہ پہلا ہی روز تھا اس لیے ایمانداری لازمی تھی۔ گٹھا باندھ کر ٹیمکرن کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیمکرن آگئی۔ سر پر کا گٹھا نیچے رکھتے ہوئے سکھو کے گٹھے کی طرف دیکھا اور کہا اگر ایسے گٹھے باندھنا شروع کردو گی تو دیوالہ نکل جائے گا۔ ٹیمکرن نے سکھو کا گٹھا پھر سے باندھا۔ چاروں طرف کھلا ہوا اور درمیان میں بالکل کھوکھلا۔ میں نے بالکل ایمانداری سے باندھ دیا تھا۔ سکھو نے کہا۔

اس وقت کہاں جاتی ہے ان لوگوں کی ایمانداری جب وہ بم گراتے ہیں اور گھر جلاتے ہیں۔ ٹیمکرن نے جواب دیا۔

سبھی عورتیں بازار کے لیے نکل پڑیں۔ راستے میں کچھ اور عورتوں سے ملاقات ہو گئی۔ تاندرے کی ساوتن گلاّ دیوی کی رُکمن اور جانولے کی انبکرن' یہ سبھی عورتیں روز ہی بازار کی طرف جانے والی تھیں اسی ایک راستے سے گذرنے والی۔ کسی کے پاس لکڑیاں' کسی کے پاس گھاس' کسی کے پاس ترکاریاں۔ سر پر بوجھ اور ہاتھ خالی تھیلی تو کہیں خالی چٹی کی بوتل۔

بازار پیٹھ جونہی قریب آگیا کنکولی کے اس انگریزی اسکول کے قریب ہی لکڑیاں بیچنے والی اور گھاس بیچنے والی عورتیں تھم گئیں۔ انھوں نے گھاس کے گٹھے اور لکڑیوں کو پھر ایک بار قرینے سے سجا لیا۔ ایک گٹھے کے دو گٹھے ہو گئے۔ پھر کچھ دیر کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر روٹی کھا کر پاس کے کنویں پر پانی پی لیا اور سیدھے بازار میں آکر کھڑی ہو گئیں۔ ٹیمکرن نے سکھو سے کہا تم میرے ساتھ چلو۔ آج تمھارا یہ پہلا ہی دن ہے۔ تمھیں دو چار اچھے گاہک دکھا کر رکھ دوں گی۔ اس بات پر دوسری عورتیں قدرے ہنس پڑیں۔ سکھو ان کی ہنسی کا مطلب بالکل نہ سمجھ سکی۔ اسے تو اپنے کام سے کام تھا۔ سب سے پہلے سداشیو برہمن کا ہوٹل راستے میں پڑتا تھا۔ سداشیو نے وہیں کاؤنٹر پر سے آواز لگائی اری ٹیمکرن کیا لے گی۔ ڈیڑھ روپیہ۔ آگے بڑھو' یہ کمبخت ہوٹل والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نہ لینا نہ دینا۔ ٹیمکرن سکھو سے مخاطب تھی۔ اس

کے بعد لپا کدالکر کی لوجنگ بورڈنگ آگئی۔ لپا نے ممبروں کو پروستے پڑوستے پوچھا کیسا دیا۔
ڈیڑھ ڈیڑھ روپیہ۔
"دس دس آنے میں دے دو"۔ لپا نے ممبروں کی تھالی دال پڑوستے ہوئے کہا۔ ذرا غور سے دیکھو لپا اگر آپ جیسے لوگ بھی بھاؤ تاؤ کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ تو پھر ــــــــ
ٹیمبکرن قدرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ سکھو کو محسوس ہوا گویا اس لپا اور ٹیمبکرن میں بہت پرانی پہچان ہے۔ البتہ لپا اس گٹھے کی بہ نسبت ٹیمبکرن کو زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد لپا نے سکھو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یہ نئی کون ہے؟ پڑوسن ہے میری۔ آج سے یہ بھی لکڑیاں فروخت کرے گی۔ پر تم جیسے سیٹھ لوگ خریدیں تو؟ ٹیمبکرن قدرے مسکرائی۔
لپا نے کہا ٹھیک ہے آج میں اسی سے خریدوں گا تم اپنے گٹھے کو کہیں اور بیچ آؤ۔ سکھو نے بھی فوراً کہا ڈیڑھ روپیہ۔ البتہ وہ دل میں سوچتی رہی روپیہ ہی کہہ دینا ضروری تھا۔ صرف چار ہی تو لکڑیاں بندھی ہیں۔
لپا نے کہا غالباً تجھے بھی اس ٹیمبکرن نے سبق پڑھا رکھا ہے۔
نہیں بالکل نہیں۔ یہ نئی نئی ہے بالکل نئی۔ ٹیمبکرن نے وضاحت کی۔ نئے اور پرانے سبھی ایک جیسے۔ ٹیمبکرن تم پچھلی جانب چل کر لکڑیاں اتار دو' میں پیسے لے آتا ہوں' لپا نے کہا۔ اسی وقت ٹیمبکرن نے سکھو سے کہا تم اسی طرح آگے بڑھو اور دو چار دکانیں دیکھ لو۔ اچھا سا گاہک مل جائے تو بیچ ڈالو۔ میں وہیں پل پر کھڑی تمھارا انتظار کروں گی تم جلد ہی لوٹ آنا۔ ٹیمبکرن بورڈنگ کی پچھلی جانب مڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ سکھو کو اس بات پر بے حد تعجب ہو رہا تھا۔ آخر ہوٹل والا لپا ڈیڑھ ڈیڑھ روپیہ دینے پر کیسے راضی ہوا؟
سکھو آگے بڑھ گئی۔ کچھ لوگ چھ آٹھ آنوں تک رک گئے' پر وہ دکاندار نہیں تھے۔ ٹیمبکرن نے اس بات کی پہلے ہی وضاحت کردی تھی کہ دکاندار باقی لوگوں کی بہ نسبت زیادہ پیسے دینے کے قائل ہیں اسی لیے وہ دکانوں کے قریب سے ہی گذر رہی تھی۔ نکڑ پر ایک دکاندار نے اسے آواز دی کیا لوگی اس گٹھے کا۔
ڈیڑھ روپیہ۔
ذرا قریب تو آجاؤ تاکہ میں دیکھ سکوں کہ واقعی ڈیڑھ روپیہ کے قابل ہے یا

نہیں۔ سکھو دکان کے دروازے پر آکھڑی ہوگئی۔ صبح سے وہ بوجھ اپنے سر پر لادے گھوم رہی تھی۔ اسی لیے اب اس کی گردن میں قدرے تناؤ بھی آگیا تھا اور یہ بوجھ اب ناقابل برداشت ہورہا تھا۔ اگر کوئی بھی اٹھنی بھی دینے کے لیے تیار ہوجاتا تو وہ اس بوجھ کو اپنے سر سے اتار پھینکتی۔ دکاندار نے اپنی جگہ چھوڑی۔ گاہک بالکل نہیں کے برابر تھے۔ کالے کلوٹے دکاندار نے خوب مل کر تیل لگایا تھا۔ اسی لیے تیل کی وجہ سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ململ کا کرتہ پہنے تھا اور گلے میں سونے کی مالا لٹک رہی تھی۔ وہ سکھو کے قریب آگیا اور اس کے چہرے کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ بالکل اسی انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے لالٹیمکرن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سکھو نے اپنی نظریں نیچی کرلیں۔

دکاندار نے پوچھا۔ کون سے گاؤں کی ہو تم؟

"ہو میر گاؤں کی۔"

آج تک میں نے تمھیں کبھی بھی بازار پیٹھ میں لکڑیاں بیچتے نہیں دیکھا۔

نہیں۔ "آج پہلی بار آرہی ہوں۔"

سودا بہت ہی منہگا ہے۔

میری بولی ہوئی قیمت کیا تم نے ادا کردی؟ تم مانگ سکتے ہو اپنی مرضی کے مطابق۔

"لیکن کبھی کبھی تو بولی ہوئی پوری قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے"۔ دکاندار نے کہا۔

سکھو کو اس کا لہجہ بہت ہی مختلف لگا۔ اسی لیے اس نے خاموشی مناسب سمجھی۔

دکاندار نے پھر کہا۔ "چلو اب ایک ہی قیمت بتلادو۔ اگلے دروازے کی بھی اور پچھلے دروازے کی بھی۔"

پھر ایک بار دکاندار عجیب سی زبان میں گویا تھا۔ وہ زبان جو سکھو کی زبان سے باہر تھی۔ بالکل کبھی نہ سنی ہوئی۔ انجانی اور خطرناک بھی۔ جونہی سکھو کے قدم آگے کی جانب بڑھنے لگے۔ دکاندار نے کہا۔ اچھا تو منظور ہے سودا؟ اتار دو لکڑیاں پچھلے دروازے پر۔ سکھو آگے اور دکاندار پیچھے۔ اس طرح دونوں ہی دکان کے پچھواڑے چلے گئے۔ پچھلی جانب جتنی بھی جگہ تھی۔ چاروں جانب سے بند کی گئی تھی۔

"اتار دو یہاں"

سکھو نے قدرے گردن کو جھٹکایا اور لکڑیاں اتار دیں۔ دوپہر کا وقت چاروں اور گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لکڑیاں اتارنے کی آواز دور دور تک گونجتی رہی۔ سکھو نے

جونہی پسینہ صاف کیا۔ دکاندار نے دو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"یہ رہے تمہارے پیسے"
لیکن میرے پاس واپس دینے کے لیے اٹھنی نہیں ہے۔
میرے پاس بھی چھٹے نہیں ہیں لیکن پچھلے دروازے پر لکڑیاں اتارتے وقت کون سی عورت بقایا واپس کرتی ہے؟ وہ جو بھی دام طلب کرتی ہے۔ ہم دے دیتے ہیں۔" یہ لو دو روپے" دکاندار اس سے اور بھی قریب ہوگیا۔ اس نے سکھو کے تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھوں میں نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت یہاں کوئی نہیں بھی آئے گا۔

سکھو نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور وہی اس کے چہرے پرزور سے دے مارا اور اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی باہر نکل آئی' اور پسینہ صاف کرتے ہوئے کہہ اٹھی عزت لوٹنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

دوسری جانب سے تارا اپنی لکڑیاں بیچ کر واپس آرہی تھی۔ اس کی تھیلی سامان سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ وہ سکھو کو دیکھتے ہی کہہ اٹھی۔ لگتا ہے آج پہلے ہی روز اچھا سودا ہوگیا ہے۔ سکھو نے سوچا کیوں نہ اُس تارا کے چہرے پر بھی وہی بھر پور ہاتھ دے ماروں جو تھوڑی دیر پہلے اس دکاندار کی مرمت کر چکا ہے۔ لیکن اس نے مزید جھگڑا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے گھر کا راستہ لیا۔

گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی تھی۔ اس کے سبھی بچے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انھیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ آج جہاں ہماری ماں ہمارے لیے مٹھائی لے آئے گی' وہیں کتابیں تختیاں بھی آج ہی خریدی جائیں گی لیکن وہ تو خالی ہاتھوں واپس لوٹی تھی۔
بچے روئے کچھ کسمسائے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد نیند کی آغوش میں چلے گئے۔
سبھی سو گئے۔ صرف سندرا جاگ رہی تھی۔ اسے آج اپنی ماں سے کچھ کہنا تھا۔ اسی لیے وہ دھیرے دھیرے ماں کے قریب چلی گئی۔

کہا" آج ٹیمبکرن کی بڑی لڑکی ویملا کے ساتھ کھیلنے گئی تھی۔ اس کی ماں کل سے اسے بازار پیٹھ بھیج رہی ہے۔ لکڑیاں بیچنے۔ آج اس کے لیے اس کی ماں نئی ساڑی بھی خرید لائی ہے۔ کیا تم ویملا کے ساتھ مجھے بازار پیٹھ نہیں بھیج سکتیں؟ میں روپئے کماؤں گی تو تمھیں بازار پیٹھ جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تم گھر سنبھالنا۔ میں لکڑیاں بیچ آؤں گی۔

سندرا کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ "بازار کیسا ہوتا ہے' کیا ہوتا ہے' وہ صرف اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ ذمہ دار ہونا چاہتی تھی۔ اس کی ان معصوم باتوں کو سن کر سکھو سے نہ رہا گیا۔ اس نے اسے اپنے سینے سے لگالیا اور روتی ہوئی کہہ اٹھی پھر کبھی بازار کا نام زبان پر نہیں لانا۔ تمھاری اس ماں کو اس بازار کا تجربہ ہوچکا ہے۔ ہم یہاں بھوکوں مر جائیں گے لیکن اس طرف کا کبھی بھول کر بھی رخ نہیں کریں گے۔ سندرا بازار کی نعمت ہمارے لیے نہیں۔ گھر کی بھوک سہنے کے ہم عادی ہو چکے ہیں"

ڈاکٹر حنیف سیف ہاشمی
پروفیسر صدر شعبہ اردو
سہیادری کالج کوئم پو یونیورسٹی
شیموگہ

وقار خلیل...........

ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم نے وضع خرام

شیموگہ میں برادرم س، الف، حسینی صاحب، نبیرۂ خواجہ بندہ نوازؒ کی زبانی یہ اندوہ ناک خبر سنی کہ وقار خلیل بروز پیر ۲ر نومبر ۱۹۹۸ء کو حیدر آباد میں انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! ان کی مفارقت سے دل پہ جو رنج گراں گزرا وہ بیان سے باہر ہے۔

بہت اداس ہوں آنکھوں سے اشک بہتے ہیں
اسی کو لوگ جدائی کا درد کہتے ہیں

مرحوم، اردو کی خدمت میں مصروف بکار ہمیشہ خنداں وشاداں زندہ رہے اور اسی "نقش پا" کی خدمت میں ہنستے کھیلتے سرخرو اٹھ گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر عزیز اڑسٹھ برس کی تھی۔ وقار خلیل کا خاندانی سلسلہ سادات گوگی شریف سے تھا۔ مرحوم ہمیشہ اور ہر حال میں پُر وقار زندگی گزارا کیے خواہ وہ غربت میں رہے ہوں خواہ حالت ثروت میں۔ ان کی حیات مستعار کا بیشتر حصہ غربت و تنگدستی کی نذر ہوا، آخری ایام میں ثروت و خوشحالی بھی نصیب ہوئی لیکن کون جانتا تھا کہ

ع جینا آتے ہی موت آجاتی ہے

وقار خلیل سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۷ء کی گرمیوں میں ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ سن ستاون کے لگ بھگ تھا۔ قد میانہ جسم دبلا پتلا، اپنائیت اور اعتماد کو دعوت دیتا ہوا پر وقار چہرہ، رنگ سنولا، پیشانی فراخ، لمبی ستواں ناک، بڑی چمکیلی، پرنور کالی آنکھیں اور آنکھوں پر عینک چڑھی ہوئی، سر گول اور بڑا، سلیقے سے جمے ہوئے گھنیرے سیاہ بال، نظر تیز، اشیاء کی اسیر نہیں حقائق و معارف سے آشنا اور شرح و تفصیلات سے گریز پا، جسم پر ملگجی شیروانی اور پاجامہ، ٹھیٹ حیدر آبادی تہذیب و آداب کے مظہر

تھے۔ راقم نے ان سے عرض کیا۔ ناچیز تحقیق کا ایک ادنا طالب علم ہے۔ وقار خلیل بڑے تپاک سے ملے، گلے لگایا اور دیر تک محو گفتگو رہے۔ ایسے لگا جیسے وہ ریسرچ اسکالرس کی خدمات کے لیے ہی معمور کیے گئے ہوں۔ انھیں کے توسط سے راقم کو "ایوان اردو" میں پروفیسر مغنی تبسم سے پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ بہر کیف قیام حیدر آباد کے دوران وقار خلیل سے مختلف موڑ پر میری ملاقاتیں رہیں، اس طرح ان کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کے مواقع نصیب ہوتے رہے لیکن اب جبکہ ان کے سانحۂ وفات کی خبر سنی تو ماضی کی ان یادوں کے نقوش قلب سے سطح ذہن پر اُبھر رہے ہیں اور یادوں کی بارات سجانے کے لیے صفحہ قرطاس پر اپنے سرخامہ کو جنبش دے رہا ہوں۔

وقار خلیل دکن ہند کے علمی وادبی وشعری نیز خانقہی گھرانے کے چشم وچراغ تھے ابتدائی اور وسطانی تعلیم گوگی شریف میں پائی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق اوائل عمر ہی سے رہا۔ والد ماجد حضرت سید شاہ چندا حسینی چشتی نامی کو ہسوار شاہ پوری حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اور علامہ اقبال کے معاصر۔

حیدر آباد کرناٹک کے قادر الکلام شاعر تھے جن کی شعری تخلیقات اور مضامین برصغیر ہند وپاک کے علمی وادبی موقر رسائل وجرائد میں شائع ہوتے تھے اور جن کے نام اب سے ساٹھ سال اُدھر کے برصغیر ہند وپاک کے علمی وادبی رسائل واخبارات قلمی تعاون کے صلے میں آیا کرتے تھے۔ وقار خلیل کو بھی اپنی تعلیمی مصروفیات کے بعد والد ماجد کے کتب خانے اور اخبارات ورسائل سے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، پھر انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں بچوں کے لیے کہانیاں، مضامین اور نظمیں لکھنا شروع کیں، اس طرح وقار خلیل نے اپنے ذوق، اپنی فکر ونظر ہی کو اپنا رہنما اور استاد بنایا اور اس طرح دنیائے ادب میں نام پیدا کیا۔

وقار خلیل حضرت محمود بحری کے مقام مدفن گوگی شریف تعلقہ شاہ پور گلبرگہ شریف میں ۱۹۳۰ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔ والد ماجد حضرت نامی کوہسوار شاہ پوری محکمۂ تعلیمات سے منسلک تھے اور ضلع گلبرگہ شریف اور ضلع رائچور کے مختلف تعلقوں میں بحیثیت استاد اردو اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے، پھر وقار خلیل اپنے وطن مالوف گوگی شریف کو خیر باد کہہ کر حیدر آباد چلے آئے اور آخری دم تک وہیں رہے اور اسی ارضِ دکن کی خاک پاک کے پیوند ہوئے۔

وقار خلیل نے میٹرک تک گورنمنٹ ہائی اسکول چادر گھاٹ میں تعلیم حاصل

کی۔ نامساعد حالات اور اس دور کے پولیس ایکشن کے صدمے نے انھیں اپنے تعلیمی سلسلے کو منقطع کرنے پر مجبور کیا لیکن اس کے بعد انھوں نے اپنے طور پر منشی فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اسی دوران اردو میں مضمون نگاری، اخبارات و رسائل اور معموں کی گائیڈس کے ذریعے اپنے آپ کو سنبھالنے کی سعی تمام کی۔ بچوں کے لیے ماہنامہ "انعام" جاری کیا جو قریب ایک سال تک جوں توں چلتا رہا۔ تقریباً چار پانچ سال تک روزنامہ ملاپ حیدر آباد میں بچوں کے کالم 'بال سبھا' کے مرتب بھی رہے۔ اس کے بعد وقار خلیل ڈاکٹر زور صاحب کے ادارۂ ادبیات اردو سے منسلک ہو گئے اور دم آخر تک ادارۂ ادبیات اردو سے اپنا رشتۂ وفا استوار رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وقار خلیل کو ادارۂ ادبیات اردو میں مدت مدید تک کام کرنے کا موقع ملا۔ اصل یہ ہے کہ ان کی علمی و ادبی و تصنیفی سرگرمیوں کے اچھے سے اچھے نمونے اسی ادارہ کے قیام کی دین ہیں۔ وقار خلیل کو ادارۂ ادبیات اردو میں ڈاکٹر زور صاحب جیسے مغتنمات روزگار کی صحبت و سرپرستی نصیب ہوئی واقعیت یہ ہے کہ وقار خلیل کو اردو نوازی کی روایت زور صاحب کی بدولت حاصل تھی اور اس روایت کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں مرحوم نے جیسی مسلسل اور بے بہا خدمات انجام دی ہیں وہ بہر آئینہ قابل تعریف اور یادگار رہیں گی۔ ۱۹۵۸ء سے تادم واپسیں ادارۂ ادبیات اردو میں اس کے رسالے "سب رس" کے مدیر اور پھر معاون مدیر اور شعبۂ امتحانات کے منتظم کی حیثیت سے اردو کی خدمات میں مرحوم اپنا حصہ ادا کرتے رہے۔ ماہانہ یافت کی نہ پوچھیے بس جیسے تیسے گزر بسر کر لیتے تھے۔ ضمناً یہاں مرحوم کی ایک بات کی طرف اشارہ کر دینا غیر مناسب نہیں ہوگا۔ مئی ۱۹۸۷ء کی بات ہے ایک صحبت میں دوران گفتگو شیموگہ میں اردو کی زبوں حالی کا ذکر چھڑا تو مرحوم نے عرض کیا۔ حنیف سیف وہاں میری خدمات حاصل کیجیے۔ سات آٹھ سو روپے ماہانہ مشاہرے کا انتظام فرمایئے گا میں شیموگہ آجاؤں گا۔" اس بات سے یہ نتیجہ مستنبط کر سکتے ہیں کہ مرحوم کس قدر قلیل معاوضے برسر خدمت رہے۔ وقار خلیل سیدزادے تھے۔ فقر و قناعت ان کی سرشت میں داخل تھی۔ مرحوم ہمیشہ اپنی قلندری اور درویشی پر فخر کرتے تھے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی نامساعدت کا شکوہ ان کی زبان پر کبھی نہیں آیا۔

وقار خلیل مرحوم ایک عرصہ تک روزنامہ منصف حیدر آباد کے ادبی رپورٹر اور کالم نویس بھی رہے نیز یہ واقعیت بھی قابل ذکر ہے کہ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن سے جب کبھی کنٹراکٹ آتے تھے کلام شاعر، فیچر اور مضامین کے ذریعے اپنی تخلیقات سامعین

اور ناظرین تک پہنچاتے رہے۔ وقار خلیل کے مضامین اور شاعری برصغیر ہند و پاک کے تقریباً تمام معیاری ادبی رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں مثلاً سر عبد القادر کے "مخزن" سے لے کر زور صاحب کے "سب رس" تک ان کی تخلیقات ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام بنا چکی ہیں۔

"بچوں کا ادب" وقار خلیل کا محبوب اور مرغوب نظر موضوع رہا ہے چنانچہ ادب اطفال کے سلسلے میں یہاں اس حقیقت اور واقعیت کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ادارہ ادبیات اردو سے ان کی دو کتابیں ایک ایک ہفتہ کے نوٹس پر ڈاکٹر زور نے لکھوا کر شائع فرمائیں، پہلی کتاب "محمد قلی قطب شاہ کی جیون کہانی" اور دوسری کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد" اس سے قبل بچوں کے لیے "پرستان کی پری" کے نام سے ایک اور کتاب جو تیئیس صفحات پر مشتمل ہے شائع ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۸ء میں وقار خلیل کی شاعری کا مجموعہ "شاعری" کے عنوان سے ریاستی اردو اکیڈمی کی مالی اعانت سے شائع ہوا اور بچوں سے متعلق نظموں کا ایک مجموعہ "ڈالی ڈالی پھول" کے نام سے شائع ہوا۔ وقار خلیل کو ہر دو مجموعوں کی اشاعت پر مختلف اردو اکیڈمیوں کی طرف سے انعام بھی ملے، اہل علم و نظر نے انھیں خوب سراہا اور نقد تبصرے کے ذریعے وقار شناسی کا ثبوت دیا۔ مارچ ۱۹۸۷ء میں ایک اور مجموعہ نظم "ورثہ" کے نام سے شائع ہوا جس میں مرحوم کی قومی، ملی اور تہذیبی نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے تیسرا مجموعہ نظم "حرف حرف نظم" جو ابجدی نظموں پر مشتمل ہے اور ارت انسانی وسائل حکومت ہند کے ترقی اردو بیورو نے باتصویر آرائش و تزئین کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس جگہ ایک نکتے کی صراحت ازبس ضروری سمجھتا ہوں کہ متذکرہ مجموعہ نظم میں وقار خلیل نے بچوں کے مزاج نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حروف تہجی کے تحت نظمیں تخلیق کی ہیں جن کے مطالعے سے بچوں کے غنچہ ہائے دل شگفتہ و شاداب ہو جاتے ہیں اور ان کے دل میں سرور انگیز اور کیف پرور اہتزاز پیدا ہوتا ہے اور یہ ہے بھی سچ کہ بچے شعر سے فکری لگاؤ اور شناسائی پیدا کر لیتے ہیں اور طبعی طور پر متاثر بھی ہو اٹھتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ نظمیں بچوں کو بہ آسانی یاد بھی ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان نظموں کے مطالعہ سے نئی نسل و پود میں اردو نظم خوانی اور بیت بازی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔

وقار خلیل کے شعری رویے کے بارے میں عرض ہے کہ وہ کلاسکی شعری روایات کی پاسداری اور علم شعر سے کماحقہ آگاہی کے بغیر شاعری کرنا کار فضول سمجھتے

تھے۔ سطحی اور روایتی شاعری ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے اور ہر ایک دور میں وہ ادب عالیہ Great Literature سے خارج بھی رہی ہے جس سے وقار خلیل کو عمر بھر کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ نیز اس حقیقت اور واقعیت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ میر سے لے کر ناصر کاظمی تک ہمارا شعری منظر نامہ فکر و فن کی صلابت اور عصری حقائق و معارف کا بے بہا گنجینہ رہا ہے۔ اسی لیے وقار خلیل اردو کی بڑی اور اچھی شاعری کرنے والوں میں اقبال حالی اور ترقی پسند تحریک کے فیض ، مخدوم، فراق، جامی اور احمد ندیم قاسمی سے بے حد متاثر رہے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اردو کی ہمہ جہتی شاعری کے رخ کا تعین کرنے میں ترقی پسند تحریک نے اپنا بہتر منصب ادا کیا جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ پھر ۱۹۴۷ء کے بعد جدید فکر کے نام سے نئی شاعری نے ترقی پسند تحریک کی بنیادوں پر اپنے فکر و فن کا ہیولا تیار کیا اور اس نے حقیقت اور واقعیت کے معین خطوط سے گریز کیا، پھر جدید وقدیم باہم ایک ہوگئے، یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ وقار خلیل کا تعلق اسی زمرہ شعرا سے ہے جو ترقی پسندی کی ابتدائی یلغار کے بعد شعری افق پر نمودار ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ وقار خلیل کے یہاں ابتدائی دور کی ترقی پسندی کے اثرات بھی ہیں اور ۱۹۴۷ء کے بعد کی تشکیل وتعمیر نو کے آثار وعلائم بھی۔ اس طرح وقار خلیل کی شاعری دونوں ہی ادوار کے شعری رویوں کی عکاسی کرتی ہے۔

مجھے یاد ہے ۱۹۸۷ء کی گرمیوں کی ایک شام دونوں کی صحبت میں "عصری شعری رویے" پر گفتگو چھڑی تو وقار خلیل کہنے لگے آج جبکہ ناوابستہ ایشیائی ملکوں نے اپنی شناخت کو روشن کیا ہے ضرورت اس بات کی ہے ہم ایشیائی اہل قلم کیا ہندستان کیا پاکستان اور کیا بنگلہ دیش سبھوں کو سیکولر اور جمہوری طرز فکر کو اپناتے ہوئے اپنی اپنی زبانوں اور اپنی اپنی تہذیبوں اور اپنے اپنے فنون لطیفہ کو عالمی معیارات سے ہمکنار کرنا ہے۔" انھوں نے اپنے سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا:

"میں اردو کا ایک نامعتبر تو نہیں ایک بااعتماد قلم کار ہوں اور اپنی تحریروں میں اس امر کو پیش نظر رکھتا ہوں کہ ترقی پذیر مشرقی اور گنگا جمنی معاشرے کے حقائق ومعارف، آرزوؤں، امنگوں اور اندیشوں کو اپنی فکر کا زاویہ بناؤں اور یہی میں نے کیا ہے۔ مجھے انسانی برادری کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا ہر لمحہ دکھ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے معاصر قلم کار، ادیب، شاعر، صحافی، استاد، غرض ہر مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے اصحاب

اپنی اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے انسانی برادری کی بہتری و فلاح کی سمت اپنا قدم اٹھائیں۔ لسانی تعصب، مذہبی جنون، اور سماجی نابرابری کے خاتمے اور امن عالم کے لیے صف آرا ہونے کی آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے اور اس فریضے کی تکمیل میں آپ اور ہم اہل قلم ادیب، شاعر، صحافی، استاد بھی اندھیرے میں چراغ فکر روشن کر سکتے ہیں۔
حضرت جگر کا شعر یاد آتا ہے ۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

میں یہاں یہ بھی عرض کروں گا کہ اہل سیاست کو ان کے سیاسی امور کی بے لگام انجام دہی پر ہم قلم کاروں کو احتجاج کرنا ہے جو انسانی معاشرے کے استحکام اور عالمی امن کے قیام کے لیے ناگزیر شرط ہے۔"

وقار خلیل کے متذکرہ بیان کے بغور مطالعے سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط کیے جا سکتے ہیں:

اہل قلم یا فنکار معاشرے کے اہم منصب شہادت پر فائز ہوتا ہے لہٰذا اسے حقیقت و صداقت کی تصدیق کرنا پڑتی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم اور مشکل فریضہ ہے جس سے عہدہ برآ ہونا اہل فکر و فن کا فرض منصبی ہے۔ اہل قلم کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ نوع انسان کو جہالت و ضلالت کے اندھیرے سے نکال کر شعور و آگہی کے اُجالے کی طرف لے جائے، نیز اہل فن کا فرض منصبی ہر زماں و مکاں کے انسان کو فائدہ پہنچانا ہے چنانچہ فن کو رنگ، نسل، زبان و قومیت کے حصاروں میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ وقار خلیل ایک با اعتماد اور ذمہ دار قلم کار تھے جن کے پیش نظر ایک نصب العین تھا اس کی تحصیل کے لیے انھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں سے انسانی برادری کی بہتری و فلاح کی سعی تمام کی ہے۔

یاد ش بخیر ایک دن "تخلیقی فعلیت" پر گفتگو ہو رہی تھی تو وقار خلیل نے فرمایا:

"میں اپنے ماحول اور معاشرے اور اپنی برادری سے اثر قبول کرتا رہا ہوں۔ ذہنی طور پر شعوری یا لاشعوری کیفیت مجھ سے شعر کہلواتی رہی ہے۔ میں نے بہت کم فرمائشی طریق و منہاج پر شعر کہے ہیں۔ سوچتا اور غور کرتا ہوا ذہن اپنی فکر و نظر کے سہارے اپنا کام کیے جاتا ہے۔ میری تخلیقات میں کسی ازم یا کسی آدرش و عقیدے کی پرچھائیں ملیں گی ضرور مگر فن اور فکری علامتوں اشاروں کے تناظر میں، ویسے تخلیق فوٹو گرافی، خبر رسانی یا قلم نویسی نہیں ہے کہ واقعہ یا حادثہ کی ہو بہو تصویر کشی کی جائے۔ فنکار اپنی تخلیقات میں

غفران راغب
معرفت ڈاکٹر محمد فہیم آزو گر
سیوڈیہہ بوکارو بہار

غزل

غالب کی زمین میں غالب کی نذر

ان سے ان سے لڑا کرے کوئی
خون اپنا پیا کرے کوئی

دیکھ کر دخترِ رز کے ساتھ مجھے
لال پیلا ہوا کرے کوئی

پھاند جائے کوئی تو دریا کو
اور پانی پیا کرے کوئی

سب لٹیرے دکھائی دیتے ہیں
دریا دل کب ہوا کرے کوئی

بیٹھ کر وقت کی منڈیروں پر
صرف صدیاں گنا کرے کوئی

باز آجاؤں ہر گناہ سے میں
بابِ غیرت تو وا کرے کوئی

میرے مردہ ضمیر کو راغب
"قم باذنی" کہا کرے کوئی

وحید کلیم
4-8-42 نواب پورہ اورنگ آباد

ماہیے

آنکھوں میں حیا کیسی
معصوم سی لگتی ہے
اس کی یہ ادا کیسی

نازوں میں پلی بنی
گھر اپنا بسانے کو
سسرال چلی بیٹی

اپنا مقدر ہے
کتنے ہی مظالم ہوں
سسرال ہی بہتر ہے

انصاف دلاتے ہیں
قانون سے لڑکر ہی
قاتل کو بچاتے ہیں

کب ظلم پنپتا ہے
دھرتی ہی نہیں اس سے
آکاش بھی تپتا ہے

دل درد سے بھر آیا
پردیس سے اکتا کر
میں لوٹ کے گھر آیا

کیسے چاند ستارے کیا
قسمت کے اندھیروں کو
بخشیں گے اجالے کیا

شبنم فردوس
سوتی پوری، بہار

کروٹیں

سنو! اوہ چاندنی راتوں میں
مرے ہاتھوں کو لے کر اپنے ہاتھوں میں
تم جو وعدے کیا کرتے تھے مجھ سے
یاد نہیں تم کو؟
شاید تمھیں کچھ یاد نہیں
یا پھر انھیں یاد کرنا نہیں چاہتے
لیکن ایک ایک لمحہ تمھارے ساتھ گزرا ہوا
آج بھی یاد ہے مجھ کو
وہ سارے وعدے تمھارے
میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتے ہیں
اور میں
درد کے بستر پر
کروٹیں بدل بدل کر
نہ چاہتے ہوئے بھی
ماضی میں کھو جایا کرتی ہوں
وہ تمھارا عہد زندگی بھر ساتھ دینے کا
وقت کے ہاتھوں کہیں کھو گیا شاید
تم نے اکثر مجھے مستقبل کے رنگین خواب
دکھلائے
کہا کرتے تھے تم تمھاری زندگی ہوں میں
بغیر میرے تم جی نہیں سکتے
لیکن آج
میں تمھاری زندگی سے
ایسے نکل چکی جیسے کبھی تھی ہی نہیں شاید
اب تم جیسے ہی بے قرار رہتے ہو
ویسے ہی میرے ساتھ رہا کرتے تھے

آر لارنس، مرادآباد

غزل

نامرادی میں بھی ہمت سے بہت کام لیا
ان سے رسوائی سہی، ان ہی سے انعام لیا

بے وفا کون ہے، یہ وقت ہی طے کر دے گا
یوں تو لوگوں نے کئی بار مرا نام لیا

میں تو مجرم کی طرح بیٹھا ہوں ہر محفل میں
تم نے ناحق ہی شناسائی کا الزام لیا

تم تو مقبول تھے اپنوں میں پرایوں میں مگر
کیوں قدم روک لیے، کس نے تمھیں تھام لیا

کوئی اچھا سا لطیفہ ہی سناؤ یارو
سوگواری نے ہمیں گھیر سر شام لیا

رفیعہ شبنم عابدی

شاعر بے آسماں

آج سے تقریباً بیس برس پہلے ایک شعری مجموعہ نظر سے گزرا تھا جس کو پڑھنے کے بعد اقبال کا یہ قطعہ ذہن میں آگیا تھا کہ۔

ترا شیدم صنم در صورت خویش
بشکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود برون رفتن محال است
بہر رنگی کہ ہستم خود پرستم

(میں نے ایک بت اپنی صورت کا تراشا اور اس کی پرستش کی۔ میں نے جب خدا کا تصور کیا تو اپنی ہی شکل میں کیا۔ غرضیکہ اپنی ذات سے ہٹ کر کچھ سوچنا میرے لیے مشکل ہے کیونکہ میں جیسا بھی ہوں، جو کچھ بھی ہوں، آپ اپنا پرستار ہوں)
اسی لیے یہ اشعار پڑھے تھے کہ۔

اپنی ویران سی آنکھوں کو سجا لو مجھ سے
پھر نہ ہاتھ آؤں گا اڑتا ہوا سپنا ہوں میں
میری قیمت زمین و آسماں ہے
بہت انمول ہوں پھر بھی بکا ہوں
شرار سنگ میں پرواز میں ظاہر میں
فلک سے گرتا ہوا کوئی زخمی طائر میں
اک حقیقت ہوں اگر اظہار ہو جاؤں گا میں
جانے کس کس جرم کا اقرار ہو جاؤں گا میں

تو مجھے لگا تھا کہ فن کار اپنی ذات سے باہر کچھ دیکھنے کو تیار ہی نہیں ہے اپنی مایوسی، اپنے زخم، اپنی سچائی، اپنی ناکامی، اپنی تنہائی، اپنی خوشیاں اور اپنے غم۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب غزل نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ بدلتے ہوئے وقت اور بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ساتھ غزل کے تیور بھی بدل گئے تھے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی ختم ہو رہی تھی اور غزل ساتویں دہائی میں قدم رکھ رہی تھی۔ اس دور کے کچھ اپنے مسائل تھے۔ مثلاً رشتوں کی ناقدری اور شکست، تضادات سے بھری ہوئی ایک مصنوعی تہذیب، بکھرتا اور ٹوٹتا ہوا معاشرہ، زندگی کی بے کیفی اور بے معنی، سائنسی ایجادات کی تیز رفتاری اور بدلتی ہوئی قدریں، فکر کا کرب و اضطراب، فرد کا احساسِ تنہائی اور انفرادیت اور بڑھتی ہوئی انا۔ "میں" کی غزلوں میں یہ سب کچھ موجود تھا مگر یہ انا بھر کی انا نہ تھی کہ ہاتھ مر جانے دھرے سو جاتے۔ غالب کی انا نہ تھی کہ در کعبہ وا دیکھ کر الٹے پھر آنے کو جی چاہتا۔ یگانہ کی انا نہ تھی کہ خدا بننے کی خواہش میں آپ سے باہر ہو جاتی۔ یہ وہ انا تھی جس میں اقرارِ ذات تو تھا مگر انکارِ ذات بھی شامل تھا۔ کشفِ ذات تو تھا مگر کربِ ذات بھی موجود تھا۔ احساسِ ذات تو تھا مگر پاسِ ذات کے ہمراہ۔

اور تب مجھے وارث علوی یاد آ گئے تھے۔ "میں ایک فرد ہوں اور فرد کے طور پر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک بڑے ادارے کا پرزہ منظور نہیں" (ادب اور آدرش وابستگی شب خون نومبر ص ۱۷) مگر اس کے ساتھ شاعر کی یہ آواز بھی کہ۔ "میں اس کائنات کی ایک حقیر سی اکائی سہی لیکن اتنا یقین ہے کہ مجھے اپنے مرکز سے الگ کر کے یہ کائنات اپنی تکمیل کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔" (بے آسماں۔ صفحہ ۲۱)

شاعر کی آواز وارث علوی کی آواز میں مدغم ہوتی ہوئی لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ ہاں میں اپنے وجود کے آئینے میں صرف اپنے آپ ہی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے باہر جھانک کر دنیا دیکھنے کی خواہش نہیں کیونکہ دنیا تو خود میرے اندر گم ہے۔ تب ایک لمحے فکر یہ آیا کہ کیا مطالعہ ذات اور کشفِ ذات کے عمل میں فرد یا فن کار کائنات سے دور ہو جاتا ہے؟ کیا ذات کائنات میں اور کائنات ذات میں گم نہیں؟ تو کیا زمان و مکاں کا اس قدر تبدل کا کائنات اور ذات سے کوئی ازلی و ابدی رشتہ نہیں؟ اگر ہے تو پھر ہم جو دنیا سے لڑ رہے ہیں؟ کیا خود اپنے آپ سے نہیں لڑ رہے ہیں۔ ہماری یہ لڑائی خود اپنی ذات سے نہیں؟ پھر شاعر کا یہ کہنا بجا ہی تو ہے کہ۔

مرا ہی خون ہوا اور میں ہی قاتل ہوں
مرا ہی خون مرے قتل کے گواہ میں ہے
ہر نفس [illegible] ہے کمال
اپنی ہی ذات شکستہ اس کا

آج جب بے آسماں شاعر اپنی گذشتہ بیس سالوں کی ذہنی کاوشوں کا سرمایہ لے کر ایک بار پھر سامنے آیا ہے تو لگتا ہے دنیا بدلی کہاں ہے؟ ہاں کچھ آگے کو سرک آئی ہے۔ مسائل اب بھی وہی ہیں۔ مگر تھوڑی سی توسیع کے ساتھ تنہائی اب فرد کی تنہائی نہیں رہ گئی ایک عالم کی تنہائی ہو گئی ہے۔ کل شاعر نے کہا تھا۔

اٹھائے پھرتا ہوں بے شخصیت بدن اپنا
اور اپنے گم شدہ چہرے کو ڈھونڈتا ہوں میں

آج وہی شاعر اس "میں" کو ہم میں تبدیل کرتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

ہم اپنی پلکوں کے خیمے اٹھائے پھرتے ہیں
نہ جانے کب کہاں خوابوں کا قافلہ ٹھہرے
سلسلہ دل کا تھا میں نے درد سے جوڑا لے
درد کے رشتے سے عالم گیر ہونا بھی ہے
روح کے رزق — کا ملال کیا کرتے تھے
ہم کہ بے گھر نہ تھے گھر جہاں سے پہلے

کیا یک چہرگی یا بے چہرگی اب کئی چہروں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ کل تک اپنی بے چہرگی کے خوف سے پریشان رہنے والے انسان کو کلوننگ نے ایک نقلی چہرہ عطا کر دیا ہے جو اس جیسا ہو کر بھی وہ نہیں ہے۔ یعنی "میں" "میں" جیسا ضرور ہے مگر "میں میں" نہیں ہے۔ آج کے دور کا المیہ یہی ہے کہ ہم سب اپنے اندر ایک کلون لیے پھر رہے ہیں مگر کوئی یہ نہیں پہچان پاتا کہ کلون کون ہے اور "میں" کون ہے۔ اگر "میں" میں ہوں تو پھر کلون کون ہے اور اگر کلون "میں" ہے تو پھر میں کون ہوں۔ انکشافِ ذات، اندرونِ ذات اور بیرونِ ذات۔ اصل ذات اور عکسی ذات۔ یہ چکر ہی آج کے فرد کا مقدر بن گیا ہے شاید اسی لیے وہ زمین پر رہ کر بھی بے زمینی کا شکار ہے۔ آسمان اس کے سر پر ہے مگر وہ بے آسمان ہے۔

عبد اللہ کمال کی شاعری اسی بے اماں دور کے آسماں احساس کی شاعری ہے یہ سچ
ہے کہ آسمان کبھی اردو شاعری اور اردو شاعروں سے دور نہیں رہا۔ ان کے آس پاس یا
سر پر منڈلاتا رہا ہے۔ شاعر اسے اپنے لفظوں میں قید کرتے رہے۔ کیا بدلتا ہے رنگ
آسماں کیسے کیسے' یا بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا' یا آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا۔
یا زمین تنگ ہے' آسماں دور ہے' غرضیکہ کبھی آسمان ان کا دشمن رہا کبھی دوست۔
مگر یہ کیا کم تھا کہ ان کے سر پر ایک آسمان تو تھا جسے وہ طعنے دے کر دل کی بھڑاس نکال
لیتے تھے۔ آج کا شاعر تو بے اماں کا یوں شکار ہے کہ زمین اس کے قدموں سے نکل
جارہی ہے اور اس کے سر پر آسمان بھی نہیں رہا۔ اسی لیے تو عبد اللہ کمال کہتے ہیں۔

وہ قیامت تھی کہ ریزہ ریزہ ہو کے رہ گیا
اے زمیں! دیکھ کبھی اک آسماں میرا بھی تھا

مگر کمال اس ریزہ ریزہ آسمان سے ہمدردی رکھتے ہیں' دشمنی نہیں۔ یہی آج کی فکر
اور کل کی سوچ کا' آج کے ذہنی رویے اور کل کے ذہنی رویہ کا فرق ہے۔ بے آسمان
ہونے کے باوجود شاعر آسمان کا غم بلکہ پوری کائنات کا غم بن گیا ہے۔

چار جانب اک اکیلا آسماں
سوگوار' افسردہ' مجھ سا آسماں
دل زدوں کا دوست' شب گردوں کا یار
زخم زخم - دیدہ شب گریہ آسماں
چاند تارے ہیں کہ جیسے زخم ہیں
میرے دل کا عکس ہے یا آسماں

صنعتی دور کا یہ شاعر بے اماں ہونے کے باوجود بھی اپنی ذات سے ناامید ہے نہ
زندگی سے۔ بے اماں کے باوجود اس کے ہاں ایک احساس اماں موجود ہے۔ عدم تحفظ میں
تحفظ کا احساس' جو اسے بے اماں نہیں ہونے دیتا۔ ایک ان جانی' ان دیکھی مہربان طاقت
اسے اپنے سر پر' اپنی پشت پر محسوس ہوتی ہے اور یہی اسے ناسازگار حالات میں بھی جینے
کا حوصلہ اور شعور عطا کرتی ہے۔ عبد اللہ کمال کی شاعری میں یہ شعور نمایاں طور پر نظر
آتا ہے۔

نہ آسماں ہی مرا ہے نہ یہ زمیں لیکن
یہ کون ہے جو مرے سر پہ سائباں ہے یہاں

[illegible]

آنگن [illegible] تیرا [illegible] بہت [illegible] وہ [illegible] بھی

دستِ دعا ہے میرے باہر بھی کہیں ہے

ہر ایک جگہ کی یہی داستاں ہے بھائی
جہاں بھی جاؤ یہی آسماں ہے بھائی

جتنا آج کا انسان مشینوں سے قریب ہوتا جارہا ہے، اتنا ہی آج کا فن کار کائنات اور فطرت کے قریب ہوتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ کمال کے ہاں کائنات اور فطرت کے حسین استعارات زندگی کی تعبیر بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پھل، پھول، شجر، درخت، پتے، سمندر، ہوا اور ہواؤں میں اڑتے ہوئے پرندے یہ سب جدید غزل کے مقبول استعارے ہیں۔ عبداللہ کمال نے بھی ان استعاروں کو نئے نئے مفاہیم میں اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان معنوی وسعتوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ مثلاً ایک استعارہ جو ان کے اکثر اشعار میں ملتا ہے وہ ہے پرندہ۔ پرندہ کہیں دوست اور محبوب کے روپ میں آیا ہے، کہیں خواہش اور تمنا بن کر، کہیں خود اپنی ذات، کہیں انسانی وجود کی بے بسی اور کہیں سفاکی اور شاطر طاقتوں کا اور کہیں بلند عزائم کا استعارہ بن کر۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شاخِ دل سے دفعتاً سارے پرندے اڑ گئے
اور اچانک وہ بھی اک بھولا ہوا قصہ ہوا

میں اپنی ڈار سے بچھڑا ہوا پرندہ ہوں
مری اڑان ابھی درد کی نوح میں ہے

عجب اس کا ہنر ٹھہرا ہے قفس رکھنا پرندے کو
اور اس کے سامنے شاخِ شجر پر آشیاں رکھنا

اور یہ پوری غزل ہی پرندہ ردیف کے ساتھ کہی گئی ہے جس میں مختلف مفاہیم سامنے ہوتے ہیں۔

ہوابازی میں ماہر تھا پرندہ
ہوا شہ تھی، شاطر تھا پرندہ
ڈرا یوں تھا کہ تھی وسعت جہاں میں
گرا یوں تھا کہ آخر تھا پرندہ

ان کے علاوہ اپنی اور حقیقت گوئی کے استعارے جدید شاعری میں کم نہیں
ہیں مگر ہر عہد کے شاعروں کے ساتھ ان کے مفاہیم میں فرق ضرور آتا رہا ہے۔
عبداللہ کمال کی شاعری میں اس انداز میں استعمال ہوئے ہیں کہ ان کی شاعری کی فکری
سے معمور ہو کر خود ایک کل منظر بن گئی ہے اور یہ تعلق کی غزلوں کا خود ذاتی رویے کا
کلیش بن گیا ہے۔ ایک اور استعارہ جو کمال کی شاعری میں کثرت سے موجود ہے وہ ہے
شاہزادہ یا شہزادہ جس کا ذکر خود انھوں نے اپنے دیباچے میں بھی کیا ہے لہذا اس کی
تشریح یہاں ضروری نہیں لگتی البتہ اس سے ان کے فکر کی رسائی اور بلندی اور ان کی
نفسیات پر روشنی پڑتی ہے کہ شاعر دنیا اور زندگی کو سمجھنے کے لیے نہ فقیروں کا بھیس
بدلتا ہے نہ فقیر نہ صدا لگانے کا قائل ہے بلکہ ایک انداز شاہزادگی کے ساتھ کائنات کا
مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ شاہزادہ علامت ہے طاقت کی، شجاعت کی، ذہانت کی، مہم جوئی کی،
حق گوئی کی، سر فروشی کی۔

نوکِ نیزہ پہ بھی حرفِ حق ہی کہا دیکھو رقص کا
شاہزادے کے سر جو بھی الزام ہے وہ ترا نام ہے
چمک دے چاند کو، ٹھنڈک ہوا کو، دل کو امنگ
اداس قصے کو پھر ایک شاہزادہ دے

وحید اختر نے سچ کہا تھا کہ "نئی نسل کا مزاج نہ ترقی پسندوں سے ہے نہ اشاریت پسند
تحریک سے، وہ دونوں کے جان دار عناصر کے وارث ہیں اور اپنے زمانے اور اپنی زندگیوں سے
انصاف کرنا چاہتے ہیں" (اردو ادب کے تیس سال مطبوعہ ساتھ ہم قلم کراچی ص ۱۱)
اپنے سر پر تباہیوں کی گٹھری اٹھائے عبداللہ کمال بھی اپنے عہد میں انصاف کی اسی
ڈگر پر چل رہے ہیں۔

آئے وہاں نسل کے حصے میں رونق ہے ہوا
خوف، وحشت، نفرتیں اس عہد میں ہم پر تمام
یہ زہر زہر ہوائیں یہ برگ برگ گھٹن
صدا شہر میں ہر لمحہ بے اماں ہے مگر
میں کہ تنہا ہی شاعر ہے کمال
وہ رہنے کے لیے مگر میں [illegible]

عبداللہ کمال کی غزلوں میں ایک اور خوبی Parodo کا استعمال ہے۔ ان کے بہت متضاد اجزاء حامل ہیں۔ یعنی ایک مصرعہ میں کسی بات کی نفی ہے تو دوسرے ایک میں اثبات ہے تو دوسرے میں نفی۔ اثبات و نفی کے درمیان معنی کا چولی دامن کا ساتھ ہوا ہے جو غور کرنے پر سمجھ میں آتا ہے۔ مثلاً

اپنا کوئی خدا نہیں ہے (نفی)
یعنی تیرے سوا نہیں ہے (اثبات)
ہوئے سارے افق غرقاب میرے (اثبات)
ہیں خوش فہمی میں کچھ احباب میرے (نفی)
کوئی اس شہر میں کب تھا اس کا (نفی)
اسے یہ زعم کہ رب تھا اس کا (اثبات)
تو بھی ہے ابتدا سے لیکن (اثبات)
میری بھی انتہا نہیں ہے (نفی)

زبان میں شکست و ریخت یا ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ تو جدید غزل گویوں کے ہاں ظفر اقبال ہی سے شروع ہو گیا تھا جسے آگے بڑھایا محمد علوی اور بشیر بدر نے۔ عبداللہ کمال کے یہاں بھی ایک نئی زبان، نئے لفظیات اور نئے افعال ملتے ہیں مگر ان میں وہ بے معنی پن نہیں ہے جو ظفر اقبال کے ہاں نظر آتا ہے۔ مثلاً شہر جینا، غزل جینا، سمندر سوچنا،

کیا مرا شہر مجھے جاگتا ہوگا یوں ہی یا
تو مجھے چاہے جئے یا نہ جئے

اس کے علاوہ بعض الفاظ جیسے بے دنیا، خوش خوابیا وغیرہ۔ دل غم گینا، اس کے علاوہ کچھ فارسی تراکیب کی جدت مثلاً زخم زباں، شائستہ ایفاں، قید گراں، سنگ صدا خانہ، شورش افتادہ، قوس لا، ملفوف شب، شروع شور، جشن نو یافت، قید قیام، تکذیب بدن وغیرہ۔ اور کچھ فک اضافت سے بنی ترکیبیں۔ جیسے وصال شب۔ غزل دن۔ کا بوس زدہ شب۔ لہولذت۔ درد منظر۔ شجر گزیدہ۔

کچھ خوبصورت پیکر عبداللہ کمال کی شاعری کو حسن بخشتے ہیں۔ مثلاً
راہیں دھوپ روتی ہیں کہ شب اترتی رہی بوند بوند پلکوں پر، منظر جمود اوڑھتے ہیں،
اک دھند اتر رہی ہے مجھ میں۔

اس نئی زبان کے باوجود کہیں کہیں زبان کی غلطیاں بھی شاعری کا دامن پکڑ لیتی ہیں اور لگتا ہے اگر عبد اللہ کمال یہاں ذرا سا غور کرتے تو شاید یہ عیب نہ ہوتا۔ مثلاً

کب تلک کام آئیں گی دیمک زدہ بیساکھیاں
دو قدم بھر اپنے پیروں سے ذرا چل کر تو آ

یہاں 'بھر' کا لفظ بھرتی کا لگتا ہے۔ قدم بھر اپنے پیروں سے چل کر آیا" "دو قدم اپنے پیروں سے چل کر آنا" مناسب تھا۔

نہ پوچھ فتح میری کیوں شکست میں بدلی
کہ اک غنیم کا مخبر مری سپاہ میں ہے

یہاں 'ہے' کی بجائے 'تھا' کا محل ہے۔ مگر یہ شاید ردیف کی مجبوری تھی۔

سر غرور ہے مرا یہ کاسئہ گدا نہیں
اگر چہ اس کے سامنے (کبھی کبھی) جھکا بھی ہے

یہاں غالباً سر پُر غرور ہونا چاہیے تھا ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں ہر شاعر کے ہاں رہ پاتی ہیں مگر یہ دو چار اشارے محض اس لیے لکھ دیے ہیں کہ کمال صاحب اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"مجھ سے زیادہ میری تکفیر کوئی اور نہیں کر سکتا ــــــ اور مجھ سے زیادہ مجھے تسلیم بھی کوئی اور نہیں کر سکتا۔ ملا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی ہی شخصیت کے کچھ پہلو ایسے ہوتے ہیں جو ہماری اپنی ذات سے پوشیدہ' بیرون ذات زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ اور اسے سامنے والا ہی دیکھ پاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ادب میں نقد یا تنقید کی ضرورت نہ ہو۔ شاعر خود ہی اپنی شاعری اور اپنا ادبی مقام متعین کرے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا' چاہے شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو' اسے تنقید و احتساب کی منزل سے تو گزرنا ہی پڑتا ہے اور دنیا کو سمجھنے کے لیے بھی کچھ پہلو چھوڑ دینا بہت ضروری ہے۔ غالب لاکھ ڈھول پیٹتے رہے کہ ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے ـــــ یا اے اہل دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور۔ یا شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن۔ مگر جب تک اکرام اور بجنوری نہ پیدا ہو گئے غالب کو وہ مقام نہ مل سکا جس کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ میری خیال سے عبد اللہ کمال کو بھی کسی اکرام یا بجنوری کا انتظار کرنا چاہیے' صرف اپنے دیباچے سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔

انھوں نے فکری و ذہنی طور پر اپنا رشتہ میر اور غالب سے جوڑا ہے اور وہ بھی براہ راست درمیان میں کوئی نظر نہیں آتا۔

پہلے غالب کے گھر میں رہتی تھی
اب میرے گھر میں آگئی ہے غزل
پھر بھی عرض ہنر سے آگے کمال
کوئی غالب کہ میر سا کیا ہے
کہاں مجھ کو فراغ اتنا تشلط غم سے
میں غالب ہو چکا اب میر ہو رہا ہوں

مگر بہار، دلی اور پھر بمبئی آکر بس جانے کے اس طویل سفر میں میر اور غالب کے بعد ایک بڑا نام درمیان میں اور ہے جو عبد اللہ کمال کو اپنی آبائی سرزمین سے جوڑتا ہے اور وہ ہے یگانہ۔ یہی 'یگانیت' کمال کی غزلوں کا قصہ ہے۔

کون موجود ہے سوا میرے
اور جو ہے میرے سوا کیا ہے
آگے بڑھتا ہے روند کر خود کو
دوسرا کوئی راستہ کیا ہے
بت شکن میں ہوں، خود شکن بھی میں
دیکھ یہ تیشہ لا کیا ہے
کوئی اچھا نہیں ہے میرے سوا
خود ستائی یہی برا کیا ہے
کوئی پہچانتا نہیں مجھ کو
نہ سہی کوئی جانتا کیا ہے

اس یگانیت ہی نے بے آسماں ہونے کے باوجود کمال کی غزل کو وہ آسمان عطا کیا ہے جس کی وسعتیں بے کراں ہیں۔ اس بے کراں آسمان میں کمال کو یہ بلند پروازیاں مبارک ہوں"

اس دعا کے ساتھ، کہ

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

☆☆☆

بھی اپنے ساتھ لے آئے ہیں جو تم نے "مست مولا شاعر۔ مرزا غالب" کے عنوان سے لکھا ہے۔ بندۂ خدا! یہ تو بتاؤ کہ یہ کالم کیا بلا ہے۔ میں تو ایک "عالم" کو ہی جانتا تھا جسے میں "حلقۂ دام خیال" میں رکھا کرتا تھا۔ یہ کالم کوئی نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے بتایا کہ لکھنے کے ذریعہ تم جو صفحے کے صفحے کالے کرتے ہو تو اسے "کالم" کہتے ہیں۔ کالے کرتوتوں کو بیان کرنے کے لیے اچھی ترکیب نکالی ہے۔ تمھارے کالم کے مطالعہ سے پتا چلا کہ میری دو صد سالہ سالگرہ تقاریب کی خبر کو نشر کرتے وقت ایک ٹیلی ویژن چینل نے مجھے "اردو کا مست مولا شاعر" قرار دیا تھا۔ بھائی میرے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔ اب یہ بھلا ٹیلی ویژن کیا بلا ہے۔ کسی نے بتایا کہ گھر بیٹھے دنیا کا حال دکھائی دیتا ہے۔ بٹن دباؤ تو باہر کے لوگ گھر میں گھسے چلے آتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو گھر کی پردہ دار بیبیاں کہاں چلی جاتی ہیں۔ کیا نامحرموں کے سامنے بے پردہ بیٹھی رہتی ہیں۔ ہائے کیا زمانہ آگیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ٹیلی ویژن پر ایسی نازنینوں کے رقص بھی دکھائے جاتے ہیں جن کے بدن پر انگوٹھی، ٹھمکوں اور گھڑی کے سوائے کوئی قابل لحاظ لباس نہیں ہوتا۔ میں تو لباس مجاز کو ہی دیکھتا رہ گیا۔ کبھی لباس غیر مجاز کی طرف دھیان نہیں گیا۔ افسوس کہ میرے زمانے میں یہ سہولت نہیں تھی ورنہ میں ڈومنی کے کوٹھے پر کیوں جاتا۔ بٹن دبا کر اسے یہ نفس نفیس گھر میں ہی بلا لیتا۔ اب اپنی قبل از وقت موت پر آنسو بہاتا ہوں:

ع کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اور سناؤ وہاں کا کیا حال ہے۔ تم حال نہ بتاؤ تو تب بھی مجھے معلوم ہو ہی جاتا ہے۔ لو ایک واقعہ سنو۔ پچھلے دنوں ایک صاحب جو مرنے سے پہلے دلی میں رہا کرتے تھے عالم بالا میں آئے تو ان کے اعمال کے مطابق منکر نکیر نے انھیں دوزخ میں بھیج دیا۔ دوزخ میں پہنچ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے مجھ گنہگار کو جنت میں بھیج دیا۔ اس پر منکر نکیر نے کہا "بندۂ شیطان! یہ جنت نہیں دوزخ ہے دوزخ"۔ بولے "اگر یہ سچ مچ دوزخ ہے تو تب بھی میں اسے جنت ہی سمجھوں گا کیونکہ مجھے تو یہاں کے حالات دلی کے حالات سے بہتر نظر آتے ہیں۔"
بس مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم وہاں کس حال میں ہو۔ اور ہاں پچھلے دنوں ایک سیاسی رہنما بھی ہندستان سے آئے تھے۔ دوزخ میں جانے سے پہلے دوزخ کے داروغہ سے بار بار کہہ رہے تھے کہ انھیں دوزخ کے ایرکنڈیشنڈ حصہ میں رکھا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ

تو جیلوں میں بھی ایرکنڈیشنڈ کمروں میں رہنے کے عادی رہے ہیں۔ مجھ کو ذرا یہ بتاؤ کہ یہ ایرکنڈیشنگ کیا بلا ہے۔ تاہم مجھے اس وقت اپنا ایک شعر یاد آ گیا:

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ایک دلچسپ بات اور سنو۔ تمھارے بچپن کے دنوں کے مشہور گلوکار عزیزی کے۔ ایل۔ سہگل بھی اکثر میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ بہت بھلے آدمی ہیں۔ میرے ہم مشرب نہ سہی "ہم مشروب" تو ہیں۔ میرے نام لیوا اور عقیدت مند ہیں۔ بتا رہے تھے کہ نیچے کی دنیا میں میری شہرت کو دس بارہ چاند لگا کر آئے ہیں۔ اس واسطے کہ انھوں نے میری غزلوں کو اپنی مخصوص آواز میں گایا ہے۔ دو ایک بار نمونہ کے طور پر میری دو چار غزلیں گا کر بھی سنائی تھیں۔ آواز تو اچھی ہے مگر گلے میں خراش کا عنصر کچھ زیادہ ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کہتے ہیں کہ ان کے گلے میں بڑا سوز اور بڑا درد ہے۔ ہو سکتا ہے منشی جی ٹھیک کہتے ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اگر کے۔ ایل۔ سہگل اپنے گلے کے درد کا علاج کرا لیتے تو اور بھی اچھا گا سکتے تھے۔ میں نے دو ایک شعروں پر داد دی تو یوں جھک جھک کر آداب کرنے لگے جیسے یہ غزل میں نے نہیں انھوں نے کہی ہو۔ اس سے اندازہ ہوا کہ بے حد مہذب اور شایستہ آدمی ہیں۔ اور ہاں یہ گانے کے بیچ میں کھانستے بھی ہیں۔ میں نے سمجھا کہ شاید کھانسی ہو گئی ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ہندستان کی موسیقی میں اب کھانسی بھی موسیقی کا حصہ بن گئی ہے۔ جب ہم "ضرورت شعری" کے تحت شاعری میں دست درازی کرتے ہیں تو گانے والے "ضرورت موسیقی" کے تحت کیوں نہ کھانسیں۔ مجھے تو بس اتنی شکایت ہے کہ کھانسی کے دوران میں میرے بعض شعر وزن سے گر جاتے ہیں۔ میں نے اس بات کی شکایت کی تو بڑی معصومیت سے بولے "حضور! صرف شعر ہی تو گرا رہا ہوں۔ آپ کو تو نہیں گرا رہا ہوں۔" اب ایسے معصوم شخص سے میں اور کیا بحث کرتا۔ اور ہاں ہندستانی کلاسیکی موسیقی کے ایک استاد بھی مجھ سے ملنے بطور خاص آئے تھے۔ ایک دن میری غزل "نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے" گانے کے لیے بیٹھ گئے۔ ماشاءاللہ آواز بہت اچھی پائی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گلے میں اتنا درد نہیں ہے جتنا کہ سہگل کے ہاں پایا جاتا ہے۔ غزل بہت اچھی گائی لیکن خرابی یہ دیکھی کہ اچھا بھلا گاتے گاتے کسی ایک لفظ کو بار بار دوہرانے لگتے ہیں اور راگ الاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے

تو انھوں نے شعر کے "غم دل" کو اچھی طرح اپنے گلے کی گٹھلی میں جکڑ لیا۔ پھر "غم دل" کی گردان شروع کی تو کچھ اس طرح کی اور اتنی مرتبہ کی کہ دل کا سارا غم نچوڑ کے رکھ دیا۔ پھر نچوڑے ہوئے دل کو پرے پھینکا تو اچانک "کلو گلس" پر ٹوٹ پڑے۔ پھر بیچ میں نہ جانے کیا آئی کہ نکتہ کو بھی ہٹا کر رکھ دیا اور "گلس" کے پیچھے پڑ گئے۔ اب جو انھوں نے "گلس گلس گلس" کا ورد شروع کیا تو بسیا میں بھی گلس بول گیا۔

میرزا مجتبیٰ! ذرا ادھر آؤ میرے پاس آن بیٹھو۔ دل لگی کا ایک قصہ اور سنو۔ قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام رہتے تو یہیں خلد آباد میں ہیں لیکن تم حیرت کرو گے کہ آج تک ان ماہرین غالبیات سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ تینوں مجھ سے منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ ایک دن میں نے میر مہدی مجروح کے ذریعہ پیغام بھجوایا کہ بندگان خدا کبھی تو آن ملو۔ تینوں نے بیک زبان ہو کر میاں مہدی سے کہا "ہم کیوں غالب سے ملنے جائیں۔ ہم تو ماہرین غالبیات ہیں۔ کیا تم غالب اور ماہرین غالبیات کا فرق بھی نہیں جانتے۔ غالب کو خود چل کر ہمارے پاس آنا چاہئے۔ غالب نے جو بھی زندگی گزاری تھی وہ تو پندرہ فروری ۱۸۶۹ء کو ہی اس کی طبعی موت کے بعد ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جس غالب کو ہم نے دریافت کیا ہے یا دوبارہ پیدا کیا ہے وہ تو ہماری تخلیق ہے۔ غالب جیسے شخص کی زندگی کی بازیافت کے لیے ہم تینوں نے اپنی بیش قیمت زندگیاں ضائع کی ہیں۔ ہمارے غالب کا اس غالب سے کیا تعلق جو ۱۸۶۹ء سے پہلے اس دنیا میں زندہ تھا۔"

اس کے جواب میں میر مہدی مجروح نے کہا "حضور والا! غالب کی زندگی کی بازیافت کے لیے آپ حضرات بلاوجہ قدیم تذکروں اور مخطوطات وغیرہ کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ کیوں نہیں آپ خود چل کر غالب سے پوچھ لیتے۔" مولانا امتیاز علی عرشی بولے "آپ بھی کس کا ذکر لے بیٹھے۔ غالب کے قول اور فعل کا بھی کوئی بھروسہ ہے۔ اب یہی دیکھو کہ مذاق مذاق میں یہ بات اڑا دی کہ اس کے فارسی کلام کے استاد کوئی ملا عبدالصمد تھے۔ ہم برسوں سے اس استاد کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ پچھلے دنوں خلد آباد میں کسی ملا عبدالصمد کی فارسی دانی سے متاثر ہو کر مالک رام یہ جاننے کے لئے اس کے پیچھے پڑ گئے کہ کہیں وہ تو غالب کے فارسی کلام کا استاد نہیں ہے۔ ارے صاحب وہ تو اس بات پر اتنا مشتعل ہوا کہ ہاتھاپائی کی نوبت آ گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ قاضی عبدالودود نے بیچ میں پڑ کر ملا عبدالصمد کو مالک رام سے الگ کیا۔ جب

بھی یہ جعلی عبدالصمد' مالک رام کی شیروانی کے اوپر کے دو بٹن لے گیا۔"

میر مہدی مجروح کی زبانی یہ واقعہ سن کر میں بہت ہنسا۔ واللہ باللہ مجھے ان ماہرین غالبیات سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مجھ سے نہیں ملنا چاہتے تو نہ ملیں لیکن یہ مخلوطات کی گرد میں اپنے گز گز بھر ہاتھ کیوں اٹائے پھرتے ہیں۔ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ تم ہی بتاؤ مجھے ان سے کیا لینا دینا ہے۔ یوں بھی میرے کام تو چلتے ہی رہتے ہیں:

ع غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

میں نے سنا ہے کہ تمہارے ہاں ماہرین غالبیات کی بڑی عزت ہے اور وہ میرے سیمیناروں میں شرکت کی خاطر ہوائی جہازوں میں اڑے پھرتے ہیں اور بھاری معاوضوں سے اپنی جیبیں بھرتے ہیں۔ ہر آدمی اپنا رزق اپنے اپنے ڈھنگ سے کماتا ہے۔ بھائی میرے یہ تو بتاؤ کہ میں نے اپنی پنشن کے لیے جو عرضیاں دی تھیں ان کا کیا ہوا۔ مجھے تو اپنی تنگدستی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔

تمہارے کالم سے پتا چلا کہ عزیزی جگجیت سنگھ نے میری مشہور غزل "ہزاروں خواہشیں ایسی کی ہر خواہش پہ دم نکلے" کو گاتے ہوئے یہ شعر بھی مجھ سے منسوب کر دیا:

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

تم نے اپنے کالم میں اس شعر کے بارے میں شبہ ظاہر کیا کہ یہ شعر میرا نہیں ہو سکتا۔ اس پر کئی اصحاب نے حوالوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ شعر میرا ہی ہے۔ تم نے پریشان ہو کر اس معاملہ کو دو جید ماہرین غالبیات شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کے علاوہ "آج کل" کے مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی سے رجوع کیا۔ میاں یہ تمہاری شرارت نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک ہی شعر کے پیچھے تین تین نامی گرامی "فاروقیوں" کو لگا دیا۔ خیر بعد میں عزیزی کالی داس گپتا رضا نے یہ کہہ کر تمہاری مشکل آسان کر دی کہ یہ شعر بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ مگر سنا ہے کہ اب بھی، کچھ ستم ظریف مندرجہ ذیل شعر کو مجھ سے منسوب کرنے پر اصرار کر رہے ہیں:

ذرا دے زور سینہ پر کہ تیر پر ستم نکلے

جو یہ نکلے تو دل نکلے' جو دل نکلے تو دم نکلے

بھائی میرے! میں نے کبھی ایسے دفتری شعر نہیں کہے جن میں ہر کام "تھرو پراپر چینل" انجام پاتا ہو۔ یعنی پہلے تو سینے سے تیر پر ستم نکلے اور تیر پُرستم نکلے تو پھر دل نکلے۔ اور اگر دل نکل جائے تو اس میں سے بالآخر دم نکلے۔ بھیا! یہ شعر ہے یا کسی دفتر کی فائیل۔ ایسے چونچلوں والے شعر داغ دہلوی یا نوح ناروی وغیرہ کے تو ہو سکتے ہیں میرے نہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں نے دل کے معاملہ میں کبھی احتیاط نہیں برتی بلکہ میں تو بوقت ضرورت دل بھی بازار سے لے آتا تھا۔ اب اگر کوئی مجھے "مست مولا شاعر" کہتا ہے تو کہنے دو۔ تم کیوں ناحق پریشان ہوتے ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ مجھے شاعر تو تسلیم کرتا ہے۔ چاہے وہ مست مولا ہو یا بدمست مولا۔ اگر وہ مجھے شاعر بھی نہ مانے تو تم کیا کرلو گے۔ اور میں تو کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

میاں مجتبیٰ! بہت عرصہ پہلے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر یہ شعر کہا تھا:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا' ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا' نہ کہیں مزار ہوتا

میں نے یہ شعر اس لیے کہا تھا کہ میرے مرنے کے بعد اگر کسی نے میرے مزار کی طرف توجہ نہ کی تو میرے مزار کی جو بے حرمتی ہونی ہے سو ہو گی۔ میری بھی کچھ کم نہ ہو گی۔ اس خیال سے غرق دریا ہونے کو بہتر جانتا تھا۔ مگر خدا بھلا کرے بیگم حمیدہ سلطان کا کہ پچھلے چالیس برسوں سے ہر سال میرے یوم وفات پر میرے مزار کے احاطہ میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کرتی ہیں اور نامی گرامی عمائدین شہر کو بلاتی ہیں۔ یقین مانو جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے مجھے اپنے "یوم وفات" کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ تم سوچو گے بھلا کوئی اس طرح بھی اپنے "یوم وفات" کا انتظار کرتا ہے۔ مگر میں تو کرتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے۔ سنا ہے کہ اس سال کی تقریب میں تین تین سابق گورنروں کو مہمانان خصوصی کے طور پر مدعو کر رکھا ہے۔ سابق کی پابندی غالباً اس لیے رکھی ہے کہ میں بھی تو سابق شاعر ہوں۔ کیا کروں میرا سابقہ بھی تو "سابقوں" سے ہی پڑتا رہتا ہے۔ یوں بھی میرے معاملات میں اب "لاحقے" کم اور "سابقے" زیادہ نظر آتے ہیں۔ اگر زندہ ہوتا اور یہ تینوں گورنر برسر اقتدار ہوتے تو کیا مجال جو میرے قصیدوں کی زد میں آنے سے بچ رہتے۔ بیگم حمیدہ سلطان کو میرا اسلام پہنچاؤ اور کہو کہ میرے یوم وفات پر میرے

کسی مصرع طرح پر۔ تو سالانہ مشاعرے منعقد ہوتے ہیں انھیں میں اپنے مزار میں پڑے پڑے بہت غور سے سنتا ہوں۔ میری تو خیر مجبوری یہ ہے کہ میں مزار سے اٹھ کر بھاگ نہیں سکتا لیکن ان مظلوم سامعین کو کس نے روکا ہے۔ کیا فیویکول سے چپکائے جاتے ہیں۔ شاعر سوچ سمجھ کر شعر نہ کہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن سامع بھی سوچے سمجھے بغیر داد دے سکتا ہے یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں سخنوری کو اتنا اہم نہیں مانتا جتنا کہ سخن فہمی کو۔

میرزا مجتبیٰ! نامہ طویل ہوتا جارہا ہے اور ادھر حوران خلد میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں کہ میں نامہ کو یہیں ختم کردوں۔ پوچھ رہی ہیں کہ کس نابکار کو اتنا طویل نامہ لکھا جارہا ہے۔ یہ حوران خلد بھی عجیب و غریب مخلوق ہیں۔ ان کے حسن کا عالم کیونکر بیاں کروں۔ بیچاری اردو زبان میں یہ تاب اور یہ مجال کہاں کہ ان کے حسن کا احاطہ کرسکے۔ مگر ایک راز کی بات سنو۔ حسن کی اتنی فراوانی اور افراط و تفریط کے باوجود حوران خلد میں مجھے وہ صورت نظر نہیں آتی جس کے لیے میں شعر کہا کرتا تھا۔ یقین مانو ان کی صحبت میں میرا جی بالکل نہیں لگتا۔ ہر آن دسیوں حوران خلد میرے آگے پیچھے منڈلاتی رہتی ہیں۔ میری ایک نگاہ التفات کے لیے ایک دوسرے پر گری پڑتی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میں ایسے وصل کا کبھی خوگر نہیں رہا جس کے پیچھے ہجر کی لمبی راتیں نہ ہوں' ٹھنڈی آہوں کا ہجوم نہ ہو' چاک کیے ہوئے گریبانوں کا ڈھیر نہ ہو' ظالم سماج کا آہنی شکنجہ نہ ہو' قاصد کا سہارا اور دربان کی لعن طعن نہ ہو' رقیب کی ریشہ دوانیاں اور ناصح کی لن ترانیاں نہ ہوں۔ سچ مانو میں تو یہاں آکر "وصل کی بد ہضمی" کا شکار ہو گیا ہوں۔ ایسا وصل فرشتوں کے بس میں ہو تو ہو انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ طویل نامہ بھی تمھیں صرف اس خیال سے لکھ رہا ہوں کہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی "وصل کے عذاب" سے تو بچا رہوں۔ لو یہ دیکھو۔ حوران خلد نے نامہ کو زبردستی میرے ہاتھ سے چھیننا شروع کردیا ہے۔ اب کیا خاک لکھوں:

نامے کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

تم سے نجات کا طالب

غالب

نصرت ظہیر
۱۱-۲۰۵ ڈی پور، دہلی ۹۱

طنز

مسئلہ تذکیر و تانیث

انگریزی زبان میں اور چاہے کتنی بھی خامیاں ہوں لیکن یہ بات بڑی اچھی ہے کہ اس میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ اتنا شدید نہیں جتنا اردو میں ہے۔ مسئلہ تو خیر یہ ہندی زبان میں بھی ہے لیکن ہندی چونکہ راشٹر بھاشا ہے اس لیے اسے سات خون معاف ہیں چنانچہ کوئی کچھ نہیں بولتا' جس کے جو جی میں آتا ہے' کہتا رہتا ہے' جب کہ اردو والے اتنے ذکی الحس واقع ہوئے ہیں کہ اگر کوئی کسی لفظ کی تذکیر یا تانیث میں ایک مرتبہ گڑبڑ کردے تو ناراض اور دوسری یا تیسری مرتبہ کردے تو بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

انگریزی کا معاملہ خوب ہے۔ فری اسٹائل زبان ہے۔ جو بھی جس طرح چاہے بول اور لکھ پڑھ سکتا ہے۔ شیڈول Schedule کو آپ آرام سے اسکیڈول بولیے کوئی کچھ نہیں کہے گا اور اگر کہے بھی تو پورے رعب سے کہہ دیجیے یہ امریکن انگلش ہے' مجال ہے جو کوئی چوں بھی کر جائے (امریکہ کے آگے تو اب چین بھی چوں نہیں کرتا صرف چیں کر کے رہ جاتا ہے)۔ پھر کسی اور محفل میں اسی لفظ کو اچیڈول کہہ دیجیے وہاں بھی کوئی زبان کھولے تو یہ کہہ کر ڈانٹ دیجیے کہ چپ! خبردار!! یہ جرمن انگلش ہے۔ پھر دیکھیے کس طرح سب کے سب ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ عربی میں بھی لفظ مزے سے جدول بولا جاتا ہے۔ مگر خیر' انھیں کون کچھ کہہ سکتا ہے' وہ تو اسے اپنی ہی زبان کا لفظ مانتے ہیں۔ ویسے بھی ان کا اصول ہے کہ سب کچھ اپنے حساب سے اور مزاج سے بولتے ہیں اور نہیں بھی بولتے ہیں۔

مثلاً .... عربی میں "گ" نہیں ہے پھر بھی بولتے ہیں۔ اور "ج" ہے پھر بھی نہیں بولتے' بلکہ "ج" کی جگہ بھی "گ" بولتے رہتے ہیں۔ اس مثال کی ایک مثال یہ ہے کہ جمال عبدالناصر کو عرب والوں نے ہمیشہ گمال عبدالناصر کہا اور اللہ جل جلالہ کو آج بھی اللہ گل گلالہ کہتے ہیں۔ یعنی ظالموں کو خدا کا بھی خوف نہیں۔

تاہم الفاظ، املا اور تلفظ کی ہیرا پھیری میں انگریزی تمام زبانوں سے آگے ہے۔ انگریزی ڈکشنریاں مرتب کرنے والوں کا عجیب حال ہے۔ انھوں نے بھی خوب کمال دکھائے ہیں۔ یہاں کا لفظ وہاں اور وہاں کا لفظ نہ جانے کہاں ڈال دیا ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ "نائف" یعنی چاقو "ک" کے تحت ملتا ہے تو نمونیہ "پ" کے باب میں۔ اسی طرح سائکالوجی (نفسیات) ہونی چاہیے "س" کے تحت مگر وہ ملے گی "پ" کے ماتحت، جبکہ اسی باب میں آپ سائکل ڈھونڈیں گے تو کہیں نہیں ملے گی۔ وہ ملے گی اس حرف کے تحت جو پکارا تو "سی" کے نام سے جاتا ہے مگر آواز دیتا ہے کبھی "ک" کی تو کبھی "چ" کی اور کبھی "س" کی، چنانچہ آپ کو سائکل کے علاوہ کیٹ یعنی بلی بھی اسی میں ملے گی اور "چارٹ" یعنی نقشا بھی وہیں نظر آئے گا، یہاں تک کہ شراڈ (Charade) یعنی چیستاں بھی اسی میں مل جائے گا۔

لہٰذا یہی وجہ تھی کہ ایک مشہور لطیفے میں کیمسٹری کو چیمسٹری بولنے والے چوپڑا جی کو ایک انگریز نے جل بھن کر مسٹر کھوپڑا کہنا شروع کردیا اور مسٹر چوپڑا اس کا کچھ بھی نہ کر سکے۔

یہی حال "جی" (G) کا بھی ہے۔ اس حرف کا کوئی ٹھکانہ نہیں کب کیا آواز نکال دے۔ کسی لفظ کے شروع میں آئے گا تو عام طور پر "گ" کی آواز دے گا لیکن جغرافیہ اور جبرئیل بھی اسی کے تحت مل جائیں گے۔ یہی "جی" بیچ میں آئے تو الجبرا میں "ج" کی اور میگنٹ (مقناطیس) میں "گ" کی آواز دے گی۔ لیکن ایچ کے ساتھ مل جائے تو کبھی "ف" بن جائے گی (جیسے رف۔ Rough) اور کبھی بالکل ہی غائب ہو جائے گی (جیسے ہائی۔ High)۔

لیکن اس تمام گڑبڑ گھوٹالے کے باوجود انگریزی میں تذکیر و تانیث کے معاملے میں کوئی ایسی خاص پیچیدگی نہیں ہے۔ سیدھا سادا حساب ہے۔ "ہی" مذکر ہوتی ہے اور "شی" مؤنث ہوتا ہے۔ اس حساب سے جانداروں میں نر مذکر ہے اور مادہ مؤنث مگر بے جان چیزیں نہ مذکر ہوتی ہیں نہ مؤنث۔ بس "اِٹ" اور "دیٹ" کے دائرے میں گھومتی رہتی ہیں، البتہ بحری جہاز اور ملکوں کے لیے جنس مقرر کردی ہے اور ان کے لیے "شی" اور "ہر" کا استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ جہاز دخانی ہو یا ملک افریقی انگریزی میں مؤنث ہی رہیں گے۔

مگر ایک لطف کی بات ہے۔ جانداروں کے لیے اگرچہ انگریزی میں تذکیر و تانیث کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ تاہم خود اپنی جنس انگریز حضرات کبھی نہیں بتاتے۔ حالانکہ جنس

معاملات میں وہ خاصے آزاد خیال سمجھے جاتے ہیں۔ انگریز اور انگریزی داں حضرات جب بھی فرسٹ پرسن میں بات کرتے ہیں تو اپنی جنس پر ایسا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا وہ بول رہا ہے یا بول رہی ہے۔ "میں آیا ہوں" اور "میں آئی ہوں" دونوں کی انگریزی' انگریزی زبان میں ایک ہے۔ "آئی ہیو کم!"

یہی وجہ ہے کہ ہم انگریزی کے ان ادبی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ عموماً نہیں کرتے جو صیغہ واحد متکلم میں لکھے گئے ہوں کیونکہ ان میں مسئلہ یہ رہتا ہے کہ ہم آدھی کہانی (اور کبھی کبھی تو پوری کہانی) پڑھ کر بھی یہ نہیں سمجھ پاتے کہ بیان کرنے والا مذکر ہے یا مؤنث' تاوقتیکہ کہانی میں اس کے شوہر یا بیوی کا ذکر نہ آ جائے۔

فرسٹ ہی نہیں سیکنڈ پرسن اور کبھی کبھی تھرڈ پرسن کی جنس بھی واضح نہیں ہو پاتی۔ چنانچہ تم آئے ہو' یا تم آئی ہو اور وہ آئے ہیں کو بھی ایک ہی طرح سے بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی میں بیشتر اشخاص کی جنس غیر واضح رہتی ہے اور اس کا صرف دوسری علامتوں سے ہی ٹھیک پتا چل پاتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی دوسری علامتیں بھی غیر واضح ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ میاں عبدالقدوس نے نوعمر انگریز سیاحوں کی ایک ٹولی کو کناٹ پلیس میں دیکھا تو بولے

"اگر طوطا بول رہا ہو تو مذکر ہے اور بول رہی ہو تو مؤنث! سمجھے؟ اب بیٹھ جاؤ اور گرامر یاد کرو۔"

اس روز ہم تمام دن یہی سوچتے رہے کہ یا اللہ! یہ کیسے پتا چلے گا کہ طوطا بول رہا ہے یا بول رہی ہے۔

ان ہی دنوں گھر پر ایک دن گرامر کا سبق یاد کرتے کرتے ہم گھر میں آئی ہوئی دور کے رشتے کی ایک بزرگ خالہ سے پوچھ بیٹھے۔

"خالہ اماں آپ مذکر ہیں یا مؤنث؟"

یہ سنتے ہی خالہ اماں نے ہماری کمر پر دو ہتڑ جما دیے اور بولیں۔

"ہٹ موئے　دو بالشت کا چھوکرا اور بوڑھی بیوہ سے مذاق کرتا ہے؟ آ تو سہی' ابھی تیری ہڈی پسلی ایک کرتی ہوں۔"

وہ دن اور آج کا دن' ہم نے دوبارہ کبھی کسی سے اس کی جنس معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دراصل جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں' اردو میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا

نازک اور پیچیدہ ہے۔ ہمارے ہاں' انگریزی کے برعکس' جانداروں کے علاوہ بے جان چیزوں کے لیے بھی تذکیر و تانیث طے کرنی پڑتی ہے اور مشکل یہ ہے کہ وہ بھی کسی طے شدہ اصول کے بغیر!

ویسے موٹے طور پر بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث طے کرنے کے لیے اس آمرانہ' جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ اصول کی پابندی کی جاتی ہے کہ جو چیز دیکھنے میں بڑی اور طاقتور ہو وہ مذکر اور چھوٹی اور کمزور ہو وہ مؤنث۔ مثلاً بڑا لوٹا مذکر ہے لیکن چھوٹا لوٹا مؤنث ہو کر لٹیا بن جاتا ہے۔ اسی طرح پر آٹا مذکر ہے توروٹی مؤنث اور چپاتی اور بھی زیادہ مؤنث۔

اور بھی سیکڑوں چیزیں ہیں جیسے پہاڑ اور پہاڑی' دریا اور ندی' شہر اور بستی' محل اور جھونپڑی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہاں بھی ایک قباحت ہے۔ پہاڑی پہاڑ سے چھوٹی ہوتی ہے لیکن ٹیلہ پہاڑی سے چھوٹا ہوتا ہے پھر بھی مذکر کہلاتا ہے۔ اسی طرح ندی کے مقابلہ میں نالہ' بستی کے مقابلہ میں محلّہ اور جھونپڑی کے مقابلے میں گھونسلہ چھوٹا ہونے پر بھی مذکر بن جاتا ہے۔

ٹرک' کار اور ٹمپو
کوٹ' قمیص اور بنیان
تہمد' پتلون اور نیکر
قالین' دری اور غالیچہ
تربوز' نارنگی اور آلو بخارا

یہ چند مثالیں ہیں جن میں بڑی چیز مذکر ہے' اس سے چھوٹی مؤنث مگر مؤنث سے چھوٹی اور کمزور پھر مذکر بن گئی ہے۔

پھر کئی معاملوں میں بڑے اور چھوٹے کی بھی تمیز نہیں ہے۔ مثلاً دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد بڑی ہونے پر بھی مؤنث ہے جب کہ اس کے قریب جین بھائیوں کا چھوٹا سا لال مندر مذکر کہلاتا ہے۔

کرسی اور اسٹول' کتاب اور کتابچہ' رضائی اور کمبل اور دہلی و ہونولولو' کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے کہ مؤنث بڑی ہے اور مذکر چھوٹا!

اب آپ ہی بتائیے' ان حالات میں تذکیر و تانیث طے کرنے کا کوئی واضح اصول کیسے بن سکتا ہے۔ پھر ایک جھگڑا یہ ہے کہ لوگوں نے خود بھی اپنی اپنی تذکیر و تانیث طے کر

رکھی ہیں۔ مثلاً دلی میں جو یوپی والے ہیں وہ دہلی انتظامیہ کو مذکر مانتے ہیں جبکہ بہار کی طرف کے لوگ اسے مؤنث کہتے ہیں اور جو لوگ نہ یہاں کے ہیں نہ وہاں کے وہ سرے سے اس کے وجود کو ہی نہیں مانتے۔ اکثر پوچھتے رہتے ہیں کدھر ہے دہلی انتظامیہ' کہاں ہے میونسپل کارپوریشن؟

ویسے مشرقی یوپی اور بہار کی طرف کے اردو دانوں کی بات ہی الگ ہے۔ یہ لوگ اردو کے معاملے میں پورے انگریز ہیں اور اسے اپنی مرضی سے جس طرح چاہتے ہیں' استعمال کرتے رہتے ہیں۔ تذکیر و تانیث کی بات تو جانے دیں' واحد اور جمع کا بھی خیال نہیں رکھتے۔

ایک صاحب ہیں' غالباً بہار کی طرف کے' وہ ریڈیو پر کرکٹ کی کمنٹری سناتے ہیں۔ کھیل کا حساب وہ ہمیشہ اس طرح بتاتے ہیں کہ "سری کانت نے ۸۵ رن بنایا ہے اور شاستری کے ایک رن بنے ہیں۔ مظفر نگر نے' معاف کیجیے' مدثر نذر نے چھ اوور گیند پھینکا ہے اور وسیم اکرم کے ابھی ایک اوور گیر پورے ہوئے ہیں۔ اس وقت دوپہر کا سوا بارہ بجا ہے اور امید کرنی چاہیے کہ جب ایک بجیں گے اور لنچ کے بعد کی کھیل شروع ہوگی تب تک وکٹ اور دھیما کھیلنے لگے گی' تو آئیے تب تک میں آپ کو اسٹوڈیو واپس لیے چلتی ہوں۔ معاف کیجیے چلتا ہوں!"

تذکیر اور تانیث کا کوئی واضح اصول نہ ہونے کی ہی وجہ ہے کہ اردو کے ہزاروں ادیب اور شاعر لاکھ سر مارنے پر بھی آج تک بلبل جیسے حقیر و فقیر پرندے کی جنس طے نہیں کرپائے ہیں۔ بلبل کی جنس پر اتنے ادبی جھگڑے اور فساد برپا ہو چکے ہیں کہ کچھ نہ پوچھیے۔ شاعروں نے اپنی اپنی ضرورت اور قافیہ ردیف یا مضمون کی مناسبت سے اسے مذکر اور مونث دونوں طرح باندھا ہے۔ کسی شاعر کے جی میں آیا تو اس نے کہہ دیا۔

دھیرے دھیرے آرے بادل دھیرے دھیرے آ

میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا

اور کسی دوسرے شاعر کی طبیعت آئی تو اس نے لکھ دیا۔

ایک تھا گل اور ایک تھی بلبل دونوں چمن میں رہتے تھے

پھر یہ خیال کرکے کہ بات بالکل پکی ہو جائے اس سلسلہ میں اپنے بزرگ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ مصرعہ لگا دیا کہ۔

ہے یہ کہانی بالکل سچی میرے نانا کہتے تھے!

ایک مرتبہ ہم نے مسئلۂ بلبل کے سلسلہ میں میاں عبدالقدوس سے رجوع کیا تو انھوں نے فرمایا......

"تذکیر و تانیث مزاج اور تنزل کا معاملہ ہے۔ جہاں تک بلبل کی جنس کا تعلق ہے تو اپنے موقف کی تائید میں ایک مرتبہ میں نے یہ شعر فی البدیہہ کہا تھا۔

ان کا جو صیغہ ہو وہ اہلِ گرامر جانیں
میرا بلبل تو مونث ہے جہاں تک پہنچے!

امید ہے اس سے میرا موقف واضح ہو گیا ہوگا۔"

"لیکن آپ نے مونث بلبل کو بھی میرا کہا ہے۔ اس سے بات پھر الجھ گئی ہے۔"

"الجھ نہیں گئی الجھائی گئی ہے اور اسی کو استادی کہتے ہیں۔ بہر کیف بلبل کے مسئلے کا حل میرے نزدیک یہ ہے کہ بلبل کو مونث مان لیا جائے۔"

"تو پھر مذکر بلبل کو کیا کہیں گے؟" ہم نے پوچھا۔

"بلبلہ!" انھوں نے جواب دیا۔

فارم حسب قاعدہ

بابت "کتاب نما" نئی دہلی ۲۵

۱۔ مقام اشاعت: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت: ماہنامہ۔

۳۔ پرنٹر کا نام: سید وسیم کوثر
ہندوستانی پتہ: جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۴۔ پبلشر کا نام: سید وسیم کوثر
ہندوستانی پتہ: جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۵۔ ایڈیٹر کا نام: شاہد علی خاں

مالکان کا نام اور پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

چیرمین کا نام: ڈاکٹر سید ظہور قاسم اے۔ ۱۵ ڈیفنس کالونی، نئی دہلی۔ ۲۴

۱۔ ڈائرکٹر: نواب اقبال محمد خاں۔ کف پریڈ کولابہ، ممبئی ۵

۲۔ لفٹیننٹ جنرل ایم۔ اے ذکی۔ وی۔ سی۔ لاج جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۳۔ خواجہ محمد شاہد: ڈی ۱۸ ۳ قدوائی نگر ویسٹ نئی دہلی ۲۵

۴۔ صدیق الرحمن قدوائی۔ باغ شفیق، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایے کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ اسلام جیم خانہ کینیڈی سی فیس ممبئی ۷

میں سید وسیم کوثر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

مارچ ۱۹۹۹ء

دستخط
سید وسیم کوثر

تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

اقبال کا نظریہ شعر اور ان کی شاعری

مصنف: پروفیسر آل احمد سرور
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
صفحات: ۸۰　　قیمت: ۴۵.۵ روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پروفیسر آل احمد سرور اس عہد کے ایک ممتاز عالم اور نقاد ہیں۔ وہ نصف صدی سے بھی زیادہ لمبے عرصے سے اقبال کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ ماہرینِ اقبال میں پروفیسر آل احمد سرور کا درجہ اس لیے بھی بڑھ جاتا ہے کہ انھوں نے اقبال کا زمانہ بچشم خود دیکھا اور اقبال کے خیالات کو سمجھنے میں خود اقبال سے مدد لی۔ انھوں نے اقبال سے خط و کتابت کی اور ان کے افکار سے استفادہ کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اس زمانے میں بھی اقبال کا چراغ روشن رکھا جبکہ ہندستان میں اقبال کو شجر ممنوعہ سمجھ لیا گیا تھا۔

خوش قسمتی سے دہلی یونیورسٹی دہلی کے شعبہ اردو کے نظام اردو خطبات کے لیے پروفیسر آل احمد سرور کو ۱۹۷۸ء میں مدعو کیا گیا۔ یہ نظام خطبات اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ملک بھر میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں دہلی یونیورسٹی کا یہ نظام خطبہ پروفیسر آل احمد سرور نے دیا۔ اس کا موضوع تھا۔ "اقبال کا نظریہ شعر و شاعری" اس خطبہ کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ حصہ اول میں عہد اقبال کی تاریخ تہذیب اور سماج وغیرہ کی روشنی میں اقبال کے شعری نظریہ کو دیکھا۔ انھوں نے اقبال کی شاعری میں مذکور اقبال کے شعری نظریات ان کی تحریروں، تقریروں اور ان کے ماحول کی روشنی میں بھی اقبال کے شعری نظریہ کو واضح کیا ہے۔ جس کی متعدد تفصیلات حوالے اور مختلف اجزا کا نہایت موثر اور فلسفیانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اقبال کا شعری نظریہ ایک بلند نصب العین سے وابستہ ہے۔

خطبے کے حصہ دوم میں اقبال کی شاعری کو اقبال کے شعری نظریات کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ یعنی جو اصول و نظریات اقبال نے شاعری کے لیے قائم کیے تھے ان کی روشنی میں اقبال کی شاعری کہاں تک پوری اترتی ہے اس کی مفصل اور مدلل بحث حصہ دوم میں کی گئی ہے۔ خطبہ کے اس حصے کا نام "اقبال کی شاعری" رکھا گیا ہے اس حصہ میں اقبال کی تصانیف شعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور "بانگ درا" بال جبریل' ارمغان حجاز اور جاوید نامہ پر بالخصوص گفتگو کی گئی ہے۔

۱۹۷۸ء کا یہ نظام خطبہ عرصہ دراز سے نایاب تھا۔ اب اسے از سر نو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے بڑی حسن و خوبی کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اس پر پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے بہ نفس نفیس نظر ڈالی ہے اور گذشتہ اڈیشن کی بعض اغلاط کو درست کیا ہے۔ آغاز کتاب میں پروفیسر آل احمد سرور کا نوٹ بھی شامل کتاب ہے۔ خطبے کے عنوان میں بھی قدرے ترمیم کر کے اس کا نام "اقبال کا نظریہ شعر اور ان کی شاعری" کر دیا گیا ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ واضح اور روشن ہو گیا ہے۔ کمپوزنگ' طباعت اور اشاعت وغیرہ شفاف اور دل پذیر ہے۔

	مدیر: افتخار امام صدیقی
"شاعر" ممبئی	معاون: ناظر نعمان صدیقی
ہم عصر اردو ادب نمبر	مبصر: اسلم عمادی
(جلد اول)	قیمت دو سو پچاس (-/250) روپے صفحات (1240)

(۱۹۹۷۔۱۹۹۸ : "الف تا س")   ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ممبئی۔ ۳ علی گڑھ۔ ۲

ماہ نامہ "شاعر" کے جس خاص نمبر کا اردو حلقوں میں انتظار تھا، اس کا پہلا جزو یعنی جلد اول شائع ہو کر مبصر کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ پہلی نظر میں شاعر ممبئی کا یہ شمارہ خاصا ضخیم اور پیش کش کے اعتبار سے دلکش ہے۔ اس شمارہ میں شریک ادیب و شاعر ابجدی ترتیب کے لحاظ سے الف سے حرف 'س' تک پر احاطہ کرتے ہیں۔ اس طرح اس شمارہ میں افسانہ کی ضمن میں آصف فرخی سے سیدہ حنا تک' شاعری کی نوع میں ابرار احمد سے لے کر سید احمد شمیم تک، تحقیق میں ابرار احمد سے سید یحییٰ نشیط تک (بہ تغیر عناوین) اور تنقید کی صف میں ابن فرید سے نظام صدیقی تک اور اس کے علاوہ اور بھی کچھ اہم گوشے شریک ہیں۔

اردو زبان کی نشر و اشاعت سے متعلق اصحاب ان دشوار مراحل سے ضرور بہرہ ور ہوں گے جو اس نوع اور معیار کے خاص نمبر کی ترتیب و تزئین میں در پیش ہوتے ہیں۔ ادارہ شاعر اپنی روایتی خوش سلیقگی کے ساتھ ایک اور اچھا خاص نمبر پیش کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ ماہنامہ شاعر کی تاریخ ہم عصر ادب کی ہم قدم ہے، اسی لیے جب علامہ سیماب اکبر آبادی

مرحوم اور اعجاز صدیقی مرحوم نے اس ادارہ کے لیے "قصر الادب" کی ترکیب استعمال کی تو وہ ترکیب نام ہی ثابت ہوئی۔ شاعر کے یہ اور ایسے خاص نمبر اہم ادبی کردار ادا کرتے ہیں اور ادبی لائبریریوں میں حوالہ اور اشاریہ کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ ان شماروں سے یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہم عصر ادب کس رخ پر جا رہا ہے؟ اچھا اور معیاری ادب فی زمانہ کیا ہے؟ اور متوازن ادبی صحافت کا معیار کیا ہے؟ ایسے سوالوں کا نئے رسائل اور خاص نمبروں کے تناظر میں جواب ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ شاعر کا یہ خاص نمبر نہ صرف جدید تر ادب کا اشارتی نمایندہ ہے۔ اس کے ابتدائی حوالوں اور مضامین میں شاعر کے اوائل میں علامہ سیماب اکبر آبادی کے قائم کردہ آگرہ اسکول اور اعجاز صدیقی کے متعین کردہ ادبی اور صحافتی ابعاد کا بھی تفصیلاً ذکر ہے۔ شاعر کے خاص شماروں کی تاریخی روایات اس شمارہ سے بھی مترشح ہیں۔ اس کی ترتیب و تزئین اور مشمولات کی جزئیات کی حد تک دیدہ ریزی و موزونی کے ساتھ پیش کش، آرٹ و تصاویر اور حوالات کا حصول، دیدہ زیبی کا اہتمام اور ایسی کئی خوبیاں ادارہ شاعر اور اس کے سرخیل افتخار امام کے طویل اشاعتی تجربہ کی تازہ مثال ہے۔ اعجاز صدیقی صاحب مرحوم سے یہ صلاحیت "دست بہ دست" یا "سینہ بسینہ" افتخار امام' تاجدار احتشام مرحوم اور ناظر نعمان تک پہنچی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے' اپنی ان تمام صلاحیتوں کے ساتھ، افتخار امام نے کوشش کی ہے کہ شاعر کے شمارے بہ پابندی شائع ہوں' چاہے کبھی کبھی ضرورت کے تحت کم تر ضخامت پر اکتفا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چونکہ یہ خانوادہ ادب کے رنگ میں مکمل طور سے رنگا ہوا ہے، عالمی اردو ادب کے تناظر میں ہر بار قابل ذکر رسالہ پیش کرنے کے لیے کوشاں بھی ہے، اس وجہ سے افتخار امام اپنی جستجو میں کامیاب ہوتے ہیں۔

زیر نظر خاص نمبر میں ہر شعبہ اور جزو پر ادارہ شاعر کی خصوصی محنت و شراکت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ مدیر مسئول نے ہر شعبہ پر حاشیہ نما تعارف فراہم کر کے اپنی ذاتی سوچ اور تجزیاتی فکر کا زاویہ واضح کیا۔ گویا مدیر ناظرین کے ساتھ مطالعے میں شریک ہونے کے لیے کوشاں ہے۔

تقریباً تمام ہی مشتمل تخلیقات عصری سوچ کی نمایندگی کرتی ہیں اور ایک طرح سے دیرینہ شکوہ' جمود اور طعن یکسانیت کا مسکت جواب بھی فراہم کرتی ہیں۔ تخلیقات کی بوقلمونی وہمہ رنگی نئے اور ہم عصر ادیب کے زندہ اور محو فکر ذہن کی دلیل ہے۔ اور یہ واضح کرتی ہیں کہ آج کا ادیب شاعر زندگی میں شریک بھی ہے اور اس طرح شریک کہ اس کی ذات میں احساس کا

چراغ ابھی روشن ہے۔

منظومات میں ایک دلچسپ کوشش شاعری سے نثر اور نثر سے شاعری کی طرف ہجرت (بلکہ رجوع) کرنے والے ادیبوں شاعروں کے احساسات کی عکاسی ہے جس میں موصوف ادیب خود اپنے ذہنی جھکاؤ کی پرت کھولتا ہے۔ اسی طرح قلم کاروں کے سوانحی اشاریے اور پتے کی ڈائرکٹری بھی بڑی مفید اور کافی حد تک بسیط ہے۔

اس شمارہ کی صفحاتی تقسیم کچھ یوں ہے

ابتدائیہ، قلمی کیری کچر وغیرہ: ۳۲ صفحات

آگرہ اسکول سیماب اکبر آبادی مکاتیب و مراسلت بنام و از سیماب و اعجاز وغیرہ ہم: ۱۲۸ صفحات

باب تنقید:	۶۱ صفحات
نثر و نظم کے درمیان شاعر و ادیب:	۷۰ صفحات
باب افسانہ:	۷۷ صفحات
باب شاعری:	۲۱۰ صفحات
باب تحقیق:	۴۹ صفحات
مذاکرے:	۹۴ صفحات
قلم کاروں کی سوانحی لغت، آٹوگراف، پتے وغیرہ:	۷۷ صفحات

اوپر دی ہوئی صفحات کی تقسیم یہ بات واضح کرتی ہے کہ خاص کوشش کے ساتھ مختلف زاویوں، سرخیوں اور عناوین کے ساتھ اردو شعر و ادب نے عالمی گاؤں کی سیر کی جائے۔ اس شمارہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ حدود و ابعاد کے معاملے میں غنی ہے۔ اس میں ہند و پاک کے علاوہ وطن سے باہر مقیم ادیبوں اور شاعروں کا ذکر بھی اسی توازن کے ساتھ دیا گیا ہے۔ کویت میں مقیم اردو احباب کے لیے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ اس میں اسلم عمادی (ایک مکمل صفحہ) اور سعید روشن کا کلام بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ گو کہ "ن کا حرف اگلے شمارہ میں مقصود ہے" ادارہ شاعر نے اس کے باوجود نور پرکار کی کتابوں کا (صفحہ بھر کا) اشتہار اور اکابرین ادب کی فہرست شکریہ میں ان کے نام کی شمولیت کا التزام بھی رکھا ہے۔

جدید شعر و افسانہ موضوعات اسالیب اور لفظیات کے اعتبار سے گزشتہ دو تین عشروں سے کن دور رس تبدیلیوں اور تجربات سے دوچار ہے۔ اس شمارہ میں شامل تخلیقات سے ان پر ست شناس آراء

تعارف و تقابل کے ذریعہ پیش منظر پہ آنے سے اہل تحقیق و نظر کے لیے ضروری دل چسپی کا باعث بنیں گے اور کلیدی کشائی کا کام کریں گے۔

اس شمارے کی ضخامت کے پیش نظر غالباً کمپیوٹر لفظ سازی اور کتابت دونوں کا متوازی استعمال کیا گیا۔ غالباً ادارہ شاعر کا مقصد اس طرح مرحلہ طباعت کو آسان و سریع کرنا تھا لیکن اگر ساری کمپوزنگ کمپیوٹر سے نا صرف کتابت سے ہوتی لطف آوری ہی آتا۔

ماہنامہ شاعر کی یہ خوبی بھی رہی ہے کہ وہ کسی ادیب یا کسی حلقہ خاص کا ترجمان بن کر نہیں رہا اور دیانت داری کے ساتھ معیاری ادب کو نشر اشاعت کا واسطہ فراہم کرتا رہا ہے۔ یہ بات اس خاص نمبر میں بھی پیش نظر رکھی گئی ہے۔

ادارہ شاعر اس شمارہ کی اشاعت کے لیے قابل ستائش ہے، موجد سے خوبصورت سرورق مزین گٹ اپ اور قیمت و طباعت کے ساتھ اردو ادب کے دوستوں کے لیے ایک قابل قدر تحفہ ہے۔

علی گڑھ سے دیوبند تک

مصنف: پروفیسر اکبر رحمانی
تبصرہ نگار: صغیر احمد ایم اے
قیمت مجلد: ۶۰ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ آموزگار اسلام پور جلگاؤں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی ۳ دہلی، علی گڑھ ۲

پروفیسر اکبر رحمانی اردو صحافت، تعلیم تحقیق، تاریخ اور ادبی دنیا کی ایک ممتاز اور معروف شخصیت ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب نویں کتاب ہے جو ایجوکیشنل اکاڈمی جلگاؤں سے شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک تعلیمی سفر نامہ ہے۔ آج سے قریب چھ سال پہلے یوپی رابطہ کمیٹی علی گڑھ نے اپریل ۱۹۹۲ء میں یوپی کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک تعلیمی کارواں ترتیب دیا تھا جس میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے ممتاز اساتذہ کے علاوہ دیگر صوبوں کے ماہرین تعلیم کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مہاراشٹر کی نمایندگی اردو کے واحد تعلیمی و تدریسی جریدے ماہنامہ آموزگار کے مدیر اعلا جناب ڈاکٹر اکبر رحمانی نے کی تھی۔ یہ تعلیمی کارواں مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور ممتاز دانشور سید حامد صاحب کی قیادت میں بارہ روز تک یوپی کے اہم شہروں میں سرگرم سفر رہا۔ یہ وہ دور تھا جب یوپی میں بابری مسجد' رام جنم بھومی، متنازعہ کا لاوا پک رہا تھا۔ رتھ یاتراؤں سے فضا گرم اور حالات کشیدہ ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں مسلم دانشوروں کا تعلیم و جہت اور امن کا

پیغام لیے تعلیمی دورے پر جانا جرأت اور ہمت کا کام تھا۔ علی گڑھ سے دیوبند تک دراصل اس تعلیمی یاترا کی سرگذشت ہے جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارواں جہاں جہاں سے گزرا مسلمانوں میں حوصلہ، امید اور مثبت انداز فکر پیدا کرتا گیا اور ماحول کی گرمی کو امن و محبت کی شیتل پون سے ٹھنڈا کرتا گیا۔

علی گڑھ سے شروع ہونے والا یہ کارواں سکندر رو، ایٹہ، بھر گین، قائم گنج، فرخ آباد، سدحن، فتح گڑھ، قنوج، کانپور، فتح پور، الہ آباد، بنارس، غازی پور، مئو، اعظم گڑھ، گورکھپور، خلیل آباد، بستی، گونڈہ، بہرائچ، لکھنؤ، شاہجہانپور، بریلی، رام پور، مرادآباد، بجنور، سہارنپور سے ہوتا ہوا دیوبند جاکر ختم ہوا۔ یعنی عصری تعلیم گاہ سے شروع ہوکر دینی درس گاہوں پر ختم ہوکر مسلمانوں کو یہ بتایا کہ دینی اور دنیوی تعلیم ضروری ہے۔ دینی درسگاہوں میں عصری تعلیم کا جوز تقاضائے وقت ہے۔ عصری تعلیم گاہوں میں دینی تعلیم کا جوز اسلامی تشخص کے لیے ضروری ہے۔

اس تعلیمی سفر نامے کے آئینے میں ہم یوپی کے مختلف شہروں کی تاریخ، تعلیمی و معاشی حالت، ثقافت علمی و ادبی و تحقیقی اداروں اور دینی درس گاہوں کی رنگارنگ تصویریں دیکھتے ہیں۔ انداز بیاں دل کو موہ لینے والا۔ بقول ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، اکبر رحمانی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مشاہدات، تجربات اور تاثرات کو ایسے دلکش اور دلآویز انداز میں بیان کیا ہے کہ ہر شہر کے درخشاں ماضی کی تصویر اور حال کا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے ابھر جاتا ہے۔ کتاب ایک مرتبہ ہاتھوں میں لینے کے بعد پھر اسے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔" اکبر رحمانی نے یوپی کے مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور زبوں حالی کا بھی کھل کر ذکر کیا اور پسماندگی کے خاتمے کے لیے ان میں پایا جانے والا جوش، تڑپ اور عملی جدوجہد کا بھی ذکر دیانت داری سے کر کے دلوں میں امید کی شمعیں بھی روشن کیں۔ سفر کے دوران یوپی کے اہم علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں جیسے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر آل احمد سرور ، سید حامد، ڈاکٹر خلیق انجم، ابراہیم سلیمان سیٹھ، ظفریاب جیلانی وغیرہ سے جو گفتگو ہوئی ہیں ان کی وجہ سے اس سفر نامے کو دستاویزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ بالخصوص سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) سے جو بات چیت ہوئی اس نے حامد صاحب کے دور وائس چانسلر کے اہم واقعات پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹا کر حقائق کو پہلی بار سامنے لایا گیا۔ یہ گفتگو مسلم یونیورسٹی کے اہم نازک دور کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتی ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ سید حامد صاحب اور پیش لفظ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے لکھا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی (مدیر ندائے ملت لکھنؤ) اور سید مصطفےٰ علی بریلوی (ایڈیٹر سہ ماہی العلم کراچی) کے تاثرات دیے گئے ہیں۔

ترتیب و تہذیب: جابر حسین
مبصر: کوثر مظہری
صفحات: ۷۹۸ قیمت: ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ترجمان

اردو مرکز عظیم آباد (پٹنہ) کے بہت سی کتابیں اور کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔ اردو مرکز کے روح رواں پروفیسر جابر حسین اپنی تمام تر سیاسی و سماجی مصروفیات کے باوجود علمی و ادبی خدمات بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ "ترجمان" بھی انھی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

آٹھ سو صفحات کا یہ مجلّہ بہت ہی خوبصورت اور بھرپور معلومات کا خزینہ ہے۔ ۴۶۸ صفحات مضامین کے لیے مختص ہیں۔ اس کے علاوہ جو صفحات ہیں وہ بازگشت (تاثرات) اور رجحان (اردو مرکز کی مطبوعات پر شائع شدہ تبصرے) کے لیے وقف ہیں۔ مضامین میں کچھ کے نام اس طرح لیے جا سکتے ہیں: میرا تخلیقی سفر (انور عظیم: بازیافت (بہار حسین آبادی، سہیل عظیم آبادی)؛ میراث (قیوم خضر)، انیس کی شاعری کا سماجی مقصد (راج بہادر گوڑ)؛ ذیشان فاطمی کی کتاب بہاریہ (جابر حسین: بہار حسین آبادی ایک بلند قامت مرثیہ گو (حسین الحق)؛ خود آگہی اور خدا آگہی کا منفرد اسلوب (حکیم محمد سعید)؛ تفہیم غالب (عبدالحق)؛ سفر ستارہ (ثوبان فاروقی)؛ بے اماں کہانیاں اور سنگین سچائیوں کی دھوپ (پروفیسر محمد حسن)؛ بہار کا افسانوی ادب (عنوان چشتی)؛ ن اے کاتب۔ ایک میاافسانوی عہد نامہ (ش اختر) وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی کئی اہم مضامین ہیں جن کی تفصیلات یہاں ممکن نہیں۔ "باز گشت" کے تحت سو سے زائد خطوط شامل ہیں جن میں تقریباً ۷۰ فیصد ایسے نام ہیں جن سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے۔ چند نام یوں ہیں: آل احمد سرور، گیان چند، علی سردار جعفری، انور عظیم، جوگندر پال، گلزار، شکیل الرحمان، پروفیسر شمیم حنفی، شمس الرحمان فاروقی، عابد رضا بیدار، مظہر امام، خلیق انجم، مشرف عالم ذوقی، شہپر رسول، ارتضیٰ کریم، شمس الحق عثمانی، ندا فاضلی وغیرہ۔ اسی طرح "ترجمان" کے تحت ۵۵ لوگوں کی آراء مختلف مطبوعات پر شامل ہیں۔ ان میں کچھ نام اس طرح لیے جا سکتے ہیں: شبر امام، توقیر احمد خان، عبدالمغنی، حقانی القاسمی، عاصم شہنواز شبلی، کوثر مظہری، شکیل الرحمان، امتیاز احمد، نسرین بانو، قاسم خورشید، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، عبدالاحد ساز، صدیقی مجیبی، فخرالدین عارفی وغیرہ۔

پروفیسر جابر حسین نے اداریے میں "مکالمہ" کے عنوان سے اپنی محنت اور اپنی فعالیت

کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اردو زبان اور کلچر اور اقلیتی طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ اور ان کی زبان کے ساتھ ہمدردی اور محبت ہے۔ ان کے احساسات اور افکار کو اس اقتباس کی روشنی میں دیکھیں:

"اردو سماج کے مسائل، جدوجہد اور ان کے حل کے لیے صحت مند عوامی ادب کی ترتیب و اشاعت بھی ہمارے پروگرام میں شامل ہے۔ ان کے علاوہ ہندی، بنگلہ، اڑیا، پنجابی اور مراٹھی زبانوں میں پسماندہ اور دلت طبقوں کی سماجی نفسیات پر لکھے گئے ادب سے اردو سماج کو روشناس کرانا بھی ہماری ترجیحات کا حصہ ہے۔ اسی طرح مختلف مذہبی و لسانی اقلیتی جماعتوں کے مسائل پر مثبت معلوماتی ادب کی تصنیف و اشاعت پر بھی ہماری نظر ہے۔" (ص ۱۶)

"ترجمان اردو مرکز کا بے باک اور حسین ترجمان ہے۔ شروع کے مشمولات دل چسپی کے عناصر سے پر ہیں۔ جناب انور عظیم کا تخلیقی سفر، جناب سہیل عظیم آبادی کی ڈائری کے چند اوراق اور بہار حسین آبادی کی مرتبہ گوئی پر سیدہ جعفر اور حسین الحق کے مضامین اہم اور دل چسپ ہیں۔ "ترجمان" پرچوں پر یہ درج نہیں ہے کہ اس کا وقفۂ اشاعت (Period) کیا ہوگا، اس لیے اسے دوماہی، سہ ماہی، ششماہی کہنا مناسب نہ ہوگا۔ ممکن ہے دوسرے شمارے سے اس بات کا اہتمام کیا جائے اس لیے کہ قارئین کو اسی متذکرہ وقفے کے مطابق رسالے یا جلے کا انتظار رہتا ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر آیندہ بھی اس کی اشاعت اسی اہتمام سے ہوتی رہی تو محمود ایاز مرحوم کے "سوغات" کی کمی پوری ہو جائے گا۔ "ترجمان" کی پذیرائی پوری اردو دنیا میں ہوگی۔ اس کا آیندہ شمارہ عصری ادبی تخلیقات اور سماجیاتی مطالعہ پر مشتمل ہوگا۔ اس کی وضاحت جابر حسین صاحب نے اپنے اداریے میں کردی ہے۔

ایڈیٹر سیفی سرونجی

ڈاکٹر خالد محمود نمبر مبصر شاہ عالم

انتساب

صفحات ۴۵۶ قیمت ۳۰۰ روپے

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

سہ ماہی انتساب اردو کا معیاری رسالہ ہے۔ تقریباً پندرہ سالوں سے یہ پرچہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ کئی اہم شخصیتوں پر انتساب کا خاص شمارہ منظر عام پر آچکا ہے۔ ابھی ابھی انتساب کا ڈاکٹر خالد محمود نمبر منظر عام پر آیا ہے۔ غالب گمان ہے کہ یہ انتساب کا سب سے ضخیم شمارہ ہے۔ یہ خاص نمبر ڈاکٹر خالد محمود کی شخصیت اور فن پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود کا پہلا شعری مجموعہ "سمندر آشنا" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ ادبی حلقوں میں اس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حنیف کیفی نے لکھا ہے۔

"ان کی غزل بڑی سنبھلی ہوئی اور متوازن کیفیات و خصوصیات کی حامل ہے اور یہ توازن نفس میں جدیدیت کے صالح احساس اور روایت کے گہرے شعور کے امتزاج سے پیدا کیا ہے۔ جدیدیت سے اپنی غزل کے لیے خالد محمود نے فکر و احساس اور انداز و اسلوب حاصل کیا اور روایت سے پختگی اور توانائی" (سمندر آشنا کا شاعر خالد محمود)

ڈاکٹر خالد محمود نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور بہت اچھی اچھی نظمیں بھی کہیں۔ ۶/ دسمبر صیاد کے ہم نفس' فاصلہ' زندگی کیا ہے' اگر موت اسے کہتے ہیں' زاویے' وغیرہ ان کی اہم نظمیں ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے گرد و پیش سے حد درجہ باخبر ہے اور معاشرے میں پیدا شدہ خلفشار کو شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ' ڈاکٹر خالد محمود کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ان کا یہ مقالہ کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکا ہے۔

اس رسالے میں ڈاکٹر خالد محمود کی شخصیت اور فن پر عہد حاضر کی اہم شخصیتوں کے مضامین شامل ہیں جو ان کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔

شخصیت سے متعلق چودہ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون پروفیسر ظفر احمد نظامی کا قلمی چہرہ کے نام سے ہے۔ مقفیٰ و مسجع نثر میں ڈاکٹر خالد محمود کی کچھ یوں تصویر پیش کرتے ہیں۔

"چہرہ کتاب نما' تبسم ماہتاب نما' دراز قد' دلکش خال و خد' صحت مند جسم' دلربا با طلسم۔ ستواں ناک' زباں بے باک۔ آنکھوں میں چمک' رخ پر دمک۔ تا حد نظر پیشانی' دلیل خوش بختی جانفشانی یہ ہیں ممتاز شاعر و ادیب۔ زبان ادب کے نقیب۔ رہرو منزل تحقیق' خار زار تنقید کے رفیق۔ ایک کامیاب استاد' مجسم اعتبار و پیکر اعتماد۔ بے نیاز زیان و سود یعنی ڈاکٹر خالد محمود !!

ان کے علاوہ شخصیت کے گوشے میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی' پروفیسر صغرا مہدی' ڈاکٹر شاہ عبدالسلام' ڈاکٹر شفیقہ فرحت' ڈاکٹر عزیز اندوری' ڈاکٹر آفاق حسین' ڈاکٹر شان فخری' ڈاکٹر شاہد میر' انیس دہلوی' محمد یوسف پاپا' رہبر جونپوری' محمد توفیق خاں سیفی سرونجی' کے مضامین شامل ہیں۔ بحیثیت غزل گو اور نظم گو کل بیس مضامین شامل ہیں۔ بلند پایہ نقادوں اور ادیبوں کے مضامین ان کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر' پروفیسر علی محمد خسرو' پروفیسر شمیم حنفی' پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی' ڈاکٹر مناظر عاشق

ہرگانوی' ڈاکٹر اسعد بدایونی' ڈاکٹر شکیل احمد فاروقی' ڈاکٹر رفعت اختر' ڈاکٹر شہپر رسول' محمد ایوب واقف' ڈاکٹر نعمان خاں' عشرت ظفر' عارف عزیز' اظہر غوری' کوثر مظہری' احمد محفوظ' عبدالاحد ساز' سلیم انصاری' ڈاکٹر حدیث انصاری اثری' کے مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود کی شاعری سے متعلق چند آرا ملاحظہ ہوں۔

خالد محمود کی غزلوں میں روایتی مضامین بھی ہیں اور علائم بھی۔ لیکن ان کی تخلیقی اُپج نے ان خیالات کو نئے انداز میں پیش کیا ہے چونکہ وہ زبان کے رمز شناس ہیں اور الفاظ کے دروبست سے شعر میں نغمگی پیدا کرنے کے فن سے بھی واقف ہیں اس لیے اکثری اور نامانوس زمینوں سے بھی صاف اور دلنشیں شعر نکال لیتے ہیں۔

(قرۃ العین حیدر)

خالد محمود کا شعری سفر خط مستقیم پر جاری نہیں ہے کیونکہ ان کے یہاں غم کی آنچ بھی ہے سرخوشی اور سرمستی بھی' طنز و مزاح کا لہجہ بھی ہے اور فکر و فلسفہ کے رموز بھی' پھولوں کا رس بھی ہے اور نیش عسل بھی' گویا ایک زندگی ہے جس میں تنوع ہے۔"

(کوثر مظہری)

بحیثیت نثر نگار پانچ مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر سید حامد حسین کے دو مضامین ڈاکٹر خالد محمود کے انشائیے اور خاکے" اور "خالد محمود اور ان کے سفر ناموں کا مطالعہ" بہت بھرپور ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر صادقہ ذکی' ڈاکٹر رضیہ حامد' احمد کمال پروازی کے مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ اس میدان میں ان کی سرگرمیوں پر دو مضامین "ایک اچھا استاد" اور "ایک ماہر تعلیم" کے عنوان سے پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر محمد صابرین نے سپرد قلم کیے ہیں۔

رسالے میں شامل مضامین کی تعداد اچھی خاصی ہے مگر بعض مضامین بہت مختصر ہیں جنھیں اور طویل ہونا چاہیے تھا۔ مجموعی طور پر شامل مضامین سے ان کی شخصیت اور فن کے تمام گوشے اجاگر ہو جاتے ہیں۔

رسالے کا ایک بڑا حصہ ڈاکٹر خالد محمود کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ انشائیے خاکے' تجزیے' مضامین' جائزے' ترجمہ اور آخر میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ان کی کچھ نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ سٹی بس کا سفر' ان کا بہت مشہور انشائیہ ہے۔ اس انشائیہ میں انھوں نے جو دہلی کی بسوں کا نقشا پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ان کا ایک انشائیہ جب اچانک میکے سے بیوی آجائے' بھی بہت اچھا انشائیہ ہے جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

رسالے کے ابتدائی حصے میں ان کی زندگی کے مختلف ادوار کی تصویریں شامل ہیں۔

[illegible]

پانچ جدید شاعر

اس مجموعے میں اردو کے پانچ جدید شاعر فیض احمد فیض' میراجی' حامد مدنی' ن' م' راشد اور ضیا جالندھری کا تعارف ' شخصیت و کردار کی کچھ جھلکیاں ان کا' مختصر کلام اور کلام پر تبصرہ شامل ہے۔ قیمت :/120

اعلا تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین

مترجم. مسعود الحق

اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ایسے ۱۴ خطبات شامل ہیں جو موصوف نے ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر دیے تھے۔ یہ خطبات تعلیم سے متعلق ہیں۔ یہ خطبات عام لوگوں کے لیے عموماً اور تعلیم کا کام کرنے والے حضرات کے لیے خصوصاً بڑے مفید ثابت ہوں گے۔ قیمت :/120

اردو زبان وادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ مرتبہ. اصغر مہدی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ابتدا ہی سے اردو کی تعلیم اور فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اس مجموعہ مضامین میں جامعہ کے اساتذہ اور قدیم طلبہ نے بتایا ہے کہ جامعہ نے صحافت' تحقیق' نثر نگاری' ڈراما نگاری اور بچوں کے ادب کے لیے کس پایے کا کام کیا ہے۔ قیمت :/57

ڈسپلن کی تعلیم و تربیت: ڈاکٹر محمد اکرام خاں

اس کتاب کا مرکزی نقطہ بچے کی 'داخلی ڈسپلن" ہے۔ اس کے لیے والدین اور اساتذہ میں روشن خیالی کے ساتھ ساتھ جس صبر و ضبط کی ضرورت ہے اس کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت : 90/

آخر کار مجتبی حسین

عہد حاضر کے سب سے زیادہ مقبول مزاح نگار کے مضامین کا نیا مجموعہ۔ جسے ایک بار پڑھنے کے بعد بار بار پڑھنے کو دل چاہے گا۔
قیمت -/60

الجھن عبداللہ ولی بخش قادری

یہ کتاب قاری کو نہ صرف اپنی ذات اور اپنے ماحول کو سمجھنے اور برتنے کے لیے آمادگی پیدا کرے گی بلکہ نفسیاتی تہہ داری نیز ان کی موجودہ الجھنوں کو رفع کرنے اور نئی الجھنوں سے بچانے کا موجب بھی ہو سکتی ہے۔ قیمت:/ 60

طب یونانی اور چیلنجز حکیم اشہر قدیر

اس تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ حلقہ طب اجتماعی طور پر ان مسائل سے واقف ہو جو طب کے مقابل چیلنج بن کر کھڑے ہیں اور مشترکہ طور پر اس فن کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں۔ اپنی نوعیت کی اہم کتاب۔ قیمت :/60

فراق۔ دیار شب کا مسافر

مرتبین: شمیم حنفی / سہیل اختر فاروقی

فراق کے غیر مطبوعہ مضامین انٹرویو' شخصیت' شاعری' نثری جائزے۔ معروف ادیبوں کے قلم سے۔
قیمت:/ 150

لفظوں کی انجمن میں ڈاکٹر سید حامد حسین

یہ کتاب آپ کے اس تجسس کو بڑی حد تک تشفی بخشے گی جب آپ کو یہ معلوم کرنے کی خواہش ہو گی کہ یہ لفظ کہاں اور کیسے ہماری زبان میں آیا۔
قیمت /135

بیاں اور اختر سعید خاں

اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب اختر سعید خاں کے دس بلندپایہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔
قیمت /144

تعبیرو تفہیم ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم کا نام اب اردو دنیا کے لیے نیا نہیں ہے۔ موصوف کے کئی ادبی' تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے مجموعے منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں بھی بیشتر مضامین تحقیقی ہیں۔ قیمت /135

فرہنگ اصطلاحات طب

(انگریزی۔ اردو۔ا)

GLOSSARY OF MEDICAL TERMS

(ENGLISH-URDU)

مصنف ڈاکٹر اختر امرتسری

نظر ثانی ترمیم واضافہ مسعود احمد برکاتی

اس کتاب میں عام عربی' فارسی' اصطلاحی الفاظ کے بجائے اردو کے آسان الفاظ کو ترجیح دی گئی ہے۔ میڈیکل سائنس کے شعبے میں یہ اصطلاحی لغت ترجمے کی ضرورتوں کو یقیناً پورا کرے گا۔ طب کے اساتذہ و طلبہ کے لیے مفید لغت۔ قیمت۔/45

معاصرین و متعلقات مولانا ابوالکلام آزاد

عبدالقوی دسنوی

پروفیسر عبد القوی دسنوی کا نام آزاد شناسوں کی صف میں خاصا نمایاں ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ قیمت /60

سلاخ ٹوٹتی ہے کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کے پانچ ریڈیائی ڈراموں کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت /90

منجملہ یوسف ناظم

اردو کے ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم کے سولہ دلچسپ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ پڑھیے اور سر دھنیے۔ قیمت/51

جو رہی سو بے خبری رہی ادا جعفری (خود نوشت)

بدایوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان پرورش پانے والی ایک ذہین اور حساس لڑکی کی آپ بیتی' جس کی حیثیت آج اردو شاعری میں خاتون اوّل کی ہے۔
قیمت /200

Regd. with R.N.I. at No. 4967/60 MARCH, 1999
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت توجّہ داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ۔ اردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیّدین — مرتبہ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہرِ تعلیمات خواجہ غلام السیّدین کے علمی، ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم — ڈاکٹر بدرالدین الحافظ

ناول نگاری کا جائزہ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۷/=

تغزلیاتی تلازموں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

اپریل ۱۹۹۹ء — جلد ۳۹ — شمارہ ۴

فی پرچہ 8/
سالانہ 80/
سرکاری تعلیمی اداروں سے 125/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
e-mail: maktaba@ ndf. vsnl. net.in
Tele Cum Fax No (011)-6910191
ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ ممبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین وبیانات نقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

جائزے

کھلے خطوط

اور ادبی تہذیبی خبریں

نئی مطبوعات

ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ شخصیت اور خدمات	ڈاکٹر آدم شیخ	250/-
کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر ابرار رحمانی تنقید	150/-
ادب کی تفہیم	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی	80/-
اردو کے نثری اسالیب	شہاب ظفر اعظمی	150/-
تدوین۔ تحقیق روایت	رشید حسن خاں	170/-
اردو افسانے پر مغربی ادب	ڈاکٹر شہناز شاہین	120/-
میرانی شاہ کا فکری پہلو	پروا سر اظہار احمد	100/-
میری کہانی	اویس احمد دوراں	120/-
پنڈت آنند نرائن ملا	ڈاکٹر عبدالرشید ظہری	150/-
تعلیم ایک تحریک ایک چیلنج	محمد اسحٰق	150/-
جدید ترکی میں اسلامی بیداری	عبداللہ فہد فلاحی	100/-
مسائل امامت مکمل مدلل	محمد رفعت قاسمی	50/-
مسائل نماز	رر	90/-
تقویۃ الایمان	سید احمد شہید	90/-
نگر ذکر	آصف نقوی	100/-
انتخاب غزلیات فراق	کالی داس گپتا	300/-
اقبالیات (طب)	ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی	62/-
طب نبوی کھجور اور شہد سے علاج	معظم جاوید	60/-
اے ڈکشنری آف اردو کلاسیکل ہندی اینڈ انگلش (ڈکشنری)	جو ہن ٹی۔ پلاٹس	750/-
ذہن جدید نمبر ۲۷	ترتیب زبیر رضوی	20/-
شرف محنت و کفالت	شمیم طارق	150/-
غلام بخش اور دیگر کہانیاں	مشرف عالم ذوقی	120/-
قمر رئیس ایک زندگی	ڈاکٹر سلمیٰ شاہین	250/-
ارتقاء (پاکستانی رسالہ)	نئی شمارہ	50/-
ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ	عتیق اللہ	600/-
قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری	نبیل بیابانی	250/-
اردو جدید شعری روایت مسلسل اور انحراف	ڈاکٹر شاہینہ تبسم	250/-
قندیل مرتب	خورشید احمد خاں	100/-
قومی تہذیب کا مسئلہ	سید عابد حسین	54/-
فکر و فن اور فکشن	یونس اگاسکر	150/-
اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات	سید تنویر حسین	170/-
دوسری تخلیق	محمود ایوبی	150/-
نماز محبت	جگجوپال امرتسری	150/-
غالب ایک مطالعہ	ڈاکٹر علی احمد جلیلی	60/-
ریگ رواں کا مجلہ	سید المظفر وسیم	75/-
شمع آزادی کے پروانے	عزیز الحسن صدیقی	20/-
اردو ادب کے ارتقاء میں غازی پور کے خدمات	ڈاکٹر علی شیر خاں	250
سہ ماہی جہات	مدیر حامدی کاشمیری	50/-
دستاویز	پروفیسر جابر حسین	50/-

سرورق: ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ

ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا
شخصیت اور خدمات
ڈاکٹر آدم شیخ

ڈاکٹر جمخانہ والا 'انجمن اسلام' ممبئی کے صدر ہیں انھوں نے ایک طویل عرصے سے اپنے آپ کو تعلیمی اور سماجی خدمات کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ممبئی اور مہاراشٹر کے بیشتر علاقوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے نئے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور قدیم تعلیمی اداروں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے میں جو خدمات ڈاکٹر صاحب انجام دے رہے ہیں وہ قابل تعریف ہی نہیں قابل فخر بھی ہیں ڈاکٹر صاحب کے اس طریقۂ کار سے تعلیم کے میدان میں کام کرنے والوں کے حوصلے بلند ہوں گے۔ ڈاکٹر آدم شیخ نے ڈاکٹر جمخانہ والا کی سوانح لکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اس کتاب کو ایسے ات بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے جو تعلیم کے خارزار میدانوں میں تعلیم کی روشنی پھیلانے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

قیمت -/250

مہمان مدیر
ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک ا۔ آر۔ کے۔ پورم' نئی دہلی (اشاریہ)

آزاد ہندستان میں اردو زبان و تعلیم پر ایک نظر

آزادی کے پچاس سال بعد بھی اردو کے مسائل پر بحث کی ابتدا اگر برصغیر کی تقسیم سے کی جائے تو یہ کلیشے ہوگا۔ برصغیر میں آگ کا دریا بہا تو اس نے زندگی کے ہر شعبے کو جھلس دیا اور ہر تصویر پرائی نظر آنے لگی۔ اردو اپنے ہی وطن میں ایک ایسی بہو بن کر رہ گئی جو اپنے ساتھ جہیز نہیں لائی تھی اور جس کو اس کی سسرال زندہ جلا ڈالنے کا اہتمام کرنے لگی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ Syndrome کے لیے ہمارے قومی رہنماؤں نے جو شاک تھریپی اختیار کی وہ ناگزیر تھی اور وقت کا تقاضا۔ ان حالات میں یہ تھریپی غلط نہیں تھی لیکن مستقبل کے لیے یہ حکمت عملی تباہ کن ثابت ہوئی۔

۱۹۵۶ء میں جب لسانی بنیادوں پر ریاستوں کو تشکیل نو ہوئی تو جدید ہندستانی زبانوں کو الگ الگ علاقے تفویض ہوئے۔ تامل زبان کو تمل ناڈو اور پنجابی کو پنجاب کا علاقہ مل گیا لیکن اردو جو قومی سطح کی حامل زبان تھی' متحدہ ہندستان کی سب سے اہم زبان ہونے کے باوجود کسی صوبے کی سرکاری زبان نہ بن سکی۔ ایسا ہونا وفاقی اصولوں اور جمہوری نمبر گیم کا تقاضا تھا۔ ریاستوں کی تشکیل جدید کے بعد اردو بیشتر صوبوں میں ایک بڑی اقلیت یا مجموعی طور پر ملک کی دوسری اکثریت کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ یہ کروڑوں ہندستانیوں کے تشخص کے اظہار کا وسیلہ تھی یا پھر کروڑوں لوگ اردو کلچر سے وابستہ تھے۔ اردو والوں کی اس بڑی تعداد کو دیکھ کر حکومت ہند نے اسے آئین کے آٹھویں شیڈول میں شامل کر کے فروغ اردو کو اپنے ایجنڈے میں شامل کیا۔ یہ قابل قدر قدم تھا۔

۱۹۵۶ء کے Reorganisation of Indian States کے ایکٹ کے بعد اردو کی جو حیثیت ابھر کے آئی وہ فیڈرل تشکیل نو کا ایک نارمل نتیجہ تھی۔ حکومت ہند کسی زبان کی بقا اور ترویج کے لیے کیا کر سکتی ہے یہ بات اہم ہے لیکن کسی بھی زبان کے فروغ کی ذمے داری متعلقہ ریاست کی ہے اور ریاستیں اپنی علاقائی زبان کو فروغ دینے کی پابند ہیں۔ ریاستوں میں نئی عوامی حکومتیں منتخب ہوئیں ان کو اپنی ریاستی زبانوں کے فروغ کا Mandate حاصل ہو گیا۔ کسی اقلیتی زبان کا فروغ پہلی Priority نہیں ہو سکتا تھا۔

اس آئینی اور قانونی پس منظر میں آئین ہند میں اقلیتوں کے متعلق حقوق (Article 29-30) کی اہمیت فروغ اردو کے لیے اور بڑھ جاتی ہے۔ لسانی اقلیتوں کو اپنی زبان، رسم الخط اور ثقافت کے تحفظ کے حقوق حاصل ہیں۔ مذہبی اور لسانی اقلیتیں اپنے مذہبی اور تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظام اور انصرام کا حق رکھتی ہیں۔ ریاستی حکومتوں کو یہ احتیاط برتنی ہوگی کہ جب کسی تعلیمی ادارہ کو مالی امداد فراہم کریں جو مذہب اور لسانی بنیادوں پر کسی اقلیت نے قائم کیا ہے، کسی قسم کا امتیاز نہ برتیں۔ ہر ریاستی حکومت اور مقامی حکومت کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ ثانوی درجوں تک تعلیم پانے والے بچوں کو جو لسانی اقلیتی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں' مناسب سہولیات فراہم کریں اور ان سہولیات کی عدم دستیابی کی صورت میں صدر جمہوریہ ہند ضرورت پڑنے پر ہدایات جاری کر سکتے ہیں۔ یہ آئین ہند ہے اور حکومت کی تسلیم شدہ پالیسی۔

آزادی کے پچاس سال بعد آج ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہوئے ہیں۔ آئین ہند اور حکومت کی طے شدہ پالیسی کے تحت ہمیں اردو کے فروغ کے لیے قابل عمل منصوبہ تشکیل دینا ہوگا۔ پچھلے پچاس سال میں اردو تعلیم اور فروغ اردو زبان میں اگر کسی چیز کی کمی رہی تو وہ منصوبہ بند پالیسی سازی ہے۔ پچاس سال کے بعد تہذیب' تشخص اور قومیت کی نئی تفہیم ہو رہی ہے۔ یہ تفہیم ماضی سے جڑنے کی بھی ہے' اپنی جڑوں کا تازہ احساس بھی ہے اور تاریخ کے Distortions کو سمجھنے سے بھی عبارت ہے۔ گولڈن جوبلی سال میں اعتراف گناہ کے ساتھ سچائیوں کی بازیافت ضروری ہے۔ اکیسویں صدی میں اس بازیافت کے بغیر سوچا نہیں جا سکتا اور نہ کسی پالیسی کی ہیئت ترکیبی متعین کی جا سکتی ہے۔

ہماری زبان کے ارتقا کی تاریخ کا ایک ورق یہ ہے کہ ہم نے اردو کو ادب کے نعم البدل کے طور پر دیکھا اور سمجھا ہے۔ جیسے ہی ہم اردو زبان کی بات کرتے ہیں اس کی تفہیم صرف اور صرف اردو ادب اور اس کے مطالعے سے وابستہ کر دیتے ہیں یعنی جدید سائنسی اور سماجی علوم یا عام زندگی میں کام آنے والے کسی بھی نوعیت کے علم سے اردو کو جوڑنے کی فکر ہمارے مزاج کا حصہ ہی نہیں ہے۔ اردو کا مقدر آج یہ ہے کہ ہر حرف شناس بہ زعم خود اردو کا ذی وقار ناقد بن بیٹھتا ہے اور جھٹ پٹ غالب پر ایک کتاب لکھ ڈالتا ہے۔ اردو والوں کی یہی دکھتی رگ ہے جس پر ہم کو فوراً توجہ دینا ہوگی اور اس ادیب کو بتانا ہوگا کہ بھائی آسمان کے نیچے اس زمین کے اوپر اور بھی دنیا جہان کے مضامین ہیں جو آپ کی توجہ کے محتاج ہیں اُن کا مطالعہ کیجیے اور قوم کی نئی نسلوں کو ان سے روشناس کرائیے۔

اب اردو کی تاریخ کا ایک اور ورق الٹیے۔ پوری تاریخ پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ ہمارے ہاں اردو تعلیم سے متعلق ماہرین تعلیم عنقا ہیں۔ اردو میں تعلیم کے نظم کے لیے کبھی کوئی پالیسی وضع نہیں کی گئی۔ نتیجتاً اردو تعلیم کے نام پر قوم کے نونہالوں کو صرف ادب پڑھایا جاتا رہا۔ ان کے لیے

نصاب کو ترتیب دینے کی ذمے داری کسی ماہر تعلیم نے نہیں بلکہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں ہی نے نبھائی۔ تعلیمی عمل ادبی عمل سے الگ ہے۔ ہمارے ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں نے اردو زبان کو دنیا کی عظیم زبانوں کے ہم پلہ کیا اور اپنے دائرے کے اندر قابل ستایش کارنامے انجام دیے لیکن تعلیمی نظام کو استوار کرنے کا کام دوسری طرح کا ہے۔

اردو کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے ملکی تعلیمی نظام میں کیا حیثیت دی جاتی ہے اور اردو میڈیم کو کیسے استحکام دیا جاسکتا ہے۔ ہندستان میں ۷۰ فیصد طالب علم ملکی میڈیم سے تعلیم حاصل کرتے ہیں جیسے تامل، پنجابی، بنگالی، ہندی اور اردو۔ گذشتہ ۵۰ برسوں میں یہ فکر پروان چڑھی کہ انگریزی میڈیم اور اعلا معیار لازم و ملزوم ہیں اور دوسرے ملکی میڈیم سے دوسرے اور تیسرے درجے کے طلبہ پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اکیسویں صدی کے ہندستان میں ۷۰ فیصد طالب علم ایسے ہوں گے جو عام نظر میں دوسرے اور تیسرے درجے کے طالب ہوں گے اور ملک کے مرکزی دھارے کے نظام تعلیم اور ابھرتے ہوئے ٹیکنولوجیکل Challanges کا سامنا نہیں کرپائیں گے۔ یہ ایک سنگین صورت حال ہوگی جس کا سامنا ملک کے منصوبہ سازوں کو کرنا پڑے گا۔

کسی بھی میڈیم کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ آیا اسے جدید Educational Technological Inputs مہیا ہیں یا نہیں۔ یہ Inputs چونکہ ملکی زبانوں کے تعلیمی میڈیا میں مفقود ہیں اس لیے یہ کمزور پڑے ہیں۔ inputs میں معیاری نصابی کتابیں، معاون علمی مواد، اساتذہ کی تربیت Audio Visual امداد اور کمپیوٹر ماحول شامل ہیں۔ ملکی زبانوں کے میڈیم اور اردو میڈیم کے استحکام کے لیے ان بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوگا۔ تعلیمی نصاب، قومی معیار اور قومی مقاصد کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ اردو میڈیم میں تعلیم پانے والے بچے جب ہائی اسکول پاس کریں تو مین اسٹریم (Main-Stream) کے تعلیمی نظام میں نہ صرف کھپ جائیں بلکہ اس میں بھی چمک اٹھیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی اب سمٹنے کو ہے۔ اردو زبان کی بقا اور ترویج کے لیے ضروری یہ بھی ہے کہ وہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ اکیسویں صدی میں اردو زبان، رسم خط ادب اور ثقافت کو زندہ و پایندہ رکھنے میں اہم قدم یہ ہوگا کہ ہم منصوبہ طریقے سے اردو کو کمپیوٹر ٹکنالوجی سے روشناس کرائیں۔ اردو سافٹ ویئر، مشین ٹرانسلیشن اور اردو Programming کی سہولیات مہیا کریں۔ اردو کا مستقبل تعلیمی نظام میں اردو زبان کی حیثیت اور اردو میڈیم کے استحکام پر منحصر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو حالتِ موجودہ کے بدلاؤ کی صورت نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر ظہیر الدین ہاشمی

حروف اور اعداد

(اردو اور صحت)

"مختلف زبانوں میں حروف کے اعداد دیے گئے ہیں۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب کا پراز معلومات مضمون عددوں کا نظام 'کتاب نما کی ستمبر کی اشاعت میں شائع ہوا۔ حروف کے اعداد کے بارے میں انگریزی میں میرے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا مضمون پڑھنے کے بعد اردو داں حضرات کے لیے قلم بند کیا جاتا ہے۔"

حروفوں کے اعداد کیوں اور کس طرح دیے گئے ہیں۔ عربی حروف میں "الف" کا ایک 'ب' کے دو 'غ' کے ہزار کیوں ہیں؟

کیوں نہیں 'الف' کے ہزار اور 'غ' کا ایک ہے؟

کیا یہ موجودہ سائنس اور علوم کے مطابق ہیں۔ ان کی کیا حقیقت ہے؟

سائنس میں بہت عرصہ تک صرف جوہر ATOM کا تصور تھا۔ اس کے بعد Electron Proton Neutron کے بارے میں معلومات ہوئیں۔ اور جس طرح نظام شمسی میں گردش ہے اسی طرح کائنات کی ہر چیز میں گردش اور نور ہے۔ اسی ارتعاش Vibration کی وجہ موجودہ زمانے میں ریڈیو' ٹیلی فون' T.V. وغیرہ ایجاد ہوئے۔

عہد قدیم سے پانی دریافت کرنے کا فن چلا آتا ہے جس کو ڈاوزنگ کا طریقہ کہتے ہیں۔ اس کو عصائے خداوندی کا طریقہ بھی کہا جاتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں فرانس کے پادری Abbe Bouly نے اس کو ترقی دی اور Radiesthesie کا نام دیا جس کے ذریعہ نہ صرف پانی کا پتہ لگایا جاسکتا ہے بلکہ پٹرول اور دوسری معدنیات' مفر تابکاری اثرات گمشدہ چیزیں یا اشخاص' نباتیاتی' حیوانیاتی' ریسرچ اور ان کی بیماریوں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ فن وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کو Extra Sensory Perce Ption زائد حس

موجود ہوتی ہے الماتا قزاقستان کی تحقیق کے مطابق یہ حس سو میں دو تین آدمیوں میں ہوتی ہے۔ پانی' پٹرول اور معدنیات کے لیے درخت کی قلیل نما شاخ' پنڈولم Pendulon یا تسبیح کا استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ حساس لوگوں کو اس کی بھی ضرورت نہیں ہوتی وہ صرف ہاتھ کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف پانی کی جگہ معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کی گہرائی مقدار اور خاصیت کا بھی پتا لگتا ہے۔ اسی طرح پٹرول اور دوسری معدنیات کا پتا لگانے کے لیے اس مقام پر جانے کی ضرورت نہیں صرف نقشا کے ذریعہ بھی یہ ممکن ہے۔ جس کو Mapdowsing کا نام دیا گیا ہے۔

فرانس میں بیٹھے ہوئے الجیریا میں پٹرول وغیرہ کا پتا لگایا گیا۔ یہی وجہ تھی فرانس الجیریا پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

اس طریقہ کو اپناتے ہوئے راقم نے بھی آندھرا کے ضلع کوشنا میں ۱۹۷۰ء میں پٹرول دریافت ہونے کے کئی سال پہلے نشان دہی کی تھی۔

اس طریقے سے انسانوں کے علاج کے لیے اولین کوشش کیلی فورنیا کے ڈاکٹر ابراہام نے کی تھی۔ ابراہام کے موجب انسان کے پیٹ سے تابکاری اثرات کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ دق کے مریضوں کو مغرب کی طرف رخ کر کے پیٹ پر تھپکنے سے تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔

اس کے بعد انگلستان کے ڈاکٹر گوایں رچرڈ نے اس کو آگے بڑھایا اور کیمیا میں عناصر کو جو نمبرات دیے گئے ہیں۔ ان کی حقیقت بتائی اس طرح جراثیم' انسان کے جسم کے مختلف اعضاء اور ادویات کے ارتعاش کے بھی نمبرات دیے ہیں۔

انسان کے خون یا پیشاب کے قطرے تصویر' ہاتھ کی لکھائی فنگر پرنٹ کے ذریعہ بیمار کے مکمل معلومات اور علاج کا طریقہ معلوم ہو جاتا ہے۔ چاہے بیمار سیکڑوں میل دور ہو اور اس کا علاج کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر رچرڈ کے شاگرد ڈاکٹر Dr. Tombinson نے مزید ترقی دی اور اس میں تصوف اور سلوک کو بھی شامل کرلیا جیسے

عالم انسان

عالم مثال

عالم فلکی

عالم دماغ

اور ان کی یہ طاقتیں دیں

عالم انسان کی طاقت ۹۵ ہے
عالم مثال کی طاقت ۱۵۰ ہے
عالم قلبی کی طاقت ۴۵۰ ہے
عالم دماغ کی طاقت ۷۵۰ ہے

اور ادویات کو بجائے نمبرات کے مقناطیسی طریقہ سے تقسیم کیا ہے۔ جس کی وجہ تشخیص کے وقت میں کافی بچت ہوتی ہے اس کے بعد امریکہ Dr. Ruth Drown اور انگلستان میں Dr. Georgedela Warr نے مزید ترقی دی ہیں۔ میں بہت سے آلات شامل کئے گئے ہیں۔ جس کے ذریعہ ایک خون یا پیشاب کے قطرے کے ذریعہ اندرونی بیماری کی تصویر لی جاسکتی ہے۔ جس دوا کی ضرورت ہو بغیر اجزا کے الکوہل یا شکر میں بنائی جاسکتی ہے۔ فاصلے کے مریض کا ارتعاش سے علاج کیا جاتا ہے۔ سادے پانی میں تابکاری اثرات اور اس کو پڑھ کر پھونکنے سے جو تبدیلی آتی ہے وہ تصاویر لی گئی ہیں۔

ہومیو پیتھی اونچی طاقت کی دواؤں میں صرف الکوہل رہتا ہے۔ مگر خاص کیمرہ سے تصویر لینے پر اس میں جو نور ہوتا ہے وہ ظاہر ہوتا ہے۔ اب اس علم کے لیے Radionic کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

الفاظ سے جو نور Radiation پیدا ہوتا ہے۔ اس کی Kirtian Photography کے ذریعہ تصویر بھی لی جاسکتی ہے راقم نے بھی سادے پانی اور زم زم میں جو نور ہے یا پانی پر پڑھ کر پھوکنے سے جو تبدیلی آتی ہے اس طریقہ سے تصاویر لی ہیں۔

حروف کو اعداد دینے کا طریقہ زمانے قدیم سے چلا آتا ہے۔ جیسا کہ ابجد کے الفاظ کو دیا گیا ہے۔ یہ ارتعاش Vibration ظاہر کرتا ہے یا تو Positive ہوگا یا Negative یا Neutral۔ جس کو Occilation کہا جاتا ہے۔ جس کو Pendulam یا تسبیح کے ذریعہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح حروف کے ارتعاش کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ الف میں ایک مرتبہ ارتعاش ہوتا ہے ب میں دو مرتبہ اس طرح ہر ایک حروف پر یہ بات صادق آتی ہے۔

کائنات میں متعدد قسم کی لہریں ہیں جو مختلف کاموں میں آتی ہیں۔ عربی زبان جو کئی ہزار سال قبل مسیح سے چلی آتی ہے اور اب بھی زندہ زبان ہے۔ اس کی تصدیق بائبل کے کتبوں سے ہوتی ہے۔

عربی میں شمسی اور قمری حروف ہیں۔ مگر خاص بات یہ ہے تمام حروف مثبت Positive ہیں۔ مذکر اور مونث میں صرف رفتار کا فرق ہے۔

اس کے برخلاف اردو' فارسی' ہندی' سنسکرت وغیرہ میں بعض الفاظ جیسے پ' ٹ' ج' ڈ' ڑ' گ منفی Negativa ارتعاش کے حامل ہیں۔

دوسری زبان کے حروف عربی حروفوں کے ساتھ لکھنے سے ارتعاش میں فرق آجاتا ہے۔ یا تو طاقت کم ہو جاتی ہے یا منفی بن جاتے ہیں۔ کسی کے نام کو دوسری زبان میں لکھنے سے بھی فرق آتا ہے۔

اعداد کو مختلف بنیادوں پر نکالا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے بعض زبانوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ جنوبی ہند کی زبانوں ملیالم' تامل' تلگو' کنڑی کا ارتعاش بہ نسبت انگریزی' ہندی کے زیادہ ہے۔ عربی زبان میں مخارج کو خاص اہمیت ہے۔

لفظ ایک مقام سے نکلتا ہے اور اس کا اثر دوسرے مقام پر ہوتا ہے۔ یہ آکیو پنچر کے پائنٹ ہیں جس سے صحت پر اثر ہوتا ہے۔

عربی الفاظ کی تلاوت کرنے سے 'تکرار کرنے سے' لکھنے پڑھنے سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ کئی بیماریاں آنے نہیں پاتی یا جلدی اچھی ہو جاتی ہیں بشرطیکہ منفی اثرات کا غلبہ نہ ہو۔

ہندستانی زبانوں کو عربی الفاظ میں لکھنے کا رواج مغربی ساحل پر آئے ہوئے عربوں نے اردو سے بہت پہلے شروع کردیا تھا۔

کوئی زبان جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی رسم الخط نہیں ہے۔ عربی حروف میں تحریریں موجود ہیں۔ ہم اردو کو عربی اسم اعضا میں استعمال کرنے سے اپنی صحت پر مثبت اثر کرسکتے ہیں۔ اردو بیشتر عربی کے حروف ہیں اور اردو' فارسی اور عربی کا زینہ ہے اور اس کی وجہ ہندستان کی دوسری زبانوں سے بھی اجنبیت نہیں رہتی۔

عربی یا کسی زبان کو ہم اپنی مادری زبان کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بغیر سمجھے پڑھنے سے ہم اپنا کردار نہیں بناسکتے اور خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔ قرآن لکھنے پڑھنے سے بیماریاں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ سورج' چاند' ستاروں کے اثرات Positive Negativ اور Neutral ہوتے ہیں۔ چاہے اس کو کوئی جانے یا نہ جانے اور ان کی ایک ارتعاش کی طاقت ہوتی ہے۔ انسانوں میں یہ عالم فلکی پر اثر کرتی ہے۔ جس کی طاقت ۲۵۰ بتائی جاتی ہے۔

جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے یا پڑھا جاتا ہے تو طاقت ہزاروں لاکھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ستاروں کے منفی اثرات بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ہم کو جسمانی' دماغی اور روحانی صحت کے لیے عربی اور اردو ضروری ہیں۔ ایسی کتابیں جس کو بار بار پڑھنے کی خواہش ہو وہ آپ کے لیے بہترین ہیں۔

ڈاکٹر محمد اکرام خاں
جامعہ نگر نئی دہلی۔۲۵

پختہ شخصیت کے عناصر اربعہ کی پختگی

اپنے جسم کو صحیح سلامت اور تن درست رکھے بغیر کوئی شخص اچھی زندگی نہیں گزار سکتا۔ جسم کمزور اور خراب ہونے پر اپنے مالک کا بدترین دشمن بن جاتا ہے اور طاقت ور اور تن درست رہنے کی صورت میں بہترین دوست ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح دماغی حالت کمزور ہونے پر انسان جذبات کا شکار بن کر رہ جاتا ہے اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تقریباً ختم ہی ہو جاتی ہے جسم اور دماغ دونوں آپ کی ذات کو (Self) بنائے رکھنے کے لیے ضروری عنصر ہیں اور ہم ان ہی کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔ دراصل یہ ہمارا قصور نہیں ہماری تعلیم کا قصور ہے۔

ہمارا نظام تعلیم دقیانوسی اور روایتی ہے۔ اس میں تدریس کے ذریعہ ہمیں خارجی معلومات سے بذریعہ حکم یا انعام کے لالچ اور سزا کے خوف سے واقف کرادیا جاتا ہے لیکن ہماری قوت متخیلہ، قوت حافظہ اور قوت استدلال کو فروغ دینے کی کوشش نہیں کی جاتی چنانچہ ذات (Self) مجروح ہو کر رہ جاتی ہے مثال کے طور پر ہم اپنی طالب علمی کے زمانہ کی ایک بات دہراتے ہیں:۔

"یہ بات ہے ۱۹۳۱ء کی۔ ہم چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ استاد جماعت درسی مضامین بڑی سنجیدگی اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے ہم سنتے جاتے اور رٹ کر یاد کر لیتے تھے۔ اگر ہم میں سے کبھی کوئی طالب علم نیچی گردن کر کے کچھ سوچنے لگتا تھا تو فوراً کہتے "ارے کیا رات نہیں سویا تھا۔ یہاں بیٹھا سو رہا ہے۔" بس یہ تھا اس زمانہ میں استاد کا اپنے طلبا کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ اور یہی طریقہ تدریس، کم و بیش آج بھی ابتدائی تعلیم کے استادوں کا ہے۔

ذرا غور کیجیے کہ بچوں کو کس قسم کی غذا ملتی ہے۔ متوازن یا غیر متوازن۔ غیر متوازن غذا کے باوجود بچوں کو میٹھا کھانے کی عادت ہوتی ہے اور وہ گڑ، مٹھائیوں اور ٹافیوں کی صورت میں میٹھا زیادہ کھاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے دماغ کی نشوونما پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح

انھیں الٹے سیدھے کھیل کھیلنے سے اپنے جسم کی صحیح نشوونما میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ جن بچوں کو اسکول کے تنگ و تاریک صحن میں لیفٹ رائٹ جیسے حکم کے ذریعہ قدم سے قدم ملا کر چلنا سکھایا جاتا ہے وہ ورزش سے بددل اور نالاں ہو جاتے ہیں۔ انھیں تو تازہ ہوا اور کھلے میدان میں کھیل کر خوشی ہوتی ہے وہ خوش ہوتے ہیں گنگا اور جمنا جیسے دریا کے کنارے بھاگنے دوڑنے اور ہرے بھرے کھیتوں کی سیر کرنے سے۔

جسم اور دماغ کی طرف سے جس طرح غفلت برتی جاتی ہے کچھ اسی طرح قوت ارادی کو بھی نظرانداز کیا جاتا ہے۔ قوت ارادی بڑھتی ہے کسی کٹھن منزل کو طے کرانے یا کسی مشکل کو آسان بنانے سے۔ ہم بچوں کو اپنی لاعلمی کے سبب ایسی صورت حال سے دور ہی رکھتے ہیں جس سے نپٹنے کے لیے انھیں کچھ جدوجہد کرنا پڑے اور ان کی قوت ارادی مضبوط ہو۔ اچھا یہ ہے کہ اسکول میں بچوں کو شروع ہی سے ایسی ورزشیں کرنے اور ایسے کھیل کھیلنے کا موقع دیا جائے جن میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انھیں قوت ارادی سے کام لینا پڑے۔

جسمانی صحت بنانے اور برقرار رکھنے کے لیے بچوں کو شروع ہی سے یہ سکھانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ دوڑنا ہو یا کرکٹ اور فٹ بال کا کھیل ہو۔ غرض یہ کہ جو بھی ہو اسے روزانہ پابندی کے ساتھ کھیلا جائے۔ کھیلتے رہنے یا کھیل میں شرکت سے قوت ارادی کو مضبوط کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

ذات (Self) کو مدت دراز تک توانا اور تن درست رکھنے کے لیے جسمانی صحت کا ہونا شرط اول ہے۔ جسمانی صحت بنتی ہے متوازن غذا، صحیح قسم کی ورزش، تازہ ہوا اور سورج کی روشنی ملتے رہنے سے۔ جسمانی صحت کے بعد دوسرا اہم مسئلہ جذبات کا ہے۔ جذبہ اور احساس میں ہر شخص تمیز نہیں کر سکتا اور نہ ہی بچوں کو ان دونوں کا فرق سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہم میں بہت کم ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ عقل و فہم یعنی سوجھ بوجھ کو بڑھانے میں خاموش اور نفیس احساس معاون ثابت ہوتا ہے اور مضطرب احساسات عقل و فہم یعنی سوجھ بوجھ کو دبانے کا کام کرتے ہیں۔

ضرورت ہے بچوں کو یہ سکھانے کی کہ نفیس احساسات سے غور و فکر کرنے میں مدد ملتی ہے اور جذبات غور فکر کی صلاحیت کو ابھرنے ہی نہیں دیتے۔ ضرورت ہے یہ سکھانے کی کہ حقائق زندگی کو پہچاننے اور سمجھنے میں خاموش اور نفیس احساسات سے مدد ملتی ہے اور ان ہی احساسات کی مدد سے بصیرت میں پختگی پیدا ہوتی ہے بچوں کو سکھانا چاہیے کہ مسائل زندگی پر جذبات سے دور رہ کر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں خاص طور سے یہ سکھانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر صورت میں جذبات کی رو میں بہہ جانے کے بجائے ان پر قابو پا لیا

جائے اور انہیں اپنے لیے مفید اور کار آمد بنایا جائے۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں بچوں کی اس قسم کی تربیت نہیں کی جاتی۔ اگر کہیں کچھ سکھایا بھی جاتا ہے تو بس یہ کہ احساسات عقل و فہم (ادراک) کو دباتے ہیں۔ یعنی ان کی وجہ سے ادراک کی نشو نما میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے طریقہ تدریس کو سائنٹیفک ثابت کرنے کے لیے اپنی بات اس طرح شروع کرتے ہیں "مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے اور سلجھانے کے لیے فرد کو موضوعی (Sabjeetive) نہیں معروضی (Objeetive) نقطہ نظر اختیار کرنا ہوتا ہے یعنی احساس کو ادراک سے علاحدہ رکھ کر ٹھنڈے دل سے منطقی طور پر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔" یہ بات کہنے والے شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ اچھا سائنس داں اپنے مضمون کی اہمیت کے احساس سے کبھی غافل نہیں رہتا۔ اچھا سائنس داں اور اچھا فلسفی احساسات کو وہی مرتبہ دیتا ہے جو عقل و فہم کا ہوتا ہے۔ اچھا سائنس داں اور اچھا فلسفی پراسرار طریقہ پر احساسات کی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔

احساسات فطرت انسانی کا اہم جز ہیں۔ ان کی تربیت میں اطمینان قلب اور اور دلی مسرت کا سہارا لینے سے فائدہ ہوتا ہے۔ شائستہ اور نفیس احساسات کے بغیر شخصیت کی پختگی میں کمی رہتی ہے۔ گندے اور مضطرب احساسات یعنی جذبات کا ہیجان بسا اوقات جھگڑے اور فسادات کا سبب بن جاتا ہے۔

شائستہ اور نفیس احساس کو شخصیت کی پختگی کا دوسرا اہم عنصر مانا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر دوارن تعلیم اس میں صحیح طریقہ سے شائستگی اور نفاست پیدا کرائی جانی چاہیے۔

پختگی پیدا کرنے کے لے تیسرا عنصر قوت ارادی ہے ہم زیادہ تو نہیں لیکن اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدہ کی روشنی میں صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اپنے مقاصد میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جس کی قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے اور کوئی مشکل یا وقتی ناکامی اس کی قوت ارادی کو مغلوب نہیں کرپاتی۔ کامیاب وہی شخص ہوتا ہے جس کی لغات زندگی میں "نہیں یا ناممکن" نام سے کوئی لفظ نہیں ہوتا۔ وہ کسی ایک طریقہ سے اپنے کام میں ناکام رہتا ہے تو دوسرا طریقہ کار اختیار کرتا ہے۔ دوسرے میں ناکام رہتا ہے تو تیسرا طریقہ سوچتا ہے۔ غرض یہ کہ وہ کسی بھی صورت حال میں مایوس اور ناامید نہیں ہوتا۔ اپنی ناکامی کے اسباب پر ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہے۔ ایک ناکامی کو دوسری کامیابی کا پیش خیمہ بناتا ہے۔ مشکل اور پریشانی کے وقت اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ وہ مستقل مزاجی کے ساتھ مسلسل محنت سے کامیابی حاصل کرتا ہے۔ قوت ارادی ہی اس کی مستقل مزاجی اور ہمت افزائی میں ممد و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

جن لوگوں میں قوت ارادی کی کمی ہوتی ہے وہ پہلی ہی ناکامی پر ہمت ہار کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ کام کے منصوبہ کو کاغذی پیراہن پہنا کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور

کچھ لوگ صرف باتیں کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ کام پورا ہو جائے گا۔ کام تو سوچ سمجھ کر کرنے ہی سے پورا ہوتا ہے اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ کسی کام کو کچھ دن کرنے کے بعد طے کر لیتے ہیں کہ یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے۔ یہ سب وہ ہوتے ہیں جن میں قوت ارادی کی ہوتی ہے یا وہ کمزور ہوتی ہے۔

اچھے استاد اپنے شاگردوں میں قوت ارادی پیدا کرانے اور اسے مضبوط بنانے کے لیے مختلف قسم کی تعلیمی سرگرمیوں اور کاموں سے مدد لیتے ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں کے مشورہ سے کاموں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کاموں کے لیے ضروری سامان اور سہولتیں فراہم کراتے ہیں ۔ کام شروع کرانے کے بعد اسے پورا کراتے ہیں۔ کام پورا ہونے کے بعد اس کی اچھائی اور خرابی کا جائزہ لیتے ہیں۔ خرابی یا کمی کو دور کراتے ہیں اور اچھائی کی تعریف کرکے شاگردوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ اسکول میں قوت ارادی سے کام لینے اور اسے فروغ دینے کے لیے مسلسل یہ سمجھایا جاتا ہے کہ زندگی کو بنانے اور شخصیت میں پختگی پیدا کرنے کے لیے قوت ارادی سے بڑی مدد ملتی ہے۔

شخصیت کی پختگی کے لیے چوتھا اور ضروری عنصر ذہن ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں ذہن کی نشوونما پر خاصی توجہ دی جاتی ہے لیکن اس کے لیے ناقص طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس میں جسمانی قوت، قوت حس اور قوت ارادی کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے شخصیت میں خاطر خواہ پختگی نہیں ہو پاتی ۔ اس طریقہ سے نشو پایا ہوا ذہن بالکل اس پودے کی طرح ہوتا ہے جو مناسب نگہداشت اور ضروری غذا کی کمی کے باوجود بڑھ تو جاتا ہے لیکن تر و تازگی اور طاقت سے محروم رہتا ہے۔

ذہن کی صحیح نشوونما روایتی اور خبری علم سے نہیں ہوتی تجربی علم سے ہوتی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں روایتی اور خبری علم کے ذریعہ جس قسم کا ذہن پیدا کیا جاتا ہے وہ محض خیالی پلاؤ پکانے اور پتنگ کی طرح ہوا میں اونچا اڑتے رہنے میں مگن رہتا ہے۔ اس قسم کا ذہن رکھنے والے اپنے اسی خیال میں مگن رہتے ہیں کہ وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کر سکتے ہیں۔ ہم نے ایسے بہت سے ذہین لوگوں کو دیکھا ہے جو صرف باتیں کرتے ہیں اور عمل سے دور رہتے ہیں۔ جو کام کرنے والوں کو اچھی نظر سے تو دیکھ سکتے ہیں لیکن خود کسی کام کو کرنے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ ایسے نام نہاد ذہین سماجی اور فلاحی کاموں سے دور کا واسطہ رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن نفس کے عیب چھپانے کے لیے پردہ کا کام کرتا ہے۔

ذہن کی صحیح نشوونما کے بغیر شخصیت کی پختگی نامکمل رہتی ہے۔ اس کی صحیح نشوونما ہاتھ کے کاموں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جس ذہن کی پرورش ہاتھ کے کاموں کے ذریعہ ہوتی ہے وہ

ہاتھ کو کام سے نہیں روکتا بلکہ وہ تو ہاتھ سے کام کرتے رہنے کا شوق دلاتا ہے اسی لیے بنیادی قومی تعلیم کے نصاب میں ہاتھ کے کام کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔ ذہن کو سماجی اور غیر سماجی دونوں طرح کے کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سمجھ دار آدمی جس کے دل میں دوسروں کا درد ہوتا ہے۔ جو دوسروں کی عزت اور اطمینان کو اپنی عزت اور اپنا اطمینان گردانتا ہے اور دائمی اور غیر متغیر اقدار میں یقین رکھتا ہے وہ ذہن کو سدا مثبت اور مفید کاموں میں استعمال کرتا ہے۔

شخصیت کی پختگی کے لیے چاروں عناصر جسمانی قوت یعنی قوت عمل، قوت حس قوت ارادی اور ذہانت یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ کوئی بیمار، بے حس، متزلزل مزاج اور غبی انسان سماج میں قابل قدر مقام نہیں حاصل کرپاتا۔ یہ مقام حاصل ہوتا ہے اس شخص کو جو تندرست، حساس، مستقل مزاج اور ذہین ہوتا ہے۔ ان چاروں عناصر میں کوئی ایک عنصر بھی باقی تینوں کے بغیر اپنی اہمیت باقی نہیں رکھ سکتا۔ ضرورت ہے چاروں عناصر کے ساتھ رہنے کی اور چاروں کی یکساں نگہداشت کی۔

یوں سمجھیے کہ ایک شخص جسمانی اعتبار سے بالکل تندرست اور توانا ہے لیکن اس میں زود حسی مستقل مزاجی اور ذہانت کی بہت کمی ہے اور وہ ہر ایک کام محض جسمانی طاقت کے بل بوتے پر کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے عمل کے لحاظ سے جانور سے کچھ کم نہیں سمجھا جاتا۔ ایک وہ شخص جس میں شائستہ اور نفیس احساسات کی تو کمی نہیں ہوتی لیکن پختگی کے باقی تین عناصر اس کے اندر نہیں ہوتے تو وہ بلاوجہ ڈرتا رہتا ہے اور بہت سی خیالی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ شخص جو مستقل مزاج اور ارادہ کا پختہ ہو لیکن جسمانی قوت یعنی قوت عمل زود حسی اور ذہانت سے محروم ہو تو وہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے مطلق العنان بن کر دوسروں کو مرعوب کرنے لگتا ہے اور احساسات اور جذبات پر قابو نہ رکھنے والا شخص معمولی معمولی سی اختلافی باتوں پر لڑائی جھگڑا کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح آدمی ذہانت کی کمی کے سبب اپنے نفس پر قابو پانے میں ناکام رہتا ہے اور اکثر خلاف امید غیر سماجی کام کرنے لگتا ہے۔

دلچسپ اور قابل غور بات یہ ہے کہ پختگی کے لیے ان چاروں عناصر یا خاصوں کی یکساں ضرورت اور اہمیت ہوتی ہے اور ان کی نشو و نما یکے بعد دیگرے ہوتی رہتی ہے۔ سب سے پہلے جسم کی پھر قوت حس کی اس کے بعد قوت ارادی کی اور سب سے آخر میں ذہن کی۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے دوران ان کی شخصیت میں یہ چاروں عناصر بالترتیب پیدا کرائے جائیں اور سکھایا جائے کہ ان کے مناسب اور صحیح استعمال سے ہی شخصیت کی پختگی کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔

شاہین
Post Boz 2276
Statian D Otta wra Ontano
Kıp 5wy Canada

غزل

دن چھوٹا ہے رات بڑی ہے
مہلت کم اور شرط کڑی ہے

اُس کا اشارہ پا کر مر جا
جینے کو اک عمر پڑی ہے

بند نہیں سارے دروازے
خیر سے بستی بہت بڑی ہے

خوش ہیں مکیں اب دونوں طرف کے
بیچ میں اک دیوار کھڑی ہے

جاگ رہی ہے ساری بستی
اور گلی سنسان پڑی ہے

ہر پل چھوٹی ہوتی دنیا
پہلے سے اب بہت بڑی ہے

دل میں چبھن ہے لیکن ہاتھ میں
نازک سی پھولوں کی چھڑی ہے

صحرا کر دیا جس نے دل کو
ساون کی یہ وہی جھڑی ہے

جمع ہوئے سب دکھ کے مارے
جنت کی بنیاد پڑی ہے

ایک دیا شاہین ہے طاق میں

W.A.SHAHEEN
Post Box 2276
Stu.D Ottawa Ontario
Kip Swy Canada

غزل

کیا عناصر میں اختلاف سا ہے
کانچ کے گھر میں کیوں شگاف سا ہے

اصل کیا ہے پتہ نہیں چلتا
دھند کا اک عجب غلاف سا ہے

میں شکستہ نہیں ہنوز مگر
عجز میرا کچھ اعتراف سا ہے

عمر گزری ہنر نہیں آیا
کسبِ عصیاں تو اعتکاف سا ہے

تجھ سے نسبت کبھی ہمیں بھی تھی
یہ تصور اب انکشاف سا ہے

ہم کہاں تک بنے رہیں اپنے
اک زمانہ ہی جبر خلاف سا ہے

اک ذرا فرق ہے زمانے کا
ورنہ ماحول کوہ قاف سا ہے

اوڑھ کر چاہیے تو سو رہیے

رفعت سروش
اے۔۸۰ سیکٹر ۲۷
نوئیڈا۔۲۰۱۳۰۱

نیم خوابی میں

رات پھر جادو ساکت ہے
فضا ہے خاموش
کوئی آہٹ نہ ہوا،
شرق سے غرب تلک
چاند ٹوٹا ہوا۔۔۔۔۔۔ کونے میں پڑا ہے گم سُم
بزم تاروں کی سجی ہے، لیکن
ایسی پُر ہول کہ جیسے ہو طلسمات کی رات
ٹمٹمائے ہوئے تارے ہیں فلک کی میخیں
میخ نکلی تو فلک ٹوٹ کے گر جائے گا

نیم خوابی کا یہ عالم بھی عجب عالم ہے
دل بیمار کو بے ربط خیال آتے ہیں۔
لفظ معنی کے دھندلکوں میں بکھر جاتے ہیں۔
(بستر علالت سے)

اسلم کاویانی
ہل ویو، تیسری منزل
نوانگر، ڈوک یارڈ روڈ، ممبئی

پانچ اور چھے کی پھیلتی چھایا

(کچھ مزید)

محترمی سید حامد حسین صاحب نے "کتاب نما" کے پچھلے شماروں میں "پانچ کی پنچ میل دنیا" اور "چھے کی پھیلتی چھایا" کے عنوانات سے انوکھے ڈھنگ سے رسوم وروایات مذاہب وعقائد، زبان وادب، سیاست ومعاشرت، طب اور فلسفہ غرض یہ کہ گوناگوں شعبہ ہائے زندگی میں اعداد کے تعلق سے دلچسپ ونادر نکات کا ذخیرہ بہم پہنچایا ہے، اس سلسلے میں کچھ مزید مندرجات اسلم کاویانی پیش کررہے ہیں: ملاحظہ فرمائیں (ادارہ)

ہندستان کی بے مثل رزمیہ داستان "مہابھارت" میں کوروؤں کے حریف اور فاتح پانڈو برادران کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔ یہ پانچ بھائی (۱) یدھشٹر (۲) ارجن (۳) بھیم (۴) نکل اور (۵) سہدیو تھے۔

۱۹۴۷ء میں ہندستان کی تقسیم کے ساتھ پنجاب بھی تقسیم ہوگیا تھا، لیکن اس کے نام کے ساتھ پانچ دریاؤں کا تصور آج بھی یکجا ہے، جو کہ جہلم، چناب، راوی، ویاس اور ستلج ہیں۔ ان میں سے اول الذکر تین دریا تو پاکستان میں ہیں، باقی دو ہند میں بچے ہیں۔ پنجاب کے ذکر پر سکھوں کے "پنج پیارے" بھی یاد آتے ہیں۔ جن میں سے ایک کھتری، ایک جاٹ، ایک نائی، ایک سقہ اور ایک رنگ ریز تھا۔ یہ سب سکھوں کے گرو گوبند سنگھ کے ذریعہ لیے گئے ایک کڑے جاں سپاری کے امتحان سے گزر کر خالصہ پنتھ کے بنیادی رکن بنے اور "پنج پیارے" کہلائے۔ سکھ مت کے بانی گرونانک نے "پنج کھنڈ" (دھرم کھنڈ، گیان کھنڈ، شرن کھنڈ، کرم کھنڈ اور سچ کھنڈ) کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ انسانی روح کو کن کن مراحل سے گزرنے کے بعد وہ منزل حاصل ہوتی

ہے' جہاں اسے دائمی سکون ملتا ہے۔

جین مت کے پانچ مہابرت کا ذکر مضمون میں آیا ہے۔ جین مت ہی میں سمیک گیان (صحیح علم) کی پانچ قسمیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) متی گیان: حواس اور عقل پر مبنی علم' (۲) شرت گیان: مقدس کتابوں پر مبنی علم' (۳) اودھی گیان: غیب دانی سے حاصل کردہ علم' (۴) من پریایا گیان: دوسروں کے خیالات واحساسات کا علم اور (۵) کیولیہ گیان: علم کامل' جو زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے اور جو روح کی اصلی حالت ہے۔

جین مت میں سادھوؤں کے لیے یہ "پانچ چرتر" یا پانچ اخلاقی معیار حاصل کرنے ضروری ہوتے ہیں۔ (۱) مکمل جمعیت قلبی (۲) سکون قلب کے درہم برہم ہو جانے پر اسے دوبارہ حاصل کرنا (۳) مکمل اور غیر مشروط اہنسا (۴) جذبات وخواہشات سے مکمل آزادی اور (۵) بے غرض ومثالی طرز عمل۔

جین مت کی رو سے اس کائنات میں جیو اور اجیو کی پانچ قسمیں' اس طرح کل چھے بنیادی حقیقتیں ہیں۔ اجیو (غیر ذی روح) کی پانچ قسمیں یہ ہیں۔ (۱) پدگل (مادہ) (۲) دھرم' وہ شے جس کے بغیر کائنات کی کوئی چیز حرکت نہیں کر سکتی۔ (۳) ادھرم' وہ شے جس کی وجہ سے کسی چیز کا سکون میں آنا ممکن ہوتا ہے۔ (۴) اکاش یا فضا' جو تمام اشیا کے وجود کے لیے جگہ فراہم کرتی ہے اور (۵) کال یا وقت' ایسی حقیقت جو فضا کے دائرے سے باہر ہے۔

جین مت کا بنیادی عقیدہ کسی جاندار کو ضرر نہ پہنچانا ہے اور اس اصول کی تاکید میں پانچ سمیتیاں (احتیاطیں) مقرر ہیں' جو کہ چلنے' بولنے' بھیک مانگنے یا کھانا کھانے' چیزوں کے رکھنے یا اٹھانے' حتیٰ کہ رفع حاجت کے دوران بھی انتہائی احتیاط روا رکھنے سے متعلق ہیں۔

ہندوؤں کے دھرم شاستر یا سمرتیوں میں ایک گرہست کی روزمرہ کی زندگی کے فرائض کو پانچ لازمی قربانیوں (یا جناؤں یا یگیوں) کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے اور یہ ہیں' (۱) برہم یا جنا: یہ قربانی' روحانی بزرگوں اور رشیوں کے لیے' مقدس کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کے عمل سے ادا ہوتی ہے۔ (۲) پتر یا جنا: یہ اپنے اسلاف کے لیے ہوتی ہے اور شرادھ کی رسم کے ذریعے روزانہ کھانے پینے کی چیزوں کے نذر ونیاز سے ادا ہوتی ہے۔ (۳) دیو یا جنا: قربانی

دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہے اور گھر کی مقدس آگ پر نذر چڑھانے سے ادا ہو جاتی ہے۔ (۴) بھوت یا جنا: یہ قربانی کھانے پینے کی چیزوں کے نذر و نیاز سے ان بھٹکی بری ارواح کے لیے ہوتی ہے' جو انسانی زندگی کے کوائف پر اثرانداز ہو سکتی ہیں۔ (۵) نریا جنا: یہ قربانی اپنے ہم جنس انسانوں کے لیے ہوتی ہے اور مہمانوں اور اجنبیوں کو کھلانے پلانے سے ادا ہو جاتی ہے۔ ہندو دھرم کے مطابق یہ پانچ قربانیاں ہر گرہست و گرہنی کو روزانہ ادا کرنی چاہئیں۔

سنسکرت محقق امر سنہا کے مطابق پُران پانچ قسم کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں: (۱) اولین آفرینش کائنات' (۲) کائنات کا ارتقا' خاتمہ' ثانوی آفرینش (۳) دیوی دیوتاؤں' رشیوں' منیوں کے اساتیری مطالعے' (۴) منو کے عہد' یگیوں اور دیومالاؤں کے قصے اور (۵) بڑے خاندانوں خصوصاً سوریہ ونشی اور چندر ونشی خاندانوں کے حالات۔

پُرانوں میں خودکشی کو کار ثواب بتایا گیا ہے' اور خودکشی کے پانچ افضل طریقے بتائے گئے ہیں' (۱) اپنے آپ کو آہستہ آہستہ آگ سے جلا دینا' (۲) اپنے آپ کو آگ سے اس طرح جلانا کہ پانو سے آگ بڑھتے بڑھتے سر تک پہنچے' (۳) اپنے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دینا' (۴) مرن برت رکھنا' اور (۵) سب سے اعلا قربانی یہ ہے کہ اپنے آپ کو پریاگ کے مقام پر گنگا میں ڈبو دیا جائے۔

ہندوؤں کے نزدیک پانچ تیرتھوں کے ساتھ "پنچ سرووَر" (پانچ تالابوں) کی بھی اہمیت ہے' ان کے نام ہیں: (۱) مان سرووَر (۲) پشکر سرووَر (۳) بندسرووَر (سدھ پور) (۴) ناراین سرووَر اور (۵) پمپا سرووَر۔ پنچ کنیاؤں کی جو ترتیب حامد صاحب نے دی ہے اس میں' ہندوؤں کی بعض کتابوں میں کنتی کی بجائے سیتا کا نام ملتا ہے۔

عہد قدیم میں ہندستان میں "پانچ علوم' کی تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل تھی: (۱) ویاکرن (صرف و نحو) (۲) وست کاری (۳) آیوروید (طب) (۴) نیائے (منطق) اور (۵) درشن (فلسفہ)

آیورویدک طریق علاج میں انسانی جسم سے مواد و فضلات کو خارج کرنے کے لیے "پنچ کرم" یا پانچ طریقے بتائے جاتے ہیں' جو یوں ہیں: (سہنن'

یعنی چکنائی یا روغنیات بطور دوائی استعمال کرنا' (۲) سویدن یعنی پسینہ لانے کا عمل' (۳) ومن' یعنی قے کرانے کا عمل' (۴) وشتی' یعنی حقنہ کرانا' اور (۵) نسیہ' یعنی نسوار دینے کا عمل۔

پارسیوں کی مذہبی کتاب آویستا کے پانچ حصے ہیں: (۱) یاسنا (۲) گاتھا (۳) وسپرو (۴) وینديداد اور (۵) یاشت۔ اسی طرح یہودیوں کی مقدس کتاب توریت پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔ جن کی تفصیل یوں ہے: (۱) کتاب پیدائش (۲) کتاب خروج (۳) کتاب احبار (۴) کتاب گنتی اور (۵) کتاب استثنا۔

کنفیوشش ازم کے مطابق اگر "پانچ رشتے" خوش اسلوبی سے استوار رکھے جائیں تو ملک کی خوش حالی اور بہبودی کی ضمانت ہوتے ہیں' یہ (۱) حاکم اور رعایا (۲) باپ اور بیٹے (۳) شوہر اور بیوی (۴) بھائی اور بھائی' اور (۵) دوست اور دوست کے مابین رشتہ ہے۔

ناٹیہ شاستر میں ابھینیہ (اداکاری) کے ضمن میں گالوں کے اسلوب کی پانچ قسمیں بتائی گئی ہیں: (۱) کشام' غم میں بیٹھے ہوئے گال (۲) پھل' خوشی میں' روٹھنے میں پھولے ہوئے گال' (۳) پورن' خوشی' ہنسی میں پھیلے ہوئے گال' (۴) کمپت' غصے یا خوشی میں کانپتے ہوئے گال' اور (۵) سم' گال فطری حالت میں۔

حیوانات کو بھی پانچ انواع میں بانٹا گیا ہے: (۱) چرندہ (چرنے والا) (۲) پرندہ (اڑنے والا) (۳) درندہ (پھاڑنے والا)' (۴) گزندہ (کاٹنے والا) اور (۵) دولادولاروندہ (رینگنے والا)

خمس' شیعہ فرقے کے مطابق سال بھر کے مصارف کے بعد بچے ہوئے مال کے پانچویں حصے کو کہتے ہیں' جو کہ سات اشیائے خمس پر واجب ہوتا ہے اور حق آل محمدؐ ہے۔

حواس خمسہ (ظاہری و باطنی) کا ذکر مضمون میں آیا ہے۔ ہم یہاں اردو کے عناصر خمسہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جنھوں نے لگ بھگ ایک ہی دور میں اردو ادب میں نئے ڈھنگ سے تنقید' تاریخ' سیرت اور سوانح نگاری کے اولین نقوش قائم کیے اور اپنے گراں بہا مقالات سے اردو ادب کا خزانہ بھر دیا۔ اردو ادب کے عناصر خمسہ ہیں (۱) سر سید (۲) محمد حسین آزاد (۳) حالی (۴) شبلی اور (۵) نذیر احمد۔

"خمسہ نظامی" نظامی گنجوی کی پانچ مختلف بحروں میں لکھی ہوئی وہ مشہور کلاسیکی مثنویاں ہیں۔ جس کی تقلید میں اکابر شعرا نے خمسہ لکھنے کی روایت ڈال دی تھی۔ غزل، وہ صنف نظم ہے جس میں کم از کم پانچ شعر ہونے لازمی ہیں۔

پانچ کپڑوں میں پگڑی، انگرکھا، پاپجامہ، دوپٹا اور رومال گنے جاتے ہیں اور پنچ پارچہ خلعت، وہ شاہی انعام ہوتا تھا جس میں شملہ، چپکن، پٹکا، رومال اور دوشالہ ہوتا تھا۔ پنج ہزاری بھی مغل دور کا ایک درجے کا منصب تھا۔ "پنچوں کا پیالہ پینا" سے مراد ہے برادری میں شامل ہونا۔ "پنچ پولیا" ایسے بڑے اور کشادہ پنج درہ کو کہتے ہیں جو اگلے وقتوں میں بڑے بازاروں میں اس غرض سے بنایا جاتا تھا کہ اس سے سوار اور پیادے گزر سکیں۔

کیف و سرور بخشنے والے مشروب PUNCH کے ساتھ یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ طنز و ظرافت کا حامل اخبار بھی "پنچ" کہلانے لگا۔ انگلستان میں اس نوع کے اخبار کے تتبع میں لکھنو سے اودھ پنچ جاری ہوا تھا۔ "پنجہ صاحب" سکھ عقائد کی رو سے راول پنڈی کے قریب گردوارے کے پاس ایک چٹان پر بابا نانک کا نقش کف ہے، البتہ پنجہ مریم ایک گھاس کا نام ہے، جس پر حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ کو جنم دیتے وقت دردزہ میں ہاتھ مارا تھا۔

عہد قدیم میں اس دنیا کی پانچ عظیم مملکتوں کے پانچ عظیم فرماں روا تھے، جو (۱) فغفور چین (۲) راجہ ہند، (۳) خاقان ترک (۴) شاہ ایران اور (۵) قیصر روم کہلاتے تھے۔ ان فرماں رواؤں کو بقول عربوں کے (بالترتیب) (۱) ملک الناس (چونکہ چین کو حکومت، قوانین اور سیاست میں بہتر سمجھا جاتا تھا۔) (۲) ملک الحکمتہ، (ہندی حکمت مشہور تھی) (۳) ملک السباع (ترکوں کی شجاعت کی طرف اشارہ ہے)، (۴) ملک الملوک (ایران کی وسعت مملکت اور شان و شوکت کے پیش نظر) اور (۵) ملک الرجال، رومی اپنے دور میں سب سے خوش جمال، خوب رو ہوا کرتے تھے۔) کہا جاتا تھا۔

اسی طرح ایران کے کیانی خاندان کے پانچ عظیم بادشاہ بھی تاریخ میں مشہور ہیں۔ جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا ؎

کوئی قابل ہو تو ہم 'شان کئی' دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہ "شاہان کئی" تھے:(۱) کیومرث (۲) کیخسرو (۳) کیقباد (۴) کیکاؤس اور (۵) کے لہراسپ۔ خیر ماضی کے قصے سے نظر ہٹائیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمیں آج بھی پانچ بڑوں سے مفر حاصل نہیں۔ ہماری دنیا پر آج بھی پانچ بڑی طاقتوں کا بول بالا ہے اور انھیں کون نہیں جانتا: (۱) امریکا (۲) برطانیہ (۳) فرانس (۴) چین اور (۵) روس۔

چھے کی چھپلتی چھایا میں ان اندراجات کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے' مثلاً: مسلمانوں کے عہد حکومت میں فوج کی ترتیب عموماً چھے حصوں پر مشتمل ہوتی تھی:(۱) قراول (چند سرداروں کا مجموعہ جو فوج سے کافی آگے رہ کر دشمن کی فوج اور گرد و پیش کی خبر رکھتا تھا۔(۲) ہراول' فوج کا اگلا حصہ یا پیش خیمہ (۳) میمنہ (دائیں بازو کی فوج)(۴) میسرہ' (بائیں بازو کی فوج)(۵) قلب (لشکر کا درمیانی حصہ) اور (۶) جناح' (وہ گروہ جو لشکر کے دونوں اطراف مدد کے لیے ہوتا تھا۔)

گھوڑے کی چال کے مدارج کو بھی چھے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:(۱) نرم(Walk) گھوڑے کا آہستہ آہستہ چلنا (۲) دلکی(Trot) یہ چال ذرا تیز ہوتی ہے جس میں گھوڑا ٹانگیں باری باری اٹھاتا ہے اور سواری کی حالت میں سوار کو اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے۔(۳) پویہ(Canter) یہ دلکی سے تیز چال ہے اور سرپٹ سے کم(۴) رہوال(Amble) یہ عجیب وغریب چال ہے' اس میں گھوڑا ایک طرف کے دو اور دوسری طرف کا ایک پانو اٹھاتا ہے۔(۵) سرپٹ(Gallop) اس میں گھوڑا اپنے چاروں پانو زمین سے اٹھا کر بھاگتا ہے۔ گھوڑدوڑ میں اسی چال سے کام لیا جاتا ہے' اور(۶) چھلانگ(Jump) گھوڑا زمین سے اچھلتا اور پھلانگتا ہے۔

ناٹیہ شاستر کے مطابق چھے صوتی اسلوب ہوتے ہیں:(۱) اک (بلند) (۲) پت (پرجوش)(۳) مندر (بھاری)(۴) نک (نیچا)(۵) ورت (تیز) اور (۶) ولبت (دھیما)

شش عید کے روزے' عید رمضان کے دوسرے دن سے متواتر چھے دن تک رکھے جاتے ہیں۔ برہمنوں کے چھے فرائض کی ایک بدلی ہوئی ترتیب یوں ملتی ہے:(۱) اشنان (۲) دھیان (۳) جپ (۴) ترپن (دیوتا کی پوجا' وید پڑھنا)(۵) یگ کرنا/ کرانا' اور (۶) دان لینا/ دینا۔

ڈاکٹر ظفر حمیدی
آم گولا روڈ، مظفر پور ۲

غزل

زندگی لگتی ہے بوسیدہ کتاب
ہے مگر اب بھی وہ پوشیدہ کتاب

دیکھتے ہیں لوگ اسے پڑھتے کہاں
ایک شخصیت کی پیچیدہ کتاب

آج کے بازی گروں کے ہاتھ میں
ملک کا دستور لرزیدہ کتاب

خوشنما تہذیب کے قالین پر
فن کی دوشیزہ ہے ترسیدہ کتاب

اک عجائب گھر میں ہے رکھی ہوئی
رہنما قدروں کی جوئیندہ کتاب

وید یا قرآن یا انجیل آج
معبدوں میں ایک خوابیدہ کتاب

ڈھونڈتا ہے آج ہر ذہن جدید
معتبر سائنس زائیدہ کتاب

ہے ابھی بھی چیستاں یہ کائنات
کاش بن جائے یہ فہمیدہ کتاب

تھی ظفر کی شاعری پڑھنے کی چیز
بن گئی آخر میں نادیدہ کتاب

اقبال مدعو
۹۴۹ سوداگر محلہ ' بھیونڈی ضلع تھانہ ' مہاراشٹر

غزل

کس نے چھیڑا ہے یہ نغمہ کتنا سوز و ساز ہے
جیسے میری یاد گم گشتہ کی یہ آواز ہے

اس قدر سہمی ہوئی ڈرتی ہوئی سی کیوں ہے یہ
ایک ملزم کی طرح کیوں زیست کا انداز ہے

پر سمیٹے دائرے میں خوف کے بیٹھے ہو کیوں
اڑ کے دیکھو تم کو حاصل طاقت پرواز ہے

سات دریا پار کرنا کوئی جانبازی نہیں
پار جس نے نفس کا دریا کیا جاں باز ہے

اس کا چہرہ کہہ رہا ہے اس کی روزی ہے حلال
یہ سکون دل اسی روزی کا اِک اعجاز ہے

خود کو کیوں بیچیں ضرورت کے کسی بازار میں
اے خریدارو سنو ہر دل کی یہ آواز ہے

پروفیسر شمشاد حسین
وائس چانسلر نالندہ اوپن یونیورسٹی

غزل

بڑھتی ہوئی نفرت کو محبت سے مٹا دے
دنیا کو بھی جینے کا یہ انداز سکھا دے

جاتے ہوئے لمحوں کا ہے بس اتنا تقاضا
بجھتے ہوئے شعلوں کو نہ پھر کوئی ہوا دے

کچھ ایسی خطائیں ہیں جو ہو جاتی ہیں سب سے
مالک پہ یہ چھوڑا ہے وہ جو چاہے سزا دے

قاصد کی نگاہوں نے ہی جب کہہ دیا سب کچھ
اس بات کی کیوں ضد ہے کہ پیغام سنا دے

فرزانوں سے پوچھا تھا کہ کس بات پہ گم ہیں
کہنے لگے ہنس کے کوئی دیوانہ بنا دے

بے باک سی فطرت پہ انھیں ناز بہت ہے
تہذیبی تقاضے بھی ہیں کچھ ان کو بتا دے

سوچا تھا کہ ان کو کوئی پیغام نہ دیں گے
موسم کا تقاضا ہے کوئی ان کو بُلا دے

منزل پہ پہنچنا تو ہے بس کام تمہارا
رہبر کا ہے یہ کام کہ رستے کو بتا دے

گزرے ہوئے لمحوں کو اگر ڈر ہے تو اتنا
شمشاد انھیں ذہن سے اپنے نہ ہٹا دے

بشیر فاروقی
۵۱۵ مراد علی لین
ودھان سبھا مارگ، لکھنؤ

غزل

ہمنوائے حلقۂ اغیار کیسے ہوگئے
تیرے خم اے گیسوئے دلدار کیسے ہوگئے

تو بھی اب اٹھے تو نکھرے گا نہ رنگ صبح و شام
سارے منظر اے نگاہِ یار کیسے ہوگئے

وہ رواداری، محبت، درد مندی اب نہیں
آدمی کو کیا ہوا کردار کیسے ہوگئے

یہ ہمارا ملک ہے اس کی تباہی کے لیے
کچھ پرائے ہاتھ ذمہ دار کیسے ہوگئے

منہ نظر آتا تھا ان میں اے غبار ماہ و سال
اس حویلی کے در و دیوار کیسے ہوگئے

سوچتے ہی ضرب سی تار رگ جاں پر پڑی
سبز موسم جان کا آزار کیسے ہوگئے

یہ تو اے ظلِ الٰہی سوچنے کی بات ہے
شاخِ گل جیسے قلم تلوار کیسے ہوگئے

ہونٹ اپنے سی لیے شہر ستمگر میں بشیر
اس طرح جینے پہ تم تیار کیسے ہوگئے

انیس احمد خاں انیس
ایڈوکیٹ سپریم کورٹ بار بلڈنگ نئی دہلی

غزل

دل میں کوئی رہا نہ رہا تم کو اس سے کیا
گھر ہے بسا بسا نہ بسا تم کو اس سے کیا

میں نے کہا گئے ہو تو آتے ہو یاد کیوں
بولے معاملہ ہے مرا تم کو اس سے کیا

اب بات زندگی کے مسائل کی بھی کرو
کیسی ہے زلفِ یار بھلا تم کو اس سے کیا

سب لٹ چکا جہاں وہاں پہرہ لگا دیا
گھر کون سا لٹے گا بھلا تم کو اس سے کیا

دونوں بدن کے قرب کو سب کچھ سمجھ لیا
ذہنوں کا فاصلہ جو رہا تم کو اس سے کیا

غیروں کی رہبری کرو منزل انھیں بتاؤ
میں بھول جاؤں اپنا پتہ تم کو اس سے کیا

پامال کوئی پھول کرے یا اجاڑ دے
تم نے چمن ہی بیچ دیا تم کو اس سے کیا

پوچھو نہ یہ انیس کہ دل ٹوٹا کس طرح
بس ٹوٹنا تھا ٹوٹ گیا تم کو اس سے کیا

عبداللہ خالد
Gher Katey Bag Khan
Rampur(U.P)

غزل

کہاں گئے وہ پیار کرنے والے سب کہاں گئے
کسی سے جب خفا نہ تھے تو بے سبب کہاں گئے!

تھے جن کے دم سے قہقہے وہ محفلیں، وہ رت جگے
وہ ہم سخن بتا مجھے سکوت شب، کہاں گئے

یہ گم کہاں پہ ہو گئیں شرافتیں مسرتیں
روایتیں کدھر گئیں حسب نسب کہاں گئے

خنک ہوا بھی رات بھی ستارے بھی ہیں چاند بھی
مگر وہ بے نوا مسافران شب کہاں گئے

وہ جن کے دم سے زندگی میں نور تھا سرور تھا
وہ لوگ ہم سے روٹھ کر ارے غضب کہاں گئے

ظفر امام
قادری منزل، بتیا، بہار

اندھیرا پار کرنا ہے

اندھیرا ہے گھروں میں
اور آکاشوں پہ کوئی روشنی کا ہالہ اُڑتا ہے
بلاتا ہے
اشارے کرتا جاتا ہے
کہ آؤ خول سے باہر
نکالو ہاتھ جذبوں کے
مری جانب بڑھو، دوڑو
لپک کے چھو لو میرا ایک بھی ذرہ
اندھیرے سے اجالوں کی کرن کا لمس
ہو جائے

اور ایسے میں اندھیرا بند کر کے آنکھ
بیٹھا ہے انا کے خول کے اندر
انھیں جذبوں نے اس کے ہاتھ باندھے ہیں
جنھیں لے کر نکلتا ہے
تو چھوتا ہے اجالوں کو
اندھیرا پار کرنا ہے

سید انوار حسین محوّر
رائل ہوٹل بس اسٹینڈ چھولا روڈ بھوپال

ظفر مجیبی
شاہ کمپاؤنڈ شاستری نگر، موتیہاری (بہار)

غــــزلــیں

آنکھوں میں دھوپ چھاؤں کے منظر سمیٹ کر
اُترا ہوں پھر زمیں پہ کھلے پر سمیٹ کر

رنگینیٔ حیات کے دفتر سمیٹ کر
بیٹھا ہوں خود کو ذات کے اندر سمیٹ کر

میں تشنہ کام آج بھی لوٹا ہوں اپنے گھر
آنکھوں کی کشتیوں میں سمندر سمیٹ کر

ہجرت نصیب ہوگئے اپنے ہی شہر میں
پھرتے ہیں مٹھیوں میں مقدر سمیٹ کر

سورج کے ساتھ ہم بھی ازل سے سفر میں ہیں
جذب وجنوں میں عرصۂ محشر سمیٹ کر

بلوے میں جل کے خاک ہوا اور بکھر گیا
لے جائیں اب ہوائیں مرا گھر سمیٹ کر

محور دل ودماغ بڑی کشمکش میں ہیں
قرطاس جاں پہ فکر کے جو ہر سمیٹ کر

جب سناتا ہے کوئی اپنے وطن کی باتیں
یاد آتی ہیں مجھے گنگ وجمن کی باتیں

تیرے گیسو تیری آنکھیں ترے لب روح غزل
تجھ کو دیکھوں کہ کروں حسن چمن کی باتیں

شام اپنی ہے سحر اپنی ہے راتیں اپنی
آؤ مل بیٹھیں کریں شعر وسخن کی باتیں

آج ہیں عیش وطرب شیشہ وساغر کے اسیر
کل کیا کرتے تھے جو دارورسن کی باتیں

سامنے ان کے تو لب ہلتے نہیں ہیں میرے
من میں رہ جاتی ہیں اکثر مرے من کی باتیں

کار خانے ہیں عمارات ہیں ہر سمت بلند
اجنبی لگتی ہیں اب صحن چمن کی باتیں

چاندنی چپ ہے ظفر نکہت گل بھی ہے خموش
کیا کہیں کس سے کریں ان کے بدن کی باتیں

ڈاکٹر شرف النہار
سر سید نگر، علی گڑھ

مہاراشٹر کا مجاہد اعظم "سانے گرو جی"

کوکن کے خوبصورت پال گڑھ دیہات میں سداشیوراؤ کھوت گھرانے میں یہ مجاہد اعظم ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوا جس کا نام پنڈھرپور کے مشہور دیوتا پانڈورنگ کے نام پر پانڈورنگ رکھا گیا۔ والدین نے شیام کے نام سے پکارا لیکن قومی اور ملکی خدمت کے سبب وہ پورے مہاراشٹر میں سانے گروجی کے نام سے مشہور ہوئے اور آج ان کی ادبی و ملّی خدمات کو سراہتے ہوئے پورے مہاراشٹر میں "صد سالہ صدی" کے موقع پر جو جشن منعقد ہو رہے ہیں اور اخبارات کی سرخیوں میں جو نام دیکھا جارہا ہے وہ "سانے گروجی" ہی ہے' چنانچہ آج ہم بھی انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے سانے گروجی کے نام سے ہی مخاطب کر رہے اور یہ مقالہ سپرد قلم کر رہے ہیں۔

جہالت سے جہاد کرنے والا' غریبی سے جہاد کرنے والا' دشمنانِ وطن سے جہاد کرنے والا' غلامی سے جہاد کرنے والا' سیاسی منصوبہ بندی سے جہاد کرنے والا' متعصبانہ فضا سے جہاد کرنے والے اس مرد مجاہد نے اپنے قلم سے جہاد چھیڑ کر سیکڑوں' ہزاروں نوجوانوں کے دلوں کو گرمایا' ان میں تعلیم کی اہمیت کا احساس پیدا کیا' ان کے ذہنوں کو حصول علم کے لیے تیار کیا' انسانیت کا درس دیا' جذبہ مادر وطن کی قندیلیں روشن کر کے ان میں زندگی کی معنویت کا احساس پیدا کیا۔

سانے گروجی کا کنبہ انتہائی غریب تھا لیکن والدین کی خواہش کے مطابق انھوں نے ابتدائی تعلیم پال گڑھ میں حاصل کی اور ثانوی تعلیم کے لیے وہ داپولی روانہ ہو گئے۔ داپولی میں کوئی رہائش گاہ نہ ہونے کے سبب وہ اپنے ایک دوست کے یہاں رہے جہاں ہفتہ میں تین روز خیرات کے کھانے پر گزران کرتے اور

بقیہ تین روز برت رکھ کر گزار دیتے تھے لیکن اپنی غربت کا کسی سے کبھی شکوہ نہ کیا اور فاقہ کشی کے ایام میں بھی خود اعتمادی اور ایمانداری کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس طرح حصول تعلیم کو مقصد تصور کرتے ہوئے انھوں نے سنسکرت اور مراٹھی مضمون سے اقتیازی نمبروں سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد درشن شاستر میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی چنانچہ عسرت و تنگدستی میں زندگی گزارنے والے اس انسان نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر انسان میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی لگن ہے اور اس میں جذبہ صادق ہے تو دنیا کی مخالف ہوائیں بھی اس کے خیالات کے دھارے کو موڑنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔

جب ملک میں آزادی وطن کی تحریک زوروں پر تھی اور ہندستان کا نوجوان طبقہ اپنے ملک کے رہنماؤں کی قیادت میں وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا اس وقت لوکمانیہ تلک کی سودیشی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں سانے گروجی کے والد سداشیو عرف مالوراؤ کو چھ ماہ کی سزا ہوئی لیکن انھوں نے ایک نڈر وطن پرست کی طرح کبھی ہمت نہ ہاری اور اپنے حوصلے کو ہمیشہ بلند رکھا۔ ایسے وطن دوست باپ کا بیٹا ہونے کا شرف سانے گروجی کو حاصل ہوا اور اس طرح خدمت وطن کے جذبات گویا انھیں ورثہ میں ملے۔ اس جذبہ کی پیشکش میں انھوں نے جس میدان کا انتخاب کیا وہ نونہال وطن کی خدمت تھی۔ ایک استاد کی حیثیت سے وہ طلبہ میں علمی شوق کے ساتھ ایسا جوش و خروش پیدا کرنا چاہتے تھے جو مادر وطن سے محبت کے ساتھ پاکیزہ خیالات کو فروغ دینے والا ہو۔ وہ صرف تاریخ کے گایک نہ بن کر وطن کے نایک بن سکیں، چنانچہ اس خیال کے پیش نظر انھوں نے "چھاترائے دیتک" کے عنوان سے ایک روزنامہ نکالنا شروع کیا جس کو مالی وسائل محدود ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔ یہ پرچہ بچوں کی فلاح و بہبود اور ان میں علمی شوق پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے نومبر ۱۹۲۶ء میں ماہنامہ "ودھیار تھی" کا اجراء کیا۔ جس میں طلبہ کے لیے علمی شوق کے ساتھ قومی جوش کے نظریہ کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ اس میگزین میں ان کی ذہنی سطح کے مطابق آسان زبان استعمال کرتے ہوئے مضامین لکھے۔ یہ دونوں رسائل ان کے اس خیال کا پیش خیمہ تھے کہ جب تک ملک سے ناخواندگی کو دور نہیں کیا

جائے گا ہمارا ملک اور ہماری قوم ترقی نہیں کر سکتے' چنانچہ انھوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرتے ہوئے ادب کی ہمہ جہت ترقی کے واسطے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔

آزاد ہندستان کی عالیشان عمارت کو استحکام بخشنے کے لیے سانے گروجی انتر بھارتی تنظیم کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس تنظیم کا مقصد صرف زبان کی تعلیم دینا نہ ہو بلکہ اس کا مقصد علاقائی تہذیب سے آگاہی اور مختلف حصوں میں فنون لطیفہ کی اہمیت ہونا چاہیے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے فرقہ واریت' صوبائی اختلافات دور کرنے' نسلی بھید بھاؤ ختم کرتے ہوئے قومی اتحاد' آپسی بھائی چارے کی فضا قائم کرنے' مختلف علاقائی زبانوں اور رسم ورواج میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے انتر بھارتی کی بنیاد ڈالی۔ یہاں علاقائی زبانیں سیکھنے والوں کے لیے وہ گرودیو ٹیگور کے شانتی نکیتن جیسا ماحول چاہتے تھے اگرچہ ان کی اس خواہش کو قابل احترام تصور کرتے ہوئے مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن نے مالی امداد سے بھی نوازا مگر افسوس کہ یہ کام ان کی زندگی میں تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ہاں ہمیں اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ طلبہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے لائق ستایش خدمات انجام دیتے ہوئے انھوں نے خود کو "گرو' جیسے پاکیزہ عہدے کے لائق ثابت کر دکھایا۔

ایک کامیاب گرو کی حیثیت' سے رونما ہونے والی اس شخصیت کے عہد طفلی پر جب نظر کرتے ہیں تو اس خیال کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ "بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے یعنی یہ گہوارۂ مادر کی تعلیم کا ہی طفیل تھا کہ سانے گروجی کی پوری زندگی آزمایشی دور سے گزرنے کے باوجود ملک و قوم کی خدمت کے فرائض وہ بڑی حسن وخوبی سے انجام دیتے رہے۔ ان کی ماں یشودابائی جانتی تھیں کہ ظاہری تعلیم کی بہ نسبت' زندگی میں ہونے والے تجربوں کا اثر بچے کے ذہن پر زیادہ ہوتا ہے اور یہی تاثر ہمیشہ رہنے والا بھی ہوتا ہے۔ سانے گروجی کو اپنی ماں کا یہ جملہ ہمیشہ یاد رہتا کہ "گناہ کرتے وقت شرماؤ بیٹا! اچھے کاموں میں کیسی شرم؟" چنانچہ اسکاؤٹ آندولن کی رکنیت کے بعد وہاں کے اصول کے مطابق کہ "روز کوئی نیک کام کرنا چاہیے۔" سانے گروجی راہ پر چلنے والوں کی مدد کرتے تھے۔ وہ ماں سے عقیدت کی حد تک پیار کرتے تھے

اور ماں کے حکم کو زندگی میں خدا کا حکم تصور کرتے تھے۔ انھوں نے ماں کے نذرانہ محبت کو "شیام چی آئی" (شیام کی ماں) کی شکل میں عوام کے سامنے پیش کر کے ایک لائق و فاضل اولاد کے حق کو ادا کرنے میں اپنی مثال قائم کی ہے جس کا مزید ذکر ہم آیندہ سطور میں کریں گے۔

سانے گروجی کو سماجی مصلح کی تحریک مراٹھی کے مشہور اولین ناول نگار ہری نارائن کی تحریروں سے ملی اور وطن پرستی کے جذبات کو ابھارنے میں وہ گاندھی جی، رابندر ناتھ ٹیگور، رام کرشن پرماہنس وغیرہ کے نظریات سے متاثر ہوئے۔ ان اشخاص کے نظریۂ فکر نے انھیں بڑی حد تک اپنی پیروی کرنے پر مجبور کیا اور گاندھی جی کے خیال کے مطابق انھوں نے معاشرے کی فلاح کے واسطے کسی بھی کام کو کرنے سے گریز نہیں کیا۔ چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ تھا۔

سانے گروجی کی تمام تر ادبی خدمات میں مصلح سماج اور تربیتی نظام کا راز پوشیدہ ہے جس زمانے میں انھیں انسانی بیداری کی تحریک میں شریک ہونے اور تقریر کرنے کے جرم میں متعدد مرتبہ جیل جانا پڑا تو انھوں نے قید و بند کی زندگی میں بھی اپنے خیالات کو قلم بند کرنا فرض تصور کیا۔ اپنے خیالات و نظریات کی وضاحت انھوں نے نظم و نثر دونوں اصناف میں کی اور مختلف زبانوں سے تراجم کا کام بھی وہاں انجام دیا۔ انہی یادگار دنوں کا تخلیق کردہ ناول "شیام چی آئی" ۱۹۳۲ء ہے یہ دھلیا جیل سے تبادلہ ناسک کے وقت جیل کی تاریک زندگی میں صرف پانچ دنوں میں انھوں نے لکھا تھا۔ "شیام چی آئی" ماں کی تربیت، عقیدت اور محبت کا ایک ایسا دلآویز نذرانہ ہے جو بچوں کے لیے مشعل راہ بن کر ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو روشن و منور کر جاتا ہے۔ اس ناول کو ماں کی محبت کا بہت بڑا جھرنا تصور کرنا چاہیے۔

دوسرا ناول "کرانتی" بھی غالباً ۱۹۴۱ء انھوں نے جیل ہی میں لکھا۔ کرانتی عنوان سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضرور اس وقت کے ناسامعہ حالات سے بغاوت کا بیان ہوگا۔ اگرچہ انھوں نے سیاسی موضوع سے صرف نظر کرتے ہوئے اس خیال کو پیش کیا ہے کہ کرانتی کا مطلب صرف ظاہری تبدیلی نہیں بلکہ انسان کی ذہنی تبدیلی سے ہے۔ اس میں انھوں نے فرقہ پرستی کی مخالفت

کرتے ہوئے گاندھی واد اور سماج واد کے نظریے کو ترجیح دیتے ہوئے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اشرو' کھرا دھرم' ماڑے دھیے' نظمیں بھی قید و بند کی تخلیق کردہ ہیں جو انسانی زندگی میں تربیتی اصول پر زور دیتی ہیں۔ رہائی کے بعد سانے گروجی نے محبِ وطن کی حیثیت سے "بھارتیہ سنسکرتی" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس کا مقصد پڑھے لکھے طبقے میں اپنے وطن اور ہندستانی تہذیب کے تئیں محبت کے جذبات پیدا کرنا تھا۔ بالخصوص مذہب اور وطن سے محبت و عقیدت کے تاثرات کو پیش کرنے والا ان کا شعری مجموعہ "پتری" بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن دوسری جنگ آزادی کے وقت حکومت کے ہاتھوں اس کو ضبط کر لیا گیا مگر ان کے نظریات واحساسات کو حکومت ضبط نہ کر سکی اور وہ اپنا پیغام ہر حال میں دیتے رہے۔

"بھارت چھوڑو آندولن" میں حصہ لیتے ہوئے سانے گروجی نے پورے مہاراشٹر کا دورہ کرتے ہوئے عوام کو آزادی کی اہمیت کا اس طرح احساس دلایا کہ پورا مہاراشٹر ان کا ہم نوا بن گیا اور ان کی تقریری جادو بیانی سے ایسا متاثر ہوا کہ اس تحریک میں شریک ہونا اپنا فرض تصور کرنے لگا۔ سانے گروجی کی شخصیت کی جاذب نظری اس بات سے بھی ظاہر ہوتی کہ جب مذکورہ تحریک شروع ہوئی تھی اس وقت وہ نظر بند تھے لیکن رہائی کے فوراً بعد انھوں نے شہیدوں کے گھر جا جا کر غم گساری' ہمدردی اور انسانی فرض کا جو مظاہرہ کیا وہ ان کی انسان دوستی اور اعلا اقدار کی مثال بخوبی ظاہر کرتا ہے۔

سانے گروجی کو جذبہ مساوات کے تحت انسانی زندگی میں کسی طرح کی تفریق پسند نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے سماج کی تخلیق کرنا چاہتے تھے جس میں مارکس اور گاندھی دونوں شخصیات کے نظریات کا سنگم ہو۔ جہاں اقتصادی' معاشرتی اور مذہبی فرق نہ ہو بلکہ انسانیت انسان کا مذہب ہو اور ہمدردی اس کا ایمان۔ ان کے نظریہ کے مطابق "وہ انسان عظیم ہے جو پوری انسان برادری کی بھلائی کو پیش نظر رکھے' محبت اس کی طاقت ہو' قربانی ان کی شان ہو اور غریبوں کی بھلائی اس کا مقصد ہو۔"

سانے گروجی نے مذکورہ نظریات کی پیروی کرتے ہوئے اپنی زندگی کو وطن پرستی کے جذبہ پر قربان کر دیا۔ مادر وطن کی خدمت اور اس کے شاندار

مستقبل کے لیے وہ تاحیات جدو جہد کرتے رہے گو کہ فطری طور پر وہ سیاسی آدمی نہ تھے لیکن غربت زدہ لوگوں کی حالت دیکھ کر انھیں سیاست میں داخل ہونا پڑا اسی لیے قید و بند کی زندگی میں بھی وہ ایک نڈر سپاہی کی حیثیت سے اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنے نظریۂ فکر کو عام کرتے رہے۔ اس مرد مجاہد نے تیر' تلوار یا تیغ سے جہاد نہیں چھیڑا۔ یہ گفتار کا غازی تھا اسی لیے قلم سے جہاد چھیڑتے ہوئے اس نے آزادی تو حاصل کی مگر جس آزادی کا وہ خواہش مند تھا یہ وہ آزادی نہ تھی۔ بقول فیض احمد فیض -

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

سانے گروجی نے جس آزادی کا خواب دیکھا تھا یہ وہ آزادی نہ تھی۔ انھوں نے انسان' انسان کے درمیان ایسی آزادی کی آرزو نہیں کی تھی جو انسانیت سے عاری ہو' ساری زندگی کی جدو جہد کا یہ انعام انھیں مایوس کر گیا اور وہ اداس رہتے ہوئے موت کے آرزو مند رہنے لگے لیکن ان کے یہاں موت کا فلسفہ بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ وہ موت کے تصور سے خوف زدہ نہیں بلکہ خوش ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ "موت کا فرشتہ حقیقت میں ماں کی طرح ہے۔ جس طرح تھکے ماندے بچے کو ماں اٹھا کر گلے لگا لیتی ہے موت بھی انسان کو بالکل ماں کی طرح شفقت بخشتی ہے۔ موت دراصل زندگی ہے۔ دونوں ہی خدا کی پرچھائیاں ہیں بس فرق اتنا ہے کہ زندگی انسان کو سر گرداں رکھتی ہے اور موت تھکے ہوئے انسان کی آخری منزل ہے جہاں اسے ابدی نیند میسر ہو جاتی ہے۔ تو پھر اس نیند سے کیا ڈرنا؟"

چنانچہ زندگی کی تلخیوں' ناہمواریوں' مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرتے ہوئے یہ مجاہد قوم و وطن نوجوان طبقے کے درمیان اپنی تخلیقات کا بے پایاں خلوص بھرا تحفہ چھوڑ کر اس دار فانی سے ۱۱ر جون ۱۹۵۰ء کو کوچ کر گیا۔ لیکن آج بھی اس کے پاکیزہ اور عظیم جذبات و نظریات انسان کے ذہن و ضمیر اور دل و دماغ کو انسانیت کا درس دیتے ہوئے بقائے دوام کا درجہ رکھتے ہیں۔

*

مجتبیٰ حسین
۲۰۰۔ انگور اپارٹمنٹس
پٹپڑ گنج، دہلی ۱۱۰۰۹۲

ڈاکٹر سدھیشور راج سکسینہ سے ایک ملاقات

پچھلے دنوں ہم اپنے کرم فرما اور دہلی کے سابق پولیس کمشنر راجہ وجے کرن سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئے تو راجہ وجے کرن نے کہا اچھے وقت آئے۔ آپ کے لیے میرے پاس ایک سرپرائز ہے کیونکہ آپ کے ایک پرانے دوست آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہیں اور اس وقت میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے ڈرائنگ روم میں گئے تو دیکھا کہ ہمدم دیرینہ ڈاکٹر سدھیشور راج سکسینہ گلے میں مالا پہنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہی ذوق کا یہ شعر سنایا۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ سے ملنا بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

پھر ہم سے بغلگیر ہوگئے۔ بولے "میں کل رات ہی حیدر آباد سے آیا ہوں اور آج رات لندن واپس جارہا ہوں۔ صبح سے تمھاری تلاش میں ہوں۔ پتا چلا صبح ہی گھر سے نکلے ہوئے ہو۔ میری بات مانو اس وقت میری کشش ہی تمھیں یہاں کھینچ لائی ہے۔" ڈاکٹر سدھیشور راج سکسینہ ہمارے چالیس برس پرانے دوست ہیں۔ جب ہم عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھا کرتے تھے تو یہ غالباً نظام کالج میں زیر تعلیم تھے مگر "اردو فیسٹول" اور اردو کی ادبی محفلوں میں (جو ان دنوں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں) ان سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ بعد میں انھوں نے عثمانیہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کا امتحان کامیاب کیا اور نیلو فر اسپتال میں امراض اطفال کے ماہر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ ہمارے بڑے بھائی محبوب حسین جگر مرحوم انھیں بہت عزیز رکھتے تھے اور طبی اور ادبی موضوعات پر ان کے اکثر مضامین "سیاست" میں پابندی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں یہ اچانک انگلستان چلے گئے اور وہاں جاکر یہ انگریزوں کا علاج تو کرنے لگے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں ایک ایسی بیماری میں بھی مبتلا کرنے

لگے جسے اردو شاعری کہتے ہیں۔ ہمارے لندن کے ایک اور دوست تقی تنویر کا کہنا ہے کہ سدھیشور راج سکینہ کے علاج سے ان کے مریض تو شفایاب ہو جاتے ہیں لیکن بعد میں ہم جیسوں سے اقبال، غالب، مومن، خواجہ میر درد اور داغ دہلوی کے شعروں کا مطلب پوچھنے چلے آتے ہیں۔ تقی کا بیان ہے کہ ڈاکٹر سکینہ کا ایک انگریز مریض تقی کے پاس یہ جاننے کے لیے چلا آیا کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں جس خودی کو بلند کرنے کی تلقین کی ہے اسے کس طرح بلند کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ تقی خود اردو ماحول کا پروردہ ہے بلکہ اردو کا ادیب بھی ہے لیکن اسے بھی نہیں معلوم کہ خودی کو کس طرح بلند کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب کو ٹالنے کے لئے تقی اس انگریز کو ایک میکدے میں لے گیا اور اسے جیسے ہی اسکاچ وہسکی کے تین چار پیگ پلا دیے اس کی خودی اپنے آپ ہی بلند ہو گئی اور وہ ڈاکٹر سکینہ کے علاج کی تعریف اور علامہ اقبال کی شاعری کی برائی کرنے لگا۔ تقی کو بھی پہلی بار پتا چلا کہ خودی کیسی ہوتی ہے اور یہ کیسے بلند ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سدھیشور راج کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اردو شاعری کے حوالے کے بغیر کوئی بھی کام، چاہے وہ اچھا ہو یا برا، انجام نہیں دے سکتے۔ حد تو یہ ہے کہ طب جیسے دقیق موضوع پر بھی جب وہ انگریزی میں مضامین لکھتے ہیں تو اس میں جابجا اردو شعروں کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔ انھیں اردو شاعروں کے ہزاروں شعر یاد ہیں جنھیں وہ عام گفتگو میں بھی بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ پانی بھی مانگنا ہو تو میر تقی میر کے کسی شعر کا حوالہ دیں گے۔ کھانا کھانا ہو تو داغ دہلوی کو زحمت دیں گے۔ سو جانا ہو تو سونے سے پہلے علامہ اقبال کے کسی اچھے سے شعر کی چادر اپنے اوپر تان لیں گے۔ سدھیشور راج سکینہ کو اردو کے جتنے شعر یاد ہیں اور لندن میں تیس برس گزارنے کے باوجود یاد ہیں یہ ایک حیرت ناک بات ہے۔ اردو ماحول اور اردو تہذیب میں اتنے ڈوبے ہوئے ہیں کہ انگریز اور انگریزی تہذیب دونوں مل کر ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ ۱۹۸۴ء میں ہمیں ڈیڑھ دو مہینے تک لندن میں قیام کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہر محفل میں وہ اپنی دلآویز اردو اور اساتذہ کے ہزاروں اشعار کے ساتھ موجود رہتے تھے۔ تقریر کرتے تو ایسی فارسی آمیز اردو بولتے کہ لندن کے اردو داں حضرات ایک دوسرے کی بغلیں جھانکنے لگ جاتے تھے۔ سدھیشور راج سکینہ اچھے کام کے معاملے میں شدت پسندی کے قائل ہیں۔ نیکی کریں گے تو کرتے ہی چلے جائیں گے۔ شرافت کا مظاہرہ کریں گے تو رکنے کا نام نہ لیں گے۔ لغت میں نیکی اور شرافت کے جو بھی معنی ہوں گے وہ ان

سے بھی آگے کو نکل جائیں گے۔ اب بھی دیکھیے کہ سدھیشور راج نہ صرف یہ کہ ہمارے پرانے دوست ہیں بلکہ ہمارے مداح بھی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ہماری تعریف میں کبھی رطب اللسان ہو جائیں تو اتنی تعریف کریں گے کہ تعریف تو آگے کو نکل جائے گی اور ہم بہت پیچھے کہیں کھڑے رہ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی ملتے ہیں تو ہماری ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ انھیں کسی طرح ہماری تعریف کی پٹڑی پر چلنے نہ دیں۔ حد ہو گئی کہ اس دن بھی باتوں میں ... وجے کرن سے کہنے لگے "وجے کرن! کیا کریں آج اردو زبان و ادب کا اتنا چرچا نہیں رہا۔ اگر میرا یہ یار انگریزی زبان کا ادیب ہوتا تو آج سارے عالم میں اس کا ڈنکا بج رہا ہوتا۔ اب تو بیچارے کو خود ہی اپنا ڈنکا آپ بجانا پڑتا ہے۔" یہ سنتے ہی ہم نے بیچ میں پڑ کر انھیں اپنی تعریف کی پٹڑی پر چلنے سے زبردستی روکا۔ اس لیے کہ وہ ہمارے ہر مضمون کو "معرکتہ الارا" قرار دیتے ہیں اور اردو محاورے کی رعایت سے یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہم ہر مضمون کو لکھ کر قلم توڑ دیتے ہیں۔ یوں بھی اردو کا ادیب قلم کو لکھنے کے لیے کم اور اسے توڑنے کے لیے زیادہ استعمال کرتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ لندن میں انھوں نے ایک ایسے شخص کے سامنے ہمارے قلم توڑنے کی بات کہی تھی جو اردو ادب سے کماحقہ واقف نہ تھا۔ اس پر اس بیچارے نے ہمیں نہایت ہمدردانہ اور مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ "میاں! آپ لکھتے وقت بال پین کا استعمال کیوں نہیں کرتے۔ زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔" غرض ایسی ہی باتوں کی وجہ سے ہم اپنے یار طرحدار سدھیشور راج کو ہماری تعریف کرنے کا موقع عطا نہیں کرتے۔

بہر حال سدھیشور راج بہت محبت سے ملے۔ حیدر آبادی تہذیب کا شیرازہ جس طرح بکھر رہا ہے اس کا رونا دیر روتے رہے۔ بعد میں انھوں نے از راہ عنایت ہمیں دو کتابیں تحفتاً پیش کیں۔ ایک کتاب تو خود سدھیشور کی تصنیف ہے جسے انھوں نے انگریزی میں لکھا ہے۔ جس کا نام ہے "A Sound Mind in a Sound Body"۔ اس کتاب میں انھوں نے طب 'فلسفہ' یوگا اور روحانیت کو یکجا کر کے دور جدید کے انسان کی ذہنی ناآسودگیوں اور پیچیدگیوں کو دور کرنے کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر سکینہ کی زندگی کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ سچ مچ یہ ایک معرکتہ الارا کتاب ہے۔ برطانیہ کے کئی نامی گرامی ڈاکٹروں کے علاوہ پرنس مکرم جاہ اور ہمارے دوست تقی تنویر نے اس کتاب کے لیے تعارفی مضامین لکھے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ طب جیسے خصوصی موضوع پر لکھی گئی اس کتاب میں بھی ہمیں غالب اور اقبال کے دو شعر مل گئے جن کا بڑا برمحل استعمال

ڈاکٹر سکینہ نے کیا ہے۔

دوسری کتاب کا عنوان ہے "پیاری کا پکوان" جسے پربھا سکینہ نے 'جو ڈاکٹر سدھیشور راج سکینہ کی شریک حیات بھی ہیں' لکھا ہے۔ اس میں ایک سو سے زیادہ حیدر آبادی کھانوں کو تیار کرنے کے نسخے درج کیے گئے ہیں۔ پربھا سکینہ اپنے گھر میں چونکہ "پیاری" کے نام سے پکاری جاتی ہیں اس لیے اس کتاب کا نام "پیاری کا پکوان" رکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ان دنوں ہمارے پاس حیدر آبادی پکوان سے متعلق کتابیں زیادہ آنے لگی ہیں اور اس سلسلہ میں ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ پکوان کی کتابوں پر تبصرہ کرنے کے لیے اگر ہمارے پاس کتابوں کی بجائے کسی حیدر آبادی پکوان کے دو پکے پکائے نمونے روانہ کیے جائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ شعر و ادب سے پرانے تعلق کی وجہ سے ہم شعری مجموعوں اور افسانوں کی کتابوں کے صرف سرورق دیکھ کر تبصرہ کر دیتے ہیں لیکن پکوان کا معاملہ دوسرا ہے جب تک کھانے کو خود چکھ کر نہ دیکھ لیں تب تک ذائقہ کا پتا نہیں چلتا۔ سدھیشور راج نے اپنی شریک حیات کے بارے میں کیا خوب کہا ہے کہ "وہ پیٹ کے راستہ سے ان کے دل میں داخل ہوئی ہیں۔" انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ خود پربھا سکینہ بھی کھانا بنانے اور بعد میں اسے مہمانوں کی خدمت میں پیش کرنے کے دوران میں اردو کے بے شمار چٹپٹے اور مزیدار شعر سناتی رہتی ہیں۔ (ڈاکٹر سکینہ جیسے شوہر کی صحبت میں رہنے کا یہی انجام ہو سکتا ہے) چنانچہ اسی مناسبت سے ہر حیدر آبادی کھانے کے نیچے اردو کے کسی شاعر کا شعر رومن رسم الخط میں درج کیا گیا ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ اگرچہ ان شعروں کا اس کھانے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ان کا خیال ہے کہ اچھا اردو شعر بھوک کو (ہر قسم کی) اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ سو کھانوں کے پکانے کی ترکیبوں کے نیچے سو اردو شعر بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ہم ان شعروں کو یہاں نقل تو نہیں کریں گے البتہ جن شاعروں کے حصہ میں جو حیدر آبادی کھانے آئے ہیں ان کی دو چار مثالیں پیش کرنا چاہیں گے۔ (دہی وڑا۔ علامہ اقبال) (شامی کباب۔ مومن) (دہی اور گوشت کا سالن۔ مرزا غالب)۔ (چکن مصالحہ۔ خواجہ میر درد)۔ (قبولی۔ میر تقی میر)۔ ہری مرچ کے سالن کی ترکیب کے نیچے حسرت موہانی کا حسب ذیل شعر لکھا گیا ہے۔

مرمٹے ہم تو کبھی یاد بھی تم نے نہ کیا
اب محبت کا نہ کرنا کبھی وعدہ دیکھو

ویسے تو ہمیں مشورہ دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن ہری مرچ کے سالن کی خاصیت اور شعر کی معنویت میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے یہاں اردو کا صرف یہ مصرعہ لکھ دیا جاتا تو کافی تھا۔

ع دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ پربھا سکسینہ نے اس معرکتہ الارا کتاب کو لکھتے وقت قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔ البتہ پکوان سے متعلق اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں پربھا سکسینہ نے کئی برتن ضرور توڑے ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس برتن توڑ کتاب کی خاصی پذیرائی ہوگی۔ ہمارے اس قلم توڑ تبصرے کے باوجود کوئی صاحب مندرجہ بالا کتاب کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں تو مندرجہ ذیل پتہ پر ربط پیدا کر سکتے ہیں۔

Dr. SIDHESHWARAJ SAXENA "PRASIDH" 12- C

ALLEYNROAD WEST,DULWICH SE 21- AL,LONDON

دو گھنٹوں کی ملاقات کے بعد جب ہم جانے لگے تو ڈاکٹر سکسینہ ہم سے بغلگیر ہوتے ہوئے محبوب حسین جگر مرحوم کو یاد کر کے اچانک آبدیدہ ہو گئے۔ بولے "حیدر آباد کو جن لوگوں نے حیدر آباد بنایا تھا اب وہ اس شہر میں نہیں رہے تو یہ شہر خالی خالی سا ہو گیا ہے۔" ہماری دعا ہے کہ سدھیشور راج سکسینہ لندن میں خوش و خرم رہیں تا کہ ہمیں حیدر آباد بھرا بھرا نظر آتا رہے۔

پرویز یداللہ مہدی

(طنز و مزاح)

صدارت کا پھندہ ناچیز بندہ

جب سے تعلیم عام ہوئی ہے ہر پڑھا لکھا شخص چاہے گریجویٹ ہو یا انڈر گریجویٹ اپنے دل میں ہزاروں خواہشوں کے ساتھ ایک خواہش یہ بھی رکھتا ہے کہ زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں اسے کم از کم ایک بار کسی کل ہند، کل شہر، کل محلّہ، کل گلی یا کل مکان قسم کے مشاعرے جلسے کی صدارت کا شرف حاصل ہو۔ اب رہے انگوٹھا چھاپ افراد تو ان میں سے بیشتر اصحاب ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں کے مصداق کرسی صدارت عظمیٰ سے کم کی خواہش نہیں کرتے۔ جہاں تک کسی مشاعرے یا ادبی جلسے کی صدارت کا تعلق ہے کسی کو اگر ایک بار اس کا چسکہ لگ جائے تو پھر اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ وہ ہر جگہ دوسروں سے اونچی جگہ بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں اکثر منہ کے بل گرتا ہے جس کے باعث وقت سے پہلے اس کے دہن مبارک میں اصلی دانتوں کی جگہ نقلی بتیسی لگ جاتی ہے۔ ایسے غنچہ دہن اصحاب کے دل و دماغ پر ہر گھڑی چونکہ مسند صدارت سوار رہتی ہے اس لیے جب بھی یہ کسی مسند صدارت پر بیٹھے ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مسند صدارت پر نہیں بلکہ مسند صدارت ان پر بیٹھی ہوئی ہے۔ جلسہ و مشاعرہ گاہوں میں مسند صدارت عموماً عام نشستوں سے کسی قدر اونچی ہوتی ہے اور یہ اہتمام اس لیے کیا جاتا ہے کہ مسند صدارت پر نمائشی چیز کی طرح دھرے ہوئے جناب صدر تمام حاضرین کو بہ آسانی نظر آسکیں۔ اور یوں شرکائے جلسہ و مشاعرہ کو جناب صدر کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنے میں سہولت رہے۔ اس اعتبار سے مسند صدارت کو مسند عبرت بھی کہا جاسکتا ہے۔ مسند صدارت جب تک خالی رہتی ہے بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے اور جی یہی چاہتا ہے کہ یہ اسی طرح خالی ہی رہے لیکن جیسے ہی جناب صدر اس پر تشریف رکھتے ہیں اچھی خاصی کرسی صدارت بیت الخلائی کرسی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس پر متمکن جناب صدر اس

مصرع کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتے ہیں ۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو

صدارت چاہے کسی مشاعرے یا جلسے کی ہو، کسی انجمن یا ادارے کی ہو یا ملک کی ہو اس پر قبضہ جمانے کے لیے امید وار کو پاپڑ تو خیر بیلنے ہی پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چیزیں درکار ہوتی ہیں مثلاً ملکی صدارت کے لیے اہلیت، قابلیت، صلاحیت سے زیادہ قسمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انجمن یا ادارے کی صدارت کو ہتھیانے کے لیے رتبے اور دولت کی حاجت ہوتی ہے۔ البتہ مشاعرے یا جلسے کی صدارت چونکہ وقتی اور عارضی ہوتی ہے لہٰذا اس کے خواہش مندوں کے لیے جلسہ ہٰذا کے شامیانے، کرسیوں اور پھولوں کا خرچہ اٹھالینا ہی کافی ہے اور یہ صرف خرچہ بھی شاطر کارکنان پروگرام چندے، عطیہ اور ڈونیشن کی صورت پیشگی وصول کر لیتے ہیں اور جو اصحاب رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی کے مصداق اپنی جیب سے دھیلہ خرچ کیے بنا صدارت کے خواب دیکھتے ہیں ان کا کیا حشر ہوتا ہے، اس کی صرف ایک مثال پیش ہے۔ کسی زمانے میں ہمارے محلہ میں ایک بزرگوار ایسے ہوا کرتے تھے جنھیں صدارت کا عارضہ بری طرح لاحق تھا۔ یوں سمجھیے تیسرا اسٹیج تھا موصوف خاندانی لٹھ، پیدائشی ناخواندہ اور یقینی کنجوس بھی تھے چنانچہ ایک مرتبہ محلے کے چند شریر نوجوانوں نے مفت میں صدارت کرنے کا بھوت ان کے سر سے اتارنے کا منصوبہ بنایا۔ موصوف کی صدارت میں جلسہ کا انعقاد کیا اور پہلے ہی ان پر یہ بات واضح کر دی کہ وہ منتظمین جلسہ کی ہر بات ہر حکم مانیں گے لہٰذا گلپوشی کے وقت ان سے کہا گیا۔ جناب صدر مسند صدارت پر چپ چاپ لیٹ جائیے۔

اس عجب وغریب حکم پر جناب صدر نے گھبرا کے پوچھا۔ لیٹ جاؤں! وہ کیوں ! کیا صدر کو لٹا کر گلپوشی کرنے کا کوئی نیا طریقہ رائج ہوا ہے؟

جی ہاں...... سب نے ہم آواز ہو کر جواب دیا۔

کب سے! جناب صدر نے گڑبڑا کر پوچھا۔

جواب ملا۔ آج ہی سے ایک تو آپ نے اپنی انٹی ڈھیلی نہیں کی دوسرے آپ کی شخصیت اتنی مشہور و معروف بھی نہیں ہے کہ کوئی آپ کے لیے پھولوں کے ہار لے آتا۔ آپ کے فری فنڈ میں صدارت کرنے کے شوق کو دیکھتے ہوئے یہ دیکھیے بچے آپ کے لیے کیا لے آئے ہیں۔ ایک عدد کارکن جلسہ نے اتنا کہہ کر اپنے ہاتھوں میں

تھی چنگیری کا اوپری حصہ کھولا اس میں سے پھولوں کی لڑیاں برآمد ہوئیں جنھیں دیکھ کر جناب صدر کھسکھیا کر بولے۔ یہ تو پھولوں کی چادر معلوم ہوتی ہے!

جواب ملا۔ جی ہاں آپ نے ٹھیک پہچانا' پھولوں کی یہ چادر بچے' لنگوٹی رائے بابا کے مزار سے کچھ دیر کے لیے اڑا لائے ہیں۔ چلیے وقت کم ہے فوراً مسند صدارت پر لمبے لمبے لیٹ جائیے۔

جناب صدر نے گڑبڑا کر کہا۔ "یہ کیسی گلپوشی ہے!"

جواب ملا۔ یہ گلپوشی نہیں گلپاشی ہے۔ حالات کی ستم ظریفی سے گھبرا کے جناب صدر نے وہاں سے نکل بھاگنے کی بہتیری کوششیں کیں لیکن ان کی ہر کوشش ناکام بنادی گئی اور انھیں زبردستی مسند صدارت پر لٹا دیا گیا۔ ان کی مٹھی میں اگربتی کا ایک بنڈل تھما کر ادھر کسی نے دیا سلائی دکھلائی ادھر دیگر منتظمین نے جناب صدر کے زندہ وجود پر پھولوں کی چادر چڑھادی۔ کنوینر جلسہ نے فوراً باواز بلند ہانک لگائی۔ الفاتحہ۔

کہاوت ہے کہ پیاسے کو کنویں تک جانا پڑتا ہے۔ کنواں پیاسے تک نہیں آتا لیکن صدارت کے معاملے میں کبھی کبھی یہ مثل الٹ جاتی ہے یعنی جس طرح بلی کے بھاگوں چھیکہ ٹوٹتا ہے اسی طرح کبھی کبھی صدارتیں بھی عام آدمی کے گلے پڑ جاتی ہیں۔ ہماری بات پر آپ کو یقین نہیں آرہا ہے تا کوئی بات نہیں جو واقعہ ہم آپ کی خدمت میں اس وقت پیش کرنے جا رہے ہیں اس کے بعد آپ بھی ہماری طرح اس بات پر ایمان لے آئیں گے کہ اللہ مہربان تو گدھا پہلوان۔ واقعہ کیا ہے آپ بیتی ہے۔ عرصہ پہلے کی بات ہے حیدر آباد فرخندہ بنیاد کے پرانے شہر کے پرانے محلے کی ایک پرانی حویلی کے باب الداخلہ پر کپڑے کا ایک بینر (BANNER) جھول رہا تھا جس پر جلی حرفوں میں لکھا تھا۔ یاد احمق زیر اہتمام بزم احمقاں...... ایک تو ہمیں وقت گزارنا تھا' دوسرے سگریٹ کی طلب شدت سے محسوس ہو رہی تھی' سگریٹ تو ہماری جیب میں موجود تھی بس دیا سلائی کی کمی تھی اس لیے یہ سوچ کر مذکورہ حویلی میں داخل ہو گئے کہ دیا سلائی بھی مل جائے گی اور دو تین گھنٹے بھی آسانی سے بیت جائیں گے۔ سامنے ہی ایک وسیع وکشادہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ البتہ مجمع کسی بات پر بھیرا ہوا نظر آرہا تھا۔ ہم جیسے ہی روشنی میں پہنچے ایک صاحب جو غالباً کنوینز پروگرام تھے اور مائیک سنبھالے ہوئے لوگوں پر غرا رہے تھے ہمیں دیکھتے ہی خوشی سے چلا کر بولے۔ حضرات غصہ تھوک دیجیے۔ صدر صاحب تشریف لا چکے ہیں۔ اتنا کہہ کر موصوف نے راست ہماری طرف اشارہ

حکیم محمد حسین خاں شفاء
جیل روڈ، رام پور

ڈاکٹر عبادت بریلوی مرحوم

انسان حیات و موت کے سلسلہ میں بالکل ناچار ہے لیکن کچھ لوگ اس عرصہ حیات میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دے جاتے ہیں جن کو ایک زمانہ تک بھلا یا نہیں جاسکتا۔ ان ہی اہم اشخاص میں ایک نام ڈاکٹر عبادت بریلوی کا بھی ہے جو ستمبر ۱۹۹۸ء کو لاہور پاکستان میں مرحوم ہو گئے۔

عبادت صاحب بریلی یوپی میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ اعلا تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی میں اور پھر لندن میں حاصل کی 'دہلی' یورپ' انقرہ' اور پاکستان کے علمی اداروں میں ۱۹۸۰ء تک خدمات انجام دیں۔ ہزاروں صفحات لکھنے کے ساتھ اپنے چاہنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بھی چھوڑا ہے۔ انھوں نے ذکر احباب میں اپنے بارے میں بھی بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ در اصل خاکہ نگاری' یا خطوط نویسی ایک قسم کی آپ بیتی ہی ہوا کرتی ہے اور عبادت صاحب اس فن میں طاق تھے۔ عبادت صاحب پر جن جن لوگوں کا حق تھا وہ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ ادا کردیا ہے۔

اور یہی مضامین و خاکے عبادت صاحب کا اصل سرمایہ اور ہمارے سماجی ادب کا قیمتی اثاثہ ہے۔ عبادت صاحب نے اشخاص پر بھی لکھا ہے' علوم و فنون اور نظریات پر بھی۔ وہ مشرق و مغرب کا بہترین امتزاج تھے تقسیم ہند اور پھر ہجرت ان کی زندگی کا المیہ تھا جس کی کسک وہ تمام عمر محسوس کرتے رہے۔

انھوں نے اپنے غیر مسلم احباب کو کبھی فراموش نہیں کیا بلونت سنگھ ان کے دوست تھے ان کے خاکوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ جس سے جتنا تعلق رہا یا استفادہ کیا اس کا کھل کر اعتراف کیا۔

وہ بابائے اردو مولوی عبد الحق اور علامہ نیاز فتح پوری سے بہت متاثر تھے اور انھوں نے دونوں پر مضامین لکھے ہیں۔

اور یہ حضرات بھی عبادت صاحب کی صلاحیت و علمی خدمات کے مداح تھے۔

راہ نوردان شوق' میں عبادت صاحب نے بابائے اردو عبد الحق صاحب پر ۸۰ صفحات کا اہم ترین خاکہ لکھا ہے جس میں عبد الحق کی شخصیت' خدمات اور مزاج کی بہترین عکاسی کی ہے۔ اس خاکہ میں بلا کی توانائی اور زندگی ہے۔

چونکہ یہ خاکہ انتقال کے فوری بعد لکھا گیا ہے اس وجہ سے عبد الحق صاحب کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔

عبادت صاحب نیاز فتح پوری کے بارے میں لکھتے ہیں ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کر چکا تھا اور اردو تنقید پر کام شروع کردیا تھا اس زمانے مین نیاز فتح پوری صاحب کے لکھنے کی دھوم تھی میں بھی ان سے ملا' انھوں نے مجھ سے پوچھا آپ کس کلاس میں پڑھتے ہیں؟

میں نے جواب دیا پی ایچ ڈی کا طالب علم ہوں۔ اردو تنقید پر تحقیقی کام کررہا ہوں کہنے لگے آپ نے بہت اچھا موضوع منتخب کیا ہے' اس موضوع پر آج تک کوئی خاص کام نہیں ہوا ہے۔

آپ کی کتاب جب چھپے گی تو یقیناً اس کی حیثیت سنگ میل کی ہوگی۔

یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں کے نصابوں میں اس کو داخل کیا جائے گا اور عرصہ دراز تک ادب اور تنقید سے دل چسپی لینے والے اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔"

یہ سن کر عبادت صاحب نے کہا میں نے مواد تو اچھا خاصا جمع کرلیا ہے لیکن ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ تحریر کی طرف طبیعت کا میلان نہیں ہوتا'

اس پر نیاز صاحب نے فرمایا'

لکھنا ایک عادت ہے بس آپ لکھنا شروع کردیجیے۔ یہ نہ سوچیے کہ کیسا لکھ رہے ہیں' بس لکھتے جایئے' بعد میں پڑھیے گا اور دیکھیے گا کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔

کاٹ چھانٹ تو لکھنے میں ہوتی ہی رہتی ہے۔ لکھنا ایک فن ہے ایک ہنر ہے' آتے آتے آتا ہے۔ یہ فن محنت چاہتا ہے اور مشق کا تقاضا کرتا ہے اور محنت اور مشق لکھنے کو عادت بنا دیتی ہے[1]

میں نے نیاز صاحب کے اس مشورہ پر عمل شروع کردیا اور چند مہینے میں تمام مقالہ

---

(۱) جلوہ ہائے صد رنگ ۱۹۷۰ء ص ۳۷' حصہ ۳' ۷۰

مکمل ہو گیا' اس کے بعد عبادت صاحب کا زندگی بھر نیاز صاحب سے تعلق رہا جس کے سلسلہ میں نیاز صاحب لکھتے ہیں

ڈاکٹر عبادت بریلوی ہمارے نقادوں کی صف میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ دوسرے نقادوں کی طرح تنقید کو صرف فرض کفایہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کو عبادت جان کر پورا خشوع و خضوع اس پر صرف کردیتے ہیں(۱)

بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب نے لکھا ہے۔

ڈاکٹر عبادت صاحب اردو کے ممتاز نقادوں میں ہیں اور ان کا انداز تنقید امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔(۲)

اردو ادبیات پر عبادت صاحب نے ۸۰ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ جن مین کتنی داخل درس ہیں۔ان کے علمی کاموں کا اشاریہ بہت ضخیم اور وسیع ہے۔ اگر اس کو عنوانات کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو تنقید و تحقیق کے اکثر گوشوں پر حاوی ہے۔

خاکہ نگاری کے ذیل میں انھوں نے خود اپنی سوانح کے اکثر گوشوں کو نمایاں کردیا ہے۔ وہ جلوہ ہائے صد رنگ میں لکھتے ہیں۔

"میں ایک کم آمیز آدمی ہوں لیکن عجب اتفاق ہے کہ زندگی میں مجھے اس عہد کے بڑے بڑے سیاست دانوں ادیبوں اور شاعروں سے قریب رہنے کے مواقع ملے اور ان سب کی صحبتوں میں کچھ ایسے تجربات ہوئے جس کا دوسروں تک پہنچانا میں نے ضروری خیال کیا ــــــ یہ خاکے دل چسپ اس وجہ سے ہیں کہ ان میں اس عہد کی بعض دلکش اور رنگا رنگ شخصیتوں کی ایسی تصویر کشی ہے جس میں ہماری معاشرتی اور تہذیبی روایات کا پس منظر بھی بے نقاب نظر آتا ہے۔"

عبادت صاحب کی اہم ترین کتاب اردو تنقید کا ارتقا ہے۔ اس پر ڈاکٹر ظہور الدین صاحب نے جارحانہ تنقیدی مقالہ لکھا جس کے جواب میں عبادت صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

میری کتاب" اردو تنقید کا ارتقا" پر جو تبصرہ آپ نے مجھے بھیجا ہے' وہ مجھے پسند نہیں آیا۔ اس میں نہ تو کوئی تحقیق ہے نہ صحیح تنقید!

میں تبصرہ نگار سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن ان کی تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ

---

(۱) راہ نورد اں شوق' آوردگان عشق' یاران دیرینہ'

(۲) شجرہائے سایہ دار' ان کے خاکوں کے مجموعہ ہیں۔

وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہیں۔ وہ ہر جملے میں یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس طرح نہیں، اس طرح لکھنا چاہیے تھا۔ ہر شخص اپنے انداز سے لکھتا ہے، اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ اس کو ہدایات دے۔

پھر وہ بغیر سوچے سمجھے بات کرتے ہیں۔ ایک جگہ تو انھوں نے حد کردی ہے۔ لکھا ہے کہ "نویں باب میں ۱۹۷۰ء کے بعد اردو تنقید میں ابھرنے والے جدید نظریات سے بحث ہوتی۔ خصوصاً اسلوبیات کے ارتقا پر روشنی ڈالنے کے بعد اردو میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مرزا خلیل بیگ کی خدمات کا جائزہ لیا جاتا۔"

جب یہ کتاب شائع ہوئی تو نارنگ صاحب اور خلیل صاحب اسکول میں پڑھتے ہوں گے۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان لکھی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں مجھے ڈگری ملی۔ ۱۹۴۸ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب نے اس کو انجمن ترقی اردو سے شائع کردیا۔ بڑے بڑے محققوں، نقادوں اور ادیبوں نے اس کی تعریف کی، اور لکھا کہ یہ اردو تنقید کی پہلی مکمل اور مبسوط تاریخ ہے۔ ان میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق پنڈت کیفی، ڈاکٹر زور، مولانا حامد حسن قادری، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر سید احتشام حسین، علامہ نیاز فتحپوری، مولانا عبد الماجد دریابادی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری وغیرہ شامل تھے۔

اس کتاب کے اب تک آٹھ دس ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، اور یہ تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے میں اس پر نظر ثانی نہ کرسکا۔ ناشر اس کو اسی طرح چھاپتے رہے جس طرح پہلی بار چھپی تھی۔ غالباً یہ ان کی مجبوری اور ضرورت تھی۔ تقریباً نصف صدی سے یہ کتاب چھپ رہی ہے۔ اور فروخت ہو رہی ہے۔ اس حقیقت کو بھی تبصرہ نگار کو سامنے رکھنا چاہیے تھا۔ اس تبصرے میں غیر ذمہ دارانہ بیانات کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر اس کا لہجہ اور انداز ایسا ہے جو ایک محقق اور نقاد کو زیب نہیں دیتا۔ حیران ہوں کہ ریسرچ کانگریس نے اس کو اپنے اجلاس میں پڑھنے کی اجازت کیوں دی۔

ریسرچ کانگریس کے بانی خدابخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر عابد رضا بیدار تھے انھوں نے ۱۹۹۱ء میں معیار تحقیق کے نام سے ایک اہم مجلہ شائع کیا جس میں عبادت صاحب کی کتاب پر تبصرہ اور اس کا جواب شامل ہے۔ ڈاکٹر بیدار بھی احباب عبادت میں شامل رہے ہیں۔

ادب، تنقید و سماج کے سلسلہ میں عبادت کا اپنا صالح نظریہ تھا جس کا انھوں نے جگہ جگہ اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"تنقید کو میں ادب کے لیے ضروری بلکہ ناگزیر سمجھتا ہوں وہ ادب کو صحیح معنوں میں ادب بناتی اور صحیح راستوں پر لگاتی ہے ان کا کام صرف ادب کی نکتہ چینی یا مدح سرائی نہیں ہے وہ اس سے بہت بلند ہے سب سے پہلے شمع راہ اور رہبر منزل کا کام کرتی ہے اور پھر عوام میں صحیح ادبی ذوق پیدا کرتی اور اعلیٰ ادبی اقدار رائج کرتی ہے میں تنقید کو ادب سے علاحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتا وہ خود ادب ہے ———— میری تنقید میں سب سے پہلے آپ کو ادب کے موضوع اور اس ماحول کی طرف توجہ ملے گی جس کے درمیان وہ تخلیق کیا گیا پھر اس کا بیان ملے گا کہ کس حد تک اس کا تخلیق کرنے والا اپنے ماحول سے متاثر ہے،

یہ تاثیر صحت مند ہے یا غیر صحت بخش اس میں ادیب یا فن کار کی شخصیت کسی حد تک نمایاں نظر آتی ہے وہ زندگی کو غلط تو نہیں سمجھتا———— (تنقیدی زاویہ)

اردو زبان و ادب ایک زمانہ تک عبادت صاحب کو یاد رکھیں گے ہمیں امید ہے جلد ان کی شخصیت و خدمات مطبوع وغیرہ مطبوع نگارشات پر کوئی جامع کتاب شائع ہوجائے گی۔ عبادت صاحب کے عقیدت مندوں اور تلامذہ کا وسیع حلقہ ہے عبادت صاحب میں بڑی خوبیاں تھیں وہ زندہ دل بزلہ سنج احباب کے کام آنے والے شگفتہ مزاج اور شگفتہ نگار بھی تھے ان کی نثر میں بڑی سادگی اور سنجیدگی ہے ان کا تحقیقی و تنقیدی انداز بیان خاکہ نگاری سے مختلف ہے۔ ان کے خطوط میں معلومات کے ساتھ زبان و بیان کا لطف بھی ہے۔

اقبالیات پر ان کی دس کتابیں، مطبوع ہیں ادبی دریافت، تحقیق و تدریس پر ۳۰ کے قریب اہم کتابیں ہیں۔ وہ زندگی بھر علم و ادب کی خدمت کرتے رہے ان کے شخصی خاکوں میں علامہ نیاز فتح پوری، شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی وغیرہ جن سے ان کے روابط تھے بہت دل چسپ ہیں ان کی تحریروں میں اپنے ذاتی تجربات معتقدات اور طالب علموں کے واسطے بہت سبق آموز مواد ہے۔

خدا مغفرت کرے بڑی خوبیوں کے خوش عقیدہ صوفی منش وقت کے قدر داں انسان تھے۔

ا۔ و۔ شاکرہ
49/2RT وجے نگر کالونی
حیدر آباد-570

غالب مست مولا شاعر

عام طور سے حیدر آبادیوں کی شہرت چار مینار کی گلیوں میں ہی گھومتی رہتی ہے۔ مجتبیٰ جیسے جیالے چند ہی ہیں جنھوں نے دہلی میں رہتے بستے ہوئے لال قلعہ پر تو نہیں۔ ہاں لال قلعہ کی فصیلوں پر اپنے مزاحیہ طنزیہ کالموں کے ایک نہیں کئی جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ اپنے ان کالموں میں وہ اکثر دلی کے دل والوں کے کارناموں اور انکشافات پر ہنستے ہنساتے رہتے ہیں۔ مگر ۲۷/دسمبر ۱۹۹۸ء کے سیاست 'میرا کالم' میں "غالب مست مولا شاعر" کے عنوان سے پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ دلی کی حالیہ محفلوں میں غالب کو مست مولا شاعر کے بھیس میں پیش ہوتے دیکھ کر اور وہاں موسیقی کی ایک محفل میں غالب سے منسوب ایک شعر کو سن کر ان کے ہوش پریشان ہونے لگے اور طنزیہ ہنسی گریہ وزاری میں بدلتی معلوم ہونے لگی۔ انھوں نے بڑی دردمندی سے غالب کے اس مست مولا پن کے خرقہ یا شیروانی کو اتروانے کی کوشش کی ہے۔ کچھ تحقیقی مزاج والوں نے غالب کے مستند اور غیر مستند دیوانوں سے تلاش کرکے اس شعر کو غالب کا ثابت کرنے کی کوشش کی۔

غالب کے دوسو سالہ جشن پیدائش کی تقریبیں دسمبر ۱۹۹۷ء سے شروع ہوکر دسمبر ۱۹۹۸ء تک ساری دنیا میں منائی جاتی رہیں۔ دسمبر ۱۹۹۸ء میں ان تقریبوں کا شاندار اختتام ہوا۔ چنانچہ دہلی کے دو موقر اداروں یعنی غالب انسٹی ٹیوٹ اور اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۱۱/دسمبر سے ۱۶/دسمبر ۱۹۹۸ء تک ایک کے بعد ایک بین الاقوامی غالب تقاریب منائی گئیں۔ ان کی تفصیل میڈیا کے ذریعہ عام ہو چکی ہے۔ خوش قسمتی سے غالب انسٹیٹوٹ کی جانب سے منائی گئی تقاریب میں اس ناچیز کو بھی شرکت کا موقعہ ملا۔

تقریب کے ایک عینی شاہد کی حیثیت سے کچھ اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتیں دلی کی اس تقریب کے بارے میں پیش کرنا چاہتی ہوں تاکہ اس حادثہ یا

واقعہ سے مضطرب عزیزوں کی بے چینی سکون سے بدل جائے۔

۱۱ر دسمبر ۱۹۹۸ء کی شام غالب انسٹی ٹیوٹ کے افتتاحی اجلاس میں سیمنار کے کنوینر اور عالمی سطح کے فارسی اور اردو کے محقق وناقد پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد نے مستند ماخذوں اور خود غالب کے حوالوں سے بتایا کہ غالب قدیم فارس کے آئین یا دساتیر سے بیحد متاثر تھے اور ان کے خطوط سے بھی ان کی اس قدیم مسلک سے گہری عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی رات سونی ویڈیو کمپنی کی جانب سے غالب کی غزلوں کا پروگرام مشہور موسیقار جگجیت سنگھ کی ترنم ریز آواز میں پیش ہوا۔ موسیقی کی اس محفل میں جگجیت سنگھ کی آواز کا جادو جیسے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وقفہ وقفہ سے جب شعر پورا ہوتا تو سننے والوں کے نعرہ ہائے تحسین گونج اٹھتے تھے۔

دو تین غزلوں کے بعد جگجیت سنگھ نے غالب کی سادہ وپرکار مگر شہرہ آفاق غزل شروع کی ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تب یوں محسوس ہوا ہر سننے والے کے دل میں اس کے ارمان مچلنے لگ گئے ہیں۔ موسیقار نے پھر ایک جذب کے عالم میں تان لگائی ۔

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

ایک لمحہ کے لیے بعض سننے والے دم بخود رہ گئے۔ پھر داد کا شور بلند ہوا۔ شعر پھر دہرایا گیا۔ یہ نعرہ تحسین اسٹیج کے سامنے والی صفوں سے بلند ہوا۔ پیچھے اونچائی پر بنی نشستوں پر جہاں لوگ بیٹھے تھے کچھ بے چین سی سرگوشیاں کچھ حیران حیران کانا پھوسیاں ہونے لگیں۔ ایک آواز پچھلی نشست سے آئی۔ یہ شعر ہرگز غالب کا نہیں ہے۔ خود مجھے بھی ایسا ہی خیال آرہا تھا کہ یہ شعر غالب کے دیوان میں نظر نہیں آیا ہے۔ سوچا بانو آپا (جہاں بانو نقوی) نے کبھی ایسے شعر کی تشریح نہیں کی۔ اگر کرتیں تو ضرور یاد رہتا۔ بازو بیٹھی ناصرہ بہن سے پوچھا جو زینت آپا کی شاگرد اور زیادہ شعر فہم ہیں۔ انھوں نے فوراً جواب دیا نہیں یہ غالب کا شعر نہیں ہے۔ تب میں نے پورے وثوق سے اپنے بازو کی نشست پر بیٹھے مضطرب فرد سے کہہ دیا ہے یہ شعر غالب کا نہیں ہے۔ یہ سن کر ان کا اضطراب 'اطمینان سے بدل گیا۔ اطمینان اور وثوق سے وہ آگے بیٹھے بے چین مضطرب

حضرات سے کہنے لگے یہ محترمہ بھی کہہ رہی ہیں کہ یہ شعر غالب کا نہیں ہے۔ جگجیت سنگھ کی نغمہ سرائی جاری رہی اور اسی غزل کا اگلا شعر بھی محفل پر چھا گیا۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

یہ عالمی سمینار مزید دو دن جاری رہا۔ عنوان تھا اردو فارسی نظم ونثر میں غالب کی دین۔ دلی کے سمینار اپنے ناقدانہ مباحث کے لیے مشہور ہیں مگر یہ عالمی سمینار بڑا منضبط اور عالمانہ تھا۔ پروفیسر نذیر احمد اور اراکین کمیٹی کی قدردانی کہ مجھ کو اس بین الاقوامی سمینار میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ دوسرے دن ۱۳ ردسمبر کے اجلاس میں مجھے موقع ملا۔ ایک لائبریرین کی حیثیت سے اپنے طویل تجربہ کی بنا پر یہ بتانے کی کوشش کی کہ اردو ادب میں دانش ورانہ' محققانہ اور ناقدانہ ادب کی بہتات ہے مگر حوالہ کا ادب یا معاون ادب (ریفرنس میٹریل) اس زبان میں کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اسی وجہ سے اردو کا اعلا پایہ کا ادب جو بھی ہے وہ غیر معروف اور شناخت سے محروم رہ جاتا ہے۔ آگاہی کی اس کمی کی وجہ سے اردو ادب میں ایک کمی ایک کجی پیدا ہو رہی ہے۔ غالب جیسے بلند پایہ شہرہ آفاق شاعر اور نثر نگار کی نہ تو کوئی لغت ہے نہ اس کے اشعار' شعری ترکیبوں یا محاوروں کی کوئی فرہنگ یا اشاریہ۔ غالب کے بارے میں لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا ایک آدھ اشاریہ تو بنایا گیا ہے مگر اس کی تجدید نہیں ہوئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہو رہا ہے کہ غالب کے جعلی' الحاقی اور رد کیے ہوئے اشعار ان کے مستند کلام میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ تو حقیقت ہے کہ غالب نے ۲۰ سال کی عمر میں اپنے وسیع شعری اثاثہ کا ایک منتخب دیوان مرتب کر لیا تھا اور بقیہ کلام کو رد کر دیا تھا۔ پھر بھی یہ رد کیا ہوا کلام بھی دوسرے جعلی اور الحاقی کلام کے ساتھ کہیں کہیں شائع ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال حیدر آباد کی دانش ور ڈاکٹر زینت ساجدہ نے بتلائی ہے۔ غالب کے ایک شعر کا مصرع ہے۔ ع ابرا ہی دے کے بچایا ہے کشت کو۔ یہ شعر غالب کے صرف کسی ایک دیوان میں موجود ہے۔ اس میں موجود لفظ ابرا کے معنی عام اردو لغات میں انھیں نہیں ملے۔ بیاض غالب میں بھی یہ شعر نہیں ملا۔

دوسری مثال کچھ دن پہلے کی محفل موسیقی میں جگجیت سنگھ کا سنایا ایک شعر بھی متداول دیوان غالب میں موجود نہیں ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ اس شعر کو سن کر کیسا اضطراب اور بے چینی ایوان غالب میں اس رات پھیلی تھی۔

اخبار سیاست میں مجتبیٰ حسین نے یہ بات لکھ کر غالب کا حق ادا کر دیا تو ۱۸ر دسمبر ۱۹۹۸ء کے سیاست میں صلاح الدین شجاعی کی اطلاع کے مطابق دیوان غالب کے نظامی اڈیشن میں یہ دو شعر کسی قلمی بیاض سے لیکر شامل کیے گئے ہیں لیکن مطبوعہ دیوان غالب میں یہ موجود نہیں تھے۔ اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ ہر بڑے شاعر کی طرح غالب کا بھی الحاقی، جعلی اور خود ان کا رد کیا ہوا کلام کبھی کبھی اصل کلام میں شائع ہو گیا ہے۔ اس کے سدباب کے لیے ایسے اشعار کا بھی ایک اشاریہ مرتب ہو جائے تو اچھا ہوگا۔

اب رہی کافر صنم کی بات۔ برصغیر ہندستان کی ادبی تاریخ میں ایک دور بھگتی ادب کا بھی رہا۔ ہندی میں اس کو بھگتی کال بھی کہا گیا۔ برصغیر کی سبھی علاقائی زبانوں میں اس مکتب خیال کا ادب موجود ہے۔ سنت کبیر نے یہ آواز بلند رام اور رحیم کے ایک ہونے کی اور کعبہ و صنم خانہ کی مماثلت پر زور دیا۔ اردو شاعری میں بھی ایسی آوازوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابتدائی دور کے مسلمان مبلغوں نے اپنے مفہوم کو سمجھانے کے لیے ہندی اور دوسری مقامی زبانوں کا سہارا لیا۔ اس طرح شعر وادب میں بھی یہ آوازیں عام ہوئیں۔ پھر مندروں اور خانقاہوں میں ان کی بازگشت ہوتی رہی۔ عزیزی مجتبیٰ کی عینی آپا (قرۃ العین حیدر) اردو کی مایہ ناز ادیب اور اسکالر نے اپنے ناول گردش رنگ چمن کے ایک باب میں ایسے مکتب خیال کے ایک خانوادہ کی دلچسپ اور پراثر تصویر کھینچی ہے۔ کچھ اور کتابوں اور مضامین نظم ونثر دونوں میں ایسے خیالات ملتے ہیں۔ سارے برصغیر کی طرح دکن میں بھی ایسے ادب پر توجہ ہوئی۔ دکھنی اردو کو صوفیائے کرام نے اپنایا تو مرہٹی میں سادھوؤں اور سنتوں کی بانی کا پرچار ہوا۔ اردو زبان کو بھی اس قسم کے ادب کے لیے موزوں سمجھا گیا۔ اپنے اس مشاہدہ کی تائید مجھے ایک کتابچہ سے ہوئی ہے جو ہمارے حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد میں موجود ہے۔ یہ کتابچہ یا مجموعہ غزلیات باہتمام محمد ابوبکر خویشگی دارالطبع جامعہ عثمانیہ سے شائع ہوا ہے۔ سرورق موجود نہیں ہے۔ سن اشاعت ممکن ہے سرورق پر شائع ہوا ہو۔ اندر کے صفحات پر کہیں نہیں ملا۔ اس مختصر مجموعہ میں ریاست حیدر آباد یا سلطنت آصفیہ کے صدر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد کے ایوان میں منعقد کیے گئے ایک مشاعرہ میں دی ہوئی طرح میں پڑھی گئی فارسی اور اردو کی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ مشاعرہ کی تاریخ بھی اس کتابچہ میں نہیں ملی۔ اس

مشاعرہ کی طرح غالب کی اسی غزل کا مطلع ہے جو جگجیت سنگھ نے غالب تقریب پر منعقدہ محفل موسیقی میں سنائی اور جس کا ذکر اس مضمون میں ہو رہا ہے۔ یعنی ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

اس مشاعرہ میں کلام سنانے والے مہاراجہ سر کشن پرشاد کے علاوہ ریاست کے کچھ اور عہدہ دار تھے ۔ اس موقعہ پر پڑھی گئی غزلوں میں سے کچھ اشعار کافر کے موضوع کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں۔ جن کو یہاں پیش کیا جارہا ہے کہ مضطرب افراد کا اضطراب دور ہو۔ ان شاعروں کے بارے میں کتابچہ میں دی گئی تفصیل کے علاوہ کچھ میری معلومات سے بھی اضافہ کردیا ہے۔

(۱)

جناب شہزادہ مسعود الزماں صاحب

نکلتی یہ نہیں ہے زال دنیا کعبہ دل سے
مدد کو یا علی آؤ تو یہ کافر صنم نکلے

(۲)

جناب غلام مصطفیٰ صاحب رسا مہتم کروڑگیری

حریم دل میں میرے دیر نکلے یا حرم نکلے
جو کچھ نکلے الٰہی اس میں تصویر صنم نکلے
دکھایا کفر و دیں دونوں میں جلوہ اپنی وحدت کا
نقیب کعبہ بن کر دہر میں گویا صنم نکلے

(۳)

حضرت شاد صوفی مدظلہ

مٹایا امتیاز کفر و ایماں حق پرستی نے
حرم کو دہر کو دیکھا یہی بیت الصنم نکلے

(۴)

سید غلام پنجتن صاحب شمشاد بی اے ایل ایل بی (حیدر آباد کی ایک انسان دوست فیض رساں شخصیت۔ جناب عابد حسین سابق ہندستانی سفیر برائے امریکہ اور تراب الحسن کے والد)

نہ چھٹنا تھا نہ چھوٹا محتسب رندوں سے مے خانہ
مگر جنت سے آدم اور کعبہ سے صنم نکلے

سجود شیخ کی تصدیق کرنے جو ہم نکلے
حرم کی سرزمیں میں سیکڑوں بیت الصنم نکلے
خود آئینی اور خود بینی مٹا کر ہم نے یہ دیکھا
کہ پردہ میں تو کعبہ اور کعبہ میں صنم نکلے

(۵)

مرزا محمد ہادی (رکن دارالترجمہ) غالباً مشہور ناول امراؤجان ادا کے مصنف

مسلمانوں کے دل میں گھر کیا خانہ خرابوں نے
خدا کے گھر سے جب بے آبرو ہو کر صنم نکلے

شعرا کے اصل اشعار کے علاوہ دوسرے شاعروں کے اشعار بھی ایک دوسرے کے اشعار میں مل جاتے ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ بڑے بڑے موسیقار بھی کبھی الگ الگ شاعروں کا کلام ملا کر سنا دیتے ہیں۔ مرحوم عزیز احمد وارثی اکثر ایک ہی وزن یا بحر کے اشعار ملا کر سنادیا کرتے تھے تاکہ لوگ محظوظ ہوں۔

جگجیت آواز کے ساحر تو ہیں مگر بذات خود شاعر نہیں نہ اردو زبان کے اسکالر۔ انھیں کسی نے غالب کی مذکورہ غزل کسی دیوان سے نقل کر کے دی ہوگی انھوں نے اسی طرح کیسٹ یا محفل موسیقی کے لیے سنادی۔

اردو کے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ نے غالب کے الحاقی یا منسوخ شعر کی نشاندہی کر کے اردو زبان وادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ اسے نامناسب نہیں کہا جاسکتا۔

غالب بڑا اور بہت بڑا شاعر اور انسان دوست تھا۔ پھر بھی اسے مکمل انسان کہنا خود غالب کی توہین کرنا ہے۔ بڑے اور اچھے شاعروں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مکمل انسان یا مکمل شاعر بھی ہوں۔ اسی طرح مکمل انسان کے لیے شاعر ہونا ضروری نہیں ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مکمل انسان یا انسان کامل ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں۔

پس نوشت. بعد میں جناب کالی داس گپتا رضا نے یہ انکشاف کیا کہ یہ شعر غالب کا نہیں بلکہ بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ جناب کالی داس گپتا ایسے شعروں کے بارے میں تفصیل سے لکھیں تو یہ اہم کام ہوگا۔

ڈاکٹر نیر جہاں
جی۔۷ ۴ ابوالفضل انکلیو'
جامعہ نگر' نئی دہلی ۔۲۵

شبلی کے تاریخی مقالات

ایک عمومی جائزہ

شبلی کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور جامع تھی ۔ وہ قدیم علوم کے ماہر تھے اور جدید خیالات و رجحانات کے واقف کار ۔ وہ اپنے خیالات اور مذاق طبیعت میں اپنے زمانے سے بہت آگے تھے ۔ ان کی فکر میں ذہانت کے ساتھ جدت بھی تھی ۔ انھوں نے علمی اور عملی جس میدان میں بھی قدم رکھا' اپنی الگ راہ نکالی اور اپنے افکار و تصورات کے ذریعہ ایک انقلاب پیدا کردیا ۔ وہ سوانح لکھ رہے ہوں یا سیرت' شاعری کر رہے ہوں یا تنقید۔ ان کا اشہب قلم تاریخ کے میدان میں رواں ہو یا مذہب کی جانب۔۔۔۔۔ ان کا مقصد ایک ہی تھا ۔ راہیں الگ تھیں مگر منزل ایک ۔۔۔۔ قوم کی اصلاح اور اسے احساس کمتری کی دلدل سے باہر نکالنا۔ وہ قوم جو صدیوں کی حکمرانی کے بعد اپنا وقار کھو چکی تھی جس کا احساس مردہ ہو چکا تھا' جذبے سرد پڑچکے تھے' جسے دنیا تاریک نظر آرہی تھی۔۔۔ نہ راہیں متعین تھیں' نہ منزل کا پتہ تھا ۔ ایسی قوم کو از سر نو زندہ کرنا' ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنا' انھیں گہری نیند سے بیدار کرنا اور ان کے بزرگوں کے لازوال کارناموں کو سامنے لانا اُس عہد کے ادیبوں کا سب سے عظیم مقصد تھا ۔۔۔۔ ادیبوں کی اس صف میں سر سید بھی تھے' حالی بھی' نذیراحمد' محسن الملک اور چراغ علی بھی ۔ لیکن بحیثیت ادیب شبلی اپنے تم ہم عصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں ۔ وہ تنہا اپنی ذات میں انجمن تھے ۔ ان کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے حق ادا کر دیتے' چاہے وہ مقالہ ہو یا مستقل تصنیف ۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ان کے قلم میں بہت توانائی تھی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے نثر کی زبان کو وہ معیار عطا کیا کہ وہ ہر طرح کے مفہوم و مطالب' اغراض و مقاصد اور خیالات و جذبات کو مؤثر

طور پر ادا کرنے کے قابل ہو سکی ۔ اس اعتبار سے ہم انھیں جدید نثر کا بانی کہہ سکتے ہیں۔

شبلی کی ساری زندگی ایک علمی جہاد تھی ۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ساری زندگی سرگرم عمل رہے اور جس راہ سے بھی قوم کی اصلاح کر سکتے تھے' کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انھوں نے جہاں فرماں روایان اسلام کی سوانح و شخصیت اور ان کے کارناموں کو قوم کے سامنے پیش کیا وہیں علمی اور عملی میدانوں سے یگانۂ روزگار شخصیتوں کا انتخاب بھی کیا ۔ المامون' سیرۃ النعمان' الفاروق' الغزالی' سوانح مولانا روم اور سب سے قابل قدر تصنیف سیرۃ النبیؐ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں ' ان کے مقالات بھی اسی مقصد کے تحت لکھے گئے حالانکہ شبلی سے قبل بھی تاریخ و ادب' مذہب و سیاست اور تمدن و معاشرت پر کثیر تعداد میں مقالے لکھے گئے تھے ۔ شبلی نے بھی مذہب و تاریخ' فلسفہ و منطق' شعرو ادب' سیرت و سوانح اور تنقید پر گراں قدر مقالے لکھے ہیں لیکن شبلی کے علاوہ جتنے بھی مقالہ نگار ہیں ان کے مقالوں پر ایک قسم کی سنجیدہ' خشک اور سپاٹ سی فضا چھائی رہی ۔ یہ مقالے اس شگفتگی' لطافت اور دلکشی سے محروم ہیں جو شبلی کے مقالوں کا حصہ ہے ۔فکر کی گہرائی' نظر کی وسعت اور اندازِ بیان کی دلکشی کے سبب ان کے مقالے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ۔

شبلی کے یہ مقالات اُس دور کے اخبارات و رسائل مثلاً' معارف اعظم گڑھ' دکن ریویو' انسٹی ٹیوٹ گزٹ' تہذیب الاخلاق' الندوہ اور مسلم گزٹ میں وقتاً فوقتاً چھپتے اور دادِ تحسین وصول کرتے رہے ۔ بعد میں ان کے شاگردِ رشید سید سلیمان ندوی نے انھیں آٹھ جلدوں میں مع مقدمہ کے اعظم گڈھ سے شائع کیا۔ ان مقالات کی ترتیب یہ ہے :

جلد اول (مذہبی)' جلد دوم (ادبی)' جلد سوم (تعلیمی)' جلد چہارم (تنقیدی)' جلد پنجم (تاریخی حصہ اول)' جلد ششم (تاریخی حصہ دوم)' جلد ہفتم (فلسفیانہ) جلد ہشتم (اصلاحی و سیاسی)۔

زیر نظر مضمون کا مقصد ان کے تاریخی مقالات کا مختصر جائزہ اور ادب میں ان کی اہمیت و افادیت اور قدر و قیمت کا تعین ہے ۔ یہ بہر حال افسوس کامقام ہے کہ ان کی مستقل تصانیف پر تو بہت کچھ لکھا گیا لیکن ان کے مقالات کی جانب بہت

کم توجہ دی گئی۔

شبلی نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ "تاریخ ان کے دستر خوان کی چٹنی ہے"۔۔۔ ان کے دستر خوان پر ضیافت کے جو بھی سامان موجود ہوں، تاریخ اپنا جلوہ ضرور دکھاتی ہے۔یہ تاریخ ان کا طرۂ امتیاز بھی تھی اور یہی ان کی کمزوری بھی۔ وہ خواہ کچھ بھی لکھ رہے ہوں، تاریخ سے اپنا دامن نہیں بچا پاتے۔ موقع نہ ہو تو موقع نکال لیتے ہیں اور پھر ان کا قلم اپنے خوب خوب جوہر دکھاتا ہے۔ سید سلیمان ندوی بھی اقرار کیے بنا نہیں رہتے، ملاحظہ فرمائیے:

"۔۔۔ اگر چہ اس غلط خیال کی تردید ہو چکی ہے کہ مولانا شبلی مرحوم تاریخ کے سوا اور کوئی فن نہیں جانتے تھے، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ ان کا خاص فن تھا اور تاریخی کتابوں کے علاوہ انھوں نے بہت سے تاریخی عنوانات پر نہایت کثرت سے مضامین لکھے تھے۔۔۔" (مقدمہ، مقالات شبلی، تاریخی حصہ اول، جلد پنجم۔ص ۱)

شبلی کے تاریخی مقالات کو دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ جلد پنجم حصہ اول میں مشاہیر اسلام کی سوانح حیات ہے۔ جلد ششم حصہ دوم تاریخی مسئلہ سے متعلق ہے۔ حصہ اول میں جو مقالات درج ہیں ان کی ترتیب یہ ہے۔

" حضرت اسماؓ (اخلاق عرب)، المعتزلہ و الاعتزال، ابن رشد، علامہ ابن تیمیہ حرانی، متنبی، موبدان مجوس، زیب النساء، مولوی غلام علی آزاد بلگرامی، فرید وجدی بک ۔" یہ مضامین الندوہ میں شائع ہوتے رہے، صرف ایک مضمون معارف سے لیا گیا ہے۔

شبلی کے تمام کاموں کی بنیاد ایک تھی ۔۔۔ اسلاف کے کارناموں کو اجاگر کرکے اپنوں اور غیروں کے سامنے پیش کرنا۔ یورپ کی توجہ جب اس جانب ہوئی تو اس نے اپنے اسلاف کو گمنامی کے پردے سے نکال کربامِ عروج پر پہنچادیا اور اب حال یہ ہے کہ انسانی فضائل و برکات کا ذکر آتے ہی یورپ اور اس کے اسلاف کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں حالانکہ ہمارے بزرگ بھی انسانی فضائل، علم وفن، تدبر و تہور اور شجاعت و بہادری میں یکتائے روزگار تھے۔ لیکن چونکہ ان کے حالات گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں، ان کے اخلاف نے ان کے کارناموں کو منظر عام پر لانے کی کوئی سعی نہ کی اس لیے فضیلت کا تاج یورپ کے سر ہے اور مشرق اس

سعادت سے محروم ہی رہا۔ شبلی نے اسی مقصد کے پیش نظر اپنی مستقل تصانیف کے علاوہ سلسلۂ مضامین بھی شروع کیا' تاکہ لوگوں کو اپنے بزرگان کی شخصیت اور کارناموں سے واقفیت حاصل ہوجائے۔

شبلی اپنے تاریخی مقالات کے پہلے مقالہ کی ابتداء ہی ان الفاظ سے کرتے ہیں:

" ایک نکتہ داں شخص نے کس قدر سچ کہا ہے کہ " ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کر لیا ہے' بلکہ یہ بھی رونا ہے کہ ہمارے مُردوں پر بھی یورپ کے مُردوں نے فتح پالی ہے۔" ہر موقع اور ہر محل پر جب شجاعت' ہمت' غیرت' علم و فن کسی کمال کا ذکر آتا ہے ' تو اسلامی ناموروں کے بجائے یورپ کے ناموروں کا نام لیا جاتا ہے — جب فضائلِ انسانی کا ذکر آتا ہے تو خواہ مخواہ انہی لوگوں کا نام زبان پر آتا ہے' جن کے واقعات کی آوازیں کانوں میں گونج رہی ہیں اور یہ وہی یورپ کے نامور ہیں۔"
(حضرت اسماءؓ' مقالاتِ شبلی' جلد پنجم' ص ۱)

مولانا کے اس بیان سے ان کی اس زبردست خواہش کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقالوں میں ایسی شخصیتوں کی شجاعت و بہادری' علم و فن اور ہمت و استقلال کو ابھاریں جن سے مسلمانوں کو اپنے ماضی کی عظمت کا احساس ہو اور انھیں بھی اپنے بزرگوں اور ناموروں کے حالات پر فخر کرنے کا موقع حاصل ہوسکے جیسا کہ یورپ والے کرتے ہیں۔

حضرت اسماءؓ (عرب اخلاق):

حضرت اسماءؓ اور ہندہ والدۂ امیر معاویہؓ کے توسط سے شبلی مسلمان عورتوں کے استقلال و ثبات اور ان کی دلیری و آزادی کا حال بیان کرتے ہیں۔ حجاج بن یوسف نے جب عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مکہ میں محاصرہ کرلیا اور رسد وغیرہ پر مکمل پابندی لگادی تو ان کے جاں نثاروں کی تعداد گھٹنے لگی چنانچہ وہ حجاج بن یوسف سے صلح پر آمادہ ہو گئے۔ اس سلسلہ میں ماں سے مشورہ کرنے گئے۔ ماں نے بڑی دلیری سے جواب دیا کہ اگر تم ناحق پر ہو تو تم نے صریحاً غلطی کی' اور اب بھی اپنی غلطی پر قائم ہو اور اگر تم حق پر ہو تو ہر حال میں اس پر قائم

رہو ۔ چونکہ عبد اللہ بن زبیرؓ کو اپنے سچے ہونے کا یقین تھا لہٰذا حق کے لیے جان پر کھیلنے کا فیصلہ کرلیا اور ہتھیار سے لیس ہو کر ماں سے اجازت لینے پہنچ گئے۔ ماں نے گلے سے لگایا تو ان کے سینے پر سختی محسوس کی اور ٹوکے بنا نہ رہ سکیں کہ جان پر کھیلنے والے یوں زرہ پہن کر میدانِ جنگ میں نہیں جایا کرتے ۔ بیٹے نے فوراً زرہ اتار کر پھینک دی اور میدانِ جنگ میں جانبازی کے جوہر دکھاتے ہوئے شہید ہوگئے ۔ ان کی لاش سولی پر لٹکادی گئی ۔ کئی دن کے بعد جب ان کی ماں کا ادھر سے گزر ہوا تو بیٹے کی لاش پر نظر پڑی' فرمایا " کیا اب بھی یہ وقت نہیں آیا کہ یہ شہسوار اپنے گھوڑے سے اتر آئے۔"

ایک دوسرا واقعہ ہندہ (امیر معاویہؓ کی والدہ) کی بیعت کا ہے ۔ فتح مکہ کے بعد ہندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کی غرض سے آئیں۔ اس وقت ان کی اور آنحضرت ﷺ کی گفتگو شبلی بڑے رواں اور دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں ۔ اور مسلمان عورتوں کی بے خوفی اور جرأت کو سراہتے ہوئے عرب کی آزاد پسندی کی داد بھی دیتے ہیں کہ حق بات کو بے باکی سے کہنے کے وہاں پورے مواقع میسر تھے ۔

المعتزلہ والاعتزال :

اعتزال کے آغاز اور ان کے عروج و زوال کی مکمل داستان مرتب کی گئی ہے ۔ اسلام کے بہت سے فرقوں میں چار فرقے زیادہ تر کامیاب ہوئے' اور ایک مدت تک موجود رہے۔ ان میں سنی' شیعہ' معتزلہ اور باطنیہ ہیں ۔ معتزلہ اور باطنیہ تقریباً معدوم ہوگئے ہیں لیکن معتزلہ کو بہت عروج حاصل رہا۔ ان میں بڑے بڑے مصنفین اور علماء پیدا ہوئے' علم' تصنیف' لٹریچر وغیرہ میں ان کی بہت سی یادگاریں وجود میں آئیں۔ شبلی کو اس کا دلی رنج ہے کہ اس مشہور فرقہ کے واقعات و حالات کی جانب سے مکمل بے توجہی برتی گئی' جو ایک تاریخی غلطی ہے ۔ چنانچہ انھوں نے معتزلہ کے متعلق ایک مضمون لکھا' جس میں مذہب اعتزال کی ابتدا' اشاعت' ترقی' تنزلی اور اس کے اسباب نیز مشہور معتزلیوں کے مختصر حالات' اعتزال

کے مسائل، دیگر فرقوں پر معتزلیوں کا اثر وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے زمانے تک اسلامی عقائد میں کلمہ توحید اور اعمال میں فرائض خمسہ کی پابندی لازمی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد بھی عرب کی تمام تر دماغی اور عملی قوت مہماتِ ملکی تک محدود تھی لیکن صحابہ کرامؓ کا ایک گروہ اب بھی علمی اشغال میں مصروف تھا۔ یہیں سے بحث و تدقیق کا سلسلہ شروع ہوا اور مختلف فرقوں کی بنیاد پڑی۔ عقائد و اعمال میں اختلاف شروع ہوا۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی صلح کے بعد خارجیوں کی اصطلاح قائم ہوئی اور یہیں سے اس بات کی ابتدا ہوئی کہ اختلافِ رائے کی بنا پر الگ الگ فرقے قائم ہو سکتے ہیں اور ان کے جدا جدا نام بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ اعتزال کے ابتدائی آثار رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی موجود تھے۔ صحابہؓ میں سے چند مذہبی مسائل کے متعلق کچھ بھی غور و فکر سے عاجز تھے لیکن ان میں بعض ایسے تھے جو ہر بات کو عقل کے معیار سے جانچتے اور پرکھتے تھے یا شرعی معاملات میں عقل کو بالکل بے دخل قرار نہیں دیتے تھے۔ یہی اعتزال کی بنیاد تھی جس پر آگے چل کر راستہ ہموار ہوا۔ اعتزال کی بنیاد اس مسئلہ پر قائم ہوئی کہ انسان جو کچھ برائیاں کرتا ہے، خدا نہیں کراتا۔ اس مسئلہ کو قدر کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے معتزلیوں کا دوسرا نام قدریہ ہے۔ اس مسئلہ کی تشہیر سب سے پہلے سعید جہنی نے کی، اس کے بعد غیلان دمشقی، عمرو بن عبید، واصل بن عطا، دولتِ عباسیہ کا دوسرا بادشاہ منصور، مامون الرشید، معتصم اور واثق وغیرہ نے اس فرقہ کو بہت ترقی دی اور اس میں خوب نکتہ آفرینیاں کیں۔ مغلوں اور ترکوں کے زور پکڑنے کے بعد اس کا زور کم ہوتا گیا، کیونکہ یہ لوگ قلم سے زیادہ تلوار پر بھروسہ کرتے تھے اور مذہب کے نازک اور دقیق معاملات قلم سے سلجھائے جا سکتے ہیں تلوار سے نہیں۔

ابن رشد :

اب شبلی کی نظر انتخاب بارہویں صدی عیسوی کے ایک مشہور فلسفی ابن رشد پر پڑتی ہے۔ ان کی پیدائش اور ابتدائی حالات کے بعد ان کی تعلیم و تربیت

کا ذکر کرتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں ابن رشد کے شیوخ فلسفہ میں سے ابن ماجہ کے تفصیلی حالات بیان کیے ہیں' کیونکہ ان کے ذکر سے ابن رشد کی علمی زندگی بھی سامنے آتی ہے ۔ ابن ماجہ نے جس کام کی ابتدا کی' ان کے شاگرد ابن رشد نے اسے انجام تک پہنچادیا۔

ابن رشد کا دادا قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھا۔ ابن رشد کو آغاز جوانی ہی میں قضا کی خدمت مل گئی ۔ سب سے پہلے اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہوا' پھر قرطبہ کا قاضی بنا اور اس کی شہرت شاہی دربار تک جا پہنچی۔ ابن رشد نے فلسفہ کے سلسلہ میں جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا' وہ تصنیفات ارسطو کی شرح تھی۔ اس نے ارسطو کو اپنا امام اور پیشوا قرار دیا۔ اس کی تمام تصنیفات کو ترتیب دیا اور بہت سے ایسے مسائل جو جمہور اسلام کے خلاف تھے' ان کی حمایت بھی کی جس میں سے ایک یہ کہ افلاک قدیم اور ازلی ہیں' خدا نے ان کو پیدا نہیں کیا بلکہ خدا صرف ان کی حرکات کا خالق ہے ۔ اس نے اشاعرہ کے عقائد کو باطل قرار دیا اور انھیں عقل اور نقل دونوں کے خلاف بتایا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ امام غزالیؒ کی تہافت الفلاسفہ کا ردّ لکھا۔ اس پر فلسفہ کا رنگ اس درجہ غالب آگیا تھا کہ اکثر اس کی زبان سے ایسے کلمات ادا ہوجاتے تھے جو عام عقائد کے خلاف ہوتے تھے ۔ رفتہ رفتہ اس کے خلاف محاذ بنتا گیا اور اسے ملحد اور بے دین قرار دیا گیا' اور جلاوطن کر دیا گیا۔ اس نے فقہ' طب' فلسفہ و کلام پر کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف کیں۔ یورپ میں اس کی تصنیفات کی بڑے پیمانے پر اشاعت ہوئی اور یورپ نے ان سے زبردست استفادہ کیا۔ اس کے فلسفہ کو اگرچہ تمام یورپ میں فروغ حاصل ہوا لیکن اس کا صدر مقام پیڈوا کی یونیورسٹی تھی' جو اٹلی میں واقع تھی۔ اس یونیورسٹی نے سب سے پہلے ابن رشد کے فلسفہ کو نصاب میں داخل کیا۔

علامہ ابن تیمیہ حرانی:۔

مجدد یا رفارمر کے لیے شبلی تین شرائط کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ (۱) مذہب یا علم سیاست (پالٹکس) میں کوئی مفید انقلاب پیدا کرے (۲) جو خیال اس کے دل میں آیا ہو کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو' بلکہ اجتہاد ہو (۳) جسمانی مصیبتیں

اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو، سر فروشی کی ہو —— اور ان تینوں شرائط پر پوری اترنے والی شخصیت شبلی کے نزدیک کوئی دوسری نہیں علامہ ابن تیمیہ کی ہے۔ اس لیے کہ مجددیت کی تمام تر خصوصیتیں علامہ کی ذات میں موجود تھیں لہٰذا مجدد یا رفارمر کی حیثیت سے شبلی کے تاریخی مقالات میں ان کی جگہ بھی مسلم ہے۔ مقالہ کی ابتدا ابن تیمیہ کے نام و نسب، ابتدائی حالات، حصول علم نیز جن اساتذہ سے انھوں نے فیض حاصل کیا، ان کے ذکر سے ہوتی ہے۔ انھوں نے ۶۹۸ھ میں ایک استفتا کا خاصا طویل جواب حمویہ کے نام سے لکھا، جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ اشعریوں کی غلطی ثابت کی۔ لہٰذا ایک بڑا گروہ ان سے بر سر پیکار ہوگیا۔ کچھ لوگوں کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن ۷۰۵ھ میں یہ فتنہ دوبارہ زورو شور سے اٹھ کھڑا ہوا اور نائب سلطنت کے حکم سے انھوں نے علماء و فضلاء کے مجمع میں حاضر ہو کر اپنی تصنیف عقیدۂ واسطیہ تین جلسوں میں پڑھ کر سنائیں، تب جا کر لوگوں نے تسلیم کیا کہ ان کے عقائد اہل سنت کے عقائد ہیں۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان کے خلاف محاذ آرائی ہوتی رہی اور انھیں قیدو بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔

علامہ ابن تیمیہ عام علماء کی طرح صرف نماز روزہ کے ہی پابند نہیں تھے بلکہ ان کا یقین تھا کہ علماء کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ سیاسی مہموں میں حصہ لیں۔ ۶۷۸ھ میں جب ان کی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی، غازان خاں ہلاکو نے شام پر حملہ کیا، مصر کے بادشاہ سلطان ناصر نے زبردست مقابلہ ہوا اور ناصر کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ غازان خاں حمص پر قابض ہوگیا اور دمشق میں غارت گری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ابن تیمیہ خود غازان خان کے پاس گئے اور امن کا فرمان لے کر آئے اور شیخ الشیوخ نظام الدین محمود کو لے کر شہر میں امن و امان قائم کیا۔ دوبارہ جب غازان خان نے شام پر حملہ کی تیاری شروع کی تو ابن تیمیہ غازان خان سے ملے اور اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ۷۰۲ھ میں تاتاریوں نے پورے زوروشور سے شام پر چڑھائی کی سلطان ناصر اور ارکان دربار کی ہمت جواب دے گئی لیکن علامہ مصر پہنچ گئے اور بادشاہ سے نہایت جرأت سے ملے اور اسے غیرت دلائی۔ ناصر کو جوشِ غیرت نے حملے پر مجبور کیا۔ دونوں فوجوں میں زبردست معرکہ ہوا اور تاتاریوں کی تمام فوجیں تباہ ہو گئیں۔ علامہ تیمیہ اس معرکہ

میں عالم و فاضل نہیں ایک مرد مجاہد نظر آرہے تھے۔

متنبی:۔

اخلاقِ عرب کو نمایاں کرنے کی فکر میں شبلی کی نظر متنبی پر پڑتی ہے۔ اگر چہ وہ چوتھی صدی کا شاعر ہے' اس وقت تک عرب کے شعرا اپنی امتیازی حیثیت کھو چکے تھے تاہم متنبی کا بچپن صحرائے عرب اور بدویوں میں گزراتھا' اس لیے عرب کے بہت سے شریفانہ اخلاق اس میں موجود تھے۔ اگر چہ اس کا کلام درس میں داخل ہے' لیکن محض تدریس کے ذریعہ سے اس کے کلام کی امتیازی خصوصیات یا منفرد انداز' اس کی شاعری کے محاسن و معائب اور ہم عصر شعرا سے اس کی نسبت کے بارے میں اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ شبلی نے مورخانہ تحقیق و تدقیق سے کام لے کر اس کے تمام مستند حالات لکھے' اور کلام پر تنقید بھی کی ہے۔

متنبی فطری شاعر تھا۔ بدویوں کی صحبت نے اس کی صلاحیت کو جلا بخشی۔ اوراسے اپنا کلام تمام شعرا میں ممتاز نظر آیا۔ چنانچہ اس نے نبوت کا دعویٰ کردیا اور قبیلہ بنو کلب اس کا معتقد بھی ہوگیا۔ جب اس فتنہ نے زور پکڑا تو حمص کے گورنر نے اسے گرفتار کرلیا۔ بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے توبہ کرلی۔

شاعری کو اس نے ذریعہ معاش ٹھہرلیا اور مصر وشام کے فرمانروا سیف الدولہ کے دربار تک رسائی حاصل کرلی۔ متنبی میں غرور اور نخوت پسندی کا مادّہ بہت زیادہ تھا' جس سے سیف الدولہ اور دوسرے درباری نالاں رہتے۔ جب شکایات اور بدگمانیاں حد سے بڑھیں تو سیف الدولہ نے بھی اپنی برہمی کا اظہار کردیا۔ متنبی نے ایک قصیدہ لکھ کر سیف الدولہ کی ناقدری اور اپنی بلند حیثیت کو ثابت کیا۔ سارا دربار اس کے خلاف ہوگیا۔ آخر وہ دربار چھوڑ کر مصر کے حکمراں کافور کے پاس پہنچا اوراس کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک قصیدہ پڑھا' کافور نے اسے انعام و اکرام سے نوازا لیکن اسے کسی ضلع پر حکمرانی کی خواہش تھی لہٰذا اس نے دربار کی حاضری ترک کردی۔ کافور اس بات پر سخت برہم ہوا اور اس نے متنبی کے دروازہ پر پہرہ بٹھادیا۔ اس نے کافور کی ایک ہجو لکھی اور وہاں سے فرار ہوگیا۔ کوفہ سے بغداد ہوتا ہوا وہ فارس پہنچ گیا' جہاں عضدالدولہ کے درباریوں میں محمد بن العمید نام

کا ایک درباری اعلیٰ پایہ کا عالم و فاضل تھا۔ اس نے متنبی کو خلعت اور تحائف کے علاوہ پچاس ہزار اشرفیاں دیں۔ اس نے ایک مدحیہ قصیدہ بادشاہ کی شان میں کہا اور عوض میں کافی انعام و اکرام حاصل کیا اور شاہانہ خلعت بھی عنایت ہوئی۔ اور یہی دولت اس کی موت کا سبب بھی بن گئی۔ بدویوں کے سردار فاتک اسدی نے کوفہ کے راستہ میں اس پر ہلتہ بول دیا' اور وہ بے جگری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

موبدان مجوس:۔

شبلی یورپ کے اس فعل سے حد درجہ نالاں ہیں کہ ان کے قلم کا سارا زور' اور احساسات کی ساری توانائی اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ جب اہل یورپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں پارسی قوم کے معابد' مذہبی پیشواؤں' ان کی تصنیفات اور تعلیم و تلقین کا پتہ نہیں چلتا تو وہ یہ فیصلہ صادر کردیتے ہیں کہ ہندستان کے حکمرانوں نے تعصب کے سبب انھیں ملک میں گھسنے نہیں دیا انھیں گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور رکھا۔ چنانچہ شبلی اپنے ایک مضمون میں پارسیوں کے ان مذہبی پیشواؤں کا مختصر حال لکھتے ہیں جو ہندستان میں سکونت پذیر تھے اور جن کی تصنیفات و تالیفات کا اہل علم میں چرچا تھا۔

اکبر کے زمانے میں موبدوں کا پتہ چلتا ہے۔ اکبر نے جب مذہبی کانفرنس قائم کی اور ہر مذہب و ملت کے پیشواؤں کو دور دور سے بلایا تو ایران کے پارسی پیشوا آذرکیوان کو بھی خط لکھا۔ وہ کانفرنس میں شرکت تو نہ کر سکا لیکن ایک عجیب وغریب تصنیف بھیجی جس کا کمال یہ تھا کہ خالص فارسی زبان میں تھی' لیکن نقطوں کو اول بدل دیا جائے تو عربی ہوجاتی تھی اور الفاظ کوالٹ کر پڑھا جائے تو ترکی اورپھر مصحف کرنے سے ہندی میں بدل جاتی تھی لیکن شبلی کی محققانہ نظر اس کی صداقت پر آنکھ بند کرکے یقین نہیں کر لیتی۔ چنانچہ وہ اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکے کہ " اگر چہ اس ناممکن صنعت پرہم یقین نہیں کرسکتے' لیکن اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ آذر کیوان نے اپنی کوئی تصنیف ضرور بھیجی تھی۔

آذرکیوان ماہر علوم وفنون تھا۔ عربی زبان پر قادر تھا۔ اس کی تبحر علمی کی

وجہ سے اسے ذوالعلوم کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ آذر کیوان کے شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس کے ممتاز شاگردوں کے نام اور حالات بھی شبلی نے درج کیے ہیں۔ شبلی مسلمانوں کی بے تعصبی ثابت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بہت سے مسلمان فضلاء نے آذرکیوان کی علمیت سے متاثر ہوکر ان کی شاگردی اختیار کی تھی یہاں تک کہ شیخ بہاء الدین عاملی بھی آذر کیوان کی صحبت سے فیض یاب ہوا تھا۔

زیب النسا :۔

اورنگ زیب کی پہلی اولاد زیب النساء کے متعلق انگریزوں نے بہت سے جھوٹے اور من گھڑت واقعات پھیلا رکھے تھے۔ بمبئی کے سفر میں مولانا شبلی کی نگاہ انڈین میگزین اینڈریویو' کے ایک آرٹکل پر پڑی جس میں زیب النسا کے متعلق بے سروپا باتیں قلم بند تھیں۔ شبلی نے صحیح صورت حال سامنے لانے کا بیڑہ اٹھایا اور اپنے مضمون میں زیب النساء کے ابتدائی حالات' تعلیم و تربیت' اعلا صلاحیت' نثر و نظم سے اس کی دلچسپی وغیرہ کو بڑے جذب کے عالم میں بیان کیا ہے۔ وہ خود شاعری کرتی تھی اور مخفی تخلص کرتی تھی۔ نستعلیق' نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی۔ اس نے عالموں سے بڑی تعداد میں کتابیں لکھوائیں اوراپنے دربار کو ایک اکیڈمی کی شکل دے رکھی تھی۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی اس نے قائم کررکھا تھا۔ وہ اگر چہ درویشانہ مزاج رکھتی تھی' لیکن نفاست پسند تھی۔ اسے اپنے بھائیوں سے بے پناہ محبت تھی۔ شبلی نے اپنے اس مضمون کے ذریعہ اس کی تمام تر صلاحیتوں کو زمانہ کے سامنے ابھارا اور اپنے محققانہ قلم سے ایک الزام کا پردہ بھی چاک کیا جوعاقل خاں رازی سے متعلق ہے جس کے بارے میں یہ مشہور کیا گیا تھا کہ زیب النساء کو اس سے عشق تھا' اور وہ چوری چھپے اسے اپنے محل میں بلایا کرتی تھی۔

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی :۔

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی اعلا درجے کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات

اس وجہ سے امتیازی درجہ رکھتی ہیں کہ انھوں نے ہندستان کے علما، ادبا اور عمائد کے حالات مرتب کیے۔ ان کی تصانیف سرو آزاد، ید بیضا، مآثر الکرام، خزانۂ عامرہ، روضۃ الاولیاء، سند العادات فی حسن خاتمۃ السادات، دیوان عربی، دیوان فارسی، شرح بخاری وغیرہ اعلا حیثیت کی حامل ہیں۔ ایسی عالم و فاضل ہستی کی شبلی کو ہمہ وقت تلاش رہتی تھی، اور ایسی ہستیاں انھیں جس میدانِ زندگی میں نظر آجاتیں، ان کا قلم حرکت میں آجاتا۔

فرید وجدی بک :۔

جدید تعلیم یافتہ گروہ میں ایک ممتاز نام فرید وجدی بک کا ہے۔ انھوں نے فلسفۂ حال اور اسلام کی تطبیق پر لٹریچر کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ تیار کیا ہے۔ شبلی کے گراں قدر مقالوں میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ شبلی ان کے نام و نسب، ابتدائی حالات، تعلیمی زندگی وغیرہ کا ذکر نہایت مبسوط انداز میں کرتے ہیں۔ فلسفہ سے انھیں گہرا شغف تھا۔ انھوں نے درسی علوم کو چھوڑ کر اسلام و فلسفہ کی مطابقت پر غور و فکر شروع کیا اور مذہب اور تمدن کی مطابقت پر ایک کتاب تطبیق الدیانۃ الاسلامیہ علی نوامیس المدنیۃ لکھی۔ اس کے علاوہ بھی ان کی کئی تصانیف ملتی ہیں، مثلاً الفلسفۃ الحقہ فی بدائع الاکوان، الحدیقۃ الفکریہ فی اثبات اللہ بالبراہین الطبیعۃ، المراۃ المسلمۃ، الاسلام فی عصر العلم، صفوۃ العرفان فی تفسیر القرآن، سفیر الاسلام الی سائر الاقوام اور کنز العلوم واللغۃ جو انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر چہ وہ جدید تعلیم کا حامی تھا لیکن عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کا دل سے مخالف تھا اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے بر خلاف مذہبی ارکان کا پابند تھا۔ نماز اول وقت میں پڑھتا، شراب کو ہاتھ بھی نہ لگاتا لیکن شبلی اپنی غیر جانبداری کو برقرار رکھتے ہوئے بڑی حقیقت پسندی سے اقرار کرتے ہیں کہ اس کی مذہبی معلومات سطحی اور سرسری ہیں جب وہ حدیث یا قرآن مجید کے متعلق کسی نکتہ پر قلم اٹھاتا ہے تو اس کی کم مائیگی کی جھلک صاف دکھائی دے جاتی ہے۔

ڈاکٹر عابد معز

انسولین INSULIN

لبلبہ (Pancreas) کے بنا خلیے انسولین تیار کر کے خون میں خارج کرتے ہیں۔ عام حالات میں طبعی وزن رکھنے والے صحت مند انسان کا لبلبہ ایک یونٹ فی گھنٹہ کے حساب سے انسولین کو خون میں داخل کرتا ہے۔ غذا حاصل کرنے کے بعد خون گلوکوز میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیش خون گلوکوز کے سبب انسولین کے اخراج میں پانچ تا دس گنا اضافہ ہوتا ہے۔ اس حساب سے چوبیس گھنٹوں کے دوران ایک عام انسان کے لبلبہ سے چالیس یونٹ انسولین کا اخراج عمل میں آتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ طبعی حالات میں ہمیں ہر دن چالیس یونٹ انسولین کی ضرورت پڑتی ہے۔

امراض ذیابیطس کی وجہ انسولین ہارمون کی کمی یا اس ہارمون کا غیر کارگر ہونا ہے۔ علاج میں انسولین کی ضرورت کے لحاظ سے ذیابیطس کی دو اہم قسمیں ہیں۔ انسولین انحصار (Insulin Dependent) اور غیر انسولین انحصار (Non-Insulin Dependent) گو کہ بہتر کنٹرول کے لیے غیر انسولین انحصار ذیابیطس مریضوں میں بھی انسولین استعمال کیا جاتا ہے۔

انسولین کو 1921 میں دریافت کیا گیا اور صرف دو سال کے اندر ہی 1923 میں انسولین ذیابیطس کے علاج کے لیے بازار میں دستیاب ہونے لگا تب سے اب تک انسولین کی تیاری اور استعمال میں کئی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔

علاج میں انسولین کے استعمال کا فیصلہ، معالج مختلف امور کو خاطر میں لا کر کرتا ہے۔ طبیب بہتر جانتا ہے کہ مریض کے لیے کونسا طریقہ علاج مناسب ہوگا۔ عام طور پر تیس سال سے کم عمر اور دبلے ذیابیطسی مریضوں (جن کی اکثریت انسولین انحصار کی ہے) کا علاج انسولین کے انجکشن سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے ذیابیطسی مریض جن کے خون

میں بہت زیادہ گلوکوز کے ساتھ پیشاب میں کیٹونز (Ketones) موجود ہوں تو ان کے علاج کے لیے بھی انسولین شروع کیا جاتا ہے۔ حمل کے دوران خواتین میں بیش خون گلوکوز کو قابو میں کرنے کے لیے صرف انسولین استعمال ہوتا ہے۔ حاملہ خواتین میں خون گلوکوز کم کرنے والی گولیوں سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ دیگر مختلف بیماریوں اور جراحی کے دوران ہر قسم کے ذیابیطسی مریضوں کو انسولین ہی کے انجکشن دیے جاتے ہیں۔ غیر انسولین انحصار ذیابیطس کے بعض مریضوں میں بہتر گلوکوز کنٹرول کے لیے بھی انسولین استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے موجب پچیس فیصد ذیابیطس مریض انسولین کے انجکشن لیتے ہیں۔

انسولین صرف انجکشن کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ انسولین ایک پولی پیپٹائڈ (Polypeptide) ہارمون ہے جو معدہ میں ہضم ہو کر ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے انسولین کو انجکشن کے ذریعہ جسم میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر انسولین کے انجکشن کو جلد کے نیچے (زیر جلد، Subcutaneous مخفف Sc) لگایا جاتا ہے۔

انسولین کی اقسام

بازار میں ملنے والے انسولین کی کئی قسمیں ہیں۔ عموماً تین خوبیوں کو بنیاد بنا کر انسولین کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ حصول (Origin) خالص (Purity) اور مدت اثر (Duration of Action) کے لحاظ سے انسولین کی کئی قسمیں ہیں۔ انسولین کی مختلف اقسام اور ناموں کے تعلق سے خاصی الجھن بھی پائی جاتی ہے۔

گاؤ انسولین خنزیری انسولین اور انسانی انسولین، ابتدا میں انسولین جانوروں کے لبلبہ سے تخلیص کیا گیا۔ گائے کے لبلبہ سے حاصل ہونے والے انسولین کو بقری یا گئو انسولین (Bovine/Beef Insulin) کہتے ہیں۔ انسانی اور گاؤ انسولین کے 101 امینو ترشوں میں سے تین امینو ترشوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

خنزیر کے لبلبہ سے تیار کیے گئے انسولین کو خنزیری انسولین (Pork/Porcine Insulin) کہتے ہیں جو انسانی انسولین سے صرف ایک امینو ترشے میں مختلف ہوتا ہے۔

پہلی مرتبہ انسانی انسولین کو 1981ء میں تیار کیا گیا۔ انسانی انسولین کی تیاری میں انسان یا اس کے لبلبہ کا عمل دخل نہیں ہے۔ انسانی انسولین (Human Insulin) کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس انسولین میں امینو ترشوں کی تعداد اور ان کی ترتیب انسانی جسم میں تیار

ہونے والے انسولین کے مماثل ہے۔

انسانی انسولین کو دو طریقوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ پہلے طریقہ میں خنزیری انسولین کو خامروں (Enzymes) کی مدد سے انسانی انسولین میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے انسولین کو ای ایم پی (Enzymatically Modified Porcine مخفف emp) انسانی انسولین کہتے ہیں۔ دوسرے طریقے میں حیاتیاتی تکنیک (Biotechnology) سے خورد بینی نامیات (Miocro Organisms) کے ڈی این اے۔ (DNA) میں ایسی تبدیلیاں لائی جاتی ہیں جس سے خورد بینی نامیات انسانی انسولین تیار کرنے لگتے ہیں۔ عام طور پر دو قسم کی تکنیک استعمال ہوتی ہے اور تیار ہونے والے انسولین کو بی آر پی (Bacteria Recombinant Proinsulin، مخفف prb) اور پی وائی آر (Recombinant Yeast Precursor، مخفف pyr) انسانی انسولین کہتے ہیں۔

تینوں اقسام کے انسولین، گاؤ خنزیری اور انسانی انسولین بازار میں دستیاب ہیں ابتدا میں گاؤ اور خنزیری انسولین سے حساسیتی (Allergic) مسائل کا سامنا تھا لیکن خالص انسولین کی تیاری سے حساسیتی رد عمل (Allergic Reactions) میں کافی کمی ہوئی ہے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ گاؤ، خنزیری اور انسانی انسولین کے اثر میں کوئی خاص فرق نہیں پایا جاتا۔ بعض ماہرین کے خیال میں انسانی انسولین نسبتاً تیز اثر کرتا ہے اور انسانی انسولین سے قلت خون گلوکوز (Hypoglycaemia) بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے جو مریض پہلے سے گاؤ یا خنزیری انسولین استعمال کر رہے ہیں انھیں وہی انسولین جاری رکھنے کی صلاح دی جاتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے انسانی انسولین کا استعمال کرنا چاہتے ہیں تو انھیں گاؤ یا خنزیری انسولین کی خوراک کا دس فیصد کم انسانی انسولین خوراک مقرر کرنی ہوگی۔ نئے مریضوں کے علاج کے لیے انسانی انسولین شروع کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

مدت اثر کے لحاظ سے انسولین کی اقسام

مختصر مدتی انسولین، وسط مدتی انسولین، طویل مدتی انسولین اور مخلوط انسولین ابتدا میں صرف سادہ انسولین (Regular or Soluble Insulin) دستیاب تھا۔ اس انسولین کا اثر چند گھنٹوں تک برقرار رہتا ہے۔ سائنسداں ایسے انسولین کی تیاری کی فکر میں رہنے لگے جو زیادہ وقفہ کے لیے کارگر ہوں۔ کامیابی 1936ء میں ہوئی پروٹامین

(Protamine) ایک قسم کا کم سالمی وزن پروٹین) کو انسولین کے ساتھ ملانے سے وقف کار کردگی میں اضافہ ہوا۔ چند سال بعد لینٹی انسولین (Lente Insulin) تیار ہوئے جو مزید وقفہ تک باا‌ثر رہتے ہیں۔ سادہ انسولین میں مختلف طریقوں سے جست (Zinc) ملانے سے لینٹی انسولین تیار ہوتے ہیں۔ بازار میں چالیس کے لگ بھگ مختلف انسولین دستیاب ہیں۔ مدت اثر (Duration of Action) کے لحاظ سے انسولین کو چار زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے مختصر مدتی / سادہ انسولین (Regular / Soluble / Insulin Short acting) یہ قدرتی انسولین ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں کی جاتی ہے۔ اسی لیے اسے سادہ انسولین بھی کہتے ہیں انجکشن کے آدھے اور ایک گھنٹے کے اندر اثر شروع ہوتا ہے جو چھ تا آٹھ گھنٹوں تک برقرار رہتا ہے۔ دو اور چار گھنٹوں کے درمیان سادہ انسولین کی کارکردگی عروج پر ہوتی ہے۔

وسط مدتی انسولین (INTERMEDIATE ACTION INSULIN)

مدت اثر بڑھانے کے لیے سادہ انسولین میں مختلف طریقوں سے پروٹامین یا جست کو ملایا جاتا ہے جس سے انجکشن کے بعد انسولین کا انجذاب آہستہ ہوتا ہے۔ انجکشن دینے کے ایک اور دو گھنٹوں میں اثر شروع ہوتا ہے جو چودہ تا اٹھارہ گھنٹوں تک برقرار رہتا ہے۔ وسط مدتی انسولین کی کارکردگی پانچ اور آٹھ گھنٹوں کے درمیان عروج پر ہوتی ہے۔

طویل مدتی انسولین (Long Actigg Insulin) اس قسم کے انسولین کا اثر چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت تک کے لیے رہتا ہے اور کارکردگی آٹھ اور بارہ گھنٹوں کے درمیان عروج پر ہوتی ہے۔

مخلوط انسولین (Mixed Insulin) مختصر مدتی یا سادہ انسولین اور وسط مدتی انسولین کو ملا کر مخلوط انسولین بنائے جاتے ہیں۔ مخلوط انسولین میں مختصر اور وسط مدتی کا تناسب مختلف ہوتا ہے جو دس فیصد سادہ اور نوے فیصد وسط مدتی سے لے کر پچاس فیصد سادہ اور پچاس فیصد وسط مدتی انسولین تک ہوتا ہے۔

انسولین کی پیمائش یا انسولینی قوت

انسولین کی پیمائش انٹرنیشنل یونٹس فی ملی لیٹر (Internationaı Units Permilliliter، مخفف ML/IU) سے کی جاتی ہے۔ صرف یونٹس (Units) کا مطلب

انٹر نیشنل یونٹس ہی لیا جائے گا۔ ابتداء میں انسولین ایک یونٹ فی ملی لیٹر (1IU/ML) قوت کے ہوا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ 20, 40اور 80 یونٹس فی ملی لیٹر انسولین بننے لگے۔ 40 یونٹس فی ملی لیٹر (40 IU/ML) انسولین بہت عام ہوئے 1970ء کے دہے میں ایک سو یونٹس فی ملی لیٹر (100 IU/ML) انسولین کے استعمال کو فروغ دینے اور دیگر قوتوں کے انسولین کو موقوف کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب بازار میں صرف ایک سو یونٹس فی ملی لیٹر انسولین ملتے ہیں۔

انسولینی قوت کے لحاظ سے انسولین پچکاری یا سرنج (Syringe) دستیاب ہوتے رہے ہیں۔

انسولین کی حفاظت

بہتر کارکردگی کے لیے انسولین کو 2اور 8ڈگری سنٹی گریڈ کے درمیان رکھنا چاہیے۔ فریج کے عام حصہ میں درجہ حرارت 4ڈگری سنٹی گریڈ ہوتا ہے جو انسولین رکھنے کے لیے مناسب ہے۔ اگر فریج میسر نہ ہو تو تھرماس میں ٹھنڈے پانی کے ساتھ انسولین کی بوتل کو رکھا جاسکتا ہے۔

آخری اور اہم بات یہ ہے کہ مریض کے لیے انسولین کی قسم اور خوراک تجویز کرنا معالج کا کام ہے۔ اپنے آپ انسولین تجویز کرلینا خطرناک نتائج کا باعث بن سکتا ہے اسی لیے احتیاط کا تقاضہ ہے کہ ڈاکٹر کے نسخہ اور ہدایات پر ہی انسولین استعمال کرنا چاہیے۔

(بہ شکریہ سیاست)

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

بازار میں نیند
(ڈرامے)

مصنف: شمیم حنفی
تبصرہ نگار: کوثر مظہری
قیمت: ۷۵روپے صفحات: ۱۳۶
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

زیر مطالعہ کتاب "بازار میں نیند" پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے مٹی کا بلاوا، مجھے گھر یاد آتا ہے، زندگی کی طرف، منظر عام پر آچکے ہیں۔ انھوں نے جدید اردو تنقید کو بھی نئی سمت عطا کی ہے اور ایک طرح سے اردو نثر میں نئی چاشنی پیدا کی ہے۔

اس کتاب میں جو ڈرامے شامل ہیں ان کے نام یوں ہیں' بازار' چوراہا' نیا ہنس نامہ' ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے' الٹی ہو گئیں سب تدبیریں' دور پاس' نیند۔ ڈراما "بازار" کا موضوع یہ ہے کہ دنیا ایک بازار کے مشابہ ہے جہاں ہر آدمی کچھ خریدنے یا فروخت کرنے میں مصروف ہے۔ ہر آدمی کو کسی نامعلوم منزل پر پہنچنے کی جلدی ہے اور رفتار پر قابو نہیں۔ اس ڈرامے میں انسان کی عقل پر پڑے پردے کو بھی ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ جملہ ملاحظہ کیجیے۔ اوپر سے یہ لگتا ہے کہ کتے کو ٹہلایا جارہا ہے جبکہ ہوتا یہ ہے کہ کتے لوگوں کو ٹہلاتے ہیں۔" (صفحہ ۱۵) انسان کے اندر اور باہر ایک ہجوم ہے جس کا نتیجہ ڈراما نگار کی نظر میں منفی نکلتا ہے جب سلیم چچا کہتے ہیں:

سلیم چچا: باہر بھی بھیڑ ہے' اندر بھی بھیڑ بہت ہے' کوئی اکیلا نہیں' اس لیے تو لوگ سوچنا بھولتے جاتے ہیں۔ (صفحہ ۲۱)

ڈراما "چوراہا" میں دو کرداروں کے مختلف افکار کو پیش کیا گیا ہے۔ چچی امی ہر حال میں وضع داری اور رکھ رکھاؤ کو نبھانا چاہتی ہیں جبکہ چچا میاں زمانہ شناس اور pracrical ہیں۔ چچا میاں کا یہ جملہ:

چچا میاں: بھاڑ میں گئی وضع داری' زمانے کو دیکھوں کہ ان چونچلوں کو؟ تمھیں کچھ پتا بھی ہے دلدار نگر کے تعلقہ دار کے گھر کی عورتیں اب چکن کڑھائی کر کے پیٹ پالتی ہیں۔ (صفحہ ۳۹)

"نیا ہنس نامہ" .T.V کے لیے لکھا گیا ڈراما ہے جو پانچ مناظر پر مشتمل ہے۔ اس کا مرکزی

خیال یہ ہے کہ کسی کلچر کو زبردستی خود پر مسلط کرنا انسانی فطرت کے منافی ہے۔ مرزا انگریزی تہذیب کو اپنانا چاہتے ہیں مگر جب کھاتے وقت ان کے حلق میں کانٹا چبھ جاتا ہے تو ان کی صورت حال نہایت ہی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ مرزا اپنے بیٹے انور سے کہتے ہیں:

مرزا:(انور سے) بیٹے' وہ نامعقول چھری اور کانٹے پھنکوا دو' اور وہ میز اور صوفہ سب تم اپنے کمرے میں لے گئے نا۔(صفحہ ۷۳)

اس سماج میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنا خرچ کم کرنے کی ذھن میں دوسروں پر بوجھ بننا پسند کرتے ہیں۔ راشد ایک ایسا ہی کردار ہے جو "ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے" میں اپنی چالاکی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ گھر کی ضروریات میں کٹوتی کرکے جمع خرچ کا حساب متوازن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈرامے کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما نگار کی نظر میں کم و بیش ہر آدمی کی فطرت میں یہ عنصر پایا جاتا ہے۔ اسی ڈرامے سے مماثلت رکھتا ہوا ڈراما "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں" ہے۔ صرف یہ ہوا ہے کہ کردار اور پس منظر بدل گئے ہیں۔ ان دونوں میں ڈراما نگار نے مزاحیہ عناصر کی آمیزش کی ہے جو موضوع کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ مگر مزاحیہ عناصر کی زیریں تہوں میں طنزیہ لہریں متموج ہیں۔

"دور پاس" ماضی اور حال کا خوبصورت اعلامیہ ہے جس کی اساس ماضی کی یادوں اور حال کے سنہرے لمحوں پر قائم ہے۔ جمال صاحب کا کردار ایام گذشتہ کا استعارہ ہے جب کہ سلیم کا کردار حال کی مصروف زندگی کا علامتی اظہار ہے۔

"نیند" آخری ڈراما ہے جس میں سامیہ ایک خواب پرست لڑکی ہے۔ یہ ایک الیہ کردار ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اس دنیا میں ہر آدمی کوئی نہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ ندی اور بہتا ہوا پانی سیال زمانہ ہے جو اپنے ساتھ آدمی کے احساسات' خواب مسرت اور تمناؤں کو بہالے جاتا ہے۔

"بازار میں نیند" کے ڈرامے یا تو گھریلو زندگی اور سماجی کج روی کو پیش کرتے ہیں یا پھر لطیف احساس کو استعاراتی اور فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ شمیم حنفی نے کئی ایک مقام پر مجردات کی تجسیم (Personification) بھی کی ہے۔ کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ ڈراما دفعتاً ختم ہو گیا ہے' مگر یہ بھی زندگی اور تحریر کی تکمیلیت (Perfection) کا اشاریہ ہے۔ زندگی کے اگلے لمحے میں کیا ہوگا اور کہاں زندگی ختم ہو جائے گی' کسی کو معلوم نہیں اور یہی نامعلوم لمحے نامکمل زندگی کو مکمل کرتے ہیں۔ شمیم حنفی نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہے۔ اصلی اور حقیقی نہیں ہے۔ یہ تصور ہمیں تصوف کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ مظاہر کائنات پرتو ہے اصل ذات الہٰی کا۔ اس دنیا کی حقیقت ہی کیا ع ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔

اپنے ڈرامے کے اختتام کے سلسلے میں پیش لفظ میں شمیم حنفی نے وضاحت کی ہے:

" . اپنے ڈرامے کے اختتام یا انجام کو زبردستی اور خواہ مخواہ موڑنے توڑنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ جس طرح زندگی کا کوئی بھی سلسلہ اچانک کہیں رک جاتا ہے' اسی طرح یہ ڈرامے یونہی چلتے چلتے ٹھہر جاتے ہیں۔" (صفحہ ۸)

"بازار میں نیند" اردو ڈرامانگاری میں ایک خوبصورت اور لائق تحسین اضافہ ہے۔ شمیم حنفی نے کافی ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ اردو میں اسٹیج ڈراموں کی کمی آج بھی محسوس کی جارہی ہے۔ اگر وہ چند اسٹیج ڈرامے بھی لکھ چھوڑتے تو یہ ایک بڑا مستحسن اقدام ہوتا۔ شمیم حنفی کی سوچ پر فلسفۂ حیات کا رنگ ہمیشہ غالب رہا ہے۔ یہ فلسفۂ زندگی "بازار میں نیند" کے صفحات پر کہیں کہیں جگنو کی طرح چمک جاتا ہے۔ خواب پرست لڑکی "سامیہ" کا کردار ہو یا ڈرلا چورا کا کردار عارف' ان میں فلسفۂ زندگی کے عناصر موجود ہیں۔ کتاب دیدہ زیب چھپی ہے جو مکتبہ جامعہ کا خاصہ ہے۔

خدا کے منتخب بندے

مصنف: اطہر رضوی
تبصرہ نگار: پروفیسر حیدر عباس رضوی
قیمت: ۱۰۰ روپے (۱۰ ڈالر)
ناشر: فکشن ہاؤس ۱۸ ارنگ روڈ' لاہور

اطہر رضوی کی تصنیف "خدا کے منتخب بندے" یہودیوں کے نسلی تفاخر' اقتدار کے بیجا مظاہرے اور حریف فلسطینی عوام یعنی عرب مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ کی منصوبہ بند تباہی اور بربادی کے جائزے پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں اصل موضوع کے ساتھ اطہر رضوی نے دنیا کی عظیم جنگوں اور عالمی تاریخ کے قتل عام کے اعداد و شمار بھی درج کیے ہیں پہلی جنگ عظیم' دوسری عالمی جنگ' سوئیٹ گولاگ' انقلاب چین' انقلاب روس' انڈونیشیا' بروونڈی' براونڈا' کمپوچیا' یوگینڈا' گنی' ویت نام' الجیریا' سوڈان' نیمبیا' ایتھوپیا' چلی' نائجیریا' عراق' برازیل اور بوسنیا کے اعداد و شمار محسوب ہیں۔

اطہر رضوی نے متعدد واقعات کے ذریعہ امریکی صحافت' الیکٹرانک ذرائع ابلاغ' فلم' تھیٹر' بینک' تجارتی اداروں اور سائنسی اور علمی معاملات میں یہودی دانشور طبقہ کی سرگرمیوں نیز امریکی معاشرت و معاشرہ پر ان کی غیر معمولی گرفت کی ایسی سچی تصویر کشی کی ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔

۱۱۲ صفحات پر محیط اس کتاب کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ یہ غالباً اردو میں پہلی کتاب ہے جس کے ذریعہ فلسطین کے پیچیدہ تر مسئلہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ تاریخ کے وسیع تناظر میں

پوری قوت وطاقت کے ساتھ متعارف کرلیا ہے۔ اطہر رضوی نے معلومات کے سمندر کو ایک کتاب کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس کتاب کے اعداد و شمار متاثر کن ہیں۔ اگر کچھ حوالے اقوام متحدہ کمیشن برائے حقوق انسانی اور عالمی ریڈ کراس سوسائٹی وغیرہ کی رپورٹ سے بھی شامل ہوتے تو اس کا پایہ دستاویز کا ہوتا۔

کتاب کا موضوع بہت وسیع وہمہ گیر ہے۔ مصنف نے یہودی لابی کے اثرات اور یہودی دہشت گردی کی شدید مخالفانہ کارروائی کے اندیشوں کے باوجود انتہائی جرأت وبیباکی کے ساتھ اردو میں ایک نیا باب تصنیف کھول دیا ہے۔ بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ ہمارے صاحبان قلم اسے ایک روشن روایت میں تبدیل کرنے پر توجہ فرمائیں گے۔ مصنف کے قلم کی بیباکی اور جرأت اظہار ہمارے اعتراف واستحسان کی مستحق ہے۔

دوسرے دن کا سورج
(شعری مجموعہ)

شاعر: اندر موہن کیف
مبصر: پروفیسر عبدالقوی دسنوی
قیمت: ۷۵ روپے
ناشر: اندر موہن کیف ۸/۹۶ سول لائن، جھانسی

اندر موہن کیف کا شعری مجموعہ "دوسرے دن کا سورج" فروری ۱۹۹۸ء میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنو کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔ کتاب ظاہری حسن اور کتابت وطباعت کی تمام ترخوبیوں سے آراستہ ہے۔ میں نے اس شعری مجموعہ کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مجھے مصنف کی شعری صلاحیت اور زبان وبیان کی خوبیوں نے متاثر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کتاب مذکور معنوی اور شعری اعتبار سے اہل علم ونظر کی توجہ کی مستحق ہے۔ ان کا انداز فکر ایک اچھے اور انسان دوست سے ملتا ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے، انداز اور لہجہ دل کو چھونے اور متاثر کرنے والا ہے پہلے تمام غزلیں پڑھ گیا اور چپکے چپکے داد دیتا رہا۔ کبھی کبھی بے اختیار زبان سے واہ واہ کی آواز نکل آتی۔ مندرجہ ذیل اشعار نے مجھے کبھی روکا، کبھی ٹوکا اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔

کس کو ہم سفر سمجھیں جو بھی ساتھ چلتے ہیں
آشنا سے لگتے ہیں اجنبی نکلتے ہیں

اپنی دھرتی کی خوشبو سے تن من میں ہریالی ہے
انسانوں کو بانٹ نہ پائے دھرتی کے بٹوارے بھی

زندگی نام ہے روانی کا
جاتے جاتے یہ کہہ گیا پانی

ہم سفر تو تھا مگر غم آشنا وہ بھی نہ تھا
فاصلہ رکھ کر چلے تھے میرا سایہ اور میں

پھر درد دل پہ کسی یاد نے دستک دی ہے
پھر بہا کر مجھے لے جائے گا دریا کوئی

کتنے ہی جھونپڑوں پہ زمیں تنگ ہو گئی　　جھگڑا تو چند اونچے مکانوں کے بیچ تھا

جہاں تک نظموں کا تعلق ہے ان میں بھی ان کا رنگ 'شاعری کا مزاج اور تخلیق کار کی پہچان الگ دکھائی پڑتی ہے۔ ہر نظم اپنی بات اپنے ڈھنگ سے کہتی ہے اور قاری پر اپنا خاص اثر چھوڑتی ہے۔ کہیں کہیں ایسی بے ساختگی اور روانی ہے کہ پڑھنے والا بے قابو ہو کر اس بہاؤ کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں پہلی نظم ہے "آؤ تتلیاں پکڑیں" اسے پڑھا تو بچپن کے ایام میں کھوتا چلا گیا۔ ان اشعار نے تو ایک خاص کیفیت پیدا کر دی:

یہ تتلیاں
یہ پیاری پیاری تتلیاں
یہ اڑتی پھرتی تتلیاں
ادھر گئیں' ادھر گئیں
کہاں گئیں 'کدھر گئیں
اگر ٹھہر گئیں
تو منظروں میں حسن بھر گئیں
اڑیں تو پھر
فضا میں رنگ رنگ سا بکھر گئیں

اور جب "آسمان خالی ہے" پر پہنچا تو یہ نظم بھی سہل رواں اور فکر انگیز محسوس ہوئی۔ نظم کے اختتام پر پہنچتے پہنچتے انسانی عظمت کی طرف کس خوبصورتی کے ساتھ اشارہ کیا ہے:

اے زمیں کے اُجیارو　　روشنی کے مینارو
سب زمیں ہماری ہے　　کل جہاں ہمارا ہے
ہم نے اپنی محنت سے　　بازوؤں کی قوت سے
یہ زمیں اجالی ہے　　یہ جہاں سنوارا ہے۔
اور زمیں کے آنچل میں　　صنعتیں سجائی ہیں
چمنیاں اٹھائی ہیں　　وقت اور دوری کے
مرحلے مٹائے ہیں　　ہو نکتی مشینوں کے

آسماں ہمارا ہے　　کل جہاں ہمارا ہے
دوریاں کہاں ہیں اب　　آسماں کو چاہے جب

ہاتھ اٹھائیں اور چھو لیں	آسماں میں کیا ہے ؟
آسماں تو خود ہی	نور کا سوالی ہے
آسمان خالی ہے	آسمان خالی ہے

ان کے علاوہ اور بھی دوسری نظمیں مجھے اچھی لگیں۔ انھیں پڑھنے میں نیا لطف آیا' نئی کیفیت پیدا ہوئی' زندگی کی نئی سمتوں پر غور کرنے کا موقع ملا۔

اندر موہن کیف کے کلام میں ایک خوبی یہ بھی نظر آئی ہے کہ ان کی شاعری میں ہندی الفاظ اس برجستگی اور اعتماد کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ نہ صرف اجنبی محسوس نہیں ہوتے بلکہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ لطف پیدا کرتے ہیں۔

میری طرف سے اس مجموعہ کلام کی اشاعت نئے ادب اور نئی شاعری کی سمت اشارہ کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کیف شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور نئے مجموعہ کلام کی تیاری میں مصروف ہو جائیں گے اور اس طرح ادب اور انسانیت کی خدمت کا سلسلہ تادیر قائم رکھیں گے۔

دوسری مخلوق

مصنف: محمود ایوبی
مبصر: علی امام نقوی
قیمت: ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' جامعہ نگر' نئی دہلی ۲۵

محمود ایوبی کے افسانوی مجموعہ "دوسری مخلوق" کے مطالعہ کے دوران رہ رہ کر مجھے محافظ حیدر یاد آتے رہے' جن کے افسانوں کا مجموعہ "کاغذ کی دیوار" ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ افسوس کہ تاحال ان کے آموختہ پر ایک آدھ تبصرہ کے علاوہ کسی ناقد کی نظر نہیں پڑی ہے۔ ذہن جدید کے پچیسویں شمارہ میں جید ناقد فضیل جعفری نے جیلانی بانو کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے دہلی میں منعقد ہونے والے سمینار ورکشاپ کا ذکر کرتے ہوئے تمہیداً تحریر کیا ہے کہ "جن فنکاروں کو ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۵ء والے مذاکرات میں موضوع بحث بنایا گیا ان کے علاوہ بھی اردو میں افسانہ نگاروں کا ایک طاقتور گروہ موجود تھا اور آج بھی ہے۔ جہاں تک رام لعل اور جوگندر پال کا تعلق ہے وہ ترقی پسند افسانہ نگاروں اور ان کے بعد آنے والوں کے درمیان رابطے کی اہم اور تاریخی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ جن افسانہ نگاروں کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں ان میں رتن سنگھ' جیلانی بانو' اقبال مجید' اقبال متین' غیاث احمد گدی' انور عظیم' عابد سہیل اور عوض سعید وغیرہ شامل ہیں۔ محافظ حیدر بھی ان کے ہم عصر اور تقریباً ہم عمر ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنا پہلا مجموعہ اتنی تاخیر سے شائع کیا کہ اردو افسانہ کی پسنجر گاڑی بھی بہت آگے نکل چکی تھی۔ فضیل جعفری مزید تحریر فرماتے ہیں "ہم نے ابھی ابھی جن افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں نہ تو کسی مذاکرے کی ضرورت سمجھی گئی اور نہ ہی

ورکشاپ کی۔ مگر یہ بات بھی سچ ہے کہ سچے اور اچھے ادیب اپنی تخلیق کے بل بوتے پر ہی زندہ رہتے ہیں۔

محمود ایوبی کی کتاب کا عنوان تو جدید ترقی کا منہ بولتا ثبوت ہے لیکن انھوں نے اپنے افسانوں میں آدمی کے اندر چھپے ہوئے آدمیوں کی جس قدر شکلیں دیکھی ہیں۔ ان کے جن ناموں سے آپ اور ہم واقف ہیں ان ہی کو بیحد موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ موضوعات کے تقاضوں سے واقفیت کے باوجود اپنے افسانوں میں ذاتی مشاہدہ کا پُر اثر اظہار کرتے ہیں۔ ان کی نگاہیں جزیات کو گرفت میں لیتی ہیں اس لیے بھی کہ جزیات کا درجہ اہم ہوتا ہے کیونکہ وہ کل کا ہی تو حصہ ہوا کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں جزیات کی تفصیل اس لیے نہیں کھلتی کہ اس کے ساتھ واقعہ چلتا ہے۔ جہاں واقعہ کی رفتار سست ہونے لگتی ہے اسے محمود ایوبی کا بیانیہ مہمیز کرتا ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ اس وصف سے محمود ایوبی ناول میں بڑا اہم اور موثر کام لے سکتے ہیں۔

"دوسری مخلوق" میں شامل افسانوں کے موضوعات عصری مسائل سے منتخب کیے گئے ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر اقتدار کی شکست وریخت کرپشن اور انتظامیہ کی سرد مہری کا رویہ ہے۔ جن کے اثرات کتاب میں شامل تمام افسانوں میں بار بار چہرے اور نام بدل کر پڑھنے والے کے سامنے آتے رہتے ہیں اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ ان چہروں میں اس کا اپنا چہرہ کون سا ہے ؟ اگر جواب میں وہ خاموش ہے تو وہ کہیں ظلم اور ظالم کے ساتھ تو نہیں ہے؟ اور اگر وہ دبی دبی سی آواز ہی میں چیخ اٹھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ موجودہ سسٹم کا کل پرزہ نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا سکوت فائدہ مند ہے یا اس کی چیخ مفید ہے؟

اس کے جواب کی جستجو جمو جیٹ میں مسافرت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ نہ ہی تیز رو ٹرینوں کی احتیاج ہوگی کیونکہ وہاں تو ان کی اپنی اذیتیں خود ان کے وجود کے ساتھ محبوس ہیں اور ایک آدھ چیخ بلند بھی ہوتی ہے تو تیز رو گاڑیوں کے شور میں کھو جاتی ہے۔ ان چیخوں کو سننے پہچاننے کی خاطر تو اسے پسنجر گاڑی کے مسافروں کی رفاقت کی ضرورت پڑے گی۔ متغیر ہوتے وقت نے جن سے ان کی اپنی بیل گاڑی 'بیلوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں 'ان سے نکلتی ہوئی آوازیں چھین لی ہیں اور ان سے چھینا ہے زمین کا واسطہ 'دھرتی کا لمس کیونکہ سڑکوں کی تعمیروں سے فاصلے تو سمٹ ہی چکے مگر ترقی کے اس افادی پہلو میں کئی چیخیں چھپی ہوئی تھیں۔ پوشیدہ چیخوں میں سب سے اہم چیخ تو روایت کی ہے 'معصومیت کی ہے اور شرافت کی بھی ہے۔ محمود ایوبی کی دوسری مخلوق ان ہی اذیتوں سے ابھری چیخوں سے عبارت ہے۔ دوسری مخلوق ایڈ شاٹ ہیلی کیشنز نے اپنی روایت کے مطابق بیحد خوبصورت چھاپی ہے۔

سب خواب

شاعر: نصرت گوالیاری
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۱۰۰ روپے　　صفحات ۱۶۰
تقسیم کار: موڈرن پبلیشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ، نئی دہلی

"سب خواب" نصرت گوالیاری کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ کتاب کا عنوان شاید مجموعہ میں شامل اس غزل سے لیا گیا ہے جس کی زمین ہے "خواب تحریریں" "گلاب تحریریں" اور اسی غزل کو مجموعہ میں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انتساب والے صفحہ کے لیے جس شعر کا انتخاب کیا گیا ہے وہ اسی غزل کا ہے۔ مجموعہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نصرت گوالیاری ایک پختہ گو اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے خیالات میں ندرت ہے اور کیونکہ فنی گرفت مضبوط ہے اس لیے شعر کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ ہے زبان نہایت شگفتہ اور سادہ ہے ان کی شاعری میں ایک آبشار کی روانی محسوس ہوتی ہے جو آگے چل کر ایک سریلی ندی کی مانند بہتی چلی جاتی ہے۔ انھوں نے چھوٹی اور بڑی ہر طرح کی بحروں میں طبع آزمائی کی ہے۔ بعض اوقات تو اتنی مختصر بحر میں شعر کہے ہیں جس میں شعر کہنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ مثلاً ایک غزل کے یہ شعر دیکھیے

ناقص تحریں　چھوٹی تشہیریں
اجلے خوابوں کی　میلی تعبیریں

یہ ان کی فنی مہارت اور عرصہ دراز کے تجربوں کا ثبوت ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ نصرف گوالیاری اردو شاعری کے اس زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اب مفقود ہو چکا ہے یا جس کے نادر و نایاب نمونے اب خال خال نظر آتے ہیں۔ "سب خواب" سے منتخب چند اشعار حسب ذیل ہیں:

ختم کر دے یہ شب جہل سویرا کر دے　　میرا اک خواب تو سچا مرے مولا کر دے
اے خدا قبر کے مردوں سے نہیں میری مراد　　چلتے پھرتے ہیں جو مردے انھیں زندہ کر دے
لوگ جس زہر سے ہلاک ہوئے　　کتنا میٹھا تھا ذائقہ اس کا
آسماں کی ہیں گردشیں ساری　　پس رہی ہے زمیں بے چاری

پوری شاعری بے حد دلکش بلکہ دلخراش ہے جہاں نظر ڈالیے ایسے ہی شعر ملیں گے۔ خوش نما کتابت نے (کمپوزنگ نہیں) کتاب کے داخلی حسن کی طرح اس کے ظاہری حسن کو دوبالا کیا ہے۔ قیمت مناسب بلکہ کم ہے۔ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر شریف احمد، پروفیسر ظفر احمد نظامی، شارب ردولوی اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے آرا شامل ہیں۔ نصرف گوالیاری اس کی اشاعت پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دلت آواز

مترجم: یعقوب راہی
مبصر: یوسف ناظم
قیمت: ۲۲۰ روپے
ناشر: ایڈ شاٹ پبلی کیشن۔ ممبئی
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۶ ممبئی ۳

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ یعقوب راہی مصروف رہنے کے عادی ہیں لیکن اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ بری طرح مصروف رہنے اور ڈوب کر کام کرنے کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ اب ان کی تازہ کتاب "دلت آواز" چھپ کر سامنے آئی تو پتا چلا کہ یہ تو مشقت طلب اور مضر کاموں میں مستغرق اور منہمک رہنے میں تامل نہیں کرتے اور اس کے باوجود ہشاش بشاش رہنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کتاب کے بارے میں کچھ خامہ فرسائی کرنے سے پہلے موقعہ ملا ہے تو آج کیوں نہ خود ان کی شخصیت پر تھوڑی بہت روشنی بھی ڈال دوں اپنے مزاج کے اعتبار سے یعقوب راہی ٹریفک پولس کے چوکنے سپاہی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا ہی لفظ کا اطلاق صرف ان سپاہیوں پر نہیں ہوتا جو سڑک پر ٹریفک کو قابو میں رکھنے کا فرض انجام دیتے ہیں بلکہ ان افسروں پر بھی ہوتا ہے جو ٹریفک کو قابو میں رکھنے والے سپاہیوں کو قابو میں رکھتے ہیں سیاہ کا ہر مہرہ سپاہی ہی ہوتا ہے اس کا یونیفارم پہننا اور منہ میں سیٹی رکھنا ضروری نہیں ہے۔ یعقوب راہی بغیر سیٹی والے سپاہی ہیں) کسی بھی سمینار اور ادبی جلسے میں مقرر کی تیز رفتاری اور مقررہ حدوں سے آگے بڑھنے یا کسی دوسری سمت میں نکل جانے کی خواہش اور کوشش پر یعقوب راہی کا ایک جملہ معترضہ قدغن لگا دیتا ہے اور ایک مرتبہ وہ اپنا جملہ معترضہ نافذ کر دیں تو پھر اس کی پیش رفت میں کئی جملے وارد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے اس حسن سلوک میں انحراف تردید اور انتباہ کے عوام کارفرما ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ جتنے معترت رساں ہیں اتنے ہی ضرورت بخش ہیں۔ ایک مرتبہ کسی کو اپنا دوست کہہ دیتے ہیں تو پھر کچھ ہو جائے اپنا بیان بدلتے نہیں ہیں۔ دوستی کے معاملے میں وہ بہت "سافٹ ویئر" ہیں ان کے مزاج کے اسی جھکاؤ نے انھیں دلت ادب کے مطالعے پر راغب کیا اور وہ اس مطالعے میں اتنے ڈوبے کہ کامل ۶ سال تک یوں سمجھیے تہہ آب رہے لیکن اس انہماک استغراق مشقت اور اپنے آپ پر جبر کرنے کا نتیجہ میں سمجھتا ہوں ان کی اپنی توقع سے بھی زیادہ خوشگوار اور فرحت بخش برآمد ہوا وہ اس طرح کہ جب وہ خوب اچھی طرح ڈوب کر اوپر آئے تو کئی ناتراشیدہ موتیوں کا اچھا خاصا ذخیرہ اپنے ساتھ لیتے آئے یہی ذخیرہ دلت آواز کے عنوان سے کتابی صورت میں ہمارے سامنے

کتاب کے سرورق پر چند شکلیں ہی یعنی چند چہرے دکھ اور الم کی رہتی تصویریں ہیں۔ دلت آواز انہی تصویروں کی شعری داستان ہے۔ مکمل تفسیر یعقوب راہی نے بڑی جانفسانی کے ساتھ ۳۲ دلت شاعروں کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مراٹھی ادب سے اردو داں طبقہ سرے سے ناآشنا ہے لیکن مراٹھی میں اب دلت آواز کی گونج سب سے زیادہ اونچی ہے۔ یہ کتاب آپ کو ایک دکھ بھری فضا اور المناک ماحول میں لے جاتی اور تقریباً بے بس کر دیتی ہے۔ مسور کا لفظ میں نے اس لئے استعمال نہیں کیا کہ دلت شاعری آپ کو سلاتی نہیں جگاتی ہے اور جگہ جگہ دہلاتی بھی ہے۔ مراٹھی نظموں کے ترجے جستہ جستہ چھپتے اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں لیکن اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مشمولات آپ کو ایک رویے سے روشناس کراتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دلت آواز میں صرف محرومی اور یاس نہیں ولولہ بھی ہے۔ صرف احتجاج اور شکوہ نہیں اس میں حوصلہ بھی ہے۔

کتاب کا آغاز مترجم کے پیش لفظ "دلت آواز اور میں" سے ہوتا ہے اور اسے پڑھے بغیر اجنبی اور ان دیکھے راستے پر چل پڑنا ہے اس لیے پس منظر سے واقف ہونے اور پیش آنے والی صورت حال سے آگاہی حاصل کرنے کے ان کے لکھے ۳ صفحے ضرور پڑھ لیجیے۔ اس آغاز کے علاوہ ایک ابتدا بھی ہے جو کرج کی نظم نقاب کشائی کی صورت میں آپ کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے اور کہتی ہے مجھے بار بار پڑھو۔ یوں تو پوری نظم نقل کی جانی چاہیے لیکن صرف چند مصرعے بھی آپ کو اس کی روح کی جھلک دکھا سکتے ہیں۔

بابا صاحب

میں نے آج

آپ کے مجسمے کی نقاب کشائی کی..... ایک عجیب وغریب تجربہ تھا.... اس پل میں اپنے سنگ مرمر کے چبوترے سے...... نیچے اور نیچے گرتا چلا گیا... بلند چوٹی سے وادی میں تیز پھینکے گئے کسی پتھر کی طرح..... سیدھے پاتال تک......

جہاں لفظ "پستی" بے معنی ہو کر رہ گیا۔

اس نچلی سطح سے...... میں نے آپ کے مجسمے کی طرف دیکھا..... اس وقت مجسمہ تو دکھائی ہی نہیں دیا

دکھائی دے رہا تھا۔ محسوس ہو رہا تھا..... ایک وشال دہکتا روشنی کا گولہ...... سورج کے ہالے کی طرح!

یہی کرج اس کتاب کی شناخت ہے۔ اس آغاز اور اس ابتدا کے بعد بھی ایک شروعات ہے

اور وہ ہے۔

مراٹھی میں دلت ادب (ایک گفتگو) پروفیسر گنگا دھر پانتاونے اور بھاسکر نندن وار کے درمیان

اس آغاز ابتدا اور شروعات کے بعد اب کھلتا ہے در ترجمہ۔

ترجمے کے بارے میں میں اپنی رائے دینے سے احتراز کروں گا کیونکہ یہ واقعی ناقص ہو گی میں مراٹھی سے واقف نہیں ہوں اور جب تک اصل اور ترجمہ دونوں کی جان کاری نہ ہو رائے دینے والے پر لازم ہے کہ وہ اپنی جان کی فکر کرے۔ لیکن اس کتاب میں شامل ۳۲ ترجمے پڑھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ یقیناً صحیح ترجمے ہوں گے اس لیے کہ ترجمے میں بھی ایک نبض ہوتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے۔ ترجمے ہمارے وژن میں بصارت پیدا کرتے ہیں اور دلت آواز پڑھ کر یں کہہ سکتا ہوں کہ بڑی حد تک دلت ادب کی جانکاری حاصل کرلی۔

دلت آواز کی ساری نظمیں گوکہ الگ الگ رنگ کی ہیں لیکن اس رنگین دوپٹے کی طرح ہیں جو مختلف رنگوں میں رنگا جاتا ہے اور نظروں میں کھپ جاتا ہے اردو میں اسے دعوت نظارا کہا جاتا ہے۔ دیکھیے بالور اؤ باگل کہتے ہیں۔

عمر خیام / تمھاری شاعری پڑھ کر لگتا ہے / میں بھی عمر بن جاؤں۔ جوان ہو جاؤں / مگر میرا جنم تو اس دیش میں ہوا ہے / جہاں / کہاں کی بیاض اور کہاں کی صراحی / یہاں تو میں جنم جنم کا قیدی / جن لوگوں نے غلطی کی ہے / یہاں جنم لینے کی / انھیں اپنی غلطی سدھار لینی چاہیے گھمسان کی جنگ لڑ کر / یا پھر / دیش چھوڑ کر۔ (مجھے نوجوش کا وہ شعر یاد آگیا جس میں وہ قدرت سے فریاد کرتے ہیں تو اسے علام ملک میں کیوں پیدا کیا۔ لیکن اس نظم میں حوصلہ پوری طرح نمایاں ہے۔ دعوت رزم' خفیہ نہیں ہے۔

یعقوب راہی نے صرف ترجمے کا نام انجام نہیں دیا ہے۔ ہر شاعر کا خلاصہ بھی چاہے یہ تحقیقی کام ہے عمر' تعلیم' وطن' رہائش' پیشہ' پتا' اشارتاً ساری باتوں کا ذکر ہے اور اگر شاعروں کے نام اور تفصیلات نہ دی گئی ہوئیں تو اس کو ایک ہی شاعر کا کلام سمجھ لینے کی غلط فہمی صرف مجھے نہیں مراٹھی واں لوگوں کو بھی ہو جاتی کیونکہ رویہ ایک ہے۔

دلت آواز میں سر ملے بول نہیں ہیں، پھولوں کی مہک نہیں ہے۔ تخیل کی پرواز سے عاری یہ نظمیں شعریت سے بہت دور ہیں لیکن یہ اس ذہن و مزاج کی شاعری ہے جس پر کرب اور درد کا سایہ ہے۔

یہ آواز گلشن میں آمد فصل بہاراں کی یا درِ زنداں کے کھلنے کی خوش خبری کا اعلان نہیں

کر رہی ہے۔ یہ الگ ہی وضع کی شاعری ہے۔ شاعری کیا ہے آہ اور آنسوؤں میں گندھی ہوئی لڑیاں ہیں۔ دیکھیے سریکھا بھاگوت کی آواز جو ہاتھ کی لکیروں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں۔ یہ اگر ہاتھوں کی لکیروں ہی بولی ہوتیں / تو ان ہاتھوں نے / ساری دنیا بدل ڈالی ہوئی خون خرابے کے بغیر / لیکن / دے لکیرو / تم میں وہ طاقت کہاں / یہ صدی کون سی ہے بھلا / یہ علامہ کون سا ہے بھلا / کون سے آثار بدن پر سجا کر اٹھلا رہا ہے یہ دیش / کیوں نہ لگائی اتہاس کو لگام اس مستقبل نے / کیوں روکا جا سکا ماؤں بہنوں کی سیندوری کی سیندوری مانگوں کا اجاڑا جانا۔

ان دیکھتے ہوئے شعلوں کو ریشمی اور شبنمی ملبوس کیسے دیا جا سکتا تھا۔ آگ جب پھلتی ہے تو عروض اور بحروں کی پابند نہیں ہوتی۔ یعقوب راہی نے جو یقیناً اچھے مترجم ہوں گے۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کتاب کا نام "دولت آواز" رکھ کر انصاف کیا ورنہ وہ دولت شاعری کا نام بھی رکھ سکتے تھے۔ مترجم کی محنت کی داد دیسے اور ان کی نظر انتخاب کی بھی تعریف کیجیے تالیاں بجانے کی ضرورت نہیں کیونکہ تالیاں تو رسماً بجائی جاتی ہیں ان میں صرف آواز ہوتی ہے جذبہ نہیں ہوتا۔ یہ کتاب کسی مشاعرہ کا "گلدستہ" نہیں۔ اندھیری کوٹھریوں اور تہہ خانوں سے ابھرنے والی سسکیوں اور کراہوں کی بازگشت ہے۔ یہ ایک ان دیکھا رستہ ہے۔

اور ہاں کتاب کے ناشر اطہر عزیز کے لئے بھی تھوڑی سی داد محفوظ رکھیے۔ "یہ ایڈشاٹ" کے سربراہ میں اور پچھلے سال ان کے دل میں خیال آیا کہ اردو کتابوں کا پبلشر بننا چاہیے۔ دعا کیجیے کہ صرف چار کتابیں چھاپ کر توبہ نہ کر لیں اس سے پہلے کہ سرکاری روش کے مطابق اس میں کوئی اضافہ ہو کتاب خرید لینی چاہیے۔

جنگِ آزادی کی بہادر عورتیں

مصنف: شبانہ
مبصر: پروفیسر صغرا مہدی
ناشر: جیلانی پبلیکیشن، کوچہ چیلان، دہلی ۲

گاندھی جی نے کہا تھا جب تک عورتیں جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیں گی ہم یہ جنگ نہیں جیت سکتے۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم اور ترقی کو ملک کی ترقی کے لیے ضروری قرار دیا اور تاریخ گواہ ہے کہ ہندستان کی عورتوں نے کس طرح جنگ آزادی میں حصہ لیا اور مختلف محاذوں پر کتنے اہم رول ادا کیے جیل وہ گئیں سینہ گرو کے جلوسوں میں شریک ہو کر لاٹھیاں انھوں نے کھائیں بدیسی چیزوں کا بائیکاٹ کیا۔ کھدر پہنی چرخا کاتا اور جنگ آزادی کے ان مجاہدوں کی بھرپور مدد کی جو عملی طور پر اس میدان میں کودے تھے ان میں ہر مذہب و ملت اور ہر طبقے کی خواتین تھیں۔

آج جب سماج میں عورت کی حیثیت کو بلند کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں اس کی بہت ضرورت ہے کہ ان عورتوں کے بارے میں لوگوں کو بتایا جائے خاص طور سے بچوں کو شبانہ ایک استاد ہیں بچوں کے لیے وہ برابر مختلف رسائل میں لکھتی رہتیں۔ ریڈیو پر بھی انھوں نے تقریریں نشر کی ہیں "جنگ آزادی" کی بہادر عورتیں ان کی تازہ تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے ان خواتین کی زندگی کے حالات اور کارنامے مختصر طور پر بیان کیے ہیں جنھوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ اس میں رانی لکشمی بائی بھی ہیں اور حضرت محل بھی کملا نہرو بھی ہیں اور سروجنی نائیڈو بھی اینی بسنٹ بھی ہیں اندرا گاندھی اور ارونا آصف علی بھی ہیں۔

ان مضامین کو لکھتے وقت اس کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ بچے ان کو دلچسپی سے پڑھیں۔ زبان آسان ہے انداز اینی بسنٹ کے بارے میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ پڑھنے والوں کے دل میں یہ بات پوری طرح اتر جائے کہ اگر انگریز بحیثیت قوم کے ہندستان کو غلام بنانے کے حق میں تھے تو ان سب میں اینی بیسنٹ جیسے لوگ بھی تھے جو اس کے خلاف تھے اور اس کی آزادی دلانے کے لیے کوشاں تھے۔

سروجنی نائیڈو کی بڑی شگفتہ تصویر ابھرتی ہے اور کملا نہرو کی بھی بقول شبانہ وہ ایک قوم پرست خاتون اچھی بیوی اور جنگ آزادی کی عظیم خاتون تھیں۔

بی اماں کا ذکر اس میں نہیں ہے اس کی کمی محسوس ہوتی ہے اور اندرا گاندھی کے ذکر میں قدر تفصیل ہوتی تو اچھا تھا جنگ آزادی کی پہلی لڑائی سے آخر تک جنگ آزادی میں حصہ لینے والی خاتون کا تعارف کرانے میں شبانہ کامیاب ہوئی ہیں اور ان کی یہ کوشش یقیناً قابل تحسین ہے۔

کھلے خطوط

جنوری کے کتاب نما میں عاصم شہنواز شبلی کا اداریہ 'ادبی رسائل کو درپیش دشواریوں کو بہت صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرتا ہے۔ چونکہ وہ خود بھی ایک ادبی سہ ماہی رسالے "اثبات و نفی" کے مدیر ہیں۔ اس لیے صورتحال کا کم و بیش درست جائزہ پیش کرنے میں وہ کامیاب رہے ہیں۔ خاص طور سے اشتہارات کی فراہمی کا مسئلہ ادبی رسائل کے لیے بہت گمبھیر مسئلہ بن گیا ہے۔ تاہم میں ان کے اس نظریے سے متفق نہیں ہوں کہ تخلیق کار اپنی تخلیقات سے ادبی رسائل کو مزین بھی کرے اور جب وہ چھپ جائے تو اس کی خریداری بھی کرے۔ ایک رسالہ نکالنے میں آپ کاغذ اور سیاہی سے لے کر پوسٹیج تک پر پیسے خرچ کرتے ہیں لیکن تخلیقات نہ صرف بغیر معاوضے کے حاصل کرتے ہیں بلکہ قلم کار سے یہ توقع بھی کرتے ہیں کہ وہ رسالہ خرید کر پڑھے۔ دوسری طرف جو صاحب ذوق حضرات ہیں (ادیب و شاعر) وہ اپنی پسند کے رسائل خریدتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی ہیں۔ البتہ یہ بات میں یونیورسٹی پروفیسروں کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔

جہاں تک ادبی رسائل کی بقا کا تعلق ہے تو جناب! اردو ہی نہیں ہندی اور انگریزی کے کتنے ہفتہ وار اور ماہنامے اب تک بند ہو چکے ہیں جن میں مشہور زمانہ ہفتہ وار السٹریٹڈ ویکلی بھی شامل ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اردو میں جتنے ماہوار' سہ ماہی اور شش ماہی ادبی رسائل ہندستان میں شائع ہو رہے ہیں۔ اتنے رسائل راشٹر بھاشا ہندی میں بھی نہیں شائع ہو رہے ہیں۔ کیا یہ بات قابل اطمینان نہیں کہ اردو کے درجنوں خالص ادبی رسائل جن میں اثبات و نفی بھی شامل ہے۔ اردو دنیا کو "بیدار بخت" بنائے ہوئے ہیں!!

ڈاکٹر سید حامد حسین ' قارئین کو لفظوں کی پہچان کروا کر ایک مفید کام انجام دے رہے ہیں۔ لیکن یہ کالی پیلی نیلی ہری غزلوں کا سلسلہ کب تک چلے گا؟ کیا اپنی پہچان کے لیے باقر مہدی کا زرخیز دماغ کوئی اور وسیلہ نہیں ڈھونڈھ سکتا۔ راج نرائن راج پر مجتبیٰ حسین کا خاکہ دلچسپ بھی ہے اور ان کی شخصیت کے صحیح خدوخال بھی اجاگر کرتا ہے۔ تھوڑی بہت شناسائی میری بھی راز صاحب سے تھی۔ ان کی اچانک موت سے مجھے بھی بہت رنج ہوا۔ خدا ان کی روح کو شانتی دے۔

نامی انصاری' ۹۹/۹۵ تالہ روڈ' چمن گنج کانپور

....

کتاب نما فروری کا شمارہ پیش نظر ہے۔ سبھی تخلیقات ادب بدلتے ادبی پس منظر کی عکاس ہیں احمد صغیر صدیقی نے فکاحیہ طرز پر غزل کے مزید رجحانات کو اپنا ہدف بنایا ہے

لیکن اس خیالی تصویر کا دوسرا رخ غائب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل کے اشعار خواہ کتنے ہی مبہم کیوں نہ ہوں کسی نہ کسی شخصی پہلو کے ترجمان ہوتے ہیں۔ آخر شاعر بھی اسی مادہ پرست جمہوری نظام زندگی کا حصہ ہے جس کی بنا انانیت اور نخوت پر ہے۔ صغیر صاحب کے پیش کردہ مندرجہ ذیل شعر مفہوم سے عاری نہیں کہے جاسکتے۔

وہ کب سے تخت پر بیٹھا ہوا تھا
اگرچہ سلطنت اس کی نہیں تھی

اس شعر میں 'وہ' کا مفہوم عوام اخذ کرلیا جائے تو خیال واضح ہوجاتا ہے۔

فضا میں دور تک پھیلی تھی اک خاکستری بو
فرشتوں کے سبھی پر جھڑ گئے تھے جھاڑنے میں

ہاتھ جھاڑنا محاورہ ہے اس کے مقابل پروں کا جھڑنا ایک اچھی اصطلاح ہوسکتی ہے۔ سیاست داں خود کو فرشتہ صفت ظاہر کریں مگر حقیقت ایک نہ ایک دن سامنے آہی جاتی ہے۔ نئی شاعری میں شاعر کی انا' تعیش پسند زندگی کی خواہش' سیاست ہی سر فہرست ہے۔ مضمون کے دیگر اشعار بھی جنسی اور مادی انتشار فکر کا نمونہ نہیں ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب کا اشاریہ خوب ہے۔ مجھے ان سے اتفاق ہے کہ اکیسویں صدی میں ملک کو لسانی نسلی' مذہبی اور ثقافتی شکست وریخت سے بچانے میں ملک کا قلم کار اہم رول ادا کرسکتا ہے۔ مومن خاں شوق کی غزل کے تمام اشعار پسند آئے۔

ڈاکٹر محمود شیخ' جبل پور (ایم۔پی)

مارچ کا کتاب نما موصول ہوا۔ یوں تو تمام مشمولات جاذب نظر ہیں مگر "معرعہ اولی" اور "بے آسماں" پر مضامین بہت پسند آئے۔ محترمہ رفیعہ شبنم صاحب کے لفظ لفظ سے میں متفق ہوں۔ عبداللہ کمال کی "بے آسماں" غزلیں اپنی بیکراں پر افشانیوں میں متحیر کرکے رکھ دیتی ہیں کبھی کبھی قاری کو اور یقینی طور پر کمال کو کسی اکرام یا بجنوری کی ضرورت نہیں۔ ان کی غزل اپنے آپ کو خود ہی منوالیتی ہے۔ جناب خواجہ حسن نظامی پر مسعود برکاتی کا مضمون سیر حاصل ہے۔ جناب نصرت ظہیر اور مجتبیٰ حسین صاحب حسب معمول' چاق وچوبند اور بشاش ملے۔ دیر تک ان کے مضامین کا لطف لیتی رہی۔ مراٹھی کہانی کا ترجمہ بھی اچھا ہے۔ لیکن اس بار شعری حصہ مختصر بھی ہے اور ناتشفی بخش بھی۔ رسالہ شاعر کے ہمعصر نمبر پر تبصرہ اچھا ہے۔ شاعر کا یہ خاص نمبر واقعی جدید تر ادب کا اشارتی نمائندہ ہے۔ مگر پتا نہیں کیسے میرے ساتھ بڑی زیادتی ہوگئی ان سے۔ دیکھیے نا قلم کاروں کی سوانحی لغت میں ایم۔اے کی سند عطا فرمادی ہے انھوں نے' اور میرے والد کا "نام کرن" کرکے انھیں عنایت الرحمٰن سے عنایت اللہ خاں بنادیا گیا۔ ارے میری تو سات پشتوں میں کسی کو "خان" ہونے کا فخر نصیب نہیں ہوا۔ اور میں جس سے کبھی کسی اسکول اور مدرسے کی صورت تک نہیں دیکھی ایم۔اے کیسے ہوگئی۔ اور تو اور میری تصویر جو میں نے انھیں

بھیجی تھی کہ میری پرانی تصویر کی جگہ جو ہمیشہ وہ میری غزل کے ساتھ چھاپ دیتے ہیں۔ جواب میری صورت سے بالکل نہیں ملتی اسے چھاپا کریں۔ وہ تصویر انھوں نے محترمہ بلقیس قاطمی کے نام کے ساتھ چھاپ دی ہے۔ میں نے انھیں تو خط لکھ ہی دیا ہے۔ اب آپ کو یہ سب اس لیے لکھ رہی ہوں کہ اگر کتاب نما میں یہ بات آجائے تو شاید اس غلطی کی ممکن تصحیح ہو جائے۔ کم از کم میری طرف سے۔

بلقیس ظفیر الحسن سیکٹر ۱۵ اروہنی دہلی ۸۵

....

"غالب مست مولا" کیا عمدہ طنزیہ تحریر ہے جناب مجتبیٰ حسین صاحب کے اس مضمون میں ایک شعر

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

مجتبیٰ حسین صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "ہماری دانست کے مطابق یہ شعر غالب کا نہیں ہے۔ ..."

شرح دیوان غالب از پروفیسر یوسف سلیم چشتی جدید اڈیشن ۱۹۹۲ء (اعتقاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی) صفحہ ۸۱۵ پر پروفیسر صاحب نے تحریر فرمایا ہے "میری رائے میں یہ شعر بیت الغزل ہے بلکہ غالب کے بہترین اشعار میں سے ہے اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔" آپ کے موقر رسالہ کے ذریعہ میری درخواست ہے کہ کوئی محقق میری یہ خلش دور کردے کہ اگر یہ شعر غالب کا نہیں ہے تو کس کا ہے؟ اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے ایسے محقق اور ذمہ دار شخص کو یہ شعر کہاں سے ملا؟ اور یہ شعر غالب کے جانب کب اور کیسے منسوب ہو گیا؟ اسی سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہو جاتا تو بہت اچھا تھا۔

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

یہ شعر کس کا ہے اگر غالب کا نہیں ہے تو ان کی جانب کیسے منسوب ہو گیا۔ مذکورہ شعر پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی شرح میں نہیں ہے۔

محمد جلال الدین عبدالمتین، فرنگی محل، لکھنو

....

کتاب نما فروری ۱۹۹۹ء مل گیا تھا۔ اردو کے ریسرچ اسکالرز کے لیے یہ بہت ہی مفید ہے اور اہم بھی، نظمیں بھی بہت ہی پیاری ہیں لتا منگیشکر بہت اچھی لگی اور اگر سچ پوچھیں تو لتا کے گانوں کے ذریعہ بھی اردو کو بہت فروغ ملا ہے۔

عبدالسمیع ۱۸۵ بہار قلعہ، حیدر آباد

تازہ شمارہ فروری ۱۹۹۹ء دلچسپ اور شگفتہ مشمولات، احمد صغیر صدیقی کا غزل کے مزید جدید رجحانات اور نصرت ظہیر کا ایک یاد گار استقبالیہ ادبی طنزیات کی یادگار مثالیں ہیں واقعی لوٹ پوٹ ہو گیا۔ مجتبیٰ حسین کا "غالب مست مولا شاعر" ہم ہندستانیوں کے لیے سبق آموز ہے۔ اس مضمون کا ہندی انگریزی ترجمہ بھی ہونا چاہیے تاکہ غیر اردو داں حضرات اپنی اصلاح کر سکیں۔ اس شمارے میں جناب پروفیسر وہاب اشرفی کا مضمون "جابر

حسین کی افسانہ نگاری" بھی خوب ہے۔ اتنے اچھے مضمون پر بعض لوگوں کو تعجب ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ادب میں مشہور و معروف لوگوں پر ہی مشہور و معروف لوگ رقم طراز ہوا کرتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ بڑی حقیقت جیتے ہوئے بڑا افسانہ لکھتے ہیں مگر کم کم چھپتے ہیں انھیں بڑے لوگ بڑا مان کے نہیں دیتے۔ ان کی بہ نسبت جو لوگ کہ صرف افسانہ جیتے ہیں اور افسانہ ہی لکھ پاتے ہیں مگر یہاں وہاں خوب چھپتے ہیں افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی کافی شہرت ہو جایا کرتی ہے۔ اور ادب کا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بعض واقعی بڑے لوگ (بڑی تخلیق والے) اپنی بے نیازی یا عملی (صرف زبانی یا قلمی نہیں) مصروفیات کے سبب دست ادب سے ہاتھ آئے ہوئے جواہر کی طرح نکل جاتے ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی لائق صد مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اردو افسانہ کے لیے جابر حسین صاحب کے افسانوی جواہر پارے تلاش کیے اور انھیں اپنا حوالہ بھی عطا فرمایا۔

جابر صاحب کی شخصیت جہاں تک میں جانتا ہوں عام ادیب یا صرف شاعر یا محض افسانہ نگار کی نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتی ہے۔ ملک گیر نظام و سیاست میں سیاہ طاقتوں کے خلاف انھوں نے کئی کامیاب اور نہایت اہم مجاہدے کیے ہیں اور زمینی سطح سے انسانیت کے درد و الم کو چن چن کر گلے لگایا ہے۔ "سن لے کاتب" سے قبل ان کی کئی اہم کتابیں آئی ہیں۔ "بہار کی پسماندہ مسلم آبادی" نامی کتاب زبوں حالی مسلم آبادیوں کی اگرچہ تحقیق ہے جسے غالباً منڈل کمیشن میں ترمیم و اضافہ کی غرض سے تیار کیا گیا۔ مگر ان تحقیقات کی حقیقتیں فطرتاً ایسی مسجع ہیں کہ ان پر افسانوں کے خوبصورت دلدوز اور دلگیر شہروں کی سیر کا گمان ہوتا ہے۔ سن لے کاتب کے تجزیے میں پروفیسر موصوف نے ایک جگہ دلت لٹریچر کا ذکر کیا ہے اور مراٹھی نظم کا انگریزی ترجمہ بھی بطور حوالہ نقل کیا ہے۔ ابتدائے مضمون میں پریم چند کی نسبت بھی ظاہر کی ہے اور پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی کے حوالے سے لفظ Unusual کی جہتیں بھی آشکار کی ہیں۔ یہ تمام جزیات قارئین کرام کے لیے بطور خاص لائق توجہ ہیں کہ کہیں "بہار کی پسماندہ مسلم آبادی" سے لیکر "سن لے کاتب" تک میں دلت اردو افسانہ کی بہترین مثالیں تو پوشیدہ نہیں؟

عبدالمبین صدیقی، دربھنگہ

ادبی تہذیبی خبریں

اترپردیش اردو اکاڈمی کے انعام یافتگان برائے ۱۹۹۸ء

پروفیسر شمیم حنفی اور شارب ردولوی بھی شامل

(ایک لاکھ گیارہ ہزار روپے)

۱۔ پروفیسر شمیم حنفی دہلی کو ۵۵ ہزار پانچ سو روپے

۲۔ پروفیسر شارب ردولوی دہلی کو ۵۵ ہزار پانچ سو روپے

مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں تین انعام

۱۔ جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ مرحوم (پس از مرگ) ۳۴ ہزار روپے ۲۔ پروفیسر وارث کرمانی (بارہ بنکی) ۳۴ ہزار روپے

۳۔ جناب رئیس انصاری لکھنؤ کو ۳۴ ہزار روپے

دو خصوصی انعامات دس دس ہزار روپے کے

۱۔ مسٹر راجیندر بہادر موج (فرخ آباد) کو دس ہزار روپے

۲۔ مسٹر رباب رشیدی (شاہجہانپور) کو دس ہزار روپے

مولانا عبد الوحید صدیقی انعام برائے صحافت

۱۔ جناب فوق کریمی۔ علی گڑھ کو دس ہزار روپے۔

پانچ پانچ ہزار روپے کے دو انعامات

۱۔ اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی۔ دہلی۔

۲۔ نگارشات زمانی۔ ڈاکٹر آصف زمانی لکھنؤ۔

تین تین ہزار روپے کے چار انعامات

۱۔ ایران نامہ۔ سید فضل الرحمٰن۔ علی گڑھ

۲۔ جدید مرثیے کے بانی میر ضمیر۔ علی جواد زیدی، لکھنؤ

۳۔ جینے والے۔ عابد سہیل، لکھنؤ

۴۔ جل چنبیلی باغ میں۔ مظفر حنفی، دہلی۔

دو دو ہزار روپے کے ۱۷ انعامات

۱۔ اردو افسانہ کا پس منظر مغرب و مشرق کے حوالے سے۔ فیاض رفعت، لکھنؤ

۲۔ اقبال صحت زبان۔ اکبر حیدری کاشمیری، لکھنؤ

۳۔ اردو میں جدید شعری روایت تسلسل اور انحراف۔ ڈاکٹر شاہینہ تبسم۔ دہلی ۴۔ آج ہوا روشن ہے۔ شیخ عبد الحمید سیتاپور ۵۔ حاصل کلام۔ عمر انصاری لکھنؤ ۶۔ سر سید کا اصلاحی مشن۔ توقیر عالم علی گڑھ ۷۔ سید ظہیر حیات و خدمات۔ زیب النساء الہ آباد ۸۔ عصری افسانہ کا فن۔ مہدی جعفر بھوپال ۹۔ عبد الماجد دریابادی سلیم قدوائی دہلی ۱۰۔ عربی ثقافت کے سماجی پہلو۔ محمد حیات نصرت سندیلہ، ہردوئی ۱۱۔ فکر و فن اور فکشن۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر ممبئی ۱۲۔ مطلع انوار بیبا صغیر علی گڑھ ۱۳۔ مفتی میر محمد عباس لکھنوی۔ ابو ذر غفاری بھاگل پور ۱۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ضیاء الدین اصلاحی اعظم گڑھ ۱۵۔ ویدک ادب ایک مطالعہ۔ چمن جیت لال سہگل جموں توی ۱۶۔ دادی طولی۔ سہیل احمد زیدی الہ آباد ۱۷۔ واپسی۔ انجم الاسلام رانی گنج۔

ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے کے ۲۰ انعامات

۱۔ اردو تذکرہ نگاری ۱۸۳۵ء کے بعد، ڈاکٹر نیر سلطانپوری سلطان پور ۲۔ اندر اور دوسرے افسانے م۔ ع غم شاہ جہاں پور ۳۔ انڈا کیسے پھوٹا۔ محسن خاں لکھنؤ ۴۔ پنڈت آنند نرائن ملا حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر عبد الرشید ظہیری گورکھپور ۵۔ پانچ اسٹیج ڈرامے۔ انیس اعظمی دہلی ۶۔ جنرل بخت خاں۔ محمود علی دہلی

۷ـ جوش ملیح آبادی بحیثیت نثر نگار۔ ڈاکٹر جعفر عسکر لکھنؤ ۸ـ دھنک۔ اختر شاہ جہاں پوری دہلی ۹ـ دوسری مخلوق۔ محمد اقبال ممبئی ۱۰ـ دید حرم۔ عاطر شبلی کلکتہ ۱۱ـ سراج الحسن سراج لکھنوی حیات اور ادبی خدمات ۱۲ـ ڈاکٹر زاہد نعیم خاں بہرائچ ۱۳ـ سحر آہنگ۔ سحر شاہ جہاں پوری شاہجہانپور ۱۴ـ سوکھے گلاب۔ صولت زہرہ دہلی ۱۵ـ شکم آشنا۔ اکبر مسعود لکھنؤ ۱۶ـ فروزاں۔ خواجہ محمد یونس لکھنؤ ۱۷ـ مجروح سلطان پوری فن اور شخصیت فخر الدین خاں قمر۔ گونڈہ ۱۸ـ احتجاج عقیدت تاج الدین اشعر مدارسی ۱۹ـ لینن کا کرب خورشید ملک شاہجہاں پور ۲۰ـ نشور واحدی شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر محمد ارشد خاں اعظم گڑھ ۲۰ـ برنگ زمین۔ ترنم ریاض دہلی۔

ایک ایک ہزار روپے کے ۲۰ انعامات

انمول کہانیاں احتشام الدین صدیقی بجنوری پور آغاز علام گوروچدر سنگھ کوہلی دہلی الاستفتاح محسن ذکر اہل اصلاح معین الدین حیدر علوی کاکوروی لکھنؤ تقدیر غزل اقبال بھارتی مراد آباد' پر تو' حیدر حسین فضا لکھنؤ جستجو منصور حنفی مراد آباد' درد کی آنچ ثریا رحمن دہلی' دسترس نصیر بلالی کانپور' رنگ رنگ مطرب نظامی لکھنؤ' سرخ ریگ ڈاکٹر حسین لکھنؤ شہر میرا ور ناصر کاظمی وقار ناصری لکھنؤ' صبح مدینہ اختر عزیز الہ آبادی' صدائے دل خالد بے پوری بے پور نثری جہان جہاں بانو ڈاکٹر یوسف تقی کلکتہ' ماضی کے دریچے سے شوکت اللہ خاں دہلی لفظوں کے پرندے' ظفر صہبائی بھوپال' علی گڑھ سے دیو بند تک اکبر رحمانی (جل گاؤں) جل گاؤں نوائے غم صابر ابوہری ہریانہ ہندی اردو کوش ڈاکٹر رضوان احمد الہ آباد چنگ شورش صدیقی لکھنؤ

انعام برائے ناشر

ابر شارث پبلی کیشنز لکھنؤ ایک ہزار روپے

انعام برائے کتابت

محترمہ نسرین جہاں لکھنؤ پانچ سو روپے۔

شعبۂ تعلیم' جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دہلی ـ "علم صرف اداروں میں ہی حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ علم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کے مل جل کے بھی سیکھا جاتا ہے۔ آج اسی کی کمی محسوس ہوتی ہے" یہ الفاظ ماس کمیونیکیشن ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر محترم پروفیسر حبیب قدوائی کے تھے۔ وہ انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان ایجوکیشن IASE کے سالانہ جلسے کو بطور مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔

محترم پروفیسر قدوائی نے مزید کہا کہ شعبۂ تعلیم جامعہ کے ان اداروں میں جن کا قیام جامعہ کے زمانے سے ہی ہے۔ آج جامعہ کی شناخت جن اداروں سے قائم ہے ان میں شعبۂ تعلیم کا اہم مقام ہے۔ جامعہ کی مشترکہ تہذیبی روایات کو قائم رکھنے میں شعبۂ تعلیم کا اہم رول رہا ہے۔ یہاں کی رنگا رنگ تہذیب کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر IASE کے صدر پروفیسر غلام دستگیر نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے ادارے میں طالب علموں کی شخصیت میں ہمہ جہت فروغ ہو۔ اسی سلسلے میں یہاں تعلیم کے علاوہ کھیل کود' این ایس ایس' پکنک' تعلیمی سفر وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پروفیسر دستگیر نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اب پورے ہندوستان میں بی۔ایڈ

کو دوسالہ کورس کیے جانے پر بحث چل رہی ہے امید کی جاتی ہے کہ اگلی صدی کے اوائل میں اس پر عمل شروع ہو جائے۔
پروگرام کی شروعات اسلم جمشید پوری نے تلاوت کلام پاک سے کی۔ پھر جامعہ کا ترانہ استاد سراج خاں اور ہمنواؤں نے پیش کیا۔ اس موقع پر ایک کلچرل پروگرام اور تقسیم انعامات کا سلسلہ بھی ہوا۔
محترمہ امت السلیم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

بزم ہمقلم کی ایک ادبی شام

نئی دہلی (۱۹ مارچ) بزم ہمقلم کی جانب سے افسانہ نگار ڈاکٹر نگار عظیم صاحبہ کے دولت کدے پر ایک ادبی شام کا انعقاد عمل میں آیا۔ محفل کی صدارت پروفیسر قمر رئیس نے اور نظامت اسلم جمشید پوری نے کی۔ مشہور افسانہ نگار جناب رتن سنگھ اور معروف شاعر جناب شبنم نقوی بطور مہمان شریک ہوئے۔
رتن سنگھ نے اپنا افسانہ "بیسویں صدی کا صدر بازار" اور اپنی طویل نظم "آپ بیتی" کے کئی حصے سنائے۔ شبنم نقوی نے سامعین کے اصرار پر کئی غزلیں سنائیں۔ ظہیر کوٹہ سے آئے ہوئے مہمان شاعر اقبال ظہیر کوٹوی نے بھی غزلیں سنائیں۔ صدر محفل محترم پروفیسر قمر رئیس نے اپنی نظمیں "موج و ماہی" "جشن مئی" "مسودہ" اور "نیم شب" سنائیں۔
شبنم نقوی کا یہ شعر کافی پسند کیا گیا
؎

باہر باہر خاموشی ہے لیکن اس خاموشی میں
اندر اندر شور مچا ہو یہ بھی تو ہو سکتا ہے

محفل میں پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، محترمہ نور زہرہ، جناب منصور آغا، جناب احمد محفوظ، محترمہ نجمہ خاں اور جناب عبد العظیم صدیقی بھی شریک تھے۔

آئی ایف اے

آئی ایف اے ایک آزاد قومی ادارہ ہے جس کا مقصد تخلیقیت اشتراک عمل اور تنقیدی صلاحیتوں کے فروغ میں اضافے کے لیے تعاون دینا ہے۔ یہ ادارہ اپنے فنی تحقیقاتی اور دستاویزی پروگرام کے تحت فن سے متعلق مختلف شعبوں میں تحقیق کی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیتا ہے نیز ایسی قدر و قیمت کے حامل ڈاکومینٹیشن کے لیے مالی امداد فراہم کرتا ہے اور فنی نمائش کشی اور مطبوعات پر ختم ہونے والی تحقیقاتی سرگرمی کے لیے بھی رقومات منظور کرتا ہے۔ ایسے تحقیقاتی منصوبے جو مختلف النوع فنی اصناف کا ایک ساتھ احاطہ کر سکیں، جو ملک میں رائج فنی مشاغل کی طرف ایک ناقدانہ بصیرت کو ترقی دے سکیں اور فنی معاشرے کو درپیش عملی مسائل کے حل میں معاون ہو سکیں۔ اس پروگرام کے تحت انہیں بھی امداد دینے پر غور کیا جا سکتا ہے۔
آئی ایف اے کے درخواست برائے تجاویز (انگریزی اور کچھ دیگر ہندوستانی زبانوں میں) مندرجہ ذیل کو عرضی بھیج کر منگوائی جا سکتی ہے۔

The Executive Director, India Foundation for the Arts, Tharangini, 12the Cross Raj Mahal Vilas Extension, Banglore-560080

Tel/ Fax 080-331-0583/331-0584
E-mail rlabang@blr vsnl net.in

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۹۹

سنت کبیر اور جوش ملیح آبادی پر دو روزہ سیمینار

نئی دہلی: انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام سنت کبیر اور جوش ملیح آبادی پر منعقدہ دو روزہ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے سابق وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال نے کہا کہ تعلیم یافتہ درمیانی طبقہ ہی ترقی پسند کا حامی رہا ہے۔ اور ہر طرح کی ناانصافیوں کے خلاف جدو جہد کی قیادت اسی طبقے کے ہاتھوں میں رہی ہے اب سوچ بدل گئی ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں دانشوروں کو نئے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا۔

افتتاحی اجلاس میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد' جناب مظفر حسین برنی' جناب سید اقبال حیدر' ڈاکٹر وشوناتھ ترپاٹھی' ڈاکٹر خلیق انجم' اقبال مرزا وغیرہ نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سمینار کے پہلے دن سنت کبیر مقالے پڑھے گئے اور دوسرے دن جوش ملیح آبادی پر دو اجلاس ہوئے۔ سمینار کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ سنت کبیر اور جوش ملیح آبادی اپنے اپنے عہد کی ایسی شخصیت تھے جنہوں نے اپنی فکر اور شاعری کے ذریعہ معاشرے میں انقلاب برپا کیا۔

محسن بھوپالی سیفیہ کالج میں۔

کسی تعلیمی درسگاہ کے شعبۂ اردو میں تعداد و معیار کے اعتبار سے اس قدر مطبوعات کا طبع ہونا اور اتنی بڑی تعداد میں مختلف موضوعات پر اہم کتابوں کا یکجا ہونا بڑی خوش آئین بات ہے میں نے یہ اہتمام پاکستان کے کسی کالج یا یونیورسٹی میں بھی نہیں دیکھا۔

مذکورہ خیالات کا اظہار ہندو پاک کے معروف شاعر و ادیب جناب محسن بھوپالی نے شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں منعقدہ ایک ادبی جلسہ میں کیا۔

انہوں نے شعبۂ اردو کے گوشہ غالب' و اقبال' و بھوپال آزاد اور لغات کو بھی سراہا۔ تقریر کے آغاز میں انہوں نے اپنے ادبی سفر' شعری رویے نیز صنف نظمانے اور ہائیکو پر بھی روشنی ڈالی اور طلبہ کی فرمائش پر چند نظمانے" ہائیکو ' قطعات اور غزلیات سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔

پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر محمد نعمان خاں صدر شعبہ اردو نے مہمان محترم کا تعارف کرایا۔

اس موقع پر جناب اقبال مسعود ' پروفیسر ذکی الرحمن خاں' پروفیسر عقیل احمد ندوی' پروفیسر ونے دوبے' پروفیسر مزمل انصاری' پروفیسر نفیس احمد' ڈاکٹر قدسیہ اختر اور اردو کے طلباء موجود تھے۔

یادِ فگار کل ہند سمینار اور مشاعرہ

طنز ومزاح کے مشہور اردو شاعر حضرت دلاور فگار کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کے وطن بدایوں (یوپی) میں دو روزہ کل ہند سمینار اور مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔

سمینار کا افتتاح ۵ مارچ ۱۹۹۹ء شام ساڑھے چھ بجے جناب مجتبیٰ حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا نظامت کے فرائض پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے ادا کیے۔ اس اجلاس کے شرکاء کا تعارف جناب عرفان صدیقی صاحب نے کرایا۔ سب سے پہلے فگار صاحب کی تصویر کی نقاب کشائی پروفیسر ایم اے علوی

نے کی۔ جناب فخر احمد شوبی (کنوینر یادِ نگار کمیٹی) نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ افتتاحی تقریر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے کی۔ اس کے علاوہ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر حنیف نقوی اور جناب عبداللہ ولی بخش قادری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب طالب خوندمیری نے نگار صاحب کے بارے میں ایک طویل نظم پڑھی۔ جناب مجتبیٰ حسین صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں دلاور نگار صاحب سے اپنے تعلقات اور ان سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات کا ذکر کیا۔

آخر میں یادِ نگار کمیٹی کے سرپرست جناب ذکی تاناگانوی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعہ پر الیاس رشید' ابرار احمد' چندر پرکاش وکشت' شہزاد بدایونی' اسحاق طبیب اور وریندر پرشاد سکینہ نے مہمانوں کی گل پوشی کی۔ اس کے بعد دلاور نگار کو کلام پڑھتے ہوئے ویڈیو کے ذریعہ دکھایا گیا۔ رات ۹ بجے افتتاحی اجلاس کا اختتام ہوا۔

۱۴ مارچ کو صبح ساڑھے دس بجے دلاور نگار فن اور شخصیت پر سیمینار کی ابتدا ہوئی جس کی صدارت جناب پروفیسر ظہیر احمد صدیقی' پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور قاضی الیاس رشید نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر وقار الحسن' حمایت اللہ نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اسعد بدایونی نے ادا کیے۔ جناب مجتبیٰ حسین' پروفیسر حنیف نقوی' وریندر پرساد سکینہ' ڈاکٹر یعقوب یاور' پروفیسر خالد حسین خاں' شمس بدایونی' نظر برنی' فرخ جلالی نے مقالات پڑھے۔ یوسف ناظم صاحب کی غیر موجودگی میں ان کا مقالہ یاد نگار کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر شاداب ذکی نے پڑھا۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے صدارتی تقاریر پیش کیں۔ اختتام پر جناب فخر احمد شوبی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

۱۶ مارچ شب دس بجے سے کل ہند مشاعرے کی ابتدا ہوئی جس کی صدارت مزاح نگار مجتبیٰ حسین صاحب نے کی۔ اس مشاعرے میں تیس بیرونی شعراء کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی شروعات جناب راجہ رام اپادھیائے ضلع مجسٹریٹ بدایوں نے شمع جلا کر کی۔ حضرت دلاور نگار کی تصویر کی نقاب کشائی جناب برج بھوشن شرما (ضلع کپتان بدایوں) نے کی۔ کنوینر مشاعرہ فخر احمد شوبی نے سبھی مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ بدایوں میں ایک مدت بعد ایک ایسا مشاعرہ ہو رہا ہے جس میں اتنی بڑی تعداد میں بیرونی شعراء اُدباء اور دانشوران موجود ہیں۔ ابتداء میں عقیل نعمانی نے نعت پڑھی اور آباد احمد ایڈوکیٹ نے نگار صاحب کا کلام پیش کیا۔ مشاعرہ میں جن شعراء نے اپنا کلام پیش کیا اُن کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد' ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی' جناب متین صدیقی' حق کانپوری' معراج فیض آبادی' حمایت اللہ' رئیس انصاری' حنا تیموری' منصور عثمانی' ایم اے علوی' نظر برنی' مونس بریلوی' وکیل آفریدی' نزہت نگار' معصوم نجوروی' طاہر مرزا' رعنا زیبا' عقیل نعمانی' اشوک ساحل' اسعد بدایونی' سہیل لکھنوی' طالب خوندمیری' انجم ملیح آبادی' ہلال سیوہاروی۔ مشاعرہ اپنی تمام تر کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا ہوا صبح کے ۵ بجے اختتام پذیر ہوا۔ دور دراز سے آئے ہزاروں افراد نے مشاعرہ میں شرکت کی۔ مشاعرہ کے اختتام پر یادگار کمیٹی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

سلام بن رزاق کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

ساہتیہ اکادمی نے اردو کے معروف ادیب جناب سلام بن رزاق کو "ترجمہ کا ایوارڈ" دینے کا اعلان کیا ہے۔ موصوف نے ہندی کی منتخب کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کر کے اردو قارئین کو عصری ہندی کہانیوں کے رجحانات سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ اردو میں ترجمہ شدہ ان ہندی کہانیوں کا مجموعہ "عصری ہندی کہانیاں" کے عنوان سے ۱۹۹۵ء میں نیشنل بک ٹرسٹ کی وساطت سے منظر عام پر آیا تھا۔

ننگی دوپہر کا سپاہی اور معبر جیسی کتابوں اور انجام کار' درمیانی صنف کا سورما ذمی اور ستی جیسی کئی درجن کہانیوں کے خالق سلام بن رزاق میونسپل کارپوریشن کے محکمہ' تعلیم میں بحیثیت صدر مدرس وابستہ ہیں۔ غالباً یہ پہلا موقع ہے جب کارپوریشن کے تدریسی اسٹاف کے کسی رکن کو اتنا اہم ایوارڈ ملا ہو۔

درگاہ کمیٹی اجمیر' اختر الواسع صدر منتخب

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ اور دانشور پروفیسر اختر الواسع کو درگاہ کمیٹی اجمیر کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ کمیٹی کے ناظم مسٹر اشفاق حسین کی ریلیز کے مطابق کل اجمیر میں درگاہ کمیٹی ارکان کی میٹنگ میں مسٹر واسع کو اتفاق رائے سے صدر چنا گیا۔ خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ ہندوستان کی واحد ایسی درگاہ ہے جس کی دیکھ ریکھ پارلیمنٹ سے منظور شدہ ایکٹ کے تحت مرکزی حکومت کی طرف سے تشکیل دی جاتی ہے۔ اس سے قبل سید شہاب الدین اور مسٹر طارق انور درگاہ کمیٹی کے صدر کے عہدے پر رہ چکے ہیں۔

عرفان صدیقی نمبر کے لیے

مضامین مطلوب

"علم وادب" عرفان صدیقی پر خاص نمبر جون ۱۹۹۹ء میں شائع کر رہا ہے۔ عرفان صدیقی کے فن اور شخصیت پر مضامین مطلوب ہیں۔

فخر الدین یادگار کمیٹی کے چیئرمین

کو استقبالیہ

رامپور ۱۰ مارچ۔ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیے جانے پر ڈاکٹر حسن احمد نظامی صدر شعبہ اردو گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور کے اعزاز میں صولت پبلک لائبریری کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا۔ سابق صدر شعبہ اردو گورنمنٹ رضا کالج پروفیسر آفتاب شمسی ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے بھی ڈاکٹر حسن احمد نظامی کو خراج تحسین پیش کیا۔

لائبریری کے سکریٹری شبیر حسن خاں نے سپاس نامہ پیش کیا۔ ریسرچ اسکالر اطہر مسعود خاں نے ڈاکٹر نظامی کا دلچسپ خاکہ پیش کیا۔ مکارم الحق مکارم نے اپنے مضمون میں ان کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ نیشنل اوپن یونیورسٹی دہلی کے ایگزیکٹو آفیسر ڈاکٹر شعیب رضا وارثی نے ڈاکٹر نظامی کی علمی بصیرت کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ وہ بھی

ڈاکٹر علی کے شاگرد ہیں۔ استقبالیہ تقریب کی نظامت رضوان احمد صدیقی نے کی۔

برکت اللہ یونی ورسٹی کے اردو میں پہلے ڈی لٹ نریندر ناتھ ویرمنی

برکت اللہ یونی ورسٹی بھوپال نے ڈاکٹر نریندر ناتھ ویرمنی کو ان کے تحقیقی مقالے پر اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مدھیہ پردیش کی کسی بھی یونی ورسٹی سے اردو میں ڈی لٹ کرنے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا: ہندستان کی اہم سیاسی اور سماجی تحریکات اور اردو شاعری (۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۷ء) ایک مطالعہ"

آپ نے یہ مقالہ پروفیسر آفاق احمد کی زیرنگرانی تحریر کیا۔ ڈاکٹر ویرمنی اس سے قبل دیوی اہلیا یونی ورسٹی اندور سے "ہندستان کی جنگ آزادی میں اردو کا حصہ (مدھیہ پردیش کے خصوصی حوالے سے) ایک تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ" کی سرخی سے پولیٹکل سائنس میں پی ایچ ڈی کرچکے ہیں۔ اس مقالے کے نگران کار پروفیسر بی آر سود (پولیٹکل سائنس) اور پروفیسر آفاق احمد (اردو) تھے۔

ڈاکٹر ویرمنی کی اردو خدمات کے اعتراف میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے انھیں غیر لسانی فنکار کا پہلا شمبھو سخن اعزاز پیش کیا جبکہ ڈاکٹر ویرمنی آئی پی ایس مدھیہ پردیش کے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پولس کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ بعد میں چترکوٹ یونی ورسٹی کی وائس چانسلر بھی رہے۔

شعبۂ اردو ممبئی یونی ورسٹی کی پیش رفت

شعبۂ اردو ممبئی یونی ورسٹی گزشتہ دو سال سے ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ اس کا ایک ثبوت ایم اے سال اول (۹۹ـ۱۹۹۸ء) میں سو کے قریب طلبہ کا داخلہ ہے۔ جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ اس سے قبل اتنی بڑی تعداد میں داخلے نہیں ہوئے تھے۔ امسال اعلا تعلیم حاصل کرنے اور تحقیقاتی کام کرنے کی غرض سے ایم فل میں پندرہ طلبہ نے داخلہ لیا ہے۔ یہ بھی شعبۂ کے لیے ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے اور اردو کی اعلا تعلیم کے لیے ایک نیک فال ہے۔ ماضی میں یہ تعداد بیس سے تجاوز نہیں ہوئی تھی۔ امسال اردو سرٹیفکٹ کورس میں بھی ایک بڑی تعداد میں غیر اردو داں طلبہ نے داخلہ لیا ہے۔

شعبۂ اردو کو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت بھی حاصل ہو گئی ہے اور اس کا امکان ہے کہ جلد ہی اردو پروگرام کا آغاز ہو جائے کیونکہ اردو سافٹ ویئر کے لیے یونی ورسٹی سے منظوری حاصل کی جاچکی ہے۔ ان تمام ترقیوں میں شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر یونس اگاسکر اور اساتذہ کرام کی دلچسپی اور کارکردگی کو خصوصی دخل ہے اور انھیں کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں یونی ورسٹی کی اسٹوڈینٹس کونسل میں بھی شعبۂ اردو کو نمائندگی حاصل ہوئی ہے۔

ظہیر احمد رکن اسٹوڈینٹس کونسل ممبئی یونی ورسٹی

اسرار جامعی کو ساہتیہ سیتو کا خطاب

پٹنہ (ڈاک سے) بہار کے مشہور ادارے "کلا کنج" نے بہار کے پندرہ فنکاروں کو جنھوں نے ادب اور دوسرے علوم وفنون میں عظیم کارنامے

انعام دیے ہیں اور (جن کا فن نہ صرف اکیسویں صدی بلکہ اس سے آگے کی صدیوں میں بھی دنیا کو فیضیاب کرتا رہے گا۔) کو اپنے مخصوص انعامات سے نوازا ہے۔

ہر انعام ایک سونے کا تمغہ، ایک شال اور مبلغ پچیس ہزار روپے نقد پر مشتمل تھا۔ اس سلسلہ میں مشہور شاعر طنز و مزاح جناب اسرار جامعی کا نام سر فہرست تھا۔ جنھیں "ساہتیہ ستھو" کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

مسقط میں ہندوپاک مشاعرہ جشن علی سردار علی جعفری

مسقط ۱۶ر مارچ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ملک کے عظیم ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کی ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں ۱۸ر مئی ۹۹ء کو رات ۸ بجے ہوٹل شیر ٹن مسقط میں ہندوپاک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جس میں ہندوپاک کے شعرا بالخصوص شرکت کر رہے ہیں۔ مشاعرہ کے منتظمین مستجاب احمد اور ہمایوں ظفر زیدی کی اطلاع کے مطابق اس مشاعرے کی نظامت نوجوان شاعر ماجد دیوبندی کریں گے۔ مدعو شعرا میں پاکستان سے احمد فراز، انور مسعود، امجد الاسلام امجد، حسن رضوی اور ہندستان کے علی سردار جعفری، راحت اندوری، ماجد دیوبندی، چرن سنگھ بشر، پاپولر میرٹھی، حنا تیموری اور انجم رہبر کے نام شامل ہیں۔

مخمور سعیدی ملازمت سے سبکدوش

نئی دہلی، دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری جناب مخمور سعیدی ۳۱ر مارچ کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔ مخمور سعیدی گذشتہ دو برس سے دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری تھے۔ وہ "ایوان اردو"

ادبی رسالے کے بانی مدیر بھی تھے۔ ان کے عہد میں اردو اکادمی نے خاطر خواہ کامیابیاں حاصل کیں۔ اکادمی کے دونوں رسالے "ایوان اردو" اور "امنگ" میں مواد اور گیٹ اپ کے لحاظ سے خوش کن تبدیلی واقع ہوئی۔

مخمور سعیدی نے سکریٹری کے اپنے عہد میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کی بنا پر خود کو بہترین منتظم بھی ثابت کیا۔

رضا نقوی واہی اور عبدالمغنی راج بھاشا انعام کے لیے منتخب

پٹنہ، راج بھاشا کی اعلا سطح کی ٹیم نے اردو کے اعلا ترین مولانا مظہر الحق ایوارڈ کے لیے رضا نقوی واہی کو منتخب کیا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے نقد پر مشتمل ہوتا ہے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ایوارڈ کے لیے پروفیسر عبدالمغنی کو منتخب کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے نقد پر مشتمل ہوتا ہے۔

نورجہاں ثروت کے اعزاز میں نشست

نئی دہلی، انجمن تشکیل کے زیر اہتمام مشہور شاعرہ محترمہ نورجہاں ثروت کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔

جناب عظیم اختر نے نورجہاں ثروت کی شخصیت پر ایک خاکہ پڑھا۔ محترمہ مخمور سعیدی، ڈاکٹر عفت زریں اور رؤف رضا نے نورجہاں ثروت کے شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر ایک تعارفی فولڈر بھی تقسیم کیا گیا جس کا اجراء مخمور سعیدی نے فرمایا۔

نشست کی صدارت مرزا شاہد بیگ چنگیزی نے اور نظامت اقبال اشہر نے کی۔

دہلی یونی ورسٹی میں غالب میموریل لکچر

نئی دہلی' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی کے اشتراک سے پہلا غالب میموریل لکچر بہ عنوان "ہندوپاک کے سیاسی' معاشی اور سماجی تعلقات" آرٹس فیکلٹی میں منعقد ہوا۔ وائس چانسلر پروفیسر وی آر مہتہ کی صدارت میں منعقد ہونے والا یہ خطبہ ماہر اقتصادیات پروفیسر علی محمد خسرو نے پیش کیا۔

پروفیسر خسرو نے ہندوپاک کے سماجی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے لیے خیر سگالی اور تعاون کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان نفرتیں سطحی اور مصنوعی ہیں۔

صدارتی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر مہتہ نے کہا کہ آج کے دور میں جب یورپی ممالک ایک مشترک تشخص کی تلاش میں سرگرداں ہیں' برصغیر کے ممالک کو ان کے مقابلے کہیں زیادہ اتحاد اور مشترک تشخص کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر پروفیسر امیر عارفی' ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ اور دیگر لوگوں نے بھی اظہار خیال کیا۔

شام بہار ٹرسٹ کا سلور جبلی مشاعرہ

انبالہ' شام بہار ٹرسٹ انبالہ کے زیر اہتمام ایک سلور جبلی انٹر نیشنل مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ میں ہندستان کے معروف شعرا پروفیسر جگن ناتھ آزاد' جناب مخمور سعیدی' ڈاکٹر بشیر بدر اور پاکستان کے مرتضٰی برلاس اور ڈاکٹر حسن کے علاوہ تقریباً ۲۰ شعرا نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض پاکستان کے پریس اتاشی جناب مفتی جمیل نے ادا کیے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شمولیت سے مشاعرے کی رونق میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مشاعرہ صبح کے ۵ بجے تک بحسن وخوبی چلتا رہا۔

ہندپاک دوستی کے نام ایک شام

نئی دہلی' آل انڈیا اردو ایڈیٹرز گلڈ کے زیر اہتمام "ہند پاک دوستی کے نام ایک شام" منعقد ہوئی۔ اس موقع پر مشاعرہ کی صدارت مشہور شاعر افتخار نسیم (شکاگو) نے کی۔ محترم غلام نبی آزاد نے مہمان خصوصی کی حیثیت شرکت کی۔

مشاعرہ میں پاکستان کے ڈاکٹر خالد جاوید جان' محمد افضل' علی بابا تاج اور ارشد علی نے اپنا کلام پیش کیا۔ ہندستانی شعرا میں نصرت گوالیاری' انور ہادی' شہباز ندیم ضیائی' احمد محفوظ' اقبال فردوسی اور سلیم صدیقی نے اپنے کلام سے محفل کی رونق بڑھائی۔

کویت "دکن لٹریری سرکل" اور رائٹرز فورم" کا تعزیتی اجلاس

اردو کے مستند شاعر اور دکن لٹریری سرکل کے صدر عبداللہ ساجد کی رہائش گاہ پر دکن لٹریری سرکل اور رائٹرز فورم کے زیر اہتمام تعزیتی اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس میں دکن کے ترقی پسند شاعر اختر راہی' بزم دکن کے خازن ابراہیم کچیل اور انڈین کیمونٹی کی معروف شخصیت و تاجر و دکن لٹریری سرکل کے مشیر اعلا محمد صالح بروڈ کے بڑے بھائی حسن میاں بروڈ کے لیے دعائے مغفرت کی گئی جو حال ہی میں داغ مفارقت

دے گئے۔ کویت میں مقیم اردو کے معروف شاعر ناقد اور مراٹھی کے پہلے مترجم نور پرکار نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کوکن کے ترقی پسند شاعر اختر راہی کے پہلے مجموعہ کلام ابن آدم کا دیباچہ کرشن چندر نے لکھا تھا۔ انھوں نے کوکن کی مثنوی بھی تحریر فرمائی ہے اور ایک مجموعہ کلام زیر طبع ہے۔ اسی طرح انھوں نے محمد صالح بروڈ اور مولانا عبدالستار بروڈ سے اپنے غم کا اظہار کیا اور حاضرین کو بتایا کہ حسن میاں بروڈ اپنے کانوشری ورودھن میں زندہ دلی کی مثال تھے۔ وہیں وہ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ نور پرکار نے ابراہیم تطل سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ابراہیم تطل نے بزم کوکن کے خازن کی حیثیت سے ایک نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اور نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کے نقیب ابراہیم تطل کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ شرکا میں علی چوگلے ایوب قاسم کرجیکر انور قادری، عارف قاضی، سمیر کاپڑی، نعیم چوگلے کے علاوہ رائٹرز فورم کے جنرل سکریٹری اور نیپالی کے معروف شاعر جسبیر سنگھ دھیمان، ہندی شاعر اومیش شرما اور ڈوگری کے شاعر ڈاکٹر اروندر رینا کے نام قابل ذکر ہیں۔ (انور قادری)

محمد کفایت اللہ کا انتقال

مالیر کوٹلہ: انتہائی غم و افسوس کے ساتھ یہ خبر دی جارہی ہے کہ والد محترم ہیڈ ماسٹر محمد کفایت اللہ صاحب ۲۲ر فروری ۱۹۹۹ء صبح چار بجے اپنا دنیاوی سفر مکمل کرکے مالک حقیقی کے حضور چلے گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون (خالد کفایت)

پروفیسر محمد حسن کا انتقال

نئی دہلی، ملک گیر شہرت یافتہ ادیب، شاعر اور سائیکلوجسٹ پروفیسر محمد حسن کا ۱۸ر مارچ کو انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً ۸۸ برس تھی۔ پروفیسر محسن کی تصانیف میں کہانیوں کا مجموعہ "انوکھی مسکراہٹ" ادبی مضامین کا مجموعہ "نفسیاتی زاویے" اور شعری مجموعہ کلام "ترنم کے پھول" شامل ہیں۔ ان کی کہانی "انوکھی مسکراہٹ" اردو کی چند لازوال کہانیوں میں سے ایک ہے۔

ڈاکٹر خاور ہاشمی کی اہلیہ کا انتقال

نئی دہلی ۱۶ر مارچ: نامور ادیب اور آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر خاور ہاشمی کی اہلیہ کا کل رات اچانک دل کا شدید دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) ان کی عمر ۵۴ برس تھی۔ پسماندگان میں شوہر کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی میت کو تدفین کے لیے ان کے آبائی وطن مراد آباد لے جایا گیا۔ جہاں کثیر تعداد میں لوگ تدفین میں شریک ہوئے۔

بدر عظیم آبادی کا انتقال

نئی دہلی، اردو کے حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مشہور صحافی و ادیب بدر عظیم آبادی کا آج صبح انتقال ہو گیا۔ وہ ۶۵ برس کے تھے۔ ان کی تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان عمل میں آئی۔ بدر عظیم آبادی کئی سال تک جریدہ "ترجمان" سے وابستہ رہے۔ بعد میں انھوں نے "البدر" کے نام سے اپنا رسالہ بھی شائع کیا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسان الصدق — مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ =/۷۵

نظام رنگ — ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ =/۱۵

شہید جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) — پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مرد درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مرد مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۷۵

پرانی بات ہے (سلسلہ وار نظمیں) — زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں۔ =/۳۰

غزل نما — تصحیح و ترتیب ادا جعفری
(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۲۸۰ =/۷۵

ساز سخن — ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتون اول، محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے انداز بیان سے ایک ایسی قوت ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔ =/۴۵

ترجمۂ قرآن — پروفیسر مشیر الحق
(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/۸

نذر مختار — مالک رام

مجموعۂ مضامین جو نامور محقق اور دانشور، پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دست مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/۱۰۱

Regd. with R.N.I. at No. 4967/60 APRIL, 1999
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

کتاب

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

مئی ۱۹۹۹ء   جلد ۳۹   شمارہ ۵

فی پرچہ 8/.
سالانہ 80/:
سرکاری تعلیمی اداروں سے 125/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
e-mail: maktaba@ ndf. vsnl. net.in
Tele Cum Fax No (011)-6910191
ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

جائزے

جوش ملیح آبادی کے خطوط/ مخمور دہلوی حیات و شاعری غالب کی شناخت/ عظیم شاعر مرزا غالب/شاعری میرے حصے میں آئی ہے۔

نئی مطبوعات

شعر، غیر شعر اور نثر۔ (تحقیق) شمس الرحمٰن فاروقی -/240
شاہ عالم ثانی انتخاب احوال و ادبی خدمات ڈاکٹر قادر جمیل -/200
اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات (سیاست) مظہر مہدی -/150
نو آبادیاتی ہندستان ۱۹۱۴۔۱۸۵۷ء
سائنس اور سماج (سائنس) ڈاکٹر سریو پرشاد گپتا -/125
وشت تحیرات (۱۹۸۵ سے ۱۹۹۸ تک کی نظموں کا انتخاب) صلاح الدین پرویز -/350
افسانہ اور علامتی افسانہ (تنقید) علی حیدر ملک -/80
ارمغان محسن (شاعری) محسن زیدپوری -/150
حرف درد (//) سدھا جبین انجم -/160
امکان (تاریخ ادب) ابو بکر رضوی -/250
مسلم مجاہدین ثاران وطن (تاریخ) اولیس قرنی سلطان پوری -/120
پریم چند کے افسانے (تنقید) خالد حیدر -/150
اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ (تنقید) اصفہانی اشرف -/150
وطن کے لال جنگ آزادی کے مجاہدین پروفیسر عبد القادر -/100
انتخاب کلام شمیم کرہانی (شاعری) پروفیسر حنیف کیفی -/25
انتخاب بسمل سعیدی (شاعری) مخمور سعیدی -/25
اردو رسم الخط اور املا ایک مکالمہ (املا) ڈاکٹر ابو محمد سحر -/130
انگلیاں فگار اپنی (شاعری) زبیر رضوی -/75
اردو تنقید کا سفر (تنقید) ڈاکٹر تابش مہدی -/200
شاخ زیتون (شاعری) رؤف خلش -/50
دل کی بیماری اور عام علاج (معلومات) ایس۔ پدماوتی -/30
کینسر (معلومات) ایس۔ ایم۔ بوس -/35
ڈاکٹر صاحب کی کہانی (شخصیت) سعیدہ خورشید عالم -/30
جمہوریت ۸۰ سوال اور جواب (سیاست) لا یوڈ جمہوریت کیوں چاہیے -/30
سبزیاں بشرا جبیں چودھری -/60

ننھی اڈویلت انل اگروال -/65
ساز جرس (شعری مجموعہ) کوثر صدیقی -/70
دامن گلزار (شعری مجموعہ) ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید -/75
فوری علاج شیش اگروال -/10
سانجھ۔ سویرا (ایڈز کی جانکاری) مینا کشی سوامی -/9
غذا اور ہمارا جسم (بچوں کا ادب) رینو چوہان -/10
سون پہاڑی کا راز (بچوں کا ادب) چترا نائک -/9
زلزلے اور شعلے (بچوں کا ادب) رسکن بونڈ 9/50
کمر کا درد (بچوں کا ادب) جیتندر گمبھوری -/9
پانی (بچوں کا ادب) رام درش مشر -/7
کیڑوں کی دنیا (بچوں کا ادب) شمس الاسلام فاروقی -/35
انسانی حقوق سوال و جواب لیہہ لیون -/40
آئینہ گلیا (شعری مجموعہ) سلیمان آصف -/20
سہ ماہی اردو ادب (دہلی) مدیر اسلم پرویز فی شمارہ -/30
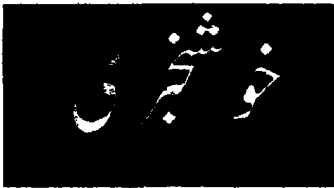
مہمان مدیر
ابو بکر رضوی
شعبۂ اردو، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ

اشاریہ

اردو افسانے میں مہملیت (۱۹۶۰ء کے بعد)

اس حقیقت سے شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ ہمارے یہاں (اردو ادب میں) کوئی بھی تحریک، رجحان، نظریہ، فلسفہ یا رویہ اس وقت داخل ہوتا ہے جب دوسری زبانوں بالخصوص مغرب میں یہ دم توڑ چکا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہم ان تحریکات و میلانات کے داخلی عوامل تک رسائی کے بغیر اسے ظاہری صورت میں اپنانے کی دانشورانہ غلطی کرتے ہیں۔ ایسی طفلانہ دانشوری کا مظاہرہ کرنے کے پس پردہ ہماری کچھ مجبوریوں کا دخل ہوتا ہے۔

عام طور پر دوسری زبانوں سے ہماری واقفیت کا عالم "نیم حکیم" کا سا ہوتا ہے۔ جب زبان سے ہماری شناسائی صفر یا اس کے آس پاس ہو تو اس کے ادب میں پروان چڑھنے والے رجحانات و نظریات کی تفہیم کی کوشش مضحکہ خیز صورت ہی پیدا کرتی ہے۔ اس سے ادب کا فائدہ کم نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تقسیم ہند کے خونی ڈرامے 'ہجرت کے کرب اور معاشرتی انتشار نے برصغیر میں بھی کم و بیش وہی صورت حال پیدا کر دی تھی جس نے مغرب میں انسانی وجود پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ لہٰذا جلاوطنی' بے زمینی' اور بے تعلقی کے احساس نے فطری طور پر ادب میں وجودیت کے لیے عقبی زمین فراہم کر دی۔

جدیدیت جو دراصل وجودیت کی توسیع ہے کہ اردو ادب میں فروغ کے ساتھ وجودیت کے تمام بنیادی عناصر تخلیقی صورت میں ہمارے یہاں رونما ہونے لگے۔ مہملیت (Absurdity) کا رجحان بھی ان ہی غالب رجحان میں سے ایک تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ساری دنیا بالخصوص مغرب میں تشدد اور موت کے اس ناچ نے انسانی وجود پر سوالیہ نشان

لگادیا۔ وجود داخلی اور خارجی سطحوں پر پراگندگی و ابتری کی آماجگاہ بن گیا۔ تنہائی، بیزاری، اکیلا پن، اکتاہٹ، ناامیدی، عدمیت، خوف ودہشت، بے بسی، بے کسی، سطحیت، یکسانیت، لافردیت، لاشخصیت، بے معنویت یہ اور ایسے تمام منفی احساسات انسانی وجود کا مستقل حصہ بن گئے۔ مادیت اور ہوس پرستی نے انسانی وجود کو ایک مشین کی صورت بنادیا۔ اس طرح انسان اور انسان کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔

انسانی وجود پر آئے اس گمبھیر سنکٹ اور اس کی اتفاقی وحادثاتی تخصیص نے وجودیت کے فلسفے کی بنیاد رکھی۔ بقول لطف الرحمٰن۔

> "یہ فلسفہ وجود کے کرب، الجھن، کشاکش، بیزاری، تنہائی اور احساس جرم کے ادراک واحساس سے تحریک حاصل کرتا ہے۔ یہ زندگی کو تاریکیوں میں محصور دیکھتا ہے اور روشنی کا جویا ہے۔ اس نظریے کے مطابق زندگی بے معنی اور مہمل ہے چنانچہ یہ فلسفہ زندگی کو امکانی حد تک بامعنی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔" [1]

وجودی مفکرین کے نزدیک حقیقت لغو اور مہمل ہے۔ فلسفہ تغویت یا مہملیت Absurdity کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ وجودیوں کے مطابق کائنات اور زندگی مکمل لغو اور مہمل ہے اس لیے کہ آدمی اس کی ابتدا اور انتہا کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ اس بات سے قطعی ناواقف ہے کہ وہ کس طرح عالم وجود میں آیا؟ اس کو کیا ہونا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ وجود کے دونوں ہی کنارے اندھیروں میں گم ہیں۔ اس لغو اور مہمل حالت میں اسے اپنی زندگی کو ایک بامعنی صورت عطا کرنا ہے۔

زندگی کی مہملیت اور لغویت کی تصویر کشی فرانسیسی مفکر البیئر کامیو نے اپنی تصنیف The Myth of Sisyphus میں کی ہے جو اس نظریے کا بانی بھی تھا اور شارح بھی۔ اس کے نزدیک دنیا اور انسانی زندگی لغو اور مہمل ہے۔ سی سی فس کا کردار اس دنیا میں انسانی زندگی سے عبارت ہے۔ وہ تمام عمر پہاڑ کی چوٹی پر پتھر نصب کرنے کی ناکام اور بے سود کوشش میں مصروف ہے۔ انسان کی تقدیر سی سی فس کی تقدیر سے ہم آہنگ ہے۔ سی سی فس کی طرح ایک دن انسان کی ساری کوششیں عدم میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اس طرح یہ فلسفہ قنوطیت سے قریب ہے۔ کامیو کے علاوہ سارتر اور کافکا کے یہاں بھی یہ نقطہ نظر ملتا ہے۔ اس کے

---

[1] جدیدیت کی جمالیات: لطف الرحمٰن، صفحہ ۱۴

برعکس کرکے گارڈ ہائیڈ گر مارسل اور جیسپر کے یہاں فلسفہ مہملیت کی رجائی صورت ملتی ہے۔

فلسفہ مہملیت میں غیر ملحدانہ رویہ رکھنے والے مفکرین اپنے مذہبی عقیدے کی بنیاد پر زندگی کی بے معنویت سے نجات کی ایک صورت پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ خودی کا احساس اپنے اندر نہیں رکھتے۔ ہر شے کو وہ خدا کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک "میں کی" کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات کے منکر ہوتے ہیں اور صرف خدا کی ذات کا اقرار کرتے ہیں۔ اسی لیے کر کے گارڈ کہتا ہے کہ صرف خدا کے لیے یہ دنیا بامعنی اور منطقی ہے۔ انسان اس کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بحران ہستی اور انتشار وجود کے اس نظریے نے ادب میں Absurd تحریک کو جنم دیا۔ سارتر، کامیو، کافکا کے علاوہ سیموئل بکٹ، یوجین آئنسکو، جین جینے، رابرٹ پینگٹ، آرتھر ائڈموبھ اور این ایف سمسن وغیرہ نے نہ صرف یہ کہ اپنی تخلیقات میں اس نظریے کو برتا بلکہ عالمی ادب پر اس کے گہرے نقوش چھوڑے۔

جدیدیت کے آغاز کے ساتھ ہی مہملیت کا رجحان ادب کی مختلف صورتوں (صنفوں) پر مرتسم ہونے لگا۔ شاعری کے علاوہ جن دوسری صنفوں پر اس کے گہرے نقوش واضح ہوئے وہ اردو فکشن کی دنیا ہے۔ فکشن میں بھی خصوصی طور پر افسانوں میں مہملیت یا بے معنویت کے زیر اثر بے شمار فنی و تکنیکی تجربے ہوئے۔ جہاں تک ناول کا تعلق ہے تو اردو میں کوئی بھی ایسا ناول نظر نہیں آتا جو بنیادی طور پر فلسفہ وجودیت یا فلسفہ مہملیت پر مبنی ہو۔ جس طرح مغرب میں کامیو کا The Outsider اور سارتر کا Nausea ہے۔ ہاں بعض ناول ایسے ضرور ہیں جن میں فلسفہ مہملیت کے بنیادی عناصر کا انشراح ہوا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" اس کی اچھی مثال ہے۔ اس کا بیشتر کردار اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں اور وقت کے جبر کے آگے مجبور و بے بس نظر آتا ہے۔ ناول میں بے شمار ایسے جملے ہیں جو زندگی کی بے معنویت اور لغویت کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

"آگ کا دریا" کے علاوہ "خدا کی بستی" (شوکت صدیقی) "نواس نسلیں" (عبداللہ حسین) "تلاش بہاراں" (جمیلہ ہاشمی) "بستی" (انتظار حسین) "جنم روپ" (انور سجاد) "بیانات (جوگندر پال) اور "پانی" (غضنفر) میں خال خال بے معنویت یا مہملیت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے میں مہملیت کا غالب رجحان نظر آتا ہے ہر بڑے اور چھوٹے افسانہ نگار نے اسے اپنی تخلیق کا حصہ بنایا ہے۔ گویا اس کے بغیر کوئی افسانہ نگار خود مکمل تصور کرتا نظر نہیں آتا۔ مہملیت یا بے معنویت کو بطور فیشن اور تتبع اپنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ معیاری اور اچھے افسانے تو کم وجود میں آئے لیکن بے تکے اور فضول افسانوں کا سیلاب سا آگیا۔

۱۹۶۰ء کے بعد جن افسانہ نگاروں کے یہاں فنی اور تکنیکی سطح پر فلسفہ بے معنویت یا مہملیت کا خوبصورت انشراح ہوا ہے اس میں قرۃالعین حیدر، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، انور سجاد، بلراج مینرا، سریندر پرکاش، کلام حیدری، جوگندر پال، رشید امجد، خالدہ حسین، کمار پاشی، اکرام باگ، احمد انیس، قمر احسن، بلراج کومل، احمد یوسف، شرون کمار ورما، مسعود اشعر، اقبال متین، الیاس احمد گدی، سمیع آہوجہ، زاہدہ حنا، حسین الحق، اختر واصف، شوکت حیات، انور خاں، شفق اور احمد جاوید کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے یہاں مہملیت پر مبنی خوبصورت اور معیاری افسانے ملتے ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں مہملیت کا رجحان فطری انداز میں ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ یہ احساس نہیں ہوتا کہ مغرب کی نقالی میں بے معنویت کے نظریہ کو افسانوں میں برتا کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے معروف اور غیر معروف افسانہ نگاروں کے یہاں حیرت انگیز طور پر مہملیت پر مبنی کامیاب افسانہ مل جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہاب اشرفی کا افسانہ "کھویا ہوا چہرہ" قابل ذکر ہے۔

فلسفہ مہملیت کے زیر اثر تخلیق پانے والے افسانوں میں حیات و کائنات کی بے معنویت کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق انسان کا وجود اور یہ کائنات بے معنی اور لغو ہیں۔ اسے انسان اپنی کوششوں اور کاوشوں سے معنویت کا جامہ پہناتا ہے۔ داخلی کرب، وجود کا انتشار، خوف و دہشت، تنہائی و اجنبیت عدمیت وکلیت اور اقدار کی شکست وریخت جیسے موضوعات و مسائل کے اردگرد افسانوں کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ افسانوں میں فلسفہ مہملیت کی پیش کش کے لیے ہیئت تکنیک اور اسلوب کی سطح پر نت نئے تجربے ہوئے۔ علامتی، تجریدی، سرئیلی، تمثیلی، اساطیری اور اس طرح کے دوسرے Form میں افسانے لکھے گئے۔ چونکہ اس فلسفے کی بنیاد ہی وجود کا انتشار ہے لہٰذا ان میں عموماً کہانی پن اور پلاٹ کا فقدان بھی ملتا ہے۔ لیکن بڑے فنکاروں کے یہاں افسانے کی مصوری اتنی خوبصورت کامیاب اور فنکارانہ ہوتی ہے

کہ پلاٹ، کردار اور کہانی پن کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان سب کے بغیر بھی ایک شاہکار سامنے آتا ہے جو اہل نظر کی توجہ بے اختیار اپنی جانب مبذول کرلیتا ہے۔ مسئلہ تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مغرب کی تقلید میں بغیر سوچے سمجھے کم علمی، کم فہمی، اور تخلیقی صلاحیت کے فقدان کی صورت میں افسانہ، افسانہ نہیں مجذوب کی بڑ بن جاتا ہے اور جب ترسیل کی ناکامی اور کہانی پن کے غائب ہونے کا شکوہ کیا جاتا ہے اور بہت حد تک یہ شکوہ بجا ہوتا ہے۔ وارث علوی لکھتے ہیں۔

> "اس کے متعلق (جدید افسانہ) جو عام شکایت کی جاتی ہے کہ وہ پڑھا نہیں جاتا تو اس شکایت کو جدید افسانہ کے حواری نقاد دلچسپ اور غیر دلچسپ مشکل اور غیر مشکل مبہم اور غیر مبہم کی اصطلاحات میں الجھا کر بالآخر ترسیل کے المیہ کے لچر اور پارینہ نظریہ میں پناہ لیتے ہیں۔ حالانکہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ ہر اس تحریر کی مانند چاہے وہ نظم ہو، نثر ہو یا تنقید جو الجھی ہوئی ہے موہوم Vague ہے۔ عناصر ترکیبی کا شعور نہیں رکھتی۔ فکر و نظر کے ڈسپلن سے عاری ہے، محض زبان و بیان کا چھلاوہ ہے، اور فارم کے انتشار کا عبرت ناک نمونہ، جدید افسانہ بھی پڑھا نہیں جاتا کیونکہ محولہ بالا معائب کے سبب ایسی تمام تحریریں اچھی تحریر کی اولین صفت پڑھے جانے کے گن ہی سے محروم ہوتی ہے۔ جدید افسانہ کے حامی نقاد قاری میں یہ احساس کمتری پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ افسانے تو رموز و عرفان کے خزینے ہیں۔ اگر قاری ان کا ادراک نہیں کرپاتا تو اس کا عجز اور کوتاہی ہے لیکن قاری آرٹ اور نان آرٹ کے فرق کو پہچانتا ہے۔" [۲]

وارث علوی کا یہ Comment حق بجانب ہے لیکن وارث کا یہ فرمان جدید افسانے کے پورے سرمایے یا ہر ایک افسانہ نگار کے سلسلے میں نہیں ہے۔ انھیں بھی شکایت ان ہی سے ہے جو آرٹ کو بازیچہ اطفال سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ورنہ جہاں انھوں نے نئے افسانہ نگاروں کی سرجری کی ہے وہیں فن کی بنیاد پر غیاث احمد گدی اور خالدہ اصغر کے معترف بھی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر عہد میں گراں قدر اور سطحی دونوں طرح کا ادب لکھا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر عہد میں اچھا اور بڑا ادب بہت کم ہی تخلیق ہوتا ہے۔ حقیقت ادب تو حقیقت کی تلاش ہے۔

---

[۲] جدید افسانہ اور اس کے مسائل: وارث علوی، صفحہ ۴۰

افسانوں میں اس کی شعوری کوشش کو دخل نہ ہو۔ راقم الحروف کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بے معنویت اور مہملیت کا تصور میرے لیے پسندیدہ نہیں رہا ہے۔ پوری طرح میری سمجھ میں بھی نہیں آسکا۔ میں نے اپنے افسانوں میں بے معنویت سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی قارئین کو ان میں کچھ بے معنویت محسوس ہوتی ہے۔ اس میں میری شعوری کوشش کو کوئی دخل نہیں۔"

فلسفہ مہملیت نیر مسعود کے لیے تفہیم کا مسئلہ ہو یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو میں بیشتر افسانہ نگاروں کے نزدیک فلسفہ مہملیت تفہیم کا مسئلہ رہا ہے اور ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے تفہیم کی کوئی بھی منزل طے کیے بغیر بطور فیشن اسے اپنے افسانوں میں برتا ہے جس کے نتیجے میں یہ افسانے لغو اور مہمل ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہاں اردو کی مشہور افسانہ نگار شکیلہ اختر سے ان کی حیات کے آخری ایام میں ہوئی اپنی گفتگو کا ایک حصہ قارئین کی نذر کرنا چاہتا ہوں جو دلچسپ بھی ہے اور بر محل بھی۔ جب میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ جدید افسانوں (۱۹۶۰ء کے بعد) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ان کا جواب تھا:

"رائے وائے کیا' ایک واقعہ سن لو" وہی میری رائے ہے۔ ظفر اوگانوی کو جانو ہو' ایک دن میرے پاس آئے اور مجھے ایک کتاب دیتے ہوئے کہا کہ آپا میرا افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے۔ لیجیے پڑھیے گا۔ اگلی ملاقات میں آپ کا تاثر جانوں گا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر آئے اور پوچھا۔ آپا آپ نے کتاب پڑھی' کیسی لگی؟ میں نے کہا: اے ظفر ای کاالول جلول لکھو ہو جی۔" ؎

شکیلہ اختر کا یہ کمنٹ جہاں ۱۹۶۰ء کے بعد کے افسانوی منظر نامے کی قلعی کھولتا ہے وہیں اردو افسانے میں مہملیت Absurdity سے گریز کا عقدہ بھی ہم پر وا کرتا ہے۔

؎ شکیلہ اختر سے ایک گفتگو (ریکارڈیڈ)

احمد ندیم قاسمی

غزل

کیوں میری سمجھ میں یہ معمّا نہیں آتا
اب رونا جو چاہوں، مجھے رونا نہیں آتا

جاتا بھی ہے، آتا بھی ہے خورشید ازل سے
انسان جو جاتا ہے، دوبارہ نہیں آتا

ہر دکھ کے جلو میں چلے آتے ہیں نئے دکھ
دکھ بھی ہے عجب دوست، کہ تنہا نہیں آتا

اک عمر سے اس فکر کی کشتی میں رواں ہوں
جس میں سے نظر کوئی کنارا نہیں آتا

جامد نہیں گر وقت، تو حیراں ہوں کہ اس میں
امروز ہی امروز ہے، فردا نہیں آتا

اے حسن، مجھے لمس کا اعزاز عطا کر
مجھ کو تو ہیولوں سے لپٹنا نہیں آتا

اختر سعید خاں
بھوپال

غزل

بے نیاز حسرت تعبیر ہوں
یعنی خواب دیدۂ تصویر ہوں
دیکھ بھی لے تو مجھے پڑھتا ہے کون
خط کشیدہ سی کوئی تحریر ہوں
اصطلاحاً جس کو دل کہتے ہیں لوگ
میں اسی اک حرف کی تفسیر ہوں
بڑھ نہیں پاتا حصار ذات سے
میں خود اپنے پاؤں کی زنجیر ہوں
مجھ سے کتراتی ہے کیوں طوفاں کی موج
ایک بے بنیاد سی تعمیر ہوں
سر گراں ہیں مجھ سے کیوں اہل ستم
میں تو اب اک آہ بے تاثیر ہوں
کھل نہ پائی اپنے ہی دل کی گرہ
شرمسار ناخن تدبیر ہوں
مجھ کو تنہا دیکھ کر کہتی ہے رات
ہائے کس مجبور کی تقدیر ہوں
خود حریف دل تھی میری زندگی
میں ہی اختر لائق تعزیر ہوں

ادا جعفری
43/8B.Block 6
P.E.C.H. Society
Karachi-75400

گواہی

تھک گئی تھی
اور چھالوں سے مرے تلوے بھرے تھے
ادھر ناگن سی کالی رات
میری سمت بڑھتی آ رہی تھی
ایسے میں تمھیں آواز دی
اور پھر اسے آواز دی
جس نے کبھی تنہا نہیں چھوڑا
اسے آواز دی
اور پھر وہیں
ان سنگریزوں پر بچھا کر اوڑھنی
اک گھر بنا لیا
اپنا گھر
وہ جس کی چھت ستاروں سے مرصع تھی
جڑے تھے جھلملاتے، جگمگاتے
ان گنت روشن ستارے
کہ جیسے آنکھ میں پہلی محبت کا اجالا ہو
کنول موسم کے آنے کا سندیسہ ہو
ہوا کے نرم جھونکے
مجھ سے باتیں کر رہے تھے
محبت اور گھنیری چھاؤں
اور اجلے سنہرے دن کی سب باتیں
وہ میری اور تمھاری داستاں تھی
یا کسی سوکھی ہوئی ٹہنی پہ کوئی
پھوٹتی کونپل تھی
اور میں تھی
کہ اپنی اور تمھاری داستاں
سنتی رہی، سنتی رہی
سنتی رہی...

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی

پروفیسر سید وحید الدین مرحوم

(استاد عالم اور فلسفی)

سٹی کالج (حیدر آباد دکن) سے میٹرک کرنے کے بعد میں نے انٹر میڈیٹ کی تعلیم کے لیے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا تھا۔ انٹر میڈیٹ میں میرے اختیاری مضامین نفسیات، منطق اور معاشیات تھے انٹر میڈیٹ کے بعد بی اے کے لئے میں نے فلسفہ کا انتخاب کیا تھا۔ اگر میں چاہتا تو معاشیات یا انگریزی میں بی اے کر سکتا تھا۔ لیکن فلسفہ سے میری رغبت کے کیا محرکات تھے ان پر میں فی الحال روشنی نہیں ڈالوں گا۔ بی اے اور ایم اے میں فلسفہ سے متعلق جن اساتذہ صاحبان کے آگے میں نے زانوئے ادب تہہ کیا تھا ان میں بی اے سے ایم اے تک تدریسی فرائض انجام دینے والے پروفیسروں میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر شیو موہن لال ماتھر، پروفیسر مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر میر ولی الدین، پروفیسر صلاح الدین اور ڈاکٹر سید وحیدالدین کا شمار ہوتا تھا۔ پروفیسر وحیدالدین ان سب کے مقابلے میں نہ صرف کم عمر تھے بلکہ شعبہ فلسفہ میں نووارد تھے۔

پروفیسر وحیدالدین حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۵ ستمبر ۱۹۰۹ء ہے ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد ایک خانگی مدرسہ میں شریک ہوئے جو آگے چل کر سرکاری اسکول میں تبدیل ہو گیا۔ سٹی ہائی اسکول سے ۱۹۲۸ء میں میٹرک کیا۔ میڈیم انگریزی تھا۔ ۱۹۳۳ء میں فلسفہ سے بی اے کیا۔ ایم اے کا پہلا سال مکمل کیا تھا کہ جرمنی جاکر تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ہوا۔ گورنمنٹ سے وظیفہ نہ ملنے کی صورت میں اپنی دادی کی جائیداد مکفول کر کے جرمنی چلے گئے۔ جرمنی کی ماربرگ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۷ء میں حیدر آباد لوٹے تقریباً ساڑھے تین سال بے روزگار رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں آپ کے لیے کوئی جگہ خالی نہیں تھی جیسا کہ خود ڈاکٹر وحیدالدین صاحب نے لکھا ہے۔ "اساتذہ کی تعداد قریب قریب طالب علموں کی تعداد کے برابر تھی اور فلسفہ کو اب کی طرح پہلے بھی لوگ ایک ذہنی تعیش سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔" ڈاکٹر سید حسین جو اس وقت

عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے عارضی طور پر ان کا تقرر شعبہ انگریزی میں جونیئر لکچرر کے طور پر کردیا۔ واضح ہو کہ جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعہ تعلیم قرار دیے جانے کے باوجود انگریزی زبان وادب کا معیار اس قدر اونچا تھا کہ جامعہ کے فارغ التحصیل طلبا کو یورپی جامعات میں تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ ویسے بھی وحیدالدین صاحب نے بی اے میں انگریزی میں امتیازی کامیابی حاصل کی تھی۔ شعبہ انگریزی کے صدر پروفیسر حسین علی خاں کا مشورہ تھا کہ آپ آکسفورڈ جاکر انگریزی زبان وادب کی تحصیل کریں۔ شعبہ انگریزی میں اس وقت کے ایک انگریز استاد پروفیسر اسپیٹ انگریزی میں وحیدالدین صاحب کی قابلیت کے مداح تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ذکر یار چلے گئے" مصنف مرزا ظفرالحسن نے اپنی کتاب میں پروفیسر اسپیٹ کا مذاق اڑایا ہے لیکن وحیدالدین صاحب نے ان کو ایک شریف النفس انسان تسلیم کیا ہے۔ وحیدالدین صاحب کا بیان ہے کہ جب وہ یورپ جارہے تھے تو تمام اساتذہ صاحبان میں سے صرف پروفیسر اسپیٹ پھولوں کا گلدستہ لیے انھیں الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔

جامعہ عثمانیہ میں ایم اے سال اول کا نصاب بڑی حد تک مشکل ہی نہیں بلکہ فلسفہ کے طلبا کے لیے کافی محنت طلب تھا۔ مغربی حکما کی حد تک کسی ایک فلسفی کے افکار کا خصوصی مطالعہ کرنا ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بی اے میں اسلامی فلسفہ پر درس دیتے ہوئے ایک مرتبہ استاذی مولانا عبدالباری ندوی نے فرمایا تھا کہ "جس طالب علم نے مغربی فلسفہ کی حد تک کانٹ(Kant) کو سمجھ لیا تو جان لو کہ وہ مغربی فلسفہ پر حاوی ہوگیا۔ اسی طرح اسلامی فلسفہ کی حد تک جس نے امام غزالی کو اپنا رہنما بنالیا تو سمجھ لو وہ اسلام کی روح سے واقف ہوگیا۔ مولانا نے کانٹ کی اہمیت جتلاتے ہوئے اس کا یہ فقرہ بھی دہرایا تھا۔ "میں نے علم کی تحدید اس لیے کی ہے کہ ایمان کے لیے جگہ نکلے۔" بہرحال مولانا کے یہ ارشادات میرے ذہن پر اس قدر نقش ہوگئے تھے کہ آگے چل کر میں نے خصوصی مطالعہ کے لیے کانٹ کا انتخاب کیا تھا اور پی ایچ ڈی کے لیے امام غزالی کے تصوف پر میں نے ریسرچ کی تھی۔ ایم اے میں میں نے ڈاکٹر وحیدالدین صاحب کی نگرانی میں کانٹ کا خصوصی مطالعہ کیا تھا۔ کانٹ ایک مشکل فلسفی ہی نہیں بلکہ اس کی شاہکار تصنیف تنقید عقل محض کے متن کو اچھی طرح سمجھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ ہم میں سے اکثر طلبا جرمن فرنچ اور یورپ کی دوسری زبانوں کے فلسفوں سے انگریزی تراجم کے ذریعہ ہی واقف ہوئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر وحیدالدین صاحب جب لکچر دیتے تھے

تو ان کے سامنے جرمن زبان کی اصل تصنیف ہوتی تھی۔ یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ صدر شعبہ فلسفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ۱۹۴۳ء میں امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل مقرر ہوکر Deputation پر کشمیر چلے گئے تھے جہاں بعد میں انھوں نے ناظم تعلیمات کا عہدہ بھی حاصل کیا۔ ۱۹۴۷ء میں حیدر آباد آگئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ڈین آف آرٹس فیکلٹی مقرر ہوئے تھے۔ اسی درمیان ڈاکٹر وحیدالدین صاحب شعبہ انگریزی سے شعبہ فلسفہ میں آئے تھے۔ جب خلیفہ صاحب ریٹائر ہوکر پاکستان چلے گئے تو وحیدالدین صاحب فلسفہ کی جائیداد پر مستقل ہوئے۔

ڈاکٹر وحیدالدین صاحب کے تبحر علمی اور ان کی پُرکشش شخصیت سے میں اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے متاثر رہا ہوں۔ ان دنوں جب میں ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر حاضر ہوتا تھا تو وہ اپنی ابتدائی زندگی کے حالات کے علاوہ اپنے قیام جرمنی کے واقعات بیان کرتے اور میں انھیں اپنی بیاض میں لکھتا جاتا تھا۔ پولیس ایکشن سے ایک ماہ پہلے جب میرا تقرر فلسفہ و نفسیات کے لکچرر کی حیثیت سے اورنگ آباد کالج پر ہوا تب بھی میرا پروفیسر وحیدالدین صاحب سے ربط قائم رہا۔ میری ذہنی اور ادبی تربیت میں ڈاکٹر صاحب کا خاصا حصہ رہا ہے۔ ابھی میں ایم اے کا طالب علم تھا کہ میں نے آرین پاتھ میگزین میں شائع شدہ غالب پر وحیدالدین صاحب کے انگریزی مضمون کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو ایک مقامی ہفت روزہ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس ترجمہ کو ڈاکٹر صاحب نے پسند فرمایا تھا۔ غالب کے اشعار کے ساتھ ماہ نامہ تحریک دہلی کے غالب نمبر میں شائع ہوچکا ہے۔ ریاستوں کی تنظیم جدید کے بعد مجھے مہاراشٹر کے حوالے کردیا گیا تھا۔ اس طرح میرا تعلق بحیثیت استاذ ہی مادر جامعہ سے منقطع ہوگیا تھا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر وحیدالدین صاحب کے عہد میں مجھے ممتحن مقرر کیا گیا تھا۔

ان دنوں جامعہ عثمانیہ میں وظیفے پر سبکدوش ہونے کی مدت ۵۵ سال تھی۔ وظیفے کے بعد ایک سال کے لیے ڈاکٹر وحیدالدین صاحب کا دوبارہ تقرر ہوا۔ اس کے بعد دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر وحیدالدین صاحب کا تقرر بحیثیت صدر شعبہ فلسفہ ہوا۔ پروفیسر ہمایوں کبیر اور ڈاکٹر سچیدانند مورتی سلکشن کمیٹی کے ممبر تھے جنھوں نے آپ کو صدارت کے لیے منتخب کیا تھا۔

دہلی یونی ورسٹی میں شعبہ فلسفہ کی صدارت کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر سچیدانند مورتی (سابق وائس چانسلر والیئر یونی ورسٹی) کا ایک انگریزی مضمون ترجمے

کی غرض سے روانہ فرمایا تھا جو برصغیر کے مسلمانوں کے فلسفیانہ افکار کے بارے میں تھا۔ میرا یہ ترجمہ ماہ نامہ برہان میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح دہلی یونیورسٹی کی صدارت کے زمانے میں آپ نے ایک سے زائد بار مجھے بی اے کا ممتحن Appoint کیا تھا۔ دہلی یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد پروفیسر وحید الدین صاحب نے ہمدرد فاؤنڈیشن کے تحقیقی ادارے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ لیکن جب ہمدرد یونیورسٹی بن گئی تو حیدرآباد واپس آگئے کیونکہ سرکاری قوانین لاگو ہوگئے تھے۔ آپ کے دہلی کے قیام کے دوران ایک عیسائی عالم Troll سے دعا کے موضوع پر طویل گفتگو ہوئی تھی۔

(Experience Of ravyr: Christian Troll En Conversation With Vabiduddin یہ گفتگو روم کے ایک رسالہ Encounter میں شائع ہوئی تھی (اکتوبر ۱۹۷۷ء) اس کی زیراکس کاپی پروفیسر وحید الدین صاحب نے مجھے بھیجی تھی اور اپنے خط میں لکھا تھا۔ "میرا انٹرویو TRoll کے ساتھ غیر مسلم دانشوروں کو کافی پسند آیا تھا کیونکہ اس میں بلا تامل اپنے حالات کا ذکر ہے۔ اگر آپ کبھی ترجمے کا خیال فرمائیں تو کسی موقر رسالے یں اسے شائع کیجیے۔"

میں نے انٹرویو کے صرف ان حصوں کا ترجمہ کیا ہے جو پروفیسر وحید الدین صاحب کے ابتدائی حالات زندگی سے متعلق ہیں۔

شروع ہی سے ہمارے گھر کا ماحول مذہبی رہا ہے جس کا مجھ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ میری دادی نہایت متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ ان کا میری تربیت میں بہت زیادہ حصہ رہا ہے۔ میرے والد کا جب انتقال (۲۸سال کی عمر میں) ہوا تو میں تین سال کا تھا۔ میرے دو بھائی ایک بہن ہیں۔ والدہ کبھی دادی کے پاس اور کبھی اپنے میکے میں رہتی تھیں۔ میرے بھائی اور بہن والدہ کے ساتھ رہتے تھے اور میں دادی کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے دادا سید فضل شاہ پنجاب سے آئے تھے مشائخ خاندان سے تھے۔ شاہ سلیمان تونسویؒ کے خلیفہ اور چشتیہ سلسلے سے منسلک تھے۔ خوش آب کے رہنے والے تھے۔ نہایت خوش خط تھے۔ ان کے لکھے ہوئے قرآن شریف کا ایک نسخہ میں جرمنی کے کتب خانہ کو دے آیا ہوں۔ میری دادی کے پاس ان کی لکھی ہوئی ایک ڈائری بھی تھی جس میں جگہ جگہ قادریہ سلسلے کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات کے حوالے ملتے ہیں۔ وہ رباعی بھی کہتے تھے۔ ان کی رباعیات میں معرفت کا رنگ زیادہ تھا۔

"والد میری دادی کے اکلوتے فرزند تھے۔ کم عمری میں دادی کی شادی ہوئی تھی۔ ابھی شادی کو دو سال ہوئے تھے کہ انھیں بیوگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ شوہر کا انتقال اور جوان بیٹے کی موت کا صدمہ۔ انھیں زندگی میں ان دو جانکاہ حادثات سے دوچار ہونا پڑا اور ان کا مجھ پر بھی اثر پڑا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ آج کل کی زندگی میں جب ہماری آرزوؤں کی تکمیل نہیں ہوپاتی تو ہم بے یقینی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مگر میری دادی کا ردعمل بالکل الگ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کی سب سے اہم اور قیمتی چیزیں کھودی تھیں۔ سہارے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے شوہر کو کھودیا اکلوتے فرزند سے محروم ہوگئیں' اس کے باوجود زمانے سے انھیں شکایت نہیں تھی۔ وہ میرے لیے ایک مثالی خاتون تھیں' جنھوں نے قرآنی تعلیمات کے مطابق خود کو اللہ کی مرضی کے سپرد کردیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ضعیفی میں صبح جب بھی وہ سورۂ رحمٰن کی تلاوت اپنے مخصوص لحن میں کرتی تھیں اور جب اس آیت فبای الاء ربکما تکذبٰن (۵۵-۱۳) کو دہراتی تھیں تو وہ آیت میرے ذہن میں گونجتی رہتی تھی۔ اس طرح اسلام سے میں اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں واقف ہوا۔ میں ایک ایسے ماحول میں پلا بڑھا جس پر اداسی اور یاسیت نے اپنا سایہ ڈال رکھا تھا' چونکہ میرے والد کا انتقال کم عمری میں ہوا تھا اس لئے والدہ وظیفے کی مستحق نہیں تھیں اور وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھیں۔ چنانچہ ان ناگفتہ بہ حالات کا مجھ پر غیر معمولی اثر ہوا۔ مصائب نے چاروں طرف سے آگھیرا تھا۔ اس کے باوجود میں خدا کا منکر نہیں ہوا تھا اور اس کا مجھے کبھی بھی خیال نہیں آیا کیونکہ مصائب کا سامنا کرنا آدمی کا مقدر ہے۔ میرے نانا نقشبندیہ مجددیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک غیر معمولی آدمی تھے۔ ان کی شخصیت کا مجھ پر گہرا اثر پڑا تھا۔ دوسرے کئی صوفیوں کی طرح وہ زاہد مرتاض نہیں تھے۔ حیدرآباد دکن کی ایک جاگیر میں مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے پاک اور صالح زندگی گزاری تھی۔ وہ صلح کل مسلک کے آدمی تھے۔ دوسروں کے عقائد پر نکتہ چینی نہیں کرتے تھے۔ میری نانی بھی متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں۔"

پروفیسر وحیدالدین صاحب کے مذہبی تصور کے ارتقاء میں محولہ بالا کوائف کا بڑا حصہ تھا عیسائی عالم ٹرال (TROLL) سے اپنی گفتگو میں پروفیسر صاحب نے اور بھی قرآنی مسائل جیسے دعا کی اہمیت اور غیب کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے لیکن میں نے اس طویل گفتگو میں سے صرف ان حصوں کو پیش کیا ہے جن سے ان کے حالات زندگی پر

روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر وحید الدین صاحب کے قیام دہلی کے زمانے میں کبھی کبھار ہمارے درمیان خطوط کا تبادلہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے فلسفیانہ اور ادبی موضوعات پر لکھے ہوئے بیشتر مضامین کے Offprints میرے پاس موجود ہیں۔ ان کی فہرست کافی طویل ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو دانشور فلسفہ اور نفسیات کے راستے سے ادب میں داخل ہوتے ہیں ان کی ادبی تخلیقات خواہ وہ انگریزی میں ہوں یا اردو میں حسن فکر اور ایک خاص اسلوب کی حامل ہوتی ہیں۔ غالب جن کو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم حکیم فرزانہ کہتے ہیں اور اقبال جرمن شاعر گوئٹے کا ہم نوا قرار دیتے ہیں ڈاکٹر وحید الدین صاحب کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ غالب پر انگریزی میں لکھے ہوئے تین مضامین کے آف پرنٹس میرے پاس پرنٹس ہیں۔ ایک مضمون کے اردو ترجمہ کا (جسے میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کیا تھا) ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ ان کا مضمون Ghalib The Restless Soul ایک لاجواب مضمون ہے جس کا اردو میں ترجمہ میں نے شروع کیا تھا لیکن مکمل نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر صاحب کی حیدر آباد واپسی کے بعد میری ان سے ایک سے زائد بار ملاقات ہوئی تھی۔ تب موصوف نے اپنے اردو مضمون "غالب کا حسن فکر اور حقیقت آگہی" کی زیراکس کاپی مجھے عنایت فرمائی تھی۔ انڈین فلاسفیکل کانگریس (۱۹۸۸ء) میں آپ نے جو صدارتی خطبہ پڑھا تھا وہ حد درجہ فکر انگیز ہے۔ ڈاکٹر وحید الدین صاحب کے دوسرے پسندیدہ مفکر اور شاعر اقبال ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے بہت کچھ لکھا اور کہا ہے۔ اقبال اور فکر مغربی اردو میں ان کے لکچروں پر مبنی رسالہ ہے جسے اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ خطبات جو اقبال کا عظیم نثری کارنامہ ہے اور جن کو اقبال کے فلسفیانہ افکار کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے اس کے مطالب کو اردو میں پیش کرنے کے لئے مغربی اور مشرقی فلسفوں سے کماحقہ واقفیت ضروری ہے۔ ڈاکٹر وحید الدین صاحب کی تصنیف فلسفہ اقبال خطبات کی روشنی میں (ناشر ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی) اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اسلامیات کے تحت ڈاکٹر صاحب نے کئی معرکہ آراء مضامین لکھے ہیں۔ ان کا لکچر Muslim Thought in Changing World حد درجہ فکر انگیز ہے۔ فارسی کے کلاسیکی شعرا میں حافظ شیرازی ڈاکٹر وحید الدین صاحب کے محبوب شاعر ہیں۔ حافظ پر آپ کا ایک مضمون Hafiz Poet Saint And Sinnfr امریکہ کے میگزین The Personalist میں شائع ہوا تھا جس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

میری تدریسی زندگی کے کئی سالوں تک بلکہ ریٹائرمنٹ اور اس کے بعد بھی ڈاکٹر وحیدالدین صاحب نے مجھے اپنے مکتوبات سے نوازا تھا اور فلسفیانہ مسائل کے سلسلے میں میری رہنمائی فرمائی تھی۔ یہاں میں صرف ایک خط کے متن کو نقل کرنا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے اپنے قیام جرمنی کے زمانے میں کئی فلاسفہ سے ملاقات کے بارے میں میرے استفسار کا جواب لکھا تھا۔

"ہاں میں نے مارٹن ہائیڈگر (Martin Heidegger) کو فرائی برگ میں سنا ہے۔ وہ اس وقت "شلنگ اور مسئلہ آزادی" پر لکچر دے رہے تھے۔ (وجودیت کے فلسفہ کے ضمن میں میں نے ہائیڈگر کی تصنیفات کو بغور پڑھا ہے۔ سارتر نے بھی جرمنی جاکر اس سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا فلسفی ناززم (Nazism) کا حامی اور ہٹلر کے مخالف یہودی پروگرام کا مبلغ کیونکر ہو سکتا ہے۔ جب وہ جرمن یونیورسٹی کا رکٹر تھا تو اس نے کئی ممتاز یہودی پروفیسروں کو یونیورسٹی سے نکال باہر کیا تھا۔

لیکن میری ملاقات ہسرل (Husseral) سے ہوئی جو ہائیڈگر کے استاد تھے اور جو مظاہریت کے فلسفہ (Phenonenology) کے بانی تھے بہت دلچسپ رہی۔ وہ اس وقت بہت ضعیف ہوگئے تھے اور اس کے بعد بہت دنوں تک زندہ بھی نہیں رہے۔ وہ یہودی تھے اور اس لیے حکومت سے بہت نالاں تھے پہلا سوال انھوں نے یہ کیا Do you want to bea philosopher or a professor of philosophy کہنے لگے ان کو کسی نے نہیں سمجھا اور مجھ سے کہا۔ "سب کو چھوڑو اور مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

میں نے ہائیڈگر سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ماربرگ میں ڈگری لینے کے بعد میں ہائیڈبرگ چلا گیا وہاں میری ملاقات سپر j a s p e r سے ہوئی اور ان کے seminar میں بھی شریک رہا۔ پھر جرمنی کو خدا حافظ کہنے سے پہلے میں روڈولف آٹو (Rudolf Otto) سے ملا جن کے ساتھ ایک ہی مکان میں میں نے دو سال گزارے تھے۔ وہ رہے ایک ممتاز عیسائی تھیالوجین اور میں ایک نوجوان مسلمان طالب علم۔ قریب قریب ہر روز میں ان کے ساتھ تفریح کو نکل جاتا تھا۔ وہ شادی شدہ نہیں تھے۔ میری باتوں سے ان کا دل بہت بہل جاتا تھا۔ میری یورپ سے واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ چل بسے۔ بہت غیر معمولی انسان تھے۔ وداع کے وقت انھوں نے کہا "اب تم کو جانا ہے۔ اس یقین کے ساتھ جاؤ کہ تم نے میرا دل موہ لیا ہے۔" اور میں نے ان کو اپنی

تصویر نذر کی اور پیچھے حافظ کا کوئی شعر لکھا۔ اب شعر یاد نہیں آرہا ہے (بہت عر ۔ ہوا روڈلف آٹو کے ساتھ لی ہوئی ایک تصویر ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی عنایت کی ں۔) جرمنی کو خدا حافظ کہنے کے بعد میں نے پیرس میں چند ماہ گزارے۔ وہاں میں تصوف کے عالم اور منصور شناس لوئی میسون (L Massignon) سے ملا تھا۔

اکتوبر ۱۹۹۵ء میں جب میں نے وحیدالدین صاحب سے ملاقات کی تو گفتگو کے دوران میں انھوں نے ایک خاص واقعہ بیان کیا۔

"میرا یہ ایقان ہے کہ کٹھن حالات میں بھی کوئی غیبی ہاتھ مدد کرتا ہے۔ سرمایہ ختم ہوچکا تھا۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ چاہے کچھ ہو پیرس میں چند دن گزاروں گا۔ لینڈ لیڈی خود چاے اور ناشتہ دیتی تھی اور بل رکھ دیتی تھی۔ پیسہ ہی نہ تھا کہ بل چکایا جائے۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے بجائے بل کے پیسے رکھ دیئے۔ ایک پرزہ پر اس نے لکھا تھا معلوم ہوتا ہے آپ کو پیسے کی تنگی ہے جب آپ کے پاس پیسے آئیں مجھے دے دینا۔ میں نے ہندستان آنے کے بعد پیسے بھجوائے۔

آخر میں ایک بات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ جامعہ عثمانیہ سے میرا اکیڈمک رشتہ منقطع ہونے کے بعد مجھے مرٹھواڑہ یونیورسٹی (اورنگ آباد) نے ڈاکٹریٹ کے لیے آزادانہ طور پر بغیر کسی گائیڈ کے ریسرچ کرنے کی اجازت دی تھی۔ ریسرچ کے دوران جب بھی حیدرآباد جانا ہوتا تو ڈاکٹر وحیدالدین صاحب سے ضرور رہنمائی حاصل کرتا۔ اس کے علاوہ کئی ریسرچ پراجکٹس تھے جن کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے میری رہبری فرمائی تھی۔ (بالخصوص مراٹھی انسائیکلو پیڈیا آف فلاسفی کے لیے میرے لکھے ہوئے اسلامی فلسفہ پر چار مضامین) گذشتہ سال (مئی ۱۹۹۸ء) میں ڈاکٹر وحیدالدین صاحب اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ پروفیسر وحیدالدین صاحب کی رحلت ان کے اعزہ اور احباب کے لیے ہی نہیں بلکہ میرے لیے بھی ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ وہ محض میرے استاد ہی نہیں تھے بلکہ میری ادبی اور علمی تربیت میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ فلسفہ آدمی کو نہ صرف جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے بلکہ اس کو موت کے لیے بھی تیار کرتا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر وحیدالدین صاحب مرحوم کی تمام علمی اور ادبی تخلیقات کا مکمل احاطہ ممکن نہ تھا۔ یہ فقط ایک استاد، عالم اور فلسفی کے حضور ایک حقیر سا نذرانہ عقیدت ہے۔

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

احمد صغیر صدیقی

جائزہ۔ ناجائزہ

ہمارے دانش ور، قلم بردار دوست حضرت خنجر بغدادی پہلے کم کم ملتے تھے، آج کل زیادہ آرہے ہیں۔

پچھلے دنوں وارد ہوئے تو بہت خوش اور خاصی ہیجانی کیفیت میں تھے۔ بیٹھ کر سانسیں درست کیں۔ پھر کانپتے ہاتھوں سے انھوں نے جیب سے دو عدد کاغذ بر آمد کیے اور میری طرف لہراتے ہوئے بولے۔ "لوجی بالآخر یہ آہی گیا جس کا بے حد انتظار تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ ہے کیا؟"

بولے۔ جائزہ ہے"

میں نے کہا۔ "کیسا جائزہ؟"

بولے۔ "ارے یار۔ میرے دیوان کا، اور کس کا"

میں نے کہا۔ "اچھا تو تمھارا کوئی دیوان بھی ہے؟"

وہ ہنسے اور فرمایا۔ "لوجی۔ تمھیں یہی نہیں معلوم۔ ارے ایک نہیں بہت سے ہیں۔ کچھ ترتیب شدہ ہیں۔ کچھ غیر ترتیب شدہ۔ کچھ ابھی کہے جارہے ہیں۔ مگر یہ سب باتیں چھوڑو۔ دراصل بات اس دیوان کی ہے جس پر میں مشاہیر ادب سے فلیپ، دیباچے اور جائزے وغیرہ لکھوا رہا ہوں۔"

"اچھا۔ تو یہ جائزہ ہے تمھارے کسی آنے والے دیوان کا؟"

"ہاں ہاں۔ اور یہ بڑا اہم جائزہ ہے۔ اسے استغفراللہ صاحب نے لکھا ہے۔

" تمھارا مطلب ڈاکٹر پروفیسر استغفراللہ سے ہے۔ خوب۔ وہ تو ملک کے بہت نامور ناقد ہیں۔ ذرا بتانا تو انھوں نے کیا لکھا ہے تمھاری بونگی شاعری کے بارے میں"

وہ ہنسے کہنے لگے۔ "تم میری شاعری کو کچھ کہو۔ یہ دیکھو ڈاکٹر صاحب نے کیا لکھا ہے۔"

انھوں نے دونوں شیٹیں مجھے دے دیں۔

یہ "جائزہ" جوں کا توں، نیچے لکھا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پرواز ابابیل۔ ایک جائزہ

حضرت خنجر بغدادی کے مجموعۂ کلام "پرواز ابابیل" کا مسودہ میرے سامنے ہے۔ میں اس پر اپنے تاثرات کا اظہار انتہائی معذرت سے کر رہا ہوں۔ خدا مجھے معاف کرے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کسی ادبی تصنیف پر کسی قسم کی درست رائے دینے کی اہلیت نہیں رکھتا، ہمیشہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے مطلق شرم بھی نہیں آتی۔ بس یہ خیال ذہن میں رہتا ہے کہ اس ملک کے ادبا اگر خود معاملے کو نہیں سمجھتے تو اس میں میرا کیا قصور۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ بات ہو رہی تھی حضرت خنجر بغدادی کی۔ بد قسمتی سے مجھے اب پڑھنے وڑھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی لہٰذا جناب خنجر بغدادی کا نام میرے لیے قطعاً نیا ہے اور یہ میرے لیے بالکل بے شناخت ہیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ بغداد کے ہیں یا ان کا تعلق تھانہ بغدادی سے ہے۔

میں نے مسودہ ملنے پر حسب معمول اسے کئی بار الٹا پلٹا۔ چونکہ شعر وادب سے متعلق میرا ابتدائی تاثر عموماً گمراہ کن ہوتا ہے لہٰذا میں نے اسے الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ کئی ہفتوں کے بعد میں نے یہی حرکت پھر کی۔ اس بار جو تاثر ذہن نے قبول کیا اسی کی روشنی میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

مسودے کے مشمولات سے جو اندازہ ہوا کہ جناب بغدادی خاصی اچھی رفتار سے شاعری کی جملہ اصناف پر چیش دستی کر رہے ہیں۔ چونکہ وہ کافی عرصے سے شاعری کر رہے ہیں ان کے کلام میں سقم وغیرہ کی تلاش بے سود ہے۔ وہ کہنہ مشق ہیں اور اس رعایت سے اس بات کے مستحق ہیں کہ وہ جس لفظ کو جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔

مجموعے میں پہلا حصہ غزل کا ہے۔ میں نے ان کی غزل میں جدید یا قدیم رجحانات تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ عموماً میں ایسی کوششوں میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا، البتہ مجھے اس میں شعور ولاشعور کے سارے منطقوں کے افقی اور

عمودی زاویے ضرور دکھائی دیے جن کی بنا پر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی غزل ن۔ م۔ راشد ا میراور جی کی ابتدائی غزلوں سے بہت دور نظر آتی ہیں اور یہی ان کی غزل کا جواز ہے۔ دیکھیے کیا حسب حال شعر کہا ہے۔

ہائے اس حویلی کو کیوں جلادیا تم نے

ہم کبوتروں کا تو ایک ہی ٹھکانا تھا

مسودے کا دوسرا حصہ "ہائیکو" پر مشتمل ہے۔ میں ابھی تک جاپان نہیں جاسکا ہوں لہٰذا ان کے بارے میں مجھے بہت معمولی شد بد ہے۔ مجھے امید ہے انھوں نے ان میں مناسب انحراف واختراع کے بعد انھیں کوئی خاص شکل ضرور دی ہوگی اور یہ کہ مستقبل قریب یا بعید میں یہ صنف سخن انہی کے نام سے رواج پائے گی۔ کیا عجب شباب ممکن کے بعد انھی کے ہائیکو کو سب سے زیادہ پسند کیا جائے اور خود جاپان والے عرصہ دراز تک انھیں یاد رکھیں۔

ایک ہائیکو ملاحظہ ہو۔

کھل گئے سارے راز

میرے حلق سے جو نہی نکلی

مینڈک کی آواز

اس مجموعے کا تیسرا حصہ "ماہیوں" پر مبنی ہے۔

اس میں انھوں نے جرمنی کے قریشی صاحب سے بغاوت کرتے ہوئے پونے تین مصرعوں کے بجائے سوا تین مصرعوں سے کام لیا ہے اور نوٹ میں لکھا ہے کہ اس کی وجہ سے، اس بک بک جھک جھک کا سدباب ہو جائے گا جو اس صنف سخن کے بارے میں آج کل ہو رہی ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس سلسلے میں ایک پوری کتاب لکھی جانی چاہیے جیسے "بڑھاپا اور اس کا سدباب" نامی کتاب لکھی جا چکی ہے۔ حضرت بغدادی کے ماہیوں میں سے ایک ملاحظہ ہو۔

دریا کی روانی ہے

انسان نہیں گھوڑے کی

یہ دو چشمی کہانی ہے

مجھے یقین ہے حضرت بغدادی کے جمالیاتی اظہار خیال کے زیر اثر یہ صنف

سخن جلد ہی یہاں سے افق کے اس پار پہنچ جائے گی۔

اس مسودے کا ایک حصہ نظم کے لیے بھی مخصوص ہے۔ اپنی نظموں میں جناب بغدادی نے جس "ساخت" کا سہارا لیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ساختیات پر خاصی درک رکھتے ہیں اور مدیر ماہنامہ ساختیات کی طرح بدیع الاسلوب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

مجھے امید ہے اپنے نظموں کی وجہ سے جلد ہی ان کا نام اعلادرجے کے شعرا کی صف ماتم میں ضرور نظر آئے گا۔

اس مجموعے یعنی "پرواز بابنیل" میں شاعری کی تقریباً تمام دوسری اصناف پر بھی ان کی طبع آزمائی کے نمونے موجود ہیں۔ مثلاً قطعات، ثلاثیاں، کہہ مکرنیاں، دوسطریاں، فی البدیہیاں، تروینیاں، نکے، ٹپے، گدّے وغیرہ۔

ان سے حضرت بغدادی کی قادر الکلامی کا پتا چلتا ہے۔ ایسی قادر اندازی فی زمانہ سوائے مکرمی و مخدومی جناب مراد آبادی کے اور کہیں نہیں ملتی۔ واللہ عالم۔

جناب بغدادی نے کتاب میں بڑی نظمیں بھی شامل کی ہیں اور کیا خوب ہیں۔ یعنی ہر نظم آدھی نظم میں ہے اور آدھی نثر میں۔ اپنی اس روش کی بنا پر وہ اطالوی نشاۃ ثانیہ کے فنکاروں سے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ ان سے ایک طرف "نثری نظم" کا جواز نکل رہا ہے اور دوسری طرف یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ جیسے سہ ماہی "کل پرسوں" میں چھپنے والے انگریزی نظموں کے ترجمے سارے کے سارے انہی کے کیے ہوئے ہیں۔

جناب بغدادی کا یہ مجموعہ اس لائق ہے کہ اسے صرف اردو میں نہیں بلکہ کئی زبانوں میں چھاپا جائے تاکہ ساری دنیا اس سے فیض اٹھا سکے، بلکہ میری رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے سنسکرت زبان میں منتقل کیا جائے۔ کیا عجب کہ یہ مردہ زبان ان کے کلام کی برکت سے زندہ ہو جائے۔

جیسا کہ میں اس سے قبل اپنے ہر جائزے میں دوسرے اور تمام مجموعہ ہائے کلام کے بارے میں لکھ چکا ہوں مجھے یہ لکھنے میں کوئی باک نہیں کہ بھلے ملک کے چھوٹے سے ادبی حلقے میں نہ سہی (کہ اس کا باوا آدم ہی نرالا ہے) یہ مجموعہ یعنی "پرواز ابابنیل" ملک کے وسیع غیر ادبی حلقے میں معتبر و مستحسن قرار پائے گا اور اس کے کم از کم سات اڈیشن تو ضرور شائع ہوں گے۔ ادب کی موجودہ شاندار فضا کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی بعید از فہم بات ہرگز نہیں ہوگی۔

استغفر اللہ عفی عنہ

عبدالقوی ضیا

منصورہ احمد

زخم زخم شخصیت کی شاعرہ

منصورہ احمد ہمارے ادب کی ان نوخیز شاعرات میں سے ہیں جو اپنی فکر و فن کی بالیدگی اور شعور کی پختگی کی وجہ سے ابتدا ہی سے قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ انھوں نے زمانے کے دکھوں کو اپنا دکھ سکھ سمجھ کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے سہارے اپنی جودت طبع کا حصہ بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں دونوں سجیلی سجیلی۔ البیلی البیلی دھوپ میں پگھلائی ہوئی، چاندنی میں نہائی ہوئی، چاند تاروں سے سجائی ہوئی پیارا پیارا دل ربایانہ لہجہ، نکھرا نکھرا ستھرا ستھرا انداز سخن۔ دلپذیرانہ اسلوب، اجلا اجلا سا دل لبھانے والا نیرنگ، آنکھوں سے قلب کی گہرائیوں تک اتر جانے والا رنگ و آہنگ اور اس سجے سجائے سے رنگ و آہنگ و نیرنگ میں عصری شعور اور تقاضائے وقت کے روشن روشن نشانات، بڑے واضح طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ گزرے ہوئے دور کے پسندیدہ اصطلاحات اور استعارات، وقت کے کروٹ بدلتے ہوئے مطالبات سے نہ تو گریزپا ہیں اور نہ ہی ان پر حاوی بلکہ ایک دوسرے کی ہم رشتگی میں دوش بدوش چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظمیں سبھی کی سبھی سنجیدگی اور فہمیدگی سے ہمکنار۔ کسی بھی نگارش سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعرہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ محض تفنن طبع یا وقت گزاری کی خاطر بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے مشاہدات میں وسعت، تجربات میں تنوع ہے۔ مروجہ روایات سے نہ تو زستگاری ہے اور نہ بیزاری بلکہ ان کو اپنے نت نئے تجربات سے ہم آہنگ کر کے اپنی فکر اور واردات قلبی کا ہمنوا بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نزدیک ایک فنکار کا سب سے بڑا جوہر یہ ہے کہ وہ اپنے پیش رووں کے تجربات کو ان رجحانات کے ہمدوش کر دے جو وقت کی آہٹ کو محسوس کرتے ہوئے دبے پاؤں عہد رواں کے ادب کا حصہ بننے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ایلیٹ کی اس رائے سے مطابقت کے ثبوت میں منصورہ کی نظم جس سے ان کے مجموعہ کلام 'طلوع' کا سورج جدیدیت کے افق سے 'بے انجام' میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

سنو!
اس رات کی دھڑکن میں
کن منہ زور قدموں کی دھمک ہے؟
یہ دل کس جبر سے سہما ہوا ہے؟
زمانوں سے زمانوں تک بھی اس رات میں
ہم ہاتھ آنکھوں پر لپیٹے
کیوں مسلسل چل رہے ہیں
زمیں اپنے سوا نیزے پر اوندھے منہ گری ہے
ہمارا ہر قدم کتنے نشیبوں میں لڑھکتا ہے
یہ کیسی بے ابد سی ہوک ہے
جو رات کے پس منظروں میں گونجتی ہے
کوئی گھٹ گھٹ کے جیسے بین کرتا ہو

اس اک چھوٹے سے بند میں سیاسی و سماجی حالات کے اتار چڑھاؤ کا جو المیہ ہے، اس کو دیانت داری سے پیش کر کے فنکارہ اپنی جرات اظہار اور بے باکی کا ثبوت دے رہی ہے اور اپنے قارئین کے دل و جگر کو ریزہ ریزہ بھی کر رہی ہے۔ اس پوری نظم میں جو کرب و آگہی ہے وہ ہماری آنکھوں کو نم دیدہ کئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ نظم بتدریج یوں آگے بڑھتی ہے!!

کبھی تم نے خبر نامے میں
لمبی میز کے چاروں طرف بیٹھے خدا دیکھے؟
کبھی ان کی نگاہوں میں جمی بیگانگی دیکھی
انھیں آسودگی یہ ہے
کہ ان کے فیصلوں سے
جن گھروں میں موت اترے گی
وہاں کے گھر نہیں ہوں گے!

پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعرہ نہ تو مصلحت کوش ہے اور نہ ہی مصلحت اندیش بلکہ حق گوئی اور بے باکی اس کا آئین فطرت ہے۔ اب ذرا کچھ اور آگے بڑھیے اور ان اشعار پر اپنی توجہ مبذول کیجیے!

تمھیں معلوم ہے یہ سرد آنکھیں تو ہمارے مقبرے ہیں
ہم ان قبروں میں عمریں بھوگ دیتے ہیں
مگر ایک پل بھی زندہ رہ نہیں پاتے
ادھر یہ میز کے چاروں طرف بیٹھے فقط یہ سوچتے ہیں
کہ قبریں اور گہری کس طرح کھودیں
یہ سورج باندھ سکتے ہیں تو سب کچھ باندھ سکتے ہیں
ہماری روشنی، تمھیں، ہوا سب ان کے قیدی ہیں
سویرے سے تہی یہ رات ہی آزاد پھرتی ہے

پوری نظم میں کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ فنکارہ کے فکر و ذہن کی بالیدگی کے سہارے یہ زینہ زینہ آگے بڑھتی ہے اور یوں انجام پذیر ہوتی ہے!۔

ہمیں کب تک نشیبوں میں لڑھکنا اور قبروں میں پنپنا ہے
چلو ایک بار ہی چیخیں
کہ اس پر ہول سناٹے میں کوئی گونج تو ابھرے
یہ ممکن ہے ہماری چیخ کی آواز
اس دیوار کی پرلی طرف جکڑے ہوئے سورج کو چھو جائے
مگر یہ کیسے ممکن ہے؟؟

اس پوری نظم میں اتنے جہان معنی پنہاں ہیں کہ پڑھنے والا اسے بار بار پڑھے اور ہر بار ایک نئی گتھی کو سلجھانے میں الجھ جائے۔ مجھے قاسمی صاحب کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ اس فنکارہ نے "بے انجام دل کے لہو میں قلم ڈبو کر لکھی ہے" اس کے پڑھنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے فنکارہ کا وہ قلم اب خود لہو لہو ہو گیا ہے اور نہ جانے کتنے پڑھنے والوں کا دل لہو لہو کر کے چھوڑ گیا۔

اہل علم اور اہل قلم اپنے وقت کی موثر آواز بھی ہوتے ہیں اور اس دور کی پہچان اور ترجمان بھی۔ اس کا اندازہ منصورہ کی ایک دوسری نظم بس اک تارہ چمکتا ہے، پڑھنے سے بخوبی ہوتا ہے۔ اس کا صرف ایک چھوٹا سا بند یہاں پیش کر رہا ہوں!!

لہو کی ایک گردش
جس میں سب رشتے بندھے ہیں
میری شریانوں سے ٹکراتی
اور آنکھوں سے پگھلتی ہے
سب اس گردش کی قیدی
پرندے میرے ہیرو ہیں

اس نظم میں جو احساسات کی فراوانی اور جذبات میں وجدانی کیفیت ہے وہ خود شاعرہ کو اس عہد کی نہ صرف ایک منفرد آواز بنا دیتی ہے بلکہ اپنی ہی گردش کا ایک بے سروسامان قیدی بھی۔ حتیٰ کہ وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اب انسانوں کے بجائے پرندے ہی اس کے ہیرو ہیں۔ یہ ایک بہت ہی لطیف اور نازک خیال ہے اور ہمیں ان کے لہجہ میں جو ندرت ہے اس کا احساس دلاتا ہے۔ اس کے بعد ہماری نظر جب آشوب، پر پڑتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ شاعرہ حالات کی بے راہ روی کی وجہ سے ندامت اور خجالت سے چور چور ہو کر، خدا کے حضور اس طرح دست بدعا ہو جاتی ہے!

خدایا! میری بستی کے مکینوں کو بشارت دے
یہاں تو رات دن سورج سوا نیزے پہ جلتا ہے
سنا ہے میری بستی پر کبھی شامیں اترتی تھیں
چہکتی بولیوں سے جاگتی تھیں نکھرتی تھیں
تو جھولا جھولتی سب لڑکیاں کھلکھلاتی تھیں
مگر اب رات دن سورج سوا نیزے پہ جلتا ہے

اس نظم میں بھی شاعرہ سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی آئینہ داری بڑی طرحداری اور چبھن کے ساتھ کرتی ہے اور اپنے قلم کو لہو رنگ کرکے بڑی بے تابی سے یہ کہہ اٹھتی ہے کہ!

میری بستی کے اندر سب جلتے ہوئے خیموں کے اندر دلہنیں ہیں
جن کے ہاتھوں سے ابھی مہندی نہیں چھوٹی
انھیں تو تتلیوں کے ساتھ شہر خواب جانا تھا
کہ ان کی سیج کی خوشبو کسی نے قتل کر ڈالی

شہر خواب بڑی تیکھی سی ترکیب ہے اور سیج کے قتل ہونے کی واردات دل میں ترازو

ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارا دل اسے پڑھ کر حزن وملال اور رنج واندوہ سے تڑپتا ہوا، بچوں کے ادھ جلے اور ٹیڑھے میڑھے کھلونوں کو نہلاتا ہوا دکھ درد کی ماری بہت سی ماؤں تک پہنچتا ہے اور ہم اپنے آپ کو ایسے عالم میں چاہتے ہیں جس سے پناہ ملنا آسان نہیں۔ آپ پڑھیں گے تو خود بھی اس کرب واضطراب کا شکار ہو جائیں گے۔ ذرا ایک نظر ڈالیے!

خدایا اتنی حدت ہے کہ بچوں کے کھلونے
ادھ جلے ہیں، آدھے ٹیڑھے ہیں
اور ان کے زرد چہروں پر جو آنسو سوکھتے ہیں
وہ فقط شہر ہزیمت تک کا راستہ بتاتے ہیں

☆

مزید ملاحظہ ہو!

تپش وہ ہے کہ ماؤں کی دعائیں اور رستہ دیکھتی آنکھیں
چٹختے خشک ہونٹوں کی دراڑوں میں
اٹک کر رہ گئی ہیں
گھروں میں صرف دہلیزیں بچی ہیں

آخر یہ سب کیوں اور کیسے؟ یہ وحشت ناک سوال شاعرہ کے دماغ میں ابھرتا ہے اور اس کا جواب وہ اس انداز سے دے پاتی ہے کہ اس شکست وریخت کا اصل سبب یہ ہے کہ!!

ہمیں ڈالر کی دہشت نے اپاہج کر دیا ہے
ہمارے سر بریدہ ہیں جسم بازاروں میں پھرتے ہیں

گویا یہ غارت گر زمانہ جسے ڈالر کہتے ہیں کتنے ہی لوگوں کو محبوس اور بے بس کیے ہوئے ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنا آسان نہیں۔ اس کے بغیر زندگی بسر کرنا ممکن نہیں اسی وجہ سے مجبور اور لاچار ہو کر تخلیق کار یہ فریاد کرنے لگتی ہے!

خدایا ایک بارش دے
ہمیں اتنی جسارت دے کہ ہم
پاتال میں جکڑی ہوئی اپنی صدائیں
اہرمن کی قید سے آزاد کرلائیں

نظم کا یہ حصہ خاصا دل گداز اور فکر انگیز ہے۔ عہد کی ناانصافیوں، حق تلفیوں اور

اہل قوت کی ستم کاریاں جو لاچاروں اور مجبوروں پر ہر روز روا ہوتی رہتی ہیں ان کی مکمل طور پر نشاندہی کرتی ہے۔ اس میں چبھن ہے، تڑپ ہے، کسک ہے، لہجہ میں کھرا پن ہے مگر کھردرا یا کھوکھلا پن نہیں۔ بیان میں گہری معنویت ہے۔ صوتی لذت ہے، الفاظ کے انتخاب میں ندرت ہے۔ نکہت ہے۔ علامتی اور استعاراتی نظام منصورہ کی اور بہت سی نظموں کی طرح اس میں بھی بڑی خوبصورتی سے ابھرا ہے۔ فکر میں قنوطیت کے بجائے رجائیت ہے۔ ذہن کی رسائی اور فکر کی رعنائی بلند حوصلگی لیے ہوئے ہے۔ پڑھنے والے کو یہ محسوس کراتی ہے کہ منصورہ کے یہاں ایک جہد کی تمنا ہے۔ آگے بڑھنے کی خواہش ہے۔

ذرا سی دیر کو آشوب کی سحر زدگی سے باہر نکل کر ایک دوسری تلاش کی طرف چلے چلیں۔

چلو پھر زندگی کو کھوجنے نکلیں
وہ شاید دائی ماں کے پوپلے چہروں کی شکنوں میں چھپی ہے
کہ اس کی اوٹ میں جو آسماں تھا وہ تو نیلا تھا
پرندوں کی اڑانوں اور روئی کے نرم گالوں سے سجا تھا
بگولوں سے پہلے کوئی حیران سی بچی
اس ابھی رہ گزر پر زندگی کو ڈھونڈتی آئی
مگر بابا کے نخلستان تک جاتے ہوئے پاؤں جلا بیٹھی
بگولوں میں گھری بچی کو گھر تک کس طرح لائیں؟
چلو پھر زندگی کو کھوجنے نکلیں
وہ شاید اس کی آنکھوں کے تذبذب میں بسی ہے
مگر وہ بھاگتی سی روشنی جس جگہ بھی ہے
مرے ہاتھوں کی حد سے ماورا، میری رسائی سے سوا ہے
میں اس کو ڈھونڈنے آخر کہاں جاؤں؟

زندگی کو کھوجنے والی چاروں بگولوں سے پہلے کی بات ہے کہ کوئی حیران سی بچی اپنی حیات کے عقدوں کو سلجھانے اور اپنی گم شدہ زندگی کو ڈھونڈنے نکلی ہے۔ وہ حیران سی بچی خود شاعرہ ہے جو ادھر ادھر بھٹکتی پھر رہی ہے اور جب اس کے سامنے "بس اک تارہ چمکتا ہے" تو وہ اس کی سمت مڑ جاتی ہے۔

طلوع میں ایک نظم آزمایش کے عنوان سے شامل ہے جو بظاہر تو خود مہاتما گوتم بدھ کی تپسیا پر لطیف طنز کرتی ہے مگر پڑھنے والے کو یہ محسوس کراتی ہے کہ شاعرہ کو اس مت سے دلچسپی ضرور ہے اور ہمیں یہ تلقین کراتی ہے کہ نروان کا حصول آسان نہیں لیکن یہ اگر میسر آجائے تو زندگی مکمل ہو جائے۔ وہ ہمیں یہ بھی باور کرانا چاہتی ہے کہ اسے تمام مذاہب کے اقدار و آداب کا پورا احترام ہے۔ یہ اقدار چاہے اسلام کے ہوں یا دوسرے ادیان کے۔

منصورہ نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اور جہاں اس کے ذہن و فکر کی نشو و نما ہوئی وہاں تنگ نظری، توہم پرستی، کم علمی، اقتدار پسندی، جاہ و منصب پرستی اس قدر عام ہے کہ اہل ثروت اہل غربت کو کچلے ڈال رہے ہیں پھر بھی ان کا ضمیر ملامت انھیں نہیں کرتا۔ قوم کے بیشتر افراد سرمایہ داری، جاگیرداری وڈیرہ شاہی کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہیں جہاں ذہانت، علمیت، ادبیت نااہلوں کے زیر اثر ناقدری کا شکار ہو گئی ہے۔ ایسے کشمکش کے عالم میں کسی ذہین فنکار یا فنکارہ کا ڈنکے کی چوٹ پر اس ناپسندیدہ معاشرے کے خد و خال کو نمایاں کرنا بڑے حوصلے اور دل جگرے کا کام ہے۔ اس نے جس شد و مد سے ملک کے معاشرتی نظام پر ضرب پہ ضرب لگائی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے 'نظم جلسہ عام' پر مفکرانہ طور پر نظر ڈالیے!!

سروں کا ایک سیل بے کراں ہے
سروں کے نیچے جتنے جسم ہیں بے اسم ہیں
جتنے بھی چہرے ہیں
سبھی پہچان اپنے گھر کی دہلیزوں کے اندر چھوڑ آئے ہیں
یہ سب آقاؤں کے اہرام کی زینت بڑھانے کے لیے
آواز کی لاشیں! اٹھائے مصر کے بازار آئے ہیں
یہ بیلٹ باکس کی محسوس دنیاؤں کے قیدی ہیں
جو دو وقتوں کی بنجر بھوک مٹنے کے دلاسے کے عوض
اپنی سبھی سانسیں
چمکتی گاڑیوں کے ٹائروں کی دھول میں
سستی سڑاندی سبزیوں کی چھابڑی ہیں
اور شفاخانے کے لیے جرثومہ اگلتے بستروں میں
رہن رکھ آئے

کبھی ہیبت زدہ ساکت سروں پر
خوف کی پرچھائیاں سی اگنے لگتی ہیں
تو آنکھیں کیمروں کی برق رفتاری سے
سارے منظروں کو قید کرتی ہیں
کہ دنیا تو آخر دیکھ لے
آقاؤں کی طاقت کا نظارہ
مورخ کے لیے بھی ایک دستاویز بن جائے
سروں کا سیل پھر سے بادشہ کی دید سے سرشار ہو کر
اطلسی محراب میں اپنے لہو کی بھینٹ دے گا
اور پھر دونوں
ہمارا بادشہ اور بادشہ گر
اپنے اپنے راستوں پر لوٹ جائیں گے۔

یہ ساری نظم بڑی بے باکی اور حوصلہ مندی سے لکھی گئی ہے
اس میں اور منصورہ کی دوسری نظموں میں بلند خیالی، بلند حوصلگی بلند آہنگی اور بلند نظری ڈرڈر کر دبے پاوں نہیں بلکہ بڑی دیدہ دلیری سے در آئی ہے جو اسے دوسری ہم عصر شاعرات سے ممیز اور مختلف کر دیتی ہے۔ اس کا تہذیب یافتہ ذہن ابلاغ کے روشن دریچوں کو وا کر کے قارئین تک اپنی بات پہنچانے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ اس کیفیت کا اندازہ دکھانے کے لیے ان کی 'نظم میں گڑیوں سے نہیں کھیلی' پڑھیے!

میں گڑیوں سے نہیں کھیلی
مرے بھائی مری گڑیوں کی ٹانگیں اور بازو توڑ دیتے تھے
آنگن میں اک سورج کا گھر تھا
جہاں سارے کھلونے اور غبارے بھک سے اڑ جاتے
تو پھر یہ کون ہے جو ہر گھڑی مجھ سے
مری ٹوٹی ہوئی گڑیاں
کھلونے اور غبارے مانگتا ہے
سنا ہے زندگی آغاز ہی بچپن سے ہوتی ہے
تو میری زندگی کا آغاز کب ہوگا؟

منصورہ زندگی کے ارتقائی مراحل سے گزرنے کے بارے میں اپنے آپ سے یہ سوال پوچھ رہی اور جانے کتنے ہی سوالات اپنے قارئین سے پوچھ ڈالتی ہے اور پھر متوقع ہوتی ہے کہ وہ اس کے جوابات دیں گے۔ تسلی بخش، اطمینان انگیز، مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

منصورہ کی نظموں میں نہ صرف موضوعات کے لحاظ سے بلکہ نئی نئی اصطلاحات اور خیال افروز استعارات واشارات کی بنا پر بھی جدید تر لفظیات کے خوبصورت جواہر پارے جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ بہت سی فرسودہ اور مستعمل شدہ تشبیہات اور تلازمات کو نیا پیکر عطا کیا ہے نہ صرف یہ بلکہ بہت سے اصطلاحات اور تراکیب کو جنم بھی دیا ہے۔ مثال کی طور پر ناشنیدہ لمحے۔ بے ابد ہوک۔ خاکستری گلیاں آہن پوش سانسیں۔ نابود لمحے۔ غنودہ لمحے۔ باسی لمحے۔ دم توڑتی پگڈنڈیاں لفظوں کا سنگھاسن۔ الزام اور دشنام کی اونچی مچانیں۔ گنگ حروف۔ بانجھ فریادیں۔ پت جھڑ کی سسکی۔ بے اسم جسم۔ دشت ازل، شب بے ماہ دوش سنگ۔ خزاں کی سرد گود۔ زہریلا سورج۔ خوابوں کی تلاش وغیرہ اس میں اثر آفرینی بھی ہے۔ نکتہ دری بھی۔ دلکشی بھی اور زندہ رہنے کی صلاحیت بھی۔

منصورہ کو جہاں اپنی ذات کے علاوہ سورج کی روشنی میں نہائے ہوئے عظیم اور محترم بابا سے پیار ہے۔ وہاں ننھے منھے معصوم بچوں سے بھی قلبی لگاؤ اور والہانہ محبت ہے۔ ان بچوں سے شاعرانہ لہجہ میں باتیں کرنے میں وہ ایک عجیب ذہنی لذت اور دلی مسرت محسوس کرتی ہیں۔ ان کی نظمیں پیارے بچو۔ اپنے بابا کے لیے، میں گڑیوں سے نہیں کھیلی، نارسا، بھولی ماں، بابا کے لیے ایک دعا، اس بات کی غماز ہیں وہ نہ صرف بے سہارا بچوں سے ہمکلام ہیں بلکہ جیسے خود انھیں اپنا بچپنا بھی یاد آرہا ہے۔ ان کے پڑھنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انھیں بچوں کی نفسیات سے بھی دلچسپی ہے۔ بالخصوص CHILD,S PATTERNS OF THOUGHT BEHAVIOR AND اور

CHILDREN,S SOCIALIZATION AND THEIR ATTITUDES

ایک بچہ کس وقت اور کن حالات سے متاثر ہو کر سن بلوغ تک پہنچتا ہے اور کن محرکات کے تحت اپنے آپ کو سوسائٹی کا اہم رکن سمجھنے لگتا ہے اس میں کون کون سے عوامل بچپنے ہی سے کام کرنا شروع کردیتے ہیں اس کا اندازہ اسے کچھ نہ کچھ ہے کہ بچوں کے تعلق سے "طلوع" میں شامل نظمیں اس کی غمازی کرتی ہیں۔ غالباً انھوں نے سگمنڈ فرائڈ کو پڑھا ہے کہ اس نے بچوں کی نفسیات کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر یہ بھی اس کے علم میں ہے کہ فرائڈ کے بہت سے نظریات بچوں کے تعلق سے اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں جہاں تک

میں سمجھتا ہوں اس ضمن میں MAX WERT HEIMERدراصل GESTAT PSYCHOLOGYکا موجد ہے اور NEO- FREUDIANSرجحانات کے زیر اثر KAREN HORNEY .ERICH FROMMاور H.S SULLIVANزیادہ قابل اعتماد اور ماہرین نفسیات سمجھے جاتے ہیں۔ انسانی ذہن اور جسمانی اعضا کے ارتقا میں کون کون سے عناصر کار فرما ہوتے ہیں اس میں ان کی تجسسانہ نظر بہت دور تک پہنچی ہے اور اس کے اثرات مجھے منصورہ کی نظموں میں کلی نہیں تو جزوی طور پر ضرور نظر آئے۔ زبان وبیان کے تعلق سے جو نئے نئے تجربات منصورہ نے اپنی نظموں میں کیے ہیں اس کی جھلک ان کی غزلوں میں بھی بطور خاص نمایاں ہے۔ ان میں بھی روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ واردات قلبی کی نگہداری بھی عمل پیرا ہے۔ ان میں اندھیری راتوں میں جگ مگ کرنے والے جگنوؤں کی سی چمک ہے۔ ستاروں کی دمک ہے۔ گل ونسترن کی مہک ہے۔ پھڑ پھڑاتی ہوئی چڑیوں کی چہک ہے۔ غزلوں کی سی لطافت نکہت اور نگہت بے ساختگی ہے، شائستگی اور دار فتگی ہے، غم دل بھی ہے غم دیگراں بھی، آنکھوں میں کھپ جانے والی IMAGERYکا حسن ہے۔ درون قلب سے نکلی ہوئی کرب انگیز صدائیں ہیں۔ کچھ اشعار بطور نمونہ یہاں پیش کرتا ہوں!!

زندگی بانجھ سی عورت تھی کہ جس کے دل میں	بوند کی پیاس بھی تھی، آنکھ میں سیلاب بھی تھے
زخم کیوں رسنے لگے اک تیر چھو لینے سے	دکھ سمندر تھے مگر موجِ پایاب بھی تھے
میں رنگ ہوں کہ صدا ہوں مجھے سجھائی نہ دے	کہ کربِ ذات میں مرے عکس کو اکائی نہ دے
انا کی کہر میں سب لپٹا ہوا ہے یوں مرا دل	مرے خدا کو بھی انوار کبریائی نہ دے
بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح خاک سے تا ہفت افلاک	دائرہ دائرہ، افسانہ درافسانہ پھر دل
تمام شہر میں تیرہ شبی کا چرچا تھا	یہ اور بات کہ سورج افق سے نکلا تھا
میں سب سمجھتی رہی اور مسکراتی رہی	مرا مزاج ازل سے پیمبر وں سا تھا
ملا کے سب آرزو کے کتبے	مرے سفر کی کتاب لکھ دے
وجود کے ٹھہرے پانیوں پر	مری صدا کا جواب لکھ دے

ہر چند کہ منصورہ نے غزلیں کم کہی ہیں مگر جتنی بھی کہی ہیں وہ بہت سے روایات پسند شعراء کے ضخیم مجموعوں پر بھاری ہیں۔ نئی نسل کی شاعرات رگ سنگ سے لہو رنگ کشید کرنے کا ہنر ان سے سیکھیں گی۔

پروفیسر عتیق اللہ
221، غالب اپارٹمنٹ
پیتم پورہ، دہلی ۳۴

اطرافِ رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی ہمارے ان مزاح نگاروں میں سے ایک ہیں جن کی شخصیت اور روزمرہ زندگی میں انضباط اور سنجیدگی کا عنصر، سب سے نمایاں اور دیگر تمام عناصر پر حاوی رہا ہے۔ اس احتیاط کی جھلک ان کی تحریروں میں بھی صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک طنز و مزاح نگار جب تک تھوڑا سا نڈر اور تھوڑا سا شریر نہ ہو اس سے یہ توقع رکھنا فضول ہی ہے کہ اس کا طنز کسی نئی سرگرمی کا باعث بنے گا اور مزاح میں وہ کھلا پن پیدا ہوگا جو ہماری طبیعتوں کی دُھند چھانٹ دیتا ہے۔ طنز و مزاح میں یوں بھی بے ضرر چیزیں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ استثنا کی ایک سامنے کی مثال رشید احمد صدیقی ہیں۔ شاید اسی بنا پر اسلوب احمد انصاری اپنی نئی تنقیدی تصنیف "اطراف رشید احمد صدیقی" میں جو رشید صاحب کے طنز و مزاح کی مختلف جہتوں کا احاطہ کرتی ہے، لکھتے ہیں: "رشید صاحب کار وبائے زیست اور مرکزی اقدار میں اس وسعت اور فراخی کی کمی کا احساس ہوتا ہے، جو بعض اعلا درجہ کے تخلیقی فن کاروں کے ہاں پائی جاتی ہے۔" دراصل اسلوب احمد انصاری کی نظر میں جس فراخی اور وسعت کا تصور کام کر رہا ہے، میں اسے تھوڑی سی وضاحت اور تھوڑے سے قبائلی انداز میں نڈرتا اور شرارت کا نام دے رہا ہوں۔ مگر میرا تاثر یہ بھی ہے کہ رشید صاحب ایک غیر معمولی خلاقانہ سعادت رکھتے تھے۔ اور اسی سعادت نے ان کی بہت سی کمیوں کی تلافی کچھ اس طور پر کی ہے کہ ہمیں رشید صاحب کو پڑھتے ہوئے نہ تو اس تکلف کا احساس ہوتا ہے جو پیدا ہوتا ہے علم سے اور نہ وہ تحدید کسی حس کا شکار کرتی ہے جو قائم ہوتی ہے علیگڑھ کے روزمرہ سے۔ رشید صاحب کی تحریر ہمیں بڑی خاموشی سے اس جال میں الجھا دیتی ہے جسے بڑی باریکی اور ہوشمندی کے ساتھ تخلیقی ذہانت نے بنا ہے اور جو ہمیں اکثر اپنی ترجیحات بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اسلوب احمد انصاری کی یہ تصنیف رشید احمد صدیقی پر لکھی ہوئی اب تک کی تحریروں سے یقیناً ایک اگلا اور بہت آگے کا قدم ہے۔ انھوں نے رشید صاحب کے تقریباً تما پہلوؤں کا بڑی معروضیت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ ان میں طنز و مزاح کے مخصوص فن کو جو رشید صاحب اور صرف اور صرف رشید صاحب کا ساختہ ہے، علی الخصوص بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ان مضامین میں طنز و مزاح کا فن ایک بنیادی تھیسس قائم کرتا ہے کہ رشید صاحب نے اپنے ذہن کی براقی، احساس کی ندرت ونفاست اور زبان کے کینڈے پر اپنی بے پناہ قدرت کے طفیل لطف وانبساط کا ایک دفتر کھول دیا ہے۔ تخلیقی نثر اس سلسلے کا دوسرا اور افسانوی کردار تیسرا اہم مضمون ہے۔ اسلوب صاحب نے یوں تو رشید احمد صدیقی کے مزاح اور ان کے افسانوی کرداروں کی گوناگوں جہتوں اور ان کو ابھارے بلکہ ایک خاص طرز سے ابھارنے اور ذو معنی اور غیر متوقع خلاقانہ فقروں سے لدی پھندی زبان کو کئی ناموں سے یاد کیا ہے اور ان کا تجزیہ کیا ہے لیکن رشید صاحب کی تخئیل کے اس خاص عمل پر انھوں نے کوئی توجہ نہیں دی، جو فنتاسی کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے۔ رشید صاحب اپنے انشائیوں ہی میں نہیں بلکہ اپنے مرقعوں میں بھی اکثر حقیقت کو بڑی نیک نیتی اور سادہ دلی سے مسخ کر کے یا اسے بڑی حد تک گھٹا بڑھا کر کچھ اس طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر پیکر تصویر ایک کاغذی پیرہن میں اپنے خالق کی شوخی تحریر کا عبرت ناک نمونہ بن جاتا ہے۔ اسے عبرت ناک کہیں یا مضحکہ خیز، بہر حال وہ بار بار ہماری مروجہ لسانی ساختوں کو توڑتے ہیں، صورتیں بناتے ہیں پھر بگاڑتے ہیں، اس طرح کی توڑ پھوڑ سے انھیں بڑی لذت حاصل ہوتی ہے یہ مسوکیت ہے نہ مساویت بلکہ فنتاسی کی وہ صورت ہے جو حقیقت سے ایک طور پر متعارف کراتی ہے مثلاً

> "اسلام کا نظریہ نکاح مشتبہ ہے۔" اتنا بیان دے کر حاجی صاحب نے ڈاڑھی کو اس طور پر تکان دی، کہ ایک ایک بال باہمہ اور بے ہمہ ہو گیا۔ پیشانی پر شکنیں پڑنی شروع ہوئیں، تو سر کے بال خطِ استوا پر جا کر ختم ہوئے اور آنکھیں شاہ نامہ فردوسی بن گئیں۔"

> "مغالطے کی تحقیق و تفتیش میں میرے پاس وہی مواد ہے، جو سودا کو اپنے گھوڑے کے سلسلے میں دستیاب ہوا تھا۔ فرق

صرف اس قدر ہے کہ ان کے گھوڑے پر شیطان سوار ہو کر
جنت سے نکلا تھا اور بڑی تحقیقات سے یہ نتیجہ بر آمد ہوا کہ
مغالطہ خود شیطان پر سوار ہو کر دنیا میں آیا ہے۔"
"خلفشار کم ہوا، دیا سلائی جلائی گئی تو دیکھتے ہیں کہ حاجی بلغ
العلی بہ شکلِ سینٹ کلاویز وارد ہیں۔ بس یوں کہہ لیجیے کہ ایک
ڈاڑھی اور کمل پر حاجی صاحب اسی طور پر مسلط ہیں، جس طرح
سارے ہندستان پر یونین جیک۔ جہاں تک حاجی صاحب کے
چلنے کا تعلق ہے بہت کم لوگ اس راز سے آشنا ہوں گے کہ
فی الحقیقت ڈاڑھی اور کمل حاجی صاحب پر مسلط نہیں ہوتے
بلکہ خود حاجی صاحب ڈاڑھی اور کمل پر مسلط ہیں۔"

ان اقتباسات میں صرف زبان سے گزرنے ہی کا کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ حقیقت سے وابستگی کے ایک نئے طور کی جھلک بھی صاف نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ رشید صاحب شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ذہن میں جو ایک معیاری اور مثالی دنیا آباد ہے حقیقی دنیا اس کے منافی ہے۔ چاروں طرف حسن، نظم اور یگانگت کا فقدان ہے۔ نتیجہ اس مایوسی کی صورت میں نکلتا ہے جو انھیں فنتاسیہ کے لیے اکساتا ہے اور وہ حقیقت کے تخیلی متبادلات پیش کرنے لگتے ہیں۔ گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی ذہن میں یہ قوت ہے کہ وہ کسی وجود کے تجربے ہی کا تصور نہیں کرتا بلکہ تخیلی متبادل بھی خلق کر سکتا ہے کیوں کہ ہر حقیقت ایک سے زیادہ متبادلات کی حامل ہوتی ہے۔ اسی طرح رشید صاحب ایسے لمحوں میں جہاں بعض مغائر کو مسترد کرتے ہیں وہاں بعض نئے مغائر کی بنیادیں بھی فراہم کرتے ہیں۔

اسلوب صاحب کا اپنا ایک تنقیدی طریق کار ہے۔ وہ اپنی کسی بات کو کہیں مکمم بنا کر پیش نہیں کرتے کیوں کہ ان کے CONCEPTS قطعی واضح ہوتے ہیں۔ بحث جہاں کہیں علمی تعبیرات اور مغرب کے حوالوں سے بوجھل ہونے لگتی ہے یا بوجھل ہونے کا اندیشہ جہاں لاحق ہوتا ہے وہاں وہ فوراً اپنے استدلال قائم کرنے کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری کی یہ کتاب رشیدیات میں ایک اہم اضافہ ہے جو اپنے اجمال میں بڑی تفصیل کا حکم رکھتی ہے۔ میری نظر میں رشید صاحب کے آرٹ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بیسویں صدی کی آخری دہائی کی یہ سب سے بڑی سوغات ہے۔

ڈاکٹر محمد شاہد حسین

عوامی ذرائع ترسیل اور اس کی سماجی معنویت

عوامی ترسیل ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے اطلاعات' خیالات' تجربات' نظریات' علوم وفنون' تفریحی مواد' حالات حاضرہ عوامی مسائل اور دیگر بہت سی چیزیں تیز رفتاری کے ساتھ بڑے انسانی گروہ تک بروقت پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ترسیل عربی لفظ ہے جس کا مفہوم ہے بھیجنا' روانہ کرنا۔ اردو میں یہ انگریزی لفظ کمیونیکیشن (Communicaton) کی جگہ استعمال کیا جارہا ہے جو لاطینی لفظ کیمونس (Communis) سے بنا ہے۔ جس کا مطلب ہے شریک کرنا۔ ہر شخص کے اپنے خیالات' تجربات ومحسوسات ہوتے ہیں جس میں وہ دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا بنیادی طور پر خیالات محسوسات اور تجربات' میں دوسروں کو شریک کرنے کا عمل ہی ترسیل کہلاتا ہے۔

چنانچہ جب کوئی شخص اپنے خیالات' محسوسات یا تجربات کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے مناسب الفاظ' اشارات' تصویر یا کوئی اور نظر آنے والا نشان چنتا ہے' جو اس کے خیالات کو صحیح اور مکمل طور سے دوسروں تک پہنچادے۔ دوسرا شخص ان الفاظ' اشارات یا تصاویر کو موصول کر کے اس کے ذریعے پہلے شخص کے تصورات کو سمجھتا ہے' پھر اسے بتاتا ہے کہ اس نے اس کی بات سمجھ لی ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ترسیل ایک دوطرفہ سماجی عمل ہے جو انسانی معاشرے میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ سماج ہی ترسیل کا دائرہ ہے اور یہی اس کی تنظیم کرتا ہے۔ لہٰذا ہم راہ چلتے بات کرتے یا کسی سے ملتے وقت کسی نہ کسی طرح ترسیل کے دائرے میں ہوتے ہیں لیکن یہاں خیالات کا مکمل اظہار یا اس کی صحیح ترجمانی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں مناسب تسلسل و توازن ہوتا ہے' اس کا دائرہ بھی محدود ہوتا ہے۔

چنانچہ خیالات' تجربات یا اطلاعات کو زیادہ ترتیب وار مکمل اور بھرپور طریقے پر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ہم عوامی ذرائع ترسیل کا سہارا لیتے ہیں اور عوامی ذرائع ترسیل کے وسائل میں آج کل اخبارات' رسائل' کتب' فلم' ریڈیو' ٹی وی و تھیٹر کا شمار ہوتا ہے۔

عموماً ترسیل ارادی یا شعوری طور پر کی جاتی ہے۔ عوامی ذرائع کسی خیال' اطلاع یا تجربے

کی ترسیل ارادی یا شعوری طور پر کی جاتی ہے۔ عوامی ذرائع ترسیل میں ترسیل کی گئی تمام چیزیں شعوری اور ارادی ہوتی ہیں جن میں سوچ سمجھ کر الفاظ کا بامعنی اور مناسب استعمال ہوتا ہے۔ دوسری وہ جس میں کسی خیال اطلاع یا تجربے کی ترسیل غیر شعوری طور پر کی جاتی ہے۔ اس میں پیغام رساں کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کا معاشرے پر کیا اثر ہوگا۔

اسے مزید خانوں میں اس طرح بھی بانٹا جاتا ہے۔

ا۔ زبانی ترسیل:۔ اس میں کوئی شخص بولتا ہے دوسرے سن کر سمجھتے ہیں مثلاً کلاس میں ٹیچر بولتا ہے' طلبہ سن کر سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر یا ٹیلی فون یا وائرلیس پر کچھ بولنا سننا۔

۲۔ بصری ترسیل:۔ اس میں پیغام کی ترسیل تصویر یا کسی اور بصری نشان یا اشارات کے ذریعے کی جاتی ہے۔ مثلاً ٹریفک سگنل میں پیغام صرف اشارات کے ذریعے دیے جاتے ہیں۔ ٹی وی اور سنیما میں الفاظ اور تصویر دونوں کو ملا کر پیغام دیے جاتے ہیں۔

۳۔ تحریری ترسیل:۔ جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے اس میں پیغام رساں تحریر کے ذریعے پیغام کی ترسیل کرتا ہے۔ جسے پیغام حاصل کرنے والا پڑھ کر سمجھتا ہے لیکن خیال رہے پڑھنا ہمیشہ آنکھوں ہی کے ذریعے نہیں ہوتا "بریل" طریقہ تحریر میں ابھرے ہوئے نقطے استعمال کیے جاتے ہیں جنھیں صرف انگلیوں سے چھو کر پیغام حاصل کیا جا سکتا ہے۔

عوامی ذرائع ترسیل کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ سورس (Source) ۲۔ میسیج (Message) ۳۔ چینل (Channel)

۴۔ ریسیور (Reciever) ۵۔ فیڈ بیک (Feedback) ٦۔ اور بیریر (Barrier)

کسی بھی پیغام کو بھیجنے والا "سورس" ہوتا ہے۔ وہ پیغام میں کیا بھیجتا ہے یہ "میسیج" ہوا۔ یہ پیغام جس چیز کے ذریعے بھیجا جاتا ہے وہ "چینل" ہے جیسے اخبار و رسائل' تھیٹر' ریڈیو' فلم' ٹی وی پیغام کو جس کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ "ریسیور" ہے یعنی پیغام کو حاصل کرنے والا۔ اس پیغام پر اس کا رد عمل ہوتا ہے یہ 'فیڈ بیک" کہلاتا ہے۔ کبھی کبھی پیغام غلط طریقے سے موصول ہوتا ہے تو یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ "بیریر" یعنی رکاوٹ آئی۔

بیریر کی وجہ چینل میں خرابی ہو سکتی ہے مثلاً پرنٹ میڈیا میں چھپائی کا خراب ہونا۔ الیکٹرانک میڈیا میں آواز یا تصاویر کا واضح نہ ہونا یا گھر میں زیادہ شور کی وجہ سے آواز کا ٹھیک سے نہ سن پانا لہٰذا پیغام کسی بھی چینل سے بھیجا جا رہا ہو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ سورس سے ریسیور تک کوئی رکاوٹ نہ آئے۔

فی زمانہ پرنٹ میڈیا میں اخبارات 'رسائل اور کتب والیکٹرانک میڈیا میں ریڈیو ٹی وی اور فلم عوامی ذرائع ترسیل کے مقبول ترین وسیلے ہیں۔ یہ ہمیں ترغیب (Persuade) دیتے ہیں ۔ تفریح (Entertain) کے سامان مہیا کراتے ہیں۔ اطلاعات (inform) فراہم کراتے ہیں اور تعلیم (Educate) کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔

پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا یہ قارئین وناظرین کے ذہن کو بھرپور طریقے سے متاثر کرتا ہے یہاں تک کہ ان کے نظریات کو تبدیل کرکے کسی چیز کے بارے میں ان کی رائے بدل سکتا ہے اور اس طرح بہت سے معاملات میں انھیں ترغیب دیتا ہے گو کہ کبھی کبھی اس کے منفی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں لہٰذا کسی نئے خیال یا نئے نظریے کی ترسیل کے وقت یہ اچھی طرح پرکھ لینا چاہیے کہ اس کا معاشرے پر کیا اثر پڑے گا۔ اسی لیے عوامی ذرائع ترسیل کے سلسلے میں گیٹ کیپنگ (Gate keeping) کی بات بار بار دہرائی جاتی ہے۔

جہاں تک تفریح کا سوال ہے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عوامی ذرائع ترسیل آج ہماری تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ زمانہ قدیم میں تھیٹر یہ خدمت انجام دیتا تھا۔ پسندیدہ ڈرامے ہفتوں مہینوں چلتے رہتے 'ہزاروں لوگ لطف اندوز ہوتے۔ فلم کی ابتدا ہوئی تو یہی ڈرامے اس کا پلاٹ بننے لگے۔ تھیٹر کے مقابلے میں فلم کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فلم میں ان مناظر کو پیش کرنا ممکن ہو گیا جو تھیٹر میں نہیں دکھائے جا سکتے تھے جیسے بارش کا ہونا' سمندر میں جہاز کا ڈوبنا۔ پٹریوں پر ٹرین کا دوڑنا۔ ہوا میں طیاروں کا اڑنا۔

اطلاعات ہمیں صرف خبروں ہی کے ذریعے نہیں ملتیں 'بلکہ غیر خبری حصے یہاں تک کہ تفریحی مواد سے بھی ملتی ہیں۔ اور ان ہی کے ذریعے کوئی معاشرہ نئی فکر' نئی اقدار' نئی پالیسی' نئے ترقیاتی پروگرام اور دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرتا ہے۔

تمام عوامی ذرائع ترسیل کی اثراندازی کے پیش نظر اسی بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ اس کا براہ راست استعمال تعلیم کے لیے کیا جائے مغربی ممالک میں اس سلسلے کی کامیابی' یہاں بھی کامیابی کی ضامن بنتی جا رہی ہے۔ خصوصاً ٹی وی اس سلسلے میں بہت اہم رول ادا کر رہا ہے۔ اس کے رسیور کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ یہ سمعی اور نظری دونوں ذرائع سے اثر کرتا ہے۔ اس کی رسائی دور دراز علاقوں تک ہے یہ تمام چیزیں ہمارے گھروں کے اندر تک پہنچاتا ہے۔ دوسری اہم بات جو ٹی وی اور ریڈیو دونوں پر عائد ہوتی ہے وہ یہ کہ ان میں خواندگی کی شرط ختم

ہو جاتی ہے۔ پرنٹ میڈیا سے صرف خواندہ لوگ ہی استفادہ کر سکتے ہیں جبکہ ان سے ناخواندہ اشخاص بھی بہت کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔

دنیا میں رونما ہونے والے مختلف واقعات یا صورت حال میں ہر لمحہ ہوتی تبدیلی سے عوامی ذرائع ترسیل ہمیں بلا تاخیر آگاہ کراتے رہتے ہیں اور صرف آگاہ ہی نہیں کراتے بلکہ ہماری سوچ فکر اور برتاؤ میں تبدیلی لا کر نئے شعور سے ہم آہنگ کراتے ہیں۔ ہمارے تجربات وسیع کر کے نئے مسائل سے نبرد آزمائی کے لائق بناتے ہیں۔

آج دنیا کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی ترقی میں عوامی ذرائع ترسیل کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری روزمرہ کی زندگی منظم ہوئی ہے آج کا انسان اپنے ہر دن کا آغاز نئے طریقے اور نئے انداز سے کرتا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا عوامی ذرائع ترسیل کے ذریعے بھیجے جانے والے پیغام کو حاصل کرنے والا انسانوں کا ایک بڑا گروہ ہوتا ہے جسے ہم ایک معاشرہ یا سماج کہتے ہیں، اور یہ سماج عوامی ذرائع ترسیل کا ایک بڑا اہم عنصر ہے۔ اگر اسے الگ کر دیا جائے تو عوامی ذرائع ترسیل بے معنی ہو جائیں گے، البتہ عوامی ذرائع ترسیل کا سماج کے افراد کی فکر اور برتاؤ میں تبدیلی پیدا کرنے کا عمل ہر طبقے پر یکساں نہیں ہوتا مثلاً کھیتی سے متعلق پیغامات کی اہمیت اس شہری طبقے کے لیے کم ہو جاتی ہے جس کا کھیتی سے کوئی واسطہ نہیں، اسی لیے عوامی ذرائع ترسیل کے ذریعے کسی پیغام کو بھیجتے وقت یہ سوچنا پڑتا ہے کہ یہ سماج کے کس طبقے کے لیے ہے، لہٰذا ہمیشہ یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ یہ کسی نہ کسی طبقے کے لیے موزوں ہو اور اس میں ہر طبقے کے لیے کچھ نہ کچھ ہو، گوکہ اس کوشش میں یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی پیغام اتنے محدود طبقے کے لیے ہو جاتا ہے جو نسبتاً اس بڑے گروہ سے بہت چھوٹا ہوتا ہے جس تک پیغام پہنچانا عوامی ذرائع ترسیل کا مقصد ہے۔ یہ اسپیشل آڈینس گروپ کہلاتا ہے اور کبھی کبھی اس سے رابطہ قائم کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

ترسیل نے اشارات و نشانات کے ذرائع سے جدید وسائل تک ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ جدید دور کے انسان کے پاس نہ تو چوپال میں بیٹھ کر گپ کرنے کا وقت ہے اور نہ وہ سنی سنائی باتوں پر یقین کرتا ہے۔ آج لوگ میڈیا کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اس کے ذریعے بلا رکاوٹ پیغام حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ ایسے ہی سماج نے گلوبل ولیج (Golobal Village) کے نظریے کو جنم دیا ہے جہاں وقت اور فاصلے سمٹ جاتے ہیں لہٰذا جدید سماج کو میڈیا سماج کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اہم کتابیں

اقبال کا نظریۂ شعر اور ان کی شاعری

پروفیسر آل احمد سرور

اردو کے ممتاز نقاد اور دانش ور پروفیسر آل احمد سرور کا مایۂ ناز خطبہ جو دہلی یونیورسٹی میں نظام خطبات کے تحت ۷۷۔۱۹۷۸ء میں پیش کیا گیا۔ اس خطبے میں سرور صاحب نے اقبال کے نظریۂ شعر کے بارے میں نہایت فکر انگیز خیالات پیش کیے ہیں۔

قیمت-/45

نظام اردو خطبات کا 19 واں خطبہ

داستان امیر حمزہ

شمس الرحمٰن فاروقی

"داستان' زبانی بیانیہ' بیان کنندہ اور سامعین" کے عنوان سے یہ خطبہ اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں پیش کیا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کر دیا ہے۔

قیمت-/60

بازائیں نیند (ڈرامے)

پروفیسر شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کا چوتھا مجموعہ ہے' اس کے ڈرامے جیتی جاگتی آنکھوں کا تجربہ ہیں۔

قیمت-/75

ماضی کے دریچے سے

ڈاکٹر شوکت اللہ

اس کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین ان قدیم تاریخی عمارتوں سے تعلق رکھتے ہیں جو اب ہمارے لیے ایک عظیم تاریخی سرمایے کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں' ان میں کچھ عمارتیں World Heritage کی فہرست میں بھی شامل کی جا چکی ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں اور تاریخ کے طلبہ کے لیے ایک نہایت اہم کتاب

قیمت:-/75

فکر انسانی کا سفر ارتقا

خواجہ غلام السیدین

نظام اردو خطبات کا آغاز شعبہ اردو' دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۵ ہر فروری ۱۹۶۲ء کو ہوا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا اور صدارت ڈاکٹر سی ڈی' دیش مکھ' وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے فرمائی۔ ملک کے دیدہ ور ماہر تعلیم پروفیسر غلام السیدین نے مندرجہ بالا عنوان پر دو لیکچر دیے۔ اب اس خطبے کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔

قیمت:-/45

غالب کی شخصیت اور شاعری

رشید احمد صدیقی

یہ نظام اردو خطبات کا چوتھا خطبہ ہے جس کو ملک کے مایۂ ناز طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی نے پیش کیا ہے۔

(تیسرا ایڈیشن) قیمت:-/45

شمیم حنفی کی نئی کتاب

قاری سے مکالمہ

فکشن شاعری اور تنقید و تخلیق مضمرات پر مضامین کا مجموعہ۔ قیمت:-/150

ناز قادری
مہدی حسن روڈ، مظفر پور

غزل

اب غم لالہ زار کون کرے
ذکر دور بہار کون کرے

بے قراری ہے زندگی میری
آرزوئے قرار کون کرے

تیرے وعدوں کو آزما دیکھا
اب ترا اعتبار کون کرے

شام غم بن گئی اجل کا پیام
تاسحر انتظار کون کرے

چھیڑ کر قصہ خلوص ووفا
آپ کو شرمسار کون کرے

حسنِ ماضی مری نظر میں ہے
عہدِ حاضر کو پیار کون کرے

اپنا اپنا نصیب ہے اے ناز
شکوہ روزگار کون کرے

بخش لائل پوری
337,Staines Road Hounslow
Middx, London Twusap(U.K)

دوہے

(۱)

بے نور چراغوں میں
امن کے دعوے ہیں
سازش ہے دماغوں میں

(۲)

خطرے میں امانت ہے
اپنی سیاست میں
چوری ہے خیانت ہے

(۳)

ایسے بھی ستم دیکھے
جہل کے ہاتھوں میں
قرطاس و قلم دیکھے

(۴)

آنکھوں نے اتاری ہے
دل کی چوکھٹ میں
تصویر تمھاری ہے

(۵)

جتنے بھی وڈیرے ہیں
قوم کے ڈاکو ہیں
یا بنک لٹیرے ہیں

(۶)

جینے کے قرینے سے
سانس معطر ہیں
محنت کے پسینے سے

رفعت صدیقی

رات کا الاؤ

رات کے الاؤ کی
صرف راکھ باقی ہے
وہ جو کارواں کل رات
اس جگہ پہ ٹھہرا تھا
جس کے دم سے ساری رات
چاندنی کی بارش میں
ڈھولکی کی تھاپوں پر
گھنگھروؤں نے کتنے ہی
گیت گنگنائے تھے
پائلوں کی چھم چھم نے
میٹھے سر بکھیرے تھے
بازوؤں کی جنبش نے
دائرے بنائے تھے
رقص کرتے پیروں نے
لے کی تیز لہروں پر
شر اک جگایا تھا
وہ جو کارواں کل رات
اس جگہ پہ ٹھہرا تھا
جا چکا ہے جانے کس اجنبی سی منزل کو!
اب نہیں یہاں کچھ بھی
رات کے الاؤ کی' صرف راکھ باقی ہے!

عطا عابدی
اردو شعبہ' بہار قانون ساز کاؤنسل'
پٹنہ ۱۵

غزل

کوئی تازہ مصیبت چاہتی ہے
یہ دنیا پھر نصیحت چاہتی ہے
تصنع کی ہے قیدی ساعت غم
کوئی موقع ہو' زینت چاہتی ہے
تمنائے سکوں معراج پاکر
غریبوں کی اقامت چاہتی ہے
یہ آنکھیں بند ہونے پر مصر ہیں
نفس کچھ اور مہلت چاہتی ہے
جنوں کی فصل پھر سے باغ دل میں
نمو کی اک عنایت چاہتی ہے
کھٹکتی ہے ترقی دوسروں کی
حسد کی آگ قربت چاہتی ہے
ہر اک مرتے ہوئے لمحے سے 'دیکھو
امید اب بھی وصیت چاہتی ہے
فنا انجام ہے' یہ جان کر بھی
میری غفلت 'کہ مہلت چاہتی ہے
نہیں جنس وفا نایاب عابد
مگر اب وہ بھی قیمت چاہتی ہے

بشر صہبائی
۱۹۔ حاطہ منگا شاہ، بھوپال

غزل

مقدر بھی اگر مجھ سے خفا ہوتا تو کیا ہوتا
میں اس کے شہر میں بے آسرا ہوتا تو کیا ہوتا
میں اکثر سوچتا ہوں یوں ہوا ہوتا تو کیا ہوتا
میں اس کا اور وہ میرا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا
لگا لیتا ہے چہرے کی لکیروں سے وہ اندازہ
اگر ناصح تخیل آشنا ہوتا تو کیا ہوتا
ابھی تو کتری جا سکتی ہیں سب خاروں بھری شاخیں
فسادی پیڑ اونچا ہوگیا ہوتا تو کیا ہوتا
غنیمت ہے کہ نادانی نے مکاری عیاں کردی
اگر خنجر نشانے پر لگا ہوتا تو کیا ہوتا
لگا رہتا ہے میلہ عاشقوں کا نامرادوں کا
الٰہی وہ ستمگر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا
خدا کے فضل نے خاک شفا تجھ کو عطا کر دی
مسیحا مرض میرا لادوا ہوتا تو کیا ہوتا
سمجھ تو خوب لیتا ہے وہ کچھ لفظوں کی تہہ داری
اگر ناقد تخیل آشنا ہوتا تو کیا ہوتا
جہاں چہرے ہوں نظروں میں وہاں کیا قدر علم و فن
بشر ہم نے قصیدہ بھی لکھا ہوتا تو کیا ہوتا

متین سید
یٰسین منزل، بھوپال

غزل

بھول جا، مت رہ کسی کی یاد میں کھویا ہوا
اس اندھیرے غار میں کچھ بھی نہیں رکھا ہوا

تو الٹ کر دیکھ، ماضی کی کتاب زندگی
حاشیے پر کچھ نہ کچھ مل جائے گا لکھا ہوا

خواب میں رکھی گئی بنیاد شہر آرزو
جاگتی آنکھوں نے دیکھا یہ مگر، اجڑا ہوا

خود اٹھایا جو سوال اس کا نہیں کوئی جواب
بے زبانی نے بھرم رکھا چلو اچھا ہوا

مجھ سے خوشبو کی طرح جو دور رہتا ہے متین
میں صبا کی طرح اس کے گرد ہوں پھیلا ہوا

بی پی سریواستو ارتد ساغری
آر-۱۶-ا-سیکٹر ۱۱، نوئیڈا

غزل

دراز قامتی تیرا ہنر گیا آخر
جو قد کو میں نے بڑھایا تو سر گیا آخر

وہ جنگ جیت کے لوٹا تو لوگ پوچھتے تھے
لہو اچھالنے والا کدھر گیا آخر

کرے گا کون تعقب اداس لمحوں کا
کہ جو علیل تھا مجھ میں وہ مر گیا آخر

جو ایک لفظ تڑپتا تھا میرے ہونٹوں پر
وہ کرب بن کے لہو میں اتر گیا آخر

طلسم توڑ کے احساس فکر و خواہش کا
یہ کون روح کو بیدار کر گیا آخر

مجھے جنون تھا تاروں کو توڑ لانے کا
مگر میں خود بھی خلا میں بکھر گیا آخر

تمام عمر کے دکھ سکھ کو بانٹ کر اے رند
مرا غنیم مرے ساتھ مر گیا آخر

شمس فرخ آبادی
سحر و منزل، گولا گنج لکھنؤ

غزل

کون اچھا خراب ہوتا ہے
دل نظر کا حساب ہوتا ہے

اصل تو انتخاب ہوتا ہے
دریا جیسا سراب ہوتا ہے

پڑھنے والوں کے واسطے چہرہ
ایک کھلی سی کتاب ہوتا ہے

جو بھی دنیا برتنا جانتے ہیں
ان کو حاصل خطاب ہوتا ہے

بھیڑ میں رہ کے جو رہے تنہا
اس کا جینا عذاب ہوتا ہے

یوں زمانہ بنا کرے رستم
وقت افراسیاب ہوتا ہے

دل کا قصہ بھی شمس کیسے کہیں
وہ تو گونگے کا خواب ہوتا ہے

احساس آفاقی
چال ۸ بی بلاک نو پاڑھ مادے نگر کرلا ممبئی

رباعیات

داغ تعصبات نہ ماتھے سے دھو سکا
نقش دوئی کو پردۂ دل سے نہ کھو سکا
حیوانیت برتتا ہے مذہب کی آڑ میں
انسان آج بھی تو مہذب نہ ہو سکا

حساس بن کے دیکھ تو رنجور بن کے دیکھ
نادار بن کے دیکھ تو مزدور بن کے دیکھ
گر چاہتا ہے تجھ پہ حقائق ہوں منکشف
مظلوم بن کے دیکھ تو مجبور بن کے دیکھ

بدلے خیال آدمی حالات کے تحت
بدلے طریق زندگی حالات کے تحت
زاہد کی مے فروشی پہ حیرت نہ کیجیے
ایسا بھی ہوتا ہے کبھی حالات کے تحت

آنکھ سب رکھتے ہیں لیکن چشم بینا اور ہے
نور عرفاں سے ہو جو معمور سینہ اور ہے
یوں تو ہر انسان جی لیتا ہے دنیا میں مگر
عارفانہ طور سے احساس جینا اور ہے

حساسؔ کو اے واعظو! رنجور نہ کرو
یوں تم کسی شریف کو رنجور نہ کرو
جس کی نظر اک عالم انسانیت پہ ہو
اس کو حصار دین میں محصور نہ کرو

رضوان الرضا رضوانؔ
۲ کشمیر ہوسٹل، سلیمان ہال
اے ایم یو علی گڑھ

غزل

نظر نہ آؤں اسے میں تو یوں نہاں بھی نہیں
مگر دکھائی پڑوں اس قدر عیاں بھی نہیں

زمیں رہے نہ رہے دل میں یہ نہ ہو احساس
کہ میرے سر پہ تو قائم اب آسماں بھی نہیں

طلسم شب کا اثر بھی نہ اب رہا مجھ پر
اب اپنی آنکھ میں وہ خواب بیکراں بھی نہیں

بکھر گئے در و دیوار کھو گئی رونق
کہ وہ مکیں بھی نہیں اب وہ اب مکاں بھی نہیں

وہ آشنائے غم دل نہ ہو سکا رضوانؔ
ابھی تمام محبت کی داستاں بھی نہیں

ہیرانند سوز

ستیہ پال آنند کی شاعری میں دیومالائی رنگ

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی زندگی کا بیشتر حصہ انگریزی ادب کی تعلیم اور تدریس میں گزرا ہے۔ پہلے وہ بھارت میں پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے طلبہ کو انگریزی ادب پڑھاتے رہے پھر امریکہ ہجرت کر جانے کے بعد وہاں بھی انگریزی ادب کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یونیسکو کے تربیتی پروگرام کے تحت انھوں نے ریاض (سعودی عرب) میں انگریزی کے پروفیسروں کو بھی ٹریننگ دی۔ یورپی ماحول اور انگریزی ادب سے اس درجہ وابستہ رہنے کے باوجود ان کے ذہن میں اپنی قدیم تہذیبی روایات، قومی اقدار اور دھارمک اساطیر محفوظ رہیں جن کا ذکر ان کی نظموں میں کہیں براہ راست اور کہیں حوالے کے طور پر برابر ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے فکری رویے اپنی تہذیب اور مذہبی عقائد سے بدستور مجوے ہوئے ہیں۔ شاعر اپنے کلام میں فطری طور پر اپنے احساسات اور جذبات کی ہی ترجمانی کرتا ہے اور ان سوچوں کا احاطہ کرتا ہے جس کا تعلق اس کی ذات معاشرے یا اس ماحول سے ہو جس میں اس کی نشو نما ہوئی ہے۔ یہ بات ستیہ پال آنند کی شاعری پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ انسانی شعور و فکر کے ارتقا میں اساطیر ہمیشہ ایک اہم رول ادا کرتی رہی ہیں اور اس کی روشنی میں زندگی کے ضابطے مقرر ہوتے آئے ہیں ایک طویل عرصہ تک انسانی ذہن و فکر پر اساطیر کی حکومت رہی ہے۔ اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر دور میں انسان کی منطقی سوچوں کے رشتے دیومالائی ادب سے جڑے رہے ہیں، اسطور نگار کیونکہ بنیادی طور پر شاعر ہی رہے ہیں اس لیے اسطوری ادب کا رشتہ شاعری سے زیادہ گہرا ہے۔ یوں تو شہاب جعفری اور میراجی کی نظموں میں بھی دیومالائی اور اسطوری رنگ موجود ہے مگر ستیہ پال آنند نے مغرب کا فکری اسلوب اپنا کر مشرقی اساطیر کا احاطہ کیا ہے جس سے ان کی انفرادیت ابھر کر سامنے آئی ہے۔ وہ یورپ اور امریکہ کے جس

گوشے میں بھی رہے ہیں ان کا ذہنی رشتہ اپنے معاشرے اپنی تہذیبی روایات اور ہندستانی دیومالا سے جڑا رہا ہے۔ اسی جبلت نے ان کی شاعری کو متنوع دیومالائی رنگ عطا کیا ہے۔ اسطوری اسلوب کے ساتھ ساتھ ستیہ پال آنند کی نظموں میں مغربی تصورات کے تحت نامیاتی کوشش کی ہے جس سے تاثر کی تجسیم کی روایت کو فروغ ملا ہے اور خیالات کے پھیلاؤ کو تقویت پہنچی ہے۔ اساطیری حوالوں اور دیومالائی افکار نے اس عمل میں اپنا خاطر خواہ حصہ ڈالا ہے۔ ست پال آنند نے اپنے پہلے شعری مجموعے "دست برگ" میں شامل نظم "جیکل اور ہائیڈ" میں جہاں اپنی ذات کا تجزیہ کرتے ہوئے قدیم انگریزی ادب کے ضرب المثل کردار Dr.Jekal and Mr. Hyde کا حوالہ دیا ہے وہاں انھوں نے "پتھر کی اہلیہ" کے عنوان سے لکھی اپنی نظم میں رامائن کی کتھا کا ایک پہلو پیش کرتے ہوئے دور حاضر میں محبت کی کھوکھلی پاکیزگی پر بھی طنز کیا ہے۔ اسی طرح اس مجموعے میں شامل نظم آج کا فاؤسٹ میں جرمن لوک کتھا کا اسطوری کردار فاؤسٹ موجود ہے جس کا موازنہ شاعر نے اپنی ذات سے کیا ہے۔ گوتم کا چیلا، میں بھی آنند کے ہی دو روپ سامنے آتے ہیں ایک صدیوں پہلے کا بھکشو آنند اور ایک آج کا آنند جن کی شخصیتوں میں تضاد کا ایک لطیف سا اشارہ ملتا ہے۔

دوسرے شعری مجموعے کے "وقت لاوقت" کا بھی کچھ حصہ تتھاگت" نظموں کے تحت گوتم بدھ کی ذات اور ان کے فرمودات کے لیے مختص ہے جس میں بدھ ازم کی فلاسفی اور گوتم کی تعلیمات کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہ ساری نظمیں دیومالائی انداز میں ہی لکھی گئی ہیں۔

"لہو بولتا ہے" میں ایسی نظموں کی تعداد مقابلتاً زیادہ ہے جو لوک کتھاؤں، دیومالائی قصوں اور اساطیر الاولین کے تناظر میں لکھی گئی ہیں۔ اور جنھیں جدید فکری اسلوب سے سجایا سنوارا گیا ہے۔ "پرکٹی دو سون چڑیاں" پنجاب کی مشہور لوک کتھا کے دو کرداروں پورن بھگت اور لونا کی علامت کے طور پر پیش کی گئی ہیں جن کے جنسی تعلقات سماج کی نظروں میں قابل گردنی زدنی قرار پائے تھے اور یہ چڑیاں شاہی عتاب کا شکار ہو گئی تھیں یہ داستان پورے تاثر کے ساتھ علامتی انداز میں پیش کی گئی ہے۔

"قید دوام کے ساتھی" میں رشتہ ازدواج کو لچھمن ریکھا سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس استعارے کو رامائن کے پس منظر میں بڑی خوش اسلوبی سے نظم بند کیا گیا ہے۔

"زندہ در گور بہت زمیں" میں بھی رامائن کی کتھا کو بنیاد بنا کر عورت کی مظلومیت کی

داستان بیان کی گئی ہے۔ روایت ہے کہ سیتا زمین سے برآمد ہوئی تھی اور پوری سماج میں مرد ذات کی زیادتیوں کا شکار ہو کر پھر زمین میں سما گئی۔ اسی طرح دروپدی بھی مردوں کی بالادستی کے باعث بے عزت ہوئی۔ ستیہ پال آنند نے اپنی اس نظم میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ہندوؤں کے دونوں عظیم دھرم گرنتھ رامائن اور مہابھارت اس امر سے خالی نہیں ہیں کہ عورت ہمیشہ مظلوم رہی ہے اور رفیق حیات کی بجائے اسے ذاتی ملکیت سمجھا جاتا رہا ہے۔

"جدامجد بھیشم پتامہ" میں ستیہ پال آنند نے مہابھارت کے اہم کردار بھیشم پتامہ کے حوالے سے ہند وپاک کے عوام کو آپس میں بھائیوں کی طرح رہنے کی تلقین کی ہے۔ اس نظم میں دیومالائی کردار بھیشم پتامہ ہندستان کی سالمیت کا سمبل ہے اور تیروں کی سیج پر اس امید سے آنکھیں کھولے پڑا ہے کہ کب دونوں بھائیوں کے درمیان کھڑی نفرت کی دیوار گرے اور اس کی روح کو سکون نصیب ہو۔

"نٹ راج" شوجی کا لقب ہے، جو دیومالائی حوالوں کی بنا پر کل کائنات کی تعمیر اور تخریب پر قادر ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنی ذات کو نٹ راج سے منسوب کرکے اپنے اندر اور باہر کے برہمانڈوں کی منظر کشی نہایت خوبصورت انداز میں کی ہے "بالمیک" رامائن کا تخلیق کار تھا۔ نظم "بالمیکی" میں شاعر بالمیک کی بازیافت کا اس امید پر خواہاں ہے کہ شاید بالمیک کی تخلیقی صلاحیتیں اس کی شناخت کا وسیلہ بھی بن سکیں۔

نظم "لہو بولتا ہے" میں پیش کیے گئے نظریے کو ستیہ پال آنند نے بدھ مت کے ژین فرقے کی تعلیمات سے اخذ کیا ہے جس میں جنس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ دست برگ میں شامل تھاکت نظم "جسم اور جنس" میں بھی جنس کے بارے میں بدھ ازم کے نظریات کی وضاحت ہوتی ہے اور "وقت لاوقت" میں شامل تھاکت نظم "ذاتی فیصلہ" میں بھی جنس کے بارے میں بدھ مت کا موقف بیان کیا گیا ہے۔ نظم "سارتھی" میں مہابھارت کی رزمیہ داستان کے اہم ترین کردار کرشن کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔ روایت ہے کہ کرشن بھگوان کا روپ تھے اور پاپوں کا ناش کرنے کے لیے ہی دنیا میں آئے تھے۔ وہ رتھ بان کے طور پر کوروؤں اور پانڈووں کی جنگ میں شریک ہوئے تھے اور ارجن کے جنگ سے گریز کرنے پر انھوں نے اسے گیتا گیان دے کر زندگی کے رموز سمجھائے تھے اور کرم کانڈ کے فلسفے سے روشناس کرلیا تھا مگر آج وہی سارتھی اپنے گھوڑوں کی لگامیں تھامے خاموش کھڑا اجاڑوں طرف اپنی نظریں دوڑا رہا

ہے۔ وہ صدیوں کے لمبے سفر کے بعد عہد حاضر کے تناظر میں پھر کچھ کہنا چاہتا ہے مگر اب سوال کرنے والا کوئی ارجن ہی سامنے نظر نہیں آتا۔

"اہلیہ" رامائن کتھا کا ایک ذیلی کردار ہے جو بھگوان رام کی روحانی عظمت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس سے متعلق ستیہ پال آنند کی ایک نظم "پتھر کی اہلیہ" دست برگ میں بھی شامل ہے مگر "لہو بولتا ہے" میں اہلیہ کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ دونوں میں دیومالائی رنگ البتہ ضرور نمایاں ہے۔

"لوٹ جائیں" دیومالائی داستانوں پر استوار ایک بھرپور نظم ہے جس میں انتظار کی ایک ایسی کیفیت بیان کی گئی ہے جو بنی نوع انسان کا مقدر بن چکا ہے۔ اس یگ کا بھٹکا ہوا انسان رہنمائی کے لیے پھر سے کسی دیوتا کا منتظر ہے جو اس گمراہی سے نجات دلا سکے اور اسے بے سکونی کی صلیبوں سے اتار سکے مگر کہیں کوئی پیغمبر نہیں اترتا۔ دیوتا امرت منتھن کی مہم سے واپس نہیں آتے۔ ہر طرف ویران خاموشی ہے۔ امیدوں کے چراغ گل ہو رہے ہیں۔ منتظرین اب واپس لوٹ جانے کی سوچ رہے ہیں کہ وہ اب انتظار کی صدیاں پوری کر چکے ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ ستیہ پال آنند کے ان تین شعری مجموعوں میں شامل اور بھی بہت سی نظموں میں دیومالائی اور اسطوری اشارے ملتے ہیں جو ستیہ پال آنند کے دیومالائی ادب کی طرف رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ کہنا درست ہے کہ ہم عصر اردو شعرا میں ستیہ پال آنند وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اس اسطوری کرداروں کی شعری بازیافت کے عمل میں ان کرداروں اور ان سے وابستہ واقعات کو عصر حاضر کی گرہوں کو کھولنے میں معاون پایا ہے۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۰۔ الکوردیار منٹس
پٹ پڑ گنج، دہلی ۱۱۰۰۹۲

لوگ ہمیں بھی ڈاکٹر کہنے لگے

ادھر جب سے یہ اطلاع آئی ہے کہ جمشید پور کے کریم سٹی کالج کے اردو استاد افسر کاظمی نے ہمارے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ بعنوان "مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار" لکھ کر بہار کی رانچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے تب سے ہم گھر سے باہر ذرا کم ہی نکلنے لگے ہیں۔ مبادا آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس تحقیق کے بعد ہم منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے ایک پرانے دوست جو اردو کے ممتاز ناقد اور پروفیسر بھی رہ چکے ہیں اچانک راستہ میں مل گئے تو ہمیں دیکھ کر حیرت سے بولے "ارے! تم تو ابھی زندہ ہو۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تم کب کے گزر چکے ہو کیونکہ ابھی کچھ دن پہلے یہ اطلاع کہیں پڑھی تھی کہ کسی ریسرچ اسکالر نے تم پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ بھیا! ایک زمانہ میں تحقیق تو صرف مُردوں پر ہوا کرتی تھی۔ زندوں پر بھلا کوئی تحقیق کرتا ہے۔ تحقیق تو گڑے مُردوں کو اکھاڑنے کا کام ہے۔ زندوں کو گاڑنے کا نہیں۔"

ہم نے نظریں جھکا کر کہا "ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ تحقیق اصولاً مُردوں پر ہی ہونی چاہیے تاکہ موضوعِ تحقیق کے مرنے میں اب بھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہو تو وہ پوری ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات تحقیق زندوں کو مارنے میں بھی بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جو لوگ کسی وجہ سے بروقت مر نہیں پاتے اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس دھرتی کے سینہ پر مونگ دلنے کا کام انجام دیتے رہتے ہیں انھیں تحقیق کے ذریعہ ہی ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ کسی کو مارنے کا یہ بڑا مجرب نسخہ ہے۔"

ہمارے پروفیسر دوست نے پوچھا "پھر تو سچ سچ بتاؤ۔ اس اعتبار سے تم زندہ

ہو یا مر چکے ہو؟"

ہم نے کہا" میں نے تو یہ مقالہ اب تک نہیں دیکھا ہے۔ کیسے بتاؤں گا کہ زندہ ہوں یا مر چکا ہوں۔"

حیرت سے بولے" خدا کی قسم سچ بتاؤ۔ کیا یہ مقالہ تم نے نہیں لکھا؟"

ہم نے کہا" تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں خودکشی بھی کر سکتا ہوں۔ کوئی دوسرا مجھے ہلاک کر دے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن ایک شریف آدمی اپنے ہاتھوں ہی اپنا گلا گھونٹ کر اپنے آپ کو ہلاک بھی کر سکتا ہے یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" بولے" اگر یہ سچ ہے تو تم نرے بدھو ہو' میں دو چار نامی گرامی اہل قلم کو جانتا ہوں جن پر جب ان کی حیات میں بعض ریسرچ اسکالروں نے پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالے لکھے تو ان مقالوں کا ایک ایک لفظ خود انہی حضرات کا لکھا ہوا تھا۔ مقالہ نگاروں کا نہیں' ان کی بڑائی صرف اتنی تھی کہ اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود انھوں نے مقالہ پر مقالہ نگار کی حیثیت سے اپنا نام نہیں لکھا بلکہ اس مقالہ نگار کا لکھا جسے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنی تھی۔ اللہ اللہ قربانی اور ایثار کی ایسی مثال کہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔"

ہم نے ان کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔" بھیا میں اس بات کو نہیں مانتا۔ تم کیسے یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ مقالے مقالہ نگاروں نے نہیں بلکہ خود ان شخصیتوں نے لکھے تھے جن کے بارے میں یہ مقالے لکھے گئے تھے۔"

بولے" میاں! میں خود ایک ایسے مقالے کا ممتحن رہ چکا ہوں جس میں مقالہ نگار نے اپنے ممدوح سے بعض ایسے سوالات پوچھے تھے جو بخدا منکر نکیر بھی بعد مرنے کے ان سے پوچھنے کی جسارت نہیں کر پائیں گے۔ پھر لطف کی بات یہ کہ ان سوالات کے جواب میں مذکورہ شخصیت نے اپنا سینہ ٹھونک ٹھونک کر اپنے جو کارنامے مقالہ نگار سے بیان کیے تھے بخدا ان کی اطلاع ابھی تک کراما کاتبین کو بھی نہ ہوگی۔ ایک عمر کے بعد آدمی جب اپنے آپ کو Glorify کرتا ہے تو ایسی ہی خیالی دنیا اپنے اطراف آباد کر لیتا ہے۔ مانا کہ اکثر مقالہ نگار جوان ہوتے ہیں اور ان کا علم ان حضرات کے مقابلہ میں ہو سکتا ہے کمتر ہوتا ہو جن پر مقالے لکھے جاتے ہیں لیکن مذکورہ مقالہ میں جو باتیں لکھی گئی تھیں وہ کم علم سے کم علم مقالہ نگار بھی نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ ایسی باتیں یا تو پرائمری اسکول کا کوئی طالب علم ہی لکھ سکتا ہے یا پھر

زگمسیت کا شکار کوئی ایسا عمر رسیدہ شخص جس کے پاس اب کرنے کو کوئی کام باقی نہ رہ گیا ہو۔ یوں بھی بچہ ہر دم اپنے مستقبل کو رنگین بنانے کی تمنا رکھتا ہے اور عمر رسیدہ شخص اپنے بے رنگ ماضی کو رنگین بنانے میں جی جان سے مصروف رہتا ہے۔ مجھے تو دونوں کے سوچنے کے انداز میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یقین مانو اس مقالے کو پڑھتے ہوئے مجھے یکبارگی مقالہ نگار کے دماغی عدم توازن اور اس کی نااہلیت پر افسوس ہوا تھا لیکن اس اثناء میں میری نظر مقالہ کے ایک ایسے باب پر پڑی جس میں صیغہ واحد متکلم کا جابجا استعمال ہوا تھا۔ تب احساس ہوا کہ اس باب کو لکھتے ہوئے ممدوح کو یہ یاد نہیں رہا کہ وہ خود اپنے بارے میں مقالہ تو ضرور لکھ رہے ہیں لیکن اپنی طرف سے نہیں بلکہ مقالہ نگار کی طرف سے لکھ رہے ہیں۔ بس اسی بات پر ان کی چوری پکڑی گئی۔ بحیثیت ممتحن میں چاہتا تو اس مقالہ کو مسترد بھی کر سکتا تھا لیکن چونکہ یہ مقالہ اردو کے ایک نامی گرامی پروفیسر نے بھیس بدل کر خود اپنے بارے میں لکھا تھا اس لیے میں نے "ضرورت شعری" کی طرح "ضرورت پروفیسری" کے تحت اس مقالہ کو ڈگری کے لیے قبول کرنے کی سفارش کردی تھی۔" ہم نے کہا "حضور اردو کے پروفیسروں کی مصلحتوں کو آپ سے بہتر اور کون جا سکتا ہے لیکن جہاں تک ہمارے بارے میں افسر کاظمی کے مقالہ کا تعلق ہے اتنا ضرور عرض کریں گے کہ اردو کے کسی ریسرچ اسکالر کو ہم جیسا موضوع اور ممدوح نہ ملا ہوگا۔ ہمیں یاد ہے اور برادرم افسر کاظمی کو بھی یاد ہوگا کہ چار پانچ سال پہلے جب انھوں نے اپنے مقالے کے سلسلے میں ہم سے ملاقات کی تھی تو ہم نے انھیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہم زندوں پر تحقیق کے قائل نہیں ہیں اور اگر وہ واقعی ہم پر ریسرچ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مرحوم مان کر ہی ریسرچ کا بیڑہ اٹھائیں اور ہم سے کسی تعاون کی امید نہ رکھیں۔ حد ہوگئی کہ ہم نے انھیں اپنی صحیح تاریخ پیدائش تک یہ کہہ کر نہیں بتائی کہ جب ہم اس دنیا میں ہی نہیں ہیں تو اپنے پیدا ہونے کی تاریخ کس طرح بتا سکتے ہیں۔ ہم نے یہ احتیاط اس لیے بھی برتی کہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں ایک ریسرچ اسکالر ہم پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ دو ایک بار حیدر آباد میں موصوف جب ہم سے ملے تو احساس ہوا کہ ان کی ساری دلچسپی ہماری مزاح نگاری میں کم اور ان خواتین میں زیادہ ہے جن سے ہماری دوستی رہ چکی ہے۔ موصوف کا شخصی خیال تھا کہ اگر ان خواتین سے ہماری دوستی نہ ہوتی تو ہماری مزاح

نگاری کے تیور کچھ اور ہی ہوتے۔ بہر حال ہم نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ مستقبل میں کسی ریسرچ اسکالر سے تعاون کر کے اپنی "فرضی حیات معاشقہ" کو طشت از بام نہ ہونے دیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم افسر کاظمی کی ہمت، اہلیت اور صلاحیت کے قائل ہو گئے کہ ہمارے اتنے سارے منفی رویہ کے باوجود انھوں نے ہمارے بارے میں نہ صرف تحقیقی مقالہ لکھ لیا بلکہ اس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ سچ ہے کہ ایک ہی ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔

اب آپ سے کیا چھپانا کہ شخصی طور پر ہمیں افسر کاظمی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ملنے کی بے پناہ خوشی ہے۔ وہ اس لیے کہ جب بھی کوئی ہم سے ہماری اپنی تعلیمی قابلیت کے بارے میں پوچھتا ہے تو ہم اسے باتوں میں لگا کر کسی اور موضوع کی طرف لے جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہماری تعلیمی قابلیت کو جاننے پر اصرار کرتا ہے تو ہم اپنے بچوں کی تعلیمی قابلیت کے بارے میں بتانا شروع کر دیتے ہیں کہ ماشاء اللہ دو بیٹے انجینئر ہیں۔ ایک بیٹی تاریخ کی لکچرار ہے اور جلد ہی ڈاکٹر بھی بننے والی ہے۔ دوسری بیٹی بھی ماشاء اللہ استاد ہے۔ پھر بھی وہ اصرار کرے تو ہم اپنی گاڑی کا نمبر اور اس عہدہ کا حوالہ دینے لگ جاتے ہیں جس سے ہم سبکدوش ہوئے ہیں۔ ایسا کرنے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء میں ہم نے عثمانیہ یونی ورسٹی سے روتے بسورتے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس ڈگری کا پھٹا ہوا ایک چوتھائی حصہ اب بھی ہمارے پاس محفوظ ہے جس میں ہمارا نام اور رول نمبر تو درج نہیں ہے البتہ "درجہ دوم" میں پاس ہونے کا ثبوت ضرور موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ہم نے کبھی علم سے کوئی مطلب نہیں رکھا۔ علم کی اہمیت کا احساس تو ہمیں اس وقت ہوا جب ہم یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر باہر نکلے۔ اور لوگ تو یونی ورسٹی سے ایک بار ڈگری لے کر باہر نکلتے ہیں تو پھر کبھی علم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن ہم نے یونی ورسٹی سے نکلنے کے بعد ہی دوبارہ کسی یونیورسٹی میں ملوث ہوئے بغیر اعلا تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا جو آج تک جاری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس اعلا تعلیم کی کوئی ڈگری نہیں مل سکی۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۹۷۴ء میں لوگوں کے بہکاوے میں آکر ہم نے دہلی یونی ورسٹی کی شام کی کلاسوں میں شرکت کر لی تھی تاکہ وہاں سے ایم۔ اے کر کے اپنا شمار بھی پڑھے لکھے لوگوں میں کر سکیں، دو چار دن بعد ہی جب ہمیں نصاب کا علم ہوا

تو دیکھا کہ اس میں طنز و مزاح کے پرچہ میں خود ہماری مزاح نگاری کا جائزہ بھی شامل ہے۔ ہم اس صورتحال سے گھبرا گئے جہاں ہمیں خود اپنی ہی کتابیں پڑھنے پر مجبور کیا جارہا تھا۔ اس کے بعد ہم نے پھر کبھی دہلی یونی ورسٹی کا رخ نہیں کیا۔ ہمیں وہ جہالت بدرجہا بہتر لگی جس میں کم از کم یہ پابندی تو نہیں تھی کہ ہم اپنی ہی تحریروں سے علم زبردستی اسی طرح حاصل کریں جس طرح ایک زیر تفتیش ملزم سے اقبال جرم کروالیا جاتا ہے۔

تاہم اس کے بعد جب کبھی برسبیل تذکرہ کوئی ہم سے ہماری تعلیمی قابلیت کے بارے میں پوچھ لیتا تھا تو ہمیں کوئی معقول جواب دینے میں ہمیشہ دشواری ہی پیش آئی۔ مگر اب برادرم افسر کاظمی نے ہمیں اس سوال کا ایک معقول سا جواب فراہم کردیا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے۔ ایک ہندی رسالہ کے نمائندے نے ہم سے انٹرویو کے دوران یہی سوال ہم سے پوچھ لیا تو ہم نے ہنس کر کہا۔ "بھئی! اپنی تعلیمی قابلیت کے بارے میں آپ کو کیا بتائیں۔ من آنم کہ من دانم۔ رانچی یونی ورسٹی میں ایک صاحب نے ہم پر ریسرچ کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی دو اور خوش قسمت یونی ورسٹیوں میں دو بد قسمت ریسرچ اسکالر ہماری علمی بصیرت پر اپنی ذہانت کو ضائع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ چاہیں تو ہم جھوٹ موٹ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ڈگریاں نہیں ہیں مگر پھر بھی ہماری وجہ سے کئی لوگوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں مل رہی ہیں تو ایسے میں آپ ہماری تعلیمی قابلیت کے بارے میں کیا اندازہ قائم کریں گے؟"۔ ہمارے اس گول مول سے سوال نما جواب سے وہ نمائندہ کچھ اتنا متاثر ہوا کہ جتنی دیر وہ ہمارا انٹرویو لیتا رہا بار بار ہمیں "ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!" کہہ کر ہی مخاطب کرتا رہا۔ اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کی تکرار کو سن کر مسرت کا جو احساس ہوا اس کا اندازہ یا تو ہم ہی کرسکتے ہیں یا پھر ڈاکٹر افسر کاظمی جنھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل چکی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی "ڈاکٹریٹ" کی آڑ میں ہم بھی "ڈاکٹر" کہلائے جانے لگے ہیں۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ آخر میں ہم اپنے نوجوان دوست ڈاکٹر افسر کاظمی کے شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے عمر کے آخری حصہ میں ہمارے درجات بلند ہوتے جارہے ہیں۔

ڈاکٹر یعقوب یاور

شعبہ اردو، وسنتا کالج برائے خواتین۔
راج گھاٹ۔ بنارس

دلاور فگار کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری

طنز و مزاح ایک ایسا وسیلہ اظہار ہے جو سریع الفہم بھی ہے اور زود اثر بھی لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ اس کے توسط سے مسائل کی گہرائی میں اترنا اکثر ممکن نہیں ہو پاتا، پھر ہمارے ناقدین نے اسے ادب کے اس تیسرے درجے میں ڈال رکھا ہے جو اکثر ان کی توجہ سے محروم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موثر ذریعہ اظہار کے امکانات کھل کر سامنے نہیں آسکے جو اس کی اہمیت کو ثابت کرتے۔ ویسے تو ادب میں صنف سخن یا انداز اظہار کی بنیاد پر کسی شاعر کے مرتبے کے تعین کی کوشش کرنا کوئی مناسب عمل نہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ایسا اکثر ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ سچ بات تو بس اتنی سی ہے کہ سلیقۂ اظہار کی بنیاد پر صرف یہ متعین ہو سکتا ہے کہ کوئی تحریر ادب ہے یا نہیں۔ تحریر ادب ہوتی ہے یا پھر ادب نہیں ہوتی۔ اس بنیاد پر اول دوم درجے کی باتیں کرنا گمراہ کن بھی ہے اور ضرر رساں بھی۔

اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ ادبی تحریر میں معیار کا تعین نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میر، غالب، اقبال اور درد، مومن، حسرت سب ایک ہی ترازو میں تل کر مساوی قرار پائے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب شاعر ہم مرتبہ نہیں ہیں۔ ان سب کی اپنی علاحدہ شناخت ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ معیار کا یہ تعین صنف سخن یعنی طریقہ اظہار کی بنیاد پر نہیں بلکہ فکر و خیال کی گہرائی اور گیرائی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اظہار میں سلیقہ مندی کی اپنی علاحدہ اہمیت ہے لیکن اس کی اہمیت ثانوی ہے۔ طنز و مزاح بھی ایک وسیلۂ اظہار ہے۔ اس لیے کسی شاعر کے معیار اور مرتبے کا تعین محض اس بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لیے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ شاعر کی فکری کائنات اور تخیل کی پرواز کیا ہے۔ اگر ہم نے طنز و مزاح کو تیسرے درجے کا ادب سمجھنے کا وتیرہ یوں ہی اپنائے رکھا تو بھلا اس میں ان چیزوں کی تلاش کی زحمت کون کرے گا اور یہ کیسے طے

ہو گا کہ اس میدان میں کون سا شاعر کس مرتبے کا مستحق ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سنجیدہ شاعری کے مقابلے میں طنزیہ ومزاحیہ شاعری زیادہ موثر ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ جہاں سنجیدہ شاعری کا اثر دیرپا اور دائرہ اثر وسیع ہوتا ہے وہاں طنز ومزاح کا اثر وقتی اور محدود ہوتا ہے۔ طنز ومزاح جس تیزی سے سامع یا قاری پر اثر انداز ہوتا ہے اس کا اثر اتنی ہی تیزی کے ساتھ زائل بھی ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پڑھنے اور سننے والا اسے تفریح طبع کے طور پر قبول کرتا ہے اور اس میں موجود سنجیدہ اشاروں کو سنجیدگی سے قبول نہیں کرتا۔ اس کا سبب انسانی فطرت کا وہ خاصہ ہے جو غموں کو زیادہ گہرائی سے محسوس کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس کا اثر دیرپا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس خوشی اور مسرتوں کا احساس اتنی گہرائی تک نہیں پہنچتا چنانچہ اس کا اثر بھی قلیل مدتی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے باوجود جس طرح خوشی اور اس کی اثر آفرینی کے بغیر کسی زندگی کی تکمیل کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح زندگی کے عکاس ادب کی تکمیل بھی ان لمحات کو گرفت میں لائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ ادب میں طنز ومزاح کی اہمیت کا یہی جواز ہے۔ یہ ادب کی تکمیل میں معاون ہے۔ زندگی کو جتنی ضرورت سنجیدگی کی ہے خوش مزاجی بھی اس کے لیے اتنی ہی اہم ہے، اس لیے کم از کم اس بنیاد پر ایک کو کم تر یا ایک کو برتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ادب میں طنز ومزاح کی اہمیت بھی دوسری اصناف کے برابر ہے۔ نہ رتی کم نہ رتی زیادہ۔ ہاں اس سے متعلق شاعروں کے کم تر یا بہتر ہونے پر بحث کی جا سکتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے غزل کی بنیاد پر میر و میرزا کے کلام میں فرق کی روایت رہی ہے۔

طنز ومزاح کو ایسا ماحول زیادہ راس آتا ہے جہاں دستور زباں بندی کی گرفت سخت ہو، جہاں لوگ اپنے دل کی بات کہنے کو آزاد نہ ہوں۔ ایسے ماحول میں چونکہ راست اظہار خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اس لیے طنز ومزاح اور ابہام وایمائیت معاشرے کی ضرورت بن جاتی ہے۔ پھر اس کا استعمال تفریح طبع کے ساتھ ساتھ دل کا بخار نکالنے کے ایک محفوظ ذریعہ اظہار کے طور پر ہونے لگتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں اظہار پر کوئی پابندی نہ ہو، وہاں یہ طریقۂ اظہار محض شوق کی تکمیل کا مظاہرہ اور خوش طبعی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ ثانی الذکر کے مقابلے میں اول الذکر صورت حال طنز ومزاح کے معیار کی بلندی اور اس کے فروغ کا سبب بنتی ہے۔ ہندستان اور پاکستان کی سیاسی صورت حال اور وہاں تخلیق ہونے والے ادب کو سامنے

رکھ کر دیکھیں تو یہ بات زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔ ہندوستان میں طنزومزاح کو وہ ترقی حاصل نہ ہو سکی جو اسے پاکستان میں حاصل ہوئی۔ وہاں بھی یہ صنف ان حلقوں میں زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہے جہاں اظہار پر پابندی کا تناسب نسبتاً زیادہ ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مقابلے میں وہاں طنزومزاح کی ایک مستحکم روایت قائم ہوگئی ہے جو مسلسل پروان چڑھ رہی ہے۔

دلاور فگار طنزومزاح کے شاعر ہیں۔ ان کے شعری سرمایے پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں ابتداء عروج اور زوال کے مدارج طے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا تقریباً نصف اول ہندوستان میں اور نصف آخر پاکستان میں گزارا ہے۔ ان کی شاعری کا دور عروج ہندوستان کا دور آخر اور ہجرت پاکستان کا اولین زمانہ ہے۔ اس عہد میں ان کا کلام فنی اعتبار سے پختہ بھی ہے اور فکری اعتبار سے بلند بھی لیکن بعد میں شاید حصول رزق کی تگ ودو، فرمایشوں کی تکمیل اور حب پاکستان کے معنوی اور متواتر اعلان نے ان کے فکر اور ان کے فن دونوں کو متاثر کیا اور آخری دور تک آتے آتے ان کی شاعری محض منظوم صحافت بن کر رہ گئی۔

جب پاکستان کے معنوی پن کی بات یوں سامنے آتی ہے کہ حب وطن کوئی ایسا اختیاری جذبہ نہیں کہ اسے جب چاہا دل میں داخل کر لیا اور جب چاہا کھرچ کر پھینک دیا۔ یہ کسی سرزمین اور کسی ماحول سے اپنائیت اور قرب کے احساس کے ساتھ خود بخود وجود میں آتا ہے لیکن کسی ایک ملک یا خطہ کرض سے محبت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ انسان کسی دوسرے ملک یا بستی سے محبت نہیں کر سکتا۔ ہجرت پاکستان کے بعد ہندوستان کا ذکر خیر گناہ کا متبادل ہونے کے باوجود شعوری طور پر یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے دل سے ہندوستان کی محبت نکال دیتے اور اس کے بدلے پاکستان کی محبت اوڑھ لیتے۔ اس نئی جگہ اور نئے ملک سے محبت کے لیے وقت اور اپنے پن کا احساس درکار تھا اور اس کے لیے وہاں کے حالات سازگار نہ تھے۔ سیاست کے غلبہ کی وجہ سے حب الوطنی فی زمانہ لازمہ حیات بن چکی ہے۔ اس جبر کا تقاضا ہے کہ بھلے ہی یہ محبت آپ کے دل کی آواز نہ ہو، آپ کو وقتاً فوقتاً اس کا سچا جھوٹا اظہار کرتے رہنا ہے۔ یہ مسئلہ اکثر ان لوگوں کو پیش آتا ہے جو نقل وطن کرتے ہیں۔ یا پھر وہ اس ذہنی کشمکش سے دوچار ہوتے ہیں جو اپنی محبت کو جغرافیائی سرحدوں کا پابند نہیں بنا پاتے اور ساری

دنیا سے محبت کا دم بھرتے ہیں۔ دلاور فگار کا نقل وطن ان کی اس ذہنی کشمکش کا سبب بنا۔ ان کی شاعری میں حب پاکستان کا جذبہ کچھ ایسے ہی تذبذب کا شکار ہے چونکہ یہ جذبات پر مصلحت کی بالادستی کے تحت فن کار کی مجبوری ہے اس لیے اس مسئلے کو ان کے فن کی اساس بنا کر اس کے متعلق گفتگو کرنا نہ تو قرین انصاف معلوم ہوتا ہے اور نہ اس سے کسی بامعنی نتیجے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں دوسرے زاویے میسر ہیں جن کی بنیاد پر بہ آسانی ان کے مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

کوئی موضوع بذات خود مزاحیہ نہیں ہوتا۔ یہ مزاح نگار کا فنی کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنے اظہار میں مزاح کا پہلو نکال لیتا ہے۔ اس کے پاس مزاح پیدا کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں لیکن یہ طریقے کسی جامد اصول کے پابند نہیں ہوتے کیونکہ کسی طے شدہ ضابطے کے ذریعے لبوں پر مسکراہٹ نہیں لائی جا سکتی۔ مسکراہٹ لانے کے لیے جو بھی طریقۂ کار اپنایا جاتا ہے وہ غیر معمولی ہوتا ہے۔ اس کے لیے فن کار کبھی جملوں کی ساخت اور لفظوں کی ترتیب میں الٹ پھیر سے کام لیتا ہے، کبھی ایمائیت اور ابہام کا سہارا لیتا ہے کبھی مختلف زبانوں کو باہم خلط ملط کرتا ہے اور کبھی مکالمے میں وہ انداز اختیار کرتا ہے جو رواج سے ہٹ کر ہو۔ مزاح پیدا کرنے کے مزاح نگار کے کچھ اپنے مخصوص انداز بھی ہوتے ہیں۔ دلاور فگار نے بھی اپنی شاعری میں مزاح پیدا کرنے کے لیے نہ صرف ان آزمائے ہوئے طریقوں کا پوری فن کاری کے ساتھ استعمال کیا ہے بلکہ کچھ ایسے طریقے وضع کیے ہیں جو ان سے پہلے موجود نہ تھے۔

مثال کے طور پر جب وہ لفظوں کے الٹ پھیر اور ان کے مفاہیم اور طریق استعمال میں جزوی ردوبدل کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو رائج زبان ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ "میرا شاگرد" اسی قسم کی ایک نظم ہے جس میں ایک شاعر کی طرف سے استاد کی خدمت میں شاگرد بننے کی درخواست پیش کی گئی ہے۔ یہاں لفظوں کا غلط استعمال اور ان کا خلاف معمول دروبست ایک طرف تو مزاح کا سبب بنتا ہے اور دوسری طرف اس شاعر کی نااہلی کا اشاریہ بن کر اس مزاح کو طنز کی کیفیت سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ دلاور فگار کا کمال یہ ہے کہ ان کے اس عمل سے ترسیل کا کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہوتا۔ شاگرد کہتا ہے:

میں تو قبلہ آپ کے ادنیٰ پرستاروں میں ہوں
آپ میرے کفش ہیں، میں کفش برداروں میں ہوں
میں ابھی تک مشتی ہوں اس میں کوئی شک نہیں
مجھ کو فنِ شعر میں پوری طرح ادرک نہیں
سوچتا یہ ہوں کہ بیٹھوں کس کے در کے سامنے
سینکڑوں استاد ہیں پیش نظر کے سامنے
مجھ کو یہ سمجھا یئے، بہر خدارا کے لیے
کیسے فرماؤں غزل اپنی ستارا کے لیے

ان اشعار میں کفش، کفش بردار اور مشتی میں معنوی تحریف، ادراک کی بجائے ادرک کے استعمال اور پیش نظر کے سامنے نیز "بہر خدارا کے لیے" جیسے خود ساختہ پیرایوں کے ذریعے لطف پیدا کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ پوری طرح کامیاب ہے۔ ایسی ہی ایک نظم "سہرا اور مرثیہ" ہے جس میں مصرعوں کے الٹ پھیر سے مزاح کی ایک بالکل نئی قسم وجود میں آگئی ہے۔ اس نظم میں سہرے کے کچھ اشعار یوں ہیں۔

اچھے میاں کا عقد ہوا ہے بہار میں
کہہ دو کسی سے پھول بچھا دے مزار میں
دولہا دلھن شریف گھرانے میں ہیں پلے
لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
یارب نبی کے ساتھ ہمیشہ بنا رہے
یہ کیا رہیں گے جب نہ رسولِ خدا رہے

اس کے دوسرے حصہ میں یعنی مرثیے کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

پیارے میاں کی موت ہوئی ہے بہار میں
مدت سے اقربا تھے اسی انتظار میں
پیارے میاں کے سوگ میں دل بے قرار ہے
ساون کے گیت گاؤ فضا خوش گوار ہے
پیارے میاں کو عمر بڑی مختصر ملی
مدت کے بعد آج یہ اچھی خبر ملی

اس نظم میں ہوا بس یہ ہے کہ کسی استاد نے اپنے شاگرد کو اس کی متواتر فرمایشوں سے تنگ آکر سہرے میں مرثیے کے مصرعے اور مرثیے میں سہرے کے مصرعے ملا کر دے دیئے۔ اور اس نے دو مختلف مجمعوں میں یہ دونوں نظمیں سنا بھی دیں جس کا نتیجہ داد کی بجائے رسوائی کی صورت میں بر آمد ہوا۔ یہ انجام استاد کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ شاگرد اس کا اندازہ نہ کر سکا۔ یہ اس کی نااہلی تھی اور نااہلی کے اس معنی خیز اظہار میں طنز کی نشتریت پوشیدہ ہے۔

دلاور فگار کبھی کبھی نظموں میں نئے گوشوں کی تلاش اور ایمائیت کی بازیافت کے ذریعے بھی طنز پیدا کرتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی مشاقی اور مہارت فن کا ثبوت ملتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

جہیز میں یہ جو اک گرم شیروانی ہے
مرا خیال ہے اس کا بھی عقد ثانی ہے
کل ایک آپا کو دیکھا تو اک خوشی یہ ہوئی
کہ اپنی خوش قسمتی سے میں نہیں آیا
استاد جواب خام ہیں ناراض نہ ہونا
بو جہل بھی بی کام میں ناراض نہ ہونا
لے کر برات کون سپر ہائی وے پہ جائے
ایسی بھی کیا خوشی کہ سڑک پر وصال ہو

کبھی کبھی وہ اردو میں انگریزی کے الفاظ اور فقرے بلکہ مکمل جملے اس خوبی کے ساتھ پیوست کرتے ہیں کہ کلام میں ایک نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ قطعہ:

اک یونیورسٹی میں کسی سوٹ پوش سے
میں نے کہا کہ آپ ہیں کیا کوئی سارجنٹ
کہنے لگا کہ آپ سے مسٹیک ہو گئی
آئی ایم دی ہیڈ آف دی اردو ڈپارٹمنٹ

اردو میں انگریزی کے الفاظ ملا کر شعر کہنا دلاور فگار کی اختراع نہ سہی لیکن انھوں نے اس کے ذریعے اردو کے اساتذہ کی انگریزی زبان سے مرعوبیت کی طرف جو بلیغ اشارہ کر دیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ فگار سے پہلے بھی متعدد شعرا نے

اپنے کلام میں بے تکلف انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر اکبر الہ آبادی نے یہ تکنیک جس کثرت کے ساتھ اور جتنے بلیغ انداز میں استعمال کی ہے اس سے ہم بخوبی واقف ہیں، لیکن دلاور فگار نے اردو میں انگریزی کی آمیزش کے پہلو بہ پہلو انگریزی میں برائے نام اردو کے تال میل سے اس لسانی صنعت کاری کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔ یہ بہرحال ان کی ایجاد ہے۔ ان کی ایک غزل دیکھیے جس میں پورے کے پورے مصرعے انگریزی میں ہیں اور اردو کے بس اکا دکا لفظ ہی آتے ہیں۔ کہتے ہیں:

دی نیشن ٹاکس اِن اردو، ہوی ہیپلی فائٹ اِن اُردو
ڈیر ریڈرس، دیٹ از وھائی آئی رائٹ ان اُردو
نہ ہو جب ہارٹ ان دی چسٹ پھر تھنگ ان دی ماؤتھ کیوں
ٹو ہیونی فائی دس لائن تھرو سم لائٹ اِن اردو
ویَر وِل بی گریٹر اٹریکشن اِن دی اِسٹائل
کہیں براق کے بدلے جو اسنو وائٹ ان اُرڈو
ویر ھٹذ بی یقیناً نو ملاوٹ ان دی لٹریچر
ویر فور آئی نیور کال شب کو نائٹ ان اُرڈو
مری نظموں کا اک والیوم ہے پبلشڈ اُرڈو میں
ویر فور آئی وڈ لائک اے کاپی رائٹ ان اُرڈو
فگار ان دس غزل تیری زباں اُرڈو ہے اور انگلش
مگر یو ہیو ٹائڈ قافیے کیا ٹائٹ ان اُرڈو

شاعری میں مکالماتی پیرایہ بیان کے ذریعے طنز پیدا کرنے کا کام بھی فگار سے پہلے ہو چکا ہے لیکن فگار نے یہ طریق احسن صرف اس روایت کی پیروی ہی نہیں کی ہے، اپنے مخصوص فنی اجتہاد کو بروئے کار لا کر اس میں ایک نئی جان بھی ڈال دی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار اس منفرد طرز بیان کی نمائندگی کرتے ہیں جو اردو کے مزاح نگاروں میں صرف ان کے ساتھ مخصوص ہے:

میں نے کہا کہ بحر سے خارج ہے قافیہ
بولے کہ بحر چھوڑ دیں بر دیکھتے چلیں
تم کھو گئے ہو سِو رہیں، آرام کرنا فرض ہے
ہم کہیں گے ہوچکا آرام مطلع عرض ہے

محسن کمپیوٹر سے پوچھے گا مجھے بھی تو بتا
میرا شوہر کون ہوگا، اس کا نام، اس کا پتا؟
ٹھیک اسی وقت اک صدا آئے گی کمپیوٹر سے یوں
جیسے وہ کہتا ہو اس خدمت کو میں تیار ہوں

دلاور فگار نے اختراع طنز کے لیے جو پیرائے اختیار کیے ہیں وہ کثیر الجہات ہیں۔ اکثر وہ ایک ہی شعر میں مختلف زاویوں سے وار کر جاتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ اس طنز کی ضرب براہ راست احساس پر پڑتی ہے اور قاری یا سامع حیران رہ جاتا ہے۔ مندرجہ بالا چند مثالیں مشتے از خروارے کی تعریف میں آتی ہیں، جن کا باقاعدہ طور پر انتخاب بھی نہیں کیا گیا ہے۔ ایسی مثالیں آپ کو ان کے کسی بھی مجموعے کے کسی بھی صفحے میں بآسانی مل جائیں گی۔ یہاں ان اشعار کو پیش کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ ان کا بہترین انتخاب سامنے آئے بلکہ یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں ان کے طرز کلام کا عکس تازہ ہو جائے تاکہ ان کی شخصیت اور فن کے متعلق ایک واضح رائے قائم کی جاسکے۔

دلاور فگار نے اپنا کتنا وقت آرائش سخن میں صرف کیا ہے اور اپنی زندگی عزیز کا کتنا حصہ اس طنز لطیف کی تزئین میں لگایا ہے، اس کا اندازہ ان کی کتابوں کی تعداد سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی ایک ایک کتاب کے اصلی اور جعلی کتنے کتنے اڈیشن شائع ہوئے۔ ان کے مطبوعہ مجموعہ ہائے کلام کے بارے میں جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں اس کے مطابق ان کی کل تعداد دس ہے۔ یہ مجموعے حادثے، ستم ظریفیاں، شامت اعمال، آداب عرض ہے، انگلیاں فگار اپنی، از سر نو، مطلع عرض ہے، سنچری، خدا جھوٹ نہ بلوائے اور چراغ خنداں کے ناموں سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہندستان یا پاکستان میں اگر ان کا کوئی اور مجموعہ بھی شائع ہوا ہے تو وہ ہمارے علم میں نہیں۔ ان مجموعوں میں اکثر کلام کی تکرار ہے یعنی ایک ہی تخلیق کئی کئی مجموعوں میں شامل ہے لیکن ان کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر بار گذشتہ طباعت کی بہ نسبت نظم میں کچھ ترمیم و اضافہ اور اصلاح ہو جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پرانی شاعری پر بھی وقتاً فوقتاً نظر ثانی کر کے اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے چند امریکی

شعرا کے کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا جو "خوشبو کا سفر" کے نام سے شائع ہوا۔ سابق صدر امریکہ جمی کارٹر کی خود نوشت سوانح WHY NOT THE BEST کا انھوں نے اردو نثر میں ترجمہ کیا جو "خوب تر کہاں" کے نام سے شائع ہوا۔

ان تفصیلات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دلاور فگار بسیار گوئی کی طرف مائل تھے اور بسیار گوئی کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ اکثر شاعر کے پاس موضوعات کی قلت ہو جاتی ہے، فگار کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے یہاں موضوعات بہت محدود ہیں لیکن اس بات کا مثبت پہلو یہ ہے کہ انھوں نے جب جب اپنے پسندیدہ موضوع کو اٹھایا، اس کی کسی نئی جہت کی بازیافت کی۔ اس طرح دلاور فگار اپنے ان مخصوص موضوعات کی گہرائی میں اتنی دور تک چلے جاتے ہیں کہ وہاں تک پہنچنے میں عام طور پر طنز و مزاح نگاروں کے قدم کانپنے لگتے ہیں۔ شاعر نقلی شاعر، نت نئے ادبی تجربات، بدلتی ہوئی ادبی قدریں، شاعروں کا مزاج اور ان کی بے راہ رویاں، اردو اور اردو والوں کا رویہ، ان کے پسندیدہ ترین موضوعات ہیں۔ ان موضوعات پر ان کی متعدد نظمیں اور اشعار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے معاشرہ، سیاست، کھیل، جغرافیائی حد بندیاں، قبر، عالم بالا، موسیقی، کراچی وغیرہ موضوعات پر بھی بار بار طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا متنوع نہ ہونا ذرا کھٹکتا ہے کیونکہ ان جیسے شاعر سے اس سے کچھ زیادہ کی امید رکھنا ایک فطری امر ہے۔

دلاور فگار نے اپنے فن کا سارا جوہر اظہار پر صرف کیا ہے، چنانچہ ان کے کلام میں زبان کی چاشنی بھی ہے اور کائنات معانی کی بوالعجبی اور نگارنگی بھی۔ ان کی مہارت کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص پیرایۂ بیان کے ذریعے اکثر اپنے موضوعات کی گہرائی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس سے طنز و مزاح میں ایک نئے باب کا اضافہ اور ایک نئی دنیا کی بازیافت ممکن ہوئی ہے۔ اس کے برعکس ان کے فکر و خیال کی دنیا بہت چھوٹی ہے۔ ان کی نظریں مقامی اور عمومی مسائل میں اس طرح الجھ گئیں کہ عالم گیر مسائل تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اس لیے فگار کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم ان کے کمال کا عکس وہیں دیکھیں جہاں وہ عروج پر ہیں اور جسے وہ ہمیں دکھانا چاہتے تھے۔

حیدر قریشی :
Aufder Roos 7,
65795 Hattersheim 1/Germany

کتاب نما ـــــ ۱۹۹۸ء میں

(ایک سرسری جائزہ)

ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی چھوٹے سائز کا بڑا ادبی رسالہ ہے۔ اس رسالہ کی بڑائی اس کی ضخامت سے نہیں بلکہ ادب اور اردو زبان کے فروغ کے لیے کی جانے والی کاوشوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ۱۹۹۸ء میں "کتاب نما" کے بارہ پرچے شائع ہوئے۔ ان بارہ شماروں کے مواد کو یک جا کیا جائے تو کسی بھی ضخیم ادبی رسالہ کی ضخامت کے مقابلہ میں بھی اسے رکھا جاسکتا ہے لیکن اصلاً ہر ادبی پرچے کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ "کتاب نما" کو بھی کسی مقابلہ میں لائے بغیر اس کے مزاج کے حوالے سے اور اس کے مندرجات کے حوالے سے دیکھنا مناسب ہوگا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ "کتاب نما" نظریاتی تنازعوں کے دور میں اپنی غیر جانبداری کی روایت پر قائم ہے۔ ادب کے فروغ کے ساتھ اردو زبان کے مسائل پر غور و فکر کا عمل جاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں بلبعض تلخ حقائق بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ ادب کے عمومی موضاعات سے ہٹ کر جدید سائنسی معلومات، انٹرنیٹ اور درس و تدریس سے متعلق معلومات سماجی اور نفسیاتی معاملات پر مضامین بھی "کتاب نما" میں شائع ہوئے ہیں۔

"کتاب نما" نے ۱۹۹۸ء میں "مہمان اداریے" کی اپنی روایت کو برقرار رکھا۔ یہ مہمان اداریے سینئرز کے مقابلہ میں نسبتاً نئے لکھنے والوں نے زیادہ تحریر کیے اور متعلقہ موضوع کے حوالے سے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان اداریوں کے موضوعات ہی سے ان کے تنوع کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کینیڈا میں

اردو (رضاء الجبار)، نیا شاعر۔ محرم راز حیات (جمال اویسی) اردو تحقیق۔ مسائل اور تجاویز (شاہد پٹھان)، اردو میں حوالہ جاتی کتب (ڈاکٹر جمیل اختر)، ادب کی غیر معنویت (اعجاز علی ارشد)، جواز ۱۹۸۰ء کے بعد کی شاعری کا (کوثر مظہری) اردو زبان کا مستقبل اور ہماری ذمہ داریاں (نرگس سلطانہ)، بچوں کے رسائل کا کردار (مسعود احمد برکاتی)، مصر میں اردو زبان (ڈاکٹر السعید حلال الحفناوی)، تانیثی شاعری کا باغیانہ لہجہ (ڈاکٹر نجمہ رحمانی)، کچھ ترقی پسندی کی حمایت میں (قیصر تمکین) اردو، اساتذہ اور انتخاب (پروفیسر عبدالحق)۔ ان میں سے بعض اداریوں میں حقائق کا اظہار کرتے ہوئے تلخی در آئی ہے لیکن یہ تلخی، کڑوے سچ کی زائیدہ ہے جو بعض خرابیوں کو دور کرنے کی راہ بھی سجھاتی ہے۔ آپ کسی اداریے سے اتفاق کریں یا اختلاف کریں لیکن ان سب میں یہ خوبی موجود ہے کہ یہ سوچ کو متحرک کرتے ہیں۔

سال بھر میں تقریباً ستر مضامین "کتاب نما" میں شائع ہوئے۔ چند اہم ترین مضامین میں خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ (ڈاکٹر گیان چند جین) عددوں کا نظام (ڈاکٹر سید حامد حسین) اصول تدوین کتب (سید قدرت نقوی) اردو کا تہذیبی مزاج (انتظار حسین) ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) حیات غالب سنین کے آئینے میں (ڈاکٹر گوہر نوشاہی) اقبالیات یورپ میں (پروفیسر نثار احمد فاروقی) اردو اور غالب دونوں کو گھر چاہیے (علی سردار جعفری) کا ذکر کیا جانا چاہیے۔ دیگر مضامین میں بعض ادیبوں کے فن یا شخصیت کے حوالے سے جائزے لیے گئے ہیں، بعض اہم ادبی موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے، سائنسی، سماجی اور ثقافتی معلومات مہیا کرنے والے عمدہ مضامین بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ایسے سارے مضمون نگاروں میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر اسلم فرخی، پروفیسر عبدالخالق، شفیقہ فرحت، نرگس سلطانہ، سلیم انصاری، خالد عبادی، مظہر امام، شکیل اختر فاروقی، ڈاکٹر وہاب قیصر، بدر اقبال، وہاب اشرفی، عبدالاحد ساز، ڈاکٹر محمد اکرام خاں، انوار رضوی، منظور الامین، ڈاکٹر نیر جہاں، نور جہاں عثمانی، سعید الظفر چغتائی، آفاق حسین صدیقی، پروفیسر عبدالستار دلوی، شرف النہار، انیس احمد چشتی، انور شمیم انور، عبدالقوی ضیا، احمد صغیر صدیقی، ڈاکٹر سید حامد حسین اور بعض دیگر مضمون نگار شامل ہیں۔ ڈاکٹر سید حامد حسین کا مضمون "کچھ ناموں اور

عرفیتوں کے بارے میں" دلچسپی کا حامل ہے۔ انھوں نے اداکارہ "عائشہ جلکا" کے نام کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ نام امریکہ سے ہو کر لوٹا ہے جہاں کی سیاہ فام لڑکیوں میں عائشہ نام بہت مقبول ہے۔ امریکہ میں بھی یقیناً یہ نام مقبول ہو گا تاہم اپنے نام کے بارے میں اداکارہ آئشہ جلکا نے ایک بار ایک انٹرویو میں خود وضاحت کی تھی کہ اس کی پیدائش سے پہلے اس کے والدین کے ہمسایہ میں ایک مسلم کشمیری خاندان رہتا تھا ان کی بچی کا نام عائشہ تھا۔ بچی اتنی خوبصورت اور پیاری تھی کہ عائشہ جلکا کے والدین کو اس کا نام بھی پیارا لگنے لگا چنانچہ ان کے ہاں جب بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام آئشہ جلکا ہو گیا۔ غالباً ہندی رسم الخط کے باعث اس کا نام عائشہ کی بجائے آئشہ رائج ہو گیا ہے۔

اس مشینی دور کی تیز رفتار زندگی میں انسان اعصابی تناؤ کا شکار ہونے لگا ہے۔ "کتاب نما" نے اس تناؤ کو کم کرنے کے لیے ادبی سطح پر عمدہ اہتمام کیا ہے۔ سال کے بارہ پرچوں میں تقریباً ۳۲ ایسے مضامین شائع کیے گئے ہیں جو طنز و مزاح سے بھرپور ہیں۔ یہ مضامین کہیں مسکراہٹ پیدا کرتے ہیں تو کہیں بے ساختہ ہنسا دیتے ہیں۔ پروفیسر بدرالدین الحافظ کے "انشائیہ" کو بھی طنز و مزاح کے ذیل میں ہی شمار کرنا چاہیے۔ "مانگے کا اجالا" کے تحت خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کے تین مضامین (کالم) شائع ہوئے۔ خامہ بگوش کے مزاح کی تہہ داری اور طنز کی دوہری دھار کا ایک زمانہ معترف ہے۔ فضل حسنین کا ایک مزاحیہ مضمون "کاروبار ادب" شائع ہوا۔ یوسف ناظم کے پانچ مزاحیہ مضامین "کتاب نما" کی زینت بنے۔ یوسف ناظم سینئر لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے طنز میں ڈنک کی بجائے ہلکی سی چٹکی لینے کا اور مزاح میں شائستگی کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے سیاسی منظرنامے سے لے کر ادبی منظرنامے تک اپنے موضوعات کو نبھایا ہے۔ نصرت ظہیر کے شروع کے مضامین میں فکاہی کالموں کا صحافیانہ انداز نمایاں تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کے مضامین میں ادبی شان پیدا ہونے لگی ہے۔ نصرت ظہیر نے اس برس "کتاب نما" میں، اپنے دس خوبصورت اور طنز و مزاح سے بھرپور مضامین پیش کیے۔ یہ مضامین احساس دلاتے ہیں کہ نصرت ظہیر اس میدان میں مسلسل پیش قدمی کر رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین طنز و مزاح کا بہت بڑا نام ہیں۔ ان کے طنز میں نشتریت اور مزاح میں گدگدی محسوس ہوتی ہے۔ مجتبیٰ حسین سال کے بارہ مہینے "کتاب نما" کے صفحات

پر چھائے رہے۔ عمومی طور پر انھوں نے اپنا لکھنے کا عمدہ معیار برقرار رکھا لیکن انجم عثمانی کے بارے میں اپنے مضمون میں ایک طنز نشتر کی حد سے آگے چلا گیا ہے۔ صرف ایک واقعہ کے بیان سے پورے مضمون کا معیار مجروح ہوا ہے۔ ان کے برعکس انجم عثمانی کے بارے میں نصرت ظہیر کا مضمون بے حد خوبصورت ہی نہیں بلکہ ان کے عمومی معیار سے بھی اوپر اٹھ آیا ہے۔ دراصل طنز و مزاح میں اگر بات تھوڑی سی پردے میں رکھ کر کی جائے تو تحریر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کا مضمون "گجرال کمیٹی پر عمل ہو تو ہم حیدر آباد جائیں" ایسی ہی شاندار تحریر ہے جس میں باریک سے پردے نے "ناگفتنی" کو نہ کہنے کے باوجود "گفتنی" کر دیا ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ مجتبیٰ صاحب اب اپنے ۱۹۹۸ء کے آخری مضمون کے معیار سے آگے کا سفر کریں گے ---- "کتاب نما" کے ان سارے طنزیہ، مزاحیہ مضامین سے اعصابی تناؤ میں کمی ہوئی ہے۔ ہونٹ، مسکراہٹ سے بھیگ جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ان مضامین کی ادبی قدر و قیمت بھی ہے۔ بلا شبہ ان میں سے بعض مضامین تو اردو طنز و مزاح میں بے بہا اضافہ ہیں۔

اس سال "کتاب نما" میں غزلوں اور نظموں کے ساتھ دوہے اور ماہیے کو بھی اہمیت دی گئی۔ دوہا ہندی گیت ہے اور اس کا ایک خاص وزن ہے جس کا اہتمام کیے بغیر دوہا دوہا نہیں رہتا۔ ایسے ہی ماہیا پنجابی لوک گیت ہے جس کی مخصوص لے میں اس کا وزن محفوظ ہے۔ اس وزن کا خیال کیے بغیر ماہیا بھی ماہیا نہیں رہتا۔ خوشی کی بات ہے کہ کتاب نما میں چھپنے والے دوہے۔ دوہے کے مخصوص وزن کے مطابق تھے اور ماہیے بھی ماہیے کے درست وزن کے مطابق تھے۔ شفیق سرونجی، بھگوان داس اعجاز، کاوش پرتاپ گڑھی اور معین مضطر کے دوہوں سے دوہے کی اصل روپ ریکھا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۹۸ء میں کتاب نما نے مجموعی طور پر ۳۲ نظمیں شائع کیں۔ ایک نثری نظم کو چھوڑ کر باقی ۳۱ نظموں میں احمد ندیم قاسمی، جگن ناتھ آزاد، ادا جعفری، ضیا جالندھری، باقر مہدی، منصورہ احمد، عبدالستار دلوی، سلیم انصاری، عبدالاحد ساز، ستیہ پال آنند، اطہر راز، رضا نقوی واہی، عشرت قادری اور بعض دیگر نظم نگاروں کی نظمیں شامل ہیں، بعض فوری رد عمل کی نظمیں بھی شائع ہوئیں۔ ادب کے پورے منظر نامہ کی طرح "کتاب نما" میں بھی غزل شاعر کی آبرو بنی رہی۔ مشرقی

مزاح کی یہ مضبوط ترین اور مقبول ترین شعری صنف مخالفت کے کئی ادوار سے گزرنے کے بعد آج بھی پوری آن بان کے ساتھ سربلند ہے۔ "کتاب نما" نے ۱۹۹۸ء میں ۷۷ غزلیں پیش کیں۔ ان غزلوں میں سے بعض میں غزل کے روایتی مضامین آئے ہیں تو بعض غزلیں عصر حاضر کے تجربات کا اظہار کرتی ہیں۔ انداز بیان میں نشیب و فراز کی متضاد کیفیتیں ملتی ہیں لیکن ظاہر ہے ایسا ہر صنف ادب میں ہوتا ہے۔ غزل گو شعرا میں ایک طرف احمد ندیم قاسمی، عنوان چشتی، مظفر حنفی، باقر مہدی، محسن احسان، اختر سعید خاں، مخمور سعیدی اور اختر بستوی جیسے سنئیر شعرا رونق افروز ہیں تو دوسری طرف نئی نسل کے شہپر رسول، ظفر گیبی، شمیم انجم وارثی، ملک زادہ جاوید، حنیف ترین، کرامت بخاری، اوشا بھدوریہ جیسے شعرا بھی موجود ہیں۔ احمد صغیر صدیقی، پرکاش تیواری، انیس انصاری، عاصی کاشمیری، مہدی پرتاپ گڑھی، پی پی سری واستو رند، سحر سعیدی، رفیق جعفر، عطا عابدی، راجیندر بہادر موج، رفیق جمال، رؤف صادق، احمد وصی، عبدالرحیم نشتر، شمس تبریزی، بشیر فاروقی، زاہد نظر، اقبال مسعود اور متعدد دیگر شعراء کی غزلیں ان شعرا کے مخصوص انداز کے مطابق دکھائی دیتی ہیں۔ حضرت امیر خسرو سے شروع ہونے والی اردو غزل ولی، میر، غالب، ترقی پسند دور اور جدیدیت کے دور سے گزرنے کے بعد اب اپنے عہد سے بھی آنکھیں چار کر رہی ہے۔

"کتاب نما" میں کتابوں پر تبصرے "جائزے" کے زیر عنوان شائع کیے جاتے ہیں۔ اس برس مجموعی طور پر ۴۷ کتب/رسائل پر تبصرے شائع کیے گئے۔ ان میں شاعری کے گیارہ مجموعے، افسانوں کے چار مجموعے افسانوں کے دو مرتب کردہ انتخاب، تین رسائل (مفتاح الجنتہ، جہات اور گلبن) تحقیق و تنقید کی سات کتب، متفرق موضوعات کی گیارہ کتب، طنز و مزاح کی ایک کتاب آپ بیتی کی ایک کتاب اور شخصیات پر سات کتب یا رسائل کے خصوصی نمبر شامل ہیں۔ تبصرہ نگاروں میں توقیر احمد خاں اور عبداللہ ولی بخش قادری زیادہ سرگرم دکھائی دیتے ہیں، شاہینہ تبسم، فرحت فاطمہ، سلمٰی شاہین رضیہ حامد، حمیرا جلیلی، صغرا مہدی، نیر جہاں نے تبصرہ نگاری کی الگ سی قوس قزح بنادی ہے۔ خلیق انجم، سعید عارفی، انجم عثمانی، کوثر مظہری، جی ڈی چندن، راج بہادر گوڑ، پروانہ ردولوی، صدیق الرحمٰن قدوائی، مظفر عالم، خالد محمود، ایس ایس بھٹناگر شاداب، طاہر حسین کاظمی،

احمد محمود، خلیل تنویر، محبوب راہی، ثوبان فاروقی، خلیل احمد بیگ، ظہور الاسلام، عبداللطیف اعظمی، صابر حسن رئیس، رضوان اللہ، ابوالکلام عارف کے تبصروں نے متعلقہ کتب کو عمدگی سے متعارف کرایا۔ یوسف ناظم کے تبصرے ان کے مخصوص طنزیہ مزاحیہ انداز سے سامنے آئے بالخصوص ڈاکٹر سید حامد حسین کے مزاحیہ مضامین کی کتاب پر ان کا تبصرہ سونے پر سہاگہ ہو گیا ہے۔ تاہم نفیس بانو شمع کی آپ بیتی "جنت سے نکالی ہوئی حوا" پر ہیر انند سوز کا تبصرہ اپنے کھلے پن کے باعث سب سے منفرد رہا۔ "کتاب نما" کے مندرجات سے یہ خوش کن صورت حال سامنے آئی ہے کہ وفات شدہ ادیبوں اور شاعروں ہی کو نہیں، زندہ شاعروں اور ادیبوں کی خدمات کو سراہنے کا رویہ بھی فروغ پانے لگا ہے۔ حسرت موہانی، فرمان فتح پوری، اختر الایمان اور اطہر حسین پر لکھی گئی / مرتب کی گئی کتب، انشاء کا نیاز فتح پوری نمبر، کتاب نما کا محبوب حسین جگر نمبر، یہ تو مربوط صورت میں کام ہوئے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی ستیہ پال آنند، خالدہ حسین، علی سردار جعفری، سالک لکھنوی، سجاد سید، عارف عزیز، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، سید شہاب الدین دسنوی، ناصر کاظمی، کالیداس گپتا رضا، نظیر اکبر آبادی، عبدالمغنی، دلاور فگار، محمد احمد سبزواری، ڈاکٹر عالی جعفری اور شجاع خاور کے فن یا شخصیت کے کسی نہ کسی گوشے کو مضمون کی صورت میں نمایاں کیا گیا، حکیم محمد سعید دہلوی کی شہادت پر انھیں دو مضامین کے ذریعے یاد کیا گیا۔ جمیل الدین عالی کے بارے میں بھی دو مضامین شائع ہوئے۔ یوں فوت شدگان کے ساتھ زندہ ادیبوں کی خدمات کے اعتراف کا مثبت عمل مستحکم ہونے لگا ہے۔

"ادبی تہذیبی خبریں" کے تحت "کتاب نما" میں اسکولوں کی تقریبات، بین المدارس مباحثوں اور ہونہار طلبہ کو ایوارڈز کی خبروں سے لے کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے نئے ڈاکٹرز کی خبروں تک ---- ادبی سیمنار، ایوارڈ، تقریبات سے لے کر چیئروں کی تبدیلی اور نئی تقرریوں تک ڈھیر ساری معلومات مہیا کی گئی ہے۔ اس خبر نامہ کے مطابق اقبال برکی، جلیل الرحمٰن صدیقی، سراج اجملی، رشید حسین، رابعہ بیگم، طلعت رضوان، محمد نسیم، اظہر حیات، نسیم اختر انصاری، عبدالمعبود، حسین احمد زاہدی اور گل نغمہ نے اس برس اپنے اپنے پی ایچ ڈی پر جیکٹس پر ڈگریاں حاصل کیں۔ امریکی دانشور ایڈورڈ سعید کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں

ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ کتابوں کی تقریبات میں انکشاف (س۔ یونس) پانی پت (رفعت سروش) معرکہ تیغ وگلو (شہزاد معصومی) آخر کار (مجتبیٰ حسین) رنگِ صدا (عمران عظیم) موج سراب (رہبر جونپوری) دلّی حرف حرف چہرے (عظیم اختر) مضامین گجرال (اندر کمار گجرال) رنگ منچ کے پانچ رنگ (رفعت سروش) آبشار خیال (سحر اکبر آبادی) صحرا کی گونج (قمر منتو) ٹھہرے ہوئے لوگ (انجم عثمانی) اور پرماتما کے نام آتما کا پتر (محمد صلاح الدین پرویز) کی رپورٹس شائع ہوئیں۔ غالبیات اور اقبالیات اس صدی کے جاندار موضوع رہے ہیں۔ "کتاب نما" میں اس سال ان دونوں موضوعات پر مضامین شائع ہوئے۔ علامہ اقبال کے فکر و فن پر بھوپال میں ایک سیمنار اور دہلی میں یوم اقبال کی رپورٹس بھی "کتاب نما" میں شائع ہوئیں۔ غالب کی امیجری پر توسیعی لیکچر، دوصد سالہ جشن غالب اور غالب تنقید کے سو سال جیسے متنوع حوالوں سے کلکتہ، ممبئی، کھنڈوہ، بھوپال اور جھانسی میں ہونے والی غالب تقریبات کی رپورٹس شائع کی گئیں۔ شاہد ماہلی کو "ایوان غالب" کا نیا ڈائریکٹر بنالیا گیا ہے۔ اس خبر سے توقع کی جانی چاہیے کہ اب دلی میں بھی غالب جشن کا کوئی پروگرام ضرور ہوگا۔۔ انڈیا کے مختلف شہروں کی تقریبات کی روداد کے ساتھ "کتاب نما" میں سعودی عرب، امریکہ، جرمنی اور کویت کی ادبی تقریبات کی رپورٹس بھی شائع ہوئیں۔ سال کے پہلے شمارہ میں بھاگل پور میں ہونے والے سب سے پہلے ماہیا مشاعرہ کی مختصر رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ ماہیا مشاعرہ کی یہ روایت ۱۹۹۸ ہی میں کلکتہ، ناگپور، گوجرانوالہ اور سرگودھا میں بھی دہرائی جاچکی ہے۔ خبر نامہ کی ایک اہم خبر یہ رہی کہ مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے چیئرمین پروفیسر عبدالستار دلوی نے اور اکادمی کے اراکین رام پنڈت، قاسم امام، یونس اگاسکر اور ندا فاضلی نے احتجاجاً استعفے دے دیے۔ ایک بے حد افسوسناک خبر یہ رہی کہ جی ڈی چندن کے گھر چوری ہوئی، چور قیمتی سامان لے گئے اور ادبی کتابوں کو چھوڑ گئے۔

"کھلے خطوط" کے سیکشن میں قارئین ادب کا ردعمل شائع کیا جاتا ہے۔ اس سال مجموعی طور پر ۵۶ خطوط شائع کیے گئے۔ ان قارئین ادب میں مشاہیر بھی شامل ہیں، نئے لکھنے والے بھی شامل ہیں اور عام قارئین بھی شامل ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی، امین فرید، ڈاکٹر گیان چند، رفیع الدین ہاشمی اور عبدالقوی دسنوی

کے خطوط سے "کتاب نما" کے قارئین کے حلقہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ منیر الدین احمد اور ستیہ پال آنند کے خطوط وضاحت احوال کرتے ہیں تو رام پرکاش کپور نے اردو کی صورت حال پر کھری کھری باتیں کی ہیں۔ خالد عرفان نے ڈاکٹر "گوپی چند نارنگ" کے مضمون کو پسند بھی کیا ہے اور اختلافی زاویے کو بھی ابھارا ہے۔ شجاع الدین خاں غوری نے پروفیسر امیر عارفی کے انٹرویو کے بعض مندرجات پر اعتراض کیے ہیں تو ظہیر غازی پوری نے مظہر امام کے جائزہ کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ایک طرف سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے امام اعظم کی قلمی نام پر مذہبی نکتہ نظر سے شدید اعتراض کیا ہے تو دوسری طرف جمال اویسی اپنے ایک مضمون میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ Deconstruction ہر طرح کے انسانی گروپوں کا رد کرتی ہے ۔ کلیسائی نظام فکر ہو یا اسلامی نظام فکر ڈی کنسٹرکشن اس سے انکار کرتی ہے اور اعلا انسانی اقدار کی بازیافت کرتی ہے۔ (اگر ابھی تک اس کا کوئی عملی نمونہ سامنے آیا ہو تو قارئین کو ان اعلا انسانی اقدار" سے آگاہ کرنا چاہیے)۔ "بیاض غالب کی بحث" پروفیسر انصار اللہ کا مضمون "کتاب نما" میں شائع ہوا تو پہلے اس کے جواب میں" گیان چند جین کا خط" شائع ہوا۔ پھر ڈاکٹر گیان چند جین کا مضمون "خود نوشتہ دیوان غالب اور الزام جعل سازی" شائع ہوا۔ علمی اور تحقیقی حوالے سے تو یہ ایک اعلا مضمون ہے ہی، مضمون کے شگفتہ انداز بیان نے گیان چند جین کی تحریر کی جوانی کا احساس بھی دلایا ہے۔ خطوط کے صفحات پر م۔ م راجندر، نصرت ظہیر، جمال اویسی، عالم خورشید، جعفر ساہنی، ثوبان فاروقی ، محمد شاہد پٹھان، جاوید عالم، نامی انصاری، عاصم شہواز شبلی، بھگوان داس اعجاز، شبیر احمد قرار اور متعدد دیگر ادیبوں کے خطوط سے گہما گہمی کا احساس ہوتا ہے۔

جو ادبی رسائل ہر ماہ باقاعدگی سے اور بروقت نکل رہے ہیں اور جنھوں نے ضخیم ادبی جرائد کے اس پُر کشش دور میں بھی ادبی ماہنامہ کی روایت کو زندہ رکھا ہوا ہے ان میں ماہنامہ "کتاب نما" کو صف اول کا ادبی ماہنامہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ مختلف نظریات کے مباحث میں غیر جانبداری اور اظہار کی آزادی کے اوصاف نے "کتاب نما" کی ادبی حیثیت کو مستحکم کیا ہے۔ رسالہ کے ایڈیٹر شاہد علی خاں نے ادبا پر اپنی رائے مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا یہی رویہ انھیں اردو کے بعض دیگر ادبی رسائل سے الگ شناخت عطا کرتا ہے اور یہی "کتاب نما" کی شناخت ہے۔

دیگر اداروں کی مطبوعات

ذہنِ رسا (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
قصرِ جاں (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
رباعیات (شاعری) بہار حسین آبادی 50/-
سرمایۂ حسین (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
نمودِ سخن (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
طبعِ رسا (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
کیمیائے سخن (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
تخلیقِ کائنات (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
فکرِ رسا (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
گنجِ شہیداں (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
خاصانِ خدا (شاعری) بہار حسین آبادی 10/-
سفرِ ستارہ (شاعری) پرکاش فکری 50/-
سن اے کاتب (مضامین) پروفیسر جابر حسین 100/-
کربلا در کربلا (مرثیہ) پروفیسر جابر حسین 100/-
مثنوی نالۂ شبگیر (مثنوی) پروفیسر جابر حسین 100/-
منٹو شناسی (تنقیدی مضامین) شکیل الرحمٰن 100/-
رقصِ بتانِ آذری (ادب) شکیل الرحمٰن 50/-
اختر الایمان جمالیاتی لیجنڈ شکیل الرحمٰن 100/-
میر شناسی (تنقیدی مضامین) شکیل الرحمٰن 50/-
تاریخ ایک تخلیقی نظم (شاعری) اختر پیامی 25/-
غالب کا سومنات خیال علی سردار جعفری 30/-
نوائے سکوت (شاعری) مرتضیٰ اظہر رضوی 50/-
شجرِ ممنوعہ (شاعری) صدیق مجیبی 50/-
ساحل سے دور (شاعری) شمشاد سحر 50/-
برگِ حنا (شاعری) مہدی علی 50/-

اقلیت (سیاسیات) قاسم خورشید 10/-
مرزا غالب ایک تنقیدی جائزہ محمد ارشاد 80/-
پیاسا کہسار (شاعری) مہدی علی 100/-
[illegible] (تنقیدی جائزہ) ڈاکٹر ذیشان فاطمی 100/-
کلس (شعری مجموعہ) اختر پیامی 100/-

شعر، غیر شعر اور نثر
شمس الرحمن فاروقی

اس کتاب میں فاروقی صاحب کے ۲۱ بلند پایہ تنقیدی، تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ابتدا میں "غبارِ کارواں" کے عنوان سے آپ نے اپنے بچپن اور جوانی کے حالات بھی لکھے ہیں۔ قیمت-/240روپے

میراثِ نثر
پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی

اس مجموعہ مضامین میں ایک جانب غالب، شبلی، مرزا رسوا، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور راجندر سنگھ بیدی کے نثری افکار پر بہترین مطالعات پیش کیے گئے ہیں تو اس کے ساتھ ہی امیر خسرو سے عہد نو کے صلاح الدین پرویز تک کے شعری و فکری عقائد و نظریات پر مختلف مضامین موجود ہیں۔

قیمت-/200روپے

نیش
شعری مجموعہ
شفیع ساغر

شفیع ساغر کی شاعری میں زبان کی صحت اور شگفتگی کے ساتھ طنز و مزاح کی بہت خوشگوار چاشنی بھی ہے جس نے ان شعروں میں لطف پیدا کر دیا ہے۔
قیمت -/150روپے

تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

جوش ملیح آبادی کے خطوط

مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم
مبصر: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
ناشر: انجمن ترقی (اردو ہند) دہلی
قیمت: ڈھائی سو روپے

اردو دنیا میں کتابوں کی طباعت واشاعت کا سلسلہ کئی اعتبار سے ناہموار ہونے کے باوجود تسلی بخش ہے اور مختلف اشاعت گھروں اکادمیوں یا افراد کی کوششوں سے ایسی مطبوعات سامنے آتی رہتی ہیں جو دلچسپ بھی ہوتی ہیں اور کار آمد بھی۔ یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوتی ہے کہ اب ہمارے ہاں کتاب سازی کا معیار بھی پہلے سے بہتر ہو گیا ہے۔ جلد بندی کاغذ کتابت اور صفائی ستھرائی کے اعتبار سے صفحات میں کشش آتی ہے۔ کمپیوٹر کے استعمال نے بھی اشاعت کی دنیا میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

ایسی ہی کتابوں میں ایک اہم دلچسپ اور زیب نظر جلد جوش ملیح آبادی کے خطوط" ہے جو خلیق انجم نے مرتب کی ہے۔ ہمارے ادبی سرمایے میں خطوط کی اہمیت ہمیشہ رہی ہے۔ آج سماجیاتی اور سیاسی زاویے سے نجی خطوط کا تجزیہ لازم سمجھا جاتا ہے کہ نہ جانے کتنے حقائق جو خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے نجی خطوط میں محفوظ ہیں۔ مشاہیر کے خطوط کی مزید اہمیت مکتوب نگار اور مکتوب الیہم کے بارے میں سوانحی معلومات کی بنا پر بھی ہوتی ہے۔ آج غالب کے خطوط کی ادبی اور تاریخی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ جب بھی ان کو پڑھیے ایک نیا لطف آتا ہے۔

بڑا ادب کیا ہے! اس کی بے شمار تعریفیں مل جائیں گی۔ مگر وہ ادب یقیناً بڑا ہے جسے محض بلا وجہ بھی پڑھا جائے اور ہر زمانے میں پڑھا جاتا رہے۔ غالب کے خطوط اس زمرے میں آتے ہیں مگر غالب کے خطوط نے مکتوب نگاری کے شوق وشغف کو بھی اردو والوں میں مہمیز کیا اور اس طرح مکتوب نگاری ایک باقاعدہ ادبی صنف کے طور پر ہمارے ہاں اپنی ایک مستقل

جگہ بنا چکی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایسے خطوط بھی بڑی تعداد میں ظہور میں آئے جو طباعت کی غرض سے ہی لکھے گئے۔ چنانچہ مکتوب ایک خالصتاً نجی تحریر ہونے کی بجائے پڑھنے والوں کے بڑے طبقے کو متاثر کرنے کا بھی ذریعہ سمجھے جانے لگے۔

طباعت کی غرض سے لکھے ہوئے خطوط کی اہمیت اس اعتبار سے بہت محدود ہوتی ہے کہ مکتوب نگار خود اپنا ایک پیکر تراش کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہاں اس کی شخصیت وہ نہیں ہوتی جیسی کہ وہ ہے بلکہ وہ ہوتی ہے جیسی کہ وہ خود ظاہر ہونا چاہتی ہے، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہر وقت نقاب پوش نہیں رہتے۔ ان کی زندگی میں ایسے لمحات زیادہ آتے ہیں جب وہ بالکل بے محابا' بے لاگ بلکہ بے حجاب ہوتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی ہماری ایسی ہی ادبی شخصیات میں تھے۔ خلیق انجم صاحب نے ان کے خطوط کو شائع کر کے جوش کی اصل شخصیت کو عیاں کیا ہے۔ جوش نے یہ خطوط مختلف اوقات میں اپنے دوستوں' معشوقوں کو لکھے اور انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں شاید یہ شک نہ رہا ہو کہ کوئی ان کو تلاش کر کے چھاپ بھی دے اور پھر جوش جس قسم کے انسان تھے انھوں نے شاید یہ بھی سوچا ہو کہ کہ اگر کوئی چھاپ بھی دے تو ان کی بلا سے۔ ان سے کون کیا چھین لیتا۔

جوش کے یہ خطوط مولانا عبدالماجد دریابادی سے لے کر جدن بائی تک کے نام ہیں۔ ان کے لاتعداد خطوط ہوں گے جہاں تک خلیق انجم کی رسائی ابھی تک نہ ہو سکی مگر جو کچھ بھی انھوں نے جمع کیے ہیں وہ اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے کم نہیں اور کیونکہ ان کی تحریر کے وقت اشاعت کی خواہش کو دخل نہیں تھا اس لیے جوش کی شخصیت و کردار کا صحیح روپ اگر جلوہ گر ہوتا ہے تو ان ہی صفحات پر۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریابادی جو جوش کے خاص احباب میں تھے عالم دین تھے مگر اپنی جوانی میں الحاد کی منزل سے گزر چکے تھے ان کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آپ کی زندگی جو کچھ ہو سو ہو' لیکن آپ کا قلم ایک رند خراباتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ آپ کے طرز نگارش کے پودے اور آپ کے ادبی بانکپن کے سبزے کو آپ کی مولویت کے تناور درخت کے سایے نے پنپنے کی اجازت کیوں کر دی۔ یہ اگر خرق عادت نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ کی سخن سنجی اور ادب نوازی کی کھیتی تعشق اور تورّع کے زبردست پالا گر جانے کے باوصف اب تک لہلہا رہی ہے۔ اگر آپ کے گلستان وجود کو اتنے شدید پالے سے پالا نہ پڑا ہوتا تو نہ جانے آپ کیا ہوتے اور کیا کچھ نہ کرتے۔

جو پری جو لہا چادر میں اس بری طرح دل موہے لے رہی ہے اگر وہ نام خدا بن ٹھن کر چوتھی کا جوڑا پہن کے سامنے آتی تو اللہ ہی بہتر اندازہ کر سکتا ہے کہ کتنے ارباب نظر خاک

دخوں میں غلطیدہ نظر آتے۔
ماجد صاحب! آپ تو یاد ش بخیر ہماری فوج کے کپتان تھے۔ یہ آپ کے جی میں کیا آیا کہ یہاں سے فرار ہو گئے۔ اب تک آپ کی وردی ہمارے مال خانے میں پڑی ہوئی ہے۔"

اس طویل اقتباس میں جوش ایک بے تکلف اور پر خلوص دوست کے ساتھ ساتھ ایک صاحب طرز نثر نگار کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں۔ ان کا شدید جذبہ واحساس ہی ان کے خوشگوار معنی خیز اور نوع بہ نوع استعاروں کا سر چشمہ ہے۔

ان کی ادبی زندگی کے بعض معرکوں کا ذکر بھی ان خطوں میں کہیں کہیں ملتا ہے۔ مثلاً ایک اور خط میں نیاز فتح پوری کے بارے میں لکھتے ہیں۔ جی ہاں! نیاز صاحب دریابادی کو بے نقاب کر چکنے کے بعد اب ملیح آبادی کو بے نقاب فرمانے میں مصروف ہیں لیکن اس کی پروا نہ کیجیے۔ اس دنیا کی رونق اور کارخانہ عالم کی چہل پہل انھیں ہنگاموں سے ہے۔"

ان خطوط میں ادبی معاملات پر بھی جوش کی رائیں کہیں کہیں ملتی ہیں اگرچہ یہ ہیں بہت کم مثلاً تمکین کاظمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ آپ مومن خاں کی شاعری کے باب میں میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ غزل گوئی محض ایک رسمی چیز ہے۔ مومن کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے رسمی اور غلط چیز میں ایک بڑی حد تک رنگینی دل کشی پیدا کر دی تھی۔

غزل گوئی کے بارے میں جوش نے زیادہ تر اسی رائے کا اظہار کیا اگرچہ ابتدا میں انھوں نے روایتی انداز کی اچھی غزلیں بھی کہی تھیں۔ جوش کی مرثیہ نگاری کا آج بہت ذکر ہوتا ہے اب ذرا خود جوش کی زبانی ان نظموں کے بارے میں سنیے:

"میں نے اس پر کبھی اصرار نہیں کیا کہ میرے 'مسدسوں' کو مرثیے کیا جائے۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ انھیں آپ مرثیے کا نام دیں یا نہ دیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پیش نظر اس قسم کے مسدس لکھتے وقت مرثیے کا ہی تصور رہتا ہے۔ میرا موضوع ان مرثیوں میں جب کربلا حسینیت 'عزم شہیدان کربلا' بے باکی اور حق گوئی ہوتا ہے تو پھر نقادوں کی یہ رٹ کہ جوش کے مسدس جدید مرثیے نہیں ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتی۔

آپ کو غالب کے خطوط میں ایک دوست کی معشوقہ کی موت کا تعزیت نامہ تو یاد ہو گا۔ اب ذرا جوش کی زبانی ہلال نقوی کی شادی پر سہرے کی فرمائش کا جواب سنیے

"سہرا لکھنا تو بڑی بات ہے۔ مجھ سے تو یہ خط بھی لکھا نہیں جا رہا ہے۔ خط اس طرح لکھ رہا ہوں جس طرح کمزور بینائی والا سوئی کے ناکے میں ڈورا ڈالتا ہے۔ کیسے بتاؤں کہ رسم ازدواج محبت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اور شوہر صاحب کا احساس ملکیت زوجہ کے حسن کو

نکل لیتا ہے۔ جب تک شادی نہ ہو معشوقہ محمل نشیں لحل ہوتی ہے اور شادی کے بعد وہ انگنائی میں بندھی ہوئی گائے میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہلال میاں مبارک ہو کل بدر بن جانے کے بعد تمھاری آب و تاب میں تو ضرور اضافہ ہو جائے گا مگر بانکپن نہیں رہے گا۔"

پاکستان چلے جانے کے بعد انھیں وہ گلیاں یاد آتی ہیں جہاں عمر کا زیادہ حصہ گزارا تھا۔

"ہائے ماجد صاحب! میرا لکھنو اجڑ گیا" سارے جانے پہچانے چہرے مٹی میں مل گئے۔ ہائے نہ اب وہ یار ہیں نہ وہ گیسو و رخسار چوک کے چھجے ویران پڑے ہیں۔ جہاں سے کل زلفوں کی بدلیاں برسا کرتی تھیں۔ اب داڑھیوں کا عذاب نازل ہو رہا ہے۔ ملیح آباد گیا تو بس اُداسی دیکھی۔ دادا میاں کا محل بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ باپ کی ڈیوڑھی سنسان پڑی ہے۔ نہ دو دو بجے رات تک خدمت گاروں کی حقہ لاؤ ... لاؤ کی آوازیں ہیں۔ نہ چوب داروں کی ڈفلیاں نہ مصاحبوں کا ہجوم جی پھٹتا ہے ان سب باتوں کو دیکھ دیکھ کر۔ چند نوبت می زند بر گنبد افراسیاب۔

جوش عام زندگی میں اپنے دوستوں کے سامنے جیسے ہیں ویسے ہی ان خطوں میں بھی لگتے ہیں۔ بہتر روزگار اور خوش حال زندگی کی تمنا انھیں پاکستان لے جاتی ہے۔ مگر وہاں بھی وہ خوش نہیں رہتے وہ ایک عام غرض مند انسان بھی ہیں۔ جن سے کچھ امید ہے ان کی خوش آمد کرتے ہیں اور جن سے ناراض ہیں ان کے بارے میں گالی گلوج مغلظات فحشیات کے بالکلف استعمال میں بھی تکلف نہیں کرتے۔ جوش جیسے تھے ان کو اس عالم میں دیکھنا ہو تو یہ خطوط دیکھیے۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کتنا ہی بڑا ہو بہر حال وہ اس دنیا کے پست و بلند میں شامل ہے۔ خلیق انجم صاحب نے مناسب حواشی کے ساتھ بہت سے خطوط کو یک جا کر دیا ہے۔ انھوں نے جوش کے قیام حیدر آباد اور پھر وہاں نظام کی ناراضگی کے بارے میں بھی سارے دستاویزات پیش کر دیے ہیں۔ غرض کہ جوش کی شخصیت و کردار اور سوانح کے بارے میں معلومات کا یہ اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ ان کے ان خطوط کو بھی شامل کر لیا جائے جو ساغر نظامی کے نام ہیں اور خلیق انجم صاحب شائع کر چکے ہیں تو ان کے بارے میں خود ان ہی کے قلم نے بہت سی دلچسپ باتیں سامنے آئیں گی۔

مخمور دہلوی حیات و شاعری

مرتبہ: نسیم مخموری
مبصر: ڈاکٹر محمد نفیس حسن
قیمت: عام اڈیشن ۷۵ روپے
لائبریری اڈیشن ۱۰۰ روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶

بیسویں صدی عیسوی کی نصف صدی کے آخر (۱۹۵۲ـ۱۹۴۸ء) دہلی کی بزم سخن میں

ایک ایسے شاعر کے سامنے شمع سخن آتی ہے جس کی مترنم نوائے سادہ وشیریں نے ہر خاص وعام کو مسحور بھی کیا اور مخمور بھی۔ آج بھی نہ جانے کتنے صاحب ذوق موجود ہیں جن کے قلب وذہن حضرت مخمور دہلوی کے نغمہ وشعر سے گوش بر آواز ہوں گے۔ وقت کی سرد مہری نے شاید شعر وادب کو بھی وردی پہنادی۔ ہمارا میزان اعزاز واستناد بھی بسااوقات کسی تنگ نائے میں سمٹا نظر آتا ہے۔ شاید حضرت مخمور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ حالانکہ داغ اسکول کے پس منظر اور شعر وادب کے اس وسیع کینوس میں مخمور فراموشی ایک ادبی خسارہ ہے۔ مخمور کا شعری اسلوب اور فکری آہنگ باوجود اپنی تنگ نائے غزل اور محدود فکر ونظر کے متقاضی ہے کہ تحقیق وتنقید کے میزان پر رکھ کر اس صدائے بازگشت کے کیف وکم اور زیر وبم کا اندازہ کیا جائے۔ مخمور کی خاص دہلوی وضع جو یہاں کی تہذیب واقدار کی دین ہے نیز اس مرد خدامست کی شخصیت سیرت حیات اور شاعری پر اس کے شایان شان جس التفات وتوجہات کی ضرورت تھی۔ وہ افسوس ہے کہ نہ ہو سکا۔ "بادۂ مخمور" (۱۹۵۲ء) سے "عرفان مخمور" (۱۹۵۷ء) اور پھر کلیات مخمور (۱۹۸۶ء) کی اشاعت کو اگرچہ مخمور شناسی کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ لیکن تشنگی باقی رہتی ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد مخمور دہلوی حیات وشاعری (۱۹۹۸ء) اس خلا کا تدارک ہے۔ یادگار بزم مخمور یعنی نسیم مخموری صاحب نے قدردان مخمور کے مستقل اصرار اور گزارش کو قبول فرمایا چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے منتشر مضامین کو یکجا کرنے اور نئے مضامین کی سعی وجستجو کی گئی۔ ایک سال سے زائد اس کوشش میں خدا کا شکر ہے۔ مخمور دہلوی حیات وشاعری کا یہ نقش اولین بر آمد ہوا۔ ۳۶ مضامین اور قطعہ ہائے تاریخ پر مشتمل اس ہدیہ خلوص میں مختلف النوع شخصیات علمائے دین' ادیب ونقاد' اہل علم اور شعراء حضرات کی یہ نگارشات اور رشحات حضرت مخمور دہلوی کی وسیع المشربی اور ہر دلعزیزی کا ثبوت ہیں۔

اہل قلم حضرات کی طویل فہرست مضامین میں یہاں ناموں کی قطار بندی نہ ممکن ہے۔ نہ مناسب انتخاب کا یہ معیار پیچیدہ بھی ہے اور نازک بھی یوں بھی ان نگارشات کے کیف وکم اور اثر وتاثر کا فیصلہ تو قاری پر موقوف ہے۔ جہاں تک کتاب کی ظاہری تشکیل وتزئین کی بات ہے اس میں شک نہیں کہ کاغذ' طباعت اور جلد بندی دلکش ہے جو ریحان عباسی صاحب کی حنابندی کا نتیجہ ہے۔ اس پر جابجا نقطہ وحرف کی کمی بیشی یا لفظ کی معنوی تبدیلی وغیرہ روایتی اغلاط کتابت کو "خال وخط روئے زیبا" کے سوا اور کیا کہا جائے۔ گرانی کے اس دور میں اس گرانقدر تالیف کی قیمت بھی بہت متوازن ہے۔

امید ہے کہ نسیم مخموری صاحب کی یہ پیش قدمی ریسرچ اسکالرز اور اہل ذوق سب کے

لیے یکساں طور پر مفید و معاون اور بنیادی ماخذ ثابت ہو گی نیز مخمور کی صدائے بازگشت کی موجب بھی۔ مضامین کے موضوعات کے انتخاب میں مزید وسعت کی گنجائش اور تنقید کے صحت مند امکانات کے باوجود مخمور دہلوی کی حیات و شاعری سے متعلق یہ باسعادت و مخلصانہ کوشش لائق تحسین و مبارکباد ہے۔ امید ہے اس سے مخمور شناسی کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گا۔ وما توفیقی الا باللہ

غالب کی شناخت

مصنف: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی
تبصرہ نگار: ایس ایس بھٹناگر 'شاداب
قیمت: ۸۰ روپے
ملنے کا پتا: غالب انسٹی ٹیوٹ 'ایوان غالب' نئی دہلی

"غالب کی شناخت" غالب پر ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی دوسری کتاب ہے۔ غالب پر پہلی کتاب "بیاض غالب تحقیقی جائزہ" ۱۹۷۱ء میں چھپی تھی' جو بڑی تختی ۲۰×۳۰ کے ۴۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک مخطوطہ دیوان جو غالب کی سوویں برسی کے موقع پر بھوپال سے برآمد کیا گیا تھا اور جسے امتیاز علی خاں عرشی' مالک رام اور ڈاکٹر گیان چند جین وغیرہ نے بخط غالب قرار دیا تھا' اس کے ایک ایک لفظ ایک ایک حرف بلکہ ایک ایک شوشہ پر ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے عرق ریزی کی اور یہ ثابت کیا کہ یہ ایک جعلی دستاویز ہے۔ انھوں نے اس مخطوطہ دیوان میں سو سے کچھ زیادہ ایسے شعروں کی نشاندہی کی جن کے مصرعے نسخہ شیرانی کے مطابق ہیں جو نسخہ بھوپال کے چھ سات سال کے بعد کا ہے اور یہ مخطوطہ دیوان نسخہ بھوپال سے پہلے کا بتایا گیا یعنی ۱۲۳۱ ہجری کا اور وہ بھی ترقیمے میں کتابت ختم ہونے کا وقت' دن اور تاریخ سب کچھ ہے لیکن سنہ میں "ن" کا نقطہ ہے لیکن سال نہیں لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی آزادی سے پہلے مشہور افسانہ نگار اور اس سے زیادہ مشہور شاعر تھے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "بادبان" ۱۹۴۸ء میں چھپا تھا۔ پھر اس کا دوسرا اڈیشن بھی چھپا۔ ۱۹۶۴ء میں انجمن ترقی اردو ہند' علی گڑھ نے ان کی نظموں کا اور غزلوں کا انتخاب بھی چھاپا۔ اسی سال پنڈت جواہر لال نہرو پر ان کی کتاب جواہرات شائع ہوئی اور اسی سال ان کی نظموں کا مجموعہ "کوہسار گاتے ہیں" بھی شائع ہوا۔ ایک محقق کی حیثیت سے انکا نام پہلی بار "بیاض غالب تحقیقی جائزہ" کی وجہ سے سامنے آیا اور ان کی غالب شناسی پر پروفیسر نورالحسن ہاشمی' پروفیسر خواجہ احمد فاروقی' ڈاکٹر محمد حسن اور پروفیسر فرمان فتح پوری نے مضامین لکھے اور تحقیقی جائزہ میں ان کے نظریہ کی تائید کی یہ مخطوطہ دیوان نہ تو غالب کے خط میں ہے اور جو نیا کلام

غالب سے منسوب کیا گیا ہے وہ الحاقی ہے۔
یہ تحقیق انھوں نے کشمیر میں کی تھی جہاں بہت سے ماخذ فراہم نہیں تھے۔ دلی میں انھوں نے اصل ماخذوں سے رجوع کیا اور پورے حوالوں کے ساتھ اس موضوع پر دوبارہ لکھا جو "غالب کی شناخت" کا آٹھواں باب ہے۔ اس باب کے علاوہ اس کتاب کا ایک اہم باب مرزا کا سنہ ولادت ہے اور غالب کے زمانہ کی تحریروں سے اور خود غالب اور حالی کی تحریروں سے انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب کا سن ولادت ۱۷۹۷ء نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے ہے۔
۱۹۷۳ء میں دلی یونی ورسٹی نے مخطوطہ شناسی پر ایک گھنٹہ کا مقالہ پڑھنے کے لیے کمال احمد صدیقی کو مدعو کیا تھا۔ ان کی یہ تاریخی تقریر بھی غالب کی شناخت کا ایک باب ہے 'عنوان ہے مخطوطہ شناسی اور یہ ص: ۷۱ سے ص: ۹۶ تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ مخطوطہ کی پرکھ کا باب ص: ۱۳۸ سے ص: ۲۲۶ تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ طالب علم جو تحقیق کے اصول سمجھنا چاہتے ہیں اور وہ عالم بھی جو غالب اور غالب سے غلط طور سے منسوب مبینہ دیوان کو' جس کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے، سمجھنا چاہتے ہیں وہ بھی اس باب میں استفادہ کے کئی اہم مقامات پائیں گے۔
سید علی حیدر نظم طباطبائی بجنوری اور مالک رام کے بعض بیانات سے بھی مختلف ابواب میں ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے بحث کی ہے اور اہم نکات سامنے آئے ہیں۔
آخر میں میں اس بات کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ پیش لفظ عام طور سے رسمی ہوتے ہیں لیکن غالب انسٹی ٹیوٹ کی پبلی کیشن کمیٹی کے چیئرمین سید مظفر حسین برنی نے ڈھائی صفحے کا جو پیش لفظ لکھا ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ خود مصنف نے ساڑھے سات صفحے کا جو حرف آغاز لکھا ہے وہ بھی کئی اہم باتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔
دلی اردو اکادمی نے پچھلے سال کی جن مطبوعات پر پہلا انعام دیا ہے غالب کی شناخت ان میں سے ایک ہے۔

عظیم شاعر مرزا غالب

مصنف: پروفیسر صادق
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: درج نہیں ہے صفحات: ۴۴
ناشر: وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند

غالب کے دو سو سالہ جشن ولادت کے موقع پر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر صادق نے ایک ہدیہ تبریک پیش کیا ہے۔ اس موقع پر چھپنے والی دوسری

کتابوں کے مقابلہ میں اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اول تا آخر آرٹ پیپر پر قدرے بڑے سائز میں رنگین تصویروں کے ساتھ شائع کی گئی ہے جس میں غالب کے سوانح پیش کیے گئے ہیں۔ اس طور پر یہ کتاب حیات غالب کا مختصر تعارف بن گئی ہے۔ ڈاکٹر صادق کے ایجاز قلم نے اسے اور بھی زیادہ دلکش و دلچسپ بنادیا ہے۔ یہ کتاب ایک ساتھ تین زبانوں میں یعنی اردو ہندی اور انگریزی میں شائع ہوئی ہے۔ اس لئے اس سے غیر اردو داں حضرات بھی استفادہ کر سکیں گے۔ شاید اسی لئے اس اڈیشن کی تعداد اشاعت ایک لاکھ ہے۔ اس کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی گئی ہے۔ یعنی اہل ذوق صرف ایک خط لکھ کر اس بیش قیمت کتاب کو بلا قیمت طلب کر سکتے ہیں۔ کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غالب کے ہاتھ کی تحریریں مثلاً ان کے حالات زندگی انھیں کے قلم سے۔ اور ایک غزل بھی بخط شاعر شامل ہے۔ غالب کی نادر کتابوں "اسمائے فارسی اور قادر نامہ" "مہر نیم روز" قاطع برہان' "دستنبو" اور عود ہندی' کے سرورق کے رنگین عکس اتنی صفائی اور خوبصورتی سے شائع کیے گئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ عکس اصل سے کہیں زیادہ دلکش ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ غالب کی رنگین تصویر بہادر شاہ ظفر کا فوٹو۔ مزار غالب قدیم کا فوٹو اور مزار غالب کا موجودہ نو تعمیر شدہ مقبرہ وغیرہ نہایت خوبصورت انداز میں چھاپے گئے ہیں۔ فوٹو گرافی کی پیش کش میں جدید ترین ٹیکنولوجی کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی حویلی' ان کی جائے پیدائش 'شبیہ غالب از گنجینہ ادب حبیب گنج' شبیہہ غالب غالب اکیڈمی نئی دہلی کی فن کارانہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان جاذب نظر تصاویر نے کتاب کو ایک خوبصورت اور یادگار مرقع بنادیا ہے جسے بجا طور پر مرقع غالب چغتائی اور مرقع اقبال وغیرہ کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ صوری اور معنوی خوبیوں سے متصف اس البم کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے مصنف و مرتب ڈاکٹر صادق ہیں جو اس سے پہلے مرزا غالب پر دو ڈاکو منٹری فلمیں بناچکے ہیں جو دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکی ہیں۔ امید ہے کہ اردو ہندی اور انگریزی کے ادبی حلقوں میں اس مرقع غالب کی توقع سے زیادہ پذیرائی کی جائے گی۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے شریمتی این جے کرشنا ڈائریکٹر جنرل آف ڈی اے وی پی بجا طور پر مبارک باد کی مستحق ہیں جن کی خصوصی دلچسپی سے "مرزا غالب" کی بیک وقت تین اہم زبانوں میں اشاعت عمل میں آئی۔

شاعری حصے میں آئی ہے

مصنف: شاغل ادیب
مبصر: شارق جمال ناگپوری
قیمت ۶۰ روپے
ملنے کا پتا: نیرنگ ادب پبلیکیشنز ۴-۳۰۴-۱
مشیر آباد حیدر آباد ۴۸

حیدر آباد اردو شعر و ادب کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں اردو زبان میں ہر موضوع پر لکھنے والوں کی کمی نہیں اور ہر شہر کی طرح یہاں بھی شاعروں کی بہتات ہے۔ شعرا کی اسی بھیڑ میں ایک نام شاغل ادیب کا بھی ہے۔ شاغل ادیب صرف شاعر ہی نہیں، یہ نثر نگار بھی ہیں۔ کئی نثری کتب کے مصنف بھی ہیں اور آپ کی شاعری کی بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۲۵ر ۳۰ سالہ مشق سخن نے اور شعر و ادب کی لاتعداد کتابوں کے مطالعے نے ان میں کئی موضوع پر قلم اٹھانے کی اہلیت پیدا کر دی ہے۔ شاعری میں بھی کئی موضوع پر آپ کا قلم تیزی سے چلتا ہے لیکن صنف غزل میں طبع آزمائی آپ کا خاص مشغلہ ہے۔

زیر تبصرہ کتاب "شاعری حصے میں آئی ہے" میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی ہیں۔ نظم و غزل دونوں اصناف میں شاغل ادیب کا اسلوب نگارش ٹھیٹ کلاسیکل ہی ہے اور نہ ہی بالکل جدید لیکن کہیں کہیں دونوں رنگوں کی آمیزش نے ان کے شعروں کو ایک خوبصورت اسلوب عطا کیا ہے۔ کافی حد تک صفائی زبان و بیان کا خیال رکھ کر شعر کی تخلیق فرماتے ہیں۔ تمام تر تخلیقات احساسات و جذبات کا مرقع ہوتی ہیں۔ احساسات و جذبات کے اظہار کا جو سلیقہ ایک شاعر میں ہونا چاہیے وہ شاغل ادیب میں موجود ہے۔ آپ بڑی عمدگی سے اس امر کو انجام دیتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں آپ بیتی کم جگ بیتی زیادہ ہی نظر آئے گی۔ پھر اس پر بھی حقیقت پسندانہ رویے کو سامنے رکھ کر اصل بات کو غلو سے بچانے کا ہنر آپ کو خوب آتا ہے۔ جو بھی لکھتے ہیں یا کہتے ہیں وہ سر تا سر حقیقت پر مبنی ہوتا ہے اور آج کے دور میں سچ کہنے کی یا لکھنے کی جرأت کا ہونا بھی حیرت کی بات ہے۔

شاغل ادیب نے جو اشعار نئے انداز و اسلوب میں لکھنے کی کوشش کی ہے اور جو صاف زبان میں ہیں انھیں میں ذیل میں نقل کر رہا ہوں ۔

اک دھندلکا جا بجا ہے شہر میں — خواب کوئی جل رہا ہے شہر میں

منہ کے بل گر پڑا ہوں اے شاغل — فخر سے سر اٹھا کے دیکھ لیا!

سلیقہ مند ہے کتنی یہ گردش دوراں — کہ آج اگتے ہیں شام و سحر سلیقے سے

تخلیق کی ہتھیلی پہ اسلوب کی چتا شاغل ادیب! فن کا یہ معیار دیکھنا
ہر دور میں سر چڑھ کے رہا ظلم کا جادو ہر دور میں انسان یہاں قتل ہوا ہے

ہے ذہن نیا اور بیاں سر کا شاغل
اسلوب ہنر تیرا بڑا کام کیے ہے

نئے اسلوب شعر سازی کے ہنر سے واقفیت کا اظہار کرنے والے شاغل ادیب نے "شاعری حصے میں آئی ہے" کے صفحات پر اسی طرح کے کئی گل بوٹے بکھیرے ہیں۔ جو دیکھنے سے اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاغل ادیب کا قلم خود کو غلو کی راہ سے بچا کر حقیقت نگاری کی راہ پر پوری رفتار کے ساتھ چلتا ہوا نظر آتا ہے اور اس رفتار سے چلنے میں بھٹکنے کا امکان بھی ہے لیکن شاعر کا حوصلہ اس کی احسن سوچ اور پختہ فکر اسے بھٹکنے سے یقیناً بچائے گی۔

شاعر اعظم

قہقہہ ہو یا ہنسی یاز یر لب مسکراہٹ یہ سب مفردات مفرح قلب و جگر ہیں، پریشانیوں سے نجات دلا کر دل کو گارڈن گارڈن کرنے والے ٹانک۔ ہمارے طنز و مزاح کے مجموعہ کلام "شاعر اعظم" کو پڑھ کر آپ تبسم زیر لب کے بعد کچھ سوچنے پر بھی مجبور ہوں گے۔ اگر یقین نہ آئے تو پڑھ کر دیکھ لیں۔

اس کتاب کا سرقہ جائزہ ہے، مانگنا گناہ کبیرہ اور خرید کر پڑھنا ثواب دارین کا موجب دیکھیں اللہ پاک آپ کو کیا توفیق دیتے ہیں۔

قیمت عنایتی۔ 151 روپے سکہ رائج الوقت
قیمت رعایتی۔ 100 روپے مع تین تبسم زیر لب
کتاب پسند نہ آئے تو قیمت واپس

پتہ: اسرار جامعی۔ مدیر "پوسٹ مارٹم" ا۔ جامعہ نگر دہلی ۲۵

پارۂ عم

اردو اور انگریزی میں ترجمہ مع تشریح اور عربی متن

حکیم محمد سعید صاحب نے نوجوانوں کے مرتبہ فکر و علم کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن حکیم کے تیسویں پارے کا آسان اردو اور انگریزی ترجمہ اور تشریح مع عربی متن پیش کیا ہے۔ انگریزی ترجمہ متجر عالم عبداللہ یوسف علی کا نتیجہ فکر ہے۔

آج کا نونہال خواہ اردو میڈیم کا طالب علم ہو یا انگریزی میڈیم کا 'پارہ عم کو پڑھنے اور سمجھنے میں سے کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ اپنے نونہالوں کو پارۂ عم تحفے کے طور پر پیش کیجے۔ ہدیہ۔ -/45

فی البدیہہ یوسف ناظم

اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار یوسف ناظم کے ۱۹ دلچسپ اور قہقہوں سے بھرپور مضامین کا نیا مجموعہ۔ قیمت -/۵۰

ادبی تہذیبی خبریں

انٹرنیٹ پر بی بی سی اردو سروس آغاز

بی بی سی ورلڈ سروس نے بدھ ۳/مارچ سے اپنی اردو سروس کی روزانہ چاروں نشریات کی نئی ویب سائٹ قائم کردی ہے اور پہلی مرتبہ انٹرنیٹ پر یہ نشریات اپنی تمام آوازوں سمیت میسر ہوں گی۔ بی بی سی کی ایشیا اور پیسیفک ریجن کی سربراہ الزبتھ برائٹ نے بتایا کہ دنیا میں بیس کروڑ سے زیادہ لوگ اردو بولتے ہیں اور ان کی بڑی تعداد جو جنوبی ایشیا سے باہر رہتی ہے' ہماری نشریات نہیں سن سکتی مگر نئی ویب سائٹ کی بدولت اس علاقے کے لاکھوں افراد اپنے کمپیوٹر (PCS) پر ان نشریات کو براہ راست سننے کے قابل ہوں گے۔ اس موقع پر اردو سروس جنوبی ایشیا کے مینجنگ اڈیٹر سام ملر اور لندن میں مقیم بی بی سی اردو سروس کے اڈیٹر عباس ناصر بھی موجود تھے۔ الزبتھ برائٹ نے کہا کہ بی بی سی کی پوری مجلس پیر سے جمعرات تک سنی جاسکتی ہے جبکہ جمعہ سے اتوار تک انہی پروگراموں میں خصوصی میگزین اور فیچر پیش کیے جائیں گے۔ ویب سائٹ کا پتہ یہ ہے۔

WWW.BBC.CO.uk/urdu

بی بی سی کی اردو سروس کا دائرہ کار بڑھانے اور اسے مزید مقبول بنانے کے حوالے سے الزبتھ برائٹ نے کہا کہ گذشتہ ماہ بی بی سی نے اپنے تین سالہ ترقیاتی منصوبے کا اعلان کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ ۲۰۰۲ء تک دنیا کی بارہ اہم زبانوں میں سکرپٹ اور آواز سمیت ملٹی میڈیا مکمل براڈ کاسٹ فراہم کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بی بی سی کی اردو سروس وہ پہلی سروس ہے جسے ملٹی میڈیا براڈ کاسٹ اور "ویب سائٹ" کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں عباس ناصر اڈیٹر اردو سروس نے کہا کہ ہم اپنی نشریات کی کوالٹی کو بہتر بنانے کے لیے ۱۴ملین پونڈ خرچ کر رہے ہیں جس سے ہر علاقے میں ہماری نشریات کے سگنلز زیادہ موثر طریقے سے سنے جاسکیں گے۔ بی بی سی اردو سروس کی روزانہ نشریات کا مجموعی دورانیہ ایک گھنٹہ اور ۵۵ منٹ ہے جو پاکستانی وقت کے مطابق صبح چھ بجکر ۳۰ منٹ پر' دوپہر ایک بجکر ۳۰ منٹ پر' شام کو آٹھ بجے اور رات کو ساڑھے دس بجے پیش کی جاتی ہیں۔

ادب صحافت کے شعبے میں اعلا اعزازات کی تقسیم

صدر مملکت محمد رفیق تارڑ نے یوم پاکستان کے موقع پر ایوان صدر میں منعقدہ ایک پر وقار تقریب میں مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے پر اعلا اعزازات سے نواز۔ ادب وصحافت کے شعبے میں بلندپایہ کارکردگی پر نوائے وقت اور دی نیشن کے مدیر اعلا مجید نظامی اور سید شریف الدین پیرزادہ کو نشان امتیاز سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر جمیل الدین عالی کو ادب اور الطاف گوہر کو صحافت کے حوالے سے ہلال امتیاز

عطا ہوا جبکہ منیر نیازی (ادب)، ڈاکٹر وزیر آغا(ادب)، عطاء الحق قاسمی(ادب)، افتخار عارف (ادب)، امجد اسلام امجد(ادب)، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری(ادب)، اور ڈاکٹر شمس لاکھا(تعلیم) کو ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔ بیگم نثار عزیز بٹ (ادب)، افتخار علی (صحافت)، مسرور انور(بعد از وفات)(ادب)، ڈاکٹر شہزاد قیصر(ادب)، اور محمد کامران خاں (صحافت) کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا ہوا۔ مسعود الحسن تابش دہلوی(ادب)، اختر ہوشیار پوری(ادب)، ڈاکٹر لیاز حسین قادری بعد از وفات(ادب)، نسیم درانی (ادب)، پروفیسر محمد افضل رضا(ادب)، ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلع داری (ادب)، پروفیسر ڈاکٹر بیگم مشہودہ حسن (تعلیم) پیر شاہ ہمدرد(صحافت) اور محمد اطہر طاہر (ادب) کو تمغہ امتیاز عطا کیا گیا۔

کام کرنے والوں پر ہی نکتہ چینی کی جاتی ہے

ڈاکٹر اسحق کی سوانح حیات کے اجراء پر جگن ناتھ آزاد کا اظہارِ خیال

ممبئی ۹ر اپریل (وسیم انصاری) ڈاکٹر محمد اسحق جمخانہ والا، شخصیت اور خدمات نامی کتاب کی رسم اجراء پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کرتے ہوئے کہا کہ اس کا دیباچہ میں نے کتاب کے مصنف ڈاکٹر آدم شیخ کا مسودہ پڑھنے کے بعد تحریر کیا حالانکہ کسی کی سوانح عمری یا سفر نامہ لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے لیکن ڈاکٹر آدم شیخ نے جس طرح ڈاکٹر جمخانہ کی سوانح عمری تحریر کی ہے وہ قابل تعریف ہے کیونکہ جو شخص کام کرتا ہے اس پر ہی نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ جو کام نہ کرے اس پر نکتہ چینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر آدم شیخ نے کتاب میں بزنس ٹائپ نہیں بلکہ معاشیات، سماجیات اور اخلاقیات کا ذکر کر کے اسے ایک ادبی کتاب بنادیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر جمخانہ والا کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ انجمن اسلام کے ماتحت ۲۷ ادارے چلا رہے ہیں۔ محمود الرحمٰن (وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) نے فرمایا کہ سوانح نگاری آسان کام نہیں ہے۔ خود کی سوانح عمری تحریر کرنا آسان ہے مگر دوسرے کی سوانح عمری لکھتے وقت محاسبہ کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن جہاں اندھیرے ہیں وہاں چراغ جلانے کا کام ڈاکٹر جمخانہ والا کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر محمد شمیم جیراج پوری (وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدر آباد) نے ڈاکٹر صاحب کے کاموں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اردو کو ایسے رشتہ میں باندھنا مشکل کام ہے اور جب میں نے حیدر آباد میں پہلا سمپوزیم کیا تو میرے ذہن میں بات تھی کہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں ممبئی سے اردو میڈیم سے کامیاب ہونے والے طالب علم داخلہ لیتے ہیں اور فوراً مجھے ڈاکٹر جمخانہ والا کا نام یاد آیا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی مدد کے بغیر مہاراشٹر یا ممبئی میں اسٹڈی مرکز نہیں کھولا جاسکتا اور ہم نے جمخانہ والا کے تعاون سے ممبئی میں اسٹڈی مرکز قائم کیا اور جلد ہی

بھیونڈی، پونے اور دوسرے اضلاع میں مرکز قائم کریں گے۔

علی سردار جعفری (گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ) نے کہا کہ میرا نعرہ ہے روٹی اور کتاب جو ایک عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور علم کو پھیلانا ضروری ہے اور آج انجمن اسلام جیسے سیکڑوں اداروں کی ضرورت ہے اور جو نفرت کرتے ہیں وہ قوم کو فائدہ نہیں بلکہ خود کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

کے ایم عارف الدین (مدینہ ایجوکیشن ٹرسٹ حیدر آباد) نے کہا کہ تعلیمی میدان میں جمخانہ والا کی شخصیت کی خاص اہمیت ہے اور ڈاکٹر صاحب سیکولر انسان کے ساتھ پکے مسلمان بھی ہیں۔ مجاہد آزادی ڈاکٹر اوشا مہتا نے کہا کہ مجھے حکومت برطانیہ سے لڑنے کی ہمت تھی مگر ڈاکٹر جمخانہ والا کے سامنے نہ کہنے کی ہمت نہیں ہے۔

کتاب کے مصنف ڈاکٹر آدم شیخ نے بتایا کہ مجھے ڈاکٹر جمخانہ والا کا کام دیکھ کر سوانح عمری لکھنے کا شوق ہوا۔ حالانکہ ایک گروپ تھا جو ڈاکٹر صاحب پر تنقید کرتا تھا اور میں نے ڈاکٹر جمخانہ والا پر نکتہ چینی کرنے والوں کے لیے کتاب لکھی جو سیاسی سماجی اور معاشرہ کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا نے سبھوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے آپ کو کبھی قائد نہیں سمجھا۔ آج میرا دل جذبات سے معمور ہے۔ اس موقع پر ہارون رشید علیگ (مدیر انقلاب) خلیل زاہد (مدیر ماہنامہ چٹان) نند کشور نوٹیال (مدیر نوتن سویرا) نے بھی خطاب کیا جبکہ شہر کے معزز حضرات اساتذہ ڈاکٹر اور بڑی تعداد میں خواتین بھی موجود تھیں۔

ڈاکٹر وہاب قیصر کو مبارک باد

حیدر آباد ۳۰ / مارچ (راست)

ہندستانی بزم اردو ریاض کی جانب سے ڈاکٹر عابد معز اور غوث ارسلان نے ممتاز کالج کے پرنسپل مقرر ہونے پر ڈاکٹر وہاب قیصر کی گل پوشی کی اور پُر خلوص تہنیت پیش کی۔ ماہنامہ شگوفہ کے دفتر میں کل شام منعقدہ ایک غیر رسمی تہنیتی محفل سے مخاطب کرتے ہوئے بزم کے نائب صدر ڈاکٹر عابد معز نے کہا کہ ایک اقلیتی ادارے میں ادبی اور علمی اعتبار سے نمایندہ اردو شخصیت کا انتخاب قابل تحسین اقدام ہے۔ اس طرح کی شخصیتوں کے انتخاب سے علمی اعتبار سے اردو کی ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ صدر محفل پرویز یداللہ مہدی نے کہا کہ ڈاکٹر وہاب قیصر نئے سائنسی موضوعات پر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ جس سے سائنسی ادب کے اردو سرمایہ میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر وہاب قیصر نے تہنیت کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ہر وہ کام جو انھیں سونپا گیا پورے خلوص اور لگن کے ساتھ کیا اور کرتے رہیں گے اور علمی و ادبی سرگرمیوں سے ہمیشہ وابستہ رہیں گے۔

انسائیکلوپیڈیا مشاورتی اجلاس

حیدر آباد ۳۰ / مارچ (پریس نوٹ)

ریاست آندھرا پردیش میں آزادی کے بعد اردو زبان وادب کا ارتقاء ۱۹۹۷ء کے زیر عنوان قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام "بھارت سیریز" کے سلسلے میں انسائکلو پیڈیا کی تیاری کے سلسلے میں دو روزہ مشاورتی اجلاس کے آج پہلے دن دو سیشن مرکزی اردو لائبریری اردو اکیڈمی پرانی حویلی حیدر آباد میں گیارہ بجے دن سے منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت جناب سید شاہ نور الحق قادری ایڈوکیٹ صدر اکیڈمی نے اور دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر سیدہ جعفر نے کی۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی اور پروفیسر سیدہ جعفر اور دوسرے اجلاس میں پروفیسر اشرف رفیع اور پروفیسر عقیل ہاشمی بہ حیثیت مہمان خصوصی شریک تھے۔ ان مشاورتی اجلاسوں میں اس عنوان کے تحت نثر، نظم، تنقید و تحقیق اور صحافت و تعلیم کے چار زمروں میں آندھرا پردیش میں اردو زبان کی ترقی وارتقاء میں اردو اکیڈمی اور دوسرے اداروں کے رول، اردو ذریعہ تعلیم کے مسائل، اردو بہ حیثیت زبان دوم فکشن ونان فکشن اور شاعری کی تمام اصناف اور تخلیق کاروں جیسے ۲۴ موضوعات کی نشاندہی کی گئی اور ان زمروں کے تحت چار مشاورتی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں جو ان موضوعات اور ان کے لیے مقالے لکھنے والوں کے ناموں اور رہنمایانہ خطوط کو قطعیت دیں گی۔ ابتدا میں ڈائریکٹر سکریٹری جناب مسعود بن سالم نے خیر مقدم کیا اور اس مشاورتی اجلاس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ صدر اکیڈمی جناب سید شاہ نور الحق قادری نے اکیڈمی کی سرگرمیوں اور مستقبل کے لائحہ عمل سے اکابرین اجلاس کو واقف کروایا۔ پہلے دن کے دونوں اجلاسوں میں جناب ہاشم حسن سعید، ڈاکٹر صادق نقوی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر غیاث متین، ڈاکٹر بیگ احساس، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ڈ پروفیسر حبیب ضیاء ڈاکٹر مجید بیدار، جناب عابد صدیقی، جناب محمد الحق، جناب منظور احمد منظور نے شرکت کی، جناب حمید الظفر، جناب محمود سلیم اور دوسرے ارکان نے انتظامی امور کی دیکھ بھال کی۔ کل مشاورتی اجلاس کا دوسرا دن ہے جس کے دو سیشن صبح گیارہ بجے اور تین بجے منعقد ہوں گے۔

غالب کی رہائش محل سرا کے انہدام کے خلاف حکم التوا

(پی ٹی آئی) دہلی ہائی کورٹ نے مرکزی اور دہلی کی حکومت سے کہا کہ محل سرا کی حیثیت سے مشہور "نواب لوہارو" کی حویلی کے تحفظ کو یقینی بنائے جہاں اردو کے بے مثال شاعر مرزا غالب طویل عرصہ تک مقیم رہے تھے۔ جسٹس ارون کمار اور جسٹس منموہن سرین پر مشتمل ایک ڈویژن بنچ نے مرکز، محکمہ آثار قدیمہ، حکومت دہلی، مجلس بلدیہ دہلی اور دوسروں کو نوٹس وجہ نمائی جاری کی اور کہا کہ

جواب دہندگان اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ یہ عمارت منہدم نہ کی جاسکے۔ انھوں نے متذکرہ بالا تمام جواب دہندگان کو ۱۰ مئی تک جواب دینے کی ہدایت دی۔ یہ نوٹس سوسائٹی برائے تحفظ ورثہ کلچر کی درخواست پر جاری کی گئیں۔ سوسائٹی نے اس عمارت کو غالب کی یادگار میں ایک محفوظ یادگار قرار دینے کی استدعا کی ہے۔

محمد عبدالرشید خاں صاحب پرنسپل فلک نما جونیر کالج مقرر

حیدر آباد۔ ٦۔ اپریل ڈائرکٹر آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے مراسلہ نمبر 379/jc2-1/99 ۳۱/ اپریل 1999 کے ذریعہ فلک نما جونیر کالج کے زوآلوجی کے جونیر لکچرار جناب محمد عبدالرشید خاں کو پرنسپل کی زائد ذمہ داریوں پر تعینات کیا گیا ہے۔ موصوف نے ۵/ اپریل کو اپنے اس نئے عہدے کا جائزہ حاصل کیا۔ اس موقع پر موجودہ اسٹاف نے مبارکباد پیش کی اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

اردو شاعرہ کویتا کرن کو ایل ایل بی کی ڈگری

اردو کی نامور شاعرہ کویتا کرن نے جامعہ عثمانیہ سے ایل ایل بی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ کویتا کے چار شعری مجموعہ پہچان، سوغات، آشنا اور نوازش شائع ہو چکے ہیں۔ اخبار سیاست اور سالار (بنگلور) اور ہندی ملاپ کے علاوہ ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی کلام سنایا کرتی ہیں۔ کویتا کرن ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی دختر، مسٹر بی مہیشور راؤ کی اہلیہ اور مسٹر پریم چند ایڈوکیٹ کی بہو ہیں۔

خوشبو کا سفر کا ۲۹ واں شمارہ کی اشاعت

جناب صلاح الدین نیر کی ادارت میں ماہنامہ خوشبو کا ۲۹ واں شمارہ شائع ہو چکا ہے۔ حصہ نثر میں ڈاکٹر اختر سلطانہ پروفیسر لطیف سبحانی، شاغل ادیب، کبیر احمد، سیدہ مہر شکیل گوالیاری، امتہ الصالحہ، ڈاکٹر میر گوہر علی، امام چراغی اور صلاح الدین نیر کی نگارشات شامل ہیں۔ حصہ افسانے میں نکہت سیدیا سمین فردوس، نورالدین اور رحیم انور کے افسانے شامل ہیں۔ حصہ شاعری میں بیکل اتساہی، خواجہ شوق، محسن جلگانوی، ڈاکٹر قمر بہرائچی شفیع اللہ خاں راز اناوی، ڈاکٹر مسعور جعفری، سید المظفر وسیم، ڈاکٹر عبرت بہرائچی، رئیس قیوم فیاض، عبدالوہاب غوری افغانی، مقیت اعظمی ڈاکٹر نورشاہی فراز سروہاشمی اور ضمیر یوسف کا کلام شامل ہے۔ عمدہ کتابت نفیس کاغذ، بہترین طباعت اور دیدہ ور سرورق سے آراستہ یہ رسالہ ڈائمنڈ بک اسٹال نامپلی، روبرو پٹرول پمپ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

محمد عبدالبصیر کا بحیثیت لکچرر اقامتی کالج گنٹور تقرر

مسٹر محمد عبدالبصیر، فرزند، جناب محمد عبدالقدیر ریٹائرڈ سپر وائزر نظام آباد کا بحیثیت لکچرر، اقامتی جونیر کالج اردو میڈیم گنٹور تقرر عمل میں آیا ہے۔ مسٹر بصیر نے روزنامہ سیاست

میں بحیثیت رپورٹر خدمت انجام دی ہیں۔ وہ ایم اے (اردو) سے گولڈ میڈلسٹ رہے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ لکچرر کے عہدے پر ان کا انتخاب کالج سروس کمیشن کی جانب سے کیا گیا۔ انھوں نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور کالج سروس کمیشن کے زیر اہتمام منعقدہ قومی اقلیتی امتحانات میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے خلیل واڑی ہائی اسکول نظام آباد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اور گیری راج ڈگری کالج نظام آباد سے گریجویشن کی تکمیل کی۔

تطہیر فاطمہ کو اردو اکادمی دہلی ایوارڈ

نئی دہلی۔ ۱۶/اپریل۔ سر وودیہ ودھالیہ نود نگر ایسٹ دہلی ۹۱ کی طالبہ تطہیر فاطمہ بنت شمیم شیلا نقوی کو امسال ۹۸۔۱۹۹۷ کے لیے اردو مضمون کے ساتھ چھٹی کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرنے پر اردو اکادمی دہلی نے وظیفے کا مستحق قرار دیتے ہوئے آٹھ سو روپے نقد مع سرٹیفکیٹ اور ایک شیلڈ سے نوازا۔ اس موقع پر دہلی اسمبلی کے ممبر اور وقف بورڈ کے چیرمین ہارون یوسف کے ہاتھوں یہ ایوارڈ تقسیم ہوئے۔

مجروح سلطانپوری کے ساتھ ایک شام

بھوپال۔ اردو کے نامور شاعر، غزل کے امام اور ترقی پسند تحریک کے میر کارواں مجروح سلطانپوری کی گرانقدر شعری خدمات کے اعتراف میں ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے ایک پراثر استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا۔ اس یادگاری جلسے میں جس کے مہمان خصوصی سپریم کورٹ کے سابق جج اور مدھیہ پردیش کے موجودہ لوک آیکت جسٹس فیضان الدین تھے جبکہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیرمین عزت مآب عزیز قریشی نے مجروح صاحب کی خدمت میں الفاظ وجذبات کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے انھیں عظیم شاعر ہی نہیں بھوپال کے ادبی خاوندان کا ایک شفیق بزرگ ہمدرد اور رہبر قرار دیا اور یہ تمنا بھی ظاہر کی کہ اگر ان کے نام کے ساتھ سلطانپور کے بجائے بھوپال کی نسبت ہو تو اس سے ہمارا قد کتنا اونچا ہو گیا ہوتا۔

شری عزیز قریشی صاحب نے مزید کہا

ستون دار پر رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

اس شعر کو پاکستانی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ نے فوجی حکومت کے خلاف اور بحالی جمہوریت کے لیے اس کو اپنا قومی نغمہ بنا لیا تھا۔

سپاسنامہ میں مزید کہا گیا کہ مجروح صاحب کی شہرت کی بنیاد وہ غزل ہے جو ایک جادوئی نغمہ بن کر ابھری اور جمالیات کے لطیف ونازک جذبات کے ساتھ ان کی مفکرانہ اور نظریاتی شاعری پچاس سال سے زیادہ عرصہ سے اردو دنیا کے قاری کو مسحور کئے ہوئے ہے۔ انھوں نے ترقی پسند ادب کے عوامل اور رجحانات کو غزل کے پیکر میں ڈھال کر اس کی کلاسیکی ہیت کو نیا آہنگ بھی عطا کیا جو باوجود کم

تنی کے ایک ناقابل فراموش اسکول کی بنیاد بن گیا۔

سپاسنامہ کے جواب میں جب مجروح سلطانپوری صاحب کھڑے ہوئے تو وہ شدت جذبات سے مغلوب آواز میں یوں گویا ہوئے کہ بھوپال سے میرا تعلق اظہر من شمس ہے اور یہ سب مدھیہ پردیش اکادمی کے چیئر مین عزیز قریشی نے میرے لیے جو کہا وہ ان کی وسیع القلبی ہے اس کا میں خود کو لائق نہیں سمجھتا اور شدت جذبات میں اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ آپ کی اس ذرہ نوازی پر میں خوشی اور ندامت کے ملے جلے جذبات اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں۔

اس موقع پر مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ملار موزی سنسکرتی بھون کا ہال لوگوں سے چھلکا پڑ رہا تھا اس بھیڑ بھرے جلسے میں جب جسٹس فیضان الدین صاحب نے اردو اکادمی کا میمنو اور شال محترم مجروح صاحب کو نذر کیے تو تالیوں کے گونج نے جیسے سارے ماحول کو مسرت و خوشی سے بھر دیا۔

مدھیہ پردیش کے لوک آیوکت جسٹس فیضاالدین صاحب نے بولتے ہوئے کہا کہ مختلف اداروں کے ذریعے اردو کے آئینی تحفظ کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دئے جارہے ہیں اس میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی سر فہرست ہے اور اکاڈمی کے ارد اس کے قابل چیئر مین جناب عزیز قریشی کے ذریعہ اردو کے بزرگ اور قد آور فنکاروں کے استقبال کو اسی سلسلے کی ایک قابل تحسین کڑی قرار دیا۔ اور اس کے لیے ان کو مبارکباد دی۔

اردو دنیا کے معتبر اور اقبال اعزاز حاصل کرنے والے بھوپال کے آسمان پر سورج کی طرح روشن شاعر جناب اختر سعید خاں نے شکریہ کے کلمات ادا کرنے سے قبل ترقی پسند تحریک کے آغاز و عروج اور منطقی انجام پر اس کے رویہ بن جانے کے تعقل سے نہایت بصیرت افروز تقریر کی اس اور اس کا ایک عظیم نمائندہ مجروح سلطانپوری کو قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ جس طرح ان کی غزل اپنے سیاسی مفاہیم کے ساتھ ہماری رہبری کرتی رہی ہے مستقبل میں بھی اس طرح روشن رہے گی جب تک کہ لو معجزہ حیات جاری ہے۔

اس خوبصورت یادگاری اور تاریخی جلسے کی شروعات مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے وائس چیئر مین محترم منوہر کیشور صاحب کے استقبالیہ کلمات اور گلپوشی سے شروع ہوئی جبکہ نظامت کے فرائض اردو اکادمی کے رکن اور مشہور شاعر عشرت قادری نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی۔

مدھیہ پردیش میں اردو آزادی کے بعد "

پر دو روزہ ورکشاپ

بھوپال ۱۰ / مارچ ۔ اردو کے عالمی حیثیت کے حامل غزل گو شاعر مجروح سلطانپوری نے آج یہاں کہا کہ ترقی پسند تحریک کو گلے لگانے اور آگے بڑھانے کا جو کام بھوپال

کے ادیب وشعرا نے کیا ممبئی اور لکھنو کے سوا کوئی دوسرا شہر اس کا ہمسر وثانی نظر نہیں آتا۔ اور مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی تعرض نہیں کہ اس شہر میں غزل کی جس طرح پرورش ہوئی اور اس کے نتیجے میں تاج بھوپالی، کیف بھوپالی، اختر سعید خاں اور عشرت قادری وغیرہ نے ترقی پسند غزل کو بام عروج پر پہنچادیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے بالخصوص اختر سعید خاں کی غزل کا بر صغیر میں آج کوئی ثانی دکھائی نہیں دیتا۔

مدھیہ پردیش میں اردو آزادی کے بعد" موضوع پر منعقدہ دو روزہ ورکشاپ کا ملار موزی سنسکرتی بھون میں افتتاح کرتے ہوئے مذکورہ گرانقدر تعریف جناب مجروح سلطانپوری نے کی جس کا اہتمام مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی کے تعاون سے کیا۔ انھوں نے بھوپال سے اپنے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے نصف صدی کا حصہ قرار دیا اور کہا کہ اہل بھوپال سے انھیں جو صحبت ملتی رہی ہے ہندستان کا کوئی دوسرا شہر اسکا ثانی نہیں ہے۔ اس سے قبل مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیرمین عزت مآب عزیز قریشی نے مہمان مکرم کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد ۵۰ سالہ شعر وادب کے تجزیہ پر مبنی ورکشاپ کے افتتاح کے لیے مجروح صاحب سے بہتر کوئی دوسری شخصیت نہیں ہو سکتی کہ ان کی آواز نصف صدی کے دوران پورے ملک میں نہ صرف گونجتی رہی بلکہ اردو زبان تہذیب کی نمائندگی کرکے اس کی خصوصیات سے اہل ملک کو متعارف کراتی رہی ہے۔

ورکشاپ کے کلیدی خطبہ کے نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب اختر سعید خاں نے ورکشاپ کے موضوع کو ایک ہمہ گیر موضوع قرار دیتے ہوئے اس کا جائزہ ریاست کی علاقائی خصوصیت اور زبان وادب میں ان کے کردار کے تجزیہ کے ساتھ کرنے کا مشورہ دیا۔

شروع میں ورکشاپ ڈاریکٹر ڈاکٹر حامد حسین نے ورکشاپ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی کے ایک کثیر المقاصد منصوبے کا یہ ایک حصہ ہے جس کے تحت ملک کے مختلف حصوں میں اردو زبان وادب کی کیا ترقی ہوئی اس کا جائزہ لے کر درپیش مسائل پر مبنی ورکنگ پیپر تیار کئے جائیں گے تاکہ اردو کی واقعی صورتحال کا اندازہ ہوسکے۔ بالخصوص اس کی ترقی میں مختلف ادارے افراد تعلیمی انسٹی ٹیوٹ کیا کردار ادا کررہے ہیں آزادی کے ۵۰ برسوں میں ان کا طریقہ کار کیا رہا۔ اس پر بنیادی نوعیت کے حقائق جمع کرکے انھیں دستاویزی شکل دی جاسکے۔ اس مقصد کے پیش نظر ریاست کے مختلف علاقوں کے ماہرین کو مدعو کیا ہے ۔ اس موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی کی سابق پروفیسر ڈاکٹر انور سمیعل صاحبہ نے تقریر کرتے ہوئے بھوپال کے تہذیبی وادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور تدریس کا فریضہ ذمہ داری سے ادا کرنے پر زور دیا۔ نشست کے آغاز میں اردو اکادمی کے وائس

چیرمین جناب منوہر کیھو نے مہمانوں کا گلپوشی کی اور آخر میں شکریہ کا ساتھ ادا کئے۔

دور وزہ ورکشاپ میں ڈاکٹر شاہد نے مدھیہ پردیش میں اردو غزل کے پچاس سال ڈاکٹر انیس سلطان نے مدھیہ پردیش میں اردو غنفیق کی نئی جہات "پروفیسر کوثر جہاں نے" مدھیہ پردیش میں اردو افسانہ ازادی کے بعد ڈاکٹر سیس حامد حسین نے مدھیہ پردیش میں اردو زبان وادب کا ارتقا آزادی کے بعد سے ۱۹۹۷ تک ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے " مدھیہ پردیش میں اردو طنز و مزاح آزادی کے بعد اور مدھیہ پردیش میں اردو صحافت آزادی کے بعد" نیز اقبال مجید نے مدھیہ پردیش اور منصوبہ بند اردو صحافت پر مقالے لکھ کر پیش کئے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے پتے میں تبدیلی

امریکہ میں مقیم ڈاکٹر ستیہ پال آنند کچھ خانگی حالات کے پیش نظر کینیڈا میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ان کا نیا پتہ یہ ہے۔

DR SATYAPAL ANAND

367,BURNETT ANE.,

CAMBRIDGE QNT NIT-1G6

CANADA

ادبی ٹرسٹ کا جلاس

حیدرآباد ۔۱۶ اپریل (راست) ادبی ٹرسٹ کا اجلاس ۳۰ مارچ کو ۴:۳۰ بجے کے شام دفتر سیاست میں صدر نشین ادبی ٹرسٹ ڈاکٹر سید عبد المنان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ معزز ارکان ٹرسٹ پروفیسر مغنی تبسم جناب ظہیر الدین علی خاں، جناب محمد فخر الدین (آڈیٹر) اور منیجنگ ٹرسٹی جناب زاہد علی خاں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں گزشتہ اجلاس کی روئیداد کی توثیق کی گئی۔ شاعروں، ادیبوں اور اداروں کو دی گئی امداد کی بھی توثیق کی گئی۔ اجلاس میں میڈیکل سائنس اور انجنیرنگ کالجس کے ۵۵ ٹرینگ کے لیے بھی ۴۰ ہزار روپے منظور کئے گئے۔ اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ ایسے طلباء و طالبات یو تعلیمی امداد دی جاۓ جو اردو میں درخواست لکھ سکتے ہوں۔ امداد کے سلسلہ میں شاعروں، ادیبوں کے اہ خاندان کو ترجیح دی جائے گی۔ اردو کلاسس کے لیے اردو گھر کو دی گئی امداد کی توثیق کی گئی طلباء و طالبات کو تعلیمی امداد کے لیے سالانہ ۳۰ ہزار روپے مختص کئے گئے ۔ یہ اجلاس منیجنگ ٹرسٹی جناب زاہد علی خاں کے شکریہ پر اختتام کو پہنچا۔

آئین ہند میں اردو کو تحفظ کی گارنٹی پر عمل کیا جائے۔ جسٹس وینکٹ چلیا

نئی دہلی ۔۱۶ اپریل جامعہ اردو علی گڑھ کی ۶۰ ویں سال گرہ کے سلسلے میں منعقد ایک خصوصی تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے سابق چیف جسٹس آف انڈیا اور قومی لسانی حقوق کمیشن کے چیئر مین جسٹس ایم این وینکٹ چلیانے آج یہاں اپنی تقریر میں کہا کہ اردو ہندستان کی خوبصورت ترین اور شیریں زبان ہے۔ اس کی اثر آفریں سے شاید ہی کوئی انکار

کرے۔ اردو زبان کے فروغ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ آئین ہند میں اس زبان کے تحفظ کا یقین دلایا گیا لیکن اس کے باوجود اگر اردو عدم تحفظ کا شکار ہے۔ اور اہل اردو کو اس بات کا شکایت ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ابھی تک آئین میں دی گئی گارنٹی پر باقاعدہ اور پوری طرح عمل نہیں ہوا ہے۔

مسٹر نابی الیس نریمن سنئیر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ نے اپنے خطبہ صدارت میں محسوس کیا کہ اردو زبان ملک میں کمزور ہوئی ہے اور اسے پھر سے مضبوط بنانا از حد ضروری ہے۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہی تہذیب بھی ہے اردو اور تاج محل یہ چیزیں ہندستان کو مسلمانوں کی دین ہیں اور یہی وہ چیزیں اب ملک کی شناخت بن چکی ہیں لہذا اردو کے تحفظ اور اسے فروغ دینے کی ذمہ داری اس ملک کی ہے الہ آباد ہائی کورٹ کے جج جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے واضح طور پر کہا کہ اگر اردو کمزور ہوتی ہے تو یقیناً پورا ملک کمزور ہوگا۔ اردو کی جڑیں تمام ملک میں گہرائی تک پھیلتی ہوئی ہیں لہذا اسے مضبوط بنا کر پورے ملک کا بھلا کیا جاسکتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر مسٹر حمید اللہ بھٹ نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ ملک تقسیم اب ماضی کا قصہ بن کر رہ گئی ہے اس المیہ کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔ یوں بھی اس کے لیے اردو ذمہ دار نہ تھی جو لوگ اردو کو مسلمانوں یا پاکستان سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود تو غلطی پر ہیں ہی اردو کو بھی اس کے مقام سے محروم کرنے کی سازش کرنے والی غلط ذہنیت کو ہوا دیتے ہیں آج ملک میں اس قسم کی ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

یہ تقریب ایک سمپوزیم کی شکل میں تھی جس کا موضوع ہندستانی دستور میں اردو اور دیگر لسانی اقلیتوں کی حیثیت تھا فلمی اداکارہ اور ممبر پارلیمنٹ شبانہ اعظمی بھی تقریب میں شروع تا آخر شریک تھیں۔ سمپوزیم چار اجلاس پر مشتمل تھا جس میں ملک کے کئی معروف دانشوروں اور اہل فکر حضرات نے اردو زبان اور اس کے مسائل پر روشنی ڈالی جامعہ اردو علی گڑھ کے رجسٹرار ایس انور سعید تقریب کے روح رواں تھے اس تقریب کا کارروائی انگریزی میں ہونے سے کئی اہل اردو بے اطمینانی کا اظہار کرتے دکھائی دیئے لیکن منتظمین کا جواب تھا کہ اردو کی آواز اور مسائل کو بین اقوامی سطح پر اٹھانا مقصد ہے لہذا کارروائی انگریزی میں ہونا چاہیے۔

چھٹا عالمی ماہیا مشاعرہ

کلکتے کا پہلا ہندستان کا چوتھا اور دنیا کا چھٹا ماہیا مشاعرہ عالمی اردو ادب کے شہرت یافتہ محقق ناقد، شاعر اور "کوہسار جنرل" کے مدیر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے اعزاز میں فراغ روہوی کی جانب سے ۱۲ نمبر زکریا اسٹریٹ فرسٹ فلور کلکتہ ۷۳ میں ۱۹ر فروری ۱۹۹۹ کو شام چھ بجے منعقد ہوا۔

مشاعرے کی صدارت مغربی بنگال اردو اکادمی کے وائس چیئرمین علقمہ شبلی نے فرمائی۔ ضمیر یوسف نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے دہلی

سے تشریف لائے ہوئے معروف شاعر جناب مظہر امام نے مشاعرے کو یادگار بنادیا۔

مشاعرہ شروع ہونے سے قبل حضرت علقمہ شبلی، جناب مظہر امام، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، قیصر شمیم صاحب، ظہیر کمال جعفری، ذ۔ س۔ اعجاز عاصم شہواز شبلی اور بھاگل پور سے آئے ہوئے شاعر جناب اشعر اور ینوی کی خدمت میں گلہائے عقیدت پیش کیے گئے۔ نیز رائٹرس ایسوسی ایشن، اور "جدید ادبی مرکز" ہوڑہ نے بالترتیب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گلدستہ اور سپاس نامہ پیش کیا۔

مظہر امام صاحب نے اس بزم شمولیت سے اپنی غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا۔ کلکتہ کو اپنا ماضی بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انسان اپنے ماضی کے سہارے جیتا ہے۔ مستقبل نئے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بات میرے اندازے سے زیادہ اور بڑی حیرت انگیز ہے کہ اتنے سارے لوگ ماہیے لکھ رہے ہیں حضرت علقمہ شبلی اور قیصر شمیم صاحب سے اپنی دیرینہ دوستی، قرابت اور ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مناظر صاحب کو اپنا عزیز بتایا۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کے ماہیے کے جواز ان سامنے آچکے ہیں انھیں کو ماہیا کا طے شدہ وزن سمجھنا چاہیے۔ پنجابی میں تو گھر کی عورتیں اور لڑکیاں ماہیے گاتی ہیں لیکن اردو کا مزاج الگ ہونے کی وجہ سے شاید اردو میں یہ ممکن نہیں۔ ماہیے کے مخصوص آہنگ اور اسلوب کے پیش نظر انھوں نے کہا کہ جو باتیں غزل میں کہی جارہی ہیں۔ انھیں باتوں کو ماہیے میں دہرانے سے کیا فائدہ۔ مشاعرے میں اپنی شرکت اور سنائے ہوئے ماہیے پر اپنی بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فراغ روہوی کی اس کوشش کو سراہا۔

ملک کے ممتاز قلمکار آنند کے اعزاز میں جلسہ

بھوپال کے شعری ادبی اور تہذیبی ماحول کے بارمیں، میں بہت پہلے سے پڑھتا اور سنتا رہا تھا کہ اس شہر کا مزاج اور معیار ہندوستان کے دوسرے بڑے بڑے ادبی مراکز کے ہم پلہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ایک الگ شناخت بھی رکھتا ہے۔ اور آج جب میں اردو رائٹرز گلڈ، مرکز ادب، اور علامہ وجدی اکیڈی کے زیر اہتمام قلمکاروں کے درمیان ہوں تو مجھے یہ محسوس ہورہا ہے کہ بھوپال کی ادبی تہذیبی اور تمدنی روایات کے بارے میں میری واقفیت مکمل نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہاں ابراہیم یوسف جیسی اردو ڈرامہ کی بلند پایہ شخصیت موجود ہے اور تحقیق تنقید، افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری نیز شاعری کے شعبوں میں ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر سید حامد حسین، اقبال مجید، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، ڈاکٹر محمد نعمان خاں، عشرت قادری، اقبال مسعود، اور نئے لکھنے والوں میں اختر وامق، فاروق انجم۔ بدر واسطی اور انور حسین محور جیسی باشعور شخصیتیں موجود ہوں، اس شہر کے بجا طور پر علمی و ادبی مرکز کہا جاسکتا ہے اور اس وقت میں یہاں کے ادبی خاندان کے ساتھ بیٹھ کر

خوشی اور فخر محسوس کر رہا ہوں"
یہ الفاظ اردو کے مشہور و ممتاز ناول
وافسانہ نگار اور ڈرامہ نگار جناب آنند لہر نے کہ
جو جموں سے بھوپال محض اس شہر کو دیکھنے کی
غرض سے اپنی فیملی کے ہمراہ آئے تھے۔

معروف افسانہ نگار ناول نگار ڈرامہ نگار حجب امتیاز علی انتقال کر گئیں

لاہور (انشعاب رپورٹ) معروف
افسانہ نگار ناول نگار اور ڈرامہ نگار، بیگم حجاب
امتیاز علی ۱۸ مارچ کو رات گئے حرکت قلب بند
ہو جانے سے انتقال کر گئیں ان کی عمر ۹۱ برس
تھی۔ حجاب امتیاز علی نامور ڈرامہ نویس علی تاج
کی بیوہ تھیں انھیں ۳ مارچ کو تشویشناک حالت
میں ہسپتال میں داخل کر لیا گیا تھا۔ ان کے
پسماندگان میں ایک بیٹی یاسمین طاہر اور تین
نواسے شامل ہیں مرحومہ کو میکلوڈ روڈ پر مومن
پورہ قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ حجاب
امتیاز علی نے بہت کم عمری میں اپنے سفر کا آغاز
کیا۔ ان کا پہلا افسانہ "میری ناتمام محبت" اس
وقت شائع ہوا۔ جب ان کی عمر صرف گیارہ برس
تھی اس افسانہ نے اردو ادب کی ناقدین کو اپنی
جانب متوجہ کیا اور اس کے بعد مسلسل ۸۰ برس
تک وہ ادبی افق پر چھائی رہیں۔ وہ نواب سر محمد
اسماعیل کی صاحبزادی اور نواب زین یار جنگ کی
بھتیجی تھی۔ انھوں نے درجنوں ناول اور ڈرامے
تحریر کیے ان کے زیادہ تر ڈرامے ریڈیو پر براہ
کاسٹ ہوئے ایک ڈرامہ "چچا بھتیجیاں" الحمرا
لاہور میں سٹیج کیا۔ حجاب نے معروف ڈرامہ نگار
امتیاز علی تاج کے ساتھ محبت کی شادی کی جس
میں دونوں کے والدین کی رضامندی بھی شامل
تھی وہ برصغیر کی پہلی خاتون تھیں جنھیں
برطانوی حکومت نے پائلٹ کا لائسنس جاری
کیا۔ یہ لائسنس ۱۱ جون ۱۹۳۶ء کو جاری کیا گیا۔
۱۹۵۰ میں حجاب امتیاز علی کا نروس بریک ڈاؤن
ہوا۔ مگر وہ کچھ عرصہ علاج کے بعد صحت یاب
ہو گئیں۔ ۱۸ اپریل ۱۹۷۰ء کو امتیاز علی تاج اور
حجاب امتیاز پر قاتلانہ حملے میں شدید زخمی
ہوئیں۔ امتیاز علی تاج حجاب امتیاز صحت یاب
ہو گئیں۔ اس موقع کے بعد وہ مستقل طور پر اپنی
بیٹی کے ہاں منتقل ہو گئیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے ستارہ امتیاز

اسلام آباد (انشعاب رپورٹ) حکومت
پاکستان نے ممتاز نقاد اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا کو ان
کی گرانقدر علمی و ادبی خدمات پر ستارہ امتیاز عطا
کیا ہے یہ ایوارڈ ۲۳ مارچ کو ایوان صدر اسلام
آباد میں ایک خصوصی تقریب کے دوران دیا گیا
ڈاکٹر وزیر آغا ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ جانے کے سبب
تقریب میں شریک نہ ہو سکے اور یہ ایوارڈ ان کے
نواسے نے وصول کیا۔

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت دس روپے (-/Rs.10) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون -/70 روپے ہے) صرف -/65 روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25% اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر 10% کمیشن دیا جائے گا (ہر فرمایش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جا سکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ 202002

Regd. with R.N.I. at No. 4967/60 MAY, 1999
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

کتاب نما

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

Gram: "ACADEMY" New Delhi
e-mail : maktaba@ndf.vsnl.net.in
Tele Fax: 011-6910191
Phones: 3276018
6910191
3260668

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

جون ۱۹۹۹ء	جلد ۳۹	شمارہ ۶

فی پرچہ 8/-
سالانہ 80/
سرکاری تعلیمی اداروں سے 125/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
e-mail: maktaba@ ndf. vsnl. net.in
Tele Cum Fax No (011)-6910191
ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ ممبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقاء ایچ این سنہا -/85
فتاویٰ یوسف القرضاوی (مذہب) ترجمہ زاہد اصغر فلاحی -/100
تذکرہ حیوانات قرآن کریم میں (مذہب) ڈاکٹر میر کوثر علی خاں -/56
احکام و مسائل حصہ دوم مذہب سید احمد قادری -/58
شیئر بازار میں سرمایہ، موجودہ طریقہ کار اور اسلامی نقطہ نظر
ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی -/95
آل احمد سرور دانشور نقاد و شاعر غالب انسٹی ٹیوٹ -/200
ارمغان محسن (مجموعہ مراثی) محسن زیدپوری -/150
اعتماد (شعری مجموعہ) نظیر باقری -/92
اخبار الصنادید (تاریخ رامپور) نجم الغنی خاں رامپوری -/600
حمل ناؤ کے مشاہیر ادب (تذکرہ) علیم صبا نویدی -/500
تحریک آزادی ہند اور مسلمان (تاریخ) محمد احمد صدیقی -/20
ادب گاہ رامپور (منظوم تذکرہ) ہوش نعمانی -/150
تاریخ کتاب خانہ رضا (تاریخ) تالیف شوق رامپوری -/400
شناخت (ڈراما) سید وکیل احمد ہاشمی -/15
گھر داماد (ڈراما) سید وکیل احمد ہاشمی -/10
کلس (شعری مجموعہ) اختر پیامی -/100
لوح نور (شعری مجموعہ) کلیم شفائی -/90
ناآشنا چہچہیں (شعری مجموعہ) سید بشارت علی -/100
بازیافت (مجلہ) شعبہ اردو۔ کشمیر یونیورسٹی -/50
انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح کا مجلہ۔ مدیر۔ ضیاء الرحمن اعظمی
"یہ صبح" دہلی (ادبی سہ ماہی) مدیر سید نوشاد علی (قیمت نہیں لکھی)
اردو بک ریویو۔ شمارہ ۳۱۔۳۲۔ مدیر۔ جاوید اختر۔ فی شمارہ -/20

سرورق محمود شیخ

کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر ابرار رحمانی

کلیم الدین احمد پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اپنی تنقید میں بے لچک رویہ اپنایا۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی نے کلیم الدین احمد کا تنقیدی نگارشات کا معروضی مطالعہ کر کے اس کی قدر و قیمت کا از سر نو تعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ قیمت -/400

سرونج کی ادبی خدمات

ڈاکٹر شان احمد فخری

"سرونج کی ادبی خدمات" ڈاکٹر شان فخری کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس مقالے پر بھوپال یونیورسٹی نے موصوف کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ ایک نہایت اہم دستاویز قیمت -/500

درد آتا ہے دبے پاؤں

اقبال مہدی

اقبال مہدی کا نام افسانہ نگار کی حیثیت سے اب نیا نہیں رہا آپ کے بیشتر افسانے اردو کے معیاری رسائل میں شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ "درد آتا ہے دبے پاؤں" آپ کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے قیمت -/100

تاریخ فکر اسلامی

مصنف: پروفیسر محمد اجتباء ندوی

یہ کتاب پروفیسر محمد اجتباء ندوی کے علمی، تاریخی فکری اور سوانحی مقالات کا مجموعہ ہے جو مختصر، سادہ اور عام فہم اسلوب و انداز میں دیدہ زیب ٹائٹل اور عمدہ طباعت کے ساتھ "تاریخ فکر اسلامی" کی شکل میں منظر عام پر آگئے ہیں۔
قیمت -/110 روپے

مہمان مدیر
محمود شیخ

۵۹۲۔ نیا محلہ۔ مرزا غالب مارگ

جبل پور

(اشاریہ)

غیر منظّم آبادی کا اثر ---- زبان و ادب پر

غیر منظم آبادی، سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر نہ صرف زبردست تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہے، بلکہ تاریخ، تہذیب و تمدن کے وجود اور عدم وجود میں بھی اس کا زبردست ہاتھ ہے۔ کارل مارکس نے معیشت کی منصفانہ تقسیم پر زور دیا لیکن Dialectical Materialism پر اثر انداز ہونے والی اس اہم سچائی کو نظر انداز کر دیا جو کسی بھی نظریہ کو تہہ و بالا کرنے کے لیے کافی ہے۔

جس گھر میں افراد زیادہ ہوں، وہاں رہائشی مسائل اور مادّی ضرورتیں بھی زیادہ ہوں گی۔ ضرورت انسان کو نئے وسائل تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ معاشی ضرورتوں پر توجہ مبذول ہوتے ہی زندگی کے مادی شعور میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں رہائش اور بود و باش میں دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مرد و زن کے درمیان حصول تنہائی کے نفسیاتی مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ضرورتوں کی تکمیل نہ ہونے کے سبب مایوسی اور بے چارگی سے گھریلو فضا مکدر ہو جاتی ہے۔ سماجی رشتوں کی استواری اور ناکامی بھی افراد کے اضافے پر منحصر ہے۔

دنیا کا دستور ہے کہ جس کی افراط ہوتی ہے اس کی قدر و قیمت Market value) کم ہو جاتی ہے۔ آب، خاک، باد سبھی کچھ انسان کو وافر مقدار میں حاصل ہے۔ حالانکہ موجودہ تحقیقات نے صاف پانی اور ہوا کے حصول میں آنے والے خطرات سے انسان کو آگاہ کر دیا ہے۔ یہ مسائل غور طلب ہی نہیں بلکہ اپنا تدارک بھی چاہتے ہیں۔ آبی اور فضائی آلودگی کے اسباب انسانی ضرورت اور خواہشات کی دنیا میں تلاش

کیے جانا چاہییں۔ لیکن بے لگام جمہوریت کے سرمایہ دارانہ نظم معاشرت پر کچھ بھی قربان کیا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ رشتے اور جذبات بھی۔

مادّی ضرورتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں بلکہ ان کا دائرہ روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔ چونکہ انسان کی اکثر ضرورتیں خواہش سے پیدا ہوتی ہیں لہٰذا ان پر اخلاقی بندش ضروری ہے مگر خواہشوں کو پیدا ہونے سے روکا نہیں جاسکتا۔ سبب یہ کہ انسان آدمؑ کی اولاد ہے اور آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا اور مٹی مادّہ ہے اور مادّہ کی اپنی کیمیاوی خصوصیات ہوتی ہیں جو اس کے مادّی وجود کو قائم رکھتی ہیں۔ خواہش اور ضرورت بھی اسی مٹی کی پیداوار ہیں جس کا منبع ہے نفس، اور نفس کا ارتقاء خواہش کے فروغ میں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی شے اپنی ذات میں کُل نہیں ہوتی۔ مٹی بھی ایک نامیاتی کُل ہے حقیقت نہیں ہے۔ پانی کو ہوا کی ضرورت ہے اور ہوا، روشنی اور حرارت کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ پانی، حرارت اور روشنی کا مجموعہ مٹی ہے۔ پانی ہوا اور حرارت کے ختم ہوتے ہی مٹی کا فنا ہو جانا بھی یقینی ہے جیسے چاند میں کوئی روشنی نہیں ہے مگر دمکتا ہے، یہ روشنی ہے تو چاند بھی ہے، ورنہ کچھ بھی نہیں۔

موجودہ تجارتی نظم کے ذریعہ انسان پر نفسیاتی دباؤ بنا کر جمہوری نظم زندگی کا مطیع اور فرمانبردار بنایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت ہی موجودہ تہذیب و تمدن کی اساس ہے، اور سرمایہ داری اور جملہ فنونِ ادب و سائنس اس کے دست راست۔ خواہشات اور ضرورتوں کے محکوم افراد ادب و سائنس کا وہی راستہ اختیار کرتے ہیں جو انھیں سرمایہ داری کے حضور پہنچا سکے جہاں جمہوریت کی مطلق العنان حکمرانی ہے پہلے اس حکمرانی میں کیمونزم بھی شریک تھا لیکن، اس کی کمزوری یہ تھی کہ سرمایہ داری کو تقویت دینے والی خواہشات اور ضرورتوں پر اس کا کوئی کنٹرول نہ تھا۔ عام آدمی بڑا مطلب پرست اور خود غرض ہوتا ہے لہٰذا اپنے سر۔ یہ میں کسی بٹوارے اور تقسیم کو پسند نہیں کرتا۔ دوسری طرف جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا اسی مناسبت سے ضرورت اور خواہشات بھی زور پکڑ رہی تھیں۔ انسان اپنی بے لگام خواہشات کو انسانی آزادی سے منسوب کر رہا تھا۔ جمہوریت اسے ضرورت اور خواہش کی تکمیل کا خواب دکھا رہی تھی۔ کیمونزم انسان کو ایسا کوئی خواب دکھانے میں ناکامیاب ہو گیا تھا۔

آبادی کا اضافہ جہاں انسان کو مادّی قوت فراہم کرتا ہے وہیں اس کی

ضرورت خواہش اور امیدوں کو تقویت بھی حاصل ہوتی ہے۔ انسان کیا چاہتا ہے؟۔ خواہش اور ضرورت کو جمہوریت انسانی زندگی کا مقصد سمجھتی ہے، اور یہ مقصد ہے، آزادی۔ خواہشات کے مطابق زندہ رہنے کی آزادی انسان کا بنیادی حق ہے لیکن اہل مشرق اطاعت خداوندی کو انسان کا بنیادی حق سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک خواہشات کی دنیا میں رہنے والا شخص کبھی معاشرہ کے لیے فلاحی نہیں ہو سکتا۔

خواہشات اور ضرورت کا گہرا تعلق آبادی کے اضافہ سے ہے۔ جنسی اور مادّی خواہش ایک فطری امر ہے جس کی تکمیل خاندانی اور معاشرتی ضرورت بھی ہے۔ خاندان کی تشکیل ہوتے ہی آدمی کی ضرورتیں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ ایک ہی گھر کے افراد مختلف اکائیوں کی شکل میں خاندان اور معاشرتی تعمیر کرتے ہیں۔ خاندانی رشتے جہاں افرادی قوت کا باعث بنتے ہیں وہیں ان میں نفسی انفرادیت اور خودی بیداری کا سبب بھی ہوتے ہیں۔ آدمی اپنا وجود اور انفرادیت ثابت کرنے کے لیے علوم وفنون سائنس اور تہذیب وتمدن کے وسیلے پیدا کرتا ہے۔ بعد کو یہی وسیلے بنی نوع انسانی کی ترقی اور کامیابی کا زینہ بن جاتے ہیں اور اس کی شناخت بھی۔

یہاں سوال اٹھتا ہے کہ تاریخ مشرق کی بے شمار محترم شخصیتوں نے اپنی ذات کے اظہار میں یا خداترسی اور انسان دوستی کے جذبوں سے سرشار ہو کر تخلیقی فرائض انجام دیے یا پھر وہ اپنا اور اپنی قوم کا وجود ثابت کرنا چاہتے تھے؟ اس سوال کا سیدھا سادہ جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی وجودی احساس کے بغیر کسی انسان کے پاؤں زمین پر ٹھہر ہی نہیں سکتے لیکن اس حقیقت کو موجودہ ذہن انسانی کی مدد سے سمجھنا ناانصافی ہوگی کیونکہ مخصوص حالات میں پیدا شدہ حقیقتیں اپنے اظہار کے لیے مخصوص ذہن بھی چاہتی ہیں۔ سبب یہ کہ الفاظ بہرحال جذبے کے محکوم ہوتے ہیں، خالق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی روزِاول سے آخر تک ایک وقفہ ہے۔ ماہ وسال اور صدیوں کا احساس محض اضافی ہے۔ لفظ ومعنی بدلتے ہیں جذبات نہیں بدلتے۔

زبان محسوساتی نظام عمل کا ایک پیمانہ ہے جس سے خیالات اور جذبے کی گہرائی اور گیرائی عیاں ہوتی ہے لیکن اس اظہار میں وہ نفسی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں جو خاص اس شخص میں جغرافیائی ماحولیاتی اور فطری طور پر پہلے ہی سے موجود ہیں۔ انسان اپنی ضرورت کے مطابق لفظ ومعنی پیدا کرلیتا ہے۔ ایک ایسا گھر جس کے افراد

منظم ہوں اور محنت و مشقت کے عادی ہوں تو یقیناً اس گھر میں خوش حالی ہو گی اور وہ اپنی ضرورت اور خواہش بہتر طور سے پورا کر سکیں گے۔ ان میں طمانیت اور آسودگی ہو گی۔ ان کی ضرورتیں اور احساسات ان افراد سے مختلف ہوں گے جن کا تعلق ایک بڑے کنبے سے ہے اور جہاں صرف کچھ ہی لوگ محنت و مشقت کرتے ہیں۔ ان کا اظہار و بیان مختلف ہو گا۔ یہی فرق گاؤں دیہات کے باشندوں میں بھی ہوتا ہے۔ ان افراد میں شہری زندگی سے پیدا شدہ ذہنی انتشار نہیں ہوتا۔ ان کی ضرورتیں اور خواہشات نسبتاً محدود ہوتی ہیں۔ لہٰذا جذبات کے اظہار میں وہ اسی فطری سادگی کا سہارا لیتے ہیں، جو ان کی محدود خواہشات اور بنیادی ضرورتوں کے مطابق ہوتا ہے۔ مادّی طور پر آسودہ حال اور متمول حکمراں طبقات کا اپنا ایک مخصوص کردار ہوتا ہے جو عوامی نہیں ہوتا اور ہمارا مقصد عوام سے ہے۔

شہری زندگی جتنی مکانائز ہوتی جاتی ہے خواہشات کے دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ زبان بھی اپنے دائرہ کار میں وسعت اختیار کرتی ہے اور نئے الفاظ وضع کیے جاتے ہیں۔ یا پھر دیگر زبانوں سے مُستعار لے کر قابلِ استعمال بنا لیا جاتا ہے۔ مختلف قومیتوں سے وابستہ افراد اپنے مافی الضمیر میں اپنا ذاتی شعور اور مشاہدہ بھی منتقل کرتے رہتے ہیں بعض اوقات یہ نئے متبادل کسی مخصوص مفہوم میں رائج ہو کر اپنی ایک نئی زمین ہموار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

فنِ موسیقی، مصوری اور ادب زندگی کے روزمرہ میں شامل نہیں ہے۔ مگر سیاست اور معیشت کا، روزمرہ کی ضرورتوں سے گہرا تعلق ہونے کے سبب، اخبارات کی مانگ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست اور معیشت کے کاروبار سے وابستہ افراد کی شہرت فنکار سے زیادہ ہوتی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے آنے سے جہاں سیاست اور معیشت کو استحکام حاصل ہوا ہے، وہیں فنکار کو اپنی پہچان بنانے میں دشواریوں کا سامنا ہے۔ میڈیائی وسائل اور، ثقافتی تجارت مغربی سرمایہ دارانہ جمہوری سیاست کے زیرِ سایہ صرف ان ہی افکار و نظریات کو ترجیح دی جاتی ہے، جن سے تہذیبی، سیاسی اور معاشی مفادات کی بالادستی قائم رہ سکے۔ ترقی پذیر ممالک میڈیائی ضرورتوں کے لیے مغرب کے دست نگر ہیں خصوصاً جمہوری ممالک میں ثقافتی وسائل سرمایہ داروں کی ملکیت ہیں لہٰذا تیسری دنیا کی تہذیبی سرگرمیاں میڈیائی بھیڑ میں اپنی شناخت قائم رکھنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ فنکار بھی بہر حال انسان

ہے اور اس کی اپنی کچھ ذاتی خواہشات اور ضرورتیں ہوتی ہیں لہٰذا وہ بھی اسی راستے پر چل نکلتا ہے جہاں اسے شہرت اور دولت کا حصول آسان لگتا ہے۔ اس طرح تیسری دنیا کی تخلیقیت خود بخود معطل ہو جاتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب نے اردو ادب کو ایک نئے مادّی اور نفسیاتی شعور سے آشنا کیا۔ جب خانقاہیت اور متصوفانہ شعور و عمل، مادّی چمک دمک، افکار و نظریات اور نظام عمل و سیاست کے سامنے بے بس ثابت ہو گیا اور شریف قومیں ذلیل و خوار ہو گئیں، اس وقت مادّی حقیقت پسندانہ شعور برطانوی سیاست کے ساتھ ہندستانی اذہان میں منتقل ہو رہا تھا۔ اساطیر اور داستانوی نثر کا طلسم پھیکا پڑ گیا۔ نئے خیالات، انداز بیان کا نیا وسیلہ تلاش کر رہے تھے۔ اس دور کی حقیقتیں مرزا غالب، سر سید اور رتن ناتھ سرشار کی نثری تخلیقات سے عیاں ہیں۔ حالی اور محمد حسین آزاد نے اردو نظم کو مثنوی اور قصیدہ کے طلسم سے باہر آنے کا حوصلہ دیا۔ غالب نے غزلوں میں نئے انسان کی داخلی کیفیتوں کو زندہ کرنے میں کامیابی حاصل کی اور قدیم اصطلاحی نظام کے متبادل کچھ ایسی اصطلاحیں وضع کیں جن سے زندگی کا مادّی اور نفسیاتی شعور عیاں ہوتا ہے۔

انیسویں صدی انگریزی استحصال اور ہندستان کی معاشی تباہی کی اندوہناک تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ اس دور میں عوامی زندگی سے متعلق سبھی ضرورتیں گھریلو صنعتوں کے ذریعہ پوری کی جا رہی تھیں۔ معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ انگریزی لوٹ کھسوٹ کے سبب تمام ملک خالی ہو چکا تھا۔ عوام غریب سے غریب تر ہو گئے۔ زمینداروں، سیٹھ ساہوکاروں نے دولت کے حصول کے لیے کاشت کاروں اور دست کاروں پر اپنا شکنجہ مضبوط کر لیا تھا۔ تجارت اور صنعت انگریز کے قبضے میں تھی عوام مفلوک الحالی سے پناہ مانگتے، ودیسی سرکار کے حضور ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ بیسویں صدی کے آتے آتے نظم سیاست و حکومت پر بھی لارڈ میکالے کا انگریزی شعور حاوی ہو چکا تھا۔

مذہب ، اقتصاد، جنس اور نجات کا آفاقی تصور نئی تاویلات کا متقاضی تھا۔ عوام غربت اور پس ماندگی سے نجات چاہتے تھے۔ معاشرتی زندگی کا نیا شعور نظم و نثر کی مختلف اصناف سخن کے ذریعہ عام کیا جا رہا تھا۔ اس انقلاب آفریں قدم سے جہاں ۔ طرف عوامی مسائل کو زبان ملی وہیں دو ری جانب فکر و فن کی نئی جہات روشن

ہوئیں اور خواہشات زندگی کی مادّی حقیقتوں کو جدید مغربی شعور سے مزین کیا گیا۔ زبان وبیان کا قدیم اصطلاحی اسلوب ایک نئے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ علم سیاست اور علم معیشت کے بدلتے ہی انسانی شعور میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں جس نے زبان اور اسلوب بھی بدل دیا۔

اپنے ابتدائی ادوار میں زبان ایک بچے کی طرح اپنے مربی اور سرپرست کی نقل کرتی ہے اور ایام بلوغیت میں اپنی تخلیقی قوتوں سے معاشرہ کو تہذیبی اور لسانی استحکام دے کر تعمیر وترقی میں معاون ومددگار ہوتی ہے۔ زبان اپنے افراد کی شخصیت وکردار کا آئینہ ہے اس لیے محکوم اور مضمحل افراد کو بے زبانی کے کرب سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں تخلیقی صلاحیتیں یا تو ختم ہوجاتی ہیں یا پھر خود سے زیادہ طاقتور اور متمدن افراد کو اپنا ذہن وعمل سونپ کر اپنی پہچان گنوا بیٹھتی ہیں۔ ان حالات میں معاشی، سماجی اور مذہبی آزادی اور خود مختاری کا تصور عوامی شناخت کو ختم ہونے سے روکتا ہے۔

تہذیب وتمدن کے اظہار کا موثر وسیلہ زبان ہے۔ جمہوریت نے جہاں انسان کو جنسی اور مادّی آزادی سے روشناس کیا، وہیں اسے خواہشوں کی دلدل میں پھنسنے کی ترغیب بھی دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جذبات نفسی اور مادّی شعور کے دست نگر ہوگئے اور انسان امویا (Emoeba) کی طرح خود اپنی مادّی تشکیل میں مصروف کار ہوگیا۔ جذبے کی آفاقیت نفسی ضرورتوں تک محدود ہوگئی۔ میڈیا پر سرمایہ داروں کا قبضہ، جذبات کو ذاتی خواہشاتی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اس طرح جہاں صارفین کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے، وہیں تہذیب وتمدن کی باگ ڈور بھی ان کے ہاتھ آجاتی ہے۔ فنکار کا فن بھی سرمایہ کا محکوم ہوتا ہے لہٰذا وہ ان ہی خیالات ونظریات کو پیش کرتے ہیں جنھیں سرمایہ دارانہ طرز فکر اور نظریات ادب کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہو۔ ایسا کوئی بھی خیال اور نظریہ ان کے نزدیک لائق اعتنا نہیں ہوتا جس کی بنیاد محض جذبۂ ایثار وقربانی پر ہو۔ معاشی بنیاد رکھنے والے علوم وفنون ان کے نزدیک قابل قبول ہوتے ہیں۔ اس طرح فکری آزادی کا مثبت اور آفاقی تصور ختم ہوجاتا ہے اور فنکار کی آواز میڈیا کی محکوم ہوجاتی ہے۔

جمہوریت، سرمایہ داری، اشتراکیت اور سوشلزم سبھی کچھ مغرب سے مستعار ہے جس نے خواہشات نفس کے سیل رواں کو تھام رکھا ہے۔ دنیا کی بے پناہ اور غیر

منظم آبادی کی ضرورتوں اور عوامی خواہشات کو میکانکی طرز فکر و عمل نے تکمیل کے سامان مہیا کیے اور انسان کو ایک ایسے عمرانی شعور سے آشنا کیا جس کا منبع نفس اور مادّہ ہے۔ فن اور فلسفہ کے سبھی دبستانِ مغرب، مشرقی اوہام اور سرّیت پسندی سے ناآشنا ہیں جبکہ مشرقی ادب کا بیشتر حصہ روحانی ثمرات کا آئینہ ہے جس میں مغرب کی مجرد نفس پرستی کا کوئی گزر نہیں۔

ان حالات میں زبان و ادب کو اپنی بقا کے لیے سخت جدوجہد اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ عوام تک پہنچنے کے ذرائع ناکافی ہونے کے سبب بعض اوقات نہایت وقیع تصنیفات بھی غیر اہم اور غیر ضروری خیال کرلی جاتی ہیں۔ خاص طور پر تیسری دنیا کے عوام معاشی طور پر خود کفیل ہونے کا خواب دیکھتے ہیں لیکن دل میں مذہبی، سماجی، اور اخلاقی قدروں کے ٹوٹنے کا خدشہ بھی بنا رہتا ہے۔ مناسب ادبی رہنمائی نہ ہونے کے سبب ایک تذبذب کی کیفیت سے وہ ہمیشہ دوچار رہتے ہیں۔ ان میں اپنی قدروں کو قبول کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ خواہشات نفس انھیں اخلاقی طور پر کمزور بنا کر سرمایہ دارانہ معیشت سے پیدا شدہ تہذیب و تمدن کو قبول کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ نفسیاتی دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ افراد اپنے فن اور فلسفہ کی تحقیر میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ عوامی ضرورت اور خواہشات زبان و ادب کی کسی بھی مثبت پیش قدمی کو نظرانداز کر دیتی ہے۔

انسان قدرت کا شاہکار ہے اور اپنے وجود کا متلاشی بھی۔ اس کی جسمانی نشو و نما اور جذباتی تسکین کے سامان بھی قدرت نے مہیا کیے ہیں۔ فطری شخصیت معاشرتی تسکین و توازن چاہتی ہے۔ خواہشات انسان کو عمل کا حوصلہ دیتی ہیں اور کاروبار زندگی کو تقویت اور فروغ، خواہشات کے بغیر زندگی کا کارواں تھم جاتا ہے۔ منظم قوموں کی خواہشات اور ضروریات زندگی کا دائرہ تکمیل مکمل ہوتا ہے۔ کثیر العیال معاشرہ کے غیر منظم افراد میں تعمیری افکار و نظریات، ذاتی خواہشات اور ضرورت کے محکوم ہوتے ہیں۔ عملی دائرہ کار میں تعمیری تخریب معاشی حصول تک محدود ہو جاتی ہے۔ معاشی طور پر ترقی یافتہ معاشرے کے افراد چونکہ مادی ضرورتوں سے محروم نہیں ہوتے۔ لہٰذا جنس اور مادّیاتی تکمیل میں فن اور فلسفہ کا استعمال کیا جاتا ہے، جس سے اخلاقی انارکیت کو فروغ ملتا ہے۔

دنیا کی آبادی کا غالب حصہ مشرقی ملکوں میں بود و باش رکھتا ہے۔ ان ملکوں میں حالانکہ مادّیاتی ضروریات زندگی کے سبھی سامان مہیا ہیں لیکن افراد میں ایک بے اطمینانی کی کیفیت بھی ہے۔ ہر شخص ایک انجانے خوف میں مبتلا ہے اور اپنے مادّی وجود اور تشخص کا متلاشی بھی۔ ترقی یافتہ ملکوں سے در آمد شدہ صنعتی زندگی کی بے راہ روی نے اس خوف کو دائمی بنا رکھا ہے جس کا بلا واسطہ اثر دیگر علوم وفنون کی طرح زبان وادب پر بھی پڑ رہا ہے۔ خاص طور پر زبان کا جذباتی دائرہ کار مادّی خواہشات اور ضرورت کے اظہار و تشکیک تک محدود ہو گیا اور ادب کے تخیلاتی عناصر نفس کے مادّی شعور کے اسیر ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عشق و محبت کا آفاقی تصور روپوش ہو گیا اور عشق مجازی کے پردے میں عشقِ حقیقی کا بیان گزرے زمانے کی یاد بن کر رہ گیا۔ خواہشات مجازی یا علامتی بیانیہ کے پردے میں سماجی، معاشی اور سیاسی کمزوریوں سے پیدا شدہ نفسیاتی مسائل کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ افسانہ، غزل اور ناول میں ضرورت اور خواہشات کا اظہار تو ملتا ہے جذباتی حقیقتوں کی مثبت اور دائمی قدریں آشکار نہیں ہوتیں۔ خاص طور پر واحد متکلم کا صیغۂ امر جذباتی محاکات کی تعمیر میں تخلیق کے نفسیاتی اور مادّی پہلوؤں پر زور دیتا ہے۔

پر شور گنجان رہائشی علاقوں میں افراد کی نقل و حرکت ایک غیر محسوساتی نفسی دباؤ پیدا کرتی ہے جس سے حواس خمسہ متاثر ہوتے ہیں اور دماغ کی حساس رگیں آہستہ آہستہ بے حس و بے کار ہو جاتی ہیں اور زبان ان لطیف جذبات کی ترجمانی سے محروم ہوتی ہے جس سے زبان کا جذباتی ربط و تسلسل قائم ہے۔ صوت و آہنگ اور جذبات فوراً ختم نہیں ہوتے بلکہ کسی بھی جاندار اور حساس بدن میں آدمی کی پسند ناپسند کے مطابق ٹیلی ویژن کی تصویر و صوت کی طرح منتقل ہو جاتے ہیں۔ ادیب و شاعر چونکہ خود بھی معاشرتی جزو ہے لہٰذا ان ہی افکار و نظریات کو اختیار کرتا ہے جو اس معاشرے کی مادّی اور نفسیاتی ضرورتوں سے مطابقت رکھتے ہوں لیکن یہ مادّی اور نفسیاتی صداقتیں خلاقیت سے محروم ہوتی ہیں۔ سبب یہ کہ مادّہ کی طرح مادّیاتی تفکر بھی وقتی طور پر کار آمد تو ہوتا ہے لیکن ایک معینہ مدت کے بعد جسم انسانی کی طرح اس کی اہمیت اور افادیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

تدوین: اعجاز راہی
نظر ثانی: ڈاکٹر ممتاز منگلوری

سفارشات املا و رموزِ اوقاف

مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام جون ۱۹۸۵ء کے اواخر میں اردو زبان میں املا و رموزِ اوقاف کے موضوع پر ایک سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا، جس میں جناب ڈاکٹر سید عبداللہ سمیت ملک کے معروف علمائے علم و ادب نے شرکت کی۔ یہ سیمینار ۲۵ر جون ۱۹۸۵ء کو شروع ہو کر ۲۷ر جون ۱۹۸۵ء تک جاری رہا۔ پانچویں نشست میں املا و رموزِ اوقاف کے ضمن میں بعض سفارشات منظور کی گئیں۔ جنھیں اس امر کے ساتھ مشروط کر دیا گیا کہ ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی جائے۔ جو مجوزہ سفارشات کا تفصیلی جائزہ لے اور اردو املا میں دیگر اختلافات کو بغور دیکھ کر اس خاکے میں تفصیلات کا اضافہ کرے تاکہ مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے ان سفارشات کی اشاعت کا اہتمام کیا جا سکے۔

اس ذیلی کمیٹی میں یہ اصحاب شریک تھے:

(۱) جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری (صدر) (۲) جناب مظفر علی سید (۳) جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (۴) جناب پروفیسر شریف کنجاہی (۵) جناب ڈاکٹر ممتاز منگلوری (۶) جناب ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی (معتمد) (۷) ڈاکٹر اعجاز راہی

ذیلی کمیٹی کا ابتدائی اجلاس ۲۸ر جون ۱۹۸۵ء کو ہوا اور طریقہ کار و دیگر امور طے کیے گئے۔ پہلا باقاعدہ اجلاس ۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۵ء کو راولپنڈی میں ہوا۔ یہ اجلاس تین دن تک جاری رہا۔ اس میں سیمینار کی طرف سے تجویز کردہ اصولوں کی روشنی میں اردو املا، رموزِ اوقاف اور اعداد پر بالتفصیل غور کیا گیا اور سفارشات کا کسی قدر مفصل خاکہ تیار ہوا۔

کمیٹی کا دوسرا حتمی اجلاس ۱۶ء فروری ۱۹۸۶ء کو ہوا، یہ بھی تین دن جاری رہا۔ املا، رموزِ اوقاف اور اعداد کے تمام اختلافی پہلوؤں تضادات اور عمومی مسائل پر بالتفصیل غور کیا گیا اور سفارشات کو حتمی شکل دی گئی۔ ذیلی کمیٹی کی بالاتفاق منظور کردہ یہ سفارشات نذر قارئین کی جا رہی ہیں۔

اردو میں املا و رموزِ اوقاف کے مسائل پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مختلف مکتبہ ہائے فکر اپنا اپنا مسلک رکھتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ املا کو اپنے ماخذ کے قریب تر رہنا چاہیے۔ بعض کے نزدیک اخذ الفاظ کو اپنے صوتی آہنگ کے تابع کیے بغیر لفظ سے مغائرت برقرار رہتی

ہے اور جب تک صوتی نظام کے تابع نہ ہو جائے، زبان کا حصہ نہیں بن سکتا۔ یہ طبقہ تسہیل و تطہیر کی طرف راغب ہے اور اردو حروف تہجی سے بعض حروف ہی کو خارج کر دینے تک چلا جاتا ہے لیکن ایک تیسرا نقطہ نظر رکھنے والا مکتب بھی موجود ہے۔ جو نہ تو ماخذ پر بقدر شدت اصرار کرتا ہے اور نہ ہی تسہیل و تطہیر ہی کے زیر اثر تقلیب و تصرف کا اس حد تک حامی ہے کہ لفظ اپنے اصل ماخذ سے جدا ہو جائے۔

کمیٹی کے سامنے یہ نظریے اور نظریہ ساز تھے، لیکن اس نے اپنے لیے اعتدال کا راستہ انتخاب کیا۔ بحثوں میں الجھے بغیر قومی زبان کی معاشرتی، ثقافتی، سائنسی، طبعی اور سماجی علوم و فنون کی بنیادی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر اپنی سفارشات مرتب کیں۔ ایک اشاریے کے اضافے کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

سفارشات املا ورزاوقاف کمیٹی

ا۔ الف مقصورہ

عربی کے ایسے الفاظ، جن کے آخر میں یائے تانیث پر چھوٹا الف (الف مقصورہ "یٰ") آتا ہے، مگر پڑھتے وقت یائے کی بجائے الف پڑھا جاتا ہے، انھیں اردو میں بھی عربی املا کے مطابق لکھا جائے، کیونکہ قرآن پڑھنے والے سبھی لوگ اس سے مانوس ہیں، مثلاً

(i) ادنیٰ، اعلیٰ، اولیٰ،
بشریٰ،
تحت الثریٰ، تعالیٰ، تقویٰ،
حتیٰ،
دعویٰ،
سلمیٰ، سلویٰ، (من سلویٰ)
صحاریٰ، صغریٰ، (نام)
طوبیٰ،
عظمیٰ، عقبیٰ، علیٰ، عیسیٰ،
فتویٰ،
قویٰ،
کبریٰ (نام) کسریٰ،
لبنیٰ، لیلیٰ،
ماریٰ، متبنیٰ، مثنیٰ، مرتضیٰ، مصطفیٰ، مقفیٰ،
موسیٰ،
نصاریٰ،
وسطیٰ، ہدیٰ،
یتامیٰ، یحییٰ،

(ii) بدر الدجیٰ،
خدیجۃ الکبریٰ،
روضۃ الکبریٰ،
شمس الہدیٰ،
شمس الضحیٰ،
کیف الوریٰ،
نور الہدیٰ،

(ب) عربی کے درج ذیل الفاظ کو اسی طرح لکھا جائے:

زکوٰۃ مشکوٰۃ صلوٰۃ

(ج) ذیل کی تمام صورتوں میں بھی الف عربی طریقے ہی سے لکھا جائے:

الٰہ، الٰہی، الٰہیات،

لٰہذا ہٰذا

(د) بعض عربی الفاظ میں کسی حرف کے اوپر الف لکھا جاتا ہے، اردو میں اس الف کو متعلقہ حرف کے بعد مستقل حرف کی حیثیت سے شامل کردیا جاتا ہے، یہ دونوں طرح لکھنا جائز ہے جیسے:

اسحٰق اسحاق

اسمٰعیل اسماعیل

رحمٰن رحمان

مولٰینا مولانا

یٰسین یاسین

علیحدہ علاحدہ

۲۔ الف اور الف مقصورہ

عربی کے مندرجہ ذیل الفاظ کو اردو میں الف سے لکھا جاتا ہے انہیں اسی طرح درست سمجھنا چاہیے:

تقاضا، تماشا سلیمان

صغرا (صغیر کی جمع) کبرا (کبیر کی جمع)

لقمان

ماجرا، مبرا، مصفا، معرا، مقتدا، منقا، مولا، ہیولا

۳۔ الف لام اور عربی کے مرکبات

عربی کے ایسے مرکبات جن کے درمیان "الف لام" لکھا جاتا ہے، انھیں اردو میں "الف لام" کے ساتھ ہی لکھا جائے، مثلاً

(ا) اختر الایمان اصل الاصول

امیر البحر انا البحر

انا الحق بالترتیب بالفصل،

بالفعل بالکل بین الاقوامی

حتی الامکان، حتی المقدور، حتی الوسع،

رومتہ الکبریٰ،

شمس الہدیٰ،

عبدالجبار، عبدالجلیل، عبدالغنی، عبدالغفار،

عبدالغفور، عبداللطیف، علی الحساب،

علی الخصوص، علی العموم،

فی البدیہہ، فی الحال، فی الفور، فی الوقت

مابہ الامتیاز،

بین السطور

صدر الصدور

عبدالرزاق، عبدالرحمٰن، عبدالرحیم، عبدالستار، عبدالسلام، عبدالسمیع، علی الترتیب، علی الرغم، علی الصباح، مافی الضمیر،

مسیح الدین، مسیح الرحمٰن، مسیح الزماں،

۴۔ الف بجائے ہائے مختفی:

(ا) عربی اور فارسی کے ماسوا اردو میں مروج دیگر تمام زبانوں کے ایسے الفاظ جن کے آخر میں "الف" کی آواز آتی ہے، ان کے آخر میں "الف" ہی لکھا جائے، مثلاً

آرا، آریا

اڑا، اکھاڑا
باڑا، بال خورا
بتاشا، بسترا، بگولا، بلبلا، بندا، بھانجا، بھرتا،
بھروسا، بھوسا، بھیا
پارا، پانسا، پپیتا، پتا، پٹاخا، پٹکا
پرسا، پلا، پلندا
تارا، تولیا،
تھانا،
ٹڈا،
ٹھیکا، جوشیلا،
جھروکا،
چاولا، چوراہا، چونا،
چھبیلا، چھلا
دلیا، دوپٹا، دورخا
ڈاکا، ڈالیا، ڈبا، ڈبیا،
ڈراما،
راجا، رکشا،
سمجھوتا،
شلوکا
فرما (فن طباعت سے متعلق)
کاکا، کتھا، کرم کلا، کمبوڈیا، گھونسلا، میلا، ٹھیلا،
(ب) عربی فارسی کے ایسے الفاظ جنھیں اردو میں یہ تصرف استعمال کیا جاتا ہے، انھیں دونوں طرح لکھا جاسکتا ہے، جیسے:

چغہ	چغا
خاکہ	خاکا
صافہ	صافا
صوفیاء	صوفیا
طلباء	طلبا
نصیبہ	نصیبا
نشیلہ	نشیلا
نقشہ	نقشا

(ج) شق (ا) کے تحت آنے والے ایسے الفاظ جن کے آخر میں "الف" لکھنے سے معنی کا التباس ہو سکتا ہے، ان کے آخر میں "ہائے مختفی" لکھی جائے۔ مثلاً

آنہ	(ایک سکہ)	آنا	(مصدر)
بدلہ	(انتقام)	بدلا	(بدلنا مصدر سے)
پتہ	(شناخت)	پتا	(نباتات)
پیسہ	(ایک سکہ)	پیسا	(مصدر)
تولہ	(وزن)	تولا	(تولنا مصدر سے)
خاصہ	(کھانا)	خاصا	(خصوصیت)

(د) وہ اسمائے خاص جو ہائے مختفی سے لکھے جارہے ہیں، بدستور اسی طرح لکھے جائیں:
ٹھٹھہ، ڈسکہ، سوبادہ، کوئٹہ، گوجرہ،
مانسہرہ، مندرہ، ہالہ
آگرہ، ڈھاکہ،
افریقہ، امریکہ
مکہ (معظمہ)، مدینہ (منورہ)
(ہ) فارسی کے بعض الفاظ اردو میں "الف" سے لکھے جارہے ہیں، انھیں "ہ" سے لکھنا چاہیے، جیسے:
گلہ

مزہ

(د) عربی، ترکی، فارسی کے بعض الفاظ کو اردو میں "ہ" سے لکھنے کا غلط رواج ہو رہا ہے۔ انھیں "الف" سے لکھا جانا چاہیے، مثلاً

تمغا، حلوا، سقا، شوربا، قورما، ملغوبا، معما

۵۔ "ت" اور "ط"

(ا) درج ذیل الفاظ "ت" کی بجائے "ط" سے لکھے جائیں۔

طوطا، طشت، طشتری طپنچہ، طمانچہ، طہماسپ، غلطاں

(ب) مندرجہ ذیل الفاظ کو "ت" سے لکھنا بہتر ہے۔

تراوت، تنبورہ، تیار، تیراک

۶۔ تنوین

(ا) اردو میں عربی کے ایسے بہت سے الفاظ مستعمل ہیں جن پر دو زبر لکھے جاتے ہیں اور آواز نون کی طرح ادا ہوتی ہے جیسے عموماً (عمومن) مثلاً (مثلن) وغیرہ۔ اردو میں ایسے الفاظ کو لکھتے ہوئے لفظ کے آخر میں الف کا اضافہ کر کے اس پر تنوین لگاتے ہیں، مثلاً

آناً فاناً، اتفاقاً، اسماً، اصالتاً، اندازاً

حقیقتاً

شکایتاً، ضرورتاً،

عادتاً، عمداً

فطرتاً، فعلاً، فوراً

مثلاً، مروتاً

نسباً، نسلاً

(ب) عربی کے تائے مدورہ "ۃ" پر ختم ہونے والے الفاظ جو اردو میں چھوٹی "ہ" سے لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً "ارادہ" ان پر عربی قاعدے سے ہی تنوین لگائی جائے۔

ارادہ سے ارادۃً

دفعہ سے دفعتہً

کلیہ سے کلیۃً

۷۔ ذ۔ز

(ا) درج ذیل الفاظ کے املا کا ایک طریقہ نہیں انھیں کبھی "ذ" اور کبھی "ز" لکھ دیا جاتا ہے۔ معیاری املا کے لیے ان الفاظ کو "ذ" سے لکھا جائے۔

باج گذار بذلہ

پذیرائی پذیرفتہ

خدمت گذار

دل پذیر، درگذر

ذات، ذرا، ذرہ

راہ گذر

سرگذشت

شکرگذار

عرضی گذار

گذشتہ، گذرگاہ، گذشتگان، مال گذاری، گذارش، گذارنا

(ب) مندرجہ ذیل الفاظ کو "ز" سے لکھا

جائے۔

آزر (حضرت ابراہیمؑ کے والد / چچا)

ازدحام

زرتشت، زخار

گزاف، گزند

ناگزیر

۸۔ ژ

مندرجہ ذیل الفاظ "ژ" سے لکھے جائیں۔

ارژنگ، اژدرہا

بیژن

پژمردگی، پژمردہ

ٹیلی وژن

۹۔ ہائے مخلوط (ھ)

جن الفاظ میں ہائے مخلوط کی آواز ہو یعنی "ہ" کی آواز دوسرے حرف سے مل کر مرکب آواز دیتی ہو جیسے بھ، پھ وغیرہ وہ الفاظ ہمیشہ ہائے دو چشمی (ھ) سے لکھے جائیں مثلاً

(ا) ابھی، تبھی، سبھی، کبھی،

انھیں، تمھیں، جنھیں

تمھارا، تمھاری

چولھا

دولھا، دولھن

کمھار، کولھو

جھنجھناہٹ

پھڑپھڑانا، پھوپھا، پھوپھی

تھرتھرانا

چھم، چھم، چھن چھناہٹ

کھکھر

گھنگھور

گھونگٹ

(ب) مندرجہ ذیل الفاظ کے تلفظ میں اکثر ہائے مخلوط کی تکرار ہوتی ہے مثلاً بھابھی ڈھنڈھورہ لیکن تلفظ کے پیش نظر لکھنے میں صرف جز اول ہائے مخلوط (ھ) سے لکھا جائے۔

بھابی، بھبک، بھبکی، بھنبوڑنا، بھوبل

ڈھنڈورا، ڈھونڈنا، ڈھیٹ

کھکل

گھنگرو، گھنگریالے، گھونگٹ

۱۰۔ نون غنہ

(ا) بعض الفاظ میں نون غنہ کی آواز کے مقام و مخرج کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے چونکہ ان الفاظ کا املا بہ صورت ذیل رواج پا چکا ہے، اس لیے اسی طرح لکھا جائے۔

(i) پاؤں، چھاؤں، داؤں، کھڑاؤں، گاؤں

(ii) بہنگی، لہنگا

مہندی، مہنگا، مہنگائی، مہنگی

(ب) مندرجہ ذیل الفاظ کا دونوں طرح لکھنا درست ہے۔

پیترا پینترا

چوچلہ چونچلہ

جھوک	جھونک
سپولیا	سنپولیا
سیکڑا	سینکڑا
کیچلی	کینچلی
کیچوا	کینچوا
موچھ	مونچھ

۱۱۔ واؤ

(ا) قدیم املا کے رواج کے مطابق آج بھی بعض الفاظ کو کہیں کہیں پیش (ُ) کی بجائے "واؤ" سے لکھا جاتا ہے جو درست نہیں، ان کو "واؤ" کے بغیر ہی حسب ذیل طریقے سے لکھا جائے۔

ادھار، بڑھاپا
پہنچانا، پہنچے
چغا
دکان، دلارا، دلاری

(ب) مندرجہ ذیل الفاظ دونوں طرح یعنی "واؤ" کے بغیر پیش سے یا "واؤ" سے لکھنے درست ہیں۔

پریا	پوریا
دگنا	دوگنا
دہرا	دوہرا
رمالی	رومالی
لہار	لوہار
مٹاپا	موٹاپا
نکیلا	نوکیلا

۱۲۔ واؤ معدولہ (و)

(ا) درج ذیل الفاظ میں اگرچہ "واؤ" کی آواز موجود نہیں ہے لیکن "واؤ" لکھی جاتی ہے اس لیے انھیں اسی طور پر لکھا جائے، نیز درسی کتابوں میں واؤ معدولہ کا نشان واؤ کے نیچے چھوٹی سی لکیر مثلاً خوش، خواجہ ڈالنا بہتر ہوگا۔

استخواں، افسانہ خواں
تنخواہ
خدانخواستہ
خواب، خواجہ، خوار، خواہ، خواہش،
خود، خودی، خورد، خورشید، خوش،
خوشامد، خوش آمدید، خوش نما،
خوشنود، خویش
درخواست

(ب) مندرجہ ذیل الفاظ کا واؤ معدولہ کے ساتھ لکھنا درست نہیں، یہ بغیر "واؤ" کے لکھے جائیں۔

برخاست
خرد (برادر خرد و کلاں) خردہ
(خردہ فروش، خردہ گیر)

۱۳۔ ہمزہ اور الف

(ا) عربی کے ایسے الفاظ جن کے آخر میں ہمزہ لکھا جاتا ہے لیکن اردو نے انھیں بغیر ہمزہ کے اپنا لیا ہے انھیں ہمزہ کے بغیر ہی لکھا جائے۔ مثلاً

ابتدا، ادبا، استغنا، استفتا، استسقا، اشتہا،

املا' انتہا' انشا' اولیا
بہا' ثنا
جزا' حکما
ضیا
طلبا
علما
فقرا
منشا
وزرا

(ب) شق (ا) میں درج قبیل کے الفاظ اگر کسی ترکیب کا حصہ ہوں تو اس صورت میں ان میں ہمزہ کا لکھنا ضروری ہے جیسے:
انشاء اللہ' بہاء الحق' بہاء الدین'
بہاء اللہ' ثناء الحق' ذکاء اللہ
ضیاء الحق' ضیاء الدین' علاء الدین
منشاء الحق

(ج) شق (ا) کے ایسے الفاظ جن پر تنوین لگ سکتی ہے' تنوین لگاتے ہوئے ان میں ہمزہ برقرار رہے گا' مثلاً
ابتداً' بناءً جزاً

(د) عربی کے ایسے الفاظ جن کے درمیان الف کے اوپر ہمزہ لکھا جاتا ہے اردو میں بھی انھیں اسی طرح لکھا جائے مثلاً
تأثر' تأسف' تأمل' توأم
جرأت
قرأت

۱۴۔ ہمزہ اور واؤ

(ا) مندرجہ ذیل عربی الفاظ کو اردو میں بھی عربی املا کے مطابق لکھا جائے۔
مؤثر' مؤخر' مؤدت' مؤذن'
مؤرخ' مؤسس' مؤکل' مؤلف' مؤنث

(ب) اردو کے ایسے الفاظ جن کے آخر میں واؤ لکھی جاتی ہے اور ہمزہ کے بغیر ان کی آواز مکمل نہیں ہوتی ان میں ہمزہ لکھا جائے مثلاً
الاؤ' الجھاؤ' بناؤ' اودبلاؤ'
پاؤ (وزن) پلاؤ' پھاؤڑا' پھراؤ'
تاؤ
جھکاؤ
چاؤ' چناؤ' چھڑکاؤ
داؤ' دباؤ
راؤ
کھاؤ' گھناؤ' گھماؤ
لگاؤ
مناؤ

(ج) ایسے مصادر جن کا صیغہ امر "الف" پر ختم ہو' ان کے تمام صیغوں میں "ہمزہ" کا استعمال ہوگا اور جہاں امر "الف" کی بجائے کسی اور حرف پر ختم ہو "حرف واؤ" کا استعمال ہوگا جیسے کھانا سے کھا۔ کھاؤ اور کرنا سے کر۔ کرو
آؤ' اٹھاؤ' اڑاؤ
بتاؤ' بچاؤ' بہاؤ
پاؤ (پانا سے)' پڑھاؤ

جاؤ
سناؤ
گاؤ، گھٹاؤ، گھماؤ
لاؤ
منگاؤ

(د) جمع کی صورت میں آنے والے مندرجہ ذیل الفاظ "ہمزہ" اور "واؤ" کے ساتھ لکھے جائیں گے۔

بہو بہوؤں
بچھو بچھوؤں
سادھو سادھوؤں
ہندو ہندوؤں

(ہ) ایسے مصادر جن کا امر "الف" یا "واؤ" پر ختم ہو (مثلاً آنا، جانا، دھونا وغیرہ) ان کے تمام متعلقہ صیغوں میں "ہمزہ" استعمال کیا جائے۔ مثلاً

(i) آئے، جائے، دھوئے، سنائے
(ii) گئے، نئے
(iii) آیئے، اٹھایئے، بتایئے، پکایئے،
جایئے، چلایئے، سنایئے، سویئے،
فرمایئے، کھایئے، کھویئے، گھمایئے
لایئے، ملایئے، منگوایئے،
(iv) آئیو، پائیو، جائیو، کھائیو

۱۵۔ "ہمزہ" اور "ی"

ایسے مصادر جن کا صیغہ امر "الف" یا "واؤ" پر ختم نہ ہو (مثلاً اٹھنا، بولنا، جینا، چاہنا) ان کے کسی بھی صیغے میں "ہمزہ" استعمال نہیں ہوگا، انھیں "ہمزہ" کے بغیر "ی" سے لکھا جائے۔ مثلاً:

جیے، دیے، سیے، کیے، لیے، چاہیے
اٹھیے، بولیے، بیٹھیے، پیے، پیسے،
تولیے، دیجیے، کیجیے، کھولیے، لیجیے،
ملیے، مریے،

۱۶۔ "ہمزہ" اور "یے"

وہ الفاظ جن میں "یے" کے ساتھ ہمزہ کی واضح آواز موجود ہو، انھیں ہمزہ اور "یے" کے ساتھ لکھا جائے، جیسے:

(i) چائے، رائے، سائے، سرائے، گائے
(ب) آئے، اترائے، اٹھائے، اٹھوائے،
اگائے، بتائے، بجائے، بچائے،
بٹھائے، بڑھائے، بھگائے،
بھگوئے، بھلائے، بنائے، پائے،
پھرائے، پکائے، پھلائے، پھنسائے،
پہنائے، جائے، جتائے، جگائے،
جلائے، جمائے، چبائے، چرائے،
چڑھائے، چلائے، چھڑائے
دھلائے
رلائے
ستائے، سجائے، سنائے، سلائے
کمائے، کھلائے، کھدائے، کھلائے
گنائے، گنوائے، گھمائے، گھبرائے
نبھائے، نہائے
ہرائے، ہلائے، ہنسائے

۱۷۔ ہمزہ اور ی (آزمائش۔ آزمائش)

(الف) عربی اور فارسی کے بعض الفاظ میں اصلاً "ی" استعمال ہوتی ہے لیکن اردو میں ان کے تلفظ میں ہمزہ کی آواز واضح طور پر نکلتی ہے، اس لیے انھیں "ی" کی بجائے ہمزہ ہی سے لکھا جائے، مثلاً

آزمائش، آسائش، افزائش
پیدائش
فرمائش
گنجائش
نمائش
آئندہ، پائندہ، نمائندہ
پائندگی، نمائندگی
سائل، قائل، مائل
شائق، فائق، لائق
ذائقہ، معائنہ، مضائقہ

(ب) عربی کے ایسے الفاظ جن میں دو "ے" ایک ساتھ آتی ہیں، اردو میں انھیں لکھتے ہوئے پہلی "ے" کو ہمزہ سے بدل دیا جاتا ہے۔ انھیں ہمزہ سے لکھنا جائز ہے مثلاً:

تخییل تخئیل
تزیین تزئین
تعیین تعئین
تمییز تمئیز

(ج) مندرجہ ذیل تراکیب اضافی میں یائے کا استعمال نہیں ہوگا بلکہ ہمزہ کے نیچے زیر کا استعمال ہوگا، جیسے:

سوءِ ادب، سوءِ ظن

(د) مندرجہ ذیل قسم کے عربی و فارسی الفاظ بھی ہمزہ سے لکھے جائیں۔

آرائیں، اناؤنسر
بائبل
پائل، پاؤڈر، پائلٹ، پرائیویٹ
ٹائپ، ٹائٹل، ٹائلٹ، ٹائم
ڈائنامیٹ، ڈیزائن
رامائن
سائنس
فائل، فینائل
کمپاؤنڈر
گائکہ، گھائل
میئر
نرائن، نائک، نائکہ

(ہ) درج ذیل الفاظ میں ہمزہ اور "ے" کی بجائے صرف ہمزہ لکھا جائے، مثلاً

بےپائگی
پائجامہ، پائدار، پائمال،
جائداد، ہمسائگی

۱۸۔ ہمزہ اور اضافت

(ا) اگر مضاف کے آخر میں ہائے مختفی ہو، تو اضافت کے لیے ہمزہ کا استعمال کیا جائے، جیسے

تشنۂ کربلا
پیمانۂ صبر
جذبۂ دل، جلوۂ مجاز
خانۂ خدا

دیوانہ ہونیا
فسانہ دل
نالۂ شب، نذرانۂ عقیدت،
نشۂ دولت، نغمۂ فردوس

(ب) جو لفظ الف یا واؤ پر ختم ہوتا ہے، اس کے بعد اضافت کے لیے ہمزہ اور "ے" (یۓ) لکھی جائے، جیسے:

اردوئے معلی
بوئے گل
دعائے نیم شبی، دنیائے فانی
صدائے دل
کوئے یار
گفتگوئے خاص
نوائے ادب

(ج) "ے" "ی" اور واؤ پر ختم ہونے والے بعض الفاظ کی اضافت ہمزہ کے بغیر بہتر ہے، مثلاً:

پیروی میر،
سعی لاحاصل،
شناسائے دیرینہ
گاوِ زمین
نفی خودی، نفی غیر
وادی سندھ، وحیِ آسمانی

(د) مرکب اضافی کی درج ذیل صورتوں میں ہمزہ استعمال ہوگا۔

پئے نظر کرم، در پئے آزار، مئے باقی

۱۹۔ وصل و فصل

(ا) مرکب الفاظ، جہاں تک ممکن ہو، ملا کر نہ لکھے جائیں، جیسے:

آب پارہ، آتش کدہ، آج کل، ان پڑھ،
ان گھڑ
بت خانہ، بیش تر، بے جان
پھل، کاری
توپ خانہ
جے پور
خوب تر، خوب سیرت، خوب صورت
دانش کدہ، دل لگی، دل نواز،
ستم گر
شاہ جہان آباد
غم کدہ
کم تر، کم ترین
گل بدن، گل دستہ، گل ریز، گل کاری،
گل کدہ
ہم عصر، ہم نام

(ب) مندرجہ ذیل الفاظ کو جوڑ کر لکھنا بہتر ہے:

اینچی، انجان
باغبان، بآسانی، بحد ادب، بخدا،
بخوبی، بدولت، بذاتِ خود، براہِ راست،
بشرطیکہ، بعینہ، بغیر، بہتر، بہر حال،
بہم، بیدل، بیخودی
پاسبان
تاجور، تاوقتیکہ

جاں بلب، جانور، جبکہ، جستجو
چنانچہ، چونکہ
حالانکہ، خاکسار، خوشتر، خوشبو
زمیندار
سخنور، سوگوار
شاخسانہ، شاہراہ، شرمسار، شہباز
صاحبدل
غرضیکہ، غمگسار، غمگین
فنکار
کمزور، کیونکہ
گفتگو، گمراہ، گناہگار
مشکبو
نگہبان

(ج) انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کے الفاظ کو جہاں تک ہو سکے، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں لکھنا چاہیے، تاکہ پڑھنے میں سہولت ہو، جیسے

ان فارمل	(INFORMAL)
انسٹی ٹیوٹ	(INSTITUTE)
پارلی منٹ	(PARLIAMENT)
ٹیلی فون	(TELEPHONE)
ٹیلی وژن	(TELEVISION)
ٹیلی گرام	(TELEGRAM)
فونوگرام	(PHONOGRAM)
کیفے ٹیریا	(CAFETAREA)

(د) درج ذیل الفاظ کو جوڑ کر لکھنا مناسب ہے۔

سٹیشن	(STATION)
انسپکٹر	(INSPECTOR)
انسٹرکٹر	(INSTRUCTOR)
ڈاکٹر	(DOCTOR)
ریڈیو	(RADIO)
ریلوے	(RAILWAY)

(۲۰) امالہ

(ا) ایسے الفاظ جو "ہ" یا "الف" پر ختم ہوتے ہوں یا ایسے الفاظ جن کے آخر میں "ہ" ہے لیکن وہ "الف" کی آواز دیتے ہوں اور ان کی جمع بڑی (یے) سے بن سکتی ہو، ایسے الفاظ کے بعد حروف مغیرہ (کو، سے، میں، پر، نے، کے، کا، کی، تک وغیرہ) کے آنے کی صورت میں ان کا "الف" یا "ہ" بڑی "ے" میں بدل جائیں گے۔ مثلاً

آگرہ	آگرے کا تاج محل
اڈہ	اڈے پر
افسانہ	افسانے کا عنوان
دیوانہ	دیوانے کی بڑ
لڑکا	لڑکے نے
معاملہ	اس معاملے میں
مسئلہ	اس مسئلے کو
مرغا	مرغے کی ٹانگ
مکہ، مدینہ	مکے سے مدینے تک

(ب) تاہم عربی فارسی کے الفاظ جو الف پر ختم ہوتے ہیں امالہ قبول نہیں کرتے (البتہ

مقامات اور شہروں کے ساتھ امالہ استعمال ہوگا جیسے:

(i) املا
انشا
دنیا
صحرا

(ii) مکے 'مدینے 'کعبے 'چار سدے 'کوئٹے

(ج) بعض ایسے مرکبات جن کے پہلے لفظ کی جمع بن سکتی ہے 'وہ بھی امالے کے ساتھ لکھے جائیں گے ' چاہے کوئی حرف مغیرہ ان کے بعد آئے یا نہ آئے۔ جیسے:

پہرے دار
تانگے والا
ذمے دار
رکشے والا
سٹے باز
مزے دار
مقدمے باز

(د) بعض ایسے الفاظ جو الف نون غنہ (اں) پر ختم ہوتے ہیں اور ان کی جمع "ی" نون غنہ (یں) سے بنتی ہے 'وہ بھی امالہ قبول کریں گے۔ جیسے:

دھویں سے
کنویں سے

(ہ) عربی کے ایسے الفاظ جو "ع" یا "ع ہ" پر ختم ہوتے ہیں اور ان کی آخری آواز بھی الف کی نکلتی ہے 'وہ بھی امالہ قبول کریں گے جیسے:

برقعے میں
جمعے کو
(اس) قطعے میں
قلعے کے اندر
مصرعے 'مرقعے 'مقطعے 'موقعے

۲۱۔ اعراب

اردو میں اعراب کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

زبر	بن 'کل
زیر	بن 'کل '(کل کل)
پیش	بن 'کل
مد	آم 'آج
جزم 'سکون	دوست 'گوشت
تشدید	تمنّا 'مؤثر

(الف) درسی کتب میں اعراب ضرور لکھے جائیں

(ب) لفظ کے پہلے حرف پر زبر 'ہو تو وہ عام طور پر لکھا نہیں جاتا۔

۲۲۔ علامات

مندرجہ ذیل علامات بھی موقع اور محل کے مطابق عبارت میں استعمال کی جانی چاہئیں:

ایضاً
تخلص کی علامت

الخ　　پورا شعر یا عبارت لکھنے کی بجائے اس کے چند ابتدائی کلمات لکھ دیے جاتے ہیں اور ان کے بعد الخ لکھ دیا جاتا ہے اس سے

مراد "الی آخرہ" یعنی اس سے آخر تک ہے۔

ؒ رحمتہ اللہ علیہ / علیہا وغیرہ کے لیے

ؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا / عنھم کے لیے

ﷺ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

ع مصرے کی علامت

ص صفے کی علامت

کذا کسی عبارت کو نقل کرتے وقت یہ لفظ لکھتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اصل عبارت اسی طرح ہے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔

۲۳۔ رموزِ اوقاف

(ا) رموزِ اوقاف کے بالمقابل درج علامات باقاعدگی سے استعمال کی جائیں۔

نام	علامات
ختمہ	۔
سکتہ	،
رابطہ	:
سوالیہ	؟
ندائیہ / فجائیہ	!
قوسین	() {} []
واوین	" "
ترچھا خط	/
محذوفہ	٨

(ب) مندرجہ ذیل رموزِ اوقاف کا استعمال اختیاری ہے۔

وقفہ	.
تفصیلہ	:ـ
نقطے	......
زنجیرہ	٥

۲۴۔ اعداد

اعداد کو لفظوں میں لکھتے ہوئے درج ذیل طریقے سے لکھا جائے:

(i) ایک

دو	دونوں،	دوسرے
تین	تینوں،	تیسرے
چار	چاروں،	چوتھے
پانچ	پانچوں،	پانچویں
چھے/چھ	چھیوں،	چھٹے
سات	ساتوں،	ساتویں
آٹھ	آٹھوں،	آٹھویں
نو	نوؤں،	نویں
دس	دسوں،	دسویں

(ii) گیارہ سے اٹھارہ تک کے الفاظ ہائے ملفوظ سے لکھے جائیں۔

گیارہ، بارہ، تیرہ وغیرہ

(ب) گیارہ سے اٹھارہ تک اعداد ترتیبی اور عصری میں ر سادہ آواز کی بجائے حرف تنفسی یعنی رھ میں بدل جاتی ہے جیسے:

گیارھواں، بارھواں، تیرھواں، وغیرہ

گیارھوں، برھوں، تیرھوں وغیرہ

(iii) اکتالیس سے اڑتالیس تک کی گنتی میں لام کے بعد "ی" کا استعمال ضروری ہے، جیسے:

اکتالیس، بیالیس، تینتالیس، چوالیس وغیرہ

(iv) ذیل کے الفاظ نون غنہ کے ساتھ لکھے جائیں:

تینتیس، چونتیس، پینتیس،
پینتالیس، سینتالیس

اشاریہ

سفارشات میں صحیح املا کے نمونے

"آ"

آب پارہ	آتش کدہ	آٹھ
اٹھارہ	آٹھوں	آٹھویں
آجکل	آرا	آریا
آزر	آزمائش	آگرہ
آگرے کا تاج محل	آنا	آناً فاناً
آئندہ	آؤ	آئے
آئیں	آئیو	آیئے

"ا"

ابتدا	ابتدأ	ابھی
اتسرائے	اتفاقاً	اٹھاؤ
اٹھائے	اٹھایئے	اخترالایمان
ادبا	ادنیٰ	ادھار
اڈا	ارادہ	ارادۂ
اردوئے معلیٰ	ارائیں	اڑاؤ
ازدحام	ازدر	استثنا
استخواں	استسقا	اسٹیشن
اسحاق (اسحٰق)	اس قطعے میں	اسماً
اشتہا	اصالتاً	اصل الاصل
اعلیٰ	افریقہ	افزائش
افسانہ خواں	اقچی	اکھاڑا
اگائے	انگیزامیز	الاؤ
الجھاؤ	الہٰ	الٰہی
الہیات	امریکہ	املا
امیرالبحر	اناالبحر	اناالحق
ان پڑھ	اناؤنسر	انتہا
اندازاً	انسپکٹر	انشا
انشاءاللہ	ان فارمل	ان گھڑ
انھیں	اودبلاؤ	اوٹی
ایک		

"ب"

باآسانی	باانداز خاص	بارھواں
باج گذار	بارھواں	باغبان
بالترتیب	بال خور	بالفصل
بالفعل	بالکل	بالمشابہ
باؤلا	بھانجا	بائبل
بتاشا	بتاؤ	بتائے
بتایئے	بت خانہ	بجائے
بجنسہ	بچاؤ	بخوبی
بدرالدجیٰ	بدلا۔بدلہ	بدولت
بذات خود	براوراست	برخاست
برقعے	بڑھاپا	بڑھائے
بیون	بچھو	بچھوؤں
بسترا	بسمہٖ تعالیٰ	بشریٰ
بعینہٖ	بغیر	بلاؤ
بلائے	بلبلا	بلکہ
بناؤ	بہاؤ	بہائے
بندا	بقضہ	بنک

بوئے گل بہا بہاءالحق پھل کاری پھنسائے پھوپھا
بہاءالدین بہاؤ بہتر پھوپھی پھیلائے پیسا(پیسنے کا مصدر)
بہرحال بہو بہوئیں پیسہ (ایک سکہ) پینتالیس پینتیس
بھابی بھاؤ بھبک پے نظر کرم پترا پینترا
بھبکی بھبوکا بھتا ت
بٹھائے بھرتا بھروسا تاثر تاجور تاسف
بھگائے بھگوئے بھلائے تأمل تانگے والا تاوقتیکہ
بھنبوڑنا بھنبھناہٹ بھوبل تبھی تحت الثریٰ تخیل
بھوسا بھیا بیخودی تحلیل تراوت تزئین
بیدل بیش تر بے جان تزئین تعالیٰ تعیّن
بین الاقوامی بین السطور بے مائیگی تعیین تقاضا تقویٰ
"پ" توأم توپ خانہ تولا
پارا پاسبان پانا تولہ تولیا تولیے
پانچ پانچواں پانچویں تماشا تمغا تمھی
پانسا پائجامہ پائدار تمہارا تمھیں تمیز
پائل پائلٹ پائمال تمیز تنبورہ تنخواہ
پائندگی پائندہ پاؤ(وزن) تھانا تھرتھرانا تھیلا
پاؤڈر پاؤں پائے تیار تیراک تیسرا
پائیو پتا(نباتات) پتہ(شناخت) تین تینتیس تینوں
پٹاخا پٹکا پرسا ٹ
پذیرائی پذیرفتہ پژمردگی ٹائپ ٹائٹل ٹائم
پژمردہ پرائیویٹ پریا ٹیلی فون ٹیلی گرام ٹیلی وژن
پڑھاؤ پکائے پکائیے ٹھٹھہ ٹھیکا
پلا پلاؤ پلائے ث
پہنائے پہنچانا پہنچے ثناء ثناءاللہ
پہاوڑا پتھراؤ پھراؤ ج
پھرائے پھڑپھڑانا پھسلائے جائداد جائے جائیے

جائیو جتائے جذبۂ دل خوب سیرت خوبصورت خود
جڑا جڑا جرأت خودی خورد خورشید
جگائے جلائے جلاؤ خوشامد خوش آمدید خوشنما
جمعے کو جوشیلا جلوۂ مجاز خوشنود خویش
جھروکا جنھیں جھوک د
جھونک جے پور جیسے دانش کدہ داؤ داؤں
چ دباؤ درپے آزار درخواست
چار چارسدے کی بس چاولہ درگذر دعائے نیم شبی دعوئی
چاؤ چاہیے چبائے دفعہ دفعتہً دکان
چباہیے چرائے چڑھائے دلارا دلاری دل پذیر
چغا چغہ چلاؤ دل لگی دلنواز دلیا
چلائیے چنانچہ چناؤ دنیائے فانی دہرا دوپٹا
چوچلہ۔ چونچلہ چورلہا چولھا دورخا دولھا دولھن
چوما چونکہ چھپر دوہرا دھوئے دھلائے
چھاؤں چھبیلا چھتا دھواں دھوئیں دیے
چھٹا چھٹے چھپتے دیکھیے دینہ دیوانہ
چھڑائے چھڑکاؤ چھلکاؤ دیوانۂ دنیا
چھم چھم چھن چھناہٹ ڈ
ح ڈاکا ڈاکٹر ڈاکیا
حالانکہ حتیٰ حتی الامکان ڈائنامیٹ ڈبا ڈبیا
حتی المقدور حتی الوسع حقیقتاً ڈراما ڈسکہ ڈیزائن
حکما حلوا ڈھاکہ ڈھنڈورا ڈھونڈا
خ ڈھیٹ
خاصا خاصہ خاکہ ذ
خانۂ خدا خدانخواستہ خدمت گذار ذات ذائقہ ذرا
خدیجہ خرد خردہ ذرہ ذکاء اللہ ذمہ
خواب خواہش خوب تر ذمے دار

ر

راجا رلائیں راؤ

راہ گزر رحمان۔ رحمٰن رکشا

رکشے والا رلائے رہائی

رومالی ریڈیو ریلوے

ز

زخار زرتشت زکوٰۃ

س

سات ساتوں ساتویں

سادھو سادھوؤں سائل

سائنس سپولیا ستائے

ستائش ستم گر سٹے باز

سجائے سخنور سرگزشت

سعی لاحاصل سقا سلائے

سلمٰی سلیمان سلویٰ (من و سلویٰ)

سمجھوتا سناؤ سنائے

سنائیے سوئیے سینتالیس۔

سیے سیکڑہ سینکڑہ

سوءادب سوءظن سبھی

ش

شاخسانہ شاہراہ شاہ جہاں آباد

شائق شرمسار شکایتاً

شکر گزار شلوکا شمس الضحیٰ

شمس الہدیٰ شناسائے دیرینہ شوربا

شہباز

ص

صاحبدل صافا صافہ

صحارا صحرا صدائے دل

صدرالصدور صغرا (صغیر کی جمع) صغریٰ (نام)

صلوٰۃ صوفیا صوفیاء

ض

ضرورتاً ضیا ضیاءالحق

ضیاءالدین

ط

طپنچہ طشت طشتری

طلبا طلباء طمانچہ

طوبیٰ طوطا طہماسپ

ع

عادتاً عاشورا عبدالجبار

عبدالجلیل عبدالرحمٰن عبدالرحیم

عبدالرزاق عبدالستار عبدالسلام

عبدالسمیع عبدالغفار عبدالغفور

عبدالغنی عبداللطیف عرض گزار

عظمیٰ عقبیٰ علاءالدین

علاحدہ علٰحدہ علی الترتیب

علی الحساب علی الخصوص علی الرغم

علی الصباح علی العموم عمداً

عیسیٰ

غ

غبارا غرضیکہ غلطاں

غم کدہ غمگسار غمگین

ف

فائل فتویٰ فرما (فن طباعت سے متعلق)

فرمائش فرمایئے فطرتاً

فعلاً فقرا فنکار
فوراً فوٹوگرام فی الحال
فی الفور فی الوقت فینائل

ق

قرأت قلعے قورما
قوئی

ک

کاکا کبرا(کبیر کی جمع) کبریٰ(نام)
کتھا کرم کلا کسریٰ
کعبے کلیہ کلیتہً
کمائے کمبوڈیا کمپاؤنڈر
کم تر کم ترین کمزور
کوئے کوئے یار کہلائے
کھائیو کھائیے کھڑاؤں
کھدائے کھلائے کھولیے
کھوئیے کیجیے کیچلی
کیچوا کیف الوریٰ کیفے ٹیریا
کینچلی کینچوا کیونکہ

گ

گاؤ گاؤزمین گاؤں
گائکہ گزاف گزند
گفتگو گل بدن گل دستہ
گل ریز گل کاری گل کدہ
گمراہ گناہگار گنائے
گنجائش گنوائے گہنائے
گیارھواں گیارھوں گھلاؤ
گھائل گھبرائے گھٹاؤ

گھٹائیے گھسو گھماؤ
گھمائیے گھنگرو گھنگریالے
گھنگھور گھونسلا گھونگھٹ

ل

لاؤ لائے لتی
لبھائیے لٹکائے لڑکا
لقمان لگاؤ لوہار
لہار لہذا لہنگا
لیجیے لیلیٰ

م

مابہ الامتیاز ماجرا ماوئی
مبرا متمنی مٹائے
مثلاً مثنیٰ مجتبیٰ
مدینہ(منورہ) مرتضیٰ مرغا
مرقعے مروتاً مریے
مزیے دار مسئلہ مسیح الدین
مسیح الرحمٰن مسیح الزماں مشکبو
مشکوٰۃ مصطفےٰ مصرعے
مصفاً مضائقہ معاملہ
معائنہ معرا معما
مقتدا مقدے باز مقطعے
مقفیٰ مکہ(معظمہ) ملائیے
ملغوبا ملیے مملا
منائے منشا منشاءالحق
منقا منگائے منگوائے
منگوائیے موٹاپا مؤثر
موچھ مؤخر مؤدت

مؤذن مؤرخ مؤسس نقشا نقشہ کیلا
موسیٰ موقع مؤکل نگہبان نمائش نوائے ادب
مولا مولانا مولنا نورالہدیٰ نوکیلا نووٗں
مؤلف مؤنث مونچھ نویں
مہندی مہنگا مہنگائی
مہنگی مئے باقی میئر و
میلا ٹھیلا وادیٔ سندھ وحیِ آسمانی وزرا
ن ہ
نارائن ناگزیر نالۂ شب ہڑا ہدیٰ ہلائے
ناٹک ناٹکہ نبھائے ہم عصر ہم نام ہندو
نذرانۂ عقیدت نسباً نسلاً ہندوٗں ہنسائے ہیولا
نشۂ دولت نشیلا نشیلہ ی
نصاریٰ نصیبا نصیبہ یاسین یتامیٰ یحییٰ
نغمۂ فردوس نفیٔ خودی نفیٔ غیر یٰسین (بشکریہ اخبارِ اردو)

اسلم فرخی

پتلے اکرام

(اکرام احمد کی یاد میں)

اخبار کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے خبر چھاپ دی ورنہ بیسیوں آدمی روزانہ شہر سے اٹھ جاتے ہیں مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ عام اور معمولی آدمی کو کون پوچھتا ہے۔ اطلاعیں بڑے آدمیوں کی شایع ہوتی ہیں۔ ان کا تمطراق مرنے کے بعد بھی برقرار رہتا ہے۔ جینا بھی اطلاعوں کی روشنی میں اور مرنا بھی اطلاعوں کی جگمگاہٹ میں۔ اب اگر اس فضا اور ماحول میں ایک عام اور معمولی آدمی کے گزر جانے کی اطلاع اخبار میں چھپ جائے تو اسے اخبار والوں کی مہربانی سمجھنا چاہیے، مگر اتنا کچھ لکھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ شیخ اکرام احمد معمولی آدمی ہوتے ہوئے بھی معمولی آدمی نہیں تھے۔ غیر معمولی آدمی تھے۔ جس آدمی نے ساری زندگی حالات ماحول اور معاشرے سے جنگ کی اور کبھی ہار نہیں مانی وہ معمولی آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔ جس نے بے سر وسامانی اور وسایل نہ ہونے کے باوجود دوستوں کی دلداری اور خدمت میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے دُکھ کو اپنا دُکھ اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھا۔ ان کی خاطر دوسروں سے بڑا بنانے۔ جس نے اخلاق اور وضع داری کے کچھ اصول مقرر کر لیے تھے اور ساری زندگی ان پر عمل پیرا رہا۔ مخالف بھی اُس کے ان اصولوں کے معترف تھے اور اپنے تو خیر کلمہ بھی پڑھتے تھے تو وہ آدمی معمولی کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر حالات کا پھیر نہ ہے کہ غیر معمولی، معمولی اور معمولی سمجھے جاتے ہیں اور سمجھے جاتے رہیں گے۔ شبنم اکرام احمد جیسے وضع دار اور محبت کرنے والے انسان دلوں میں یاد رکھے جاتے ہیں۔ عام زندگی میں انھیں شہرت حاصل نہیں ہوتی۔

شبنم اکرام احمد، شبنم صاحب، اکرام صاحب۔ اکرام بھائی اور عام دوستوں میں پتلے اکرام کے نام سے مشہور تھے۔ لمبا قد۔ دُبلا ڈیل۔ پتلا اور ستا ہوا چہرہ۔

چپاں سی آنکھیں۔ کسی قدر پھیلی ہوئی ناک۔ چھوٹا سر۔ انگریزی بال مگر عام طور پر سر پر کشتی دار ٹوپی۔ کمزور ہاتھ پاؤں چھرے مہرے اور انداز سے مریض معلوم ہوتے تھے مگر اس منحنی اور مریض نظر آنے والے جسم میں بلا کی قوت اور مصائب برداشت کرنے کا غیر معمولی حوصلہ تھا۔ زبان کترنی کی طرح چلتی تھی بلکہ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ساری توانائی زبان میں کھینچ آئی تھی مگر کسی کے للو چپو نہیں کرتے تھے۔ بات ایمان اور دھڑا کے کی کہتے تھے۔ بہت دن تک باقاعدہ شیروانی پہنتے رہے۔ پھر جاڑے جاڑے پہننے لگے۔ آخر آخر میں جاڑے میں سوئٹر سے کام چلانے لگے تھے۔ ان کی گرمی گفتار سے جاڑے میں بھی پسینہ آجاتا تھا۔

اکرام مراد آباد کے رہنے والے۔ روہیل کھنڈی تھے اگرچہ روہیلے نہیں تھے تاہم مزاج میں انکسار کے باوجود وہی ندبو تھی۔ نوجوانی میں تلاش روزگار میں دل آئے۔ عام میں انتخاب اس شہر کی آغوش محبت سب کے لیے وا تھی۔ اسی کی فضا اور ماحول میں جذب ہو گئے۔ بھائی وصی (مولوی وصی اشرف مرحوم) کے کتب خانہ علم و ادب میں کام سے لگ گئے۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے ان کی قدت تویائی کا احساس ہوا اور پھر کتابوں کی قدت تویائی سے متاثر ہو کر ان کے خالقدہ تک جا پہنچے کتب خانے علم و ادب میں ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ بہتوں سے واقف ہو گئے۔ نوجوان تھے۔ ذہین تھے۔ ادبی ماحول، چشمکوں، گروہ بندیوں۔ اکھاڑے بازیوں سے واقف ہو گئے۔ اہم اور غیر اہم کا فرق پہچان گئے۔ اپنے پرائے میں تمیز کرنے لگے۔ بھائی بڑے مرنجاں مرنج اور میاں آدمی تھے۔ کاروبار کو دوستی مروت اور یار باشی کے اصولوں پر چلاتے تھے۔ اکرام نے بھی یہ باتیں گرہ میں باندھ لیں۔ زندگی کے آداب اور قرینہ سیکھا مگر تربیت کا یہ دور مکمل ہونے سے پہلے ہی دلی لٹ گئی اور میاں اکرام ہزاروں دوسرے لوگوں کی طرح ہمایوں کے مقبرے سے ہوئے بیک بینی و دو آدش وارد کراچی ہوئے۔

کراچی میں نئی زمین نیا آسمان۔ پہلے تو سر چھپانے کا ٹھکانا ڈھونڈا پھر روزگار کی فکر ہوئی۔ ڈھونڈا ڈھکولا تو معلوم ہوا کہ بھائی وصی بھی تباہ پریشان کراچی آگئے ہیں۔ جا کر ملے اور بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد ایلفی کی فٹ پاتھ پر ایک چھوٹے سے کھوکے میں کتابوں کی ایک دکان قایم کر دی۔ بھائی وصی دلی سے بالکل برباد ہو کر

آئے تھے سرمائے کی کمی تھی۔ دن بھر سرمائے کی تلاش میں مارے مارے پھرتے۔ دکان اکرام نے سنبھالی۔ بڑی محنت سے کام لیا مشکل یہ تھی کہ نئے ملک میں نیا جنم لینے والوں کے پاس عزم و حوصلہ تو بہت تھا مگر وسایل نہیں تھے۔ کتابوں کی طرف کون توجہ کرتا پھر بھی اکرام کی ہمت اور بھائی وصی کی دوڑ بھاگ نے دکان میں زندگی کے آثار پیدا کردئے کہ ایک دن ناگہانی پولیس نے سارے کھوکے مسمار کردئے۔ سارا محل۔ امیدوں اور کتابوں دونوں کا اڑاڑا دھم ہو گیا۔

اکرام نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔ بھائی وصی تو اس سانحے سے بالکل دل برداشتہ ہو گئے اور گھر بیٹھ گئے کتب خانہ علم و ادب میں گاہکوں کی ریل پیل اور ادیبوں شاعروں میں گھرا رہنے والا۔ وضع دار ادب دوست ناشر دوبارہ دکان سجانے کی ہمت نہ کرسکا اور بیر کالونی کے ایک معمولی مکان میں لشتم پشتم زندگی گزارتا رہا۔ اکرام نے کسی کے ساجھے میں کیپٹل سینما والی میں پھر دکان سجائی۔ جگہ اچھی تھی۔ مسجد کی تھی۔ اس لیے دکان اچھی چلی۔ ایک دن یہ اتفاق ہوا کہ جگر صاحب ادھر سے گزرے۔ اکرام نے دکان سے اتر کر بڑے احترام سے دست بستہ سلام عرض کیا۔ جگر صاحب نے تیز تیز نظروں سے دیکھا۔ مراد آبادی نسبت نے جوش مارا۔ پہچان گئے۔ گلے لگایا۔ خیریت دریافت کی اور ضرورت، ہوتے ہوئے بھی خاصی کتابیں خریدلیں۔ قیمت میں بھی قیمت سے زیادہ دام ادا کئے۔ اکرام جگر صاحب کی وضع داری اور فیاضی کا یہ واقعہ اکثر سناتے تھے۔ خصوصاً اس موقعے پر جب کوئی ادیب یا شاعر پیسوں پر جھگڑتا یا تھڑدلی کا مظاہر کرتا تو اکرام یہ واقعہ ضرور بیان کرتے تھے۔

دکان چلنے لگی مگر اکرام کی قسمت میں چین کہاں۔ یہاں بھی وہی صورت حال پیش آئی۔ جمی جمائی دکان منٹوں میں برباد ہو گئی۔ پھر وہی بیر روزگاری۔ وہی بے یقینی اور ناامیدی۔ اکرام نے پھر بھی ہار نہیں مانی۔ مرمر کے جئے جانے کی عادت ہو چلی تھی۔ اس دفعہ بندر روڈ پر ڈو میڈیکل کالج کی دیوار سے متصل فٹ پاتھ پر ایک چھوٹے سے ابھرتے ہوئے بازار میں کتابوں کو کیبن بنالیا۔ بھتیجے کے نام مشتاق پر بک ڈپو نام رکھا۔ بڑے بھائی اخلاق احمد دکان پر بیٹھے اکرام دوڑ بھاگ کرنے لگے۔ تھوڑے دن میں یہاں بھی دکان میں زندگی کے آثار پیدا ہو چلے مگر پھر وہی ستم غیب نہیں بلکہ کارپوریشن کی جانب سے ہوا چلی اور ساری دکانیں

اُکھاڑ پھینکی گئیں مگر کارپوریشن نے دکانداروں کے آنسو یوں پونچھے کہ متبادل جگہ فراہم ہوگی۔ اکرام کو بھی اردو کالج اور فٹ بال اسٹڈیم کے درمیان نئی تعمیر شدہ دکانوں میں سے ایک دکان الاٹ ہوگئی۔ مشتاق بک ڈپو وہاں منتقل ہوگئی۔ یہاں مشکل یہ تھی کہ چاروں طرف لوہے لنگڑ کا کاروبار اور دکانیں۔ سامنے نشتر روڈ کا وہ حصہ جہاں لوہے کہ سریے اور عمارتی لوہے کی فروخت ہوتی تھی۔ مشتاق بک ڈپو کے اردگرد مشینوں کی مرمت کی دکانیں۔ فولاد اور لوہے کا کاروبار۔ یہاں کتابوں کے گاہک کہاں سے آتے۔ دن بھر بیٹھے مکھیاں مارتے رہو۔ نہ گاہک نہ گاہک کا سایہ۔ ادیب شاعر ضرور آتے رہتے تھے مگر گاہک عشاقِ تھے آنے والے ادیب شاعر کبھی کبھی کوئی کتاب خرید بھی لیتے مگر اولوں سے پیاس کہاں بجھتی ہے۔

اکرام نے قسمت آزمائی کے لیے پبلیشنگ کا کام کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ قرض وام کر کے ایک کتاب چھاپی۔ کتاب بھی چھاپی تو فنشی سجاد حسین کی حاجی بغلول۔ سرورق پر ایک دبلے پتلے آدمی کی مضحکہ شبیہ۔ کتاب تو انھوں نے جیسے تیسے کر کے بیچ لی مگر دوستوں نے انھیں حاجی بغلول کہنا شروع کردیا۔ اکرام نے برا نہیں مانا۔ بہ ترکی تبر کی جواب دیتے رہے۔ ایک آدھ کتاب اور چھاپی مگر پوتھ پورا نہ ہوا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم مرحوم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع کیا ایک آدھ کتاب جالبی نے دے دی بہتیرا ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیابی کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ نتیجہ ہمیشہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ گھریلو ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ اکیلے سے دکیلے ہوگئے تھے نجانے کیسے گزر کرتے تھے مگر کبھی کسی پر اپنا حال ظاہر نہیں کرتے تھے۔ ہنستے ہی رہتے تھے اور گفتگو میں تیر و نشتر برساتے رہتے تھے۔

آخر آخر میں یہ دکان اکرام کے لیے گلے کا پھندا بن گئی۔ یافت کے نام پر ایک پیسہ بھی نہیں۔ اکثر بند رہتی تھی۔ بھائی اخلاق بیٹھتے تھے انھوں نے بھی بیٹھنا چھوڑ دیا۔ اس صورت حال میں اکرام کو ایک وضع دار شریف اور شریف پرور مرادآبادی نے سہارا دیا۔ اپنے ادارے سے وابستہ کرلیا۔ اکرام یہاں کیا فرائض انجام دیتے تھے۔ تو مجھے معلوم نہیں۔ یہ ضرور معلوم ہے کی وہ بڑی باقاعدگی سے دفتر جاتے۔ سارے وقت موجود رہتے۔ جو کام سپرد کیا جاتا اُسے خوشی خوشی اور اپنی صلاحیت کے مطابق انجام دیتے۔ زندگی بھر کھکھیڑ اٹھاتے اٹھاتے صحت کا ستیا ناس ہوگیا تھا۔ بیمار رہنے لگے تھے مگر بیماری کے باوجود دفتر آتے۔ شکیل صاحب

نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ طبیعت خراب ہو تو دفتر نہ آئیں مگر وہ ہمت کر کے آجاتے اور کام کرتے شکیل صاحب بھی ایسے دریادل کہ انھوں نے اکرام کی ہر طرح مدد کی اور ایک لمحے کے لیے بھی انھیں بے سہارا ہونے کا احساس نہ ہونے دیا اکرام ان کی توجہ اور سہارے سے زندگی سے لڑتے رہے مگر زندگی ایسی زبردست ہے۔ ہر ایک کو مار رکھتی ہے۔ آخر کار اکرام بھی اس کی بے رحمی کا شکار ہوگئے۔ رہے نام اللہ کا۔

اکرام سے میری ملاقات بھائی وصی کی اپلی والی دکان پر ہوئی تھی۔ برادرم شمس زبیری مراد آبادی نے ملاقات کرائی تھی۔ یہ دونوں مرادآبادی آپس میں بے تکلف تھے۔ ملاقات نے صاحب سلامت کی شکل اختیار کرلی۔ کیٹیل والی دکان پر بھی آنا جانا رہا اور بندر روڈ والی دکان پر بھی پھیرا ہوتا رہا۔ کیونکہ صدر اور بندر روڈ تقریباً روزانہ ہی جانا ہوتا تھا مگر جب وہ اردو کالج کے پڑوس میں جا بسے تو روزانہ کی ملاقات برقرار نہ رہی مگر اس وقت تک ملاقاتوں میں اتنا استحکام پیدا ہو گیا تھا کہ روزانہ نہ ملنا اس استحکام پر اثرانداز ہوا۔ اکرام کی عادت تھی کہ مولوی رازق الخیری کی طرح مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ میاں اسلم کہتے تھے۔ موقع موقع سے چٹکیاں لیتے رہتے تھے مگر خلوص و وفا کے پتلے تھے جاں نثار تھے اور دوستوں کی خدمت کے لیے ہر وقت حاضر رہتے تھے۔

اکرام ادیبوں شاعروں اور ناشروں کی چلتی پھرتی انسائکلو پیڈیا تھے۔ ادب اور ادیب کے معاملات و مسائل سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور اس واقفیت کو افسادہ خلق کے لیے عام کرتے رہتے تھے۔ دشمنوں اور مریضوں کا ذکر برائی اور مذمت سے کرتے۔ باقی کسی کے لیے ناملایم الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ایک ادبی رسالے کے مدیر سے انھیں چڑ تھی۔ چڑ کیوں تھی۔ بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ شاید ان کی خفیف الحرکاتی سے چڑ گئے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھتے۔ ہر آنے جانے ملنے جلنے والے کو ان کے سازشی ذہن اور کرتوتوں سے آگاہ کرتے رہتے۔ جب زیادہ غصے میں ہوتے تو ان کے خلاف ایک عدد پوسٹر نکالنے کا ارادہ بھی ظاہر کرتے لیکن یہ دھمکی کبھی عمل میں نہیں آئی اور ادھر دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا۔ میں انھیں چھیڑنے کے لیے کبھی کبھار ان مدیر کا ذکر خیر کرتا تو برہم ہو کر کہتے "میاں اسلم۔ تم دور سے تماشہ دیکھنے

والوں میں ہو۔ اس سے پالا نہیں پڑا۔ پالا پڑ جاتا تو ناکوں چنے چبوا دیتا۔" میں پھر کوئی چٹکی لیتا۔ "ارے میاں۔ تمھاری تو وہ مثل ہے ناحق چوٹ جلد ہا کھانے۔ جلتے ہو اس کی شہرت سے۔" کچھ اور زیادہ بھڑک جاتے۔ مگر یہ سارا جذبہ پیکار صرف الفاظ تک محدود تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ اکرام نے اس مدیر کے خلاف کبھی کوئی عملی اقدام نہیں کیا۔ نہ اسے زک پہنچانے کا کوئی منصوبہ بنایا۔ ان کا غصہ اور اشتعال دودھ کا سا ابال تھا۔ جلال آیا تو آپے سے باہر ہو گئے۔ جلال ختم ہو گیا تو جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ آخر آخر میں یہ کہنے لگے تھے کہ "میاں چھوڑو اس کے ذکر کو کیوں گڑے مُردے اکھیڑتے ہو۔"

ان کی دوسری ناپسندیدہ شخصیت ایک اور صاحب تھے۔ بظاہر مسکین لیکن بڑے تیز طرار اور آسمان میں تھگلی لگانے والے۔ ان میں یہ کمال تھا کہ اپنی مسکینی اور نرم نرم باتوں سے ہر شخص کو رام کر لیتے تھے اکرام کی ان سے بگڑنے کی وجہ وضع داری اور اخلاقی بندش کا دباؤ تھا مگر کیفیت یہ تھی کہ اکرام جتنا بگڑتے اتنا ہی وہ صاحب صدقے قربان ہوتے۔ اکرام کی شادی میں بھی وہ موجود تھے اور بھائی اخلاق کے مرنے پر پُرسے کے لیے بھی دوڑے گئے تھے لیکن اکرام کے نزدیک ان کی خطا ناقابل معافی تھی اور وہ کسی طرح بھی انھیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ادھر ان کا ذکر آیا اور ادھر اکرام کا رنگ بدلا۔ شروع یہاں سے ہوتے کہ "اس کے تو رگ و ریشہ میں مکر ہے۔ میاں اسلم تم کیا جانو وہ کیا چیز ہے" میرا اتنا کہنا بارود میں چنگاری ڈالنے کے مترادف ہوتا۔ پھر جو بکھان ہوتا تو اللہ دے اور بندہ لے۔ مرتے مر گئے مگر اس دشمن صاحب کو حاجی کو معاف نہیں کیا۔

اکرام کو شہر کے سارے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ہمیشہ اول درجے کی معلومات رہتی تھیں۔ نجانے کیسے کیسے اور کہاں کہاں سے معلومات جمع کرتے۔ فون کرتے۔ "ارے میاں! سُنا تم نے۔ فلاں صاحب یہ کہہ رہے تھے۔ اب وہ چو مکھی لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سُنا تم نے ان لوگوں کو اور کوئی کام تو ہے نہیں۔" شہر میں کوئی ادبی واردات۔ سانحہ۔ حادثہ۔ بخشم بخشی۔ تکرار ایک دوسرے پر تنقید کچھ بھی ہو اکرام کو سب خبر رہتی تھی جس بات کی تصدیق کی ضرورت ہوتی ان سے پوچھ لی۔ اکرام فوراً پوری تفصیل فراہم کر دیتے مگر کسی کی برائی اور مذمت کے ساتھ نہیں۔ ایک چیز تو وہ ہوتی ہے جسے لتراپن کہتے ہیں

جہاں بیٹھے کسی کی بُرائی کر کے اُٹھے۔ خواہ مخواہ کی غلط فہمی پیدا کر دی اور اچھے دل بُرے کر دیے۔ اکرام میں یہ صفت نہیں تھی۔ وہ صرف خبر دیتے تھے۔ اپنی طرف سے کلی پھندے نے نہیں لگاتے تھے نہ ذاتی تبصرے شامل کرتے تھے۔ دوسری چیز افواہ سازی اور بدگوئی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں میں یہ وبا عام ہے۔ ایک دوسرے کے بارے میں افواہیں اور اسکینڈل (اس کا موزوں مترادف میری سمجھ میں نہیں آتا) پھیلاتے ہیں۔ بڑے خلوص اور معصومیت سے دوسرے کے بارے میں ایسی بات کہتے ہیں۔ کوئی ایسا واقعہ منسوب کر دیتے ہیں جس سے اس شخص کی کردار کشی ہوتی ہے مگر یہ کردار کشی ایسے فن کارانہ سلیقے سے ہوتی ہے سننے والے کو اس کی گہری معنویت کا احساس نہیں ہوتا۔ اکرام میں یہ صفت بھی نہیں تھی وہ گفتار و کردار میں شمشیر برہنہ تھے۔ اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق کی تصویر تھے۔ خبریں ضرور فراہم کرتے تھے اور اس کی وجہ سے ادبی گزٹ بھی کہلاتے تھے بس اس سے آگے کچھ نہیں۔

اکرام کی سب سے اہم خصوصیت ان کی حد سے بڑھی ہوئی جاں نثاری اور وفاداری تھی۔ اسی جاں نثاری کی وجہ سے جالبی صاحب اُنھیں "اپنی کمزوری" کہتے تھے۔ ہمیشہ خیال کرتے تھے۔ اکرام بھی ان پر جان دیتے تھے مجھے بھی یہ خوش فہمی ہے کہ شمس زبیری اور جالبی صاحب کی طرح اکرام میرے بھی انتہائی دوست تھے۔ مجال نہیں کہ اکرام کے سامنے کوئی بھی شخص ہم لوگوں کے بارے میں کوئی ناروا بات کہہ دے۔ فوراً جان کو آجاتے تھے۔ جھاڑ کا کانٹا بن جاتے ناروا بات کہنے والے کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ وطنی نسبت کا بھی بڑا پاس کرتے تھے اشتیاق طالب نفیس فریدی۔ پروفیسر ذوالفقار مصطفیٰ۔ اس نسبت سے ان کی پسندیدہ شخصیتوں میں شامل تھے ایک دفعہ اکرام ریڈیو اسٹیشن آئے اس وقت میرے پاس استاد حامد حسین سارنگی نواز بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اکرام سے ان کا تعارف کرایا اور کہا۔ یہ بھی مراد آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سنتے ہی اکرام نہایت گرم جوشی سے ان سے گلے ملے اور گفتگو اس انداز سے شروع کی جیسے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے اور ان کے اب وجد سے پوری طرح واقف ہیں۔ بعد میں اکرام جب بھی ریڈیو اسٹیشن آئے حامد حسین سے ضرور ملے۔ حامد حسین بھی اُنھیں اکثر پوچھتے رہتے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے انسیت ہو گئی تھی

مگر اکرام کا نمبر بڑھا ہوا تھا ویسے ان کے تعلقات کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ ادیبوں اور شاعروں میں شاید ہی ایسا کوئی ہو جو انھیں نہ جانتا ہو اور ان کا احترام نہ کرتا ہو۔ محمی مشفق خواجہ سے لے کر پروفیسر لطیف اللہ تک سب ان کے معترف اور قدردان تھے۔ اکثر ادیب اور شاعر انھیں اکرام بھائی کہتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔

اکرام اپنی پریشانیوں کے باوجود سب کا کام کرتے تھے۔ کسی کو رعایتی قیمت پر کتابیں درکار ہیں تو اکرام صاحب کو پکڑا۔ کسی کو کسی کتاب کی جستجو ہے۔ اکرام نے نجانے کہاں سے ڈھونڈ کر فراہم کردی۔ کسی کو کتاب کا مقدمہ لکھوانے کے لیے موزوں آدمی کی تلاش ہے۔ اکرام نے دو چار نام بتادیئے بلکہ ایک آدھ سے سفارش بھی کردی۔ کسی کو اخبار میں کوئی اطلاع چھپوانا ہے۔ اکرام کی وجہ سے مشکل آسان ہوئی مجھے اپنے مکان کے لیے پلاسٹک کی تختی پر نام لکھانا تھا۔ اکرام سے ذکر آیا تو کہنے لگے وہ جو آپ کے شاگرد ہیں ان سے لکھوالیجیے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ صاحب یہ کام کرتے ہیں مگر ذہن اس طرف رجوع ہی نہیں ہوا تھا اکرام نے یاد دلایا تو یاد آیا۔ کسی کا مضمون اشاعت کے لئے کسی اخبار یا رسالے میں بھجوادیا۔ نئے ادیبوں اور شاعروں کو دوستانہ مشورے بھی دیتے تھے۔ "میاں دیکھنا! تمھارا وہ مضمون ذرا ہلکا ہے معلوم ہوتا ہے محنت نہیں کی۔ میاں! مشاعرے میں کمزور غزل نہ پڑھا کرو۔ سمجھنے والے اچھی رائے قائم نہیں کرتے۔" ادیبوں۔ شاعروں میں رہتے رہتے اور کتابوں کی دنیا میں زندگی گزارتے گزارتے انھیں ادب و شعر کی خاص فہم ہو گئی تھی۔ بے لاگ رائے دیتے تھے۔ اور رعایت نہیں کرتے تھے دوستوں کے لیے سعی سفارش کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ چونکہ تعلقات کا حلقہ وسیع تھا اس لیے کوئی نہ کوئی مناسب رابطہ ڈھونڈ نکالتے تھے اور صحیح آدمی تک پہنچ جاتے تھے۔

اکرام میں کوئی نہ کوئی ایسی خصوصی کشش ضرور تھی کہ اکثر لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ دو چار دفعہ ملے اور ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔ ضیا الدین برنی مرحوم۔ خطاط اعظم یوسف دہلوی مرحوم، علاء الدین خالد مرحوم اور نجانے کتنے لوگ تھے جو ان سے بڑی محبت سے ملتے تھے۔ میرے ایک عزیز نے اس عمارت میں ایک دفتر کرایے پر لیا جس میں شکیل صاحب کا دفتر ہے۔ جب انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے فلاں جگہ دفتر لیا ہے تو میں نے انھیں اکرام کا نام اور حلیہ بتایا اور کہا

ان سے ملنا اور مجھے ان کی خیریت بتانا۔ وہ اکرام سے مل کر بہت خوش ہوئے اور متاثر بھی ہوئے۔ دو تین ملاقاتوں میں ایسے رنجھے کہ ان کا دم بھرتے تھے۔ جب ملتے کہتے "صاحب کیا لاجواب آدمی ہیں۔ آپ نے بڑے عمدہ آدمی سے ملاقات کرادی۔" ادھر اکرام بھی جب ملتے یا فون کرتے تو ان کا تذکرہ ضرور کرتے اور بڑی تعریف کرتے۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ اگرچہ میرے عزیز نے کچھ دن بعد وہ جگہ چھوڑ دی اور کہیں اور دفتر لے لیا لیکن اکرام کو ہمیشہ محبت سے یاد کرتے رہے اور جب مجھ سے ملاقات ہوتی تو انھیں ضرور پوچھتے بظاہر اکرام کی شخصیت سپاٹ نظر آتی تھی لیکن جہاں ان سے ایک دفعہ بات ہوگئی جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو آہستہ آہستہ خود کو منکشف کرتی ہیں۔ یہ دیر آشنا شخصیتیں بہت دیر میں کھلتی ہیں اور دھیرے دھیرے اپنا اثر جماتی ہیں۔ ان کے برعکس بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو پہلی ہی ملاقات میں کھل جاتی ہیں۔ ان کے یہاں "اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں" والی بات نہیں ہوتی۔ ان کا اثر فوری اور تیز ہوتا ہے۔ اکرام بھی ایسی ہی شخصیت تھے۔ فوری اثر کرنے والے۔ تیز اثر کرنے والے اور اس اثر کو قایم رکھنے والے کی کتاب کی تقریب اجرا میں اکرام بھی موجود تھے اور حسب معمول مجھے اپنی ہی افشانی گفتار سے محلوظ کر رہے تھے۔ مکالمہ ختم ہوا تو وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئے۔ ایک صاحب جو انھیں نہیں جانتے تھے مجھ سے کہنے لگے۔ "کون صاحب ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بڑی معلومات رکھتے ہیں اور زبان تو ایسی چلتی ہے کہ بس۔" میں نے انھیں اکرام سے ملوادیا۔ کچھ دن بعد دیکھا تو وہ اکرام کی دکان پر ڈٹے ہوئے تھے اور دونوں میں بڑا محبت بھرا مکالمہ ہو رہا تھا۔ وہ صاحب میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ "صاحب۔ آپ نے کس آدمی سے ملاقات کرادی۔ ان کے پاس آجاتا ہوں تو سارے شہر کی ادبی فضا سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ ایسے لاجواب آدمی کہاں ملتے ہیں۔" اکرام بھلا کیسے چپ رہتے بولے۔ "میاں کوڑی کے تین تین پھرتے ہیں۔ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔" پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ "میاں! جب میں مر جاؤں گا تو تم یہی کہہ کر یاد کرلو گے کہ ہمارا دوست تھا۔ بھلا آدمی تھا۔" میں نے کہا "تم بھلے آدمی۔ فلاں صاحب۔ ارے وہی اس رسالے کے مدیر وہ تو کچھ اور کہتے ہیں۔" بس اکرام برس پڑے۔ "ارے

بد معاش۔ وہ کیا کہے گا۔ جو خود بھلا نہ ہو وہ کسی بھلے آدمی کو کیا پہچانے گا۔ کیسے مانے گا۔"

میں نے مراد آباد کے برتنوں کے علاوہ دو باتیں اور بھی مراد آباد کے حوالے سے سُنی تھیں ایک تو کچھ ضرب المثل قسم کی چیز تھی جس کی تشریح میں فساد خلق کا اندیشہ اور ثقہ نازک مزاجوں کی جانب سے گردن نہ دل کا خوف ہے ویسے بھی فرہنگ آصیفہ۔ نور اللغات اور محاورات ہند میں اس مثل کا اندراج نہیں ہے۔ مگر انھیں بزرگ بننے کا شوق ایسا تھا کہ فضلی سنز کے طارق رحمان کو گاہے گاہے دھونس دیتے رہتے میاں تم کیا چیز ہو۔ ارے ہم نے تو تمھارے باپ کا ولیمہ کھایا ہے۔" شاہد بھائی (شاہد احمد دہلوی) بھی کبھی موڈ میں ہوتے تو حامد حسین سے پوچھتے۔ مثل جو ہے اس کے کیا معنی ہیں۔ حامد حسین کچھ شرماتے کچھ کھسیاتے اور چپ ہو جاتے۔ دوسری بات جو ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی قسم کی تھی یہ تھی کہ مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا۔ شمس زبیری کا دعویٰ تھا کہ وہ جو مشہور رہے مرگئے لالہ جھمن لال۔ ٹھنڈی برف پلانے والے۔ تو ان لالہ جھمن لال کا تعلق بھی مراد آباد سے تھا۔ بہر حال یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ بات مردہ زندہ ہونے کی ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی جب ہنسنے ہنسانے کو جی چاہتا تو اکرام کو فون کیا جاتا۔ اردو کالج کے قریب والی دکان پر فون کرلیں۔ ضروری کام ہے خواجہ صاحب از راہ دوست پروری صوفی یا نسیم کو بھیج کر انھیں اطلاع کرا دیتے تھے تھوڑی دیر بعد اکرام نے فون کیا۔ شروع ہوئے۔ ہاں میاں خیر تو ہے۔ کیا بات ہو گئی۔ کیا ارجینٹ کام آن پڑا ہے۔ میں نے بڑی مسکینی سے کہا۔ "میاں اکرام سنا ہے مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا" یہ سننا تھا کہ اکرام کی ٹرٹری چلی۔ "ہاں میاں۔ ہاں۔ تم بھی اپنے دل میں حسرت نہ رکھو۔ کہہ لو۔ میاں! مردہ کیا زندہ ہو گا۔ اب تو خود ہمیں ہیں مردے سے بدتر۔ تم ایسوں کی دل لگی کا نشانہ بننے کے لیے رہ گئے ہیں۔ اس لیے بلایا تھا۔ کچھ تو اللہ کے غضب سے ڈرو۔" یہ کہہ کر اس وقت تو چلتے بنتے۔ پھر کسی وقت خود سے فون کر کے کہتے۔ دیکھو میاں۔ بزرگوں سے اس قسم کی باتیں نہیں کرتے اور وہ بھی پرائے دفتر میں" میں پھر چٹکی لیتا۔ "کون بزرگ۔ تم بزرگ کب سے ہو گئے۔ میاں ہوش کے ناخون لو۔ چلے ہو بڑے بزرگ بننے"

اکرام کو طول کلامی کا شوق تھا۔ دوستوں کو بھی افشانی گفسار سے خوب

خوب نوازتے رہتے تھے مگر چھوٹوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ہنسی مذاق اور طول کلامی برابر والوں کے ساتھ تھی۔ ان کے گھر پر فون کرو تو پھر تفصیل سے بات ہوتی۔ جی بھر کر بولتے اور دوسرے کی بات ذرا کم سنتے تھے۔

اکرام کی عمر عزیز کا بڑا حصہ سفر میں گزر گیا۔ صبح کو سعود آباد سے نکلنا اور لوکل میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ گزارنا اور شام کو لوکل ہی سے واپس جانا مگر وہ سفر کے اس تواتر سے کبھی دل تنگ نہیں ہوئے۔ زہے روانی عمرے کی در سفر گزرد۔ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے تھے دوستوں کو دیکھ کر کھل جاتے تھے۔ اہم اور ضروری باتیں بڑے رازدارنہ انداز میں کہتے کوئی غیر معمولی اطلاع ملتی تو فوراً ٹیلی فون کر کے بتاتے۔ کتابوں کے اشتہار اچھے لگتے تھے اخباری خبریں بھی لکھ لیتے تھے اور اور بڑے معقول صحافیانہ انداز سے لکھتے تھے۔ کتابت طباعت وغیرہ کے رموز سے پوری طرح باخبر تھے۔ دوسروں کو مشورے دیتے رہتے تھے مگر انھیں اپنی کسی صلاحیت کے بھرپور اظہار کا کبھی کوئی موقعہ نہیں ملا۔ اس پر بھی وہ خوش رہے اور چہکتے رہے۔

اکرام گاہے گاہے دوستوں سے خوش طبعی سے بھی پیش آتے تھے۔ دو چار دفعہ مجھے بھی اپنی خوش طبعی کا نشانہ بنایا۔ "میاں! تمھارے لیے ایک مضمون کا تراشہ رکھا تھا۔ تحقیقی مضمون ہے" اب دکان میں ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ کر اکھکوڑا۔ پھر بولے۔ "اس وقت مل نہیں رہا ہے۔ اگلی دفعہ آؤ گے تو ڈھونڈ کر نکال لوں گا۔" مگر وہ مضمون ہو تو ڈھونڈیں۔ محض خوش طبعی۔ ایک دن بڑی ترنگ میں تھے کہنے لگے۔ "ایک بڑی عمدہ ڈایری ہاتھ آئی ہے۔ میں نے تمھارے لیے رکھ لی ہے۔ دیکھو گے تو بھڑک جاؤ گے۔ گھر پر رکھی ہے۔ اب کی دفعہ آؤ گے تو دے دوں گا۔" میں نے فوراً کہا۔ "یہاں مت لانا۔ میں منگوالوں گا" اکرام یہ سن کر چپ ہو گئے۔ سوچا ہوگا۔ بھلا ایک ڈائری کی خاطر سعود آباد کون آئے گا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اسی دن ایک شاعر ٹکرا گئے جو اسی علاقے میں رہتے تھے۔ از راہ نیاز مندی کہنے لگے۔ "میرے لایق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے۔" میں نے کہا میاں سعود آباد میں اکرام احمد رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک ڈایری دینے کہی تھی۔ کہہ رہے تھے گھر پر رکھی ہے۔ لے لیجیے گا۔ وہ کہنے لگے "آپ بے فکر رہیں۔ میں لے آؤں گا۔" یہ بھلے آدمی جن کا نام بھی اکرام احمد تھا۔ دوسرے دن نماز فجر سے فارغ ہو کر اکرام کے

گھر پہنچ گیے۔ آواز دی اندر سے کسی نے پوچھا کون۔ جواب دیا۔ "اکرام احمد"۔
اکرام صاحب سو رہے تھے۔ ہڑ بڑا کر اُٹھے۔ باہر نکلے پوچھا۔ کون صاحب ہیں۔
انھوں نے کہا۔ اکرام صاحب ہوں۔ اسلم صاحب کی ڈائری لینے آیا ہوں۔ آپ
نے ان سے کہا تھا گھر پر رکھی ہے۔" ڈائری ہو تو ملے۔ وہ تو محض اکرام کی خوش
طبعی تھی۔ زچ ہو کر کہنے لگے "بھائی میں خود پہنچا دوں گا۔ آپ زحمت نا کریں۔"
وہ بھی ایک نمبر اُستاد پرست۔ اڑ گیے۔ کہنے لگے "میں تو روز یونیورسٹی جاتا ہی ہوں
۔ تکلیف کا ہے کی۔ استاد کی خدمت تو عین راحت ہے" بڑی مشکل سے اکرام نے
انھیں ٹالا وہ چلے تو آئے مگر یہ کہہ کر کہ میں کل پھر آؤں گا دوپہر کو انھوں نے کسی
سے ٹیلی فون کیا۔ 'میاں یہ کس کو بھیج دیا تھا۔ جانے رات کو نیند بھی آتی تھی کہ
نہیں۔ فجر کے وقت آ پہنچا۔" میں نے کہا۔ "بھائی ڈائری دے دی ہوتی قصہ ختم
ہو جاتا۔" بولے میاں! تم تو ہر بات کو بالکل سچ سمجھتے ہو بہت سی باتیں دل رکھنے اور
خوش کرنے کو بھی کہی جاتی ہیں۔ انھیں منع کر دو۔ ڈائری کہیں سے مل گئی تو پہنچا
دوں گا۔ اس کے بعد میں اکثر انھیں چھیڑتا۔ ہاں تو میاں اکرام! اکرام احمد کو
تمھارے گھر کب بھیجوں مگر اکرام دبنے والی اسامی نہیں تھے۔ ترکی بہ ترکی جواب
دیتے تھے۔

دنیا میں ایسے خوش نصیب بہت کم ہوتے ہیں جنھیں اپنے خوابوں کی تعبیر
اور محنت کا صلہ زندگی میں حاصل ہو جاتے ہیں ۔ محنت سب کرتے ہیں۔ محنت کیا
کرتے ہیں۔ جی جان سے گزر جاتے ہیں مگر ہوتا یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ نے اپنی
بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کر پاتے ہیں نہ اپنے خوابوں کی تعبیر پاتے ہیں نہ انھیں
محنت کا صلہ ملتا ہے۔ جینے کے ہاتھوں روز مرتے رہتے ہیں روز امید و بیم کا ایک نیا
جنم لیتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے تو ذہن میں ایک انجانا خوف اور کشمکش۔ شام ہوتی ہے تو
دل میں ایک موہوم خلش اندھیرے کا ڈر۔ اکرام بھی دنیا کے انھیں بے شمار
لوگوں میں تھے۔ روز کنواں کھودتے روز پانی پیتے۔ دوسرے لوگوں نے نل
لگوا لئے ان کا کنواں بھی آہستہ آہستہ خشک ہو گیا۔ کنواں خشک ہو جائے یا جاری
رہے اکرام کی موہنی شخصیت کا آب حیات ان کے دوستوں کے دلوں کو ہمیشہ تر
و تازہ رکھے گا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

منیب الرحمٰن

خانہ بدر

پیڑوں سے پرے سورج
اب ڈوب رہا ہے
آتی ہیں دھندلکوں سے خموشی کی صدائیں

جاتے ہوئے دن سے
ملتی ہیں گلے شام کی آسودہ فضائیں

ٹی وی پہ وہی خبریں
انساں کی جفائیں

ان کے لیے جو دور بدر ہو گئے گھر سے
پھر دیدۂ تر سے
اٹھتی ہیں دعائیں

۱۲/اپریل ۱۹۹۹ء

(منیب صاحب اردو کے ایک اہم شاعر ہی نہیں انسانی ہمت کی عمدہ مثال بھی ہیں۔ کچھ عرصے پہلے تک ان کی زندگی کا مقصد تحقیق و تصنیف تھا۔ حال ہی میں ان کی بینائی تقریباً ختم ہو گئی اور لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑنا پڑا۔ کوئی معمولی آدمی اتنی شدید تبدیلی کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتا۔ منیب صاحب سے مل کر آپ گمان بھی نہ ہوگا کہ انھیں کوئی افسوس ہے۔ اب پڑھنے کے بجائے ٹیپ پر انگریزی کے کلاسکس سنتے ہیں اور ٹیپ پر ہی اپنی شاعری ریکارڈ کرتے ہیں۔ اوپر لکھی ہوئی نظم مجھے فون پر لکھوائی اس تاکید کے ساتھ کہ کتاب نما میں چھپنے کے لیے بھیج دوں۔ حال ہی میں منیب الرحمٰن کا نیا شعری مجموعہ 'نقطۂ موہوم' دلی سے چھپا ہے۔ بیدار بخت)

ادا جعفری
43/8B Block 6
P/E C.H. Society
Karachi-75400

ہم نے خواب دیکھے تھے

وہ عجیب موسم تھا
ہم نے کورے کاغذ پر
اپنے خواب لکھے تھے
ہم نے خواب دیکھے تھے
ان کہی کہانی کے
حرف سب دعا سے تھے
درد کے بلاوے تھے
دل کی حکمرانی تھی
دور افق کناروں تک
رہگزر ہماری تھی
اَن گنت زمانوں میں
سانس لے رہے تھے ہم
اجنبی جزیروں میں
نقش پا ہمارے تھے

آنکھ میں تھی تحریریں
بے پناہ جلووں کی
چاندنی کے لہجے نے
ہم سے گفتگو کی تھی
زندگی کا ہر منظر / لمحہ لمحہ جاگا تھا
پہلی بار ہی ہم نے
زندگی کو دیکھا تھا
روز و شب کے میلے میں
خواب ہی تو سچے تھے

خواب ہی تو سچے ہیں
خوف ہے تو اتنا ہے
فاصلوں کے جنگلوں میں
خواب کھو بھی جاتے ہیں

مظفر حنفی
پروفیسر اقبال چیئر کلکتہ یونیورسٹی

غزل

چپ رہنے کی اس طرح سزا دی ہے کسی نے
بارود مرے دل میں دبادی ہے کسی نے

کیوں آنکھوں سے گرنے لگے بیساختہ آنسو
اندر کہیں زنجیر ہلا دی ہے کسی نے

پھر آج مرے سینے سے اٹھتا ہے دھواں سا
بستی میں کہیں آگ لگادی ہے کسی نے

ایسا ہے کہ دل بھول گیا دھڑکنیں دوچار
محسوس ہوا جیسے صدا دی ہے کسی نے

چنگاری تو ہر غنچے کی مٹھی میں دبی تھی
لایا کوئی خاشاک ' ہوا دی ہے کسی نے

ماتم سے لرزنے لگا غم خانۂ آفاق
لگتا ہے اب آواز اٹھادی ہے کسی نے

ہے ریگ رواں آج غضب ناک' مظفر
صحرا میں غزل تیری گھمادی ہے کسی نے

ڈاکٹر ستیہ پال آنند
367 Burnett Ave
Cambridge Qnt Nit IG6

دھرتی پران

یہ نظم کتھاساہتیہ کی قبیل سے ہے۔ عروض کے اعتبار سے صحیح ہے۔ صرف کہانی کے فارم ایٹ میں لکھی ہوئی ہے۔ ہندستان اور پاکستان کے جوہری بموں کے تناظر میں یہ نظم زیادہ پر معنی ہو جاتی ہے۔ لیکن شاعر نے مسئلے کو ایک وسیع آفاقی تناظر میں دیکھا ہے۔ پرانوں کی کتھاؤں کی طرح یہ بچوں کی سی آسان اور سہل ہے۔ (ادارہ)

● چاند کی بڑھیا دیکھ رہی تھی۔ پہلے ابھرے کئی سمندر۔ پھر کچھ اونچے نیچے پربت۔ کچھ ایسے بھی، جن کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ پھر بادل گھر گھر کر آئے۔ پانی کی بوچھاڑیں برسیں۔ ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ تو چین کا سانس لیا دھرتی نے۔ دریا، ندیاں 'نالے 'اس کے مٹ میلے آکار پہ لاکھوں شریانوں سے پھوٹ کے ابھرے۔

● دھرتی کے یہ رنگ بدلتے موسم بڑھیا دیکھ رہی تھی

● چاند کی بڑھیا اونگھ گئی کچھ دیر کو، لیکن جب جاگی تو اس نے دیکھا، دھرتی بالکل بدل گئی تھی۔ بڑھیا تو پہچان نہ پائی اس دھرتی کو، جس کی صورت روزانہ دیکھا کرتی تھی۔ عینک کے موٹے شیشوں کو پلو سے کچھ صاف کیا، تو دیکھا اس نے سبز گھنے جنگل، نیلے ساگر، ندیاں نالے، جھیلیں، برفانی تودے۔ جھر جھر کرتے فواروں سے ابل ابل کر گرتے جھرنے۔ گھاس، جھاڑیاں، دور تلک پھیلے میدانوں میں چرتے آزاد مویشی، پنکھ پکھیرو۔ اور دوپائے۔

● چونک گئی کچھ، کچھ گھبرائی چاند کی بڑھیا!

● یہ کیسی مخلوق تھی جس نے مل جل کر رہنا سیکھا تھا۔ گاؤں، بستیاں، کھیت، طویلے، نہریں، سڑکیں، بیل گاڑیاں، گھوڑے ہاتھی، بھیڑ بکریاں، جن کو انسانوں نے اپنے بس میں کر کے ان کو اپنی خدمت کا فن سکھلایا تھا۔

● چاند کی بڑھیا دیکھ رہی تھی۔ اک خط ابھرا دھرتی کے سینے پر، جس کو اس کے بیٹوں نے کھینچا

تھا۔ چین کی سرحد پر لمبی دیوار[1] جیسے وہ اپنی عینک کے شیشوں سے دھندلا دھندلا دیکھ رہی تھی۔

● یہ تو بڑھیا نے دیکھا' لیکن وہ بالکل دیکھ نہ پائی۔ وہ آڑی ترچھی' بے ہنگم سی ریکھائیں' جو دھرتی کے بیٹے مل کر سرحد سرحد کھینچ رہے تھے۔ دھرتی کے سینے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹ رہے تھے۔ یہ جاپان ہے' یہ امریکہ' یہ بھارت ہے' عرب دیس کی یہ سرحد ہے۔ یہ افریقہ' یہ یورپ ہے۔ مہادیپ' یہ بڑے بڑے ٹکڑے دھرتی کے' جن میں لاکھوں لوگ' قبیلے' نسل رنگ اور قومیت کی بنیادوں پر اپنی ماں کو بانٹ رہے تھے۔ مہادیپ سب اک جیسے تھے' لیکن ان کے اندر جو ریکھائیں تھیں' وہ سرحد سرحد دھرتی ماں کو کاٹ رہی تھیں۔

● چاند کی بڑھیا یہ سب بالکل دیکھ نہ پائی

● صدیاں گزریں' بڑھیا خوش تھی۔ دھرتی ماں کے بیٹے ماں کی گود میں پل کر بڑے ہوئے تھے۔ ماں کی گود ہری تھی' بیٹوں کی دنیا آباد تھی۔ اس میں چکا چوندھ تھی۔ بستی بستی بسی ہوئی تھی

● صدیاں گزریں' چاند کی بڑھیا روز زمیں کو' چاند کے کالے آسمان پر چڑھتے' اترتے دیکھ رہی تھی۔

● یہ کیسا طوفان تھا' جو اک چھتری کی مانند ہواہیں اونچا اٹھتا' کھمب کی صورت دھرتی کے سینے سے ابھرتا' شعلوں میں ملبوس کسی راون سا جلتا' میلوں اونچا' دور خلا تک اس کی جانب لپک رہا تھا!

● بڑھیا کچھ بھی سمجھ نہ پائی

● دھرتی کے بیٹوں نے کس دوزخ کے جن کو خوابیدہ جنات کی بوتل کے زنداں سے کھینچ نکالا؟

● ایک دو' دس بیس' سینکڑوں ایسے ہی طوفان اٹھے' تو بڑھیا نے گھبرا کر اپنا پہلو بدلا۔ آنکھیں میچیں۔ اپنی عینک کے شیشوں کو توڑ دیا۔ بھنا کر بولی۔ یہ ناخلف تو ماں کی عزت کو لوٹیں گے۔ اپنا گھر تاراج کریں گے۔ دھرتی جل کر آگ کا گولہ بن جائے گی۔ ایسی قیامت' یہ پرلے کا منظر میں کیسے دیکھوں گی؟ میں بڑھیا اندھی کی اندھی ہی اچھی ہوں۔ کبھی نہیں دیکھوں گی اب دھرتی کی جانب!

● چاند کی بڑھیا نے دھرتی کی سمت دیکھنا چھوڑ دیا ہے!

---

[1] چاند پر اترنے والے پہلے خلائی مسافر نیل آرمسٹرانگ نے کہا "میں زمین پر نسل آدم کا ساختہ صرف ایک نشان دیکھ سکتا ہوں۔ چین کی دیوار۔"

عبدالقوی ضیاء
13 E, HOLE STREET
LONDON E-174SD

میرے اندر کا سناٹا

میرے اندر کا سناٹا یہ مجھ سے روز کہتا ہے
ذرا سوچو، ذرا سوچو، ذرا دیکھو، ذرا پرکھو
نہ جانے کب یہ ہنگامہ تمھاری زیست کا خاموش ہو جائے
شکست و ریخت کی حد سے گزر کر
سنگ ریزوں میں بکھر جائے
یہ سانسیں آج دیپک راگ گاتی ہیں
نہ جانے کب یہ دیپک شام ہی سے بجھ کے رہ جائیں
یہ آہیں سوز میں ڈوبی ہوئی ٹھٹھری ہوئی سی
لبوں کو چیر کر باہر نکلنے کی ہوس میں
اندر اندر گھٹ کے رہ جائیں
یہ باتیں آج جو افسوں گری کے فن میں ماہر ہیں
نہ شاید وہ لکیں بھولے سے تم کو اتنی فرصت بھی
کہ اپنی بے بسی، بے چارگی، حرماں نصیبی کا
اگر کرنا بھی چاہو لاکھ شکوہ تم نہ کر پاؤ
کبھی نیلے گگن پر چاند مکھڑا اپنا دکھلائے
تو اس کی زرد ہو رنگت
کہ جیسے پیس کر ہلدی کوئی مکھڑے پہ مل ڈالے
کبھی گر چاندنی چھٹکے
تو سونی سیج پر سوکھے ہوئے گجروں کا میلہ ہو
کبھی سورج اگر نکلے
تو یہ محسوس ہو جیسے سوا نیزے پہ اٹکا ہو
یہ سب دیکھو اور پھر دیکھ کر خاموش ہو جاؤ

غزلیں

عاصی کاشمیری
Quality Food Store & Off Licenc
788, Woodborough Road
NOTTINGHAM
LONDON

طوفان بلاخیز کا منظر میرے اندر
بپھرا ہوا لگتا ہے سمندر میرے اندر

ہونے لگی ہے خواہش پرواز مجھے بھی
اگنے لگے ہیں جب سے کئی پر میرے اندر

میں جس کو گلا گھونٹ کے خود مار چکا ہوں
زندہ ہے ابھی شخص وہ مر کر میرے اندر

شاید نہ نکل پائے میری مورت سے پہلے
بیٹھا ہوا ہے جو بڑا شاعر میرے اندر

بوئے ہیں اسی نے ہی میرے دل میں اندھیرے
ہے قید جو اک نور کا پیکر میرے اندر

خنداں ہے میرے کاتب تقدیر پہ عاصی
بے چین ہے قسمت کا سکندر میرے اندر

کرامت بخاری
۲۳ا۱ین سوک سنٹر میلوڈی اسلام آباد

بوڑھا برگد بول رہا تھا
راز پرانے کھول رہا تھا

خواہش کا معصوم پرندہ
اڑنے کو پر تول رہا تھا

شاید کچھ خوشیاں آئی تھیں
دل دروازہ کھول رہا تھا

پر اسرار سکوت کے پیچھے
سارا منظر بول رہا تھا

دہر میں صرف وفا کا موسم
ہر رت میں انمول رہا تھا

درد کا لمحہ چپکے چپکے
دل کی نبض ٹٹول رہا تھا

بھگوان داس اعجاز
ڈی۔۵۱/۴ بجیت نگر، نئی دہلی ۸

دوہے

اپنے گھر کڑکی رہی، تیرے گھر تہوار
تو نے کس سادھو سے لی، داڑی مونچھ اُدھار

آدھے گھر میں بھکری، آدھے گھر پکوان
ایک ہی گھر میں ہو رہی، دو گھر کی پہچان

اک روٹی چھ تھالیاں، زیادہ بھوکا کون
کتا بیٹھا دوار پہ، ٹک ٹک دیکھے مون

انگ بکیں بازار میں، آنکھیں گردہ، خون
جیسے جان غریب کی، ہو دکان پرچون

افسر بھوک کے پیٹ کا، چون ملے دو پون
دھرم گنوایا جھوک نے، کھایا تیتر بھون

بھوک پیاس کی مار سے، مرتا روز غریب
خود تو جاگے رات بھر، سویا رہے نصیب

سوجھ بوجھ ایمان کو، لیا بھوک نے پھانس
سدھ بدھ کھو کر کھا رہی، مچھلی اپنا مانس

حیدر قریشی
Auf Dir Roos7
65795Katles Heim I
Germauy

غزل

دل کی حالت کچھ اضطراری ہے
بے قراری سی بے قراری ہے

کوئی تبدیلی چاہیے دل کو
کیسی یکسانیت سی طاری ہے

پہلے دیوی بنایا ہے تجھ کو
پھر تری آرتی اتاری ہے

ہم سزاوار وصل ٹھہرے ہیں
غلطی حالانکہ یہ تمھاری ہے

راس آتی نہیں خوشی کوئی
اپنی دکھ درد سے ہی یاری ہے

داؤ پر جو ہمیں لگا بیٹھا
وقت شاید کوئی جواری ہے

ہم نے بھوگا ہے صرف اسے حیدر
ہم نے کب زندگی گزاری ہے

رضیہ پروین ابر
سرائے بھاگل پور، بہار

غزل

آئینوں میں شکل کیا کردار بھی دیکھا کرو
اٹھ کے صبح روز تم اخبار بھی دیکھا کرو

پھول خوشبو رنگ موسم سب بدلنے لگ گئے
اب بدلتے یگ کے ہیں آثار بھی دیکھا کرو

کیوں دلوں کے درمیاں اب فاصلے بڑھنے لگے
کس نے کی ہے یہ کھڑی دیوار بھی دیکھا کرو

حادثوں کے سلسلے دل میں کبھی ٹھہرے نہیں
ہے غموں کا دل میں جو انبار بھی دیکھا کرو

فکر و فن ڈھلنے لگے ہیں اب نئے الفاظ میں
حرف کی خوشبو نہیں معیار بھی دیکھا کرو

ہو گی اب دنیا میں انساں کی نئی قربانیاں
بن رہی ہیں کس لیے تلوار بھی دیکھا کرو

ابر بدلے ہے مقدر کس طرح انساں میاں
ان کے ہاتھوں میں ہیں کیا اوزار بھی دیکھا کرو

آثر بدایونی
43, Pearl Apts, Dr. Ansari Road,
2nd Rabodi, Thane (W) – 400 601

غزل

خطائے دوست کا الزام میرے سر آیا
مگر وفا کا ' میں پرچم بلند کر آیا

جو اہل ظرف تھے راضی تری رضا پہ رہے
کبھی نہ حرف شکایت زبان پر آیا

نظر فریب مناظر ہزارہا تھے مگر
ہوئی جو شام تو میں سیدھا اپنے گھر آیا

پرانے لوگوں کو بدلے ہوئے مسائل کا
نہ کچھ مناسب و معقول حل نظر آیا

جمال عارض گلنار کا حصار تھا جو
میں اس حصار فسوں کا رستے گزر آیا

ضرورتیں تو کبھی ختم ہونے والی نہیں
یہ سوچ کر مرا دل بے بسی پہ بھر آیا

آثر نہ بھول سکا سادگی و سادہ دلی
مجھے یہ شخص عجب وضع کا نظر آیا

کشمیری لال ذاکر
ہریانہ اردو اکادمی ۵۱۶ سیکٹر ۱۲ پنچکولہ

غزل

چمکتی ریت پہ یارو، بکھر کے دیکھتے ہیں
کھلی فضاؤں میں سج کے، سنور کے، دیکھتے ہیں

بھنور میں ڈوبنے والا کبھی تو اُبھرے گا
ندی ہے گہری، تو اس میں اُتر کے دیکھتے ہیں

ہزار سال جیے پر نہ ہم پہ کھل پایا
وہ راز کیا تھا، چلو آج، مر کے دیکھتے ہیں

گھروں کو لوٹ کے آئے، شکستہ پر پنچھی
سمٹتے پھیلتے سائے، شجر کے دیکھتے ہیں

فصیلِ شہر کے باہر، سحر کے دیوانے
اندھیری رات میں، جلوے سحر کے دیکھتے ہیں

کریم مودھوی
کتاب گھر، حسین گنج، مودہا، راگول ہمیر پور

غزل

بیٹھنے والوں کو، محفل سے اٹھا کر لے گیا
ایک سیلاب جنوں سب کو بہا کر لے گیا

مہرباں ہے واقعی مجھ پر مری ماں کا وجود
پُر خطر راہوں سے جو مجھ کو بچا کر لے گیا

ہوش پہلے پھر تحمل اور پھر صبر و سکوں
دشمن جاں کچھ نہ کچھ ہر بار آ کر لے گیا

ہم تو دیوانے تھے لیکن وہ خرد مندوں کو بھی
آخر آخر اپنا دیوانہ بنا کر لے گیا

میں نہ تھا اس کی طرف مائل مگر وہ حیلہ ساز
سیکڑوں خواب حسیں، مجھ کو دکھا کر لے گیا

اس قدر تھا صابر و شاکر دلِ مضطر کریم
سیکڑوں غم اپنے پہلو میں چھپا کر لے گیا

عاصم شہواز شبلی
صدر شعبہ اردو، دارجلنگ گورنمنٹ کالج

رباعیات

تصویرِ وفا عزم کا ایماں ہیں ہم
تقدیرِ وطن روحِ گلستاں ہیں ہم
تم ہی سے ضیا تاب ہے راہِ ہستی
مشرق کے افق کا مہِ تاباں ہیں ہم

ہنستا ہوں نہ روتا ہوں عجب عالم ہے
جیتا ہوں نہ ہارا ہوں عجب عالم ہے
میں بارِ گراں زیست کا لیکن پھر بھی
کاندھوں پہ اٹھاتا ہوں عجب عالم ہے

ناکردہ گناہوں کی سزا دو مجھ کو
یا میری خطا کیا ہے بتادو مجھ کو
گر کچھ نہیں کرسکتے ہو اتنا تو کرو
ہوجائے قلم خشک دعا دو مجھ کو

رقصندہ نظاروں پہ مرا بھی حق ہے
تابندہ شراروں پہ مرا بھی حق ہے
میں نے بھی لہو اپنا دیا ہے اس کو
گلشن کی بہاروں پہ مرا بھی حق ہے

ہے قصرِ فریدوں کا نہ جامِ جم ہے
انعام کی خواہش نہ زیاں کا غم ہے
آشفتہ مزاجی میری فطرت لیکن
اخلاص کا خنجر ہو تو سر بھی خم ہے

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی
۱۴۱۷۰ اردو بازار، دہلی ۶

غزل

تمہارے پیار نے ہم کو بگاڑا بھی سنوارا بھی
یقین آیا کہ ہے تقدیر سے رشتہ ہمارا بھی

ہماری زندگی کیا ہے! سمندر آرزوؤں کا
بھنور ہے آزمائش کا امیدوں کا سہارا بھی

دعا کے بے اثر ہونے کا ہم شکوہ کریں کس سے
شبِ تاریک میں اس کو کبھی ہم نے پکارا بھی

اگر یہ بیوفائی ہے وفاداری ہے کیا؟ کہیے
ہمیں بھایا تھا طوفاں بھی پسند آیا کنارا بھی

ہمیں قدریں پیاری ہیں تمھیں نیرنگیِ عالم
سکوں چھینا ہے اس دل نے ہمارا بھی تمھارا بھی

یوسف ناظم

ابلیس کا معافی نامہ خالق کونین کے نام

خطہ ارض۔ حلقہ شرقی جنوری ۱۹۹۹ء

خدائے کون ومکان، رب ذوالجلال! ایک راندہ درگاہ کا سلام عقیدت قبول ہو اور ساتھ ہی آپ کی اس دنیا کے رواج کے مطابق نئے سال کی مبارکباد بھی ادا پیش کرتا ہوں کہ یہ موقع بھی ہے اور رسم دنیا بھی۔

مالک دوجہاں، میرا عریضہ پاکر آپ کو تعجب ضرور ہوگا لیکن یقین مانیے۔ میں اب تھک گیا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آدمیوں میں رہتے رہتے میں بھی انھی کی طرح بلڈ پریشر کا مریض ہوتا جارہا ہوں۔ بے انتہا پولیوشن کی وجہ سے دمہ کا الگ خطرہ ہے۔ راتوں میں اکثر خلجان کی کیفیت ہوتی ہے۔ مرغن غذائیں تو برسوں سے چھوٹ گئی ہیں لیکن خمیرہ مروارید، خشک وتر میوے اور قوت بخش دوائیں میری توانائیوں کو بحال کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ چیزیں شاید خالص ہیں بھی نہیں۔ یوں بھی اب میرے لیے کرنے کو کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ آپ کے خلیفۃ الارض میں مزید گمراہ ہونے کی گنجایش کہاں ہے۔ آپ تو سمیع و بصیر ہیں اس لیے میں کیا عرض کروں اور کیوں عرض کروں کہ سارے کرہ ارض پر کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں ہو رہا ہے۔ آپ نے مجھے اپنے تخلیق کردہ آدمی کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا بس یہی میری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ میں نے تو آپ کے حضور میں کھڑے ہو کر نظریں اٹھا کر آپ کو دیکھا نہیں لیکن آپ کا وہ حکم سن کر میں نے نظریں اٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا اور حضور! یقین فرمائیں پہلی ہی نظر کے ساتھ میرے ذہن میں ایک دانشمندانہ لہر دوڑ گئی۔ (دانشمندانہ لہر سے میری مراد برین ویو (Brain Wave) اور اسی لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اپنی تخلیق میں یعنی اس شخص میں جسے آپ نے خلیفۃ الارض بنانے کا فیصلہ کیا، کوئی نہ کوئی خامی رہ گئی ہے۔ مجھے اس کے ضمیر اور خمیر پر شبہ ہوا اور میرے

دل میں یہ خیال گذرا کہ اس میں برائی سے بچنے کا عزم اور مستقل مزاجی نہیں ہے۔ خادم نے اس جانب آپ کی توجہ مبذول کرانے کی بات سوچی بھی لیکن آپ کے جاہ وجلال اور عظمت کا رعب مجھ پر حسب معمول جاری اور طاری رہا۔ آپ کے حکم سے سر تابی کی البتہ مجھے اس لیے جرآت ہوئی کہ آخر کار میں معلم الملکوت کی معزز خدمت پر مامور تھا۔ فرشتے میرے طریقۂ تدریس سے خوش تھے اور میں ان کے حلقے میں بے حد مقبول تھا۔ جب صورت حال یہ ہو تو میں اپنے شاگردوں کی موجودگی میں ایک اجنبی مخلوق کے آگے کیسے سر جھکا دیتا۔ میں تو مثالی استاد تھا اور انعام واکرام کا مستحق۔ (آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج آپ کی دنیا میں وسطانی اور فوقانی مدارس کے معلموں کو توصیفی صداقت ناموں اور رقمی انعامات سے کس فیاضی کے ساتھ نوازا جاتا ہے جو ایک لحاظ سے مستحسن اور مفید اقدام ہے،اس پوزیشن میں رہتے ہوئے کیا یہ میرے لیے مناسب تھا کہ میں آپ کے خلیفۃ الارض کو سجدہ کرنے پر رضامند ہو جاتا۔ آپ نے اس وقت میری ہراسانی اور پریشانی پر غور نہیں فرمایا اور یک لخت مجھے معزول و معتوب قرار دے دیا۔ اب میں سوچتا ہوں تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس سے پہلے کس نے آپ کے حکم کو ٹالنے کی جرات کی تھی، میرا گستاخانہ عمل جو باغیانہ بھی تھا ظاہر ہے آپ کو غیظ و غضب پر آمادہ کرنے کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کی تخلیق کردہ شخصیت یعنی خلیفۃ الارض کو بھی چند دن بعد اسی صورت حال سے گزرنا پڑا اور موصوف کے لیے بھی وہی سزا تجویز ہوئی جو میرے مقدر میں تھی۔ میں چاہتا تو اس سانحے پر خوش ہو سکتا تھا لیکن دنیا میں موصوف کی آمد نے تو مجھے بے حد مصروف کر دیا۔ دن رات مجھے انھیں کے تعاقب میں گھومنا دوڑنا پڑا۔ (بعد میں موصوف میرے پیچھے پیچھے رہے اور میرے مشن کی تکمیل میں مصروف و مشغول رہے)۔ اللہ میاں مانا کہ آپ کی اس وسیع و عریض دنیا میں اب بھی کچھ بندے ایسے ہیں جن کے دل و دماغ میں خوف خدا اور یاد خدا دونوں موجزن ہیں لیکن اے خالق دو جہاں! اب میرے عناصر میں اعتدال نہیں رہا ہے اور میں مزید بار برداشت کرنے کا اپنے کو اہل نہیں پا رہا ہوں۔ ویسے بھی اگر کچھ دین دار اور پائدار لوگ اربوں کی آبادی میں باقی رہ بھی گئے تو میرے کیے ہوئے کاموں پر پانی تو نہیں پھر جاتا۔ چند حق گو اور راہ راست پر چلنے والوں کی 'اے خدا' دنیا کو واقعی ضرورت ہے۔ میں نے اپنی جسمانی حالت کی بنا پر تہیہ کر لیا ہے کہ اپنا دفتر سمیٹ لوں۔ میں

اپنے مشیروں ماتحتوں کو برطرف تو نہیں کروں گا اور نہ فی الحال اپنے عملے میں تخفیف کروں گا (یہاں اس عمل کو چھٹنی کرنا کہا جاتا ہے اور طرح طرح کے فارمولوں کی چمک دمک دکھلا کر عملے کو ہنسی خوشی رخصت ہونے کی ترغیب دلائی جاتی ہے جس میں قاضی الحاجات یعنی کرنسی کا بڑا دخل ہوتا ہے) کیونکہ دنیا میں کچھ نہ کچھ تو کام ہونا ہی ہے اس لیے میرے دفتر کی تالہ بندی (لاک آوٹ) صرف اس وقت ممکن ہوگی جب آپ میرے معذرت نامے پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے (یہ ہمدردانہ غور یہاں کے ہمدردانہ غور سے مختلف ہوگا یہاں تو یہ بیدردانہ ہوتا ہے) میں صرف یہ عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ سزا کے طویل ہونے کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ یہ میری تجویز نہیں استدعا ہے۔ میں آدمیوں کی طرح خودکشی جیسا فعل اور بے معنی حرکت کر نہیں سکتا۔ یہ میرے منصب کے خلاف ہے۔ میں نے ایک طویل مدت آپ کی خدمت کرنے میں گزاری ہے۔ فرشتوں کی تعلیم بمعہ تربیت میں اپنا سر کھپایا ہے۔ میں اسی خدمت گزاری کے واسطے سے آپ کے ترحم کو آواز دے رہا ہوں۔ آپ تو ارحم الرحمین ہیں۔ دنیا میں 'آدمیوں کی صحبت میں زندگی گزارنے کے بعد بھی میں نے ان افعال شنیعہ میں حصہ نہیں لیا ہے جس سے آپ کے خلیفہ کو بے حد شغف رہا ہے۔ کام کی یکرنگی (یعنی موناٹنسی) نے میرے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ میں بالکل اوب چکا ہوں۔ یہاں تو وہ لوگ جو سرکاری ملازمت کرتے ہیں چند ہی برسوں میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش کردیے جاتے ہیں (اس حسن خدمت کی نوعیت کیا ہے آپ دیکھ ہی رہے ہیں) میں تو یہ بھی نہیں چاہ رہا ہوں کہ مجھے اپنی سابقہ خدمت پر بحال کیا جائے۔ میں ری امپلائمنٹ کا طلب گار نہیں صرف آپ کی قربت کا خواستگار ہوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے پرسکون لمحات میں حارج نہیں ہوں گا۔ میرا قصور جو قصہ پارینہ ہو چکا ازراہ کرم معاف فرمایا جائے۔ میں دنیا میں ہر قسم کے طعنے سن چکا ہوں خاص طور پر ان اردو علاقے میں طرح طرح کے اشعار سے مجھے نوازا گیا۔ ایک شعر تو مجھے یاد بھی ہو گیا۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برسوں سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

اتنا بڑا طنز اور وہ بھی خالق ارض و سما کی خدمت میں مصروف رہنے پر۔ لیکن یہ ایک ہی شعر تھوڑے ہی ہے۔ ایسے کتنے زہریلے تیر میرے سینے میں پیوست ہو کر رہ

گئے ہیں۔ (اور خود ان آدمیوں نے جنھیں انسان بننا میسر نہیں ہوا کہاں کہاں سجدے نہیں فرمائے ہیں) ان کی داستان تو چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے۔ شرم ان کو مگر نہیں آتی۔ لیکن اپنی طرف سے ایک پیش کش یہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میرے اس غیر مشروط معافی نامے کو اگر آپ شرف قبولیت بخشیں اور آدمی کی ساری حرکتوں سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود مجھے از سر نو حکم دیں گے کہ میں اسے سجدہ کروں تو میں صرف اس لیے کہ آپ کی قربت نصیب ہوگی آپ کے حکم کی تعمیل میں سر جھکا دوں گا۔ میرا دل اس شخص کی طرف سے بہر حال صاف نہیں ہے اس کا اعتراف میں اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ آپ کس کے دل کا حال نہیں جانتے۔ میرا یہ عقیدہ بہر حال برقرار رہے گا کہ شیطان کو راہ راست پر لانا یا خود بخود اس کا صحیح راستے پر آجانا ممکن ہے لیکن آدمی کو ٹھیک کرنا ممکن نہیں ہے۔

میں شرمندہ ہوں کہ میں نے ایک مرتبہ یہ دعوا کر دیا تھا کہ دل یزداں میں کھٹکتا ہوں میں کانٹے کی طرح۔ وہ صرف وہم بلکہ وسوسۂ شیطانی تھا۔ آپ مجھے واپس بلا کر دیکھیے تو سہی۔، میں صدق دل سے عرض کر رہا ہوں کہ آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ۔ زیتون کے درختوں کا وہ لہلہانا میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ یقین فرمائیں کہ ویسے تو غنویت میں میری لاتعداد صدیاں گزر گئیں تھیں۔ یہ بیسویں صدی ناقابل برداشت تھی۔ اس کے ختم ہونے سے پہلے میری سزا کی منسوخی کا حکم صادر فرمادیں۔

آپ کا یہ دیرینہ خادم اپنے کو اس معذرت نامے کی نقول اپنی تمام ایجنسیوں کو بھیج رہا ہے تاکہ میرے شاگرد اور کارکن میرے منصوبے سے واقف رہیں اور اپنی آیندہ زندگی کے لیے کوئی لائحہ عمل سوچ لیں۔ انھیں بے روزگار رہنے کی عادت نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ بھی آدمیوں کی طرح لوٹ کھسوٹ (اکسٹارشن) کے ذریعے روپے کمائیں۔

پس نوشت: میری عرض یہ بھی ہے کہ آپ میرے عرق انفعال کے قطروں کو موتی سمجھ کر نہ چنیں لیکن اپنی شان کریمی کے صدقے مجھے معاف ضرور فرمادیں۔

آپ کا خادم
ابلیس المعروف بہ شیطان

مجتبیٰ حسین
۲۰۰ر انکور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج دہلی۔ ۲

اس دور میں ہوتے حاتم طائی

اگر ہوتے حاتم طائی اس دور میں تو کیا ہوتا؟۔ یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کسی استاد نے اپنے شاگرد سے پوچھا کہ آج شیکسپیئر زندہ ہوتا تو کیا ہوتا؟۔ اس پر شاگرد نے جواب دیا "ہوتا کیا۔ شیکسپیئر کی عمر ۴۰۰ برس کی ہو جاتی اور وہ اتنا ضعیف ہو چکا ہوتا کہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتا۔" ہم نہیں جانتے کہ حاتم طائی آج زندہ ہوتے تو ان کی عمر کتنے ہزار برس ہوتی لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ سیکڑوں برس تک سخاوت کا مظاہرہ کرنے کے بعد آج ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی بلکہ کیا عجب کہ وہ ہمیں کسی فٹ پاتھ پر کشکول تھامے کھڑے نظر آتے اور ہر راستہ چلنے والے کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دیکھا کر اس کی رگ سخاوت کو پھڑکانے کی کوشش کرتے۔

یہ اچھا ہی ہوا کہ حاتم طائی مر گئے۔ اگر وہ نہ مرتے تو آج تاریخ میں زندہ نہ رہتے۔ ذاتی طور پر ہمارا خیال یہ ہے کہ پیدا ہونا تو سب کو آتا ہے لیکن مناسب وقت پر مرنا ایک فن ہے اور اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے آدمی کو برسوں زندہ نہیں رہنا پڑتا۔ تاریخ عالم ایسی شخصیتوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جنھوں نے مر کر اپنی جان بچائی۔ سکندر اعظم اگر مناسب وقت پر نہ مرتا تو شاید "اعظم" نہ کہلاتا۔ اس کی زندگی کا راز یہی ہے کہ وہ مناسب وقت پر مر گیا بلکہ بعض تاریخی شخصیتیں تو ایسی بھی گزری ہیں جو صرف مرنے کے لیے پیدا ہوئی تھیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حاتم طائی مناسب وقت پر مر گئے۔ اگر وہ خدانخواستہ آج کے دور میں زندہ ہوتے تو انھیں اپنی سخاوت کو جاری رکھنے کے لیے نہ جانے کتنی دھاندلیاں کرنی پڑتیں۔ یہ ان کی خوش بختی تھی کہ وہ ایسے دور میں سخی کہلائے گئے جب دولت مندوں کا طبقہ اکثریت میں اور غریبوں کا طبقہ اقلیت میں تھا بلکہ خدا کے صرف چند ہی معزز بندوں کو غریب ہونے کا شرف عطا کیا جاتا تھا۔ اس دور میں فقیری ایک پیشہ

نہیں بلکہ منصب جلیلہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ فقر و فاقہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو آج کے دور میں عیش و عشرت کو حاصل ہے۔ لوگ غربت کے لیے ترستے تھے۔ بڑے بڑے حاکموں کا یہ حال تھا کہ فقیروں کے آگے پیچھے جھولیاں لٹکائے پھرتے تھے کہ "سائیں بابا تھوڑی سی غربت ہماری جھولی میں ڈال دو۔" خیرات دینے کے لیے فقیروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑنا پڑتا تھا۔ فقیروں کے غریب خانوں پر مال دار افراد جاکر صدائیں دیا کرتے تھے کہ "مائی باپ اللہ کے نام پر ہم سے خیرات لیجیے۔ پانچ دس پیسے جو کچھ بھی ہو ہم سے لیجیے۔ اللہ آپ کو اور بھی غربت عطا کرے گا، چار دنوں سے کسی کو بھی خیرات نہیں دی ہے۔ ہمارے حال پر رحم فرمائیے۔" اور فقیر حضرات اپنے گھروں کے اندر بیٹھے بیٹھے کہتے "میاں معاف کرو، ایک مہینہ پہلے ہی ہم نے کھانا کھایا تھا۔ اب کھانے کی ایسی تمنا بھی نہیں، کسی دوسرے فقیر کا گھر تلاش کرو۔" ظاہر ہے کہ جب ایسا دور ہو تو ایسے میں حاتم طائی بننا کون سا مشکل کام تھا۔ اگر حاتم طائی آج کے دور میں بھی حاتم طائی بر قرار رہ کر دکھاتے تو تب ہم ان کی سخاوت کے قائل ہو جاتے۔ اس دور میں تو لوگوں کی سخاوت کا یہ حال ہے کہ کسی کو پانچ پیسے بھی دیتے ہیں تو یوں سمجھتے ہیں کہ جیسے انھوں نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری ہے۔ اگر حاتم طائی آج زندہ ہوتے تو ایسے سخی حضرات کو لات مارنے کے لیے ان کی قبر کا سہارا نہ لینا پڑتا بلکہ جیتے جاگتے حاتم طائی کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتے۔ اسے آپ خود ستائی نہ سمجھیں تو عرض کریں ہم بھی جذبہ سخاوت میں حاتم طائی سے کچھ کم نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ خیرات دینے کے لیے بھی ہمیں کسی سے قرض مانگنا پڑتا ہے۔

بارہا ایسا ہوا کہ سڑک پر چلتے چلتے کسی بد حال فقیر پر ترس آگیا لیکن خیرات دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اچانک اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔ فقیر کی طرف حسرت بھری نظر ڈالی تو یوں محسوس ہوا کہ ہم فقیر کو نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ آئینہ میں اپنی شبیہ دیکھ رہے ہیں۔ اگر فقیر پر بہت زیادہ رحم آگیا تو ہم نے فوراً اپنے کسی دوست سے ایک پیسہ مانگا اور اسے جوں کا توں فقیر کی جھولی میں ڈال دیا۔ حالاں کہ اصولاً اس پیسہ کو خود اپنے پاس رکھنا چاہیے تھا۔ سخاوت کا ایسا اچھوتا جذبہ بھلا حاتم طائی کہاں سے لاتے۔ یہ تو ہمارا ہی دل گردہ ہے کہ ہم خیرات دینے کے لیے دوسروں سے خیرات مانگتے ہیں۔ حاتم طائی تو اس دور میں خیرات دیا کرتے تھے جب فقیروں کو ڈھونڈھنا پڑتا تھا۔ اب وہ دور آگیا ہے جب اچھے خاصے حاتم طائی پر بھی فقیر ہونے کا

گمان ہوتا ہے۔ اگر آپ خیرات دینے کے لیے اپنی جیب سے ایک سکّہ نکالتے ہیں تو فقیروں کا ایک جم غفیر آپ کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ ایک بار ہم نے ایک بوڑھے فقیر پر رحم کھا کر ایک پیسہ دینے کی کوشش کی تو اچانک کئی فقیر ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ہم ان سے بچنے کے لیے آگے بڑھے تو سارے فقیر ہمارے پیچھے ہو لیے۔ ہم ایک میل تک اسی طرح آگے چلتے رہے۔ فقیر نہ صرف ہمارے پیچھے چلتے رہے بلکہ اس غول میں نئے فقیر بھی شامل ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر بعد سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ہم فقیروں کے ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ کئی دوستوں نے پوچھا کہ یہ تمھیں فقیروں کے جلوس کی قیادت کرنے کی کیا سوجھی؟۔ اور ہم نے یہ پوچھ کر انھیں چپ کرا لیا کہ "کیا آپ بھی جلوس میں شریک تھے؟"

آپ ہی سوچیے کیا حاتم طائی ہماری طرح فقیروں کے جلوس کی قیادت کر سکتے تھے۔ خیرات دینا ایک الگ بات ہے، فقیروں کے جلوس کی قیادت کرنا بالکل ہی ایک الگ بات ہے۔ اس کے لیے آدمی میں صرف جذبہ سخاوت کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ آدمی کو تھوڑا سا بے شرم بھی ہونا پڑتا ہے۔ حاتم طائی جب سخاوت کے خزانے لٹایا کرتے تھے تو ان دنوں فقیروں کی اتنی قسمیں نہیں تھیں جتنی کہ آج ہیں بلکہ آج کا ہر فقیر بذات خود ایک نئی قسم کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر بھی ہم نے سہولت کی خاطر فقیروں کی چند قسمیں مقرر کی ہیں جیسے جلالی فقیر، کمالی فقیر، جمالی فقیر۔ خالی فقیر اور گالی فقیر۔ ان فقیروں کو ان کی صفات بابرکات کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے۔

جلالی فقیر آپ کے گھر خیرات مانگنے یوں آتا ہے جیسے وہ خیرات نہ مانگ رہا ہو بلکہ قرض وصول کر رہا ہو۔ کمالی فقیر کمالات کے ذریعہ بھیک مانگتا ہے۔ کمالات سے ہماری مراد یہ ہے کہ سڑک کے ایک فٹ پاتھ پر تو وہ اندھا ہونے کا کمال دکھاتا ہے لیکن دوسرے فٹ پاتھ پر پہنچتے ہی اس کی بینائی واپس آجاتی ہے اور وہ لنگڑا بن کر کمال دکھانے لگ جاتا ہے۔ اس طرح وہ لوگوں سے دو مرتبہ خیرات وصول کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اندھے کی حیثیت سے اور دوسری مرتبہ لنگڑے کی حیثیت سے۔ جمالی فقیر وہ ہوتا ہے جو ہٹا کٹا ہوتا ہے اور صرف جلوہ حسن کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ ایسے ہی ایک فقیر سے کسی خاتون نے پوچھا تھا کہ "تم کافی بھلے چنگے ہو پھر بھیک کیوں مانگتے ہو؟" اس پر جمالی فقیر نے کہا "محترمہ فقیری ہی دنیا کا وہ واحد پیشہ ہے جس میں کسی تعارف

کے بغیر کسی بھی خاتون سے بات چیت کی جا سکتی ہے" گویا ایسے فقیروں کا مسلک غالب کی زبان میں کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری

خالی فقیر وہ ہوتا ہے جو صرف فقیر ہوتا ہے اور فقیر کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا اور گالی فقیر اس فقیر کو کہتے ہیں جسے خیرات نہ دی جائے تو اچانک دعاؤں کا بینڈ تبدیل کر دیتا ہے اور آپ کو بے نقط گالیاں سنانے لگتا ہے۔ ظاہر ہے حاتم طائی اگر آج زندہ ہوتے تو فقیروں کی اتنی ساری قسموں کا حال جان کر حیران ہو جاتے اور انھیں خیرات کا باضابطہ سالانہ بجٹ بنانا پڑتا۔

بیچارے حاتم طائی تو سیدھے سادے معصوم سے آدمی تھے۔ انھیں کیا معلوم ہوتا کہ آج کے دور میں خیرات دینے کے لیے آدمی کو ہوشیار ہونا پڑتا ہے بلکہ اس کی تو باضابطہ ٹریننگ دی جانی چاہیے۔ اگر آدمی ہوشیار نہ ہو تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے فقیروں کو خیرات دے دیتا ہے جن کی مالی حیثیت خود اس سے بہتر ہوتی ہے۔ خود ہماری مثال لیجیے کہ ایک بار ہم نے ایک فقیر کو ٹالنے کے لیے یہ عذر پیش کیا کہ ہمارے پاس سو روپے کا کرنسی نوٹ ہے لہذا مجبوری ہے۔ یہ سنتے ہی اس فقیر نے اپنی جھولی سے ۹۹ روپے ۹۹ پیسے نکال کر ہمارے ہاتھ میں تھما دیے اور کہا لائیے سو روپے کا کرنسی نوٹ میرے حوالے کر دیجیے۔" اس وقت ہمیں جو شرمندگی ہوئی اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں کہ ہماری جیب میں اس وقت صرف دو پیسے رکھے تھے اور وہ بھی ہم نے محض اس لیے رکھ چھوڑے تھے کہ سائکل ٹیوب میں ہوا بھروائی جائے۔ چار و ناچار ہمیں اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ ہماری جیب میں سو روپے کے علاوہ اتفاق سے دو پیسے بھی موجود ہیں۔ یہ کہہ کر ہم نے دو پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور خود سائکل کو ہاتھ میں پکڑ کر گھر واپس پہنچے۔

ہمیں فقیروں کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔ سنیما گھر کے سامنے اگر ہم کسی فقیر کو دس پیسے دیتے ہیں تو وہ انٹرول میں ہمیں سنیما گھر کے ایسے درجہ میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہے جو اس درجے سے بلند ہوتا ہے جس میں ہم بیٹھے ہیں۔ اگر کسی ہوٹل کے باہر ہم کسی فقیر کو خیرات دیتے ہیں تو وہ تھوڑی دیر بعد ہمیں اسی ہوٹل میں ہم سے اچھی غذائیں کھاتا ہوا ملتا ہے۔

حاتم طائی کے ساتھ اگر ایسی صورتیں پیش آتیں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی

سخاوت سے فوراً دست بردار ہو جاتے۔

اگر حاتم طائی سچ مچ اس دور میں زندہ ہوتے تو ان کے گھر سے کوئی فقیر اپنی جھولی خالی نہ لے جانے کی بجائے اپنی بھری ہوئی جھولی بھی ان کے گھر خالی کر کے چلا جاتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک صبح ہمارے گھر میں ابھی چولھا نہیں جلا تھا کہ ایک فقیر ہمارے گھر پر آگیا۔ ہم نے فقیر کو اپنا سارا ماجرہ کہہ سنایا اور جب وہ واپس جانے لگا تو ہم نے چولھا جلانے کے لیے اس سے دیا سلائی کی ڈبیا بھی مانگ لی اور اسے اتنی ساری دعائیں دیں کہ وہ آبدیدہ ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے وہ ہمیشہ ہمارے گھر کو اوور ٹیک کر کے نکل جاتا ہے جیسے ہمارا گھر، گھر نہ ہو یتیم خانہ ہو۔ اگر حاتم طائی کو خدانخواستہ ایسی رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا تو کیا عجب کہ وہ خود بھی ہاتھ میں جھولی تھام کر سڑک پر نکل پڑتے۔ یہ تو ہماری ہی ہمت ہے کہ ہم نے آج تک اپنی جھولی کسی کے سامنے نہیں پھیلائی حالانکہ ہمیں اصولاً بہت پہلے یہ انداز اختیار کر لینا چاہیے تھا۔

شرف النہار
علی گڑھ

اردو اور مراٹھی ناول کے اولین معمار ایک تقابلی مطالعہ
(۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء)

اٹھارویں صدی کا زمانہ دنیا کی تمام ادبیات میں دور تراجم کے نام سے منسوب ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کا ابتدائی ادب ترجمہ شدہ فسانوں، قصوں، کہانیوں، حکایتوں اور سبق آموز بیانوں سے عبارت ہے۔ اگرچہ اسی دور میں محیر العقول واقعات مبالغہ آرا بیانات اور اساطیری کہانیوں نے قاری کے تئیں تفنن طبع کا سامان فراہم کیا، چنانچہ دیگر ادبیات کی طرح اردو اور مراٹھی ادب بھی داستانی فضا کی حکمرانی کے زیر اثر پروان چڑھا اور انسانی دل بستگی کا قایم مقام بنا۔ لیکن ہندستان میں انیسویں صدی کا دور، دور تغیر کی حیثیت رکھتا ہے جس سے زندگی کے تمام شعبہ جات نے متاثر ہو کر ایک نئی راہ اختیار کی اور ادب و فن نے بھی زندگی کا ساتھ دیتے ہوئے ان تبدیلیوں کو قبول کیا۔ یہ صورت حال صرف اردو، مراٹھی ادب تک محدود نہ تھی بلکہ ہندستان بھر کی تقریباً تمام زبانوں کے ادب نے بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کو قبول کیا اور داستانوں کی طلسمی دنیا اور تخیل و تصور کی نیرنگ خیالیوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے زندگی کی صداقتوں اور عصری حقائق کو قبول کیا۔

انگریزی حکومت کے زیر اثر زندگی گزارتے ہوئے انگریزی تہذیب اور فکر و فن سے متاثر ہونا ایک فطری عمل تھا چنانچہ علم و ادب کی دنیا میں ناول کا ورود اسی طرز عمل سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ بقول انور پاشا۔

> "دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب کی طرح ہندستانی زبانوں کے ادب میں بھی ناول کا آغاز ایک خاص اسٹیج میں آکر ہوا۔ چونکہ ہندستان میں وہ مخصوص سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی صورت حال نسبتاً تاخیر سے پیدا ہوئی جو ناول کو جنم دیتی ہے اور اس کے ارتقا کی سمتوں کا تعین

کرتی ہے ، مثلاً ناول کے آغاز وارتقا میں جن تاریخی
حالات کا فیصلہ کن رول ہوتا ہے ان میں اہم ہیں۔۔ مطبع
کی ایجاد و استعمال، تعلیم کی تبلیغ واشاعت، حقائق کا ادراک
وشعور اور عقلیت پسندی کی جانب بڑھتا ہوا رجحان ،
جمہوری اساس ورجحان کا فروغ، متوسط طبقہ کا ورود اور
فرد یا ذات کی اہمیت کا احساس وغیرہ ہندستان میں یہ حالات
انگریزی حکومت کے زیر اثر ہی پیدا ہوئے اس لیے
ہندستانی ادب میں ناول کا آغاز بھی انگریزی حکومت کے
قیام کے بعد ہی عمل میں آیا۔"[1]

اردو ناول نگاری میں اصلاح پسندی کے رجحان کے تحت ہم نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ موضوع آج بھی زیر بحث ہے کہ اردو کے پہلے ناول نگار نذیر نہیں لیکن ہم نے اس بحث کی تفصیل میں جائے بغیر اردو کا پہلا ناول "مراۃ العروس" ۱۸۶۹ء کو تسلیم کیا ہے۔ اس ناول میں اندرون خانہ کی زندگی، بالخصوص مسلم خواتین کی تعلیم و تربیت، اخلاقی محسن اور تہذیب و تمدن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ناول نگار نے پورے معاشرے کی اصلاح پر روشنی ڈالی ہے۔ ناول کی اہمیت وافادیت آصف فرخی کے اس بیان سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ

"کسی بھی ہندستانی مصنف نے اس سے پہلے بجائے نشاطی
اور مداح کے ، بات چیت اور گفت وشنید سے اصل
حقیقت کو ایسا ادا نہیں کیا۔"[2]

متذکرہ ناول کے علاوہ نذیر احمد متعدد ناولوں کے خالق ہیں مثلاً بنات النعش، توبتہ النصوح، ابن الوقت، فسانہ مبتلا، ایامی، رویائے صادقہ وغیرہ۔ یہ تمام ناول اصلاح حیاتکے رجحانات کے تحت لکھے گئے ہیں۔ نذیر احمد کے نقطۂ نظر کی وضاحت وقار عظیم کے مندرجہ ذیل قول سے اور بھی ہو جاتی ہے

"نذیر احمد اپنے ناولوں کے ذریعہ مسلمانوں کے متوسط

۱۔ ترقی پسند اردو ناول، انور پاشا، نئی دہلی ۱۹۹۰ء ص ۔ ۱۲ ۔ ۱۳

۲۔ اردو ناول کی داستان، سوغات، محمود ایاز، بنگلور ستمبر ۱۹۹۳ء، شمارہ ۵، ص ۱۱۶

طبقے کو ابھار کر معاشرتی، اخلاقی اور معاشی نقطۂ نظر سے اس
قابل بنانا چاہتے تھے کہ وہ مستقبل کا مقابلہ، یقین اور اعتماد
کے ساتھ کر سکیں۔" ۱؎

اگرچہ بیشتر ناقدین و محققین کا یہ اعتراض ہے کہ نذیر احمد کے پلاٹ ڈھیلے ڈھالے، واقعات میں بے ربطی اور کردار ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہیں لیکن باوجود اس کے ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ خواتین کی سماجی حیثیت میں تبدیلی، تعلیم کا اصلاحی مشن اور کامیاب زندگی کے نقوش کو ابھارنے میں نذیر احمد نے جس مناسب ترین پیکر تراشی اور قصہ گوئی سے کام لیا ہے وہ ناول کے ابتدائی دور کی تشکیل میں بلاشبہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مراٹھی ناول کی روایت، اردو ناول کی بہ نسبت زیادہ قدیم ہے۔ مراٹھی ادب کا اولین طبع زاد ناول باباپدمن جی کا "یمنا پریٹن" ۱۸۵۷ء ہے جس میں مسائل بیوگان کو موضوع بحث لاکر اس عہد میں بیوہ کی حیثیت اور اس کی بدحالی کو بیان کیا گیا ہے۔ مقصدیت کے اعتبار سے یہ ناول ہندو بیواؤں کو پست حالت سے نجات دلانا اور درپردہ عیسائیت کی تبلیغ ہے۔ یہ تبدیلی مراٹھی ادب میں مغربی ادب کے زیر اثر سامنے آئی۔ انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے اور متاثر ہونے کی مزید وضاحت کرشن شاستری چپلونکر کے استاد مور شاستری ساٹھے کے اس جملے سے یوں ہوتی ہے

"کندھے پر شال رکھ کر گھومنے میں اب پرتیشٹھا نہیں
رہی۔ اگر تم سمجھ دار ہو تو انگریزی پڑھو۔" ۲؎

متذکرہ خیال مہاراشٹر کے تعلیم یافتہ طبقے کی ذہنی بیداری کی جانب اشارہ کرتا ہے جس کی مثال مراٹھی کے پہلے ہی ناول سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس ناول کے مقصد اور کامیابی سے متعلق ڈاکٹر یونس اگاسکر کا یہ قول غور طلب ہے

"جہاں تک اس ناول (یمنا پرٹیٹن) کے مقصد کا تعلق
ہے یہ سوال ذہن میں سر اُٹھاتا ہے کہ باباپدمن جی کو
بیواؤں کی شادی ہی کو بنیاد بنا کر عیسائیت کی تبلیغ کا خیال

۱؎ داستان سے افسانے تک، سید وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۷ء، ص۔ ۱۷

۲؎ ہندی اور مراٹھی کے سماجک اپنیاسوں کا تلناتمک ادھیین، ڈاکٹر چندرکانت مہادیو واندیوڈیکر، ۱۹۶۹ء، ص۔ ۱۹

کیوں آیا؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس دور میں بیواؤں کی شادی ایک Burning Topic تھا۔ ناول کی اشاعت سے ایک سال قبل ۱۸۵۶ء میں بیواؤں کی شادی کا قانون پاس ہو چکا تھا جسے بابا پدمن جی نے "یمنا پریٹن" کے پہلے اڈیشن میں ضمیمے کے طور پر شامل بھی کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں عیسائیت کے پرچار کے لیے کسی ایسے تھیم کو میڈیم بنانا ضروری تھا جو عام طور پر لوگوں کی ہمدردی کا باعث بن سکے۔ بابا پدمن جی نے لوہا گرم جان کر اپنے مقصد کا ہتھوڑا اس پر چلا دیا اور انھیں اس میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔"[1]

مذکورہ ناول میں بابا پدمن جی نے مختلف واقعات بیوگان کو ایک کڑی میں پرو کر اس طرح بیان کیا ہے کہ جس نے تاثر کی چاشنی کو برقرار رکھتے ہوئے ناول نگار کے مقصد کو بھی پوری طرح واضح کیا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار نو عمر بیوہ یمنا ہے جس کی زبانی ناول نگار نے مختلف بیواؤں کے قصوں کو بیان کر کے اس وقت کی صورت حال سے آگاہ کیا ہے۔ یمنا چونکہ مشنری اسکول کی روشن خیال تعلیم یافتہ لڑکی ہے، وہ تصور کرتی ہے کہ ہندو مذہب جہاں اپنی رسومات کی قربان گاہ پر انسان کو زبردستی بلی چڑھا دیتا ہے وہاں عیسائی مذہب میں انسانی زندگی کے لیے فلاح کا راستہ ہے، گویا اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنے کی گنجایش ہے چنانچہ وہ عیسائی مذہب قبول کرتے ہوئے دوسری شادی کر لیتی ہے۔ اگرچہ ناول کی ساخت کو دیکھتے ہوئے بابا پدمن جی کے اس ناول کو بیشتر ناقدین نے یہ کہہ کر ٹیکسر ناول کے زمرے سے خارج کیا کہ یہ ناول "ناول کے اصول و ضوابط پر پورا نہیں اترتا۔" لیکن جب ہم اس کہانی میں تخیل سے زیادہ حقیقت، تفریح سے زیادہ مقصد، بندشِ خیال سے زیادہ آزادیٔ رائے جیسے نکتوں کو پاتے ہیں تو ہمیں یقیناً اسے اپنے دور کی حقیقت حال بیان کرنے والا ناول تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے اس خیال کو مزید تقویت دینے میں شری۔ ل۔ م۔ بھنگارے کا یہ بیان مددگار ثابت ہو سکتا ہے

"اگرچہ مختلف بیواؤں کے قصے الگ الگ ہیں لیکن ان

---

[1] مراٹھی ادب کا مطالعہ، ڈاکٹر یونس اگاسکر، نقش کوکن پبلی کیشن ممبئی ۱۹۷۶ء ص۔ ۱۱۲

سے یمنا پر ہونے والے اثرات کی وحدت کے پیش نظر
باباپدمن جی کی تخلیق کو ناول کہنا ہی مناسب ہوگا۔"[۱]

شری۔ل۔م۔ بھنگارے کے اس بیان کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں نذیر احمد کے ناول کی طرح مراٹھی ناول کے ابتدائی نقوش قایم کرنے میں یہ ناول مددگار ثابت ہوا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کا موضوع اصلاح نسواں ہے تو دوسرے کا موضوع ترقی نسواں۔ یعنی نذیر احمد نے اگر مسلم متوسط طبقے کی خواتین میں تعلیم کے ذریعہ یقین واعتماد پیدا کرنے کے جذبات کو ابھارا ہے تو باباپدمن جی نے ہندو معاشرے میں عورت کے حقوقِ آزادی اور خود اعتمادی کی بات کی ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان ابتدائی کوششوں میں ناول نگار سے واقعات وپلاٹ کی فنی ساخت یا ناول کے مکمل اجزائے ترکیبی کا مطالبہ کرنا دور از کار ہوگا۔

اردو کے ابتدائی ناول نگاروں میں نذیر احمد کے بعد دوسرا اہم نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ انھوں نے جاگیردارانہ نظام اور انسانی زندگی کے زوال کی داستان کو شوخی وظرافت اور مزاح کی رنگین فضا کو قایم رکھتے ہوئے "فسانہ آزاد" میں بڑے کھلنڈری انداز سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے نذیر احمد کی مذہبی، اخلاقی اور پند ونصائح کی تعلیم سے جداگانہ روش یعنی شوخی وظرافت اور بذلہ سنجی کا طرز بیان اختیار کرتے ہوئے لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت اور تہذیبی اقدار کی تصویر کشی میں واقعیت کی نہ داری کو قایم رکھا ہے اور زندگی کو جس وسعت وگہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کی تعریف پروفیسر وقار عظیم ان الفاظ میں کرتے ہیں

"سرشار اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے زندگی
کے پھیلاؤ اور اس کی گہرائی پر احاطہ کرنے کی طرح ڈالی اور
اردو ناول کو ایک ایسی روایت سے آشنا کیا جسے فنی عظمت کا
پیش خیمہ کہنا چاہیے۔"[۲]

سرشار نے "فسانہ آزاد" میں زندگی کی پیش کش میں بڑے اُبالی قسم کے کردار تراشے ہیں۔ یہ کردار جذباتی تنوع اور مزاح کی رنگارنگی سے اپنے عہد کے حقیقی

بحوالہ مراٹھی ادب کا مطالعہ، یونس اگاسکر، نقش کوکن پبلی کیشن ممبئی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۲

ترقی پسند اردو ناول، انور پاشا، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۱۸

حالات کو قاری پر اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خود کو اسی فضا و ماحول میں سانس لیتا محسوس کرتا ہے۔ انھوں نے رومانی فضا کو بر قرار رکھتے ہوئے اپنے عہد اور حالات کے نئے تقاضوں سے پیدا ہونے والی نئی اقدار کی کش مکش کو بڑے منفرد اسلوب میں پیش کیا ہے۔

فسانۂ آزاد کے علاوہ سیر کہسار، جامِ سرشار، کامنی اور خدائی فوجدار وغیرہ سرشار کے اہم ناول ہیں۔ ان کی تخیل پرستی، ذہنی استعداد اور اجتماعی زندگی سے ربط کو محسوس کرتے ہوئے ہی حسن عسکری کا کہنا یوں ہے۔

"ان کے (سرشار) تخیل میں وہ تندرستی اور توانائی تھی جو
اجتماعی زندگی میں شمولیت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔"[۱]

یمنا پریٹن کے بعد مراٹھی کا دوسرا اہم طبع زاد ناول لکشمن موریشور رہلیے کا "مکتامالا" ۱۸۶۱ء ہے جس نے رومانی فضا اور داستانی ماحول کی فضا بندی سے عجیب وغریب واقعات، معجزات، پُر تاثیر بیانات، مافوق الفطرت عناصر کے ذریعہ قارئین کے تئیں دلچسپی کا سامان فراہم کیا۔

"مکتامالا" کا بنیادی مقصد باطل پرستی کا خاتمہ اور حق کی فتح ہے۔ مصنف نے رومانی طرز میں اپنے قلم کے جوہر دکھاتے ہوئے کنبہ پروری اور بے رحمی کے سلوک کی مخالفت کی ہے اور رومانی انداز میں معاشرتی اصلاح کا پرچار کیا ہے۔، یہ ناول تخیل کی بلند پروازی اور واقعاتی پیش کش میں منطق سے زیادہ اتفاقات پر بھروسا کرنے والا ہے،

مصنف نے ناول کے قصے کو مزید پُر تاثیر بنانے کے لیے عشقیہ بیان، غیر فطری تفصیلات اور مافوق البشر کرداروں کو پیش کیا ہے۔

لکشمن جی اپنے عہد کے مشہور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے جید عالم بھی تھے۔ اپنی علمی قابلیت کی بنا پر انھوں نے اس ناول کے ہر باب کا آغاز بقول یونس اگاسکر "ایم۔ اسلم کے انداز میں سنسکرت کے اشعار یا اشلوک سے کیا ہے" یہ شعر یا اشلوک پورے باب کا نچوڑ پیش کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے، اور قاری پر باب میں آنے والے واقعات کی تفسیر گویا خلاصہ حال کی طرح ظاہر ہو جاتی ہے، اس طرح "مکتامالا" کی منفرد تکنک نے اپنے دور کے دیگر ناول نگاروں کے لیے راستہ

اردو ناول کی داستان (سوغات) محمود ایاز، شمارہ ۵ ص ۱۴۴

ہموار کرنے میں مدد کی ہے چنانچہ اس دور کے ناول کا اہم وصف مصنوعی زبان پُر تکلف بیان، جذبات نگاری کا اہتمام اور فطری تفصیلات کی شان تھا جو ہمیں سرشار کے "فسانہ آزاد" اور رسوا کی "ملکا مالا" دونوں میں یکساں طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

اردو کے ابتدائی ناول نگار مثلاً نذیر احمد اور سرشار کے بعد تیسرا اہم نام عبدالحلیم شرر کا ہے انھوں نے عہد گزشتہ کی پُر وقار تاریخ کو ناول کے فریم میں جڑ کر اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کیا ہے ان کے یہاں بھی اصلاحی اور مقصدی رجحان کا غلبہ ہے لیکن انھوں نے اپنے اصلاحی اور مقصدی نقطہ نظر کو عظمت رفتہ کی داستانیں دہرا کر اس وقت کے مسلمانوں کے دلوں سے افسردگی کو دور کرنے، جوش و ولولہ پیدا کرنے اور نئے تابندہ مستقبل کی راہیں استوار کرنے کی طرح ڈالی ہے۔

شرر کا پہلا ناول "ملک العزیز ورجینا" ۱۸۸۸ء میں رسالہ دلگداز میں قسط وار شائع ہوا۔ اس ناول کی انفرادیت اور کار آمد ہونے کا احساس خود ناول نگار کو بھی تھا چنانچہ ناول کے اختتام میں درج، شرر ہی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> "غالباً اردو میں یہ اپنی طرز کا پہلا ناول ہے۔ ہمارے مسلمان دوستوں نے اس ناول کو حد سے زیادہ پسند کیا۔ اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو از سر نو زندہ کر سکتے ہیں۔"[۱]

شرر نے اپنے فکر و خیال کو دوسروں تک پہنچانے کا موثر اور دل نشیں ذریعہ ناول تصور کیا انھوں نے اپنے ناولوں میں تاریخ کے ساتھ رومانیت اور تصوریت کے عناصر کو بھی شامل کیا۔ جس کے سبب واقعہ کی صداقت اور کرداروں کے غیر مانوس ہونے کا احساس قاری کو بُری طرح کھٹکتا ہے، باوجود اس کے۔

> "فنی سطح پر شرر، نذیر احمد، سرشار سے ممتاز نظر آتے ہیں، چونکہ وہ انگریزی ناول اور اس کی تکنیک سے اچھی واقفیت رکھتے تھے لہٰذا اپنے ناولوں میں بھی انھوں نے اس طرز اور تکنیک کو شعوری طور پر برتنے کی کوشش کی ہے، جس سے ان کے ناول، فنی اعتبار سے اپنے پیش رووں کے مقابلے میں بڑھے ہوئے ہیں۔"[۲]

۱۔ داستان سے افسانے تک، سید وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۷ء ص ۷۱

۲۔ ترقی پسند اردو ناول، علی احمد فاطمی، نئی دہلی ۱۹۹۰ء ص ۲۰

شرر نے اپنے تخیل و تصور کی رنگینی میں ڈوبی ہوئی دنیا کو واقعہ نگاری اور کردار نگاری کی سطح پر بڑے ربط و تسلسل اور منظم انداز میں پیش کیا ہے، ناول نگار کا یہ طرز اسلوب ہی قاری کو تاریخ کے پارینہ اوراق میں دلبستگی کا سامان فراہم کرتا ہے، اس ضمن میں ان کے قابل اعتبار و تاریخی و معاشرتی ناول "ملک العزیز ورجینا" کے علاوہ حسن انجلینا، شوقین ملکہ، منصور موہنا، عزیز مصر، فلورا فلورنڈا، فتح اندلس اور فلپانا وغیرہ ہیں، اگرچہ فنی لوازم سے آراستہ ان کا مشہور ناول "فردوسِ بریں" ہی ہے جو اردو ادب میں ان کی شناخت متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ بقول انور پاشا۔

"لیکن ان کا شاہکار ناول فردوس بریں ہی ہے جس میں ناول نگاری کے فنی لوازمات کو انتہائی سلیقے سے برتا گیا ہے۔"[۱]

شرر کی انفرادیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے تاریخی پس منظر میں اپنے نصب العین کو ظاہر کرتے ہوئے اپنے پیش رووں میں ایک الگ ڈگر اختیار کی اور اردو ادب میں "اسکاٹ" کے خطاب سے متعارف ہوئے۔

مراٹھی ادب میں تاریخی ناول کی حیثیت سے را۔ بھی۔ گنجی کر کا پہلا ناول "موچن گڑھ" ہے جو رسالہ وودھ گیان وستار میں ۱۸۶۷ سے قسط وار شائع ہوا اور ۱۸۷۱ میں ایک مکمل ناول کی شکل میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول مہاراشٹر کے تعلیم یافتہ طبقے کے مزاج کی تغیرپذیری کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ طبقہ وطنی آزادی اور ملکی ترقی کے ساتھ ادب میں بھی تبدیلی کا خواہش مند تھا، چنانچہ ان کا ذہن قومی تاریخ کے مطالعہ کی جانب روبہ مائل ہوا اور "موچن گڑھ ان کے انھیں خیالات کا سرچشمہ ہے۔ آ۔ کا۔ پریولکر کے خیال کے مطابق۔

""موچن گڑھ" ایک بہترین آئیڈیل تاریخی ناول ہے۔ موچن گڑھ میں جو کچھ خیالی باتیں ہیں وہ ایک خاص تاریخ کے 'زمانے سے منسوب ہیں۔ ناول میں تصوراتی کردار ہوتے ہوئے بھی شواجی کے عہد کے خاص حلقے کو بڑی خوبصورتی سے جیتا جاگتا پیش کیا ہے۔ مصنف نے وقت کے ساتھ کرداروں کو بھی گویا دوبارہ زندہ کیا ہے جس سے ان کی زندگی کے مقاصد سامنے آئے ہیں۔"[۲]

ترقی پسند اردو ناول، انور پاشا، نئی دہلی ۱۹۹۰ ص ۲۰

پروکشنہ زا۔ شری جوگ۔ (مراٹھی کادمبری) ڈاکٹر بھال چندر پھڑکے کا نتی نیشنل پرکاشن پونہ ۱۹۸۰ء ص ۲۰۸-۲۰۹۔

"موچن گڑھ" کے مطالعہ کے بعد یہ خیال گزرتا ہے کہ ضرور تجی کرکے زیر مطالعہ انگریزی کے مشہور تاریخی ناول نگار "سروالٹر اسکاٹ" کا ناول "کینل ورتھ" (Kenil Warth) رہا ہوگا جس میں تاریخ، مقام اور کردار، سب حقیقی پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے برخلاف تجی کرکے ناول میں زمانہ، تاریخ اور مقام تو حقیقی ہیں لیکن کردار کی پیش کش غیر حقیقی ہے، یعنی موچن گڑھ میں دور شیواجی کو پس منظر بنایا گیا۔ تاریخ مراٹھوں کی پیش کی گئی ہے۔ اور مقام مہاراشٹر کا ہے لیکن کردار تصوراتی دنیا سے مستعار ہیں۔ دراصل تجی کر اپنے وطن کی تاریخ لکھنے کے خواہش مند تھے اسی وجہ سے انھوں نے وودھ گیان وستار میں بیان کیا ہے کہ۔

اگرچہ یہ ناول، مراٹھی ناول کی تاریخ میں ناول نگار کا پہلا تجربہ ہونے کے سبب تاریخی بیان اور فنی شعور کے اعتبار سے کچھ خامیوں کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ باوجود اس کے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ تجی کرنے مراٹھی ناول نگاری میں ایک مسلمہ فن کی طرح ڈالی۔ ان کا دوسرا ناول بعنوان "گوداوری" ۱۸۷۲ء بھی ان کے اسی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کا یہ طرز بیان اس عہد کے قارئین میں اتنا مقبول ہوا کہ "ہمبیر راؤ۔ اور پتلی بائی ۱۸۷۳ء، زناواڑا ۱۸۸۹ء، شکشک ۱۸۸۳ء، چتوڑ گڑھ چاویڈھا، سمساجی، شِلاوتیہ، پانی پت چی موہم وغیرہ تاریخی ناول یک بعد دیگرے منظر عام پر آئے اور قاری کے ذوقِ جمال، ذہنی آسودگی اور معلومات میں اضافے کا باعث بنے۔ آج دور حاضر میں بھی مراٹھی قاری کو مہاراشٹر کی تاریخ اور اپنے علاقے کی معلومات حاصل کرنے میں بڑی دلچسپی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہاں تاریخی ناول آج بھی ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

الغرض اردو اور مراٹھی ناول کے ابتدائی دور کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دونوں ہی ادب میں موضوعات کی بنیاد پر یکسانیت ہے۔ دونوں ہی جگہ اصلاحی، رومانی اور تاریخی موضوعات کی کار فرمائی ہے، معاشرتی مسائل اور وقت کے عصری تقاضوں کو جس طرح اردو میں سب سے پہلے نذیر احمد نے محسوس کیا کم و بیش اسی طرح مراٹھی میں بابا پدمن جی نے ان مسائل کی پیش کش میں اپنے قلم کو تحریک دی۔ دونوں کے یہاں ابتدائی موضوع اصلاح پسندی کا رہا ہے۔ ایک نے اگر ترقی نسواں اور تعلیم نسواں کو موضوع بنایا ہے تو دوسرے نے اصلاح معاشرے پر زور دیا۔ گویا دونوں جگہ ابتدا میں خواتین کے مسائل کو زیر

بحث لایا گیا ہے۔

رومانی طرز اسلوب کو اختیار کر کے لکھے گئے ناولوں کا مقصد دونوں ناول نگاروں کے یہاں اپنے عہد کے ناگفتہ بہ حالات تھے۔ وہ ان حضرات کے ذہنی سکون کے خواہاں تھے جو اپنے زمانے کی نئی حکمت عملی اور سیاسی متعصبانہ برتاؤ کا شکار تھے چنانچہ ان کے ذہنی سکون اور تفریح طبع کا سامان فراہم کرنے کے لیے جو طرز اسلوب اختیار کیا گیا وہ رومانی تھا اور مبالغہ آرا بیانات، محیّر العقل واقعات اور مافوق الفطرت عناصر کی پیش کش اس عہد کے لکھنے والوں کا شیوۂ گفتار بن گیا۔

تاریخی موضوع کی پیش کش میں اردو ناول نگار شرر نے جہاں اپنی بات کہنے کے لیے اسلامی تاریخ کو بنیاد بنا کر بجھے ہوئے دلوں اور پژمردہ حوصلوں کو پھر سے توانائی بخشنے کی کوشش کی ہے وہاں مراٹھی ناول نگار آپٹے نے مہاراشٹر کے پُر شکوہ بادشاہوں کی شجاعت و بہادری کی داستان، معرکتہ الآرا کارناموں کو قومی تاریخ کے پس منظر میں پیش کرتے ہوئے اپنے عہد کے نوجوانوں کے دلوں سے وطنی آزادی اور ملکی ترقی کے جذبات کو ابھارا ہے کیونکہ آپٹے کا مقصد موجودہ نسل میں جوش وجذبہ پیدا کرنا ہے اور وہ کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

اس مختصر جائزے سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں رجحانات کی پیش کش میں زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو مراٹھی ناول نگار اردو ناول نگار سے زیادہ آگے ہے۔ وہ فکر و خیال اور ہیئت و اسلوب میں بھی اردو ناول نگار سے آگے نظر آتا ہے۔ مثلاً جن مسائل پر مراٹھی ناول نگار نے ۱۸۵۷ء میں لکھ رہا تھا ان پر تقریباً بارہ، پندرہ برس بعد قلم اٹھایا گیا۔ اس تاخیر کی حقیقی وجہ ہمارے یہاں تعلیم کا فقدان تھا لہذا نذیر احمد نے ۱۸۶۹ء میں سب سے پہلے خواتین کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و تمدن کے زیر فکر جو ناول تخلیق کیا وہ مرأۃ العروس تھا۔ وہ جانتے تھے کہ تعلیم کا حصول ہی انسان میں روشن خیالی کے جذبات پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی ان کی ذہنی ترقی اور آزاد خیالی کی بات کی جا سکتی ہے جب کہ مراٹھی ناول نگار کے درپیش ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں تینوں رجحانات کی پیش کش پہلے سامنے آئی جس سے ان کی روشن خیالی اور فکری بیداری بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

شاغل ادیب ایم۔اے
۴-۹-۴۳/۳ ,۳-۳-۱ا، زیب منزل
مشیر آباد حیدرآباد-۴۸

(ریڈیائی فیچر)

پروین شاکر
شخصیت وفن

راوی۔ پروین شاکر ----- ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء

راویہ ہاں! ۲۶----۱۹۹۴ء اردو شعر وادب کے لیے نہایت ہی منحوس ثابت ہوا۔ اس دن اردو شاعری کا "ماہ تمام" پروین شاکر - آسمان ادب سے اچانک او جھل ہو گیا۔

ایک آواز۔ لیکن اس کی یاد کا چاند ہمارے ذہنوں میں آج بھی جگمگا رہا ہے۔ اس کے شعروں کی روشنی اب بھی ہمارے دلوں کو اُجال رہی ہے۔ اس نے خود بھی کہا تھا۔

مر بھی جاؤں تو کہاں، لوگ بھلائیں گے مجھے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

راوی۔ اردو شاعری کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہماری صدیوں پرانی شاعری کی روایت میں خواتین کی حصہ داری نہیں کے برابر ہے۔ قدیم تذکروں میں شاعرات کے نام کہیں کہیں ملتے ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ ماضی میں مشرقی آداب واطوار کے زیر اثر عورتوں کو شاعری اور دیگر فنون لطیفہ سے الگ ہی رکھا جاتا تھا۔

راویہ۔ ہاں! سماجی اور تہذیبی ضابطوں کے تحت خواتین بھی شاعری میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھیں اور کہیں کہیں کسی نے کچھ جرأت کی بھی تو اسے پردۂ راز ہی میں رکھا گیا۔

راوی۔ یہ سچ ہے کہ مغل شہزادی زیب النسا مخفی سے بیگم بھوپال تک ایسے کئی نام ہیں جو کھل کر سامنے نہیں آئے۔ اردو شاعری کی اول خاتون شاعر شہنشاہ اورنگ زیب کی دختر زیب النساء مخفی ۔

راویہ۔ لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں ان گنت معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی انقلابات اور تحریکات کے زیر اثر خواتین کے ایک بڑے گروہ نے قدیم معاشرتی اور تہذیبی بندشوں کی مخالفت کرتے ہوئے کھلم کھلا شاعر ہونے کا اعلان کیا۔

راویہ۔ اردو شاعرات کی اس جراءت و حوصلہ سے متاثر ہو کر ڈاکٹر علی احمد فاطمی کہتے ہیں "کسے خبر تھی کہ اردو شاعری کا یہ معشوق اس طرح اچانک اٹھ کھڑا ہوگا اور نہ صرف عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرے گا بلکہ مردوں کو عشق و محبت کے طریقے بھی سکھائے گا۔"

راویہ۔ جاگیردارانہ نظام میں شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں فنون لطیفہ بالخصوص رقص، موسیقی اور شاعری سے اپنے آپ کو دور ہی رکھتی تھیں۔ البتہ طوائفیں فنون لطیفہ کے ہر شعبے میں ماہر تھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں تعلیم نسواں اور عورتوں کی آزادی کی تحریک کے زیر اثر عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش چلنے کی جراءت کرنے لگیں۔

راویہ۔ بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں ادب کے میدان میں جن خواتین کے نام ملتے ہیں ان میں نذر سجاد حیدر، حجاب اسمٰعیل، رشید جہاں، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، قرۃالعین حیدر وغیرہ شامل ہیں۔

راویہ۔ لیکن اس دور تک میں بھی شاعری عورتوں کے لیے شجر ممنوعہ ہی رہی۔ البتہ تیسرے دہے کے بعد ادا جعفری پہلی خاتون شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں نسائی مزاج برتا۔

راویہ۔ خواتین میں ایسے فنکار کم ہیں جن کی تحریروں میں عورت کے کرب کا اظہار ہوتا ہے۔ شاعری کے میدان میں عورتیں تو دکھائی دیتی ہیں لیکن عورتوں کی شاعری کم پڑھنے میں آئی ہے۔

راویہ۔ اپنے مخصوص نسائی مزاج حسیت اور لہجے کے اعتبار سے کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر اور سارہ شگفتہ کے ساتھ شائستہ یوسف کا نام بھی ملتا ہے۔ یہ شاعرات عورت اور مرد کے ازلی و ابدی رشتے کو منفرد انداز میں پیش کرنے کے ساتھ شاعرانہ ہنر سے بھی واقفیت رکھتی تھیں۔

ایک آواز۔ بیسویں صدی میں آزادی کے بعد اس کے دوسرے نصف میں اردو

شاعرات نے اپنے مختلف شعری رویوں اور نسائی لہجوں سے اردو دنیا کو پوری طرح متوجہ کیا اور بلاشبہ اس تبدیلی کا سبب پروین شاکر ہے۔

راوی۔ پروین شاکر نے اردو شاعری کی روایت کو ایک نئی تاریخ دی۔ ماضی میں نسوانی شاعری کی موجد شہزادی زیب النساء مخفی رہی ہے اور دور جدید میں اس کی شہزادی پروین شاکر ہے۔

ایک شہزادی تھی۔ اس پر شاعری کی دیوی Muse مہربان تھی اور اس پر محبت اور عورت کا علامت ہاتھ سایہ بھی نچھاور تھا۔

پروین شاکر نے اپنی پیشرو شاعرات سے نہ صرف اکتساب کیا بلکہ ان سے آگے نکل جانے میں اپنی انفرادیت کے نت نئے افق بھی روشن کیے۔"

ایک آواز۔ پروین شاکر ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ کو ثاقب حسین شاکر کے گھر پیدا ہوئیں۔ رضویہ گرلز کالج سے ۱۹۶۶ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ سرسید گرلز کالج سے ۱۹۶۸ میں ایف اے اور ۱۹۷۱ء میں بی۔ اے کیا۔ بعد ازاں جامعہ کراچی سے انگریزی ادبیات اور لسانیات میں ایم اے کیا۔

راوی۔ انھوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ذرائع ابلاغ کا کردار کے موضوع پر ڈاکٹریٹ بھی کی اور ہارورڈ یونیورسٹی سے بینک ایڈ منسٹریشن میں ایم اے بھی کیا تھا۔

راویہ۔ ملازمت کے اعتبار سے پروین شاکر ابتدا میں درس و تدریس سے منسلک رہیں۔ اور ۹ سال تک عبداللہ گرلز کالج میں لکچرر کی خدمات انجام دیتی رہیں۔ بعد ازاں سول سروس میں امتیازی کامیابی کے بعد محکمہ کسٹمز سے وابستہ ہو گئیں۔ ۱۹۸۶ء میں وہ سیکنڈ سکریٹری سی بی آر، اسلام آباد متعین کی گئیں۔

ایک آواز۔ پروین شاکر کی شادی ۱۹۷۶ میں ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی۔ ڈاکٹر نصیر علی خوش شکل اور بظاہر تمام تر خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ پاکستان آرمی کور سے منسلک تھے اور اپنی خدمات کے سلسلے میں ہمیشہ باہر رہا کرتے تھے۔

راوی۔ پروین شاکر کی زندگی اور سوچ کا انداز نیا تھا مگر اس کی سسرال روایتی انداز کی شدت سے پرستار تھی۔ پروین شاکر نے اپنے آپ کو سسرال کے روایتی ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی، مگر ناکام۔

راویہ۔ سسرال میں پروین شاکر کو نہایت ہی دردناک حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں

یہاں ہر صبح ایک نئے کرب کا شکار ہونا پڑتا تھا تو ہر شام ان پر آفتوں کی قیامت ٹوٹتی تھی۔ دن بدن حالات بگڑتے ہی گئے اور ڈاکٹر نصیر نے ۱۹۸۷ء میں انھیں طلاق دے دی۔ پروین شاکر کے ڈاکٹر نصیر علی سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام مراد ہے۔

ایک آواز۔ پروین شاکر نہایت ہی حساس تھیں۔ اس حادثے نے انھیں بے حد رسوا کیا۔

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

راوی۔ ڈاکٹر نصیر علی نے دوسری شادی کر لی مگر پروین شاکر کا کمال ضبط دیکھیے

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے دلہن تری سجاؤں گی

راویہ۔ مگر عورت عورت ہی ہوتی ہے۔ اس کی غیرت نسوانیت کے لبوں پر یہ بول جگمگا اٹھے۔

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آجاتا

ایک آواز۔ پروین شاکر عصر حاضر کی اردو شاعرات میں ایک اہم و نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے ایک اثنا عشری گھرانے میں آنکھ کھولی۔ شعری روایت میں اثنا عشری گھرانے میں آنکھ کھولنے والی بچی ہوش سنبھالنے سے پہلے شعر کے آہنگ کو جزو سماعت بنا چکی ہوتی ہے۔ اس گھرانے میں انیس کے اشعار روز مرہ ہو جاتے ہیں اور سوچنے بولنے میں اکثر سادہ لفظ آہنگ کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔

راویہ۔ زبان کی جو تہذیب ہمیں اکثر کرنا پڑتی ہے وہ پروین شاکر کو ورثہ میں ملی۔ ان کی شاعری میں ان کے خاندانی اثرات شدت سے موجود ہیں۔

راویہ۔ پروین شاکر کا گھرانہ علمی و ادبی روایتوں کے ساتھ مذہبی ماحول بھی رکھتا تھا۔ ان کے ذہن میں مذہب ہر وقت موجود رہتا تھا مگر انھوں نے اپنی فکر کو جو پیکر عطا کیا اور اپنی ندرت طرازی سے اس میں جو رنگ بھرا وہ قابل قدر ہے۔

ایک آواز۔ پروین شاکر کا قاری یا سامع یہ غلطی نہیں محسوس کرتا کہ وہ اپنی

شاعری میں اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کر رہی ہیں۔

راویہ۔ پروین شاکر کی غزلوں میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں واقعہ کربلا کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ رثائی ادب اپنی ایک خاص شناخت رکھتا ہے مگر دورِ حاضر میں یہ شہادت حسینؓ کے تاریخی حوالے سے ہٹ کر معنیاتی تقاضوں کے تحت عام اردو شاعری میں ایک الگ مقام پا رہا ہے۔

ایک آواز۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دورِ جدید کی شاعری میں کربلا کا واقعہ جن نئے مضامین و مضمرات میں پیش کیا جا رہا ہے، اسے رثائی ادب نہیں کہا جا سکتا مگر اس میں تو تہ در تہ استعاراتی اور علامتی توسیع کی بنا پر اسے عالمگیر آفاقی معنویت نصیب ہو رہی ہے جس کا اطلاق تمام انسانی برادری اور عہد حاضرہ کی تمام ترحق و صداقت کی جد و جہد پر ہوتا ہے۔

راوی۔ غزل اور کربلا کے مصنف ضمیر حسن نے اپنی کتاب میں پروین شاکر کے ان گنت اشعار نقل کیے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی اپنی تصنیف کربلا بطور شعری استعارہ میں پروین شاکر کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

راویہ۔

پابہ گِل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون
دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پہ پہلے تیر کون
کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے درِ خیمہ پہ اب تک صورتِ تصویر کون
میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری پھر دے گیا تشہیر کون

ایک آواز۔ نثر ذات کو چھپانے کا نام ہے اور شعر کی کل کائنات شاعر کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اپنی شاعری میں پروین شاکر نے کربلا کے حوالے سے اپنی ذات کو نہایت شاعرانہ و فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

اسیرِ کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہے پھر زنجیر بھاری
آئیں کے ساتھیوں کی پہنیں گے گلے میں مالا
اہلِ کوفہ کو نئی شہر پناہیں دیں گے

ردا چھنی مرے سر سے مگر میں کہا کہتی
کٹا ہوا تو نہ تھا ہاتھ میرے بھائی کا
خیمہ سے دور شام ڈھلے اجنبی جگہ نکلی ہوں کس کی کھوج میں بے وقت سر کھلے
پیہروں کی تشنگی پہ بھی ثابت قدم رہوں
دشت بلا میں روح مجھے کربلائی دے

مگر انھیں شہرت ان کی غزلوں سے ہی ملی۔ ان کی نظموں سے متعلق ڈاکٹر ناظم جعفری لکھتے ہیں " پروین شاکر انگریزی ادب کی پوسٹ گریجویٹ تھیں اور انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز انگریزی لیکچرر کی حیثیت سے کیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ انگریزی سے زیادہ متاثر تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مجموعوں میں انگریزی طرز کی نظمیں بہ کثرت موجود ہیں انھوں نے اپنی بیشتر نظموں کے عنوانات انگریزی میں رکھے ہیں

راویہ پروین شاکر کی نظموں میں ایک طلسماتی فضا ملتی ہے۔ ان نظموں میں انھوں نے قدیم داستانوں کا سحر تازہ کیا ہے۔ انھوں نے صرف مشرقی داستانوں کو ہی اپنے تجربات کا حصہ نہیں بنایا بلکہ مغربی لوک داستانیں بھی ان کی تخلیقی تجربات کا ایک جز ہیں۔

ایک آواز۔ ہماری قدیم شاعری کے استعارے جو فارسی ادب سے مستعار ہیں، آج بھی نئی معنویت کے ساتھ موجود ہیں۔ پروین شاکر کے پاس مشرق و مغرب کے استعاروں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہ امتزاج عہد حاضر کی نسائی ذہانت کا ایک حصہ بھی ہے۔

راوی: پروین شاکر کے یہاں طلسماتی دنیا کا مثالی پیکر ملتا ہے جو جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ایک ویران محل میں طلسماتی نیند میں محو کسی شہزادے کی آمد کا منتظر ہے۔ وہ آکر اسے نیند کے حصار سے آزاد کرے گا۔

راویہ۔ پروین شاکر کی طرح کسی اور خاتون شاعر کے یہاں برق رفتار مشکی رہوار اور اس کے نسائی راکب کا تذکرہ نہیں ملتا۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ وہ بھی کسی گم شدہ نسل کی شہزادی ہے جو حال کی چو مکھی لڑنے کو مقرر کی گئی ہے مگر اپنے ماضی کے رشتہ کو نہیں توڑا۔

ایک آواز۔ پروین شاکر کی نظموں میں جنگل کا استعارہ ایک مستقل صورت لیے ہوئے ہے۔ یہ جنگل شہر ذات کے راستے کو بھی مسدود کرتا ہے اور اپنی سرزمین پر

محیط بھی ہے۔

راوی۔ پروین شاکر کی نظموں میں انفرادی اور اجتماعی دونوں احساسات کی عکاسی ملتی ہے۔ انھیں سنسار میں ان گنت حادثوں کے طوفان سے گزرنا پڑا۔ ان پر چاروں سمت سے یلغار کا سامنا رہا۔ اس طرح زمانے نے انھیں تند لہجہ، تمکنت حسب ضرورت وبقدر ذائقہ سخت گیری سب کچھ سکھایا۔

راویہ۔ اپنی نظموں میں پروین شاکر ایک سماجی مفاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی نظمیں اک ہجوم قلق لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ناانصافی جبر و منافقت اور آمریت کے خلاف اعلان جہاد ملتا ہے۔

راوی۔ پروین شاکر کا احتجاج دو سطحوں پر ملتا ہے۔ ایک معاشرہ کے عام فرد کے حوالے سے اور دوسرے عورت کی زندگی کے حوالے سے شبہ، ظل الٰہی۔ پر وبلمز، کنیادان، اور اسٹینوگرافران کی نظموں کی اچھی مثالیں ہیں۔

راویہ۔ ان کی نظمیں ایک کفارہ کا روپ رکھتی ہیں جسے وہ اپنے تخلیقی جوہر کی مطابقت اور سرشاری کے صدقہ میں پیش کرنا چاہتی ہیں۔ حقیقت نگاری، حالات کی سنگینی اور تلخی اوقات کے حوالے سے ان کی نظمیں اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

ایک آواز۔ پروین شاکر کا شعری سفر نئے شعور کے برملا اظہار سے عبارت ہے۔ انھوں نے جہاں ایک طرف عورتوں کی نیم جاں حسرتوں، ٹوٹتے بکھرتے خوابوں اور گمشدہ ارمانوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے وہیں دوسری طرف مسمار ہوتی ہوئی تہذیب اور انسانی قدروں اور اس کے ملبے پر چار و ناچار کھڑے فرد کا ماتم بھی کیا ہے۔

راوی۔ پروین شاکر نسائی جذبات واحساسات کا والہانہ اور بے ساختہ اظہار کرتی ہیں۔ ان کے یہاں اردو شاعری کی روایتی عورت کے برخلاف ماڈرن عورت ملتی ہے جو ایک ماں، ایک بہن اور ایک بیوی ہونے کے ساتھ آج کی زندگی کے بعض دوسرے محاذوں پر مردوں کے دوش بدوش نبرد آزما ہے۔

راویہ۔ پروین شاکر کی ہم عصر شاعرات نے بھی نسائی جذبات کی ترجمانی کی ہے مگر تکمیل شعر کے تعلق سے وہ ان سب پر فوقیت رکھتی ہیں۔ پروین شاکر کی پیشرو شاعرات کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض نے ان کی شعری فکر کو قوت بخشی۔ کشور ناہید نے عورت کو کسی بھی خانے میں رکھنے سے انکار کیا اور اس کے خلاف شدید احتجاج کا

مظاہرہ کیا۔ فہمیدہ ریاض نے جنس کے حوالے سے ایک پوری عورت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ انھوں نے ایک پوری عورت کو اپنا اجتماعی اور انفرادی شعور عطا کیا۔

ایک آواز۔ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید نے عورت کے نفسیاتی، جذباتی اور مابعد الطبیعیاتی وجود کو تسلیم کیے جانے کا جو شعری اصرار کیا تھا، پروین شاکر نے اپنے تخلیقی جوہر سے ان نسائی پیچیدگیوں اور صنفی مساوات کو فن کی صورت میں پیش کیا۔

راویہ۔ پروین شاکر نے اپنی فکر کو فلسفہ نہیں شاعری بنایا۔ وہ شاعری جو دماغ میں نہیں دل میں اترتی ہے۔ پروین شاکر نے اپنے اسلوب' اپنے لب ولہجہ کے تلازموں کو بہت ہی مختلف اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

ایک آواز۔ پروین شاکر کی شاعری اس کی اپنی ذات کی شاعری تھی۔ وہ اپنے باطن میں نامعلوم گہرائیوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کا وجدان اتنا نازک اور حساس تھا کہ وہ اپنے سوچ سمندر سے ایسے شعر بآسانی نکال لاتیں کہ وہ بلا تامل اجتماعی پسند کا نغمہ بن جاتے۔

راویہ۔ جو صبح خواب لگا شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اس سے مرا دل اداس کتنا تھا
سکونِ دل کے لیے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل کہ سدا اس کی انجمن میں رہا

رواوی۔ اوروں کا ہاتھ تھا جو انھیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر، تم کو اس سے کیا
میں برگ برگ اس کو نمو بخش رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا

ایک آواز۔ تیرا خیال کر کے میں خاموش ہو گئیں
ورنہ زبانِ خلق سے کیا کیا نہیں سنا
ایک ہی شہر میں رہ کر جن کو اذن دید نہ ہو
یہ ہی بہت ہے ایک ہوا میں سانس تو لیتے ہیں

راوی۔ پروین شاکر کی شاعری عشقیہ شاعری تھی۔ انھوں نے بڑی سچی، کھری اور لفظ و بیان سے سجی ہوئی شاعری کی ہے۔ عشق و معاملات عشق ان کی شاعری کے موضوع رہے ہیں لیکن ان کا عشق محض خیالی نہیں بلکہ ایک طویل اور مرحلہ وار

عمل ہے۔

راویہ۔ پروین شاکر کی شاعری کوئی زبانی جمع خرچ کی بات نہیں ہے۔ انھوں نے محبت کے تجربوں کو اپنے رگ وپے میں محسوس کیا اور اس کی مختلف حسیاتی اور نفسیاتی کیفیتوں کو کبھی صاف کھلے لفظوں میں بیان کیا اور کبھی ان کو استعاروں کو حسین روپ دیا۔

خوشبو ہے وہ تو چھو کے بدن سے گزر نہ جائے
جب تک مرے وجود کے اندر اتر نہ جائے
ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اس نے گھر کا دروازہ کیا

ایک آواز۔ پروین شاکر نے ایسی عشقیہ شاعری ہجر وصال میں بھی خوب فنکارانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ ان معاملات میں ان کا انداز بیان قدرتی اور اثر انگیز ہے۔ یہاں ان کے ہاتھوں حیا وادب کا دامن کبھی نہیں چھوٹتا۔

راویہ۔ ان کے یہاں معاملات عشق میں لمس اور خود سپردگی کی کیفیتیں اس انداز میں ملتی ہیں کہ ان کا اظہار زبان وبیان کی معراج کو پہنچ جاتا ہے۔

اک حجاب تہ اقرار ہے مانع ورنہ
گل کو معلوم ہے کیا دست صبا چاہتا ہے
مدتوں بعد اس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منصب دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا

راوی۔ ان کے یہ شعر بھی کیا خوب ہیں۔

رگ رگ میں ترا لمس اتر تا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے انتہائی دے
مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رُت میں مہکتا دیکھوں

ایک آواز۔ پروین شاکر کا شعری، سرمایہ (۱)خوشبو (۱۹۷۶)(۲)صد برگ (۱۹۸۰)(۳)خود کلامی۔ انکار (۱۹۹۰)اور ایک کلیات "ماہِ تمام" پر مشتمل ہے۔ ان کے اولین مجموعہ کلام خوشبو کو آدم جی ایوارڈ ملا، خود کلامی پر، ہجرہ ایوارڈ اور انھیں مجموعی خدمات کے لیے حکومت پاکستان کے سب سے بڑے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

راوی۔ پروین شاکر کو زبان و بیان پر فطری قدرت حاصل تھی ۔ ان کی شاعری دراصل نئی زبان اور نئے اسلوب سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے اردو ادب کے معیار کو بلند و بالا کیا ہے۔ زبان کی سادگی اور پرکاری بھی ان کی شاعری کی پہچان ہے۔ ان کے یہاں الفاظ و تراکیب کا استعمال ایک خاص رکھ رکھاؤ رکھتا ہے۔ ان کے یہاں بول چال کی زبان محاورے اور روزمرہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں ہندی اور فارسی لفظیات کو بھی بڑے ماہرانہ انداز میں استعمال کرتی ہیں عام طور پر ان کی شاعری دھیمے لہجے اور میٹھے بول کی شاعری ہے۔

راویہ۔ مگر جب کبھی انھیں زندگی کے تلخ تجربات کا سامنا ہوا تو یہ میٹھے بول کڑواہٹ میں تبدیل ہوتے رہے۔ پروین شاکر کی شخصیت میں جو خود اعتمادی اور انا کا عنصر ہے، وہ ان کی شاعری میں ہر جگہ جھلکتا ہے۔ اسی کے سہارے انھوں نے زندگی اور معاشرے کی ہر مشکل کا سامنا کیا۔ انھوں نے سنار کی بدسلوکی پر بھی ہمت نہیں ہاری اور اپنا سر تاحیات اونچا ہی رکھا۔ وہ ہر لحہ گیت بنتی رہیں اور اپنے فن کی خوشبو سے دیار ادب کو معطر کرتی رہیں۔

ایک آواز۔ انھوں نے واقعی اپنے نئے اسلوب سے انتہائی خوبصورت شعری پیکر تراشے ہیں۔ ان کے یہاں سیدھے سادھے الفاظ اور مانوس ترکیبوں کے استعمال کے باوجود ان کی شاعری گہری معنویت اور تفہیم لیے ہوئے ہوتی ہے۔

راویہ: پروین شاکر نے پرانی علامتوں کے نئے معنیٰ و مفہوم کا ملبوس عطا کیا ہے۔ زبان و بیان پر بے پناہ دسترس کے ساتھ ان کے یہاں فکر و نظر کی گہرائی اور گیرائی بھی ملتی ہے۔

راویہ۔ پروین شاکر نے جدید لب و لہجہ ضرور استعمال کیا ہے مگر اس کے باوجود انھوں نے قدیم شعری روایتوں سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

درست ہے نئی راہوں سے واسطہ رکھنا
روایتوں سے بھی خود کو مگر جڑا رکھنا

ایک آواز۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

رات خوشبو کی طرح پھیل گئی پیرہن میرا شکن اس کی تھی
کئی رتوں سے مرے نیم وا دریچوں میں ٹھہر گیا ہے ترے انتظار کا موسم

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

کہیں رہے وہ مگر خیریت کے ساتھ رہے
اٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دعا آئی

راوی۔ ہاں! ذرا یہ شعر بھی دیکھیے گا

اجنبی لوگوں میں تم اور اتنی دور ہو
ایک الجھن سی رہا کرتی ہے روزانہ مجھے

اچانک ریت سونا بن گئی ہے
کہیں آگے سراب آئے گا شاید

اس بار جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بڑا پیار تھا اس بوڑھے شجر سے

راویہ۔ اور یہ اشعار

یکلخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا

وہ شہر میں ہے یہی بہت ہے
کس نے کہا میرے گھر بھی ٹھہرے

بھیڑیے مجھ کو کہاں پا سکتے
وہ اگر میری حفاظت کرتا

ایک آواز۔

رائے پہلے سے بنالی تو نے
دل میں اب ہم ترے گھر کیا کرتے

گلی کے موڑ پہ دیکھا اسے تو کیسی خوش
کسی کے واسطے ہو گار کا ہوا شاید

کل رات ایک گھر میں بڑی روشنی ہوئی
تارا مرے نصیب کا تھا اور کھلا کہاں

راوی۔ پروین شاکر نے نئی غزل کے خدوخال کی تشکیل میں تاریخی کردار عطا کیا ہے۔

راویہ۔ قدرت نے پروین شاکر کو جو نسائی بصیرت عطا کی تھی وہی ان کی شاعری کے منفرد لب ولہجہ کی امین ہے۔

ایک آواز۔ تازگی، سادگی، پرکاری، اظہار کی برجستگی اور بے ساختگی پروین شاکر کی تخلیقات کا طرہ امتیاز ہے۔

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

جگن ناتھ آزاد
شخصیت اور فن

مرتب: ایم حبیب خاں
مبصر: رفاقت علی شاہد
۵۱روپے
ناشر: ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو کا قدیم اور فعال اشاعتی ادارہ ہے۔ کتابوں کی حوصلہ افزا اشاعت کے ساتھ ساتھ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے ایک ادبی ماہنامہ "کتاب نما" بھی شائع ہوتا ہے۔ اس ادارے نے ایک منفرد روایت کی طرح ڈالی ہے یعنی اردو کے قابل ذکر اور نامور زندہ ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کے اعتراف میں ان کے فکروفن پر "کتاب نما" کا خاص شمارہ شائع کیا ہے۔ اس سلسلے میں درجنوں نمبر شائع ہوکر اس درجہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں کہ ان میں سے بعض کی دوبارہ سہ بارہ اشاعت کا اہتمام کرنا پڑا۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی روایت کی کڑی ہے۔ یہ کتاب پروفیسر جگن ناتھ آزاد پر "کتاب نما" کا خصوصی شمارہ ہے۔ اس کے مضامین میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ جگن ناتھ آزاد کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو کے معروف نقاد اور محقق ایم حبیب خاں (مرحوم) نے مرتب کی ہے۔

اداریے میں مرتب نے جگن ناتھ آزاد کے علمی وادبی مرتبے کا تعین کرتے ہوئے بتایا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ہندستان میں اقبال کا نام لینا بھی گناہ اور جرم سمجھا جاتا تھا۔ ایسے میں آزاد نے اس خوف اور جھجک کی فضا کے سکوت کو توڑا اور اقبال کی ہمہ گیریت اور عالمی حیثیت واہمیت واضح کی۔ وہ اقبالیات کے ماہر تسلیم کیے گئے۔ اقبال پر ان کے تحقیقی وتنقیدی کارناموں کا اعتراف صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے انھیں "اقبال ایوارڈ" دے کر کیا۔

وہ بڑی خوب صورت اور موثر شاعری بھی کرتے ہیں۔اس سلسلے میں انھیں اپنے والد تلوک چند محروم جیسے شعر شناس اور سخن گو کی رہنمائی میسر آئی ہے جس نے ان میں اچھے شاعر کے جملہ خصائص جمع کر دیے ہیں۔

آزاد کو اردو سے والہانہ عقیدت اور محبت ہے۔اس کی بڑی وجہ یقیناً ان کے والد کی تعلیم و تربیت ہے جن کی پرورش اور رہنمائی میں اردو نوازی یقیناً شامل رہی۔ آزاد کی اردو نوازی کا منفرد پہلو یہ ہے کہ وہ اس کے حق میں دو سو سے زائد قطعات لکھ چکے ہیں۔

انھوں نے حق گوئی و بے باکی کے جواہر سے بھی اپنی شخصیت کو مالا مال کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو ہو یا مسلمان' وہ ہمیشہ کھری اور سچی بات کرتے اور حق کا ساتھ دیتے ہیں۔ بابری مسجد کی شہادت پر بھی انھوں نے مختلف قطعوں اور نظموں کے ذریعے اپنے سوگوار جذبات کا اظہار کیا تھا۔

اس کتاب میں مختلف ادیبوں کے "آزاد" کے فکر و فن اور سوانح حیات پر تنقیدی' تاثراتی اور تجزیاتی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مضمون نگاروں نے آزاد کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خدمات ادب کو سراہا ہے۔ مضمون نگاروں میں صف اول کے ادیب شامل ہیں جیسے مسعود حسین خاں' رشید حسن خاں' ڈاکٹر خلیق انجم' ڈاکٹر ظ' انصاری' ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی' ایم حبیب خاں' خواجہ غلام السیدین' سید احتشام حسین اور حنیف فوق۔ آخر میں چند مزید مشاہیر ادبا کی آزاد کے بارے میں آراء درج کی گئی ہیں' ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی' مالک رام' نیاز فتح پوری' رشید احمد صدیقی' ڈاکٹر یوسف حسین خاں' حکیم محمد سعید اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار شامل ہیں۔ صف اول کے ان ادبا کے اعتراف سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کا مرتبہ اردو ادب میں کس قدر بلند ہے۔

مرتب کی تنقیدی نظر کی بھی داد دینی پڑتی ہے جنھوں نے مضامین کے انتخاب میں معیار کو پیش نظر رکھا ہے۔مذکورہ منفرد روایت پر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' دہلی بھی مبارکباد کا مستحق ہے۔

بجلی کی آنکھ مچولی نے بقیہ کتابوں کے تبصروں کے پرنٹ نہیں نکلنے دیے۔ براہ کرم بقیہ تبصرہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔
مصنف اور مبصر حضرات معذرت قبول فرمائیں　　　(ادارہ)

کھلے خطوط

☆غفران راغب، معرفت ڈاکٹر محمد عظیم، آزاد نگر، سیوڈیہہ، بوکارو ۸۲۷۰۱۱ (بہار)

اپریل ۹۹ کا "کتاب نما" پیش نظر ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے اداریہ میں سچی اور اچھی باتیں کہی ہیں۔ جناب بھٹ بہت قابل شخص ہیں قومی کونسل کے ذریعہ موصوف ادب اور اردو کے متعلق اپنی سنجیدہ فکر کو عملی جاہ پہنانے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ زیر نظر شمارے میں شامل باقی مضامین بھی قابل غور و مطالعہ ہیں اعداد کے متعلق لوگ اچھی کوشش کر رہے ہیں نئے نئے گوشے نکالے جارہے ہیں۔ سائنسی پہلو اور نقطہ نظر پر ہماری اردو زبان میں بہت کم لکھا جارہا ہے۔ اشد ضرورت ہے کہ مختلف شعبہ سائنس پر ماہرین و مفکرین کی اعلیٰ اور عمدہ تجربوں کو منظر عام پر کثیر تعداد میں پیش کیا جائے اور لوگ مستفیض ہوں۔ اس شمارے میں شعری حصہ جاندار ہے۔ پرویزیداللہ مہدی کی تحریریں میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ ان کی تحریریں بہت مزہ دیتی ہیں لیکن آپ نے بات پوری نہیں ہونے دی الجھن سی ہونے لگتی ہے۔ اگر کوئی چیز بیچ میں چھوٹ جائے تو شاید کمپوزنگ میں غلطی ہوتی ہے خطوط کے کالم میں نامی انصاری کی کہی گئی باتوں سے میں پوری طرح متفق ہوں۔ یہ مانا کہ فی زمانہ ادب کے قاری وہی حضرات ہیں جو قلمکار ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جتنے رسائل شائع ہوتے ہیں ان سب کا خریدار قلم کار کو ہونا ضروری ہے۔ یہ ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ بہت سارے ادبی رسائل ایسے ہیں جو مہمل ہیں۔ (اثبات و نفی ایک موقر ادبی پرچہ ہے) اور میں نے ان رسائل میں سے چند کے مدیران کو بالکل کھلے طور پر لکھ بھی دیا ہے کہ اگر آپ کو خرچ اور نقصان کی فکر ہے تو آپ اپنے جریدے کو بند کردیں اور کسی معتبر اور معیاری رسائل کو اپنا تعاون پیش کریں بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ معتبر اور معیاری رسائل کی ایجنسی لے لیں اور آپ اسی لگن کے ساتھ (جو آپ کے اپنے رسالے کے لیے ہو) ان کی فروخت میں لگ جائیں۔ اس طرح آپ کو فائدہ ہوگا اور اردو ادب کو فروغ بھی ملے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری ان باتوں سے متفق ہوں گے۔

☆جاوید انور

"کتاب نما" شمارہ اپریل ۱۹۹۹ء نظر نواز ہوا، شکریہ۔ اداریہ پڑھا۔ اردو زبان وادب کی موجودہ صورت حال کے متعلق کیا عرض کروں۔ بہر حال، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ایک اہم بات جو کہ اداریہ میں

تحریر فرمائی ہے وہ یہ کہ۔

"اردو کا مقدر آج یہ ہے کہ ہر حرف شناس یہ زعم خود اردو کا ذی وقار ناقد بن بیٹھتا ہے اور جھٹ پٹ غالب پر ایک کتاب لکھ ڈالتا ہے۔ اردو والوں کی یہی دکھتی رگ ہے جس پر ہم کو فوراً توجہ دینا ہوگی اور اس ادیب کو بتانا ہوگا کہ بھائی آسمان کے نیچے اس زمین کے اوپر اور بھی دنیا جہان کے مضامین ہیں جو آپ کی توجہ کے محتاج ہیں۔ ان کا مطالعہ کیجیے اور قوم کی نئی نسلوں کو ان سے روشناس کرائیے۔"

حمید اللہ بھٹ صاحب نے جس جانب توجہ دینے کا مشورہ دیا ہے، اس پر توجہ تو مرے خیال سے ۶۰۔۵۰ برس پہلے ہی ہو جانی چاہیے تھی۔ اگر اب بھی ہمارے ادبا کو حمید اللہ بھٹ صاحب کا مشورہ پسند آئے تو یہ "دیر آید درست آید" مثل ہو گی اور اب بھی کوتاہی برتی گئی یا اسے نظر انداز کیا گیا تو معاملہ "اگر اب بھی نہ جاگے تو پہر جا کر اٹک جائے گا۔

یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ کیا ہمارا ادب غالب تک ہی محدود ہے؟ اور اگر ہم غالب پر نہیں لکھیں گے (واضح رہے کہ غالب پر تقریباً سب کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب کسی مزید کتاب لکھنے کی گنجائش شاید ہی باقی ہو، ہاں اگر دور حاضر سے غالب کی شاعری کا موازنہ یا اسی طرح کے مضامین ہوں تو اس کے ابھی بہت امکانات ہیں اور اگر ادیب یہ چاہتا ہے کہ تمام دوسری کتابوں کی ہی تحریر کو الٹ پلٹ کر اپنے انداز میں بیان کر ایک نئی کتاب ترتیب دے دے تو اس طرح کروڑوں کتابیں اب بھی لکھی جا سکتی ہیں) تو کیا ہمیں ادب قبول نہیں کرے گا؟ اور اگر ایسا ہے کہ غالب پر لکھنا ضروری قرار دیا جاتا ہے تو میرے خیال میں یہ مناسب نہیں۔

بقول شمس الرحمٰن فاروقی "ہوا بندھی ہوئی تھی صاحب کہ جو غالب پر نہ لکھے وہ ادیب نہیں ہے تو ہم نے بھی غالب پر لکھا۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں "اصل میں دیکھیے ہم لوگ لے دے کر غالب پر آکر اٹک جاتے ہیں۔ غالب کے یہاں ضرور ایک خاص طرز ملتا ہے کہ۔

"بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

اس سے حد درجہ خطرناک شعر مصحفی نے کہے ہیں، میر نے کہے ہیں۔ لیکن ہم لوگوں کے سامنے غالب کی ایسی دیوار کھڑی ہے کہ اگر غالب کے یہاں نہیں ہے تو پھر یہ غزل میں نہیں ہوگا۔ کیوں نہیں ہوگا! یہ بات بالکل غلط ہے۔ غالب نے شعوری طور پر یا کسی بنا پر جس کے بارے میں ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ غالب نے کسی بنا

پر تجزیہ نہیں کیا اس بنا پر کہ غالب نے بہت سی چیزیں جو کلاسکی غزل میں تھیں، اپنے یہاں نہیں رکھی ہیں۔ مثلاً ان کے یہاں طنز ہے، ان کے یہاں ظرافت ہے، اپنے اوپر ہنسنے کا انداز ہے، اپنے اوپر غصہ کرنے کا انداز ہے لیکن معشوق سے لڑنے کا وہ انداز نہیں ہے جو میر کے یہاں ہے"

کیا ہمارے ادب میں صرف غالب ہی ایک ایسا شاعر ہے جو عالمی ادب کے سامنے کھڑا کیا جا سکتا ہو اور کوئی نہیں جو عالمی ادب کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکے۔ کیا اور کوئی ایسا شاعر ہے جس کے اشعار آفاقی ہوں! جو ہر دور پر صادق آتے ہوں؟ ہیں صاحب یقیناً ہیں۔ بس ضرورت ہے ان کو تلاشنے کی اور ان کی شاعری کے عمیق مطالعے کی۔ جتنا ذہن غالب کو سمجھنے کے لیے لگایا جارہا، یا ان پر جتنا ذہن خرچ کیا جا رہا ہے، اگر کسی دوسرے شاعر پر اتنا زور دیا جائے ان کی شاعری کا عمیق مشاہدہ کیا جائے تو یقیناً کار آمد نتائج بر آمد ہوں گے۔

میرا مطلب غالب کی شخصیت کا انحراف قطعی نہیں ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا؟ میں تو حمید اللہ بھٹ صاحب کی اس تحریر کا قائل ہوں اور انھیں کے جملے کو دہرا رہا ہوں "بھائی آسمان کے نیچے اس زمین کے اوپر اور بھی دنیا جہاں کے مضامین ہیں جو آپ کی توجہ کے محتاج ہیں، ان کا مطالعہ کیجیے اور قوم کی نئی نسلوں کو ان سے روشناس کرائیے۔

☆ڈاکٹر خلیق انجم

اردو اکیڈمیوں کو تمام اردو اخباروں اور رسالوں کو باقاعدہ اشتہار دینے چاہئیں اور ہر اکیڈمی میں صحافیوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی جانی چاہیے

تمام اہل اردو اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو اخباروں اور رسالوں کی مالی حالت خاصی تشویشناک ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے اخبار اور رسالے ہندوستان کے اردو سماج کی بہت اہم خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن مرکزی حکومت ہو یا صوبائی حکومتیں یا ہماری بارہ تیرہ اکیڈمیاں، کوئی بھی اردو صحافت کی مالی حالت کو بہتر بنانے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس وقت ہندستان سے شائع ہونے والے تمام زبانوں کے اخبارات میں اردو اخبارات ورسائل کا تیسرا نمبر ہے۔ اردو اخباروں کے مالک کیسی کیسی پریشانیوں اور مصیبتوں کے ساتھ اردو صحافت کی ترقی اور بقا کے لیے کام کر رہے ہیں اس کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کے ایسے اخبارات کی تعداد خاصی ہے جن کے اسٹاف میں ایک دو سے زیادہ کام کرنے

والے نہیں ہوتے۔ اردو اخبار کا مالک دنیا بھر کی مصیبتیں برداشت کر کے اپنے اخبار کو جاری رکھتا ہے۔ اس بات کو بھی اردو اخبارات کی کوتاہی پر محمول کیا جاتا ہے کہ اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جب کہ یہ بات کچھ ہی اخباروں پر صادق آتی ہے لیکن بیشتر اردو اخباروں کے بارے میں درست نہیں ہے۔ لوگ قومی پریس کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس پریس کے اخبارات انگریزی اور کچھ ہندی میں ہیں۔ یہ بات ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عوام پر چھوٹے اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کا زیادہ اثر ہوتا ہے کیونکہ قومی پریس کے اخبارات صرف شہروں کے طبقۂ اشرافیہ تک محدود ہیں۔ عام آدمی اردو یا مقامی زبان کے اخبارات پڑھتا ہے۔ بعض چھوٹے علاقوں میں آج بھی ایک روایت یہ ہے کہ داستانِ امیر حمزہ کی طرح ایک آدمی اردو کا اخبار بہ آواز بلند پڑھتا ہے تو اس کے ارد گرد بیٹھے دس لوگ اور سنتے ہیں۔ اردو اخبارات و رسائل کو مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں سے بہت کم اشتہارات ملتے ہیں اور پبلک و پرائیویٹ سیکٹر سے تو بالکل ہی نہیں ملتے۔

انگریزی ہو یا ہندی یا کوئی بھی بڑی علاقائی زبان، اخبارات صرف اور صرف اشتہارات کے بل پر چلتے ہیں۔ ہر صوبے میں دو چار اخبارات کو چھوڑ کر باقی تمام اخباروں کی حالت لگ بھگ وہی ہے جو اردو اخباروں کی ہے۔ یہ پوری بحث ہم نے صرف اس لیے کی ہے کہ اگر اردو اخبارات کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بقول بعض اردو دشمنوں کے، غیر معمولی حد تک کم ہے تو پھر اردو اکیڈمیاں اپنی سرگرمیوں کی خبریں اردو اخبارات کو کیوں بھیجتی ہیں اور اپنی اہم ترین اطلاعات کو اردو اخبارات کو بھیج کر اپنے مقاصد میں کامیابی کیسے حاصل کر لیتی ہیں؟۔ اگر واقعی قومی پریس اہم ہیں اور اردو پریس کی کوئی اہمیت اپنی نہیں ہے تو اکیڈمیاں اور بعض یونیورسٹیاں سرگرمیوں کی رپورٹیں اور اطلاعات قومی پریس کو کیوں نہیں بھیجتیں۔ اور صرف اردو پریس ہی کیوں کرم فرماتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ قومی پریس کسی بھی قیمت پر اکیڈمیوں کی سرگرمیاں شائع نہیں کرتا اس لیے مجبور ہو کر اردو اخبارات کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی اکیڈمی ایسی ہو جس کی سرگرمیاں اردو اخبارات میں نمایاں کر کے نہ چھاپی جاتی ہوں۔ یہ اخبارات اردو اکیڈمیوں اور اردو کی خدمت کرتے ہیں لیکن جوابًا اردو اکیڈمیاں ان اخباروں کے لیے کیا کرتی ہیں؟ ہندستان میں اس وقت تیرہ چودہ اکیڈمیاں اور تین چار ایسی یونیورسٹیاں ہیں جو اپنی سرگرمیوں کی رپورٹیں اور اطلاعات اردو اخبارات کو لازمی طور پر بھیجتی

ہیں۔ ان میں سے ہر اکیڈمی کا بجٹ بیس لاکھ سے لے کر ڈیڑھ دو کروڑ تک ہے۔ یہ اکیڈمیاں سیمنار کرتی ہیں، ادبی جلسے منعقد کرتی ہیں اور مارچ کے مہینے تک سارا روپیہ خرچ کر کے ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ان سیمناروں ، ادبی تقریبوں، شعری نشستوں اور کتابوں کی طباعت سے اردو کی اتنی ہی خدمت ہوتی ہے جتنی اردو اخبارات کر رہے ، یقیناً نہیں۔ کیوں کہ اکیڈمیوں اور حکومت کے دوسرے اردو اداروں کی سرگرمیاں ایک مخصوص طبقے تک محدود رہتی ہیں جب کہ اخبارات ایک بڑے وسیع حلقے کی خدمت کرتے ہیں۔ اردو اخبارات زندگی اور موت کی کشمکش میں رہتے ہیں۔ آپ کسی بھی اکیڈمی کے سالانہ آمد و خرچ کو دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ان اکیڈمیوں کے بجٹ میں سے پورے سال میں اردو اخبارات پر چار پانچ ہزار خرچ نہیں ہوئے۔ کیا اردو اخبارات ان اکیڈمیوں سے زیادہ اردو کی خدمت نہیں کر رہے تو پھر انھیں ان کا حق کیوں نہیں ملتا۔ ہم اخبارات کے لیے اکیڈمیوں سے بھیک نہیں مانگتے اپنا حق مانگتے ہیں اور ہمارا حق یہ ہے کہ اگر کوئی اکیڈمی دس رپورٹیں یا اطلاعات کسی اخبار کو بھیجے تو کم سے کم چار پانچ اطلاعات اشتہارات کے طور پر بھیجی جائیں تاکہ اخبارات کی مالی حالت بہتر ہو سکے۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اردو اکیڈمیوں کے اراکین میں صحافیوں کو بالکل نمائندگی نہیں دی جاتی۔ ہر اکیڈمی میں کم سے کم بیس پچیس اراکین ہوتے ہیں۔ اگر ان میں کبھی کبھار کوئی جرنلسٹ شامل ہو تو یہ محض ایک اتفاق ہے۔ اس لیے ہمارا مطالبہ ہے کہ ہر اکیڈمی میں کم سے کم دو نمائندے اخباروں کے اور رسالوں کے ضرور لیے جائیں۔ تقریباً ہر اکیڈمی میں مختلف کاموں کے لیے کمیٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق کسی بھی اکیڈمی میں صحافت سے متعلق کوئی کمیٹی نہیں ہے اس لیے ہر اکیڈمی میں اردو صحافت کی ترقی اور فروغ اور صحافیوں کے مفاد کا خیال رکھنے کے لیے صحافتی کمیٹی تشکیل دی جانی چاہیے۔

☆عاقل زیاد، رامپور، ضلع بستی پور

تازہ شمارہ مارچ کا گو بہت پہلے دستیاب ہو چکا تھا لیکن پڑھنے کے لیے وقت کی بڑی قلت رہی پھر بھی نصف سے زائد تو پڑھ ہی گیا۔ آپ کے نثری وشعری انتخاب پر مجھے اب بھی پورا اعتماد ہے۔ تاہم مابعد جدیدیت میری سمجھ میں ایک ہاؤ ہو، کے سوا اب کچھ نہیں رہ گیا۔ یہ ٹاپک اب یہیں ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ خوامخواہ سر کا درد بن رہا ہے۔

ادبی تہذیبی خبریں

دہلی میں اردو اور پنجابی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا

نئی دہلی ۲۴ر مئی (ی ن ا) آج حکومت دہلی نے اردو اور پنجابی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا فیصلہ کر کے اردو والوں کا بہت پرانا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ آج اس سلسلے کا فیصلہ کابینہ کی ایک میٹنگ میں کیا گیا۔ جس کی صدارت وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے کی۔ ایک سرکاری پریس ریلیز میں بتایا گیا ہے کہ متعلقہ محکموں کو اس سلسلے میں مناسب اقدامات فوراً کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

راجدھانی کے اردو بولنے والے لوگ متعدد حکومتوں سے یہ مطالبہ کرتے رہے تھے کہ اردو کو دہلی کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اسی طرح اکالی دل اور پنجابی کی متعدد ادبی وسماجی تنظیمیں پنجابی کو ایسا ہی درجہ دینے کا مطالبہ کر رہی تھیں کیونکہ راجدھانی میں خاصے لوگ پنجابی بولتے ہیں۔

اردو اور پنجابی کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا خیر مقدم

نئی دہلی ۲۵ر مئی قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر طاہر محمود نے حکومت دہلی کے اردو اور پنجابی کو دوسری سرکاری زبانوں کا درجہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ ایسا کر کے صوبائی حکومت نے کسی پر احسان نہیں کیا ہے بلکہ محض اپنا ایک مقدس دستوری فریضہ نبھایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی میں اول تو تقریباً دس لاکھ مسلمان اور پانچ لاکھ سکھ رہتے ہیں جو خود ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ اور دارلسلطنت کی کل آبادی کا سولہ فی صد سے زائد ہے اور دوسرے اردو اور پنجابی زبانیں صرف مسلمان اور سکھ ہی نہیں بولتے ہیں بلکہ یہ دونوں دہلی میں عام طور پر بولی جانے والی مقبول ترین زبانیں ہیں اور ان کے بولنے والوں کی مجموعی تعداد تقریباً ۲۵ فی صد ہے۔

پروفیسر طاہر محمود نے مزید کہا ہے کہ دہلی کی حکومت کو قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی اردو اکیڈمی اور قومی اقلیتی کمیشن سے صلاح ومشورے کے بعد اس سلسلہ میں ایک مستقل اور مستحکم قانون اسمبلی سے پاس کروانا چاہیے۔ دریں اثناء انھوں نے اردو اور پنجابی بولنے والے دہلی کے تمام باشندوں کو ریاستی حکومت کے اس خوش آئند اقدام پر مبارکباد دی ہے۔

ڈاکٹر طاہر محمود نے مزید بتایا ہے کہ انھوں نے دہلی کی نو تشکیل شدہ ریاستی اردو اکیڈمی، وقف بورڈ اور حج کمیٹی کے ارکان سے متعلق عوامی بے اطمینانی کا نوٹس لیتے ہوئے حکومت سے اس سلسلے میں نظر ثانی کرنے کی سفارش کی ہے۔ اردو اکیڈمی دہلی

نائب چیئرمین جناب اشتیاق عابدی نے بھی شیلا دیکشت سرکار کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے توقع ظاہر کی ہے کہ کابینہ کے اس فیصلے کی بنیاد پر جلد از جلد بل کی منظوری ہو جائے گی اور اس پر بلا تاخیر عمل در آمد شروع ہوگا۔ بزم ہم قلم نے بھی سرکار کے اس اقدام کو سراہا ہے بزم کی جانب سے ایک بیان میں ڈاکٹر مہر نگار عظیم نے اس کو مسز شیلا دیکشت کا ایک جراتمندانہ اقدام قرار دیا ہے انھوں نے دہلی سرکار کے اس اقدام کے لیے وزیر ٹرانسپورٹ پرویز ہاشمی کو بھی مبارکباد دی ہے۔ آل انڈیا اردو رابطہ کمیٹی نے بھی دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے دہلی حکومت کے فیصلہ کا خیر مقدم کیا ہے اور اس کو دیر سے اٹھایا گیا ایک صحیح فیصلہ قرار دیا ہے۔

دہلی کے نئے اے ڈی ایم عظیم اختر

نئی دہلی ۱۴ر مئی دلی کے لیفٹیننٹ گورنر کے حالیہ فرمان کے مطابق مسٹر عظیم اختر شمالی دلی کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (اے ڈی ایم) مقرر کیے گئے ہیں۔ اردو ادب میں طنز نگار اور خاکہ نگار کی حیثیت سے معروف عظیم اختر اس سے قبل دلی سرکار کے محکمہ سماجی بہبود کے سینئر سپر نٹنڈنٹ رہے ہیں۔ وہ وقف بورڈ کے چیف سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے ہیں اس کے علاوہ دلی سرکار کے کئی اہم ترین عہدوں پر بھی وہ اپنی ذمہ داریاں نبھا چکے ہیں۔

نشور واحدی کی شاعری

نئی دہلی ۱۴ر مئی۔ رابطہ ادب اسلامی دہلی نے شام نشور کا اہتمام کیا پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی نے نشور واحدی کی شاعری پر مقالہ پیش کیا اور ان کی قومی ملی نظموں اور غزلوں کے نمونے پیش کیے۔ صدارت جناب وارث قدوائی نے کی مقالے کے اختتام پر متعدد اہل علم نے نشور کے فکر و فن پر اظہار خیال کیا صدر رابطہ پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی نے نشور کی شاعری کو دل کشی و رعنائی اور پاکیزہ خیالی کا دل کش مرقع قرار دیا۔ ڈاکٹر محسن عثمانی نے کلام نشور کو بی اے، ایم کے نصاب میں شامل کیے جانے پر زور دیا۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی کے خیال میں کسی کے کلام کا کورس میں شامل ہونا یا نہ ہونا اس کی وقعت پر دلیل نہیں، زمانہ دھیرے دھیرے نشور کی وقعت و عظمت پر متوجہ ہو رہا ہے رضوان اللہ فاروقی نے کہا کہ نشور اور اقبال کے سرچشمہ ہائے فیض ایک ہی تھے، تاہم بادۂ و ساغر کے پیرایۂ بیان میں مشاہدۂ حق کی گفتگو میں نشور کی ندرت و انفرادیت مسلم ہے۔

میتھلا یونیورسٹی کے وی سی

فرقہ پرستی کے شکار / انجمن ترقی اردو ہند

پٹنہ ۱۵ر مئی۔ متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالمغنی کو ریاست کے محکمہ ویجی لنس نے بی ایڈ کی جعلی

ڈگریوں کے ریکٹ کا سرغنہ ہونے کے شک میں حراست میں لے لیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کے گھر کی تلاشی کے دوران کچھ کاغذات، دستاویزات اور بینکوں کی کتابیں افسران نے اپنے قبضہ میں لے لیں۔ ڈاکٹر مغنی کو ان کی رہائش گاہ واقع سلطان گنج سے حراست میں لیا گیا۔ ذرائع کے مطابق ان کے خلاف یہ کارروائی ریاست کے گورنر بی ایم لال کی ہدایت پر کی گئی ہے۔ پروفیسر مغنی پر الزام ہے کہ وہ اپنی یونیورسٹی کے تحت متعدد غیر موجود اقلیتی اداروں کے ذریعہ بی ایڈ کی ڈگریاں جاری کرتے تھے۔

آج نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو ہند نے پروفیسر مغنی کی گرفتاری کو فرقہ پرستوں کی سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے آج نہایت سخت الفاظ میں ڈاکٹر مغنی کی گرفتاری کی مذمت کرتے ہوئے ایک طویل بیان میں کہا کہ پرفیسر مغنی جیسا ایماندار نیک اور شریف انسان مشکل سے ہی ملے گا۔ وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک اور بہار کی اردو تحریک کے رہنما ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا ہے۔ جب سے وہ میتھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تھے ایک فرقہ پرست سیاسی جماعت ان کی مخالفت پر تلی ہوئی تھی۔ جب سندر سنگھ بھنڈاری گورنر ہوئے تو اس سیاسی جماعت نے ان سے مل کر ایک انکوائری کمیٹی تشکیل دلائی تھی۔ اس کی سفارش پر مغنی کے خلاف یہ قدم اٹھایا گیا۔ ناگپور میں ایک سمینار کے دوران ڈاکٹر مغنی نے بتایا تھا کہ ایک فرقہ پرست سیاسی جماعت ان کی شدید مخالفت پر اتری ہوئی ہے۔ یہ فرقہ پرست سیاسی جماعت مطالبہ کر رہی ہے کہ چوں کہ اخلاق الرحمٰن قدوائی یونیورسٹی کے چانسلر تھے اس لیے ان کو بھی گرفتار کیا جائے۔

ڈاکٹر انجم نے حکومت سے اپیل کی ہے کہ ڈاکٹر مغنی کے ان تمام معاملات کی انکوائری کے لیے ایک ایسی کمیٹی تشکیل کرے جس میں سیکولر لوگ شامل ہوں۔ انھوں نے رابڑی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ڈاکٹر مغنی کے خلاف کارروائی بند کردے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدر آباد ۲۶ر اپریل: مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری نے اردو آبادی سے اپیل کی ہے کہ وہ اس یونیورسٹی کے پروگراموں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ استفادے کی بہترین صورت یہ ہے کہ یونی ورسٹی میں جو کورسز شروع کیے گئے ہیں ان میں یا تو خود داخلے لیں یا داخلے کے خواہش مند اور ضرورت مند لوگوں تک اس کا پیغام پہنچائیں۔ وائس چانسلر نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ مولانا آزاد یونیورسٹی نے اس برس تین پروگراموں کا اعلان کیا جس میں بی اے، بی کام اور غذا اور تغذیہ میں سرٹیفیکٹ کورسز شامل ہیں۔ ان

تینوں کورسز کا ذریعہ تعلیم اردو ہے اور تینوں ہی فاصلاتی طریقہ تعلیم سے دستیاب ہیں یعنی ان کورسز میں ملک کے کسی بھی حصے میں مقیم افراد داخلہ لے سکتے ہیں۔ پروفیسر جیراجپوری نے مزید کہا کہ ان تینوں کورسوں میں داخلے کے لیے باقاعدہ تعلیمی لیاقت لازمی نہیں ہے بلکہ وہ سبھی لوگ داخلے کے اہل ہیں جن کی عمر ۱۸ سال ہو چکی ہے۔ تاہم جن کے پاس باقاعدہ تعلیم کی سند نہیں ہوگی انھیں اہلیتی امتحان پاس کرنا ضروری ہوگا۔ البتہ انٹرمیڈیٹ پاس یا ۲+۱۰ لوگوں کا داخلہ راست ہوگا۔

ڈاکٹر ظفر الدین پبلک ریلشنز آفیسر۔
مولانا آزاد اردو یونیورسٹی۔ حیدر آباد۔ ۸

حمد و نعت کا سالانہ مشاعرہ

فیلو شپ آف رائٹرز ٹورانٹو کی جانب سے حمد و نعت کا سالانہ مشاعرہ ۱۰ ار اپریل ۱۹۹۹ء بروز سنیچر شام ۵ بجے اسلامک فاؤنڈیشن کے بنکٹ ہال میں منعقد ہوا۔ بھوپال سے آئے ہوئے پروفیسر آفاق احمد صاحب نے صدارت کی۔ اسلامک فاؤنڈیشن مسجد کے امام ڈاکٹر اسرار احمد مدنی بطور مہمان خصوصی صدر نشین پر تشریف لائے۔ محفل کی ابتداء جناب انعام مکی صاحب کی قرأت سے ہوئی۔ ممتاز افسانہ نگار جناب رضاء الجبار نے " آخری سورت کے نزول سے آخری آیت کے نزول کا درمیانی سفر" کے عنوان سے معلوماتی تقریر پیش کی۔

اس کے بعد انھوں نے ہی اس مشاعرہ کے نظامت سنبھالی۔ پندرہ سے زائد شعراء نے حمد ونعت کے علاوہ ایسی نظمیں سنائیں جن کے موضوعات اسلام کے دائرے میں تھے۔ شاعروں میں عابد جعفری، افتخار حیدر، جمال زبیری، رشید صدیقی، انور کمال رضوی اور افضال نوید کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد مدنی نے عربی میں لکھی ہوئی نعتوں کے اشعار سنائے اور ان کا اردو ترجمہ پیش کیا۔ مشاعرے کے اختتام پر ساڑھے تین سو کے قریب مہمانوں نے ڈنر سے استفادہ حاصل کیا۔ عبد العلیم صاحب کے شکریے پر محفل کا اختتام ہوا۔

قیصر حسین، فیلوسپ آف رائٹرز ٹورانٹو

مہاراشٹر میں اردو

مہاراشٹر میں اردو کے عنوان سے ایک ادبی، تاریخی، تنقیدی، تحقیقی تذکرہ زیر ترتیب ہے۔ اس سلسلہ میں ایک چھپا ہوا سوالنامہ مہاراشٹر کے تمام ادباء شعراء، صحافیوں، مدیروں، ادبی انجمنوں، دارالمطالعہ اور کتب خانوں کو ارسال کیا گیا ہے۔ جن اہل قلم تک نہ پہنچا ہو تو وہ مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ پیدا کر کے کوائف نامہ حاصل کر سکتے ہیں۔

لطیف احمد سبحانی، مکان نمبر ۷۵ مہاراشٹر ہاؤزنگ بورڈ کالونی
شاہ بازار اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹر)

"طلبہ کے اندر چھپی ہوئی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ضروری ہے"
شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی میں انور عظیم کی آمد

گزشتہ دنوں شعبہ اردو ممبئی یونی ورسٹی کی دعوت پر اردو کے ممتاز افسانہ نگار، بزرگ صحافی اور نامور مترجم جناب انور عظیم شعبے میں تشریف

لائے اور ان کے اعزاز میں ایک مخصوص ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر جناب انور عظیم نے اردو ادب کے کے مستقبل، ترجمے کے مسائل، اردو فکشن اور ترقی پسند تحریک پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس محفل میں محافظ حیدر، حسن کمال، انور قمر، سلام بن رزاق، مقدر حمید، اطہر عزیز اور صدر شعبہ واساتذہ کے علاوہ ایم اے اور ایم فل کے طلباو طالبات نے شرکت کی۔

وزیر اعلا دہلی کے نام خط

اردو اکادمی دہلی کے گورننگ کونسل کے ممبران کی فہرست نظر سے گزری۔ کونسل میں ریسرچ اسکالرز کی نمائندگی نہیں ہے۔

جامعہ اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن، آپ سے مانگ کرتا ہے کہ گورننگ کونسل میں ریسرچ اسکالرز کی بھی نمائندگی شامل کی جائے تاکہ اردو کے طالب علموں اور ریسرچ اسکالرز کے مسائل بخوبی حل ہو سکیں۔

اسلم جمشید پوری، جامعہ اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن
شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

"اردو تنقید کا سفر" کی رسم اجرا

۹ر مئی کو غالب اکیڈمی میں مشہور ناقد و محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ڈاکٹر تابش مہدی کی تحقیقی و تنقیدی کتاب "اردو تنقید کا سفر" (جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تناظر میں) کا اجرا فرمایا۔ دہلی کے منتخب علماء، دانشوروں اور اہل ادب نے شرکت فرمائی۔ مشہور افسانہ نگار جناب انجم عثمانی نے ایک مضمون پڑھا جس میں تابش مہدی سے اپنے دیرینہ وخاندانی مراسم، تابش مہدی کی شخصیت اور فن پر جامع روشنی ڈالی۔ پروفیسر تنویر احمد علوی نے کتاب پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اسے تابش مہدی کا بڑا علمی و تحقیقی کارنامہ قرار دیا اور زبان وبیان کی غیر معمولی تحسین کی۔ دہلی کی معروف وہر دلعزیز ادبی شخصیت جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ تابش مہدی نے یہ کتاب لکھ کر پوری جامعی برادری کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں ادبی اجلاس و مشاعرہ

ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ کے زیر اہتمام ۱۶ر مئی کو گلبرگہ میں ایک ادبی اجلاس منعقد کیا گیا۔ معتمد انجمن جناب امجد حسین ہندرگ نے ابتداء میں مہمان خصوصی کا تعارف کروایا اور کنوینر جلسہ مسٹر حامد اکمل نے خیر مقدم کیا۔ جناب مجتبیٰ حسین نے اپنی تقریر میں انجمن ترقی اردو ہند کی نئی اور وسیع وعریض دو منزلہ عمارت کی تعمیر پر مسرت کا اظہار کیا۔ انجمن کی نئی عمارت کی تعمیر کے ضمن میں انھوں نے صدر انجمن جناب سید مجیب الرحمٰن، انجمن کے سرگرم عہدیدار وخازن جناب وہاب عندلیب اور ممتاز صحافی جناب حکیم شاکر کے علاوہ انجمن کے سرپرست اعلا تقدس مآب حضرت سید شاہ محمد محمد الحسینی صاحب قبلہ سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے اشتراک وتعاون اور خدمات کی ستائش کی۔ جناب مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضمون "دیمکوں کی ملکہ سے ایک ملاقات" کو تمام شرکاء ادبی اجلاس نے بے حد پسند کیا۔

صدر جلسہ الحاج اقبال احمد سرڈگی نے اپنی

تقریر میں جناب مجتبیٰ حسین کے فن اور ان کی
شخصیت کی بلندیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قومی
و بین الاقوامی سطح پر شہرت حاصل کرنے والے
عظیم فنکار کی حیثیت سے شہر گلبرگہ اور سرزمین
دکن ان پر ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے۔ محفل شعر
میں ڈاکٹر ماجد داغی، محبّ کوثر، خمار قریشی، حامد اکمل
زنگ راؤرنگ، خورشید وحید اور جبار جمیل نے
حصہ لیا۔ صدر انجمن ترقی اردو جناب سید مجیب
الرحمٰن نے بھی جناب مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ
مضمون پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ مسز ڈاکٹر
ناصر بن علی، سید عثمان کنوینر ریاستی اقلیتی سیل
کانگریس، ڈاکٹر ناصب قریشی، سعد الدین قریشی
بشیر باگ، ڈاکٹر رفیق رہبر، خواجہ پاشاہ اتحاد ار،
چاند اکبر، پیر زادہ فہیم الدین، قاسم شاہ پوری، میر
شاہنواز علی خاں شاہین وغیرہ کے علاوہ صاحب
ذوق حضرات کی کثیر تعداد جلسہ میں شریک تھی۔
جناب مجیب اللہ معتمد تنظیمی کے شکریہ پر جلسہ
اختتام کو پہنچا۔

دلی اردو اکادمی کی نئی گورننگ کونسل

دہلی اردو اکادمی کی چیئرمین اور دہلی کی وزیر اعلا
محترمہ شیلا دکشت نے نئی گورننگ کونسل کا وائس
چیئرمین جناب اشتیاق عابدی کو نامزد کیا۔ ممبران
کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: پروفیسر
اختر الواسع، پروفیسر صدیقی، انیس جامعی، نصرت
ظہیر، چندر بھان خیال، شریف الحسن نقوی، منظور
حسن، ڈاکٹر نگار عظیم، مہ لقا ملک، حبیب قریشی،
ڈاکٹر اے ایس خان، نور الدین، محمد عاشقین قریشی،
محمد جہانگیر، محمد یونس، ریاست علی، بنارسی داس تلی،
کفیل آذر اور سید بھروچ۔ پروفیسر عظیم الشان
صدیقی، پروفیسر امیر عارفی اور پروفیسر نصیر احمد
خاں کو بھی بعد میں کونسل کا ممبر نامزد کیا گیا۔
کونسل کی مدت دو برس ہے۔ تازہ ترین اطلاع کے
مطابق ڈاکٹر علی جاوید ریڈر شعبہ اردو دہلی
یونیورسٹی کو دہلی اردو اکیڈمی کا سکریٹری منتخب کیا گیا
ہے۔ ادارہ کتاب نما علی جاوید صاحب کو مبارک باد
پیش کرتا ہے اور ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہے۔

بیگم حمیدہ سلطان احمد کو استقبالیہ

بیگم حمیدہ سلطان احمد کی اردو زبان کے تحفظ اور اس
کی ترقی کے لیے پچاس سال سے زیادہ طویل مساعی
جمیلہ کے اعتراف میں گزشتہ روز علی منزل، کوچہ
پنڈت دہلی میں ایک استقبالیہ منعقد ہوا۔ اس موقع
پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے بیگم صاحبہ کی
خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا۔
اس مناسبت سے "بیگم حمیدہ سلطان احمد" نام کے
ایک کتابچے کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ اس کتاب
میں بیگم صاحبہ کی اردو خدمات اور دہلی کی تہذیبی
سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے پیہم کوششوں
پر چند معروف دانشوروں اور اردو کے اساتذہ کے
مختصر مضامین شامل ہیں۔
اس تقریب کا آغاز غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر
جناب شاہد ماہلی کی مختصر تقریر سے ہوا جس میں
آپ نے بیگم صاحبہ کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی
ڈالی۔ اس کے بعد پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی،
ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، گلزار دہلوی
، پروفیسر سید امیر حسن عابدی وغیرہ نے بیگم صاحبہ
کی ادبی و ثقافتی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس تقریب
میں شہر کے کئی اردو دانشوروں نے شرکت کی۔

Regd. with R.N.I. at No. 4967/60 June, 1999
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

کتاب نما

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اقبال کا نظریۂ شعر اور ان کی شاعری
پروفیسر آل احمد سرور
اردو کے ممتاز نقاد اور دانش ور

پروفیسر آل احمد سرور کا مایۂ ناز خطبہ جو دہلی یونیورسٹی میں نظام خطبات کے تحت ۱۹۷۸-۷۷ میں پیش کیا گیا۔ اس خطبے میں سرور صاحب نے اقبال کے نظریۂ شعر کے بارے میں نہایت فکر انگیز خیالات پیش کیے ہیں۔ قیمت-/45

نظام اردو خطبات کا 19 واں خطبہ
داستان امیر حمزہ
"داستان، زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین" کے عنوان سے اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں پیش کیا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کر دیا ہے۔ قیمت -/60

بازار میں نیند (ڈرامے)
پروفیسر شمیم حنفی
پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کا چوتھا مجموعہ ہے، اس کے ڈرامے جیتی جاگتی آنکھوں کا تجربہ ہیں۔ قیمت-/75

ماضی کے دریچے سے ڈاکٹر شوکت اللہ
اس کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین ان قدیم تاریخی عمارتوں سے تعلق رکھتے ہیں جو اب ہمارے لیے ایک عظیم تاریخی سرمایے کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں، ان میں کچھ عمارتیں World Heritage کی فہرست میں بھی شامل کی جا چکی ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں اور تاریخ کے طلبہ کے لیے ایک نہایت اہم کتاب قیمت-/75

فکر انسانی کا سفر ارتقا خواجہ غلام السیدین
نظام اردو خطبات کا آغاز شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲۵ر فروری ۱۹۷۶ء کو ہوا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا اور صدارت ڈاکٹر سی' ڈی' دیش مکھ' وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے فرمائی۔ ملک کے دیدہ ور ماہر تعلیم پروفیسر غلام السیدین نے مندرجہ بالا عنوان پر دو لیکچرز دیے اب اس خطبے کا تیسرا اڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔ قیمت-/45

غالب کی شخصیت اور شاعری
رشید احمد صدیقی
یہ نظام اردو خطبات کا چوتھا خطبہ ہے جس کو ملک کے مایۂ ناز طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی صاحب نے پیش کیا ہے
(تیسرا اڈیشن) قیمت :-/45

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

جولائی ۱۹۹۹ء جلد ۳۹ شمارہ ۷

فی پرچہ 8/-

سالانہ 80/-

سرکاری تعلیمی اداروں سے 125/-

غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/-

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

e-mail: maktaba@ ndf. vsnl. net.in

Tele Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر: 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں اور ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

افسانے

جائزے۔ کھلے خطوط اور ادبی تہذیبی خبریں

نئی مطبوعات

قرآن کریم اور علم النفس (مذہب) محمد عثمان نجاتی -/150
سید میاں عبدالرحمٰن حیات و خدمات ڈاکٹر شہریار احمد -/250
میر مہدی مجروح حیات اور تصانیف (تلمیذ غالب) ڈاکٹر محمد فیروز -/250
عالمی اردو ادب ۱۹۹۸ء (مجلہ) نند کشور وکرم -/200
یادوں کی برات (خود نوشت سوانح) جوش ملیح آبادی -/350
شہاب نامہ دلی ایڈیشن (سوانح) قدرت اللہ شہاب -/350
اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات مظہر مہدی -/150
کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز زاہدہ زیدی -/100
دو دل اور دو روزن ہے جرمن نظمیں انتخاب مترجم حمیدالدین احمد -/100
معاصرین میرزا دبیر تقابلی مطالعہ ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی -/160
ہاپوڑ اردو کی خدمات قیام سے اورنگ آباد کے دورِ اول (تحقیق) فردوس سرت -/300
تدوین۔ تحقیق۔ روایت رشید حسن خاں -/170
اردو غزل اور تقسیم ہند (تحقیق و تنقید) محمد قمر الحق -/100
زاویہ نظر (مضامین) رفعت سروش -/100
فن اور فنی مباحث (مضامین) ابوالفضل سحر -/110
روشن لکیریں (مضامین) شمیم طارق -/150
ایٹمی جنگ (افسانہ) حیدر قریشی -/40
افسانے (روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں) حیدر قریشی -/100
ڈاکٹر کیول دھیر کی کہانیاں کیول دھیر -/150
ملفوظات و مکتوبات قدسی (مذہب) حضرت خواجہ قدسی شاہ چشتی قادری -/70
شہر غزل (شعری مجموعہ) رفعت سروش -/150
سبز ہے اور روشن ہے (شعری مجموعہ) عبدالحمید -/75
سائے سائے (شعری مجموعہ) شفیق سروجی -/50
شب تاب (شعری مجموعہ) شاہ حسین نہری -/125
لوحِ نور (شعری مجموعہ) کلیم شائق -/90
نقش ہائے گماں (شعری مجموعہ) ماجد بیاولی -/100
تلخی (شعری مجموعہ) اوم پرکاش -/100
گرمی میں اترتی شام (افسانے) نورالحسنین -/150
ماہنامہ حیات دلی (پہلا شمارہ) مدیر شمیم فیضی فی شمارہ -/10

لوحِ جمیل ، اقبال شمس -/40

مہمان اداریہ
حیدر قریشی
Auf der Roos 7
65795 Hattrarsheim 1
Germauny

اشاریہ

یہ ایک صدی کا قصہ ہے

بیسویں صدی میں دنیا حیرت انگیز اور تیز رفتار تبدیلیوں سے گزری ہے۔ بیل گاڑی سے راکٹ تک، گراموفون ریکارڈ سے سٹلائٹ تک، تختی اور سلیٹ سے کمپیوٹر تک، بندوق سے ایٹم بم تک، میٹرنٹی ہوم سے کلوننگ تک۔۔ ہر آن تبدیل ہوتی ہوئی ترقیات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کا ابھی تک کوئی انت نظر نہیں آرہا۔ ان ترقیات کے سلسلے میں ایک بات واضح طور پر سامنے ہے کہ ہمارا ایک قدم آگے کی طرف بڑھتا ہے تو ایک قدم مسلسل پیچھے کی طرف بھی جارہا ہے۔ ایک طرف پوری دنیا ایک گاؤں بنتی جارہی ہے تو دوسری طرف علاقائی سطح پر شکست وریخت کا عمل جاری ہے۔۔۔۔ اس برق رفتاری کے مثبت اور منفی اثرات اردو ادب پر بھی مرتب ہوئے ہیں، ایسے اثرات کو سطح پر تلاش کرنا مناسب نہیں اور گہرائی میں جائیں تو پوری صدی کے ادب پر گہری نظر رکھنا ضروری ہے۔ اہلِ نظر اس سلسلے میں توجہ کریں تو تجزیہ و تنقید کا کام ایک نئے زاویے سے شروع کیا جاسکتا ہے۔ یہاں میں بیسویں صدی کے اردو ادب کے سفر کو پلٹ کر بس ایک نظر دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ ایک سو سال کے اس ادبی سفر کے صرف اہم ترین حوالے ہی یہاں آسکیں گے۔ ان میں بھی صرف وہ حصے سامنے آئیں گے جو میری اچٹتی نظر میں آگئے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے اردو ادب کے دامن میں شاعری کی اصناف میں غزل، قصیدہ، مثنوی، پابند نظم کی بعض اقسام، قطعہ اور رباعی وغیرہ موجود تھیں۔ بیسویں صدی میں ان میں سے بیشتر اصناف پہلے نصف میں ہی خوددم توڑ گئیں۔ قطعات اور رباعیات کا تھوڑا بہت سلسلہ ابھی تک جاری ہے لیکن ادبی سطح پر ان کی پہلی سی مقبولیت قائم نہیں رہی، صرف غزل نہ صرف پہلے سے زیادہ مقبول ہوئی ہے بلکہ باقی شعری اصناف کے مقابلہ

میں بے حد زرخیز اور جاندار بھی ثابت ہوئی ہے۔ غزل کو ختم کرنے کے لیے اس صدی میں دو تین بار شدید حملے کیے گئے لیکن شاید یہ سارے حملے اس لیے ناکام رہے کہ اردو بلکہ برصغیر کے کلچر میں غزل کی جڑیں بہت دور تک اتری ہوئی ہیں۔ ہندی روایت کی دو شعری اصناف دوہا اور گیت اردو کے لیے بہت اہم رہی ہیں۔ ہندی گیت کی روایت فلمی اور کیسٹ کمپنیوں کے گیتوں کے شور میں کم ہوتی جارہی ہے، تاہم دوہے کو اردو میں ایک بار پھر اہمیت ملنے لگی ہے اور یہ اہمیت دوہے کے اصل وزن کی بنیاد پر مل رہی ہے۔

نئی شعری اصناف میں آزاد نظم نے اردو ادب میں اپنی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔ آزاد غزل کا تجربہ اگرچہ ابھی تک بہت زیادہ رائج تو نہیں ہو پایا پھر بھی اس میں ایک نئے ذائقے کا احساس ضرور ہوا ہے۔ گذشتہ دو تین دہائیوں سے مختصر شعری اصناف کے بعض تجربے ہو رہے ہیں۔ ہائیکو، ثلاثی، ترویجی اور ماہیے کے سہ مصرعی تجربے اپنی اپنی الگ ہیئت اور مزاج کے باعث اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ مقبولیت کے لحاظ سے ماہیا شاید دوسری تمام سہ مصرعی شعری اصناف سے کہیں آگے ہے کہ یہ خالصتاً برصغیر کے ایک بڑے علاقے کا لوک گیت ہے جو اردو میں باقاعدہ شعری صنف بن گیا ہے۔ حالیہ دنوں میں امیر خسرو کی کہہ مکرنیوں کی روایت بھی اردو میں پھر سے مقبول ہونے لگی ہے۔

اردو کا دامن داستان کی روایت سے بھرا ہوا تھا لیکن بدلتے وقت اور حالات کے پیش نظر داستان کی جگہ چپکے سے ناول نے لے لی۔ پھر افسانہ آیا ناولٹ آیا، افسانچے آئے۔ اردو فکشن نے اپنی داستان خود مرتب کی۔ فکشن کے دوش بدوش سفر نامہ، رپورتاژ، خاکے اور خود نوشت لکھنے کا رجحان توانا ہوا۔ انشائیہ نے اردو ادب میں پاؤں جمائے تو پرانے قصوں کے طنزیہ مزاحیہ حصے اردو میں باقاعدہ ایک ادبی صنف کی صورت اختیار کر گئے۔ طنز و مزاح سے بھرے ہوئے مضامین نے نہ صرف اپنا الگ تشخص قائم کیا بلکہ قاری کے ادب کے ساتھ تعلق کو مضبوط بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ تھیٹر کے ذریعے اردو ڈرامہ مقبول ہو کر ایک ادبی صنف بننے لگا تھا لیکن ٹی وی ڈراموں کی یلغار نے ادبی ڈرامہ کے ساتھ وہی کچھ کیا ہے جو کچھ فلمی گیتوں کے ہاتھوں ہندی روایت کے گیت کا ہو چکا ہے۔ بہر حال یہ سب کچھ ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔

اردو تذکروں کو تنقید کے ابتدائی آثار مانا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی میں اردو تنقید نے آہستہ روی سے اپنا سفر شروع کیا اور اب پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو تنقید اپنے اصل مآخذ مغربی تنقید کے برابر آن کھڑی ہے، تاہم یہ بات بھی

افسوس کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ذہین نقادوں نے مشرقی ادب کی پرکھ کے لیے مشرقی مزاج سے ہم آہنگ ادبی پیمانے مقرر کرنے کی طرف بہت ہی کم دھیان دیا ہے۔ بیسویں صدی میں ادبی رسائل کی اشاعت کی سہولت نے ادبی صحافت کو فروغ دیا۔ یوں ادبی اداریے، کتابوں پر تبصرے، اور رسائل میں چھپنے والے خطوط بھی ادبی حوالے سے اہمیت حاصل کر گئے۔ ادیبوں کے انٹرویوز کے ذریعے نہ صرف ان کی شخصیت کے بلکہ ان کی تخلیقات کے بعض مخفی گوشے بھی ابھر کر سامنے آنے لگے۔ تحقیق کے میدان میں بھی قابل ذکر پیش رفت ہوئی۔

ادبی اصناف میں قصیدہ، مثنوی، مسدس وغیرہ مطلع وادب سے غائب ہو گئیں۔ رباعی قطعہ اور گیت بھی آہستہ آہستہ متروک ہوتے جا رہے ہیں۔ داستانیں اور قصے بھی اب صرف ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ تاہم اپنے ایسے سارے گم شدہ ادبی سرمائے کے حوالے سے ہی اردو ادب آج اتنا مالا مال ہے۔ کچھ افسانے، افسانہ، ناولٹ، ناول، سفر نامہ، رپورتاژ، خود نوشت، یاد نگاری، خاکہ، انشائیہ، طنز و مزاح اور تنقید جیسی ادبی نثری اصناف اور غزل، آزاد نظم، ماہیا، دوہا اور دیگر شعری اصناف یقیناً بیسویں صدی کے سفر کا حاصل ہیں۔

اس صدی کے اوائل میں غزل کو چھوڑ کر دیگر بیشتر اصناف ادب میں معاشرتی اصلاح اور اخلاقی قدروں کے فروغ کے لیے واضح پیغام دیا جاتا تھا پھر رومان انگیز تحریریں پیش کی جاتی تھیں۔ علامہ اقبال کی آواز بجائے خود ایک تحریک تھی انھوں نے اپنی تخلیقی قوت کے ذریعے اپنا پیغام قوم تک پہنچایا اور ادب میں ایک استثنائی مثال بن کر ابھرے۔ ترقی پسند تحریک نے لکھنے والوں میں ایک نئی روح پھونک دی، اردو ادب کو جتنے اعلا پایے کے تخلیق کار ترقی پسند تحریک کے ذریعے نصیب ہوئے بعد میں کسی اور تحریک کے ذریعے اتنی تعداد میں نہیں مل سکے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے ذریعے مقصد کو ادب پر نہ صرف فوقیت دی جانے لگی بلکہ ادب کو محض آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اتنے بڑے فورم کی طرف سے بے شمار ٹریش بھی ادب کے نام پر پیش کیا جانے لگا۔ تاہم ترقی پسند تحریک نے ادب کے دھارے کا رخ تبدیل کر کے ایک انقلابی کارنامہ انجام دیا۔ بیسویں صدی کے ادب پر سب سے گہرے نقش ترقی پسند تحریک کے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت کا دور آیا۔ معتدل اور متوازن جدیدیت ادب کے لیے نیک فال تھی لیکن پھر یہاں جدید علامتی پیرائے کی جگہ گہرے تجریدی بادل چھا گئے۔ ادب کی جادوگری کی جگہ الفاظ کا مداری پن نمایاں ہوا۔ قاری ادب سے ہی بے زار ہونے لگا۔

خدا خدا کر کے یہ دور گزرا اور اب بیسویں صدی کا آخری کنارا ہے۔ اس دور کو مابعد جدیدیت کہہ لیں، چاہے جدیدیت کی توسیع کہہ لیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ادیبوں کی نئی نسل لفظ و معنی سے ہم رشتہ ہونے ہی میں اپنی ادبی بقا سمجھتی ہے اور اسی میں ادب کی بقا بھی ہے۔

ایک عرصہ تک دوسری زبانوں کا ادب اردو میں ترجمہ ہوتا رہا ہے، تاہم اب کچھ عرصہ سے اردو ادب کے تراجم بھی دوسری زبانوں میں ہونے لگے ہیں۔ اگرچہ تراجم کا زیادہ تر کام نجی سطح پر ہو پایا ہے اور تاحال ایسے تراجم کے اچھے اثرات بھی سامنے نہیں آئے تاہم ایک اچھے کام کی ابتداء ہوئی ہے تو اس کے اچھے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے ادب کے عالمی دھارے کا چرچا ہو رہا ہے۔ جب ساری دنیا عالمی گاؤں میں تبدیل ہو رہی ہے ادب کا عالمی دھارا بھی اگر معرضِ وجود میں آجائے تو اچھی بات ہے لیکن ہر زبان کا اپنا ایک لسانی کلچر ہوتا ہے اور اس کلچر سے اُگنے والی تخلیقات ہی اس زبان کا اعلا ادب ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ادب کے عالمی دھارے میں ایسی تخلیقات کو کہاں رکھا جائے گا جو ترجمہ کی ٹھیس بھی برداشت نہیں کر سکتیں؟ ہم نے مغرب سے ہر سطح پر استفادہ کیا ہے لیکن اہلِ مغرب کی برکات کو مشرقی سانچے میں ڈھال کر مغربی ادبی اصناف بھی ہمارے ہاں صرف وہی رائج ہو سکی ہیں جو مشرقی مزاج میں آسانی سے رچ بس سکتی تھیں۔

اہلِ مغرب کی اپنی ترجیحات ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اردو کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ اب ویسی اہمیت عربی اور جاپانی کو دی جا رہی ہے تو اہلِ مغرب کے "نظریہ ضرورت" کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ساختیات کے مغربی دانشوروں نے جس طرح جنرل تھیوری کا حربہ آزمانے کی کوشش کی تھی کہیں ادب کے عالمی دھارے کا بھی ویسا ہی مقصد تو نہیں ہے؟ عالمی ادبی برادری کا تصور خوش کن ہے لیکن ادب کے کسی بڑے سے بڑے دھارے میں بھی ہر زبان کے ثقافتی تشخص کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو ادب کے ثقافتی تشخص کو قائم رکھنے کے لیے ہمارے اہلِ ادب کو سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کیونکہ نئی صدی میں ادب کے عالمی دھارے کا مسئلہ زیادہ بڑی سطح پر سامنے آرہا ہے۔

انیسویں صدی تک اردو ادب کے سفر کی رفتار اُس زمانے کی رفتار کے مطابق رہی اور بیسویں صدی میں زمانے کی پے درپے تبدیلیوں کے ساتھ اردو ادب کا دامن وسیع ہوا۔ ادب میں وسعت کے ساتھ ادیبوں کے ساتھ ادیبوں کی معاصرانہ چشمک، مفادات کی دوڑ، گروہ بندیوں اور نجی کدورتوں کے منفی اثرات بھی نمایاں ہوئے۔ تنقید میں غلط بخشیوں نے مذکورہ منفی اثرات کو مزید مستحکم کیا۔ اس کے باوجود اردو ادب کی ترقی کا گراف بڑھ رہا ہے۔ اردو زبان

اپنے سارے ادبی سرمائے کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں ہمارے سامنے ادب کے عالمی دھارے کے مسئلے کے ساتھ ایک اور سوال بھی غور طلب ہے اکیسویں صدی میں صرف اردو ادب ہی کا نہیں، دنیا بھر میں ادب کا مستقبل کیا ہو گا؟ امید ہے ہمارے اہل ادب اس سوال پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

بلراج کومل
۱۳۹ ای۔ کالکاجی
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

خستہ ورق

میں خدا کا شکر کرتا ہوں
کہ مجھ کو نعمتیں، سب مشتہر آسائشیں
برسوں کے اچھے یا بُرے لمبے سفر میں
میری خوش بختی
عطا ہوتی رہیں
زندگی کے زیر و بم کے درمیاں
دستِ شاطر کے طفیل
مجھ کو آخر وہ فضیلت
مرتبہ
اعزاز حاصل ہو گیا
شہر نو میں جو مقامِ پُرکشش کی
تازہ تر پہچان تھا
اک ہجوم نادرات خوب رُو
موجود ہے امروزِ میرے چار سُو
صرف میری جانِ جاں
زندہ کتاب
گھر کے اندر اور باہر
توشۂ گر مک نہ ہوئی
دھجیوں میں بٹ گئی
بے دست و پا
طوفان کی زد میں منتشر ہوتی گئی
اس کا میں
آخری خستہ ورق
اپنا ہدف
اپنا تماشائی ہوا
غرقِ نسیاں ہو گیا

رفعت سروش
A080 Sector 27
NOIDA 201301

غزل

صداقت ہو محبت میں تو اک لمحہ غنیمت ہے
اگر دل سے ادا ہو جائے اک سجدہ غنیمت ہے

بہار آتی ہے گلشن میں، ہزاروں پھول کھلتے ہیں
چمن کا نام ہو جس سے وہ اک غنچہ غنیمت ہے

ہزار آتش فشاں بھڑکیں، فضا میں آگ برسائیں
گرے جو قصر باطل پر وہ اک شعلہ غنیمت ہے

سنا ہے آسماں در آسماں سورج دہکتے ہیں
کرے جو روح کو روشن وہ اک جلوہ غنیمت ہے

سر بازار حسن شعلہ ساماں کی فراوانی
مگر گھر میں سروش اک پھول سا چہرہ غنیمت ہے

ایک کیفیت

صبح بستر سے جو اٹھتا ہوں، تو یوں لگتا ہے
کرب بے خوابی سے تپتا ہوا جسم
سر بہ سر زخم ہے اک
سانس لیتا ہوا زخم
جس کی ٹیسوں سے دھواں اٹھتا ہے
ہاتھ پاؤں جو اٹھاؤں تو رگوں میں جیسے
درد کے قفل سے لگ جاتے ہیں
اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ جسم ہے زنداں میرا

(بستر علالت سے)

پروفیسر ظفر احمد نظامی
شعبۂ سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

قطعات

اُس کو بچھڑے ہوئے زمانہ ہوا　　پھر بھی چاہت کا خبط باقی ہے
اُس سے تو واسطہ نہیں لیکن　　اُس کی یادوں سے ربط باقی ہے

☆

چاہتا ہوں کہ میرے کچھ آنسو　　آنکھ میں جذب ہوں تو چھلکیں بھی
لیکن اے دوست یوں بھی ڈرتا ہوں　　بھیگ جائیں نہ تیری پلکیں بھی

☆

زندگی عشق کے اندھیروں میں　　جانب درد مڑ گئی اے دوست
یہ تری یاد کا کرشمہ ہے　　نیند آنکھوں سے اُڑ گئی اے دوست

☆

تیری نظروں سے مل کے میرا دل　　رشک ماہ و نجوم ہے ساقی
جس طرف بھی نگاہ کرتا ہوں　　روشنی کا ہجوم ہے ساقی

☆

آج بھی زندگی کی راہوں پر　　سوئے غم عازم سفر ہوں میں
جس سے منسوب ہیں کئی یادیں　　ہاں وہی آپ کا ظفر ہوں میں

وارث کرمانی
اللہ والی کوٹھی سول لائنس۔دودھ پور
علی گڑھ (یو۔پی)

غالب کا
"حلقۂ دام خیال"

غالب کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کے لیے ورثہ میں جو روایت ملی وہ باہر سے درآمد کی ہوئی تھی۔اس کے استعارے اور علامتیں، اساطیری اور تاریخی پس منظر، اقسام واصناف سخن یہاں تک کہ شعری موضوعات سب ہندستان کے باہر سے تعلق رکھتے ہیں۔اس ملک کے شمالی مغربی ملکوں میں اب سے دس بارہ صدی پہلے جو قیاس کیا گیا تھا وہی غالب کے زمانے تک شاعری کی اساس بنا رہا۔ہندستان میں عرصۂ دراز تک شاعری کی یہ یکسانیت کئی اسباب کی بنا پر قائم رہی۔ منجملہ ان کے ایک خاص سبب طے شدہ مضامین پر طبع آزمائی تھی جن میں عشق اور تصوف خاص طور سے پسندیدہ تھے۔ تصوف تو خالص ماورائی اور روحانی نوعیت رکھتا تھا، عشق کا موضوع بھی اکثر افلاطونی ہوا کرتا تھا اور جہاں یہ مجاز کی حدود میں داخل ہوتا تھا وہاں یہ واقعاتی ہونے کے بجائے روایت کی گرفت میں آجاتا تھا۔افلاطون ہی کے نظریہ کے مطابق جو واقعاتی یا ہمارے حواس کی رو سے حقیقی عشق تھا اُسے مجازی قرار دیا گیا اور جو مجازی تھا اُسے حقیقی بتایا گیا۔تصوف اور شعری روایت کے ان اثرات کی وجہ سے وہ تجربات ومشاہدات جو روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے تھے شعری افکار میں بہت کم راہ پاتے تھے۔مادّی عشق کا تصور بھی جگہ جگہ سے کٹا پٹا اور داغدار اور روایت زدہ معلوم ہوتا ہے۔غالب سے پہلے امیر خسرو، حسن سنجری، ثنائی، نظیری اور میر تقی میر جیسے معدودے چند شعرا ضرور ایسے ملتے ہیں جنھوں نے واقعی عشق میں سرشار ہو کر سوز وگداز میں ڈوبی غزلیں کہی تھیں۔غالب کے یہاں یہ بنیاد بھی نہیں ہے۔ان کے بیشتر اشعار عشق کی بشریت اور تصوف کے عرفان سے عاری نظر آتے ہیں۔خود غالب نے اپنے مکتوبات میں عشق اور تصوف سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی۔

ساقی نامہ میں کہتے ہیں۔

تصوف نزیبد سخن پیشہ را سخن پیشہ رند کفر اندیشہ را

نشاں مند این روشنائی نہ ای غزل خوان وی خور سنائی نہ ای

ترجمہ: ایک شاعر اور رند پیشہ کو تصوف زیب نہیں دیتا۔ تو اس روشنی کا اہل نہیں ہے۔ تو غزل پڑھ اور شراب پی۔ سنائی کیوں بننا چاہتا ہے۔ عشق کے متعلق ان کا مشہور مصرع ضرب المثل بن گیا۔

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

انھوں نے عشق میں سودے بازی کا انداز اختیار کیا اور معشوق کو بے وقوف بنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

من آن نیم کہ دگر میتواں فریفتہ مرا فریبمش کہ مگر میتواں فریفتہ مرا

ترجمہ: میں وہ نہیں ہوں کہ جسے دوبارہ فریفتہ کیا جا سکے لیکن میں اُسے یہ فریب دیتا ہوں کہ مجھے فریفتہ کیا جا سکتا ہے۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے

ان اقتباسات سے میں غالب کے تصور عشق کی تضحیک نہیں کرنا چاہتا بلکہ ایسے ہی افکار کو میں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں آگے چل کر استعمال کرنے والا ہوں۔ غالب کے تصوف کے سلسلے میں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ یا تو مندرجہ بالا اشعار کے مطابق انھیں تصوف کا شاعر نہ مانا جائے یا اگر خلیفہ عبدالحکیم اور مولانا حالی کے اصرار اور سفارش پر انھیں صوفی شاعر تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان کا تصوف فلسفہ وحدت الوجود سے ہٹ کر کوئی دوسری چیز ہوگا جس سے ان کے جدید ذہن کی تفسیر میں مدد ملے گی، یہاں جس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ ہماری شعری روایت کے دو اوصاف حمیدہ یعنی عشق اور تصوف غالب کی شاعری میں اگر مفقود نہیں تو مجروح ضرور ہوئے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی اہل نظر واقف ہیں کہ ابتدائی دور میں غالب پر بیدل کا بھوت بُری طرح سوار تھا۔ اردو میں ان کی ناکامیاب تقلید سے غالب کی شاعری اور بھی خراب ہوئی۔ محفلوں اور مشاعروں میں ان کا مذاق اڑایا گیا اور معتبر اساتذہ ان کے کلام کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ اچھے شعر کی تعریف میں بیدل کا یہ فقرہ "شعر خوب معنی ندارد" ہر چند کہ بہت معنی خیز تعریف تھی تاہم نوجوان غالب اس سے گمراہ ہو کر اپنی منطق اور نیم مہمل شاعری سے خاصے

مطمئن ہوگئے تھے۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ان تمام خامیوں کے نشانات غالب کے ایوان شاعری میں کرید کر دیکھے جاسکتے ہیں۔ روایت کی گرفت اور فارسی بندشوں کے شوق نے ان کے ڈکشن کو بُری طرح جکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے ان کے تازہ افکار و خیالات موج تہ نشیں کی طرح، گہرائیوں میں محوِ خواب، معلوم ہوتے ہیں۔ ان خامیوں کے ساتھ اور ماضی کے ادبی سرمائے سے علمی و ادبی تعلق کے باوجود غالب ہماری شاعری میں پہلے جدید ذہن کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کے اردو اور فارسی اشعار بکثرت موجود ہیں جن میں جدید ذہن کی کار فرمائی ملتی ہے لیکن ان اشعار کے پیش کرنے سے غالب کو جدید ذہن کا شاعر ثابت کرنا مقالے میں سطحی انداز پیدا کردے گا جبکہ یہ مسئلہ سطحی نہیں پیچیدہ نوعیت کا ہے کیونکہ غالب کے یہاں جدید انداز کی خیال انگیزی کو تسلیم کرتے ہوئے بھی انھیں جدید شاعر کہنے میں تامل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے وقت کے معیار سے بھی جدید شاعر ہوتے تو اتنے بڑے شاعر نہ ہوتے۔ حالی کی مثال ہمارے سامنے ہے جنھوں نے بڑے مبلغانہ انداز میں اعلان کیا تھا۔

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

حالی شاعری اور تنقید دونوں میں جدیدیت کے علمبردار بلکہ ان کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اگر غالب کو بھی جدید شاعر کہا جائے تو پھر حالی اور غالب میں کیا فرق ہوگا اور غالب کو حالی کے مقابلہ پر زیادہ مقبولیت اور مرتبہ کیوں حاصل ہے۔ اس مقالے میں غالب کے اس امتیازی وصف کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لیے ہمیں غالب سے پہلے تھوڑا ماضی میں سفر کرنا پڑے گا۔

کلام غالب کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں ماضی کے شاعروں کے حوالے جس کثرت سے ملتے ہیں غالباً کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتے اور یہ سب حوالے ہندستان کے باہر نہیں جاتے یعنی بیدل، حزیں، کلیم، ظہوری، طالب آملی نظیری اور عرفی کا ذکر بار بار آتا ہے لیکن جامی حافظ اور سعدی کا نام مشکل سے کہیں ملتا ہے حالانکہ وہ لوگ زیادہ بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غالب شعر کہتے وقت ہندستان کے فارسی شعرا کو پیش نظر رکھتے تھے بلکہ

ان کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مثنوی باد مخالف میں ان کا تفصیلی ذکر ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

دامن از کف کنم چگونہ رہا طالب و عرفی و نظیری را

ترجمہ: میں اپنے ہاتھ سے طالب عرفی اور نظیر کا دامن کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

ہندستان کے فارسی شاعروں کا دامن پکڑنے کے کیا معنی جبکہ ان سے زیادہ بڑے شاعر ملک میں مقبول تھے اور ان کا کلام تعلیمی نصاب میں داخل تھا۔ فردوسی نظامی، مولانا روم، شیخ سعدی، حافظ اور جامی وغیرہ تو تعلیمی نصاب کے علاوہ شاہی درباروں، صوفیوں کی خانقاہوں اور روز مرہ کی باتوں اور اہل علم کی محفلوں میں گھسے ہوئے تھے۔ اس سے ایک اور نکتے کی طرف ذہن جاتا ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ غالب سبک ہندی کے دبیز اور پیچیدہ اسلوب کو اظہار خیال کے لیے موزوں جانتے تھے۔ یہ اسلوب نہ صرف فارسی بلکہ ان کی اردو شاعری میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ سعدی اور حافظ کا اسلوب اُس وقت کی پیداوار تھا جب سماج میں اتنی پیچیدگی نہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایران اور توران کے لیے موزوں تھا جہاں ہمارے ملک کی طرح مختلف مذاہب اور کلچر کے لوگ نہیں رہتے تھے اور معاشرے میں وہ انتشار، تصادم اور تموج نہیں پایا جاتا تھا جو درۂ خیبر سے بنگال تک موجود تھا۔ ہندستان کے فارسی شعرا نے تیموری سلطنت کے ابتدائی زمانے ہی میں یہاں کی مشترکہ تہذیب کی عکاسی کے لیے فارسی کا ہندستانی اسلوب ایجاد کیا تھا جو ہندستانی سماج ہی کی طرح پیچیدہ اور گہرا تھا اور اتنے وسیع و عریض ملک کے مختلف فرقوں اور طبقوں کی متغائر زندگی کا احاطہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ سبک ہندی کے ابہام اور استعاروں میں در پردہ بات کہنے کی بڑی گنجایش تھی جس کی وجہ سے دوست اور دشمن اپنے اور بیگانے کو بیک وقت خوش اور مطمئن رکھا جا سکتا تھا اور سخت اعتراض اور احتجاج بھی کیا جا سکتا تھا۔ نظیری نے اکبر کے مذہبی رجحانات اور اس کے درباری شاعروں کی ملحدانہ روش سے برہم ہو کر یہی حربہ استعمال کیا تھا۔ مندرجہ ذیل شعر میں معشوق کے پردے میں اکبر بادشاہ پر چوٹ کی ہے۔

حسنت تلافی غم ایام می کند در عہد تو شکایت گردوں نکردہ کس

ترجمہ: اے محبوب تیرا حسن غم ایام کی تلافی (یہاں مراد کمی) پوری کر دیتا ہے لہٰذا تیرے عہد میں آسماں کے ستم کی شکایت کرنے کی ضرورت

ہی نہیں رہی۔

غالب نے اسی مضمون کو اپنے اردو شعر میں لازوال بنادیا ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یہ شاعرانہ لچک صرف معشوق سے متعلق بیان میں نہ تھی بلکہ کسی بھی مضمون سے کئی مطالب نکل سکتے تھے۔ ایک ہی شعر شیخ و برہمن دونوں کو خوش فہمی میں مبتلا کر سکتا تھا اور ایک ہی خیال سے دین داری، تشکیک اور الحاد تک کی تفسیر کی جا سکتی تھی۔ غالب ہی کی شہادت پیش کرنا بہتر ہوگا۔

حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت
دستگاہ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

ترجمہ: میرے شعر کا ایک ایک حرف فتنہ پردازی کے مزاج میں اپنی جگہ بنا لے گا۔ اور شیخ اور برہمن دونوں اس پر اپنے طور پر فخر کر سکیں گے۔

شعر میں یہ لچک اور اس کی معنویت میں کئی سطحیں پیدا کرنے کے لیے غالب نے اپنا اسلوب پرانے انداز ہی پر قائم رکھا۔ انھوں نے فن شعر کے بارے میں جہاں جہاں خطوط اور دوسری تحریروں میں اظہار خیال کیا ہے اس سے بھی قدامت ٹپکتی ہے۔ حالی نے لکھا ہے کہ مرزا پرانے نظریہ کے مطابق شاعر کو کامل اُسی وقت سمجھتے تھے جب اُسے قصیدہ گوئی پر کامل دسترس حاصل ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کے قصیدوں کو نظر انداز کر کے صرف غزلوں کی تعریف کرتا تھا تو وہ خوش نہیں ہوتے تھے۔ ان تمام باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب قدیم شاعری کے قدیم تصورات اور روایت کا بہت احترام کرتے تھے لیکن اس کے برعکس ان کے افکار میں قدامت شکنی کے آثار جابجا نظر آتے ہیں بلکہ ان کے فکری طلسم میں اگر جھانک کر دیکھا جائے تو ایک دوسرا ہی عالم نظر آتا ہے جو کم از کم وہ نہیں ہے جس کی نمائش غالب نے خارجی مواد سے کی ہے۔ یہ عالم ہزار ہا سال کے انسانی مفروضات سے منحرف ہے مذہبی عقائد اور نظریات پر شک کرتا ہے اور تسلیم شدہ قدروں کا باغی ہے۔ ہماری مفاد زدہ دنیا کی طرح یہ عالم بھی ایک کیفیت پر نہیں ٹھہرتا۔ اس میں غم کی کسک کے ساتھ ساتھ خوشی کی امنگ ملتی ہے۔ اس میں کہیں تو سنجیدہ اور ظرافت آمیز عناصر کا ٹکراؤ ہے تو کہیں ناامیدی اور حوصلہ مندی کی باہم آویزش، کسی جگہ عرفان و تصوف کی گرم

گفتاری ہے تو دوسرے موقع پر رندی و سرمستی کا والہانہ انداز اور انسانی تحت الشعور سے ابھرتی ہوئی نہ جانے کتنی پرچھائیاں کتنے بے نام احساسات اور کتنے مبہم خاکے ایک دوسرے کو کاٹتے پیٹتے اور نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور بظاہر شاعر عجمی روایت کا پیرو، عجمی تہذیب کا دلدادہ، رسم عاشقی پر وضعداری سے قایم، تصوف کا بالواسطہ مدعی اور سخن سنجی و سخن گوئی میں استادانِ قدیم کی روش پر حرف بحرف چلنے والا معلوم ہوتا ہے۔

غالب کی شاعری میں جدید ذہن کا اظہار جن مختلف مسائل و موضوعات پر ہوا ہے ان کا ذکر اس جگہ بہت ضروری نہیں۔ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ خود راقم نے اپنی تحریروں میں اس پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ یہاں شاعری کے دو خاص موضوعات یعنی عشق اور تصوف کو لے کر یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ غالب نے ان موضوعات کے ساتھ اندر ہی اندر کیا سلوک کیا اور انھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔
تصوف کا وہ عنصر جسے اقبال نے مشرب گوسفنداں کہہ کر مذموم قرار دیا تھا غالب کے زمانے میں بلکہ ہندستان کے پورے اسلامی عہد میں بہت مقبول تھا اور فارسی شاعروں نے اُسے بطور خاص اپنا موضوع بنایا تھا لیکن ابن عربی کے فوراً بعد ہی جلال الدین رومی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے انسان کی قدرت و صلاحیت پر زور دیا تھا اور پھر ہندستان میں عرفی شیرازی نے اپنے ولولہ انگیز اشعار میں رومی کے نقطہ نظر کو ازسر نو فروغ دیا تھا۔ رومی نے انسان کے مجبور و محکوم تصور سے اکتا کر کہا تھا۔

زین ھمرھانِ سست عناصر دلم گرفت		شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

ترجمہ: ان سست مزاج ہم راہیوں سے میرا دل ہٹ گیا ہے اب مجھے شیر خدا اور رستم جیسے انسانوں کی آرزو ہے۔

گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت		قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف است

ترجمہ: میں نے مان لیا کہ جنت مجھے بغیر عبادت مل جائے گی لیکن اُسے قبول کر کے وہاں جانا انصاف کی بات نہ ہوگی۔

غالب نے رومی اور عرفی کی آزادی و خود مختاری کے محل پر ایک اور منزل کا اضافہ کیا
ہم بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم		الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور پھر اقبال نے رومی، عرفی اور غالب کی اس مشترکہ خصوصیت کو اپنی شاعری کا جزو اعظم بنایا۔ غالب پر اقبال کی نظم محض ان کی عظمت کی تعریف میں نہیں

بلکہ اپنے سلسلہ رشد و ہدایت کے ایک اہم مرکز کا اعتراف ہے۔ غالب کی طرح عرفی پر بھی ان کی ایک علاحدہ نظم ملتی ہے اس لیے رومی سے اقبال تک پہنچنے میں عرفی اور غالب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور غالب کو صوفی شاعر کہا جائے تو وہ اسی گروہ کے صوفی شاعر سمجھے جائیں گے۔ درحقیقت دیوان غالب کا پہلا ہی شعر تصوف کے فرسودہ راستے سے الگ ہو جاتا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ شعر ایک عام خیال پر مبنی ہے جس میں خدا کو مصور اور بندے کو تصویر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن تصویر کا مصور سے احتجاج اور اپنی مجبور اور آفت رسیدہ زندگی کی شکایت کرنا شعر کو قرون وسطیٰ کی فضا سے دور جدید میں لے آتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں یہی کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اسی جدید انداز فکر کے تحت غالب کبھی منصور کو تنگ ظرف کہتے ہیں۔ کبھی بنی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر موسیٰؑ کے تقاضائے 'رب ارنی' کا مذاق اڑاتے ہیں اور خدا کے حضور میں بحث و تکرار سے باز نہیں آتے۔ وہ خدا جو رب المشرقین والمغربین ہے، جس نے وسیع و عریض زمین پر انسان کو اتار کر انواع و اقسام کی نعمتوں سے مالا مال کیا لیکن انسان نے ناشکری اور غداری کی اور زمین پر فساد پھیلایا۔ وہ خدا جس نے شہد و شیر و خرما انگور اور لولو و مرجان عطا کر کے انسان سے پوچھا تھا کہ تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، اسی رب کے سامنے غالب انسانی زندگی کا دوسرا رخ پیش کر کے انسان کی محرومی و مظلومی، بے نوائی و نامرادی، بیماری و ضعیفی اور دولت کی غلط تقسیم کا بیان ایسی گرمجوشی سے کرتے ہیں کہ عالم ملکوت میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ اپنی شراب نوشی کی مدافعت میں کہتے ہیں کہ اگر نغمہ و شراب کا حساب لینا ہے تو جمشید بہرام اور پرویز جیسے بادشاہوں سے لیا جائے۔ مجھ غریب کی شراب نوشی کیا:

حساب می و رامش و رنگ و بو ز جمشید و بہرام و پرویز جو

نہ از من کہ از تاب می گاہ گاہ بدریوزہ رخ کردہ باخم سیاہ

ترجمہ: شراب اور راگ و رنگ لہو کا حساب جمشید بہرام اور پرویز سے لے نہ کہ مجھ سے کہ جس نے شراب کے نشے سے کبھی کبھی مچل کر اپنا منہ کالا کر لیا ہو۔

وہ اپنی غریبی اور ناداری کا حال بیان کر کے تمام نوع بشر کے وکیل بن جاتے ہیں۔

بہاران و من در غم برگ و ساز | در خانہ از بینوائی فراز
بنا سازگاری زہمسایگان | بسرمایہ جوئی زبے مایگان
سراز منت ناکسان زیر خاک | لب از خاکبوس خساں چاک چاک

بدان عمر ناخوش کہ من داشتم
زجان خار در پیرہن داشتم

(مثنوی ابر گہربار)

ترجمہ: موسم بہار کے شب و روز اور میں روٹی روزی کے غم میں نڈھال، اپنا دروازہ مفلسی کی شرم سے بند کیے ہوئے کبھی پڑوسیوں کی ناراضگی میں جتلا تو کبھی کم ظرف کمینوں سے پیسہ مانگنے پر مجبور۔

کبھی حقیر لوگوں کے احسان سے سرزمین پر گزرتا ہوا تو کبھی گھٹیا لوگوں کی خاک بوسی کرنے سے اپنے ہونٹ چاک چاک کیے ہوئے۔ ایسی تکلیف دہ زندگی میں نے گزاری جیسے میرے پیرہن کے اندر جان نہ ہو بلکہ کانٹا ہو۔

عدالت ایزدی میں یہ بیان دے کر غالب خود کو عذاب و سزا کے بجائے دادرسی اور اپنے نقصانات کی تلافی کا مستحق ثابت کرتے ہیں۔ یہ خیال کہ غالب نے اس باغیانہ روش، حقیقت پسندی اور ارضیت کے برعکس ہستی کو فریب نظر کہا ہے، قطرے کے دریا میں فنا ہونے کو عشرت قرار دیا ہے اور وحدت الوجودی فلسفے کے منفی اثرات کو بھی اپنے اشعار میں جگہ دی ہے، محض اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ مصلحتاً اپنا رشتہ شعر و تصوف کے غالب رجحان سے منقطع کرنا نہیں چاہتے تھے اور قدامت پسند معاشرے کے سامنے خود کو یکسر اجنبی یا جدید بنا کر پیش کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کوشش میں وہ اتنا کامیاب ہوئے کہ نہ صرف ان کے ہمعصر بلکہ بعد میں آنے والے نقاد بھی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے انھیں "صوفی شاعر کا درجہ دیتے رہے یہاں تک کہ آج بیسویں صدی کے اختتام پر بھی ایک ممتاز نقاد نے غالب کے اس پُر فریب انداز فکر کی طرف معنی خیز اشارہ کیا ہے۔

"غالب کے یہاں یہ کشاکش (قدیم و جدید مشرق و مغرب کی آویزش) جس جدلیاتی شان سے نمایاں ہے وہ مرزا ہی کا حصہ ہے کہ انھوں نے اپنے خاص انداز میں کفر سے بھی جھاڑی اور ایمان کا بھی ساتھ دیا"

لیکن میں غالب پر اپنی اس عملی تنقید کی تائید میں اس نقاد کا ایک اور اقتباس زیادہ پر زور سمجھتا ہوں جسے اُس نے جدید ترین ادبی نظریات کے حوالے سے کافی غور و فکر کے بعد لکھا ہے اگرچہ یہ غالب یا کسی خاص ادیب کے بارے میں نہیں ہے۔

"معنی چونکہ تفریقیت سے پیدا ہوتا ہے اور جتنا سامنے ہے اتنا ہی غیب میں بھی ہے اس لیے فقط سامنے کا یا مانوس یا معمولہ معنی ہی کل معنی نہیں، غائب معنی یا معنی کا دوہرا پن بھی اہمیت رکھتا ہے اور اکثر یہ وہ معنی ہوتا ہے جسے تاریخ کے مقتدرہ نے یا طاقت یا اقتدار کے کھیل نے دبا دیا ہے یا نظر انداز کر دیا ہے" پروفیسر گوپی چند نارنگ، تنقید کے نئے ماڈل کی جانب مطبوعہ آج کل دہلی ستمبر ۱۹۹۳ء

غالب کے متعلق میری ان معروضات کو شاید سائنٹفک یا محققانہ مزاج رکھنے والے قارئین بہت زیادہ خیال پردازی یا دور از کار سمجھیں اس لیے میں نے جو معنی غالب کی تخلیقات کے بین السطور سے اخذ کیے ہیں اُسے وہ مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

غالب کا مخصوص ڈکشن بھی جو اردو کے عام مشاعروں سے مختلف تھا اسی در پردہ کوشش یا کار فرمائی کا ایک رخ تھا۔ ذوق، سودا، میر اور مومن کی زبان اور محاورے ہمیں ان کے زمانے کی دلّی اور اس کے گلی کوچوں کی یاد دلاتے ہیں جبکہ غالب کی فارسی بندشوں کا آہنگ ہمیں بیدل سے امیر خسرو تک عجمی روایت کی پوری شاہراہ خیال کو جگمگا دیتا ہے اور اس روایت کے شاعر زندہ تر اور تابندہ تر نظر آنے لگتے ہیں۔ تصوف کی طرح غالب کی عشقیہ شاعری میں بھی تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو وہ دربان کے قدموں پر گر کر اپنی شامت بلاتے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

تو دوسری طرف معشوق کو بد تمیزی سے بات کرنے پر ڈانٹ دیتے ہیں۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

بظاہر انھوں نے روایتی عشق کے تمام لوازمات کو ملحوظ رکھا ہے لیکن نہایت پوشیدہ و دزدیدہ طریقے سے انھوں نے اسے اندر سے کھوکھلا کر کے بے وقت کی راگنی ثابت کیا ہے ورنہ جو شخص اتنے نادر اور عہد آفریں اشعار کا خالق ہو اُس کے قلم سے ایسے

اشعار نکلنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پانوں داب تو دے

غالب کے بارے میں اکثر کہا گیا ہے کہ انھوں نے ناسخ لکھنوی کا بھی اثر قبول کیا ہے۔ اس میں بھی نکتہ پوشیدہ ہے کہ شعری روایت کے کھوکھلے عناصر کو تمسخرانہ انداز میں پیش کرنے کے لیے ناسخ سے زیادہ مواد انھیں کہاں مل سکتا تھا ورنہ بیدل عرفی فیضی اور نظیری کی روش پر چلنے والے اور اقبال کی پیش گوئی کرنے والے شاعر کے یہاں ناسخ کی تقلید کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے ہاں زبان و بیان کی صفائی اور صیقل کی حد تک یہ بات درست ہے۔

غالب نے اپنے نئے رویّے سے عاشق کے کردار کو واقعی منقلب کر دیا ہے۔ غالب کی کردار تراشی کے بعد اردو غزل کا عاشق بے غیرتی کی حد تک وفادار ہونے کے بجائے پروقار عقل مند، معاملہ شناس اور عالی دماغ ہو گیا ہے۔ وہ نسبتاً کم سخن اور کم آمیز بھی لگتا ہے۔ معشوق اگر پہلو تہی کرتا ہے تو وہ بھی جگہ خالی کر دیتا ہے "اگر پہلو تہی کیجیے جگہ میری بھی خالی ہے۔" رقیب سے معشوق کے بڑھتے ہوئے اختلاط اور ناجائز تعلقات سے بدحواس ہونے کے بجائے وہ مطمئن اور پُر سکون رہتا ہے کیونکہ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا" غالب کے وہ اشعار جن میں ایک جہان معنی کروٹیں لیتا نظر آتا ہے، جن کی اشاریت اور خیال انگیزی متعدد تفسیروں کے بعد بھی تشنۂ تاویل رہ جاتی ہے، جن کے الفاظ میں ایسا ترنم جس کے خرام کی موجیں سماعت پر بکھرتی اور گل کترتی چلی جاتی ہیں اور جن کے خیال کی ضرب سے مستقبل کا گلشن ناآفریدہ، کھلنے لگتا ہے۔ ایسے اشعار کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔ ان کا ادراک اور اہتزاز پڑھنے یا سننے والے کی شخصی استعداد پر موقوف ہے، البتہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ فن شعر کا یہ عظیم اجتہاد اور فکر انسانی کا یہ شاہکار اپنے ہی ماضی کی گہرائیوں سے ابھر کر آیا ہے جیسے کوئی درخت دھرتی میں شگاف پیدا کر کے نمودار ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے ماضی سے مستقبل کی طرف بڑھنے اور پھوٹ پڑنے کا ایک جدلیاتی عمل ہے۔ اسی لیے غالب اتنے بیباکانہ اور گستاخانہ اظہار

خیال کے باوجود ہمارے محبوب اور نہایت عزیز شاعر بنے رہے۔ انھوں نے بت شکنی سومنات کے مہنت بن کر کی، انھوں نے دیر مغاں کی دیرینہ روایات کو 'بزم گزاری' اور زمزم سرائی، کرتے ہوئے توڑا اور اسلاف کے عقائد پر صاحب نظر فرزند بن کر چوٹ لگائی۔

با من میاویزاے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

ترجمہ: جناب والد محترم مجھ سے مت الجھیے۔ آزر کے بیٹے (حضرت ابراہیمؑ) کو دیکھیے جو لڑکا صاحب نظر نکلا وہ اپنے بزرگوں کے دین سے مطمئن نہ رہ سکا۔ دین بزرگاں خوش نکرد، یعنی بزرگوں کے دین کی تکذیب؟ معاذ اللہ۔ کوئی شہنشاہ وقت اور فاتح زمانہ بھی یہ جرات نہیں کر سکتا تھا مگر غالب کی آواز پوری قوم کے تہذیبی سرمائے میں حلول کر کے باہر آئی تھی۔ یہ آواز یورپ کی صنعتی یلغار اور انقلاب فرانس سے ہم خیال ضرور تھی لیکن اس سے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا شجرہ نسب ہندستانی تھا۔ یہ آواز کسی سیاسی مبلغ یا مذہبی واعظ کی بھی نہ تھی بلکہ ایسے دانشور اور پیغامبر شاعر کی آواز تھی جو اس کے عوامی رد عمل کے خطرات سے آگاہ تھا لیکن اسے اپنے فن کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی پر بھی مکمل اعتماد تھا۔

آن راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار توان گفت و بہ منبر نتوان گفت

ترجمہ: وہ راز جو میرے سینے میں پوشیدہ ہے وعظ نہیں ہے، اُسے پھانسی کے تختے ہی پر کہا جاسکتا ہے منبر پر نہیں۔

یہاں اس امر کی طرف توجہ مبذول کرنا مناسب ہوگا کہ غالب سے پہلے اکبری دور نشاۃ ثانیہ کے بعض شعرا میں منبر کے بجائے دار کی طرف سے لے جانے والا رجحان دیکھا جاسکتا ہے، خاص طور سے عرفی اور فیضی میں۔ فیضی کی عالمانہ جراتیں اور یونانی انداز فکر نے اُس کے حق میں کانٹے بو دیے تھے لیکن غالب فیضی کی بدنامی اور پریشانی سے اس لیے بچے رہے کہ ان کے یہاں فیضی کا اکہرا پن یا براہ راست انداز بیان نہیں پایا جاتا ہے۔ فیضی اس معاملہ میں خاصے پھوہڑ یا اناڑی تھے۔ وہ غالب سے کمتر درجے کے شاعر ہونے کی وجہ سے اُس دانشوری اور علمیت کو ہضم نہ کر سکے جو غالب کے یہاں گہرائیوں میں روپوش ہوئی ہے۔ آپ سوچیے آخر فیضی نے اتنے غضب کا

شعر کیوں کہا تھا جو ان کے لیے واقعی عوامی رد عمل کی شکل میں غضب الٰہی بن گیا تھا۔

اگر حقیقت اسلام در جہاں این است ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

ترجمہ: اگر اسلام کی حقیقت دنیا میں یہی ہے تو ایسی مسلمانی پر کفر ہزار بار ہنسے گا۔ بات دراصل یہ تھی کہ فیضی کا علم اُس کے شاعرانہ ظرف سے زیادہ ہونے کی وجہ سے باہر چھلک گیا ہے۔ وہ اپنے مقاصد اور غزلوں میں یونانیت یا اس نظام عقل کا ڈھنڈورا اکثر پیٹتا تھا جسے انگریزی کے ناقدین (HELLINISM) نے ہیلنزم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ہیلنزم جسے ہم یہاں عقل RATIONALISM کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں بڑی اچھی چیز ہے اور اس پر جتنا بھی فخر کیا گیا ہے کم ہے کیونکہ یہ انسانی تعصبات، توہمات اور مردہ اخلاقیات کی نفی کر کے روشن ضمیری، فہم و فراست یا مختصراً عقل کی طرف ذہن کو لے جاتی ہے لیکن شاعری میں صرف عقل سے کام نہیں چلتا، اس میں کچھ اور ساز و سامان بھی ہوتا ہے۔ اس سے ہماری مراد جذبہ یا جوش نہیں اسے تو سبھی جانتے ہیں۔ اس سامان میں لفظوں کے ساتھ ان کا ہمزاد بھی ہوتا ہے جو ہمیں نظر نہیں آتا لیکن اُس کی موجودگی محسوس ہوتی ہے اور پڑھنے والے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی خصوصیت سے کلام غالب کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ غالب خود بہت بڑے عقل پرست تھے، ان کی پوری پوری نظمیں عقل کی تعریف میں ہیں۔ بالکل صاف الفاظ میں جیسے یہ اشعار۔

بود بستگی را کشاد از خرد سر مرد خالی مباد از خرد

خرد چشمۂ زندگانی بود خرد را بہ پیری جوانی بود

فروغ سحر گاہ روحانیان چراغ شبستان یونانیان

ترجمہ: ہر گرہ عقل سے کھل جاتی ہے، خدا نہ کرے کہ کسی مرد کا سر عقل سے خالی ہو۔ عقل زندگی کا چشمہ ہے، عقل کے بڑھاپے میں جوانی ہوتی ہے، (عقل) روحانی بزرگوں کی صبح کا فروغ ہے۔ (عقل) یونانیوں کی شبستاں کا چراغ ہے۔

غالب کی عقل پرستی کا کھلا ہوا ثبوت ان شعروں میں موجود ہے لیکن ایک اور موقع پر غالب اسی عقل کے دعوے کو مسترد کر دیتے ہیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ یہ دوسرا غالب کون ہے لیکن یہ تلاش بعد میں ہوگی پہلے عقل کو مسترد کرنے والے شعروں پر نگاہ ڈال لی جائے۔

در ہنر من ثنا گر عقلم در سخن عقل مدح خوان منست

من عیار خرد ہمی گیرم عقل — در بند امتحان منست
ہر چہ از غیب در دلم ریزند — عقل گوید کہ ہم از آن منست
ہر چہ دانش ز خامہ انگیزد — گویم آوردۂ بنان منست
من سخن گوئی و عقل گرم نزاع — لیکن متاع ایست کز دکان منست

عقل اندیشہ زاد و من بفغان
لیکن حدیثیست کز زبان منست

ترجمہ: میں ہنر میں عقل کی تعریف کرتا ہوں یعنی اُس کی اہلیت کا قائل ہوں لیکن شاعری میں عقل میرا لوہا مانتی ہے۔ میں عقل کے جوہر کو پرکھتا ہوں اور عقل میرے امتحان اور آزمائش کی فکر میں رہتی ہے۔ جو کچھ غیب سے میرے دل میں آتا ہے عقل کہتی ہے کہ یہ میری ملکیت ہے۔ عقل اپنے قلم سے جو لکھتی ہے میں اُسے اپنی انگلیوں کا لایا ہوا سمجھتا ہوں۔ میں شعر کہتا ہوں تو عقل جھگڑا کرتی ہے کہ یہ مال میری دکان کا ہے۔ عقل سوچنے سے جو بات پیدا کرتی ہے تو میں چیختا ہوں کہ یہ بات میری زبان کی ہے"

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان شعروں میں عقل کے مقابلہ پر دوسرا کون ہے جسے غالب سامنے لا رہے ہیں اور جو عقل کی پونجی کا دعوے دار بن رہا ہے۔ یہ دوسرا مدعی فیضی کے یہاں غائب ہے لیکن غالب کے شعروں میں ساتھ رہتا ہے اور نہ صرف ان کا دوست اور محافظ ہے، بلکہ ان کے حروف کو پھیلا کر نا قابل گرفت بنا دیتا ہے اور زمانے کے تغیرات کے ساتھ ان کا بھیس بدلتا رہتا ہے۔

غالب کے بہت سے اشعار کچھ بیان کرنے کے بجائے زندہ اور متحرک تصویریں معلوم ہوتے ہیں جیسے یہ شعر

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

ان تصویروں کو ایک خاص زاویے سے تخلیق کیا گیا ہے اور ان کی ورک شاپ منظر عام سے علاحدہ ہے۔ یہ تصویریں اور خاکے اپنے ناظرین تک جس بات کا ابلاغ کرتے ہیں اُس سے مستقبل میں ہمارے ذہنی سفر کو کئی جہتوں میں روشنی ملتی ہے لیکن وہ تصویریں خود کسی محور پر نہیں پڑتیں اور کسی بات کا اقرار نہیں کرتی ہیں۔

غالب کا زمانہ سیاسی و سماجی اعتبار سے سخت تشنج و تغیر کا زمانہ تھا۔ ہندستان کے لوگ جن میں غیر مسلم بھی شامل تھے مغل حکومت کے زوال کے بعد بھی مغل تہذیب سے چمٹے ہوئے تھے

میں غیر مسلم بھی شامل تھے مغل حکومت کے زوال کے بعد بھی مغل تہذیب سے چمٹے ہوئے تھے مجاہدین کی تحریک مذہبی اور سماجی دونوں محاذوں پر سرگرم عمل تھی۔ صوفیوں کا اثر بڑے بڑے تعلیم یافتہ گھرانوں پر قائم تھا۔ شاہ عبد العزیز ہندستان کو دار الحرب قرار دے چکے تھے اور صوفیوں کے زیر اثر حلقوں میں انگریزوں کی دست درازی اور استبداد سے ذہنی مجہولیت اور افسردگی پیدا ہو رہی تھی جو منگولوں کے عالم اسلام میں تہلکہ ڈالنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس افراتفری میں غالب کسی مقام پر مستقل قایم نہیں رہے۔ وہ تنگ نظروں اور مذہبی انتہا پسندوں کے خلاف تھے لیکن اصلاحی تحریک کے علمبرداروں سے بھی مکمل اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ انھیں سلطنت مغلیہ کے مٹنے کا غم تھا لیکن وہ فاتح قوم کی اعلا صلاحیتوں اور بہتر کردار کے بھی مداح تھے اور اس حد تک مداح تھے کہ سر سید جیسے انگریز دوست رہنما کو 'آئین اکبری' کی تصحیح پر ٹوکا تھا اور مغربی علوم پھیلانے کی ترغیب دی تھی۔ انھیں سر سید اور ان کے رفقاء سے کہیں زیادہ اس بات کا اندازہ تھا کہ ہندستانی قوم کو ترقی کرنے بلکہ آنے والے دور میں زندہ رہنے کے لیے پرانے خیالات اور پرانے طرز زندگی کو ترک کرنا ہوگا اور مغربی علوم کو نصاب تعلیم میں جگہ دینا ہوگی۔ اپنی نثری تحریروں اور فارسی کی بیانیہ شاعری میں انھوں نے ان خیالات کو واضح اور قطعی شکل میں ظاہر کیا ہے اور غنائیہ شاعری کے تحت الشعور میں بھی یہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ اس کے موضوعات میں ہم عصر معاشرے کے مختلف اور متضاد رجحانات کی گونج پائی جاتی ہے۔ اس میں مٹتے ہوئے نظام کی ٹوٹی ہوئی طنابیں اور بجھتی ہوئی چنگاریاں دیکھی جا سکتی ہیں اور آنے والے دور کا شور سنا جا سکتا ہے۔ اس میں تجسس، تحقیق اور تشکیک کی کیفیت قدم قدم پر رکنے اور سوچنے پر مجبور کرتی ہے 'تماشائی گلشن' اور 'تمنا چیدن'، دل کو گناہ پر اکساتے ہیں۔ زندگی کو بنانے اور سنوارنے کا شوق پڑھنے والے کو بے چین کرتا ہے اور عملی زندگی کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی قدیم اخلاقی قدریں چیختی اور کراہتی نظر آتی ہیں یہ سب غالب کے جدید ذہن کی دین تھی جسے انھوں نے گہری رمزیت اور ماضی کے فکری تسلسل کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ یہ شاعری انیسویں صدی کی ہندستانی ذہنیت کو اتنی ہمواری اور خاموشی سے جدید دور میں لے آئی کہ اسے پتہ بھی نہ چلا۔ غالب نے ہمارے دل و دماغ کو جس ہنر مندی اور شاطرانہ انداز سے نئے افکار کو قبول کرنے پر آمادہ کر دیا کوئی مصلح کوئی مبلغ کوئی حکمراں نہیں کر سکتا تھا، اسی کو ہم نے 'حلقۂ دام خیال' کا نام دیا ہے جسے خود غالب اپنے شعر میں غیر شعوری طور سے استعمال کر گئے ہیں۔

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

مولوی غلام ربانی مرحوم

کچھ بابائے اردو کے بارے میں

مولوی غلام ربانی مرحوم بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بے حد قریبی ساتھی اور اردو کے ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کا ایک غیر مطبوعہ مضمون ہم "تبرکا" شائع کر رہے ہیں جس کا عنوان ہے "کچھ بابائے اردو کے بارے میں" مولوی غلام ربانی کا وطن یوں تو پلول ضلع گڑگاؤں ہریانہ، تھا مگر وہ مستقل طور پر ریاست حیدر آباد میں بس گئے تھے اور ان کی زندگی کا ابتدائی حصہ اورنگ آباد دکن اور بہت زیادہ حصہ شہر حیدر آباد میں گزرا۔ مولوی عبدالحق سے مولوی غلام ربانی مرحوم کے نہایت قریبی مراسم تھے اور اردو کے ادیب رشید الدین کے، مولوی غلام ربانی سے قریبی تعلقات تھے جنھوں نے مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مضمون "کتاب نما" کے لیے بھیج دیا ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں (اڈیٹر)

مولوی عبدالحق پر ہزاروں صفحے لکھے جا چکے ہیں اور لکھنے والوں نے اتنا لکھا ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ میں نے بھی چند مضامین ان کی شخصیت پر لکھے ہیں جن کے بارے میں خود بابائے اردو نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"غلام ربانی صاحب نے میری وہ باتیں لکھی ہیں جن کو میں بھول گیا تھا اور بعض تو ایسی ہیں کہ یاد کرنے سے بھی یاد نہیں آتیں، خواب معلوم ہوتی ہیں۔"

اس موقع پر چند ایسی ہی بھولی بسری باتیں لکھ رہا ہوں۔ ان میں کوئی ترتیب یا سلسلہ نہیں ہے، جو یاد آتا جاتا ہے لکھتا جاتا ہوں۔

جامعہ عثمانیہ سے اردو کی پروفیسری چھوڑ کر مولوی صاحب دلّی چلے گئے مگر اورنگ آباد کی کشش نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ برابر اورنگ آباد کے چکر لگاتے

رہے۔ کوئی پچیس سال ہوئے مولوی صاحب اورنگ آباد آئے ہوئے تھے۔ ان دنوں جناب میر حسن صاحب ریڈیو اورنگ آباد کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ یہ مولوی صاحب کے بہت عزیز شاگرد ہیں، ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مولوی صاحب سے خواہش کی کہ وہ ان کی نشرگاہ سے تقریر کریں، مولوی صاحب نے صاف انکار کردیا۔ میر حسن صاحب نے بہت اصرار کیا مگر وہ نہیں مانے۔ دو تین دن بعد میر حسن صاحب نے ایک ریڈیو سیٹ ان کے بنگلے پر بھجوادیا۔ شام کو جب خبریں نشر ہونے لگیں تو اناؤنسر نے کہا کہ خبروں سے پہلے ایک ضروری اعلان سنیے۔ آیندہ ہفتہ کی شام کو بابائے اردو کی تقریر نشر ہوگی۔ مولوی صاحب نے جب سنا تو بگڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر خاموش ہوگئے۔ دوسرے دن پھر یہی اعلان ہوا وہ جز بز ہو کر رہ گئے۔ تیسرے دن اناؤنسر نے کہا ہم بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ کل شام کو چھ بجے بابائے اردو کی تقریر ہوگی۔ مولوی صاحب بہت برہم ہوئے، کہنے لگے یہ سب میر حسن کی شرارت ہے۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ مگر شاگرد نے وہ داؤں کیا تھا کہ دوسرے دن وقت مقررہ پر مولوی صاحب کی تقریر ہوئی۔ یہ پاکیزہ تقریر میرے پاس موجود ہے۔

مولوی صاحب کے بنگلے سے ملا ہوا ایک بڑا شاداب چمن تھا۔ اس میں گلاب بہت قسم کے تھے۔ مقبرہ کے سیلانی بعض دفعہ وہاں آجاتے اور پھول توڑتے تھے۔ ایک دن میں بنگلے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ مولوی صاحب نے دوسرے کمرہ سے مجھ کو آہستہ سے بلایا۔ میں وہاں گیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑے تھے۔ کھڑکی کے دونوں پٹ بند تھے مگر بیچ میں جھری تھی، مجھ سے کہنے لگے ادھر آؤ تم کو ایک تماشا دکھاتا ہوں۔ میں نے جھری میں سے جھانک کر دیکھا تو دو خواتین چکوترے توڑ رہی تھیں۔ کہنے لگے ان کو ڈانٹنا نہیں، بیچاری پردہ نشین ہیں۔ بھلا ان کو یہ آزادی کہاں نصیب ہوتی ہے۔ دیکھو کس قدر خوش ہیں! اچک اچک کر چکوترے توڑ رہی ہیں۔ میں نے کہا آپ جانتے ہیں یہ کون ہیں۔ ان میں سے ایک تو ابراہیم صاحب (پروفیسر تاریخ) کی بیوی ہیں اور دوسری بیگم ربانی ہیں۔ مولوی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا پھر تو ان کی خبر لوں گا۔ تم یہیں اندر ٹھہرو۔ یہ کہہ کر وہ باہر برآمدے میں آئے۔ ان کو دیکھ کر یہ دونوں جلدی جلدی جانے لگیں۔ مولوی صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔ "کہاں جاتی ہو ادھر آؤ۔" وہ چور بنی ہوئی آئیں۔ مولوی صاحب کو

ہنسی آگئی۔ ان کو کمرے میں بٹھایا اور اپنے آدمی سے کہا ان کے لیے چاے لاؤ اور کچھ مٹھائی بھی لانا۔ رات کو ہماری محترمہ نے فخر کے طور پر کہا آج مولوی صاحب نے ہم کو چاے پلائی۔ میں نے کہا ان کا کیا ہے وہ چوروں کو بھی چاے پلاتے ہیں۔

مولوی صاحب ضلع بیڑ کے دورہ پر تھے۔ نرمل راؤ صاحب مہتمم تعلیمات تھے، وہ بھی ان کے ساتھ ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ نرمل راؤ صاحب کو پاس کے کسی گاؤں میں کام تھا، وہ کچھ دیر کے لیے چلے گئے۔ مولوی صاحب نے ایک پلنگ پر کچھ کپڑے اور بستر ارکھ کر اس پر چادر ڈال دی اور ایک تکیہ پر کوئلے سے آدمی کا چہرہ بنا کر سرہانے رکھ دیا۔ دور سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آدمی کروٹ لیے سو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد نرمل راؤ صاحب آئے۔ مولوی صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے ارے بھئی تمھارے کوئی دوست تم سے ملنے آئے ہیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے پلنگ پر لیٹتے ہی سو گئے۔ نرمل راؤ صاحب نے دروازہ میں سے دیکھا تو واقعی کوئی شخص پلنگ پر لیٹا دکھائی دیا۔ جب زیادہ دیر ہو گئی تو نرمل راؤ صاحب اٹھ کر اندر گئے، چادر اٹھائی تو مطلع صاف تھا۔

بڑے لوگوں کی بھول بھی خوبصورت ہوتی ہے۔ ایک دن مولوی صاحب نے مجھے ایک کتاب Booker Washington دی اور کہا اسے پڑھو بڑی دلچسپ ہے۔ یہ ایک حبشی کی کہانی تھی واقعی دلچسپ تھی۔ امریکہ کی جنگ آزادی میں جن حبشیوں کو آزادی ملی تھی ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ اس نے خود اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔ ہفتہ عشرہ کے بعد مولوی صاحب نے مجھ سے کہا میاں تم نے وہ کتاب مجھے واپس نہیں دی۔ میں نے کہا مولوی صاحب وہ تو میں آپ کو دے چکا ہوں۔ بس پھر کیا تھا بپھر گئے، کہنے لگے۔ نہیں تم نے ہرگز نہیں دی۔ میں نے بڑی غلطی کی جو تم کو وہ کتاب دی۔ میری بہت سی کتابیں اسی طرح ضائع ہو چکی ہیں اور نہ معلوم کیا کیا کہا۔ میں کھسیانا ہو کر اپنے کمرہ میں چلا گیا اور سوچتا رہا کہ آخر میں یہیں رہتا ہوں۔ وہ کتاب کہاں گئی۔ شاید تیسرے دن میں کسی کام سے ان کے کمرے میں گیا، وہ کچھ لکھ رہے تھے اور سامنے میز پر وہ کتاب رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا اور کتاب کو دیکھتا رہا۔

مولوی صاحب تاڑ گئے اور کہنے لگے میاں اسے کیا تک رہے ہو، وہی کتاب ہے تم نے واپس کر دی تھی میں تو یونہی تم کو ستا رہا تھا۔

مولوی صاحب روزہ نماز کے پابند نہیں تھے۔ ایک دفعہ دورہ کے سلسلہ میں ایک گاؤں (سیتک نور ضلع بیڑ) میں پہنچے اور وہاں کے مدرسہ کا معائنہ کیا۔ گاؤں والوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اتنے بڑے مولوی ہمارے یہاں آئے ہیں آج جمعہ کا دن ہے کیا اچھا ہو جو یہ نماز پڑھائیں۔

چنانچہ چند لوگ ان کے پاس آئے اور ان سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ مولوی صاحب نے کہا میں ضرور نماز پڑھاؤں گا اور اس کے بعد میرا وعظ بھی ہوگا۔ گاؤں والے بہت خوش ہوئے اور مسجد بھر گئی۔ آپ نے جمعہ کی نماز پڑھائی پھر وعظ شروع ہوا۔ وہی اردو کی راگنی چھیڑ دی اور چندہ کی اپیل کی۔ جب دورہ سے واپس آئے تو مجھ کو کوئی پچیس روپے دیئے اور کہا یہ ایک نماز کی کرامت ہے۔

چندہ کی فہرست جو دیکھی تو اس میں ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے آٹھ آٹھ اور چار چار آنے دیے تھے۔ ان دنوں انجمن کے لیے ایک ایک روپیہ ایک ایک اشرفی کے برابر تھا۔

انجمن کے ابتدائی زمانہ میں آپ نے قدیم نایاب تذکرے ایڈٹ کرنے شروع کیے جن کی اشاعت سے انجمن کو بہت زیادہ فائدہ ہوا۔ کرم خوردہ نسخوں کو پڑھنا بڑی دیدہ ریزی اور پتہ ماری کا کام ہے اس کے لیے آپ نے رات کا وقت مقرر کیا۔ کھانے کے بعد مجھ کو لے کر بیٹھ جاتے اور بارہ بجے تک کام کرتے کبھی ایک بھی بج جاتا تھا۔ ایک دن میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کسمسا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کہنے لگے کچھ نہیں اچھا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی بے چینی دیکھ کر میں نے کہا آج شاید آپ کا مزاج اچھا نہیں ہے۔ آپ آرام فرمائیں۔ اس پر انھوں نے اپنے پیر کا انگوٹھا دکھایا کہنے لگے تھوڑی دیر ہوئی بچھو نے ڈنک مارا، کمبخت بڑا زہریلا تھا۔ مگر میں نے بھی بدلہ لے لیا۔ اسی وقت اس کو مار ڈالا۔

میں نے دیکھا کہ انگوٹھے پر ورم آگیا تھا اور پیلا پڑ گیا تھا۔ میں سمجھا اب یہ کام نہیں کریں گے مگر اس رات بھی انھوں نے اپنا پورا کام کیا۔ یہ تھی کام کی دھن اور اردو کی لگن جس نے انھیں بابائے اردو بنا دیا۔

حدیثِ دلکش و افسانۂ از افسانہ می خرد
دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی مطبوعات

اشارات قلب پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم

اشارات قلب میں ڈاکٹر سید اسلم صاحب نے سادہ و سلیس زبان میں دل کی صحت، تکلیف، اسباب و متعلقہ مسائل نہایت اختصار کے ساتھ مع ضروری ہدایات کے پیش کیے ہیں۔ قیمت-/6

مولانا ابوالکلام آزاد پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی
(فکرو نظر کی چند جہتیں)

اس کتاب میں مولانا آزدا کے افکار و خیالات اور ان کی علمی و عملی سر گرمیوں کے قومی وملی محرکات کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یقیناً ان مضامین میں قارئین کو مولانا سے متعلق بعض نئی معلومات بھی ملیں گی۔ قیمت-/60روپے

صحرا میں لفظ فضیل جعفری

فضیل جعفری کا شمار آج کے عہد کے سنجیدہ اور ذمے دار نقادوں میں ہوتا ہے۔ دور حاضر کے شاعروں پر لکھے ہوئے موصوف کے ۱۴ نہایت اہم مضامین کا مجموعہ۔ قیمت-/80

جدید ادبی تحریکات و تعبیرات
ڈاکٹر سید حامد حسین

اس مجموعے میں ۲۲ مضامین شامل ہیں جو ۱۹۶۴ سے ۱۹۹۴ء کے عرصے میں لکھے گئے ہیں اور اس دوران اردو کے ادبی منظر نامے میں جن تحریکات و تعبیرات کی کار فرمائی نظر آتی ہے ان کے بعض اہم پہلوؤں کو بحث کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔ قیمت-/51روپے

طرازِ دوام اختر سعید خاں

غزل کا فن نرم آنچ سے جلا پاتا ہے بھڑکتے شعلوں سے نہیں۔ وہ ایک آنسو ہے پلکوں پر ٹھہرا ہوا۔ ایک تبسم ہے ہونٹوں پر پھیلا ہوا۔ کبھی اس کے تبسم میں اشک کی نمی ہوتی ہے تو کبھی اشکوں میں تبسم کی جھلک۔ یہ ساری خوبیاں اس شعری مجموعے میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔
قیمت-/51روپے

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ
ڈاکٹر مومن محی الدین

ڈاکٹر مومن محی الدین کا شمار جدید فارسی ادب کے اسکالر زمین ہوتا ہے۔ موصوف نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ فارسی داستان نویسی کی تاریخ مرتب کی ہے جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔
قیمت-/45روپے

سیر کردنیا کی غافل ڈاکٹر صغرا مہدی
(سفر نامے)

ڈاکٹر صغرا مہدی کا نام اردو دنیا میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مندرجہ بالا کتاب آپ کے پانچ سفر ناموں کا مجموعہ ہے اس کتاب میں ڈاکٹر خالد محمود کا ان سفر ناموں پر تبصرہ اور یوسف ناظم کا دلچسپ خاکہ بھی شامل ہے۔
قیمت-/51روپے

ڈاکٹر وہاب قیصر
پرنسپل
ممتاز کالج ملک پیٹ حیدر آباد

عہدِ آصفیہ میں سائنسی علوم کی ترویج و ترقی

حیدر آباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے اور یہ ایک سال سے بروئے کار ہے۔ سارے اردو والوں کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ انھیں امید ہے کہ مستقبل میں یہ یونیورسٹی تمام عصری تقاضوں کو پورا کرے گی اور اردو ذریعہ تعلیم کی ایک ایسی درس گاہ کہلائے گی جس میں سائنس، ٹکنالوجی اور دیگر عصری علوم کی تعلیم کا انتظام رہے گا۔ اگر ہم حیدر آباد میں سائنسی علوم کی نشر و اشاعت کا تاریخی جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے بہت پہلے اس کی ترویج و ترقی کے لیے بہت کچھ کیا جا چکا تھا۔

انیسویں صدی میں سائنسی علوم کی اشاعت کے لیے حیدر آباد کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ نواب فخر الدین شمس الامرا ثانی (۱۸۶۳۔۱۷۷۵ء) نے یہاں سائنسی علوم کی ترویج میں جو کارہائے نمایاں انجام دیا تھا، دکن کی تاریخ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ایسے موقع پر ہر کسی کے ذہن میں یہ سوال ضرور اٹھ سکتا ہے کہ نوابی تہذیب کے اس دور میں شمس الامرا ثانی کو سائنس کی کتابیں کہاں سے دستیاب ہوئیں؟ اور انھیں سائنسی علوم میں دلچسپی کیوں کر پیدا ہوئی؟ ان سوالات کے جواب کے لیے ہم ان کے بچپن کے حالات پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔

شمس الامرا ثانی کے والد امیر پائگاہ تھے۔ وہ سات سال کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ بادشاہ وقت نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے اعلا تعلیم و تربیت کے لیے انھیں نہ صرف شاہی محل میں رکھا بلکہ بعد میں اپنا داماد بھی بنا لیا۔ اس دور میں انگریز اپنے ساتھ وطن سے سائنسی علوم کی کتابیں لے آتے اور امرا و رؤسا اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں بطور تحفہ پیش کیا کرتے تھے۔ شمس الامرا ثانی کو بچپن ہی میں یہ کتابیں دستیاب ہونے

لیں اور انھیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ انگریزی اور فرانسیسی میں علم ہیئت، ریاضی ور سائنس کے مختلف علوم کی کتابوں سے وہ استفادہ کرنے لگے تھے۔ اردو، عربی اور فارسی میں تو وہ مہارت حاصل کر ہی چکے تھے لیکن انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر بھی انھوں نے کسی قدر عبور حاصل کر لیا تھا جس کا ثبوت دونوں زبانوں کی سائنسی کتابوں کے تراجم سے ملتا ہے جس کو انھوں نے بذات خود انجام دیا تھا۔

شمس الامراء ثانی کی سائنسی علوم میں حد درجہ دلچسپی اور انھیں عوام تک پہنچانے کے جذبے نے علمی اور تعلیمی امور انجام دینے پر مجبور کیا۔ سائنس کی کتابوں کی اشاعت کے لیے انھوں نے "مطبع سنگ شمس الامراء" کے نام سے ۱۸۲۵ء میں ایک پریس قائم کیا جو حیدر آباد کا پہلا پریس تھا۔ اس پریس میں تصویر کشی کا انتظام تھا، سائنسی آلات کے نقشے بھی یہاں چھپتے تھے یہ اس دور کی بات ہے جب سارے ہندستان میں صرف لکھنو، کلکتہ اور مدراس میں دو چار چھاپے خانے تھے۔ حیدر آباد کے تعلیم یافتہ طبقہ کی سہولت کے لیے انھوں نے فارسی میں سائنسی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے ۱۸۲۵ء میں موسیٰ کلارک کی فرانسیسی کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا جو "شمس الہندسہ" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شامل کئی شکلیں ان کے فرزند محمد رفیع الدین شمس الامراء ثالث نے بنائی تھیں۔ یہ کتاب مطبع شمس الامراء سے کئی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کی کئی جلدیں طالب علموں، امراء و شرفائے شہر میں تقسیم کی گئیں۔ علاوہ اس کے انھوں نے ریاضی، علم ہیئت، علم طبیعیات و کیمیا اور دوسری سائنسی کتابیں تحریر کیں۔ سائنس کی چند انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کا اردو اور فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمس الامراء ثانی نے حیدر آباد کے تعلیم یافتہ طبقہ کو سائنسی علوم سے واقف کروانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انھوں نے شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو سائنسی علوم کے کاموں کی طرف راغب کیا۔ اپنے پاس ایسے لوگوں کو ملازمتیں دیں جو ان کے اس کام میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔

شمس الامراء ثانی نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ ریاست کے طالب علموں کو اردو کے بغیر نہ تو سائنسی علوم سے واقف کروایا جا سکتا ہے اور نہ انھیں کوئی نئی زبان سکھائی جا سکتی ہے۔ اردو میں ان علوم کی کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے وہ خود کتابیں تصنیف کرتے اور دوسروں سے لکھوایا کرتے جنھیں نواب صاحب کے مطبع میں چھاپا جاتا چنانچہ ان کی سرپرستی میں میکانیات، بصریات، برقیات، مقناطیس اور موسمیات پر مشتمل انگریزی زبان کی چھ کتابیں ترجمہ کروائی گئیں جو "ستۂ شمسیہ" کے نام سے ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۸۴۳ء میں انھوں

نے حیدر آباد کا پہلا عصری مدرسہ "مدرسہ فخریہ" کو اپنے محل میں قائم کیا، جہاں دیگر جات کے ساتھ فلکیات، ریاضی اور طبعیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔

شمس الامراء ثالث کو سائنسی علوم میں دلچسپی اپنے باپ سے ملی تھی۔ انھیں حساب اور علم ہندسہ میں اچھی خاصی مہارت حاصل تھی۔ ان موضوعات پر انھوں نے نہ صرف کتابیں لکھیں بلکہ دوسروں سے بھی لکھوائیں۔ غرض دونوں باپ بیٹے اور ان کے مقرر کردہ مترجمین کی کوششوں کی وجہ سے بے شمار سائنسی کتابوں کا انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ ہوا۔

حیدر آباد میں خالص سائنسی علوم کے علاوہ فنی اور تکنیکی علوم کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی کیا گیا تھا چنانچہ علم طب کی تعلیم کی ابتداء ۱۸۶۴ء میں ہوئی جب کہ ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے حکم سے ایلوپیتھی طریقہ علاج کی تعلیم کے لیے "حیدر آباد میڈیکل اسکول" قائم کیا گیا، جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں کو جدید طریقہ علاج سے واقف کروایا جاتا تھا۔ اس کا تعلیمی معیار ممبئی کی MBS ڈگری کے مماثل تھا۔ ۱۸۸۴ء میں اس کا ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی کر دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں میڈیکل کو "عثمانیہ میڈیکل کالج" میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۹۲۷ء میں میڈیکل کالج کا اردو ذریعہ تعلیم بحال کرتے ہوئے اس میں ایم بی بی ایس کی جماعتوں کا انتظام کیا گیا، جس کا الحاق جامعہ عثمانیہ سے عمل میں آیا۔ تب تک اردو میں علم طب کی ۲۴ معیاری کتابوں کی اشاعت عمل میں آچکی تھی اور ۳۵ ہزار طبی اصطلاحات کو مدون کیا جا چکا تھا۔ عثمانیہ میڈیکل کالج آج بھی حیدر آباد میں میڈیسن کی تعلیم کا ایک اہم مرکز ہے۔

آصف جاہی دور حکومت میں یونانی طب کو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ ۱۸۹۰ء میں نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے حیدر آباد میں یونانی شعبہ کو قائم کیا تھا۔ اس شعبہ کا قیام ہندستان میں یونانی طبی نظام کو سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے کا سب سے پہلا واقعہ تھا۔ آیورویدک طبی نظام کے محکمہ نے ۱۹۳۳ء میں "نظام آیور ویدک سنگھ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ یہ ادارہ آیورویدک طبی نظام کی ترقی کے لیے کوشاں رہا اور ۱۹۳۵ء میں حیدر آباد میں ایک آیورویدک کالج قائم کیا۔

طبی علوم کے فروغ کے لیے ۱۸۵۸ء میں میڈیکل کالج سے اردو میں ایک سہ ماہی رسالہ "طبابت" شائع ہونے لگا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حیدر آباد میں اردو صحافت کی ابتدا اسی رسالہ سے ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ طب، جراحی اور ان سے متعلقہ سائنسی علوم کی اشاعت کے لیے ۱۸۹۸ء سے "دکن میڈیکل جرنل" کی اشاعت بھی عمل میں لائی

جانے لگی جو اردو اور انگریزی کا دو لسانی ماہنامہ تھا۔ یہ ماہنامہ نواب لقمان الدولہ بہادر، اسٹاف سرجن نظام دکن کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا۔ اس میں بیماریوں پر مضامین، امراض سے متعلق عملاء کے تجربات، بیرون ممالک کی جانے والی میڈیکل سائنس میں تحقیق وغیرہ کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ حیدر آباد سے زرعی سائنس اور صنعت و حرفت کا ایک ماہنامہ "فنون" منشی محمد مشتاق احمد کے زیر نگرانی ۱۸۸۳ء سے شائع ہونے لگا تھا۔ اس کے ذریعہ زرعی پیداواروں اور کھاد سے متعلق تکنیکوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔

حیدر آباد میں انجینئرنگ کی تعلیم ۱۸۷۰ء میں شروع ہوئی، جب کہ "حیدر آباد سول انجینئرنگ اسکول" قائم کیا گیا۔ مگر ۱۸۹۴ء میں بعض وجوہات کی بنا پر اس کو بند کر دیا گیا۔ البتہ ۱۸۷۸ء میں ہنمکنڈہ میں ایک مدرسہ انجینئرنگ قائم کیا گیا تھا۔ اس کو ۱۸۹۸ء میں حیدر آباد منتقل کیا گیا۔ جہاں یہ مدرسہ ۱۹۲۸ تک برقرار رہا اور اسی سال اس کو جامعہ عثمانیہ کے کلیہ انجینئری میں ضم کر دیا گیا۔

جامعہ عثمانیہ میں باضابطہ تعلیم کے آغاز سے دو سال قبل ہی دارالترجمہ وجود میں آچکا تھا جہاں دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم کی انگریزی زبان سے اردو میں منتقلی کا کام شروع کیا گیا۔ جامعہ کی مکمل تشکیل کو تقریباً بارہ سال کا عرصہ درکار ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں اس کا پہلا امتحان میٹرک کے لیے منعقد ہوا۔ جبکہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کا افتتاح اگست ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام جن مقاصد کے تحت عمل میں لایا گیا تھا ان میں ایک اہم مقصد عصری اور سائنسی علوم کی تعلیم دینا بھی تھا۔ چنانچہ نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کا فرمان جو ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۳۶ ہجری کو جاری کیا گیا تھا، اس میں چند کلمات کچھ اس طرح تھے۔

> "......اس سے مقصد اول یہ کہ مملکت میں تعلیم پھیلائی جائے۔ اس کے علاوہ اس کا مطمح نظر یہ بھی ہونا چاہیے کہ طلبہ کی اخلاقی تربیت بھی کی جائے اور ان میں سائنٹفک مضامین کا شوق دلایا جائے ...."

جامعہ عثمانیہ کا قیام حیدر آباد میں جدید سائنسی علوم کی تعلیم اور تحقیق کے لیے سنہری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تمام علوم حتیٰ کہ انجینئرنگ اور میڈیسن کی تعلیم تک، جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا گیا ہے، اردو زبان میں دی جانے لگی تھی۔ جامعہ عثمانیہ اور اس کے شعبۂ دارالترجمہ میں مختلف علوم کی ایک اندازے کے مطابق ۹۶۰ سے زیادہ تراجم و تالیفات پر مشتمل کتابیں شائع ہوئیں۔ جامعہ میں جن سائنسی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا

کے ان میں ریاضی، طبعیات، کیمیا، حیاتیات، معدنیات وغیرہ شامل ہیں۔

جامعہ عثمانیہ میں سائنسی علوم کی تعلیم کا احاطہ پروفیسر عبد الرحمن خاں (۱۸۸۱-۱۹۶۲) کی کاوشوں کے تذکرے کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ رحمن خاں صاحب ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ ماہر تعلیم، سائنس داں اور ماہر فلکیات ہونے کے علاوہ اردو اور فارسی کے ادیب بھی تھے۔ ۱۹۲۴ء میں جب جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل مقرر ہوئے تو سائنسی علوم کی کئی شاخوں کی تعلیم کا آغاز کیا۔ انھوں نے انجینئرنگ، میڈیسن اور زراعی کالجوں کے قیام میں اہم رول انجام دیا۔ جامعہ کی سائنسی تجربہ گاہوں کو ترقی دی۔ اس کی لائبریری کے معیار کو تحقیقی سطح تک بلند کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے سائنسی ریسرچ جرنل کی اشاعت کا آغاز کیا۔ اردو کی اصلاح سازی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مشکل انگریزی کی سائنسی اصطلاحات کو اردو میں ڈھالا۔ یہاں تک کہ اسکول کی سطح پر سائنس کی تعلیم کو رائج کرنے میں ریاستی محکمہ تعلیم کو اپنی خدمات بھی دیں۔

۱۹۳۸ء میں حکومت آصفیہ نے سائنس کی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کیا کہ تمام سرکاری مدارس میں طبعیات، کیمیا اور حیاتیات پر مشتمل جنرل سائنس کو لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل نصاب کیا جائے چنانچہ ۱۹۴۳ء میں اس فیصلہ پر عمل در آمد ہوا جو آج تک قائم ہے۔ ۱۹۴۵ء میں حکومت نے یہ محسوس کیا کہ اعلیٰ تعلیم سے استفادہ حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد آئے دن بڑھ رہی ہے اس لیے شہر حیدر آباد کے تمام تعلیمی اداروں کے ساتھ سٹی کالج میں داخلہ کی نشستوں کی تعداد دوگنی کر دی گئی جو سائنس اور ریاضی کی تعلیم دینے کے لیے مختص تھا۔

۱۹۴۶ء میں جامعہ عثمانیہ میں سائنسی علوم میں تحقیق کے لیے راہیں ہموار کی گئیں حکومت نے بورڈ برائے صنعتی و سائنسی تحقیق کی تشکیل کے لیے ایک تحقیقی ادارے کے قیام کی منظوری دی تاکہ اساتذہ اور طلبہ دونوں ہی کے لیے سائنس میں تحقیق کو بڑھاوا مل سکے۔ جن مضامین میں تحقیق کی سہولتیں فراہم کی گئیں ان میں ریاضی، فلکیات، طبعیات، کیمیا، ارضیات اور حیاتیات شامل ہیں۔ اسکالرس کو تحقیق کی ترغیب کے لیے اسکالرشپ اور فیلوشپ کی منظوری بھی دی گئی۔ بیرونی ریاست کے سائنس دانوں اور ماہرین سائنس کو جامعہ عثمانیہ میں مختصر مدت کے لیے "مہمان پروفیسر" کی حیثیت سے کام کرنے کی دعوت دینا طے پایا۔ چنانچہ ہندستان کے نامور سائنس داں وی رامن کو تین ہفتوں کے لیے مہمان پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔

پروفیسر عبدالستار دلوی
سابق صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی

نو آبادیاتی ہندوستانی انگریزی ادب

(مشہور انگریزی شاعر نسیم ایزیکل کے اعزاز میں مجموعۂ مضامین)

علم و ادب ہندوستانی تہذیب کا ایک نشان امتیاز ہے۔ ہندوستانی تہذیب اپنے علوم، فنون، اور زبان و ادب کے حوالے سے، عالمی تاریخ میں اپنی قدامت اور فکری اعلیٰ بلندی کے لیے شہرت رکھتی ہے۔ یہاں صدیوں سے زبانوں کا بول بالا رہا ہے۔ ایک زبان کے بعد دوسری زبان یہاں ترقی کرتی رہی سنسکرت اور اس کے بعد پراکرتیں اور اپبھرنشائیں یہاں ترقی کرتی رہیں اور انھیں کی کوکھ سے یہاں ہند آریائی زبانوں کا عروج ہوا۔ پھر فارسی اور عربی کے زیر اثر ایک رابطے کی زبان یا لنگوا فرینکا، اردو نے جنم لیا۔ بیرونی زبانوں میں فارسی کے بعد انگریزی نے بھی اپنے لیے اس ملک میں راہیں ہموار کیں۔ فارسی صدیوں تک یہاں انتظامیہ، اعلیٰ ادب اور تہذیب و شائستگی کی زبان رہی، پھر انگریزی کا دور شروع ہوا۔ فارسی نے امیر خسرو، بیدل، نظیری، غالب، اقبال اور دوسرے کئی شعرا پیدا کیے جو ہندستانی ادبیات میں منارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں جب انگریزی ہندستان میں داخل ہوئی تو اس نے بھی یہاں کی فکری اور تہذیبی زندگی کو متاثر کیا۔ اس نے صرف کلرک نہیں پیدا کیے بلکہ اس نے بھی اپنے لیے ہندستان میں مستقل جگہ بنالی۔ یہ بھی انتظامیہ، تعلیم اور ادب کی زبان بنی ہے۔ انیسویں صدی میں بنگال میں دت خاندان نے متعدد شاعر اور ادیب پیدا کیے۔ اربندو، ٹیگور، سروجنی نائڈو بیسویں صدی کے نصف اول کے ممتاز ترین نام ہیں۔ ہندستانی انگریزی ادب ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ آزادی کے بعد اس کی رفتار ترقی میں مخالفتوں کے باوجود اضافہ ہی ہوتا رہا۔ لہذا اب امریکی ادب

کی طرح ہندستانی انگریزی ادب کی اپنی ایک شناخت بن گئی ہے۔ آزادی کے بعد ہندستانی انگریزی شاعروں کی طویل فہرست میں نسیم ایزیکل، ڈام مورائس، عادل جسا والا، اے۔ کے رامانجن، آر پارتھا سارتھی، شیو کمار، مہاپاترا اور کملاداس چند معروف و مشہور نام ہیں۔

نسیم ایزیکل کا شمار جدید ہندستانی انگریزی شاعری میں ایک ممتاز نام ہے۔ بحیثیت استاد، شاعر اور ڈراما نگار کے شہرت رکھتے ہیں اور عرصہ تک ممبئی یونیورسٹی میں امریکی ادب کے استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہیں سے وہ امریکی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انھیں ہندستان اور باہر بحیثیت شاعر غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور اکثر بین اقوامی کانفرنسوں اور مشاعروں (POETRY READING SESSIONS) اور (POERTRY READING FESTIVALS)، میں شرکت کرتے رہے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے اور ڈرامے شائع ہوئے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ (ATIME TO CHANGE) کے نام سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اس کے بعد SIXTY POEMS ۱۹۵۳ میں شائع ہوا، بعد میں ان کے شعری مجموعے THE THIRD ۱۹۵۹ء، THE UNFINISHED MAN ۱۹۶۰ء THE EXACT NAME ۱۹۶۵ء، اور HYMES IN DARKNESS ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئے۔ انھیں ۱۹۸۲ء میں ساہتیہ اکادمی کے انعام سے بھی نوازا گیا۔

نسیم ایزیکل کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ ان کا خاندان صدیوں پہلے یہاں آباد ہو گیا تھا۔ اگرچہ ان کا تعلق اصلاً بنی اسرائیل سے ہے، اب وہ ایک ہندوستانی ہیں اور ایک ہندوستانی انگریزی شاعر کی حیثیت سے اپنی ملکی (ہندستانی) شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ہندستان کے ادبی افق پر ایک جگمگاتا ہوا ستارہ ہیں جس کی ہر طرح سے قدر افزائی ہوئی۔ ایک ادیب، شاعر، دانشور اور نقاد اور ایک استاد کی حیثیت سے انھیں جو مقام ہندستانی انگریزی ادب (INDIAN ENGLISH LITERATURE) میں حاصل رہا وہ قابل رشک ہے۔ نسیم ایزیکل ایک باوقار شاعر اور مرنجاں مرنج انسان ہیں اور ہمارے ادبی حلقوں میں گذشتہ تقریباً نصف صدی سے ایک ادبی رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اگرچہ انگریزی کے صف اول کے شاعر اور ادیب ہیں لیکن انھیں اس بات پر اصرار ہے کہ مراٹھی ان کی مادری زبان ہے مراٹھی کی طرح انھیں اپنے شہر ممبئی

سے بھی بے پناہ محبت ہے جس کا ثبوت ان کی بمبئی سے متعلق وہ نظمیں ہیں جو بامبے پوئمس (BOMBAY POEMS) کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔

۱۹۸۲ء میں میں نے شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی میں جب کرشن چندر چیئر کا عہدہ سنبھالا تو ابتدا ہی سے شعبہ کی ہمہ جہت ترقی میں کوشاں ہو گیا۔ میں نے درس و تدریس اور نصابی تعلیم کے ساتھ اس بات پر بھی زور دیا کہ شعبہ میں علمی و ادبی موضوعات پر باقاعدگی سے توسیعی خطبات اور مذاکرات ہوتے رہیں اور اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے حوالے سے بھی ابلاغ و ترسیل بڑھے، تاکہ طلبا اپنی نصابی ضروریات کے علاوہ اہل علم کو مختلف موضوعات پر سنیں اور اپنے مبلغ علم میں اضافہ کریں۔ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا کہ طلبا میں علمی ذوق پیدا کرنے کے لیے اس طرح کے علمی و ادبی اجتماعات بے حد ضروری ہیں جب شعبۂ اردو میں ان تقاریب کا سلسلہ شروع ہوا تو ان تقاریب کے دعوت نامے طلباء کے علاوہ دیگر شعبوں کے اساتذہ کے نام بھی بھیجے جاتے تھے۔ ایک روز میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ نسیم ایزیکل نے ایک مختصر خط کے ذریعہ اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ میں نے شعبۂ اردو کو فعال بنایا ہے اور اسے صحیح خطوط پر آگے بڑھا رہا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ یونیورسٹی میں زبان و ادب کے دیگر شعبوں کو بھی انھیں خطوط پر کام کرنا چاہیے۔ اس خط کے بعد حقیقتاً میرا حوصلہ بڑھا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب آئے جب ۱۹۸۳ء میں ساہتیہ اکادمی نے انھیں اپنے گراں قدر انعام سے نوازا تو میں نے ان کے سندھی کے شاعر اور میرے رفیق ڈاکٹر ارجند میر چندانی شاد کے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسے کا اہتمام کیا۔ شاد کو بھی اسی سال ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا تھا۔ ممبئی یونیورسٹی کے کالینا کیمپس میں یہ پہلا بڑا جلسہ تھا جس کی صدارت پروفیسر ایم۔ ایس گورے، مشہور ماہر عمرانیات اور وائس چانسلر، ممبئی یونیورسٹی نے کی۔ اس سے ہمارے تعلقات اور رفاقت کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اسی زمانے میں نسیم ایڈنبرا پوئٹری ریڈنگ فیسٹول کے لیے تشریف لے گئے اور واپسی میں ۳۰ مسلسل نظموں کا مجموعہ EDINBUGH INTERLUDE سائکلو سٹائل کاپی مجھے مرحمت فرمائی۔ جس کا اردو ترجمہ حال ہی میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ان ذاتی روابط کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نسیم ایزیکل نہ صرف ایک ممتاز شاعر ہیں بلکہ علمی اور ادبی کاموں سے وہ خوش بھی ہوتے ہیں اور حوصلہ بھی بڑھاتے ہیں۔ یہ ایک وسیع القلب ادیب، شاعر

نوازی بھی ہے۔ جس سے ان کے خلوص، علم و ادب سے دلچسپی اور تعلیمی انداز فکر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ ان کی شخصیت کی بلندی اور وسعت قلبی کی ایک مثال ہے۔ در اصل حقیقت یہ ہے کہ خوبی اور انداز فکر نسیم کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے جس سے ان کے رفیق، دوست اور طلباء بھی فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔

نسیم ایزیکل کی شخصیت کا غالباً یہی پہلو ہے کہ ان کے ملازمت سے سبکدوش ہونے کی بعد، اعتراف خدمات کے طور پر ان دو شاگرد پروفیسر نیلو فر بھروچہ اور پروفیسر ورندا نابر نے ان کے اعزاز میں مجموعہ مضامین مرتب کیا جو ۱۶ دسمبر ۱۹۹۸ء کو ان کی چوہترویں سالگرہ کے موقع پر غائبانہ طور پر ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس جلسہ میں وہ اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے)۔ یہ "ارمغان" MAPING CULTURAL SPACES: POST-COLONIAL-INDIAN LITERATURE IN ENGLISH کے نام سے شائع ہوا۔ ابتداء میں پروفیسر نیلو فر بھروچہ کا نسیم ایزیکل سے انٹرویو ہے جس میں نسیم کے تعلق سے اور بطور خاص ان کی آزادانہ فکر کے تعلق سے دلچسپ گفتگو قلم بند کی گئی ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ میں جدید ہندستانی انگریزی شاعری اور جدیدیت کے پس منظر میں مکرند پرانجپے کا مقالہ ہے۔ اسی طرح "۱۹۲۰ء تا ۱۹۹۰ء کے درمیان ہندستانی انگریزی ناول نگاری" پر ونے کرپال، مینا کشی مکرجی، سی۔ آر۔ تنجا اور اندو سارلیا کے تنقیدی مقالات ہیں۔ دوسرے حصے میں "شعرا اور شاعری" کے زیر عنوان چھ مضامین ہیں جن میں نسیم ایزیکل کے علاوہ جن میں ان کی "بمبئی کی نظمیں" بھی شامل ہیں، کیکی دارو والا ایک پارسی شاعر، ہندستانی انگریزی شاعری کا انتخاب، امتیاز دھار کر کی شاعری اور گولڈن گیٹ، بیانیہ فنکاری کے زیر عنوان بجے کمار داس، آر، راجا راؤ، انجنا دیسائی، جان آلیور سری سرور شیری چاند اور سہاتا داس کے ادبی اور فکری مطالعے شامل ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ پہلے دو حصوں کے مقابلے میں طویل ہے۔ اس میں انگریزی کے ہندستانی ناول اور ناول نگاروں پر تنقیدی مقالات شامل ہیں۔ اس حصے میں کل بارہ مضامین ہیں اور ہندستانی انگریزی ناولوں کے مختلف پہلوؤں پر محیط ہیں۔ ان میں پہلا مقالہ پروفیسر ورندا نابر کا عالمانہ مقالہ "۱۹۸۰ء کے تین ہندستانی ناولوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ" ہے۔ ایک اور مقالہ پارسیوں کے لکھے گئے ناولوں میں پارسی

مذہب و ثقافت کا لارنس و ہائی اثرات پر بھرپور تنقیدی جائزہ ہے۔ یہ مقالہ پروفیسر نیلوفر بھروچہ نے لکھا ہے۔ مذکورہ دونوں مقالات کے مصنفین، اس "ارمغان" کے مرتبین ہیں اور ہندستانی انگریزی ادب میں معروف و معتبر نام ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ملک راج آنند، کے۔ آر۔ نارائن، اینڈو گھوش، سلمان رشدی، نین تارا سہگل وغیرہ کے حوالوں سے مفصل، ناقدانہ اور دلچسپ مضامین ہیں جو ہندستانی جدید انگریزی ادب کو سمجھنے اور اس کی رفتار ترقی اور ان کی فنی اور ادبی خصوصیات نیز ان میں پائی جانے والی ہندوستانیت کا بھرپور تعارف کراتے ہیں۔ یہ مجموعہ مضامین نسیم ایزیکل کی خدمات کا اعتراف ہے جس میں شامل نگارشات ان کے سابق رفقا اور شاعر، ڈرامہ نگار اور استاد کے حضور میں نذرانۂ عقیدت مندی ہے اس گرانقدر تصنیف کے لیے پروفیسر نیلوفر بھروچہ اور پروفیسر ورندانابر (مرتبین کتاب) اور ان کے شاگرد مقالہ نگار خصوصیت سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نسیم ایزیکل

ترجمہ پروفیسر عبدالستار دلوی

دو انگریزی نظمیں

میں بمبئی کو بچا لوں یہ ہو نہیں سکتا
اور اس کو آپ بھی ہر گز بچا نہیں سکتے
انھیں بھی اس کو بچانے کی کوئی چاہ نہیں
جو اس کے حسن کی رعنائیوں کے مالک ہیں
یہ کیا ضرور کہ اس شہر پر خطر میں ہم
کسی طرح سے سہی زندگی بسر کر لیں
مرے خلوص کے وہ برگ ہائے آوارہ
کوئی بھی فصل ہو ہر وقت گرتے رہتے ہیں

☆

مرا خیال تھا میں اس کو چھوڑ آیا ہوں
وہ بے پناہ غریبی جو خشگوار بھی تھی
مری گلی میں جو صدیوں سے بستی آئی ہے
اب اس مقام پہ پھر مجھ کو یاد آتے ہیں
وہ گیت جن سے عبارت تھا بچپنا میرا
جنھوں نے مری غلط فہمیوں کو دھو ڈالا
وہ اشتباہ جو غربت کے ساتھ تھا مجھ کو
میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں آج آخر کار
کہ عیش و رنج تو دنیا میں ہر مقام پہ ہیں
مرا وجود بھی دراصل ایک حصہ ہے
اسی غریبی و پستی کا خستہ حالی کا
میں اس کو پیار کروں یہ تو ہو نہیں سکتا

شاہد میر
ڈائریکٹر کرشی وگیان کیندر
سرونج ۴۶۴۲۲۸

غــــزل

کہنہ لفظ نئے مفہوم — اپنی غزلوں کی ہے دھوم
فتنے نئے اٹھاتے ہیں — چہرے لگتے تھے معصوم
سانسوں کو سنگیت بنا — اپنے من کی تال پہ جھوم
پتی پتی سجدہ کر — پھولوں کو آنکھوں سے چوم
اندھا گھر یاد آئے گا — یوں نا روشنیوں میں گھوم
مجھ پر حکم چلاتے ہیں — جو کردار کیے منظوم
پھانس چبھے جب یادوں کی — باد سحر ہے باد سموم
پینے والے سوچ ذرا — سوکھے ہیں. کتنے حلقوم
ریشمی جال بھی دیکھ ذرا — اے من کے پنچھی معصوم
گہری چپ کا عالم ہے — کیا ہونا ہے کیا معلوم
پھیلا ہوا ہے دام ہوس — سب کچھ پاکر ہوں مغموم
کس منزل کو جانا ہے — راہ میں آئے ماہ و نجوم

ق

کتنے شعر کہے میں نے — کتنے لفظ کیے مرقوم
پھر بھی ایسا لگتا ہے — جیسے ادھورا ہو مفہوم
یہی زندگی ہے شاہد — چند فریضے چند رسوم

شمیم احمد قرار
بی ونگ ۲۰۱۳، ایڈن کوسہ،
تھانہ، ممبئی

غزل

پانی کا جو سجدہ اب تک
بادل دیکھ کے زندہ اب تک

چٹکی بھر امید کے گھر میں
مٹھی بھر آئندہ اب تک

چاند پہ کیا کیا چھڑ کے جان
زخمی ایک پرندہ اب تک

اس کی رادھا کے ہونٹوں پر
سبز و تر گوندا اب تک

راہب پھر بھی راہب ٹھہرا
بے چارا شرمندہ اب تک

فکر و فن کے موتی رولے
ہر آنسو کا رندہ اب تک

نقطہ نقطہ جگ مگ جگ مگ
اپنی غزل تابندہ اب تک

ڈاکٹر شہپر رسول
شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

غزل

تیری آہٹ پہ ترا نام و نشاں بھی کیا ہو
ان فریبوں میں حقیقت کا گماں بھی کیا ہو

اشک آئیں کو نظاروں کی تپش سے جھلسیں
ایسے موسم میں کوئی گریہ کناں بھی کیا ہو

میں تو جھونکا ہوں فضاؤں میں غلط فہمی کا
کوئی خوشبو مری جانب نگراں بھی کیا ہو

کچھ سسکتی ہوئی شامیں بھی جھلستے دن بھی
جب وہاں کچھ بھی نہیں ہے تو یہاں بھی کیا ہو

کون رہتا ہے تغافل کے خرابے میں سدا
ایسے ویران جزیرے میں مکاں بھی کیا ہو

بجھتے رہتے ہیں دیے یوں تو ہزاروں شہپر
لیکن اس صحن کشادہ میں دھواں بھی کیا ہو

شاہد نجیب آبادی
پوسٹ بکس ۲۶۵۷۲، بحرین

غزل

اِدھر اُن کی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
اُدھر شوقِ نظارہ کی فراوانی نہیں جاتی

حیاتِ مختصر میں چرخ نے وہ رنگ دکھلائے
کہ مرتے دم بھی چشمِ وا کی حیرانی نہیں جاتی

ہوئی مدت کہ دیکھا تھا نظارہ زلفِ برہم کا
اُسی دن سے مرے دل کی پریشانی نہیں جاتی

غموں میں سیکڑوں یادیں، بسے ہیں سیکڑوں ارماں
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

تجھے میں کیا بتاؤں باغباں تھا آشیاں کس جا
جلی ہے شاخِ گل ایسی کہ پہچانی نہیں جاتی

ہمیشہ حرکتیں کیں اور ہمیشہ ہی سزا پائی
مگر پھر بھی دلِ شاہد کی نادانی نہیں جاتی

ڈاکٹر خاور خان سرحدی
سرائے میاں، دہلی گیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

غزل

سب بھی پوچھتے ہیں تو مرا کیا لگتا ہے
میں جو سچ بولوں تو لوگوں کو بُرا لگتا ہے

دیکھتا ہوں تو زمانے سے جدا لگتا ہے
وہ ستمگر ہے مگر مجھ کو بھلا لگتا ہے

کارگر ہوتی نہیں کوئی دوا کوئی دعا
اور تو جیسے مقدر کا لکھا لگتا ہے

دوستو! طنز کی ایک حد تو مقرر کر لو
میں بھی انسان ہوں مجھ کو بھی بُرا لگتا ہے

اب وہ تنہائی کا عالم ہے کہ یارو مجھ کو
حالِ دل پوچھنے والا بھی خدا لگتا ہے

پاس جانے سے ہی کھُلتی ہے حقیقت خاور
دور سے پیڑ کا سایہ تو گھنا لگتا ہے

ڈاکٹر عبید الرحمٰن
82C، ابوالفضل انکلیو
... نئی دہلی ۲۵

غزل

ہوا ہے جب سے تعصب زدہ نظر کا چراغ
حصارِ ظلمتِ شب میں ہے سب کے گھر کا چراغ

جو خوش نگاہ تھے ٹھہرے وہ معترف میرے
کہ میرے ہاتھ میں روشن رہا ہنر کا چراغ

ہمارا عیب بھی سب کو ہنر نظر آتا
ہمارے پاس بھی ہوتا جو مال و زر کا چراغ

ارادے جس کے جواں ہیں نظر ہے جس کی حسین
اُسی کے واسطے جلتا ہے رہ گزر کا چراغ

کوئی اندھیرا مرا دل بجھا نہیں سکتا
تمھاری یاد بنی ہے مرے سفر کا چراغ

غرور جن کو بہت ہے اُڑان پر اپنی
جلا نہ ڈالے کہیں ان کو بال و پر کا چراغ

اب اس سے بڑھ کے کوئی اور بات کیا ہوتی
بشر کے ہاتھوں بجھایا گیا بشر کا چراغ

مرے لہو سے بہاروں کی آبرو ہے عبید
مری نوا سے فروزاں ہر اک جگر کا چراغ

کلیم ضیا
صدر شعبۂ اردو اسمٰعیل یوسف کالج
جوگیشوری مشرق، بمبئی۔ ۴۰۰۰۶۰

غزل

خامشی میں بھی تو منظر وہ سہانے دے گا
اور بولے گا تو پتھر کو ترانے دے گا

ہے کواڑوں کی دراڑوں پہ اندھیروں کا ہجوم
وہ تو کرنوں کو بھی اندر نہیں آنے دے گا

ڈور تو خود ہی سنبھالے گا اگرچہ سب کو
وہ فضاؤں میں پتنگوں کو اڑانے دے گا

بارہا غوطے لگانے پہ کرے گا مجبور
ایک موتی بھی سمندر سے نہ لانے دے گا

زخم تو دے گا مگر صبر کی تلقین کے ساتھ
اور پھر اُن پہ نہ مرہم بھی لگانے دے گا

میرے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹا دے گا مگر
مجھ کو اک حرفِ غلط تک نہ مٹانے دے گا

ایک مدت سے ضیا مجھ سے وہ کہتا ہے یہی
درد کے ساتھ محبت کے خزانے دے گا

ترنم ریاض
C-11 جنگ پورہ ایکسٹینشن۔ نئی دہلی ۱۴

کچھ ماہیے گرمی کے

چبھتے ہیں تپش کے تیر
مئی کے مہینے میں
تجھے یاد آئے کشمیر

اوپر سے اگن برسے
ٹھنڈی ہوا کے لیے
کس طرح جیا ترسے

اب کس سے کریں فریاد
بجلی کے جانے پر
ہمیں آتی ہیں جھیلیں یاد

بوندوں کو گھٹاؤں کو
سوچ کے خوش ہو لوں
میں ٹھنڈی ہواؤں کو

دوزخ سے چلا آئے
جون میں کھڑکی سے
بھٹی کی ہوا آئے

صبح کے کچھ ماہیے

خوابوں میں چلا آئے
کوئی پرندہ جب
چہکے چپ ہو جائے

مجھے اپنے ہی جیسا لگا
نیلے فلک پہ صبح
ٹوٹا سا تھا چاند ٹنگا

جو جاگے وہی پائے
صبح کی ہوا لے کر
پیغام حیات آئے

کچھ ماہیے بارش کے

پوری ہوگی خواہش
مٹی کی آئی مہک
کہیں دور ہوئی بارش

کوئی یاد نہ آئے غم
سب میں ہے مجھ کو پسند
اک بارش کا موسم

بارش کی کریں گے بات
سوچ کے جھیلوں کو
ہم گرمی کو دیں گے مات

[illegible] سیما
[illegible] اسٹریٹ، [illegible]
کلکتہ ۷۰۰۰۱۴

غزل

کیا گفتگو گناہ کی ہے کیا ثواب کی
رکھو تم اپنے پاس یہ باتیں کتاب کی

میں دوستوں کو اپنے کہوں بھی تو کیا کہوں
مجھ کو ندی دکھاتے ہیں لیکن سراب کی

دریا جو چڑھ گیا تھا، اتر تو گیا مگر
تصویر رہ گئی وہی آنکھوں میں خواب کی

میری غزل میں چہرہ اترا دیکھتے ہیں لوگ
دیتے ہیں داد مجھ کو مرے انتخاب کی

اب جانے حال کیا ہو غزل جیسی صنف کا
گردن ہے اس کی اور چھری ہے قصاب کی

سیما ملے گا سایۂ امن و سکوں مگر
کچھ اور منزلیں ہیں ابھی اضطراب کی

رؤف صادق یمنی

غزل

بجز حسرت و غم خواب کی تعبیر میں کیا ہے
جلنے کے سوا دھوپ کی تقدیر میں کیا ہے

کیوں مسخ شدہ ہے تیرے احساس کا چہرہ
حالات کی بگڑی ہوئی تصویر میں کیا ہے

یونہی تو بھڑکتے نہیں جذبات ہمارے
شعلوں کی لپک سی تری تقریر میں کیا ہے

اپنے ہی لہو سے نئی تاریخ لکھو تم
اس عہد کی بکھری ہوئی تحریر میں کیا ہے

تا عمر کرے کوئی اسیری کی تمنا
اس زلف گرہ گیر کی زنجیر میں کیا ہے

حالات سکوں خیز، لگے ہم کو کشیدہ
یاروں کے نظریات کی تشہیر میں کیا ہے

دشمن جو سنے دل سے عداوت کو مٹا دے
اخلاص، وفا، پیار کی تفسیر میں کیا ہے

یوسف ناظم

کبوتر خانوں سے خون کبوتر تک

حافظہ ہمارا ایویں سا ہے یعنی حال حال میں کمزور ہوا ہے ورنہ پہلے قابل رشک نہ سہی، اچھا خاصا تھا لیکن یہ بات ایک مدت گزر جانے کے بعد بھی ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم طفل مکتب ہونے کی عمر کو نہیں پہنچے تھے تو ہم سے ہمارے کسی بزرگ نے (تایا ہوں گے یا اگر تایا نہ ہوں گے تو چچا ہوں گے) پوچھا تھا کہ ہمیں کون سے پرندے پسند ہیں۔ ہم نے کچھ سوچ کر جواب میں شمع کے گرد بے وجہ رقص کرنے والے پتنگوں اور پھولوں پر منڈلانے والی تتلیوں کا نام لیا تھا اور ہمارا (یہ نہایت معقول) جواب سن کر ہمارے بزرگ جو جیسا کہ ہم نے بتایا، تایا یا چچا تھے ہنس پڑے تھے۔ اس زمانے میں بزرگ لوگ خواہ کتنے ہی کم بزرگ ہوں، بچوں کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے۔ ان میں خاصا حوصلہ تھا۔ آج ذرا بچوں کی کسی بات پر ہنس کر دیکھیں۔ بچے البتہ ان کی غیر موجودگی میں نہیں خود ان کے روبرو اور بالکل بالمشافہ ان کی باتوں پر ہنستے ہیں اور ایسی ویسی ہنسی بھی نہیں کہ باچھیں کھول دیں یا دل ہی دل میں ہنس کر خوش ہو لیے بلکہ باضابطہ بلند بانگ قہقہے سے اپنا دل خوش کرتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ ہم نے کم سنی (جسے غالب نے کودکی کہا ہے) اور کبر سنی دونوں صورتوں میں قہقہے ہی سنے ہیں۔ اس وقت ہمارے چھوٹے سے دماغ میں انہی دو پرندوں کی گنجائش تھی۔ بھونرے کا نام ہم نے شاید سنا ہی نہیں تھا ورنہ ہم دو کی جگہ تین کو اپنی پسند کا پرندہ بتاتے بہر حال ہمارے بزرگ نے (جو تایا یا چچا تھے) ہمیں بتایا کہ تتلیاں اور پتنگے پرندے نہیں ہوتے۔ اس وقت تو ہم نے ان کی بات مان لی لیکن ان کے پرندہ نہ ہونے میں اب بھی شک ہے لیکن ہم نے اپنی پسند کا دائرہ ذرا پھیلا دیا اور اب جو دو تین پرندے ہمیں پسند ہیں ان میں کبوتر نام کا پرندہ بھی شامل ہے۔ یوں تو فاختہ بھی اچھا پرندہ ہے لیکن اسے چھوؤ تو محسوس ہوتا ہے جیسے قتل پر

باتھ پھیر رہے ہیں اور یہ خاموشی تو اتنی ہے کہ شاید ہی کسی نے اس کی آواز سنی ہو
لیکن فاختہ کو جب سے ہمارے سیاست والوں نے سیاسی پرندہ بنادیا اور اسے امن کا
نمایندہ بنا کر جبرائیل کی طرح ہوا میں اڑانا شروع کیا یہ ہمارے دل سے اتر گئی ورنہ
یقین مانیے یہ ہمیں اتنی مرغوب تھی کہ ہم اس کی خاطر خلیل خاں تک بننے کو تیار تھے۔
اب ہم صرف کبوتروں کو عزیز رکھتے ہیں۔ برسبیل تذکرہ مینا کا بھی ذکر کردیں تو کیا
حرج ہے۔ مینائیں ہمیں بہت بھاتی تھیں اور خاص طور پر گھر کی چھت سے لٹکے ہوئے
پنجروں میں مہمان مینائیں تو ہمیں بے حد پسند آتی تھیں۔ بعض گھروں میں ہم نے
کچھ لڑکیوں کو ان میناؤں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میناؤں
میں جتنی نسوانیت ہوتی ہے اتنی تو اب خود طبقہ اناث میں نہیں پائی جاتی۔ میناؤں سے
ہم بد ظن اس وقت ہوئے جب ہم نے بعض۔ بعض کیا اکثر لوگوں کو طوطا مینا کا ایک
ساتھ ذکر کرتے سنا۔ یہ ہمیں اچھا بہت معلوم ہوا۔ طوطا مینا کی کہانی تو ہم نے نہ سنی
نہ پڑھی لیکن ہمیں ان دونوں کا نام ہی ایک ساتھ لینا کچھ غیر شرعی سا لگا۔ یوں
سمجھیے ہمارے مزاج کا غیر ضروری تقدس پن، میناؤں سے ہماری قربت میں حارج رہا ورنہ
کیا ہم جانتے نہیں کہ یہ غریب ننھی سی جان ہمارے کلچر کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہیں۔
ہمیں ان کی طرف دوبارہ راغب کرنے کی خاطر ہمارے ایک تنقید نگار دوست نے تو
ہم سے ایک وقت یہ تک کہا کہ پرندوں میں میناؤں کا وہی درجہ ہے جو ادب میں امراؤ
جان ادا کا ہے۔ ہم یہ تشبیہ سن کر متاثر ضرور ہوئے لیکن اپنے پسندیدہ پرندوں کی
فہرست میں اضافہ کرنے پر خود کو رضامند نہیں کرسکے۔ ہم اس خیال کے حامی ہیں کہ
اگر اس طرح فہرست میں اضافہ کیا جاتا رہے تو یہ فہرست ہماری سیاسی جماعتوں کی
فہرست بن کر رہ جائے گی۔ کوئی حد ہے سیاسی پارٹیوں کی۔ اب تو ایک آدمی بھی ایک
پارٹی کہلانے لگا ہے۔ (فرد فرید کے معنے اب ہماری سمجھ میں آئے) اس کا ایک ووٹ
ادھر کی بجائے ادھر پڑ جائے تو سرکار کی کرسی کے لیے سوئمبر منعقد کرنا پڑتا ہے اور
کسی کا تیر نشانے پر نہیں لگتا۔ لیکن اس مسئلے سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ آئیے کچھ
کبوتروں کی باتیں ہو جائیں۔

کبوتروں کو ہم نے بے حد ملنسار پایا ہے بلکہ ان کی خوش مزاجی اور نرم روی دیکھ
کر ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ کبوتروں اور انسانوں کی تخلیق شاید ایک ہی دن ہوئی ہو ورنہ یہ
پرندے آدمیوں سے اتنی قربت رکھنے پر مصر کیوں ہوتے۔ ایک زمانے تک ہم لوگ

کبوتر اور بٹیر نام کے پرندوں پر بے تحاشہ دولت صرف کرتے رہے۔ یہ بات ہم ہندستانیوں میں سے تو کسی کو نہیں کھلی لیکن نووارد انگریزوں نے اتنا تو مانا کہ انھوں نے خود ہمیں بٹیر بنادیا۔ ہم نے حالات سے مجبور ہو کر بٹیر بازی اور کبوتر بازی کے مشغلوں کو ترک کردیا لیکن کبوتر بہر حال ہمارے ساتھ رہے، تقریباً شریکِ حیات کی طرح۔ ان کے خورد و نوش کی ذمہ داری ہمارے ہی سر رہی۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھیں دیکھ کر کبھی یہ گمان نہیں گزرا کہ ان کی آبادی میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے اور انھوں نے ہم انسانوں کی طرح دنیا کو تنگ اور اپنے آپ کو باعث ننگ سمجھ لیا ہے۔ یہ پرندے بڑی مستعدی اور جانفشانی کے ساتھ اپنی آبادی کا گراف ایک مقررہ نشان پر رکھتے ہیں۔ (ہم لوگ بہت ٹارگٹ ٹارگٹ کرتے رہتے ہیں لیکن ٹارگٹ کی مخالف سمت میں بھاگتے ہیں اور بھاگنے سے پہلے پاؤں سر پر رکھ لیتے ہیں) کبوتروں کو اپنی آبادی میں کسی زوال کا خطرہ شاید اس لیے بھی محسوس نہیں ہوا کہ یہ پرندے ہمیشہ تناول طعام میں مصروف رہے۔ غذا بندی (ڈرا کٹنگ کا ان میں کوئی منصوبہ نہیں ہے اور نہ انھیں چھریرا رہنے کی کوئی ضرورت ہے)۔ ان کا طریقہ خورد و نوش ہے بھی بہت شریفانہ، سرِشام وہ کھانے پینے کے مشغلے سے مستعفی ہو جاتے ہیں یہ نہیں کہ آدمیوں کی طرح آدھی رات گزرنے تک مصروفِ طعام رہیں۔ کچھ لوگ تو جو ہوتے آدمی ہی ہیں رات کے ۳ بجے گھر پہنچ کر کھانا مانگتے ہیں اس شرط کے ساتھ کہ کھانا گرم ہونا چاہیے اور وہ اس وقت خود اتنے گرم ہوتے ہیں کہ کھانے کی دیگچی ان کے سر پر رکھ دی جائے تو چولھا جلانے کی ضرورت نہ پڑے۔ کبوتر بھوکے سو جائیں گے لیکن غروبِ آفتاب کے بعد ایک دانہ منہ میں نہیں جانے دیں گے۔ لہو و لعب میں بھی انھیں مبتلا ہوتے نہیں دیکھا گیا ہے یہ بڑے شرم و لحاظ کے پرندے ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ انھیں پر کیوں دیے گئے ہیں۔

کبوتروں کو شروع ہی سے آدمیوں کی صحبت بہت پسند رہی ہے اور وہ آدمیوں کے نجی معاملات میں بھی بڑی حد تک دخیل رہے ہیں۔ انھیں سدھاؤ تو سدھ بھی جاتے ہیں۔ پورا نصاب تو خیر یہ نہیں پڑھ سکتے لیکن سبق اگر مختصر اور اس میں شعر و سخن کی طرح کی کوئی پیچیدگی نہ ہو تو سبق انھیں پوری طرح یاد رہتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ ایک زمانے تک آدمیوں کے ایک مخصوص طبقے کے خطوط یہ کبوتر ان کے مرسل الیہوں کو نہایت دیانت داری کے ساتھ پہنچاتے رہے۔ کبوتروں کو اچھی

طرح معلوم تھا کہ ان خطوں میں لکھا گیا ہوتا ہے لیکن انھوں نے کوئی خط نہ ضائع کیا نہ اصل مرسل الیہ کے علاوہ کسی اور کے حوالے کیا۔ ہاں اگر مرسل الیہ کے گھر والوں کی بدگمانیوں اور سزا رسانیوں کی بنا پر کوئی خط کسی ماموں یا چچا کے ہاتھ پڑ گیا ہو اور اس کے نتیجے میں کوئی بکھیڑا کھڑا ہو گیا ہو تو کسی کبوتر کو انفرادی طور پر اور کبوتروں کے قبیلے کو اجتماعی طور پر اس کا قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ آدمیوں کے کلچر میں ایسا ہوتا ہے کہ کرتا کوئی ایک شخص ہے اور بدنامی کا سہرا پورے فرقے یا قوم کے سر باندھ دیا جاتا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ اس سہرے کو کسی نوشاہ کا سہرا سمجھ کر جگہ جگہ اسے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ پہلے زمانے کے معاشقوں میں بڑا نظم و ضبط تھا۔ ان کا ایک ان لکھا قانون تھا اور سارے عاشق اس کے پابند تھے۔ یہ لوگ قطعاً تلوّن مزاج نہیں تھے۔ ہرجائی پن، تو ان میں سرے سے تھا ہی نہیں۔ اگر عشق ایک جگہ پھل پھول سکا تو کسی بھی عاشق کے دل میں دل بدلی کا خیال نہیں آیا۔ اس نے یا تو صبر کا میٹھا پھل کھانے کے انتظار میں عشق سے توبہ کر لی یا ایک نامراد عاشق کی حیثیت سے مر جانا اور اپنا نام روشن کرنا قبول کیا لیکن عشق کو تاش کے پتوں کا کھیل نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ میں نامراد عاشقوں کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ کامیاب عشق کو کبھی شہرت نہیں ملی۔ (استثناء کی بات اور ہے) عاشقوں کی بے دماغی ایک عام بات تھی لیکن کبوتروں نے بعد میں محسوس کیا کہ آدمی صرف تجارت اور سیاست کے معاملات میں نہیں، عشق کے معاملے میں بھی بددیانت ہوتا جا رہا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو رسل و رسائل کے معزز پیشے سے الگ کر لینا مناسب سمجھا۔ آج کوئی کبوتر جانتا تک نہیں کہ اس کے آباواجداد طبعاً اور عملاً ڈاکیے تھے۔ خود آدمی بھی تو اپنے پیشہ آبا سے منحرف ہو کر طرح طرح کے پیشوں سے منسلک ہو گیا۔ ستمگری قحبہ گری تک بیسیوں پیشے ہیں جو آدمیوں میں مقبول ہیں۔ جس طرح چند ملکوں میں شادی صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ شادی بغیر طلاق نہیں دی جا سکتی اسی طرح چند ملکوں میں قانون شکنی کے شوق کی خاطر قانون بنائے جاتے ہیں۔ کبوتروں نے بہرحال اپنی کشادہ دلی کی وجہ سے آدمیوں کے خلاف کوئی محاذ نہیں بنایا۔ یہ تو کبوتر ہیں بڑے سے بڑا پرندہ بھی آدمیوں کے مقابلے میں پر نہیں مار سکتا اس لیے صرف خطوط رسانی کا کام متاثر ہوا۔ کبوتروں نے اپنے تعلقات کا سلسلہ حسب سابق برقرار رکھا۔ کبوتر چونکہ شہری پرندے ہیں اور بلدی حدود میں ان کی رہائش ہے اس لیے آدمیوں اور کبوتروں کے

بیچ میں کوئی دیوار کھڑی ہوئی نہ کوئی خلیج حائل ہوئی۔ کبوتر گھروں میں نہیں پالے جاتے لیکن آدمیوں نے ان کے لیے جگہ جگہ کبوتر خانے قائم کر رکھے ہیں جن کا پوسٹل ایڈریس کبوتروں کے پاس موجود ہے۔ بڑے شہروں میں جہاں کبوتروں کی رہائش عام ہے، قلت امکنہ کی وجہ سے ان کے کھانے پینے کا بندوبست شارع عام پر کیا جاتا ہے۔ پولیوشن میں اضافہ ہو جائے یا راہ گیروں اور کار نشینوں کو ایک دوسرے سے بچ کر چلنا اور گزرنا پڑے تو کوئی حرج نہیں لیکن کبوتروں کی دعوت تو ہو کر رہے گی۔ سڑکوں پر دعوت بھی آدمیوں ہی کی قائم کی ہوئی روایت ہے۔ شادی بیاہ کے موقعے پر ہر کسی کو کہاں کوئی شادی خانہ دستیاب ہوتا ہے۔ سڑکیں ہی کام آتی ہیں۔ یہ طریقہ ہمیں بھی پسند ہے۔ یہ راستہ روکو کی مہم نہیں ہے۔ اس میں دکانوں کے شٹر نہیں گرائے جاتے نہ موٹر گاڑیوں کے ٹائر پر عمل جراحی کی جاتی ہے بلکہ کیا تعجب کہ اگر آپ کسی ایسے محلے سے گزریں جہاں پنڈال کھڑا کیا گیا ہو تو آپ کو بھی شربت پینا پڑے۔ (شربت کی حد تک تو خیر ٹھیک ہے لیکن ٹھنڈائی پینے سے احتراز کرنا چاہیے ٹھنڈائی پینے کے بعد آگے چلے بغیر منزل خود سامنے آجاتی ہے۔)

کبوتروں کو معلوم ہے کہ اب وہ پالتو پرندے نہیں رہے لیکن ان کی کدوکاوش جاری ہے۔ جہاں بھی موقع ملتا اور گنجائش نظر آتی ہے کبوتر خانہ سازی سے چوکتے نہیں ہیں۔ کیا تعجب آدمیوں نے اسی بنا پر ان کے کھانے کا انتظام سڑکوں پر کر دیا ہو۔ وہ لوگ جو مقررہ کبوتر خانوں سے بہت دور رہتے ہیں کیا تعجب آگے چل کر ان کبوتروں کے لیے ٹفن بھیجنے کا بھی انتظام کر دیں۔ ویسے کبوتروں کا ٹفن ہوتا ہی کتنا ہے گھر سے کچھ بھیجے یا لے جانے کی ضرورت نہیں، کبوتر خانوں کے قریب ہی دانہ فروشوں نے اہل خیر کے لیے چلتی پھرتی غذائی سبیلوں کا بندوبست کر رکھا ہے۔

پرندوں کی اس خوبی کی جسے صفت کہنا چاہیے کوئی داد نہیں دیتا کہ کبوتر خانوں میں کوئی دوسرا پرندہ نہ پر مارتا ہے نہ منہ۔ یہ تو آدمی ہے جسے ملک گیری کی ہوس جگہ جگہ لیے پھرتی ہے۔ کبوتر خانوں کے اطراف نہ تو کوئی سیکورٹی ہے نہ راتوں میں گشت کرنے والی وین ان کی نگرانی کرتی ہے۔ حد یہ ہو گئی کہ ناٹو جیسا خوفناک اور مہلک ادارہ بھی کسی کبوتر خانے کو نشانہ نہیں بناتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو گی کہ خونِ کبوتر ہوتا ہی کتنا ہے۔

مجتبیٰ حسین
[illegible]
[illegible]

پتھر کے دور سے پتھری کے دور تک

کون کہتا ہے کہ انسان پتھر کے دور سے نکل کر لوہے کے دور ' صنعتی دور وغیرہ سے ہوتا ہوا اخلاقی دور میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ انسان آج بھی پتھر کے دور میں زندہ ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ آج بھی ہم بڑے اہتمام کے ساتھ ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے رہتے ہیں۔ ہمارے رہنماؤں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں اور ان کی عقل پر تو اور بھی زیادہ پتھر پڑے رہتے ہیں۔ ان حالات میں ہم جیسے لوگ اپنے دل پر پتھر رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اردو شاعر تو خیر یوں بھی بڑی آسانی سے ایک دوسرے کے سر پھوڑنے کے اہل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے از راہ عنایت اپنے ہی پتھر سے خود اپنا سر پھوڑنے کو ہمیشہ پسندیدہ فعل جانا بلکہ اس خصوص میں معشوق کے سنگ آستاں تک کو زحمت دینا گوارا نہ کیا۔

وفا کیسی ' کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

کہنے کو انسان چاہے کسی بھی دور میں داخل ہوا ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پتھر کی اہمیت ہر دور میں برقرار رہی ہے بلکہ حضرت شیخ سعدی تو پتھر کی آزادی کے بھی قائل رہے ہیں۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ ایک بار وہ کسی شہر سے گزر رہے تھے تو ایک کتے نے ان پر بھونکنا شروع کر دیا۔ انھوں نے کتے کو مارنے کے لیے زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کو اٹھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ پتھر زمین میں کافی اندر تک دھنسا ہوا ہے۔ اس پر شیخ سعدی نے کہا "بڑا عجیب شہر ہے ' یہاں لوگ کتے کو تو کھلا چھوڑ دیتے ہیں لیکن پتھر کو باندھ کر رکھتے ہیں۔"

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم کسی بھی بات کو گھما پھرا کر بیان کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے اپنے قارئین پر اتنی لمبی تمہید کا پتھر اؤ صرف یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ پچھلے دنوں

ہمارے پتّے کی پتھری کا آپریشن ہوا ہے اور اس آپریشن کے بعد ہم پر یہ راز منکشف ہوا کہ انسان پتھر کے دور سے نکل کر کسی اور دور میں نہیں گیا بلکہ پتھری کے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ کہنے کو انسان کئی ادوار سے گزر کر خلائی دور میں داخل ہوا ہے لیکن ہر دور میں وہ کچھ ایسی حرکتیں کرتا رہا ہے جن سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر سے پتھر کے دور میں داخل ہونے کی دلی خواہش رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ جو ایٹمی طاقتیں آئے دن ایٹمی تجربات کرتی رہتی ہیں تو وہ انسان کی اس دلی خواہش کی غماز ہیں۔ خیر ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ پچھلے ہفتہ حیدرآباد کے میڈی سٹی اسپتال میں ہمارے اس پتّے کو جسے ہم زندگی بھر یا تو مارتے رہے یا جسے پانی پانی کرتے رہے، ہمارے پیٹ سے کاٹ کر نکال باہر کر دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس پتّے کو پتھری کی شکایت لاحق ہو گئی تھی اور جو پچھلے دو ڈھائی برسوں سے ہمیں تنگ کرتا چلا آ رہا تھا۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ہم مثالی صحت رکھتے ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں ہمارا ٹمپریچر کبھی نارمل سے اونچا نہیں ہوا۔ دل ہمارا آج تک اس لیے خراب نہیں ہوا کہ ہم نے اسے کبھی اپنے پاس نہیں رکھا۔ جہاں کوئی اچھی شکل دیکھی اس کی جھولی میں اسے ڈال دیا۔ ہماری ساری خرابیوں کی جڑ ہمارا اپنا پاپی پیٹ ہی رہا ہے جس کی خاطر ہم نے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے مگر اسے ہم کبھی اپنی ذات سے الگ نہ کر سکے۔ یوں بھی دل کے تو کئی خریدار مل جاتے ہیں لیکن پاپی پیٹ کا کوئی خریدار نہیں ملتا۔ غرض ہم جہاں گئے اپنے اس بدکار پیٹ کو ساتھ لے کر گئے (دعوتوں میں تو اور بھی زیادہ ساتھ لے گئے) ہمارے دوست افتخار عارف کا شعر ہے۔

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر سگِ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

ڈیڑھ دو برس پہلے جب ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے پتّے میں پتھری آ گئی ہے تو ہم نے اس کے آپریشن کو حتی الامکان ٹالنا چاہا۔ ہم نے سوچا کہ جس پتّے کو ہم زندگی بھر مارتے رہے اب اسے کیونکر اپنی ذات سے الگ کریں۔ ہماری ذات میں مارنے کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے۔ اگر یہ نکل جائے تو ہم کسے ماریں گے۔ نفسِ امّارہ کو مارنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ مارا نہ گیا۔ اب ایک پتّہ رہ گیا ہے سو وہ بھی خموش ہے۔ دوسری بات یہ کہ دوستوں کی مزاج پرسی کرنے کے لیے یوں تو ہم سیکڑوں بار اسپتال گئے ہیں لیکن خود کبھی اسپتال میں شریک نہیں ہوئے۔ اگرچہ نوجوانی میں بیسیوں مرتبہ ہم اپنے ہوش گنوا چکے ہیں لیکن انستھیزیا (Anesthesia) کی مدد سے اپنے ہوش گنوانے کو ہم نے ہمیشہ کسرِ شان سمجھا۔ پھر پیٹ کے آپریشن سے ہم اس لیے بھی گھبراتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ بعض اوقات غلطی سے آپریشن کے دوران اپنی چھری، چاقو، پستول، قلم، قینچی وغیرہ پیٹ میں رکھ کر بھول جاتے ہیں اور بعد میں مانگنے چلے آتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی ڈاکٹروں

کی بڑائی ہے ورنہ آج کے زمانہ میں کون کسی کے پیٹ میں اپنی کوئی چیز چھوڑتا ہے۔ بعض لوگوں کا ہاضمہ اتنا اچھا ہوتا ہے کہ پورے ملک تک کو کھا کر ہضم کر لیتے ہیں لیکن ہم جیسوں سے ایک معمولی [illegible] ہضم نہیں ہوتی۔ ویسے ڈاکٹروں کا بس چلے تو مریض کا پورا پیٹ تجوری سمیت نکال کرلے جائیں۔ کیا کریں ڈاکٹر کو بھی تو اپنے پاپی پیٹ کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ غرض ایسی ہی باتوں کی وجہ سے ہم پیٹ کے آپریشن سے گریز کرتے رہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ہم نے اپنے دل میں کئی باتیں چھپا کر رکھی ہیں لیکن آج تک ہمارے پیٹ میں کوئی بات نہ رہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ہمیں ہلکے پیٹ کا آدمی سمجھتے ہیں۔ پہلے ہی ہمارا پیٹ ہلکا ہے اوپر سے اس میں سے پتا نکال دیا جائے تو اس میں باقی کیا رہ جائے گا۔

اسے ہماری خوش بختی ہی کہیے کہ ہمارے پیٹ کا آپریشن امراض شکم کے نوجوان سرجن ڈاکٹر ونئے کمار نے کیا جو ہمارے کرم فرما جناب شیو شنکر کے فرزند ہیں۔ ہمیں یہ یقین بھی تھا کہ شیو شنکر صاحب سے ہمارے مراسم کی وجہ سے ڈاکٹر ونئے کمار ہمارے پیٹ میں قینچی وغیرہ نہیں بھولیں گے۔ جب ہم نے اس بھروسہ کا اظہار ڈاکٹر ونئے کمار سے کیا تو بولے "جناب! آپ کے پیٹ کو کھولا ہی نہیں جائے گا تو اس میں قینچی کو رکھ کر بھولنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے میں تو سرجری کی جدید تکنیک (Laparoscopy) کے ذریعہ آپ کے پتے کو پتھری سمیت باہر نکال لوں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر ونئے کمار نے ڈیڑھ گھنٹہ کی سرجری کے ذریعہ کچھ ایسی صفائی سے ہمارے پتے کو پیٹ سے نکال باہر کیا کہ آپریشن کے چھ گھنٹوں بعد ہی ہم نہ صرف اپنے بستر میں اٹھ بیٹھے بلکہ کچھ دور چلنے کا بھی مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر ونئے کمار نہایت مستعد اور چاق وچوبند نوجوان ہیں۔ اپنی بات چیت میں "خدا کا فضل' خدا حافظ' انشاء اللہ' ماشاء اللہ" جیسے لفظوں کا بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ گویا علم طب کی مدد سے جہاں عمل جراحی انجام دیتے ہیں وہیں زخموں پر مندرجہ بالا ادو لفظوں کے ذریعہ مرہم کا پھاہا بھی رکھتے جاتے ہیں۔ اسے ڈاکٹر ونئے کمار کی جراحی کا کمال کہیے یا ہماری مثالی صحت کا کرشمہ کہ اسپتال میں اپنے دوروزہ قیام کے دوران میں وہاں کے عملہ سے ہمارے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکے۔ نرسیں ہمیں مریض سمجھ کر ہم پر اپنے التفات کی بارش برسانا چاہتی تھیں اور ہماری خواہش تھی کہ یہی کام وہ ہمیں صحت مند سمجھ کر انجام دیں۔ سوچنے کے اس بنیادی فرق کی وجہ سے اسپتال کی ایک دایا نے تو ہمیں زبردستی پہیہ دار کرسی پر بٹھادیا کہ بندہ خدا کچھ دیر کے لیے تو مریض بنے رہو۔ مریض بننے کی اتنی بھاری فیس اسپتال کو دے رہے ہو تو اس کا فائدہ بھی اٹھاؤ مگر ہم نے مریض بن کے نہ دیا' چنانچہ آپریشن کے دوسرے ہی دن علی الصبح جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم

غفلت میں اسپتال کے کپڑوں میں ہی چہل قدمی کرنے کے لیے اپنے کمرہ سے باہر نکل کر چلے گئے۔ کیا کریں چہل قدمی کی عادت پچیس تیس برس پرانی ہے۔ اس سے کیوکر دستبردار ہو جائیں۔ اس پر نرسوں نے واویلا مچایا کہ یہ مریض اسپتال میں صحت مندوں کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ بعض اوقات تو اپنے بستر سے بھی غائب رہتا ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹروں نے کمار نے ہمیں دو ہی دن میں اسپتال سے چھٹی دینے میں عافیت سمجھی (ہماری نہیں اپنی) اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری مزاج پرسی کے لیے آنے والے احباب بھی اسپتال کے عملہ کے لیے مسئلہ بنتے چلے جا رہے تھے حالانکہ ہمارے احباب کو ہماری علالت کی اطلاع صرف اڑتے اڑتے ہی ملی تھی۔ کچھ کرم فرما ایسے بھی تھے جنھوں نے میڈی سٹی اسپتال کی بجائے میڈوین اسپتال سن لیا اور ہماری مزاج پرسی کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ ہمارے بزرگ دوست جناب محسن علی بتاتے ہیں کہ وہ بھاگے بھاگے میڈوین اسپتال گئے۔ ریسپشن پر ہمارا نام بتایا تو انھیں ایک کمرہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں سچ مچ ایک مجتبیٰ حسین داخل تھے جو اتفاق سے اس وقت بعض ضروری طبی معائنے کرانے کے لیے اسپتال کے کسی شعبہ میں گئے ہوئے تھے۔ البتہ کمرہ میں ان کی خوش اخلاق بیگم صاحبہ ضرور موجود تھیں۔ محسن علی صاحب کو بڑے تپاک سے یہ کہہ کر بٹھایا کہ آپ تشریف رکھیں وہ ابھی آجاتے ہیں۔ محسن علی صاحب نے ہمیں بعد میں بتایا کہ خاتون چونکہ خاصی کم عمر نظر آرہی تھیں اس لیے انھیں ایک لمحہ کے لیے شبہ بھی ہوا کہ شاید وہ غلط جگہ آگئے ہیں۔ (محسن علی صاحب صحیح جگہ پر پہنچ کر اسے غلط سمجھنے کے لیے یوں بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں) اتنی دیر میں وہ ہمارے بارے میں کئی مشکوک اندازے بھی قائم کرتے رہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اصلی مجتبیٰ حسین آئے تو ان کی غلط فہمی رفع ہوئی مگر افسوس کہ ان کے میڈوین سے میڈی سٹی آنے تک ہم گھر واپس ہو چکے تھے۔ اس معاملہ میں ہمارے ایک اور کرم فرما پروفیسر جعفر نظام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ مزاج پرسی کرنے والوں کی بھیڑ تو یقیناً رہی لیکن ہمیں یہ سہولت حاصل رہی کہ ان ہی دنوں میں پروفیسر سراج الدین بھی میڈی سٹی اسپتال کے ایک کمرہ میں شریک تھے۔ جب مزاج پرسی کرنے والوں کی بھیڑ بڑھ جاتی تو ہمارے ایک دوست بعض احباب سے کہتے "بھئی اتنی دیر میں آپ ذرا پروفیسر سراج الدین صاحب کی مزاج پرسی کر آئیے۔" جب سراج الدین صاحب کے کمرہ میں لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی تو وہ کچھ لوگوں کو ہماری طرف بھگا دیتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون کس کی مزاج پرسی کر رہا ہے۔ اس مسئلہ کا بھی واحد حل یہی تھا کہ ہم جلد از جلد اسپتال سے گھر بھاگ آئیں۔ سو ان دنوں پتے اور احباب کے بغیر ہم آرام سے ہیں اور سچ مچ آرام کر رہے ہیں۔

نصرت ظہیر
۱۹-ئے، گھڑی پور دہلی ۹۱

بڑے حکیم صاحب!

اس ملک میں اردو زبان کا عجیب حال ہے۔ ہندی کے سر ٹیفکٹ کے ساتھ فلموں میں بولی جاتی ہے تو سنیما گھروں کی ٹکٹ کھڑکیاں اور باکس آفس کے ریکارڈ توڑ دیتی ہے مگر جب اردو کے نام سے اردو میں چھاپی جاتی ہے تو گھر کے برتن بھانڈے تک بکوا دیتی ہے۔ اردو کتابوں اخبارات اور رسائل کا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے کہ ان کی ردی تک کم داموں میں بکتی ہے۔

یہ غالباً ہندستان کی واحد زبان ہے جس میں نناوے فیصد رسالے صرف بند ہونے کے لیے نکلتے ہیں۔ آئینہ۔ کتاب۔ سوبرس۔ خبر و نظر۔ درجنوں ادبی سماجی ماہنامے، ہفت روزے بازار میں آئے، کچھ دن چمکے اور پھر ایسے غائب ہوئے کہ ان کی داستانیں بھی داستانوں میں نہ رہیں۔

مگر خدا بھلا کرے بڑے حکیم صاحب کا۔ یہ ان ہی کا دم ہے کہ تمام تر نامساعد حالات کے باوجود کئی اردو رسالے آج بھی بڑے ٹھاٹ سے چل رہے ہیں اور خوب روپے کما رہے ہیں۔

آپ پوچھیں گے، بڑے حکیم صاحب کون؟ تو ہمارا جواب ہوگا، یا تو آپ مذاق کر رہے ہیں یا پھر آپ نے اردو کے رنگ برنگے ادبی اور فلمی، سالوں کی پشت پر چھپے وہ اشتہار نہیں پڑھے جن میں زندگی سے مایوس نوجوانوں کو بشارت دی جاتی ہے کہ خبردار۔۔۔ مایوس مت ہونا۔ بڑے حکیم صاحب کے پاس تمھاری ہر پوشیدہ اور نیم پوشیدہ بیماری کا علاج موجود ہے۔ بےکار اور فضول جگہوں پر اپنی حلال کمائی کے روپے برباد کرنے کے بجائے حکیم صاحب کو بے جھجک اپنے حالات لکھ کر مندرجہ

ذیل پتے پر بھیج دو۔ وہ ایسا مشورہ دیں گے کہ زندگی سدھر جائے گی اور مشورہ کی فیس کچھ نہیں ہے۔

یہ رسالے بڑے شوق سے خریدے جاتے ہیں، اور ہر رسالہ کے دفتر میں بڑے حکیم صاحب کے نام آنے والے خطوط کے ڈھیر لگتے رہتے ہیں۔ پرانی دلی میں، جو کہ ہندستان میں ان چھپتے دیکھتے رسائل کا سب سے بڑا مرکز ہے، آصف علی روڈ، دریا گنج اور جامع مسجد سے درجنوں ایسے رسائل اور ڈائجسٹ نکلتے ہیں جو صرف بڑے حکیم صاحب کی سرپرستی میں چل رہے ہیں بلا شبہ یہ رسالے کشتوں، معجونوں اور گولی واجد علی شاہ وغیرہ کے ذریعے اردو ادب میں یونانی ادب کے ایک نئے شعبے کو فروغ دے رہے ہیں جس پر ابھی ہمارے ادبی نقادوں کی نظر نہیں گئی ہے۔ البتہ جب یہ شعبہ پوری طرح فروغ پا جائے گا تو امید کی جانی چاہیے کہ اردو ادب اور یونانی طب کے باہمی اختلاط سے ایک ایسی نئی فضاء تیار ہو گی جس میں ادب کی کتابوں میں تواطر بلال زمانی و مکانی اور دلانہ مشتقاش کے فضائل پر انتقادی بحث ہو گی اور طب کی کتابوں میں میر تقی میر کے حزن و اضمحلال اور غالب کے قلندرانہ خیالات کے انسانی اعصاب پر مرتب ہونے والے معتر و غیر معتر اثرات جیسے معاملوں کا ذکر ہو گا!

اس کے بعد مزید امید کی جا سکتی ہے کہ ایک دن وہ بھی آئے گا جب یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اردو شعبوں سے ہمارا طالب علم معجون فلاسفہ کی ڈگری لہراتا ہوا باہر نکلے گا اور طبیہ کالج سے "درد منت کش دوانہ ہوا، میں نہ اچھا ہوا برانہ ہوا" گنگناتا ہوا بر آمد ہو گا یا پھر غالب کے دوسرے طبی اشعار گنگنارہا ہو گا۔ مثلاً، آخر اس درد کی دوا کیا ہے، میرے دکھ کی دوا کرے کوئی یا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا والے اشعار!

یقین کیا جانا چاہیے کہ جب یہ زمانہ آجائے گا تب ادب کے ڈاکٹر اپنے تنقیدی مضامین میں تخلیق کے کرب اور عرق النساء کا تقابلی تجزیہ کر کے دکھایا کریں گے اور حکیم حضرات اپنے مطب میں شعروں کا اطلائے خفی و جلی نکالا کریں گے۔

غالباً ہم کافی دور نکل گئے۔ چلیے واپس بڑے حکیم صاحب کے پاس آتے ہیں۔

آپ پھر پوچھیں گے آخر یہ بڑے حکیم صاحب کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔

کیا کرتے ہیں؟ تو سنیے۔

بڑے حکیم صاحب اردو کے ہر علمی ادبی رسالہ کے دفتر میں رہتے ہیں۔ کہیں ان کا نام عبدالغفور ہے، کہیں عبدالشکور کہیں خدا بخش کہیں نورالٰہی۔۔ لیکن دنیا انھیں بڑے حکیم صاحب، ہمارے حکیم صاحب، جناب حکیم صاحب یا عبدالحکیم صاحب کے نام سے ہی جانتی ہے۔ کہیں یہ حکیم صاحب رسالے کے بنڈل باندھنے اور پارسل تیار کرنے پر مامور ہوتے ہیں، کہیں شعبہ اکاؤنٹ میں منشی کا کام کرتے ہیں، اور کہیں نوجوانانِ ملت کی ارسال کردہ بے شمار غزلوں اور نظموں کو پڑھ کر ان کے اوزان اور بحور کو درست کرنے کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ بلکہ ایک حکیم صاحب کو تو ہم نے تین افراد پر مشتمل دفتر کے لیے بازار سے چائے پان اور سگریٹ لانے کی خدمت پر بھی مامور دیکھا ہے۔

لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے۔ ان کی لکھاوٹ بڑی پختہ ہوتی ہے، جس سے پڑھنے والا مرعوب ہو جائے۔ ان حکیموں کا جز وقتی کام یہ ہوتا ہے کہ جب یہ اپنے اصلی کاموں سے فارغ ہو جاتے ہیں تو انھیں اڈیٹر لفافے اور بڑے حکیم صاحب کے نام سے چھپے ہوئے لیٹر پیڈ پکڑا دیتا ہے۔ جن پر یہ ایک ہی جیسا مضمون تحریر کرتے رہتے ہیں۔ یہ مضمون ان بے شمار خطوں کے جواب میں ہوتا ہے جو دوبئ، مسقط، ریاض، ابوظہبی بحرین، جیسے مقامات پر روزی کمانے کے لیے گئے ہوئے، تنہا زندگی گزارنے والے نوجوان اپنی طرح طرح کی گفتنی و ناگفتنی بیماریوں کے بارے میں مشورے کے لیے بھیجتے ہیں۔

مرض چاہے کوئی بھی ہو، مریضوں کے ان پرائیویٹ خطوط کا مضمون چند جملوں کے الٹ پھیر کو چھوڑ کر بالعموم یکساں ہوتا ہے۔ صرف مکتوب الیہم مختلف ہوتے ہیں۔

ہر خط کے اوپر ۷۸۶ اور تین مرتبہ ہوالشافی لکھنے کے بعد نیچے جو طویل مضمون تحریر کیا جاتا ہے اس میں عموماً یہ باتیں شامل ہوتی ہیں۔

"عزیزی نصیر میاں! آپ کا خط موصول ہوا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ میں نے آپ کا خط نہایت غور سے پڑھا ہے اور پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ بہت

جلد، خدانہ کرے، داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دینے والے ہیں، جس کا سلیس اردو میں ترجمہ یہ ہے کہ آپ کا انتقال پُرملال ہو جانے والا ہے۔ یہ سوچ کر مجھ پر رعشہ طاری ہے کہ آپ کے بعد آپ کے گھر والوں کا کیا ہوگا۔ خدا انھیں صبر جمیل دے آمین!

بہر حال گھبرانے کی کوئی بات نہیں میرا خیال ہے آپ کا مرض ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ البتہ آپ نے علاج نہ کیا تو جلد نوبت فاتحہ تک پہنچ جانے والی ہے۔ لہٰذا علاج میں ذرا بھی تاخیر نہ کریں۔ اگر آپ خود بغیر کچھ کیے اس موذی ملعون مرض کا علاج کرنا چاہیں تو ترکیب بہت آسان ہے۔

اول مینڈک کے مغز میں چاروں مغز ملا کر خوب ابالیے، اور اس کا سفوف بنانے کے بعد الو کی چونچ اور چیل کے پر ملا کر اچھی طرح کھرل کر لیجیے اور جب اس کا بھی سفوف بن جائے تو اس میں تخم کتاں کے چار دانے ملا لیں۔ (خبردار، تخم کتاں کا کتوں سے کوئی تعلق نہیں) اسے بھی کھرل کیجیے اور جب اس کا بھی سفوف بن جائے تو اس سفوف میں تھوڑی سی سونف ملا لیں اور پھر نیم کے چھتے سے حاصل کیا گیا شہد ملا کر گولیاں بنا لیجیے۔ اس کے بعد ہر روز صبح سویرے نہار منہ تین گولیاں "ہدہد کی کلیجی میں تیار شدہ یخنی یا سادہ پانی کی ساتھ کھاتے رہیے۔ انشاء اللہ تین مہینوں میں دوا فوراً اثر دکھانے لگے گی۔

لیکن اگر یہ آسان نسخہ بھی آپ تیار نہ کر سکیں تو گھبرائیں نہیں۔ میں آپ کی خاطر خود یہ زحمت اٹھانے کو تیار ہوں۔ آپ صرف تخم کتاں اور شہد کے لیے مبلغ ایک ہزار ریال کے بقدر امریکی ڈالر بذریعہ بنک ڈرافٹ درج ذیل پتہ پر ارسال دیں کیونکہ مینڈک، الو اور ہدہد تو یہاں بہ کثرت اور مفت مل جاتے ہیں!"

بس یہ ہاتھ سے لکھا ہوا خط بھیج دیا جاتا ہے۔ مریض کو چاہے دائمی نزلہ ہو یا کھانسی، یا پھر کوئی ایسی ویسی بیماری، نسخہ ہمیشہ وہی لکھا جاتا ہے، جس سے مریض کی موت ایک ماہ میں یقینی ہو! مگر ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ اتنے زوردار ہوتے ہیں کہ خط بھیجنے کے اگلے ہی ہفتے مطلوبہ رقم کا ڈرافٹ موصول ہو جاتا ہے اور یوں رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہتا ہے، جس سے اردو کی ترقی مفت میں ہو جاتی ہے!

رضاء الجبار
3311,Kingsto n Road
Suite NO 901 Scarborough
Ontario MIM IRI (Canada)

دو خبر نامے

اخبار میں خبر نامہ شائع ہوا ہے۔ تفصیلات یہ ہیں۔ چند سال ہوئے کراچی سے نکل کر نیویارک شہر میں ایک نوجوان آیا۔ امریکہ کی سرزمین پر بڑی محنت کے بعد اس نے اپنی تجارت قائم کی۔ تجارت کو اس نے ترقی کے زینے پر چڑھایا۔ ساتھ ساتھ اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے اور اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے اوقات کا انتظار کرتا رہا۔ دو چار سالوں کے بعد اس نے محسوس کر لیا کہ وہ وقت آگیا ہے۔ کراچی جانے کے لیے اس نے ٹکٹ بنوالیا۔ نئے سوٹ سلوائے۔ محبوبہ کو پیش کرنے کے لیے ہیرے کی انگوٹھی خریدی۔ اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کو سجا کر جب وہ کراچی پہنچا تو پتہ چلا کہ اس کے اوقات اچھے نہیں ہیں۔ محبوبہ کے ابو جان کو اس لڑکے کا رشتہ پسند نہیں تھا۔ محبوبہ کے والد شہر میں بڑا اثر ورسوخ ہی نہیں بلکہ اپنی فکر وارادے کو دوسروں پر لاگو کرنے کی طاقت بھی رکھتے تھے۔ وہ لڑکے کے مخالف ہوگئے۔ اس کے برخلاف لڑکی کے دل میں اپنے محبوب کے لیے بے پناہ محبت تھی۔ اس لیے ان دونوں نے رازداری میں عہد و پیمان کیے اور پوشیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے شادی کرلی۔ شادی کے فوری بعد وہ دونوں ملک سے باہر امریکہ کے لیے نکل جانے کا پلان بنانے لگے۔ رسوخ رکھنے والے باپ کے خوشامدی جاسوسوں نے باپ کے کان پر راز کو فاش کر دیا۔ والد بزرگوار طیش میں آئے۔ ان کی مخالفت میں شدت کی آگ پیدا ہوئی۔ اپنے اثرات اور طاقت کو کام میں لاتے ہوئے انھوں نے لڑکے پر سنگین الزامات لگائے۔ پہلا الزام یہ کہ اس نے ایک معزز خاندان کی لڑکی کے ساتھ بدکاری کی۔ دوسرے لگائے ہوئے الزام کے مطابق وہ اس معصوم لڑکی کو ورغلا کر بھگا رہا ہے۔ پولس آئی لڑکا گرفتار کر لیا گیا۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے وہ ہو گیا۔

اسی اخبار کے دوسرے صفحے پر دوسرا خبر نامہ ہے۔ وہ بھی یوں ہی محبت کا مارا ہے۔ کینیڈا کے شہر ٹورانٹو کے اندر لاہور سے آکر بسے ہوئے خاندان کی خوبصورت لڑکی ٹورانٹو کے اپنے اسکول کے سابق طالب علم دوست کی محبت میں دل وجان کے ساتھ گرفتار ہو گئی۔ ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے دل خوش کن وعدوں کو سونے کی انگوٹھیوں کے اندر سے گزارتے ہوئے دونوں نے مل کر سوچا کہ دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لڑکے نے بہت سی مثالیں دیتے ہوئے تصدیق کی کہ ساتھ رہنے کے لیے شادی کی جلد بازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شادی کیے بغیر بھی لڑکا اور لڑکی اپنی زندگی کی گاڑی کے پہیے بن سکتے ہیں۔ لڑکی کے کامن سنس میں مزید جو بات آئی وہ یہ تھی کہ ان کے یہ فیصلے ان کے اپنے ذاتی فیصلے ہیں اس لیے ماں باپ کی رضامندی ضروری نہیں ہے۔ لڑکی کے کامن سنس کے فیصلے پر لڑکے نے یہ کہہ کر مہر لگائی کہ ماں باپ کی رضامندی کے حصول کی شرط یوں ہے جیسے ایام جاہلیت کی کوئی فرسودہ رسم ادا کی جارہی ہو۔ اس ترقی یافتہ اور روشن زمانے میں ایسی مکروہ حرکت نہیں ہونی چاہیے۔

کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بیٹی گھر سے چلی گئی تو ماں باپ کے ہوش اڑ گئے۔ طیش میں آکر باپ نے احکامات صادر کیے۔ "وہ ہمارے مذہب کا نہیں ہے۔ یوں رہنا بے شرمی کی بات ہے۔ فوراً واپس آجاؤ ورنہ ...... ورنہ..... ورنہ.....!" ابا جان کے پھینکے ہوئے "ورنہ" ربر کے گولوں کی طرح دیوار پر ٹپ کھائے اور ابا جان کے سر پر واپس آگئے۔ ماں کے لہجے میں نرمی آئی۔ وہ رو کر بولی "بیٹی! تمھارے بغیر میری زندگی سونی ہو گئی ہے۔ یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ میں بیمار ہو رہی ہوں۔ میرا بلڈ پریشر بڑھ رہا ہے۔ میں مر جاؤں گی۔ تم واپس آجاؤ۔" امی جان کی التجائیں فرش پر گرا ہوا دودھ بن گئیں۔

رازداری کے ساتھ صلاح ومشورے ہوئے۔ پھر بیٹی کے فون کی ریکارڈنگ میں ماں باپ نے یہ پیام ریکارڈ کیا "تمھاری دادی جان بستر مرگ پر ہیں۔ معلوم نہیں کہ کب ہمیشہ کے لیے وہ ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گی۔ وہ تمھیں بھی بے اختیار یاد کر رہی ہیں۔ ہم لوگ بس دو ہفتوں کے لیے لاہور جارہے ہیں۔ اگر تم ساتھ دینا چاہو تو ہم تمھارا ٹکٹ بھی خرید لیں گے۔"

"ہالی ڈے!" لڑکی خوشی کے مارے جھومنے لگی۔ "مجھے ہالی ڈے کی ضرورت ہے۔ میں دو ہفتوں کے لیے لاہور جا رہی ہوں۔"

"ضرور جاؤ۔" لڑکے نے منظوری دے دی۔

سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اڑان کے دن لڑکی اپنے گھر سے اپنا سامان لے کر راست ایرپورٹ پر چلی گئی۔ سارے مدارج طے کرنے کے بعد جب وہ کسٹم کے شعبہ میں آئی تو محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے۔ اپنے بوائے فرینڈ کو فوراً فون کیا اور اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ لڑکے نے باہر سے فوراً چند فون گھمائے پتہ چلا کہ لڑکی کے والدین نے روانگی کے لیے ایک طرفہ ٹکٹ خریدا ہے۔ اپنا گھر اور اپنا سامان فروخت کر دیا ہے۔ اطلاع کے مطابق اس ملک میں رہنا ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اس لیے وہ واپس نہیں آئیں گے اور لڑکی کو بھی نہیں آنے دیں گے۔

لڑکی نے پریشان ہو کر لڑکے سے پوچھا کہ وہ کیا کرے۔ لڑکا بولا "کسٹم کے آفیسر کو اطلاع دے دو کہ یہ لوگ تمھاری مرضی کے بغیر زبردستی کرتے ہوئے تم کو لیے جا رہے ہیں۔ باقی امور ایرپورٹ کے باہر سے میں دیکھ لوں گا۔"

ٹورانٹو کے ہوائی اڈے پر لاہور جانے والے جہاز کے ٹیک آف سے پہلے پولس آ گئی۔ انکوائری ہوئی۔ لڑکی آزاد ہوئی اور ایرپورٹ سے باہر آ گئی۔ لڑکی کے ماں باپ کو پولس نے حراست میں لے لیا۔ انھیں کورٹ کے اندر بیان دینا ہوگا۔ انھیں سزا ہوگی۔ اس کے بعد اگر وہ ملک چھوڑ کر جانا چاہتے ہوں تو چلے جائیں!!

اسلم جمشید پوری
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۔ ۲۵

قصہ شبراتی کا

(عظیم افسانہ نگار پریم چند کی نذر)

بیلوں کو آنگن میں نیم کے نیچے باندھ کر اس نے نل اسارے کے نیچے کھڑا کر دیا۔ سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے کمر کو سیدھا کیا۔ ہاتھ میں پانی کا خالی گھڑا لئے وہ اندر پہنچا۔ شبراتن کو دیکھ کر بولا۔

"اری شبراتن آج کچھ جادہ ہی تھک گیا ہوں۔ جوڑ جوڑ دکھ رو (رہا) ہے اوپر والو (والا) کھیت دوبار جوتو (جوتا) ہے۔ جرا (ذرا) ایک گلاس گرم گرم دودھ پلا۔ اور ہاں دودھ میں مٹھاس ڈالیو۔ بس گڑ کا ایک ٹکڑا لی آئیو۔"

شبراتن نے دودھ کا گلاس بھرا۔ گڑ کے بھیلا سے تھوڑا سا گڑ پھوڑ کر شبراتی کے پاس آئی۔ ایک ہاتھ میں دودھ بھرا گلاس اور ایک میں گڑ دیتے ہوئے وہ شبراتی سے بولی۔

"سنتے ہو نائی آیو تھو (آیا تھا)۔ بلاوے گو ہے (بلاوے گیا ہے) چار بجے سانجھ کو اسکول میں پنچایت ہے۔ تمہیں بھیجنے کو کہہ گیو (گیا) ہے اور ہاں تم نے سنو (سنا) کلوا کی نئی بھینس مر گئی ہے۔"

شبراتی ایک گھونٹ دودھ کا بھرتا اور پھر تھوڑا سا گڑ کاٹ کر کھاتا۔ پورا دودھ پینے کے بعد اس نے کہا۔

"ہاں شبراتن بے چارے کلوا کی بھینس مر گئی۔ موئے بڑو (مجھے بڑا) دکھ ہے اس کر یب نے ابھی جے کی پینٹھ سے تو لی تھی۔"

زور سے ڈکار تے ہوئے وہ اٹھا اور نل کے پاس جا کر ہاتھ پاؤں دھوئے۔ باہر بیٹھک میں رکھے حقے کی چلم اٹھائی۔ اس کی راکھ کو کوڑے پر گرایا۔ نئے تمباکو کا ایک گولا بنایا اور اسے چلم کے ٹھیک بیچوں بیچ سجاتے ہوئے رکھا اور اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا کھپڑا (کھپریل کا ٹکڑا) رکھا۔ اور آگ کے لئے گھر گیا

"شبراتن آگ ہے گی۔؟"

"ہاں دیکھے تو ہے پر تھوڑی سی ہوئے گی۔ لاؤ میں رکھ دوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ بیٹھک کے باہر نیم کے نیچے چارپائی پر لیٹ کر حقہ [illegible]

لمبے کش لینے لگا۔ موسم گرم تھا۔ لیکن باہر نیم کے نیچے اسے کچھ راحت ملی۔ حقہ پیتے پیتے وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

گاؤں کے اسکول میں لوگ جمع تھے۔ جمن کاکا۔ شری کرپا چاچا، کنورپال، مہابیر، مہندر ٹھاکر، پنڈت گوپال، شبراتی۔ مکھیا ملکھان سنگھ اور بہت سے لوگ۔ روز بروز کی بڑھتی ہوئی جانوروں کی بیماریوں سے تنگ آکر گاؤں کے مکھیا ملکھان، پنڈت گوپال اور مہندر ٹھاکر جیسے بڑے لوگوں نے ایک ہنگامی پنچایت بلوائی تھی۔

مکھیا ملکھان سنگھ نے کھڑے ہو کر کہا۔

"بھائیو۔ آپ کو تو پتوی (پتہ) ہے کہ آج گاؤں کے جانوروں میں بیماری گھسی ہوئی ہے۔ جانور مرتے جارہے ہیں۔ ہمیں اس سمسیا کو (کا) سادھان کرنو (کرنا) ہے......"

"ہاں ملکھان چاچا ای بہت جروری ہے۔ کل بے چارے کلوا کی نئی بھینس مر گئی۔"

"ہاں۔ مکھیا جی۔ ہماری گائیں بھینسیں تو بالکل سوکھ گئی ہیں۔ دودھ جیسے تھنوں میں سوکھ گیو (گیا) ہے کچھ اپائے کرو مکھیا جی"۔

کنورپال کی بات سب نے سنی۔

"ہاں ہاں۔ کچھ ہونو (ہونا) چئے (چاہیے)"

بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ پنڈت گوپال نے حقے کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا

"گاؤں میں دکھ گھس گیا ہے۔ ہمیں ہر سمبھو یاسو (اس سے) چھٹکارو چیے (چھٹکارا چاہیے)"۔

جمن کاکا جو بڑے دھیان سے سن رہے تھے بولے

"ہاں پنڈت جی۔ ہمیں دکھ نکلوانو (نکلوانا) ہے۔ آپ کوئی بڑھیو سو (اچھاسا) دن رکھ دیں۔"

پنڈت گوپال نے اپنی پوتھی کھولی۔ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد پنڈت جی کی آواز بلند ہوئی۔

"پردھان جی۔ آج بدھوار ہے۔ ایسا کرتے ہیں روی وار کو رکھتے ہیں روی وار کی رات شبھ رہے گی۔"

"ہاں......ہاں...... ٹھیک ہے"

ایک ساتھ کئی آوازوں کا شور بلند ہوا پھر مکھیا ملکھان، پنڈت جی اور ٹھاکر مہندر نے کچھ مشورہ کیا اور پھر مکھیا جی کی آواز گونجی۔ خاموشی پھر چھا گئی۔

"بھائیو......روی وار کی رات دکھ نکلوایا جائے گا۔ آپ سب تیار رہیو اور ہاں اس بار آگ کا کروا

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

تالیف: پروفیسر عتیق اللہ
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ
(ادبی اصطلاحات کا اردو انسائیکلوپیڈیا)

جہان علم و دانش میں تہذیبی ورثہ اور علمی تبادلہ کی روایت بے حد پرانی ہے ازمنۂ قدیم میں ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کے ماخذ کے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ اہل عجم اور بالخصوص ہند و ایران نے یونان، مصر اور روم کے علوم و فنون سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ جدید ہندی علوم پر بھی ان قدیم تہذیبی مراکز کے اثرات براہ راست ثبت ہوئے ہیں۔ جس کے لیے طب یونانی کے طریقہ کار کی مثال نمایاں ہے۔ اس فن میں یونانی طریقۂ معالجہ یا علم علاج کو بنیاد مان کر درجنوں کتابوں کو اردو اور فارسی میں منتقل کر کے اس طرح محفوظ کر دیا گیا ہے کہ ان کی اصل شاید یونانی زبانوں میں بھی ناپید ہے۔ اس کے لیے صدہا علمی و طبی اصطلاحوں کی توضیح کی ضرورت پڑی ہوگی جو آج بھی مشرق وسطی میں طب یونانی کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ارسطو کے دقیق ترین خیالات کی ترجمانی مشرقی علوم میں علم منطق، فلسفہ اور ادبی تنقید کی صورت میں جلوہ نما ہیں۔ اس کے لکچروں کے خلاصے "بوطیقا" اور "مصنفات" کے نام سے متعدد نصابات کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ لسانی اور فنی اعتبار سے بھی قدیم مصر کی تہذیب و ثقافت علم تعبیر اور علم اللسان یعنی حساب ابجد کی شکل میں ہمارے علوم و ادب کا حصہ

چنانچہ قدیم سنسکرت علوم سے اہل عرب نے بھرپور فائدے حاصل کیے اور جتنے تراجم
کرائے ان میں ابن مقفع کی کلیلہ و دمنہ۔ [illegible] تصنیف (اصل میں ترجمہ) بھی
ہے جس کی اصل سنسکرت معدوم ہو چکی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد
یوروپی علوم کی یلغار بھی اس طرح کی جنتوں سے کچھ کم نہ تھی جو انگریزی اور فرانسیسی
صورت لیے ہوئے تھی۔ اس کے سبب ہمارے خزانۂ علم و ادب میں قیمتی
جواہرات کا اضافہ ہوا اور آخرکار آج بھی بے شمار ترجمہ شدہ اصطلاحات ہمارے ادب
میں مستعمل ہو کر علمی دنیا کو جب و تاب بخش رہی ہیں۔ لیکن اب بھی اس سے زیادہ ایسی
ہیں جو ہماری زبان میں وضع کیے جانے کی محتاج ہیں۔

ادب کا ایک طالب علم جب کسی تحقیقی مطالعے میں غرق ہوتا ہے اور نہایت
سنجیدگی سے ادب کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہے تو اسے اس طرح کی متعدد
دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ اپنے تحقیقی کام کا آغاز کرتا ہے تو انگریزی
ادب کی بعض معروف اصطلاحات (مثلاً امیجری) کے بارے میں اسے بڑی خاک
چھاننی پڑتی ہے اور آخرکار معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان میں تو اس اصطلاح کے بارے
میں کسی لغت یا فرہنگ میں کوئی جامع تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ حتیٰ کہ اس معروف اصطلاح
کے لیے کوئی معتبر اردو اصطلاح بھی نہیں گڑھی گئی ہے چنانچہ اس ضمن میں اسے
درجنوں غیر معروف اور اجنبی اصطلاحوں سے سابقہ پڑتا ہے (مثلاً تخیل کاری۔
تمثال کاری۔ تمثال نگاری۔ پیکر طرازی اور پیکر تراشی وغیرہ) اور آخرکار وہ اس نتیجے
پر پہنچتا ہے کہ ان میں سے ایک ایسے لفظ یا ترکیب (مثلاً پیکر تراشی) کو اردو اصطلاح
تسلیم کر لیا جائے جو معنوی اعتبار سے اس انگریزی اصطلاح (امیجری) کی بھرپور ترجمان
نہ ہونے کے باوجود اصطلاحی طور پر مروج و مقبول ہو چکی ہے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ
آج کی علمی و ادبی دنیا میں متعدد اصطلاحات ایسی ہیں جن کے بارے میں تفصیلی معلومات
فراہم نہیں کی جا سکی ہیں اور اس اصطلاح کے استعمال ہونے یا کرنے کے باوصف
ہمیں اس کی تاریخ مخرج اور امکانات کا علم نہیں ہو پاتا ہے۔ لغت نویسی کا کام خاصا مشکل
اور وقت طلب ہے لیکن فرہنگ نویسی کا کام اس سے کہیں زیادہ دشوار اور ادق ہے۔
فرہنگ میں لفظوں کے لغوی معنی پھر اس کے اصطلاحی معانی اور پھر تا حال اس کے
مروجہ مفاہیم کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح جو تذکرہ اس لفظ یا اصطلاح کا تاریخی بیان
بھی بن جاتا ہے۔ جس کے لیے ذخیرۂ علوم کے گرد و غبار کی تہوں میں دبے ہوئے ہیرے اور [illegible]

بھی خوش تر کو اردو میں جس سے چونکہ صرف خوشے بنانے میں مری کی وقت پیدا ہوتی ہو تو آئندہ
کسی علامت میں میری ترجیح اس ساختی پر بھی ہوگی۔

Diction کے لیے لفظیات Dissemination کے لیے معنی افشانی / معنی
افزائی Denoument کے لیے گرہ کشائی Decorum کے لیے [illegible]
Adaptation کے لیے [illegible] allusion کے لیے تلمیحات alienation کے
لیے اثر متنازعہ Caricature کے لیے مسخ کردار وغیرہ ایسے بے شمار الفاظ ہیں جو یا تو
لفظی ترجمہ ہیں یا انھیں نئی ترکیب سے وضع کیا گیا ہے یہاں میں مثال کے طور پر آرکی
ٹائپ Archetype کی اصطلاح پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

اردو میں آرکی ٹائپ کے لیے مختلف نقادوں نے مترادفات اور متبادلات کا استعمال کیا ہے۔ ان مترادفات کی تعداد بھی کافی ہے۔ جن کے نزدیک کسی مناسب اصطلاح کی عدم موجودگی میں آرکی ٹائپ ہی مرجح ہے مگر آرکی ٹائپ کے استعمال میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ یہ لفظ بذات خود مرکب ہے اور جب اسم صفت کے طور پر کسی دوسرے لفظ کے ساتھ اسے مزید مرکب شکل میں استعمال کیا جائے گا تو یہ ترکیب بوالعجبی کی مظہر ہوگی۔ اس لیے آرکی ٹائپل تنقید یا آرکی ٹائپل نظم جیسے مرکبات ہمارے لیے تقریباً نامانوس اور اجنبی ہیں۔

جہاں تک اردو مترادفات کا تعلق ہے اس میں بھی بڑا اختلاف ہے مثلاً بنیادی تماثلات جبلی سانچے تفہیم کی اساسی صورتیں، بنیادی علامات، ابتدائی عکس، بنیادی نقشے، اولین شبیہیں، بنیادی ساختیں۔ امہات النصوص مقدم مناظر۔ امہات الصور مقدیم الاصل الاوضاع، متوارث نسلی اوضاع، متوارث نسلی اوضاع، متوارث نسلی احساسات اور ازلی وابدی تمثالیں وغیرہ وضاحتی الفاظ اور مفرس ومعرب مرکبات وہ ہیں جنھیں انفرادی طور پر اپنے اپنے مطالب کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ دشواری یہ ہے کہ ان میں ایسی کوئی اصطلاح نہیں ہے جس پر بیشتر ادیب متفق الخیال ہوں۔

ہمارے نزدیک اردو میں اس مرکب لفظ کے مترادف کے طور پر قوسیہ مناسب تر اصطلاح ہے۔ بمعنی مقدم اصلی علاوہ بریں بہ معنی محراب قوس وغیرہ میں نصف دائروی شکل کا تصور ایک قدر مشترک ہے کہ دائرے کا نصف دگر معدوم ہے۔ اس معدوم حصے کی تلاش تفہیم علامت سے عبارت ہے۔ قوسیہ سے دیگر مرکبات کی تشکیل بھی آسان ہے۔ مثلاً قوسی نظم یا قوسیاتی نظم قوسی یا قوسیاتی تنقید، قوسیاتی علامات وغیرہ۔ جب ایک بار یہ

آپ نے میرے خط کے جواب میں کتاب نما جون ۱۹۹۹ء ارسال فرمادیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی مصروفیات اس قدر وسیع ہیں کہ مراسلت کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے۔ قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں اور میں کتاب نما کو ایک مکمل کتاب ہی گردانتا ہوں۔ ہاتھی کے برتن کا شربت چیونٹیوں کے برتن میں سما نہیں سکتا مگر ہر ماہ کتاب نما میں ایک ضخیم نمبر یا کتاب کا نچوڑ آجاتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ جب تک حضرت رابعہ بصریؒ شریک نہ ہوتیں، وعظ نہیں فرماتے تھے۔ اسی مصداق ہر ماہ کتاب نما میں ایک دانشور مہمان مدیر شریک نہیں ہوتا تو آپ کے سکون قلب میں چار چاند نہیں لگتے اردو زبان وادب کا قاری اور سامع چند گنے چنے ناقدین کے معرکوں سے تنگ آچکا تھا۔ برادرم ڈاکٹر خلیق انجم نے بجا فرمایا ہے کہ مابعد جدیدیت بالآخر کے سوا اب کچھ نہیں رہ گیا۔ ادب عالیہ اچھا یا برا ہوتا ہے قدیم و جدید نہیں۔ ترقی پسند تحریک یا جدیدیت سے جب مابعد جدیدیت کا سفر شروع ہوتا ہے تو یہ غلط روش ہاتھ آتی ہے کہ نقادوں کا قاضی نذر الاسلام، میر و غالب اور اقبال کے فن کو بھی پارینہ قدیم سمجھا کر رد کردے اور ان پر لکھی گئی تنقید و مقالہ کو بھی بکواس قرار دے۔ جدیدیت کو سمجھنے میں آئے دن کے لیٹسٹ فیشن کے ملبوسات کو پہننے اور ہنس کی چال چلنے کو کہا جاتا ہے، وہاں ہر روز فیشن بدلتا رہتا ہے۔ نظم و نثر میں اظہار وافکار کی جدت دیکھی جاتی ہے، الفاظ کی جدیدیت یا پیٹنٹ پیٹنٹ نہیں۔ اگر غزل یا نظم جدید بن گئی تو دوسرے دن ہی اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ شعری تخلیقات کے بطن ہی سے ڈوبلی کیمبٹ تنقید یا سکنڈ ہینڈ تنقید کا اظہار ہوتا ہے کہ ڈوبلی کیمبٹ یا سکنڈ ہینڈ اس لیے کہ ایک نما سندہ غزل گو یا نظم نگار فکرِ محض نہیں کرتا بلکہ حسنِ فکر کی تخلیق کاری کے دوران عرب کا عظیم گرامرین میں یعنی سیبویہ (Saiba Wairi) جیسا ماہر لسانیات ہی نہیں بلکہ عظیم ترین نقاد کا رول بھی ادا کرتا ہے یوں سمجھیے کہ وہ بذات خود ادیب اور شاعر ہونے کی حیثیت سے جملہ ناقدین کو outsiders سمجھ کر رد کردیتا ہے جو شعری تخلیق کی ذمہ داریوں سے ناواقف ہیں۔
کتاب نما میں مہمان مدیروں کے تا حال جتنے بھی مقالے مختلف کرنٹ ٹاپک پر شائع ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اردو دنیا میں چند گنے چنے نامور ناقدین سے کہیں زیادہ مستند تنقید، تحقیق، تاریخ، ادب

طنز اور شعر پر صالح تنقید لکھنے والے نقادوں کی کمی نہیں فراق، فیض وغیرہ کے بعد صنف غزل کے لاتعداد تخلیق فن کاروں نے نثر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ اگر اس طرف لطف الرحمان، ندا فاضلی، مظفر حنفی، عرفان صدیقی، شہریار، نشتر خانقاہی، افسر جمشید، ابوالکلام قاسمی، رفعت سروش حضرت فضا ابن فیضی وغیرہ متوجہ ہو جائیں تو کسی اور نقاد کو کیا مجال کہ وہ غزل کو طبلچی، غزلچی کہہ سکے، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا خاص مقصد ہی تابندہ تازہ کار روایتوں کے زندہ دھارے سے عصر حاضر کو علاحدہ کر دینا ہے۔ وہ تو خیر گزری کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے کلاسکی غزل کی لاج رکھ لی اور داستان امیر حمزہ کی روایتوں کو نئی نسل کے آگے بیان کرنے کی مہم شروع کر دی۔ افیون کی گولیاں نہ سہی دیسی مال ہی پلا کر کسی شخص کو اس کام پر مامور کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ وہ محفل عام وخاص داستان سنائے۔ اگر کوئی شخص زندہ درگور ہو جائے اور دو چار ماہ بعد اس کی گلی سڑی لاش کو معائنہ کے لیے نکالنے کی ضرورت محسوس ہو تو کوئی نقاد یا شاعر وادیب ہرگز آگے نہیں بڑھے گا۔ اسپتالوں میں اس کار خیر کے لیے چند جیالے مخصوص ہوتے ہیں۔ جنھیں دیسی کچی کے گھوڑوں کا رم پلا کر گلی سڑی لاش ان کے

ہاتھوں نکلوائی جاتی ہے۔ جو جیسے بیمار اور فریش تیمور لنگ کے لیے خادم بکواتی، کچی حسین اور مہمان مدیروں کے مقالے قیمتی دوائیں، ہارلکس، ماں کا دودھ، تازہ خون وغیرہ سے کہیں زیادہ مفید اور موثر ہیں۔ افسوس کہ ابوبکر رضوی صاحب نے اپنے مقالے اردو افسانے میں ہملیت، وحدۃ الوجود کی متصوفانہ فانہ وجودیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ تازہ کتاب نما میں محمود شیخ صاحب کا اداریہ ملفوظاتی آہنگ کا حامل ہے اور بیحد موثر بھی! کتاب نما میں بشر صہبائی کی غزل کے ساتویں شعر میں لفظ مرض، کا تلفظ غلط ہے، مرض میں "ر" بالفتح ہوتا ہے یا سکون نہیں۔ رند ساغری کی غزل کے تیسرے شعر میں لفظ تعاقب کا املا تعقب سہواً ہو کر ساقط الوزن ہے، جون کے شمارے کے صفحہ پر رضیہ پروین ابر کے مطلع کا مصرع ثانی بے وزن ہے۔ صبح کو صبح باندھا گیا ہے صبح بہ وزن "عشق" ہے شہ کہ یہ، وزن جہلا۔ بھگوان داس اعجاز کے پہلے دوہے میں لفظ داڑھی کا املا غلط داڑی کمپوز ہوا ہے، قاسم دہلوی کی غزل کے مقطع میں لفظ پیاری کا تلفظ غلط ہے (پروف ریڈر کی غلطی ہے)

کاوش بدری۔ آمبور

☆ مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سابقہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی اپنی آب وتاب کے ساتھ ادبی حلقے میں علم وفن کی شعاعیں

بکھیر رہا ہے۔ آپ کی غیر جانب دارانہ ادارت کا میں پہلے ہی قائل ہوں آپ نئے لکھنے والوں کو بھی برابر موقع دیتے ہیں۔ یہ آپ کی فن شناسی کی ایک مثال ہے۔ حیدر قریشی کا مضمون کتاب نما ۱۹۹۸ء میں ایک سرسری جائزہ اچھا لگا۔

عقیل احمد پوری کی "ماہیے" دوہے کے عنوان سے اور احساس آفاقی کے "قطعات" بروزن مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن (بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف) "رباعیات" کے عنوان سے چھپ گئے ہیں جو کتابت کی چوک معلوم ہوتی ہے۔

"کتاب نما" کی مہمان مدیر کی روایت دیگر رسائل کے مقابلے میں اپنے آپ میں ایک انوکھی مثال ہے جو آج بھی قائم ہے۔ ادب کے بے لوث خدمت نے آپ کی شخصیت میں چار چاند لگادیے ہیں۔

مین محفر۔ اٹا

☆ ماہ مئی ۱۹۹۹ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس میں جناب حیدر قریشی صاحب کا مضمون کتاب نما ۱۹۹۸ء میں ایک سرسری جائزہ" اپنی نوعیت کا پہلا مضمون ہے شاید اس سے قبل رسالے کی سالانہ کارکردگی کا جائزہ اس انداز سے نہیں لیا گیا۔ اس مضمون سے مصنف کی علمی و ادبی عظمت کا راز فاش ہوتا ہے۔ انھوں نے نہایت دیدہ ریزی سے رسالہ میں چھپنے والے عنوانات کا ایک خاکہ پیش کیا ہے اور ہر ایک کو کتاب نما کے انداز میں الگ الگ تقسیم کرکے روشنی ڈالی ہے اور اپنی گراں قدر رائے بھی پیش کی ہے۔ انھوں نے مضامین، غزلیں۔ طنز و مزاح۔ تبصرے، حد یہ ہے کہ علمی و ادبی خبروں کی نمایاں فہرست اس طرح ترتیب دی ہے کہ ان سب پر ایک معتدل اور جامع تنقیدی رائے بھی شامل ہوگئی ہے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ دیار غیر میں انھوں نے سال بھر کے تمام شمارے جمع کرکے ان پر کس طرح محنت کی اور تمام عنوانات کے قابل ذکر مضامین کا احاطہ کیا۔ بعض مقامات پر تو انھوں نے سال بھر میں شائع ہونے والے مضامین، غزلوں وغیرہ کی تعداد بھی پیش کردی جس کو یاد رکھنا شاید آپ کے لیے بھی دشوار ہوگا۔ یہ کام تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے نہایت معاون ہوگا اور اس طرح کے جائزے کو دیکھ کر مطلوبہ مضمون اداریہ، غزل، تبصرہ یا خبر وغیرہ کا دستیاب ہونا نہایت آسان ہوسکے گا۔ جناب حیدر قریشی صاحب نے اس نئے انداز کے کام کا آغاز کیا ہے جس سے ان کی جدت فکر کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ حیدر قریشی صاحب آئندہ برسوں میں ہر سال کے کتاب نما کا اسی طرح ذرا سی مزید تفصیل سے پیش کردیا

کریں تو یہ کام نہایت مناسب ہوگا۔ جس کے لیے نہ معلوم کتنے لوگ، مصنف اور کتاب نما دونوں کے شکر گزار ہوں گے۔

ڈاکٹر توقیر احمد خاں۔ دہلی ۲۵

☆ "کتاب نما" مارچ ۱۹۹۹ء کے شمارہ میں مہمان مدیر کی حیثیت سے جناب عبدالمتین جامی کا اشاریہ " مابعد جدیدیت یا ۲(مابعد جدیدیت) " نے ہم قارئین کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جامی صاحب نے نئی نسل کے قلم کاروں پر ساختیات، پس ساختیات جدیدیت اور مابعد جدیدیت اور متن جیسے موضوعات پر تفصیلی گفتگو کے حوالے سے جن نکات پر اظہار خیال کیا ہے وہ ایک عمیقانہ اور فکر مندانہ اظہار خیال ہے۔ جامی صاحب سوال بڑا ٹھوس ہے

" میرا سوال ہے کہ روایت کے بعد جدیدیت پھر جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت، پھر اس کے پس مابعد جدیدیت، پھر اس کے بعد؟ کیا ۲ (مابعد جدیدیت) پھر ۳ (مابعد جدیدیت)؟ اس طرح کیا ہمارے ادب میں ہر دس بیس سال میں نیا نام دینے کا سلسلہ جاری رہے گا؟"

رفیعہ شبنم عابدی کے مضمون "شاعر بے آسماں" سے جدیدیت کی خاصی تعریف کی جھلکیاں ملتی ہیں:

نصرت ظہیر صاحب اپنے مضمون "مسئلہ تذکیر و تانیث" پر خوب لکھ گئے ہیں۔

تذکیر و تانیث کے ضمن میں موصوف نے جو مثال دی ہے کہ ریڈیو پر "سری کانت نے ۸۵ رن بنایا اور شاستری کے ایک دن بنے ہیں" اکثر کرکٹ کی کمنٹری سناتے وقت تذکیر و تانیث کا لحاظ مقصود نہیں ہوتا بلکہ کھیل کی [illegible] سنانا مقصود ہوتا ہے۔

بہر کیف "کتاب نما" کا زیر نظر شمارہ مخصوص اہمیت کا حامل [illegible] ہے۔

کلیم اختر۔ لہریا ٹولہ۔ گیا

☆ مارچ ۹۹ء کا "کتاب نما" زیر مطالعہ ہے۔ جہاں تک پڑھ سکی ہوں ان میں وقار خلیل مرحوم پر حنیف سیف ہاشمی کا اداس مضمون اور شاعر بے آسماں (عبداللہ کمال) پر دل سے لکھا ہوا رفیعہ شبنم عابدی کا خوش کن تبصرہ لائق ستائش ہیں۔ شعری گوشہ میں باقر مہدی کی نظم "پہلی کتاب کا پہلا صفحہ" غضب کی چیز کہی جا سکتی ہے۔ وشیہ کلیم کے "ماہیے" میں نغمگی کے ساتھ معنویت کا رجحان بھی نمایاں ہے۔ اچھا ہوا کہ شاعر نے بطور فیشن دوسرے مصرعے کے وزن میں "زبردستی" کی کمی نہیں کی ورنہ ان کے ماہیے بھی "ادبی ماہیے" کے بجائے "فلمی ماہیے" بن کر رہ جاتے۔

صدف جعفری۔ کلکتہ

ادبی خبریں

شمس الرحمٰن فاروقی کو پرویز شاہدی ایوارڈ

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ شاہ مقبول احمد کو

کلکتہ ۲۲ر جون مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی ایک پریس ریلیز کے مطابق اکیڈمی نے ۱۹۹۷ء کے لیے کل ہند پرویز شاہدی ایوارڈ کے لیے جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور مغربی بنگال ریاستی سطح پر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ کے لیے پروفیسر شاہ مقبول احمد کا انتخاب کیا ہے۔ مذکورہ دونوں ایوارڈ مبلغ ۱۵ ہزار روپے فی کس، ایک شال اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہوں گے۔

ایک خبر کی تردید

کتاب نما کا ماہ جون ۱۹۹۹ء کا شمارہ نظر سے گزرا شمارہ اپنے معیار کے مطابق تھا مگر آخر میں ادبی تہذیبی خبریں کالم میں ایک خبر "دلی اردو اکادمی کی نئی گورننگ کونسل" کے نام شائع ہوئی جس کو پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ اس میں جو ممبران کی فہرست دی گئی ہے وہ بالکل نامکمل ہے اور چار ممبران کے نام شامل نہیں ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:(۱) محمد سلیم (۲) پروفیسر ایس۔ ڈبلیو۔ قادری (۳) ایم۔ آئی۔ ایچ۔ حنفی (۴) سید ظفر حسین۔

اس کے علاوہ آپ نے اکادمی کے نئے سکریٹری کے لیے ڈاکٹر علی جاوید، ریڈر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کا نام دیا ہے جبکہ آج تک سکریٹری کا انتخاب نہیں ہو سکا ہے۔ پتا نہیں آپ کو کہاں سے اس کا علم ہو گیا۔ ایسی خبریں شائع کرنے سے آپ کے ماہنامہ کے معیار میں گراوٹ آئے گی اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ امید قوی ہے کہ آپ اس پر دھیان دیں گے اور جو نام چھوٹ گئے ہیں ان کی بھی تصحیح کریں گے۔ ۳ر جون ۱۹۹۹ء

محمد سلیم، ممبر گورننگ کونسل، اردو اکادمی، دہلی

۱۹۹۷ء کی مطبوعہ اردو کتابوں پر مغربی بنگال اردو اکادمی کے انعامات

کلکتہ ۲۲ر جون ۱۹۹۷ء کی مطبوعات اردو کتابوں پر مغربی بنگال اردو اکادمی نے مندرجہ ذیل انعامات کا اعلان کیا ہے۔ ۱۹۹۷ء میں ہندستان گیر پیمانے پر اردو کتابوں پر انعامات۔

(۱) پانچ ہزار روپے کا انعام۔ طب یونانی اور چیلنجز، از حکیم اشہر قدیر (طب)

(۲) تین ہزار روپے کے انعامات (۱) انشائے درد، از عبدالمغنی جوہر ملیاوی (تخلیقی ادب)

(۲) الف لیلہ کے چار ڈرامے۔ از ڈاکٹر سید حامد (ادبیات اطفال)

(۳) دو ہزار روپے کے انعامات (۱) کن فیکون۔ از رضوان احمد (تخلیقی ادب (۲) جنگ آزادی کی بہادر عورتیں از شبانہ (ادبیات اطفال) (۳) افکار تازہ، از ڈاکٹر سید عبدالباری (تحقیق و تنقید)

مغربی بنگال میں ۱۹۹۷ء کی مطبوعہ اردو کتابوں پر انعامات۔

(۱) پانچ ہزار روپے کے انعامات (۱) پانی۔ از ڈاکٹر مظفر حنفی (۲) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی

خدمات فارسی۔ از ڈاکٹر خالدہ حسینی
(۲) تین ہزار روپے کا انعام۔ سائنس کی دھار۔ از قیصر شمیم
(۳) دو ہزار روپے کے انعامات (۱) مضامین مقبول۔ از پروفیسر مقبول احمد (۲) غبار سفر۔ از ڈاکٹر محمد، سمیع اللہ اسد (۳) دھوپ دھوپ بارش۔ از محبوب انور (۴) مغربی بنگال میں اردو ڈرامے کا سفر۔ از نوشاد رضا

ایک ایک ہزار روپے کے انعام

(۱) پرت پرت زندگی۔ از اسرار گاندھی (۲) دھندلکے کی زنجیر۔ از رفعت سروش (۳) ادب میں گھوسٹ ازم۔ از ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (۴) چودہ زبانیں چودہ کہانیاں۔ از عظیم الدین عظیم (۵) لمحوں کی صدا از ڈاکٹر ناز قادری (۶) خار و گل۔ از اظہر غوری (۷) کوہ ندا۔ از اوم کرشن راحت (۸) گستاخی معاف۔ از نظر برنی (۹) خط خیر۔ از رؤف خیر (۱۰) اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل۔ از ممتاز الحق (۱۱) روپیوں کا پیڑ۔ از رشید انور (۱۲) موج التہاب۔ از ڈاکٹر محبوب محشر (۱۳) افق کی مسکراہٹ۔ از اسلم جمشید پوری (۱۴) مطالعے اور جائزے۔ از م۔ ق۔ سلیم (۱۵) غبار شمس۔ از شمس رمزی (۱۶) نیا رخ۔ از ذکیہ ظفر (۱۷) توضیح فنون ادب۔ از ڈاکٹر صابر سنبھلی (۱۸) اسپورٹس کی دنیا۔ از ڈاکٹر الف انصاری (۱۹) ریفری اور بنیادی باتیں۔ از صلاح الدین پرویز (۲۰) دخل در معقولات ۔ از قیوم بدر (۲۱) مٹھی میں آسمان۔ از مہتاب پیکر اعظمی۔

ناشروں کو انعامات

دو ہزار روپے کے انعامات

(۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی (۲) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶

ایک ہزار روپے کے انعامات

(۱) اظہر غوری، ریحان فاؤنڈیشن، ۱۷ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ (۲) پروفیسر مقبول احمد ۹ رپن اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶

نفیس طباعت پر ایک ایک ہزار روپے کے انعامات

(۱) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی خدمات فارسی (پبلیشر) ڈاکٹر خالدہ حسینی، معرفت تاکی دواخانہ ۸ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳ (۲) سائنس کی دھار (پبلیشر) عرفان گرافکس ۱۰ ایم گھوش لین، شیب پور، ہوڑہ

مدھیہ پردیش اکیڈمی میں سنیل دت کی خدمات کا اعتراف

"اردو جیسی شیریں اور عوامی زبان کو بھلا کون مٹا سکتا ہے۔ زبانیں ہماری تہذیبی ورثہ ہیں۔ میں تو ان کو ملک کی بیٹیوں سے تعبیر کرتا ہوں اور ایک بیٹی یہ اردو زبان ہے جو ہم نے پاکستان کو دی ہے تاکہ وہ اس کی حلاوت سے مالا مال ہو سکے۔

سابق رکن پارلیمنٹ سنیل دت نے ان کے اعزاز میں منعقدہ جلسے میں جو ملا رموزی سنسکرتی بھون بھوپال میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی اور خالصہ پنتھ سہ صدی تقریبات کمیٹی مدھیہ پردیش کے تعاون سے منعقد ہوا تھا، اس میں مذکورہ خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سرگرمیوں کو سراہا اور اردو ہند کے ملن پر زور

دیا۔ انھوں نے دوران تقریر ڈگ وجے سنگھ، وزیر اعلا مدھیہ پردیش اور جناب عزیز قریشی، چیئرمین، اردو اکادمی کے ساتھ پارلیمنٹ میں گزارے ہوئے وقت کو بھی یاد کیا اور سیکولرازم کے تئیں دونوں کی نظریاتی اور عملی کاوشوں کو گرانقدر الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

سنیل دت نے واضح الفاظ میں کہا کہ اس ملک پر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، دلت اور کمزور طبقات کا مساوی حق ہے۔ انھوں نے مذہب کی بنیاد پر نفرت یا علاقائی و لسانی عصبیت کو قوموں کے لیے سم قاتل قرار دیا۔ انھوں نے کہا برصغیر میں امن، محبت، انسانیت اور بھائی چارے کا پیغام لے کر انھوں نے سری لنکا سے اپنا یہ پیدل سفر شروع کیا ہے جو بنگلہ دیش، نیپال کے بعد پاکستان جاکر ختم ہوگا۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین عزت مآب عزیز قریشی نے فرمایا کہ ٹیگور نے کہا تھا کہ اگر تمھاری بات سننے کے لیے کوئی تیار نہ ہو تو اکیلے ہی چلتے رہو اور کہا کہ مجروح نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی جذبہ کی نمایندگی کی ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کا کام سنیل دت آج انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے دعا کی کہ دت صاحب کا یہ مشن کامیاب ہو اور انسانیت کا جو چراغ آج جھلملا رہا ہے وہ پوری طرح روشن ہو جائے۔ انھوں نے سنیل دت کو اردو اکادمی کی مطبوعات کا ایک سیٹ بھی نذر کیا۔ خالصہ پنتھ سہ صدی تقریبات کمیٹی کے کنوینر تونت سنگھ کیر نے سنیل دت کی اس یاترا کو خالصہ پنتھ کے پیغام کو عام کرنے سے تعبیر کیا۔ بھوپال ضلع کے انچارج وزیر جناب عارف عقیل نے اہل شہر کی جانب سے سنیل دت صاحب اور ان کے ساتھیوں کا استقبال کیا۔ اس کے علاوہ ممبر اسمبلی پی سی شرما اور اکمل بخشی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شکریہ کے فرائض سردار پریتم سنگھ نے ادا کیے۔

روزگار بخش نصاب

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین جناب عزیز قریشی صاحب کی کوشش ہے کہ اردو کو روزگار بخش نصاب تعلیم سے جوڑا جائے۔ اس سلسلے میں اکادمی اردو میں ایک سالہ کمپیوٹر کورس کامیابی سے چلانے کے ساتھ ساتھ اب جلد ہی اردو شارٹ ہینڈ اور اردو ٹائپ کلاسیں شروع کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ کتابت اور خطاطی سکھانے کے لیے بھی تعلیم کا انتظام کیا جارہا ہے۔

اردو اکادمی کے پریس نوٹ کے مطابق مذکورہ میدان میں تجربے کار حضرات جو اردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ سے بخوبی واقف ہوں۔ ان کی خدمات مناسب معاوضہ پر اکادمی حاصل کرے گی۔

مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے گجرال پہلے چانسلر مقرر

حیدر آباد ۸؍جون صدر جمہوریہ ہند کے آر نارائنن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وزیٹر کی حیثیت سے ہندستان کے سابق وزیر اعظم اور اردو کے ممتاز دانشور اندر کمار

گجرال کو یونیورسٹی کا چانسلر مقرر کیا ہے۔ اردو زبان سے انھیں خصوصی لگاؤ اور شغف ہے۔ انھوں نے اردو کو ہمیشہ اور ہر مرحلے پر حمایت کی اور جہاں کہیں بھی کوئی موقع ہاتھ آیا اس کے فروغ کی کوششوں میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ وہ اردو کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اندرا گاندھی کی ایما پر قائم کی گئی کمیٹی کے صدر نشین تھے جو عرف عام میں گجرال کمیٹی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ خود اردو یونیورسٹی کے قیام کو عملی شکل دینے میں انھوں نے بڑا کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ بانی وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کا تقرر انھیں کے وزارت عظمیٰ کے دور میں عمل میں لایا گیا۔

وائس چانسلر پروفیسر جیراجپوری نے اپنے حالیہ دورہ دہلی کے دوران خصوصی طور پر جناب اندر کمار گجرال سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی اور انھیں اس تقرری پر اظہار مسرت کرتے ہوئے یونیورسٹی امور میں وائس چانسلر سے ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ گجرال صاحب نے واضح لفظوں میں کہا کہ وہ یونیورسٹی کاز کے لیے ہمہ وقت حاضر ہیں اور یونیورسٹی کے فروغ سے متعلق کسی بھی معاملے کے لیے وائس چانسلر جب بھی چاہیں ان سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ وہ اپنے تجربوں اور مراسم کے ذریعے یونیورسٹی کو ہر ممکن فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ گجرال صاحب نے یونیورسٹی کی اب تک کی کارکردگی سے اظہار اطمینان کیا۔

۱۹۹۵ء کی مطبوعات پر بہار اردو اکادمی کے انعامات

تین ہزار روپے کا بعد از مرگ انعام:
کلید گمشدہ کی بازیافت۔ از قیوم خضر

تین ہزار روپے کا کلیم الدین احمد انعام:
المیہ نگاری اور فنکار۔ از ڈاکٹر محمد سمیع الحق

تین ہزار روپے کا جمیل مظہری انعام:
طلوع وجدان۔ از ظفر حمیدی

دو ہزار روپے کے انعامات (فی کتاب)

(۱) مشکیٰ منور۔ از کرشن کمار طور (۲) خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری۔ ڈاکٹر عفت آرا شمس (۳) واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات۔ کوکب قدر سجاد علی مرزا (۴) سائنس کے کرشمے۔ پروفیسر ایم امیر احمد (۵) ضیائے عرفاں۔ نادم بلخی (۶) مہک اور مہک۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر (۷) جدید اردو افسانے کا موضوعاتی ارتقاء۔ ڈاکٹر محمد کمال الدین (۸) تحقیقی گوشے۔ ڈاکٹر رئیس انور۔

ایک ہزار پانچ سو روپے کے انعامات (فی کتاب)

(۱) دھوپ کی چادر۔ سید احمد قادری (۲) خواب کی پرچھائیاں۔ تسکین زیدی (۳) مت بھید۔ علی امام (۴) اردو نقاد کی حیثیت سے فراق کا جائزہ۔ ڈاکٹر مہتاب عالم (۵) مولانا باقر آگاہ ویلوری شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر غوث (۶) سید سلیمان ندوی، حیات و شخصیت۔ ڈاکٹر سید محمد ہاشم (۷) مضامین خالد۔ محمد خالد باری (۸) اردو صحافت کے سو سال۔ ڈاکٹر طارق قاسمی (۹) دلّی کی تاریخی مساجد۔ عطاء الرحمٰن قاسمی (۱۰) گوپی چند نارنگ، حیات و خدمات۔ ڈاکٹر محمد حامد علی خاں (۱۱) تذکرہ علمائے بہار۔ ابوالکلام قاسمی شمسی

(۱۳) مطالعہ تعلیمات حقی۔ ڈاکٹر سید [illegible]
ایک فرد اردو ہے کے مطالعہ کی کتاب

(۱) صدود کا بہار۔ جلد سوم (۲) قرنوں کی
دھوپ۔ ڈاکٹر امام اعظم (۳) نذرانہ عقیدت۔
سید شاہ حماد احمد قادری (۴) دھوپ اور سائبان۔
نور پیکر (۵) خواب کنارے۔ سلیم سرفراز (۶)
بونسائی۔ تسنیم کوثر (۷) بہادیات صحافت۔
ڈاکٹر جاوید حیات (۸) امکان۔ ابوبکر رضوی
(۹) لوزش ادب۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق (۱۰)
عظمت ہند۔ شاکر رام پوری (۱۱) زندگی ایک
سفر۔ رفعت سروش (۱۲) بہار کی اردو شاعری پر
ترقی پسند تحریک کا اثر۔ ڈاکٹر شمس الضحیٰ جاوی
(۱۳) بہار میں اردو افسانہ نگاری۔ ڈاکٹر قیام
(۱۴) ارشاد اعظم۔ سید شاہ تصدق علی اسد (۱۵)
آٹھویں دہائی کے معروف افسانہ نگار۔ ڈاکٹر نسیم
احمد (۱۶) دریچے۔ ڈاکٹر نسرین ترنم (۱۷) منڈیر
پر بیٹھا پرندہ۔ احمد صغیر (۱۸) تنخیاں۔ شبر امام
(۱۹) علاج نسواں۔ ڈاکٹر محمد سراج الدین خاں۔

قیصر تمکین کو نقوش ادبی ایوارڈ

لاہور: اردو کے ممتاز و مقبول افسانہ نگار
قیصر تمکین کو سب سے موقر و مقبول اردو ادبی
رسالے نقوش کا ادبی ایوارڈ عطا کیا گیا ہے۔ یہ
ایوارڈ گذشتہ سال نقوش میں قیصر تمکین کا افسانہ
"مزار شریف" شائع ہوا تھا جس کو قارئین اور
مقتدر ادبی شخصیتوں نے بہترین تخلیق قرار دیا۔
ایوارڈ کی رقم ۲۰ ہزار ہے۔

پروفیسر زلیش کو غالب ایوارڈ

سولن (ہماچل پردیش) ۱۸ مئی غالب
انسٹی ٹیوٹ سوسائٹی سولن کی جانب سے
۹۹-۱۹۹۸ء کا غالب ایوارڈ پروفیسر زلیش کو ان
کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر پیش کیا
گیا۔

پروفیسر زلیش پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ
میں ہندی ویر سنگھ چیئر پر مامور ہیں۔ مختلف
زبانوں میں اب تک ان کی چھپن کتابیں شائع
ہو چکی ہیں۔ شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں
وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

ایکتا کی پکار (اردو ہندی)

بزم ڈاکٹر اقبال کی تیسری پیشکش ہوگی۔
ملک کے تمام شعراء سے اپیل ہے کہ قومی ایکتا پر
نظمیں، غزلیں، گیت وغیرہ ۳۰ اگست ۱۹۹۹ء
تک ارسال کر دیں۔ تاکہ کتاب جلد سے جلد طبع
ہو کر سامنے آ سکے۔ اقبال بیدار جنرل سکریٹری
بزم ڈاکٹر اقبال (رجسٹرڈ)
۹۔ گلشن اقبال نزد رسماتا کیز، جہانگیر آباد،
بھوپال ۴۶۲۰۰۸

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

داخلہ فارم جمع کرنے کی تاریخ میں توسیع

حیدر آباد، جون: مولانا آزاد نیشنل اردو
یونیورسٹی کے بی اے، بی کام سال اول میں داخلے
کے لیے داخلہ ٹسٹ فارم جمع کرنے کی آخری
تاریخ میں بیس دنوں کی توسیع کر دی گئی ہے۔
پہلے یہ تاریخ ۱۵ جون مقرر کی گئی تھی اب طلبہ
اپنے فارم ۵ جولائی ۱۹۹۹ء (بروز پیر) تک جمع
کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان دنوں مولانا آزاد

یونیورسٹی میں داخلے کا عمل جاری ہے اور اس کے ہیڈکوارٹر حیدرآباد کے ساتھ پورے ملک میں پھیلے ہوئے ۱۹ علاقائی سنٹروں میں پراسپکٹس اور داخلہ فارم کی فروخت کا سلسلہ چل رہا ہے۔ فی الوقت یونیورسٹی نے تین کورسوں کی شروعات کی ہے جن میں بی اے، بی کام (سال اول) اور غذا و تغذیہ میں چھ ماہی سرٹیفیکیٹ کورس شامل ہیں۔ یہ تینوں کورسز اردو میڈیم سے فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت دستیاب ہیں۔ بی اے، بی کام میں دو طرح سے داخلوں کی سہولت ہے۔ اول تو وہ لوگ داخلے کے اہل ہیں جنھوں نے انٹر میڈیٹ یا اس کے مساوی تعلیم حاصل کی ہے۔ ایسے امیدواروں کے راست داخلے ہوں گے۔ دوسرا زمرہ ایسے امیدواروں کا ہے جنھوں نے کوئی رسمی تعلیم حاصل نہیں کی ہے لیکن داخلے کے خواہش مند ہیں۔ اس زمرے کے امیدواروں کے لیے یکم جنوری ۲۰۰۰ء کو کم از کم ۱۸ سال عمر اور اہلیتی ٹسٹ میں کامیابی لازمی ہے۔ اہلیتی ٹسٹ کے لیے فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ ۵ر جولائی ہے جبکہ ملک کے مختلف مراکز پر ۱۸ر اگست ۱۹۹۹ء کو اہلیتی ٹسٹ منعقد کیا جائے گا۔ بی اے، بی کام میں راست داخلے اور غذا و تغذیہ میں چھ ماہی سرٹیفیکیٹ کورس کے لیے فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ بالترتیب ۱۵ر اور ۵ر اکتوبر ۱۹۹۹ء ہے۔

کرناٹک اردو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی ڈائرکٹری

مذکورہ ڈائرکٹری (حصہ اول) شائع ہو کر منظر عام پر آگئی ہے جو ریاست کے ہر اردو داں کے پاس ہونی چاہیے۔ اب ڈائرکٹری کا حصہ دوم بھی زیر ترتیب ہے۔ ریاست کے ان ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے جنھوں نے پہلے اپنا بایو ڈیٹا ارسال نہیں فرمایا تھا، گزارش ہے کہ ڈائرکٹری کے صفحہ نمبر ۱۵ کے مطابق مندرجہ ذیل تفصیلات ارسال فرمائیں۔

(۱) نام (۲) ادبی نام ر تخلص (۳) تاریخ پیدائش اور مقام (۴) والد (۵) والدہ (۶) تعلیم (۷) مشاغل (۸) ادب میں خصوصی موضوعات (۹) زبانوں سے واقفیت (۱۰) تصانیف ر تالیفات (۱۱) انعامات و اعزازات (۱۲) نمایاں ادبی خدمات اور انجمنیں جن سے منسلک ہیں (۱۳) شادی کب ہوئی (۱۴) اہلیہ ر خاوند (۱۵) اولاد (۱۶) پتا اردو اور انگریزی میں (۱۷) فون نمبر (۱۸) دستخط مع تاریخ۔

عظیم الدین عظیم، نمبر ۳۶۲، مون اسٹون چوبیسواں بی کراس جینکری سیکنڈ اسٹیج، بنگلور ۷۰

ڈاکٹر رام پنڈت پر خصوصی شمارہ زیر ترتیب

ڈاکٹر رام پنڈت نے اردو ادب کو مراٹھی زبان میں منتقل کرنے کا قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند اور جدید ہند و پاک کہانی اور شاعری کو مراٹھی قارئین تک پہنچانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر رام پنڈت کی خدمات پر سہ ماہی تکمیل ممبئی ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر چندرکانت باندیوڈیکر، سلام بن رزاق، عبدالاحد ساز، ڈاکٹر یونس اگاسکر، انور

خان، قاسم امام، یعقوب راہی، علی امام نقوی، رفیعہ شبنم عابدی، انور قمر، شاہد ندیم، انور ظہیر خان، اسلم پرویز، خالد آرائی، منوہر مانڈ لاکر اور دیگر اہم اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔ اس شمارے کے مہمان مدیر وقار قادری ہیں۔

منصور احمد عثمانی دلی اردو اکیڈمی کے نئے سکریٹری مقرر

نئی دہلی، ۲۲ر جون دہلی حکومت کے ایک افسر منصور احمد عثمانی کو اردو اکیڈمی کا سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔ مسٹر منصور احمد عثمانی موجودہ کارگزار سکریٹری مخمور سعیدی کی جگہ پر اپنا عہدہ سنبھالیں گے۔

واضح رہے کہ سکریٹری کے عہدے سے زبیر رضوی کے ہٹنے کے بعد مسٹر عثمانی عارضی طور پر تین ماہ کے لیے پہلے بھی اس عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ مسٹر منصور احمد عثمانی نے اردو کے فروغ اور ترویج و تشہیر کے لیے خصوصی مہم چلانے پر زور دیا ہے۔

پچھلے ماہ اردو حلقوں میں یہ خبر عام تھی یا عام کروادی گئی تھی کہ ڈاکٹر علی جاوید کو دہلی اردو اکیڈمی کا سکریٹری منتخب کرلیا گیا چنانچہ ایک ذمے دار کے کہنے پر کتاب نما میں بھی یہ خبر شائع کردی گئی۔ ادارہ اس کے لیے معذرت خواہ ہے۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

محمد الیاس الاعظمی کو پروانچل یونیورسٹی جونپور نے ان کے تحقیقی مقالہ "دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ) کی تاریخی خدمات" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ محمد الیاس الاعظمی نے یہ مقالہ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

طیب انصاری کا نیا پتا

حیدرآباد: پروفیسر طیب انصاری (پرنسپل گورنمنٹ فرسٹ گریڈ ڈگری کالج کملاپور گلبرگہ) کا نیا پتا درج ذیل ہے۔

ڈاکٹر طیب انصاری
المسیر" مکان نمبر ۱۸/۶/۵-۳-۱۰ مہدی پٹنم حیدرآباد

ڈاکٹر بیگ احساس، ساہتیہ اکیڈمی اردو اڈوائزری بورڈ کے رکن نامزد

حیدرآباد (پریس نوٹ) پروفیسر سچیدانند سکریٹری ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی اطلاع کے بموجب ساہتیہ اکیڈمی کی مجلس عاملہ نے ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر بیگ احساس ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کو اردو اڈوائزری بورڈ کا ممبر نامزد کیا ہے۔ اس رکنیت کی میعاد دسمبر ۲۰۰۲ء تک ہے۔

محبان اردو سے تعاون کے لیے التماس

ایک اردو صحافی، ادیب و شاعر اور لسانی امور کے اعتدال پسند واقف کار کی حیثیت سے بیش تر محبان اردو اور تقریباً تمام اردو اداروں کو میری بے لوث خدمات کا بخوبی علم ہے۔ میں گزشتہ ایک برس سے موذی مرض فالج (Paralysis) کا شکار ہوں۔ میرا نصف حصہ جسم مکمل شل ہو چکا تھا، سرکاری آیورویدک ہاسپٹل میں داخلی مریض شریک رہا۔ اب قدرے آرام ہے مگر چلنے

لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں۔ میں گھر ہی میں رہ کر اردو کی ایک اہم بنیادی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہ "فرہنگ اردو قدیم وجدید" کی تالیف میں شبانہ روز مصروف ہوں۔ یہ "فرہنگ" دو حرفی الفاظ کو محیط اور میری ۳۶ برس کی متواتر کاوشوں کا ثمر ہے۔ اس شش لسانی لغت (اردو، ہندی ہو گئی، فارسی، عربی وانگریزی) میں اکثر الفاظ کے بارے میں تحقیقی مضامین بھی شامل ہیں۔ مسلسل بیماری نے مجھے ہر قسم کے ذریعہ معاش سے محروم کر دیا ہے۔ بفضل تعالیٰ "فرہنگ" کا کام قریب الختم ہے۔ میں آپ سب سے مودبانہ التجا کرتا ہوں کہ آپ اس اہم ترین کارنامے کو بحسن وخوبی پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجھے مالی تعاون دیں۔ اس ۱۸/۸ کراؤن سائز کی ۶۵۰ صفحات کی فرہنگ میں معاونت کاروں کے نام اظہار تشکر کے طور پر شائع کیے جائیں گے۔ قطرہ قطرہ بہم شود دریا . . . اپنے عطیات اس پتے پر ارسال فرمائیں۔

Dr.Yousuf Nadeem (Journalist)
74-Venkatgiri Nagar Yousuf guda
Hyd 500045

ڈاکٹر زیدی راجستھان اردو اکادمی کے چیئرمین

جے پور: راجستھان سرکار کے محکمہ تعلیمات گروپ ۶ کے حکم نامہ مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۹۹ء کی تعمیل میں ڈاکٹر مدبر علی زیدی نے چیئرمین راجستھان اردو اکادمی کے عہدہ کا چارج مورخہ ۱۵ر مئی ۱۹۹۹ء کو سنبھال لیا ہے۔ ڈاکٹر زیدی کا تقرر تین سال کے لیے کیا گیا ہے۔

معظم علی راجستھان اردو اکادمی کے سکریٹری

جے پور: راجستھان سرکار کے محکمہ تعلیمات گروپ ۶ کے حکم نامہ مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۹۹ء کی تعمیل میں معظم علی نے سکریٹری راجستھان اردو اکادمی کے عہدہ کا چارج مورخہ ۱۷ر مئی ۱۹۹۹ء کو سنبھال لیا ہے۔ معظم علی کا تقرر تین سال کے لیے کیا گیا ہے۔

بھوپال اور اقبال کا رشتہ تاریخ ادب کا لازوال باب ہے

"اقبال کی شاعری میں بھوپال کا حصہ" کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) نے کہا کہ علامہ نے بھوپال کے قیام کے دوران جو نظمیں کہیں ان کو "ضرب کلیم" میں ریاض منزل اور شیش محل کے حوالے کے ساتھ شائع کر کے اس شہر کو وہ توقیر عطا کی ہے کہ وہ اس معاملہ خاص میں ہسپانیہ اور قرطبہ کا ہمپلہ نظر آتا ہے۔

پروفیسر آفاق احمد نے جو بریڈ فورڈ لائبریریز کے نئے منصوبے "ریڈر ٹو ریڈر" کے جنوب ایشیائی زبانوں کے شعبے کے افتتاحی جلسے کو خطاب کر رہے تھے تفصیل کے ساتھ اپنے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سلطانی، تصوف، وحی، مقصود، حکومت، نگاہ امید، صبح، مومن، امرائے عرب سے، ابلیس کا پیغام اپنے سیاسی فرزندوں کے نام جمعیت اقوام اور مسولینی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ان نظموں نے بھوپال اور اقبال کے رشتے کو تاریخ ادب کا لازوال باب بنا دیا ہے۔ آپ نے

خاص طور پر مومن خاں اور غالب کا ذکر کیا جن میں اس خوش سواد مناظر والے شہر کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

ابتدا میں جناب اکرام اللہ کاو سکار یحیٰ نے مہمان گرامی کا تعارف کرایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر مختار الدین احمد کی صدارت میں ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں جناب صدر اور مہمان خصوصی کے علاوہ بریڈ فورڈ لیڈز مانچسٹر، بلیک برن اور دوسرے مقامات کے شعراء نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر صفات علوی نے شکریہ ادا کیا جبکہ نظامت کے فرائض حفیظ جوہر نے سرانجام دیئے۔

جناب ریاست علی تاج کو خراج عقیدت

حیدرآباد ۱۳؍اپریل استاد شاعر محقق اردو کے بے لوث خدمت گزار حضرت ریاست علی تاج کے انتقال پر ملال پر ادارہ دبستان دکن کے صدر نواب محمد نورالدین خاں معتمد عمومی جناب رؤف خیر اور جناب محبوب علی خاں اخگر نے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم بستر مرگ پر بھی اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ اراکین ادارہ دعاگو ہیں کہ خدا انھیں جنت میں جگہ اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔

اردو ماہیا نگار شعراء متوجہ ہوں

تاریخ ساز ادبی جریدہ ماہنامہ ادب لطیف لاہور کا تاریخی ماہیا نمبر زیر ترتیب ہے۔ ہندوستان میں اس نمبر کے لیے خصوصی مرتب کے طور پر نذیر فتح پوری کا نام طے کیا گیا ہے لہذا آپ سے گزارش ہے کہ

☆اپنے ۱۰تا۲۰ ماہیے اور غیر مطبوعہ ماہیے
☆مکمل پتا
☆پاسپورٹ سائز تصویر
☆تاریخ پیدائش کے ساتھ
☆نذیر فتح پوری کے پتے پر ارسال کریں۔ شکریہ۔

Nazir Fatehpuri
Edıror Asbapue Urdu Quartrly
Saira Manzil 230/B/102, Viman
Darshan Lohgaon Pune 411032

مجتبیٰ حسین نے تحریروں کے ذریعہ سماج اور اردو کی بڑی خدمت کی

"میرا کالم" کی رسم اجراء، پروفیسر افضل محمد، ڈاکٹر لطف الرحمن اور محترمہ جیلانی بانو کا خطاب

حیدرآباد۔ ۶؍جون پروفیسر ڈاکٹر افضل محمد وائس چانسلر ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی نے کل شام مدینہ ایجوکیشن سنٹر پر نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے کالموں کا انتخاب کتاب "میرا کالم" کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے کہا کہ مجتبیٰ حسین ابتدا ہی سے خوش مزاج اور قہقہہ بردوش رہے ہیں اور اب انھوں نے دنیائے ادب میں اپنے لیے منفرد جگہ بنالی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس کتاب کی رسم اجراء وائس چانسلر کی حیثیت سے نہیں ایک دوست کی حیثیت سے انجام دے رہے ہیں۔ یہ ایک ایسے ادیب کی کتاب ہے جس نے اپنی تحریروں کے ذریعہ سماج کی اور ساتھ ہی ساتھ اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ زندہ دلان

حیدر آباد کے زیر اہتمام منعقدہ اس تقریب کے مہمان خصوصی بہار کے وزیر اقلیتی امور ڈاکٹر لطف الرحمن نے کہا کہ مجتبیٰ حسین صرف حیدر آباد کے نہیں بلکہ ساری اردو دنیا کے ادیب اور نمایندہ بن چکے ہیں جہاں انھوں نے سماجی برائیوں پر نشتر لگائے ہیں، انسانیت کے زخموں پر انھوں نے مرہم بھی رکھا ہے۔ تہذیب اقدار کی شکست پر وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ ابتداء میں ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے خیر مقدم کیا اور جلسہ کی کارروائی چلائی۔ انھوں نے کہا کہ کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کے بعد ہندستان میں مزاحیہ کالم نویسی کی روایت کمزور ہوتی جا رہی تھی، مجتبیٰ حسین نے اس روایت کو نہ صرف یہ کہ مستحکم کیا بلکہ ترقی دی ان کے اکثر کالم اپنی جگہ ایک مکمل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نامور افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو نے کہا کہ مجتبیٰ حسین نے "میرا کالم" کو اتنی مقبولیت دی کہ اب یہ کالم ان کا نہیں ہمارا کالم بن گیا ہے۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے کالم نگاری کے فن پر روشنی ڈالی اور مجتبیٰ حسین کے مقام کا تعین کیا۔ جناب خالد قادری نے خاکہ سنایا۔ محترمہ زینت ساجدہ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مجتبیٰ حسین کا آبائی وطن گلبرگہ ہے جس مٹی سے ان کی تخلیق ہوئی اس کی تمام صفات ان کی تحریروں میں در آئی ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے کل [illegible]

انداز میں اظہار تشکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اگست ۱۹۶۲ء میں انھوں نے سیاست میں روزانہ کالم لکھنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۱۵ سال تک جاری رہا بعد ازاں انھوں نے سیاست میں ہر ہفتہ "میرا کالم" لکھنا شروع کی۔ اس عنوان کے تحت سنجیدہ باتیں لکھنے کی گنجائش بھی فراہم ہوتی ہے باتیں تو وہی پرانی ہیں لیکن بات کہنے کا اپنا ڈھنگ ہے جو خوش دلی اور بذلہ سنجی سے عبارت ہے۔ زندہ دلان حیدر آباد، فائن آرٹس اکیڈمی اور ادارہ شگوفہ کی جانب سے گلپوشی کی گئی۔ زندہ دلان ممبئی کی جانب سے جناب پرویز یداللہ مہدی نے گلپوشی کی۔ آخر میں جناب طالب خوندمیری معتمد عمومی نے شکریہ ادا کیا۔ بارش کے باوجود بڑی تعداد میں اہل ذوق نے شرکت کی۔

ہم دکھی ہیں

اردو کے منفرد طنز و مزاح نگار جناب سید ضمیر جعفری گذشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئے۔ سید ضمیر حسن شاہ المعروف سید ضمیر جعفری یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو جہلم پنجاب کے ایک مقام چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے لاہور کے مشہور اسلامیہ کالج سے گریجویشن کیا اور پھر فوج کی ملازمت اختیار کی۔ انھوں نے فوج میں رہ کر ایک ادبی جریدہ بھی جاری کیا تھا [illegible] سید ضمیر جعفری کی طنزیہ و مزاحیہ [illegible] اردو ادب میں ایک ممتاز مقام [illegible] کے اب تک ۸ شعری مجموعے [illegible] کے علاوہ نثر میں بھی تیرہ کتابیں [illegible] ضمیر جعفری نے [illegible] قلم اور کاغذ سے رشتہ [illegible]

برقرار رکھا جو اپنے آپ میں بذات خود ایک ریکارڈ ہے۔ گذشتہ گیارہ ماہ سے انھیں دماغ کا سرطان لاحق ہو گیا تھا۔

دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف سید ضمیر جعفری عمر کے آخری حصے میں بھی ذہنی طور پر کس قدر چاق و چوبند تھے اس کا اندازہ ان کے آخری انٹرویو سے لگایا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے نہایت انکسار اختیار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابھی مجھے بہت اہم کام کرنا ہے ہر سالی کے سوا کوئی احساس نہیں ہے جو لکھنا چاہتا ہوں وہ تو ابھی لکھا ہی نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ظرافت اور مزاح کے معنی یہ ہیں کہ اس میں بشاشت ہو، شگفتگی ہو۔ مزاح کے تعلق سے ان کا یہ جملہ بھی قول فیصل کا حامل ہے کہ اچھا مزاح وہ ہے جو سرسری طور پر پڑھا جائے تو کامیڈی اور غور کیا جائے تو ٹریجڈی لگے۔

☆

ممبئی: اردو کے مشہور شاعر اور مدرس جناب نظام الدین نظام ۱۴ مئی ۱۹۹۹ء کو صبح دس بجے یہاں طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ ۴۸ سالہ نظام الدین نظام نصیر آباد (جلگاؤں) سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ممبئی میں ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء میں آنکھیں کھولی تھیں۔ ۱۹۷۰ء کے آس پاس ممبئی سے ابھرنے والے قلم کاروں میں نظام الدین کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ انھوں نے بڑی مختصر مدت میں اپنے لیے ایک جگہ بنالی تھی۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء کا دس سالہ دوران کے عروج کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "لاشعور" [illegible] جب کہ بچوں کے لیے [illegible] "تتلیاں" بھی شائع [illegible]

ایک مدت سے انھیں جگر کا عارضہ لاحق تھا۔ ۱۴ مئی کو بعد نماز مغرب سوناپور بڑے قبرستان (میرین لائن) میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اس موقع پر شہر کے قلم کاروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو لڑکے اور ایک بچی شامل ہے۔

☆

نئی دہلی۔ اردو کے ممتاز شاعر غزل گو اور مقبول نعت گو شاعر جناب شمیم جے پوری کا ۳۰ مئی ۱۹۹۹ء کو دوپہر گیارہ بج کر ۲۰ منٹ پر اچانک انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر تقریباً ۸۰ سال تھی اور ایک عرصہ سے بیمار تھے۔ ان پر اس وقت جان لیوا دل کا دورہ پڑا جب وہ اپنے نواسے خلیق الزماں کے مکان واقع بٹلہ ہاؤس نئی دہلی میں مقیم تھے۔ شمیم جے پوری صاحب کی ولادت جے پور میں ہوئی لیکن انھوں نے میرٹھ کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ وہ نہایت ہی منکسر اور خلیق طبیعت کے مالک تھے۔ مرحوم علم العروض کے ماہر تھے اور نہایت پرگو شاعر۔ ان کا ترنم بھی دل نواز تھا اور رفعت فکر بھی عظیم الشان تھی۔ مرحوم قدیم تہذیب کی نمائندہ شخصیت تھے۔ پس ماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بچی ہیں۔ مرحوم کا پہلا شعری مجموعہ "شمیم" کا دوسرا ایڈیشن چند ماہ قبل شائع ہوا ہے۔ دوسرا مجموعہ "شمیم گل" مکتبہ جامعہ کی معرفت شائع ہونے والا ہے۔

☆

[illegible]

حیدر آباد ۲۰ مئی (یاسمین) [illegible] مشہور ادیب [illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک مشہور ادیب تھے۔ ادیبوں، شاعروں اور اردو اساتذہ سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ نماز جنازہ کل ۱۸ مئی کو بعد نماز جمعہ جامع مسجد مرو کر میں ادا کی جائے گی اور تدفین قبرستان مسجد عالمگیر شاہی گر میں عمل میں آئے گی۔ پسماندگان میں ایک بیوہ [illegible] لیکچرر ویمنس کالج آف کامرس اور ایک دختر محترمہ عائشہ لیکچرر [illegible] کالج اور دیگر دختران شامل ہیں جناب عاتق شاہ کی پہلی کتاب فٹ پاتھ کی شہزادی ۱۹۴۶ میں شائع ہوئی تھی اس کے بعد ان کی اہم کتابوں میں ایک وقت کا کھانا، اندھیری، مائی ڈیر شکنتلا، چالیس قدم، انٹرین کاجو، میں چیتوں گا، ماموں کی بکریاں وغیرہ شامل ہیں۔ عاتق شاہ کی زندگی، جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ انھوں نے ایک ٹائپسٹ کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن ترقی کرتے ہوئے وہ سردار پٹیل کالج میں اردو کے لیکچرر ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ پروفیسر عاتق شاہ، پروفیسر غیاث متین کے حقیقی ماموں تھے۔

ادارہ "کتاب نما" مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے (ادارہ)

تدوین، تحقیق، روایت — رشید حسن خاں

"جو حضرات قبول روایت کے آداب سے بے خبر ہوں، وہ تحقیق نہیں کر سکتے، جب تحقیق نہیں کر سکتے، تو تدوین کے کام کو بھی انجام نہیں دے سکتے" اس مجموعے کی تحریروں سے تدوین، تحقیق، روایت کے طالب علموں کو ضروری باتوں کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

قیمت-/170 روپے

معاصرین مرزا دبیر — سید ظاہر حسین کاظمی

اس کتاب میں مرزا دبیر، میر انیس اور ان کے معاصرین مرثیہ گو شعرا کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ان کے اسلوب نگارش، زبان و بیان، کلام میں مطابقت اور فرق واضح ہو سکے۔

قیمت 160 روپے

زاویۂ نظر — رفعت سروش

اس کتاب میں کچھ مضامین مشاہیر کے متعلق مصنف کی یادداشتوں پر مشتمل ہیں اور کچھ تاثراتی تنقید کے ذیل میں آتے ہیں۔

قیمت-/100 روپے

مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ — نیر جہاں

نیر جہاں نے اس تحقیقی مقالے میں علامہ شبلی نعمانی کا مرتبہ بحیثیت سوانح نگار متعین کیا ہے اور شبلی کی اہم تصانیف المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرۃ النبی وغیرہ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

قیمت-/250 روپے

تحریک آزادی، اردو نثر اور مسلم ادباء — ڈاکٹر ضیاء الرحمان صدیقی

آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والی ہندستان کی تحریک آزادی میں اردو زبان و ادب کی خدمات پر ایک جامع دستاویز۔

قیمت-/100 روپے

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے۔

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت پندرہ روپے (-/Rs.15) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون -/80 روپے ہے) صرف -/75 روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25% اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر 15% کمیشن دیا جائے گا (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جاسکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

صدر دفتر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

Regd. with R.N.I. at No. 4967/60 JULY, 1999
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

کتاب نما

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

اگست ۱۹۹۹ء   جلد ۳۹   شمارہ ۸

فی پرچہ	8/
سالانہ	80/
سرکاری تعلیمی اداروں سے	125/
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک)	500/

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

e-mail: maktaba@ ndf. vsnl. net.in

Tele Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر: 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

وفیات

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

کے علاوہ خطوط اور ادبی تہذیبی خبریں

نئی مطبوعات

اردو نثر کی شاعری ۱۸۲۵ء کے بعد (تنقید و تحقیق) ڈاکٹر نیاز سلطان پوری -/200

شب گزیدہ سحر (شعری مجموعہ) رفعت سلیم -/60

خواتین ہند کے تاریخی کارنامے (تاریخ) فضل حق عظیم آبادی -/80

سیر کہسار جلد اول (داستان) رتن ناتھ سرشار -/167

کاروان تھانوی (تذکرہ) حافظ محمد اکبر شاہ بخاری -/100

حیات محمود (سوانح حضرت محمود حسن گنگوہی) محمد فاروق -/180

حدیث اور اہل حدیث (تحقیق و تجزیہ) انوار خورشید -/225

دوری اور دروازے (نظمیں ترجمے) ترجمہ حمید الدین احمد -/100

صدف (شعری مجموعہ) نسیم مخموری -/100

تحریک آزادی ہند اور مسلمان (سیاست) محمد احمد صدیقی -/20

عالمی اردو ادب ۱۹۹۸ء مد کشور وکرم -/200

فن اور فنی مباحث (مضامین) ابوالفیض سحر -/110

پہلے لباس (شعری مجموعہ) ڈاکٹر اندر بکاس -/200

نمک (افسانے) اقبال مجید -/100

جہات (شعری مجموعہ) شاہد لطیف -/100

چھیاں چھیاں (شعری مجموعہ) فراغ ساحی -/100

ثنائے محمدؐ (نعتیہ مجموعہ) مرتبہ اقبال بیدار -/60

تکبیر مسلسل (شعری مجموعہ) سلمان آصف -/100

ششماہی اقبال ریویو حیدرآباد (رسالہ)

مدیر اعزازی بیگ احساس فی شمارہ -/30

گزرے روز و شب کے درمیاں (افسانے) احمد خان ناصر -/30

صدائے کرب (شعری مجموعہ) عزیز حسن عزیز -/100

سرورق.......................غلام نبی مومن

دیگر اداروں کی مطبوعات

صدف نسیم مخموری

نسیم مخموری اردو کے ممتاز غزل گو شاعر حضرت مخمور دہلوی کی صاحبزادی ہیں اس طرح شاعری انہیں ورثے میں ملی ہے۔ نسیم مخموری کی شاعری پاکیزہ جذبات کی شاعری ہے جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ قیمت:-/100 روپے

فن اور فنی مباحث ابوالفیض سحر

سحر صاحب کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے جس میں آپ کے ۲۲ نہایت اہم ادبی تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ریسرچ اسکالرز کے لیے مفید کتاب۔ قیمت-/110

ذکرا ایلزبتھ ا۔ نسیم ابزیکل ترجمہ: پروفیسر عبدالستار دلوی

یہ نسیم ابزیکل کی ۳۰ مسلسل نظموں کا اردو ترجمہ ہے۔ نسیم کی نظموں میں سادگی فکر تہذیبی تقابل نفسیات کی باریکی، عوامی شاعری کے عناصر اور ان کا مخصوص مزاج پڑھنے کے لائق ہے۔ 75/

اردو تنقید کا سفر ڈاکٹر تابش مہدی

(جامعہ ملیہ کے تناظر میں)

اس تحقیقی مقالے سے نہ صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تنقید کی روایت اور اس کے سفر کی تفصیل ملتی ہے بلکہ اردو تنقید کے بنیادی خدوخال، اصول و نظریات اور سمت و رفتار پر بھی گہری روشنی پڑتی ہے۔

قیمت:-/200

غیر ممالک کے اردو دوستوں کے لیے

آپ کی سہولت اور وقت کی بچت کے خیال سے مکتبہ جامعہ نے E-Mail لے لیا ہے اب آپ گھر بیٹھے مطبوعہ کتب کا آرڈر یا نئی کتابوں کی معلومات کے لیے مندرجہ ذیل پتے پر E-Mail کر سکتے ہیں۔

E-Mail:Maktaba@ndf.vsnl.net.in

مہمان اداریہ
ڈاکٹر غلام نبی مومن
اردو افسر، بال بھارتی، پونہ

(اشاریہ)

اردو ذریعہ تعلیم اور اساتذہ کی ذمہ داریاں

ہندستان ایک کثیر لسانی ملک ہے۔ دستور ہند میں اٹھارہ زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس فہرست میں اردو بھی شامل ہے۔ اگرچہ اردو ہندستان کی تقریباً تمام ریاستوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن یہ زبان بیشتر ریاستوں میں سرکاری سرپرستی سے محروم ہے۔ مسرت کا مقام ہے کہ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں حکومت مہاراشٹر اردو زبان اور اردو مدارس کے ساتھ تعصب کا برتاؤ نہیں کرتی۔ علاوہ ازیں یہاں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں بہت کم دشواریاں حائل ہیں۔ پوری ریاست میں اردو ذریعۂ تعلیم کے مدارس کا جال پھیلا ہوا ہے۔ اب یہ اردو والوں کے عزم و حوصلے پر منحصر ہے کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں کو کس بلند معیار تک لے جا سکتے ہیں۔

معیار تعلیم کو بلند کرنے میں انتظامیہ، صدر مدرسین، اساتذہ، طلبہ اور سرپرستوں کی مشترکہ کوشش کلیدی رول ادا کرتی ہیں۔ نظام تعلیم میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس لیے تدریسی عمل کی انجام دہی اس کا فرض منصبی ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کی بدولت طلبہ کی تعلیمی ترقی اور معیار تعلیم کو بلند کرنے میں استاد کا کردار بنیادی اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

جدید سائنسی و تکنیکی ترقی میں ریاضی کے اصول اور ضابطوں کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں ترقی کرنے کے لیے علم ریاضی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اردو مدارس کے طلبہ، ریاضی کو ہوّا سمجھتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا ہے کہ ریاضی انتہائی مشکل مضمون ہے۔ اس لیے اساتذہ کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ طلبہ کے ذہنوں سے اس غلط مفروضے کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ ریاضی کی تدریس کو دلچسپ اور آسان بنائیں۔ سبق میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مقرون اشیاء اور مختلف تعلیمی لوازمات استعمال کریں۔

ہندستان کے دور غلامی میں انگریزی زبان کو جو عروج حاصل ہوا تھا وہ آج بھی قائم

وقت اکثر و بیشتر مذاکرے کی صورت پیدا کی جائے تا کہ طلبہ محسوس کریں کہ درس میں ان کا بھی حصہ ہے۔ اس طرح ان میں مزید سیکھنے کی رغبت پیدا ہوگی۔ بچوں میں پڑھائی کا شوق پیدا کرنے کے لیے تدریس عمل کو دلچسپ بنانا ضروری ہے۔ اس لیے تعلیمی وسائل کا مناسب استعمال کیا جائے۔ آج کل تو کافی سہولت ہوگئی ہے۔ بازاروں میں تیار تصاویر، چارٹ، ماڈل وغیرہ دستیاب ہیں۔ انھیں خرید کر اسکول میں محفوظ کرلیا جائے اور وقت ضرورت انھیں استعمال کیا جائے۔ جن اسکولوں میں گنجائش ہو وہاں ویڈیو کیسٹ اور کمپیوٹر سے مدد لی جائے۔ بڑے شہروں میں اب انٹرنیٹ کی سہولت بھی حاصل ہے۔ اس سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت دینا بھی استاد کی اہم ذمہ داری ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ استاد کا اصل کام ہی بچوں کی اخلاقی تربیت اور کردار سازی ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ بچوں میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں کی نشوونما کے ساتھ ساتھ ایک فرض شناس شہری اور ایک عمدہ انسان کی ساری خوبیاں پیدا کی جائیں۔ تا کہ وہ اپنے ملک وقوم کے لیے سودمند ثابت ہوں۔ اس اہم کام کی انجام دہی کے سبب استاد معمار قوم، کہلاتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ معاشرے میں بگاڑ اپنے عروج پر ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہر برائی موجود ہے۔ جھوٹ بولنا عام بات ہے۔ چوری، ڈکیتی، قتل وغارت گری روز کا معمول بن چکا ہے۔ فیشن کے نام پر بے حیائی عام ہے۔ رشوت ستانی، بے ایمانی کی کوئی حد نہیں رہی۔ مختصر یہ کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ان برائیوں سے خالی نہیں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا۔ اس سے بڑھ کر برائی کیا ہوسکتی ہے کہ اب برائی کو برائی ہی نہیں سمجھا جاتا۔ ایسی سنگین صورت حال کے باوجود معاشرے کا بگاڑ معلم کے کردار کے پست ہونے کا جواز نہیں بن سکتا۔ بلکہ ایسے حالات میں اس کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ معاشرے کے بگاڑ کو ختم کرنے کے لیے اساتذہ ہی امید کی آخری کرن ہیں۔ معاشرے کو باشعور، بلند کردار، خوش اخلاق افراد فراہم کرنا اساتذہ کی سب سے اہم ذمے داری ہے۔ اور وہ اس ذمے داری کو اسی صورت میں پورا کرسکتے ہیں جبکہ وہ خود صاحب کردار ہوں۔

بچے نفسیاتی طور پر زبانی کی گئی نصیحتوں پر عمل نہیں کرتے اور انھیں جن باتوں سے روکا جاتا ہے، انھیں ضرور کرتے ہیں۔ البتہ وہ نقل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں صرف نصیحتیں کرنے کی بجائے اساتذہ اچھے کردار کا عملی نمونہ پیش کریں۔ اسی صورت میں وہ بچوں کے ذہن، سیرت اور کردار پر مثبت اثرات ڈال سکتے ہیں۔ اساتذہ بچوں سے شفقت اور محبت کا برتاؤ کریں، ان کے مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کریں۔ ممکن ہو تو بچوں کے سرپرستوں

ہے۔ اگرچہ انگریزوں کی سلطنت سمٹ گئی ہے لیکن انگریزی زبان پوری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ آج انگریزی کی عالمگیر علمی اور ادبی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں انگریزی زبان کا علم ناگزیر ہو گیا ہے۔ اور صورت حال یہ ہے کہ ۹۰ فیصد اردو ہائی اسکولوں کے ایس ایس سی کے نتائج کے فیصد کا تعین انگریزی میں کامیاب ہونے والے طلبہ کی تعداد کا مرہون منت ہے۔ اس لیے اردو طلبہ کی تعلیمی ترقی کے لیے انگریزی زبان کی موثر تدریس لازمی ہے۔ انگریزی پڑھانے والے اساتذہ کی اہم ذمے داری یہ ہے کہ وہ طلبہ میں انگریزی سیکھنے کی رغبت پیدا کریں تاکہ وہ صحیح انگریزی بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھیں اور دوسروں سے مسابقت میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ پچھلے چند برسوں میں انگریزی کی درسی کتابوں کو نئے ڈھنگ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اساتذہ کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس نئے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کے تحت نئی کتابیں تیار کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں Teachers Hand Book کا مطالعہ یقینی طور پر مفید ثابت ہوگا کیونکہ ہینڈ بک میں اس نظریے کو واضح کیا گیا ہے اور تدریس کے نئے طریقوں سے روشناس کرایا گیا ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ پہلے طلبہ کی انگریزی زبان کی کمزوریوں سے واقفیت حاصل کریں اور پھر انھیں دور کرنے کے طریقے اختیار کریں۔ ہمارے طلبہ عموماً انگریزی بولنے میں بہت کمزور ہوتے ہیں اس لیے Spoken English پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اردو طلبہ انگریزی اور ریاضی کو بہت زیادہ مشکل سمجھتے ہیں اس لیے ان مضامین کو پڑھانے والے اساتذہ کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دیگر مضامین پڑھانے والے اساتذہ کی کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ ہر مضمون کے استاد کی اہمیت مسلم ہے۔

فی زمانہ مختلف علوم میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ٹی وی کے عام ہو جانے کی وجہ سے بچوں کی معلومات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں نئے نئے سوالات ابھرتے ہیں جن کا وہ جواب چاہتے ہیں۔ اگر معلم کی معلومات تازہ نہ ہوں تو وہ بچوں کو مطمئن نہیں کر پائے گا۔ اس لیے ہر معلم کو چاہیے کہ وہ نہ صرف اپنے مضمون کا گہرائی سے مطالعہ کرے، اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے بلکہ اپنے مضمون سے تھوڑا بہت ربط رکھنے والے دیگر مضامین کا بھی مطالعہ کرتا رہے۔ خود بھی مطالعہ کرے اور اپنے طلبہ میں بھی مطالعے کا شوق پیدا کرے۔ طلبہ کو اسکول لائبریری سے کتابیں فراہم کرے۔ بچوں کے رسائل، کہانیوں اور معلومات کی چھوٹی چھوٹی کتابیں خریدنے کی ترغیب دے۔ علاوہ ازیں کلاس میں پڑھاتے

سے رابطہ قائم کریں۔ انھیں بچوں کی تعلیمی ترقی کی صورت حال سے آگاہ کریں اور تعلیمی امور میں ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں

فروری ۱۹۹۹ء میں Deve lo p ment Research Service کے زیر اہتمام آدتیہ برلا گروپ نے آٹھ میٹرو پالیٹن شہروں میں مختلف پیشہ وروں کے سماجی رتبے، مقبولیت اور پسندیدگی کے بارے میں سروے کیا تھا۔ مذکورہ رپورٹ سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ہندستانی عوام میں فوجی سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ فوجیوں کے بعد سائنسدانوں، ڈاکٹروں اور اساتذہ کا نمبر آتا ہے۔ یہ پوچھنے پر کہ کن پیشوں سے سماج کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے، جواب ملا طب، درس و تدریس اور سائنسی تحقیق۔ اس سروے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ مادہ پرست معاشرہ بھی اساتذہ کے کاموں کی اہمیت کا قائل ہے۔ آج بھی اساتذہ کی عزت کی جاتی ہے۔ اب بحیثیت معلم اپنا محاسبہ کیا جائے کہ کیا واقعی آپ اس عزت و احترام کے مستحق ہیں جو آپ کو سماج میں حاصل ہے۔ اگر اساتذہ اپنے اندر کوئی کمی یا کوتاہی پائیں تو اسے فوراً دور کرنے کی کوشش کریں۔ یہی ایک سچے اور فرض شناس معلم کی بنیادی ذمے داری ہے۔

آہ حکیم عبدالحمید دہلوی

حکیم عبدالحمید دہلوی کا نام آتے ہی ہمدرد دواخانہ اور جامعہ ہمدرد کا خیال ذہن میں ابھرتا ہے جن کے وہ بانی تھے اور ایسے کتنے ہی ادارے ذہن کے پردوں پر ابھرتے ہیں جن کا قیام ان کی ذات سے وابستہ ہے وہی حکیم صاحب ہمارے درمیان سے رخصت ہو کر ۲۳ر جولائی ۹۹ء اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم صاحب ۱۴ر ستمبر ۱۹۰۸ کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد حکیم عبدالمجید صاحب نے انھیں حکیم اجمل خان صاحب کے قائم کردہ طبیہ کالج قرول باغ میں داخل کرادیا جہاں سے وہ طبیب کامل بن کر نکلے عبدالحمید صاحب کی ولادت سے پہلے ہی اگست ۱۹۰۵ء میں حکیم عبدالمجید ایک چھوٹی سی دکان کی شکل میں ہمدرد دواخانہ کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ حکیم عبدالمجید جون ۱۹۲۲ء میں انتقال کر گئے اور ہمدرد کو ترقی سے ہمکنار کرنے کی ذمے داری حکیم عبدالحمید پر آگئی جسے انھوں نے انتھک محنت، ہمت اور لگن سے ایک عظیم صنعت میں تبدیل کردیا اور جو آج ایشیا کے طبی دواسازی کا عظیم مرکز ہے۔

حکیم صاحب نے ہمدرد کے قیام پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انھیں بہت سے ممتاز اداروں کے بانی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے جن میں انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ہمدرد نرسنگ ہوم، ہمدرد کالج آف فارمیسی، ہمدرد دہلی کالج، بزنس اینڈ ایمپلائمنٹ بیورو، رابعہ گرلز اسکول، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی ، مجیدیہ ہسپتال ،سینٹر فار فیڈرل اسٹڈیز ہمدرد پبلک اسکول شامل ہیں۔ یہ تمام ادارے جامعہ ہمدرد سے ملحق ہیں۔ جس کا قیام بھی حکیم صاحب ہی کا مرہون منت ہے۔ ان کے علاوہ حکیم صاحب نے مزار غالب سے ملحق غالب اکیڈمی کی بنیاد رکھی جو دلی کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز ہے اور علمی، تحقیقی اور ادبی کاموں میں مصروف ہے۔ یہ تمام ادارے تنہا حکیم صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

حکیم صاحب جامعہ ہمدرد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر تھے اور بے شمار قومی اور بین الاقوامی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ انھوں نے یونانی طریقہ علاج کو جدید بنانے کا زبردست کارنامہ انجام دیا اور اسے باقاعدگی عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دنیا کے بیشتر براعظموں کے اسفار کیے اور مختلف اجتماعات اور کانفرنسوں میں ہندستان کی نمائندگی کی۔

پچھلے سال ۱۷ر اکتوبر کو ان کے برادر اصغر حکیم محمد سعید دہلوی کو کراچی میں شہید کردیا گیا تھا۔ اس وقت حکیم صاحب علیل تھے۔ اس کے بعد وہ بستر سے لگ گئے اور پھر نہ اٹھ سکے آخر کار ۲۳ر جولائی کو ان کی وفات ہوگئی۔ اور ہندوستان اپنے ایک محسن سے محروم ہوگیا جس کی خدمات صفحۂ تاریخ پر ہمیشہ درخشندہ رہیں گی۔ ادارہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ، پیام تعلیم حکیم صاحب کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کرتے ہیں اور ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

باقر مہدی
ای ۱۰۔ روی درشن۔ کارٹر روڈ باندرہ (ویسٹ) ممبئی ۵۰

ایک کالی نثری نظم

یہ قصہ صدیوں پرانا ہے
آدمی کے سارے قصے پرانے ہیں
نئی نئی جنگوں کے قصے، آدم کے بیٹوں نے سن رکھے ہیں!
خون کی ندیوں میں ڈوب ڈوب کے ابھرے لوگ
پانی خون میں فرق نہیں کرتے ہیں!
ایک زمانہ گزرا شیر سے ڈر کے بھاگے تھے
آج کا وحشی اپنے سایے تک سے ڈرتا ہے
شہر میں جنگل آپہنچا ہے
کل تک برگد کے سائے میں بیٹھے لوگ
آج تو برگد، پیپل، نیم۔ کچھ بھی نہیں ہے
سوکھی گھاس بھی ملنا مشکل ہے
مرتے جیتے مریل لوگ آخری سانسیں لیتے ہیں
پھر بھی اپنے اپنے مذہب کی تلوار نکالے لڑتے ہیں
بٹوارے کی سرحد پر جنگ ہے جاری
جنت دوزخ کی سرحد ختم ہوئی۔ کیا؟
کوئی کسی کا دوست نہ ہمدم۔ اپنے بھی بیگانے ہیں
مار کے مرنے سے بہتر ہے۔ جنگ نہ ہونے دیں
یہ لیکن ہم سب کو منظور نہیں ہے
امن کی گھنٹی بجا بجا کے دیکھ لیا
سننے والا کوئی نہیں
دور دور تک خون کی ندی چٹانوں پہ بہتی ہے
لیکن کب تک۔۔ لیکن کب تک؟

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم مطبوعات

اقبال کا نظریۂ شعر اور ان کی شاعری

پروفیسر آل احمد سرور

اردو کے ممتاز نقاد اور دانش ور پروفیسر آل احمد سرور کا مایۂ ناز خطبہ جو دہلی یونیورسٹی میں نظام خطبات کے تحت ۷۷۔۱۹۷۸ء میں پیش کیا گیا۔ اس خطبے میں سرور صاحب نے اقبال کے نظریۂ شعر کے بارے میں نہایت فکر انگیز خیالات پیش کیے ہیں۔ قیمت-/45

نظام اردو خطبات کا 19 واں خطبہ

داستان امیر حمزہ

شمس الرحمٰن فاروقی

"داستان' زبانی بیانیہ' بیان کنندہ اور سامعین" کے عنوان سے یہ خطبہ اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں پیش کیا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کر دیا ہے۔

قیمت-/60

بازائیں نیند (ڈرامے)

پروفیسر شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کا چوتھا مجموعہ ہے' اس کے ڈرامے جیتی جاگتی آنکھوں کا تجربہ ہیں۔ قیمت-/75

ماضی کے دریچے سے

ڈاکٹر شوکت اللہ

اس کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین ان قدیم تاریخی عمارتوں سے تعلق رکھتے ہیں جو اب ہمارے لیے ایک عظیم تاریخی سرمایے کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں' ان میں کچھ عمارتیں World Heritage کی فہرست میں بھی شامل کی جا چکی ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں اور تاریخ کے طلبہ کے لیے ایک نہایت اہم کتاب قیمت:-/75

فکر انسانی کا سفر ارتقا

خواجہ غلام السیدین

نظام اردو خطبات کا آغاز شعبہ اردو' دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲۵ فروری ۱۹۲۶ء کو ہوا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا اور صدارت ڈاکٹر سی ڈی' دیش مکھ' وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے فرمائی۔ ملک کے دیدہ ور ماہر تعلیم پروفیسر غلام السیدین نے مندرجہ بالا عنوان پر دو لیکچرز دیے اب اس خطبے کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ قیمت-/45

غالب کی شخصیت اور شاعری

رشید احمد صدیقی

یہ نظام اردو خطبات کا چوتھا خطبہ ہے جس کو ملک کے مایۂ ناز طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی نے پیش کیا ہے۔

(تیسرا ایڈیشن) قیمت:-/45

شمیم حنفی کی نئی کتاب

قاری سے مکالمہ

فکشن شاعری اور تنقید و تخلیق مضمرات پر مضامین کا مجموعہ۔ قیمت:-/150

نثار احمد قریشی
پروفیسر جامعہ الازہر، قاہرہ

سائنسی ترقی کے دور میں مطالعہ و تدریس ادب کی کیا ضرورت ہے؟ ایک جائزہ

موجودہ دور میں یہ سوال اکثر سننے میں آتا ہے کہ جب سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں انسان نے حیرت انگیز ترقی حاصل کرلی ہے تو اب پھر مطالعہ و تدریس ادب کا آخر کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ سائنس کی کرشمہ سازیاں بلاشبہ زندگی کے ہر میدان میں نظر آرہی ہیں۔ سائنسی ایجادات کی بدولت انسان کے کتنے پرانے خواب حقیقتوں اور زندہ صداقتوں کا روپ دھار چکے ہیں۔ مواصلات کے حوالے سے جدید ترین موٹریں زمین دوز ریل گاڑیوں اور بحری جہازوں سے آگے بڑھ کر انسان خلائی راکٹوں اور مصنوعی سیاروں تک جا پہنچا ہے۔ ٹیلی فون، چھاپہ خانے، طب، زراعت، خودکار مشینی نظام، الیکٹرانکس اور سب سے بڑھ کر کمپیوٹر کی دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ ایٹمی ترقی نے موجودہ دور میں ترقی کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ سائنسی ایجادات نے انسانی زندگی میں لاتعداد سہولتیں اور آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا انسان کے لیے مادی آسائشیں ہی سب کچھ ہیں؟ انسان چونکہ جسم وروح کے ملاپ کے نتیجے میں وجود میں آیا لہٰذا مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی ارتقاء بھی انسانی ضرورت ہے۔ ماضی اس بات کا شاہد ہے کہ مادی و روحانی ارتقاء دونوں جبلی و فطری تقاضے ہیں لہٰذا ہر دور میں ان کی تکمیل ہوتی رہی ہے۔ ثبوت کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جن قوموں نے سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں بے پناہ ترقی کی انھی اقوام میں صف اوّل کے ادیب و شاعر بھی پیدا ہوئے ان میں انگلستان کے شیکسپیئر اور جارج برنارڈ شاہ روس کے ٹالسٹائی، اٹلی کے دانتے اور جرمنی کے گوئٹے کے علاوہ متعدد ادیبوں وشاعروں نے ایسی ہی عالمگیر شہرت حاصل کی جیسی اس دور کے سائنس دانوں کے حصے میں آئی۔ سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان نے علوم وفنون میں بھی اپنے جوہر دکھائے مادی ترقی اور روحانی ارتقاء چونکہ دونوں لازمہ حیات ہیں لہٰذا ان دونوں کو مساوی

رفتار سے آگے بڑھنا چاہیے۔ صرف کسی ایک مثلاً مادی و بدنی ارتقاء کے حد سے بڑھ جانے کو اسی لیے علامہ اقبال نے روح اور احساس کی موت قرار دیا ہے۔ علامہ کے خیال میں انسان نے مادی ترقی میں ایسا کمال دکھایا کہ سورج کی شعاؤں کو گرفتار کر لیا مگر زندگی کی سیاہ رات کو صبح کی روشنی مہیا نہ کر سکا۔ [1]

مشینی دنیا نے انسان کو سہولتیں تو فراہم کیں زندگی میں تیزی و برق رفتاری پیدا ہو گئی مگر مشینی غلبہ انسانی دل کے لیے موت کا پیغام لایا اور آلات نے انسانی احساسات و مروت کو کچل کے رکھ دیا۔ [2]

یہ بھی حقیقت ہے کہ سائنسی ایجادات کی بدولت حاصل ہونے والی سہولتوں اور آسایشوں نے انسان کو عیش و عشرت کا دلدادہ، آرام طلب اور سہل انگار بنادیا ہے جس کے نتیجے میں وہ نفس پرستی کا شکار ہو کر مصنوعی اور نمائشی زندگی کا خوگر بن گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ نفس کشی کی بھول بھلیوں میں کھو کر زندگی یا روح کے اعلیٰ مقاصد اپنے خالق و مالک کے احسانات اور اپنے ہم جنسوں کی ضرورتوں اور احتیاجات کو بالکل بھول چکا ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ مشینوں نے ایک انسان کا دوسرے انسان پر انحصار ایسا کم کیا ہے کہ ایک انسان دوسرے سے گویا بالکل ہی بے نیاز ہو گیا ہے۔ مشین ایسی بُری طرح انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہوئی ہے کہ وہ خود مشین کی مانند بے حس ہو کر رہ گیا ہے۔ جو سائنسی و تکنیکی ترقی انسان کو انسان سے بے نیاز اور زمین پر رہنے کے سلیقے اور آداب نہ سکھا سکے اگر وہاں ادب و فنون اس کی مدد کے لیے نہیں آئیں گے تو پھر کون آئے گا؟ ان حالات میں ادب و فنون جمیلہ کی تدریس کا جواز زیادہ شدت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے تاکہ انسان کو مشین جیسی بے حسی سے نکال کر انسانیت کی دنیا میں واپس لایا جا سکے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں سائنس ترقی کرتی جائے گی توں توں ادب کے مطالعہ و تدریس کی ضرورت بڑھتی جائے گی۔

گذشتہ سطور میں یہ بات کسی حد تک واضح ہو چکی ہے کہ مطالعہ و تدریس ادب انسان کی جبلی و سماجی ضرورت ہے مگر یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر ادب کیا ہے؟ اس کی اقسام کون سی ہیں اور بیشتر تعلیمی اداروں میں ادب کی تدریس جس طریقے سے ہو رہی ہے کیا اسے اطمینان بخش قرار دیا جا سکتا ہے؟

اردو ادب اور اس کی مختلف اصناف (نثری و شعری) کئی سالوں سے کالجوں اور

یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں اور اساتذہ ادب معروف تدریس ہیں مگر بصد ادب یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس طرز تدریس سے کماحقہ نتائج بر آمد نہیں ہو رہے ہیں اس کی اور وجوہ بھی ہو سکتی ہیں مگر ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ آج تک یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی کہ آخر تدریس ادب اور اس کو شامل نصاب کرنے کا مقصد کیا ہے؟ دیکھا جائے تو اس لاعلمی کے باعث نہ تو اردو زبان و ادب کی نصاب سازی کا کام صحیح خطوط پر مرتب ہو سکا اور نہ ہی تدریس ادب سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو سکے۔ اردو زبان و ادب ایک لحاظ سے بد قسمت ہے کہ اس کی تدریس کے مختلف طریقوں اور مطلوبہ اہداف و مقاصد کے بارے میں نہ تو سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض کیا گیا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ لکھا گیا۔ البتہ انگریزی زبان و ادب کی تدریس کے بارے میں بہت کچھ ضبط تحریر میں لایا جا چکا ہے۔

تدریس ادب کے ضمن میں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کسے کہتے ہیں، ادب کی کوئی جامع تعریف کہیں بھی نہیں ملتی البتہ درج ذیل چند تعریفوں کی مدد سے ادب کا مفہوم کسی قدر ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔

بقول میتھیو آرنلڈ

"تمام علم جو کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے ادب ہے۔" ۳

ایڈمنڈ برک نے ادب کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"ادب وہ تمام سرمایہ خیالات و احساسات ہے جو تحریر میں آچکا ہے اور اس طرح مرتب ہوا ہے کہ اس کے پڑھنے سے قاری کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔" ۴

علامہ اقبال نے ادب اور آرٹ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"آرٹ کی غرض محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے۔ آرٹ سے انسانی زندگی کو فائدہ پہنچنا چاہیے بلکہ ہر چیز کو انسان کی زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے۔" ۵

ادب کو آرٹ کہنے سے ایک اور بحث جنم لیتی ہے مثلاً ادب کے ذریعے ہمیں علم ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن ادب اپنی ماہیت کے اعتبار سے علم نہیں فن ہے ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک ادب کی یہ تعریف کہ وہ آرٹ ہے بہت سادہ تعریف ہے ان کے نزدیک ادب کو صرف فن کہنا ہی کافی نہیں بلکہ ادب ایک فن لطیف ہے کیونکہ اس کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ ۶

موضوع زیر بحث کے حوالے سے ادب کی اقسام اور تدریس ادب کے مقاصد پر

روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس موضوع کی متعدد جہات تشنہ تشریح رہیں گی۔ ادب کی دو بڑی قسمیں شاعری اور نثر ہیں پھر نثر کی مزید دو قسمیں افسانوی و غیر افسانوی نثر قرار دی گئی ہیں۔ افسانوی نثر میں نثر کی وہ تمام اصناف آجاتی ہیں۔ جن میں کہانی پن موجود ہو۔ مثلاً داستان، ناول، افسانہ، ڈراما اور غیر افسانوی نثر میں سوانح نگاری، خاکہ نگاری، تنقید اور انشاء پردازی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے افسانوی نثر کو ادبی نثر بھی کہا جاتا ہے جس میں ادبی موضوعات کو اچھوتے انداز میں پیش کیا جاتا ہے جبکہ غیر ادبی نثر میں علمی موضوعات مثلاً فلسفہ، سائنس، تاریخ، معاشیات، عمرانیات اور نفسیات وغیرہ سے متعلق تحریریں آجاتی ہیں۔ البتہ ادیب کامل اور مضبوط ادبی ذوق کا حامل ہو تو وہ علمی موضوعات کو بھی ادبی نثر کا درجہ دے دیتا ہے لیکن زیادہ تر علمی موضوعات سنجیدہ عبارت و اسلوب ہی کا تقاضا کرتے ہیں۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ تدریس ادب کے لیے ادب کے ساتھ ساتھ فنِ تدریس سے آگاہی رکھنا بھی ضروری ہے جس طرح ادب کی متعدد تعریفیں ملتی ہیں اسی طرح فن تدریس پر بھی کوئی ایک تعریف صادق نہیں آتی مگر ایک بات طے شدہ ہے کہ تدریس کا مقصد کسی دوسرے شخص کو سیکھنے میں مدد دینا ہے۔ اس عمل میں معلومات فراہم کرنا تعلیمی عمل کے لیے موزوں اور مناسب ماحول تیار کرنا اور ایسی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی شامل ہے جو سیکھنے کے عمل میں ممد و معاون ہوں۔ تدریس کے طریقوں میں جو مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں لیکچر، مشترکہ تدریس کا طریقہ، منصوبی طریقۂ تدریس اور مباحثاتی تدریس شامل ہیں۔ استاد ان میں سے ہر ایک کا استعمال تدریسی سہولتوں کی فراہمی کے پیش نظر جیسے چاہے کر سکتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق موثر تدریس کے لیے ضروری ہے کہ تدریس دوطرفہ عمل کے مطابق ہو یعنی استاد کے ساتھ ساتھ شاگرد بھی اس عمل میں پوری طرح شریک ہو اور عمل تدریس ایک طرح سے استاد اور شاگرد کی مشترکہ ذمے داری ہونی چاہیے۔ ے

ادب کی موثر اور با مقصد تدریس اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ شاعر اور ادیب کسی قوم کا دماغ اور مستقبل کی آواز ہوتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ادیبوں اور شاعروں نے مردہ قوموں کی رگوں میں نئی زندگی دوڑائی ہے۔ زندگی کی تلخیوں اور مسائل سے اکتائے ہوئے انسانوں کو دنیاوی حسن و جمال اور رنگینی و دلچسپی کی طرف متوجہ کیا ہے۔ انھیں اندھیرے میں روشنی اور مایوسی میں امید کی کرن دکھائی ہے۔ انسانی عقل یا سائنس صرف

اشیاء کی سطح تک محدود رہتی ہے جب کہ باطن کی خبر لانے کے لیے روحانی بیداری ضروری ہے۔ ادب ہمیں حیات انسانی کو خوشگوار، پر لطف اور پرکشش بنانے کے لیے بھائی چارے، محبت اور عالمگیر اخوت کا درس دیتا ہے اور کام سائنس و ٹیکنالوجی کے بس کا نہیں۔

آخر میں تدریس ادب کے مقاصد پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ ناقدینِ ادب نے تدریسِ ادب کے بہت سے مقاصد بیان کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ تدریسِ ادب کے ذریعہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۲۔ تدریسِ ادب کے ذریعہ جمالیاتی ذوق کی نشو و نما کا کام لیا جاتا ہے۔

۳۔ تدریسِ ادب کے ذریعہ اخلاقی اقدار کی تبلیغ و ترویج کا کام لیا جاتا ہے۔

۴۔ تدریسِ ادب کے ذریعہ ثقافتی ورثے کی ترسیل اور زبان کی تدریس کا کام لیا جاتا ہے۔

ادب کی تدریس کے ان مجموعی مقاصد کے علاوہ شاعری و نثر کے الگ الگ مقاصد بھی متعین کیے جا چکے ہیں جنھیں پیش نظر رکھنا ادب کے استاد کے لیے لازم ہے مثلاً تدریسِ شاعری یا غزل میں پہلا مقصد غزل خوانی، دوسرا تفہیم شعر اور تیسرا استحسانِ شعر ہوگا۔ شاعری کا تعلق بنیادی طور پر قوت متخیلہ سے ہے لہٰذا اس کی تدریس میں طلبہ کے ذہنی عمل کو حرکت میں لانے، ان کے شوق کو بیدار کرنے اور مجموعی طور پر شاعری سے طلبہ کے ذوق حظ اندوزی اور تحسین شعر کو پختہ اور بیدار کرنا مقصود ہے۔ [۸]

شاعری اور نثر کی تدریس کے مقاصد بھی الگ الگ متعین کیے گئے ہیں۔ شاعری چونکہ احساس کی زبان ہے اور نثر کو عقل کی زبان قرار دیا گیا ہے اس لیے دونوں کی تدریس کے مقاصد بھی الگ الگ ہیں۔ نثر کی تدریس میں یہ مقاصد پیش نظر رکھے جائیں گے۔

ا۔ درستِ عبارت خوانی

ب۔ تلفظ اور لب و لہجہ کی درستی

ج۔ رموز اوقاف کی مشق

د۔ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ

ر۔ تحریر و تقریر میں پختگی۔

ادب کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔ یہ قومی عظمت کی علامت اور قومی مزاج کی ترجمان رہی ہے اس لیے اسے صرف چند کلمات کا مجموعہ قرار نہیں دیا

جاسکتا۔ کسی بھی ملک یا قوم کے ادب کو زبان کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا گویا زبان وادب دونوں لازم وملزوم ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے۔ سائنس کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی تفہیم وتدریس بھی انسانی بقا کے لیے نہایت ضروری اور برابر کی اہمیت کی حامل ہے۔

حواشی

۱۔ کلیات اقبال (ضرب کلیم) صفحہ ۶۹
۲۔ کلیات اقبال (بال جبریل) صفحہ ۱۰۸
۳۔ ویبسٹر نیو ورلڈ ڈکشنری صفحہ ۱۰۱۲
۴۔ ویبسٹر نیو ورلڈ ڈکشنری صفحہ ۱۰۱۳
۵۔ محمود نظامی (مرتب) ملفوظات، امرت پرنٹنگ پریس لاہور۔ س۔ ن۔ صفحات ۱۴۴ تا ۱۴۵
۶۔ سید عبداللہ (ڈاکٹر) اردو ادب ۱۸۵۷۔۱۹۶۶ لاہور ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۸
۷۔ تدریسِ اردو۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔ اسلام آباد ۱۹۹۴ء صفحات ۳۳ تا ۶۰
۸۔ اختر انصاری۔ غزل اور غزل کی تعلیم۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ صفحات ۷۰ تا ۱۰۰
۹۔ تدریسِ ادب۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ ۱۹۸۹ء صفحات ۴۰ تا ۵۰

مجتبیٰ حسین
200' انگورا پارٹمنٹ
پٹ پڑ گنج۔دہلی۔110092

بلال آل مستری۔تم نے یہ کیا غضب کیا

صاحبو! دنیا کے ننانوے فیصد لوگ تو فرشتوں کے لکھے پر پکڑے جاتے ہیں لیکن ادیبوں کی مخلوق وہ واحد مخلوق ہوتی ہے جو بسا اوقات اپنے ہی لکھے پر پکڑی جاتی ہے بلکہ لکھتی ہی اس لیے ہے کہ بعد میں پکڑی جائے۔آج ہم اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے اس لمبے عرصہ میں زیادہ تر تحریریں ایسی لکھیں جنھیں اب پڑھتے ہیں تو ہمیں اپنے آپ سے شرم سی آنے لگتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی حالیہ تحریروں میں پوری دیانتداری کے ساتھ اس دلی خواہش کا بار بار اظہار کیا ہے کہ ہم بیسویں صدی میں ہی اس دُنیا سے رخصت ہو جانا چاہتے ہیں۔دنیا اکیسویں صدی میں جانے کے لیے اُتاولی ہو رہی ہے تو ہوا کرے۔ہم اکیسویں صدی میں جانا نہیں چاہتے۔لوگوں نے اسے ہماری مایوسی، قنوطیت پسندی اور حوصلہ کی پستی وغیرہ پر محمول کیا مگر اصل وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی ہی ایک تحریر کی وجہ سے اکیسویں صدی میں جانے سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔یادش بخیر! ۱۹۷۵ء میں ہم نے اس وقت کے اردو کے حالات اور اپنی حالت کے مدنظر ایک مضمون ''اردو کا آخری قاری'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ہم نے یہ مضمون اپنی دانست کے مطابق اس مفروضہ کے تحت لکھا تھا کہ آنے والے پچیس برسوں یعنی ۲۰۰۰ء کے آنے تک اس ملک میں اردو کے قارئین بالکل ناپید ہو جائیں گے اور ۲۰۰۰ء آئے گی تو اردو کے ادیب اور شاعر اردو کے آخری قاری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے اور یہ انھیں دستیاب نہیں ہوگا۔اس مضمون کو ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا اور ہم بھی اردو کے اس انجام پر پھولے نہیں سماتے رہے۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس مضمون پر سے پچیس برس بیت گئے اور اب اکیسویں صدی کی آمد میں صرف چار پانچ مہینے باقی رہ گئے ہیں۔اب ہمیں یہ فکر لاحق ہوگئی ہے کہ کل کے دن کوئی ہم سے یہ سوال پوچھ بیٹھے کہ میاں تم نے تو ۲۰۰۰ء تک اردو کے ختم ہو جانے کی پیشن گوئی کی تھی۔کیا یہ ختم ہوگئی؟۔اور یہ واقعی ختم ہوگئی ہے تو پھر یہ تنویر مینار، بلال اقبال مستری، اور زرین انصاری وغیرہ کون ہیں اور یہ کہ تم خود

کیوں اب تک اس زبان میں اپنا قلم گھستے چلے جا رہے ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اسی متوقع سوال کے خوف سے بیسویں صدی میں ہی اپنی سانسوں کے تسلسل کو ختم کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی کیونکہ ایک باضمیر اور باظرف آدمی اپنے احساس ندامت کا مقابلہ اسی طرح تو کرتا ہے

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ زندگی میں ہمیں اپنوں کے ہاتھوں ہی ہزیمت اُٹھانی پڑی ہے ہم نے جب بھی کمیں گاہ کی طرف نگاہ ڈالی ہے دشمنوں کے بجائے اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوئی ہے چنانچہ پچھلے تین برسوں سے مہاراشٹر کی نوجوان نسل کو نہ جانے کیا ہو گیا کہ ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔ تین برس پہلے شولا پور کے اردو ذریعہ تعلیم کے ایک اسکول کے طالب علم تنویر منیار نے دسویں جماعت کے امتحان میں سارے مہاراشٹر میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی (ہم نے سوچا تھا کہ غلطی کس سے نہیں ہوتی) مگر دوسرے ہی سال پونے کے اینگلو اردو اسکول کی طالبہ زرّین انصاری پونے ڈویژن میں اول آئی تھیں اور اس سال پونے اینگلو اردو بوائز اسکول کے ہونہار طالب علم بلال اقبال مستری نے دسویں کے امتحان میں ۹۶٫۵۳ فیصد نمبر حاصل کر کے سارے مہاراشٹر میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کا کمال کر دکھایا ہے۔ اس امتحان میں چودہ لاکھ طلبہ نے حصہ لیا تھا۔ ہمیں افسوس تو اس بات کا ہے کہ مہاراشٹر ہماری آبائی ریاست ہے، ہم مراٹھی نہ صرف اچھی بول لیتے ہیں بلکہ پڑھ بھی لیتے ہیں۔ ہم نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ہماری ہی آبائی ریاست کی نوجوان نسل ہمارے خلاف کمر بستہ ہو جائے گی اور اردو کا پرچم بلند کر کے ہمارے پچیس برس پرانے مضمون کا مذاق اڑائے گی۔ "YOU TOO BRUTUS" والا معاملہ ہے۔ مانا کہ نئی نسل بزرگوں کا کہنا نہیں مانتی لیکن یہ اتنی بے لگام ہو جائے گی یہ ہم نے نہ سوچا تھا۔ ہمیں اس طالب علم کی شاندار کامیابی کی اطلاع شاہد علی خاں، جنرل منیجر مکتبہ جامعہ نے فون پر دی جو بچوں کی کامیابیوں پر خود بھی بچوں کی طرح خوش ہونے کا گُر جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑوں کے رسالہ ''کتاب نما'' کی بجائے بچوں کے رسالہ ''پیام تعلیم'' کی ادارت پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ وہ ''کتاب نما'' کا اداریہ کبھی خود نہیں لکھتے بلکہ دوسروں سے اپنے رسالہ کا ''مہمان اداریہ'' لکھواتے ہیں۔ ایک دن ہم نے ان سے کہا کہ حضور کبھی کبھار آپ اپنے رسالہ کا ''میزبان اداریہ'' بھی لکھ دیا کیجیے، بولے ''اردو رسالوں میں ان دنوں اداریہ نویسی کا جو رجحان مرّوج ہے اس کے مطابق میں اردو کا نوحہ نہیں لکھ سکتا۔ آخر ہم کب تک اردو کا رونا روتے رہیں۔ اس لیے میں اپنے رسالہ میں خود نہیں روتا بلکہ دوسروں کو رونے کا موقعہ فراہم کرتا

ہوں" دوسری طرف ہمارے دوست محبوب الرحمٰن فاروقی مدیر" آج کل" ہیں جو اپنے فکر انگیز، جرأتمندانہ اور بے باک اداریوں کے لیے ساری اُردو دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے اداریوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ انھیں پڑھ کر ہم جیسا آدمی بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سوچنے کے باوجود کچھ نہیں کرتا (شمالی ہند میں ہمیں جو اردو کچر نظر آتا ہے اس کی یہی تو خصوصیت ہے)۔ اُردو رسالوں اور اخباروں کے اداریوں سے لوگ کس قدر گھبراتے ہیں اس پر ہمیں ایک پرانی بات یاد آگئی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں اُس وقت کے مشہور اُردو اخبار" پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر کا لندن جانا ہوا تھا۔ لندن پر جرمن ہوائی جہازوں کی بمباری ہو رہی تھی اور دوسری طرف ہندوستان میں جدوجہد آزادی اپنے عروج پر تھی۔ ایسے میں اُس وقت کے وزیر اعظم برطانیہ سر ونسٹن چرچل نے" پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر کو ملاقات کا موقع عطا کیا۔ ملاقات چونکہ مختصر تھی اس لیے پیسہ اخبار کے ایڈیٹر نے سر ونسٹن چرچل سے ملتے ہی بہ آواز بلند کہا" جناب عالی! اب وقت آگیا ہے کہ آپ ہندوستان کو آزاد کر دیں ورنہ۔" ورنہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے تو چرچل نے اس ورنہ کا مطلب یہ لیا کہ ہندوستان میں قتل و غارتگری برپا ہو جائے گی اور خاصا خون خرابہ ہوگا۔ تاہم چرچل نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا" ورنہ پھر کیا ہوگا۔" پیسہ اخبار کے ایڈیٹر نے بڑے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ جواب دیا" ورنہ میں واپس جا کر' پیسہ اخبار' میں آپ کے خلاف اداریہ لکھوں گا۔" بہر حال یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ شاہد علی خاں کے فون کے فوراً بعد ہمارے پاس محبوب الرحمٰن فاروقی کا فون آیا۔ خلاف توقع بہت خوش تھے۔ ان کے اداریوں میں جو غم و غصہ اور جلال پایا جاتا ہے وہ ان کے لہجہ میں سُنائی نہ دیا۔ کہنے لگے " آپ کو پتہ ہے مہاراشٹر کے ایک اردو میڈیم اسکول کے طالب علم نے دسویں جماعت میں پھر سارے مہاراشٹر میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔" ہم نے کہا" یہ سب آپ کے اداریوں کا فیضان ہے۔" ہمارا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنی خوشی کا اظہار کچھ اس طرح کرتے رہے جیسے نتیجہ بلال مستری کا نہ نکلا ہو بلکہ خود ان کے فکر انگیز اداریوں کا نکلا ہو۔ بعد میں محبوب الرحمٰن فاروقی نے ہی ہمیں روزنامہ" انقلاب" ممبئی کا وہ شمارہ دیا جس میں بلال مستری کی کامیابی کی خبر صفحہ اوّل پر چھ کالموں کی جلی سُرخی کے ساتھ شائع ہوئی تھی حالانکہ اس دن کے سارے اخبارات میں بل کلنٹن کا ایک بیان پانچ کالمی سُرخیوں کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع ہوا تھا۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اُس دن کے" انقلاب" میں بل کلنٹن کے بیان کو پہلے صفحے پر جگہ نہیں ملی بلکہ بلال مستری نے یہ جگہ بل کلنٹن سے چھین لی۔ گویا اب اردو اخبارات میں بھی شخصیتوں کی

اہمیت اور اُن کے رُتبے کو سمجھا جانے لگا ہے۔ اخبار میں نہ صرف بلال مستری کی شاندار کامیابی کی خبر شائع ہوئی ہے بلکہ پونے میں اس طالب علم کی کامیابی پر جو جلوس نکالا گیا تھا اُس کی تصویر بھی نمایاں طور پر شائع ہوئی ہے۔ اس موضوع پر اخبار کے خصوصی اداریے کے علاوہ بلال مستری کا تفصیلی انٹرویو بھی شمارہ میں شامل ہے۔ بلال مستری کی کامیابی کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ خوش آیند بات یہ بھی ہے کہ صرف بلال نے ہی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی ہے بلکہ مہاراشٹر کے اردو میڈیم کے مختلف اسکولوں کے بے شمار طلبہ نے بھی کئی مضامین میں اپنے اپنے ڈھنگ سے کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ صاحبو! پچھلے ستائیس برس سے شمالی ہند میں رہنے کی وجہ سے ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اردو ۲۰۰۰ء میں ختم ہو جائے گی۔ لیکن ہمیں کیا پتہ تھا کہ شمالی ہند والے جہاں اس زبان کو مارنا چاہتے ہیں وہیں جنوبی ہند والے اس زبان کو زندہ رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اس کی حالت فلم ''مغل اعظم'' کی انارکلی سے بڑی حد تک مشابہہ ہے جس میں مہابلی اکبر نے کہا تھا ''انارکلی! سلیم تجھے مرنے نہیں دے گا اور ہم تجھے جینے نہیں دیں گے۔'' اگر آپ ہمارے مضمون کی صداقت پر ایمان لانا چاہتے ہیں تو اتر پردیش، مدھیہ پردیش، راجستھان وغیرہ چلے جایئے لیکن اگر آپ ہمارے مضمون کو جھٹلانا چاہتے ہیں تو بشوق مہاراشٹر، کرناٹک، آندھرا پردیش، بہار وغیرہ چلے جائیں۔ ہم نے پچیس برس پہلے جو مضمون لکھا تھا وہ غلط نہیں لکھا تھا۔ اور اب جو جنوبی ہند کے اردو والے اپنے بل بوتے پر اردو کو زندہ رکھنے کے لیے کمربستہ ہو گئے ہیں تو یہ بھی غلط نہیں ہے۔ اگرچہ آندھرا پردیش میں اُردو کی صورتحال اتنی اچھی نہیں ہے لیکن عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام اردو کی جو تحریک رضاکارانہ طور پر شروع ہوئی ہے وہ اردو والوں کی خود اعتمادی، عزم اور حوصلہ کی ترجمان ہے۔ اردو کو اب دانشوروں، پروفیسروں، شاعروں اور ہم جیسے ادیبوں کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ تنویر منیاروں، بلال مستریوں، زرینائوں، شعیبوں، منانوں، جہاں آراؤں اور رضوانائوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اب سیاسی رہنماؤں کی بھی حاجت نہیں رہی۔ ہمیں کوئی بڑا سرسید بھی نہیں چاہیے۔ ضرورت ہے صرف چھوٹے چھوٹے سرسیدوں کی جو اپنے اپنے علاقوں میں اپنی تہذیبی شناخت کو برقرار رکھنے کی سعی کریں۔

میاں بلال مستری! ہماری مبارکباد قبول کرو۔ تمہاری وجہ سے ہم نے اپنی کتاب کے چوتھے ایڈیشن میں اپنے مضمون ''اردو کا آخری قاری'' میں ضروری تصحیح کردی ہے اور اردو زبان کی بقا کی عمر میں مزید ایک صدی کا اضافہ کردیا ہے۔ اب تو خوش ہو جاؤ۔

یوسف ناظم

ہمیں غصہ کیوں نہیں آتا

علم نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ غصہ ایک اچھی عادت ہے اور جب یہ آئے تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ گیا وقت پھر آتا نہیں ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ غصے کی شدت کو معتدل کرنے کی کوئی ترکیب آزمانا جیسے اگر آپ کھڑے ہوں تو بیٹھ جائیں یا بیٹھے ہوں تو لیٹ جائیں یا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھیں۔ یہ ساری ترکیبیں غیر فطری نامناسب اور قابل اعتراض حرکتیں ہیں۔ یوں بھی یہ سوچیے کہ بیٹھنے کی جگہ تو ملتی نہیں۔ آدمی لیٹ کیسے جائے گا۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے کا صحیح وقت وہ ہوتا ہے جب دل ٹھنڈا ہو اسی لیے عام طور پر آدمی کسی بات پر سوچتے ہیں تو ٹھنڈے دل سے سوچتے ہیں۔ غصے کے عالم میں تو دل خاصا گرم رہتا ہے یعنی یوں سمجھیے تقریباً آتشین ہوتا ہے ایسے عالم میں اسے کیسے یاد آسکتا ہے کہ اسے کیا ورد کرنا چاہیے۔ غصہ اعضائے جسمانی کو اور خاص طور پر اعصاب کو تقویت پہنچاتا ہے بلکہ بعض ماہرین نفسیات تو یہ تک کہتے ہیں کہ انسان کی شہ رگ پر بھی اس کے اچھے اور دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غصے کو نہ صرف فطرت انسانی کا ایک جزو اعظم مانا گیا ہے بلکہ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ جوانوں کو بھی اس نعمت سے سرفراز کیا گیا ہے جس کی مثال وہ لوگ یہ دیتے ہیں کہ گایوں اور بھیسوں میں غصے کی جراثیم بکثرت پائے جاتے ہیں اور جب بھی یہ دونوں موٹی گردنوں والی مخلوقات غصے سے بے قابو ہو جاتی ہے تو فی الفور اپنے دودھ کے مقررہ کوٹے میں سے کافی دودھ چرا لیتی ہیں اور غریب گوالے کو عین وقت پر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنا پڑتا ہے۔ وہ صبح سویرے میونسپلٹی کے جس نل پر جاتا ہے وہاں مٹکوں، برتنوں اور بالٹیوں کی قطار لگی ہوتی ہے اور اسے بھی ان گایوں بھیسوں کی طرح غصہ آجاتا ہے۔ صبح سویرے کا غصہ کہا جاتا ہے کافی فرحت بخش ہوتا ہے اور اسے آسانی سے اپنے گھر میں اتارا جاسکتا ہے۔ (غصہ بھی کہیں باہر سے آنے

والی سواری کی طرح ہوتا ہے جسے اپنے گھر میں اتارنا ہی پڑتا ہے۔)

غصہ ہماری بھی دلچسپی کی چیز رہا ہے اور ہم برسوں تک غصّے سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ ایک وقت تو ہم نے ایسا بھی گزارا ہے کہ غصے کی آمد کا انتظار ہی نہیں کیا اور مسلسل غصے ہی میں رہے ہمارے ایک شناسا ممتاز علی خاں بھی ہمیں یاد ہیں غصّے کی بہت شوقین تھے اور انھوں نے شادی بھی غصے ہی میں کی ورنہ ان کے ہاتھ میں شادی کی لکیر تھی ہی نہیں اور غصہ بھی انھیں اسی بات پر تھا کہ یہ لکیر گئی کہاں اور انھوں نے طے کیا کہ وہ ہاتھ میں لکیر تو نہیں پیدا کر سکتے۔ لیکن ایک بیوی تو پیدا کر سکتے ہیں (یہاں پیدا کرنے سے مراد تلاش کرنا ہے الفاظ کے لغوی معنوں پر نہ جائیے) اور اب تو ماشاللہ ممتاز علی خاں کے گھر میں حاصل شدہ بیوی کے علاوہ ایک امتیاز علی خاں بھی ہیں اور ایک شہناز بھی موجودہ حالات میں اتنا غصہ کافی ہے ہم بھی جیسا کہ ہم نے عرض کیا ایک عرصے تک غصے کے عالم میں رہے بس شب و روز یہی عالم تھا کہ ایک رنگ آرہا ہے اک رنگ جارہا ہے اور جو رنگ بھی آتا تھا چوکھا آتا تھا۔ ان دنوں سب سے زیادہ بار ہماری ناک پر پڑتا تھا کیونکہ ہمارا غصہ رہتا وہیں تھا۔ ناک نقشا ہمارا برا نہیں تھا اس لیے ناک تھی بھی اونچی جس کا فائدہ یہ تھا کہ غصہ ہمیشہ نمایاں رہتا تھا۔ کئی دن بعد ہمارے ایک قریبی دوست نے ہمیں بتایا کہ ہم ناک میں سوئی لگوالیں (غالبًا نیڈلنگ Needling کا لفظ استعمال کیا تھا) ہم چونکہ غصے میں تھا اس لیے ہم نے اپنے دوست کا مشورہ قبول فرمالیا اور ڈاکٹر سنگھ کے مطب میں جاکر اپنی ناک کی صحیح کروالی۔ نیڈلنگ کا یہ ہنر ہمیں فن کتابت سے ملتا جلتا نظر آیا۔ فن کتابت میں تو غلطیوں کا ہونا ضروری ہے لیکن نیڈلنگ قطعیت کا فن ہے اور اس کی پروف ریڈنگ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسے حرف آخر سمجھ کر قبول کرلینا چاہیے۔ نیڈلنگ کو ہم نے بہت کارآمد چیز پایا ہے اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اس کی تعریف و توصیف میں ایک قصیدہ لکھیں۔ نیڈلنگ خاص طور پر ان شاعروں کی لیے بہت ضروری ہے جو مشاعروں میں اپنا کلام ناک کے ذریعہ نشر کرتے ہیں۔ لیکن تفصیل پھر کبھی۔ اس وقت تو ہم صرف یہی کہیں گے کہ اس فن کو مقبول عام بنانے کی خاطر ہر اس شخص کو جدوجہد کرنی چاہیے جسے اپنی ناک عزیز ہو۔ ہم تو سمجھتے ہیں سوئی لگوانے کی ضرورت ہر اسی شخص کو ہے جو سیاست کے میدان میں مصروف اور برسرکار ہو۔ سیاست کا میدان بجائے خود ایک کرہ بن گیا ہے۔ اس کرہ ارض پر ایک کرہ خود غرضی کا ضروری تھا۔ وہ وجود میں آچکا ہے۔ ادب کی طرح

سیاست میں بھی کئی اصناف ہیں۔ مثلاً صنف زرگری۔ حصول زر کے لئے اب جو گر استعمال کیا جاتا ہے اس گر کا انگریزی نام اکسٹارشن (Extortion) ہے۔ جس طرح پولس چوکی پر کسی ناکردہ گناہ ملزم سے حقیقت اگلوائی جاتی ہے اسی طرح سیاست کے میدان میں مصروف لوگوں کو اپنے ممدوح سے پیسہ اگلوانا پڑتا ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل ہر شخص کی انگلی ٹیڑھی ہے۔ سیدھی انگلی سے یوں بھی پہلے کبھی کوئی کام ہوا ہے؟ سیدھی انگلی کو اب بذریعہ سیاست، ٹیڑھی انگلی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اکسٹارشن کو ملک کے دوسرے علاقوں میں کیا کہا جاتا ہے ہمیں معلوم نہیں ہے لیکن ہم جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں اسے ہفتہ وصولی کہا جاتا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے یہ ترکیب ہمیں زیادہ پسند نہیں آتی لیکن اسے غلط العوام سمجھ کر قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس ہفتہ وصولی کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ اغوا اور حبس بیجا جیسے اعمال بھی اسی شق میں آتے ہیں۔ اسے عملی تنقید کی طرح عملی سیاست کہا جاتا ہے اور اس عمل کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں حصہ لینے والا ہر شخص ہمیشہ غصے میں رہتا ہے۔ غصہ آدمی کو چونکہ سرگرم عمل رکھتا ہے اس لیے سیاست کے میدان میں کبھی جمود نہیں آتا۔ ہر سیاست داں کرپشن (بدعنوانی) کا سخت مخالف ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی لسانی مخالفت کے بغیر بدعنوانی کا جاری رہنا ممکن نہیں ہے۔

ہم یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ ہمیں غصہ کیوں نہیں آتا ہے۔ یہ اس لیے نہیں آتا ہے کہ اب اس میں فائدہ کچھ نہیں ہے۔ آدمی کو حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہیے اور خاص طور پر جب حالات مزاحیہ اور فکاہیہ ہوں۔ پہلے یہ صرف انشائیہ ہوا کرتے تھے یعنی ان میں کچھ ہوتا نہیں تھا سوائے سطروں کے۔ بین السطور تو ہوتے ہی نہیں تھے۔ انشائیے میں بین السطور کہاں سے آئیں گے۔ سابقہ سیاست بازی ضرور تھی لیکن یہ راست بازی تھی۔ راست بازی بھی بھلا کوئی بازی ہوئی۔ اس سے تو شطرنج کی بازی اچھی ہوتی ہے اس میں آدمی کچھ سوچتا تو تھا۔ موجودہ صورتحال میں آدمی چوکنا رہتا ہے اور صبح اٹھ کر پہلے اخبار میں یہ دیکھتا ہے کہ پٹرول اور ڈیزل کی قیمت میں اضافہ ہوا یا نہیں اور ہوا ہے تو اس کی قیمت، قوت برداشت سے باہر نکلی یا نہیں۔ آدمی کو سمجھ میں آگیا ہے کہ بنیادی قیمت پٹرول ہی کی ہوتی ہے اس میں اضافہ ہو جاتا ہے تو چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کی قیمت میں اضافہ ہونا ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ پھول ہو یا پھول گوبھی۔ معمولی گھاس ہو یا کوئی چیز خاص الخاص ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جائے

گی تو پٹرول ہی استعمال ہوگا۔ اکانومی کا یہ نکتہ سرکار کی سمجھ میں آگیا ہے۔ جب یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا تو ہمیں غصہ آتا تھا کہ اتنی معمولی سی بات سرکار کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی ہے۔ قیمتیں ایک جگہ رک رہیں تو شبہ ہوتا تھا کہ وقت تو کہیں رک نہیں گیا۔ اب ہمیں اگر غصہ کبھی آیا تو صرف اس بات پر آتا ہے کہ یہ افراط زر، کیا چیز ہے۔ آج تک ہمارا بنک بیلنس تو دور رہا ہماری جیب میں کبھی افراط زر کی صورت نہیں پیدا ہوئی بلکہ اب تو کبھی پینٹ یا شرٹ سلواتے ہیں تو اپنے درزی سے کہہ دیتے ہیں کہ جیبیں دو یا تین سے زیادہ نہ ہوں۔ ان میں رکھنا ہی کیا ہے اور چور جیب تو بالکل نہیں چاہیے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ ہماری پتلونوں پر زخم کا نشان اسی جگہ ہوتا تھا جہاں عموماً یہ چور جیب آویزاں کی جاتی تھی۔ وہی جگہ ان لوگوں کی توجہ کا مرکز رہتی ہے جو اس پر اپنا ہنر آزماتے ہیں۔ آخر یہ لوگ بھی پینٹ پہنتے ہوں گے جو کوئی نہ کوئی درزی ہی سیتا ہوگا۔ (ہوسکتا ہے کہ یہ ان کا خاندانی درزی ہو) اس لیے ان سب لوگوں کو معلوم رہتا ہے کہ نشان کہاں لگانا ہے۔ پتلونوں میں اب سب سے زیادہ غیر محفوظ جیب یہی چور جیب ہے۔ شروع شروع میں افراط زر بھی اسی جیب میں ہوا کرتا تھا۔ اب افراط زر کی ماہیت چونکہ ہماری سمجھ میں آگئی ہے اس لیے غصے کے آنےکی یہ وجہ بھی جاتی رہی۔ یوں بھی اب چھوٹی موٹی وارداتوں پر لوگ اپنا وقت اور ہنر ضائع نہیں کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو ایک زمانے میں اپنا تقریباًروز آنہ کا طریقہ حیات بنالیا تھا کہ کام سے فارغ ہوکر جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو تقریباًبسورتے ہوئے داخل ہوتے اور افراد خاندان جن میں بیوی یعنی ان کی اپنی بیوی پیش پیش ہوتیں کے پوچھنے پر مری ہوئی آواز میں سب کو مطلع فرماتے کہ ٹرین سے سفر کرنے کے دوران ان کی وہ جیب جو افراط زر سے لبریز تھی راستے میں کہیں کٹ گئی اور یہ ان کی تنخواہ کا دن ہوتا۔ خبر سن کر سننے والوں کی جن میں ان کی اپنی بیوی پیش پیش ہوتیں صورتیں یکلخت اتر جاتیں اور ہر کسی کی آنکھوں کے سامنے اس کا ایک نہ ایک مسئلہ منہ پھاڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن جب ان مبینہ وارداتوں میں بھی افراط کی صورت پیدا ہوگئی تو چند ذہین بیویوں نے اندر ہی اندر اپنے خفیہ ذرائع سے حقائق کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں کی اور انھیں ان کی ذاتی اسکاٹ خفیہ ٹیم نے بتادیا کہ عین تنخواہ کے دن شوہر کی جیب کہاں جا کر کٹتی ہے۔ جیبیں کٹنے کی خبریں سن کر ہمیں بھی غصہ آتا تھا اب نہیں آتا۔ کیونکہ اب تنخواہیں بالعموم راست بنک میں بھیجی جانے لگی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے ان مشاغل میں معروف ہنرمند

لوگوں نے کساد بازاری کی وجہ سے خود ٹرینوں میں سفر کرنا ترک کردیا ہے وہ غصے میں صرف چلتی ٹرینوں پر پتھر پھینکنے لگے ہیں اطبا نے بتایا ہے کہ چلتی ٹرین پر پتھر پھینکنے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور اس کا فائدہ وہی ہوتا ہے جو فصد کھلوانے سے ہوا کرتا تھا۔

ہمیں اب غصہ اس لیے بھی نہیں آتا کہ عوام کے ان مشاغل میں جو آمدنی کا ذریعہ تھے، مانوں کے محافظوں نے خود ہی حصہ لینا شروع کردیا ہے۔ یہ تقسیم کار بھی ہے اور اشتراک بھی۔ اگر ملک کے سارے باشندے، شانہ بہ شانہ ان مشاغل میں حصہ لینے لگیں تو کسی کو غصہ کیسے آسکتا ہے۔ گنگا جب بہہ رہی ہو خواہ وہ الٹی ہی کیوں نہ بہے سب کو ہاتھ دھو لینا چاہیے۔ کنارے پر کھڑے رہ کر صرف لہریں گننے کا فائدہ کیا ہے۔

غصے کے بارے میں ہم نے کئی اقوال پڑھے ہیں جو ہمیں ازبر تو نہیں ہیں لیکن کبھی کبھی یاد ضرور آجاتے ہیں۔ ان میں سے ایک قول جو اس وقت ہمیں یاد آرہا ہے یہ تھا کہ اگر کوئی شخص بہت غصے میں ہو اور تمھیں برا بھلا کہہ رہا ہو تو اسے ٹوکو مت۔ تم ٹوکو گے تو اس کے غصے میں مزید اضافہ ہوگا۔ اور وہ تمھیں برا بھلا کہنے کی بعد کی منزل تک جانے میں تکلف نہیں کرے گا۔ یہ قول ہمیں بہت پسند آیا تھا اور ایک مرتبہ ہم نے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ہم کئی دن تک گھر کے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ اس سانحے کے بعد ہم نے اپنے مزاج میں ٹھنڈک پیدا کرلی۔

یوں بھی غصہ اب اس آمد کی طرح ہو گیا ہے جو شاعری کے لیے مہمیز ہوا کرتا تھا۔ موجودہ حالات میں مضامین اور خیالات آورد کے پابند ہو گئے ہیں۔ آپ شاید یقین نہ کریں لیکن ہم نے ایک صاحب حیثیت شاعر دوست کے گھر کے پھاٹک پر آمد کی تختی کی جگہ آورد کی تختی لگی دیکھی ہے اور "وفت" کی تختی کی بجائے "برآمد" کی تختی۔ آپ کو یقین نہیں آیا نا۔ لیکن آپ خود جا کر کلفٹن روڈ پر دیکھ لیجیے ویسے کلفٹن روڈ کا نیا نام ہمیں معلوم نہیں ہے۔

ہمیں اب بھولے سے کبھی غصہ آیا تو صرف اس بات پر آتا ہے کہ اس کی جنس کیوں بدل گئی ہے۔ اور غصہ غصی ہو کر رہ گیا ہے اور غصی بھی بھلا کوئی آنے یا لانے کی چیز ہے۔ نہ آمد کی نہ آورد کی۔

نصرت ظہیر
4/15 کھچڑی پور۔ دہلی 91

ریشم گلی کے بھائی جی!

کئی برس پہلے کی بات ہے۔ بھائی جی سے میری پہلی ملاقات ٹیلی فون پر ہوئی۔ لہجے میں ہلکا سا دہلی پن تھا۔ ''پرانی دلّی سے یاسین بول رہا ہوں۔ بہت دنوں سے آرزومند تھا بات کرنے کا بہرحال، کبھی شرف ملاقات کا موقع دیں۔''

اس کے بعد میرے مضمونوں کی تعریفیں کرنے لگے۔ میں سمجھ گیا۔ ضرور کسی پارٹی کے لیڈر ہوں گے۔ کل ہی دفتر میں کوئی پریس ریلیز لے کر آدھمکیں گے اور کہیں گے آپ ماشاءاللہ بہت اچھا لکھتے ہیں ذرا یہ خبر پہلے صفحہ پر چھپوادیں!

اور خبر ہوگی کچھ اس قسم کی کہ آل انڈیا مسلم فلاں فلاں کمیٹی محلہ چتلی قبر کے قومی صدر یاسین خاں انڈے والوں نے امریکہ کو خبردار کیا ہے کہ وہ فلاں جگہ سے اپنی فوجیں واپس بلالے ورنہ نتیجہ بہت برا ہوگا! پھر خبر فوراً چھپوانے پر اس طرح اصرار کریں گے گویا انہیں یقین ہو کہ خبر چھپتے ہی امریکہ پر لرزہ طاری ہوجائے گا اور کلنٹن صاحب ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگتے ہوئے کہیں گے کہ حضور مائی باپ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے پتہ نہیں تھا چتلی قبر میں اتنے حساس لوگ رہتے ہیں!

مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور میں بھول گیا کہ کوئی اس طرح کا فون آیا تھا۔ چند ماہ بعد پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہی یاسین بول رہا ہوں، ملاقات کب ہوگی؟

میں نے پوچھا آپ کیا کرتے ہیں۔ بولے۔ ''کچھ نہیں۔ بس نوئیڈا میں ایک کباڑ خانہ ہے گا۔ بہرحال اس وقت وہیں سے بول رہا ہوں۔ مگر رہائش پرانی دہلی کے گلی ریشم والی میں ہے۔ بہرحال۔ آپ کہاں رہتے ہیں؟''

میں نے بتادیا۔ فی الحال اور بہرحال میں کھچڑی پور میں رہتا ہوں۔ کہنے لگے۔ اللہ رحم کرے! اس کے بعد پھر وہی ملاقات کی خواہش کی گئی۔ بولے بہرحال کبھی موقع ملے تو گھر پر یا نوئیڈا میں فون کرکے وقت اور جگہ بتادیں حاضر ہوجاؤں گا۔ میں نے کہا فون نمبر لکھوادیجیے۔ انھوں نے لکھوادیے، میں نے یوں ہی پوچھ لیا کوئی اور نمبر۔ انھوں نے دو اور لکھوادیے۔ میں نے کہا بس!؟

بولے دو اور لکھ لیجیے۔ آخر بہت سے نمبر لکھوا کر بولے۔ فی الحال اتنے ہی یاد ہیں!

میں سوچ میں پڑ گیا عجب کباڑی ہے۔ اتنے سارے فون لگا رکھے ہیں! کہیں حضرت، ایم ٹی این ایل کا کباڑ تو نہیں خریدتے؟

بہر کیف۔ آمنے سامنے ہم پھر بھی نہیں ہوئے۔ میرے ذہن میں ان کی یہ تصویر رہی کہ منھ تمباکو والے پان سے بھرا ہوگا۔ توند آگے کو نکلی ہوگی، اور ریشم کے کرتے پاجامے میں خوب لہراتے ہوئے چلتے ہوں گے! چنانچہ جب ایک شادی کی تقریب میں ان سے پہلی آمنے سامنے کی ملاقات ہوئی تو میں دن کے اجالے میں بھی انہیں پہچان نہیں سکا!

یوں ہی کھڑے کھڑے میں نے سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی شامیانے کی بلی کا سہارا لینے کے لیے اس پر ہاتھ رکھا تو اس میں سے آواز آئی، میاں مجھے یاسین کہتے ہیں۔ میں چونک گیا۔ وہی ٹیلی فون والی آواز تھی اور جسے میں شامیانے کی بلی سمجھ رہا تھا وہ سفید کرتے پاجامے میں لپٹے ہوئے نہایت دبلے پتلے دراز قد یاسین میاں تھے! نفیس سا گندمی چہرہ، لمبی سی ناک، عینک سے جھانکتی ہوئی شرمیلی آنکھیں اور عاجزی وانکساری سے جھکا ہوا سر!

خادم کو زندگی میں کئی اچھے اور کئی بہت اچھے لوگوں سے ملنے کا شرف حاصل ہے۔ مگر جو عاجزی اور انکساری بھائی یاسین میں پائی وہ کہیں نہ دیکھی۔ اور عاجزی بھی وہ جس میں نہ کوئی غرض ہے نہ مطلب! بلکہ ایک عادت ہے جو ان کی شخصیت کا حصہ بن کر رہ گئی ہے۔

اس کے بعد اس سے اب تک میری مشکل سے تین چار بالمشافہ اور سات آٹھ ٹیلی فونی ملاقاتیں ہوئی ہیں جن کے دوران بہت کرید بین کرنے پر انھوں نے اپنے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات بمشکل فراہم کی!

ایک تو یہ کہ جسے انھوں نے کباڑ خانہ کہا تھا، وہ دراصل کارخانہ تھا۔ پیتل اور اسٹیل کے قیمتی فن پارے بنانے کا کارخانہ۔ اور یہ ایک نہیں۔ کئی اور کارخانے ہیں، جن میں پیتل نہیں بلکہ سونے چاندی کے خوبصورت برتن اور دوسری آرائشی اشیاء بنا کر یوروپ امریکہ اور خلیج میں اس لیے برآمد کی جاتی ہیں کہ ملک میں ان کے خریدار نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ پورے ملک میں جو تین چار گھرانے سونے چاندی کے غیر زیوراتی فن پارے خود بنا کر ایکسپورٹ کرتے ہیں ان میں مسلمانوں کی نمایندگی اکیلے یاسین میاں کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی کہ ملک کے دو صدر جمہوریہ انھیں بہترین کاریگری کے قومی ایوارڈ دے چکے ہیں۔

ان کے فن کا ایک نمونہ، جسے دنیا بھر کے لوگوں نے ٹی وی اور اخبارات میں دیکھا، 1987 کا

ریلائنس کرکٹ ورلڈ کپ تھا۔ جس کا ذکر ایک مرتبہ دوران گفتگو انھوں نے اس طرح ڈرتے ڈرتے، بہت جھجکا کر کیا، جیسے میں سنتے ہی سخت ناراض ہو کر اٹھ کھڑا ہوں گا اور ڈانٹتے ہوئے کہہ بیٹھوں گا کہ اچھا، تو وہ کم بخت ریلائنس کپ آپ نے بنایا تھا جسے بد بخت آسٹریلیا والے لے اڑے تھے! اچلیے تھانے چلیے!

بھائی یاسین کو گھر اور کارخانہ کے سب چھوٹے بڑے، بھائی جی کہتے ہیں بیٹے بیٹیاں، پوتے، نواسے، سب کے لیے وہ بھائی جی ہیں۔ بس ایک بھابھی صاحبہ کو چھوڑ کر! اور وہ بھی، جب گھر میں دن رات بھائی جی بھائی جی کی پکار لگی ہو تو مجھے ڈر ہے کہیں بھول چوک نہ کر جاتی ہوں!

مجھ سے بھائی جی عمر میں کافی بڑے ہیں، مگر قد کاٹھی ماشاء اللہ ایسی ہے کہ ان کے آگے میں عمر رسیدہ بزرگ معلوم ہوتا ہوں۔ ان کے سر کے بال ابھی تک قدرتی کالے ہیں۔ اور بس یہی ایک سیاہی ان کی پوری شخصیت میں ہے، باقی جو بھی ہے وہ اجلا اور بے داغ ہے۔ دراز قد وہ اتنے ہیں کہ دوسروں کو خوب سر اٹھا کر بات کرنی پڑتی ہے۔ اور خود وہ سر کو پورا جھکائے رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے کہا۔ اس قدر عاجزی بھی کس کام کی! کہنے لگے، بھائی، عاجزی نہیں، حفظ ماتقدم ہے۔ سر اس لیے جھکائے رکھتا ہوں کہ کہیں ٹکرا نہ جائے!

مگر بھائی جی، سر نہیں نظریں بھی جھکائے رکھتے ہیں۔ آنکھ ملا کر عموماً بات نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی تہذیب ہے جو آج کے بزرگوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ طبعاً بھائی جی اس قدر شرمیلے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کسی روز برقعہ پوش نہ ہو جائیں!

مگر حس مزاح غضب کی ہے مشتاق یوسفی کی تحریروں کے وہ بھی شیدائی ہیں میں بھی چنانچہ دوسروں کا کم، اپنا مذاق اڑا کر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ اپنے دبلاپے کو تو اکثر مذاق کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ رات کو فون آیا۔ کہنے لگے جنگل سے بول رہا ہوں۔ میں نے پوچھا کون سا جنگل۔ بولے، رام نگر کے قریب جو مراد آباد سے آگے ہے۔ میں نے کہا وہاں تو جم کاربٹ نیشنل پارک ہے۔ فرمایا۔ ٹھیک سمجھے۔ مجھے کچھ خوف سا ہوا۔ پوچھا۔ وہاں جنگل میں اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ ارشاد ہوا۔ "بس یہاں بھی ایک جھونپڑی ڈال رکھی ہے۔ بہر حال آپ کی یاد آئی سوچا بات ہی کر لوں" میں سمجھ گیا۔ جھونپڑی میں ٹیلی فون تھا تو کباڑ خانہ کی طرح وہ بھی کسی ریسٹ ہاؤس سے کہاں کم ہو گی۔ میں نے کہا، رات میں وہاں شیر چیتے اور لکڑ بھگے گھوم رہے ہوں گے۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا۔

کہنے لگے۔ میاں شیر چیتے گوشت خور جانور ہیں۔ اور یہاں بدن میں سوائے ہڈیوں کے کچھ نہیں گھاس کے تنکے جیسا تن۔ خلال کے کام تو آ سکتا ہے بھوک نہیں مٹا سکتا البتہ کوئی شیر چیتا کھانے کے ساتھ سلاد کا شوق رکھتا ہو تو بات دوسری ہے بہر حال آپ سنایئے کیسے مزاج ہیں؟

قدرت نے انھیں تخلیق کرتے وقت جس کسر نفسی سے کام لیا تھا یہ اس کا قصیدہ تھا یا ہجو ملیح، میں سمجھ نہیں پایا۔ اکثر اس بات کا شکر ادا کرتے ہیں کہ قدرت نے اتنا تن و توش عطا کر دیا ہے کہ دن میں سڑک پر آتے جاتے وقت لوگوں کو نظر آ سکوں!

لیکن جس خوبی کے لیے میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں، اور بڑی حد تک مرعوب بھی رہتا ہوں وہ ہے، زندگی کی گہری سمجھ! مشکل سے مشکل مسئلوں کا کئی بار وہ اتنا آسان حل سامنے رکھ دیتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جائے۔

ایک مرتبہ کوئی صاحب اپنے کاروباری نقصان کا رونا رو رہے تھے۔ بھائی جی نے نقصان کا سبب پوچھا ان صاحب نے کہا بڑی محنت سے مال بنا کر دیتا ہوں مگر ڈلیوری کے بعد ہر دفعہ ایک تہائی رجیکٹ ہو جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

بھائی جی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ڈلیوری سے پہلے خود ہی خراب مال رجیکٹ کر دیا کیجیے۔ اگلی ڈلیوری سے نقصان بند ہو جائے گا!

ایک دفعہ میں صبح کو دیر سے جاگنے کی اپنی عادت کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ بہت کوشش کرتا ہوں جلد اٹھنے کی، مگر اٹھا ہی نہیں جاتا۔

حسب عادت شرما کر سر جھکا لیا، چند لمحے سوچا، پھر بڑی نرمی سے بولے۔

"میاں جتنی کوشش جلدی جاگنے کے لیے کرتے ہیں۔ اتنی جلد سونے کے لیے کر لیا کیجیے! انشاء اللہ پریشانی دور ہو جائے گی۔"

میں حیرت سے ان کا منھ تکنے لگا۔ اتنے سامنے کی بات تھی اور مجھے آج تک نہیں سوجھی!

چند روز بعد میں نے انھیں بتایا۔ "جلد سونے کی کوشش تو بھائی جی بہت کی، مگر اس میں بھی دقت پیش آ رہی ہے۔ کمرے کی تمام بتیاں بجھا کر لیٹ جاتا ہوں۔ پھر بھی گھنٹوں نیند نہیں آتی۔"

کہنے لگے۔ "کمرے کی بتیاں تو بجھ جاتی ہیں۔ مگر دماغ کی بتی جلی رہ جاتی ہو گی۔ پہلے اسے بجھایئے حضرت!

اب آپ ہی بتایئے۔ ایسی باتیں کرنے والے آدمی سے کوئی مرعوب نہ ہو تو کیا!؟

☆☆☆

انوار رضوی
28C/A-10 کالکاجی
نئی دہلی ۱۹

غالب کا ایک شعر

مرزا غالب کا ایک شعر متداول دیوان غالب کے معاصر ایڈیشنوں میں درج ذیل ہیئت میں ملتا ہے۔

بیضہ آسا، تنگ بال و پر یہ ہے کنج قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

دیوان غالب: مرتبہ: مالک رام
ناشر: صد سالہ یادگار غالب کمیٹی ۱۹۶۹ء
ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۷۹ء
دیوان غالب: ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۹۷
دیوان غالب: ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۸۶ء

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے دیوان غالب ۱۹۸۶ء اڈیشن پر مالک رام کا نام ہٹا دیا ہے اور ان کا تعارف بھی۔ اس میں تعارف محمد شفیع قریشی کا ہے جس میں صراحت کی گئی ہے کہ پچھلے اڈیشن کی تصحیح نسخہ عرشی کی مدد سے کی گئی ہے اور کتابت کی غلطیاں نکال دی گئی ہیں۔ مگر زیر بحث شعر جوں کا توں ہے۔

دیوان غالب مرتبہ مالک رام (۱۹۷۹ء) کے کور پر مندرجہ ذیل عبارت جلی حروف میں دی گئی ہے۔

''دیوان غالب کا یہ نسخہ مطبع نظامی کانپور کے نسخے پر مبنی ہے جو ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ غالب کا سب سے آخری صحیح کردہ متن ہے اور اس میں کلام بھی

سب سے زیادہ ہے۔"

جس نسخہ پر مالک رام نے دارومدار کیا تھا وہ غالب کی حیات میں چھپنے والا دیوان غالب کا چوتھا ایڈیشن تھا۔ کالی داس گپتا رضا نے ۱۹۸۷ء میں ول پبلی کیشنز، ممبئی سے اس کا عکسی ایڈیشن اپنے پیش لفظ کے ساتھ چھاپ دیا ہے۔ اس میں زیر بحث شعر کی قرات حسب ذیل طریقہ پر ہے۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہوا گر رہا ہو جائیے

دیوان غالب چوتھا ایڈیشن
مطبع نظامی کانپور۔ جون رجولائی ۱۸۶۲ (عکسی)
پیش لفظ۔ کالی داس گپتا رضا

مالک رام نے اپنے تدوین کردہ دیوان غالب ۱۹۶۹، ۱۹۷۹ میں تعارف یا حاشیہ پر کہیں صراحت نہیں کی کہ مطبع نظامی کانپور (۱۸۶۲) کے نسخہ کو بنیاد بنانے کے باوجود انھوں نے اس شعر کی قرات کس وجہ سے تبدیل کی۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے اس شعر کی حد تک نسخہ شیرانی پر تکیہ کیا ہوگا جہاں یہ شعر مندرجہ ذیل طریقہ پر کتابت ہوا ہے:

بیضہ آسا تنگ بال و پر پہ ہے کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

دیوان غالب۔ نسخہ شیرانی
ناشر۔ مجلس ترقی ادب لاہور

نسخہ شیرانی میں کاف عربی و فارسی کا خلط ہے اور اغلباً چوتھے ایڈیشن سے پہلے بھی اس شعر کی قرات وہی تھی جو معاصر ایڈیشنوں میں پائی جاتی ہے مگر مطبع نظامی کانپور چوتھا ایڈیشن (۱۸۶۲) میں صفحہ آخر پر شائع شدہ خاتمۃ الطبع میں واضح ہے کہ مصنف مرزا غالب نے بذات خود اس ایڈیشن کے لیے مسودہ تیار کیا تھا۔ یعنی تیسرے ایڈیشن کے ایک نسخہ پر تصحیح کی تھی۔ بقول غالب ۔۔۔"دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے" (خط بنام محمد حسین خاں۔ عکس در بیاض

غالب تحقیقی جائزہ۔ کمال احمد صدیقی)

حیرت اس بات پر ہے کہ مالک رام نے اس تصحیح کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور مذکورہ شعر میں تبدیلی کو کتابت کی غلطی پر محمول کر کے پرانی قرات کو بحال کر دیا۔ دیکھا جائے تو اس میں مالک رام کا بھی زیادہ قصور نہیں ہے کیونکہ چوتھے ایڈیشن میں مذکورہ شعر جس طرح چھپا ہے اس میں مصرع ثانی میں 'زندگی ہوکر' خلاف محاورہ اردو وفارسی ہے اور مصرع اولیٰ الاّ ماشااللہ کوئی معنی ہی نہیں دے رہا ہے۔ انھوں نے عاجز آکر نسخہ شیرانی کی پشت پناہی میں پرانی قرات کو بحال کر دیا۔

نسخہ حمید یہ میں زیر بحث شعر مندرجہ ذیل طریقہ پر شائع ہوا ہے۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہوگر رہا ہو جائیے

دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمید یہ
مرتبہ: مفتی محمد انوار الحق
طبع دوم عکسی ۱۹۸۲ء
مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

نسخہ حمد یہ میں اس شعر کی بدلی ہوئی ہئیت دیکھ کر مطبع نظامی کانپور (۱۸۶۲) میں شائع شدہ قرات پر اعتبار آنے لگتا ہے اور کتابت کی وہ غلطی بھی گرفت میں آجاتی ہے جس نے اس قرات کو نامعتبر بنایا تھا۔ نسخہ حمید یہ میں مصرع اولیٰ میں واضح طور پر 'ننگِ' لکھا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ مرزا غالب نے جہاں دورات دن کی محنت میں تیسرے ایڈیشن کے نسخے پر چوتھے ایڈیشن کے لیے تصحیح کی تھی وہاں اس شعر پر نظر ثانی کر ڈالی۔ کاتب نے اس شعر کی تمام کتابت مصنف کے منشا کے مطابق کی مگر تنگ کو جو ننگ بنایا گیا تھا، وہ نہیں بنایا اور شعر بالآخر بے معنی ہو کر پہلی قرات کو رجوع کر گیا۔

نسخہ حمید یہ کا اصل نسخہ گم ہو چکا ہے۔ ۱۹۲۱ میں طبع اول کے وقت اس کی کتابت کرائی گئی تھی۔ اس میں 'ننگ' کو باقاعدہ کسرۂ اضافت کے ساتھ کتابت کرایا گیا تاکہ وہ ہرگز 'تنگ' نہ پڑھا جائے مگر مفتی محمد انوار الحق نے مصرع ثانی میں

غالب کی اردو صحیح کردی اور 'گر' کو 'کر' بنا دیا حالانکہ نسخہ نظامی پریس کانپور میں کاف عربی وفارسی کا خلط نہیں تھا اور 'کر' تھا۔ دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ طبع دوم عکسی ۱۹۸۲ء طبع اول ۱۹۲۱ء کا چربہ ہے اس لیے اس کو طبع اول ہی شمار کیا جاسکتا ہے۔

متذکرہ بالا معروضات کے پیش نظر زیر بحث شعر کی قرات حسب ذیل قرار پاتی ہے۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس (نسخہ حمیدیہ ۱۹۲۱)
ازسر نو زندگی ہو کر رہا ہو جایئے (چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۲)

قیاس غالب ہے کہ زیر بحث شعر جس طرح دیوان غالب کے معاصر اڈیشنوں یا نسخہ شیرانی میں ہے اولاً اسی طرح کہا گیا ہوگا اس میں لفظ تنگ کے معنی کسا ہوا اور پریشان بال و پر کی مناسبت سے دونوں ہی کام کر رہے ہیں مگر بال و پر کی جگہ پر اگر پرندر کھا جائے تو معنی میں بے لطفی پیدا ہوتی ہے کیونکہ پرند قفس میں تنگ ہے اور پرند پر قفس تنگ ہے دونوں فقرے الگ معنی رکھتے ہیں اس لیے مرزا موصوف کی نازک مزاجی نے مصرع اولی میں تنگ کا لفظ ننگ سے بدلا اور مصرع ثانی میں گر کو کر بنا دیا۔ اس میں قباحت ایک ہی تھی کہ زندگی ہونا یا زندگی شدن اردو یا فارسی کا محاورہ نہیں تھا نہ سہی غالب، ذوق یا ناسخ تو نہیں تھے کہ اردو زبان کو مکمل جانتے ہوں۔ ایک نیا محاورہ جو سراسر شاعرانہ اور استعاراتی ہے بنا دیا۔

نسخہ حمیدیہ دیکھیے تو ایک نہیں پچاسوں اشعار ہیں جن کو غالب نے اصلاح کر کے بدلا ہے مگر ہر بار شعر کا مرتبہ بڑھایا ہے۔ زیر بحث شعر کو بھی نئے روپ میں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔

پروفیسر شمشاد حسین
چیرمین۔ یونیورسٹی سروس کمیشن،

غزل

ان کو کہاں ہے فکر کسی بھی عذاب کی
کیوں بات کر رہے ہو گناہ وثواب کی
دنیا بنائی اس نے کچھ اپنے حساب کی
تصویر کھینچ ڈالی حقیقت کی خواب کی
خود بے نقاب ہو کے جو بیٹھے ہیں راہ پر
باتیں وہ کر رہے ہیں کسی کے حجاب کی
تنقید کرتے کرتے وہ نقاد بن گئے
اب آگئی ہے باری خود ان کے حساب کی
جاتی ہوئی بہار کے منظر کو دیکھ کر
ان کو پڑی ہے فکر اب اپنے شباب کی
واقف تو ہم بھی ان کی طبیعت سے ہیں جناب
پھر بھی ہمیں امید ہے ان سے جواب کی
محرومیوں کو لے کے وہ محفل میں آگئے
نکلی ہے بات پھر وہی خانہ خراب کی
آسودگی مزے سے سلاتی ہے رات بھر
محرومیاں قبائیں بناتی ہیں خواب کی
جو لوگ خود فریبی میں رہتے ہیں مبتلا
ان کی نظر میں قدر کہاں آفتاب کی
شمشاد کو حقیقتِ کردار کا ہے علم
حاجت اسے کہاں ہے کسی بھی نصاب کی

پروفیسر فضل امام
10-A/1 بنک روڈ۔ الہ آباد

دو نظمیں

(۱)

ہم نے لیبارٹری میں
خوب تجزیہ کر کے دیکھا،
خوردبین سے بار بار دیکھا
تو یہی حاصلِ تجزیہ ٹھہرا،
کہ مینڈک اور آدمی میں کوئی بھی فرق نہیں
ساخت میں، تعمیر و تشکیل میں .
اندازِ حیات و فکر میں
زندہ رہنے کی تمناؤں میں، آرزوؤں میں، خواہشوں میں
سوائے اس کے کہ
مینڈک تفریحِ طبع کے لیے، آدمی پر پتھر نہیں پھینکتا
آدمی پر کنکر نہیں مارتا

(۲)

میں ہر بار اپنے وجود کا منکر ہوتا ہوں
لوگ سمجھتے ہیں،
میں قید ہوتا جا رہا ہوں،
مجھے محسوس ہوتا ہے،
میں آزاد ہوتا جا رہا ہوں،

سعیدہ گزدر
قلم ڈی آرٹ۔ کراچی ۷۵۴۰۰

ایٹم بم

امرتا نے کہا تھا مجھ سے
اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا
کٹھن دن ہیں جاناں

ہر سمت ہے اندھیرا
ایٹم بموں کی پوجا
قوموں کا ہے وتیرہ
اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا!

یہ بم کہاں گرے گا؟
یہ وسوسہ ہے دل کو
یہ بم جہاں گرے گا
انسان بھسم ہوگا
رنگ و نسل نہ مذہب
پہچان بن سکے گی
بے جاں نہ جانداروں میں
تفریق ہو سکے گی
اک راکھ کا سمندر
بن جائے گا مقدر
اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا

خودسوزی، خودفریبی
کا جشن ہم منائیں؟
کیوں نفرتوں کی فصلیں
دھرتی پہ اب اگائیں
امن و اماں کی کلیاں
کب آگ میں کھلی ہیں!
بھوک اور پیاس و غربت
صرف جنگ میں پلیں ہیں
ہے وقت اب بھی باقی
کچھ اور کھو نہ دینا
کٹھن دن ہیں جاناں
اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا

اقتدار امام
کوتوالی روڈ، گھنٹہ گھر۔ بدایونی

غزل

ماتھے پہ اس کے باپ کے تحریر جو بھی ہو
کاسہ لیے پھر سے ہے وہ تقدیر جو بھی ہو

زندہ ہیں آگ خون دھماکوں کے درمیاں
اس طرح ملک وقوم کی تصویر جو بھی ہو

دشمن پہ جیت درج کراتا ہے اور بات
یہ اور بات ہاتھ میں شمشیر جو بھی ہو

میں خواب بیچتا ہوں مجھے اس سے کیا غرض
حصہ میں تیرے خواب کی تعبیر جو بھی ہو

فرصت کسے نصیب ہے اس دور میں امامؔ
بس کارِ خیر کے لیے تاخیر جو بھی ہو

اختر شاہ جہاں پوری
رنگین چوپال
شاہجہاں پور ۲۴۲۰۰۱

غزل

دم بہ دم فکر پا سبانی کی
کوئی حد بھی ہے بے اَمانی کی

شام ہی سے دیے بجھا ڈالے
اے ہوا تو نے مہربانی کی

اس کی محفل میں ایک میرے سوا
اور سب نے قصیدہ خوانی کی

شہ پروں پر لکھی ہوئی دیکھو
داستاں جورِ آسمانی کی

اپنے سائے کو ہمسفر جانا
انتہا ہے یہ خوش گمانی کی

اک تجھے میہمان کرنے کو
میں نے کس کس کی میز بانی کی

اس کی یادوں کی تتلیاں اختر
اب تو حصہ ہوئیں کہانی کی

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی
اردو محلہ۔ اٹاوہ

غزل

آدمی ، رہگذر میں ہے جب تک
زندگی کے سفر میں ہے جب تک

منزل عہد نو ملے کیسے
تو پرانی ڈگر میں ہے جب تک

حادثے رہگذر پہ بیٹھے ہیں
ہر مسافر سفر میں ہے جب تک

تھر تھراتے رہیں گے دروازے
زلزلہ بام ودر میں ہے جب تک

راہبر ، لائق ِ مذمت ہے
راہزن کے اثر میں ہے جب تک

ہر نظر روشنی کو ترسے گی
گھپ اندھیرا نگر میں ہے جب تک

قیدیٔ خواہشات ہے انساں
قیدِ شام وسحر میں ہے جب تک

راز ، کیسے سکوں ملے تجھ کو
گردشوں کی نظر میں ہے جب تک

ر موہن کیف
۹۶/۱۔ سول لائن جھانسی

غزل

بیداریِ خیال کا جب ذکر چل گیا
اکثر میں اپنے قد سے بھی اونچا نکل گیا

سچ کا چراغ جب بھی جلایا ہے دوستو
ہر بار یوں ہوا کہ مرا ہاتھ جل گیا

اک سیلِ رنگ و بو ہے سڑک پر رواں دواں
میں دیکھ کر رُکا ہوں کہ منظر بدل گیا

شام سفر ہوئی تو مری آنکھ کھل گئی
میں کتنی دور خواب کے عالم میں چل گیا

شاید غم زمانہ ہماری نظر میں تھا
کچھ تم سنبھل گئے ہو تو کچھ میں سنبھل گیا

دل میں اک آرزو تھی چلو خاک ہو گئی
کانٹا سا ایک تھا رگِ جاں میں نکل گیا

محفل کی بات اور ہے محفل کے بعد کیف
ہر شخص اپنے ظرف کے سانچے میں ڈھل گیا

اشہر ندیمی
گورے گاؤں (ویسٹ) ممبئی

غزل

محلوں کے چراغوں سے بھی بہتر ہوں بھلا ہوں
ہے فیض مرا عام، میں رستے کا دیا ہوں

ہم دونوں میں سمجھوتہ ہو ممکن یہ نہیں ہے
تم ذہن کی آواز ہو، میں دل کی صدا ہوں

آغازِ تمنا سے مرادوں کی سحر تک
کانٹوں پہ چلا ہوں کبھی شعلوں میں جلا ہوں

یہ تم سے بچھڑ کر مجھے محسوس ہوا ہے
میں کانچ کے برتن کی طرح ٹوٹ گیا ہوں

ہے سوچ الگ میری خیال اس کا الگ ہے
دنیا ہے خفا مجھ سے میں دنیا سے خفا ہوں

میں غم کے سوا کچھ بھی نہ دے پاؤں گا تم کو
مت چھیڑو مجھے گیت میں اک درد بھرا ہوں

شارق عدیل
مارہرہ، ایٹہ

وَجاءالحق

جہالت کے اندھیروں سے بہت مانوس تھی دنیا
ستاروں کی، مہ و انجم کی، سورج کی
نمایش روز ہوتی تھی
مگر تاریک تھی دنیا
خدائے لم یزل کو رحم آیا ان اندھیروں پر
تو پھر اس نے
صفات بے مثالی سے مزین کر کے احمدؐ کو
اُتارا ظلمتوں کے اندھے غاروں میں
اچانک پھر
زمیں سے آسماں تک نور کے ہالے
کچھ اس انداز سے پھیلے
فلک کی ساری شمعیں ہو گئیں مدھم
مگر دنیا منور تھی
جہاں کا ذرہ ذرہ رحمۃ للعالمین کی آمد آمد پر
بہت مسرور و شاداں تھا
کہ جو گزرا ہوا کل تھا
وہی تاریکیوں کا آخری دن تھا

نسیم سامانی
خونی پور۔ گورکھپور

غزل

عرصۂ کارزار میں یہ بھی زیاں بہت ہوا
روحِ بلالؓ سو گئی شورِ اذاں بہت ہوا

منتظرِ نظر تھا میں غیر اچھالتے رہے
تیرا کرم بھی عمر بھر پیرِ مغاں بہت ہوا

مہر و مہہ و نجوم کو دے گیا آ کے روشنی
لالہ تھا دشت کا مگر شعلہ فشاں بہت ہوا

دام میں اب نہ آئیں گے اب نہ فریب کھائیں گے
تم سے مرا معاملہ سنگ دلاں بہت ہوا

حرؓ نے بلند کر دیا پرچم حق بہ نام حق
دہر میں یوں تو غوغۂ شیشہ گراں بہت ہوا

کالی گھٹا کے روبہ روبجت سیاہ دیکھ کر
گیسوئے یار کا نسیم مجھ کو گماں بہت ہوا

بدر نظیری
شمع جنرل اسٹور غفار منزل
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

غزل

زندگی کی کاوشوں کو معتبر کس نے کیا
ذرّے سب بے مایہ تھے شمس و قمر کس نے کیا

تم نے چاہا تھا رہیں گے مدتوں خوابوں میں گم
طولِ شب کو بے خودی سے مختصر کس نے کیا

تا حدِ افلاک پہنچا کوششوں کا سلسلہ
فکر کو آمدۂ بہر سفر کس نے کیا

کس نے بخشا تھا تمھیں پرواز کا اعلیٰ مقام
چار دن میں پھر تمھیں بے بال و پر کس نے کیا

پھول، پھل دے کر کیا آسودگی سے ہم کنار
پھر، بہار زندگی کو بے ثمر کس نے کیا

کچھ خبر بھی ہے تمھیں کیوں سرفرازی بخش کر
عالمِ ارواح سے یوں در بدر کس نے کیا

کس نے بھٹکا یا قبیلے کو نشانِ راہ سے
رات کی تاریکیوں کو بے سحر کس نے کیا

قطرہ قطرہ کس نے ترسا یا سحابِ فکر کو
تھی ہوا مرطوب لیکن بے اثر کس نے کیا

جبرئیلی دور سے اے بدر کر کے روشناس
تم کو اپنے آپ سے بھی بے خبر کس نے کیا

حکیم محمد یعقوب اسلم ایم اے
1/1k3 انا نگر، پیدور، وانم باڑی 635751

غزل

اپنی پہچان سے عاری رہیں چہرے کب تک
ذہن پر طاری ہوں احساس کے پہرے کب تک

میں خلاؤں میں اڑا جاتا ہوں تنکے کی طرح
ساتھ دیں گے مرا یہ خواب سنہرے کب تک

میرے احساس سے وابستہ ہے لمحہ لمحہ
میرا احساس کسی موڑ پہ ٹھہرے کب تک

تھام لو ہاتھ کسی کا تو کوئی بات بنے
چل سکو گے یوں ہی دنیا میں اکہرے کب تک

نہ کہیں بول بُرا، یہ تو ہے اپنے بس میں
بن کے رہ جائیں مگر دنیا میں بہرے کب تک

چاند مجبور سہی ساتھ نہیں دے سکتا
ساتھ دیں گے مرا یہ چاند سے چہرے کب تک

اپنی ہی دھن میں، میں بڑھ جاؤں گا آگے اسلم
گردشِ وقت کو ٹھہراتے ہو ٹھہرے کب تک

ڈاکٹر عابد معز
Medical Nutritionist
M.O.H.Saudia Arabia
P.O. Box 5253.
RIYADH-11422

ہندوستان میں
ذیابیطس کی وبا؟

ہمارے ملک ہندوستان میں دو تا ڈھائی کروڑ افراد مرض ذیابیطس کا شکار ہیں۔ اس مرض سے متاثر ہونے والوں میں مرد اور عورتیں حتیٰ کہ کم سن بچے تک شامل ہیں۔ ہندوستان اس لحاظ سے بھی دنیا کا منفرد ملک ہے کہ یہاں پر سب سے زیادہ ذیابیطس مریض پائے جاتے ہیں۔ ہر دن ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ادارۂ عالمی صحت کے اندازے کے مطابق آئندہ پچیس برسوں کے دوران ہندوستان میں ذیابیطس مریضوں کی تعداد میں دوگنا سے زیادہ اضافہ ہوگا۔ اس لحاظ سے ماہرین اس خدشہ کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہندوستان میں مرض ذیابیطس وبائی شکل اختیار کر جائے گا۔ اگر اس وبا کو روکا نہ گیا تو اکیسویں صدی کے دوران مرض ذیابیطس صحت عامہ کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ اس مضمون میں مرض ذیابیطس کو سمجھنے کے لیے مختصراً معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

ذیابیطس ایک قدیم مرض ہے۔ اس مرض کے وقوع ہونے کا ثبوت صدیوں پہلے مصر، یونان، روم اور ہندوستان میں ملتا ہے۔ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح ہندوستانی طریقہ طب ایورویدا میں اس مرض کو ''مدھومیھا'' یعنی شہدی پیشاب کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ایلوپیتھی طریقہ طب میں اس مرض کو ڈیابیٹس کہتے ہیں۔ ڈیابیٹس یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس مرض کا مکمل نام ڈیابیٹس ملائٹس (Diabetes Mellitus) ہے اور مخفف ڈی ایم (DM) استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو میں اسے ذیابیطس یا ذیابیطس شکری، فارسی میں دولابیہ اور عربی میں داءالسکری یا مرض السکر کہتے ہیں۔

ذیابیطس کیا ہے؟

انسانی جسم ایک مشین کی طرح ہے۔ اس مشین کو کام کرنے کے لیے ایندھن کی ضرورت پڑتی

ہے۔ جسم کا ایندھن گلوکوز (شکر انگوری) ہے جسے غذا سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جسمانی خلیئے گلوکوز کو جلا کر طاقت یا توانائی (Energy) پیدا کرتے ہیں۔ جسم کے مختلف خلیئوں کو گلوکوز کی فراہمی کے لیے ہر وقت خون میں گلوکوز موجود رہتی ہے۔ خون میں موجود گلوکوز کو خون گلوکوز (Blood Glucose) کہتے ہیں چونکہ گلوکوز ایک قسم کی شکر (Sugar) ہے، اسی لیے خون شکر (Blood Sugar)، خون گلوکوز کے ہم معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مختلف اوقات اور حالات میں خون گلوکوز رخون شکر کی عادی مقدار ایک حد کے اندر بڑھتی اور کم ہوتی رہتی ہے۔ جب خلیئے گلوکوز حاصل کر لیتے ہیں تو خون گلوکوز میں کمی ہوتی ہے جو غذا یا دوسرے اقدامات سے ملنے والی گلوکوز سے پوری کر دی جاتی ہے۔ غذا حاصل کرنے کے بعد خون میں گلوکوز کی مقدار بڑھنے لگتی ہے۔ خون گلوکوز میں اضافہ ہونے پر لبلبہ (Pancreas) نامی غدود حرکت میں آتا ہے اور انسولین (Insulin) ایک قسم کی رطوبت جو ہارمون (Hormone) کے زمرے میں آتی ہے) خارج کرتا ہے۔ انسولین خون گلوکوز کی بڑھتی ہوئی مقدار کو قابو میں لاتا ہے۔

مختلف وجوہات کے سبب لبلبہ انسولین نہیں بنا پاتا یا پھر انسولین کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں خون گلوکوز قابو میں نہیں رہتی۔ خون گلوکوز میں اضافہ ہوتا ہے۔ خون گلوکوز کی مستقل زیادتی مرض ذیابیطس شکری ہے۔ خون گلوکوز کی اعتدال سے تجاوز ہونے پر مختلف شکایات اور بے قاعدگیاں لاحق ہوتی ہیں۔ جس سے جسم کے اہم اعضاء جیسے دل، دماغ، گردے اور آنکھیں متاثر ہوتی ہیں۔

ذیابیطس کی اقسام

یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ذیابیطس ایک مرض نہیں بلکہ امراض کا مجموعہ ہے۔ ذیابیطس میں شامل امراض کی متفقہ خاصیت بیش خون گلوکوز یعنی خون میں گلوکوز کی زیادتی ہے۔ ادارۂ عالمی صحت کی ذیابیطس کی مجلس ماہرین نے ۱۹۸۰ء میں ذیابیطس کی چار زمروں میں درجہ بندی کی ہے۔ ان میں سے دو گروپ عام ہیں۔

پہلا گروپ ان مریضوں پر مشتمل ہے جن میں مرض ذیابیطس اوائل عمری میں شدت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ مرض پر قابو پانے کے لیے باہر سے انسولین کے انجکشن دینا ضروری ہوتا ہے۔ انسولین کے بغیر مریض کی زندگی کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اسی لیے اس قسم کی ذیابیطس کو انسولین اعتماء ذیابیطس (Insulin Dependent Diabetes Mellitus) مختصر IDDM) کہا

گیا ہے۔ ماضی میں اس قسم کی ذیابیطس کو ٹائپ ۱(Type I Diabetes) اور طفولی ذیابیطس (Juvenile Diabetes) کہا جاتا تھا۔ خوش بختی سے انسولین انحصار ذیابیطس بہت کم وقوع ہوتا ہے۔ جملہ ذیابیطسی مریضوں کا صرف ایک تا دس (مختلف مقامات پر) فیصد حصہ، انسولین انحصار ذیابیطس پر مشتمل ہے۔

دوسرا گروپ، غیر انسولین انحصار ذیابیطس (Non- Insulin Dependent Diabetes Mellitus) مخفف (NIDDM) بہت عام ہے۔

ذیابیطس کے جملہ مریضوں کا ۸۰ سے ۹۰ فیصد (مختلف مقامات پر) لوگ اس قسم کی ذیابیطس کا شکار ہوتے ہیں۔ عموماً یہ مرض ۳۵ سال کی عمر کے بعد آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے۔ اکثر مریضوں کا وزن بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ نارمل وزن کے حامل تو ند یعنی پیٹ کے اطراف جمع چربی رکھنے والے لوگ بھی اس قسم کی ذیابیطس سے متاثر ہوتے ہیں۔ غیر انسولین انحصار ذیابیطسی مریضوں کا علاج غذا، ورزش اور کھانے کی دواؤں (Oral Drugs) سے ممکن ہے۔ کئی سال کھانے کی دوائیں استعمال کرنے کے بعد اور بعض مخصوص صورتوں میں غیر انسولین انحصار ذیابیطسی مریضوں کو بھی انسولین کے انجکشن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس قسم کی ذیابیطس کو ماضی ٹائپ ۲(Type 2) یا بالغ ذیابیطس (Adult Onset Diabetes) کہا جاتا تھا۔

ذیابیطس کی شکایات اور علامات

جب جسمانی خلیئے گلوکوز کو طاقت کے لیے استعمال نہیں کر پاتے تو خون میں گلوکوز جمع ہونے لگتی ہے۔ خون میں ایک حد سے بڑھنے پر گلوکوز گردوں کے ذریعہ پیشاب میں خارج ہونے لگتی ہے۔ گلوکوز کے اخراج کے لیے پانی کی ضرورت پڑتی ہے لہٰذا جسم سے پانی کا بھی گلوکوز کے ساتھ اخراج عمل میں آتا ہے۔ مریضوں کو زیادہ اور بار بار پیشاب (Polyuria) آتا ہے۔ جسم سے پانی کے غیر معمولی اخراج کی پابجائی کے لیے پیاس بڑھتی ہے۔

جسمانی خلئیوں کو انسولین کی غیر موجودگی یا غیر کارکردگی کے سبب گلوکوز نہ ملنے سے مریضوں کو بھوک زیادہ لگتی ہے۔ اور جسمانی خلیئے توانائی پیدا کرنے کے لیے پروٹین اور چربی کو استعمال کرتے ہیں۔ جس سے وزن میں کمی اور کمزوری لاحق ہوتی ہے۔

جب خون گلوکوز میں شدید اضافہ ہوتا ہے تو مریض بے چین ہوتا ہے۔ اس پر سکتہ طاری ہوتا ہے اور آخر میں بے ہوشی یا کوما میں چلا جاتا ہے۔ اگر ذیابیطسی بے ہوشی (Diabetic Coma)

کی بروقت تشخیص اور اس کے علاج میں تیزی نہ کی گئی تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔

ذیابیطس کے ہر مریض کو ان شکایات سے واسطہ نہیں پڑتا۔ ذیابیطس کی شکایات اور علامات ظاہر ہونے اور ان کی شدت کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسولین کا اخراج اور اس کی کارکردگی کس حد تک اور کس رفتار سے متاثر ہوتی ہے۔ انسولین انحصار ذیابیطس میں انسولین کی کمی بہت جلد اور تیزی سے ہوتی ہے جس کے سبب شکایات شدید اور جلد پیدا ہوتے ہیں۔ اس تیزی اور شدت کے برخلاف غیر انسولین انحصار ذیابیطس میں انسولین کی کارکردگی آہستہ آہستہ متاثر ہوتی ہے۔ شکایات شدید نوعیت کی نہیں ہوتیں بلکہ اکثر غیر انسولین انحصار ذیابیطسی مریضوں کو کوئی شکایت ہی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر بعض ماہرین بڑی عمر میں ہونے والے ذیابیطس کو "چھپا مرض" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں ایسے لوگوں میں ذیابیطس کی تشخیص کسی دوسرے مقصد کے لیے کیے گئے خون کے معائنہ کے دوران اتفاقیہ ہو جاتی ہے۔ بعض مریض ایسے بھی ہوتے ہیں جو بغیر کوئی شکایت یا تکلیف مرض کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزار بھی لیتے ہیں اور ذیابیطس کی پیچیدگیوں کے ساتھ ڈاکٹر سے رجوع ہوتے ہیں۔

ذیابیطس کی تشخیص

مرض ذیابیطس کی تشخیص کے لیے پیشاب اور خون کا معائنہ کیا جاتا ہے قارورہ میں گلوکوز کی موجودگی مرض ذیابیطس کی نشاندہی کرتی ہے لیکن ہر وقت ضروری نہیں کہ پیشاب میں موجود شکر یا گلوکوز کی وجہ ذیابیطس ہی ہو۔ اطمینان بخش اور حتمی تشخیص کے لیے خون میں گلوکوز کی مقدار کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

کچھ سطروں پہلے بتلایا گیا کہ بیشتر ذیابیطسی مریضوں میں شکایتیں اور علامتیں نہیں ہوتی ہیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو ان کی نوعیت معمولی ہوتی ہے۔ ان معمولی شکایتوں کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بغیر تشخیص ہوئے مریض ذیابیطس کے ساتھ ایک عرصہ گذار دیتا ہے جس سے مرض کہنہ اور پیچیدہ ہو سکتا ہے۔ مرض ذیابیطس کی جلد اور بروقت تشخیص کے لیے حسب ذیل امکانی افراد کے خون کا معائنہ کیا جانا چاہیے۔

۱۔ ذیابیطسی شکایات (جیسے بار بار پیشاب آنا، پیاس کی شدت، وزن میں کمی، بھوک، جلد اور بینائی کے مسائل) محسوس کرنا۔

۲۔ ذیابیطس سے متاثرہ خاندان سے تعلق رکھنا۔

۳۔طبعی یا نارمل سے زیادہ جسمانی وزن رکھنا۔
۴۔بغیر کسی وجہ، کمزوری محسوس کرنا۔
۵۔حاملہ خواتین میں زائد وزن والے بچے پیدا ہونا۔

ذیابیطس کی وجوہات

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ذیابیطس نزلہ، زکام کی طرح متعدی مرض نہیں ہے۔ یہ مرض نہ کسی کے ذریعہ پھیل سکتا ہے۔اور نہ ہی ہم کسی کے پاس سے اس روگ کو لے سکتے ہیں۔

مرض ذیابیطس کا اصل سبب انسولین کی کمی یا انسولین کی کارکردگی کا متاثر ہونا ہے۔انسولین کو متاثر کرنے والے عوامل کے بارے میں یقینی اور مکمل معلومات تادم تحریر حاصل نہیں ہیں۔ موجودہ جانکاری کی بنیاد پر انسولین کو متاثر کرنے والے عوامل موروثی (Hereditary) اور ماحولیاتی (Enviromental) ہیں۔

ذیابیطس موروثی مرض نہیں ہے لیکن ذیابیطس سے متاثر ہونے کی حسیت susceptibility to Diabetes) موروثی ہوتی ہے۔ایک نسل سے دوسری نسل میں "ذیابیطسی حسیت" منتقل ہوتی ہے۔

ماحولیاتی عوامل کئی ہیں۔ موٹاپا (Obesity)، غذائی عناصر (شکر اور چربی کا زیادہ استعمال، ریشہ Fiber کی کمی)، غیر حرکیاتی زندگی (Sedentary Life) جسمانی چربی کی تقسیم، وائرسی سرایت یا چھوت (Viral Infection) اور ماحولیاتی عنصر (Immunological Factor) ذیابیطس کے اہم ماحولیاتی عوامل ہیں۔

آسانی سے سمجھنے کی خاطر کہا جا سکتا ہے کہ ذیابیطسی حسیت کے حامل اشخاص پر ماحولیاتی عوامل کے اثر انداز ہونے سے مرض ذیابیطس وقوع ہوتا ہے۔

ذیابیطس کا علاج

فی الحال ماہرین کے پاس مرض ذیابیطس کا علاج موجود نہیں ہے۔ علاج ان معنوں میں کہ مریض نے دوائیں استعمال کی اور مرض سے چھٹکارا مل گیا جیسا کہ ملیریا یا ٹائفائیڈ میں ہوتا ہے مکمل یا حتمی علاج نہ ہونے کے باوجود ذیابیطس لاعلاج مرض نہیں ہے ذیابیطس کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے اور ذیابیطسی مریض نارمل زندگی گذار سکتا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ دور حاضر میں ذیابیطس کا علاج مرض کو قابو میں رکھنے کی صورت میں ہے۔ ذیابیطس کو قابو میں رکھنے کے لیے غذا میں پرہیز اور احتیاط، دوائیں اور انسولین اور جسمانی سرگرمی

(Physical Activity) اور ورزش اہم رول ادا کرتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مرض ذیابیطس ایک منظم زندگی کا متقاضی ہوتا ہے۔ جس میں روز مرہ کے حرکات (Activities) اور غذا و دواؤں کے درمیان توازن قائم ہو سکے۔

علاج مرض کی سنگینی پر منحصر ہوتا ہے۔ اکثر مریضوں میں صرف غذائی احتیاط، وزن میں کمی اور ورزش کے ذریعہ مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس طریقے کے ناکام ہونے پر کھانے کی دوائیں استعمال کی جاتی ہیں، انسولین کے انجکشن دیے جاتے ہیں یا دونوں کو ایک ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ انسولین اعتماد ذیابیطسی مریضوں اور حاملہ ذیابیطسی خواتین کا علاج انسولین سے ہی کیا جاتا ہے۔ دواؤں اور انسولین کے استعمال کے باوجود غذا میں احتیاط لازمی ہے۔

خون کے معائنے سے پتہ چلتا ہے کہ ذیابیطس قابو میں ہے یا یہ مرض بے قابو ہو رہا ہے وقفہ وقفہ سے مستقل خون گلوکوز رشکر معلوم کرنا بھی علاج کا حصہ ہے۔ خون گلوکوز کے علاوہ چند دوسرے معائنوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

علاج کی کامیابی کا دارومدار مریض پر ہے کہ وہ اپنی حالت بہتر بنانے کے لیے کس حد تک دلچسپی لیتا ہے اور اپنی سوچ اور رہن سہن میں کتنی تبدیلی لاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے مرض ذیابیطس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ معالج کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مریض کو مرض کے تعلق سے جانکاری فراہم کرے۔ مریض کو علم ہونا چاہیے کہ مرض ذیابیطس کیا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے۔ اس میں کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اس مرض کے تقاضے کیا ہیں۔ اس مرض میں کیا احتیاط کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ ذیابیطس کے بارے میں معلومات اور ماہرین کے مشوروں کی روشنی میں کی گئی تبدیلیوں پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے لیے مضبوط قوت ارادی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

ذیابیطس سے پیچیدگیاں

بعض مریض ذیابیطس کو صرف خون میں گلوکوز کی زیادتی جان کر اس مرض سے بے تو جہی برتنے لگتے ہیں لیکن حقیقتاً مرض ذیابیطس ایک خطرناک مرض ہے جو جسم کے مختلف اعضاء کو متاثر کرتا ہے۔

جسم کو انسولین نہ ملنے سے خون گلوکوز میں بے تحاشہ اضافہ ہوتا ہے جسم سے پانی خارج ہوتا ہے۔ مریض کو قے ہوتی ہیں۔ پیٹ میں درد رہتا ہے۔ خون میں کیٹونز نامی مادے (Ketone Bodies) بڑھتے ہیں اور پھر یہ مادے پیشاب میں بھی آنے لگتے ہیں۔ ان مادوں کی وجہ سے مریض کی سانس سے اور مریض کے پیشاب سے میووں جیسی بو آنے لگتی ہے۔ مریض کے پاس سے

پھلوں یا میووں جیسی بو آنا خطرناک پیچیدگیوں کا پیش خیمہ ہے۔ کیٹونز مادوں کی وجہ خون ترش (Acidic) ہونے لگتا ہے۔ اس صورت حال کو ذیابیطسی ترشاؤ (Diabetic Ketoacidosis) کہتے ہیں اس مرحلہ پر بھی اگر جسم کو انسولین نہ ملا تو خون کے ترشاؤ میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور مریض کوما (Coma) میں چلا جاتا ہے اور آخر مریض کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

خون میں گلوکوز کی بڑھی ہوئی مقدار سے مختلف پیچیدگیاں لاحق ہوتی ہیں۔ ذیابیطسی مریضوں کو دوسروں کی بہ نسبت جلدی مسائل زیادہ پریشان کرتے ہیں۔ انھیں پھوڑے، پھنسیاں اور دنبل زیادہ ہوتے ہیں۔ زخم مندمل ہونے میں وقت لگتا ہے ذیابیطسی مریضوں کی آنکھیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ انھیں دھندلا نظر آتا ہے۔ چشمہ کا نمبر بار بار تبدیل ہونے لگتا ہے۔ گوہانجی (Stye) بھی ہوتی ہے۔

ذیابیطسی مریضوں کی شریانوں میں چکنائی جمع ہونے لگتی ہے جس سے دوران خون میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کئی اعضاء متاثر ہوتے ہیں اور مختلف بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ گردوں کا فعل متاثر ہوتا ہے۔ قلب پر حملہ اور فالج کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ بینائی کے ضائع ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ اعصابی نظام متاثر ہونے سے مختلف شکایات جیسے پیروں ہاتھوں میں بے حسی، چیونٹیاں بھرنے کا احساس، جلن وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ ذیابیطسی مریضوں کی جنسی کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہے۔

ذیابیطس سے اتنی پیچیدگیاں ہوتی ہیں کہ ماہرین مرض ذیابیطس کو ام الامراض بھی کہتے ہیں۔

ذیابیطس سے بچاؤ

موروثی اور ماحولیاتی عوامل کے باہم ارتباط (Interaction) سے ذیابیطس ہوتا ہے۔ ہم موروثی اسباب کو بدلنے سے قاصر ہیں لیکن ماحولیاتی عوامل پر قابو پانے سے ہم ذیابیطس سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ماحولیاتی عوامل میں غیر حرکیاتی زندگی، موٹاپا، اور غذا کو اہم قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر ذیابیطس کو طرز زندگی سے ہونے والا مرض بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے آبا و اجداد حرکیاتی زندگی گذارتے تھے اور ان کی غذا ہماری غذا سے مختلف اور بہتر تھی۔ وہ پھل اور ترکاریاں زیادہ استعمال کرتے تھے۔ ماضی میں موٹاپے کی شرح بھی کم تھی۔ ان وجوہات کے سبب ذیابیطس کی شرح بھی کم تھی۔ ذیابیطس سے محفوظ رہنے کے لیے ماہرین موجودہ طرز زندگی کو بدلنے، غذا میں احتیاط برتنے، موٹاپے سے دور رہنے وغیرہ کا مشورہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وہاب قیصر

کمپیوٹر گرافکس

اکیسویں صدی میں داخل ہونے تک کمپیوٹر نے جن جن شعبہ حیات کی تسخیر کی ہے ان میں شاید ہی کوئی شعبہ ایسا رہا ہو جس میں کمپیوٹر گرافکس سے استفادہ نہ کیا گیا ہو۔ کمپیوٹر گرافکس دراصل کمپیوٹر کے ذریعہ حاصل ہونے والی وہ سہولت ہے۔ جس میں شکل، صورت، ماڈل، ڈیزائن، نقشہ، گراف، چارٹ وغیرہ ساکت یا متحرک حالت میں بنائے جاسکتے ہیں۔ ان کا شمار کمپیوٹر کی سب سے زیادہ قابل دید، دلچسپ اور دل لبھانے والی حاصلات میں ہوتا ہے۔ انسانی فکر، تصور اور اس کی حسب منشاء عکاسی کرنا کمپیوٹر گرافکس کا طرہ امتیاز ہے۔

الکٹرانکس ٹکنالوجی کی ترقی عصری کمپیوٹروں کو عالم وجود میں لے آئی۔ ان کے ذریعہ عمل پیرا امور سافٹ ویر سے طے پاتے ہیں۔ جو کمپیوٹر سائنس کی ترقی کی دین ہیں۔ جب کہ کمپیوٹر گرافکس اور ان کے جمالیاتی حسن میں فن کو بڑا دخل حاصل ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ کمپیوٹر گرافکس کا حصول ایک ایسا فن ہے جو سائنس اور ٹکنالوجی کے امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ جس طرح کمپیوٹر، انسان کی صلاحیت کو بڑھاتے ہوئے فطرت کا مطالعہ کرنے اور اس کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں اسی طرح کمپیوٹر گرافکس، انسان کو ایسی سہولت فراہم کرتے ہیں جس سے وہ نظروں سے اوجھل مناظر کو اپنے سامنے دیکھ پاتے ہیں۔ اس طرح کمپیوٹر، گرافک نظاموں کے ساتھ، انسان کے لیے خوابوں کی مشین کہلائی جاسکتی ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے ماہرین کو کمپیوٹر گرافکس کے حصول کا اندازہ بہت

پہلے ہی ہو چکا تھا۔ لیکن گرافکس سافٹ ویر اور ہارڈ ویر میں عصری ترقی کی بدولت انھیں حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ چنانچہ امریکہ کی کمپنی زیراکس کارپوریشن نے سب سے پہلے ۱۹۷۰ء میں کمپیوٹر کے لیے گرافکس کے Interface کو فروغ دیا اور Apple Macintosh Computers نے ۱۹۸۰ء کے دہے میں اس کو مقبول عام بنایا اور آج یہ کئی قسم کے کمپیوٹروں کے لیے دستیاب ہیں۔ کمپیوٹر کی طرح کمپیوٹر گرافکس ہماری روزمرہ زندگی کا ایک حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ ہمہ اقسام کے ویڈیو گیمس چاہے ٹی وی پر کھیلے جائیں یا کمپیوٹر پر وہ تمام کے تمام کمپیوٹر گرافکس کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس طرح گھروں میں ان کا سب سے زیادہ استعمال ویڈیو گیمس کی شکل میں ہی سامنے آیا ہے۔ ٹی وی پر بتلائی جانے والی خبروں میں کھیلوں کے پروگرام، گراف چارٹ اور موسم کی پیش قیاسی میں جغرافیائی نقشے اور ان پر دکھلائے جانے والے بادل، بارش، بجلی اور ہوائیں ان ہی کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

کمپیوٹر گرافکس کے حصول کے لیے Image کو Scan کرتے ہوئے Mouse یا Stylus کی مدد سے گرافکس Tablet پر یا Lightpen کے ذریعہ بالراست اسکرین پر انھیں کھینچا جاتا ہے۔ جس سے Input کی تکمیل ہوتی ہے۔ Output کو چاہیں تو کمپیوٹر کے VDU پر یا ٹی وی کے اسکرین پر ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ پرنٹر کے ذریعہ کاغذ پر اس کی ترسیم کھینچی جا سکتی ہے یا پینٹ کی جا سکتی ہے۔ فلم پر اس کی تصویر کشی کی جا سکتی ہے۔ لیتھوگرافک تختیوں پر اس کو کندہ کیا جا سکتا ہے یا پھر کسی بھی سطح پر اس کو بنایا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر گرافکس میں مختلف شکلوں اور رنگوں کو استعمال کرنے کے لیے جو سافٹ ویر استعمال کیے جاتے ہیں۔ وہ Graphic Design Programs کہلاتے ہیں۔ اس کے ذریعہ اسکرین پر بنائی گئی تصویریں پینٹنگ کی طرح لگتی ہیں جس میں برش کے اسٹروکس تک صاف دکھائی دیتے ہیں۔

کمپیوٹر گرافکس کی ایک سیدھی شکل کسی چارٹ کی ہو سکتی ہے اور پیچیدہ شکل سائنس فکشن یا کارٹون پر مشتمل متحرک فلم ہو سکتی ہے یا پھر انجینئرنگ کا 3D بلو پرنٹ ہو سکتا ہے۔ یہ سیدھی سادھی ہوں یا پیچیدہ، انھیں Raster Graphics یا Vector Graphics کی طرح کمپیوٹر میں محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ آج کل کمپیوٹر ایڈیڈ ڈیزائن CAD میں کمپیوٹر گرافکس کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ انجینئرنگ، میڈیسن،

سرجری، موسمیات اور سائنس کے مختلف شعبوں کے لیے ماڈلس اور نقلی ماحول Simulation کے بنائے جانے میں انھیں استعمال کیا جاتا ہے۔

کمپیوٹر گرافکس کا ایک اہم استعمال Image Processing تکنیک ہے۔ جس کو کسی مقام پر نظر رکھنے مختلف اشیاء کو ضرر پہنچائے بغیر ان کے امتحان کرنے اور میڈیکل اطلاعات کی پراسسنگ کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سیٹلائٹ کی مدد سے ریموٹ سنسنگ کے ذریعہ زمین کے کسی حصے کی تصویر حاصل کی جاتی ہے۔ جس کی Image Processing کرکے وہاں کے موسم سے متعلق اطلاعات حاصل کی جاتی ہیں۔ اس کا ارضیاتی سروے کیا جاتا ہے۔ زرعی پیش قیاسی کی جاتی ہے اور نباتاتی بیماریوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔

مقتول، مجرم یا پولیس کو مطلوب کسی شخص کی ایک جھلک کسی نے دیکھی ہو تو اس کے حافظہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کمپیوٹر گرافکس کے ذریعہ کسی بیماری کی تشخیص کے لیے مریض کا Scan X-Ray کرکے اس سے 3D شکل حاصل کرتے ہیں اور کمپیوٹر کنٹرول ٹی وی اسکرین پر مختلف زاویوں سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ طبعیات کے پروفیسر اپنے کمپیوٹر کو اس طرح پروگرام کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے طلباء کو Quantum Mechanical Behaviour سمجھانے کے لیے گرافکس کا سہارا لیتے ہوئے یہ بتلا سکتے ہیں کہ کس طرح جوہر کے بنیادی ذرات اور ان کے برقی میدان ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عمارتوں کے آرکیٹکچرل ڈیزائن تیار کرنے اور ان کی پلاننگ میں جہاں کمپیوٹر گرافکس، آرکیٹیکٹ کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں وہیں پر مکان بنوانے والوں کے لیے تعمیر سے پہلے اپنے مکان کے 3D ڈیزائن کو اندرونی اور بیرونی طور پر مختلف زاویوں سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ میکانیکل انجینئر مشین کے پرزوں کے ڈیزائن تیار کرنے کے لیے اس تکنیک سے مدد لیتے ہیں اسی طرح کے کئی ایک تصویری مسائل کو حل کرنے میں انجینئرنگ کی مختلف شاخوں جیسے سیویل، الیکٹریکل، الکٹرانکس، کیمیکل، آٹو موبائیل، ہوائی جہاز اور جہاز سازی وغیرہ میں کمپیوٹر گرافکس کلیدی رول انجام دیتے ہیں۔

تحریر جہاں مسائل کے حل میں مناسب نہیں ہوتی وہاں گرافک ڈیزائن کے استعمالات مسائل کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے لیے کمپیوٹر

گرافکس کی مدد سے نقلی یا بناوٹی ماحول پیدا کیا جاتا ہے یا پھر گرافکس بنانے والے آلات کو قابو میں رکھتے ہوئے اپنے مسائل کو حل کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہوائی جہاز کے پائلٹ کی ٹریننگ میں انھیں زمین پر ہی ایک ایسے کیبن میں بٹھایا جاتا ہے جو ہو بہو جہاز کے پائلٹ کیبن کی طرح سارے بٹن اور کنٹرول سے لیس ہوتا ہے۔ سامنے ایک بڑے اسکرین پر کمپیوٹر گرافکس سے تیار کردہ رن وے ہوتا ہے۔ ٹریننگ حاصل کرنے والے پائلٹ اس کیبن میں وہ تمام امور انجام دیتے ہیں جو جہاز میں اڑان، ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت طے پاتے ہیں۔ یہ پورا انتظام کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ ٹرینی پائلٹ کو بالکل ویسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسا کہ وہ ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوں۔ اس ٹریننگ کے دوران انھیں ان تمام مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو ہوائی جہاز کے لیے فضا میں موسم کی شدید ترین حالتوں میں رونما ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک ماہر نامیاتی کیمیا Organic Chemist کمپیوٹر کی مدد سے ٹی وی کے اسکرین پر اس سالے کی ساخت کا 3D ماڈل تیار کرتا ہے جس کے مرکب کو حقیقت میں ار کیمیائی تعاملات کے ذریعہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ کمپیوٹر کی مدد سے سالمہ کے اس گرافک کو مختلف انداز سے بدل بدل کر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کو کن کن تعاملات کو عمل میں لانا چاہیے تاکہ مطلوبہ مرکب کا حصول ممکن ہو سکے۔

کمپیوٹر گرافکس۔ کمپیوٹر سائنس کی تیزی سے فروغ پانے والی تکنیک ہے۔ بیشتر ممالک میں پیداواری صنعتوں کے فروغ میں یہ معاون ثابت ہو رہی ہے۔ کاروباری تشہیر کے لیے شہر کی مختلف شاہراہوں پر نصب کیے جانے والے خودکار متحرک اشتہارات اسی کی دین ہیں۔ علاوہ اس کے کمپیوٹر ایڈیڈ ڈیزائن CAD کے ترویج و ترقی Solid, Structrral Analyysis, Modelong Process Planning اور Machine Communication کو بروئے کار لانے میں بہت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ گرافک آرٹ، ٹکسٹائل Business Presentaion, Pattern پبلی کیشنز، ٹی وی، سنیما اور تعلیم کے فروغ میں یہ ایک اچھا ذریعہ ثابت ہو رہے ہیں۔

نرگس سلطانہ
سی ا ر ۷، ۱۶ ایسٹ او بلاپور دہلی۔ ۵۳

ہمارے یہ اردو میڈیم اسکول

جولائی کا مہینا اب نصف دائرہ پورا کرنے کو ہے۔ وسط جون سے ہی مختلف صوبوں میں ہائی اسکول کے اور آئی سی ایس کے نتائج آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ دلی میں سی بی ایس سی کے ہائی اسکول اور آئی ایس ای کے نتائج کا اعلان ہو چکا ہے۔ ہمیشہ کی طرح امسال بھی اردو میڈیم اسکولوں کے نتائج سب سے زیادہ خراب رہے ہیں۔ اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان نتائج کو لے کر تجزیے کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ جو اخباروں میں زیادہ سے زیادہ ایک مہینے تک چلے گا۔ اور پھر اس کے بعد ایک سال تک مکمل خاموشی رہے گی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان خراب نتائج کے لیے طلبا اساتذہ کو اساتذہ طلبا اور ان کے والدین کو اور مینجمنٹ کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ دلی کے مشہور ترین اردو میڈیم اسکولوں میں اکثر کے نتائج ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ کے بالترتیب ۳۷ اور ۴۰ فیصد رہے ہیں اس کے برعکس مہاراشٹر ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جسے اس بات پر تو فخر نہیں کہ اردو اس کی زبان ہے اردو کی پرورش وہاں ہوئی ہے لیکن انھوں نے اسے اپنی زبان، اپنے کلچر کی زبان، اپنی قوم کی زبان، اپنے مذہب کی زبان سمجھ کر اپنایا۔ وہاں اپنے ساتھ اپنی قوم کو آگے بڑھانے کا جذبہ نہ صرف افراد میں بلکہ مختلف انجمنوں میں بھی پایا جاتا ہے آج ہندستان میں دہلی اور بہار سے زیادہ اردو میڈیم اسکول مہاراشٹر کے ضلعوں اور قصبوں میں پائے جاتے ہیں۔ پچھلے تین سالوں سے وہاں کے اردو میڈیم اسکولوں کے نتائج اس قدر زبردست، خوش کن اور حوصلہ افزا رہے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر اردو زبان کی طرف سے بڑھتی ہوئی مایوسی ایک دم ختم ہو جاتی ہے۔ دو سال قبل اردو میڈیم کے طالب علم تنویر ضیا رنے پورے مہاراشٹر بورڈ میں ٹاپ کر کے نہ صرف اپنا نام روشن کیا اپنے گھر والوں کا نام روشن کیا اپنے اسکول کا نام روشن کیا بلکہ اردو زبان کا پرچم سر بلند کیا عام طور پر مہاراشٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کے نتائج ۸۰ فیصد سے کم نہیں ہوتے۔ پچھلے سال زرین انصاری نام کی ایک طالبہ نے پورے صوبے میں میرٹ لسٹ میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اور اس سال بھی ہائی اسکول کے امتحانات میں اردو میڈیم اسکول، پونہ کے طالب علم بلال

مستری نے پورے مہاراشٹر میں اول پوزیشن حاصل کر کے اردو میڈیم کا پرچم پھر سے سربلند کیا۔ ان کی اس کامیابی پر روزنامہ انقلاب نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے "جب بلال کی کامیابی خوشبو بن کر پھیلی تو کئی صاحبان کو یقین نہیں آیا کہ اردو میڈیم کے بچے تین سال میں دو بار ٹاپ کر سکتے ہیں یہ بدخواہ اور اردو دشمن اپنے دل کو سمجھائے ہوئے تھے کہ تنویر غیاث تو دھوکے میں کامیاب ہو گیا اور زرین انصاری کے ہاتھوں بیٹیرلگ گئی لیکن ایسا سوچنے والے خود اندھے تھے اب بلال نے خود ان کے چودہ طبق روشن کر دیے۔ اب اردو کا یہ قافلہ چل نکلا ہے اور انشاءاللہ آگے ہی بڑھتا رہے گا۔

بلال مستری نے ۷۵۰ نمبروں میں سے ۷۲۴ نمبر حاصل کیے ہیں۔ اسی طرح مالیگاؤں کی ایک معذور طالبہ ثمینہ ناز سجاد احمد نے ناسک ڈویژنل ایس ایس سی بورڈ کے معذور امیدواروں کی میرٹ لسٹ میں اول مقام حاصل کیا ہے۔ وہ دونوں پیروں سے معذور ہے۔ غربت کی وجہ سے اس کے نانا اسے سائیکل پر بٹھا کر اسکول لائے تھے۔ اس نے کوئی ٹیوشن بھی حاصل نہیں کیا صرف اپنے بل بوتے پر محنت کرتی رہی اور پورے ڈویژن میں اول مقام حاصل کیا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال حیدر آباد اور آس پاس کے ضلعوں کے اردو میڈیم کے بچوں کی رہی ہے۔ روزنامہ سیاست کے مطابق حیدر آباد کے احتشام علی خاں نے کینسر اسپتال میں زیر علاج رہتے ہوئے بھی ایس ایس سی امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کیا۔ انھیں بلڈ کینسر کا عارضہ لاحق ہے۔ حیدر آباد کا اسلامیہ ماڈل اسکول جو اردو میڈیم اسکول ہے کہ ۷۶ بچوں نے فرسٹ ڈویژن حاصل کیا ہے۔

اس تقابلی مطالعے سے سرسری طور پر ہی یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند کے اردو میڈیم اسکولوں کے طالب علم اور اساتذہ دونوں میں تعلیم و تعلم، درس و تدریس کی طرف سنجیدگی، خلوص اور کمٹمنٹ کا فقدان پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اردو کی ترقی سے متعلق زیادہ تر ادارے اور تنظیمیں شمالی ہند میں پائی جاتی ہیں۔ ایسے افراد کی تعداد بھی یہاں زیادہ ہے جو اردو زبان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا رونا رو کر سارے مادی فائدے اردو کے نام پر خود بٹورنے میں لگے ہیں اردو کے فروغ کے لیے کئی انجمنیں بھی یہاں قائم ہیں اور کئی ایسے ادارے بھی ہیں جو اسکولوں کے معیار کو بہتر بنانے کا ہر وقت نعرہ لگاتے رہتے ہیں۔ ایسے متمول افراد کی بھی یہاں کمی نہیں جو اکیلے ایسے کئی ادارے قائم کر سکتے ہیں اور چلا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود آج شمالی ہند میں نہ صرف اردو زبان بلکہ اردو میڈیم اسکول بھی تنزلی کا شکار ہیں۔ ایسے افراد جن کی مادری زبان اردو ہے ان میں اکثریت مسلم طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طبقے کی اپنی قوم سے اور قوم کے

فلاح و بہبود سے کتنی دلچسپی ہے اس کی زندہ مثال پچھلے دنوں اخباروں میں شائع جامع مسجد کے قرب میں واقع بچیوں کے یتیم خانے کی کسمپرسی کی داستان سے مل جائے گی۔

اخباروں کے مطابق یتیم خانے کے منتظم نے پچھلے سال لوگوں سے اپیل کی تھی کہ آپ برائے مہربانی چہلم اور چالیسویں کا کھانا یا بطور صدقہ قربانی کے جانور کا گوشت یتیم بچیوں کے لیے نہ بھیجیں، یہ کھانا اور صدقہ کا گوشت کھلا کر آپ ان کی مستقبل کی زندگی کے لیے کھلواڑ کر رہے ہیں، منتظم نے لوگوں سے یہ بھی اپیل کی تھی کہ یتیم خانے کو اللہ کے شکر سے کسی چیز کی ضرورت نہیں، ضرورت ہے تو چند اہل خیر اصحاب کی جو ایک دو گھنٹہ یومیہ وقت دے کر یتیم خانے کی نگہبانی کر سکیں یہاں آسکیں، وقت دے سکیں، دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے بہتری کی کیا صورت ہو سکتی ہے نہ صرف مشورے دیں بلکہ انھیں عملی جامہ پہنانے میں برابر سے شریک ہوں۔ ہمیں ایسے فعال لوگوں کی ضرورت ہے جو قوم کا درد اپنے سینے میں رکھتے ہیں اور ان بچیوں کا مستقبل سنوارنے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ لیکن وائے افسوس ان کی اس اپیل پر بھی کسی نے توجہ نہیں کی۔ آج بھی بدستور لوگ چہلم اور چالیسویں کا کھانا بھیج کر اپنے قومی فریضے کی ادائگی پر سرخرو ہو رہے ہیں۔

یہ ضمنی مثال تھی، صرف دکھانے کے لیے کہ شمالی ہند کے لوگ اپنی ذمے داریوں، قوم کی ذمہ داریوں اور قوم کی امانت کے لیے اپنے دل میں کتنا دکھ اور درد رکھتے ہیں اس مثال سے آپ یہ بھی بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو قوم اپنے نونہالوں کی طرف سے اتنی لاپروا ہو اسے اپنی زبان، اپنے کلچر، اپنی تہذیب کی کیا فکر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ بے حسی، بے شعوری اور خواب غفلت میں پڑے رہنا لیکن مادی وسائل حاصل کرنے کی دوڑ میں ہمہ وقت مشغول رہنا بھی شمالی ہند کے لوگوں کی خصوصیت بن گئی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جہاں اس قدر بے حسی طاری ہو وہاں کے قوم کے نونہالوں کا مستقبل سنوارنے کی کیسے فکر ہو سکتی ہے۔ اور کس کے اندر اتنا احساس جاں گزیں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے کلچر کا کچھ خیال بھی کریں۔

اس کے برخلاف جنوب میں کئی صوبے ایسے ہیں جہاں نہ صرف اپنی زبان پر پڑنے والی کسی بھی ضرب کے خلاف لوگ نہ صرف محاذ آرائی کر لیتے ہیں بلکہ اپنے صوبے سے لے کر دلی تک قانونی اور سیاسی لڑائی بھی کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ دلی اور لکھنؤ جو ایک زمانے میں اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہے ہیں وہاں اب خود مسلمانوں کی دو نسلیں اس زبان سے بے بہرہ ہو چکی ہیں۔ اور دلی میں بھی اب اردو میڈیم میں پڑھنے والے طلبا کی غالب اکثریت غریب اور کمزور طبقوں کی ہوتی ہے۔ جنھیں شوق تو ہے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دیں۔ کم

از کم وہ ہائی اسکول کرلیں لیکن انھیں زیادہ فکر اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ کسی طور پر اس قابل ہو جائیں کہ روزی روٹی کی دوڑ میں شامل ہو جائیں۔ آج اردو میڈیم اسکولوں کی سب سے زیادہ تعداد مہاراشٹر میں ہے۔ اس کے بعد کرناٹک اور آندھرا پردیش میں اور دو چار اسکول تامل ناڈو میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جنوب کے علاقوں میں جو لوگ سماج میں کچھ بہتر پوزیشن رکھتے ہیں ان کی بھی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے قوم کے لوگوں کو آگے بڑھائیں۔ ان کے اندر یہ جذبہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جنوب میں مختلف افراد اور مختلف قسم کی تنظیموں نے نہ صرف اردو میڈیم اسکول قائم کئے ہیں بلکہ تکنیکی اور ڈاکٹروں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ وہاں کے اہل خیر حضرات نہ صرف بچوں کا مستقبل سنوارنے کے لیے زور دے رہے ہیں بلکہ ان کا سارا خرچ بھی برداشت کر رہے ہیں۔ کئی تنظیمیں تو ایسی بھی ہیں جو ہائی اسکول میں بہتر نتائج حاصل کرنے والے طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرنے کے واسطے انھیں گود لے کر ان کا سارا تعلیمی اور دیگر خرچ بھی برداشت کر رہے ہیں۔ وہاں ہائی اسکول کا نتیجہ نکلتے ہی ان بچوں کو آگے کی تعلیم دینے کے لیے کئی کمیٹیاں مشوروں اور گائیڈینس کے لیے تربیتی کیمپ لگا رہی ہیں۔ اس کام میں کسی کی کوئی تمیز نہیں ہے، بلکہ جنوب کی مشہور درگاہیں بھی اس کام میں آگے آگے ہیں انھوں نے کئی ایسے انجینئرنگ اور میڈیکل کالج قائم کر رکھے ہیں جہاں شمال سے جاکر بچے داخلہ لے رہے ہیں۔ اور تکنیکی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جب کوئی بچہ امتیازی نمبر حاصل کرتا ہے تو پورے شہر کے لوگ اس کی خوشی میں شامل ہو کر اس کا جشن مناتے ہیں اسے انعامات سے نوازتے ہیں۔ اور اس کی کامیابی کو قوم کی کامیابی سمجھ کر فخر کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف شمالی ہند میں اردو میڈم سے آئی اے ایس کے مقابلہ جاتی امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبا کا جشن منانا تو در کنار انھیں استقبالیہ تک نہیں دیا جاتا۔ یہاں تک کہ ان کی اس کامیابی کی کوئی خوشی بھی شمالی ہند کی کسی اردو تنظیم کو نہیں ہوتی اور نہ ہی آج تک ایسی تنظیموں کو یہ معلوم ہی ہے کہ اردو میڈیم سے امتحان دینے والے طلبا آئی اے ایس میں نمایاں کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ ہے شمال اور جنوب کے لوگوں میں فرق اور پھر جہاں ایسی بے حسی طاری ہو اتنا جمود طاری ہو کہ قوم کے احساس کو زنگ لگ چکا ہو وہاں اگر اردو میڈیم کے بچوں کے نتائج سب سے زیادہ خراب ہوتے ہیں تو پھر افسوس کس بات کا، اور یہ مہینے بھر چلنے والا واویلا کیوں؟

مدھو مکیش کرنک
(مصری مراٹھی ادب سے ایک کہانی)
مترجم: قاسم ندیم
لوٹس کالونی، ۵۰۵/۹ گوونڈی، ممبئی ۴۳

دودھ

اس بڑے سے بنگلے کے بند پھاٹک کے پاس تارا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ پھاٹک کس طرح کھولا جائے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اندر بڑا سا باغیچہ نظر آرہا تھا۔ ایک طرف مالی کچھ کام کر رہا تھا۔ بنگلے کے پورچ میں ایک شاندار گاڑی کھڑی تھی۔ پھاٹک کے باہر کھڑے ہو کر اس نے یہ سب دیکھا۔ اس نے سوچا کہ میں یہاں سے لوٹ جاؤں۔ پھاٹک کھولوں ہی نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو گا...

پیروں کے نیچے کی زمین گرم تھی اور اس کے پیروں میں کچھ نہیں تھا۔ پیر جلنے لگے۔ اس نے غیر ارادی طور سے پھاٹک کی کڑی بجائی۔ مالی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ پھاٹک کے پاس آیا اور اجنبی تارا سے اس نے کہا "کس سے ملنا ہے؟"

"راؤ صاحب کی بیوی سے ملنا ہے۔"

"کیوں؟"

"کام ہے... راجاراپوری کی ڈاکٹر نے بھیجا ہے۔"

مالی نے پھر کچھ نہیں کہا۔ اس نے آہستہ سے پھاٹک کھولا۔ کھرپی اِس ہاتھ سے اُس ہاتھ میں لی اور ایک بار تارا کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر وہ دل ہی دل میں پھسپھسایا۔ تارا کو کچھ سنائی نہیں دیا۔ اس کے حویلی نما بنگلے میں وہ پہلی بار ہی آرہی تھی۔ اس سے پہلے جہاں اس نے کام کیا تھا وہ گھر اسے یاد آنے لگے۔ کپڑے، برتن، کھانا بنانا یہ سب کچھ وہ کرتے آئی تھی۔ اس طرح کے بادشاہی بنگلہ میں اسے کبھی کام بھی ملے گا یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ پیر کے نیچے فرش پر دبیز سے غالیچے پر چلتے ہوئے اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔

کئی دالان پار کرنے کے بعد مالی نے آہستگی سے کہا "یہ راؤ صاحب کی بیوی کی کوٹھی، تم جاؤ اندر، میں انھیں بلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی۔

اندر سے فوراً ایک عورت باہر آئی۔ تارا نے اسے دیکھا۔ یہاں کی نوکرانی کے بھی کیا ٹھاٹ ہیں۔ چھ مہینے پہلے تارا تیسری گلی میں چوہان کے گھر کام کرتی تھی۔ اس کی بیوی سے تو یہ نوکرانی زیادہ امیر دکھائی دے رہی ہے۔ اسی وقت مالی نے کہا، "مالکن کے پاس لے کر جاؤ۔ ڈاکٹر نے انھیں بھیجا ہے۔"

اس نوکرانی نے گردن ہلائی، جیسے اسے سب کچھ معلوم ہے۔ سر پر کا پلو ٹھیک کیا۔ تارا کو سر سے پانو تک دیکھا...... دیکھتے دیکھتے اس کی نظر تارا کے سینے پر رک گئی ایسا تارا کو محسوس ہوا۔ مگر یہ باتِ اس نے دل پر نہیں لی۔ عورت نے اس انداز سے دیکھا بھی تو شرم و حیا کیسی؟

چلو، اندر چلو! مالکن کب سے تمھارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ اندر مڑ گئی۔ تارا بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ مالکن ایک صوفے پر شان سے بیٹھے بیٹھے کچھ بنائی کا کام کر رہی تھی۔ اس کے پیر کے پاس بلی جیسا ایک کتا بیٹھا تھا۔ تارا نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ جھولا کدھر ہے؟ بچہ کدھر ہے؟

مالکن بھی اسے دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا ابھرا ابھرا صاف ستھرا بدن دیکھ کر وہ خوش ہو گئی۔ اس نے بنائی کا کام روک کر پوچھا "کیا نام ہے تیرا؟"

"تارا۔"

"ڈاکٹر نے سب کچھ سمجھا دیا ہے نا؟"

"ہاں۔"

"کیا، کیا سمجھایا؟"

"یہی کہ بچے کو دودھ پلانا ہے......"

"بالکل صحیح۔ اسی کام کے لیے مجھے ایک عورت کی ضرورت تھی۔ دیکھ میں بچے کو دودھ نہیں پلا سکتی۔ سینے میں دودھ اترتا ہی نہیں...... بچہ چھوٹا ہے۔ اسے دودھ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سے میں نے کہا تھا۔ اچھی تندرست اور صاف ستھری کوئی عورت ہو تو بھیج دینا۔"

"ہاں......انھوں نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔" اس نے گردن جھکا کر کہا۔

"اور ہاں، ایک بات پوچھوں؟؟"

"پوچھیے۔"

"تیرا بچہ ہے نا؟"

تارا نے ساڑی کا سرا منہ کے پاس مٹھی سے دبایا۔ کیا جواب دوں؟ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دیکھا کہ بچہ اوپر چلا گیا۔ اسی وقت وہ مجھے کام پر رکھے گی۔ پیٹ بھر پائے گا۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ فاقوں کی نوبت نہیں آئے گی۔ خیالوں کے بے شمار پرندے پل بھر میں اس کے دماغ میں پھڑ پھڑانے لگے...... شوہر کو کام نہیں ہے۔ بعد دیگرے ہونے والے تین بچے...... خود کے اور بچوں کے فاقے......ڈاکٹر نے مشورہ دیا اگر اچھے سے کام کرو گی تو سات آٹھ مہینے آرام سے کھا پی سکو گے۔ چھاتیوں میں جو دودھ ہے اس کا سہارا لے کر سب کی بھوک پیاس ختم ہو سکتی ہے۔ مالکن سے کیا کہے؟ سچ یا جھوٹ؟

"کیا سوچ رہی ہو؟ کیا پوچھ رہی ہوں میں...... تیرا بچہ......؟"

اوپر گیا مالکن......بڑی مشکل سے اس نے یہ الفاظ ادا کیے۔

"ہاں یہی ڈاکٹر نے بھی کہا تھا۔ مجھے ایسی ہی عورت کی ضرورت تھی۔ خود کا بچہ بھی اگر دودھ پینے والا ہو تو ایسی عورتیں مالکن کے بچے کو پوری طرح دودھ سے سیراب نہیں کرتیں بلکہ اپنے بچے کے لیے دودھ چرا کر رکھ لیتی ہیں۔ مالکن کا لہجہ خشک اور بے رحمی سے بھرا ہوا تھا۔ مالکن سوئٹر بنے جا رہی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ تارا نے پہلی بار گردن اٹھا کر ہونے والی مالکن کی طرف دھیان سے دیکھا۔ گیہواں رنگ، کھلے ہوئے بازو سے ہڈیاں جھانکتی ہوئی۔ ایسی کمزور عورت کو دودھ کہاں سے اترے گا؟ تارا نے بغور دیکھا تو سینے کا ابھار بھی نظر نہیں آیا۔ وہ دہل گئی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ بھگوان بھی بچہ دیتا ہے اور اس کے لیے دودھ کیوں نہیں دیتا؟ اس عورت کو کس بات کی کمی ہے؟ میری طرح یہ غریب اور دلدر تھوڑی ہے۔

"ہر مہینے تجھے کتنا پیسہ دینا ہوگا؟" ابھی بھی مالکن کی نظر سوئٹر کے دھاگوں میں الجھی ہوئی تھی۔ تارا نے کچھ نہیں کہا۔ "پچھتر روپے دوں گی۔ مگر بچے کا پیٹ بھرنا چاہیے۔ اور ہر پندرہ دن کے بعد ڈاکٹر تمہاری جانچ کرے گی۔ تیری طبیعت بہتر رہنی چاہیے۔"

اس کے بعد بھی تارا نے کچھ نہیں کہا۔ جیسے اسے سب کچھ منظور تھا۔ پچھتر روپے...... اتنے روپے تو اس کے شوہر کو شاہو مل میں بھی نہیں ملتے تھے۔ اسے لگ رہا تھا زیادہ سے زیادہ یہ کتنی تنخواہ دے گی؟ زیادہ سے زیادہ تیس یا چالیس روپے۔ دن بھر میں تین چار بار ہی تو دودھ پلانا ہے۔ پچھتر روپے کا سن کر اسے حیرت اور خوشی ہوئی۔

"چندرا بائی، بچے کو لے آ......"

وہ نوکرانی فوراً اندر گئی اور باہر آکر کہا "بابا سو رہا ہے۔"

مالکن نے کلائی پر بندھی گھڑی میں دیکھا۔ ٹھیک ہے، سونے دے ابھی تھوڑی دیر! پھر جب وہ اٹھے گا تو اس کے پاس دودھ پلانے کے لیے دے دینا۔"

"جی مالکن۔"

ہاں ہاں، کیوں نہیں! اب تجھے اس کے ساتھ ہی سارا دن گزارنا ہے۔ جا سامنے کے روم میں سو رہا ہے وہ۔ بچہ جھولے میں سو رہا تھا۔ اوپر مچھردانی لگی ہوئی تھی۔ وہ نیند میں مٹھی چوس رہا تھا۔ صبح سے رکا ہوا دودھ تارا کے سینے سے ابلنے کو ہوا۔ وہ سینے کو مضبوطی سے دبا کر وہیں دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ بچے کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑا ہی وقت گزرا ہو گا کہ بچہ اٹھ گیا۔ رونے لگا۔ تارا فوراً اٹھی۔ بچے کو جھولے سے نکالا اور سینے سے لگا لیا۔ بارش کی بوندوں کی طرح دودھ ٹپکنے لگا۔ اس پرائے بچے کو دودھ پلاتے پلاتے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا اپنا بچہ دودھ پی رہا ہے۔ بچہ بھی چپڑ چپڑ دودھ پینے لگا۔ بچہ سیراب ہوتے ہوتے تارا کو بھی سیراب کر رہا تھا۔

تارا نے آنکھیں کھولیں تو سامنے مالکن کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ وہ تجسّس سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کون سے خیالوں میں کھو گئی تھی؟ تیرے بچے کی یاد آ گئی کیا؟" یہ سن کر تارا کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ مالکن ایسا کیوں پوچھ رہی ہے! کتنی بے رحم ہے یہ؟ دوسرے کا بچہ مر جائے اور اسی زچہ کا دودھ اس کے بچے کو ملے۔ مگر اس میں اس کی کیا غلطی ہے؟ میں اگر یہاں نہ آتی تو کوئی دوسری غریب عورت اسے مل جاتی۔ پچھتر روپیوں میں کسی کا پیٹ بھر سکتا ہے نا۔

مگر تارا نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے آنسو پونچھے اور دوسری چھاتی بچے کے منہ سے لگائی۔ بچہ بھی جیسے برسوں کا پیاسا تھا۔ دودھ پیے جا رہا تھا۔ مالکن یہ دیکھ کر اطمینان سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد بچے کا پیٹ بھر گیا۔ وہ کھیلنے لگا۔ اس نے بچے کو چندرا کے حوالے کیا اور گھر جانے لگی۔ مالکن نے اسے روکا۔ "یہ لے دس روپے۔ خرچ کے لیے رکھ اور دوپہر میں ذرا جلدی لوٹ آ ... کل سے دن بھر تجھے یہیں رہنا ہے! چلے گا نا؟"

تارا نے دس کے نوٹ کو پیشانی سے لگایا اور تیزی سے باہر نکل پڑی۔ پورچ کی گاڑی چلی گئی تھی اور بال کو منہ میں پکڑ کر کھیلنے والا کتا زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ مالی سایے میں بیٹھا تھا۔ تارا تیز تیز قدم بڑھائے جا رہی تھی۔ تارکول کی سڑک پر اس کے پیر جل رہے تھے اور دل میں طرح طرح کے خیالوں کا اژدہام تھا۔

وہ گھر پہنچی جب اس کا شوہر دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بڑا بیٹا گلی میں کھیل رہا تھا۔ بیچ والی لڑکی ٹوٹے ہوئے کنگھے سے بال سنوار رہی تھی۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔ "بچہ اٹھا تھا کیا؟"

"نہیں..... شوہر اور لڑکی نے ایک آواز میں جواب دیا۔ ویسے ہی وہ اندر گئی اور بے چین نگاہوں سے اس نے گدڑی سے بنے ہوئے جھولے کی طرف دیکھا۔ اس کا تین مہینے کا ننھا بیٹا جھولے میں آرام سے سو رہا تھا۔ جھولے کی رسیوں کو پکڑ کر اس نے آہستگی سے اس کا بوسہ لیا۔ اسی وقت سویا ہوا بچہ جاگ اٹھا اور رونے لگا۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور سینے میں بھر لیا۔ بچے نے تھوڑی دیر تک دودھ پیا۔ اسے بے حد بھوک لگی تھی۔ اس نے سینے سے منہ ہٹا لیا اور چڑ کر رونے لگا۔

تارا بے چین ہو گئی۔ ایک گھنٹہ پہلے ہی سینے کا سارا دودھ خالی ہو چکا تھا اتنی جلدی دوبارہ دودھ کیسے اترے گا؟ اس نے بار بار بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی اور وہ بھی بار بار منہ بازو میں کرنے لگا۔ بچے کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ تارا کو بھی رونا آ گیا۔ اسے کچھ بھی سوجھ نہیں رہا تھا۔ روتے ہوئے بچے کو گود میں لے کر وہ یوں ہی ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ آنکھوں کے آنسو اور بھوک کی چبھن تارا روک نہیں پا رہی تھی اور بچہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔

پھر اچانک اسے یاد آیا۔ دس کا نوٹ اس نے نکالا اور شوہر سے کہا "یہ پیسے لیجیے جلدی سے بازار جا کر دودھ کی بوتل لے آیئے۔ اچھی دیکھ کر لایئے.... اور برتن میں بچے کے لیے دودھ بھی لے آیئے......!!

ڈاکٹر مجیب احمد خاں
بی ۱۲، مختار منزل (ایکسٹینشن)
پارٹ II جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

حجاب امتیاز علی خاتون رومانی افسانہ نگار

میں تقریباً تین ماہ کے بعد گھر سے واپس دہلی آیا تو میری نظر کتاب نما پر پڑی۔ کتاب نما "ادبی و تہذیبی خبریں" کے عنوان کے تحت حجاب امتیاز علی کی وفات کی خبر پڑھ کر رنج والم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ان کا انتقال ۱۸ / مارچ کو ہوا اور مجھے ۱۴ / مئی کو معلوم ہو سکا۔

حجاب امتیاز علی اردو ادب کی ایک قد آور شخصیت تھیں۔ وہ برصغیر کی اول و آخر خاتون رومانی افسانہ نگار تھیں۔ وہ ۱۹۱۵ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کا آبائی وطن مدراس تھا۔ ان کے والد کا نام سید محمد اسمٰعیل اور والدہ عباسی بیگم جو مشہور ناول نگار تھیں۔ ان کی شادی ۱۹۳۵ء میں امتیاز علی تاج سے ہوئی تھی۔ ان دونوں ہی شخصیات نے اردو ادب کو بیش بہا سرمایہ عطا کیا۔ ان کی شادی کے بعد ادبی سرگرمیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا حالانکہ انھوں نے گھر کی ذمہ داریوں کو خوب خوب نبھایا۔ وہ متحدہ ہندستان کی پہلی مسلم ہوا باز خاتون تھیں۔ ۱۱ / جون ۱۹۳۶ء کو برطانوی حکومت نے پائلٹ کا لائسنس جاری کیا تھا۔ یہ اس وقت کے مسلم کلچر کے لحاظ سے اہم کارنامہ تھا۔

حجاب امتیاز علی کی شخصیت میں خلوص، شائستگی اور شگفتگی، شوخی اور سنجیدگی، بلند خیالی اور آزادروی، مستقل مزاجی، دور اندیشی، ہمدردی، انصاف پسندی اور ایمانداری وغیرہ خوبیوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

حجاب امتیاز علی نڈر اور دلیر خاتون تھیں۔ ان کی ہوا بازی اور اس پر طرہ فورسڈ لینڈنگ بھی کرنا، انتہائی ہمت اور بہادری کا کام ہے۔ ان کا ۱۹۵۰ء میں نروس بریک ڈاؤن ہوا

مگر وہ جلد ہی صحت یاب ہو گئیں۔ ۱۸ راپریل ۱۹۷۰ء میں امتیاز علی اور حجاب امتیاز پر قاتلانہ حملے ہوئے جس میں وہ دونوں شدید زخمی ہوئے۔ امتیاز علی تاج زخموں کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے چل بسے مگر حجاب امتیاز علی اب تک زندہ دلی سے زندگی گزار رہی تھیں۔ اس وقت ان کے پسماندگان میں ان کی بیٹی یاسمین طاہر اور نواسے فاران، مہران اور علی ہیں۔

حجاب امتیاز نے اپنا ادبی سفر ساڑھے گیارہ سال کی عمر سے شروع کیا۔ انھوں نے پہلا افسانہ "میری ناتمام محبت" لکھا۔ اس افسانے کے بارے میں وہ خود فرماتی ہیں۔

"جب بھی کوئی ناتمام محبت کی تعریف کرتا ہے۔ تو میں شرما جاتی ہوں اور اس موضوع کو ٹالنے کی کوشش کرنے لگ جاتی ہوں اور میں نے دیکھا کہ میرا مخاطب حیران ہو کر خاموش ہو جاتا ہے۔"

"ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں بغیر کسی مشاہدے اور تجربے کے محبت جیسے عمیق موضوع پر اتنا کچھ بے دھڑک لکھ لینا لڑکپن کی بے باکی اور حماقت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

چنانچہ میری ناتمام محبت ایک ناتجربہ کار لڑکی کے نابالغ ذہن کا تراشیدہ ایک ایسا بت ہے، جس کی ساخت میں کئی جگہ خود بت تراش کی نو عمری اور جذبات کی ولولہ انگیز ناہمواری جھلکتی نظر آتی ہے یا یوں سمجھیے کہ کہیں بت کی آنکھیں بہت زیادہ نشیلی ہو گئی ہیں تو کہیں ابرو بے حد خم دار ہو گئے ہیں۔ آج میں اپنی اس کتاب کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیتی ہوں اور پرانی یادیں نہ جانے مجھے کس خیالستان میں لے اڑتی ہیں۔"

(دیباچہ۔ میری ناتمام محبت۔ حجاب امتیاز علی)

حجاب امتیاز علی نے اپنی کمسنی کے باعث اس افسانے میں لطافت، شوخی و رنگینی پیدا کر دی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ایسے خوبصورت رنگین اور خوشبودار پھول کھلائے کہ دلوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ افسانہ اردو کی دنیا میں ان کی شہرت کا باعث بنا۔ بعض نقادوں کی رائے میں اگر وہ اس افسانے کے بعد کچھ بھی نہ لکھتیں پھر بھی اردو ادب میں ان کا ایک اہم مقام ہوتا۔

حجاب امتیاز علی کی شہرت رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے مگر انھوں نے ناول نگاری، مضمون نگاری، ڈرامہ نگاری، خطوط نگاری مزید برآں انھوں نے کئی مقدمات بھی

لکھے اور کئی تراجم بھی کیے ہیں۔ ان کی کچھ خاص تصانیف جو میرے مطالعے میں رہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اندھیرا خواب (ناول)، (۲) وہ بہاریں یہ خزائیں (ناول)، (۳) پاگل خانہ (ناول)، (۴) ظالم محبت (ناول)، (۵) نغمات موت (مجموعہ مضامین)، (۶) ادب زریں (مجموعہ مضامین)، (۷) خلوت کی انجمن (مجموعہ مضامین)، (۸) میری ناتمام محبت (افسانوی مجموعہ)، (۹) لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے (افسانوی مجموعہ)، (۱۰) کونٹ الیاس کی موت اور دوسرے ہیبت ناک افسانے (افسانوی مجموعہ)، (۱۱) ممی خانہ (افسانوی مجموعہ)، (۱۲) تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانے (افسانوی مجموعہ)، (۱۳) کالی حویلی (افسانوی مجموعہ)

حجاب امتیاز علی کی خط نگاری بھی توجہ کی طلب گار ہے۔ ان کے خطوط لطافت، شوخی رنگینی، شیرینی، دلکشی، بلند خیالی، مستقل مزاجی، معنیٰ آفرینی اور اثرانگیزی کے مظہر ہیں۔ زبان وبیان میں سادگی سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کے خطوط کا سرمایہ "کار جہاں دراز ہے" اور "یادش بخیر" میں شامل ہے۔ چونکہ میری بھی حجاب سے خط وکتابت رہی ہے اس لیے چند خطوط کا سرمایہ میرے پاس بھی موجود ہے۔ مزید برآں ان کا حالیہ فوٹو بھی موجود ہے جو انھوں نے میرے اصرار پر ایک خط کے ساتھ ارسال کیا تھا۔

میں نے حجاب امتیاز علی پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ہے۔ اس لحاظ سے میرے ان سے ادبی مراسم تھے۔ میں نے اس دوران ۱۹۹۶ء میں ایم فل کے مقالے کو شائع کرادیا۔ اس طرح میری پہلی کتاب "حجاب امتیاز علی، حیات اور ادبی کارنامے" شائع ہو چکی ہے۔ اس کے سرورق پر حجاب امتیاز علی کی عالم شباب کی تصویر ہے اور پشت پر مختصر تعارف۔ دراصل میرا یہ ابتدائی تحلیقی سفر ہے۔ میں نے ایک ایسی شخصیت کے کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس پر ہندوپاک میں کم ہی لکھا گیا ہے۔

میں یہ بھی واضح کردوں کہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "حجاب امتیاز علی کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے دوسری کتاب شائع کرانے کی کوشش میں ہوں۔ اس دوسری کتاب کا ذکر میں نے حجاب امتیاز علی سے بھی کیا تھا اور ان سے ان کی اور ان کے اہل خاندان کی تصاویر مانگی تھیں مگر انھوں نے اہل خاندان کی تصاویر دینے سے معذوری

ظاہر کی۔ تاہم اپنی ایک تصویر مجھے ایک خط کے ساتھ ارسال کی تھی۔

حجاب امتیاز علی کو اپنی زندگی میں اس بات کا شدید احساس رہا ہے کہ ادبی دنیا میں ان کی وہ قدر و منزلت نہیں کی گئی جس کی وہ حق دار تھیں۔ وہ حقیقت پسند خاتون تھیں۔ مگر ان کے ساتھ ادبی نقطہ نظر ان کی شہرت و مقبولیت میں حائل رہا ان کا ادبی نقطہ نظر بقول نقادان ادب "ادب برائے ادب" ہے مگر انھوں نے مجھے ایک طویل تحریر میں اپنے ادبی نقطہ نظر کو "ادب برائے زندگی" سے وابستہ بتایا ہے اور پرزور دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے کردار ڈاکٹر گار، چچالوث، کونٹ الیاس، ریحانی، نوید، روحی، صوفی، جسوتی اور زوناش وغیرہ اسی دنیا کے کردار ہیں اور ان میں زندگی کی حرارت موجود ہے۔ مزید فرماتی ہیں کہ یہ جھلملاتے ہوئے ستارے جنھیں ہر انسان روزانہ دیکھتا ہے اور پھر بھی اس کا جی نہیں بھرتا ہے تو ہم ان ستاروں بھری رات کو انسانی زندگی سے کیسے الگ کر سکتے ہیں۔ میری نظر میں نقادان ادب اور حجاب امتیاز علی دونوں ہی معتبر ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان کی تحریروں میں زندگی کی حرارت ہے مگر شدت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کرداروں میں برف کی سی سرد مہری چھائی رہتی ہے۔ ان کے افسانے اور ناول مقصدی ہیں۔ وہ معاشرے کو پاک وصاف، خوشگوار اور ترقی یافتہ دیکھنا پسند کرتی تھیں اسی لیے انھوں نے معاشرے کی برائیوں کو نظر انداز کیا ہے تاکہ تعمیر پسندی کا جذبہ برقرار رہے۔ ظاہر ہے کہ برائیوں کو ختم کرنے کا ایک طریقہ کار یہ بھی ہے کہ ان کو منظر عام پر نہ لایا جائے کیونکہ جتنا کسی چیز کو منظر عام پر لایا جائے گا اس چیز کی یاد تازہ رہے گی۔ اس لیے برائیوں کو منظر عام پر نہ لاکر بھلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے اسی مقصد کے تحت اپنی تحریروں میں تخریب کاری سے نفرت کی اور تعمیر پسندی پر زور دے کر ایک صحت مند معاشرے کی بنیاد ڈالی۔

حجاب امتیاز علی کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ وہ برصغیر کی ممتاز افسانہ ناول نگار تھیں۔ ان کی وفات سے ادبی دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے اور اب یہ خلا آسانی سے پُر ہونا ممکن نہیں ہے۔ افسوس! صد افسوس!! اس جہان فانی سے ادبی دنیا کی عظیم شخصیات دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی ہیں۔ ان کی کمی کا شدید احساس آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں : عبدالقوی دسنوی

اس کتاب میں اردو کے گیارہ شاعر (اکبر، حالی، حسرت، سید سلیمان ندوی، پرویز شاہدی، فراق، ساحر، جاں نثار اختر، فیض احمد فیض اور مجروح) کی شاعری اور فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

قیمت -/75 روپے

اخلاقیات طبیب حکیم محمد سعید

حقیقت یہ ہے کہ طبیب کے لیے علم میں مہارت جتنی ضروری ہے اتنی ہی ضروری اخلاقی رفعت بھی ہے۔ یہ کتاب اس دور میں طب کے ہر عامل اور ہر طالب علم کے لیے ایک اخلاقی معلم کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر طریق علاج کے حاملین کے لیے مفید اور معتبر۔

قیمت -/20 روپے

وسط ایشیا: نئی آزادی، نئے چیلنج آصف جیلانی

سابق سوویت یونین کی نو آزاد مسلم جمہوریاؤں کے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی بی بی سی لندن کی اردو نشریات سے نشر ہونے والے سلسلہ وار پروگراموں پر مشتمل ایک دستاویز۔ 51/

مستقبل کی طرف
مرتبین خواجہ محمد شاہد، خالد کمال فاروقی

مولانا محمود حسن کے خطبہ جلسہ تقسیم اسناد (جامعہ ملیہ اسلامیہ) سے لے کر آج تک کے ایسے تمام خطبات کا مجموعہ: ایک اہم تاریخی دستاویز۔

قیمت -/150 روپے

قلم اور قدم سید حامد

ہمارے تہذیبی، تعلیمی، لسانی، معاشرتی مسائل کا بے لاگ اور ہمدردانہ تجزیہ۔ ہمارے عہد کے ایک ممتاز دانشور اور ساجی مبصر کے قلم سے۔ ان مضامین کا اہم ترین پہلو جیتی جاگتی زندگی کے مسائل اور معاملات سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

قیمت -/75 روپے

مفکرین تعلیم ڈاکٹر محمد اکرام خاں

تعلیم کا کام در حقیقت پیغمبرانہ کام ہے۔ اس اہم اور نیک کام کے لیے جن اہم ۱۴ ملکی وغیر ملکی ماہران تعلیم نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا ہے اس کتاب میں ان کے خیالات ان کا فلسفہ، ان کی سوانح مختصر مگر جامع انداز میں پیش کی گئی ہے اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب۔

قیمت -/120 روپے

گلشن شاعری اور تنقید و تحقیق کے مضمرات پر مضامین کا مجموعہ۔

قیمت : 150/

پروفیسر ظفر احمد نظامی
شعبہ سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

راہِ عشق کا تنہا مسافر۔ شمیم جے پوری مرحوم

چہرہ مثل کتاب، آنکھوں پر شیشوں کا حجاب، چوڑی پیشانی، ناموری کی کہانی۔ سر اور گالوں پر حنائی بال، ذہن محوِ خواب و خیال۔ خوش سیرت و خوش صورت، عجز و انکسار کی مورت۔۔۔۔ یہ تھے شاعر باکمال، ترنم میں بے مثال۔ صاحبِ ''شمیم'' و ''شمیم گل'' ریاضِ شاعری کا بلبل۔ جانشین تسکین و جگر، خالق کلام پُر اثر۔ بادہ نوشِ شرابِ نوری۔۔۔ یعنی فہیم الحسن شمیم جے پوری۔ جنھیں ''مرحوم'' لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، آنکھیں روتی ہیں دل ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔

شمیم صاحب انیس سو تینتیس میں جے پور میں پھول کی طرح کھلے، انوار الحسن صاحب کو خوشبو بن کر ملے۔ انھوں نے اردو کو دل میں بٹھایا، عربی اور فارسی کو ذہن میں بسایا۔ جمالیات کے قائل ہوئے، دنیائے شاعری کی جانب مائل ہوئے۔ رباعی سے شعر گوئی کا آغاز کیا، اپنی سخن وری کا افشائے راز کیا پھر لیلائے غزل کی پناہ میں آ گئے، اساتذۂ کرام کی نگاہ پر چھا گئے۔ ناظم عزیزی سے استفادہ کیا، جے پور سے سفر کا ارادہ کیا۔ میرٹھ منتقل ہو گئے، صاحب فکر و اہلِ دل ہو گئے۔ پہلے جگر مراد آبادی سے فیضیاب ہوئے۔ پھر تسکین قریشی کی اصلاح سے سیراب ہوئے۔

دیکھنے میں تو وہ منحنی تھے مگر غزل گوئی کے دھنی تھے۔ اگرچہ روایت کا دم بھرتے تھے، مگر عصری قدروں کی قدر کرتے تھے۔ خیال کو جذبے کی آنچ پر تپاتے تھے، شعر کو کندن بناتے تھے۔ ان کے اشعار میں محبت کی سرگزشت تھی۔'' اساتذہ اردو کی باز گشت تھی۔ غزل میں بلا کے تیور تھے جو ان کی شاعری کا زیور تھے۔ کلام میں نزاکت تھی

اور نفاست بھی، نرمی تھی اور لطافت بھی شگفتگی تھی اور شائستگی بھی، نغمگی تھی اور زندگی بھی۔ وہ مشاعروں پر چھا جاتے تھے، فرزانوں کو دیوانہ بناتے تھے۔ عوام و خواص میں بے پناہ مقبول تھے، ریاض سخن کا مہکتا پھول تھے۔ سیحدم ریڈیو کا سوئچ آن کیجیے تو بس سمجھ لیجیے کہ شمیم صاحب کی غزل آرہی ہے، کسی نازک اندام کے لبوں سے گائی جارہی ہے۔ وہ مختلف ملکوں میں شاعری کا ڈنکا بجا چکے تھے، سمندر پار کے لوگوں سے داد پا چکے تھے۔ پردۂ سیمیں کے محبوب گیت کار رہ چکے تھے، کامیاب نغمہ نگار رہ چکے تھے۔

شمیم صاحب بڑے مرنجا مرنج تھے، بلبلِ نغمہ سنج تھے، وہ ایک اچھے شاعر اور بہت اچھے انسان تھے، تہذیبی اقدار کے ترجمان تھے۔ خلوص کا پیکر تھے، وضعداری کا مظہر تھے۔ اگر چہ بیباکی سے بات کرتے تھے مگر حکیم سیف الدین سیف سے ڈرتے تھے۔ ہر شخص کے مرتبے کو جانتے تھے، ڈاکٹر سید فاروق کو سرپرست مانتے تھے۔ ہمیشہ ان کے اخلاص کے اسیر رہے، مدتوں ان کے ساتھ قیام پذیر رہے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنا تیسرا مجموعہ کلام ڈاکٹر صاحب کے نام معنون کیا، اپنے گلدستہ سخن کو نذر جان چمن کیا۔ وہ شرافتوں کے امین تھے، انتہائی سنجیدہ، نہایت متین تھے۔

انھیں درِ جگر اور آستانِ تسکین سے اپنی وابستگی پر ناز تھا، یہ رشتہ ان کے لیے طرۂ امتیاز تھا۔ یا تو وہ شعر کہتے تھے یا یادالٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ روپیہ پیسہ سے ہمیشہ بے نیاز رہے، خود اپنے لیے بھی سربستہ راز رہے۔ انھوں نے دوسروں کے دکھوں کو سہا مگر اپنا دکھ کسی سے نہ کہا۔ دوستوں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھاتے تھے مگر حرف شکایت لب پر نہ لاتے تھے۔ آخر ۳۰ رمئی کو یہ آواز ہمیشہ کے لیے سوگئی، موت کی ظلمتوں میں کھوگئی اگر چہ احباب تعداد میں وافر تھے لیکن وہ اپنی راہ کے تنہا مسافر تھے۔ ان کی وفات پر ہر آنکھ سے آنسو بہا ہے تاہم انھوں نے اپنے بارے میں خود ہی کہا ہے

میں راہِ عشق کا تنہا مسافر
کسے آواز دوں کوئی نہیں ہے۔ ۱۱

☆

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔

کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ

مصنف: ابرار رحمانی
مبصر: محبوب الرحمٰن فاروقی
ناشر: تخلیق کار پبلیشرز دہلی
قیمت: ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی

بہت دنوں کے بعد کسی ریسرچ اسکالر کی کوئی تھیسس کتابی شکل میں ایسی دیکھنے کو ملی جس سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے سلسلے میں لکھی جانے والی تھیسس کے بارے میں جو عام مفروضہ قائم ہو چکا ہے اس کا اعلان ہو جاتا ہے۔ اور یوں بھی اس کی افادیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے کارناموں کا مکمل احاطہ کرتی ہے جو اپنے نظریات کی وجہ سے اردو کے سب سے متنازعہ نقاد آج بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ جن کی آج بھی ایک مخصوص حلقہ میں پرستش کی جاتی ہے اور دوسرے لوگ ان کے بارے میں عام تصور رکھتے ہوئے ان سے صرف نظر کر جاتے ہیں۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اس حلقے سے تعلق رکھنے کے باوجود، جہاں کلیم الدین احمد کی پرستش کی جاتی ہے، بڑی جانفشانی سے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد کلیم الدین احمد کی خامیوں اور خوبیوں کا بھرپور احاطہ کیا ہے یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ خصوصاً اس وقت جب ان ماخذات کا جس سے کلیم الدین احمد نے ہمیشہ استفادہ کیا ہے، کا پتہ لگا کر ان کا عرق ریزی سے مطالعہ کر کے سمجھ بوجھ کے یہ دکھایا ہے کہ کہاں ان سے لغزش ہوئی اور کہاں انہوں نے کسی مفہوم کو سیاق و سباق کے بغیر اردو پر چسپاں کرنے کی غلطی کی ہے۔ یہ اپنے آپ میں بڑی ہمت کی بات ہے۔

کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں "کلیم الدین احمد کے دور تک اردو تنقید کی سمت و رفتار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں کلیم الدین احمد کے عہد میں اردو تنقید کے رجحانات اور روایات کا عمیق مطالعہ پیش کیا گیا ہے، جن میں تاثراتی، مارکسی تنقید اور جدیدیت پسند تنقید کے

رجحانات خاص ہیں۔ باب سوم میں کلیم الدین احمد کے تنقیدی سرچشمے کے زیر بحث مشرقی اور مغربی تنقید کے ان رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن سے کلیم الدین احمد بطور خاص متاثر ہوئے ہیں۔ مغربی تنقید میں ٹی ایس ایلیٹ، آئی اے رچرڈز اور ایف آر لیوس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس باب میں مصنف نے ان تینوں کے تنقیدی نظریات سے بالتفصیل بحث کی ہے۔

باب چہارم، پنجم اور ششم کتاب کے کلیدی ابواب ہیں جس میں ابرار رحمانی نے بالترتیب اردو تنقید، اردو شاعری اور اردو داستان پر کلیم الدین احمد کی تنقید کا بھرپور اور معروضی مطالعہ پیش کیا ہے۔

کتاب کلیم الدین احمد کے سلسلے میں ریفرنس کے طور پر کام آئے گی۔ اس کے لیے میں مصنف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

کارنامہ نذیر

تالیف:۔ ڈاکٹر ریحانہ خاتون

ناشر:۔ انڈو ایران سوسائٹی

مبصر:۔ تحسیم عباسی آزاد

قیمت:۔ ۵۰۰ روپیہ (بیرون ہند: ۵۰ ڈالر)

''کارنامہ نذیر'' فارسی زبان وادب کے مایہ ناز محقق، ادیب اور دانشور پروفیسر نذیر احمد، سابق صدر، شعبہ، فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے احوال وآثار پر مشتمل ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ جسے ان کی صاحبزادی ڈاکٹر ریحانہ خاتون ریڈر، شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے مرتب کیا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد کی علمی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر عبدالستار صدیقی اور قاضی عبدالودود کی علمی وتحقیقی روایات کے امین ہیں۔ ان کے پایہ کا محقق، تنقیدی نقاد، مخطوطہ شناس، علم لغت کا ماہر خود فارسی زبان کی سرزمین ایران، افغانستان اور وسط ایشیا میں بھی شاید ہی کوئی ہو۔ ان کے علمی تبحر اور معیار تحقیق کا اعتراف ان ممالک کے ارباب فضل وکمال بھی کرتے ہیں اور انھیں عزت وتکریم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

نذیر صاحب کا اصل میدان تو متنی تنقید اور مخطوطہ شناسی ہے لیکن ان کا دائرہ تحقیق وسیع اور موضوعات متنوع ہیں۔ زبان، ادب، قواعد، لغت، تاریخ، طب سے لیکر مصوری، خطاطی، کتب شناسی اور فن تعمیرات تک پر بیشمار تحقیقی مضامین ان کی قلم سے نکل چکے ہیں۔ انھیں عادل شاہی دور اور دکنی ادب سے خاص شغف ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیقی کام کی ابتداء بھی عادل شاہی دربار کے شاعر

ظہوری اور ابراہیم عادل شاہ کی فن موسیقی پر لکھی گئی کتاب "نورس" سے کی تھی جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے توصیفی اسناد کے ساتھ پی ایچ ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی تھی۔

تحقیق و تنقید کے علاوہ نذیر صاحب نے فارسی زبان کی بعض نہایت مشکل اور ادق کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ جن لوگوں نے امیر خسرو کی "اعجاز خسروی" دیکھی ہے اس سے اتفاق کریں گے کہ اس کتاب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا کوہ کنی کے جوئے شیر لانا ہے۔ نذیر صاحب نے "اعجاز خسروی" کی پانچوں جلدوں اور ابراہیم عادل شاہ کی فن موسیقی پر لکھی ہوئی کتاب "نورس" کو انگریزی کا جامہ پہنانے کا کارنامہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جو ان جیسے ماہر لغت ہی کے بس کا کام ہے۔

ملک بیرون ملک کے بہت سے علمی و ادبی اداروں اور انجمنوں کو نذیر صاحب کی اعزازی رکنیت کا اعزاز حاصل ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ جیسے باوقار ادارے کا معیار انھیں کی بدولت قائم ہے۔ نواسی سال کی عمر کو پہونچنے کے باوجود ان کے علمی مشاغل میں کوئی کمی نہیں آئی۔ دور دراز کے شہروں اور ملکوں کا سفر، کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت، انھیں اپنے علمی و تحقیقی مضامین و مقالوں سے نوازنے کا سلسلہ بدستور قائم ہے۔ جن لوگوں نے نذیر صاحب کو علمی کام کرتے دیکھا وہ ان کی محنت، استغراق اور یکسوئی پر حیرت زدہ ہیں۔

راقم الحروف نذیر صاحب کا شاگرد رہ چکا ہے چار سال نصابی درس کے علاوہ پی ایچ ۔ ڈی کا مقالہ بھی انھیں کی نگرانی (نگرانی کم حصہ داری زیادہ) میں تیار کر چکا ہے۔ لیکن ایسا شاگرد ہے جس کے بارے میں استاد کی رائے اچھی نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اگر یہ کہے کہ چند بشری کمزوریوں کے باوجود جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے۔ نذیر صاحب جس میدان کے مرد میدان ہیں کم از کم ہندوستان میں مستقبل میں ان کی جگہ تنہا کوئی نظر نہیں آتا تو اسے مبالغہ پر محمول نہیں کیا جانا چاہیے۔ ان پر طالب آملی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

از یں پس ما و جاہل مشربی و ناخردمندی
بہ یاراں پیشکش کردیم علم نکتہ دانی را

(نکتہ دانی کا علم ہم نے دوستوں کو پیش کر دیا۔ اس کے بعد اب جاہل مشربی اور ناخردمندی کا دور ہے۔)

کتاب کو ابواب میں تقسیم کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اسے چار حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیے۔ پہلا حصہ نذیر صاحب کے حالات زندگی سے متعلق ہے جو بجائے خود علمی کام کرنے والوں کے لیے سبق

آموز اور بصیرت افروز ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ شہرت وعظمت کے مدارج پر پہونچنے کے لیے کس قدر محنت، لگن اور ریاضت کی کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرا حصہ ملک وبیرون ملک نذیر صاحب کو دی جانے والی اسناد اعزاز وامتیاز کی نقول اور ان کے بارے میں فارسی زبان وادب کے ممتاز معاصر علما کی آرا شامل ہیں۔ ان میں ایران کے ایرج افشار، سید محمد حسن شاہنگیاں، ڈاکٹر محمد رحیمیان، محمد باقر کریمیان ڈاکٹر مصطفی سزاواری اور ہندوستا ن کے پروفیسر امیر حسن عابدی، پروفیسر سید حسن، پروفیسر پروفیسر نورالحسن انصاری اور پروفیسر محمد حسن خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان میں پروفیسر محمد حسن کو چھوڑ کر باقی سب ایران وہندوستان میں فارسی زبان وادب کے گرامی قدر علما میں شمار ہوتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن نذیر صاحب کے دیرینہ دوستوں میں ہیں۔ انھوں نے نذیر صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ جو پڑھنے کے لائق ہے۔

تیسرا حصہ ہند وبیرون ہند کے اردو، فارسی اور انگریزی کے مقتدر علمی وادبی جرائد میں شائع ہونے والے اور کانفرنسوں میں پڑھے جانے والے مقالات ومضامین نیز مختصر تعارف کے ساتھ ان کی تصانیف کی فہرست پر مشتمل ہے۔ اس کی حیثیت ببلیو گرافی کی ہے۔

چوتھے حصہ میں نذیر صاحب کے چند مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین ہیں۔ ان میں ''اردو ادب میں قدیم زرتشتی عناصر'' ''متون کی تصحیح میں تخریج کی اہمیت' اور یادداشتہائے لغوی وادبی'' خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اول الذکر فکر انگیز ہی نہیں بڑا معنی خیز بھی ہے۔ اس میں ہندوستان کی تاریخ وتہذیب اور مسلمانوں کی مذہبی لفظیات پر زرتشتی عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دوسرے میں تخریج کی تعریف، اس کے عمل کی نوعیت اور متون کی تصحیح میں اس کی اہمیت کو کثرت سے مثالوں کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ تیسرا مضمون نذیر صاحب کے مطالعہ کی وسعت، قوت حافظہ اور زرف بینی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں ایسے الفاظ کی کثرتے سے مثالیں جمع کی گئی ہیں جنھیں شاعروں اور ادیبوں نے کپڑوں کے مختلف اقسام کے ناموں کے طور پر استعمال کیا ہے یا اپنے مروجہ ومشہور معنی سے مختلف معنی استعمال کیے گیے ہیں۔ دراصل آخر کے دونوں حصوں نے کتاب کی قدر وقیمت اور اس کی افادیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔

نذیر صاحب کے کارناموں کو کتابی شکل دیکر علمی وادبی حلقوں سے روشناس کرانا بھی ایک کارنامہ ہے۔ جسے ان کی لائق بیٹی ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے انجام دیا ہے۔ وہ اہل علم خصوصا فارسی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی طرف سے شکریہ کی مستحق ہیں۔

روشن لکیریں

مصنف:۔ شمیم طارق
مبصر: انور ظہیر خاں
قیمت:۔ ۱۵۰ روپے
ناشر:۔ روزنامہ ہندوستان مولانا آزاد روڈ ممبئی۔۸
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ ممبئی۔۳

آج سے لگ بھگ اٹھارہ بیس برس پہلے شمیم طارق کی جواں سالی کے دن تھے۔ شعر وادب میں ان کا نام بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل کی طرح پھیل رہا تھا کہ سیاست کی حرافہ کو اپنا دل دے بیٹھے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یار دوستوں نے انھیں اسی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ مگر جلد ہی وہ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوگیا اور یہ اپنے کیے پر شرمندہ و تائب ہوگئے۔ پھر شعری مجموعہ "شہ رگ" شائع کرایا۔ شاعری سے شوق تو پورا ہوا پر پیٹ نہیں بھرا۔ سو صحافت کو اپنا پیشہ اور تیشہ بنالیا۔ ہفت روزہ اردو "بلٹز" (ممبئی) سے وابستہ رہے۔ اپنا مشہور اور فکر انگیز کالم "آنسو گرا رہا ہوں جگہ جگہ چھوڑ کر" پہلے "بلٹز" میں پھر روزنامہ "انقلاب" (ممبئی) میں لکھتے رہے۔ ٹیپو سلطان پر ایک مختصری کتاب لکھ کے چھپائی۔ اسلام میں "تصور محبت" پر شرف محنت وکفالت کے نام سے ایک مبسوط جامع اور وقیع کتاب تحریر کی۔ حال ہی میں "روشن لکیر" کے نام سے ایک کتاب چھپی ہے۔ جو ان کے صحافت کے پیچ وخم اور آئین وآداب پر مضامین، صحافتی اداریوں اور مضمونچوں کا مجموعہ ہے۔ وہ "روشن لکیریں" کی مشمولات کے تعلق سے ذہن، ذوق، زبان اور ادارے کے عنوان کے تحت رقم طراز ہیں۔

"اس میں ایک مضمون اردو صحافت کے پچاس سال..... آج کل، نئی دہلی، اگست ۹۷)، تخلیقی ادب کی موجودہ صورت حال (ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، اگست ۹۴) نیز رشدی اور ابلیس (بلٹز) کے علاوہ سبھی اداریے اور خصوصی مضامین روزنامہ اردو ٹائمز (ممبئی) میں ۱۴ اگست ۹۷ء اور ۱۳ دسمبر ۹۷ کے درمیان شائع ہوئے ہیں اور نہایت مختصر مدت میں لکھے گئے انتہائی وسیع دائرے پر محیط سبھی اداریے علمی اخباری دلچسپی سے زیادہ قوم کے لیے گہرے غور وفکر اور ذہنی انقلاب کے داعی ہیں۔"

مندرجہ بالا عبارت کا آخری جملہ ظاہراً طوار پر دعوا معلوم ہوتا ہے لیکن سوچیے تو پتہ چلتا ہے کہ شمیم طارق کو اپنی تحریری صلاحیت وصلابت پر کتنا اعتبار ہے، یہ اسی کی جانب اشارہ کرتا ہے واقعہ یہ

ہے کہ وہ گہری فکر ونظر رکھنے والے صحافی ہیں۔ ان کی نظر اور نظریے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان کے جذبہ خلوص، علمی استغراق، علمی استغنا اور صحافتی دیانت داری سے انکار ناممکن ہے۔

اردو میں صحافیانہ تحریروں پر مشتمل کتابیں اس سے پہلے بھی شائع ہو چکی ہیں "قومی آواز" کے سابق مدیر عشرت علی صدیقی کے صحافتی مضامین کے مجموعے کے علاوہ ڈاکٹر ظ انصاری کے اداریوں، ادارتی نوٹ اوران کے اقتباسات کا انتخاب "کانٹوں کی زبان" (مطبوعہ ۱۹۸۷)، ساجد رشید کی کالم نگاری کا انتخاب،، زندگی نامہ (مطبوعہ ۱۹۹۱) اور اب شمیم طارق کی کتاب "روشن لکیریں" منظر عام پر آئی ہے۔ جسے روزنامہ "ہندوستان" (ممبئی) کے مالک ومدیر سرفراز آرزو نے شائع کیا ہے۔

عام طور پر ہندوستان میں اردو صحافت کو مسلم صحافت کا نام دیا جاتا ہے۔ شمیم طارق ایک مذہبی مسلمان ہیں۔ کم پڑھے لکھے اور شعلہ مستعجل مسلمانوں کی طرح جذباتی نہیں بلکہ عقلی بنیادوں پر غور و فکر کرنے والے مسلمان ہیں۔ جنھیں ہندوستان اور ہندوستانی سماج سے محبت ہے۔ مسلم کمیونٹی کی فکر رہتی ہے۔ ہندوستانی سماج ہو، مسلم سوسائٹی ہو یا بین اقوامی معاشرہ، ان کی اچھائیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ مگر سیاسی، مذہبی اور معاشرتی برائیوں پر پردہ نہیں ڈالتے۔ ایک کھرے اور دیانت پسند صحافی کی طرح انھیں آئینہ دکھاتے ہیں۔ ان کے اسباب وعلل پر گہرائی سے سوچتے اور پھر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو اس کتاب کو پڑھے گا جابجا ایسی مثالیں پائے گا۔

آج عام پڑھے لکھے لوگ تو درکنار اچھے خاصے علمی ادبی اشخاص بھی غیر فصیح، غیر معیاری، غیر ادبی بلکہ غلط اردو لکھتے اور بولتے ہیں۔ شمیم طارق کے اس مجموعہ مضامین میں غلطیاں نہیں کے برابر نہیں۔ جبکہ بیشتر تحریریں دم کے دم لکھی گئی ہیں اور دوسرے دن کے اخبار میں چھپی ہیں۔ یہ تحریریں ایک دو کو چھوڑ کے نہ خالص ادبی ہیں اور نہ ہی خالص صحافیانہ۔ ان میں ایک طرح کی مٹھاس ہے۔ جس کا قوام ادب سے خلا ملا رکھے بغیر تیار نہیں ہوا کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ شمیم طارق بنیادی طور پر علم اور ادب کے آدمی ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ادب اور صحافت میں ہم سائیگی کا رشتہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ادب اور صحافت پر برتری حاصل ہے۔ اور وہ اس سے بھی واقف ہیں کہ ادب صحافت میں کس حد تک دخیل ہوتا ہے۔ جو صحافت ادب سے بیگانہ وار گزرتی ہے وہ اکہری، بے رس اور بے نمک ہو کے رہ جاتی ہے۔ صحافت میں ہر ذوق وذہن کے لیے معلومات افروزی کے ساتھ زبان وبیان کی چاشنی اور تفریح طبع کا سامان بھی ضروری ہے۔ اعلیٰ پائے کی صحافت ہر طرح کی معلومات، ادبی پہلوؤں اور تفریحی عناصر کے بل بوتے ذہن سازی کا مبارک فریضہ انجام دیتی ہے۔

غرض مختلف ومتنوع موضوعات پر قلم بند کیے گئے یہ مضامین، شذرات اور اداریے دلچسپ ہیں

اور دعوت فکر و نظر دیتے ہیں۔ یہ ناک کے نیچے کی زندگی سے چپے اور آنکھ کے سامنے کے معاملات ومسائل سے اٹھائے گئے موضوعات ہیں جو ہماری بلند وپست زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اخباری چیزیں اور خبریں دوسرے دن کا سورج طلوع ہونے کے بعد باسی اور ردی ہو جاتی ہیں اگر اخباری تحریریں خبر اور خبری تجربے کے خانے سے اٹھ کر کسی کتاب میں ورق ورق پھیل جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت کی چھلنی میں چھن جانے کے بعد ان میں کچھ کے باقی رہنے کے آثار ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

سایہ دار درخت

مصنف:۔ ضیا حسنی
مبصر:۔ نظام ہاتف
قیمت:۔ ساٹھ روپے
پتہ:۔ ۳۵ ٫ رکھوناباز ارفتح پور۔ (۲۱۲۶۰۱)
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ دین وادب، امین آباد لکھنؤ

" سایہ دار درخت" ضیا حسن کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ مشمولہ سولہ افسانے پڑھ لیے، کئی تو اس سے پہلے مختلف رسائل میں پڑھ چکا ہوں۔ جہاں تک پہلے افسانے " سایہ دار درخت" کا تعلق ہے۔ افسانے کی تکنیک اچھوتی ہے۔ بوڑھے مجمن کا کریکٹر بڑا ابھرا اور مکمل ہے۔ مکالمے سب اور بجل اور فطری ہیں۔ اس کی افسانوی افادیت مسلم ہے۔ ان سبھی افسانوں کے متعلق میری واضح رائے یہ ہے کہ افسانہ نگار نے افسانوی موضوعات کے مطابق ہی محاکات اور فضا بنائی۔ اور ہماری اس افراتفری سے بھری دنیا میں چیختی بے راہ روی اور اس کے پے چیدہ ترشتی اور مضر اثرات پر ضیا صاحب نے بہت خوبصورتی سے چوٹیں کی ہیں۔ آج انسان جس زبردست دماغی اور ذہنی خلفشار سے ہم کنار ہے قہقہے تو عنقا ہو گئے ہیں مسکان تک مہنگی ہو گئی ہے ضیا صاحب کا افسانہ مہنگی مسکان اسی حقیقت کا غماز ہے۔ سہاگ، ایک اٹوٹ بندھن، آنکھوں کی سوغات، اور انتقام ان سبھی افسانوں نے مجھے جگہ جگہ لحہ فکر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فکشن کے ادب میں یہ مجموعہ یقیناً اچھی جگہ متعین کرے گا کیونکہ ضیا حسن کے اندر تحریر میں زبردست اپیل ہے وہ ایک عام زندگی سے ہو کر گزرے ہیں اس لیے اس میں تاثر بھی ہے قاری کو ایک پیراگراف پڑھ کر ہی لطف آنے لگتا ہے اس کے بعد اس کی تجسس ذہنی منزلیں واشگاف ہونے لگتی ہیں۔

افسانہ نگار نے افسانہ "دیوانے کا خواب" کو شاید کسی ہندی رسالے کے لیے لکھا ہے جہاں اس میں ہندی کے ثقیل الفاظ زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے کہیں کہیں الجھن محسوس ہوئی ہے۔ بحیثیت مجموعی "سایہ دار درخت" کو قارئین پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔

نیش

شاعر:۔ شفیع ساغر
مبصر:۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
قیمت:۔ ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ
ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی۔ ۳

غزل کو آپ لاکھ گالیاں دیں۔ اسے ہزاروں اعتراضات کا نشانہ بنائیں۔ گردن زدنی قرار دیں۔ "نیم وحشی صنف سخن" کہہ کے اس کا مذاق اڑائیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ صنف سخن ایسی سخت جان اور طاقت ور ہے کہ آپ سے اپنا لوہا منوا ہی لیتی ہے اور آپ اس کے آگے گردن جھکا دینے پر مجبور ہو ہی جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس کوزے میں فلسفہ، سیاسیات عمرانیات، معاشیات اور مذہبیات وغیرہ کا سارا سمندر سمو دیجیے لیکن سچ تو یہ ہے کہ غزل وہی غزل ہے جس میں 'تغزل' ہو کلاسیکی رچاؤ ہو دل کی باتیں ہوں۔ معاملات حسن و عشق ہوں۔ اور ایسا لگے کہ "یہ بھی میرے دل میں ہے۔" شفیع ساغر کی غزلیں اسی احساس سے پر ہیں۔ لہٰذا انھیں صحیح معنوں میں غزل کا شاعر کہا جاسکتا ہے۔ شفیع ساغر جو ممبئی یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر ہیں۔ ایک عرصے سے تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اور اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اس بے نیازی کے ساتھ کہ۔ گر نہیں ہے میرے اشعار میں معنی نہ سہی مگر ان کی ستائش ضروری ہے کہ ان کے اشعار میں معنی بھی ہیں اور مفہوم بھی۔ ان میں نہ ابہام ہے، نہ علامتوں اور استعاروں کی شعبدہ بازی، نہ بھاری بھرکم اور خود ساختہ الفاظ و اصطلاحات کی تشکیل و استعمال سے دھونس جمانے کی ناکام کوشش، نہ کسی قسم کا کوئی دعوا۔ اسی سادگی کے سبب ان کے اشعار ترسیل کے المیے کا شکار نہیں ہوتے۔ بلکہ ہمیں اپنا احساس، اپنا تجربہ اور اپنا خیال محسوس ہوتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

صلح ہم دونوں نے کرلی ہو کے شرمندہ مگر
اک تکلف سا ہمارے درمیان باقی رہا

وادیِ پر خار نکلی آرزو کی سر زمیں
چلچلاتی دھوپ ہے اور دور تک سایہ نہیں

تہذیب جذبات ملاحظہ ہوں۔

جو بھی وہ تیرے میرے بیچ ہے
ایسی باتوں کی کریں تشہیر کیا
سرور وصل کو لمحوں کے فاصلے سے نہ ناپ
ورائے کون ومکاں ہے یہ دلوں کا ملاپ

ان کے ہاں کلاسیکی لفظیات واستعارات کا استعمال فیاضی سے ملتا ہے۔ مثلاً آشیاں، دھواں، مزار، زاہد، واعظ، رقیب، ساغر، ساقی، آسماں وغیرہ، لیکن وہ اپنے عہد کے حالات سے بے خبر بھی نہیں۔ عالمی منظر نامے اور بدلتے ہوئے صنعتی شہروں کے ماحول کی طرف ہلکے ہلکے اشارے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً

تیل کی کالی بدلی نے بارش برسائی چھالوں کی
آنکھ جھپکتے کیسا بدلا ساغر ان شہروں کا روپ

آج کے فرد کی تنہائی کا یہ نادر نکتہ کسی کے ہاں اس سے پہلے نہیں ملتا۔

خدایا آج پھر تخلیق حوا کی ضرورت ہے
ترا آدم دھویں کے شہر میں بالکل اکیلا ہے
وقت ایسا آپڑا تھا تیرے شہر میں ہمیں
سب جانتے تھے اور کوئی جانتا نہ تھا۔

یہ اور اس قسم کے بہت سے اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ شاعر عصری حسیت سے بے نیاز نہیں۔ اور نہ ہی نئی زبان ولفظیات سے ناواقف ہے۔ مثلاً

کہیں بھی جاؤں مرے ساتھ ساتھ چلتی ہے
یہ زندگی ہے کسی دل جلے رشی کا شراپ

پھر یہ شاعرانہ تیور بھی ملاحظہ ہوں۔

بڑی مشکل میں ہیں اہل کدورت
انھیں پھر آپڑی میری ضرورت

ہم تری زلف کے اسیر نہیں
نرم لہجے میں بات کر ہم سے

اس چھوٹے سے شعری مجموعے کی اشاعت پر کہ جس میں زمانہ ساز مکار، بے رحم سفاک، بے مروت اور عیار زہریلی بھڑوں کے ڈنک شامل ہیں، میں شفیع ساغر کو مبارک باد دیتی ہوں۔ اس نیک تمنا کے ساتھ کہ اس "نیش" سے انھوں نے جو کچھ کشید کیا ہے۔ وہ قاری کے لیے "نوش دارو" بن جائے۔

ورثہ

مصنف:۔ یوسف ناظم
ناشر:۔ دارالمعارف۔ ممبئی
قیمت:۔ ۸۵روپے
تبصرہ نگار:۔ پروفیسر محمد انورالدین

اردو دنیا میں یوسف ناظم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کے سب سے سینئر طنزومزاح نگار ہیں۔ اردو کے صف اول کے طنزومزاح نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے لوح وقلم کی پرورش کرتے آرہے ہیں اور ہنوز ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ امتدادِ وقت اور عبور مرورِ ایام نے انھیں بزرگوں کی صف میں ضرور لا کھڑا کیا ہے لیکن ان کا فن ابھی جوان ہے۔ انکی تحریریں ماہ وسال کی گردش کے ساتھ موقر ادبی رسائل وجرائد کی زینت بنتی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں ان کے چٹپٹے مضامین کا پہلا مجموعہ 'کیف وکم' کے عنوان سے ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے زیر اہتمام منظرعام پر آیا تھا۔ جب سے لے کر آج تک ان کی تقریباً ڈیڑھ درجن تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان مستقل تصانیف سے قطع نظر وہ بعض رسائل کی خصوصی اشاعتوں کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ یوسف ناظم نام ہی کے نہیں بلکہ کام کے بھی ناظم ہیں۔ مبداء فیض نے ان کی طبیعت میں موزونیت عطا کی ہے۔ شعر خوب کہتے ہیں علاوہ ازیں ترجمے سے بھی شغف ہے۔ انہوں نے بھرتری ہری کی سنسکرت نظموں کا منظوم ترجمہ ارمغان سنسکرت کے نام سے کبیر کے دوہوں اور گیتوں کا ترجمہ نوائے کبیر کے عنوان سے کیا ہے۔

یوسف ناظم کی تخلیقی زندگی کے اس تنوع اور فنی ہمہ رنگی کے باوصف ان کی اصل شناخت طنزومزاح نگار کی ہے۔ یہی ان کا اصل میدان ہے جس میں ان کے توسن خامہ کی شوخ خرامی نے فن اور

معیار کے نئے سنگ میل قائم کئے ہیں۔ان کی تازہ تصنیف "ورنہ" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

پیش نظر کتاب ۳۲ مضامین وانشائیوں پر محیط ہے۔اس میں ایک مختصر گوشہ غالب بھی ہے۔ان مضامین کا خاص وصف یہ ہے کہ ان میں قاری کو اپنی روزمرہ زندگی کے واقعات کی جھلک اور عام مسائل کا عکس نظر آتا ہے اور یہی اچھے ادب کی نشانی ہے۔اچھا ادب خلاء میں بیٹھ کر تخلیق نہیں کیا جاتا بلکہ مٹی اور پانی کی بنی اس دنیا میں عام انسانوں کے بیچ رہتے ہوئے زندگی کے تلخ حقائق اور کڑوی سچائیوں کے تجربے ومشاہدے اور ان تجربات ومشاہدات کے فنی اظہار کے ذریعہ معرض وجود میں آتا ہے۔طنز ومزاح کا خاص وصف یہ ہے کہ اس میں دیگر اسالیب ادب کی بہ نسبت زندگی میں بہت زیادہ قربت پائی جاتی ہے۔اس میں زندگی کی ناہمواریوں، بے اعتدالیوں اور حالات وزندگی کی ناہمواریوں، بے اعتدالیوں اور حالات وواقعات کی ناموزونیت اور بے تکے پن پر طنز کا نشتر چلایا جاتا ہے۔ان کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو ابھار کر مزاح کی کشت زعفران زار اگائی جاتی ہے۔رفتار زمانہ کی ناہمواریوں، انسانی عادات واطوار کی کمزوریوں، انسانی رویوں کے بے ڈھنگے پن اور فقدان تناسب کو محسوس کرنے اور پرکھنے کے لیے نہایت درجہ ذہانت اور باریک بینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوسف ناظم کے طنز ومزاح میں قدم قدم پر باریک بینی ومشاہدے کی تیزی اور ذہانت وفطانت کا احساس ہوتا ہے۔ان مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی حقائق پر کڑی گرفت ہے اور اسے طنز ومزاح کے مخصوص چٹکی لینے والے اور خندہ آور اظہار وبیان پر مکمل قدرت حاصل ہے۔

یوسف ناظم کی نگارشات میں رمزیہ انداز عجب لطف دکھاتا ہے۔وہ بہ ظاہر اس چیز سے اتفاق کرتے ہیں جس کے درحقیقت منکر ہیں اور چپکے چپکے اس کی خامی اور حماقت کو عیاں کرتے جاتے ہیں۔

یوسف ناظم کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔وہ لطیفہ بازی یا عملی مذاق کے ذریعہ مزاح کی تخلیق نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاں مزاح کا ایک نکھرا ہوا ذوق ہے جو تحسین، رعایت لفظی اور موازنے وغیرہ کے ذریعہ اظہار کی راہ تلاش کرتا ہے۔مثلاً ذیل کا اقتباس دیکھیے۔

"ممبئی پہلے غدار شہر تھا اب گردوغبار کا شہر ہے۔(ابوالکلام) آزاد گر بقید حیات ہوتے تو غبار خاطر کی کئی جلدیں تیار کر لیتے۔آلودگی کی افراط اور گندگی کی تفریط کے لیے یہ شہر بہترین شہر ہے۔یہاں دو قسم کی کاروائیاں ہمیشہ جاری رہتی ہیں۔ایک انہدامی اور دوسرے انتقامی، انہدامی کاروائی میں مکانات ڈھائے جاتے ہیں اور انتقامی کاروائی میں قیامت ڈھائی جاتی ہے۔"

(ایک غیر مقیم ہندوستانی کا سفرنامہ)

اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ یوسف ناظم نے انسانی زندگی اور معاشرے کے وسیع اور بکھرے ہوئے منظر سے اپنے موضوعات اٹھائے ہیں ان کی طبیعت نہایت حساس، قوت باصرہ تیز اور ماحول کا شعور عمیق ہے۔

یوسف ناظم کی نگارشات میں طنز و مزاح کا خوش گوار امتزاج نظر آتا ہے ان کا مزاح بے ساختہ اور طنز بالواسطہ ہوتا ہے۔ وہ بہ تکلف مزاح پیدا کرنے اور راست طنز سے گریز کرتے ہیں سادہ اور بے تکلف انداز میں بات سے بات پیدا کرنے کے قائل ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کا ایک خاص مضمون ایک نیم سفر نامہ ہے جو" چارون مسقط میں" کے سرنامے کے تحت قلم بند کیا گیا ہے۔ یہ دراصل یوسف ناظم کے سفر مسقط (۱۹۹۵ء) کی نہایت دلچسپ اور پر مزاح روداد ہے اور خاصے کی چیز ہے۔ اس نیم سفرنامے کا خاص وصف اس کا شگفتہ انداز نگارش ہے۔ اس میں اسلوب کے ذریعہ مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون میں یوسف ناظم نے الفاظ اور جملوں کے ذریعہ ایسی شگفتہ کیفیت اور انبساط بخش فضا تخلیق کی ہے کہ قاری کے دل و دماغ، مسترد و اہتزاز میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہونٹوں پر تبسم رقصاں ہوتا ہے۔ اس سفرنامے سے خوش طبعی و ظرافت کے وہ ایک سنگ میل ملاحظہ ہوں۔

"یہ سفرنامہ نیم اس لیے ہے کہ اس میں جھوٹ اتنی مقدار میں نہیں ہے جتنا کہ سفرناموں میں ہوتا ہے"۔

وہاں (مسقط) اخبار بھی چھپتے ہیں لیکن سب لوگ انھیں گھروں میں چھپ کر پوشیدہ طور پر پڑھتے ہیں۔ سڑکوں کے بیچ کھڑے رہ کر نہیں"

"کار کی اگلی نشست پر بیٹھنے والوں پر پابندی ہے کہ وہ بیلٹ ضرور لگائیں۔ یہاں (مسقط) یہ غیر ضروری احتیاط ہے مغربی ملکوں کی حد تک یہ پابندی ٹھیک ہے وہاں لوگ کاروں میں بھی پیچھے نہیں بیٹھتے"۔

"شاعرات اور خواتین دو الگ الگ اصناف سخن ہیں ان میں سے ایک صنف کو صرف دیکھا جاسکتا ہے۔"

پیش نظر کتاب کا ایک خاص پہلو" گوشہ غالب" (مختصر) بھی ہے۔ یہ گوشہ چار مضامین پر محیط ہے۔ ان مضامین میں اردو شعر و ادب کی دنیا کی سب سے زیادہ زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت غالب اور ظرائف و متعلقات غالب کو طنز و مزاح کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اور حالی کے حیوان ظریف کے حوالے سے ظرافت اور بذلہ سنجی کے اچھوتے نمونے پیش کئے ہیں۔ اس سلسلے کی چند پھلجھڑیاں

ملاحظہ ہوں۔

"ذوق خلعت پسند شخص تھے اور مومن خلوت پسند۔ غالب کے اکثر اشعار کا مطلب دیکھنے کے لیے کسی نہ کسی ناقد کی شرح دیکھنی پڑتی ہے۔"

"جو شعر تشریح طلب نہ ہو وہ سوائے غالب کے کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہندوستان میں تو غالب اتنے مقبول ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اب بھی بقید حیات ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے تو وہ کہتے ہیں کب ہوا چند دن پہلے ہی تو ہم نے انھیں ایک سیریل میں ٹی وی پر دیکھا تھا"

زیر تبصرہ کتاب "ورنہ" اس قسم کے شگوفوں اور پھلجھڑیوں سے بھری پڑی ہے اور اس میں شائقین طنز و مزاح کے لیے تفریح دل و دماغ کا کافی سامان ہے۔ طنز و ظرافت کے اس شائستہ و متین مجموعے کی اشاعت کے لیے یوسف ناظم مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کھلے خطوط

☆ کبھی کبھار جب مجھے کوئی پرچہ بہت اچھا لگتا ہے تو میں بے ساختہ قلم اٹھا کر اپنی حقیر رائے کا اظہار کرنے پر آمادہ ہوتا ہوں "کتاب نما" کا مئی ۹۹ء شمارہ پڑھتے وقت مجھے یوں لگا کہ میں کوئی سالنامہ پڑھ رہا ہوں۔

اس بار کے مضامین پختہ اور معلوماتی لگے۔ خاص کر عبدالقوی ضیا کا منصورہ احمد پر "زخم زخم شخصیت کی شاعرہ" کی شاعری نے بے حد متاثر کیا۔ ان کی نظموں کا علامتی پن اور کہیں سیاست و معاشرے پر طنز و شکوہ نہایت موثر ڈھنگ سے پیش کیا گیا جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہا۔ پروفیسر عتیق اللہ اور ستیہ پال آنند کی شاعری پر ہیرا نند سوز کا مضمون بھی خوب ہے۔ طبیعت میں لوچ لانے کے لیے مجتبیٰ حسین کا "لوگ ہمیں بھی ڈاکٹر کہنے لگے" اور ڈاکٹر یعقوب یاور کا مضمون "دلاور فگار کی مزاحیہ شاعری کا رنگ بھی مزہ دے گیا۔ غزلیات میں عطا عابدی، متین سید اور ناز قادری کے کچھ شعروں نے تازگی دی۔ بخش لائل پوری کے ماہیے بھی خوب ہیں آپ نے انھیں دو حصے کے عنوان سے شائع کیا۔ مجموعی طور پر اس بار پرچہ بہت اچھا ہے۔ کتاب نما پر حیدر قریشی کی سالانہ رپورٹ بھی (ایک سرسری جائزہ) پر لطف و معلوماتی ہے۔

بھگوان داس اعجاز، T-451 بلجیت نگر۔ نئی دہلی ۸

☆ میں نے اپنی تازہ ترین نظم "خستہ ورق" چند ہی روز قبل آپ کے خدمت میں پیش کی تھی۔ آپ نے بڑا کرم فرمایا جو اسے جولائی ۹۹ء کے شمارے میں فوراً سے پیشتر شائع کر دیا۔ پرخلوص حرف تشکر آپ کی نذر کرتا ہوں۔

صفحہ ۹ پر شامل اشاعت میری نظم کے دوسرے کالم میں اوپر سے دوسرا مصرع غلط شائع ہوئی ہے۔ توشہٗ کرمک نہ ہوئی، نہ عروضی طور پر صحیح ہے نہ معنوی طور پر "توشہٗ کرمک ہوئی" اس کی صحیح صورت ہے۔ یہ چند سطور بطور تصحیح شائع کرنے کا کرم فرمائیں۔

بلراج کومل ۱۰۔ای ۱۳۹ کالکاجی، نئی دہلی

☆ جولائی ۹۹ء کا شمارہ مشمولات کے لحاظ سے کافی جاندار نظر آیا۔ مہمان مدیر کی حیثیت سے جناب حیدر قریشی نے بیسویں صدی میں اردو ادب کا ایک اجمالی جائزہ بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ غالب پر جناب وارث کرمانی کا مضمون بھی خاصے کی چیز ہے۔ شعری

حصے کا انتخاب بھی لائق تحسین ہے۔ البتہ ''ادبی خبریں'' کے تحت جناب نذیر فتح پوری کا اعلان ''اردو ماہیا نگار شعرا متوجہ ہوں'' پڑھ کر ذرا حیرت ہوئی۔ موصوف نے کچھ ماہیا نگاروں کے نام بھی فرداً فرداً یہی اعلان بھیجا ہے۔ چنانچہ انھوں نے مجھ ناچیز کو بھی یاد کیا ہے مگر ایک شرط کے ساتھ۔ مجھے وزن دیدیا گیا ہے۔ مفعول مفاعیلن / فعل مفاعیلن / مفعول مفاعیلن یعنی میرے لیے انھوں نے مساوی الوزن ''ماہیے'' کہنے کی گنجائش نہیں رکھی ہے۔۔۔ آخر یہ دُہرا پن کیوں؟

۱۹۹۲ء سے میرے'' ماہیے'' چھپ رہے ہیں بطور تجربہ درمیانی مصرع کو باقی دو مصرعوں سے مختلف رکھ کر بھی میں نے ماہیئے کہے ہیں اور ہندو پاک کے رسالوں میں ان کی اشاعت بھی ہوئی ہے لیکن حقیقتاً ایسے ماہیئے کی تخلیق سے کبھی تسلی نہیں ہوئی اور نہ ہی بعض حضرات کے دیے ہوئے فلمی حوالوں کو میں نے لائق اعتنا سمجھا۔ میں مساوی الوزن ماہیئے کہنے میں ہی راحت پاتی ہوں اور چراغ حسن حسرت کی پیروی میں نصیر احمد ناصر، امجد اسلام امجد، علی محمد فرشی، جلیل عالی، دیپک قمر، انجم نیازی، قیوم طاہر، حسن عباس رضا، شاہین بدر، احمد صغیر صدیقی، رونق حیات، نثار ترابی، سجاد مرزا، نسیم سحر، وصی محمد وصی، خالد رحیم، وحید کلیم، وقیع منظر، ایم۔ اے تنویر، سیما پیروز، سیدہ حنا وغیرہم کی شریک سفر رہنا پسند کرتی ہوں۔ میرے خیال میں کسی بھی ادبی جریدہ کے'' ماہیا نمبر'' میں دونوں طرح کے ماہیا نگاروں کی شمولیت ہونی چاہئے۔ اسی میں ادبی دیانتداری اور ماہیا کی بہتری ہے۔ حد بندی ٹھیک نہیں۔

صدف جعفری، لکھمیا۔ بیگوسرائے

☆ مجھے آپ کے ارسال کئے ہوئے پیام تعلیم اور کتاب نما قریب ۱۵ ماہ سے دستیاب ہوتے رہے ہیں۔ شکریہ

'' پیام تعلیم'' اور'' کتاب نما'' میں لکھنے والوں نے اپنے خیالات اور معلومات کا اظہار بخوبی کرتے ہوئے الفاظ اور جملوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ علاوہ دلچسپ معلومات کے اردو زبان کی بلند معیاری کا اندازہ ہوتا ہے ان رسالوں میں بہت سے قابل تعریف مضامین پڑھنے کو ملے۔ ہر شخص خواہ مرد، عورت یا بچہ کیوں نہ ہوں اس کو اپنی دلچسپی کے مضامین ملتے رہے ہیں اور امید ہے کہ آگے بھی زیادہ بہتر طریقے سے ملتے رہیں گے۔ ان سبھی قابل ذکر مضامین لکھنے والوں کی آپ کی اور آپ کے سوجھ بوجھ رکھنے والے دفتر کے

ساتھیوں کی حد سے زیادہ تعریف کرنا اس
خط کو طول دینا ہوگا۔ اس لیے مختصر طور پر
بھی کافی ہوگا۔ رسالے بہت اچھے
ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔ (میری زندگی
کی آخری کارکردگی میں ملازمت
Embassy of Japan بھی
شامل ہے مجھے جاپان کے شہنشاہ نے
Order of the Scred
Treasure Gold and
Silver RayS" عطا فرمایا۔ خدا
کرے آپ کے رسالے اور آپ کو دن
دونی اور رات چوگنی ترقی ملے۔

کرپا دیال ماتھر D-1/25 حوض خاص، نئی دہلی ۱۴

☆ جولائی کے شمارے میں جناب کاوش
بدری نے میری جون کے کتاب نما میں
شائع شدہ غزل میں ایک لفظ کے تلفظ کی
طرف درست نشاندہی کی ہے۔ شکر گزار
ہوں۔ پیاری بروزن فعلن ہے فعولن
نہیں۔ اس مصرع کو اب یوں پڑھا جائے:
ہمیں محبوب ہیں قدریں تمھیں نیرنگئی عالم
گیز کے کلیم صاحب نے جو یہ کہا
کہ "جبکہ سچائی یہ ہے کہ اوروں کی بنسبت
بہار والے کے زبان و بیان شگفتہ اور
تندرست ہوتے ہیں۔" تو اس کے سچ
ہونے میں کچھ شک ہے۔ یہ تندرست تو
ہوتے ہوں گے لیکن شگفتہ تسلیم کرنے
میں ذرا تامل ہے۔ جون کے شمارے
سے ایک دو مثالوں سے یہ سچائی واضح
ہو جائے گی۔ رضیہ پروین ابر (سرائے
بھاگل پور۔ بہار) کے یہ شعر دیکھیں۔

پھول خوشبو رنگ موسم سب بدلنے لگ گئے
اب بدلتے یگ کے ہیں آثار بھی دیکھا کرو
ہوگی اب دنیا میں انساں کی نئی قربانیاں
بن رہی ہیں کس لیے تلوار بھی دیکھا کرو

قربانیاں ہوگی یا ہوں گی؟ تلوار بن
رہی ہیں یا ہے؟ کیا دوسرے مصرعے از روئے
قواعد نحو درست ہیں؟ غزل میں ہر شعر کے
دوسرے مصرعے کی ساخت یہی ہے۔ یہ وہی
زبان و بیان ہے جو بہار کا عام آدمی بولتا ہے۔
نصرت صاحب کے جس جملہ پر مراسلہ نگار کو
اعتراض ہوا ہے۔ وہ تذکیر و تانیث کی نہیں واحد
جمع کی بے اعتدالی کی مثال ہے۔ تذکیر و تانیث
کی مثال اس سے اگلے جملہ میں تھی۔ مذکورہ بالا
شعروں میں کھیل کی روداد سنانی مقصود نہیں ہے
بلکہ یہ تخلیق ادب ہے۔ اور ادب کے لیے زبان
کا درست اور فصیح ہونا ضروری ہے۔ علاقائی
لہجے بھی اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ہر قسم کے رویے،
لہجہ، تلفظ اور طرز ادائیگی کے بارے میں شگفتگی کا
دعویٰ کر دینا مناسب نہیں ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ بہار کے کچھ حضرات بہت ہی شستہ
و شائستہ اور فصیح اردو لکھنے والے بھی ہیں لیکن وہ
استثناء ہیں۔

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ادبی خبریں

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا شہیدوں کو خراج عقیدت

بھوپال ۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیر مین عزت مآب عزیز قریشی صاحب کے ذریعہ کشمیر میں مادر وطن کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہونے والے جانباز سپوتوں کو خراج عقیدت پیش کرنے اور دراندازوں کے خلاف کارروائی کرنے میں اپنی حکومت کا ساتھ دینے کے لیے بلائے گئے جلسے میں اردو کے دانشور، علما، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، اہل قلم اور معززین شہر کی بڑی تعداد نے ایک آواز ہو کر مادر وطن کی سرحدوں میں پاکستان کے ذریعہ کی گئی دراندازی اور کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کی سخت الفاظ میں مزمت کی ۔ اور ایک قرار داد پاس کر کے وطن عزیز کے ایک ۔ ایک انچ چپہ کے لیے لڑنے اور جنگ کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے حکومت ہند کی، کارروائی کی پرزور حمایت کی ۔ جلسہ کے اختتام پر جنگ میں شہید ہونے والے جانباز سپاہیوں کو دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر اہل جلسہ نے اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا ۔

ابتدا میں اردو اکادمی کے چیر مین جناب عزیز قریشی نے بولتے ہوئے کہا کہ برگیڈیر عثمان سے لے کر حوالدار عبدالحمید تک وطن کی حفاظت کی داستان ہمارے لہو سے سرخ ہے ۔ انھوں نے کہا کہ ہماری دو حیثیتیں ہیں ۔ ایک بحیثیت ہندوستانی کے اور دوسرے ایک مسلمان کے، انھوں نے کہا کہ اسلام کا فرمان ہے کہ اگر آپ کے وطن پر دشمن حملہ کرتا ہے تو اس کو ایک ۔ ایک انچ زمین سے ڈھکیل کر باہر کردو ۔ انھوں نے بعد میں ایک قرار داد پیش کی جس میں کہا گیا کہ بھوپال کے اردو شعرا، ادبا، اہل قلم اور جہانِ شعر وادب ایک ذہن ہیں ایک رائے اور ایک آواز کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ وہ جموں اور کشمیر کی کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کرنے والے پاکستانی دراندازوں کو پسپا کردینے کی کارروائی پر اپنی حکومت کے ساتھ ہے اور اپنے ذہن وقلم کی پوری توانائی سے اس وقت تک ساتھ دیتے رہیں گے ۔ جب تک کہ دشمن کو اپنی سرحدوں سے باہر نہ کرائیں کہ جنگ کسی مسئلہ کا حل نہیں بلکہ وہ خود مسئلہ ہے ۔ اور اردو کے دانشوروں نے ہر عہد میں انسانی اقدار کی بربادی اور تا

انصافی کے خلاف اپنی آواز اور قلم بلند کیا ہے۔

مفتی عبدالرزاق صاحب نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وطن سے محبت کرنا ایمان کی علامت ہے اور وطن کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ مفتی محترم نے آگے کہا کہ پاکستان اسلامی ملک نہیں ہے وہ شروع سے ہی غدار اور دروغ گو ہیں۔ اس ملک کی بنیاد ہی ٹیڑھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزیر اعظم نے دوستی کی بات کی، دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور لاہور تک بس کے ذریعہ گئے مگر پاکستان نے دھوکا دیا۔ غداری کی۔ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام کا یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی تمہاری طرف دوستی کے لیے جھکے تو تم اس کی طرف جھک جاؤ۔ انھوں نے کہا کہ اگر حکومت مجھ کو اجازت دے تو میں اپنی کہن سالی کے باوجود وطن کی حفاظت کے لیے سرحد پر پہنچ جاؤں۔

عالم دین حبیب ریحان ندوی الازہیر نے اس موقع پر بولتے ہوئے کہا کہ وطن سے محبت ضروری ہے اور اپنے آقا و مالک کائنات کی وفاداری کے بعد مسلمان ملک سے ہمدردی اور محبت کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ انسانی ہی نہیں اسلامی تعلیمات بھی ہیں کہ اگر آپ کی سرحد پر غالبانہ قبضہ کرلیا جائے تو دشمن کو منہ توڑ جواب دیا جائے۔

معروف دانشور، شاعر، وکیل، ناقد اختر سعید خاں صاحب نے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اراکین اردو اکادمی نے یہ جلسہ بلا کر مستحسن اقدام کیا انھوں نے کہا کہ ادیبوں وشاعروں کا یہ قبیلہ کارگل پر لڑنے والے مجاہدوں اور شہیدوں کو سلام کرتا ہے اور ان کی عظمت کے آگے سر جھکاتا ہے۔ ایک انسان کی طرح، ایک قلم کار کی طرح اور اس لیے بھی کہ یہ جنگ ٹل جائے کہ جنگ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی عمارت ملا رموزی سنسکرتی بھون کے ہال میں منعقد اس تقریب میں سیکڑوں افراد نے اپنے ہاتھ بلند کر کے چیرمین عزت مآب عزیز قریشی صاحب کے ذریعہ پیش کردہ قرارداد کی حمایت کی۔ اس پر وقار جلسہ سے پروفیسر عبدالقوی دسنوی، پروفیسر اکشے کمار جین، تلسی اکادمی کے چیرمین اودھیش کمار پانڈے، پروفیسر حسن مسعود، سید ساجد علی ایڈوکیٹ، جمشید بہادر اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے رہنما اور سابق رکن پارلیمنٹ کیلاش نرائن سارنگ نے بھی خطاب کیا۔ اس کے ساتھ ہی جناب وفا صدیقی، جناب صابر نیازی اور جناب

بشر صہبائی نے اپنے جذبات اور جوش کا شعری پیکر میں اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض جناب عشرت قادری نے بحسن خوبی ادا کیے۔ جبکہ شکریہ اردو اکادمی کی مجلس عام کے رکن شری دیوی سرن صاحب نے ادا کیا۔

مولانا آزاد یونیورسٹی: فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ ۱۴ راگست

حیدرآباد مختلف اداروں تنظیموں اور سرگرم افراد کے اصرار پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بی اے، بی کام سال اول میں داخلے کے لیے اہلیتی ٹسٹ فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ میں مزید توسیع کردی گئی ہے۔ پہلے یہ تاریخ ۵ر جولائی مقرر کی گئی تھی جبکہ اب طلبہ اپنے فارم ۱۴ راگست ۱۹۹۹ء (بروز ہفتہ) تک جمع کرسکتے ہیں اہلیتی ٹسٹ ۸ر اگست کی بجائے اب ۱۹ ر ستمبر کو منعقد کیا جائے گا۔

ڈاکٹر ظفرالدین

اردو کی خصوصی درس وتدریس کا مطالبہ

بہار قانون ساز کاونسل کے چیرمین، پروفیسر جابر حسین نے ریاستی حکومت کے محکمہ راج بھاشا اور فروغ انسانی وسائل کو مشورہ دیا ہے کہ درج فہرست ذات وقبائل کے طلبہ وطالبات کے لیے دوسری سرکاری زبان اردو کے خصوصی درس وتدریس کے لیے کارگر قدم اٹھائے جائیں۔ پروفیسر حسین کے مطابق اردو معلم، اردو مترجم اور اردو ٹائپسٹ کے عہدوں پر تقرر کے لیے درج فہرست ذات وقبائل کے امیدوار فراہم نہیں ہوتے۔ اس کے سبب ان طبقوں کے لیے ریزرو عہدے خالی رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان طبقوں کے خواہش مند طلبہ وطالبات کو اردو پڑھنے کے لیے خصوصی سہولیات دے کر حوصلہ افزائی کا جائے۔

۱۵ مارچ ۹۹ء ریاض میں ''کشت غزل نما'' کی رونمائی

ریاض (سعودی عربیہ) صف اول کے معروف شاعر ڈاکٹر حنیف ترین کے تازہ مجموعہ کلام ''کشتِ غزل نما'' کی رونمائی، ریاض میں مقیم مشہور ومعروف شاعر، نقاد وادیب جناب شبنم مناروی کے ہاتھوں ریاض کے وسیع وعریض ہال قصر اہل اللیالی میں عمل میں آئی جس کا انتظام بزمِ فروزاں کے کارکنان، شفیق احمد عبدالغنی، تشنہ اعظمی، رحمت غوری اور ان کے رفقاء نے کیا تھا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد جب کتاب کی رونمائی

ہوئی۔ اس وقت قصرِ اہل اللیالی (جس میں ساڑھے تین ہزار لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ ہند و پاک کے ریاض اور اس کے اطراف میں مقیم اردو کے متوالوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا) تالیوں کی گونج پرتھر کنے لگا۔ جس کو دیکھ کر کتاب کے خالق ڈاکٹر حنیف ترین کی ممنون آنکھیں حیرت واستعجاب اور خوشی سے بھر گئیں۔ اور یہ لمحہ ریاض کی ادبی محفلوں کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اس جلسے میں جہاں ریاض کی پُر وقار ہستی جناب ندیم ترین صاحب اور افضل ثنائی صاحب مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے وہیں کاوش عباسی، جاوید اختر جاوید، گوہر رفیق، ڈاکٹر شفیق احمد عبدالغنی وغیرہ نے ڈاکٹر حنیف ترین کی کتاب ''کشتِ غزل نما'' پر اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ شبنم مناروی صاحب نے نہ صرف کتاب کی رسم اجراء کی بلکہ اپنے مقالے کے ساتھ ساتھ اس محفل کی صدارت بھی کی اور جاوید اختر جاوید صاحب نے خوبصورت انداز میں نظامت کے فرائض انجام دیے اور سب سے پہلے اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک کے غزل پر جو بھی تجربے ہوئے ہیں انھیں ظہیر غازی پوری اور حنیف ترین کی غزل نما کا یہ تجربہ ادب کے قارئین کو بہت پسند آئے گا۔

جناب گوہر رفیق صاحب نے کہا ردو قبول کی جنگ میں جب آزاد غزل ہماری زندگی کا کامیاب تجربہ نہ بن سکی تو اس سلسلے میں کڑی اور تخلیقی تنقید جناب حنیف ترین کی کتاب ''کشتِ غزل نما'' کی صورت میں آئی ہے کیونکہ یہ غزل کی روایت کے اندر رہتے ہوئے اس کی اجازت سے کیا جانے والا انحراف ہے۔ انھوں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر حنیف ترین کی اب تک کی شاعری، شعروفن کے پارکھوں سے خود کو منوا چکی ہے اور اب ان کا یہ کامیاب تجربہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے اردو غزل کا دامن اور وسیع وکشادہ ہوگا۔ ڈاکٹر شفیق احمد عبدالغنی نے فرمایا کہ، غزل نمایوں تو تجرباتی شاعری ہے مگر ہمیں اس میں بھی وہی سرمدی کیفیت کا اظہار خود اعتمادی اور عصری حسیت کے ہمراہ معنی آفرینی کا آبشار پھوٹتا نظر آتا ہے۔ جو حنیف ترین کا خاصہ ہے۔ اور شاید اسی کو دیکھ کر حامدی کشمیری نے حنیف ترین کو 'حرف حق کہتے ہوئے ایک ہوش مند درد آشنا اور حساس شاعر کہا۔ تو مظہر امام نے انھیں خواب کا نہیں بیداری کا شاعر''

بتلایا تھا۔ اس کتاب میں جگہ جگہ پیکر تراشی جوان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ ان کی پچھلی کتابوں (رباب صحرا اور کتاب صحرا) سے بدرجہ اتم "کشفِ غزل نما" میں بھی موجود ہے۔

کاوش عباسی نے حنیف ترین کو ایک ایسا پُر جوش شاعر کہا جس نے پچھلی دھائی میں اپنی غزل اور نظم کے ذریعے ہند و پاک کے ادبی دائروں میں اپنی شاعری کا لوہا منوایا اور اول درجے کی خامہ فرسائی کے ذریعہ اپنے اندر کے تخلیقی سرچشموں میں شانِ عصر کی لو کو بڑھایا اور چمکایا۔

شبنم مناوری نے کہا کہ حنیف ترین کی شاعری اور شخصیت اردو شاعری کو ایک نئے پرتو سے آشنا کرتی دکھلائی دیتی ہے۔ جو ہمارے معاشرے کی مثبت اقدار سے جنم لیتی ہے۔ وہ الفاظ کو احساس کے نئے قالب میں ڈھالے ہوئے رمزیت اور ایمائیت کے ذرائع سے ذہین قاری پر بڑی شدت اور بھرپور اظہار سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ "غزل نما" کا تجربہ بھی ان کی نظم اور غزل پر یکساں قدرت رکھنے کا اظہار ہے۔

آخر میں مہمان خصوصی ندیم ترین نے ڈاکٹر حنیف ترین کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جو ابھی تک دنیا کی نظر سے اوجھل تھے اور کہا، بچپن سے لے کر جوانی تک علامہ اقبال اور ناصر کاظمی وغیرہ کی شاعری گھر اور باہر لوگوں کو سنانے والا ان کا بھائی تین کتابوں کا خالق ہو کر ایک دن غزل پر جتنی تجربے کرے گا اور ہمارے خاندان کا نام یوں اردو ادب میں بھی روشن کرے گا یہ دیکھ کر مجھے کس قدر مسرت ہو رہی ہے۔ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

رسم اجراء کے بعد مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں سعودی عرب میں مقیم دیگر شہروں سے آئے اور مقامی شعراء نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ اس میں جو شعراء شریک ہوئے ان میں ڈاکٹر جعفر رضوی، شکیل مظفر نگری، علی امام ہمراز، منظور عادل بلند شہری، حقیق الزمان حقیق، شاہ نواز عالم جگنو، فراست علی خسرو، انور اسحاقی، شفیق احمد عبدالغنی اور شبنم مناروی کے نام خاص ہیں۔ اس مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر حنیف ترین نے کی اور نظامت کے فرائض فراست علی خسرو نے بہت خوبصورت انداز میں نبھائے۔

بزم فروزاں، ریاض۔ سعودی عربیہ

''غزل کا سفر''۔ دوروزہ ورک شاپ کا انعقاد

ممبئی اردو غزل کی مقبولیت اور اس میں عوام کی دلچسپی کی مدنظر ممبئی کے این سی پی اے کے لٹل تھیٹر میں ایک ورک شاپ منعقد کیا گیا۔ اس دوروزہ ورک شاپ میں اردو غزل کی تعریف، اسکا مزاج اس کی راہ میں آئے اتار چڑھاؤ۔ اس کی گائیکی اور فلموں میں غزل کی اہمیت ''غزل کا سفر'' عنوان سے ہونے والے اس دوروزہ ورک شاپ کے پہلے اجلاس کی (بتاریخ ۹ جون ۹۹ء) جن مقررین نے مخاطب کیا، ان میں پر اشوک راناڈے، کالیداس گپتا احمد وصی، راجندر مہتہ، مجروح سلطانپوری، اور تشار بھاٹیہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ ورک شاپ اس لحاظ سے بہت اہم اور کامیاب ثابت ہوا کہ اس میں شرکت کرنے والوں میں زیادہ تر تعداد ان کی تھی جو نہ تو اردو پڑھتے ہیں اور نہ جن کی مادری زبان ہی اردو ہے۔ اس میں زیادہ وہ طالبات تھیں جو انگریزی میڈیم سے پڑھتی ہیں لیکن بیشتر نے اردو پڑھنے اور سیکھنے کی خواہش ظاہر کی اس ورکشاپ کا اہتمام جندل آرٹ کرسٹو کے لیے چھایا اور للیتا نے کیا۔

''وطن کے لال'' کی رسمِ اجرا

جناب عبدالقادر دھارواڑ، ریڈر شعبۂ اردو انجمن ڈگری کالج دھارواڑ، نے ''وطن کے لال'' لکھ کر نئی نسل پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے کے ان نایاب و نادر نگینوں کا انتخاب کر کے اس اہم دستاویز میں جڑ دیا ہے، جو اپنے وقت کے مشہور و معروف حاکم، مذہبی رہنما، سیاسی رہنما، دانشور، مصلح قوم، شاعر صحافی اور جاں نثار تھے۔ اس تصنیف کا مقصد نہ صرف صحیح ماضی سے واقفیت بہم پہنچانا ہے بلکہ مطالع کرنے والوں کو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین بھی ہے۔ یہ وہ شاہکار ہے جس میں ایک ہزار سالہ مسلمانوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ مذکورہ تصنیف کی رسمِ اجرا ۲۶ رجنوری کے مبارک موقعہ پر الحاج اقبال انجم جولی، صدرِ انجمن اسلام دھارواڑ کے دستِ مبارک سے ہوئی۔

محمد غوث، صدر شعبہ اردو، انجمن آرٹس سائنس وکامرس کالج دھارواڑ

برف کی فصلیں کی تقریب رونمائی

کویت میں اردو کے معروف شاعر عنبر فتحپوری، جو منفرد لب ولہجہ سے اپنی پہچان رکھتے ہیں ان کے پہلے شعری

مجموعہ " برف کی فصلیں " کی تقریب رونمائی گذشتہ دنوں ایک مقامی ہوٹل میں ہوئی کویت بزم ادب کے سر پرست ڈاکٹر شمس مرحوم کے صاحبزادے ابوذر شمس نے کی مہمانان خصوصی مقامی تاجر وسماجی شخصیات عتیق عدنان، زاہد بٹ، اختر پیرزادہ، ڈاکٹر سی ایم پاریکھ، ڈاکٹر سید مظہر، اقبال عبدالغفور کھوکھر، خالد نواز بھیم، عبدالجبار یوسف پٹیہ رفیق ابراہیم بھائی، یونس عثمان غنی غوری، عبداللہ ابراہیم کھوکھر، اور یعقوب اسماعیل سولنکی تھے جبکہ کتاب کی رونمائی سخن شناس معروف تاجر فیاض بھنڈر کے ہاتھوں عمل میں آئی جو حصوں پر مشتمل اس تقریب کے پہلے حصہ کی نظامت معروف شاعر وادیب نور پرکار نے سامعین کو شعرائے قوما کی سن ولادت اور داغ مفارقت سے روشناس کراتے ہوئے منفرد انداز میں کی۔ تقریب کی ابتدا حافظ فضل رسول نے تلاوت کلام پاک سے کی بعد ازاں ٹی وی ریڈیو سے متعلق معروف نعت خواں فدا حسین نے عنبر فتحپوری کے برادر خورد اسماعیل غازی فتحپوری کی نعت پڑھنے کی سعادت حاصل کی جبکہ ناظم تقریب نے ماہ محرم کے تقدس کو ملحوظ رکھتے ہوئے منقبت کی سعادت کے لیے صاحب تصنیف عنبر فتحپوری کو مدعو کیا اس طرح ناظم تقریب نے اپنے شیریں انداز میں تقریب کی کاروائی جاری رکھتے ہوئے اپنا مقالہ پیش کیا نور پرکار نے عنبر فتحپوری کے پہلے شعری مجموعہ پر مبارکباد دیتے ہوئے عنبر فتحپوری کے فکر وفن کا احاطہ کیا اور عنبر کی شاعری کو عصری تقاضوں کی حامل قرار دیا، اردو کے معروف قلم کار منیر فراز نے عنبر اور عنبر کی شاعری کے حوالے سے رنگ مزاج پر مشتمل مقالہ پیش کیا۔ تقریب کے محرک پروفیسر تسلیم اکبر شاہ نے اپنے مقالے میں عنبر کے شعر کہنے کی تکنیک کو منفرد انداز میں ان کے
غم روزگار کو فن شعر سے تشبیہ دیتے ہوئے خوب صورت مقالہ پیش کیا۔ خاتون شاعرہ مسرت جبیں زیبا نے عنبر کی کتاب پر لکھے ہوئے تاثرات پیش کئے۔ مقالات کے درمیان عنبر فتحپوری سے کلام سنا گیا۔ اس طرح تقریب کا پہلا دور کامیابی سے ہمکنار رہا۔ دوسرے مرحلے میں پنجابی کے معروف شاعر جسبیر سنگھ دھیمان نے عنبر کی ادبی حلقوں میں پزیرائی کو ان کی شاعری سے منسوب کرتے ہوئے عنبر سے دیرینہ روابط کے حوالے سے گفتگو کی، رانا اعجاز سہیل نے اپنے اظہار خیال میں عنبر کی شاعری کا مکمل احاطہ اردو کے بعض کلا

سک شعرا کے حوالے سے کیا۔ معروف شاعر محمد کمال اظہر جو اس تقریب کے انعقاد میں پیش پیش رہے انھوں نے اپنے اظہار خیال میں عنبر سے قریبی تعلقات کے حوالے سے بات کی بعد ازاں نور پرکار نے مہمان خصوصی حضرات کو اظہار خیال کے لیے مدعو کیا جنھوں نے عنبر کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے اس ضمن میں اختر پیرزادہ زاہد بٹ اور عتیق عدنان نے بھی عنبر کی شخصیت پر بات کی ڈاکٹر سی ایم پاریکھ اور ڈاکٹر سید مظہر نے بھی اختصار کے ساتھ تقریب کے انعقاد پر عنبر کو مبارکباد دی بعد ازاں گیسٹ آف آنرز فیاض بھنڈر نے اعزازی کتب حاصل کرنے والے معززین کو عنبر کا شعری مجموعہ پیش کیا۔ اس کامیاب تقریب کا دوسرا دور خورونوش کے بعد شروع ہوا جو موسیقی پر مشتمل تھا۔ مقامی گلوکاروں نے عنبر کی منتخب غزلیں۔ پیش کیں اس محفل موسیقی کی نظامت معروف شاعر افتخار امتیازی نے کی جن مقامی گلوکاروں نے کلام عنبر پیش کیا ان میں ممتاز علی خاں کلیم احمد، عبدالحمید، اور امجد حسین کے نام شامل ہیں تقریب کے اختتام کے بعد عنبر کی برادری کے چند حضرات نے اعزازی کتب لیں جن میں، غلام نبی عبد الرحیم راشد عبد اللطیف، شریف صدیق غوری، اور فاروق ابراہیم سونگی کے نام شامل ہیں اس طرح اس خوب صورت تقریب کا اختتام نصف شب کو ہوا، جو ادبی کتب کی رونمائی کے اعتبار سے ایک منفرد اور یادگار تقریب کہی جا سکتی ہے۔

رپورٹ عارف عبدالحکیم غوری

''روشن لکیریں'' کے اجراء کی باوقار تقریب

ممبئی ۱۷/اپریل ۹۹ء۔ انجمن اسلام ممبئی کے احمد ذکریا ہال میں شاعر وصحافی جناب شمیم طارق کے فکر انگیز اداریوں کے مجموعہ ''روشن لکیریں'' کا اجراء کرتے ہوئے اردو زبان وادب کے بلند پایہ محقق اور شاعر جناب کالی داس گپتا رضا نے کہا میں شمیم طارق کو جوانمردوں میں شمار کرتا ہوں۔ وہ یقیناً جوانمرد ہیں اس لیے ان کے یہاں رہنے سہنے اور زندگی بسر کرنے میں وہ چمک دمک نہیں ہے بلکہ خستہ حالی نمایاں ہے، اس کے باوجود زندگی کے کسی مرحلے پر یہ شخص جھکے نہیں، اصولوں کا سودا نہیں کیا اور اس کی یہی ادا اس کی جوانمردی کی اعلیٰ مثال ہے۔ صدر جلسہ مشہور دانشور جناب ڈاکٹر رفیق ذکریا نے اپنی تقریر میں کہا کہ شمیم طارق کے اداریوں میں جس منفرد انداز نگارش کا مظاہر کیا گیا ہے، جچے تلے لفظ اور جملے

میں وہ انگریزی صحافت کے سامنے رکھے جانے کے قابل ہیں اس موقع پر آپ نے اردو کے مسائل پر بھی گفتگو کی اور بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ اگر پاکستان نے ہماری زبان چرالی ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ صدر انجمن اسلام ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے کہا کہ شمیم طارق ایک نہایت ایماندار شخص ہیں میں ان کی تحریروں اور کردار دونوں کا مداح ہوں۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انگریزی کے نامور صحافی لاجپت رائے نے شمیم طارق مختلف اداریوں کا علمی تجزیہ کرکے اس کی پذیرائی کی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے شامنامہ کے مدیر جناب عبدالسمیع بوبیرے نے کہا کہ "روشن لکیریں" میں ایک محقق کا دماغ، ایک شاعر کا احساس اور ایک ادیب کی زبان کارفرما ہے۔ اس موقع پر انگریزی روزنامہ مڈڈے کے اڈیٹر جناب ایاز میمن، انقلاب کے جناب شاہد لطیف، حج کمیٹی کے ایگزیکیٹو افسر جناب شبیہ احمد، ماہنامہ شاعر کے مدیر جناب افتخار امام صدیقی، جناب علی ایم شمشی وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"دھوادھواں منظر کا اجراء"

گجرات کے شہر بڑودہ میں مشہور شاعر ایڈوکیٹ کریم خان ساز کا اولین شعری مجموعہ "دھواں دھواں منظر" کی رسم رونمائی ۱۰؍اپریل ۹۹ء کو گجرات اقلیتی بورڈ کے چیرمین جناب غنی قریشی کے ہاتھوں ہوئی۔ جلسے میں متعدد ادیبوں اور شاعروں نے کریم خاں ساز کی ادبی خدمات پر اظہار خیال کیا۔ کہنہ مشق بزرگ شاعر جناب جمال قریشی کی صدارت میں اثر صبوحی کی نظامت نے جلسے میں چار چاند لگادیے۔

خدابخش ذاکر صاحب کی حیات وخدمات پر سہ روزہ سمینار کی روداد

خدابخش لائبریری پٹنہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر ذاکر حسین حیات وخدمات کے موضوع پر ۲۹ سے ۳۱؍مئی ۱۹۹۹ء تک کل ہند سمنار منعقد ہوا۔ سمنار کا افتتاح ال ان مشرا انسٹی ٹیوٹ پٹنہ کے اڈیٹوریم میں گورنر بہار بی ام لال نے کیا۔ حبیب الرحمٰن چغانی ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے مہمانان خصوصی، مندوبین وحاضرین جلسہ کا استقبال کیا اور خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ گورنر بہار نے خطبہ افتتاحیہ پیش کیا گورنر کرناٹک خورشید عالم خاں نے بھی اپنا خطبہ پیش کیا۔ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی سابق گورنر بہار و بنگال نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ افتتاحی جلسے میں ڈاکٹر محمود الرحمان وائس

چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کلیدی خطبہ ان کی عدم شرکت میں ان کے نمائندہ پروفیسر فرحت اللہ خاں نے پیش کیا۔ اس اجلاس میں آنند شنکر مادھون (بانکا)، جسٹس سرور علی (پٹنہ) جناب رادھا نند جھا (سابق اسپیکر بہار اسمبلی) ڈاکٹر نظر احسن (وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی) ڈاکٹر محمد اکرام خاں (دہلی) اور اجمل جامعی (گیا) نے ذاکر صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا، اس جلسے میں خورشید عالم خاں گورنر (کرناٹک) اور ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے ذاکر صاحب سے متعلق خدا بخش لائبریری سے شائع شدہ ت کتابوں کا اجراء کیا جن کے عنوان یں (۱) سیاسیات ومعاشیات (۲) تعلیمات وعلمی ادارے (۳) ہندوستان وممالک غیر (۴) متفرقات (یہ چار جلدیں مجموعہ مقالات ذاکر ہیں) (۵) نقوش ذاکر (۶) ذاکر صاحب کے خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام (۷) ڈاکٹر ذاکر حسین۔ افتتاحی جلسے کے اختتام پر ڈاکٹر سلیم الدین احمد (اسسٹنٹ ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری) نے تمام حاضرین ومندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

مختلف اجلاسوں میں ہندستان کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے مندوبین نے اپنے مقالات پیش کیے مقالات کے بعد مباحثے کا سلسلہ بھی جاری رہا، ذاکر صاحب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (پروفیسر ظفر احمد نظامی، دہلی)، ۲۔ ذاکر صاحب اور علی گڑھ (ڈاکٹر عبد الباری، علی گڑھ) ۳۔ ذاکر حسین اور انجمن ترقی اردو (ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی) ۴۔ ذاکر صاحب اور علی گڑھ (جناب خوشید رضوی، دہلی) ۵۔ ذاکر صاحب اور طبیہ کالج علی گڑھ (پروفیسر حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی علی گڑھ)، ۶۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور دارالمصنفین (جناب ضیاء الدین اصلاحی، اعظم گڑھ) ۷۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور بہار (جناب شفیع مشہدی، پٹنہ) ۸۔ ذاکر صاحب اور بیر نگر (جناب اکمل یزدانی، پورنیہ)، ۹۔ ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار (ڈاکٹر محی الدین، پٹنہ) ۱۰۔ ذاکر صاحب کا سائنسی مزاج (ڈاکٹر اقبال حسین خاں دہلی)، ۱۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین بحیثیت ماہر تعلیم (ڈاکٹر امتیاز احمد، پٹنہ) ۱۲۔ ذاکر حسین بحیثیت ایک معلم (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، لکھنؤ)، ۱۳۔ ذاکر حسین کا ایک عظیم تعلیمی نظریہ (ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی، علی گڑھ)، ۱۴۔ ذاکر حسین کا تحقیقی مقالہ (پروفیسر ظل الرحمٰن شاہجہاں پور)، ۱۵۔ ذاکر حسین جدید

ذہن کے معمار (ڈاکٹر مسعود عالم قاسمی، علی گڑھ)۔ ۱۶۔ ذاکر حسین سچ اور صدق جدید کے آئینے میں (جناب عبد العلیم قدوائی، علی گڑھ)، ۱۷۔ ذاکر حسین خطبات اور تقاریر کے آئینے میں (ڈاکٹر انجمن آرا انجم، علی گڑھ)، ۱۸۔ ذاکر حسن خطوط کے آئینے میں (حبیب الرحمٰن چغتائی، پٹنہ)، ۱۹۔ ذاکر حسین ایک عہد ساز شخصیت (انیس الرحمٰن قاسمی پھلواری شریف)، ۲۰۔ ذاکر صاحب کے تصور میں اخلاقی تشخص (ڈاکٹر بی علی شیخ، میسور) ۲۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ایک قومی معلم اور مصلح (پروفیسر مجیب اشرف، دہلی)، ۲۲۔ ذاکر صاحب کی انسان دوستی (حکیم اس ظل الرحمٰن، علی گڑھ)، ۲۳۔ رشید احمد صدیقی اور ذاکر صاحب (پروفیسر عبد الحق، دہلی) ۲۴۔ ذاکر صاحب کا تصور مذہب (پروفیسر عمادالحسن آزاد فاروقی، دہلی) ۲۵۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مذہبی رنگ اور آہنگ (ڈاکٹر عتیق الرحمٰن، پٹنہ) ۲۶۔ مرشد ورشید: دو دوست، دو جہت (جناب فرخ جلالی، علی گڑھ)، ۲۷۔ ڈاکٹر ذاکر حسین بحیثیت اچھے ہندستانی اور پکے مسلمان (ڈاکٹر محمد اکرام خاں۔ دہلی)، ۲۸۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کی کہانیاں (ڈاکٹر ارشد اسلم رانچی)، ۲۹۔ رشتہ یہ ایکتا و کاس میں بچوں کی بھومیکا (ڈاکٹر اودم پرکاش پرشاد، پٹنہ)، ڈاکٹر ذاکر حسین چند ذاتی تاثرات (پروفیسر نثار احمد فاروقی، دہلی)

مورخہ ۳۰ مئی کی شب آٹھ بجے ایک شعری نشست کا بھی اہتمام ہوا جس میں مقامی شعرا میں جناب صدیق مجیبی، پروفیسر مہدی علی، جناب سلطان اختر، جناب شفیع مشہدی، جناب ستیہ نارائن، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے علاوہ مندوبین میں محترمہ انجمن آرا انجم اور پروفیسر ظفر احمد نظامی نے اپنے اپنے کلام پیش کیے۔ نظامت جناب شفیع مشہدی نے کی اور صدارت نواب رحمت اللہ خاں شیروانی نے فرمائی۔

سیمنار کے اختتام پر نواب رحمت اللہ خاں شیروانی نے ذاکر صاحب کی یاد میں اپنے چند تاثرات پیش کیے اور فرمایا میں ان سے شاکی ہوں جنھوں نے ذاکر صاحب کو مرد کامل بنا کر پیش کیا ہے، میں ان سے بھی شاکی ہوں جو ذاکر صاحب پر طرح طرح کے اعتراض و تنقید کرتے ہیں۔ ذاکر صاحب بھی ایک انسان تھے ان سے بھی کچھ غلطیاں ہو سکتی ہیں۔

سیمنار کے خاتمے پر جناب حبیب الرحمٰن چغتائی ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے اپنے اختتامی کلمات میں تمام مندوبین و سامعین کا شکریہ ادا کیا اور یہ فرمایا اس سیمنار کی غرض و غایت یہ تھی کہ اپنے محسن و مربی ڈاکٹر ذاکر حسین کو خراج عقیدت

پیش کیا جائے۔ جن کی کوششوں سے اس لائبریری کو قومی ادارے کا رتبہ ملا اور بعض اہم ذخیرے بھی حاصل ہوئے۔ آپ نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ خدا بخش لائبریری سیمنار کے مقالات بھی کتابی صورت میں شائع کیے جائیں گے۔

شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے طلبہ نیٹ میں کامیاب

ممبئی امسال شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے چار طلبہ خان فردوس خان روشنی، نسرین کولہار اور وحید اختر نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تحت ملکی سطح پر ہونے والے ایلیجی بیلٹی ٹیسٹ (NET) میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ امسال ایم فل کی کلاس میں پندرہ طلبہ نے داخلہ لیا ہے جو ایک رکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ظہیر احمد، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

عبداللہ کمال کا نیا پتہ:

11,DARUL FALAH COLONY
KAUSA-MUMBRA
(THANE)400612

....

عطا عابدی کا نیا پتا
مکان نمبر ۱۷/۶، روڈ نمبر ۶
آر بلاک، پٹنہ

پی ایچ ڈی کی سند تفویض

شیخوپورہ (بہار) جناب سید محمد آصف اختر کو تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی بھاگلپور نے ان کے تحقیقی مقالہ "اردو تحقیق اور قاضی عبد الودود" پر پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ انھوں نے ڈاکٹر رضی احمد شاداب کی نگرانی میں مکمل کیا ڈاکٹر خورشید احمد ریڈر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ممتحن تھے۔

نکہت پروین، نکہت

محمد نثار الدین کو ڈاکٹریٹ

جناب محمد نثار الدین ۔ اسسٹنٹ رجسٹرار، بھاگلپور یونیورسٹی، کو بھاگلپور یونیورسٹی نے ان کے مقالہ بعنوان "مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ بحیثیت انشاء پرداز" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ مذکورہ مقالہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، شعبہ اردو، بھاگلپور یونیورسٹی کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے۔ ذی شان فیصل،

سید احمد شمیم پی جی آئی کے جوائنٹ سکریٹری

ممتاز ادیب اور صحافی اور رسالہ "گفتگو" کے ایڈیٹر جناب سید احمد شمیم کو پریس گلڈ آف انڈیا (ممبئی) ۲۰۰۰-۱۹۹۹ کے لیے جوائنٹ سکریٹری منتخب کیا ہے۔ اس سے قبل گزشتہ سات سال تک (۹۹-۱۹۹۲ء) وہ پریس گلڈ آف انڈیا کی بارہ رکنی گورننگ کاؤنسل کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔

کوثر انصاری کی سبکدوشی

ممبئی: کا مارو ڈ ۲ میونسپل اردو اسکول اندھیری (ویسٹ) ممبئی ۵۸ کے ڈپٹی صدر مدرس انصاری محمد یعقوب المعروف کوثر انصاری بحیثیت مثالی معلم اپنی پینتیس سالہ فرائض منصبی کی بحسن وخوبی اور نمایاں انجام دہی کے بعد یکم اگست ۹۹ء کو باعزو وقار سبکدوش ہور ہے ہیں۔

بچوں کے ادب میں خصوصی طور سے اسکولی بچوں کے لیے آپ کی لکھی ہوئی نظمیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ آپ کی طبع فراد منظوم تصانیف "گلدستہ اور" تحفہ" بھی مہاراشٹر و بہار اردو اکادمیوں سے نقد انعامات، توصیفی اسناد و ثرانی کا اعزاز پا چکی ہیں۔

ڈاکٹر محبوب راہی اپنے عہدے سے سبکدوش

مشہور ومعروف شاعر وادیب ڈاکٹر محبوب راہی اپنی اکتالیس سالہ طویل ترین تعلیمی وتدریسی خدمات کی بحسن وخوبی انجام دہی کے بعد یکم جون ۹۹ء کو صدر شعبہ اردو فارسی۔ غلام نبی آزاد آرٹس کامرس کالج بارسی ٹاکلی اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔

ہم بہت دکھی ہیں

حکیم کلب علی شاہد نہیں رہے

امروہہ: امروہہ کے مشہور ومعروف حکیم حاذق کلب علی شاہد ۸ر جون ۹۹ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ طب یونانی میں درک تام رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے بہترین نباض تھے۔ علاج بالعروق یعنی نسوں کے ذریعہ علاج کے موجد ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے جوڑنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ شاعری کے علاوہ ادب وتنقید میں دلچسپی رکھتے تھے۔ لائل پور پاکستان طب یونانی کی ٹریننگ کے زمانے میں انھیں کئی برس علامہ اقبال کی محفلوں میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ان کی ادبی اور طبی خدمات کے اعتراف میں " کلب علی شاہد شخصیت اور فن شائع ہو چکی ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو اعلیٰ جگہ دے اور ان کے بیٹے پرویز اختر راحت کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

حکم چندجی گرگ (بہین والے) نہیں رہے

ہوڈل۔ مکتبہ جامعہ کے بہی خواہ جناب حکم چند جی کا انتقال ۲۳ر جون بروز جمعرات ڈل ضلع فرید آباد میں ہو گیا ان کی آخری رسوم ان کے آبائی مکان اناج منڈی (ہوڈل) میں ۵ر جولائی کو ادا کر دی گئیں۔ موصوف نہایت ملنسار تھے اور ہر ایک سے محبت سے پیش آتے تھے۔ ادارہ کتاب نما موصوف کے انتقال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

عطا عابدی کو گہرا صدمہ

پٹنہ: نہایت ہی افسوس کے ساتھ یہ خبر دی

جاتی ہے کہ ۲؍جولائی ۹۹ء کی شام اردو کے مشہور شاعر عطا عابدی کے چھ سالہ معصوم بیٹے مظفر حسین کا قتل ان کی رہائش گاہ پر ہوگیا۔ مظفر حسین اپنے بھائی بہن کے ساتھ شام ۵ بجے اپنے آنگن میں کھیل رہا تھا۔ وہاں سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے رام کمار کا بیٹا بھی کھیل میں شامل تھا۔ مظفر کی ماں دوا کے لیے باہر گئی ہوئی تھیں۔ دریں اثنا رام کمار گھر میں گھس گیا اور لوہے کی چھڑ مظفر حسین کے سر پر دے ماری جس سے معصوم جائے وقوع پر ہی جاں بحق ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مکتبہ جامعہ عطا عابدی اور ان کی بیگم کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل خانہ کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مشہور شاعر کرشن ادیب نہیں رہے

جالندھر: ڈاکٹر کیول دھیر کی موصولہ اطلاع کے مطابق مشہور معروف شاعر کرشن ادیب کا ۷؍جولائی کو انتقال ہوگیا۔ وہ ۷۴ برس کے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۲۵ میں جالندھر میں ہوئی۔ ساحر لدھیانوی کے دوست اور ہمعصر کرشن ادیب نے اردو غزل کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی غزلیں ممتاز گلوکاروں نے گائیں۔ ساحر لدھیانوی کی سوانح ''ساحر خوابوں کا شہزادہ'' سے کرشن ادیب نے کافی شہرت پائی۔

ایک ماہر تعلیمات کی وفات

جناب خلیل الرب کا، جنھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ تعلیم کی خدمت میں صرف کیا تھا، ۲۳؍جولائی ۱۹۹۹ء کو رات کے ساڑھے نو، پونے دس بجے، اپنے وطن الہ آباد (یوپی) میں اچانک انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم یوپی کے محکمہ تعلیمات سے بحیثیت پی۔ ای۔ ایس ریٹائر ہوئے تھے۔ راقم الحروف بہت عرصہ پہلے، ۱۹۶۶ء میں جب دہلی اردو اکادمی کی طرف سے مشہور معروف اور منفرد کتاب: ''ہندستان کے اردو مصنفین اور شعراء'' مرتب کر رہا تھا تو مرحوم سے زیر تذکرہ کتاب کے لیے اپنے بارے میں ضروری معلومات بھیجنے کے لیے درخواست کی تھی، جس کے جواب میں موصوف حسب ذیل معلومات بھیجنے کی زحمت فرمائی تھی جسے کتاب میں شکریے کے ساتھ شامل کرلیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو:

والد کا نام فضل الرب تاریخ پیدائش:
۹؍فروری ۱۹۱۵ء ضلع الہ آباد (یوپی)
پتہ گل کدہ۔ پھول پور۔ ضلع الہ آباد (یوپی)
تعلیم: ایم۔ اے اردو اور تاریخ (علیگ)
مشاغل ملازمت محکمہ تعلیمات یوپی

تصانیف:

۱۔ مبادیات تنقید سنہ طباعت: ۱۹۴۵ء
۲۔ ادبی شیرازے برائے انٹرمیجیٹ ۱۹۴۷ء
۳۔ ہماری کتاب برائے ہائی اسکول ۴۵ء
۴۔ ادبی سیپارے برائے انٹرمیجیٹ ۴۵ء
۵۔ تعلیم کے مقاصد و وسائل (ترجمہ)
۶۔ تدریس تاریخ۔ مرسلہ: عبداللطیف اعظمی

Regd. with R.N.I. at No 4967/60 AUGUST, 1999
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

ستمبر ۱۹۹۹ء جلد ۳۹ شمارہ ۹

فی پرچہ 8/

سالانہ 60/:

سرکاری تعلیمی اداروں سے 125/

غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک) 500/

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

e-mail: maktaba@ ndf. vsnl. net.in

Tele Cum Fax No (011)-6910191

ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرے کے ذمے دار خود مصنفین ہیں اور کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

وفیات

طنز و مزاح

سفرنامہ

افسانہ

جائزے۔ کھلے خطوط اور ادبی تہذیبی خبریں

نئی مطبوعات

آخری نبیؐ (بچوں کے لیے) حبیب احمد خاں قادری 9/-
فکر و تحقیق (سہ ماہی جولائی تا ستمبر ۹۹) مدیر اعلیٰ محمد حمید اللہ بھٹ فی شمارہ 25/-
غالب نامہ (جولائی ۱۹۹۹ء) مدیر اعلیٰ پروفیسر نذیر احمد 60/-
تلاش غالب (تحقیق) پروفیسر نثار احمد فاروقی 200/-
افکار غالبؔ (غالبیات) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم 200/-
لمعا الناس (شعری مجموعہ) ڈاکٹر راہی فدائی 125/-
کھیل کہاوت (بچوں کے لیے) خالد سعید 35/-
انتخاب کلیات ظفر ڈاکٹر عشرت جہاں ہاشمی 200/-
بے آب سمندر (افسانے) نعیمہ ضیاء الدین 160/-
تشنگی (شعری مجموعہ) قیوم خضر 100/-
تحقیق و تجزیہ (مضامین) وہاب عندلیب 50/-
مجلس مسنون (تحقیق) مرتب پروفیسر آفاق احمد 100/-
مجلس اقبال حصہ ششم (تحقیق) مرتب پروفیسر آفاق احمد 60/-
زمین شعر (شعری مجموعہ) اقبال عمر 150/-
تصویریں اجالوں کی (ادبی شخصیتیں) نور الحسن نقوی 150/-
دوسرا اوبیہ (ادبی مضامین) ایم، خالد 40/-
کہانی کا ارتقاء (فکشن) ڈاکٹر ظہور الدین 300/-
حالات غالب (غالبیات) ڈاکٹر عقیل احمد 300/-
نئی افسانوی تقلید (افسانوی ادب تنقید) مہدی جعفر 125/-
افق کے اس پار (افسانے) نریندر ناتھ کشور 100/-
نیل دھارا (ناول) رام لعل 125/-
دس دن (ناول) درواسا 90/-
شام اودھ (ڈرامے) ڈاکٹر شبیر صدیقی 100/-
مضراب (شعری مجموعہ) محمد مرسلین شیدا 110/-
شکست حرف (شعری مجموعہ) حباب ہاشمی 80/-
سر شام (شعری مجموعہ) رفعت سروش 180/-
مثنوی مناقب خواجہ (شعری مجموعہ) محمد علی لوچ 40/-
تقویٰ کی زندگی کامیابی کی زندگی (مذہب) خرم مراد 8/-
چند لمحات کلام نبوی کی صحبت میں (مذہب) خرم مراد 15/-
ارشادات دانائے کونین (مذہب) طالب الہاشمی 35/-
سفرنامہ آخرات (مذہب) طالب الہاشمی 45/-

سرورق ۔۔۔ ۔۔۔ ابوالفیض سحر

مہمان اداریہ
ابوالفیض سحر
67.G.Pocket Iv Phase. 1
Mayur Vihar Delhi 91

اردو کے مسائل ۔ نئے تناظر میں

ہندستان میں آزادی کے بعد، اردو والوں کو جہاں اور کئی سارے غم ملے وہیں اردو کا غم بھی ملا، اس کے احساس اور اظہار و بیان کا برس ہا برس تک ایک سلسلہ بھی چلا۔ کئی سارے ادارے، جماعتیں اور افراد اس ضمن میں اپنی سوجھ بوجھ، دردمندی اور دانشوری کے مظاہروں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی بھی سعی کرتے رہے خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کی کوششیں بھی ہوئیں مگر جہاں ارادوں میں اخلاص نہ ہو، جہاں جذباتی وابستگی نہ ہو، جہاں فکر وسوچ میں شعور وادراک کی گرمی وحرارت نہ ہو وہاں خام خیالی کی خام کاری کے نتائج بھی گمراہی، تباہی و بربادی کی صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اردو کے سلسلے میں تو ہوئے بھی جس کی ذمے دار اور لوگوں سے کہیں زیادہ خود اردو والے بھی ہیں۔ مگر بعض علاقوں میں بعض مخلص کارکنوں اور بعض اداروں کے دور اندیش ذمہ داروں نے حقیقی معنی میں درد و دانش کے احساسات وجذبات کے ٹھوس اقدامات کو بروے کار لاکر دوررس نتائج کے کام بھی کئے، سستی شہرت صلے، وستایش کی تمنا سے بلند ہوکر، اپنا امیج بنانے کے لیے اہم مواقع کو Self Promotion کی خاطر Steping Stone بنانے کے سیاست آمیز طریقہ کار سے اجتناب کرتے ہوئے۔ چنانچہ ایسے ہی بے غرض محسنین اور بے لاگ مجاہدین نے جو خاموش خدمت کی، جو ٹھوس کام کیے وہی ہماری متاع عزیز ہیں اور وہی ہمار اسرمایہ حیات بھی، تفصیلات کا نہ موقع ہے نہ ضرورت ہی ہے۔ جموں و کشمیر میں اردو سرکاری زبان ہے ہی۔ بہار میں دوسری سرکاری زبان (ابتداً اور عملاً چند اضلاع کے لیے ہی سہی،) آندھرا پردیش میں دوسری سرکاری زبان (ابتداً اور عملاً چند اضلاع کے لیے ہی سہی) کرناٹک اور مہاراشٹر حتی کہ تمل ناڈ میں نسبتاً جو بہتر صورت حال ہے وہ ایسی ہی دردمندی اور دانشوری کی کدو کاوش کا نتیجہ ہے۔ اب ریاست دہلی میں بھی اردو کو

دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ ایک اور خوش آیند علامت ہے غور کریں تو باتیں اور مثالیں بہت ہیں مثلاً اردو کی ایک کتاب بھی چھپتی ہے تو دس خاندان کے روزگار کا سلسلہ بنتا ہے۔ جب دوسری سرکاری زبان کا عملاً پورا رواج ہوگا اور اس سے بڑھ کر خود اردو والے اردو کو اپنی زندگی کا جز بنا لیں تو مجموعی صورت حال کیا سے کیا ہو جائے گی۔ پوری ایک اردو دنیا وجود میں آئے گی اور متحرک ہو جائے گی اور ساری دنیا سے بھی رشتے جڑ سکتے ہیں۔ نئی پرنٹنگ ٹیکنالوجی اور خاص کر کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ Information Technology سے اردو نے جو رشتے قایم کر لیے ہیں وہ اردو زبان اور اردو والوں کو مقامی طور پر ہی نہیں بین اقوامی سطح پر Mass Communication کی ایک نئی دنیا اور فنی معلومات کی ایک نئی زندگی سے روشناس کروائیں گے جس کا کچھ عرصے پہلے تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجموعی حیثیت سے اردو کا حال اور مستقبل، ترقیاتی کاموں اور مستقل مزاج کارکردگی کی انہی بنیادوں پر قائم ہے۔ بلا شبہ، آج اردو ہندستان میں ایک بلند حوصلہ اور ثابت قدم غازی کی طرح اپنے زخموں کو خود سیتے ہوئے، اپنی منزل کی طرف مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک اردو کے ملکی و غیر ملکی Ongion اور Characteristics، رسم الخط اور روٹی روزگار کو لے کر جو جال بچھائے گئے تھے ان میں پھنس کر، قسم قسم کے دردمند اور طرح طرح کے دانشوروں نے اپنی اپنی فکر و بصیرت کے ساتھ زور قلم بھی دکھانے کی کوشش کی اور زور بیان بھی، ان میں ہمارے بعض ترقی پسند دانشور، شاعر ادیب و افسانہ نگار بھی شامل تھے، جنھیں بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سچ ہے کہ حقیقتوں اور صداقتوں کے سورج کی گرمی سے باطل و فرسودہ نظریات برف کی طرح پگھل جاتے ہیں۔ دانستہ یا غیر دانستہ، ایسے غیر مثبت رویے و رجحانات اور خام خیالیاں بخارات بن کر اڑ گئیں اور اب اس سے جڑے ہوئے اردو ذریعہ تعلیم کے سوال سے پھیلائے گئے Confused منفی نظریات کو بھی ترک کر کے، فطری رجحانات و رویوں کے مثبت اقدامات پر زور دینا ہوگا۔ اس سلسلے کے منظر اور پس منظر کو نئی معنویت دیتے ہوئے آزاد قوموں اور آزاد ملتوں کے مزاج اور کردار کے ساتھ پُر وقار انداز میں سر اٹھا کر جینے کی راہیں ہموار کرنی ہوں گی۔ ہر چند کہ جمہوری سماجوں میں آزادی تحریر اور آزادی تقریر دونوں حقوق حاصل ہوتے ہیں مگر کچھ تحریر کرنے سے قبل اور کہیں تقریر کرنے سے پہلے، تحریر یا تقریر کرنے والوں کو حقائق کی کسوٹی پر خود کو پرکھنا چاہیے کہ اس ضمن میں ان

کا کیا کردار رہا ہے، اپنا محاسبہ خود کرنا چاہیے کہ عملاً انھیں کسی ٹھوس خدمت یا تعمیری کام کا تجربہ بھی ہے کہ نہیں۔ اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ واقعی اس قابل ہیں بہ لحاظ سن وسال، بہ اعتبار علم وتجر، بہ لحاظ تجربہ، مشاہدہ ومطالعہ کہ اہم اور نازک اور ساتھ ہی دور رس نتائج مرتب کرنے والے مسائل ومعاملات پر غیر ذمے دارانہ وغیر نمایندگانہ انداز میں سہل نگاری سے کام لیتے ہوئے یا یوں ہی اپنے خیال وفکر کی ناگہانی اپج کے زیر اثر، خامہ فرسائی کریں یا اظہار خیال کریں۔ ورنہ یہ طریقہ کار اردو زبان کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے مترادف ہوگا۔ یہ معاملات ومسائل بہ ظاہر، عام فہم اور عام دلچسپی کے موضوعات لگتے ہیں مگر سیاسی وسماجی اور شہری وآئینی حقوق کی روشنی میں، اپنے مقام اور منصب سے انصاف کرنے کا رویہ اختیار کر کے سوچیں تو یہ مسائل بہت اہم، کافی حد تک نازک اور احتیاط طلب اور پھر مجموعی اعتبار سے، افراد وجماعتوں کے تعلیمی، ثقافتی وتہذیبی امور میں بھی فیصلہ کن، اور تاریخ ساز نوعیت کے حامل ہیں۔ اگر چہ بات کہنے کا حق تو سبھی باشعور شہریوں کو حاصل ہے مگر شئے کی حقیقت کو دیکھنے کی نظر سے دیکھا جائے تو بات اسی کو کہنی چاہیے جو اس کا اہل ہو اور جسے اس کا حق پہنچتا ہو۔

بہر حال، خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ اس سلسلے میں کچھ عرصہ پہلے ہی اجتماعی شعور وآگہی اور بصیرت کے زیر اثر Pragmatic Approach کے ساتھ صحیح فیصلے لیے گئے۔ ابتدائی دور میں غلط فہمیاں تھیں یا سوچی سمجھی سازشوں کے تحت پھیلائے گئے جو Confusions تھے یا جان بوجھ کر پیدا کئے گئے تھے یا جو الجھے ہوئے یا فسطائی ذہنوں کے الجھائے ہوئے مسائل تھے، ان سب پر ملک کے سبھی گوشوں میں حقیقی بصیرتوں سے روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔ جائزوں اور تجزیوں کا مفید سلسلہ بھی جاری رہا۔ اردو اور اردو والوں کے تقریباً سبھی معاملات بالخصوص اردو کے Origin اور اس کے لسانی Characteristics، اس کے رسم الخط وغیرہ کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کا سلسلہ ختم ہوا۔ حتیٰ کہ مخالفین کو بھی سچائیوں کے آئینوں میں اپنی اصلی شکلیں نظر آنے لگیں۔ زبان کو روٹی روزگار اور ملازمتوں جیسے الجھاؤ پیدا کرنے والے امور سے جوڑ کر دیکھنے کی سراب صفت اور مایوس کن روش بھی صحیح رُخ اختیار کرتی گئی۔ کوتاہ بینی کو دُور اندیشی کا زاویہ ملا جو ایسے سیاسی سماجی تہذیبی ثقافتی اور لسانی دائروں کے ساتھ تاریخی اہمیتوں کے مسائل کے ضمن میں ہونا چاہیے لیکن ابھی یہ بات اردو والوں کی تمام صفوں تک پوری طرح نہیں پہنچ پائی ہے۔ ان باتوں کو ملک کے طول وعرض میں صحیح تناظر میں پیش کرنا اور موثر ڈھنگ سے پھیلانا ہے۔ جو فضا مکدر ہو چکی تھی اسے نئے سرے سے صاف وشفاف بنانا ہے تاکہ اردو کے کاز کو تقویت پہنچے اور اردو کا کارواں

پورے اعتماد اور حوصلے سے آگے بڑھتا رہے۔

اردو، مسلمہ اور مصدقہ طور پر ہند آریائی لسانی قبیلے میں جنمی ہندستان کی اس کی اپنی قومی اور عوامی زبان ہے۔ بلالحاظ مذہب وملت اس کے بولنے لکھنے پڑھنے والے کروڑ ہا شہری یہاں آباد ہیں۔ اس کے بھی مسائل کو اپنے قومی حق کے طور پر، ہندستان کی دوسری قومی زبانوں کی طرح ملک کے آئین اور دستور کی روشنی میں، ریاستی، علاقائی اور قومی وملکی سطح پر دیکھنا اور قومی وقار، قومی جذبے اور حوصلے سے ان کے منصفانہ حل تلاش کرنے ہوں گے۔ خواہ کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ ہوں۔ جو حقوق مراعات از روئے آئین حاصل ہیں انھیں پوری طرح حاصل کرنا ہی ہوگا اور ضرورت ہو تو نئی گنجایشوں کے لیے بھی عدلیہ اور انتظامیہ میں راہیں نکالی جانی چاہییں۔ فکر کا عمل کا، اور عوامی وجمہوری جدوجہد کا یہ سلسلہ استقلال وانہماک سے ہر گوشے میں اور ہر سطح پر جاری رہنا چاہیے۔ ذرا سی پریشانی کی بات ہو تو بہت زیادہ پریشان اور مایوس، یا ذرا سی خوشی کی بات ہو تو بہت زیادہ خوش اور جامے سے باہر ہو جانا مناسب نہیں۔ ہر حال میں درد و دانش اور فکر وعمل کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے اور ہمیں اس حقیقت سے پوری طرح باخبر رہنا ہوگا کہ جمہوری سماجوں میں غلط انداز فکر غلط فہمی کا زہر، جدوجہد سے بزدلانہ گریز یا فرار یا مصلحت اندیش سودے بازی، افراد، اداروں اور جماعتوں سب کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے۔ تہذیب وثقافت پوری طرح مسخ ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں پھر مٹ جاتی ہے۔ اور اس راز کو نہ سمجھیں تو داستان بھی نہ ہوگی داستانوں میں والی بات بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس طرح ایک غلط نقطہ نظر یا غلط فیصلہ، خواہ کتنا ہی آسان، خوشنما اور موقعتی طور پر فائدہ بخش کیوں نہ ہو ملکوں قوموں اور ملتوں کی زندگیوں میں دائمی طور پر غلط اور تباہ کن ثابت ہوگا۔ اردو کے حوالے سے اتر پردیش جو کہ ساری دنیا میں اردو بولنے والوں کی سب سے بڑی ریاست ہے اس حقیقت کی اک عبرت ناک مثال ہے۔ رابطہ کمیٹی اور جناب رام لال اور ساتھیوں کی کوششیں بھی ناکام ہو گئیں جو ۲۲ لاکھ دستخطوں کی عظیم عرضداشت کے بعد شروع کی گئیں تھیں۔ ملک زادہ منظور احمد صاحب نے ایک حالیہ ملاقات میں بتایا کہ نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ قبرستانوں میں قبروں کے کتبے بھی اب ہندی میں لکھائے جا رہے ہیں اور کسی ذی شعور آدمی یا جماعت پر اس افسوسناک المیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بے خبری، بے حسی اور بے عملی کی ایسی مثال بھی شاید ہی کہیں ملے گی۔ اس طرح ایک صحیح فیصلہ، خواہ کتنا ہی مشکل حوصلہ شکن اور

دشوار گزار راہوں سے گزر کر کیوں نہ کرنا پڑے ، دیر تک اور دور تک ساتھ دینے والا، فائدہ بخش بلکہ حیات افروز فیصلہ ثابت ہوتا ہے۔ جہاں جہاں اردو کے چراغ جل رہے ہیں۔ وہ سب اس بات کی روشن علامتیں ہیں۔ اس روشنی کو بین الاقوامی سطح پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اقوام متحدہ کے اداروں کے زیر اہتمام کرائے گئے سروے سے یہ بات نمایاں ہوئی ہے کہ اردو اب عالمی سطح کی تیسری بڑی زبان بنتی جا رہی ہے اس طرح آج بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

اس پس منظر کے بیان کرنے کی غایت یہی تھی کہ اب اردو کے نادان دوست مذکورہ بالا معاملات و مسائل پر غیر ضروری طور پر بار بار، اپنی اپنی لہر میں، اظہار خیال کرنے سے گریز کریں تو بہتر ہے کیونکہ انھیں معاملات میں غلطاں و پیچاں رہنا نری ناسمجھی ہے۔ جن موضوعات و مسائل پر حتمی گفتگو ہو چکی ہے ان پر خواہ مخواہ نئے سرے سے پھر فکر و فن، تلاش و جستجو کا مظاہرہ، ناپسندیدہ ہی نہیں بلکہ انتہائی غیر ضروری بھی ہے اور نقصان رساں بھی۔ جو راستہ طے ہو چکا ہے وہ طے ہو چکا ہے۔ اب تو مزید نئے راستے بنانا اور مزید آگے بڑھنا ہے۔ اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ وقت، توجہ اور توانائی کو ضایع کیے بغیر، فکری انتشار اور عملی افراتفری کا شکار ہوئے بغیر، اتحاد فکر و عمل سے صحیح سمت میں پیش قدمی کرنا ہی، احساس ،شعور، بصیرت اور دانشوری کا ثبوت ہوگا۔ تاہم گلوبل (Global) سطح پر انقلابی قسم کی عصری تبدیلیوں پر بجا طور گفتگو ہو سکتی ہے۔ تیکنیکی شعبوں میں تو ہمیشہ ایسی گنجایش ہوتی ہی ہے۔

ادھر حال ہی میں مختلف اخباروں اور مختلف جراید میں، شاید از راہ محبت، اردو کے مسائل کے تعلق سے کئی مضامین، مقالے اور تجزیے شایع ہوتے رہے ہیں۔ بعض امور کا واقعی گہری نظر سے جائزہ لیا گیا اور بعض تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ کچھ باتیں بھی کام کی ہوئی ہیں مگر یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ تحریریں کہیں کہیں Superficial ہیں تو کہیں کہیں Superfluous بھی اور حقائق سے کچھ دور بھی۔ گفتگو کے اس موڑ پر ایک واقعہ کا ذکر کرتا چلوں۔ آج سے تقریباً ۱۰ یا ۱۱ سال پہلے کی بات ہے۔ دہلی میں اردو کے ایک ادارے میں اردو کے مسائل کے عنوان سے منعقدہ ایک مذاکرے میں صدر جلسہ جناب مالک رام (مرحوم) نے کارروائی شروع کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ

”اس اسٹیج پر آکر وہی شخص گفتگو کرے جس کے بچے اردو پڑھتے ہوں۔“

پھر کیا تھا سارے ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سب دانشور ایک دوسرے کے

چہرے کوٹٹول رہے تھے لیکن مجھ سے رہا نہ گیا۔ اٹھا اور اسٹیج پر پہنچ کر حقائق کی طاقت کے بل پر کہا کہ میں اس شرط کی تکمیل کرتا ہوں۔ پھر جو کچھ مجھے عرض کرنا تھا میں نے کیا۔ کس قدر عبرتناک واقعہ ہے، کتنا بڑا المیہ ہے کہ پچاس سال سے ہم لوگ اپنے ڈرائنگ روموں میں یا اس طرح کی چار دیواریوں میں جمع ہو کر بلکہ جمع کیے جا کر، اس طرح کی دردمندی سے اردو کے مسائل کو اس طرح حل کرنا چاہتے ہیں۔ زیادہ محنت کی ایثار و قربانی سے کام لیا تو کہیں کسی رسالے یا اخبار میں مراسلہ لکھ مارا یا کوئی مضمون لکھ دیا اور بس ہوگئی اردو اور اردو والوں کی خدمت۔ کیا کہیں مسائل وہ بھی اردو کے اور پھر آج کے سیاست سے مغلوب ہندستان میں زبانی جمع خرچ سے اس طرح حل کئے جاتے ہیں۔ اس طرح نہ تو کچھ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ یہی انفعالت اردو والوں کا مزاج کردار اور مقدر بن کے رہ گئی۔ ہمارے بیشتر سیمیناروں اور مذاکروں، کانفرنسوں اور کنوینشنوں کا بھی یہی حال ہے۔ بلکہ ایک مثال اور جو ہمارے مسائل کے تعلق سے ہمارے رویہ اور Approach کی حقیقت کو پیش کرتی ہے۔ میں گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کرانے کے کام کا اسپیشل افسر تھا، رپورٹ ابھی پوری طرح عام بھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر ایک مقام پر ایک جوشیلے خادم اردو نے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر ایک مباحثہ منعقد کیا۔ اس کو ایک کانفرنس کی صورت بھی دے دی، میں نے دریافت کیا کہ موصوف نے یا کسی اور صاحب نے رپورٹ دیکھی بھی ہے یا نہیں۔ تو موصوف نے جواب دیا رپورٹ تو کسی نے بھی نہیں دیکھی مگر اخباروں میں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ آتا رہتا ہے۔ وہی سطحی اور Casual Approach۔ وہی خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کی عادت، پھر وہی جھنڈے لے کر کھڑے ہونے کی کوشش کہ ہم یہ ہیں۔ ہم نے یہ کیا اور وہ کیا وغیرہ وغیرہ جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ پوری سنجیدگی اور ذمے داری کے احساس و شعور کے ساتھ اردو کے مسائل کو ان کے پورے سیاق و سباق میں، حاصل شدہ مراعات، مجوزہ سفارشات، آئین اور دستور کے Provisions، سروے رپورٹس اور اعداد و شمار کے Field Work اور ground realities کی روشنی میں دیکھتے ہوئے مخالفت اور مخاصمت کی شدت، گہرائی اور سازشوں کی Bearing اور Range کو بھی سمجھتے ہوئے ان کے مقابلے کے لیے درکار فہم و فراست سچے جذبے اور استقلال و انہماک کے ساتھ مسائل و معاملات کو حل کرنے کے کارگر جتن کئے جاتے۔ بعض دفعہ کوئی چھوٹا کام بھی بڑا کام بن جاتا ہے۔ یہ استثنائی صورتوں میں سے ہے، ورنہ خدمت

تو کسی شوقیہ ترنگ یا وقتی لہر کا نام نہیں بلکہ اس کے لیے تو ایثار وقربانی اور وقف ہو کر بھی لگن سے کام کرنا ضروری ہوتا ہے ۔ یہ جدوجہد انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر بھی اور جہاں جہاں ممکن ہو، ادارہ جاتی پروگراموں کے تحت بھی گلی محلوں ، گاؤں گاؤں، قصبے قصبے، شہر شہر اور ریاستی اور ملکی سطح پر بھی، ہر قسم کے خلفشار اور ٹکراؤ سے مبرا ہو کر جاری رکھی جانی چاہیے، تعلیمی بیداری کے کارواں نکالنے ہوں گے اور کوششوں کے ساتھ گرمائی اسکولوں کے قیام سے بھی اردو تعلیم کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ تعلیم بالغان اور تعلیم نسواں کے پروگرام بنائے جانے چاہییں اور ہو سکے تو اردو میڈیم کے، آئی آئی ٹی طرز کے انسٹیٹیوٹس (Institutes) بھی قائم کرنے ہوں گے۔ اپنے طور پر اور اپنے رفیقوں کو ساتھ لے کر خاص کر دوسری مقامی زبانوں کے دانشوروں اور سماجی کارکنوں وغیرہ کو بھی حسب موقع اور حسب ضرورت ساتھ لے کر آگے بڑھنا چاہیے۔ آپس میں تال میل سے اور خوش دلی سے کاموں کو بانٹ لیا جا سکتا ہے۔ اپنے بارے میں خوش گمانی اور غلط فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر Division of Work اور Specialisation کے طریقے کو اپناتے ہوئے، اہل، کارکرد تجربہ کار اور ایماندار لوگوں کو بھی ساتھ رکھ کر ان کی خدمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مل جل کر کام کرنے Collective Work Culture اور Collective Leadership بھی ابھر کر آ سکتی ہے جو بلا شبہ بہت زیادہ موثر اور مفید ہوگی۔ اس طرح کی جدوجہد اور اس طرح کی مشترکہ تحریک میں انجمن ترقی اردو ہند جس کا دائرہ کار اور بنیادی مقصد بھی یہی ہے اور جس کی سارے ملک میں ٦٠٠ سے زائد شاخیں کام کر رہی ہیں بہت اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ ساتھ ہی قومی کونسل برائے فروغ اردو جیسے دوسرے فعال ادارے اردو اکیڈمیاں اور انجمنیں اپنے تجربات اور اپنے ذرائع ووسائل کے ساتھ، اپنے اپنے علاقوں اور دائروں میں بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ اس طرح مجھے یقین ہے کہ آپسی تال میل سے شخصی اور نظریاتی اختلافات سے اوپر اٹھ کر اردو کے مشترکہ کاز کے لیے میدان عمل کے چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے، ہم خیالی کی طاقت اور اتحاد عمل کی برکتوں کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد سے ایک مشترکہ اردو کی ہمہ گیر ترقی کا قومی منصوبہ بنا کر کے بعد دیگرے اردو کے چھوٹے بڑے مسائل خوش اسلوبی سے حل کیے جا سکتے ہیں اور اردو زبان کی تاریخ میں ایک نئے اور روشن باب کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اقبال کا نظریۂ شعر اور ان کی شاعری

پروفیسر آل احمد سرور

اردو کے ممتاز نقاد اور دانش ور پروفیسر آل احمد سرور کا مایۂ ناز خطبہ جو دہلی یونیورسٹی میں نظام خطبات کے تحت ۷۷-۱۹۷۸ء میں پیش کیا گیا۔ اس خطبے میں سرور صاحب نے اقبال کے نظریۂ شعر کے بارے میں نہایت فکر انگیز خیالات پیش کیے ہیں۔ قیمت-/45

نظام اردو خطبات کا 19 واں خطبہ

داستان امیر حمزہ

شمس الرحمٰن فاروقی

"داستان' زبانی بیانیہ' بیان کنندہ اور سامعین" کے عنوان سے یہ خطبہ اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں پیش کیا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کر دیا ہے۔

قیمت-/60

بازاہیں نیند (ڈرامے)

پروفیسر شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کے ڈراموں کا چوتھا مجموعہ ہے' اس کے ڈرامے جیتی جاگتی آنکھوں کا تجربہ ہیں۔ قیمت-/75

ماضی کے دریچے سے

ڈاکٹر شوکت اللہ

اس کتاب میں شامل زیادہ تر مضامین ان قدیم تاریخی عمارتوں سے تعلق رکھتے ہیں جو اب ہمارے لیے ایک عظیم تاریخی سرمایے کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں' ان میں کچھ عمارتیں World Heritage کی فہرست میں بھی شامل کی جا چکی ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں اور تاریخ کے طلبہ کے لیے ایک نہایت اہم کتاب قیمت:-/75

فکر انسانی کا سفر ارتقا

خواجہ غلام السیدین

نظام اردو خطبات کا آغاز شعبہ اردو ' دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۵ ؍ فروری ۱۹۲۶ء کو ہوا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا اور صدارت ڈاکٹر سی ڈی' دیش مکھ 'وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے فرمائی۔ ملک کے دیدہ ور ماہر تعلیم پروفیسر غلام السیدین نے مندرجہ بالا عنوان پر دو لیکچرز دیے اب اس خطبے کا تیسرا اڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ قیمت-/45

غالب کی شخصیت اور شاعری

رشید احمد صدیقی

یہ نظام اردو خطبات کا چوتھا خطبہ ہے جس کو ملک کے مایۂ ناز طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی نے پیش کیا ہے۔

(تیسرا اڈیشن) قیمت:-/45

شمیم حنفی کی نئی کتاب

قاری سے مکالمہ

فکشن شاعری اور تنقید و تخلیق مضمرات پر مضامین کا مجموعہ۔ قیمت:-/150

اختر سعید خاں
اندرون اتوارہ، بھوپال

غزل

دل شوریدہ کی وحشت نہیں دیکھی جاتی
روز اک سر پہ قیامت نہیں دیکھی جاتی

اب ان آنکھوں میں وہ اگلی سی ندامت بھی نہیں
اب دل زار کی حالت نہیں دیکھی جاتی

بند کردے کوئی ماضی کا دریچہ مجھ پر
اب اس آئینہ میں صورت نہیں دیکھی جاتی

تو کہانی ہی کے پردے میں بھلی لگتی ہے
زندگی تیری حقیقت نہیں دیکھی جاتی

لفظ اس شوخ کا منہ دیکھ کے رہ جاتے ہیں
لب اظہار کی حسرت نہیں دیکھی جاتی

آپ کی رنجش بیجا ہی بہت ہے مجھ کو
دل پہ ہر تازہ مصیبت نہیں دیکھی جاتی

دیکھا جاتا ہے یہاں حوصلہ قطع سفر
نفس چند کی مہلت نہیں دیکھی جاتی

دشمن جاں ہی سہی ساتھ تو اک عمر کا ہے
دل سے اب درد کی رخصت نہیں دیکھی جاتی

دیکھیے جب کوئی مژہ پر ہے اک آنسو اختر
دیدۂ تر کی رفاقت نہیں دیکھی جاتی

پروفیسر شریف حسین قاسمی
شعبۂ فارسی
دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۰۷

جدید فارسی شاعری، ایک مختصر جائزہ

ادبی اور سماجی انقلاب لازم وملزوم ہیں۔ جب کبھی انسان اپنے ماحول اور حالات سے ناامید ہوکر سماجی انقلاب یا سیاسی تبدیلیوں کا خواہاں ہوتا ہے، تو ادب ان انقلابی رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، بلکہ ان کا عکاس ہوتا ہے اور بعض اوقات ان رجحانات کی راہنمائی کرتا ہے۔

غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں ایرانی ادب میں جو تحول، تبدیلی اور انقلاب رونما ہونے کے آثار نظر آتے ہیں، وہ محض ادب کے بارے میں نئے افکار وخیالات کا نتیجہ نہیں تھے، بلکہ نئے سماجی افکار وخیالات، مشروطیت (پارلیمانی حکومت) کی تحریک اور اس کے نتیجے میں زندگی کے ہر میدان میں انقلاب، تبدیلی اور تجدد کی خواہش، فارسی ادب میں جدید رجحانات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

ایران میں انیسویں صدی کے اوائل سے سیاسی اور سماجی بے چینی اور بے اطمینانی رونما ہوتی ہے۔ مغرب کے سیاسی، تمدنی اور تہذیبی اثرات اور کچھ دوسرے داخلی عوامل کی وجہ سے، ایرانی جوان نسل اور تعلیم یافتہ حلقے کے دل ودماغ میں ایک قسم کی بیداری کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔ یہ لوگ بہ تدریج، ایرانی زندگی، سماج، سیاست اور معاصر حکام سے بیزار ہوجاتے ہیں۔ ایرانی زندگی کے ہر میدان میں جو ایک صدیوں پرانا جمود واقع تھا، ان کے لیے روح فرسا ثابت ہوتا ہے اور یہ طبقہ اس جمود کے خلاف صف آرا ہوجاتا ہے۔

حکومت وقت سے اختلاف شروع ہوتا ہے۔ یہ اختلاف کچھ اس طرح رونما ہوتا ہے کہ حکومت بھی اس طبقے کے وجود کی قائل ہوجاتی ہے۔ سماجی انقلاب کی خواہش، سیاسی تبدیلیوں کی ضرورت کو اپنے دامن میں پناہ دئے، آہستہ آہستہ زور پکڑتی رہتی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے وسط یعنی ناصرالدین شاہ قاچار کی حکومت کے ابتدائی

دور (۱۲۶۲/۱۸۴۸) میں روزنامہ نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ پہلے دربار میں اور پھر عوام کے لیے شروع ہوتا ہے۔ میرزا تقی امیر کبیر تہران میں دارالفنون (پالی ٹکنک) کھولتے ہیں۔ اس کالج میں باہر کے، خاص طور پر یورپ کے اساتذہ اپنے ایرانی شاگردوں کی مدد سے لغات ترتیب دیتے ہیں۔ سائنس، فنون، صنعت وحرفت، اور فوجی امور سے متعلق کتابوں کے فارسی میں تراجم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، اس کالج سے باہر بھی، متعدد تاریخی اور افسانوی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا جاتا ہے اور مترجم، بغیر سوچے سمجھے، نسبتاً سادہ اور بے تکلف زبان میں کتابوں کے ترجمے کرتے ہیں۔

انقلاب کے حامی لوگوں کے پاس اپنے افکار وخیالات کو پھیلانے کا ایک ذریعہ، اخبار ورسائل بھی تھے۔ خاص طور پر وہ اخبار جو ایران سے باہر شائع ہوتے، عام بیداری کے لیے کوشش کرتے۔ مختلف زبانوں سے فارسی میں تراجم، اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین اور ایران سے باہر ترکی، مصر، روس، انگلستان وغیرہ میں مقیم ایرانیوں کی تالیفات جو ایران بھیجی جاتی تھیں، مغرب کے نئے سماجی اور سیاسی افکار سے پُر ہوتی تھیں۔ اور ایرانیوں کے لیے خود اپنے ملک میں سماجی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے میں ان کی مددگار ثابت ہوتیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر سے بیسویں صدی کے اوائل تک مرزا عبدالحسین معروف بہ میرزا آقا خان کرمانی (۱۸۰۳۔۱۸۹۷ء) مرزا حبیب اصفہانی (م ۱۸۹۷ء)، شیخ احمد روحی (۱۸۰۰۔۱۸۹۷)، پرنس ملکم خان ارمنی (۱۸۳۳۔۱۹۰۸) وغیرہ نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تالیف کیں اور ایرانی فکر کو نئی راہوں سے روشناس کرایا۔

ایران میں انقلاب پسندوں نے قدامت پسندی کے ہر مظہر کے خلاف تحریک چلائی اور اپنی ترقی پسندی اور نیا ایران بنانے کے پروگرام کو انتہائی موثر طریقے اور شدید لب ولہجے میں ملک کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔

اس سماجی اور سیاسی تحریک میں ایک عنصر جس پر شدت سے تنقید کی گئی، فارسی ادب ہے۔ فارسی ادب اپنی قدیم شکل وصورت اور طرز وانداز سے قدامت کا ایک عامل بن کر سامنے آیا۔ یہ بھی بجا طور پر محسوس کیا گیا کہ فارسی ادب کے بیشتر حصے کا مقصد محض حکومت کی خدمت کرنا ہے۔ خاص طور پر شاعری یا تو صرف جھوٹ بے بنیاد اور اغراق آمیز خیالات کا پلندہ ہے اور یا پھر تفریح طبع اور شخصی تجمل کا ایک ذریعہ۔ شاعری بے حال ہے۔ اس میں متحرک اور فعال زندگی کی ایک رمق بھی نہیں۔ شعرا اپنی روزی کمانے کے لیے شعر

کہتے ہیں اور تعمیر و تکمیل انسانی کا شائبہ بھی ان کے ذہن ودماغ میں نہیں آتا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب قاآنی (۱۸۰۸۔ ۱۸۹۳ء)، مرزا محمد علی سروش اصفہانی (۱۸۱۳۔۱۸۶۸ء)، محمود خان ملک الشعرا (۱۸۱۳۔۱۸۹۳ء)، وغیرہ ایرانی شعروشاعری کے افق کے درخشندہ ستارے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو ایرانی شاعری کے سفید وسیاہ کے مالک تھے۔ انھوں نے خود "سبک ہندی" کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور سب سے قدیم فارسی طرزِ شاعری یعنی سبکِ خراسانی کا احیا کیا تھا۔ ان شعرا کی کوششوں کے نتیجے میں جو طرز شاعری وجود میں آیا، اسے سبک "بازگشت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسے ادبی دور میں میرزا آقا خان کرمانی نے اس زمانے کی روایتی شاعری کے خلاف آواز بلند کی۔ میرزا کرمانی نے ایرانی شاعری میں تبدیلی اور تحول کی ضرورت پر زور دیا۔ روایتی شاعری پر بیبا کی اور شدید لب ولہجے میں تنقید کی۔ اپنے دور کے شعرا کو دروغ گو اور چاپلوس اشخاص کا ایک گروہ بتایا اور ایسے شعرا کے وجود کو نہ صرف بے فائدہ اور لغو جانا، بلکہ انھیں سماج اور ملک دشمن قرار دیا۔[۳]

میرزا آقا خان کرمانی نے، قاآنی کی شاعری کو بے بنیاد اور بے ارزش "اغراق گوئی" کا مجموعہ بتایا اور حتی یہ کہ اپنے چند اشعار میں، جو ناصر الدین شاہ قاچار کو خطاب کیے گئے ہیں، درباری شاعروں کا مذاق اڑایا۔ ان پر لعن طعن کی اور انھیں چاپلوس اور افترا پرداز اشخاص کا ایک گروہ ٹھہرایا ہے:

من این شاعران را نگیرم بہ چیز   نیرزد بہ من شعرِ شان یک پشیز
کہ تاب وتوان از سخن بردہ اند   یکی سفرۂ چرب گستردہ اند
گر این چاپلوسان بنودی بہ دھر   نمی گشت شیرین بہ کام تو زہر
تو کلک سیاسی کجا دیدہ ای   کہ بانگِ چنان خامہ نشنیدہ ای
مرا از شمار دگر کس مگیر   تو سیمرغ را ہچو کرگس مگیر۔[۴]

میرزا آقا خان کرمانی نے تو سارے مشرق میں رائج طرز شاعری پر اعتراض کیا ہے۔ مشرقی شاعری ان کی نظر میں اصلاح قوم کے بجائے "اخلاقی فساد وابتری" کا موجب ہوتی ہے:

شعروشاعری در مشرق زمین صورت بدی کسب کردہ و بہ جای اصلاح، موجب فسادِ اخلاقِ ایشان است۔[۵]

میرزا ملکم خان ایک دوسرے ناقد ہیں جنھوں نے اپنے دور کی شاعرانہ روایات کا

مذاق اڑایا۔ یہ بھی میرزا آقا خان کرمانی کی طرح اپنے ہم عصر شعرا کو چاپلوس اور افترا پردازوں کا ایک ایسا گروہ بتاتے ہیں، جن کا کام قافیہ بندی اور مغلق الفاظوں کے استعمال کے کرتب دکھانا ہے۔ میرزا ملکم خان کا عقیدہ ہے کہ شعرا اپنے اقوال وافکار میں بھی معنویت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور اپنی تمام عمر محض مغلق الفاظ کے ساتھ کھیل کرنے میں گزار دیتے ہیں۔[6]

حاجی زین العابدین مراغہ ای (۱۸۳۷ء-۱۹۱۰ء) کا شمار بھی انیسویں صدی عیسوی کے اوائل کے ان روشن فکر ایرانی اشخاص میں ہوتا ہے جو اپنے ملک وقوم کی بہبودی کے لیے کوششوں میں پورے خلوص اور توجہ سے منہمک رہے۔ زین العابدین کے افکار وعقائد سے پتا چلتا ہے کہ یہ اپنے زمانے کی ایجادات سے بہت متاثر تھے۔ نئی نئی صنعتوں کو ملک وقوم کی ترقی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ مکمل طور پر ایک مختلف اور ترقی یافتہ دور میں، پرانی فرسودہ اور روایتی باتیں کرنا، ان کے نزدیک مضحکہ خیز تھا۔ ان کا ترقی پسند ذہن انھیں ملک وقوم کے ہمدرد انسان کی حیثیت سے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے علما ادبا اور شعرا کو اپنے عصری تقاضوں کو سمجھنے، ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے اور مختلف ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کی ضرورت کا احساس دلائیں۔ انھوں نے اپنے دور کے روایت پسند اور قدامت پرست شعرا کو لعنت ملامت کی۔ ان کا خیال ہے کہ ابھی تک شاعر ایک "فرعون صفت اور نمرود ش" کی تعریف وتوصیف بیجا میں مصروف ہے۔

اب تار زلف وسنبل کا کل" کا بازار سرد اور بال سے باریک کمر کا تصور پارینہ ہو چکا ہے۔ ابروؤں کی کمان ٹوٹ چکی اور چشمان آہو اس کے خوف سے نجات پا چکے۔ اب خال لب کے بجائے کوئلے کی بات کرو، سرو وشمشاد کی مانند قد وقامت کا ذکر چھوڑ دو، مازندران کے جنگلوں میں پائے جانے والے اخروٹ اور صنوبر کے درختوں کے ترانے گاؤ، سیمین بر محبوباؤں کے دامن سے ہاتھ کھینچ لو اور چاندی اور لوہے کی کانوں کے سینے پر طاقت آزمائی کرو۔ عیش وعشرت کی بساط الٹ دو اور قالین بافی کی ملی اور ملکی صنعت کو فروغ دو۔ گلزار کے عندلیب کا نغمہ اب کارآمد نہیں، ریل کی سیٹی سے سروکار ہے، اسی کی بات کرو شمع وپروانہ کی باتیں پرانی ہو چکیں، اب بجلی کے قمقموں اور کافوری شمع کا دور دورہ ہے۔ اسی کو موضوع سخن بناؤ۔ شیریں لب معشوقوں کو بیماروں کے حوالے کر دو اور آؤ چقندر کی تعریف میں راگ الاپو، اس لیے کہ اسی سے ہمیں شکر ملتی ہے۔[7]

اس دور کے ان روشن فکر اشخاص نے اپنی معاصر شاعری کی عیب جوئی اور اس پر

محض اعتراض ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس شعر شاعری کی خصوصیات اور لوازمات پر بھی اظہار خیال کیا، جس کی اس وقت ضرورت سمجھی گئی۔ اس کے علاوہ چند اچھے اشعار کے نمونے بھی پیش کیے۔

[illegible] فتح علی آخوند زادہ (م ۱۸۷۸ء) نے شاعری کو عبارت سمجھا ایسے مطالب [illegible] حسن مضمون وحسن الفاظ یا حسن بیان ہو۔۸ ان کے نزدیک حقیقی احساسات کے بیان کا نام ہی شاعری ہے۔ میرزا آقا خان کرمانی یورپ کی طرز شاعری سے متاثر ہیں۔ اسی کی پیروی کرنا اور اسی کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعری فکر کو تنویر بخشنے، خرافات کو دور کرنے، لوگوں کے ذہن ودماغ کو بصیرت عطا کرنے، غافلوں کو متنبہ کرنے، نااہلوں کی تربیت کرنے، جہلا کو ڈرانے دھمکانے، لوگوں کو رذائل سے پرہیز کرانے اور پاکی قلب وغیرہ فضیلتوں کی طرف تشویق دلانے اور حب الوطنی کا وسیلہ ہے۔۹

حاجی زین العابدین مراغہ ای نے بھی شاعری کی نئی سمتوں کا تعین کیا ہے۔ لیلیٰ مجنوں، شیرین فرہاد اور محمود وایاز کے عاشقانہ قصے جو ایرانی شعرا اور ادبا میں بہت رائج تھے، ان کی نظر میں فرسودہ ہو چکے تھے۔ ان میں اب دلکشی باقی نہیں رہی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کہ موجودہ زمانے کے دوسرے المناک واقعات کے بیان کی ضرورت ہے جن کا تعلق عام انسان کی زندگی سے ہو۔۱۰ وہ سادہ نویسی پر زور دیتے ہیں۔ وہ ایسی زبان اور ایسے انداز بیان کی تبلیغ کرتے ہیں جو خاص وعام کے لیے ہو۔ ہر شخص اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہو۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل کے ساتھ ہی ایران میں درباری شاعری کا تقریباً خاتمہ ہو جاتا ہے۔۱۱ اس قاچاری بادشاہ کے قتل کے بعد چند انقلابی قتل کر دیے جاتے ہیں جن کا خون رنگ لاتا ہے۔ ایران کے گوشے گوشے میں مشروطیت اور آزادی کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہ تدریج بڑھنے لگتی ہے جو ایرانی زندگی اور ایرانی مملکت کی سرنوشت سے تعلق کا اظہار کرتے ہیں، اپنے وطن اور ہم وطنوں کے سلسلے میں ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں۔ جوان شعرا بھی آہستہ آہستہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ اب شاعری کو گوناگون مضامین میں، نئے ارادے اور جدید عزائم کے اظہار کا ذریعہ بننا چاہیے۔ اب عام شعرا روشن فکر شعرا کی جدوجہد اور وقتی مصلحتوں کی وجہ سے، عوامی شعرا کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان تمام عوامل کا نتیجہ ہے کہ ۱۹۰۱ء میں میرزا محمد صادق امیری ملقب بہ ادیب الممالک فراہانی جو ایک قصیدہ گو شاعر ہے، اپنی بنیادی روش کو ایک نیا روپ دیتا ہے۔ وہ بے بنیاد مدح سرائی کو خیر آباد کہتا ہے اور وطن کے

گیت گانے پر اصرار کرتا ہے:

گر ہوای سخن بود بہ سرت از وطن بعد ازین سخن گو باز
ہوسِ عشق بازی اردار ی باوطن ہم قمار عشق بباز
شاہد شوخ ودلفریب وطن بارقیب خطر شدہ د مساز

مظفر الدین شاہ کے دور میں پانچ اگست ۱۹۰۶ء کو ایرانیوں کی آرزو پوری ہوئی۔ مشروطیت کی منظوری دے دی گئی جسے ۱۹۵۸ء میں پھر برطرف کر دیا گیا۔ اب ایران گیر تحریک شروع ہوئی۔ لوگوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ نئے ارمان جاگے۔ نئی امنگیں پیدا ہوئیں۔ مشروطیت اور آزادی کی خواہش نے سارے ایران میں ایک نئی زندگی اور ایک نئے جذبے کو جنم دیا۔ ہر ایرانی آزادی خواہی اور مشروطیت کی خواہش سے سرشار نظر آنے لگا۔ اب ہر جگہ اور ہر انداز سے "وطن اور ہم وطن" ایرانی شاعر کا موضوع بحث ہے ۔ وطن کے لیے" اس کی عظمت اور وقار و ناموس کی حفاظت کے لیے ہر ایرانی شاعر، سر سے کفن باندھے، میدان کارزار میں اتر آیا۔

میرزا علی اکبر خاں دہخدا (۱۸۰۹۔ ۱۹۵۶ء) اشرف الدین نسیم شمال (۱۸۷۰۔ ۱۹۲۳ء) ملک الشعرا بہار (۱۸۸۶۔ ۱۹۵۱ء)، ابوالقاسم عارف قزوینی، ابوالقاسم لاھوتی (۱۸۸۷۔ ۱۹۵۷) وغیرہ ایسے ایرانی شعرا ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کو وطن کے لیے وقف کر دیا۔ شاعر، مصلح قوم بن جاتا ہے۔ ہر شاعر کا روی سخن، ایرانی عوام ہیں، گویا اب شاعر و شاعری نے نئے مخاطب تلاش کر لیے تھے وہ دربار کی محدود فضا سے باہر آ گئے تھے۔ اب شاعر عام فہم زبان استعمال کرتا ہے چونکہ اس کے مخاطب بھی عوام الناس ہیں۔

اب شاعری کی کسی خاص شکل وصورت یعنی صنف سخن پر اصرار نہیں کیا جاتا۔ بعض ہیجان انگیز اور موثر قالب شعر (اصناف سخن) کو ذریعۂ اظہار بنایا جاتا ہے۔ مثلاً مستزاد، مسمط، ترجیعات وغیرہ کا از سر نو رواج ہوتا ہے۔ تصنیف[12] (Belled) اور سرود[13] دوسری اصناف سخن ہیں، جو اس دور کے شعرا کی توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ مختصر یہ کہ جدید فارسی ادب، خاص طور پر شاعری، مشروطیت کے لیے جدوجہد اور اس کی وجہ سے رونما ہونے والے سیاسی اور سماجی حالات کی دین ہے۔ شعرا اس امر کی طرف توجہ دیتے ہیں کہ مدح، غزل اور محض قدرتی مناظر وغیرہ کی تعریف وتوصیف ترک کر دیں۔ ان کے کلام میں سماجی اور سیاسی چپقلش، اس کے نتائج اور ان حالات میں ایرانی عوام کی ذمہ داری منعکس ہو۔ اس وجہ سے فارسی شاعری نئی راہیں تلاش کرتی ہے۔ اپنے لیے نئی منزلوں کا تعین کرتی

ہے۔ مضمون شعر میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ زبان میں تبدیلی رونما ہوتی ہے، مقاصد شعر اور شاعر تبدیل ہوتے ہیں۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ سماجی انقلاب اور سیاسی تحریک کے اس طوفانی دور میں بھی، ایران میں ایسے شعرا موجود تھے جو حالات سے متاثر نہیں ہوئے۔ کچھ تو دور دراز علاقوں میں رہتے تھے' جہاں اس انقلابی دور کے تقاضے اور اس کے نتائج وغیرہ اثر نہ ڈال سکے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے ادبی عقائد ونظریات سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی پرانی ڈگر پر چلتے رہے۔ اس وجہ سے فارسی شاعری میں نئے رجحانات کے حامیوں اور اس کے مخالفین کے درمیان ایک خلا پیدا ہو گیا۔ یہی خلیج آگے چل کر ان شدید ادبی مباحث کی وجہ بنتی ہے جو قدیم شاعری کے طرفداروں اور جدید شاعری کے حامیوں کے درمیان عرصۂ دراز تک جاری رہیں۔ ۱۹۱۶ء میں "انجمن ادبی دانشکدہ" کا قیام عمل میں آتا ہے اس انجمن نے مجلّہ دانشکدہ کا اجراء بھی کیا اور اس میں اپنے مقاصد کا اعلان کیا کہ:

"جدید اسلوب اور موجودہ دور کی عمومی ضروریات کی رعایت سے، قدیم اساتذ شعر وادب کے اسلوب وطرزِ بیان کے احترام کے ساتھ، ادبیات ایران کے طرز وروّیہ پر تجدید کی جائے گی۔"

اس انجمن کے ممبران قدیم شعرا کے طرز واسلوب کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ معتقد ہیں کہ تبدیلی اور انقلاب، شعر وادب میں رونما ہو، لیکن یہ انقلاب اور تبدیلی قدیم اساتذ سخن سے ہمارا رشتہ منقطع نہ کردے اور جو بھی تبدیلی عمل میں آئے، بہ تدریج عمل میں آئے۔ انجمن کا یہ معتدل اور معقول روّیہ مخالف گروہ کو پسند نہیں آیا۔ اس گروہ کے ایک فعال رکن نے اپنی ناامیدی کا اس طرح اظہار کیا کہ: ہنوز طوفانی دربتہ ودات نوجوانان تہران، بر نخاستہ (ابھی تہران کے جوان، ادبی انقلاب کے لیے آمادہ نہیں ہوئے ہیں)

بہر حال اس دور کی شاعری کی خصوصیات کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ دور چونکہ سیاسی اور سماجی انقلاب کا دور ہے، اس لیے شاعری، حب الوطنی اور رزمیہ افکار سے پر ہے۔ شاعری میں سیاسی رنگ، سماجی اور تنقیدی عوامل، زبان وبیان کی سادگی، سلاست، وروانی ایسی خصوصیات ہیں جو اس دور کی شاعری کو قدیم شاعری سے ممتاز کرتی ہیں۔

اس دور کے بیشتر شعرا کے اسلوب کو آنے والے دور کے شعرا کے اسلوب سے مشخص کرنے کے لیے، "جدید فارسی شاعری" کا عنوان دیا جاتا ہے۔ اور اسے ایرانی شعرا کی بیداری کا دور بھی کہا جاتا ہے۔

اس مختصر تجزیے سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ جدید فارسی شاعری میں ابھی صرف نئے مضامین، جدید اسلوب بیان اور نئی زبان پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی۔ ابھی اس کی شکل وصورت، خدوخال یا اس کے قالب (ہیئت) وغیرہ میں مجتہدانہ تبدیلی اور ترمیم کی سنجیدہ اور اجتماعی کوشش عمل میں نہیں آئی۔

۱۹۱۶ سے ۱۹۲۱ تک کے عرصے میں نیما یوشیج فارسی شاعری کے افق پر نمودار ہوتے ہیں۔ اپنی مشہور نظم "قصہ رُنگ پریدہ" لکھتے ہیں۔ جعفر خامنہ ای، میرزادہ عشقی اور خانم کسمائی فارسی شاعری میں مزید بنیادی تبدیلیوں کی بحث میں شامل ہو جاتے ہیں اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ شعرا ہیں جو فارسی شاعری کو نئی سمتوں اور جدید افکار وخیالات سے حقیقی طور پر آشنا کرتے ہیں۔ موضوع شعر اور اس کی شکل وصورت کے سلسلے میں نئے تجربے کرتے ہیں۔

جعفر خامنہ ای نے غالباً پہلی بار چہار پارہ کی شکل میں شعر کہے جو شکل وصورت اور زبان واسلوب کے لحاظ سے بالکل نئے اور بے سابقہ تھے۔ اڈورڈ براؤن نے اپنی کتاب "ایرانی شاعری اور روزنامہ نگاری" میں جعفر خامنہ ای کا ایک مختصر قطعہ "بہ وطن" کے عنوان سے شامل کیا اور لکھا ہے کہ یہ قطعہ قالب وشکل وصورت کے لحاظ سے قابلِ توجہ ہے اور اسلوب بیان او. طرز شاعری کے لحاظ سے اس قطعہ میں متقدم شعرا کی طرز وروش سے انحراف کیا گیا ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے:

ہر روز بہ یک منظر خونین بہ در آیی
ہر دم متجلی تو، بہ یک جلوهٔ جان سوز
از سوز غمت مرغ دلم ہر شب وہر روز
با نغمۂ نو، تازہ کند نوحہ سرایی

اسی دور کے دوسرے شاعر عشقی، میرزادہ کے ایک قطعے "برگِ باد بردہ" کا ایک بند یہ ہے، جس میں شکل وصورت کے لحاظ سے نیا پن موجود ہے:

بہ گردش بر کنار بوسفور، اندر مرغزاری
رهم افتاد دیروز
چہ نیکو مرغزاری، طرف دریا در کناری
نگاهش دیده افروز
درختان را حریر سبز بر سر

زمین را از زمرد جامہ دربر
بہ ھر سو با گلی، راز
نمودہ مرغی آغاز

اس کے بعد خانم شمس کسمایی نے اپنی نوعیت کا ایک انوکھا قطعہ شائع کیا۔ شاید یہ پہلی کوشش تھی جس میں نہ وزن تھا اور نہ قافیہ یہ قطعہ اگر چہ یورپ کے کسی شعری اسلوب کی تقلید ہے، لیکن فارسی شاعری میں انقلاب کی روح کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس قطعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی شاعر کے ارادے کیا تھے، اس کی منزل کیا تھی اور وہ فارسی شعر کی شکل وصورت کے بارے میں کس انداز سے سوچ رہا تھا، قطعہ یہ ہے:

زبسیاری آتش مھر و ناز و نوازش
ازین شدت گرمی و روشنایی و تابش
گلستان فکرم
خراب و پریشان شد افسوس
چو گلہای افسردہ افکار بکرم
صفا و طراوت ز کف دادہ، گشتند مایوس

اس کے دو سال بعد ۱۹۲۳ء میں نیما یوشیج نے اپنی جدید نظم "افسانہ" لکھی۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ جدید فارسی شاعری کو انقلاب، تبدیلی اور تجدّد کے میدانوں میں حقیقی رہنمائی میسر آئی۔ یہ نظم۔ بحث مُباحثے کا موضوع بنی۔ اسی بحث ومباحثے کے بطن سے شعر نو نے جنم لیا۔ نیما یوشیج کو شعر نو کا بانی کہتے ہیں۔ نیما نے نہ صرف قدیم فارسی شاعری کی ماہیت، اس کی شکل وصورت اور اس کے قواعد وضوابط سے انحراف کیا بلکہ شعر نو کا مکمل ضابطہ عمل تیار کیا اور اسی کے مطابق شاعری کی اور اس کے مکمل ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔

شعر نو کے بارے میں نیما یوشیج نے جو بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

نیما وزن کے قایل ہیں۔ شعر کے لیے وزن لازمی جزو ہے۔ قافیہ لازمی نہیں۔ اگر نئے خیالات کو اور نئی فکری دریافت کو نئے اسلوب بیان کے ساتھ بیان کرنے میں قافیہ کا اہتمام ہوجائے تو نامناسب نہیں۔ ہاں، شعر نو آج کی زندگی کی واقعیت اور حقیقت کا بیان ہونا چاہیے۔ اس بیان زندگی میں اس کی ضرورت ہے کہ نئے افکار وخیالات اور موجودہ نسل کی پریشانیاں، مسرتیں، سرگردانیاں، ہیجانات، اطمنان وغیرہ کو جگہ دی جائے۔ ان تمام لوازمات کو مہیا کرنے کے لیے، شاعر اس کا مجاز ہے کہ جہاں کہیں قدیم اور کلاسیکی

شاعری کے قید و بند اور قواعد، اس کے راستے میں مانع ہوں اور اس کو آگے بڑھنے سے روکیں تو وہ ان اصولوں میں ترمیم کر سکتا ہے۔ شعر نو کا تقاضا ہے کہ قدیم اصول وضوابط کو شاعری کی آسانی اور اس کے فکری ارتقاء کی تکمیل پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ شعر نو اور قدیم فارسی شاعری میں یہ فرق سب سے زیادہ محسوس ہوتا ہے کہ جدید فارسی میں دو مصرعوں کے وزن کا برابر ہونا لازمی نہیں، لیکن یہ دو مصرے وزن کی رو سے مساوی نہ سہی، البتہ دونوں کسی نہ کسی ایک بحر اور وزن کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً امید کا یہ شعر:

دو تا کفتر

نشستہ اندر روی شاخۂ سدر کہنسالی

یہ دونوں مصرے بحر ہزج میں ہیں، لیکن پہلے مصرے میں صرف ایک مفاعلین کے برابر الفاظ ہیں جبکہ دوسرے مصرے میں مفاعیلن چار بار آتا ہے۔

منوچہر شیبانی، احمد شاملو، مہدی اخوان ثالث (م۔ امید) منوچہر آتشی، فروغ فرخزاد، محمود آزاد، محمد علی سپانلو، سہراب سپہری، ید اللہ رویائی وغیرہ چند وہ معروف شعرا ہیں جنھوں نے نیما کی پیروی کی اور مکتب نیما کو وسعت دینے کی کوشش کی۔

اس میں شک نہیں کہ نیما یوشیج کی کوششیں بار آور ہوئیں اور شعر نو ایک کامیاب تحریک کے طور پر ایران میں نہ صرف مقبول ہوا بلکہ متعدد شعرا نے نیما یوشیج کی پیروی کی، اس کے باوجود، نیما کے پیروکاروں میں چند ایسے شعرا بھی شامل تھے جو نیما کی بتائی ہوئی راہ کو صحیح اور حقیقی طور پر سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے بزعم خود نیما کی پیروی کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان شعرا نے نیما کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ اس طرح کی شاعری کی جس میں کسی قسم کے اصول وقواعد کی رعایت نہ تھی اور قدیم اصول وضوابط سے محض انحراف کو شعر نو سمجھا۔ عجیب وغریب نظمیں لکھیں۔ شاعری کے میدان میں تقریباً ایسی ہی کوششوں کو آج ایران میں ''شعر موج نو'' کی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کے حامیوں کی تعداد بہت کم ہے، البتہ مخالفین بہت ہیں۔ احمد رضا احمدی (متولد کرمان ۱۳۱۹ش ۱۹۴۰ء) کا انتخاب کلام ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اور اس تحریک کی بنیاد پڑی۔ بہر حال یہ تمثیلی (Symbolic) شاعری ہے اور عام طور پر نیما کے شعر نو سے انحراف کو شعر موج نو سمجھا جاتا ہے۔ [۴] ہوشنگ ایرانی کی ''جیغ بنفش'' وہ بے سروپا نظم ہے جس کی وجہ سے نیما، اس کے اسلوب اور شعر موج نو کی شدید مخالفت کی گئی اور نیما کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد نے اعتدال پسند شعرا۔ کے ایک گروہ کی تشکیل کی۔ جیغ

نبشن کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

هیاهورای

گیل ویگولی

نیبون، نیبون

غار کبود میدود

دست بگوش وفشرده پلک وخمیده

یکسره جنغی بنفش

می کشد

گوش سیاہی زیشت ظلمت تابوت

کاه۔ درونِ شہر را

میجود

هوم بوم

هوم بوم

اس قسم کی اور متعدد نظمیں ہیں جن کی وجہ سے ایرانی شعرا اور ادبا کا ایک طبقہ جو نیما کا پیروکار نہ سہی، مگر ان کی صلاحیتوں اور شاعری میں تجدد کے لیے ان کی کامیاب کوششوں کا معترف ضرور تھا، نیما کے اسلوب شاعری سے گریز کرنے لگا اور اس نے اپنا الگ طریقۂ کار متعین کیا جسے اعتدال پسندی کا راستہ کہا جاسکتا ہے اور ایران میں اس تحریک کو "شعر نوء میانہ رو" کا نام دیا گیا ہے۔ اسی کو "کلاسیک جدید" بھی کہا گیا ہے۔ اس گروہ کے رہبر ڈاکٹر پرویز ناقل خانلری تھے۔ یہ نیما کے ہم وطن، ان کے دوست اور عزیز تھے۔ اعتدال پسندوں کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ: فارسی بحور، اوزان اور ان کے منشعبات (شاخیں) کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان بحروں کو توڑنا، انہیں کسی مصرعے میں مختصر طور پر اور کسی میں طویل تر انداز میں استعمال کرنا، یا ان سے گریز کرنا، ناگزیر نہیں ہے۔۱۵

خانلری کی نظم "عقاب" اعتدال پسندی کی بہترین مثال ہے، جس کے چند بیت درج ذیل ہیں:

گشت غمناک دل وجان عقاب چواز اودور شد ایام شباب

دیدکش دور به انجام رسید آفتابش بلب بام رسید

خواست تا چارۂ ناچار کند داروئی جوید۔ وور کار کند

صبح گاهی ز پی چارۂ کار گشت بربادِ سبک سیر، سوار

آخر میں یہ عرض کر دیا جائے کہ اعتدال پسندوں کا رویہ ایران میں زیادہ مقبول ہوا۔ اور آج بھی شعرا کی ایک بڑی تعداد اسی رویے کی حامی ہے۔

نادر نادر پور معروف جدید شاعر ہیں۔ آخر میں ان کی نظم "بت تراش" آپ کی خدمت میں پیش ہے جو جدید فارسی شاعری کا ایک بہتر نمونہ ہے:

پیکرتراش پیرم و با تیشۂ خیال
یک شب ترا ز مرمر شعر آفریده ام
تا در نگین چشم تو نقش هوس نهم
ناز ہزار چشم سیہ را خریده ام

بر قامتت کہ وسوسۂ شستشو دراوست
پاشیده ام شراب کف آلوده ماه را
تا از گزند چشم بدت ایمنی دهم
دزدیده ز چشم حسودان، نگاه را

تا پیچ و تاب قد ترا دلنشین کنم
دست از سر نیاز بهر سو گشوده ام
از هر زنی تراش تنی وام کرده ام
از هر قدی، کرشمۂ رقصی ربوده ام

اما تو چون بتی کہ بہ بت ساز ننگرد
در پیش پای خویش بخاکم فگنده ای
مست از می غروری و دور از غم منی
گویی دل از کسی کہ ترا ساخت، کنده ای

ہشدار! زانکہ در پس این پردۂ نیاز
آن بت تراش بلهوس چشم بسته ام
یک شب کہ خشم عشق تو دیوانه ام کند
بیند سایه ہا کہ ترا هم شکسته ام!

حاشیہ

۱۔ وزیر ناصر الدین شاہ قاچار، یہ انتہائی دانشمند وزیر تھے۔ ۱۸۶۰ میں انھوں نے روزنامہ ایران کا اجرا کیا۔

۲۔ یہ پلی ٹکنک polytechnic ۱۲۶۸/۰۱ھ۔۸۰۲ھ کے اوایل میں قائم ہوا۔

۳۔ تاریخ بیداری ایرانیان، مقدمہ

۴۔ تاریخ بیداری ایرانیان، مقدمہ، ص ۱۰۱
اندیشہ ھای میرزا آقا خان ص ۲۰۲

۵۔ از صبا تا نیما، ج ۱، ص ۳۱۱

۶۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ، ص ۱۲۴۔۱۲۵

۷۔ اندیشہ ھای میرزا فتح علی آخوندزادہ، ص ۲۴۸

۸۔ تاریخ بیداری ایرانیان، مقدمہ، ص ۱۴۱، اندیشہ ھائی میرزا آقا خان، ص ۲۱۵

۹۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ، ص ۲۵۷

۱۰۔ محمود خان کاشانی (۱۸۲۳۔۱۸۹۴) ولد محمد حسین خان متخلص بہ عندلیب ایرانی دربار کے سب سے آخری ملک الشعرا ہیں۔ ان کے دادا فتح علی خان صبا اور والد بھی قاچاری دربار کے ملک الشعرا تھے۔ محمود خان کو ناصر الدین نے ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ ان کے ساتھ ہی درباری شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۱۔ اس قسم کی نظم کا ایران میں قدیم زمانہ سے رواج چلا آ رہا ہے۔ اس میں مقامی حالات وواقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ موسیقی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور عوامی زبان میں لکھی جاتی ہے۔

۱۲۔ گیت یا ترانے کو سرود کہتے ہیں۔ قدیم ایران میں سرود کا بہت رواج تھا۔ زردشتی گیت اور اسی طرح ادستا کا کافی حصہ سرود یعنی مذہبی گیتوں پر مشتمل ہے۔

۱۳۔ مجلہ فردوسی، شمارہ ۸۸۲، مہر ماہ ۱۳۴۷ میں ایک معاصر شاعر سپانلو نے اس بارے میں بحث کی ہے

۱۴۔ اعتدال پسندوں کے موقف کو سمجھنے میں ڈاکٹر مھدی حمیدی کی کتاب زمزمہ بہشت کا مفصل ومدلل مقدمہ کافی مدد کرتا ہے۔ یہ کتاب چاپخانہ فردوسی سے شائع ہوئی ہے۔

دلیپ راوٹے
ٹائمس آف انڈیا
نئی دہلی

میں اردو اخبارات کیوں پڑھتا ہوں

ان دنوں میں اردو کا پروپیگنڈا کر رہا ہوں۔ گرچہ زبان داں ہونے کا میرا کوئی دعوا نہیں ہے۔ میں صرف اردو تحریر پڑھ سکتا ہوں۔ میں ایک اردو روزنامہ کا مستقل خریدار ہوں اور اکثر خواتین کے میگزین خرید کر پڑھتا ہوں۔ میں انھیں آہستہ آہستہ ڈکشنری کی مدد سے پڑھتا ہوں۔

چونکہ اردو زبان ممبئی کے مسلمانوں کی زبان سمجھی جاتی ہے اس لیے جب میرے ہاتھ میں اردو کا کوئی رسالہ ہوتا ہے تو لوگ مجھے میاں بھائی سمجھتے ہیں۔ دوست احباب میری کھینچائی کرتے ہیں اور مجھے یوسف خان کے نام سے پکارتے ہیں۔ جو میرے دوست نہیں ہیں اور مخالف سیاسی نظریات کو ماننے والے ہیں وہ بھی مجھے یوسف خان پکارتے ہیں۔ صرف ان کی حب الوطنی کا جذبہ تو ٹھیک ہے باقی ان کے سارے نظریات غلط ہیں۔ مجھے سنکی قسم کے لوگ پسند ہیں۔ دنیا ایسے سنکیوں کی عدم موجودگی سے رہنے کے لائق جگہ نہیں رہ جائے گی۔

مجھے اردو سے اس وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی کیونکہ مجھے احساس ہوا کہ مجھے مسلمانوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ تاہم مسلمان ہماری کل آبادی کا ۱۳ فیصد ہیں۔ گرچہ مسلمانوں کے پاس کوئی سیاسی طاقت نہیں ہے تاہم سیاسی فائدے کے لیے ان کا استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

میں 1991 کی گلف کی لڑائی کے بعد مسلمانوں کے بارے میں اکثر لکھتا رہتا ہوں لیکن ان میں زیادہ تر علمی دلچسپی کی باتیں ہوتی تھیں۔ مجھے مسلمانوں کے صحیح معاملات کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ میرے زیادہ تر مسلمان دوست کانوینٹ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کا ممبئی کے اردو پڑھنے والے مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان میں زیادہ تر لوگ اردو زبان سے ناواقف ہیں۔ میں انھیں اکثر اردو پڑھانے کی بات کرتا ہوں کیوں کہ اتنی سوجھ بوجھ حاصل کرنا کہ اردو تحریر پڑھ سکیں صرف ایک دن کا کام ہے۔ میں اکثر ان سے یہ

کہتا رہتا ہوں مجھے آج بھی کسی ایسے شاگرد کا انتظار ہے جو مجھ سے اردو پڑھنے کے لیے راضی ہو جائے۔

میں اپنے غیر مسلم صحافیوں سے بھی اکثر اردو پڑھنے کے لیے کہتا ہوں کیوں کہ اس سے نہ صرف بالغ نظری آئے گی بلکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے کہ اب مسلمانوں میں کیا کیا سماجی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ انھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اردو اخباروں میں پاکستان کی جارحیت کے خلاف جتنے خطوط شائع ہوئے ہیں ان کا ایک حصہ بھی ممبئی کے انگریزی اور مراٹھی اخباروں میں شائع نہیں ہوئے۔

ممبئی کے بلکہ مہاراشٹر کے مسلمانوں میں بابری مسجد سانحہ کے بعد جو بدلاؤ آیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ میں اسے مسلم نشاۃ ثانیہ کا نام دیتا ہوں یہ صرف تعلیم پر منحصر ہے۔ ہندستان کا کوئی بھی طبقہ تعلیم پر اتنا زیادہ نہیں خرچ کر رہا ہے اور نہ ہی اپنے ان بچوں کے لیے تہنیتی جلسے منعقد کر رہا ہے جو اسکول اور کالج کے امتحانوں میں ٹاپ کرتے ہیں۔ ان بچوں کے کارناموں کو جس طرح ممبئی کے اردو اخباروں میں پیش کیا جا رہا ہے اتنی جگہ اب فلم اسٹاروں کو بھی نہیں ملتی۔

مسلمان تعلیم کے سلسلے میں نو مسلم جیسے جذبے کا اظہار کر رہے ہیں اور انھوں نے جاہلیت اور ناخواندگی کے خلاف جہاد شروع کر رکھا ہے۔ اردو اخباروں میں لفظ تعلیم اب تقریباً ہر اخباروں کے پہلے صفحے کی پہلی سرخی بن کر آرہا ہے۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں میں بھی بڑے پیمانے پر چندہ جمع کیا جا رہا ہے جس کا استعمال صرف تعلیم کے شعبے میں کیا جا رہا ہے۔

تکنیکی اسکول اور پیشہ ورانہ نصاب اور بے روزگاروں کے لیے مشورے کے مراکز قائم کیے جا رہے ہیں۔ کمپیوٹر کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اب اردو اخباروں میں راجہ رام موہن رائے اور ہندو سماج میں اصلاح کرنے والے دوسرے رہنماؤں کے نام اور کارنامے بھی اجاگر کیے جا رہے ہیں جنھوں نے مغربی تعلیم اور مغربی افکار کو پھیلایا تھا اور اسی طرح پادریوں نے جو جگہ جگہ پر مشن کے اسکول قائم کیے ان کی تقلید کرنے کی بات بار بار کی جاتی ہے، کٹر ملاؤں اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کی زبان خاموش کر دی گئی ہے۔ اگر مسلمان اسی جوش و خروش کو بنائے رکھتے ہیں تو وہ اگلے بیس سالوں میں مغربی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے رہنما اور سربراہی کا کام انجام دیں گے نہ کہ ان سے چندہ مانگیں۔ میں اسی لیے اردو اخبارات کا مطالعہ کرتا ہوں کیوں کہ ان سے مہاراشٹر کے مسلمانوں میں تعلیم کے سلسلے میں نئی بیداری اور اس کے بعد ہونے والی سماجی تبدیلیوں کا بھرپور پتا چلتا ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری

غزل

ساعتِ آشفتہ حالی آگئی
کمرے میں پھولوں کی ڈالی آگئی

دل سے لب تک بات آئی ہی نہ تھی
اس کے رخساروں پہ لالی آگئی

راکھ بن کر اڑ گئے جلتے چنار
کیسی یہ بادِ شمالی آگئی

کیا ملا تجھ کو چمن سے ، اے ہوا
تو گئی تھی خالی ، خالی آگئی

ایک پل کو آئینہ دیکھا نہ تھا
چپکے سے پیرانہ سالی آگئی

ساحلی اشجار نے چپ سادھ لی
موج جو آئی سوالی آگئی

غالبیات

کتاب	مصنف	قیمت
تلامذۂ غالب	مالک رام	75/
فسانۂ غالب	مالک رام	16/50
یادگار غالب (اردو) مرتبہ	مالک رام	30/
یادگار غالب (فارسی)	مالک رام	9/.
گفتار غالب	مالک رام	48/
احوال غالب	پروفیسر مختار الدین احمد	45/
غالب کچھ مضامین	ڈاکٹر خلیق انجم	40/
غالب کے خطوط (اول)	ڈاکٹر خلیق انجم	120/
غالب کے خطوط (دوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	120/
غالب کے خطوط (سوم)	ڈاکٹر خلیق انجم	75/
غالب کے خطوط (چہارم)	ڈاکٹر خلیق انجم	120/
غالب اور شاہان تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	9/50
عظمت غالب	ڈاکٹر عبد المغنی	35/
غالب پر چند تحریریں	ڈاکٹر سعادت علی صدیقی	35/
غالب	ڈاکٹر خورشید الاسلام	40/
غالب تقلید اور اجتہاد	خورشید الاسلام	30/
غالب اور انقلاب ستاون	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	60/
غزلیات غالب (اردو)	یوسف حسین خاں	95/
پرشین غزل آف غالب	یوسف حسین خاں	250/
تفتہ اور غالب	ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری	35/
دیوان غالب	نور الحسن نقوی	35/
دیوان غالب	ایوان غالب	50/
غالب اور ذکا	ضیاء الدین احمد شکیب	6/
غالب اور سرور	ایم۔ حبیب خاں	25/
غالب سے اقبال تک	ایم حبیب خاں	25/
غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	36/
غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/
دیوان غالب	غالب اکیڈمی	150/
تفہیم غالب	شمس الرحمٰن فاروقی	90/

کتاب	مصنف	قیمت
انتخاب اردو کلیات غالب	شمس الرحمٰن فاروقی	90/
غالب اور تصوف	سید محمد مصطفیٰ صابری	60/
غالب کی رہگذر	واجد سحری	35/
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	25/
غالبیات اور ہم	ڈاکٹر ابو محمد سحر	50/
جوہر آئینہ (جائزہ کلام غالب)	طالب کشمیری	25/
بین الاقوامی سمینار	یوسف حسین خاں	20/
انتخاب مضامین غالب نامہ تحقیقات	پروفیسر نذیر احمد	150/
نقد قاطع برہان	پروفیسر نذیر احمد	60/
غالب پر چند تحقیقی مطالعے	پروفیسر نذیر احمد	60/
غالب احوال و آثار	حنیف نقوی	60/
مثنویات غالب (فارسی) اردو ترجمہ	ڈاکٹر ظ۔ انصاری	60/
نادرات غالب	سید آفاق حسین آفاقی	30/
ریختہ غالب	نور الحسن ہاشمی	5/
فیضان غالب	عرش ملسیانی	22/
یادگار غالب۔ ایک جائزہ	سید حیدر عباس رضوی	8/
دیوان غالب (ہندی)	ثاقب صدیقی، انیس احمد	80/
غالب اردو غزل	ڈاکٹر یعقوب مرزا	90/
غالب اور اردو غزل	عبدالرحمٰن عباسی چڑیاکوٹی	100/
شرح دیوان غالب	یوسف سلیم چشتی	125/
غالب کون ہے	سید محمد مہدی	8/50
انشائے غالب	رشید حسن خاں	60/
گفتۂ غالب	ڈاکٹر محمد سیادت نقوی	60/
غالب پر چند مقالے	پروفیسر نذیر احمد	60/
انتخاب مضامین غالب نامہ تنقیدات	پروفیسر نذیر احمد	100/
دیوان غالب جدید	(نسخہ حمیدیہ)	32/
غالب کے چند نقاد	سلیمان اطہر جاوید	60/
غالب کی بعض تصانیف	کالی داس گپتا رضا	80/
توضیحی اشاریہ غالب نامہ	فاروقی انصاری	60/
غالب کی شناخت	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	80/
غالب کی آپ بیتی (اردو)	پروفیسر نثار احمد فاروقی	40/

پروفیسر آل احمد سرور
دودھ پور، علی گڑھ

باتیں ہماریاں

سمیناروں پر چند باتیں

سمینار یا مذاکرے فی نفسہ بہت مفید ہیں۔ کسی موضوع پر جس کے مختلف پہلو اہمیت رکھتے ہوں، اگر قاعدے سے سمینار کیا جائے یا مذاکرہ ہو تو واقعی یہ علم و ادب کی ایک خدمت ہوگی لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ آج کل یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے یا ریاستوں میں اردو کی اکیڈمیاں جو سمینار کرتی ہیں ان کے لیے نہ تو مناسب تیاری ہوتی ہے نہ مقالوں پر بحث کے لیے کافی وقت دیا جاتا ہے اور نہ مقالوں کی اشاعت پر وہ توجہ ہوتی ہے جو ہونی چاہیے۔ محمود ایاز مرحوم نے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ لوگ "سوغات" کے لیے کسی سمینار میں پڑھا ہوا مقالہ بھیج دیتے ہیں اور اس مقالے میں نہ تو کوئی نیا پہلو ہوتا ہے نہ اس سے ادب میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بیشتر تنقیدی مقالات سے نقل کردہ یا اخذ کردہ مضامین ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک ایک اچھے سمینار کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کا اعلان کم سے کم چھے مہینے پہلے کیا جائے۔ مقالہ نگاروں کے علاوہ ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو اس موضوع پر نظر رکھتا ہو اور وہ بحث کا آغاز اپنے ایک مختصر مقالہ سے کرے۔ عموماً ایک نشست میں دو یا تین سے زیادہ مقالے نہیں ہونے چاہئیں اور ہر مقالے پر سیر حاصل بحث کے لیے تقریباً ایک گھنٹہ رکھنا چاہیے اس طرح تین گھنٹے کی ایک نشست میں دو مقالے پڑھے جاسکتے ہیں۔ جو آدھے گھنٹے سے پون گھنٹے تک کے ہوں اور ان پر کم سے کم چار آدمی بحث کر سکیں۔ ان چار میں سے ایک کی تحریر بحث کے آغاز کے لیے ہونا چاہیے۔ ہمارے یہاں ایک رسم سی ہوگئی ہے کہ کسی معزز آدمی یعنی کسی وزیر یا کسی وائس چانسلر یا کسی افسر سے سمینار کا افتتاح کرایا جائے خواہ ان حضرات کا ادب سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ دراصل سمیناروں کا افتتاح مختصر ہونا چاہیے اور صدر شعبہ کو یہ فرض انجام دینا چاہیے تاکہ وہ سمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈال سکے۔ اگر حساب لگایا جائے تو سال بھر میں ان سمیناروں پر لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہوگا۔ ان میں زور افتتاح پر یا وائس چانسلر یا کسی معزز آدمی کی طرف سے دعوت طعام پر ہوتا ہے۔ یہ قطعی ضروری نہیں ہے۔ سمیناروں کے مقالات کی

اشاعت میں بھی تاخیر نہ ہونا چاہیے اور چھے مہینے کے اندر سمینار کی روداد شائع ہو جانی چاہیے۔
افسوس یہ ہے کہ ہمارے علمی اور ادبی اداروں میں اب خالص علمی اور ادبی نقطۂ نظر کے بجائے نمود و نمائش کا عنصر بڑھنے لگا ہے۔ اگر سال میں ایک یا دو سمیناروں کے بجائے مناسب تیاری کے بعد ہر دو یا تین سال میں ایک سمینار ہو تو بہتر ہوگا۔ ان سمیناروں میں دو دن میں آٹھ سے لے کر دس مقالے ہو جائیں گے اس سے زیادہ نہیں۔ یہ باتیں اس لیے کہی جا رہی ہیں کہ اب سمیناروں کی بھی ایک اچھی خاصی انڈسٹری ہو گئی ہے اور کئی شعبے اور کئی کمیٹیاں ان ہی سمیناروں کے ذریعے سے اپنی اہمیت منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض سمیناروں میں مقالات کے بجائے تقریروں سے ہی کام چلا لیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ امر مستحسن نہیں ہے۔

ادبی شعبے درس و تدریس اور ریسرچ کے گہوارے سمجھے جاتے ہیں۔ سستی شہرت اور مقبولیت سے بلند ہو کر اور ہجوم کی کشش سے بے نیاز ہو کر انھیں اپنے کام میں مصروف رہنا چاہیے۔

یہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ ادب پر پیمبری وقت پڑا ہے۔ اس وقت ادب کے ذریعہ سے زندگی کی اعلا قدروں پر اصرار اور صارفیت کے دور میں کچھ لینے کے بجائے قدروں کا عرفان عطا کرنے پر توجہ کرنی چاہیے۔ کاش ہم اس پر آشوب دور میں بنیادی حقیقتوں اور اعلا قدروں کا احساس کر سکیں۔ ایک اچھے سمینار میں ہم کسی نقاد، معلم یا محقق سے دو چار ہوتے ہیں۔ صرف اس کی تحریر ہی نہیں بلکہ اس کی پرسوز شخصیت کا بھی ہمیں کچھ علم ہوتا ہے جو بعض اوقات پوری پوری کتابوں سے نہیں ہوتا۔ سمینار ایک عالمی فضا کا متقاضی ہے، مجمع اور خطیبانہ پینتروں سے بے نیاز۔ یہاں جذبات کی حشر سامانی نہیں، خیالات کی چاندنی ہوتی ہے۔ یہی چاندنی فکر و نظر کے لیے سب کچھ ہے۔ (بہ شکریہ سیاست حیدر آباد)

نکہت بریلوی
اے۔۶۷۷، بلاک ایچ
ناظم آباد۔کراچی

غزل

بے حرف وصوت کوئی سخن ہو تو کیجیے
حاصل جو یہ مہارت فن ہو تو کیجیے

یونہی گنوایئے نہ متاع سخن وری
دور اس سے زندگی کی گھٹن ہو تو کیجیے

باقی نہ رہ سکے کوئی ظلمت کا سلسلہ
روشن دلوں میں ایسی کرن ہو تو کیجیے

باد خزاں نے خاک اڑا دی ہے باغ میں
کچھ اہتمام سرد و سمن ہو تو کیجیے

دستور کوئی سا بھی بنا لیجیے مگر
رائج محبتوں کا چلن ہو تو کیجیے

پھر کھل اٹھیں وفورجنوں میں سروں کے پھول
پھر تازہ فصل دارورسن ہو تو کیجیے

نکہت بس اب تو جاں سے گذرنا ہی رہ گیا
یہ بھی بپئے وقار وطن ہو تو کیجیے

معظم سعید۔ بحرین

غزل

اک خواب کا تعاقب ہجرت کی داستاں ہے
تعبیر کیا بتائیں منزل دھواں دھواں ہے

رستے کے ہر شجر کو یہ دھوپ کھا گئی ہے
اب قافلے کے سر پر سورج ہی سائباں ہے

دستک ہے در پہ کوئی نہ شور کھڑکیوں کا
اک خوف میرے گھر کی ہر چیز سے عیاں ہے

قدموں میں تم کسی کے سر تو جھکا رہے ہو
لیکن خیال رکھنا دستار درمیاں ہے

اس شہر زرد میں تو کوئی نہیں مسیحا
ہونٹوں پہ اب دعا بھی کیا حرفِ رائیگاں ہے

ہجر و وصال کی اب حد سے نکل چکا ہوں
نوکِ قلم پہ میری آباد اک جہاں ہے

تازہ ہوا کا جھونکا خوشبو بکھیر دے گا
دل میں سعیدؔ اب تک امیدِ خوش گماں ہے

نثار احمد فاروقی
پوسٹ بکس نمبر ۹۷۲۳
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

غالب کا ایک شعر

کتاب نما (اگست ۱۹۹۹ء) میں انوار رضوی صاحب کا مضمون "غالب کا ایک شعر" پڑھا، اُنھوں نے غالب کے اِس شعر پر جونسبۃً غیر معروف ہے، بحث کی ہے:

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے

انھوں نے شعر کا صحیح متن متعین کرنے کے لیے دیوان غالب کے نسخہ حمیدیہ، نسخہ مطبع نظامی کانپور (۱۸۶۲) سے لے کر دیوان غالب مرتبہ مالک رام (۱۹۷۹ء) تک متعدد اڈیشنوں کو سامنے رکھا ہے اور خلاصہ بحث یہ پیش کیا ہے:

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو کر، رہا ہو جایئے

میں نے رضوی صاحب کے فرمودات کو بہت غور سے پڑھا، اور اُن کی پیش کردہ دلیلوں کا جائزہ لیا، مگر اس نتیجے پر پہنچا کہ دیوان غالب مرتبہ مالک رام میں اس شعر کی یہ قرأت ہی صحیح ہے:

بیضہ آسا تنگ بال و پر پہ ہے کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے

اس متن کی تائید شعر کا مفہوم کر رہا ہے۔ غالب نے "بیضہ آسا" کی تشبیہ کنجِ قفس کے لیے استعمال کی ہے۔ چوزہ جب تک انڈے کے اندر بند ہوتا ہے (اگرچہ زندہ ہوتا ہے) اُس کے بال و پر کام نہیں آتے، وہ اُڑنا تو کیا پھڑ پھڑا بھی نہیں سکتا۔ جب وہ انڈے کی تنگ فضا سے نکل کر باہر کی دنیا میں آتا ہے تو اُسے گویا نئی زندگی ملتی ہے جو بیضے کے اندر والی زندگی سے مختلف ہوتی ہے اور اب اس کے بال و پر کو بھی کشادگی نصیب ہوتی ہے۔

غالب کہتا ہے کہ ہم کنج قفس میں ایسے پڑے ہیں جیسے ایک چوزہ انڈے کے اندر ہوتا ہے، یہاں بال و پر کے کھلنے کوئی گنجایش نہیں، اگر ہم رہا ہو جائیں تو گویا نئی زندگی مل جائے گی۔

غالب کی زندگی میں ہی مغلیہ سلطنت دم توڑ چکی تھی، ہندستان ایسٹ انڈیا کمپنی کا غلام ہو چکا تھا۔ ساری صنعتیں روبہ زوال تھیں، صناع اور پیشہ ور مفلوک الحال تھے، غربت اور افلاس کا اندھیارا پھیلتا جا رہا تھا۔ اس پس منظر میں شعر کے مفہوم پر غور کریں تو یہ ہندستان کی غلامی کا نوحہ اور آزادی کے حصول کی تڑپ کا بہترین ترجمان ہے اور اُسی قبیل کا شعر ہے جس میں غالب نے آزادی کی تمنایوں کی ہے۔

ہوں گرمیِ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

رضوی صاحب نے دوسرا مصرع یوں پڑھا ہے:

از سرِ نو زندگی ہو کر، رہا ہو جایئے

اِسے نظر ثانی کے وقت خود غالب کی اصلاح بتاتے ہیں، مگر یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ''زندگی شدن'' نہ فارسی کا محاورہ ہے نہ ''زندگی ہونا'' بجائے ''زندہ ہونا'' اردو میں بولا جاتا ہے۔ غالب زبان کے معاملے میں ایسی بے راہ روی کے روادار نہیں تھے۔ اس بارے میں اُن کے متعدد خطوط گواہی دے رہے ہیں۔

انھوں نے پہلے مصرع کو یوں پڑھا ہے:

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس

''بیضہ آسا'' کی تشبیہ بال و پر کے لیے نہیں، کنج قفس کے لیے ہے۔ کنج قفس کے لیے بال و پر کیوں باعث ننگ (باعث شرم) ہوں گے؟۔ دوسرا مصرع اگر یوں ہوتا کہ (وزن سے قطع نظر)

از سرِ نو زندہ ہو کر رہا ہو جایئے

تو یہ اعتراض تھا کہ زندہ ہونا اختیاری فعل نہیں۔

نسخہ شیرانی میں بھی وہی قرأت ہے جو مالک رام نے اختیار کی ہے، قدیم رسم الخط میں ک رگ کو ایک ہی مرکز سے لکھ دیا جاتا تھا، اِس لیے وہاں ''زندگی ہو کر'' نہیں پڑھنا چاہیے۔

یہ بحث بہر حال دلچسپ ہے، اُمید ہے کہ رضوی صاحب یا دوسرے حضرات بعض دوسرے اشعار کے بارے میں بھی غور فرمائیں گے۔

ڈاکٹر عطش درانی

اردو صوتیے، نئی املا اور کمپیوٹر تختیاں

برقیاتی ڈاک (E.Mail) اور اطلاعیات کے عالمی جال (Internet) کے باعث دنیا بھر کی زبانوں کو تکنیکی حد بندیوں اور جبر سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ چونکہ یہ ایجادیں مغرب نے کی ہیں، اس لیے انھوں نے ہر قسم کی اختراعات میں اپنی زبانوں ہی کو پیش نظر رکھا اور تمام ٹیکنالوجی انہیں کے حوالے سے وجود میں لائے۔ جب یہ ایجادات دوسری زبانوں تک پہنچیں، تب بھی معیارات اور ترکیبات مغربی زبانوں ہی کے حوالے سے سامنے لائے گئے۔ یہیں سے ان دوسری زبانوں کی مشکلات کا آغاز ہوا، جن میں ٹیکنالوجی پروان نہیں چڑھی۔

مقتدرہ میں اردو کمپیوٹر کی ضابطہ تختی (CodePlate) اور کلیدی تختے (Key Board) کی معیار بندی اور اندرونی پیش کش/اظہار (Representation Interneat) کے سلسلے میں یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ:۔

۱۔ ابھی تک اردو کے حروف تہجی کی تعداد معین نہیں۔

۲۔ یہ تعداد روز افزوں ہے اور نئے صوتیے شامل ہو رہے ہیں۔

۳۔ ان حروف کے لیے نئی املا درکار ہے۔

۴۔ کمپیوٹر میں ان امور کی گنجایش رکھنا مقصود ہے۔

یہ نتائج اردو کے کسی نقص، تناقض یا کمی کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ جدید لسانیات کے اصولوں کے عین مطابق ایک زندہ، متحرک اور فعال ترقی پذیر زبان ہونے کی شہادت فراہم کرتے ہیں جبکہ انگریزی جیسی جدید، ترقی یافتہ زبان کا یہ پہلو بے حد کمزور اور غیر تسلی بخش ہے کہ اس کے حروف تہجی کی تعداد (۲۶) ان برقیاتی ایجادات سے صدیوں پہلے معین ہو چکنے کے بعد اب نئے

تقاضوں کا ساتھ نہیں دے رہی ۔ مجبوراً ایجادات اور تکنیکی ترقیوں کو انھی کے مطابق محدود کرنا پڑ رہا ہے یا پھر لسانیاتی تقاضوں کے پیش نظر صوتیاتی ابجد (Phonetic Alphabet) وضع کرنا پڑ گئی ہے۔ اور یوں ایک نئی ابجد، جو ابھی تک صرف لغات میں موجود ہے، انگریزی کی موجودہ ابجد پر حاوی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود لسانی مسائل ہیں کہ بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

اردو کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ایک تو یہ کہ اسے انگریزی کے حروف تہجی اور علامات کی حدود میں فٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دوسرے یہ کہ مختلف املائی تحقیقات کی روشنی میں معلوم ہو رہا ہے کہ محولہ بالا مسائل موجود ہیں اور انھیں حل کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو میں بنیادی طور پر ۳۷ حروف تہجی تسلیم کیے جاتے تھے اور ابن مقلہ کی روایت کے تحت ہم شکل املا میں وضع کیے گئے تھے۔ خاص طور پر "ٹ، ڈ، ڑ" وغیرہ۔ "بھ، پھ" جیسی بھاری، حلقومی آوازوں یا صوتیوں کو دو حرفی مجموعہ (ب + ہ)، (ت + ہ)، (پ + ہ) قرار دیا گیا۔ اس قدیم روایت کے مطابق حروف یا حرفی مجموعوں کی کل تعداد ۴۸ بنتی تھی، جو کچھ حسب ذیل تھی۔

ا،

ب، پ، ت، ٹ، ث،

ج، چ، ح، خ،

د، ڈ، ذ،

ر، ڑ، ز، ژ،

س، ش، ص، ض،

ط، ظ، ع، غ،

ف، ق، ک، گ،

ل، م، ن، و،

ہ، ء، ی، ے،

بھ، پھ، تھ، ٹھ،

جھ، چھ، دھ، ڈھ،

ڑھ، کھ، گھ،،

ان کے علاوہ بھی کئی صوتیے، آوازیں یا حروف موجود تھے جو بولنے، پڑھنے اور لکھنے میں آتے تھے لیکن انھیں تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، مثلاً،

آ۔ آم، آب، وغیرہ میں،

رھ۔ سرھانا وغیرہ میں

لھ۔ کولھو، دلھا وغیرہ میں

نھ۔ منھ، مینھ وغیرہ میں

دھ۔ وھیل، وھائیٹ وغیرہ میں

یھ۔ یہاں وغیرہ میں

بعض روایات پسند لوگ آ کو الف اور مد کا مجموعہ قرار دیتے اور باقی حروف کو شوشے دار طریقے یعنی "ہہ" لکھ دیتے جیسے سرہانا، کولہو، دلہا، تمہیں، تمہارا، جمہورا، منہ، مینہ، وہیل، وہائٹ، یہاں۔ صرف ننھا یا ننھیال ان کی دسترس سے بچا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی اصوات تھیں، جو بولنے میں آتی تھیں، لیکن انھیں ہم لکھنے سے کتراتے رہے یا انھیں املائی مجبوری کے تحت لکھتے رہے۔ جیسے:

اء۔ علماء، انبیاء

اُ۔ جیسے: ماخذ وغیرہ

ۃ۔ جیسے: زکوٰۃ، صلوٰۃ وغیرہ

مّ۔ جیسے: آمّ، نامّ وغیرہ

نڑ۔ جیسے: کرشنڑ، پانڑی

لں۔ جیسے انبیا، چنبیلی میں (نون میم کی آواز)

ں۔ جیسے: جنگ، رنگ میں ننگ کی آواز

وِ۔ جیسے: خورشید، خوان وغیرہ میں

وٗ۔ جیسے: خواب، خواہش، خواتین میں

وًں۔ جیسے: گاؤں کوئیں، ہندوؤں وغیرہ میں

وٗ۔ جیسے: جاؤ، لاؤ وغیرہ میں

ء۔ جیسے: ہمزۂ اضافت میں

عربی کی بعض علاماتِ اعراب جیسے زکوٰۃ، بذاتہٖ، مثلاً نسل، عبدہٗ وغیرہ ان پر مستزاد ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی کوڈ پلیٹ وضع کرتے ہوئے ایسے بہت سے مسائل سامنے آتے ہیں۔ ان مسائل میں ان حروف کی ترتیب (Sorting Order)، اشاریہ بندی اور تلاش (Search) بھی شامل ہیں۔ اردو کے نیم مصوتے، زبر، زیر، پیش، جنھیں غلطی سے اعراب کی علامات بھی سمجھا جاتا ہے، مسائل میں اضافہ کرتے ہیں۔ درحقیقت عربی زبان کی ترتیب کاری میں ان اعراب کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی لیکن اردو کا یہ لازمی حصہ ہیں۔ مثلاً ہم اردو الفاظ زبر، زیر پیش کے بغیر بھی لکھتے ہیں اور ان کے ساتھ بھی۔ ہر دو قسم کے املا رائج ہونے کی بنا پر ترتیب کاری میں ہر دو کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اردو کا ہر حرف (چند استثنائی حروف کے علاوہ) چار قسم کے حروف کی شکل اختیار کر جاتا ہے:۔

ا، اَ، اِ، اُ

یہ چاروں حروف ترتیب کاری، اشاریہ سازی یا لغوی ترتیب میں اسی طرح سے آتے ہیں مثلاً
کھن، کَھن، کِھن کُھن وغیرہ

لغت میں حسب ذیل ترتیب سے آئیں گے۔:۔
کھن، کَھن، کِھن، کُھن،

چند حروف کو چھوڑ کر باقی میں اس تعداد کی ضرب حروف تہجی کے لیے کوڈ پلیٹ میں خانوں کی تعداد کو بڑھا دیتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے لیے ڈیڑھ سو خانے درکار ہیں اور مزید خانے اردو کی روز افزوں ترقی کے لیے بھی چاہییں۔

اگر ہم ایک نظر واپسیں ڈالیں تو اس بڑی تعداد کا جواز واضح ہو جاتا ہے۔ اردو تہذیبی سطح پر پروان چڑھنے والی ایک زبان ہے، جسے مختلف ماخذوں سے آنے والے حروف اور صوتیوں کے املا کے لیے طریق املا مستعار لے کر اس میں اپنی ضرورتوں کے مطابق تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اردو کے چند حروف عربی ماخذ سے آئے۔ ان کا املا اسی طرح رائج رہا جیسے عربی یا فونیقی میں تھا۔ یہی صورت فارسی حروف کی تھی، جو پہلے ہی عربی یا فونیقی رسم الخط میں ڈھل چکے تھے۔ کچھ مقامی اصوات تھیں (جیسے ٹ، ڈ، ڑ، بھ، پھ، ے، وغیرہ) جنھیں ملتی جلتی املا کے لحاظ سے وضع کر لیا گیا۔ البتہ ان کا املا ترقی پذیر رہا۔ پہلے ٹ، ڈ، ڑ کو دو نقطے اور لکیر کے ساتھ ت، دٜ، ر یا چار نقطوں کے ساتھ ت، دٛ، رٛ ظاہر کیا جاتا تھا۔ کتابت کی کشش قلم نے انھیں ''ط'' میں بدل

ڈالا۔ سندھی املا میں البتہ یہ اگلا قدم "ڑ" نہیں اٹھایا گیا۔ بھ، کو پہلے "بہہ" "بہہ" لکھا گیا۔ پھر دو چشمی ھ مقرر کرلی گئی۔ "ے" کے لیے پہلے یائے معروف "ی" ہی مستعمل رہی پھر اسے نصف کرلیا گیا جیسے "ی" ، پھر اسے نیچے کی طرف الٹا کھینچ دیا گیا اور "ے" کی موجودہ صورت بن گئی۔

مقامی اصوات کو غلطی سے ہندی حروف کہا گیا۔ دراصل یہ مقامی صوتیے یا حروف تھے۔ کچھ حروف انگریزی کے ذریعے وارد ہوئے جیسے Wh کی آواز "وھ" وھیل وغیرہ میں۔ بعض لوگ اسے ابھی تک اردو میں داخل نہیں سمجھتے۔ اسی طرح ایک انگریزی حرف "V" اردو میں داخل ہونے کو ہے۔ عربی سندھی کی حد تک اس کا املا "ف" کی صورت میں دیکھنے میں آیا ہے۔ اردو میں ابھی تک "و" ہی سے کام چلایا جارہا ہے۔ "X" کی آواز پستو کے "ښین" کی ہے، جو "خس" یا "خش" کی آواز دیتا ہے۔ اردو میں اسے "ک"، "گ"، "خ"، "س"، یا "ش" سے ظاہر کردیا جاتا ہے۔

ابھی تک اردو میں حروف تہجی کی صورت وزارت تعلیم، قاعدوں اور بورڈوں کے حوالے سے کچھ یوں ہے۔ ان کی تعداد ۵۳ ہے اور ان کی ترتیب حسب ذیل مانی گئی ہے:۔

ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ،
ث، ج، جھ، چ، چھ، ح، خ، د، دھ، ڈ،
ڈھ، ذ، ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ، س، ش، ص،
ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، کھ، گ،
گھ، ل، لھ، م، مھ، ن، نھ، و، ہ، ھ، ی، ے۔

اس ترتیب میں پانچ حروف: آ، رھ، لھ، مھ، نھ، کا اضافہ تسلیم کیا گیا ہے۔ نون غنہ "ں" کو حرف تو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ترتیب میں شامل نہیں کیا گیا۔ ان کے علاوہ بعض اہل علم وقلم، ماہرینِ زبان اور لغات نویس ٹ،، نھ، وھ، اور یھ کو بھی اردو کے حروف مانتے اور لکھتے چلے آئے ہیں۔ رشید حسن خاں اور قدرت نقوی "وھ" کو مانتے اور لکھتے ہیں۔ سید قدرت نقوی، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور بہت سے دیگر اہل علم وقلم نھ کو "منھ" وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔ سید قدرت نقوی "وھ" کو "وھیل" وغیرہ میں۔ شان الحق حقی "ںط" کو "کرشنں، مانک" وغیرہ کے "ن" کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے بہت سے دیگر حروف پر بھی بحث کی ہے، جن میں سب سے اہم "نگ" کی آواز ہے، جو انگریزی میں

اب "n" کی بجائے "n" سے ظاہر کی جاتی ہے۔ شان الحق حقی "یھ" کے صوتیے کو تسلیم نہیں کرتے جو "یہاں" جیسے الفاظ میں مستعمل ہے۔ اسی طرح وہ "وھ" کا صوتیہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ رشید حسن خان اردو میں "ن ط" کو "نتر" کی آواز سمجھتے اور "ن" سے لکھنا جائز قرار دیتے ہیں۔ حقی صاحب نے اسے علاحدہ حرف تسلیم کیا ہے اور اس کا نام "ڑاں" رکھا ہے۔ ہم اسے "نون" کے وزن پر "ڑون" کا نام دینا چاہتے ہیں۔ حقی صاحب "نھ" کا حرف علاحدہ نہیں سمجھتے اور "منھ، ادھر" وغیرہ کو "رنگ، ڈھنگ" کا نون غنہ ہی سمجھتے ہیں، البتہ وہ ایک نون بشکل میم کو الگ صوتیہ قرار دیتے ہیں جیسے، انبار، سنبل، چنبیلی وغیرہ دراصل نون غنہ کی کئی صورتیں ہیں، جن میں سے کچھ واضح ہو چکی ہیں اور کچھ واضح ہو رہی ہیں۔ منک، جنگ، رنگ وغیرہ میں یہ ک اور گ کے ساتھ مل کر الگ آواز ہ صوت یا حرف ہ کی صورت میں واضح ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس کے لیے "ں" (نون کے درمیان ہ دائرہ) کی املا کی سفارش کی ہے۔ جیسے منک جنگ، رنگ۔ ہاتھ سے لکھتے ہوئے ان دائروں کو نقطے کی صورت میں لکھنے کا مغالطہ ہو سکتا ہے اس کے لیے مزید جزم کی علامت لکھ دی جائے۔ "ںْ"۔ جنگ، رنگ وغیرہ میں۔ اس حرف کے لیے ایک نام بھی درکار ہے۔ اسے "ڑونگ" قرار دیا جائے تو بہتر اور موزوں ہوگا۔

صوتیہ "ن ط" اردو میں لکھنے سے اس کے "تلفظ بدلنے" کا امکان موجود ہے جیسے مانک، مانٹک ہو جائے گا۔ پانی، پاٹی بن جائے گا۔ چنانچہ اسے نون ہی پر اضافی ط کی صورت میں نٹ لکھا جا سکتا ہے اور یوں مانٹک، پاٹی، کرشنٹ ظاہر ہو سکتے ہیں۔ یعنی لکھے، پڑھے، بولے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر پاکستانی اردو میں اس تلفظ، لہجے اور صوت کی ضرورتیں بے حد محسوس ہوتی ہیں جو دیگر پاکستانی زبانوں اور عوام کی ضرورتوں کی بنا پر سامنے آ رہی ہیں۔

جہاں تک نون کی ایسی آواز کا تعلق ہے، جو میم میں بدل جاتی ہے اور جسے ہم نون میمہ بھی کہہ سکتے ہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ یا تو ہم اسے میم "م" ہی سے لکھیں یا پھر ایک نئی علامت "ن" مقرر کر لیں اور تنبورہ کو تنبُورہ یا تنبُورہ لکھیں۔

یہیں میم کی ایک آواز غنہ کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور دراصل یہ میم غنہ ہی ہے۔ اسے م کے ساتھ نون غنہ ڈال کر لکھنا چاہیے، جیسے آم، دوم، تمبورہ کو آمں، دومں، تمبورہ لکھا جانا چاہیے۔ اگر نون غنہ کی علامت کے ہمزہ یا نون میں بدل جانے کا اندیشہ ہے تو پھر حرف م کے اوپر غنہ کی علامت دے دیں، جیسے، آمّ، دومّ، تمبّورہ وغیرہ۔

کچھ صوتیے پنجابی، لاہوری وغیرہ سے اردو بول چال میں داخل ہیں۔ان میں ب اور پ، ت اور ٹ، ک اور گ، یا بھ اور پھ، تھ اور ٹھ اور کھ اور گھ کی درمیانی اصوات ہیں جو گورمکھی میں کلکے کہلاتی ہیں، اب اردو بول چال میں بھی عام ہیں۔ان کے اظہار کی صورت بھی نکالنا ہوگی۔جیسے بٖ، بھٖ، تٖ، تھٖ، کٖ، کھٖ وغیرہ۔بالکل اسی طرح جیسے سرائیکی میں بھاری ب کی صوت کے لیے حرف ''ٻ'' وضع کیا گیا ہے۔سرائیکی رملتانی کی یہ صوت بھی اردو پر اثر انداز ہورہی ہے۔اس کی مزید بھاری صوت ''ٻھ'' بھی ہے۔

واو معدولہ بھی اردو میں خاصا پریشان کن مسئلہ ہے۔اگر اسے بولنا ہی نہیں تو املا سے نکال ہی دیں۔''اصطلاحات پیشہ وراں'' میں ایسا ہی کیا گیا ہے۔پروفیسر سید محمد سلیم نے تو بجا طور پر کہا ہے کہ خواب اور خواہش میں دراصل واو معدولہ نہیں بلکہ یہ ''Ua'' کی آواز ہیں جیسے Khuab,Khuahish۔وہ اسے واو پر دائرہ لگا کر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔جیسے خوٚاب، خوٚاہش۔دراصل یہ واو مخلوط یا ملواں واو ہے۔اسے جزم کے ساتھ خوْاب، خوْاہش لکھا جاسکتا ہے۔واو کی ایک آواز خود اسی حرف کو لکھنے میں آتی ہے۔یہ ''واو'' اور ''واؤ'' کی درمیانی صوت ہے۔گاؤں، پاؤں، ہندوؤں میں بھی ظاہر ہوتی ہے اور اسے یا تو ہمزہ کے ساتھ یا اس کے بغیر لکھا جاتا ہے۔اسے بھی دراصل غنہ کی آواز اور علامت کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔''واوٗ، گاوٗں پاوٗں، ہندوٗں'' وغیرہ وٗ کی آواز روٗ، سوٗ میں ظاہر ہوتی ہے۔

نھے غنہ ںؒ کا صوتیہ جو نھ یا موتھ، اونھ، آنھ، بینھ، باتھ میں ظاہر ہوتا ہے، ابھی تک یہ حرف اور اس کے نام کا تقاضا کر رہا ہے۔اسے نھے (نھ) کی طرح ''ںھ'' (Aenh) کہا جاسکتا ہے۔

الف کی بھی کئی اصوات ہیں، جن میں سے اء ہا!، ا وغیرہ مستعمل ہیں جیسے علماء، سنا! ماخذ وغیرہ میں، لیکن اب یہ لکھنے میں نہیں آرہے بلکہ مقتدرہ نے تو انھیں حذف کرنے کی سفارش کی ہے۔

ی کا ایک صوتیہ یائے مخلوط ہے جو کیاْ، لیاْ وغیرہ میں آتا ہے، اسے بھی جزم کے ساتھ لکھا جانا چاہیے۔

عربی کی تائے مدورہ ''ۃ'' ابھی تک ہمارے ہاں مستعمل ہے، اسے بھی اردو حروف تہجی میں شامل کرلینا چاہیے اور ''ہ'' کے بعد رکھ دینا چاہیے۔

ابھی اور نہ جانے کتنی اصوات ظاہر ہونے کی منتظر ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اردو کے حروف تہجی ترقی پذیر اور روز افزوں ہیں۔ان کی کئی مکتوبی و غیر مکتوبی، املائی و غیر املائی اور حرفی

وغیر حرفی صورتیں ہمارے سامنے ہیں، کچھ ابھی تک پردہ اخفا میں ہیں۔ ان میں سے مجوزہ اسی (۸۰) صورتیں کچھ یوں ہیں۔

ا، اء، آ (أ) ب، بھ، ب، بھ، ب، بھ،
پ، پھ، ت، تھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث،
ج، جھ، چ، چھ، ح، خ، د، دھ، ڈ، ڈھ، ڈ،
ڈھ، ذ، ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ، س، ش، ښ، ص
ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ڤ، ق، ک،
کھ، ڪ، کھ، گ، گھ، ل، لھ، مٓ، م، مھ،
ں، نھ، ں، ںٔ، ڨ، ن، نھ، و، ۆ، ۏ، ۋ، و
وھ، ہ، ۃ، ء، ئ، ئ، ی، ے، ےھ

اب ان صورتوں، علامتوں، صوتیوں یا حرفوں میں سے بعض کو چند حالتوں میں محض دوسری املائی حالت قرار دے بھی دیں تو بھی ہمارے پاس کم از کم ساٹھ حروف بچ رہتے ہیں۔
اء، ا، ب، بھ، ب، بھ، ت، تھ، ڈ، ڈھ، ښ، ڪ، کھ، ں، ۏ، ڤ، کو محض ٹائپ اور کمپوزنگ میں مختلف علامت قرار دیں تو بھی ۶۴ حروف بچ رہتے ہیں۔ ان میں تائے مدورہ ۃ شامل ہے۔

(جاری ہے)

•

ڈاکٹر تابش مہدی
بیت الرّاضیہ
جی ۵/اے۔ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگرنئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

دبستانِ جگر کا نمایندہ شاعر

غزل کو محض شاعری سمجھ کر اسے حسن وعشق کی داستاں طرازیوں تک محدود کردینا، اس کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔ یہ ہماری تہذیب وجذباتی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔اس نے ساغرو مینا کے پردے میں ہر عہد کی زندگی اوراس کی پیچیدگیوں کی عکاسی کی ہےاور سماجی اور سیاسی حالات وانتشار کی تصویر کشی کی ہے۔اسے اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف کا درجہ حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو کا نام آتے ہی سب سے پہلے اس کی شاعری اور پھر غزل کا تصور اُبھرتا ہے۔رشید احمد صدیقی نے بہ جا طور پر اُردو غزل کو اُردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔اُن کا یہ خیال بھی درست ہے کہ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہےاور دونوں کو ایک دوسرے سے سمت ورفتار ملی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اُردو کی شاعری پر جب بھی گفتگو ہوتی ہے، ناقدین کے سامنے یا تو اقبال ہوتے ہیں یا ترقی پسند نظریہ۔پوری شاعری کے یہی دو محور قرار پاتے ہیں۔میں اِن دونوں کا وجود تسلیم کرتا ہوں لیکن اس بات کا قطعی قائل نہیں ہوں کہ ہر شاعر کا مطالعہ کرنے کے لیے انھیں دونوں کا ماڈل سامنے رکھا جائے اور انھیں کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی تعیین قدر کی جائے۔میری اس بات سے بہ ہر حال آپ بھی اتفاق کریں گے کہ اِن دونوں راستوں سے ہٹ کر بھی بڑی شاعری ہوسکتی ہےاور ہوئی ہے۔

جگر مرادآبادی ہمارے ان مقتولین بے گناہ میں سے ہیں، جن کے ساتھ

ناقدین نے انصاف نہیں کیا۔ کسی نے انھیں ترقی پسند نقطۂ نظر سے دیکھ کر رد کر دیا تو کسی نے اقبال کے ماڈل کو سامنے رکھ کر۔ ۱۹۵۵ء کے بعد سے جدیدیت کی عینک بھی مارکیٹ میں آئی مگر جگر اس پر بھی نہ کھرے ثابت ہوئے۔ یہی سلوک ناقدین کا اُن شعرا کے ساتھ بھی رہا، جو جگر اسکول سے وابستہ رہے ہیں یا جگر اسکول جن کی شناخت رہی ہے۔ اس سلسلے میں نشور واحدی، عارف عباسی، فنا نظامی، عامر عثمانی اور شمیم جے پوری کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ شمیم جے پوری پر کچھ زیادہ ہی تیر ستم چلائے گئے۔

شمیم جے پوری مُشاعروں کے مقبول ترین شعرا میں تھے، اُن کی شرکت مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت تصوّر کی جاتی تھی، نجی محفلوں اور خصوصی نشستوں میں تو دو چار چھے غزلیں بہت سے شعرا سے سن لی جاتی ہیں، کبھی کبھی برداشت کرنے کا بھی جذبہ سامعین میں پیدا ہو جاتا ہے لیکن میں نے کل ہند اور عالمی مشاعروں میں شمیم جے پوری سے دس دس اور بارہ بارہ غزلیں سنی ہیں۔ یہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی اُن کے لیے اِس اعتبار سے مضر ثابت ہوئی کہ ناقدین کی نگہ انتخاب میں وہ نہ آسکے۔ انھیں محض مشاعراتی شاعر سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ ان کے فکر و خیال کی گہرائیوں اور شعر و فن کی گیرائیوں میں اُترنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔

آل احمد سرور کا شعر ہے:

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمھاری بات بھی ہے

غزل میں ذات و کائنات کے مسائل اور آپ بیتی اور جگ بیتی کے پیش کرنے کا ہنر موجودہ عہد کے شعرا میں شمیم جے پوری کے ہاں ہمیں نمایاں طور پر ملتا ہے۔ کہتے ہیں:

اے وائے سعیِ ضبط کہ اکثر ترے حضور
ہنسنے کا اہتمام کیا اور رو دیے

سارے عالم کو ہم بھول بیٹھے مگر
ایک بھولی ہوئی یاد آتی رہی

دل کو غمِ جاناں نے بڑی وسعتیں دی ہیں
آ اے غمِ کونین مرے دل سے گزر جا

شمیم جے پوری نے غزل کی صالح روایات کو اپنے اندر سمویا اور جذب کیا ہے۔ ان کی غزل کی معنویت، رمزیت اور تاثیر سے لذت آشنا ہونے کے لیے پہلے میر، مومن، داغ اور جگر سے تعارف حاصل کرنا پڑے گا۔ شمیم کے ہاں محبت کا تصور پاکیزہ اور لطیف تصور ہے۔ یہ ایسا تصور ہے، جو ہمیں زندگی سے بے تعلق کرنے کے بہ جائے اس سے قریب کرتا ہے۔ شمیم نے خود بھی محبت کی ہے اور ان سے بھی محبت کی گئی ہے اور ایسی محبت کی گئی ہے کہ اُنھیں مقام محبوبیت عطا ہو گیا۔ ایسا مقام محبوبیت جس نے حکیم محمد احمد عباسی، سید محب علی رام پوری، حکیم سیف الدین میرٹھی، حکیم اسلام الحق امروہوی اور ڈاکٹر سید فاروق جیسے نہ جانے کتنوں کو ان کی محبت کا اسیر بنا دیا۔

شمیم جے پوری کی شاعری کا آغاز رباعیات سے ہوا۔ حالاں کہ رباعی ایسا مشکل فن ہے کہ اس کی طرف شعرا کافی مشق و مزاولت کے بعد ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے مختلف اساتذہ سخن سے اصلاح لی، سب سے پہلے ادیب الملک حافظ محمد یوسف علی خاں عزیز آگاہی سے اصلاح لی، ان کی وفات کے بعد حضرت آگاہی کے شاگرد رشید جناب ناظم سنبھلی سے رجوع کیا اور ۱۹۵۱ء میں جب میرٹھ سکونت اختیار کی تو حضرت جگر مرادآبادی اور تسکین قریشی سے وابستہ ہوئے۔ چوں کہ یہ دونوں بزرگ پرستاران تغزل میں تھے، اس لیے شمیم نے بھی رباعی گوئی ترک کر کے غزل گوئی شروع کر دی اور زندگی کے آخری سانس تک دامنِ غزل کو تھامے رکھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ غزل ہی جملہ اصنافِ سخن میں ایک ایسی لطیف صنف ہے، جس میں غم جاناں ہی نہیں غم دوراں کو بھی سمویا جا سکتا ہے۔ بہ شرطے کہ شاعر غزل کا مزاج شناس ہو۔

شاعری شمیم جے پوری کے لیے محض مشغلہ نہیں تھی۔ بلکہ اسے ان کی زندگی میں اُسلوبِ حیات کا درجہ حاصل تھا۔ اُن سے مل کر اور ان سے گفتگو کر کے اکثر یہ سوال ذہن میں اُبھرتا تھا کہ ان کی شخصیت غزل کا عطیہ ہے یا ان کی غزل ان کی شخصیت کا نتیجہ؟ جس میں یہ ہمہ وقت مشغول و منہمک رہتے ہیں۔ اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے سے یہی راز منکشف ہوتا تھا کہ شمیم اور غزل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان کی شخصیت کے خط و خال کی تشکیل غزل کی روایت نے کی اور پھر انھوں نے اپنی تخلیقی

صلاحیتوں سے غزل کی توسیع و تکمیل کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کی زندگی رشید احمد صدیقی کے اس قول کی آئینہ دار تھی کہ کوئی نا معقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا۔ جب ہم بہ حیثیت انسان شمیم جے پوری کی شخصیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شرافت و نجابت اور انسان دوستی و خدمت خلق ان کی سرشت میں داخل تھی۔ اپنی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کا یہ ہنر انھیں اپنے دو محترم اساتذہ حضرت جگر مرادآبادی اور جناب تسکین قریشی سے ورثے میں ملا تھا۔ اس حقیقت کا اعتراف خود شمیم جے پوری نے کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''شمیم'' میں لکھا ہے:

> ''یہ نکتہ بھی انھیں حضرات (جگر مرادآبادی و تسکین قریشی) کی خدمت میں رہ کر میں سمجھ سکا ہوں کہ اچھا شاعر بننے کے لیے اچھے دل اور اعلا کردار کی ضرورت ہے ۔ یعنی اچھا انسان ہی اچھا شاعر بن سکتا ہے۔'' (شمیم ص:۲۳)

شمیم جے پوری کی شخصی زندگی کی یہی بلندی اور شرافت و نجابت ہمیں ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے مزاج و طبیعت کی لطافت و شگفتگی سے غزل کی لطافت و شگفتگی کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کے جس کیف و انبساط سے نام نہاد جدیدیت نے محروم کرنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے اُسے پروان چڑھایا ہے۔

شمیم جے پوری کا آئینہ قلب بغض و عناد اور رشک و حسد کی گرد سے کبھی آلودہ نہیں ہوا۔ اُنھوں نے کبھی ذاتی اغراض کے لیے دامن دوستی کشادہ نہیں کیا۔ ان کی شخصیت کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ جنھیں ان سے قریب رہنے کا اتفاق ہوا ہے، اُنھیں یہ بات بہ خوبی معلوم ہے کہ ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوتا تھا۔ وہ طبعاً بہت نرم دل، حلیم الطبع اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے لیکن کبھی کبھی غیر اخلاقی، انسانیت سے گری ہوئی اور رذیل حرکات پر ان کا ردعمل بہت شدید ہوتا تھا۔ وہ جوش و جذبات سے بھر اٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مسلمان شاعر نے کسی مشاعرے کی نظامت کے دوران اسٹیج سے ایک ایسی بات کہہ دی جو سراسر ملی مفاد کے منافی تھی۔ اخبارات نے اُسے خوب پھیلایا اور اس کے حوالے سے اُن شاعر صاحب کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اندور کے ایک مشاعرے میں شمیم صاحب کی ان سے ملاقات ہوگئی،

بس پھر کیا تھا، شمیم صاحب نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا، بعض لوگوں نے درمیان میں آکر اس وقت بات دبا دی، لیکن اُن شاعر صاحب کی شامت اعمال نے دھکا دیا، پہلی بھیت کے ایک مشاعرے میں شمیم صاحب سے پھر ٹکرا گئے۔ شمیم صاحب نے تمام شاعرانہ رواداری و مروّت کو بالائے طاق رکھا اور اُن سے بھڑ گئے، نوبت بہ ایں جا رسید کہ شمیم صاحب کے ایک شاگرد نے اُن "شاعر اعظم" کو پکڑا اور ایک نالی میں پھینک دیا۔ یہ بات کافی دنوں تک اخبارات کا موضوع بنی رہی، لیکن شمیم صاحب کو کبھی اپنے اس رویے پر ندامت نہیں ہوئی، اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ حق و باطل کا معاملہ تھا۔

شمیم جے پوری مشرقی تہذیب، ثقافت اور وضع داری کا نمونہ تھے، خردوں کے ساتھ شفقت و محبت اور بزرگوں کے ساتھ ادب و احترام کا جو نمونہ ان کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے، کسی اور جگہ وہ ہمیں کم ہی نظر آتا ہے۔ جب ہم شمیم صاحب کے اس قسم کے اشعار پڑھتے ہیں تو ان کے اسی مزاج و طبعیت کی نشان دہی ہوتی ہے:

کچھ اس طرح سے رہو روحِ گلستاں بن کر
تمھارے بعد تمھاری مہک چمن میں رہے

ہر جلوۂ رنگیں سے مجھے کام نہیں ہے
اے دوست مرا ذوق نظر عام نہیں ہے

شمیم جے پوری بنیادی طور پر جگر کی طرح رُومانی شاعر تھے لیکن رومان خواہ کتنا ہی پرفریب کیوں نہ ہو، وہ حقیقت ہی کے زیر سایہ پروان چڑھتا ہے۔ شمیم چوں کہ متوازن ذہن وفکر اور حساس مزاج و طبیعت رکھتے تھے، اس لیے اُنھوں نے وقت کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں سے صرف نظر نہیں کیا۔ ان کی غزلوں میں اِس انداز کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں:

بے وفا تیری زباں پر یہ وفا کی باتیں
ایسا لگتا ہے کہ میں بول رہا ہوں تجھ میں

ہم نے ہر غم کو اُڑھا دی ہے تبسم کی ردا
دل کے زخموں کو چھپا یا ہے گناہوں کی طرح

مسیحا بن کے جو نکلے تھے گھر سے
لہو میں تر انھیں کی آستیں ہے

عہد حاضر کے رہ نماؤں اور امن و آشتی کے نام نہاد علم برداروں کی ظاہر فریبیوں اور ان کی اخلاقی و معاشرتی خرابیوں سے بیزاری کے نمونے شمیم کے ہاں قدم قدم پر ملتے ہیں لیکن اس اظہار بیزاری میں بھی وہ اپنا ایک منفرد اُسلوب رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

سنا ہے لوٹ لیا ہے کسی کو رہبر نے
یہ واقعہ تو مری داستاں سے ملتا ہے

ذرا بھی جس کی وفا کا یقین آیا ہے
خدا گواہ اُسی سے فریب کھایا ہے

آہ وہ منزل جو میری غفلتوں سے گم ہوئی
ہائے وہ رہبر جو مجھ کو راہ سے بھٹکا گئے

دہائی ہے تری اے راہ زن دہائی ہے
کہ آج لوٹ لیا راہبر نے راہوں کو

شمیم جے پوری اس خیال کے حامی تھے کہ غزل اگر اپنے عہد کی تہذیبی قدروں اور معاشرتی تقاضوں کی ترجمانی نہ کرے تو اُسے سچی شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی رائے میں غزل چاہے نالہ و شیون اور کرب و اضطراب کی آئینہ دار ہو، چاہے غم روزگار کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنائے اور چاہے تصوف کی جھلک لیے ہوئے ہو، اس کی تہذیبی اقدار

وروایات کو نظر میں رکھ کر اس کی تخلیق کی جائے تو غزل ہے۔ ان کا خیال تھا کہ شعر کو اُسی دور کے تناظر میں رکھ کر پڑھنا اور اس پر غور کرنا چاہیے، جس دور میں وہ کہا گیا ہے۔
جدیدیت پر نقد کرتے ہوئے شمیم صاحب نے لکھا ہے:

"آج کل غزل کے سانچے کو جس طرح بدلنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اُسے آدمی کی طرح نیچ بنایا جارہا ہے، اُسے محض فرار کا نام دیا جاسکتا ہے، جدّت نہیں کہا جاسکتا۔ جدّت تو میں پسند کرتا ہوں لیکن ہر بے معنی اور بے ڈھنگی چیز کو جدّت ہرگز نہیں تسلیم کرتا۔"
(شمیم ص:۲۵)

شمیم جے پوری نے اردو غزل کو رفعت وطہارت، پاکیزگی و برگزیدگی اور سنجیدگی وشائستگی عطا کی ہے۔ انھوں نے مجاز کے ساتھ حقیقت کے بھی جلوے دکھائے ہیں اور غم جاناں کے پہلو میں غم دوراں کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے ہاں روحانی بلندی بھی ملتی ہے اور عالی حوصلگی بھی اور بلندیِ خیال وشرافت مزاج کے وہ دل کش نمونے بھی، جو اُردو شعرا کے ہاں کم ہی ملتے ہیں۔ اس ذیل میں لے دے کے جگر، اقبال، شفیق جون پوری، نشور واحدی، روش صدیقی اور فاروق بانسپاری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ سچ کہا ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے:

"شمیم جے پوری کی غزلوں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ جگر اور جگر اسکول کے شعرا کی شریفانہ شاعرانہ روایت کا تتمہ وضمیمہ اور اس کی توسیع وتکمیل ہیں۔" (شمیم ص:۷)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے شمیم کو غزل کی زبان اور اس کے لہجے کا رمز آشنا قرار دیتے ہوئے ان کے کلام میں نغمگی، شیرینی، دل کشی ورعنائی، سلاست وحلاوت، متوازن آہنگ اور مترنم کیفیت کی نشان دہی کی ہے اور دوٹوک انداز میں لکھا ہے:

"جہاں تک غزلوں کی معنویت اور داخلی پہلو کا سوال ہے، اس میں شمیم صاحب نے اصغر، جگر اور روش وتسکین کی روایت برقرار اور غزل کی آبرو باقی رکھی ہے۔ عامیانہ اور سوقیانہ انداز اور ابتذال سے دامن بچایا ہے اور مجاز کو

بھی اسی طرح برتا ہے کہ حقیقت دور نہیں رہ جاتی۔"
(شمیم: ص ۸)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اگرچہ سکہ بند ناقد نہیں ہیں، عربی ادب اور اسلامی تاریخ ان کی شناخت ہے، لیکن چوں کہ عربی کے ساتھ ساتھ فارسی اور اُردو کی شعریات پر بھی ان کی [illegible] ہے، اردو شاعری سے انھیں خصوصی دل چسپی ہے، اصغر، جگر، شفیق جون پوری اور روش صدیقی جیسے شعرا سے انھیں خاص لگاؤ ہے۔ اقبال تو ان کے فکری استاذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب "نقوش اقبال" نے عربی واُردو ناقدین کے ایک بڑے طبقے کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے، اس لیے شمیم جے پوری سے متعلق ان کے منقولِ بالا تاثرات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

شمیم جے پوری اگرچہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، لیکن زندگی کے آخری دور میں نعت گوئی سے انھیں خاص شغف ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی نعتوں میں بھی وہی کیفیت اور دل کشی ملتی ہے، جو ان کی غزل میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

دل سوے مدینہ ہے نظر سوے حرم [illegible]
جب دونوں سے نسبت ہے تو کس بات [illegible] ہے

دیوانہ صحن کعبہ میں بے اختیار تھا
طیبہ کی حد میں آکے قرینے میں آگیا

شمیم جے پوری کے ہاں مقام آدمیت کا اظہار قدم قدم پر ملتا ہے۔ مثلاً:

دشمن سے بھی خلوص ہے مجھ کو خدا گواہ
کیسی بھی دشمنی ہو مگر آدمی تو ہے

میر کا شعر ہے:

اگر صبح تک میر روتا رہے گا
تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میر کے اسی مضمون کو شمیم نے اپنے انداز سے ترقی دی ہے:

کسی پہ بار نہیں نالہ ہاے نیم شبی
بڑے سکون سے سوتے ہیں میرے ہم سائے

شمیم جے پوری کی شاعری میں "مے خانے" کا استعارہ کثرت سے ملتا ہے: مثلاً:

پیتے ہیں اور تیرے کرم پر نگاہ ہے
کس درجہ مے کشوں کو شعور گناہ ہے

یہ صحیح ہے کہ اس شعر میں "مے خانے" کا استعارہ روایتی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن شعر سے یہ بات بھی بہ ہر حال واضح ہے کہ اس میں شاعر کا رجحان یا میلان رندی و مے نوشی کی طرف نہیں بلکہ زہد و اتقا کی طرف ہے۔

شمیم نے اس شعر میں بڑے حسین انداز میں اپنا تصور کائنات پیش کیا ہے

عشق اگر بندگی ہے دنیا کی
حسن اک عالم خدائی ہے

اسی طرح اس شعر سے ان کی حقیقت پسندی اور ہر حال میں راضی بہ رضا رہنے کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:

کوئی تو مصلحتِ خاص اس میں ہے ورنہ
شمیم رحمتِ پروردگار کو ترسے

شمیم جے پوری کی شاعری میں سفر کا بہت وسیع المفہوم تصور ملتا ہے۔ سفر کا یہ استعارہ ان کے ہاں بڑی تکرار مگر تنوع اور دل آویز انداز میں ملتا ہے۔ مثلاً

میں راہِ عشق کا تنہا مسافر
کسے آواز دوں کوئی نہیں ہے

خیال دوریِ منزل تو کچھ نہیں اے دل
مگر حیات بہت کم ہے کیا کیا جائے

جادۂ عشق کی شاید کوئی منزل ہی نہیں
زندگی ختم ہوئی اور سفر باقی ہے

منزل و راہ پر نہیں موقوف
چلنے والے ضرور چلتے ہیں

''ترک تعلقات'' اور ''مجبوری'' کا تصور بھی شیم صاحب کے ہاں بہ کثرت ملتا ہے لیکن یہاں بھی ان کی بلندی فکر اور ندرت خیال کا کرشمہ نظر آتا ہے اور جتنی بار بھی ترک تعلق کا مفہوم آتا ہے ایک نئی لذت اور منفرد کیفیت لے کر آتا ہے۔ کہتے ہیں:

ترک تعلقات کو مدت ہوئی مگر
دنیا پکارتی ہے مجھے لے کے تیرا نام

پھر یہ رہ رہ کر کسی کی یاد تڑپاتی ہے کیوں
اب تو ہم ترکِ محبت کی قسم بھی کھا گئے

اب حوصلہ ترکِ ملاقات کرے ہے
اتنا سا دل اور کتنی بڑی بات کرے ہے

اردو شاعری کی دنیا میں مختلف رجحانات اور تحریکوں نے اپنے جلوے دکھائے، اپنی چمک دمک اور تشہیری ہتھکنڈوں سے متاثر کرنے کی کوشش کی، ترقی پسندی کا دور آیا، پھر جدیدیت نے اپنی آرائش وزیبائش دکھائی، مابعد جدیدیت کا نعرہ بلند ہوا۔ اب شاید مابعد مابعد جدیدیت کا آوازہ بلند ہو، یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا لیکن شمیم جے پوری سنجیدگی اور یک سوئی کے ساتھ گیسوئے غزل سنوارتے رہے اور صرف اور صرف نشۂ غزل میں مست وسرشار رہے۔ پاکیزہ معانی ومطالب صحت مند خیالات وجذبات اور بلند احساسات سے ان کی غزل کا دامن لبریز ہے، استقامت اور شرافت نفس کی تجلیاں قدم قدم پر دامن دل کو کھینچتی ہیں۔ اُنھوں نے زندگی کی صالح، تعمیری اور صحت مند قدروں پر زور دیا ہے اور مریضانہ و مایوسانہ لہجہ و اُسلوب اور فاسد افکار وخیالات سے گریز کرتے ہوئے اپنے شعروں کو حقائق سے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی طرف سے جدید شاعری میں بے حد بے نیازی برتی جارہی ہے۔ ان قدروں کا پاس دار بہ قول مولانا علی میاں ندوی دبستانِ جگر کا کوئی نمائندہ ہی ہوسکتا ہے۔

رفعت سروش

مسیحا چلا گیا

(بہ یاد حکیم عبدالحمیدؒ)

انسانیت کا والہ و شیدا چلا گیا ۔ اے آنکھ خون رو، کہ مسیحا چلا گیا

ہمدردی وخلوص کا پیکر تھی جس کی ذات وہ غمزدہ دلوں کا شناسا چلا گیا

لو اُٹھ گیا وہ سید و اجمل کا ہم نوا سو محفلیں جما کے اکیلا چلا گیا

ہر انجمن میں ہے صف ماتم بچھی ہوئی محفل وہی ہے انجمن آرا چلا گیا

ہر شغل زندگی کا عبادت کی طرح تھا سیرت میں تھا وہ ایک فرشتہ چلا گیا

دیکھا کبھی تضاد نہ قول اور فعل میں علم وعمل کا تھا وہ سراپا چلا گیا

طب کو کیا جدید تقاضوں سے ہم کنار وہ عہد نو کا بوعلی سینا چلا گیا

تھا اس کا ہاتھ قوم کی نبضِ ضعیف پر تجویز کر کے نسخہ شفا کا چلا گیا

لکھا، جدید علم ہے اس قوم کا علاج فطرت شناسِ ملتِ بیضا چلا گیا

غالب نواز ، محسن اردو ، سخن شناس اہل ادب کا چاہنے والا چلا گیا

تہذیب مشرقی کا نمونہ کہیں جسے دلی وہ تیرا گوہرِ یکتا چلا گیا

صدیاں اب اس کی موت پہ آنسو بہائیں گی

پیدا ہوا تھا ایک مسیحا، چلا گیا

عبداللطیف اعظمی
ذاکر نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵

حکیم عبدالحمید دہلوی

حکیم عبدالحمید مرحوم ان چند مسلمانوں میں سے ہیں جو ملک کی آزادی کے بعد ابھر کر سامنے آئے ہیں اور ان کے علمی اور تعمیری کارنامے سے نوع بہ نوع کے اتنے وسیع اور اہم ہیں کہ انھیں اس طور پر اس دور کا سرسید کہا گیا ہے۔

مرحوم مالک رام صاحب نے جو مکتبہ جامعہ کے قابل ذکر اور اہم ترین ڈائرکٹر تھے، ۱۹۹۱ء میں "نذر حمید" کے نام سے کتاب مرتب کی تھی، جسے حکیم صاحب کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر مکتبہ جامعہ نے شائع کیا تھا۔ اس کا پیش لفظ مکتبہ جامعہ کے ایک دوسرے اہم ڈائرکٹر کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم نے لکھا ہے، جس میں مالک رام صاحب مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا ہے "مالک رام صاحب لائق مبارک باد ہیں کہ وہ ہندستان کے ایک عظیم فرزند اور ۱۹۴۷ء کی کٹی ہوئی دلی کے ایک مرد مجاہد کی ستر سالہ خدمات کا اعتراف ایک تبریک و تہنیت کی کتاب کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ آگے چل کر مرحوم زیدی لکھتے ہیں: "بعض افراد یا شخصیتیں ایک فرد یا شخصیت سے بڑھ کر بجائے خود ایک ادارہ بن جاتی ہیں۔ یہ بات پوری طرح حکیم صاحب پر صادق آتی ہے۔ جہاں تک میں ان کی زندگی یا حالات سے واقف ہو سکا ہوں، مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر تامل نہیں کہ ان کی زندگی کے ستر سال مختلف کیفیات وصفات کا بڑا حسین امتزاج ہیں۔"

لکھنؤ کے ایک ہفت روزہ اخبار "ندائے ملت" نے ۲۹ر نومبر ۱۹۹۸ء کو حکیم عبدالحمید نمبر نکالا تھا، جس میں مرحوم کے بارے میں حسب ذیل باتیں لکھی ہیں:

۱۔ تاریخ پیدائش: ۱۴ر ستمبر ۱۹۰۸ء

۲۔ خاندان : دولڑکے اور ایک لڑکی (اہلیہ محترمہ کی وفات ۱۶ر فروری ۱۹۸۴ء میں ہوگئی۔)

۳۔ تعلیم: طبیہ کالج قرول باغ۔ نئی دہلی
۴۔ فاؤنڈر چانسلر۔ جامعہ ہمدرد۔ ہمدرد نگر۔ نئی دہلی ۶۲
۵۔ خطابات: ابن سینا، ۱۹۹۳ء میں روس نے ایوارڈ دیا۔
۶۔ پدم شری ۱۹۶۵ء میں ہندستان نے عطا کیا۔
۷۔ پدم بھوشن ۱۹۹۱ء میں ہندستان نے عطا کیا۔

جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی جو اس وقت ہمدرد نگر کے ایک اہم رکن ہیں، حکیم صاحب کی زندگی میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا: "حکیم عبدالحمید صاحب کے ساتھ رسم و راہ چھٹی دہائی میں شروع ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی تعلیمی کاوشوں میں شریک ہو جاؤں۔ میں ان کا شروع سے قائل تھا۔ .. میں نے شرط یہ رکھی کہ میں رہوں گا ہمدرد نگر میں، لیکن اپنے تعلیمی اور تربیتی مشن کے لیے ہندستان کے مختلف علاقوں میں جاتا رہوں گا۔ تنخواہ کی پیش کش کی گئی، جسے ظاہر ہے کہ میں قبول نہیں کر سکتا تھا۔ مکان کی سہولتیں اور عملہ میرے حصے میں آیا۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی میری تحویل میں دی گئی اور حکیم صاحب کا تعلیمی مشیر بھی قرار پایا۔"

موصوف نے اپنے اس مضمون میں ایک جگہ حکیم صاحب کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ:" "حکیم صاحب بولتے کم ہیں: کرتے بہت زیادہ ہیں اور سوچتے اس سے بھی زیادہ ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کو اپنے کاموں اور کارناموں سے بھر دیا ہے جو کسی آدمی کی کمر توڑ دینے کے لیے کافی تھے۔" موصوف مزید لکھتے ہیں: "ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی جو کام کر رہی ہے، اس کے پیچھے اس کے بانی کا یہ مقصد چھپا ہوا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں میں قیادت کا جو بھیانک کال تقسیم ہند کے چند سال بعد رونما ہوا ہے۔" اس قحط کو دور کیا جائے۔"

طوالت سے بچنے کے لیے بس اتنے ہی اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں، جو ہمدرد سوسائٹی اور حکیم صاحب مرحوم کی خدمات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے میرے نزدیک کافی ہیں۔

پروفیسر ظفر احمد نظامی
شعبہ سیاسیات،
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

بابائے طب حکیم عبدالحمید

درمیانہ قد، پُر وقار خال و خد۔ اجلا اجلا چہرا، آنکھوں پر شیشوں کا پہرا۔ تا بہ حد نظر پیشانی، عظمت کی کہانی۔ ابھری ہوئی ناک، دل معصوم اور پاک ـــ یہ تھے جامعہ ہمدرد کے چانسلر، خلوص کا پیکر۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے سربراہ، مسیح درد آگاہ۔ بابائے طب یونانی، مسیح الملک ثانی۔ عامل اصولِ فطرت، مجسمہ صداقت و شرافت۔ عالی ہمت و بلند نظر، تہذیب مشرقی کا مظہر۔ مقررِ خاموش، ذی عقل و ذی ہوش۔ عہد آفریں شخصیت، سراپا شفقت و محبت۔ دلوں کے لیے مرکزِ امید،۔۔۔ یعنی حکیم عبدالحمید۔

حکیم صاحب ۱۴ ر ستمبر ۱۹۰۸ کو عالمِ وجود میں آئے اور عبدالحمید دہلوی کہلائے۔ وہ حکیم حافظ عبدالمجید کے فرزند تھے، ''رابعہ ہندی'' کے دلبند تھے۔ انھوں نے دامنِ علم دراز کیا، جامعہ رحمانیہ سے تعلیم کا آغاز کیا۔ اگرچہ بار بار اسکول بدلتے رہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر چھٹی جماعت میں داخلہ لیا، اینگلو عربک اسکول کا اونچا نام کیا۔ پھر تعلیم نذرِ تحریک موالات ہوگئی، غیر یقینی حالات کی وادیوں میں کھوگئی۔ ۱۹۲۲ء میں والد کا انتقال ہو گیا، گھر بار سنبھالنا محال ہو گیا۔ اس لیے علم طب میں دل لگایا، انجام کار اس کا انعام پایا۔ طبیہ کالج سے فارغ التحصیل ہوئے۔ منزل طب کا سنگِ میل ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں مطب شروع کیا، ترقی کا مہر تاباں طلوع کیا۔ روز بروز مشاق ہوئے فنِ طب میں طاق ہوئے حکیم اجمل خاں کا مطب ان کے لیے تجربہ گاہ بنا، معالجانہ زندگی کے لیے مشعل راہ بنا۔ والد نے سو روپے سے ہمدرد دواخانہ کی داغ بیل ڈالی تھی، ترقی کی منزل پر پہنچنے کی سبیل نکالی تھی۔ حکیم صاحب نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا، طب یونانی کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ تشخیص و تجویز میں بے نظیر رہے، ''ہمدرد صحت'' کے مدیر رہے۔

جب تقسیم ہند کے بعد لوگ بھاگ رہے تھے تو حکیم صاحب جاگ رہے تھے۔ انھوں تغلق آباد کو آباد کرنے کا منصوبہ بنایا، عمارتوں کا جال بچھایا۔ وہ تعمیرات میں شاہجہاں تھے، کتنے ہی اداروں کے روح رواں تھے۔ ان کے ذہن نے کئی پیکر ڈھالے تھے، جوان کی فکر کے اجالے تھے۔ وہ ہمدرد طبی کالج کو وجود میں لائے، ہمدرد نرسنگ ہوم کے بانی کہلائے۔ انھوں نے مجیدیہ ہسپتال کو قوم کے نام کیا، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کو عام کیا۔ رابعہ گرلز اسکول قائم کیا، ہمدرد پبلک اسکول کو جنم دیا۔ اسکولوں اور کالجوں کا سروے کرایا، دینی مدرسوں کی جانچ کا بار اٹھایا۔ دراصل وہ ملت کا مزاج سمجھتے تھے، تعلیم کو اس کی بیماریوں کا علاج سمجھتے تھے۔ انھوں نے عصری و دینی علوم کو پھیلایا، طب یونانی کو جدید ترین بنایا۔ ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو وجود میں لائے، تحقیق کرنے والوں کے حوصلے بڑھائے۔ ہمدرد آرکائیوز اینڈ ریسرچ سینٹر کو آگے بڑھایا، ٹیکنیکل ٹرمس ریسرچ پروجیکٹ کو اپنایا۔ رفیدہ نرسنگ اسکول کا قیام عمل میں لائے، اسی طرح کے کئی ادارے بنائے۔ وہ قدر اتحاد بین الملل سمجھتے تھے، وفاق کو سیاسی مسائل کا حل سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے سینٹر آف فیڈرل اسٹڈیز کو مرکزی حیثیت دی، سینٹر فار ایشین اسٹڈیز کو وسعت دی۔ بزنس اینڈ ایمپلائمنٹ بیورو ان کے ذہن کی اپج ہے، سینٹر فار ایڈوانسڈ سوشیولاجیکل اسٹڈیز کی بڑی سج دھج ہے۔ انھوں نے ہمیشہ تاریخ کو صحیح پس منظر میں یاد رکھا، اسی لیے ہمدرد ہسٹاریکل ریسرچ سنٹر کا سنگِ بنیاد رکھا۔

غالب ان کے پسندیدہ شاعر تھے، بڑے محبوب اور چیدہ شاعر تھے۔ ان کے اجداد کے ہمسایہ میں رہا کرتے تھے، گلی قاسم جان میں شعر کہا کرتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے انھوں نے حقِ ہمسائگی نبھایا، غالب کے مرقد سے ملحق غالب اکیڈمی کو تعمیر کرایا۔ کالج آف فارمیسی ان کا کامیاب ادارہ ہے، مطالعات اسلامی کا انسٹی ٹیوٹ روشن ستارہ ہے۔ وہ آل انڈیا طبی کانفرنس کے صدر تھے، ملک وقوم کے لیے قابلِ قدر تھے۔ انھوں نے ان تمام اداروں کو تنہا سنبھالا، جامعہ ہمدرد کو عملی شکل میں ڈھالا۔ وہ ان تمام کارہائے نمایاں کا سبب ہوئے اسی لیے اس دانشگاہ کے اولین چانسلر منتخب ہوئے۔ آج ہمدرد نگر ایک پُر رونق بستی ہے، جہاں حکیم صاحب کے کرم کی بارش برستی ہے۔

اگرچہ حکیم صاحب ذہنِ جدید کے حامل تھے، تاہم مشرقی اقدار پر عامل تھے۔

خدمت انسانیت ان کا شعار تھا، خلقِ خدا کو ان پر اعتبار تھا۔ انھیں پیرا کی کا شوق تھا، مطالعہ کا ذوق تھا۔ بہت کم بولتے تھے، شاذ ہی لب کھولتے تھے۔ اگر چہ نظریں نیچی رکھتے تھے، مگر انسانوں کو پرکھتے تھے۔ صاحبانِ علم و فن کے جوہر شناس تھے، اسی لیے قد آور اشخاص ان کے آس پاس تھے۔ وہ سادگی کا پیکر تھے، بلند خیالی کا مظہر تھے۔ ذہن پر فکر کی مالش کرتے تھے، اپنے جوتوں پر خود پالش کرتے تھے۔ فرش پر سوتے تھے، اپنے کپڑے آپ دھوتے تھے۔ نوجوانوں سے تیز چلتے تھے، علی الصبح میلوں ٹہلتے تھے۔ عید اور ہولی پر لوگوں کو گلے ملواتے تھے، دلوں میں قومی یک جہتی کے جذبات جگاتے تھے۔ وقت کے ایسے پابند کہ لوگ گھڑیاں ملاتے تھے، عوام و خواص میں "بڑے حکیم صاحب" کہلاتے تھے۔

ان کی نظر صدا بلند رہی، نمائش ہمیشہ ناپسند رہی۔ خود کو عام انسان خیال کرتے تھے ہمیشہ فی ایٹ کار استعمال کرتے تھے، ڈرائیور کے پاس والی سیٹ پر بیٹھتے تھے، تکلیف اٹھاتے تھے مگر بیٹھتے تھے۔ اگر چہ وہ سیاستدانوں کے درمیان ضرور رہے، مگر سیاست سے ہمیشہ دور رہے۔ وزرائے اعظم نے ان کا احترام کیا، ہر صدر جمہوریہ نے ان کی عظمت کو سلام کیا۔ حکومت ہند نے پہلے انھیں پدم شری بنایا، بعد ازاں پدم بھوشن سے سجایا۔ روس نے ابن سینا ایوارڈ سے صاحبِ امتیاز کیا، پاکستان نے ڈی لٹ سے سرفراز کیا۔ ایران سے نیشنل اکیڈمی آف سائنس کی رکنیت کا اعزاز پایا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنا چانسلر بنایا۔

وہ طبیب کی حیثیت سے معروف رہے، زندگی بھر مریضوں کے معالجہ میں مصروف رہے۔ خداوند تعالیٰ نے انھیں کامیاب کیا، تقریباً ساٹھ لاکھ بیماروں کو شفایاب کیا۔ انھوں نے فن طب کو وقار بخشا، اسے ہر جگہ اعتبار بخشا۔ وہ محض نظریات کے قائل نہیں رہے، زبانی جمع خرچ کی جانب مائل نہیں رہے۔ وہ عمل کی اہمیت پہچانتے تھے، اسی لیے صرف عمل کرنا جانتے تھے۔ کیونکہ وہ کہتے کم تھے کرتے زیادہ تھے، عمل اور صرف عمل کے دلدادہ تھے۔ دانشوری اور دانشمندی کی روایات کے امین تھے، ایوانِ عزم و استقامت کے مکین تھے۔ یکتائے روزگار و ماہر فن تھے، غرضیکہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ انجام کار اسلامی ہند میں حشر اٹھا گئے، ۲۳ جولائی ۱۹۹۹ء کو کیا نوے سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ اب ان کا کوئی جوہر کبھی ہویدا نہیں ہوگا، ایسا شخص ہندستان میں پیدا نہیں ہوگا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
(میر)

بھگوان داس اعجاز
ٹی۔۲۵۱، بال جی نگر، نئی دہلی

انگ بکیں بازار میں....

آدھے گھر میں بھکری ، آدھے گھر پکوان
ایک ہی گھر میں ہو رہی ، دو گھر کی پہچان

انگ بکیں بازار میں ، آنکھیں ، گردہ ، خون
جیسے جان غریب کی ، ہو دُکان پر چون

دیواروں کی روٹ میں ، بکے کھڑکیاں دوار
جی ہاں! جیتے جی لگا ، میرے گھر بازار

کھانے کو روٹی نہیں تن پر نہیں لباس
رام راج کی آس میں ، کاٹے سال پچاس

پھل کے چھلکے بین کر ، بھرنے خالی پیٹ
فاقہ کش ماں باپ کے ، بچے ہوگیے سیٹھ

بھوک پیاس کی مار سے ، مرتا روز غریب
خود تو جاگے رات بھر ، سویا رہے نصیب

بھاڑے کا گھر چھوڑ کر ، آبیٹھے فٹ پاتھ
کی غریب نے خودکشی بچے ہوئے اناتھ

ڈاکٹر ہلال فرید
۱۴، اوسٹرلی لاج، چرچ روڈ، آئزل ورتھ،
مڈل سیکس، ٹی۔ ڈبلیو۔ ۷۔ ۴۔ پی۔ کیو
لندن (یو۔کے)

غزل

وقت نے رنگ بہت بدلے کیا کچھ سیلاب نہیں آئے
مری آنکھیں کب ویران ہوئیں کب تیرے خواب نہیں آئے

دل صحرا کا وہ تشنہ لب ہر بار یہی سوچا جس نے
ممکن ہے کہ آگے دریا ہو اور کوئی سراب نہیں آئے

ہر شخص کیوں اتنا پریشاں ہے کس بات پہ آخر نالاں ہے
کیا خوشبو لوٹ نہیں پائی کے اب کے گلاب نہیں آئے

تم قرب کی راحت کیا سمجھو تم ہجر کی وحشت کیا جانو
تم نے وہ رات نہیں کاٹی تم پر وہ عذاب نہیں آئے

پہلے بھی جہاں پر بچھڑے تھے وہی منزل تھی اس بار مگر
وہ بھی بے لوث نہیں لوٹا ہم بھی بیتاب نہیں آئے

ہم کو تو ہلال یہ لگتا ہے جب تک نہ پڑھو تم اپنی غزل
چہروں کے گلاب نہیں مہکیں محفل پہ شباب نہیں آئے

امیر حمزہ ثاقب
۵۰۹ ردھار منگر ناکہ، بھیونڈی

غزل

متاعِ یادِ رفتہ کھو رہا ہوں
رواں ہے زندگی میں سو رہا ہوں

سبھی اک دوسرے پر منحصر ہیں
میں اپنا بوجھ تنہا ڈھو رہا ہوں

مجھے سب بے دلی سے پڑھ رہے ہیں
صحیفہ زندگی کا ہو رہا ہوں

خود آگاہی عذابِ آگہی ہے
میں لمحہ لمحہ خود کو کھو رہا ہوں

بھلے ہی راہ منزل میں ہوں تنہا
یہ کیا کم ہے کہ میں چل تو رہا ہوں

بھلا کیوں روئے ثاقب کوئی مجھ پر
میں اپنی لاش پر خود رو رہا ہوں

آر۔ کے۔ روشن
احمد آباد

(۱)

میں ہوں ایسا چراغ
جس کو ظلمت کے ہاتھوں نے روشن کیا
اور سورج کی دہلیز پر رکھ دیا

(۲)

التجا

کچل جائیں
نہ رنگ و بو
ترے قدموں
تلے اب کے
بہارِ نو
گلستاں میں
ذرا آنا
سلیقے سے

(۳)

نظم گلستاں

پھولوں کے صحن میں سجے
رنگوں کے دائرے
کانٹوں کے گھر میں اترے ہیں
خوشبو کے قافلے

غیاث الرحیم شکیب
ڈونگہ پور گیٹ، جاورہ

آخری خط

(احمد ندیم قاسمی صاحب کے نام)

میں نے سوچا تھا کہ تم کو خط لکھوں
اور یوں جینے کی کچھ کوشش کروں
خط کہ جس میں ذکر ہو ماحول کا
تم وہاں پر خوش رہو
میں بھی یہاں پر خوش رہوں
یہ روایت بھی روایت ہے
حقیقت کیا لکھوں
اور کیا لکھوں کہ اب مہلت نہیں
مجھ کو طے کرنا ہے تھوڑا فاصلہ
اس سے پہلے ہی کہ سورج جا چھپے
اپنی منزل پر پہنچنا ہے مجھے
آج جو لکھنا تھا وہ تو لکھ چکا
اور کیا باقی بچا ہے سوچنے کے واسطے
ہاں فقط یہ رہ گیا ہے دیکھنے کے واسطے
بوڑ برگد کی جٹائیں
پھوٹی قبروں کے نشاں
اک ہوا کا تیز جھونکا
سوکھے پتے لے اڑا
چونٹیوں کی کچھ قطاریں
مردہ کیڑوں کو اٹھائے
اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہیں
چیل اونچی شاخ پر اک چڑیا کو دبائے
نوچتی کھاتی رہی
ہوا میں ہر طرف بکھرا کیے
سانس کی سینے میں جنگ ہونے لگی
چند قطرے اور پانی نہ ملا تو کیا ہوا
سمندر پی چکے اس کا نہیں کوئی حساب
اندھیرا برف کی چادر لپیٹے
ہر طرف چھانے لگا
قطرہ قطرہ زندگی رستی رہی
کاخالی ہو گیا
چنے کو کیا بچا کچھ بھی نہیں

ابراہیم اشک
رشید کیمپ، کوسہ ممبرا
تھانہ (مہاراشٹر)

دوہے

سونے سے زیادہ کھری، بچے کی مسکان
یہ دولت سب سے بڑی، جان اسے نادان
میں نے پرکھا ہے اسے، تو بھی پرکھ کے دیکھ
بڑا ہی معنی خیز ہے یہ قسمت کا لیکھ
کون کسی کا یار ہے کس کو کس سے پیار
غرض کے سارے داس ہیں کہے تجربہ کار
اے دل تجھ سے میں کہوں گانا ایسا گیت
سنے جو دشمن کوئی تو سیکھے وہ بھی پریت
آموں کی امرائیاں اور برگد کی چھانو
دھوپ جو دیکھی شہر کی، یاد آتا ہے گانو
کڑوا ہے ماحول تو بولی میٹھی بول
بول ہی ایسی چیز ہے من جاتا ہے ڈول
سنگت ایسی کیجیے، ملے گیان کا دان
نادانوں میں بیٹھنا خود کا ہے اپمان
شہرت کے بھوکے ہوئے شاعر اور ادیب
کچھ ایسے ہی دور میں مٹتی ہے تہذیب
بچوں سے مایوں ہے گھر میں بوڑھا باپ
کل جو اس کا خواب تھا آج بنا ہے پاپ
دیکھے ہم نے باولے، اس دنیا کے لوگ
بدلے میں دس لاکھ کے، دس پیسے کا بھوگ

فصیح اللہ نقیب
اصغر حسین جونیر کالج
آکولہ۔ مہاراشٹر

غزل

صبر سے ہاتھ دھو کے بیٹھے ہیں
آنسوؤں کو بھی رو کے بیٹھے ہیں
کس کی تصویر ہے تصور میں
کیسے تصویر ہو کے بیٹھے ہیں
دل میں غم کو سمونے والے ہم
دل کو غم میں ڈبو کے بیٹھے ہیں
درس دیتے ہیں اب قناعت کا
ہاتھ گنگا میں دھو کے بیٹھے ہیں
مدعی ہیں ہمہ شناسی کے
خود کی پہچان کھو کے بیٹھے ہیں
ہے توقع سبک خرامی کی
راہ میں خار بو کے بیٹھے ہیں
ذہن پر مارتی ہے پھن الجھن
دل میں خدشے چبھو کے بیٹھے ہیں
زہر دیتے ہو قطرہ قطرہ کیا
ہم سمندر بلو کے بیٹھے ہیں
ہاتھ ہیں صاف گو نقیب ان کے
آستینیں بھگو کے بیٹھے ہیں

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی
اردو محلہ
اٹاوہ۔ یوپی

غزل

مالکِ بزم گلستاں ہو تم
پھر بھی محروم آشیاں ہو تم
عیش دنیا میں کھو نہ جاؤ کہیں
آبروئے غمِ جہاں ہو تم
پھونک دو کبر خرمن باطل
شعلۂ برق بے اماں ہو تم
باغبانوں نے جن کو لوٹ لیا
ان بہاروں کی داستاں ہو تم
اہل دنیا مٹا نہیں سکتے
ایسی تہذیب کا نشاں ہو تم
دشمنوں کو خبر نہ ہو جائے
کشتۂ تیغ دوستاں ہو تم
پاسبانِ حریم جاں ہو مگر
میری آنکھوں سے کیوں نہاں ہو تم
خوبصورت زبان رکھتے ہو
پھر بھی اے راز بے زباں ہو تم

مجتبیٰ حسین
۲۰۰ الکورا اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج، نئی دہلی ۔ ۹۲

یوم آزادی ۔ بچوں کے لیے ایک سبق

بچو! آج یوم آزادی ہے ۔ ۵۲ برس پہلے آج ہی کے دن ہم نے آزادی حاصل کی تھی ۔ کیوں حاصل کی تھی؟ یہ سوال شاید اس وقت کے رہنماؤں کو معلوم رہا ہو آج کسی کو نہیں معلوم ۔ تم بھی جان کر کیا کرو گے ۔ جس طرح ہر کسی کو سوال کرنے کی آزادی حاصل ہے اسی طرح تمھیں بھی کسی سوال کا جواب نہ جاننے کی آزادی حاصل ہے ۔ آزادی کے یہی تو فائدے ہیں ۔ فارسی میں ایک مقولہ ہے جواب جاہلاں باشد خموشی ۔ ہمیں فارسی نہیں آتی تاہم ہم نے اپنی دانست کے مطابق اس کا ترجمہ یہ کر رکھا ہے کہ دانشوروں کی کسی بات کا جواب نہ دو ۔ مانا کہ یہ ترجمہ بھی آزاد ہے کیونکہ ہم نے جاہلوں کا ترجمہ دانشوروں کر دیا ہے ۔ تاہم موجودہ حالات کے مطابق یہی ترجمہ درست ہے کیونکہ آزادی سے پہلے ہمارے ملک کے دانشور، دانشور ہی کہلاتے تھے ۔ مگر اب ان کا شمار جاہلوں میں ہونے لگا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دانشوروں کو بھی اب یہ آزادی حاصل ہو گئی ہے کہ جب جی چاہا جاہلوں کی سی بات کریں ۔ آزادی کے یہی تو فائدے ہیں ۔

جب تک ہمارا ملک آزاد نہیں ہوا تھا تب تک ہمیں روز مرہ کے کام کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ انگریز ہر معاملہ میں اپنی ٹانگ اڑا دیتے تھے ۔ اب حالات بدل گئے ہیں کیونکہ ہم اب بالکلیہ آزاد ہیں ۔ تاجروں کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جب جی چاہے چیزوں کے دام بڑھا دیں، انھیں یہ بھی آزادی حاصل ہے کہ وہ چیزوں میں جی بھر کے ملاوٹ کریں ۔ ایک مرغی کے گوشت میں ایک سالم اونٹ کا گوشت ملا دیں اور یہ اعلان کریں کہ انھوں نے تو صرف پچاس فیصد ملاوٹ کی ہے ۔ اس ملاوٹ پر اونٹ اور مرغی کو بھلے ہی اعتراض ہوتا ہو تو ہو لیکن عام آدمی کو اعتراض کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی ۔

سیاست دانوں کو یہ آزادی ملی ہوئی ہے کہ وہ جتنی چاہیں پارٹیاں بدلیں ۔ جب جی چاہے

اپنے نظریات بدل دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد سیاسی پارٹیوں کی حیثیت "نئی پارٹیوں" کی سی ہوگئی ہے کہ چاہے پی لی اور دوسری پارٹی کی طرف چلے گئے۔ بعض لیڈروں کو تو اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ آزادی کے بعد وہ کتنی پارٹیاں بدل چکے ہیں۔ ایک زمانہ میں لیڈر کسی پارٹی میں شامل ہوتا تھا تو اسی پارٹی کے کارکن کی حیثیت سے اس کا جنازہ بھی اٹھتا تھا۔ اب لیڈر کے جنازے کو کندھا دینے والے ایک ہی پارٹی کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ "مخلوط جنازے" نکلتے ہیں۔

چاہے کچھ ہو۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان دنوں فضا میں آلودگی بہت بڑھ گئی ہے اس کی وجہ بھی آزادی ہے۔ ہر ایک کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ فضا کو آلودہ کرے۔ اپنے گھر کی گندگی کو سڑک پر پھینک دے۔ اپنی موٹروں کا دھواں فضا میں پھیلا دے۔ کارخانے ایسی جگہ قائم کرے جہاں سے آلودگی سیدھے لوگوں کی ناک میں چلی جائے کہیں اور نہ جائے۔ دوسری طرف لوگوں کو یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ وہ اس آلودہ فضا کو جتنا چاہیں استعمال کریں کوئی پابندی نہیں ہے۔ آزادی کے یہی تو فائدے ہیں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ ہم نے آزادی انگریزوں سے حاصل کی تھی۔ انگریز بڑے ظالم تھے۔ جب تک اس ملک میں رہے تاریخ بناتے رہے۔ جاتے ہوئے اس ملک کا جغرافیہ بگاڑ گئے۔ انگریز برسوں اس ملک کی دولت کو لوٹتے رہے کسی اور کو لوٹنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔ جب سے ملک آزاد ہوا ہے تب سے مقامی لوگوں کو بھی لوٹنے کی یہ آزادی مل گئی ہے۔ مقامی تاجر، سرمایہ دار، صنعت کار، سیاست داں افسر غرض بھی لوٹنے کے معاملے میں آزاد ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ انگریز ملک کو لوٹتے تھے اب براہ راست عوام کو لوٹا جاتا ہے اور بہ بانگ دہل لوٹا جاتا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو لوٹنے والے غیر ملکی تو نہیں ہیں۔ اپنے لوگ ہی اپنے لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ غیروں کے ہاتھوں لٹنے سے بہتر تو یہی ہے کہ آدمی اپنوں کے ہاتھوں لٹ جائے۔ آزادی سے پہلے مقامی لوگوں کو لوٹنے کی یہ آزادی حاصل نہیں تھی کیونکہ انگریز اپنی ٹانگ اڑا دیتے تھے۔ انگریز تو خیر ہمارے ملک کی دولت کو برطانیہ پہنچاتے تھے لیکن اب مقامی افراد کو بھی یہ آزادی حاصل ہوگئی ہے کہ وہ اپنی فالتو دولت کو سوئیزر لینڈ میں رکھیں۔ آزادی سے پہلے کوئی اپنی دولت کو سوئیزر لینڈ میں رکھنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا آزادی کے یہی تو فائدے ہیں۔

بچو! آزادی نے ہمیں کئی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے۔ آزادی سے پہلے اس ملک میں اظہار خیال کی آزادی نہیں تھی۔ اب اظہار خیال کی پوری آزادی ہے۔ اگر ایک مقرر کسی جلسہ میں

ایک گھنٹہ سے لگا تار بول رہا ہو اور اگر ایسے میں کوئی اس کے لگا تار بولنے پر اعتراض کر دے تو وہ اڑ جائے گا کہ صاحب آپ کون ہوتے ہیں میرے اظہار خیال پر پابندی لگانے والے۔ اس ملک میں تو سب کو اظہار خیال کی آزادی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اظہار خیال کی آزادی سے اب وہی لوگ زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں جن کے پاس خیال تو کوئی بھی نہیں ہوتا صرف اظہار کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اظہار خیال کی اس آزادی کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں اب ہر آدمی اپنی اپنی ڈفلی بجائے چلا جا رہا ہے۔ آزادی سے پہلے لوگوں کی ڈفلیاں بیکار پڑی رہتی تھیں اب یہ صورت حال نہیں رہی۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ انگریزوں نے اس ملک میں پہلی ریل گاڑی چلائی تھی۔ بعد میں ریل گاڑیاں تو بہت چلنے لگیں لیکن انگریزوں کے خوف و ڈر کی وجہ سے ایک پٹری پر ایک ہی ریل گاڑی کو چلانا پڑتا تھا۔ اب چونکہ ملک آزاد ہو گیا ہے اس لیے ہمیں یہ آزادی مل گئی ہے کہ ہم دو مخالف سمتوں سے آنے والی ٹرینوں کو بھی ایک ہی پٹری پر چلا دیں۔ مانا کہ اس طرح ٹرینوں کے حادثے ہو جاتے ہیں لیکن اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملک کی آبادی قابو میں رہتی ہے اور دوسرا فائدہ یہ کہ بعض اوقات وزیر ریلوے شرما شرمی میں استعفیٰ بھی دے دیتا ہے۔ اگر حادثے نہ ہوں تو وزیر ریلوے کبھی استعفیٰ ہی نہ دے کیونکہ وزیر ایک بار گدی پر بیٹھ جاتا ہے تو پھر نیچے نہیں اترتا۔ یہ ٹرینوں کے حادثوں کی برکت ہی ہے کہ اب تک ریلوں کے کئی وزیر استعفے دے چکے ہیں۔ انگریزوں کے زمانہ میں چونکہ دو مخالف سمتوں سے آنے والی ٹرینوں کو ایک ہی پٹری پر چلانے کی آزادی نہیں تھی اس لیے انگریز برسوں گدی پر بیٹھے رہے یہی وجہ ہے کہ انھیں بڑی مشکل سے اس ملک سے نکالنا پڑا۔ آزادی سے پہلے لوگ ملک کے لیے قربانی دینے کو ہر دم تیار رہتے تھے۔ اتنی قربانیاں دیں کہ "قربانیوں" کا سارا اسٹاک ہی ختم ہو گیا۔ اب ہر ایک کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی قربانی اپنے پاس ہی رکھے، اسے بلا وجہ ضائع نہ کرے۔

آزادی نے ہمیں کئی نئے لفظ بھی دیے ہیں، لفظ "گھوٹالہ" کو ہی لیجیے۔ آزادی سے پہلے کوئی اس لفظ کو نہیں جانتا تھا۔ اب بچہ بچہ جانتا ہے کیونکہ ہر شہری کو کوئی نہ کوئی گھوٹالہ کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ آئے دن اتنے گھوٹالے ہوتے رہتے ہیں کہ اب یہ روز مرہ زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔ اگر آزادی نہ ملتی تو ہماری زبان میں ایسے نئے نئے لفظ کہاں سے آتے۔ ملک ترقی کرے یا نہ کرے ہماری زبان تو ترقی کرتی چلی جا رہی ہے۔ آزادی کے بعد

ہمارے رہنماؤں نے طے کیا تھا کہ اس ملک سے ''غریبی'' کو ہٹادیا جائے گا۔ چنانچہ پچھلے کئی برسوں سے غریبی کو ہٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ نہیں ہٹی تو اب سرکاریں غریبوں کو ہی ہٹانے میں لگ گئی ہیں۔

تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اردو کے شاعروں نے بھی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا یہاں تک کہ اردو کے ایک مستند شاعر مظہر امام نے غزل تک کو آزاد کرادیا۔ جب تک نئے شاعروں کو بزرگ شاعروں سے اپنے کام پر اصلاح لینی پڑتی تھی۔ اب یہ جھنجھٹ باقی نہیں رہا کیونکہ ہر کوئی غزل کہنے کے معاملہ میں آزاد ہے چنانچہ آزاد غزل اور آزاد ہندوستان میں اب کوئی خاص فرق باقی نہیں رہ گیا ہے۔

بچو! تم تو جانتے ہو کہ مہاتما گاندھی نے ''عدم تشدد'' کے ذریعہ اس ملک کو آزادی دلائی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پاگل نے انھیں گولی مار کر شہادت کا درجہ عطا کردیا۔ آزادی سے پہلے گولی مارنے کو بہت برا سمجھا جاتا تھا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ ہماری فلموں میں ہیرو اور ہیروئنوں کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ پستولوں، بندوقوں، برچھوں اور بھالوں کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ملک میں ہر کس و ناکس کو گولی چلانے کی آزادی حاصل ہوگئی ہے۔

گولیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک دوا کی گولی اور دوسری پستول کی گولی۔ دوا کی گولی سے وقتی طور پر علاج ہوجاتا ہے البتہ پستول کی گولی بہت مجرب ہوتی ہے۔ اس سے گولی کھانے والے کی ساری بیماریوں کا ایک ہی وقت میں ہمیشہ کے لیے علاج ہوجاتا ہے۔

بچو! آؤ ہم سب مل کر آج کے دن آزادی کا جشن منائیں۔ ذرا دیکھو تو سہی ہمیں کتنی آزادیاں ملی ہوئی ہیں۔

نصرت ظہیر
4/15 کھچڑی پور، دہلی 91

مجتبیٰ صاحب کا "میرا کالم"

ہندستانی ادب میں مجتبیٰ حسین اردو طنز و مزاح کے آخری مغل کا درجہ رکھتے ہیں۔
اطلاعاً عرض ہے کہ ان کی نئی کتاب "میرا کالم" مارکیٹ میں آگئی ہے۔ اور میرا بڑی شدت سے جی چاہ رہا ہے کہ اس پر کوئی تبصرہ کردوں۔

اس لیے نہیں کہ کتاب بہت اچھی ہے بلکہ اس لیے کہ ایک تو اس میں خادم کا بھی ذکر ہے، اور ذکر بھی وہ جسے ذکر خیر کہتے ہیں، جو انھوں نے غالباً برادری والا ہونے کا لحاظ کر کے احقر، یعنی خادم کے ساتھ کافی رعایت برتتے ہوئے کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ راقم کو تبصرہ کرنے کا مرض کی حد تک شوق ہے۔ جب بھی کوئی چیز سامنے آتی ہے، دل کرتا ہے اس پر فوراً کوئی تبصرہ کر ڈالوں، آپ کو یقین نہیں آئے گا، ادبی کتابیں تو بڑی چیز ہیں۔ بندہ کئی بار ریلوے ٹائم ٹیبل اور ٹیلی فون ڈائرکٹری تک پر تبصرہ لکھ چکا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ مجتبیٰ صاحب کی تقریباً ہر تحریر اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں ان کے چاہنے والوں کے لیے ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہے اور ناچیز کا ہاتھ ادب میں ذرا تنگ ہے۔ اتنا تنگ کہ اس کی بے ادبیوں سے بچپن میں اس کے والدین بھی تنگ رہتے تھے۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کتاب پر ادبی تبصرہ کیسے کروں۔

اردو کے نامی گرامی نقادوں کے تبصرے جب پڑھتا ہوں تو ان کے طرز گفتار اور تنقید کی رفتار پر بڑا رشک آتا ہے کہ کھٹا کھٹ ادیب کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ہر جملے میں دس جملے اور بیس معانی اس طرح پرو دیتے ہیں کہ ایک ادیب کو نمٹانے کے لیے ان کے تین جملے کافی ہوتے ہیں۔

کاش مجھے بھی ایسے جملے لکھنے آتے۔ کاش میں بھی، عصری آگہی، خارجی عوامل، تجریدی محرکات، ساختیات، پس ساختیات اور اُف ساختیات جیسی اصطلاحوں میں بات کرسکتا۔ یا پھر جیسا کہ آج کل کے نقادوں میں 'مابعد' کا فیشن چلا ہوا ہے تو میں بھی ہر چیز کی مابعدیت نکال لیا کرتا۔

اسی طرح جس طرح جدیدیت کی نکالی گئی ہے کہ پہلے جدیدیت تھی۔ پھر مابعد جدیدیت نکلی۔ اب مامابعد جدیدیت نکلے گی۔ اس کے بعد ماما مابعد او پھر ماماما۔۔ وعلیٰ ہذالقیاس۔

اس اصول کے تحت تبصرہ کیا جائے تو، مجتبیٰ صاحب کی کتابوں کی جو فہرست میرے سامنے ہے اس کے مطابق ''میرا کالم'' دراصل ''آخرکار'' کی مابعد ہے، جو ''بالآخر'' کی مابعد رہی ہوگی، جو ''بہر حال'' کی مابعد تھی، جو ''الغرض'' کے مابعد شائع ہوئی جو ....

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بہت جلد ـــ شاید دو تین دن میں ـــ ''میرا کالم'' بھی مابعدیت کی نذر ہو جانے والی ہے کیونکہ خبر ہے، انیس امروہوی کا تخلیق کار پبلکیشن اس کی بھی مابعد نکالنے والا ہے، جس کا نام ہے ''ہوئے ہم دوست جس کے۔''

بہر حال اس وقت میرے سامنے ''میرا کالم'' ہے جو حیدرآباد کے روزنامہ ''سیاست'' میں ہر ہفتہ شائع ہونے والے ان کے فکاہیہ کالم میں لکھے گئے مضامین کا پہلا انتخاب ہے۔ اس میں مجتبیٰ صاحب کے ۵۶ بے حد پر لطف مضامین ہیں۔ (یاد رہے ان میں خاکسار پر لکھا گیا مضمون بھی شامل ہے) اور کتاب کی قیمت صرف ۱۰۰ روپے ہے۔ یعنی فی مضمون ایک روپے اٹھتر پیسے۔ اتنی رقم میں آج کل بازار سے آپ ایک کلو آلو بھی نہیں لا سکتے۔ اور پھر مجتبیٰ صاحب کا مضمون تو اس سے بھی زیادہ لذیذ اور زود ہضم ہوتا ہے۔ لہذا میں نہیں سمجھتا کہ ملک کے ایک جید و سید مزاح نگار کو پڑھنے کا اس سے سستا سودا بھی کوئی ہوسکتا ہے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد نے کتاب کی تعداد اشاعت صرف ۵۰۰ رکھی ہے۔ ان میں سے ایک کتاب میرے پاس ہے۔ دو تین مجتبیٰ صاحب بطور یادگار اور برائے عبرت اپنے پاس رکھیں گے۔ رہ گئیں ۴۹۷ کتابیں۔ ان

میں سے سو دو سو کتابیں لائبریریاں خرید لیں گی اور انھیں قارئین کی دست برد سے محفوظ کر دیں گی ۔اس حساب سے ہندستان پاکستان ۔۔اور اب تو دوبئی میں بھی ۔۔ پھیلے ہوئے ان کے لاکھوں مداحوں کے لیے صرف دو ڈھائی سو کتابیں باقی بچیں گی ۔یعنی از روئے حساب ایک تو کیا۔ نصف فیصد کے حصہ میں بھی ایک کتاب نہیں آئے گی۔ ہاں بکڈ پو والے کتاب کو صفحہ صفحہ کر کے بیچنے لگیں تو شاید آخر میں ان کے ہر قاری کے ہاتھ ایک ایک سطر آجائے۔

وہ تو شکر ہے کہ خود مجتبیٰ صاحب اپنے قاریوں کا بے حد خیال رکھتے ہیں ۔اب تک ماشاءاللہ سولہ سترہ کتابیں لکھ چکے ہیں ۔مزید اتنی ہی اور لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں آج کل لوگوں سے ملنا ملانا کم کر رکھا ہے ۔ ٹیلی فون پر بھی بہت مختصر گفتگو کرتے ہیں اور۔۔ ''ہلو''،''نہیں''،''جی نہیں''،''خدا حافظ'' میں بات تمام کر دیتے ہیں ۔تمام توجہ مزید کتابیں لکھنے پر مرکوز ہے ۔ پھر ہندی، اڑیہ، کنڑ وغیرہ زبانوں میں بھی ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں ۔اس طرح امید کی جانی چاہیے کہ آیندہ پانچ چھے برسوں تک ان کی اتنی کتابیں مارکیٹ میں آچکی ہوں گی کہ ہر مجتبائی کے ہاتھ میں ان کی ایک کتاب ہوگی، اور اس طرح ان کا ہر چاہنے والا اہل کتاب ہو جائے گا۔

ویسے بھی مجتبیٰ صاحب بڑے دل والے آدمی ہیں ۔ عام طور پر بڑے ادیبوں کے دل چھوٹے پائے جاتے ہیں لیکن وہ جو چارلی چپلن نے کہا تھا، کہ دنیا میں سب سے بڑا دل مسخرے کا ہوتا ہے ۔۔تو مجتبیٰ صاحب کے ساتھ بھی یہی ہے۔ ''میرا کالم'' کے مضامین میں، انھوں نے اپنوں، پرایوں، ایروں غیروں سب کا ذکر بڑی فراخدلی سے کیا ہے ۔ ۵۶ مضامین میں ہزاروں کردار ہیں جو جا بجا بکھرے پڑے ہیں ۔ان سب کو سمیٹنا، مجتبیٰ صاحب کے ہی دل گردے کی بات ہے! ورنہ دوسرے ادیب تو اس طرح پھونک پھونک کر تذکرے لکھتے ہیں کہ مجال ہے جو تحریر میں کسی غیر مطلوبہ کا سایہ تک دکھائی دے جائے۔

مجتبیٰ صاحب دوسروں کے علاوہ اپنے معاملے میں بھی کافی فراخ دل ہیں اور ان مضامین میں اپنا ذکر انھوں نے کھلے دل سے کیا ہے ۔چنانچہ ''میرا کالم'' پڑھ کر آپ اس کے مصنف کے بارے میں بھی بہت کچھ جان سکتے ہیں، اور عبرت پکڑ سکتے ہیں!

بقول سید مصطفیٰ کمال مدیر ''شگوفہ''، مجتبیٰ حسین کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۶۲ میں ہوا

تھا۔ ان دنوں خادم پانچویں جماعت میں پتنگ اڑانا سیکھ رہا تھا۔ پتنگ اڑانا تو نہیں آیا البتہ چرخی سنبھالنا آ گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب میں ملاحظہ کو ملا خطا اور بحر او قیانوس کو بحر و قیانوس پڑھتا تھا اور بحر الکاہل کا ذکر آنے پر سمجھتا تھا کہ کسی بہرے اور کاہل آدمی کی بات ہو رہی ہے۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ ان دنوں میں مجتبیٰ صاحب کو پڑھتا تو سردار نرمل سنگھ نرمل رائے پوری کی طرح مجتبیٰ حسین کو محبت والا مجبتی حسین ہی پڑھا کرتا۔ بہرکیف پڑھنے کی عمر میں جب انھیں پڑھا اور پھر دہلی آنے پر ان سے ملاقاتیں ہوئیں تو معلوم ہوا، مجتبیٰ صاحب واقعی محبتی حسین ہیں! سرتاپا محبت و شفقت!

میں یہ مضمون سید مصطفیٰ کمال کے تحریر کردہ پیش لفظ کے اختتامی جملوں پر ختم کرنا چاہوں گا۔ "مجتبیٰ کا قاری ان کے پُر مزاح انداز تحریر کا قتیل ہے اور مجتبیٰ کی تحریریں اس کے مطالعہ کا لوازمہ، مجتبیٰ حسین کے چند منتخب کالموں پر مشتمل یہ کتاب (میرا کالم) یقیناً" کالم نگاری کے ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے اور طنز و مزاح کے چاہنے والوں کے لیے ایک تحفہ"۔ (اور اس میں خادم پر بھی ایک مضمون ہے۔ یاد ہے نا!)

طنزیہ و مزاحیہ ادب

کتاب	مصنف	قیمت
میرا کالم	مجتبیٰ حسین	100/-
آخر کار	مجتبیٰ حسین	60/-
چہرہ در چہرہ	مجتبیٰ حسین	51/-
مجملہ	یوسف ناظم	51/-
فی البدیہہ	یوسف ناظم	45/-
فی الفور	یوسف ناظم	30/-
فی الحقیقت	یوسف ناظم	45/-
فی الحال	یوسف ناظم	18/-
بالکلیات	یوسف ناظم	18/-
آب گم	مشتاق احمد یوسفی	125/-
چراغ تلے	مشتاق احمد یوسفی	80/-
خاکم بدہن	مشتاق احمد یوسفی	95/-
زرگزشت	مشتاق احمد یوسفی	125/-
بہ قلم خود	نصرت ظہیر	200/-

کتاب	مصنف	قیمت
تحت اللفظ	نصرت ظہیر	100/-
حماقتیں	شفیق الرحمٰن	75/-
پچھتاوے	شفیق الرحمٰن	50/-
مزید حماقتیں	شفیق الرحمٰن	65/-
شگوفے	شفیق الرحمٰن	45/-
پطرس کے مضامین	پطرس	15/-
خواہ مخواہ	شوکت تھانوی	80/-
مسکراہٹیں	شوکت تھانوی	65/-
گول مال	شفیقہ فرحت	18/-
رانگ نمبر	شفیقہ فرحت	16/-
گوشے میں قفس کے	دلیپ سنگھ	45/-
اردو کی آخری کتاب	ابن انشا	60/-
نگری نگری پھرا مسافر	ابن انشا	60/-
ادیبوں کے لطیفے	کے ایل نارنگ ساقی	150/-
بزم آرائیاں	کرنل محمد خاں	90/-
بسلامت روی	کرنل محمد خاں	120/-

صغریٰ مہدی
عابدولا۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

میخانوں کا پتہ

(سفر نامہ مکہ مدینہ شام ایران)

تو اپنے ایک جام پہ نازاں ہے ساقیا
چودہ[1] پلانے والے ہیں پرواہ ہے تیری کیا
بتلائے دیتا ہوں تجھے میخانوں کا پتہ
بطحا و کاظمین[2] خراساں[3] و سامراہ[4]
خورشید مدعا مرا برج شرف میں ہے
اک ساقیا کربلا میں مرا ایک نجف[5] میں ہے

یہ مدحیہ سوز بچپن سے سنتے آئے تھے اور یہ بھی سنا تھا کہ ان میخانوں میں اسی وقت پہنچتے ہیں جب وہاں سے طلبی ہو۔ میر انیس مرثیوں کے آخری بندوں اور رباعیوں میں وہاں پہنچنے کی بے قراری کا اظہار کرتے رہے اور بچارے نہ پہنچ سکے۔

نوکری سے آزادی کے بعد اور پیسہ ہاتھ میں آنے پر ہمیں یکا یک یہ احساس ہوا کہ ہمارا بلاوا آرہا ہے ہم نے رضا سے کہا چلو رضا ان میخانوں میں ہو آئیں۔ بولے ضرور، ہم نے کہا کب؟ آپ کا کیا مطلب کل چلیں۔ ہم سمجھ گئے یہ سفر بھی ان کے پانچ سالہ منصوبہ کا حصہ بن جائے گا۔ بلاوا آرہا تھا مگر ہم اور سفروں کی طرح فوراً تیاری کر کے روانہ نہیں ہوئے۔ عجب ششش وپنج میں تھے، اگست کا مہینہ تھا ویک وینڈ پر

۱۔ چودہ معصومین

۲۔ عراق میں کاظمین وہ جگہ ہے جہاں ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم کا مزار ہے۔

۳۔ خراسان میں آٹھویں امام رضا علیہ السلام کا مزار ہے۔

۴۔ سامرہ میں گیارہویں حضرت حسن عسکریؑ اور دسویں امام محمد تقی کے مزار ہیں۔

۵۔ حضرت علیؑ کا مزار ہے۔

۶۔ بھائی

ہمارے دونوں بھائی مع اپنے خاندانوں کے دہلی سے باہر گئے ہوئے تھے اور ہم اکیلے تھے۔ ہم نے رضا کی ڈائری سے عزیز زیدی صاحب کا نمبر نکالا۔ ان سے رضا اور چچا میاں کے خاندان کے قریبی تعلقات تھے اور ہم بھی ان سے واقف تھے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ان میخانوں تک لوگوں کو پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں، سو ہم نے فوراً ان کا نمبر ملایا۔ وہ فون پر مل گئے۔

عزیز صاحب ہم عمرہ اور زیارت کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ ہم نے فوراً ہی عرض مدعا کر دیا۔ ضرور جائیے ستمبر کے وسط میں ہمارا ایک قافلہ جا رہا ہے۔ تو پھر ہم کیا کریں؟ اس میں شامل ہونے کے لیے اپنا پاسپورٹ اور کچھ پیشگی رقم کل بھجوا دیجیے اور ہاں کچھ تصویریں بھی۔ ہمارا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ اتنی جلدی اتنی آسانی سے! کمال ہے! ہم فوراً تصویریں کھینچوانے دوڑے سر اوڑھ کر۔ اور دوسرے دن اپنی بارسوخ بہن سیدہ سیدین حمید کے ذریعہ یہ سب چیزیں عزیز زیدی کے دفتر میں تھیں، جب گھر کے لوگ آئے تو ہم نے ان کو یہ اطلاع بہم پہنچائی جو ہمارے سفروں کی اطلاعیں سننے کے عادی ہو چکے ہیں اقبال بولے ہاں بھئی ادھر بھی ہو آیئے!

رضا کچھ فکرمند نظر آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر چپ رہے اور پھر بولے آپا یہ سفر آپ کے ان سفروں سے بالکل الگ ہوگا۔ اس سفر کے کچھ آداب ہوں گے اور پھر وہ سب مشکلات ۔۔۔۔۔۔ ہاں۔ ہاں ہمیں معلوم ہے۔ جب بلاوا آتا ہے تو انسان ضرور جاتا ہے اور سب مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ رضا چپ ہو گئے اور ہم سفر کی تیاریوں میں لگ گئے۔ دل میں شدید اشتیاق کا وفور تھا۔ چشم تصور سے وہ مقامات دیکھ رہے تھے! کبھی جگر کی نعت کا وہ مصرع یاد آتا ہے

ایک رند ہے اور مدحت سرکار مدینہ
ہم مدحت کی جگہ زیارت سرکار مدینہ کر لیتے

کبھی میلا دا کبر کا یہ شعر یاد آتا ہے

ہاں دکھا دے بہار جیسے کی ہو زیارت ہمیں مدینہ کی

سفر کا شوق اس قدر غالب تھا کہ نہ گھر میں دل لگتا نہ باہر، آخر کار ستمبر کی ایک تاریخ مقرر ہوئی، امید بندھی پھر وہ تبدیل ہوگئی، پھر تو تاریخیں ٹھہرتی رہیں بدلتی رہیں۔ عزیز صاحب کو دن میں تین بار فون کرنا روز کا معمول ہوگیا۔ پھر لوگوں کے سوالات کب جا رہی ہو؟ ارے تم گئیں نہیں۔ ایک تاریخ کو ہم سب سے مل جل کر بالکل تیار تھے کہ معلوم ہوا کہ یہ

تاریخ بھی آخری نہیں ہے کہ سعودی عرب کے ویزا ملنے میں کچھ اڑچنیں ہیں۔ اب ہم نے لوگوں سے منہ چھپانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی لوگوں کو لگتا کہ ہم جا نہیں رہے۔ یوں اڑاتے ہیں کہ جا رہے ہیں رضا اپنے چہرے کے ایکسپریشن سے تو یہ کہتے کہ دیکھو ہم نے کہا نہیں تھا کہ یہ سفر آسان نہیں ہے۔ مگر ویسے تسلی دیتے۔ صفیہ[1] اور نعیمہ[2] تسلی دیتیں۔ ہمارا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ پھر شاہد علی خاں[3] کی بات یاد آئی کہ جاتے وقت ان سب سے معافی مانگو جن سے تم لڑتی آئی ہو اور اسی کے ساتھ انھوں نے ایک فہرست بھی دے دی جس میں اکابرین سے لے کر معاصرین تک کے نام تھے۔ ہم دیر تک اس فہرست کو پکڑے یہ سوچتے رہے کہ آخر یہ لوگ ہماری شکایت شاہد صاحب سے کیوں کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک آدھ ہی لڑائی کے عینی شاہد تھے۔ ہم نے سوچا کہ شاید ہم اسی لیے نہیں جا پا رہے ہیں کہ ان سب سے ہم نے معافی نہیں مانگی۔ سو فوراً ٹیلی فون کھڑکھڑائے اور سب سے معافیاں مانگنی شروع کر دیں اس تشریح کے ساتھ ہم جن باتوں پر لڑے تھے وہ صحیح تھیں۔ بجا تھیں مگر پھر بھی آپ ہمیں معاف کر دیجیے۔ ان کے پاس ہمیں معاف نہ کرنے کے علاوہ چارا ہی کیا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ اگر بلاوا نہ ہو تو عین وقت پر بھی جانا ٹل جاتا ہے، ہم جائیں گے یہ تو ہمیں یقین تھا کہ ہمیں بلاوا آیا ہے اور یہ بھی اطمینان تھا کہ سارے گناہوں کے باوجود بھی ہماری ادھر سے طلبی ہوئی ہے اور پھر یہ تو اس کی شانِ کریمی سے بعید ہے کہ بلاوا دے کر نہ بلائے۔ عزیز صاحب فون کر کے کہتے آپ اصحاب جامعہ کے ذریعہ کوشش کیجیے کہ یہ لوگ جامعہ کے لوگوں کی قدر کرتے ہیں چنانچہ ہم سب سے مدد کے طالب ہوئے کچھ نے ٹالا اور کچھ نے معذوری اظہار کی مگر ہمارے پڑوسی اجتبیٰ ندوی صاحب نے بہت مدد کی آخر کاران کی ہدایت اور عزیز زیدی کے اصرار پر ہم نے خود جانے کی ٹھانی۔ فون کر کے وقت مقرر کرایا اور دوسرے دن صبح ہی رضا کو ساتھ لے کر محرم کے طور پر ویزا آفیسر صاحب کے پاس چادر اوڑھ کر پہنچ گئے اور وہاں ہم نے ایسے دلدوز انداز میں تقریر کی کہ موصوف نے فوراً ویزا دینے کی حامی بھر لی۔ جامعہ کے استاذ اور عربی نام وہ بھی عربی انداز میں لکھا ہوا کام آ گیا،

ارے ہاں ہم یہ تذکرہ کرنا تو بھول گئے کہ ہماری پرانی شناسا حبیبہ بیگم بھی اس قافلے میں ساتھ تھیں جو ہمارے ساتھ کی وجہ سے اس میں شامل ہوئی تھیں۔ اکثر ہم سے

۱۔ بھاوج　۲۔ بھانجی　۳۔ جنرل منیجر مکتبہ جامعہ

فون پر یہ پوچھتی رہتیں کہ آپ کیا کیا سامان لے جارہی ہیں۔ ہم اِدھر اُدھر کی ہانک دیتے۔ اس سفر میں سامان کی کوئی فکر نہیں تھی۔ چند جوڑے کپڑے دو تین ربڑ کی چپلیں۔ احرام اور بس۔ ہمیں ڈاکٹر عاصمہ نے ایک احرام دے دیا تھا جو اکثر حج کو جاتی رہتی ہیں۔ اور ایک احرام ہماری دوست اور عزیز ثاقبہ بیگم نے سی دیا تھا۔ اکثر حبیبہ کہتیں یہ رکھ لیجیے گا۔ وہ رکھ لیجیے گا ہم ایک کان سے سنتے دوسرے سے اڑا دیتے۔ بس ایک ہی فکر تھی کہ سفر پر روانہ ہو جائیں اور اس فکر میں کسی دوسری فکر کو شامل نہیں کرنا چاہتے تھے مگر انھوں نے ہمارا یہ انداز دیکھ کر بہت سی چیزیں اپنے ساتھ رکھ لی۔ دودھ چائے سے لے کر سوئی دھاگا تک، اور سفر میں یہ چیزیں کس قدر ضروری تھیں یہ وہاں جا کر معلوم ہوا۔ حبیبہ بیگم نے فیاضی سے بغیر ہمیں شرمندہ کیے ان سب چیزوں کو ہمارے ساتھ شیئر کیا۔ بزعم خود ہم ان کے مددگار بن کر گئے تھے مگر انھوں نے ہماری مدد کی!

۶/ اکتوبر ۱۹۹۸ء کی وہ دوپہر اب تک کی سب دوپہروں سے الگ نوعیت کی تھی جو ہم نے اب تک گزاری تھیں۔ وہ دوپہر جب اپنے گھر سے دیار مدینہ کی طرف روانہ ہورہے تھے۔ اندرا گاندھی ایرپورٹ پر پہنچے تو باری باری سب قافلے اور پھر سالار قافلہ آئے اور اپنے ساتھ ویزا اور پاسپورٹ بھی لائے اور ہماری جان میں جان آئی۔ زیادہ تر لوگ امروہے کے تھے، باقی دہلی اور چھولس کے، زیادہ تر خواتین تھیں۔ منظور حسین قافلہ سالار نے حبیبہ بیگم کے علاوہ چھولس کے دو حضرات اور دو خواتین کو ہمارے سپرد کر دیا کہ ہم سب مراحل ان کے ساتھ طے کر کے اندر چلیں۔ وہ آتے رہیں گے چنانچہ باقی سب سے ملاقات جہاز کے اندر ہوئی۔ ہم سفروں کو بس دور سے دیکھا اور سلام دُعا ہوئی مگر ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے قافلہ میں اور سالار میں صرف چار مرد تھے۔ اپنے قافلوں کی جو فہرست دیکھی تھی اس میں ایک جانا بوجھا نام منظر عباس نقوی کا تھا جو علی گڑھ میں پروفیسر تھے۔ ابھی حال میں سبکدوش ہوئے ہیں! پاس کی سیٹ پر نظر ڈالی تو منظر صاحب اپنی بیگم بلقیس بیگم کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جہاز اڑا جا رہا تھا دل میں اب اضطراب کی جگہ سکون تھا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ خانہ خدا میں کیسے جائیں گے اور رسول اللہؐ کے شہر میں۔ واقعی ہم جا رہے ہیں! کل صبح ہماری صبح مدینہ میں ہوگی!

نجف شرف، کربلائے معلّٰی، جس کا تعارف مرثیوں کے ذریعہ بچپن سے

ہو گیا تھا وہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ ایران، عراق، دمشق، ان خیالات کے ہجوم میں حبیبہ بانو کو تسلی دیتے اور کھاتے پیتے جدہ آ گیا۔ ہم نے خوب اچھی طرح چادر سے سر ڈھکا اور اترنے کو تیار ہو گئے۔ لائن میں کھڑے اپنے قافلے والوں سے تعارف ہوا، سبھی تقریباً جاننے والے تھے۔ کافی دیر کھڑے رہنے کے بعد سب مراحل طے ہوئے کسٹم پر زائرین کے سامان کو چیک کیے بغیر نکال دیا گیا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ نکلتے ہی بس میں بیٹھے اور مدینہ کو روانہ ہو گئے۔ بس آرام دہ تھی ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ کشادہ سیٹیں تھیں اس پر سب دراز ہو گئے۔ جدہ میں رات کو دن ہو رہا تھا شہر سے نکل کر بس یوں چلنے لگی جیسے پانی میں تیر رہی ہو۔ جس میں عربی، موسیقی، کے کیسٹ بج رہے تھے۔ صبح ایک جگہ آبادی سے دور بس رکی سامنے مسجد تھی اذان ہو رہی تھی۔ یہاں سے نماز سے فارغ ہو کر ایک ایک پیالی حلیب کی چائے پی کر روانہ ہو گئے۔ نو بجے مدینہ منورہ پہنچے دور سے مسجد نبوی نظر آ رہی تھی۔ دل میں عجب خوشی کا احساس تھا۔ کچھ لوگ دعائیں پڑھ رہے تھے۔ کچھ گم صم تھے کچھ کھڑے ہو کر مسجد کی زیارت کر رہے تھے۔ مسجد نبویؐ سے متعلق سارے واقعات میرے ذہن کے پردے پر اُبھر رہے تھے۔ پھر ایک جدید ترین پُر رونق بازار میں بس ایک جھٹکے سے رک گئی۔ جہاں میں نے اُتر کر ایک دکان سے ڈالر ریال میں تبدیل کرائے۔ اور پھر ایک اوسط درجہ کے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ جہاں ہمیں ٹھہرنا تھا نہا دھو کر حبیبہ بانو کے ساتھ جو چیزیں تھیں۔ ان سے ناشتہ کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ خوشی خوشی مسجد نبویؐ کی طرف روانہ ہوئے۔ سب لوگ ساتھ تھے۔ وہ دروازہ جو صرف خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ مرد حضرات ہمیں وہاں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ہم وسیع عریض صحن پار کر کے مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے تو عجب سرشاری کا عالم تھا۔ پھر سب نے اپنی اپنی پسند کے کونے ڈھونڈھے اور عبادت میں مشغول ہو گئے!

دو پہر ہو گئی تھی ظہر کی نماز ہو چکی تھی، موٹے موٹے قالین صاف ستھرے سنہری جلدوں کے کلام مجید الماریوں میں سجے تھے۔ میں اور حبیبہ بانو اس کونے میں گئے جہاں نسبتاً بھیڑ کم تھی۔ ہم نے دیر تک ایک ہی جگہ الگ الگ نمازیں پڑھیں تلاوت قرآن پاک کی اور دعائیں پڑھیں دعائیں مانگیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کے وجود سے بھی بے خبر تھے۔ پھر عبادت ختم کر کے تا دیر بیٹھے رہے کہ عصر

کا وقت آگیا اور مسجد لوگوں سے لبالب بھر گئی۔ خواتین بڑی تعداد میں تھیں۔ چھوٹے بچے بھی ان کے ساتھ تھے ہم نے بھی نماز ادا کی اور پھر ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے۔ جاتے وقت احساس ہوا کہ ہم جہاں گزر کر جاتے ہیں وہ ایک جدید ترین [illegible] بازار ہے اس میں بلند وبالا اونچی اونچی عمارتیں ہیں بازار۔۔ زیورات، [illegible]، مغربی اشیائے استعمال اور خوردنی چیزوں سے بھرے پڑے ہیں، سڑکیں بے حد صاف ستھری اور کشادہ کم ٹریفک شور وغل بالکل نہیں،

مسجد نبویؐ سے ملحق جنت البقیع ہے بس ایک سڑک پار کر کے چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک بہت بڑا میدان ہے جس کو لوہے کی جالیوں سے گھیر دیا ہے جس میں بنی ہوئی قبروں کو کھود ڈالا گیا، عوام الناس کو قبور پرستی سے روکنے کے لیے، ایک بڑا سا لوہے کا دروازہ بھی تھا جس میں بہت بڑا قفل لٹک رہا تھا خواتین جالی پر سر ٹیک کر رونے لگیں، کچھ نے دعائیں پڑھیں۔ مجھے الگ کھڑا دیکھ کر ایک عرب حضرت بڑھے ور عربی میں زیارت پڑھانے لگے، پھر دیکھتے دیکھتے مجمع بڑھ گیا۔ کچھ لوگ طرح طرح کے تبرک بھی بانٹ رہے تھے۔ ایک صاحب میرے ہاتھ میں ٹھنڈے چھاچھ کا ایک کاغذ کا گلاس پکڑا گئے۔ پیا تو مزے کا تھا۔ نیچے اترے تو طرح طرح کی دکانیں تھیں جس میں تسبیحیں اور دوسرے تبرکات بھی تھے اور دوسری چیزیں بھی۔

صبح آنکھ اذان کی آواز سے کھلی جلدی سے نماز ادا کی کچھ لوگ مسجد جا چکے تھے ہم بھی تیار ہو رہے تھے کہ اب باقی وقت مسجد میں گزاریں گے کہ معلوم ہوا کہ آج کا دن مدینہ مقدسہ کی سیر کے لیے ہے بس آنے والی ہے ساتھ میں گائڈ کے طور پر ایک مظفر پور کے مولانا بھی ہیں، اس سیر کی ابتدا حضرت حمزہؓ کے مزار سے ہوئی جو مدینہ شہر کے باہری حصے میں ہے۔ مزار کے آس پاس کافی مجمع تھا کچھ لوگ کھجوریں، انگوٹھیاں، اور آئس کریم بیچ رہے تھے حضرت حمزہؓ! کے مزار آتے ہوئے مولانا نے ایک مسجد کی نشاندہی کی جس میں فاطمہ زہراؓ ٹھہر کر دم لیتی تھیں جب آپ یہاں فاتحہ پڑھنے آتی تھیں مزار کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی، پھر میدان خندق دیکھا اور مسجد فتح جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھ کر مسلمانوں کی فتح کی دعائیں مانگی تھیں اور یہیں آپ کو فتح کی خبر سنائی گئی تھی۔ مسجد بہت اونچائی پر تھی۔ بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر جانا ہوتا ہے۔ میں ان سیڑھیوں پر چڑھنے کی ہمت کر رہی

تھی کہ نیچے ایک کچی مسجد نظر پڑی جس پر لکھا تھا۔

مسجد سلمان فارسیؓ بے ساختہ قدم اس مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ میں نماز ختم کر چکی تو دیکھا کہ ہمارے اور ساتھی بھی آ گئے ہیں، پھر مسجد عمرؓ، مسجد ابو بکرؓ کے شکستہ کھنڈر دیکھے۔ پھر مسجد علیؓ اور باغ علیؓ کی باہر سے زیارت کی۔ پھر اس یہودی کے گھر جگہ دیکھی جہاں حضرت فاطمہؓ دعوت میں گئی تھیں جس کا حال بی بی کی کہانی میں بیان کیا جاتا ہے، جو منتیں پوری ہونے کے لیے مانی جاتی ہے، اس گھر کی جگہ مدرسہ اطفال بن گیا۔

حضرت ماریہ قبطیہؓ کا گھر اور مزار دیکھا۔ حضرت جعفر صادقؒ کے مدرسہ کے کھنڈرات بھی جہاں آپ درس دیتے تھے، پھر حضرت فاطمہؓ کا بیت الحزن جہاں آپ اپنے والد آنحضرت کی وفات کے بعد گریہ و بکا کرتی تھیں۔ آگے چل کر ایک ویران حصے میں حضرت زین العابدینؒ کا بیت الحزن تھا ایک کچا اندھیرا کمرہ۔۔ یہاں ہماری ہم سفر کمال فاطمہ نے دلدوز نوحہ پڑھنا شروع کر دیا جس سے سماں بندھ گیا۔ سب کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ دل پر دیر تک ایک حزن کی کیفیت رہی۔

رسول خدا ﷺ کے روضہ کی زیارت خواتین صرف صبح کے وقت نماز فجر کے بعد کر سکتی ہیں، وہ بھی بہت دور سے مسجد نبویؐ کے ایک حصہ سے جہاں جالی لگی ہے!

آج ہمارا مدینہ میں تیسرا دن تھا، آج ہم فجر کے وقت مسجد نبویؐ میں پہنچ گئے اور دوپہر تک رہے۔ میں اور حبیبہ بانو ایک ساتھ رہ کر بھی تنہا بغیر کسی اور احساس کے عبادت کرتے رہے اور عجب تازگی اور مسرت کا احساس ہو رہا تھا، پھر رسولؐ خدا اور ان کے دو دوستوں کے مزاروں کی زیارت دور سے کی۔ عورتوں کا ایک جم غفیر تھا بعض دعائیں پڑھ رہی تھیں، بعض جالی پر سر ٹیکے گریہ و بکا کر رہی تھی، بعض نمازیں پڑھ رہی تھیں یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک یا حبیب سلام علیک اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کا منبر نظر آیا تو اس کے آگے سر اور دل دونوں جھک گئے اور حالی کی مسدس کے بند یاد آ گئے ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مدینہ دیارِ نور میں ہم تاریک شبوں کے مارے لوگوں کی نظریں اکثر چکا چوند رہتیں۔۔ موڈرن شہر مدینہ، صاف ستھری سڑکیں، جگمگاتے بازار، روضۂ رسول اور مسجد نبویؐ کے اطراف ہر طرف کھڑکھڑاتی صفائی کی مشین، معطر فضائیں، دل میں ایک خاص قسم کا سکون وطمانیت کا احساس۔

چوتھے دن ہمیں مدینہ چھوڑنا تھا اب دل پر دوسری کیفیت تھی۔ اب وہ کیفیت تھی جو انسان کی تمنا پوری ہوجانے کے بعد ہوتی ہے مگر دھیرے دھیرے خانہ خدا کو دیکھنے کا اشتیاق بھی غالب آرہا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے اب تھوڑی تھوڑی شناسائی ہورہی تھی۔ قافلہ سالار سید منظور حسین نے اپنے مخصوص انداز میں عمرہ کا طریقہ اوراس کے آداب سمجھائے اور یہ بتایا کہ یہاں سے مسجد میقات سے احرام باندھنا ہے کہ ہمیں مکہ روانہ ہونا ہے، بس تیار تھی اور مسافر بھی مع سامان کے ہوٹل کی لابی میں تھے مگر منظر عباس صاحب نہیں مل رہے تھے جو مسجد نبویؐ میں الوداعی نماز ادا کرنے گئے تھے۔ ہم سب دم بخود۔ فوراً بی بی کی کہانی مانی گئی تھوڑی دیر میں کسی پاکستانی کے ساتھ منظر عباس صاحب نظر آئے آگئے آگئے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ منظر عباس کہہ رہے تھے کاش میں ان مدینہ کی گلیوں میں کھوجاتا!

مسجد میقات میں سارے آداب کے ساتھ احرام باندھ کر نمازیں پڑھ کر ہم لوگ مکے کے لیے روانہ ہوئے تو نو بج رہے تھے اور۔۔۔ لبیک لبیک کہتے ہوئے ہم دیارِ نور کی طرف رواں دواں تھے! بارہ بجے ایک جگہ بس رُکی ہم لوگوں نے رات کا کھانا کھایا۔۔ اور پھر چل پڑے اس وقت بھوک کا احساس تھا نہ پیاس کا، بس جلدی سے منزلِ مقصود پر پہنچ کر خانہ خدا میں باریاب ہونے کا اشتیاق تھا۔ رات اور دن کا فرق بھی محسوس نہیں ہورہا تھا، دل ہر فکر سے آزاد تھا۔ جبکہ مکہ پہنچے تو نمازِ شب ہورہی تھی۔ خانہ کعبہ کے مینار سامنے تھے پورا شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا!؎

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا
کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدیٰ کا

یہ شعر آپ ہی آپ زبان پر آگئے۔ ایک اوسط۔۔۔ درجہ کے ہوٹل میں سامان رکھا جو کعبہ شریف سے بہت قریب تھا اور ہمیں اور حبیبہ کو جو کمرہ ملا تھا اس کی کھڑکی سے

کعبہ کے مینار صاف نظر آرہے تھے۔ایک پیالی چائے پی اور پھر وضو کر کے خانہ کعبہ کو منظور صاحب کی سربراہی میں روانہ ہوئے۔ جب خانہ کعبہ میں داخل ہورہے تھے تو نماز فجر ہورہی تھی۔اذان کے الفاظ وہی تھے جو دن میں پانچ وقت سنتے اور دہراتے ہیں مگر یہاں اس فضا میں ان کا عجب اثر ہورہا تھا۔۔۔مشکل سے پانچ سات منٹ کا راستہ تھا خانہ کعبہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے بڑے دروازے سب کو اپنے اندر آنے کی دعوت دے رہے تھے ہم عورتوں والے حصے میں گئے جہاں دبیز قالینوں پر نماز فجر کی تیاری ہورہی تھی۔ہم نے بھی نماز ادا کی اور پھر اس مقام پر جو ہمارے قافلہ سالار نے مقرر کردیا تھا ہم سب پہنچ گئے۔منظر عباس صاحب نے اعلان کیا کہ وہ الگ عمرہ کریں گے۔ہم لوگ سب ہدایتوں کو ذہن میں رکھ کر کانپتے قدموں سے خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنے لگے مگر عجب بات ہے جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ٹانگوں میں طاقت آتی گئی اور جانے کب سات چکر پورے ہوگئے۔سب لوگ حجر اسود کو چومنے کی فکر میں پھر مجمع میں گھس گئے اور میں پاس سیڑھیوں پر بیٹھ کر سانس لینے لگی، سامنے طرح طرح کے آدمی عورتیں اور بچے مرد ایک لباس ایک ہی حلیہ میں دوسروں سے بے خبر آپ اپنی دھن میں۔صفائی کرتے ہوئے لوگ بڑی بڑی مشینیں صفائی کرتی ہوئی بڑے بڑے کولر آب زمزم سے لبالب بھرے کاغذ کے گلاس، منظور کی اس آواز سے میں چونک پڑی۔ چلیے۔سعی کیجیے۔بڑے سے برآمدے کو پار کر اس مقام پر پہنچے جہاں صفا اور مروہ کی پہاڑیاں تھیں۔۔۔ایک بڑا سا بلکہ بہت ہی بڑا ہال ایئر کنڈیشن فرش بھی، پکا خوبصورت پتھروں کا ٹھنڈا زرا اوپر چڑھ کر پہاڑیاں جن کے بس نشانات موجود تھے، وہاں پہنچے تو سب الگ الگ ہوگئے۔یہاں ایک ساتھ کی شرط نہیں تھی۔حبیبہ بانو نے میرا ساتھ دینا چاہا مگر میں نے منع کردیا کہ میں دھیرے دھیرے چلوں گی۔سعی کرنے والوں میں بچے بھی تھے۔جنھیں باپ گاڑیوں اور گودوں میں لے کر سعی کرا رہے تھے۔بعض لوگ وھیل چیرز پر سعی کرا رہے تھے۔تصویر زہرہ جن کی ٹانگوں کی معذوری کی وجہ سے وھیل چیر ساتھ تھی۔اس کو ہوٹل ہی میں چھوڑ آئی تھی۔نہایت مستعدی سے انھوں نے طواف بھی اپنے کمزور پیروں سے چل کر کیا اور۔۔۔اب سعی بھی کررہی تھیں۔حضرت ہاجرہؓ کی تقلید یہ عورتوں کے لیے کس قدر فخر کی بات ہے کہ ان کی ایک ہم جنس کی تقلید کو خدائے تعالیٰ نے حج کا ایک حصہ بنا دیا اس سے زیادہ عورت ذات کی اہمیت کیا ہوگی۔سب سے آخر میں سعی کر کے میں نکلی کہ میں ہر چکر میں تھوڑی دیر بیٹھ کر دم لیتی پھر دوسرا چکر شروع کرتی۔گھڑی دو بجا رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی
اردو بازار دہلی۔۱۱۰۰۰۶

کچھ مقتدرہ قومی زبان کی سفارشاتِ املا کے بارے میں

گذارش یا گزارش

کتاب نما کے جون ۹۹ء کے شمارے میں شامل مقتدرہ قومی زبان کی املا سے متعلق سفارشات کا میں نے بغرض استفادہ مطالعہ کیا۔ ان میں سے اکثر معقول اور قابل تسلیم ہیں لیکن بعض الفاظ کے املا کے سلسلہ میں چند معروضات پیش کرنے ضروری سمجھتا ہوں۔ سفارشات کی تمہید میں لکھا گیا ہے کہ:

> ''بعض کا خیال ہے کہ املا کو اپنے مآخذ کے قریب تر رہنا چاہیے۔ بعض کے نزدیک الفاظ کو اپنے صوتی آہنگ کے تابع کیے بغیر لفظ سے مغائرت برقرار رہتی ہے اور جب تک صوتی نظام کے تابع نہ ہو جائے زبان کا حصہ نہیں بن سکتا۔''

یہ صوتی نظام کا تابع ہوئے بغیر کسی لفظ کے زبان کا حصہ نہ بن سکنے کا مفروضہ اردو پر ہی کیوں لادا جاتا ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی زبانوں کے علماء کو یہ نظریہ کیوں نہیں سوجھتا۔ مثلاً انگریزی میں دیگر زبانوں کے الفاظ اپنی اصل اسپیلنگ کے ساتھ ہی رائج ہیں۔ کوئی ان میں اصلاح وتبدیلی کی کوشش نہیں کرتا۔ ہم غیر زبان والے بھی بلا قباحت کمال مشقت کے ساتھ ان کو سیکھتے یاد رکھتے اور استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک فرنچ لفظ Rendezvous انگریزی میں بہت استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تلفظ ملفوظ شکل سے یکسر مختلف ہے۔ یہ ''رین ڈیز وس'' نہیں بلکہ ''رون ڈے

و'' ہے۔ اس طرح کی سیکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس طرز فکر کی وجہ شاید وہ احساسِ کمتری ہو جو پسماندگی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔

ایک یہ عجیب و غریب رویہ بھی اختیار کیا جاتا ہے کہ اگر دو لفظ ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں تو ان کے املا کو مختلف کر دیا جائے تاکہ ان کے معنی سمجھنے میں آسانی ہو۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عبارت میں متشابہ الفاظ کے معنی سیاق و سباق سے سمجھ میں آتے ہیں اور قاری سمجھ لیتا ہے کہ مولف کتاب کو ''نذر'' کرنا چاہتا تھا اور ''نظر'' کر گیا ہے۔

اب اردو املا سے متعلق سفارشات کے حوالے سے کچھ باتیں پیش کرتا ہوں۔

سفارش کی گئی ہے کہ طلباء کو طلبا (بغیر ہمزہ کے) بھی لکھا جا سکتا ہے۔ جبکہ طالب کی جمع طلبہ ہے طلبا نہیں جیسے وارث کی جمع ورثہ (بفتحتین) ہے۔

گذر، گذشتہ، گذارش، گذارنا، گذاری، شکرگذار وغیرہ الفاظ کو ذال سے لکھنے کی سفارش کی گئی ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ متقدمین سے لے کر آج تک کا یہ مختلف فیہ مسئلہ حل ہو گیا، جن الفاظ کے املا کے سلسلہ میں حضرت غالب پر بھی اعتراض کیا گیا۔ آصفیہ میں جن کو زائے ہوز سے لکھنے کی وکالت کی گئی ہے۔ ''اردو املا'' میں رشید حسن خاں نے آٹھ دس صفحات میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ چلنے، چھوڑنے اور پار کرنے کے معنی میں گذاردن گذشتن اور گذاشتن کو اور ان کے مشتقات کو لازماً ذال سے لکھا جائے گا۔ مثلاً گذشتہ، گذرگاہ، گذران، راہ گذر وغیرہ۔ اور ادا کرنے، پیش کرنے، شرح کرنے کے معنی میں گزاردن اور اس کے مشتقات کو ''زے'' سے لکھا جائے گا۔ مثلاً گزارش، باج گزار، مال گزاری، شکرگزار، نمازگزار وغیرہ۔

مگر اب صورت حال یہ ہے کہ خود اہل زبان فارسی گزاردن کو سب معانی میں ''ذال'' اور ''زے'' دونوں سے لکھتے ہیں۔ املا کا یہ فرق ختم ہو چکا ہے۔ سلیمان حییم نے فرہنگ جامع فارسی انگلیسی میں گذاردن پر نوٹ لکھا ہے کہ ''بجالانے اور ادا کرنے کے معنی میں اس لفظ کا املا گزاردن بھی ہے۔ مثلاً سپاس گزار، شکر گزار وغیرہ۔'' اسی طرح گزارش اور گذارش دونوں کے ایک ہی معنی لکھے ہیں۔ ہاں گذاشتن اور گذشتن ''ذال'' سے ہی لکھے ہیں۔ اکثر گذشتہ اور اس کے دیگر مشتقات کو اردو میں ''زے'' سے لکھا ہوا بھی دیکھا جا رہا ہے۔ ''شاعر'' کے حالیہ شمارے (مئی ۹۹ء) کے ادا ریہ کا پہلا لفظ ''گزشتہ'' (زے کے ساتھ) لکھا گیا ہے اگرچہ لفظ ہمیشہ

"گذشتہ" (ذال سے) ہی لکھا جاتا رہا ہے۔ اردو میں گزرنا، گزر (گزر بسر) گزر (رہگور) گزری، گزران، گزرانا، گزارنا، گزارا، زائے ہوز کے ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں۔ (اردو مصدر نامہ از مولانا حفیظ الرحمان واصف دہلوی)

سفارش کی گئی ہے کہ "عربی کے ایسے الفاظ جن کے الف کے اوپر ہمزہ لکھا جاتا ہے اردو میں بھی [illegible] طرح لکھا جائے مثلاً تاثر، تأسف، تأمل، جرأت...... قرأت۔"

قرأت عربی میں نہیں لکھا جاتا بلکہ اردو میں عام لوگ بولتے اور لکھتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل قراءت ہے۔ اردو میں قرأت بعض شعراء نے باندھا ہے لیکن مولانا واصف دہلوی نے لکھا ہے:

"لفظ قراءت بروزن قیامت ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ میں ہمیشہ الف کے بعد ہمزہ لکھتا ہوں، لیکن جب کاپیاں دیکھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ کراماً کاتبین ہمیشہ ہمزہ کو الف کے کندھے پر سوار کر دیتے ہیں۔" (ادبی بھول بھلیاں ص ۱۲۱)

سفارش ہے کہ "مندرجہ ذیل عربی الفاظ کو اردو میں بھی عربی املا کے مطابق لکھا جائے۔ مؤثر، مؤخر، مؤدت، مؤذن... مؤکل .."

لیکن عربی میں قاعدہ یہ ہے کہ جس لفظ کے مادہ یعنی اصل حروف میں پہلا حرف الف ہو تو اس کے باب تفعیل کے اسم فاعل اور اسم مفعول میں واو پر ہمزہ لکھا جاتا ہے اور اگر اصل میں الف نہیں بلکہ واو ہو تو ہمزہ نہیں لکھا جاتا۔ مذکورہ بالا الفاظ میں سے مودت (بروزن محبت) اور موکل (بروزن محصل) کے حروف اصلیہ میں الف نہیں بلکہ واو ہے۔ ودّ اور وکل۔ ان میں واو پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔

سفارش ہے کہ "مندرجہ ذیل الفاظ کو جوڑ کر لکھنا بہتر ہے۔ اینچی، انجان بذاتخود" میرے خیال میں آخری لفظ بذاتخود غالباً کمپیوٹر کی وجہ سے زیادہ ہی جڑ گیا۔ "بذات خود" لکھنا ہی بہتر ہے۔

اعداد کو لفظوں میں لکھنے کے لیے دونوں، تینوں، چاروں پر قیاس کر کے چھیوں، نوؤں، دسوؤں، گیارھوں..... وغیرہ لکھنے کی سفارش کی گئی ہے۔ ان کے صحیح و فصیح استعمال کی شکل مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہو جاتی ہے۔

''عدد استغراقی کے لیے ''وں'' کا استعمال صرف چھ اعداد میں ہے۔وہ یہ ہیں: دونوں، تینوں، چاروں، پانچوں، ساتوں، آٹھوں۔ ان کے علاوہ ''وں'' کہیں نہیں بلکہ چھ کے چھ، نو کے نو، دس کے دس، گیارہ کے گیارہ۔ اسی طرح آخر تک عدد استغراقی بنے گا۔'' (ادبی بھول بھلیاں ص ۱۳۶)

سفارشات میں ارادہ، دفعہ اور کلیہ میں تو تائے مدورہ تسلیم کی گئی ہے اور بغیر اضافہ الف کے تنوین لگانے کا مشورہ دیا گیا ہے لیکن اصالت، حقیقت، شکایت، ضرورت، عادت، فطرت میں نہیں اور اضافہ الف کے بعد تنوین لگانے کی ہدایت دی گئی ہے۔ جبکہ حقیقتاً ان سب کے آخر میں بھی تائے مدورہ ہی ہے۔ یہ تائے مصدریہ ہے جو زائد ہوتی ہے ۔ اور مدورہ لکھی جاتی ہے اور اس میں بغیر اضافہ الف کے تنوین قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ حالتِ وقف میں ہائے ہوز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ عربی میں تائے دراز حرف ان الفاظ میں لکھی جاتی ہے جن کے حروف اصلیہ میں ''ت'' موجود ہو مثلاً بیت، وقت، ثبت، اثبات، سکوت، صوت وغیرہ میں۔ ان پر اگر دو زبر لگانے کی ضرورت پیش آئے تو ''الف'' کا اضافہ کر کے ہی تنوین لگائی جاتی ہے اور حالت وقف میں اس کا تلفظ نہیں بدلتا۔ اردو میں مستعمل عربی الفاظ میں اردو والوں نے فارسی والوں کی طرح یہ تصرف کیا کہ تائے مدورہ کو تائے دراز سے بدل کر مختلف معنی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس کو احمد بہمن یار نے حسن تصرف کا نام دیا تھا۔ ایسے الفاظ کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، ارادہ۔ قصد اور اراوت ۔ مریدانہ عقیدت وخلوص، عقیدت اور عقیدہ، رسالت اور رسالہ، طریقت اور طریقہ، اضافت اور اضافہ، مراسلت اور مراسلہ وغیرہ

حال میں ''اردو زبان وقواعد'' نام کی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ اسکولوں میں قواعد اردو کی نصابی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ کئی مرتبہ طبع ہو چکی ہے۔ اچھی کوشش ہے۔ اس وقت میرے سامنے اس کا حصہ اول ساتواں ایڈیشن ہے۔ بنیادی سطح پر قواعد اردو سکھانے کے مقصد سے ترتیب دی جانے والی اس کتاب کی تیاری میں ذرا تحقیق وتلاش سے کام لیا گیا ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا اور اس میں غلطیاں راہ نہ پاتیں۔ مثلاً کچھ جملوں کی مثالیں دی گئی ہیں۔ ''شورنہ کریئے۔'' (ص ۲۷) ''وہ گری

ہوتی اگر میں نہ پکڑتا۔'' (ص ۲۸) درسی کتابوں میں تو صحتِ زبان کا خیال رکھا جاتا اور ''شور نہ کیجیے اور'' ''وہ گر جاتی یا'' گر گئی ہوتی '' لکھا جاتا۔ اس کتاب میں اس طرح کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ قوس قزح کو قوس وقزع لکھا ہے (ص ۴۹) سحاب (بادل) کو سہاب (ہائے ہوز سے) لکھا ہے (ص ۱۰۵) ادب کی جمع ادباء لکھی ہے (ص ۷۹) ص ۷۷ پر لکھا ہے کہ صحرا کی جمع نہیں ہوتی لیکن ص ۸۲ پر اس کی جمع لکھی ہے صحارا۔ تیتر کا مؤنث لکھا ہے تیتری۔ قاضی کی جمع قضات لکھ دی جبکہ یہ قضاۃ ہے۔

مرکب الفاظ کے سلسلے میں یہ ہدایت دی گئی ہے ان کو الگ الگ کر کے لکھا جائے مثلاً ان جان، ان مول، ان ہونی وغیرہ۔ (ص ۷۵) مگر ذرا غور کریں'' میں ان جان داروں سے بل کل ان جان ہوں۔'' اور'' میں ان جانداروں سے بالکل انجان ہوں۔'' دونوں جملوں میں کونسا روانی سے بلا تکلف پڑھا اور لکھا جا سکتا ہے۔ اور دیکھنے میں بھی نامانوس نہیں معلوم ہوتا۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ یہ ہدایت دینے کے باوجود کمیاب، کمزور، کمتر، ہمدرد، ہمدم، باغبان نگہبان، تنخواہ، چوکیدار، بیلدار، پاندان، اگالدان، ہمزاد، مرغزار، راہزن اور اسی طرح کے سیکڑوں الفاظ کو ملا کر رائج ومتعارف املا کے مطابق ہی لکھا گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ایسا قاعدہ کیوں گھڑا جائے جس پر عمل کرنا انتہائی دشوار اور چلن کے خلاف ہو۔

صفحہ ۸۷ پر عربی قواعد کے مطابق جمع بنانے کا ایک'' قاعدہ'' لکھا ہے کہ:

'' بے جان کی جمع علامت'' الف ت'' یا ''ر'' ہوتی ہے۔ مثلاً واقعات، حادثات، معاملات، عناصر، مناظر، مظاہر وغیرہ۔''

عناصر، مناظر، مظاہر میں ''ر'' جمع کی علامت ہے یہ تو اس کتاب سے ہی معلوم ہوا۔ مگر مساجد، شوارع، کتب میں تو ''ر'' آئی ہی نہیں۔ کیا یہ اور ایسے دیگر الفاظ جمع نہیں ہیں؟ پھر عنصر منظر اور مظہر میں ''ر'' کس چیز کی علامت ہے؟ حیرت اور افسوس ہے کہ نصابی کتاب میں اس قدر غلط اور گمراہ کن قاعدے بتائے جاتے ہیں۔

صفحہ ۸۸ پر لکھا ہے۔ ''مترادف الفاظ آپس میں ہم وزن ہوتے ہیں ان میں تبدیلی کر کے ہم حسین وخوبصورت اور دوست ورفیق نہیں کہہ سکتے بلکہ حسین وجمیل اور دوست واحباب کہیں گے۔''

مترادف ہونے کا مطلب ہے ہم معنی ہونا۔ دو مترادف لفظ ہموزن بھی ہو سکتے ہیں۔ وزن ترادف کی شرط کیونکر ہو گیا اور دوست اور احباب ہموزن کیسے ہو گئے۔ بات

صرف یہ ہے کہ حسین وجمیل فصیح ہے اور حسین وخوبصورت محاورہ کے خلاف ہے فصیح نہیں ہے۔ دوست احباب فصیح اور دوست ورفیق محاورہ کے خلاف۔

صفحہ ۵۴ پر یہ اصول بتایا گیا ہے کہ:

> ''ن'' اور ''ہ'' ایک ساتھ جن الفاظ میں آتے ہیں ان کا تلفظ ''ن ہ'' کی ملی جلی آواز کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔ خیال رہے کہ ان میں ''ن'' پہلے اور ''ہ'' بعد میں لکھی جاتی ہے۔ جیسے منہدی، منہگی، منہگا، لنہگا۔''

ان الفاظ کو یوں کہیں نہیں لکھا جاتا سوائے اس کے کہ کچھ لوگوں یا اداروں کی سفارشات میں لکھا ہوا مل سکتا ہے جو قبول عام حاصل نہیں کر سکیں۔ خود اس کتاب میں ہی ص ۹۵ پر اپنے بیان کردہ اصول کے خلاف اور درست رائج املا کے ساتھ ''مہنگا'' لکھا گیا ہے۔ اس کا اکثری قاعدہ یہ ہے۔

> ''اگر ان دونوں سے پہلے حرف علت ہو تو نون غنہ ہائے ہوز پر مقدم ہوگا جیسے بانہہ، مونھ، مینھ ورنہ ہائے ہوز مقدم ہوگی جیسے مہنگا، لہنگا پہنچا، پہنچی''۔ (ادبی بھول بھلیاں ص ۱۰۵)

اردو زبان وقواعد کی یہ نصابی کتاب جو شفیع احمد صدیقی صاحب نے سالہا سال کی محنت، مطالعہ اور تجربہ کے بعد مرتب کی ہے اس بات کی متقاضی تھی کہ اس فن کے اصول وقواعد وضوابط کے جزئیات وکلیات کی کافی معلومات حاصل کرنے کے بعد مرتب کی جاتی۔ اس کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ دانشوروں کے اس قول میں شک وشبہ کی بالکل گنجائش نہیں ہے کہ اس فن پر قلم اٹھانے سے سنگلاخ وادیوں میں بھٹک جانے کا خوف رہتا ہے۔ اور اس راہ سے سلامت گزر جانا بہت مشکل کام ہے۔ اس کتاب کی کسی عربی جاننے والے شخص سے اصلاح وتصحیح کروانی چاہیے تھی تاکہ غلط سلط قواعد اور مضحکہ خیز قسم کے سہو اس میں راہ نہ پاتے۔

قیصر سرمست
کاشانہ ثریا
یاقوت پورہ، حیدر آباد

مائکرو ویوز کیا ہیں

دنیا کا تقریباً ہر انسان زندگی میں ایک بار ہی سہی کسی چھوٹے بڑے تالاب پر بطور تفریح یقیناً گیا ضرور ہوگا اگر نہیں گیا ہے تو کسی کنٹے یا ٹھہرے ہوئے پانی کے کسی جوہڑ پر، تو ضرور گیا ہوگا اور اس ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکریاں بھی یقیناً پھینکی ہوں گی۔ اس پرسکون پانی میں کنکریاں پھینکنے کے بعد آپ نے کیا دیکھا؟ یہی نا کہ جس مقام پر آپ نے کنکریاں پتھر پھینکا تھا اس جگہ سے دائرے کی شکل میں چھوٹی چھوٹی موجیں یا لہریں اٹھیں اور پھر پھیلتے پھیلتے آپ کے قدموں تک یعنی کنارے تک آگئیں۔ اگر کسی تالاب پر جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو تو کسی خالی کمرے میں (جہاں ایک بھی سامان نہ ہو) چلے جائیے اور باآواز بلند پکاریئے۔ آپ کی آواز کچھ دیر تک بازگشت کی صورت میں کمرے میں گونجتی ہوئی معلوم ہوگی اور آپ کے کانوں سے ٹکرائے گی۔
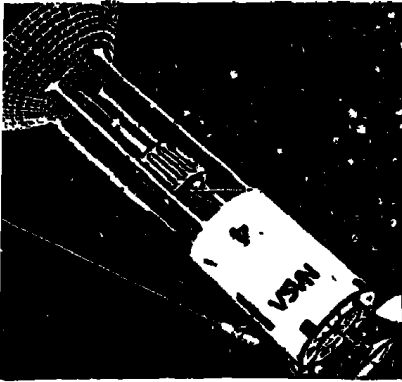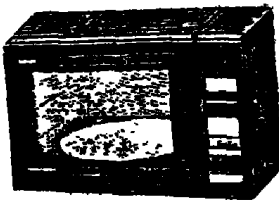
بالکلیہ یہی صورت مائکرو ویوز کی ہے۔ مائکرو ویوز ایک ہزر ملین ہرٹز فی سیکنڈ کی فری کوئنسی حاصل کر لیتی ہے (سمندر کی شدید اور بے قابو موجوں کی شکل جس طرح وادیوں

اور پہاڑیوں جیسی اونچی نیچی ہوتی ہیں اسی طرح مائکروویوز بھی پہاڑیوں اور وادیوں کی صورت میں سفر کرتی ہیں اور ان موجوں اور پہاڑیوں کے درمیان کا فاصلہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ اسی فاصلے کو طولی موج Wave Length کہتے ہیں۔ مائکروویوز کی طولی موج تیس سنٹی میٹر سے پچاس سنٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ مائکروویوز کو آپ بجلی یا مقناطیسی برقی قوت سے پیدا کر سکتے ہیں۔

ریڈیائی لہروں میں جس طرح ہم کمی وبیشی پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح مائکروویوز میں بھی کمی زیادتی کی جا سکتی ہے۔ مائکروویوز مختصر طولی موج Wave Length کی مالک ہونے کی وجہ سے مائکروویوز کو زیادہ آسانی سے طویل فاصلے تک پھینکا جا سکتا ہے اور ان کی وصولی کے لیے معمولی سے انٹینا Antenna کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں عام مواصلاتی آلات کے لیے بیحد موزوں سمجھا جاتا ہے۔ مائکروویوز زمین کے اطراف ہوا کا جو غلاف ہے اس میں سفر کرتی ہیں۔ یہ غلاف سات میل لانبا ہوتا ہے۔ اس حصے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موسم تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ عام ریڈیائی لہروں کے مقابلے میں یہ لہریں موسمی تبدیلیوں سے بہت کم متاثر ہوتی ہیں۔ اسی لیے مائکروویوز کو پیغام رسانی کے لیے ترجیح دی جاتی ہے ٹیلی ویژن کی نشریات کے لیے مائکروویوز کے استعمال میں افادیت یہ ہے کہ مختصر طول موج کی وجہ سے ان نشریات کی وصولی باہمی مداخلت کے بغیر ممکن ہوتی ہے یعنی ایک مائکروویوز انٹینا بہت سے اسٹیشنوں کی نشریات کو وصول کر سکتا ہے اور یہ موجیں باہم ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر سفر کر سکتی ہیں۔

مائکروویوز کی مختصر تاریخ۔

ان موجوں کا استعمال پیغام رسانی کے شعبے میں ۱۹۳۰ء میں شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ۱۹۴۰ میں سائنس دانوں کو ان موجوں کے استعمال میں پہلی مرتبہ کامیابی اس وقت ہوئی جب برمنگم یونیورسٹی کے شعبہ طبیعیات Physics میں ایک ایسی مشین بنائی گئی جو Ultra short electromagnetic waves پیدا کرتی ہے اس مشین کا نام Magnetrone رکھا گیا ہے اور پھر یہ مشین ۱۹۴۵ء میں تجارتی بنیادوں پر بنائی جانے لگی۔ راڈار کی حدوں کو وسیع کرنے کے لیے یہ مشین بہت کارآمد ہوتی ہے۔ بعد میں ان موجوں سے ایک بہت ہی عجیب کام لیا جانے لگا، جب یہ معلوم ہو گیا

کہ ان موجوں کو پانی کے سالموں میں سے گزارا جائے تو موجوں سے رگڑ کے نتیجے میں غیر معمولی حرارت پیدا ہوتی ہے تو اس اصول پر مائکرواوون Micro Oven تیار کیا گیا۔ (۱۹ر نومبر ۹۲ء کے صبح کے پروگرام میں ملک کی مصنوعات پر بتایا گیا۔ اسی میں دوسری مصنوعات کے ساتھ مائکروویوز اوون Oven بھی بتایا گیا تھا۔ اب یہ ملک میں تیار ہونے لگے ہیں اور بازار میں آ گئے ہیں) مائکروویوز کے استعمال ...وں میں پکنے لگا۔ میکوون اتنی تیز رفتار موجیں پیدا کرتا ہے کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ایک سکنڈ میں دو ہزار چار سو پچاس (۲۴۵۰) ملین مرتبہ تبدل پذیر ہوتی ہیں جس کی وجہ سے انتہائی غیر معمولی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کاغذ پر پکائی جانے والی غذا رکھی گئی تھی وہ اتنی حرارت کے باوجود جل کیوں نہیں جاتا؟ وجہ یہ ہے کہ کاغذ یا اوون کی بناوٹ میں پانی کے سالمات نہیں ہوتے اور مائکروموجیں صرف پانی کے سالمات پر ہی اثر انداز ہوتی ہیں۔ چنانچہ ...رم تک نہیں ہوتا۔ ایسے اوون ۱۹۶۰ء میں بننے شروع ہو گئے تھے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی تک اس کا چلن عام نہیں ہو پایا۔ دنیا کا سب سے بڑا مائکرواوون "سانتا کلارا" کیلی فورنیا میں ہے۔ اسے پلاسٹک کی تیاری کے لیے بنایا گیا ہے۔

آج کل لوگ ریڈیو کو بھول کر ٹیلی ویژن پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور شاذ ہی کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں ٹیلی ویژن نہ ہو اس لیے سب ہی ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں اور تقریباً روز ہی اناؤنسر کے اس جملے پر آپ جز بز ہو کر رہ جاتے ہیں کہ "رکاوٹ کے لیے ہمیں کھید ہے" "रूकावट के लिए हमें खेद है" (حقیقتاً یہ جملہ کچھ اس طرح کا ہونا چاہیے تھا "رکاوٹ ہمارے لیے کھیل ہے (रूकावट हमारे लिये खेल है) کیونکہ ہر تھوڑی دیر بعد ٹی۔ وی کے پروگراموں میں رکاوٹ آ جانا معمول ہو گیا ہے۔) یہ رکاوٹ مائکروویوز سسٹم میں خرابی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو کی نشریات اور پیغام رسانی کے دوسرے شعبوں جیسے ٹیلی فون اور راڈار وغیرہ میں مائکروویوز کا استعمال عام ہوتا جا رہا ہے۔ اس اہم ایجاد کی وجہ سے فضائی حادثات میں غیر معمولی کمی آ جائے گی کیونکہ طیران گاہوں Airports پر طیاروں کے اترنے کے لیے یہی نظام اپنایا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ایک ہی پٹی (رن وے) پر طیاروں کے پہلو بہ پہلو

بحفاظت اترنے کو بے خطر اور محفوظ بنا یا جارہا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں نے اس نظام کو ۱۹۸۰ء سے شروع کردیا ہے۔

ان موجوں کا استعمال اب لیزر Laser شعاعوں میں کیا جانے لگا ہے مشہور سائنس داں "ٹاؤن" نے جو شعاعیں زمرد Emerald سے گزار کر "لے زز" شعاعیں حاصل کی تھی وہ حقیقت میں مائکروویوز ہی تھیں ۔ یہ اور بات ہے کہ Laser شعاعیں اب ایک علاحدہ علم کا مقام حاصل کر چکی ہیں ۔راڈار میں مائکروویوز کا استعمال ۱۹۲۰ء میں شروع ہو چکا تھا۔ اب یہ ممکن ہو چکا ہے کہ دو کلومیٹر پر بیٹھی ہوئی ایک مکڑی کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے اور مقام کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔ طیران گاہوں اور بندرگاہوں پر جہازوں کی آمدورفت کو مائکروویوز راڈار کی مدد سے کنٹرول کیا جانے لگا ہے اور تمام جدید بحری اور ہوائی جہازوں میں مائکروویوز راڈار لگے ہوئے ہیں جو راستے کا نہ صرف تعین کرتے ہیں بلکہ موسم کا حال اور طوفان کی آمد کی پیش قیاسی بھی کرتے ہیں۔

کرۂ ہوائی میں دور دور تک جو بھی تبدیلی و تغیر ہوتا ہے ان موجوں کی مدد سے ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔ اس نئے علم کو "ریڈیو میٹرولوجی" کہتے ہیں۔ مواصلاتی نظام میں مائکروویوز کا استعمال بہت زیادہ ہونے لگا ہے۔ کیبل اور ریڈیو کے پرانے مواصلاتی نظام کی جگہ اب مائکروویوز نظام لے رہا ہے۔ مواصلاتی سیاروں سے پیام رسانی کا جو نیا اور جدید ترین طریقہ شروع کیا گیا ہے اس میں بھی مائکروویوز استعمال کیے جارہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۰ میں جو مواصلاتی سیارہ ارلی برڈ Earlybird فضا میں داغا گیا تھا جس میں (۲۴۰) ٹیلی فون چینلوں اور صرف ایک ٹیلی ویژن چینل کی گنجائش تھی اور یہ مواصلاتی سیارہ پندرہ ملکوں کے درمیان رابطہ قائم کرتا تھا لیکن ۱۹۸۴ء میں جو سولہ مواصلاتی سیاروں پر مشتمل ایک سیٹ مدار میں بھیجا گیا تھا اس میں ایک ارب ٹیلی فون چینلس تھے جو دنیا کی کل ضرورت کا دو تہائی اور اس کی وجہ سے تقریباً ایک سو ساٹھ ملکوں کے درمیان رابطہ قائم ہو گیا ہے۔ چنانچہ لاس اینجلس میں ہونے والے اولمپک کھیلوں کو اڑسٹھ ملکوں میں تقریباً ایک ارب افراد نے دیکھا۔ یہ سب انھی مائکروویوز کی وجہ سے ہوا ہے اور آگے بہت کچھ ہوگا اور ہونا ہے۔

شرون کمار ورما
گلی اونتھان والی۔ چوک پراگ داس۔امرتسر

کہو ہم زندہ ہیں

وہ خاصی بڑی عمارت تھی لمبی چوڑی، کئی منزلہ، اس میں آباد تقریباً سبھی لوگ پریشان اور دہشت زدہ سے رہتے تھے۔ایسا ایک ڈراونی آواز کی وجہ سے تھا۔

یہ عجیب وہلا دینے والی آواز تھی۔اچانک شروع ہو جاتی۔آہستہ، پھر تیز اور تیز، گونجتی، پھیلتی ہوئی۔شروع میں لگتا کوئی کتا غرّا رہا ہے، پھر بھیڑیوں کی آواز میں بدل جاتی۔عمارت میں رہنے والے ڈرے، سہمے سے ایک دوسرے کو دیکھتے، عمارت کی تمام بتیاں اچانک گل ہو جاتیں۔لوگ اپنے اپنے کمروں میں بند ہو جاتے۔گہرا سناٹا چھا جاتا۔اس بھیانک اندھیرے اور سناٹے میں کوئی درندہ برآمدوں میں گھومنے لگتا۔ وہ جیسے ہر دروازے پر رک کر انسانی بُو سونگھتا اور غراتا۔

کچھ دیر بعد وہ آواز خود بہ خود بند ہو جاتی۔ بتیاں جل جاتیں۔لوگ باہر آجاتے۔وہ بدحواسی سے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے۔سب کو ایک ہی دھڑکا لگا رہتا۔کوئی نہ کوئی ضرور کم ہوگا۔تب بوڑھا مصور پُر اعتماد لہجے میں کہتا۔

"ڈرنا چھوڑو۔"

"لیکن وہ درندہ۔وہ ڈراونی آواز، اُس کی بُو۔کتنے ہی تو اس کا شکار ہو چکے ہیں۔"

"تمھارا وہم ہے، تمھارا اپنا ڈر، نکال دو یہ ڈر دلوں سے۔"

"پوری عمارت کا کنٹرول اُس کے ہاتھ میں ہے۔سب سے اوپر والی منزل میں، سوائے اس کے کچھ پسندیدہ پچھ لگوؤں کے، کوئی نہیں جا سکتا۔وہ جب چاہے اندھیرا کر سکتا ہے۔کسی کی بھی جان لے سکتا ہے۔وہ اعلان تو یہی کرتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ ہماری بھلائی کے لیے کر رہا ہے اور کہ اصل کنٹرول ہم لوگوں کے ہاتھ میں ہے، لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے، ڈھکوسلہ ہے۔ہم کیا کر سکتے ہیں۔

''زندہ ہونے کا ثبوت دو۔ تم تو موت سے پہلے ہی مر رہے ہو۔''

''درندہ ہمیں کچھ کرنے نہیں دیتا۔ وہ اکیلا بھی نہیں ہے۔''

''اگر اس کا وجود ہوتا تو دکھائی بھی دیتا۔ دراصل وہ ہے ہی نہیں۔ وہ تمھاری کمزوری اور ڈر کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ بجائے کمروں میں بند ہونے کے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ جھپٹو اس پر، مار ڈالو اسے۔ یوں ڈرنے اور سہے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔''

''بوڑھا سٹھیا گیا ہے۔'' چکنے چہرے والے نے اونچی آواز میں کہا۔ ''یہ تمھیں ورغلا کر کسی مصیبت میں پھنسا دے گا۔ تمھارا بھلا سوچنا اوپر والوں کی ذمے داری ہے اور وہ اسے بخوبی نبھا رہے ہیں۔ انھیں ہر وقت تمھاری چنتا ہے لیکن وہ بغاوت برداشت نہیں کریں گے۔''

''اور وہ درندہ، وہ بُو اور اس کی غرّاہٹ۔''

''وہ تمھاری حفاظت کے لیے ہے۔''

''یہ چکنا آدمی، اُن کا ایجنٹ ہے۔ اس کا ناشتہ پانی سب اوپر سے ملتا ہے۔ یہ ان کے لیے کام کرتا ہے، اس سے خبردار رہو۔'' بوڑھا بولا۔

''یہ بکواس ہے، بہتان ہے۔'' چکنا آدمی بپھر گیا۔

تبھی گراؤنڈ فلور سے چوکیدار کی چیخ سنائی دی کچھ لوگ بھاگے بھاگے نیچے گئے۔ چوکیدار خوفزدہ سا کھڑا تھا۔ اُس کی بیوی کی لاش برآمدے میں پڑی تھی۔ اس کی گردن پر نوکیلے دانتوں کے گہرے نشان تھے، جسم پر تیز ناخنوں کی خراشیں تھیں۔ لباس پھٹ رہا تھا۔ اسے بڑی بے رحمی سے مارا گیا تھا۔

''یہ کیسے ہوا۔ کون تھا وہ۔''

''وہی درندہ۔ دو پیروں پر چلنے والا۔''

''لیکن کیوں۔ کیوں مارا اسے۔''

''وہ اس عمارت سے باہر نکلنے کا راستہ جانتی تھی اور اس کے بارے میں عمارت والوں کو بتانا چاہتی تھی۔ اسے اوپر والی منزل میں بلایا گیا تھا۔ وہ نہیں گئی۔''

''کیا ہم قیدی ہیں۔ نہ باہر جا سکتے ہیں، نہ اوپر۔ ہمیں چوہوں کی طرح رہنا پڑ رہا ہے۔'' نوجوان نے کہا۔ ''آخر کیوں، کب تک۔''

چکنا آدمی پیلا پڑ گیا تھا۔ تمام آنکھیں، اسے گھور رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں

پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ ایک دم وہ آواز گونجنے لگی۔ اب وہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ جیسے کوئی تنبیہہ کر رہا ہو۔ چوکیدار کی بیوی دشمنوں سے مل گئی تھی۔ وہ اس عمارت کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔ ہم بہت دنوں سے اس کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں [illegible]

[illegible] کر کمروں میں جا دبکے۔ بوڑھا اور نوجوان باہر کھڑے رہے۔ پھر وہی آواز [illegible] حاکمانہ انداز میں گونجی۔ تم بھی جاؤ۔ یہ حکم عدولی برداشت نہیں کی جائے گی۔"

وہ دونوں بھی چلے گئے۔ اب پوری عمارت سناٹے اور اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ بوڑھے نے کمرے کی پچھلی کھڑکی کھول دی۔ پچھواڑے، دور تک گھنا جنگل پھیلا تھا، اسے لگا جیسے وہ جنگل آگے بڑھ رہا ہو۔ دھیرے دھیرے کسی خطرناک ارادے سے۔

"مجھے ڈراؤ نہیں۔ میں جانتا ہوں یہ سب دھوکا ہے۔ [illegible] دھمکانے کی چال ہے۔ میں دیکھتا ہوں تم میرا کیا بگاڑتے ہو۔ بڑھتا ہوا جنگل جیسے ایک دم رک گیا، پھر وہاں جگنو سے جھلملانے لگے۔ بوڑھے کو پرمسرت خود اعتمادی کا خوشگوار احساس ہوا۔ اچانک اُسے لگا کہ کوئی عورت اُسے پکار رہی ہے۔ اس نے اندر باہر ادھر اُدھر دیکھا۔ یہ آواز وہ پچھلے کچھ دنوں سے سُن رہا تھا۔ ایک دم اُسے اپنی جیب میں رکھے خط کا خیال آیا۔ کسی عورت نے لکھا تھا۔ "میں مصیبت میں ہوں، میری جان کو خطرہ ہے۔ مجھے بچالو۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" عورت نے اپنا نام پتا کچھ نہیں لکھا تھا۔ کون تھی۔ اُسے ہی کیوں خط لکھا تھا، وہ اس کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ اب تک تو شاید وہ قتل کی جا چکی ہو۔

"خبیث بوڑھے۔ تو نے پھر کھڑکی کھولی۔ وہی آواز تھی۔ ہم تیری حرکات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ یہ خط جلا دے۔ بے معنی ہے۔ یہ کھڑکی بند کر، ورنہ مارا جائے گا۔"

بوڑھا زور سے ہنسا۔ "باہر کوئی جنگل نہیں ہے۔ میں جان گیا ہوں۔ تم لوگوں سے اُن کا اعتماد، ان کا یقین چھین لینا چاہتے ہو۔ میں کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں بتاؤں گا سب کو کہ جنگل کہیں نہیں ہے، کوئی درندہ ورندہ نہیں ہے اور یہ آواز بھی دھ[illegible] ہے۔ میں تیری یہ آواز بند کر دوں گا۔ کھڑکی بند نہیں ہوگی۔"

عمارت میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ لوگ گھبرا کر کمروں سے باہر آ گئے۔ بوڑھے نے اُنھیں بتایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ زلزلہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

[illegible] خود۔ خود رک گیا۔ بوڑھے نے کمرے میں ایزل پر لگی ادھوری تصویر

دیکھا اور سوچا، اب یہ تصویر مکمل ہو جائے گی۔

اگلی صبح وہ چکنا آدمی اوپر سے تحریری حکم نامہ لایا جس کی رو سے بوڑھے کی تمام موم بتیاں، برش اور رنگ چھین لیے گئے۔ کمرے کی بتی کاٹ دی گئی اور اُسے تصویر مکمل نہ کرنے کی تاکید کر دی گئی۔

''بوڑھے، ان فضولیات میں وقت ضائع مت کرو۔ عمارت کی توسیع کے لیے تعمیری کاموں میں ہمارے ساتھ تعاون کرو،

بوڑھا نہیں دبا

''ہنستے کیوں ہو۔''

''تمھاری بے وقوفی پر۔''

''ہم تمھاری ہنسی بھی چھین لیں گے۔''

''تب میری تصویریں ہنسیں گی۔''

''ہم تمھارے ہاتھ قلم کر دیں گے۔''

''کروڑوں ہاتھ؟۔''

چکنا آدمی پریشان ہوا تھا۔ اب وہ تو ڈرا ہوا سا تھا۔ وہ اوپر چلا گیا۔ ساتھ والے کمرے سے جھانکتی لڑکی بوڑھے کے پاس آئی اور اپنائیت سے بولی۔

''بابا، تمھیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ تمھیں بھی۔ میں ڈرتی ہوں۔''

''ڈرو نہیں، حوصلے سے کام لو۔'' وہ لڑکی کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا گیا۔'' کھڑکی کھول کر باہر دیکھو تب تک دیکھتی رہو جب تک جنگل میں چراغ نہ جلنے لگیں۔ سوچو کہ روشنی ضرور ہوگی، جنگل کہیں نہیں ہے، نہ کوئی آواز ہے، نہ درندہ۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔ چوکیدار کی بیوی۔''

''کرو گی تم ایسا۔ سب کریں گے۔ یہی ایک راستہ ہے نجات کا۔ ہمیں خود کو یقین دلانا ہوگا کہ طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے ہم حالات کو بدل سکتے ہیں۔''

''اس نے مجھے دھمکی دی ہے۔ چھوڑو'' تم اپنی تصویر واپس لے جاؤ۔'' لڑکی نے تصویر بوڑھے کو لوٹا دی۔ وہ گاڑھے، سیاہی مائل خون کے پس منظر میں کٹی زبانوں، قلم کئے گئے ہاتھوں، اندھی آنکھوں کے سیاہ گڑھوں کی تصویر تھی۔ بوڑھے کی بنائی ہوئی ایسی تصویریں عمارت کے ہر کمرے میں آویزاں ہیں۔ تصویریں بنا کر لوگوں کو دینا اُس کا

جنون تھا۔ تصویر دے کر وہ کہتا۔ "اگر یہ تم سے کچھ کہے تو اس کی بات پر عمل کرنا۔"

اس رات جب سب لوگ کمروں میں چلے گئے تو چکنے آدمی کی خوبصورت بیوی بوڑھے کے کمرے میں گئی اور تحکمانہ لہجے میں بولی

"بوڑھے، میری تصویر بناؤ۔"

"تم مر چکی ہو، مردوں کی تصویریں نہیں بنائی جاتیں۔"

"مری ہوئی عورت کیا ایسی ہوتی ہے۔ عورت نے تمام کپڑے اُتار دیے۔

"تم نے کبھی ایسی دھڑکتی ہوئی عورت دیکھی ہے۔"

"دیکھ کر سخت شرمندہ ہو رہا ہوں۔"

"بدتمیز بوڑھے" وہ چیخی۔ "تم خود مر چکے ہو۔"

بوڑھا اطمینان سے مسکراتا رہا۔

"تم میری تصویر بناؤ، تمھیں وہ تمام سہولیات میسر ہو جائیں گی جو ہم اوپر والوں کو نصیب ہیں۔ تمھارے تمام ڈر اور خدشات دور ہو جائیں گے۔"

"میں بکاؤ نہیں ہوں۔"

وہ پاؤں پٹکتی چلی گئی۔

آدھی رات کو لوگوں نے لڑکی کی چیخیں سنیں۔ بوڑھا بھاگا بھاگا گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ لڑکی مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ بوڑھے نے نوجوان سے دروازہ توڑنے کے لیے کہا تو وہ خوبصورت جوان عورت آگے آ گئی۔ اُس نے اُنھیں دھمکایا۔

"یہ غیر قانونی ہے۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"لڑکی کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"وہ ہسٹریا کی مریض ہے۔" عورت نے اپنی چابی سے دروازہ کھولا۔ بوڑھا جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔

لڑکی بستر پر پڑی چھٹپٹا رہی تھی۔ اس کی گردن اور بدن پر ناخنوں کی خراشیں تھیں۔ "کیا ہوا، کون تھا۔ بوڑھے نے شفقت سے پوچھا۔

"تم کیوں آئے ہو، چلے جاؤ" لڑکی خوفزدہ تھی" تم نے کہا تھا نا کھڑکی کھولنے کو دیکھو۔ دیکھ لو۔ وہ آیا تھا۔" لڑکی بے ہوش ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔

بوڑھا اسے سہارا دے کر کھڑکی تک لے گیا۔ ہوا میں جنگل کی خوشبو تھی۔

"دیکھو چراغ روشن ہونے لگے ہیں۔"

"اندھیرا ہے۔"

"نہیں۔ جنگل پیچھے ہٹ رہا ہے۔ غور سے دیکھو، روشنی بڑھ رہی ہے۔

لڑکی کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ اسے بستر پر لٹا کر بوڑھا اور جوان باہر آ گئے۔ "اب تم ہر کمرے میں جا کر کھڑکی کھول دو، سب کو بتاؤ کہ جنگل کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

"خبردار، ایسا کیا تو۔" آواز گونجی۔ "جنگل حقیقت ہے۔ کھڑکیاں کھلیں تو جنگل اپنے اندھیرے اور درندوں سمیت عمارت میں آ گھسے گا۔ لوگوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دو وہ اسی طرح خوش ہیں۔"

"اس آواز پر کان مت دھرو،" بوڑھا اعتماد سے بولا" جاؤ، ہر کمرے میں جاؤ۔

چکنا آدمی نیچے آ گیا۔ اُس نے نوجوان کو روکنا چاہا۔ نوجوان اُس سے گتھم گتھا ہو گیا، آخر زخمی ہو کر وہ آدمی اوپر بھاگا۔ نوجوان نے اُسے سیڑھیوں میں جا لیا اور اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔

"اوپر والی منزل کو تباہ کر دو۔" بوڑھا چیخ رہا تھا۔

اوپر جیسے گھمسان کا رن پڑا تھا، چیخیں، آوازیں، ٹوٹ پھوٹ،

لڑکی باہر آ گئی تھی۔ وہ خوشی سے بولی

"بابا جنگل غائب ہو رہا ہے، روشنی پھیلنے لگی ہے۔

تب ہر کمرے سے کھڑکی کھولے جانے کی آواز آنے لگی۔ لوگ خوش تھے۔

نور پرکار

شاعر بہ نگاہ شاعر

کچھ ہندی کوی اُمیش شرما کے بارے میں

اُمیش شرما نے اپنے پہلے ہندی شعری مجموعے ''یہ آشیاں'' میں زندگی اور خواب کو آپس میں گڈ مڈ ہونے سے بال بال بچایا ہے۔ خوبصورت زندگی کے خوبصورت خواب دیکھنا ہر شاعر کا وطیرہ رہا ہے۔ اُمیش شرما نے بھی انہی مختلف رنگوں کی پہچان میں قاری تک پہنچنے میں دیر کی ہے۔ دراصل وہ دہلی میں اسٹیج سے وابستہ رہے۔ اور نادرہ ببر اور پنکج کپور کے ڈائرکشن میں اداکاری کے جوہر دکھاتے رہے۔ فائن آرٹس سے ان کی وابستگی اداکاری سے شروع ہوئی۔ اور نظم وغزل پر آکر مرکوز ہوگئی۔ ذہن کی تنہائی میں سانس لینے اور جینے والے اس فنکار نے روایت سے محبت میں اُس سے گریز بھی کیا۔ اسی لیے اپنی نظموں میں کشمکش، ذہنی تصادم و دباؤ، اپنے گاؤں کے گلی کوچوں کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ ہو بہو نقشہ ایک منظر کی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ بات اٹل فیصلے کی صورت ضبطِ تحریر کا حصہ بن سکتی ہے کہ امیش شرما کے یہاں طرزِ احساس کی سطح پر نظم طاقت ور پہچان کے دائرے میں شمولیت کا شنکھ پھونک رہی ہے۔ دوسری خوبصورت وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انھوں نے تصنع سے کام نہیں لیا ہے بلکہ سوچ کی لہروں کو جوں کی توں بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ یہی سادگی اور پرکاری الگ الگ نقشہ پیش کرتے ہوئے قاری کو ٹھہر ٹھہر کر نظم کا مطالعہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی ان کی کامیابی کی نشانی ہے۔ یہ آشیاں کے دیباچہ میں میں نے واضح طور پر اس طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے کہ اس میں وہ سرل بھاشا استعمال کی گئی ہے۔ جو ہندستانی کا درجہ رکھتی ہے اور جس کی شروعات گاندھی جی نے کی تھی۔ آج ممبئی میں ''ہندوستانی پرچار سبھا'' کے زیرِ اہتمام اُس کی نکاسی میں اردو ہندی میں ایک مجلّہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ جس کے ایڈیٹر میرے بڑے بھائی محمد حسین پرکار ہیں۔ نایاب نسخے، کتابوں کا اتنا بڑا

ذخیرہ مخطوطات موجود ہیں کہ بطور حوالہ مستعمل کتب اسی لائبریری سے دستیاب ہوتی ہیں۔ امیش شرما کی یہ پہلی کاوش یقیناً اُن کی ثابت قدمی کا مثبت ثبوت ہے۔

لو پھر یاد آیا مجھے اپنا گاؤں وہ کوئل کی کو کو وہ انبوا کی چھاؤں
وہ سلمہ سے لڑنا وہ رینو سے کُٹی مگر ساتھ کھیلیں ملے جب بھی چھٹی
کبھی دوڑتے اور لگاتے تھے داؤں لو پھر یاد آیا مجھے اپنا گاؤں

یادوں کے خوبصورت آہنگ اور ملائی تجربوں کی روشنی اور خوشبو کے ساجھے دار امیش شرما کا جنم ۱۹۴۷ء میں بلند شہر میں ہوا۔ انٹر میڈیٹ تک وہیں ڈٹے رہے۔ پھر میرٹھ کالج سے بی۔ایس۔سی۔ پاس کیا۔ ۱۹۷۰ میں روڑکی یونیورسٹی سے انجینئرنگ اور ۱۹۹۷ میں کویت یونیورسٹی سے ماسٹر آف انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ ہم دو ہمارے دو کے مصداق ایک بیٹا اور ایک بیٹی زیر تعلیم ہیں نصف بہتر میخو شرما فورین افیئرس میں ملازم ہیں۔ ۱۹۶۶ء سے باقاعدگی سے طبع آزمائی جاری ہے۔ ہندی میں جے شنکر پرشاد اور اردو میں مرزا غالب سے زیادہ متاثر ہیں۔ رائٹرز فورم کے پبلکیشن سیکریٹری اور اُپکار کے صدر کی حیثیت سے بھی اپنے تہذیبی وقار کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ یہ آشیاں کتاب نما کے ایڈیٹر محترم شاہد علی خان نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہے۔ جس کا اجراء حال ہی میں رائٹرز فورم نے کیا ہے۔ دیگر ہندی شعراء میں جی۔کے۔سکسینہ، مسز اندرا شرما، مسز ریتا سبروال، مسز سینتا پریدا، اور مسز نشا گپتا سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ کسی پرانے درد کا حسن یوں ابھر کر سامنے آتا ہے۔

جب کبھی آئینہ دیکھا تم نظر آئے مجھے مسکرا کر اور کبھی لیتے ہوئے انگڑائیاں

لفظوں کے الٹ پھیر کی شاعری سے انھوں نے مکمل طور پر گریز کیا ہے۔ تخلیقی تازہ کاری اور فکری و فنی تجسس میں اپنے آپ کو دہرانے کے عمل سے کوسوں دور رکھا ہے۔

جیون ایک جھرنا ہے
پل پل بھر۔ چل چل کر
ندیا میں گھل مل کر
ساگر میں گرتا ہے۔ جیون ایک جھرنا ہے

ابھی امیش شرما کی سوچوں کی تازگی اور شبدوں کی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ داخلی کیفیت بہت سی سچائیوں کو سامنے لے آتی ہے اور شاعر کے سلجھے ذہن و احساس سے بھرا لہجہ متاثر کئے بنا نہیں رہتا۔

جب کبھی دیکھو گے آئینہ مجھے پاؤ گے جب بھی دامن کو سنبھالو سحر جاؤ گے
ہو گا ایسا بھی کبھی راتوں کی تنہائی میں گذرے لمحات کے سایوں سے لپٹ جاؤ گے

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔

مصنف: اقبال مہدی

درد آتا ہے دبے پاؤں

مبصر: پروفیسر ظہیر احمد خاں

قیمت: ۱۰۰ ر روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی

زیر نظر کتاب 'درد آتا ہے دبے پاؤں' اقبال مہدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جو سولہ افسانوں پر مشتمل ہے۔

اقبال مہدی بنیادی طور پر سائنسداں ہیں لہذا اردو ادب سے بظاہر ان کا تعلق نہیں رہا ہے مگر جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جن کے زیر سایہ تربیت پائی، وہ ادب وسخن کا گہوارہ تھا۔

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ سائنسداں جذباتی اور حساس نہیں ہوتے بلکہ حقیقت پسند ہوتے ہیں لیکن اقبال مہدی کے افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن کے اندر مشاہدات اور جذبات کا ایک جوالا مکھی تھا جو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا اور ان کی ذرا سی جنبش قلم سے ابل پڑا۔ سطر در سطر ان کی ایک نئی شخصیت ابھر کر سامنے آئی ہے اسی لیے ان کے افسانوں کو پڑھ کر لگتا نہیں کہ انھوں نے تین سال قبل ہی لکھنا شروع کیا ہوگا۔

'درد آتا ہے دبے پاؤں' کتاب خوبصورت نام کے ساتھ ایک کامیاب کاوش ہے۔ ویسے تو اس مجموعے کے تمام افسانے اپنی مثال آپ ہیں لیکن 'دوسرا تھپڑ' پیاسا کنارہ، عقاب، بانجھ، مدتوں رویا کریں گے۔' اور 'درد آتا ہے دبے پاؤں'۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام افسانوں کا اگر عمیق نگاہ سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ اقبال مہدی کو اظہار جذبات کے فن اور

زبان پر کس قدر دسترس حاصل ہے۔ وہ احساس کی شدت اور کرب کے اظہار سے بے چین تو ہیں مگر بے قرار نہیں۔ اسی لیے اپنے ہر افسانے میں وہ کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دیتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ ان کی تخلیقی قوت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کے بیشتر افسانے قاری کو جذباتی طور پر اس حد تک متاثر کرتے ہیں کہ آنسو نکل آتے ہیں۔ ان کی ہر موضوع پر گرفت کافی مضبوط ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار نگاری بھی بڑی کامیاب اور بہت خوب ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ کردار آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ سارے کردار آس پاس کے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانے نئی اور پرانی معاشرت کے عکاس ہیں۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے خلاف لکھتے ہیں لہٰذا رومانی پہلو خود بخود دامن بچالیتا ہے۔

اقبال مہدی بین السطور بھی ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو قاری کے دل پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔ ویسے تو ان کا خاص موضوع صنف نازک کا استحصال اور مسائل ہیں جو آج کے دور میں بھی فرسودہ نہیں ہیں۔ مگر اقبال مہدی کے افسانوں کا تعلق سماجی مسائل سے بھی اتنی ہی گہرائی سے ہے جیسے تعلیم نسواں کی اہمیت، حسب ونسب کی پابندیاں، بزرگوں کی تنہائیاں، فرشتوں کی جذبوں کی بے اعتباریاں، محبت کی نفرت پر فوقیت، حسن، دولت، اقتدار کی بے ثباتی، عصری مسائل اور سلگتے ہوئے حالات کی اڑتی ہوئی چنگاریاں، حالات و واقعات کی ایسی کڑیاں ہیں جن میں قاری پوری طرح بندھ جاتا ہے۔

آج کل جو ادب لکھ رہا ہے اس میں اکثر افسانوں کی کہانی ہوتی ہے نہ زبان۔ اقبال مہدی کے یہاں کہانی بھی ہے اور زبان کی چاشنی بھی۔ کون لکھ رہا ہے آج ایسی زبان؟ صرف انگلیوں پہ گنے جاسکتے ہیں وہ لوگ۔ بامحاورہ زبان تو بہت کم ہی لوگ لکھ رہے ہیں اور اقبال مہدی ان میں سے ایک ہیں۔ ان کی کہانیاں اور افسانے پڑھنے میں خود ان کے اپنے الگ انداز کے ہیں، عصمت چغتائی اور قاضی عبدالستار کے طرز تحریر کا بھی لطف آتا ہے حالانکہ یہ اقبال مہدی کے گہرے مشاہدے کی علامت ہے۔

اقبال مہدی سائنسداں ہیں لہٰذا انھوں نے اشاروں کنایوں میں سائنسی ترقی کے بعض مثبت اور منفی پہلوؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرورق مصنف کی اپنی کاوش ہے اور بہت خوب ہے۔ کاغذ اور چھپائی خوش گوار اور عمدہ ہے۔ قیمت معقول ہے۔

مجموعی طور پر 'درد آتا ہے دبے پاؤں' ایک کامیاب اور قابل ستائش کتاب ہے اور اردو ادب میں ایک اہم اضافہ!

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز

مصنفہ: زاہدہ زیدی
مبصر:۔ ساجدہ زیدی
قیمت:۔ ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی

ڈرامے کی دنیا میں زاہدہ زیدی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ زاہدہ کے طبعزاد ڈراموں کے مجموعے دوسرا کمرہ اور خلیجی جنگ پر مبنی طویل ڈرامہ "صحرائے اعظم" شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زاہدہ نے متعدد مغربی ڈراموں کے تراجم بھی کیے ہیں جن میں جیکٹ ایونیکو چیخوف سارتر اور براند یلو؟ کے شاہکار ڈرامے اہمیت کے حامل ہیں۔ زاہدہ کو اسٹیج پیش کش سے بھی گہری دلچسپی ہے۔

زیر نظر ڈراما کیونکر اس بت سے۔۔ جن حقائق پر مبنی ہے ان کو مختصراً ادب کی دنیا میں ان کا زوال کہا جا سکتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں مادیت، زر پرستی، صارفیت، تجارتی اقدار کی بالا دستی اور الیکٹرونک میڈیا کی سستی تفریحات کے فروغ نے جو اخلاقی خلا اور روحانی بحران پیدا کیا ہے اور ان کو جس طرح انسانی صفات اور اعلا اقدار سے بیگانہ بنا دیا ہے اس کے اثرات سے ادب اور فنون لطیفہ بھی نہیں بچ سکے۔ شاعر جو قوم کا ضمیر اور ادیب جو حق وصداقت اور خیر کا امین ہوتا ہے وہ بھی سستی شہرت، مفاد پرستی، نمایشی علمیت، گروہ بندی اور بددیانتی کے جال میں پھنستے جا رہے ہیں۔ اس صورت حال کو فروغ دے رہے ہیں ارباب حل وعقد، انعام واکرام دینے والے ادارے شعبہ جات اردو کے سربراہوں کی خوشامد پسندی اور تخلیق کے مقابلے میں تنقیدی فارمولوں اور گروہی تنقید کی بالا دستی۔ نتیجتاً جس چیز کو سب سے بڑا دھکا لگا ہے وہ ہے genuin ادب اور تخلیقی فنکار کی آزادی، یہاں تک کہ ادب کے معیار اور ادیب کے اعتبار کی پہچان بھی اس یلغار میں مشکل ہو گئی ہے۔

زاہدہ نے ان میں سے اکثر مسائل کی ڈرامائی پیش کش کی کامیاب کوشش کی ہے۔ زیر نظر ڈرامہ تین ایکٹ پر مشتمل ہے۔ پہلے ایکٹ کا منظر نامہ شخصیت پرستی (Personality Cult) اور ادبی بت پرستی کے رجحان کو واشگاف کرتا ہے۔ بحر العلوم اور شاعر اعظم کے کردار اس رجحان کی علامت بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کرداروں کا حصہ ڈرامائی ایکشن میں برائے نام ہے۔ (جوان مدارج کی

سطحیت پر دال ہے) لیکن ان کے گرد خوشامد، چاپلوسی حماقت آمیز جاہ پرستی اور زبان کے استحصال کا جو تانا بانا بنا گیا ہے اس کی مدد سے یہ پورا منظر نامہ فوکس میں آتا ہے۔ زاہدہ نے فنی چابکدستی کے ساتھ ان مکالموں میں طنز، مزاح، غلو اور البسرڈٹی کے فنکارانہ استعمال سے انھیں سپاٹ اور بے رنگ ہونے سے بچایا ہے۔ پہلے ایکٹ کا پہلا سین جو اس منظر نامے کا کلائمکس ہے، وہ ایسے محیر العقول اینٹی کلائمکس کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جس سے ڈرامے کی ڈرامائیت اور معنی خیزی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی جس شخص کے لیے مختلف کرداروں کی زبان سے گویا یہ کہا گیا تھا کہ۔ پرستش کی اتنی کہ اس بت کو ہم　　　　نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے۔ وہ خود ہی ایک بت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے علم و فضل کا تقریری اظہار کر سکے۔

اس سین میں پہلی خاتون کی تقریر، بحر العلوم کے اشارے اور ناظم جلسہ کے البسرڈ جوابات کے ذریعے، مرد اساس معاشرے میں رائج anti Feminist رجحانات کو بے نقاب کرکے ڈرامے میں طنز کی کاٹ پیدا کی گئی اور اس کے تناظر کو وسعت دی گئی ہے۔

پہلے ایکٹ کے دوسرے سین میں جس سازشی منصوبے کی ابتدا ہوتی ہے وہ دوسرے ایکٹ کے دوسرے سین میں اپنے کلائمکس کو پہنچ جاتا ہے اور غیر اخلاقی مفاد پرستی اور روحانی خلا کا اشاریہ بن کر ابھرتا ہے۔ وہی لوگ جو اپنے مفاد کے لیے بت بناتے ہیں وہی اپنے مفاد کے لیے اس بت کو توڑ بھی دیتے ہیں۔ جس عمارت کی بنیاد جھوٹ پر قائم تھی اسے ایک دوسرا جھوٹ توڑ دیتا ہے اور اس بنیاد پر ایک نئے جھوٹ کی بنیاد اٹھاتا ہے، جس کے معمار، ناظم جلسہ نوجوان، صدر صاحب، اور کلکٹر صاحب وغیرہ ہیں جو بحیثیت کرداروں کے اپنی الگ الگ پہچان رکھتے ہیں۔

ڈرامے میں پہلا شخص اور دوسرا شخص جو ڈرامے کے ایکشن میں زیادہ شریک نہیں ہیں عام حالات اور واقعات کے شاہد اور ناظر بن کر ابھرتے ہیں، جن پر رفتہ رفتہ حقیقت کسی حد تک منکشف ہوتی ہے۔ یہ دونوں کردار ایک طرح سے عام آدمی کے نمائندہ ہیں جو گرد و پیش کے حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے اور حیران بھی۔ کچھ سمجھتا ہے کچھ نہیں سمجھتا لیکن غور و فکر، آگہی اور جرأت کے فقدان کی بنا پر کچھ کر سکنے سے قاصر اور بے عمل رہتا ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے یہ کردار کورس کے قائم مقام بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن نمائندگی عام آدمی ہی کی کرتے ہیں۔

بنیادی تھیم (Theme) کے علاوہ ڈرامے میں تانیثی تھیم کا ارتقا ہوتا ہے۔ جس کی ابتدا پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں پہلی خاتون کی تقریر سے ہوتی ہے۔ مکالمات کے دوران پہلی خاتون اور

دوسری خاتون (فہمیدہ اور فرزانہ) کے کرداروں کی مدد سے عورت کی انفرادیت، اور تشخص کے تلاش کی تھیم کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک مرد اساس معاشرے میں مردانہ ریگو کی ابسرڈٹی کی بنا پر عورت کی طرف مرد کا غیر منصفانہ رویہ اور عورت کی دانشورانہ اور فنکارانہ صلاحیتوں کی نفی کے عام رجحان کو پیش کیا گیا ہے۔ نیز ڈرامے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے فنی صداقتوں کی تلاش کا منصب بھی عورت کو سونپا گیا ہے (فہمیدہ اور فرزانہ کی صورت میں) جو مایوسی اور طوائف الملوکی کے دور میں جو عصری تناظر میں شاعری، ادب اور کلچر کے مسائل پر غور وفکر کرتی ہیں۔ ادبی سازشوں کی آگاہی رکھتی ہیں اوران کا پردہ فاش کرنے کا بیڑہ اٹھاتی ہیں جس میں یہ مبہم اشارہ بھی موجود ہے کہ عورت طبعاً سازش اور گروہ بندی کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ نفسیاتی طور پر بھی یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عموماً وہی طبقہ حقیقت کی تلاش کی طرف راغب ہوتا ہے جسے صدیوں سے محکوم ومجبور رکھا گیا ہو۔

بہ این ہمہ میرا خیال ہے کہ تانیثی تھیم کو پیش کرنے کے لیے ڈرامے میں اس سے زیادہ ایکشن کی ضرورت تھی، صرف مکالموں کی مدد سے اس تھیم کے ساتھ انصاف کرنا مشکل تھا۔ مکالموں کے علاوہ دوسرے ڈرامائی عناصر کا استعمال اور دونوں خواتین کی انفرادیت کو نمایاں کرنے سے اس تھیم کو زیادہ بھرپور بنایا جاسکتا تھا۔

ڈرامے کا اختتام بڑے ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے جیسے ڈرامے کی ابتدا (پہلا ایکٹ پہلا سین) ہوئی تھی۔۔۔ ایک ضروری اعلان۔۔۔ بہنو اور بھائیو، سجنو اور سجنیو۔۔۔۔ آپ سے درخواست ہے کہ بڑی سے بڑی تعداد میں اس جشن میں شامل ہوکر بحر العلوم ثانی اور شاعر اعظم ثانی کو شاندار خراج عقیدت پیش کریں۔۔۔ وغیرہ۔۔ یعنی وہی سلسلہ ازسرنو شروع ہوجاتا ہے۔ یہ اختتام طنز کی لے تیز کرتا ہے۔ اور طنز کی تکنیک کو ڈرامائی انداز سے برتنے کی بنا پر ڈرامے کی معنویت کو دوبالا کرتا ہے۔۔۔

ڈرامے کی ساخت میں حقیقت نگاری، ابسرڈٹی، طنز ومزاح کے مناسب امتزاج نے اس کو دلچسپ بنادیا ہے اوراس کی معنی خیزی میں اضافہ کیا ہے۔۔۔

مجھے امید ہے کہ اس ڈرامے کی اسٹیج پیش کش دلچسپ اور معنی آفریں ہوگی۔

کشت غزل نما

مصنف:۔ شاعر حنیف ترین
تبصرہ: صادقہ ذکی
قیمت:۔ ۱۵۰ روپے
تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۹۹ء
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔۲۵

کشت غزل نما ڈاکٹر حنیف ترین کی ایسی نئی غزلیات کا مجموعہ ہے جن میں غزل کے اشعار ارکان کی تعداد کے لحاظ سے طول وعرض میں مختلف نظر آتے ہیں۔ گذشتہ دور میں انھوں نے غزل کے سانچہ میں اس قسم کی تبدیلیوں کا تجربہ کیا ہے۔ حنیف ترین نے پہلے آزاد غزل لکھی اور پھر غزل نما۔ اس نوع کی غزل بظاہر جنگل کی آزاد پگ ڈنڈی کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ حنیف ترین کی غزلوں میں تجربات کی وسعت اور تازگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ان کی تخلیقی شخصیت نے کئی جغرافیائی اور تہذیبی خطوں کی مسافت طے کی ہے۔ نئی زمین پر قدم رکھنے والوں اور نئی ہواؤں کو لبیک کہنے والوں کو کئی طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً زبان وتہذیب کی اجنبیت، نئے سیاسی نظام سے مفاہمت، برعکس موسمی حالات اور ان کے علاوہ تنہائی کا احساس، وطن عزیز سے دوریاں نازک اور گہرے رشتوں کے پیہم تقاضے وغیرہ۔ حنیف ترین کے کلام میں ایسے اشارے ملتے ہیں جو متفرق حالات سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان سے ان کی شخصیت کے تخلیقی ارتقا کی شناخت بھی قائم ہوتی ہے۔ متعلق بیک گراؤنڈ میں اس مجموعہ کے بعض اوراق اپنے قاری کو اس طرح متوجہ کر لیتے ہیں۔

ثمر ہمارے ضبط غم نے جو دیا
نئے افق میں بیج اس کا بو دیا

سر پہ رہتا ہے اب دھوپ کا سائبان
اتنا اونچا بنایا ہے ہم نے مکان

جس تتلی کے رنگ ہوا میں پھیلے ہیں
اس سے ہر بے رنگی کو میں ڈھانکوں گا

میں ہوں بے اماں رہ زندگی میں تمام عمر
مجھے چلنا ہے کبھی خار پر کبھی نار پر

یہ آواز شکست کی آواز نہیں ہوسکتی۔ زندگی کرنے کی صدا ہے۔ شاعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ ان کے پیش نظر جو مقصد ہے، وہ معمولی نہیں ہے۔ لیکن اس مقصد کے ساتھ نشاط کار کی فضا بھی نہیں ہے۔ پورے مجموعے میں غم تہہ نشین کی ایک ٹھہری ہوئی کیفیت سامنے آتی ہے۔ اسے کسی جبر کا نتیجہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ہر اس انسان کو پیش آنے والی ناگزیر صورت حال ہوسکتی ہے جو عام قول وفعل کی سرحد سے آگے جا کر عام بے رنگی کو ایک خاص رنگ دینا چاہے۔ یہ قید مقام سے گزرنے کا کرب بھی ہوسکتا ہے۔ اپنے وطن اور عزیز ترین رشتوں سے دور ہوکر انسان کیا کچھ محسوس کرتا ہے۔ اس قبیل کے چند شعر دیکھیے۔

فرصت کہاں کہ روئیں ترے انتظار میں
ہم کھو گئے ہیں دشت غم روز گار میں

کون ومکاں سے کچھ بڑھ کر
مرے دل کی لابی ہے

ملی جو حسرتوں کے بعد زندگی
مجھے لگی اک پتنگ کٹی ہوئی

شام فرقت ہے سحر آلام ہے
زندگی کا بس یہی انعام ہے

رباب صحرا اور کتاب صحرا کے بعد حنیف ترین کی اس کتاب میں موضوعات ومضامین کی خاصی کثرت نظر آتی ہے۔ ان اوراق میں مذہب تاریخ، صنعتی تہذیب، ایٹمی ماحول، جغرافیائی فضا اور حسن وعشق کی پرچھائیاں بیک وقت دیکھی جاسکتی ہیں۔ انھیں کسی پیچیدہ اور گہری بات کو سادگی سے کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ جس ملک میں آج کل قیام پذیر ہیں وہاں بجلی کی کثرت، اے سی اور تیز رفتار گاڑیوں نے صحرا کی تاریخی تمازتوں کو کم کیا ہے۔ ممکن ہے ان کا تجربہ ایسا ہی ہو۔ بہر صورت صحرا ریگ صحرا اور دھوپ کی علامتوں نے اکثر خوب کام کیا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں ظہیر غازی پوری کا مضمون عکس غزل نما خاصے کی چیز ہے۔ اس میں غزل نما کے متعلق اردو کے ناقدین کی

رائیں بھی شامل ہیں۔ کتاب کی طباعت کا معیار اچھا ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے شوق سے پڑھیں گے۔

اردو تنقید کا سفر (جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تناظر میں)

مصنف:۔ ڈاکٹر تابش مہدی
تبصرہ نگار:۔ خالد ولایت عمری
قیمت:۔ ۲۰۰/روپے
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ، اردو بازار جامع مسجد، دہلی۔۶
بیت المرضیہ، جی ۵ اے، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی۔۲۵

اردو شعر و ادب کے حوالے سے تابش مہدی کی شخصیت گم نام و غیر معروف نہیں۔ وہ اپنے مخصوص نگارش اور منفرد انداز شاعری کے باوصف اردو دنیا کے بڑے حصے کو اپنی طرف متوجہ کر چکے ہیں۔ ہندستان کے علاوہ پاکستان، نیپال، بنگلا دیش، انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، سعودیہ عربیہ، قطر، جہاں اور جس کانفرنس یا مشاعرے میں شریک ہوئے، اپنا نقش چھوڑ کر آئے۔ نثر میں ان کی بعض کتابیں مقبولیت کا ریکارڈ قائم کر چکی ہیں اور ان کے ایک سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تبلیغی نصاب ۔۔۔ ایک مطالعہ، مذہبی تنقید کے حوالے سے بین اقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ اس کا پہلا اردو ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں مکتبہ الایمان دیو بند سے شائع ہوا اور چودھواں ۱۹۹۳ء میں حلیم بک ڈپو دہلی سے۔ اسی دوران پاکستان کے دو اشاعتی اداروں ۔ دارالبحوث الاسلامی کراچی اور البدر بک کارپوریشن کراچی نے بہ یک وقت دس دس ہزار ایڈیشن شائع کیے۔ اب تک اردو کے علاوہ عربی، ہندی، انگریزی، گجراتی اور بنگلہ میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب "اردو تنقید کا سفر" تابش مہدی کی وہ تحقیقی کتاب ہے، جس پر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ یہ کتاب کل چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں خواجہ الطاف حسین حالی سے شمس الرحمٰن فاروقی تک کے تنقیدی کارناموں کا ایک عمومی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ذیل میں تنقید کے معنی و مفہوم پر بھی کسی قدر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے مختلف دبستانوں کا تعارف کرایا گیا ہے اور تذکروں کی تنقیدی روایت پر بھی ناقدانہ گفتگو کی گئی ہے اور ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے زیر اثر پروان چڑھنے والے تنقیدی رویوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

تنقید کے معنی و مفہوم اور اس کی تعریف پر گفتگو کرتے ہوئے تابش مہدی نے یہ راز بھی منکشف کیا ہے کہ اگر چہ لفظ تنقید کو تمام اردو لغات والوں نے کرٹیسزم (Criticism) یا آلوچنا کے معنی میں

استعمال کیا ہے اور بعض ارباب لغت نے وضاحتاً یہ بھی لکھ دیا ہے کہ عربی کا لفظ ہے اور باب تفعیل سے آیا ہے لیکن عربی لغات سے رجوع کیا جاتا ہے تو وہاں اردو کے مروج مفہوم میں لفظ تنقید کا استعمال نہیں ملتا۔ وہاں اس لفظ کے لیے، نقد، انتقاد یا منتقاد کا استعمال ملتا ہے۔ میرے علم ومطالعے کی حد تک تابش مہدی نے یہ جرأت پہلی بار کی ہے۔

دوسرے باب میں جامعہ کے عام ادبی ماحول اور اردو تنقید کے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ابتدائی نقوش کی دریافت کی گئی ہے۔ اس باب کے وسیلے سے اردو دنیا کے ایک بہت بڑے طبقے کو یہ بات پہلی بار معلوم ہو سکی ہے کہ سید وقار عظیم بھی ناقدین جامعہ میں سے ہیں اور اردو افسانوں اور داستانوں پر سب سے پہلے تنقید جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لکھی گئی۔

تیسرے باب میں سید عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا عبداللطیف اعظمی اور پروفیسر مسعود حسین کے تنقیدی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھا اور آخری باب جامعہ کے ہم عصر ناقدین کے لیے مختص ہے۔ اس باب میں تنویر احمد علوی، گوپی چند نارنگ، منظر اعظمی، انور صدیقی، مظفر حنفی، عنوان چشتی، شمیم حنفی اور قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

تنویر احمد علوی کے بارے میں تابش مہدی کا خیال ہے، کہ وہ بنیادی طور پر تحقیقی ناقد ہیں۔ البتہ کہیں کہیں وہ تہذیبی ناقد کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کے بارے میں ان کا ریمارک ہے کہ "بے شبہ انھوں نے اردو تنقید کو تفہیم وتحسین کی ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے" اور محمد ذاکر کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی ان کے ہاں تاثراتی تنقید کا غلبہ ہے۔

تابش مہدی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انگریزی ادبیات کے استاذ انور صدیقی کی اردو تنقید پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان کے بارے میں ان کی یہ رائے محل نظر ہے کہ وہ جمالیاتی ناقد ہیں۔ مظفر حنفی کے بارے میں تابش مہدی کی یہ رائے وزن رکھتی ہے، کہ "مظفر حنفی کے ہاں جو تخلیق کار موجود ہے، وہ اپنی نمود تنقید وتحقیق میں کرتا ہے، تو حقیقت کو دریافت کرنے اور اسے صداقت سے پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔

کتاب میں صغریٰ مہدی کے تنقیدی کارناموں کا بھی ذکر ہے، لیکن ان کے بارے میں مصنف کی رائے ہے۔ کہ وہ ایک دردمند ادیبہ وافسانہ نگار ہیں، تنقید نگار نہیں اور انھوں (صغریٰ مہدی) نے "اکبر الہ آبادی کی شاعری کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے، اس کی حیثیت محض تاثراتی ہے یا تشریحی۔

مصنف نے جدیدیت کے مشہور نقاد شمیم حنفی کی تنقید پر بڑی مفصل گفتگو کی ہے، اس ذیل میں

انہوں نے ان ناقدین کا بھی تعاقب کیا ہے، جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شمیم حنفی پر بے جا نکتہ چینی کی ہے۔

تابش مہدی نے اپنے اس تحقیقی وتنقیدی مطالعے میں معروضی رویہ اپنایا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ جس ناقد کے بارے میں بھی گفتگو کی جائے، اسی کے الفاظ میں یا اس سے قریب ہوکر کی جائے تاکہ تفہیم وترسیل میں کوئی دشواری پیش نہ آئے ۔ دوران گفتگو جہاں اور جس کی تحریر سے اقتباس لینے کی ضرورت محسوس ہوئی، اسے حوض میں کیا اور حاشیے کا نمبر دے کر ہر باب کے آخر میں پورا حوالہ درج کیا ہے، اور جہاں اقتباس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، محض فکر، نقطۂ نظر یا اصل بات کی روح کو لینا پیش نظر تھا، وہاں تحریر کے تسلسل کو باقی رکھتے ہوئے مصنف نے اپنی بات کہہ دی ہے، البتہ اس صورت میں بھی یہ دیانت دارانہ التزام کیا گیا ہے کہ حاشیے میں اصل ماخذ کا حوالہ دے دیا ہے۔

مصنف کے الفاظ میں کتاب میں ان تنقید نگاروں کے تنقیدی کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو یا تو جامعہ سے بہ حیثیت استاد وابستہ رہے ہیں یا اس کے کسی شعبے کے ذمے دار یا کارکن کی حیثیت سے، خواہ جامعہ سے ان کی وابستگی کی مدت دو چار برس ہی کیوں نہ رہی ہو۔

سچ کہا ہے قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کہ "تابش مہدی نے (اردو تنقید کا سفر میں) بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے اور تنقید وتحقیق کے ایک بھاری پتھر کو صرف چوم کر چھوڑ دینے کی بجائے اس کے علمی، اخلاقی اور ادبی تقاضوں کو بڑی عمدگی سے پورا کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ زبان وبیان کے ادنیٰ تسامحات سے بھی ان کا یہ کارنامہ پاک ہے۔"

یقین ہے کہ اس کتاب کی علم وتحقیق کی دنیا میں پذیرائی حاصل ہوگی۔

مجلہ انجمن طلبہ مدرستہ الاصلاح

مدیر:۔ عبدالماجد بلرام پوری
مبصر:۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں
پیش کش:۔ انجمن طلبہ مدرستہ الاصلاح
سرائے میر اعظم گڑھ، (یوپی) انڈیا

انجمن طلبہ مدرستہ الاصلاح کا سالانہ "مجلہ" ایک یادگار مجلہ ہوتا ہے۔ اس مجلہ میں مدرسہ کی سال بھر کی محنت کا سراغ ملتا ہے۔ اور طلبائے مدرسہ کے اعلا پایہ کے مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔

۱۹۹۸ء کے اس گیارھویں شمارہ میں علم تفسیر اور علم حدیث پر مضامین لکھے گئے ہیں اس طرح یہ مجلہ "حدیث، اصول حدیث اور محدثین" کے حوالے سے ایک اختصاصی نمبر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ بحث و تحقیق کے عنوان کے تحت امام ابن تیمیہ اور ان کا طریقہ تفسیر از عبدالماجد بلرام پوری شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے منہج تفسیر کا مطالعہ از سراج حسن نیپال۔ مفرد الفاظ کی تحقیق کا فراہی منہاج از رضوان احمد ارریہ۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا عظیم کارنامہ تدبر قرآن۔ جناب رفیق احمد صاحب۔ مولانا صدرالدین اور ان کی تفسیر ایک مطالعہ از اشرف اخلاق راجہ پور سیکرور۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور خدمت حدیث از محمد انظر کشمیری صحاح ستہ کی خصوصیات۔ از ضیاء الرحمان دوباواں۔ وغیرہ جامع مقالات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ شخصیات۔ گاہے گاہے باز خواں۔ سوز و ساز متاع گداز۔ عالم خیال اور متفرقات کے ابواب کے تحت متعلقہ مضامین اور فن پارے شامل کتاب کئے گئے ہیں سوز و ساز اور متاع گداز کے تحت متعلقہ شاعری اور عالم خیال کے زیر عنوان افسانوی فن پارے لکھے گئے ہیں۔ کتابت اور کاغذ ہمیشہ کی طرح سے اس بار بھی نہایت نفیس ہے۔ اس مجلہ کا ایک حصہ بزبان انگریزی بھی رکھا گیا ہے۔ جس کے کل بارہ صفحات آخر میں شامل ہیں اور دو مضمون بعنوان۔

1- Quran and its distinctive feature by- Mohd' Rafi Farahi

2- The Correct interpretation of Ayat , By Asrar Ahmad

شائع کیے گئے ہیں۔

•

خیموں کے شہر میں (سفرنامہ)

مصنفہ:۔ ڈاکٹر صادقہ ذکی
تبصرہ:۔ کوثر مظہری
صفحات: ۱۰۰
قیمت:۔ ۳۰/روپے
تقسیم کار:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

آج کل سفرناموں اور خود نوشت سوانح نگاری پر بہت زور دیا جارہا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب 'خیموں کے شہر میں' ڈاکٹر صادقہ ذکی کے سفر حج کی روداد ہے۔ اس روداد کو سفرنامہ کی صنف میں رکھنا قباحت کی بات نہیں کیوں کہ جس طرح انھوں نے شگفتہ اور رواں تخلیقی نثر میں اپنی اس روداد کو پیش کیا ہے وہ کبھی کبھی ہمیں افسانوی دنیا میں لے جاتی ہے حالاں کہ اس میں محض حقائق اور عقائد پر مبنی

احساسات وتاثرات ہیں۔ ارض پاک (کچھ کج فہموں نے پاکستان کو بھی اسی نام سے موسوم کیا ہے جو باعث شرم بھی ہے اور قابل گرفت بھی) کے مختلف مقامات، مناظر، ارکان حج اور دوران حج وقوع پذیر ہونے والے مختلف النوع واقعات کو صادقہ ذکی نے الفاظ کے پیکر میں اس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ حجاز اور فضائے حرم کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں اور ایسا اس لیے ہوا ہے کہ ان کے احساس میں خلوص اور جذبے میں سچائی ہے۔ کوئی بات زبردستی کی نہیں۔ اسلامی تاریخ میں بالخصوص مکہ اور مدینہ سے متعلق جتنے اہم مقامات ہیں اور حجاج کرام جن مقامات تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ ان سب کا ذکر ہے، ساتھ ہی ڈاکٹر صادقہ ذکی نے یہ کوشش کی ہے کہ جن مقامات کا بھی ذکر آئے ان کے پس منظر کو بھی مختصر مگر واضح لفظوں میں بیان کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اس کے لیے انھیں کچھ تلاش وجستجو سے بھی کام لینا پڑا ہوگا۔

یہ "سفر نامہ حج" اس سال کا ہے جب منیٰ میں آگ لگی تھی جس کے شعلوں نے کتنوں کی جانیں لے لی تھیں۔ اس حادثہ کی تصویر کشی صادقہ ذکی نے فطری انداز میں کی ہے۔ جس میں تصنع اور مبالغہ نہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"انجان مسافروں کا ایک بڑا ہجوم اس سڑک پر چلنے لگا
سلینڈروں کے پھٹنے کی آوازوں کے ساتھ آگ کا حملہ زیادہ

تیز ہوتا گیا۔ آگ اور انسان دونوں کا سفر ایک ہی سمت میں جاری تھا۔" (ص ۱۷)

اس کتاب کو پڑھ کر ایک طرح کی روحانی تسکین حاصل ہوتی ہے اور لگتا ہے کہ آدمی ارض حجاز پر سفر کر رہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حج سے متعلق جن ارکان کو پیچیدہ مسائل اور جملوں اور لفظیات کی مدد سے ہمارے علما سمجھاتے ہیں یا دوسری کتابوں میں تفصیلات ملتی ہیں ان کی تفہیم اس کتاب کے ذریعہ ذہن پر بغیر زور دیے ہوئے ہو جاتی ہے۔ کتاب کا نام بھی معنویت سے پُر ہے۔ خیموں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے کہ اس پر خیموں کے شہر ہونے کا گمان غالب آتا ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے اور قیمت مناسب ہے بلکہ کم ہے۔

سبز ہوا روشن ہے

شاعر: عبدالحمید
مبصر: رضوان ممتاز
قیمت: ۷۵ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی۔ ۶

"سبز ہوا روشن ہے" عبدالحمید کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ ان کی شاعری کی عمر تقریباً ۲۵ سال ہو چکی

ہے۔اس مدت میں انھوں نے صرف ۱۱۳ غزلوں کا یہ مختصر مجموعہ شائع کرایا ہے۔ دراصل وہ اپنے ہر تجربے اور مشاہدے کو فوراً شعری پیکر میں نہیں ڈھالتے بلکہ اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ وقت کا انتظار کرتے ہیں۔ ایسے میں کچھ چیزیں نظر انداز بھی ہو جاتی ہیں لیکن کچھ چیزیں اور بھی توانائی کے ساتھ ابھر کر آتی ہیں، اور شاعر کو ایک عجیب سی گھٹن، کشمکش اور تھرتھراہٹ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ ایسی چیزوں کو روکنے میں شاعر ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی وہ دھوکا بھی کھا جاتا ہے، چنانچہ کچھ مشاہدے اور تجربے کسی چور دروازے سے باہر آ جاتے ہیں۔ عبدالحمید کی انھیں چیزوں کا نام ہے "سبز ہوا روشن ہے" بقول عبدالحمید شاعری ان کی شعوری کوشش نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں Originality ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی۔

> "وہ ان چند لوگوں میں ہیں جن کے یہاں نہ تو جدیدیت کا اثر قبول کرنے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے اور نہ جدیدیت سے واقعی یا رسمی طور پر انحراف کی کوشش نظر آتی ہے"۔

عبدالحمید کی شاعری کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے ایک شدید طوفان آیا تھا اور سارے شہر کو درہم برہم کرکے چلا گیا ہے۔ یہ طوفان کیسا تھا؟ یہ ایک گہرا سوال ہے۔ شہر اور طوفان بے شمار چیزوں کی علامت بن کر عبدالحمید کی شاعری میں آئے ہیں۔ یہ طوفان انسان کی خارجی و باطنی دونوں زندگیوں کا اشاریہ ہے۔

متکلم اس شہر کے ملبے پر تنہا بیٹھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ کبھی طوفان سے پہلے کی محفلوں کو، لوگوں کو اور قدروں کو یاد کرتا ہے، تو کبھی اپنے چاروں طرف کی بربادیوں کو حسرت سے دیکھتا ہے، لیکن وہ ان بربادیوں کو دیکھ کر روتا نہیں، چیختا نہیں، اور طوفان کو بھلا برا بھی نہیں کہتا، بلکہ وہ ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے اور اس شدید طوفان کے باوجود وہ اپنے پیر وہاں جمائے رہتا ہے۔ ایسے حالات میں تنہائی ایک شدید مسئلہ بن جاتی ہے۔ لیکن وہ اسی تنہائی کو اپنی ڈھال بھی بنا لیتا ہے۔ یہی نہیں ایسی طوفانی رات میں کبھی کبھی کوئی ستارہ بھی نظر آ جاتا ہے۔

عبدالحمید کی شاعری کے موضوعات کافی وسیع ہیں۔ ان کے یہاں کلاسیکی شاعری کے مضامین بھی ہیں لیکن وہ کلاسیکی مضامین پر جب بھی طبع آزمائی کرتے ہیں تو محض انھیں دہراتے نہیں بلکہ ان میں کچھ تازگی ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ کچھ نادر مضمون بھی ان کے یہاں مل جاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے مسائل خاص کر شہری زندگی کے نئے پیدا شدہ مسائل کو انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ

پیش کیا ہے اور دبی دبی زبان میں وہ اس صورت حال سے ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

عبدالحمید کی شاعری کو جب ہم پہلی بار پڑھتے ہیں تو کچھ اچھے اشعار نظر آتے ہیں اور ذہن ودل پر ایک اثر بھی چھوڑتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسا احساس بھی ہوتا ہے کہ یہ شاعری ابھی پوری طرح ہماری گرفت میں نہیں آئی ہے چنانچہ دوسری بار پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دوسری بار پڑھنے پر زیادہ تعداد میں اچھے اشعار سامنے آتے ہیں۔ اس طرح بار بار پڑھنے پر ان کے اکثر اشعار معنی خیز معلوم ہونے لگتے ہیں۔

عبدالحمید غزل کی کلاسیکی روایت سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس شعریات کو بخوبی نبھانا جانتے ہیں۔ وہ بات کو براہ راست نہ کہہ کر اشاروں اور کنایوں میں کہتے ہیں۔ ان کی آواز دبی دبی سی لیکن مستحکم ہوتی ہے۔ اختصار اور مناسبت لفظی کے ہنر میں جہاں وہ کلاسیکی شعرا کے قریب ہیں، وہیں ان کے یہاں نئی غزل کا علامتی نظام بھی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ صحرا، سمندر، دریا، سراب، ہوا، پانی، ریت، طوفان اور اسی طرح شب، ظلمت، سحر، چراغ، ستارہ جیسی علامتوں کو انھوں نے خاص طور پر نئے نئے انداز اور بے شمار معنوی امکانات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

یہ شہر تو پہچان میں آتا ہی نہیں ہے
کیا وقت تھا اب دھیان میں آتا ہی نہیں ہے

پہچان بھی نہ پائے کوئی جو رونے آئے
ہم وہ کہ قتل گہہ میں بے سر پڑے ہوئے تھے

بساتی گئیں مجھ کو تنہائیاں
کھنڈر بنتے بنتے مکاں سا ہوا

دمک رہے تھے ستارے سکوت دریا میں
شب سیاہ کے اندر عجب خزانہ تھا

کیا لیے پھرتا ہوں میں آب سراب آنکھوں میں
ڈوبتا ہی نہیں کوئی کہ ابھرتا ہی نہیں

کہیں اشارۂ ذبح عظیم ہی تو نہیں
کہ اب یہ خواب برابر دکھائی دیتا ہے
برگ کے دف میں نیستاں کے نفس میں سن لے
رم آہو کی طرح سبز ہوا روشن ہے

دامن گلزار

شاعرہ:۔ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید
تبصرہ نگار:۔ڈاکٹر فرحت فاطمہ
قیمت:۔۷۵ روپے
ناشر۔سوغات نظر پبلیکیشنز
اشرف ولا، ۷۔۳۔۲۴۳۔۱۱ ملے پلی، حیدرآباد۔۵۰۰۰۰۱

دامن گلزار" ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے۔دیدہ زیب کتابت سے آراستہ اس شعری مجموعہ میں بانو طاہرہ کی دلکش غزلیں، نظمیں، قطعات سانیٹ اور ہائیکو شامل ہیں۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید ایرانی النسل شاعرہ ہیں۔ وہ بیک وقت تین زبانوں اردو، فارسی، اور انگریزی پر دسترس رکھتی ہیں اور اردو شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ انگریزی اور فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتی رہتی ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں ایرانی مزاج کی دلفریبی اور ہندستانی تہذیب کی سادگی اور پُرکاری سے مل کر ان کی شاعری میں بڑی رنگارنگی پیدا کردی ہے۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ بڑی زود گو شاعرہ ہیں اور بہترین نثر نگار ہیں۔اردو شعر وادب سے انھیں بے حد لگاؤ ہے ہندستانی تہذیب اور خاص طور سے حیدرآباد کی تہذیبی روایت سے انھیں بڑی محبت ہے ہندستانی تہذیب وثقافت ان کے خمیر میں رچ بس گئی ہے۔اپنے وطن حیدرآباد کی محبت میں سرشار ہوکر انھوں نے حب الوطنی کے موضوع پر بڑی خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔ وہ زبردست خلاقانہ صلاحیتوں کی مالک ہیں۔انھوں نے مشورہ سخن کے لیے کسی استاد کے آگے زانوے ادب تہ نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام تقلیدی عناصر سے پاک ہے اور ان کا انفرادی رنگ حقیقت کی رنگ آمیزی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ کسی مخصوص نظریہ ادب کی نمائندہ نہیں ہیں۔شاعری میں ان کا اپنا منفرد انداز ہے۔ان کا ایک بڑا کارنامہ ہائیکو کو ایک صنف سخن کی حیثیت سے متعارف کرانا ہے۔یہ ہائیکو تاثراتی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ہائیکو کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

گزریں صدیاں کئی، حیوان سے انساں بنتے
آج انسان پھر حیوان ہوا چاہتا ہے
راس انسان کو آئی نہ بلندی اپنی

بانو طاہرہ نے غزل کے موضوعات کو نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی غزلیں ان کی پختہ کاری اور فن پر دسترس کی مظہر ہیں۔ انھوں نے اپنے مخصوص شعری رویوں اور لسانی لہجہ سے پڑھنے والوں کے دلوں میں جگہ بنائی ہے۔ ان کی نظموں میں انفرادی اور اجتماعی دونوں احساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کا شعری سفر نئے شعور کا برجستہ اظہار ہے۔ انھوں نے عورتوں کے ان دیکھے خواب، ارمانوں اور آرزوؤں کی حسرتوں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ مٹتی ہوئی تہذیب اور انسانی قدروں اور روایتوں کی پاسداری نہ ہونے کا ماتم بھی کیا ہے۔

بانو طاہرہ کی شاعری سیدھی دل میں اترتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی فکر کو فلسفہ نہیں شاعری بنادیا ہے۔ ان کی ذات کی گہرائیاں ان کی شاعری میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

بانو طاہر کی شاعری میں بڑی صداقت ہے۔ الفاظ کھرے اور حقیقت بیان سے سجے ہوئے ہیں۔ وہ عورت کے دل کی نفسیاتی کیفیات کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا انداز بیان قدرتی اور اثر انگیز ہے۔ سادہ الفاظ اور مانوس ترکیبوں کے استعمال کے باوجود ان کی شاعری میں گہری معنویت چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ فکر و نظر کی گہرائی، زبان کی سادگی، پرکاری اور برجستگی ان کی شاعری کی پہچان بن گئی ہے۔ وہ اپنے کلام میں فارسی لفظیات کو بھی بڑے ماہرانہ انداز میں استعمال کرتی ہیں۔ شاعری میں ان کی سحر کار آواز فکر نو کی آئینہ دار ہے۔

"دامنِ گلزار" سے چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

پرانی یادیں ابھر آئی ہوں گی بن کے حباب
پرانی جب کوئی تحریر مل گئی ہوگی

جلا کئے ہیں مگر روشنی دکھاتے رہے
ازل سے شمع کی تقدیر مل گئی ہوگی

نہ آشیاں کی تمنا نہ آرزوے چمن
قفس نصیب کو اب مژدۂ رہائی کیا

ہے ایک ہاتھ میں تسبیح دوسرے میں کچھ اور
یہ میکدہ ہے یہاں وضع پارسائی کیا

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کا شمار حیدرآباد کی مشہور ترین خاتون شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی زندگی فنون لطیفہ کی خدمت میں گزری ہے۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ کی تقریباً تمام کتابوں کو ملک کی اردو اکیڈمیوں نے انعام سے نوازا ہے۔ان کا کلام حیدرآباد کے مشہور و معروف اخبار ''سیاست' میں چھپتا رہا ہے۔ریڈیو اور دوردرشن سے بھی ان کے کلام نے تعریف و تحسین حاصل کی ہے۔عالمی اردو ایوارڈ (دہلی) بھی ان کو مل چکا ہے۔ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کے فن اور شخصیت پر عثمانیہ یونیورسٹی کی طالبہ نے ایم فل کیا ہے۔انگریزی ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں انھیں امریکہ کی عالمی یونیورسٹی اریزونا' سے ڈی لٹ کا اعزاز دیا گیا ہے۔ انگریزی میں ان کا کلام اور حالات شائع ہو چکے ہیں۔بعض انگریزی نظمیں کامن ویلتھ پوسٹ گریجویٹ کورس میں شامل کی گئیں ہیں۔بانو طاہرہ کی انگریزی نظم دنیا کی بہترین ۵۰ انگریزی نظموں کے مقابلے میں شامل ہے۔ان کے کئی افسانوں اور کلام کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے۔وہ مختلف ادبی تنظیموں کی رکن اور بانی ممبر ہیں۔مشرق و مغرب کے اکثر ممالک کی سیاحت کر چکی ہیں ان کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے جس میں مشہور مجموعہ کلام ''برگ سبز'' آشیاں ہمارا'' گل خونچکاں'' دور رہ کر'' مہکتے ویرانے'' مثبت و منفی (انگریزی نظموں کا ترجمہ) شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔توقع ہے کہ اردو کے ادبی حلقوں میں اس شعری مجموعہ ''دامن گلزار'' کی توقع سے زیادہ پذیرائی کی جائے گی اور دوسرے مجموعوں کی طرح یہ بھی شہرت و مقبولیت حاصل کرے گا۔

میرا کالم

مصنف:۔مجتبیٰ حسین
مبصر۔۔نامی انصاری
قیمت:۔۱۰۰ روپے
ناشر:۔حسامی بک ڈپو۔مچھلی کمان حیدرآباد
ملنے کا پتہ:۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۔۲۵

اردو میں کالم نویسی کی تاریخ یوں تو سو سال پرانی ہے لیکن دور حاضرہ میں کالم نویسی کو جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔اخباری کالم اب صرف روزمرہ کے واقعات اور حادثات پر ہلکے پھلکے مزاحیہ تبصروں پر ہی مشتمل نہیں ہوتے بلکہ ان میں وژن، گہرائی، بصیرت، وسعت فکر اور اسلوب کی طرحداری اور شگفتگی اس طرح شیر و شکر بن جاتی ہے کہ یہ کالم مستقل ادبی

مزاح پاروں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور اسی لیے ادب میں ان کی آبرو از خود قائم ہو جاتی ہے۔

مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے ایسے ہی ادبی کالموں کا ایک عمدہ انتخاب "میرا کالم" پیش نظر ہے جو کتابی شکل میں حیدرآباد سے ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں کل ۵۶ کالم شامل ہیں جن کو تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی تماشائے اہل کرم، تماشائے اہل ستم اور تماشائے اہل قلم۔ پہلے زمرے میں عام موضوعات ہیں۔ جن پر مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے زمرے میں سیاست دانوں اور ان کے کارناموں کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے اور تیسرے زمرے میں ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے متعلق ظریفانہ اظہار خیال ہے۔ ویسے تو یہ سب کالم روزنامہ سیاست حیدرآباد میں ہفتے وار "میرا کالم" عنوان کے تحت چھپتے رہے ہیں لیکن کتابی شکل میں آنے کے بعد اب ان کو محض کالم سمجھنا اور کہنا محض بربنائے تکلف ہے۔ کیونکہ اصلاً یہ اعلا درجے کے مزاح پارے ہیں جن میں مصنف کی نظر اور نظریے کے ساتھ ساتھ اس کے تازہ کار اسلوب کی روانی اور شگفتگی خاص کشش رکھتی ہے۔ آنجہانی فکر تونسوی کو بڑی شکایت تھی کہ "جرنلزم کے سربراہ کالم نگاری کو صحیح جرنلزم شمار نہیں کرتے اور ادبی سربراہ اسے ادب کے ذیل میں نہیں آنے دیتے لیکن اب صورت حال بالکل منقلب ہو گئی ہے۔ اور ہند و پاک کے درجنوں معتبر کالم نویسوں کے کالموں کا بیشتر حصہ اردو کے معیاری ادب کا جزو بن چکا ہے جس کو کوئی نقاد مسترد نہیں کر سکتا۔

کتاب کا نام "میرا کالم" اگرچہ روکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے لیکن اندر کے مضامین پڑھ کر نہ صرف تبسم زیر لب کی مستقل کیفیت پیدا ہو جاتی ہے بلکہ ذہن و دل کو مصنف کی بصیرت اور بصارت پر ایمان بھی لانا پڑتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی کالم نگاری یوں تو ابتدا ہی سے قابل توجہ رہی ہے لیکن اب ان کے کالموں میں جو نکھار آیا ہے اور ادبی حسن کاری اور دل افروز ظرافت کے جو نئے زاویے پیدا ہوئے ہیں وہ اپنی جگہ بے مثال ہیں۔ مجتبیٰ حسین اب لطائف و ظرائف کا سہارا نہیں لیتے یا بہت کم لیتے ہیں لیکن بات سے بات خوب پیدا کرتے ہیں اور اپنی زرخیز قوت متخیلہ کو بروئے کار لاکر موضوع زیر بحث کے ایسے ایسے گوشے روشن کر دیتے ہیں کہ قاری مسحور و متحیر ہو جاتا ہے۔ ان کے اکثر عنوانات بھی شاعرانہ صنعت گری کا بہترین نمونہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً آم اب عام نہیں رہے۔ (صنعت تجنیس) کتو! انسانوں سے خبردار رہو (صنعت تضاد) پکوان میں کتابت کی غلطی (قول محال) ذکر پھر ملے پلی کا (تحریف) ابراہم لنکن نرالا بن گئے اور ملکہ الزبتھ اور ہمارا باورچی خانہ (قول محال) اور لطف یہ ہے کہ "پکوان میں کتابت کی غلطی محض قاری کو متحیر کرنے کی کوشش نہیں ہے بلکہ نفس مضمون اپنے عنوان سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

مجتبیٰ حسین کے مزاح پاروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں ابتذال اور عامیانہ پن نام کو بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی کھلے ڈلے جنسی اشارے ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر ان کی شخصیت کی طرح بڑی ہموار، شایستہ اور دلپذیر ہوتی ہے۔ وہ کھلی آنکھوں اور بیدار ذہن کے ساتھ دنیا اور اس کی کارگزاریوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں لیکن اپنے مطلب کے نکات بہت جلد اخذ کر لیتے ہیں۔ ان کے یہاں طنز کی پھواریں بھی عموماً خوشگوار انداز میں نمایاں ہوتی ہیں۔ ان میں تلخی اور زہرناکی تو بالکل نہیں ہوتی اور طنز کا حصہ اتنا ہی ہوتا ہے جتنا سالن میں نمک، طنز اگر مزاح پر حاوی ہو جائے تو مزاح نگار نواب سید محمد آزاد تو بن سکتا ہے مگر ابن انشا بالکل نہیں بن سکتا۔ مجتبیٰ حسین اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں اس لیے وہ طنز کی نشتریت اتنی ہی رکھتے ہیں جتنی نشتریت سے مزاح کا ذائقہ گہرا ہو جائے لیکن بگڑنے کی کگار پر نہ پہنچ جائے۔ ویسے بھی وہ مثبت انداز فکر کے مزاح نگار ہیں۔ منفی انداز فکر ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ مثال کے طور پر یہ مکالمہ سنیئے۔

ہم نے کہا "تم جسے ہمارا مجسمہ سمجھ رہے ہو۔ وہ اصل میں حیدرآباد کے مشہور شاعر۔ مخدوم محی الدین کا مجسمہ ہے۔ اس پر وہ بولے "یار! مگر اس مجسمے پر جو شیروانی ہے وہ تو بالکل تمھاری شیروانی کی طرح لگتی ہے۔" ہم نے دست بستہ عرض کیا "شیروانی ضرور ہماری ہو سکتی ہے لیکن اس کے اندر جو شخصیت ہے، وہ دوسری ہے"

بولے "خدا پر بھروسہ رکھو۔ جب ابراہم لنکن، سوریہ کانت نرالا بن سکتے ہیں تو تم بھی ایک دن مخدوم محی الدین ہو سکتے ہو۔ برا وقت کبھی پوچھ کر نہیں آتا۔" (ابراہم لنکن، نرالا بن گئے)

اور یہ ریمارک بھی "ہم ہندستانیوں کی عادت ہے کہ جس چیز کو بھی قومی بنا دیتے ہیں اسے مارنے کو ڈرتے ہیں۔ آم تو خیر راشٹریہ پھل ہے۔ ہم نے تو اپنے راشٹر پتا کو بھی نہیں چھوڑا" (آم اب عام نہیں رہے)

"تماشائے اہل قلم" کے تحت جو مضامین ہیں وہ بعض ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ان کے شخصی تاثرات کا اظہار تو کرتے ہی ہیں۔ بسا اوقات ان گوشوں کو بھی اجاگر کر دیتے ہیں جو اب تک پردہ اخفا میں تھے۔ سردار جعفری کے بارے میں مجتبیٰ حسین کا یہ ریمارک دیکھیے:۔

"بلاشبہ سردار جعفری، ہمارے ادب کی سب سے فعال، متحرک، توانا مگر ساتھ ہی ساتھ متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ ان کے مخالفین تو ان کو نزاعی شخصیت مانتے ہی ہیں۔ ان کے مداح اور چاہنے والے بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ (سردار جعفری، اردو ادب اور گیان پیٹھ)

تماشائے اہل قلم میں مجتبیٰ حسین نے ۲۳ ادبی شخصیتوں کے بارے میں کسی نہ کسی خاص زاویے

سے مزاح پارے (کالم) لکھے ہیں جن میں ان کی ادب شناسی، معاملہ فہمی، نکتہ رسی اور تخلیقی اپج ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہ مضامین خاکے نہیں ہیں مگر ان میں خاکوں کی جگمگاہٹ اور افسانوی دلکشی کے امتزاج سے ایک نیا انداز حسن پیدا ہو گیا ہے۔ جو صرف مجتبیٰ حسین ہی پیدا کر سکتے تھے۔
مجتبیٰ حسین کا اسلوب سادہ و پرکار ہے۔ مغلق الفاظ و تراکیب اور پیچیدہ جملوں سے وہ اجتناب برتتے ہیں مگر لفظوں کی تحریف و تقلیب سے اکثر وہ معنی کی نئی جہات پیدا کر دیتے ہیں عصری بصیرت اور نکتہ رسی ان کی تحریروں کے خاص جوہر ہیں جن سے اس کتاب کے قاری کو متواتر سابقہ پڑتا رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اعلا درجے کے ادبی طنز و مزاح کے شائقین میں اس کتاب کی ویسی ہی پذیرائی ہوگی جیسی مشفق خواجہ کی کتاب "خامہ بگوش کے قلم سے" (مطبوعہ ۱۹۹۵) کی ہوئی تھی۔"

کھلے خطوط

مجتبیٰ حسین، خود اپنے محتسب

اردو کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہم نے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی ہی تحریروں میں خودستائی اور خودسرائی کرتے ہوئے پڑھا اور دیکھا ہے۔ اردو کے قارئین ایسے کئی ایک شاعروں اور ادیبوں سے بہ خوبی واقف ہیں، لیکن ہم نے آج تک کسی ادیب یا مزاح نگار کو خود اپنی تحریروں کا جائزہ لیتے یا موازنہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ ہمارے عظیم ادیب، مزاح نگار اور کالم نگار جناب مجتبیٰ حسین کے فن کا نقطۂ عروج ہے کہ انھوں نے اپنے ۲۵ سال قبل لکھے مضمون "اردو کا آخری قاری" کے حوالے سے خود اپنے آپ کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ۲۵ رجولائی کا "میرا کالم" بظاہر مہاراشٹر کے اردو میڈیم کے طالب علم بلال اقبال مستری کی عظیم کامیابی پر تہنیتی پیام ہے مگر اردو کے اس ہونہار طالب علم نے مجتبیٰ حسین کے ضمیر اور ان کے اندر کے ادیب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور وہ خود اپنے مضمون "اردو کا آخری قاری" پر بے باک ہو کر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"اردو کو اب دانشوروں، پروفیسروں شاعروں اور ہم جیسے ادیبوں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ تنویر نیاروں، بلال مستریوں، زرینا ؤں، مناثوں، جہاں آراؤں اور رضوانا ؤں کی ضرورت ہے" مجتبیٰ حسین کا یہ کالم اردو کی ترقی اور ترویج اور اس کی بقا کے لیے ان کے اندر چھپی ہوئی تڑپ کا آئینہ دار ہے۔ وہ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"ہمیں کوئی بڑا سرسید بھی نہیں چاہیے۔ ضرورت ہے چھوٹے چھوٹے سرسیدوں کی جو اپنے اپنے علاقوں میں اپنی تہذیبی شناخت کو برقرار رکھنے کی سعی کریں"

آخر میں وہ اپنے مضمون پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اردو ادب کے ایسے پہلے ادیب قرار پاتے ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنی زندگی میں اپنا خاکہ (ملاحظہ ہو "اپنی یاد میں") لکھا ہے بلکہ اپنی تحریروں کے خود نقاد بھی ہیں۔ اس طرح اپنی شخصیت اور تحریروں کا محاسبہ کرنا اردو ادب میں پہلا تجربہ ہے اور اس کا سہرا طنز و مزاح کے ادیب مجتبیٰ حسین کے سر جاتا ہے۔ اب ہمیں از سر نو اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ طنز و مزاح کو دوسرے درجہ کا ادب کہنا کس حد تک درست ہے۔

ہم اردو کے اس ہونہار طالب علم بلال اقبال مستری کو دلی مبارکباد دیتے ہوئے ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنے عظیم کارنامے کے ذریعے نہ صرف کروڑوں اردو

والوں کے حوصلہ کو بڑھایا ہے بلکہ عظیم مزاح نگار مجتبیٰ حسین کو اکیسویں صدی میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا۔ اردو والے دونوں کی درازی عمر کے لیے دعا گو ہیں۔

محمد ضمیر الدین حیدرآباد

اردو میڈیم کے طالب علم بلال مستری کی کامیابی نہایت درجہ دل خوش کن ہے۔کونسل بار بار اسکولی سطح پر اردو میڈیم اپنانے کی اہمیت پر زور دے رہی ہے۔ اس غیر معمولی کامیابی سے ہمارے دعوے کو تقویت پہنچتی ہے کہ مادری زبان میں صلاحیت کے بھرپور بروئے کار آنے کا امکان زیادہ ہے۔ مادری زبان کو میڈیم بنانے سے خاص طور پر ڈراپ آؤٹس کی فی صد گھٹائی جاسکتی ہے اور ذہانت بڑھائی جاسکتی ہے جس کا عکس ان کے نتائج میں آئے گا۔ بلال مستری اور ان کے والدین کو یہ کامیابی مبارک ہو۔

انوار رضوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ نئی دہلی

ماہ مئی کا رسالہ بے حد پسند آیا۔ ابوبکر رضوی کا اشاریہ ''اردو افسانے میں جملیت (۱۹۶۰ء کے بعد)'' میں عصر حاضر کے افسانوی ادب پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور پی پی سریواستو رند ساغری کی غزل بہت پسند آئی۔ ادا جعفری کی نظم گواہی عصری آگہی کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ حیدر قریشی نے کتاب نما ۹۸ء کا ایک سرسری جائزہ بڑی جانفشانی سے پیش کیا۔

پروفیسر عتیق اللہ کا مضمون ''اطراف رشید احمد صدیقی'' مختصر مگر معنوی اور فکری بالیدگی نے اس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی زبان و بیان کی پیکر تراشی نے مضمون میں لطافت پیدا کی ہے۔

عبدالقوی ضیا کا مضمون ''منصورہ احمد۔ ''زخم زخم کی شخصیت کی شاعرہ'' کچھ زیادہ ہی پسند آیا۔ انھوں نے منصورہ احمد کی شاعری پر سنجیدگی سے گفتگو کی ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی حرارت موجود ہے۔

طنز و مزاح میں احمد صغیر صدیقی کا مضمون ''جائزہ۔ ناجائزہ'' ادیب و شاعر پر طنز کا نادر نمونہ ہے۔ مجتبیٰ حسین کا طنزیہ مضمون ''لوگ ہمیں بھی ڈاکٹر کہنے لگے'' انتہائی معنی خیز، دلکش اور مسکراہٹوں سے آراستہ ہے۔

تبصروں میں ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب ''جوش ملیح آبادی کے خطوط'' پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر صادق کی کتاب ''عظیم شاعر مرزا غالب'' پر ڈاکٹر توقیر احمد خاں وغیرہ کے تبصرے پسند آئے۔ صادق صاحب نے اپنی ادبی و مصورانہ کاوشوں سے غالب کو سمجھنے میں آسانی

پیدا کی ہے۔ یہ اردو ادب کے لیے اہم کارنامہ ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر مجیب احمد خاں ۱۲، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی

....

میرے مضمون "غالب کا ایک شعر" مطبوعہ کتاب نما شمارہ اگست ۹۹ میں دیوان غالب چوتھا اڈیشن مطبع نظامی پریس کانپور، ۱۸۶۲ سے ایک شعر کا اقتباس دیا گیا ہے۔ وہ سہو کتابت کا شکار ہوگیا ہے۔ وہ دراصل اس طرح ہے:

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو کر رہا ہو جائیے

براہ عنایت تصحیح شائع کردیں ورنہ بعض قارئین کو کنفیوژن ہوگا۔

انوار رضوی کالکاجی۔ نئی دہلی ۱۹

.

اگست کے مہمان اداریے میں "اردو ذریعہ تعلیم اور اساتذہ کی ذمے داریاں میں" معاشرے کو با شعور بلند کردار، خوش اخلاق افراد فراہم کرنا اساتذہ کی سب سے اہم ذمے داری ہے لکھا گیا اور اس ذمے داری کو اس صورت میں پورا کر سکتے ہیں جبکہ وہ خود صاحب کردار ہوں" کہا گیا۔ اساتذہ پر اس قدر بھاری ذمہ داری رکھنے سے قبل اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ آج کے استاد کا معیار کیا ہے؟ مدرسین کا انتخاب صرف ان کی کاغذی قابلیت پر ہوتا ہے۔ نہ کہ ان کے کردار کے معیار پر، دوسرے یہ کہ آج کا استاد جو موجودہ ماحول کا ایک حصہ ہے ان کے بلند کردار کی امید رکھنا فضول ہے۔ جب سارے گھر جل رہے ہیں تو صرف ایک گھر کو محفوظ سمجھنے کے مترادف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کیچڑ سے کنول بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن موجودہ معاشرے کی کیچڑ سے کنول جیسے استاد کا ملنا دشوار ہے اس کے علاوہ تعلیم عام ہونے کی وجہ سے لاکھوں مدرسین کی ضرورت ہے۔ کردار کے لحاظ سے اساتذہ کا انتخاب شروع کریں۔ تو تین چوتھائی مدد سے خالی رہیں گے۔ مدارس اردو کالج کی بدعنوانیوں پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ تعلیم کا میدان کس قدر گندہ ہو چکا ہے۔ نوے فیصد اس کو بحیثیت پیشہ برائے روزی اختیار کرتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب شاگرد استاد کی تلاش میں پھرتے تھے۔ راجا مہاراجا کی اولاد بھی بغرض تعلیم ان کے آشرم میں بھیجی جاتی تھی لیکن آج تعلیم کی حیثیت ایک بھکاری کی ہے۔ جو در در شاگردوں کے لیے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ سماج کے دوسرے افراد کو چھوڑ کر صرف استاد کو صاحب کردار ہونے کا مشورہ دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ گھر کی صفائی صرف سیڑھیاں جھاڑنے سے نہیں ہوتی۔

کے۔ راما راؤ، حیدرآباد

ادبی خبریں

"سیاست ویب سائیٹ" پر اردو سکھانے کا نظم، جناب زاہد علی خاں کا اعلان

حیدر آباد ۔ یکم اگست

ایڈیٹر روز نامہ "سیاست جناب زاہد علی خاں نے آج اعلان کیا کہ انٹرنیٹ کے "سیاست ویب سائیٹ" پر اردو سکھانے کا نظم کیا جارہا ہے۔ اس پروگرام کا جلد آغاز کیا جائے گا۔ جناب زاہد علی خاں محبوب حسین جگر گولڈ میڈلس کی تقسیم کی تقریب سے بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ روزنامہ سیاست "آندھرا پردیش کے تمام زبانوں کا واحد اخبار ہے جو اپنی ریاستی سرحدات پار کر کے دوسری ریاست سے بھی اپنا ایڈیشن شائع کر رہا ہے یہ سیاست کی ایک اہم کامیابی ہے، اس کامیابی کو سامنے رکھ کر "سیاست ویب سائٹ" پر اردو سکھانے کا نظم کیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں ای میل بھیجنے کا ۱۵ راگست آغاز سے کیا جارہا ہے، اس طرح اردو زبان کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگا۔ جناب زاہد علی خاں نے اعلان کیا کہ دینی مدارس سے حفظ قرآن مکمل کرنے والوں کو محبوب حسین جگر کیریئر گائڈنس سنٹر کی جانب سے کمپیوٹر کی مفت تربیت دی جائے گی۔ اس سے حفاظ کرام کو بہت سہولت ہو سکے گی۔ انھوں نے ایم ایس ایجوکیشن سنٹر کی خدمات کی ستائش بھی کی۔ مہمان اعزازی پروفیسر افضل محمد وائس چانسلر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی نے طالب علموں پر زور دیا کہ وہ اپنی تعلیم میں دلچسپی بڑھائیں اور دلچسپی سے قائم رکھیں اور اسی سے انھیں فائدہ ہو سکتا ہے۔ انھوں نے روزنامہ "سیاست" سے ۱۹۵۳ء سے اپنی رفاقت کا تذکرہ بھی کیا۔ جناب محمد لطیف خاں ڈائریکٹر ایم ایس ایجوکیشن نے ادارہ اور طالب علموں کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ ڈاہادت علی بیگ نے کارروائی چلائی اور معلوفہ تبرین نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

صحافت، طنز و مزاح اور اردو کی خدمت کے لیے ایوارڈ ۸راگست کو کانگریس رہنما ارجن سنگھ پیش کریں گے

نئی دہلی ۲راگست انڈین کلچرل سوسائٹی کی جانب سے ۸راگست اتوار ۸ر بجے شب ایوان غالب ماتا سندری لین نئی دہلی میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں سابق وزیر اعلا یو پی مسٹر نرائن دت تیواڑی نفیس عباس اور ڈاکٹر پرویز میاں کو استقبالیہ دیا جائے گا اور ڈاکٹر عزیز برنی کو اردو صحافت ایوارڈ، نصرت ظہیر کو طنز و مزاح کا مشتاق یوسفی ایوارڈ نیلم مشال کو اندرا گاندھی ایوارڈ، کے ایل نارنگ ساقی کو محسن اردو ایوارڈ، حکیم امام الدین ذکائی کو حکیم عبدالحمید ایوارڈ سید شہاب الدین اور شمیم حنفی کو بھی قومی ایکتا ایوارڈ دیئے جائیں گے۔ مشاعرے کی شمع کانگریس اقلیتی کمیٹی کے چیئرمین اور سابق مرکزی وزیر ارجن سنگھ روشن کریں گے اور عمران قدوائی قومی ایکتا شمع روشن کریں گے۔ مشاعرہ سید فاروق کی صدارت میں ہوگا۔ مشاعرے کے کنوینر میکش امروہوی کے مطابق مشاعرے میں ڈاکٹر بشیر بدر، راحت اندوروی، ساغر خیامی، موج رامپوری، منظر بھوپالی، سلطان نظامی، راہی شہابی، نصرت گوالیاری، ساحل فریدی، رامش رامپوری، متین امروہی، نور جہاں ثروت، انجم رہبر، ترنم کانپوری، عارفہ شبنم سنبل فیضانی، سرکار حیدر، رضا امروہوی،

راشد کمال گنگوہی نادر ردولوی تحسین منور شریک ہوں گے۔

سید حامد [illegible] ہمدرد کے چانسلر مقرر

نئی دہلی ۲۰ اگست۔ علی گڑھ مسلم [illegible] سابق وائس چانسلر مسٹر سید حامد کو جامعہ ہمدرد کا چانسلر مقرر کیا گیا ہے جامعہ کی طرف سے آج جاری یہاں ایک ریلیز کے مطابق بانی چانسلر حکیم عبدالحمید کے انتقال کے بعد یہ جگہ خالی ہوگئی تھی اور یونیورسٹی کی دفعہ ۱۴(اے) کے تحت سید حامد کو ۵ برس کے لیے چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔

جامعہ کا ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ

اختر الواسع ڈائرکٹر مقرر

نئی دہلی ۲۰ راگست جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جنرل ایم اے ذکی نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر اختر الواسع کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا اعزازی ڈائرکٹر مقرر کیا ہے۔ جامعہ رجسٹرار کی طرف سے جاری سرکلر کے مطابق پروفیسر واسع کو پروفیسر آئی ایچ آزاد فاروقی کی جگہ ڈائرکٹر بنایا گیا ہے۔

اردو کے علمی اور ادبی رسائل کا اشاریہ

مقتدرہ قومی زبان نے اردو کے علمی اور ادبی رسائل کی اشاریہ سازی کے ایک منصوبہ کا آغاز کیا ہے یہ منصوبہ ملک کے ممتاز محقق مشفق خواجہ کی نگرانی میں رفاقت علی شاہد انجام دے رہے ہیں۔

عظیم کتابوں کے تراجم، مقتدرہ نے دوسرا سیٹ بھی شائع کردیا

ابن سینا کی دو کتابوں، میکاولی کا بادشاہ سمیت ۱۰ کتابیں شامل ہیں

اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام جہان دانش عظیم کتب کے تراجم کے سلسلے کی دس مزید کتابیں شائع ہوگئی ہیں۔ ان میں ابن سینا کی دو کتابیں ،، اشارات و تنبیہات" (ترجمہ: ڈاکٹر محمد میاں صدیقی) "کلیات قانون" (خواجہ رضوان احمد) زرنوجی کی ایک کتاب "تعلیم المتعلم" (ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی) چارلس ڈارون کی" توریت آدم" The Descent Of Man (خادم علی ہاشمی، اے ڈی میکن ڈاکٹر مظفر حسین ملک) میکیاولی کی " بادشاہ" The Prince (ڈاکٹر محمود حسین)، ارسطو کی" طبیعات " Physics (محمد علاؤ الدین) ہکسلے کی" در ادارک" The Doors Of Perception (عبد الحمید اعظمی) پیاجے کی" جینیاتی علمیات" (اے ڈی میکن) سنو کی" دو ثقافتیں" Two Cultrures (زینت اللہ خان) شامل ہیں۔ اس سے پہلے عظیم کتب کے ضمن میں دس کتابوں کا سیٹ جشن آزادی پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر شائع ہوا تھا یاد رہے کہ پاکستان کے پچاسویں جشن آزادی کے حوالے سے مقتدرہ نے پچاس عظیم کتب کی اشاعت کا آغاز کیا تھا۔

سید محمد جعفری پر تنقیدی اور تحقیقی مضامین کتابی صورت میں شائع ہوں گے

کلام اور حالات زندگی سے متعلق ویب سائٹ بھی قائم کردی گئی

برصغیر کے نامور طنز و مزاح نگار سید محمد جعفری کے صاحبزادے علی جعفری اپنے والد سے متعلق تنقیدی، تحقیقی مضامین اور ان کی غیر مطبوعہ نگارشات یکجا کر کے کتابی صورت دینا چاہتے ہیں ۔ انھوں نے سید محمد جعفری (مرحوم) کے قریبی احباب اور ادبی دوستوں سے درخواست کی ہے کہ اگر کسی کے پاس ان کی نادر تصاویر، خطوط اور غیر مطبوعہ کوئی تحریر موجود ہو تو ۱۵۴۔ اے گلی ۔ ۱۷ ، سیکٹر ایف ۲۱۰ اسلام آباد کے پتے پر

ارسال کردیں۔ ان کا مجموعہ کلام "شوخی تحریر" بھی دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ ان کے حالات زندگی اور کلام انٹرنیٹ پر اس ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

www jafari\com

مسٹر جعفر علی خاں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے تمام اردو پروگراموں کے انچارج

حیدرآباد ۔۱۳ اگست ۔ اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد محترمہ درگا بھاسکر نے سینیر براڈ کاسٹر ریڈیو ٹی وی اور اسٹیج کے ممتاز فنکار جناب جعفر علی خاں پروگرام ایکزیکیٹو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کو حیدرآباد سے نشر کئے جانے والے تمام اردو پروگراموں کا انچارج مقرر کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مسٹر جعفر علی خاں ستمبر ۱۹۹۷ء سے دسمبر ۱۹۹۸ء تک اردو پروگرام نیرنگ کے انچارج رہ چکے ہیں جبکہ مسٹر اسلم فرشوری کے آکاش وانی گلبرگہ کو تبادلہ کے بعد ایک بار پھر سے مسٹر جعفر علی خاں کو اردو پروگرام نیرنگ کے علاوہ نوجوانوں کے پروگرام، خواتین کے پروگرام اور دیگر سب ہی پروگراموں کا انچارج بنایا گیا ہے۔ آکاش وانی حیدرآباد ملک کا وہ واحد اسٹیشن ہے جہاں سے روزانہ ڈھائی گھنٹے اردو پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

اقبال اور ذہن جدید پر بھوپال میں توسیعی خطبہ

بھوپال۔ یہاں کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز کے زیر اہتمام توسیعی خطبہ دیتے ہوئے اقبال اعزاز سے سرفراز اختر سعید خاں نے "اقبال اور ذہن جدید" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ اقبال کی شاعرانہ سربلندی کا بین ثبوت ہے کہ آج بھی اُن کے افکار اور اشعار کی معنویت کا اعتراف کیا جارہا ہے۔

اس تقریب کی صدارت جناب منوہر کیشو نائب چیرمین اردو اکادمی کررہے تھے جبکہ نظامت کے فرائض مرکز کے فاؤنڈر ممبر پروفیسر آفاق احمد نے ادا کیے۔ تقریب کے آغاز میں بھوپال کی ممتاز گلوکارہ اسماء سنان نے اقبال کی دو غزلیں پیش کیں۔

جناب منوہر کیشو نے کہا کہ وہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے معترف ہیں لیکن اُن کے افکار میں جو تضاد ہے وہ بھی ان کے پیش نظر ہے لیکن اس سے اقبال کی آفاقی شاعری کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پروفیسر آفاق احمد نے اقبال ادبی مرکز کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور بھوپال میں اقبال کے قیام کے یادگار تاریخی دنوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ شہر دارالاقبال تو پہلے سے ہی اقبال کے قدموں کی برکت سے یہ اقبال مند بھی ہوگیا۔

سوراج سنستان کے تعاون سے منعقدہ اس تقریب کے اختتام پر سکریٹری سابو راجوانی نے شکریہ ادا کیا۔

احمد محفوظ کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی نے احمد محفوظ کو ان کے مقالے "کلام میر کی تنقید کا تنقیدی مطالعہ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کی ڈگری تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی نگرانی میں لکھا گیا۔ مقالے کے ممتحن پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر قاضی افضال حسین تھے۔ اس وقت احمد محفوظ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت لکچرر وابستہ ہیں۔

پانچ صحافیوں کو اسامہ طلحہ فاؤنڈیشن ایوارڈ

لکھنؤ ۔ یکم اگست (یو این آئی) پانچ صحافیوں کو بے باکانہ اور معتمد صحافتی کوششوں کے لیے اسامہ طلحہ فاؤنڈیشن ایوارڈ 1998 کا اعزاز دیا گیا ہے۔ یہاں تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے سابق وزیر اعظم آئی کے گجرال نے کہا کہ مسٹر طلحہ

ایک بے باک صحافی تھے اور انکی جرات مندی نوجوان صحافیوں کے لیے ہمیشہ فیضان کا ایک ذریعہ ہوگی۔ بعد ازاں انہوں نے پرنٹ میڈیا کے وبھانشو دیوپال (ہندی) اختر احسن (اردو) پنکی ویراسنا (انگلش) اور الیکٹرانک میڈیا کے برکھادت اور اجمل جامی کو میڈلس اور مومنٹوز پیش کیے۔ مشہور صحافی خشونت سنگھ، لکھنؤ کے میئر ڈاکٹر ایس سی رائے، ریاستی چیف سکریٹری ڈاکٹر یوگیندر نارائن، لکھنو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر روپ ریکھا ورما، اسامہ طلحہ فاؤنڈیشن کی صدر پروین طلحہ، سکریٹری کلثوم طلحہ، شہر کے کئی معززین کے ساتھ تقریب میں موجود تھے۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، میکسیکو میں منعقد شدنی بین الاقوامی کانفرنس میں مدعو

حیدرآباد۔ ۱۴ را کتوبر ملک کی ممتاز اردو شاعرہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کو میکسیکو میں ماہ اکتوبر کے دوران منعقد شدنی انگریزی شعراء کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔ کانفرنس ایک ہفتہ تک جاری رہے گی۔ اس کانفرنس میں انگریزی زبان میں شعر کہنے والے دنیا بھر کی کئی معزز شخصیتوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی اس کانفرنس میں شرکت ایک طرح کا اعزاز ہوگا۔

ڈاکٹر طیب انصاری کا نیا پتہ

طیب انصاری
"المنیر" 10-3-5/6/1
مہدی پٹنم۔ حیدرآباد۔ 500028

پروفیسر شمیم نکہت کی کتاب اردو سیکھیے کی رسم اجرا

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی میں پروفیسر شمیم نکہت کی کتاب "اردو سیکھیے" کی رسم اجراء پروفیسر امیر عارفی صدر شعبۂ اردو کے ہاتھوں عمل میں آئی کتاب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ کتاب پروفیسر شمیم نکہت کے چھتیس۔ ۳۶ سال کے تدریسی تجربے کا نچوڑ ہے انھوں نے یہ کتاب لکھ کر ایک اہم خدمت انجام دی ہے پروفیسر عبدالحق نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بظاہر یہ ایک زباں سکھانے والی کتاب ہے لیکن شعبۂ اردو کے آغاز سے اب تک کے تجربہ کا حاصل ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کتاب کی ندرت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ درسی کتاب ترتیب دینے میں بنیادی شے مرتب کا علمی اور عملی تجربہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب ان کے چھتیس سال کے تجربات کا نچوڑ ہے اور وہ تجربہ اس کتاب کی ترتیب میں مشعلِ راہ رہا ہے۔ ڈاکٹر فرحت فاطمہ نے کہا کہ 36 سال قبل شمیم آیا۔ شروع سے ہی ان کلاسوں کی انچارج ہیں اور یہ کتاب ان کے اس طویل تجربے کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ اس میں آوازوں اور تصویروں کے ذریعہ حروف کو سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر نکہت ریحانہ خاں نے کہا کہ یہ کتاب نئے تقاضوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ یہ خوشی کا مقام ہے کہ ہم آج ایک خواب کی تکمیل دیکھ رہے ہیں۔

جلسہ کے آخر میں ڈاکٹر ابن کنول نے تمام حاضرین اور مقررین کا شکریہ ادا کیا۔ جلسہ میں یونیورسٹی کے اساتذہ، طلباء وطالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ اس کتاب کی تصویریں مشہور آرٹسٹ مصلح احمد کی بنائی ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر سید سجاد حسین کا بحیثیت پروفیسر تقرر

ڈاکٹر سجاد حسین صاحب کو اکتوبر 1998 سے پروفیسر کے عہدے پر فائز کیا گیا ہے پروفیسر موصوف اردو دنیا میں اپنی تدریسی و تحقیقی خدمات

اور تنقیدی طرز فکر کے سبب کافی مقبول ہیں۔ آپ کی چار تحقیقی وتنقیدی کتابیں شائع ہوکر علماء ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اب تک آپ کے زیر نگرانی گیارہ پی۔ ایچ ڈی اور پندرہ ایم فل کے مقالوں پر مدراس یونیورسٹی سے ڈگریاں تفویض ہو چکی ہیں۔

غالب کی سیکولر فکر، شاعرانہ عظمت اور خطوط کی اہمیت کا اعتراف

دتیا (ایم پی) انجمن ترقی اردو اور جن وادی لیکھک سنگھ کے زیر اہتمام یہاں غالب پر ایک سمینار کا انعقاد کیا۔ جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے سیکولر کردار پر روشنی ڈالی اور ان کی مثنوی چراغ دیر کے حوالے سے کہا کہ وہ محض شاعری نہیں بلکہ ان کے دل کی آواز اور ان کی سیکولر فکر کا اظہار ہے۔ ٹاؤن ہال دتیا میں منعقد اس سمینار میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے صوبائی انجمن ترقی اردو اور جن وادی لیکھک سنگھ کے صدر پروفیسر آفاق احمد نے غالب کی نثر پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے خطوط میں ان کے دل درد آشنا کی صرف آوازیں سنائی نہیں دیتیں بلکہ ان خطوط کے ذریعہ اس دور کی تہذیبی، سیاسی اور ادبی تاریخ تیار کی جا سکتی ہے۔ سمینار میں ڈاکٹر شفیع قریشی ڈاکٹر سونتر کمار سکسینہ (ڈبرا) قاسم رسا (گوالیار) کشفی جھانسوی (جھانسی) کے ایل پانڈے اور دوسرے لوگوں نے بھی اظہار خیال کیا۔ نظامت بڑی خوش اسلوبی سے وقار صدیقی نے کی اور کہا کہ اس تقریب سے دتیا کی ادبی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ آغاز میں بشریٰ صدیقی نے غالب کی ایک غزل ترنم سے پیش کی۔

اردو پنجاب اور سکھ شعرا کا اجرا

پٹیالہ "اردو وہ زبان ہے جس کا رشتہ پنجاب اور پنجابی سے ماں اور بچی کا ہے اردو کے رسم خط کو سیکھنا اہل پنجاب کے لیے اس لیے بھی ضروری ہے کہ قدیم پنجابی ادب اسی رسم خط میں موجود ہے۔" یہ اظہار خیال ۱۷ اگست کو پنجابی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جسبیر سنگھ آہلووالیہ نے یونیورسٹی میں منعقدہ آل انڈیا مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے کیا اس موقعہ پر وی۔ سی۔ صاحب نے یونیورسٹی کی تازہ اشاعت اردو پنجاب اور سکھ شعرا کا بھی اجرا کیا۔ یہ کتاب خالصہ پنتھ کی ۳۰۰ ویں سالگرہ کے موقعہ پر شائع کی گئی ہے جس کے مصنف معروف ادیب وشاعر ڈاکٹر ناشر نقوی ہیں۔ کتاب کا تعارف دیتے ہوئے ممتاز شاعر زبیر رضوی نے کہا کہ اردو ادب میں تقریباً ۹۰ سکھ شعرا کا کلام پہلی بار سامنے آیا ہے یہ کتاب پنتھ کی سالگرہ پر اردو دنیا کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔

رسمی تقریب کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ جس کی نظامت کے فرائض یونیورسٹی کے اردو پروفیسر ناشر نقوی نے انجام دیے۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا، ان میں ڈاکٹر سردار انجم، زبیر رضوی، کوثر زیدی کیرانوی، جگر جالندھری، مہیش پٹیالوی، وید دیوانہ، سردار پنچھی، ٹی، این، راز، رحمان اختر، سرور لکھنوی ششکلا سری واستو اور مہک بھارتی کے نام قابل ذکر ہیں یونیورسٹی کی روایت کے مطابق شعرا کو اعزازات سے بھی نوازا گیا یہ مشاعرہ این، ایس، ایس ڈیپارٹمنٹ نے این زیڈ، سی، سی حکومت ہند اور بینک آف پنجاب کے اشتراک سے منعقد کیا۔ ڈاکٹر بلیج سنگھ مان نے پنجاب اور اردو کے رشتے پر سیر حاصل اظہار خیال کیا۔ وی۔ سی صاحب نے مشاعرے

میں یہ بھی اعلان کیا کہ اردو ڈیپارٹمنٹ کے لیے ایک فیلوشپ شروع کی جائے گی۔

یوم انجم کے موقع پر عبداللہ ولی بخش قادری کو اعزاز انجم

بدایوں، ۱۱راگست انجمن فروغ ادب کے زیر اہتمام علامہ انجم فوقی کی یاد میں یوم انجم بنایا گیا۔ اس موقع پر 1998 کے لیے "اعزاز انجم" معروف ماہر تعلیم اور سابق استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی حضرت عبداللہ ولی بخش قادری کو دیا گیا۔ یہ اعزاز بزرگ ادیب و شاعر اور سہ ماہی 'ابر' کے مدیر حضرت ذکی تاتاگانوی نے دیا۔ اس موقع پر مشہور شاعر مونس بریلوی کی کتاب 'شاخ چراغ" کی رسم اجراء عبداللہ ولی بخش قادری کے ہاتھوں ادا کی گئی۔ پروگرام کا آغاز حافظ علی اصغر نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ انجم فوقی کے تعلق سے خاں فہیم نے مضمون اور جمیل صدیقی نے نظم پڑھی۔ بعد میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر شمس بدایونی نے کی۔ مشاعرہ صبح ۴ بجے تک چلا جس میں بڑی تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔

عالم گیر شبنم کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض

ایل، این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ نے جناب عالمگیر شبنم محمد پور کوآری ضلع سستی پور کو ان کے تحقیقی مقالہ بعنوان "اردو ناول میں اخلاقیات کی عکاسی ۱۹۳۵ تک" پر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انھوں نے اپنا مقالہ پروفیسر رئیس انور شعبہ اردو متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے زیر نگرانی مکمل کیا جبکہ ان کے دیگر ممتحن پروفیسر فاروق احمد صدیقی مظفر پور اور پروفیسر بدرالدین بھاگل پور تھے۔

غالب اکیڈمی میں حکیم صاحب کے تعزیتی جلسے میں دانشوروں کا اظہار تعزیت

غالب اکیڈمی میں ۲۹ر جولائی کو اکیڈمی کے بانی صدر حکیم عبدالحمید کے انتقال پُر ملال پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں دانشوروں اور ادیبوں نے اظہار تعزیت کیا۔

پروفیسر شارب ردولوی نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب کا ثانی اس دور میں کوئی نہیں ملے گا ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنی تقریر میں کہا کہ حکیم صاحب نے اتنا کام کیا لیکن کبھی اپنی شخصیت کو آگے نہیں آنے دیا ہمدرد دواخانے کے ذریعے کروڑوں لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ سید اوصاف علی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ابو الکلام، ابواللسان تو بہت پیدا ہوئے لیکن ابوالعمل کوئی پیدا نہیں ہوا۔ حکیم صاحب ابوالعمل تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ ان کی عبادت ان کی ریاضت کسی ولی سے کم نہیں تھی۔ آزادی کے بعد انہوں نے ہمارے معاشرے کو سب کچھ دیا۔ حکیم صاحب نے جتنے کام اکیلے کئے ہیں۔ جتنے ادارے قائم کئے ہیں اتنا کام کسی فرد واحد سے نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ رسولوں کو معجزے دیئے گئے کرشمے عطا کئے لیکن انسان کو صرف کارکردگی دی گئی۔ بڑی کارکردگی ہی اس کا معجزہ تھا اگر عام زندگی میں معجزے ہو سکتے ہیں تو حکیم صاحب کی ذات ان کے کارنامے معجزے ہی کے دائرے میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر سید فاروق نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں حکیم صاحب کو ایک استاد کی حیثیت سے جانتا ہوں ان کے اندر انکسار وقناعت کی خوبی بہت زیادہ تھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ حکیم صاحب نے ایک طویل عمر

انسانیت، قوم اور علم کی خدمت میں کھپائی لیکن ایسی شخصیات جب اٹھ جاتی ہیں تو اپنے پیچھے اتنا بڑا خلا چھوڑ جاتیں ہیں کہ جب آپ غور کرتے ہیں تو دہشت سی طاری ہو جاتی ہے۔ مظفر حسین برنی نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب نے جو کچھ کیا وہ خواب کی طرح تھا انھوں نے خواب کو صحیح ثابت کیا۔ ہمدرد یونیورسٹی کے وائس چانسلر علاء الدین احمد اور صدر جلسہ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے تعزیت کا اظہار کیا۔ متین امروہوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا اس جلسے میں حکیم صاحب کے صاحبزادے جناب عبدالمعید صاحب، حماد احمد صاحب ہمدرد وقف پاکستان کی چیف متولیہ سعدیہ بیگم صاحبہ، حکیم صاحب کے پوتے عبدالمجید ثانی صاحب اور دلی کی برگزیدہ شخصیتیں موجود تھیں۔ اور جلسے کے آخر میں حضرت مولانا اسعد مدنی صاحب نے دعا فرمائی۔

ہم غم میں برابر شریک ہیں

اردو کے ممتاز شاعر باسط عظیم حرکت قلب بند ہو جانے سے ۱۷ر جولائی ۱۹۹۹ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۵۵ برس تھی۔

باسط عظیم کے شمار غزل کے معروف شاعروں میں ہوتا تھا چند سال قبل ان کا مجموعہ کلام حروف شائع ہوا تھا۔ جس نے ادبی حلقوں میں بڑی پزیرائی حاصل کی تھی۔

نامور ادیب میرزا ادیب انتقال کر گئے

معروف افسانہ نگار، کالم نگار اور ڈراما نگار مرزا ادیب ۳۱ر جولائی کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ مرزا ادیب کی عمر ۸۶ برس تھی۔ ان کی کتاب صحرا نورد کے خطوط کو کلاسیک کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ ۸۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ مرزا ادیب لاہور میں پیدا ہوئے اور اس شہر کی ادبی سرگرمیوں میں بھر پور شرکت کی۔ وہ طویل عرصہ تک روز نامہ نوائے وقت میں "اذکار و افکار" کے عنوان سے ہفتہ وار ادبی کالم لکھتے رہے۔ انھیں سانده کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ادیبوں شاعروں کی بڑی تعداد نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔

فرحت قمر قریشی استاد زبان وادب انگریزی جامعہ اسلامیہ سنابل کی وفات

نئی دہلی ۱۳ر اگست برادران ملت کو ہمیں یہ خبر دیتے ہوئے بے انتہا دکھ ہو رہا ہے کہ مورخہ ۱۳ر اگست ۹۹ء بروز بدھ بوقت ۱۱ بجے دن ابوالکلام آزاد اسلامک اوکننگ سینٹر نئی دہلی کی اعلیٰ عربی اسلامی درس گاہ جامعہ اسلامیہ سنابل، نئی دہلی کے انگریزی کے استاد اور ماہر تعلیم فرحت قمر قریشی ایم اے، ایم ایڈ کی حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے وفات ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مسٹر فرحت ــ سے سنٹر کے صدر مولانا عبدالحمید رحمانی کے ۲۸ سال سے گہرے تعلقات تھے۔ انھیں تعلقات کی بنیاد پر مسٹر فرحت نے گورنمنٹ سینئر سیکنڈری اسکول سے ریٹائرمنٹ کے بعد سنٹر کے اعلی تعلیمی ادارہ جامعہ اسلامیہ سنابل میں انگریزی زبان وادب کی تدریس کی ذمہ داری سنبھالی اور وہ اپنی وفات تک جامعہ اسلامیہ کے ایک کامیاب مدرس تھے

اظہار تشکر

ہمارے والد حکیم عبدالحمید مرحوم کی تعزیت کے لیے ہمارے جن بے شمار بزرگوں، کرم فرماؤں اور دوستوں نے بہ نفس نفیس خود تشریف لا کر تعزیت کی، یا تعزیتی پیغامات بھیجے، ہم ان سب کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ پورے ملک اور بیرونی ممالک سے تعزیتی خطوط کا سلسلہ جاری ہے اور ہمارے لیے رنج والم کی اس گھڑی میں فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا محال ہے اس لیے ہم اس رسالے کے ذریعہ ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جن کے ہمدردانہ اور مخلصانہ الفاظ نے ہمیں تقویت بخشی ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی مطبوعات

اشارات قلب پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم

اشارات قلب میں ڈاکٹر سید اسلم صاحب نے سادہ و سلیس زبان میں دل کی صحت، تکلیف، اسباب و متعلقہ مسائل [illegible] کے ساتھ مع ضروری ہدایات کے پیش کیے ہیں۔ قیمت -/6

مولانا ابوالکلام آزاد پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی
(فکرو نظر کی چند جہتیں)

اس کتاب میں مولانا آزدا کے افکار و خیالات اور ان کی علمی و عملی سر گرمیوں کے قومی و ملی محرکات کو نئے زوائیہ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، یقیناً ان مضامین میں قارئین کو مولانا سے متعلق بعض نئی معلومات بھی ملیں گی۔ قیمت -/60روپے

صحرا میں لفظ فضیل جعفری

فضیل جعفری کا شمار آج کے عہد کے سنجیدہ اور ذمے دار نقادوں میں ہوتا ہے۔ دور حاضر کے شاعروں پر لکھے ہوئے موصوف کے ۱۴ نہایت اہم مضامین کا مجموعہ۔ قیمت -/80

جدید ادبی تحریکات و تعبیرات
ڈاکٹر سید حامد حسین

اس مجموعے میں ۲۲ مضامین شامل ہیں جو ۱۹۶۴ سے ۱۹۹۴ء کے عرصے میں لکھے گئے ہیں اور اس دوران اردو کے ادبی منظر نامے میں جن تحریکات و تعبیرات کی کار فرمائی نظر آتی ہے ان کے بعض اہم پہلوؤں کو بحث کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔ قیمت -/51روپے

طرز دوام اختر سعید خاں

غزل کا فن نرم آنچ سے جلا پاتا ہے بھڑکتے شعلوں سے نہیں۔ وہ ایک آنسو ہے پلکوں پر ٹھہرا ہوا۔ ایک تبسم ہے ہونٹوں پر پھیلا ہوا۔ کبھی اس کے تبسم میں اشک کی نمی ہوتی ہے تو کبھی اشکوں میں تبسم کی جھلک ۔ یہ ساری خوبیاں اس شعری مجموعے میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔
قیمت -/51روپے

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ
ڈاکٹر مومن محی الدین

ڈاکٹر مومن محی الدین کا شمار جدید فارسی ادب کے اسکالر زمیں ہوتا ہے۔ موصوف نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ فارسی داستان نویسی کی تاریخ مرتب کی ہے جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔
قیمت -/45روپے

سیر کر دنیا کی غافل ڈاکٹر صغرا مہدی
(سفرنامے)

ڈاکٹر صغرا مہدی کا نام اردو دنیا میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مندرجہ بالا کتاب آپ کے پانچ سفرناموں کا مجموعہ ہے اس کتاب میں ڈاکٹر خالد محمود کا ان سفرناموں پر تبصرہ اور یوسف ناظم کا .. دلچسپ خاکہ بھی شامل ہے۔
قیمت -/51روپے

Regd. with R.N.I. at No. 4967/60 SEPTEMBER, 1999
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما نئی دہلی ۲۵

اکتوبر ۱۹۹۹ء جلد ۳۹ شمارہ ۱۰

فی پرچہ	8/:
سالانہ	80/-
سرکاری تعلیمی اداروں سے	125/:
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی جہاز)	500/-

اڈیٹر

شاہد علی خان

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

e-mail:maktaba@ndf vsnl net in

Tele Cum Fax No(011)-6910191

ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز ومزاح

جائزے

نئی مطبوعات

وابستہ (شعری مجموعہ) سلیم محی الدین -/100
وقت کی آواز (آپ بیتی) اقبال سنگھ -/100
تعبیر (افسانہ) معین جینابڑے -/150
آشا (ناول) اسلم مسعود -/150
تازگی (بچوں کے [illegible]) ڈاکٹر شرف الدین ساحل -/50
خوابوں سے تراشے ہوئے دن (شعری مجموعہ) عباس رضوی -/150
اقبال اور دانتے (تحقیق) ڈاکٹر منظر حسین -/105
سیاسیات و معاشیات ڈاکٹر ذاکر حسین -/100
تعلیمات و علمی ادارے ڈاکٹر ذاکر حسین -/150
ہندستان و ممالک غیر ڈاکٹر ذاکر حسین -/125
متفرقات ڈاکٹر ذاکر حسین -/150
مخزن فوائد۔ تالیف نکہت دہلوی۔ مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین -/200
ذاکر صاحب کے خطوط مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد -/100
نقوش ذاکر مرتبہ محمد ضیاء الدین انصاری -/75
زندگی کی موت (دو ڈرامے) ابرار الرحمٰن قدوائی -/40
رسالہ خیر خواہ مسلمان (حصہ اول۔ سوم) مولفہ۔ سید احمد خاں -/150
غزلیات میر حسن مرتبہ ڈاکٹر محمد ذکی الحق -/100
تذکرہ مشاہیر کاکوروی۔ تالیف۔ حید علوی کاکوروی۔ -/200
ترجمے، ہیریں، عرض دیدے سیمار۔ ۲۸۔ ۳۰ ستمبر ۹۴ کے مقالات -/250
تذکرہ مسرت افزا ابوالحسن امیر الدین احمد -/125
اصلاحات حدیث (مذہب) محمد الحاں -/125
ارشادات دانائے کونین (مذہب) طالب ہاشمی -/35
تقویٰ کی زندگی، کامیابی کی زندگی (مذہب) خرم مراد -/8
سلک گہر (شاعری) ریحان الدین ریحان -/150

سرورق۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند

مضراب (شاعری) اظہر غوری -/150
سمرقند و بخارا کی خونی سرگزشت (تاریخی واقعات) اعظم ہاشمی -/25
عبرت نامہ بخارا (تاریخی واقعات) نصیر بائی نحاری -/60
سعودی عرب کا عدالتی نظام (قانون) حسن عبداللہ آل شیخ -/120
ایک لڑکی (ناول) رضیہ بٹ -/150
اندھیر نگری دوم (ناول) محی الدین نواب -/25
برق کلیسا (ناول) اسلم راہی -/45
بساط رقص اول، دوم (ناول) ایم۔ اے۔ راحت -/100
تاریک سایے (ناول) ابن صفی -/40
دھاکوں کی موت (ناول) ابن صفی -/45
طوفان (ناول) دیبا خانم -/80
گھر جلا برسات میں (ناول) نار کفیل گیلانی -/100
حیدرآباد کے اردو روز ناموں کی ادبی خدمات سید ممتاز مہدی -/92
ہندستانی مسلمان (سیاست) راشد شاز -/10
مسلم سیاسی پارٹی (سیاست) راشد شاز -/15
ہندستانی مسلمان ایام گم گشتہ کے پچاس برس راشد شاز -/250
گہن (ناول) نگار عظیم -/100
میرا نور بصیرت عام کردے (مذہب) ہارون رشید علیگ -/100
گنگا بہے نہ رات (نیا ایڈیشن) (ناول) کرشن چندر -/125
آئینے اکیلے ہیں (نیا ایڈیشن) (ناول) کرشن چندر -/150
ایک گدھے کی سرگزشت (ناول) کرشن چندر -/150
عقیدہ اعجاز، قرآن تاریخ ڈاکٹر عبدالعلیم -/70
سیرت نبوی اور مستشرقین ڈاکٹر عبدالعلیم -/100
فکشن کی تنقید، چند مباحث عابد سہیل -/120
تاریخ جمالیات مجنوں گورکھپوری -/55
ایک قطرۂ خون عصمت چغتائی -/200

ایک کارڈ لکھ کر مکمل فہرست کتب طلب فرمائیں

مہمان اداریہ
ڈاکٹر ستیہ پال آنند
367,BurnettAvenue
Cambridge
Ontario Nit 1G6/ Canada

پاکستان کا ادبی منظر نامہ
عرف
''کتھا پاکستان یاترا کی''

☆مقدس انجیل کے لوقا، باب ۱۰، آیت ۱۱۔۳۲ میں اس تائب گنہگار بیٹے کی حکایت درج ہے جو ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا تھا اور جب کئی برسوں کے بعد لوٹا تو اس کے باپ نے حکم دیا کہ اس کے بیٹے کی واپسی کی خوشی میں از راہ اسراف ایک ایسی دعوت کا اہتمام کیا جائے جو اس کے قبیلے میں پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ دوسری حکایت یہ ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کے رموز جاننے والے Oracle Of Adelphi نے اپنے مندر میں داخل ہونے والے دریدہ کپڑوں میں ملبوس ایک درویش نما شخص سے کہا ''تم دو جنمے ہو، کیونکہ تم شاعر ہو'' You Are Twice Born For, You,re a Poet اجنبی نے بلا تامل جواب دیا۔ ''ہاں لیکن دونوں بار میں ہی وہ شخص ہوں، جو پیدا ہوا ہوں!''

"Yes I,m The Self same Born Twice" ۲۰رفروری سے ۲۹رمارچ تک اپنی پاکستان یاترا کے وقت میرے ذہن میں یہ دونوں حکایتیں تازہ تھیں۔ آزادی کے وقت میری عمر سولہ برس کی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ میں ۵۲ برسوں کے بن باس کے بعد اپنے گھر واپس جا رہا ہوں اور یہ یقین تھا کہ میرے گھر والے اس آوارہ بنباسی بیٹے کے لوٹنے پر ایک ایسے استقبالیے کا اہتمام کریں گے جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میں وہ ہوں جو ایک ہی زندگی میں دو بار پیدا ہوا ہوں لیکن مجھے میرے آج کے دوسرے جنم نے وہ نہیں رہنے دیا جو میں پہلے

تھا اور نہ ہی وہ بننے دیا ہے جو میں بننا چاہتا تھا!

ان باون برسوں میں پاکستان کے ساتھ میرا کیا تعلق رہا ہے؟ میں نے خود سے پوچھا۔ یادداشت پر زور دے کر ایک فہرست مرتب کی تو اردو ادب سے متعلق ۸۷ نام ایسے نکلے جن کے ساتھ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی حیلے یا وسیلے سے خط و کتابت رہی ہو یا اگر انڈیا میں نہیں، تو بیرون ملک ملاقات ہوئی ہو۔ سوچا میں یعنی پاکستان کا مسرف بیٹا جو ناراض ہو کر دور دساور چلا گیا تھا آج جب اپنے گھر لوٹ کر اپنے ۸۷ سگے سمبندھیوں سے ملوں گا تو کیا کیا آؤ بھگت نہ ہوگی۔ سوچا، مجھے اپنے پہلے جنم کی کھوج بھی کرنی چاہیے، جو وہیں کہیں ماضی کے گھپ اندھیرے میں میرے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس لیے میں امریکہ سے دہلی اور پھر وہاں سے لاہور پہنچا۔

جس نے لاہور نہیں دیکھا......

☆ پنجابی میں ایک کہاوت ہے "جس لاہور نہیں ویکھیا، اُہ جمیا ہی نہیں!" یعنی جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں نے اس کہاوت میں صرف یہ اصلاح کی "کہ جس ادیب نے لاہور دیکھا ہے لیکن احمد ندیم قاسمی صاحب اور وزیر آغا صاحب سے نہیں ملا وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔" بقول محترمہ صدیقہ بیگم، مدیرہ ادب لطیف، یہ دونوں بزرگان بصیرت، لاہور کی ادبی زندگی کے 'مُڈھ' ہیں۔ محترمہ نے اپنے باتصویر پنجابی محاورے میں ٹھیک ہی فرمایا ہے۔ "مُڈھ" پنجابی میں دو معنی ہے۔ تاگے یا رسی میں شروعات کی گانٹھ، عمارت سازی میں بنیاد کا پتھر، وغیرہ کے علاوہ اس لفظ کے معنی تناور درخت کا نچلا تنا بھی ہے۔ یہ دونوں معانی صحیح طور پر ان قابل احترام ہستیوں پر صادق آتے ہیں۔ میں اس معاملے میں نہایت خوش قسمت واقع ہوا ہوں۔ اندرون ملک جاتے ہوئے پہلی بار تو سات آٹھ دنوں کے لیے وزیر آغا میرے میزبان تھے اور میں خود احمد ندیم قاسمی صاحب کے نیاز حاصل کرنے گیا، لیکن پشاور اور پنڈی سے واپسی پر کراچی جاتے ہوئے میں کچھ دن پھر لاہور رکا۔ تو نہ صرف قاسمی صاحب اور منصورہ احمد مجھے ملنے کے لیے صدیقہ بیگم صاحبہ کی رہائش گاہ گلبدن ۱۱۱ میں تشریف لائے۔ بلکہ دوسرے دن شہر کے ایک

ریستوران میں ایک پُر تکلف دعوت بھی دی جس میں ۲۰ کے قریب اہل قلم مدعو تھے اس لیے راقم الحروف کو کوئی گلہ نہیں ہے کہ وہ پیدا نہیں ہوا۔

☆ لاہور کی ادبی زندگی کئی بالائی اور زیریں سطحوں پر متحرک ہے۔ اس میں شیرینی اور حلاوت، اخلاص اور محبت، دوست پروری اور مہمان نوازی بھی ہے اور تندی تیزی اور تلخی کا عنصر بھی ہے، جو کبھی کبھار کافی ہاؤس کی میزوں سے اٹھتے ہوئے سگرٹ کے دھوئیں کی طرح پھیل کر سارے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ مجھے موخر الذکر زیریں سطح پر متحرک زندگی کا براہ راست کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ صرف سنی سنائی باتیں سننے کو ملیں جنھیں میں نے نظر انداز کر دیا لیکن شیرینی، اخلاص اور محبت، دوست نوازی اور مہمان پروری کا میں نہ صرف معترف رہا بلکہ بعض اوقات شاکی بھی رہا۔ اس قدر محبت نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آیا میں اس کا اہل بھی ہوں یا نہیں۔ جس بات نے مجھے فوری طور پر اپنی طرف متوجہ کیا وہ لاہور جیسے بڑے شہر کی دبازت اور پھیلاؤ میں بھی وہاں کی ادبی زندگی کی وحدت ہے۔ کس نے کس کے بارے میں کیا کہا، کون ٹی وی، ریڈیو، سرکاری محکمہ اطلاعات ونشریات کے متعلقہ اہل مسند کے زیادہ قریب ہو رہا ہے یا ان سے دور جا رہا ہے، بدلتی ہوئی حکومتوں کے ساتھ ساتھ کن کن کی کرسی چھن گئی، عہدوں سے فراغت ہوئی اور کن کن کو یہ کرسیاں دی گئیں، اعزاز بخشے گئے، کون امیدواروں کی صف میں کھڑا ہے اور کون باہر ہو گیا ہے۔ اس کی اطلاع یا بدلتی ہوئی صورت حال کی خبروں یا افواہوں پر مبنی آراء، ہر دن لاہور کے ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو رہتی ہیں۔ شاید یہ حالت دہلی، لکھنو یا الہ آباد میں بھی ہو لیکن میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اتنی شدت سے نہیں ہے جتنی شدت سے میں نے اسے لاہور میں دیکھا۔

☆ اور اس بات کے باوجود لاہور کی ادبی زندگی میں ایک لمحہ بھی بے تموّج نہیں ہے۔ ''اس کڑھائی میں''، بقول ایک ''لاہوریئے'' (لاہور والے) کے ''ابال آیا ہی رہتا ہے۔'' دو قومی روزناموں یعنی ''جنگ'' اور ''نوائے وقت'' کے ادبی کالم ہوں، ادبی اڈیشن ہوں یا ادبی صحافت کی اس صنف جسے ادبی اسکنڈل کہا جا سکتا ہے، سے معمور وہ ہفتہ وار اخبار ہوں جنھیں شوق سے پڑھا جاتا ہے اور جو ہر ادبی

صحافی کی میز پر بلا ناغہ پہنچتے ہیں، ''اس کڑھائی میں واقعی ابال آیا ہی رہتا ہے۔''

☆ لیکن اس بات کے باوجود سنجیدہ لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب اور وزیر آغا صاحب دو نام ہی نہیں ہیں دو انجمنیں ہیں، جو اپنے اردو گرد درجنوں معتبر سیٹلائٹ ناموں کی ایک فہرست لیے ہوئے ہیں۔ ادبی سطح پر فعال یہ شعراء، افسانہ نگار، نقاد، انشائیہ نگار اور درس و تدریس سے متعلق محقق اور جامعات کے اساتذہ، اپنی الگ شناخت بھی رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے بھی پہچانے جاتے ہیں کہ وہ کون سی انجمنوں کے رکن ہیں، کن رسائل اور جرائد میں ان کی تخلیقات شامل ہوتی ہیں اور کن بزرگانِ بصیرت کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، دوستیاں، یقیناً زیادہ ہیں، رقابتیں نسبتاً کم ہیں اور دشمنیاں بھی شاید کچھ ہوں لیکن یہ سب اس تازیانے کا کام دیتی ہیں جو ہمرکاب گھڑ سواروں کو تیز سے تیز تر شہسواری کا ہنر سکھاتی ہیں اور اس لحاظ سے بے حد ''ویل کم'' ہیں جیسا کہ ایک کالم نگار خاتون نے راقم الحروف اور اس دوپہر کی میزبان محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ کے ساتھ جمخانہ کلب (لاہور) کی لنچ ضیافت میں بیٹھے ہوئے ارشاد فرمایا۔

☆ خواتین لاہور کی بات چل ہی نکلی ہے تو اس حوالے سے بھی کچھ 'ذکر اذکار' ہو جائے۔ بہت سی شاعر خواتین کے نام سرحد کے اس پار بھی جانے پہچانے جاتے ہیں کیونکہ وہ مشاعروں میں شرکت کے لیے اکثر و بیشتر تشریف لاتی ہیں لیکن نثر نگار خواتین سے ملاقات ادبی رسائل کے صفحات پر ہی ہو سکتی ہے اور وہ زیادہ بامعنی ہوتی ہے۔ لاہور میں میری آمد کے دوسرے ہی دن جن خواتین اہل قلم نے ڈاکٹر وزیر آغا کے دولت کدے پر مجھے ملنے کے لیے تشریف لانے کی زحمت اٹھائی، ان میں بشریٰ اعجاز، نیلم بشیر احمد، صدیقہ بیگم، سیما پیروز شامل تھیں۔ انڈیا میں شاید ایک مرد مہمان کے لیے پھولوں کا 'بوقے' لانے کا رواج نہیں ہے لیکن مجھے اس طرح بھی نوازا گیا۔ دوسرے دن میرے پریس کلب کے لیکچر میں جہاں ڈاکٹر نعیم احمد نے تعارفی کلمات سے اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے صدارتی کلمات سے میری پذیرائی کی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے ''ستیہ پال آنند کا ادبی مقام'' کے عنوان سے ایک جامع مضمون پڑھا' وہاں حاضرین میں عبدالعزیز خالد جیسے مقتدر رباعی گو شاعر کے

علاوہ خواتین میں سائرہ ہاشمی، یاسمین حمید، تجدید نو، کی مدیرہ عذرا اصغراور ان کی صاحبزادی شہبہ طراز بھی شامل تھیں۔ کچھ یہی صورت حال "بزم ہم نفساں" کی خصوصی نشست میں بھی دیکھنے کو ملی، جہاں ایک طرف برگزیدہ اہل قلم وحید قریشی، آغا سہیل، وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید شامل تھے، وہاں پچاس کے لگ بھگ حاضرین میں نصف سے زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔ معروف نثر نگار اور کالم نویس نیلم بشیر احمد کو اللہ نے بلا کی ذہانت اور اس سے بھی زیادہ ستم ظریف جملہ کش زبان دی ہے۔ جب وہ میرے کانوں کے پاس آکر زیر لب بولیں۔ "آج تو بزم ہم نفساں والیوں نے آپ کے لیے پرستان سجا دیا ہے۔" تو بذلہ سنج وزیر آغا صاحب سے نہ رہا گیا۔ بولے جنوں اور پریوں کی یہی خصوصیت ہے۔ ایک کے سینگ کاٹ دو تو مرد نظر آنے لگتا ہے۔ دوسری کے پر کاٹ دو تو عورت نظر آنے لگتی ہے۔" خوش طبعی اور تفرج کے ان لمحات سے قطع نظر اس نشست کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں ہمارے ملک کے برگزیدہ افسانہ نگار رتن سنگھ بھی شامل ہوئے جو نارووال اپنے گاؤں میں اپنے پرانے دوستوں سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے اور لاہور میں آغا سہیل صاحب کے مہمان تھے۔ خواتین اہل قلم کی افضلیت اور اولیت کی کچھ شہادت مجھے اس دعوت میں بھی نظر آئی جو منصورہ احمد صاحبہ نے میری کراچی روانگی سے کچھ گھنٹے پیشتر لاہور کے ایک ریستوراں میں دی۔ اس میں بھی جہاں احمد ندیم قاسمی صاحب اور معروف نقاد سلیم اختر صاحب کے علاوہ اساتذہ، اخبار نویس اور شعرا موجود تھے، وہاں نصف سے زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔ میرے لیے کرم فرمائی کا ایک اور مظاہرہ یہ بھی تھا کہ چونکہ میری فلائیٹ میں ابھی دو تین گھنٹے باقی تھے، یہ خواتین دعوت ختم ہونے کے بعد بھی ریستوراں کی ایک دوسری میز پر میری میزبان صدیقہ بیگم صاحبہ کے ہمراہ ہمارے ایئرپورٹ روانہ ہونے تک بیٹھی رہیں۔

☆ انگریزی ادب کی تاریخ میں (اور یورپ کی دیگر زبانوں کے ادب میں بھی) گزشتہ چار صدیوں سے ایسا ہوتا آیا ہے کہ تخلیقی فکر، تلازمہ افکار اور نظم و نثر میں تخلیقیت کی سطح پر ربع صدی یا اس سے کچھ زیادہ برس شدید حرکت و جدت سے معمور گزرتے ہیں اور پھر جیسے ابال اور اٹھان میں ایک ٹھہراؤ سا آجاتا ہے، جو رفتہ رفتہ

جمود اور تعطل میں بدل جاتا ہے۔ زرخیزی اور ناپیداواری کے وقفوں کا یہ الٹ پھیر ایک قدرتی عمل ہے۔ پاکستان کے حالیہ برسوں کے ادب پر ایک نظر ڈالیں تو ایسے لگتا ہے کہ سیاسی اور معاشی بحران کے کئی ادوار کے باوجود لکھنے والے اپنی تخم ریزی میں بے حد فعال رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے اور میانے درجے کے ہفتہ وار، ماہانہ، سہ ماہی اور سال میں ایک یا دو بار چھپنے والے ادبی، سماجی اور فلمی رسالے یا کتابی سلسلے یا ڈائجسٹ میرے اندازے کے مطابق ایک سو پچاس سے اوپر ہیں۔ یہ تعداد ۱۹۴۷ء کے برٹش انڈیا میں چھپنے والے رسالوں سے کچھ زیادہ ہے۔ اسی طرح کاغذ کی گرانی کے باوجود کتابوں کی اشاعت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ سال بہ سال یہ تعداد بڑھتی ہی رہی ہے۔

☆ ایک دوسرا امر جس پر ایک بار پھر انگریزی ادب کی تاریخ کے حوالے سے ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے، وہ خواتین اہل قلم کی اولیت اور برتریت ہے۔ گذشتہ صدی میں بھی ایک دور ایسا آیا تھا جب انگلستان کے ادبی افق پر کچھ نام ابھر کر صف اول میں لیے جانے لگے تھے۔ جارج ایلیٹ، برونٹے سسٹرز اور جین آسٹن وغیرہ کچھ نام اس ضمن میں لیے جا سکتے ہیں۔ میرا اندازہ اگر غلط اعداد و شمار پر مبنی نہیں ہے تو بعینہ یہ حالت اس وقت پاکستان میں ہے۔ کسی بھی ناشر کی مطبوعات کی فہرست اٹھا کر دیکھیں یا کسی بھی ادبی، نیم ادبی اور مجلسی رسالے کے کسی شمارے کی فہرست مضامین پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ خواتین قلم کار اگر نصف سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ ''راجہ گدھ'' کے بعد ایسے لگتا تھا کہ ناول کی راہ پر یہ سنگ میل خواتین ناول نویسوں کے ایک پورے قافلے کو اذن سفر دے گا۔ ایسا تو نہیں ہوا لیکن شاعری اور افسانہ نگاری کی راہوں پر یہ قافلہ شد و مد سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اصناف شعر، غزل اور نظم دونوں میں خواتین پیش رو ہیں۔ ایک پدری سماج میں جو بنیاد پرستی کی یلغار سے پسپا ہوتے ہوئے زیادہ پدری بنتا جا رہا ہے ان میں سے بیشتر شاعرات کی شروعات Protest Poetry ہوئی۔ (پاکستان میں نہ جانے کیوں اسے مزاحمتی شاعری کہا گیا ہے؟) بہر حال یہ مزاحمتی شاعری اپنا احتجاجی اور باغیانہ رول بخوبی ادا کر چکنے کے بعد اب سفر کے اس پڑاؤ تک پہنچ گئی ہے جہاں جذبات

واحساسات میں شعور وادراک نے گھر کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ایک نہایت مبارک فال ہے کیونکہ شاعرات کو صرف نسائیت کے حوالے سے پرکھنا بھی پدری سماج میں مرد فوقیت کا ایک سمبل ہے۔ بہر حال ذکر خواتین کی اس تعداد کا تھا جس کے تحت وہ اعداد و شمار اس بات پر دال ہیں کہ پاکستان کے ادبی منظر نامے میں اب انھیں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

☆ راقم الحروف نے اپنے لاہور اور راولپنڈی قیام کے دوران کچھ ناشرین کی فہرست کتب اٹھا کر دیکھیں اور دس بارہ رسائل کے تازہ شماروں کی فہرست مضامین پر نظر دوڑائی تو پچاس ساٹھ کے لگ بھگ نام خواتین قلم کاروں کے نظر آئے۔ ان میں اکثریت پنجابی نژاد تھیں۔ برتریت اور فوقیت کا لحاظ رکھے بغیر یعنی ایک Random Order میں وہ نام میں نے درج ذیل کر دیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بہت سے نام جو اس فہرست میں ہونے چاہیے تھے، وہ نہیں ہیں اور کچھ نام ایسے ہیں جو ابھی اپنی ادبی شناخت نہیں قائم کر سکے۔ بہر حال یہ بھی نمونہ مشتے از خروارے ہے:

☆ کشور ناہید، بشریٰ اعجاز، بشریٰ رحمان، منصورہ احمد، یاسمین حمید، عذرا اصغر، شبہ طراز، پروین عاطف، نیلم بشیر احمد، شبنم شکیل، نگار سجاد، ماہ طلعت زاہدی، عرفانہ عزیز، شاہدہ لطیف، زاہدہ حنا، سیدہ حنا، شہناز شورو، سیما شکیب، ساجدہ فرحت، سیما سراج، صابرہ جیلانی، صبیحہ صبا، زینت فردوس، فوزیہ چوہدری، رخشندہ نوید، آصفہ نشاط، شیریں حسن، عائشہ عباسی، ریحانہ روحی، طاہرہ یاسمین، غزالہ خاکوانی، پروین طاہر، شاہین مفتی، ثریا شہاب، یاسمین صہبا، مسرت جبیں زیبا، بہار النسا بہار، سیدہ عبیدہ، گل سیدہ، صفیہ راگ، اینہ عنبریں، نسیم گل، شاہدہ ناز، عذرا بروہی، فاطمہ حسن، نسیم وضاحت، نزہت حنیف، سیما پیروز۔

☆ ان خواتین میں نسائیت، کے عنصر کے علاوہ وہ کیا قدر مشترک ہے جو انھیں ان کے طریق کار کے حوالے سے ایک لڑی میں پرودے؟ میں نے تین خواتین شعراء منصورہ احمد، شاہین مفتی اور یاسمین حمید کی کتابیں الگ سے ایک بار پھر پڑھ کر مغربی شعریات کے طریق کار سے کچھ پیمانوں کے اطلاق کے بعد یہ دیکھا

کہ غزلیات سے قطع نظران کی نظموں میں گھر، گلی، محلہ، گاؤں اور قصبہ کی سطحوں پر زندگی کی گوناگوں جہتوں کی امیجری کا جامہ پہنانے والی ڈکشن، بولی، کلمات، مقامی اور بھاشائی وضع الفاظ اور اس کے علاوہ نسائی سابقوں اور لاحقوں کے استعمال لفظی ابجدی اور صوتی توشیحہ و تجنیس، اجزائے کلام میں کہیں کہیں تصریفی اور قواعدی ماڈلوں سے گریز، وہ قدر مشترک ہے۔ انفرادی سطح پر تینوں میں الگ الگ جہتیں ہیں۔ منصورہ کے ہاں 'بیٹی' ہونے کے حوالے سے ہیر کے ورلاپ کی امیجری بھی ہے اور ذہنی ہجرت کے صحرا میں بھٹکتی ہوئی محبوبہ کا ''بین'' (Keening) بھی ہے۔ شاہین تلطیفِ عبارت کی قائل ہیں۔ شعور رکھتی ہیں قوائے احساس سے کچھ زیادہ قوائے فکر پر بھروسہ کرتی ہیں۔ یاسمین حمید ابھی غزل کی ڈکشن کے اختصار و بلاغت سے دامن کش نہیں ہوئیں۔ ایجاز، اختصار و تلخیص کی قائل ہیں، لیکن امیجری کی سطح پر پیکر تراشی کے ہنر میں ژولیدگی کے باوجود قابل فہم ہیں۔ ان میں جو قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ تینوں خواتین شعرا ایمجسٹ ہیں اور اس لحاظ سے اپنے ہم عصر مرد شعرا، نصیر احمد ناصر، رفیق سندیلوی اور علی محمد فرشی سے مختلف نہیں ہیں۔

☆ ۱۹۸۷ء میں جنوبی ایشیا کی شاعری کے بارے میں ایسٹرن اسٹڈی سینٹر کے پراجیکٹ پر کام کرتے ہوئے میرے ساتھ کام کرنے والے اسکالرز اور میں خود ایک حیرت آمیز خوشی سے دوچار تب ہوئے جب ہم نے پنڈی اسلام آباد اور لاہور سے تعلق رکھنے والے کچھ شعرا میں ایک نئی جہت کی شروعات کے آثار دیکھے۔ یہ جہت ان کی نظم نگاری میں کلاسیکی، نیم کلاسیکی اور نقلی کلاسیکی Pseudo Classical غزل استعمال ہونے والی لفظیات، تشبیہات اور استعارات سے مکمل آزادی تو تھی ہی، امیجری کے حوالے سے وہ تازگی بھی تھی جو زندگی اور نیچر سے براہ راست تمثالوں اور پیکروں کو نظموں سے گوندھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ امیجری کا یہ استعمال غزل سے سراسر مختلف تھا۔ غیر آرائشی تھا اور تہہ داری کا فن رکھتا تھا۔ امیج، یعنی ایک کے بعد دوسرا امیج، ایک Cluster کی شکل میں ابھر کر، جہت در جہت معانی کو خود میں سمیٹتے ہوئے، نظم کی مرکزی شاخ پر پھولوں کی طرح کھلتے ہیں اور آخر میں ایک مرکزی سمبل میں تبدیل ہو کر پوری نظم کو پُر معنی بنا دیتے ہیں۔ یہ شعری تصویر کشی

انگلستان میں اس صدی کی تیسری دہائی میں ابھرنے والی امیجسٹ اسکول کی دوسری
نسل کے طریق کار سے مختلف نہیں تھی۔ راقم الحروف نے تب یعنی ۱۹۸۷ء سے
۱۹۹۲ء تک کی اپنی تنقیدی تحریروں میں نہ صرف اس امر کی نشاندہی کی بلکہ تین
نوجوان شاعروں، نصیر احمد ناصر، رفیق سندیلوی اور علی محمد فرشی کا بالخصوص ذکر کیا، اور
اردو میں اس ''امیجسٹ اسکول'' کو خوش آمدید کہا۔ آج یہ تینوں شعرا اپنی امیجری کے
استعمال کے طریق کار میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اس راستے پر
بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ مجھے لاہور اور پنڈی میں یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ جس
شروعات کی نشاندہی میں نے چودہ پندرہ برس پہلے کی تھی وہ اب تحریک کی صورت
اختیار کر چکی ہے اور اس ضمن میں ان تین Trend-Setters کے ساتھ چلنے والے
بارہ پندرہ دیگر نوجوان شعرا کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔

شہر افسانہ

☆ اسلام آباد راولپنڈی دو ملحقہ شہروں کے کمپلیکس کو اگر شہر افسانہ، کہا
جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کچھ تاریخی حوالوں کے علاوہ میرے پاس یہ باور کرنے کے لیے
کوئی وجوہ نہیں تھیں کہ ایسا کیوں ہے۔ نہ صرف شاعروں کی نسبت افسانہ نگاروں کی
تعداد ان دو شہروں میں زیادہ تھی اور دو سینئر لکھنے والوں رشید امجد اور منشا یاد کے علاوہ
جن سے کچھ اور پر بہت اچھا لکھنے والے نوجوان افسانہ نگار بھی تھے بلکہ یہ دیکھ کر
خوشی ہوئی کہ مختلف نشستوں میں شعر خوانی اور اس پر تنقید کے علاوہ افسانہ خوانی اور
اس پر تنقید ایک لازمی امر ہے۔ مہمان خصوصی کے طور پر مجھے حلقہ ارباب ذوق،
اسلام آباد اور حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کی الگ الگ نشستوں میں شامل ہونے،
تقریر کرنے اور احباب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان دو رسمی نشستوں کے علاوہ جن
احباب کے دولت کدوں پر لنچ یا عشائیہ کی صورت میں باقاعدہ بحث و مباحثہ، نظم
خوانی اور سوال و جواب کی نشستیں منعقد کی گئیں ان میں معروف افسانہ نگار پروفیسر
رشید امجد، شاعر اور نقاد رفیق سندیلوی، شاعرہ اور نثر نگار پروین طاہر، افسانہ نگار اور
شاعر حمید شاہد، ''تجدید نو'' کی مدیرہ عذرا اصغر اور معروف امیجسٹ شاعر علی محمد فرشی

شامل تھے۔ ان سات نشستوں میں ساٹھ ستر کے لگ بھگ اہل قلم سے گفت وشنید کا موقع ملا۔ ہر محفل میں مجھے یہ احساس ہوا کہ ضیا جالندھری جیسے بزرگ اور دیگر ہم عمر اور نوجوان شاعروں کی موجودگی کے باوجود افسانہ نگاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید دو منفرد سینئر افسانہ نگاروں کی موجودگی ہے۔ پروفیسر رشید امجد اہل بصیرت ہیں، ان کے وسیع مطالعے نے انھیں اردو سے کچھ اوپر اٹھ کر عالمی سطح پر سوچنے کا موقع دیا ہے۔ اس بات کے باوجود کہ ان کے افسانوں کے انگریزی ترجمے کا مجموعہ مترجم کے کمان فن کا شاکی رہا اور بیرون پاکستان قارئین یا نقاد حضرات کی توجہ اپنی جانب مبذول نہیں کروا سکا، وہ بے حد فعال افسانہ نگار ہیں۔ ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں جدیدیت کا اثر قبول کرنے اور روایتی بیانیہ سے ہٹ کر شعوری رو کے اسلوب کو اختیار کرنے سے انھیں انفرادیت ملی ہے اور درجنوں نوجوان افسانہ نگاروں نے ان سے یہ سبق پڑھا ہے، البتہ کچھ عرصے سے بیانیہ پلاٹ کے نوکیلے زاویے اور صحیح خدوخال سے شناخت ہو سکنے والے کردار ان کے افسانوں میں ایک بار پھر سے در آئے ہیں۔ منشا یاد صاحب دوسرے سینئر افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے یلدرم پریم چند کی راسخ روایت کو کبھی تلانجلی نہیں دی اور جدیدیت کے شوریدہ سر سیلاب میں بہنے سے ہمیشہ انکاری رہے۔

☆ منشا یاد صاحب نے بھی حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کی نشست میں جس کی صدارت فیض اور ن م راشد کی نسل سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر ضیا جالندھری کر رہے تھے، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی ''بھارتی تحریکوں'' کے بارے میں مجھ سے استفسار کیا کہ کیا روایتی بیانیہ مضبوط شناخت کے کردار اور پلاٹ کی طرف بازرفت سماجی حقیقت نگاری کی طرف مراجعت نہیں ہے اور کیا مابعد جدیدیت کے بھارتی رہنما اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ جدیدیت کی مہمل نگاری کو رفع دفع کرنے کے عمل میں وہ اپنی پرانی روایت کی تصدیق و تائید کر رہے ہیں۔ ''جنگ فورم'' میں مجھ سے انٹرویو لینے والے اصحاب میں علی محمد فرشی اور انوار فطرت کے علاوہ رشید امجد صاحب بھی شامل تھے۔ انھوں نے بھی اس بحث کا آغاز کیا اور جب جواب میں مجھے یہ کہنا پڑا کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بحث میں پڑے بغیر بھی

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جدیدیت کی تحریک کے انتہا پسند Lunatic Fringe کی مہملیت کو نہ صرف قاری اور نقاد ہی بلکہ تخلیق کار بھی اب رد کر چکا ہے تو انھوں نے حامی بھری کہ یہ صحیح ہے۔

☆ بات پنڈی اسلام آباد کمپلیکس کے ''شہر افسانہ'' ہونے کے بارے میں تھی۔ان دو معتبر ناموں کے علاوہ ''جنم جنم'' کے مصنف حمید شاہد، پروین طاہر، زاہد چغتائی، سجاد فطرت اور روزنامہ 'جنگ' کے میگزین سیکشن سے منسلک انوار فطرت نہایت فعال شخصیات ہیں طاہر راٹھور، سجاد انور، عذرا اصغر، مدیرہ ''تجدید نو'' ڈاکٹر عالیہ امام اور ماہنامہ ''چہار سو'' کے مدیر گلزار جاویدان دو شہروں کی ادبی زندگی کو نثر نگاری کی طرف مائل کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔قریب ہی میر پور (آزاد کشمیر) کی جدید ٹاؤن شپ ہے، جہاں معروف شاعر اور سہ ماہی ''تسطیر'' کے مدیر نصیر احمد ناصر رہتے ہیں۔یہاں اردو افسانہ کی ایک اہم شخصیت اقامت پذیر ہے۔ میر پور ٹاؤن شپ میں اپنے دو دن کے قیام میں معروف شاعر مشتاق شاد کے علاوہ محمد الیاس سے ملاقات ہوئی جن کے افسانوں کے کئی مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔محمد الیاس پر اس وقت بھی جدیدیت کا رنگ نہیں چڑھا جب ہندستان کی دیکھا دیکھی پاکستان کے کچھ افسانہ نگار بھی اس رو میں بہہ گئے تھے۔وہ تب بھی اپنے آس پاس کی زندگی سے چمار، بڑھئی، ملا، عیسائی خاکروب وغیرہ کرداروں کو چن کر، اپنی سماجی بصیرت کی روشنی کا ہالہ ان پر مرکوز کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ پاکستان کے نوجوان افسانہ نگاروں میں جو چند اہم نام ہیں یعنی کوئٹہ سے آغا گل، حیدر آباد سندھ سے شہناز شورو اور میر پور سے محمد الیاس، اس سے دنیائے اردو کو بہت توقعات ہیں۔

اردو کے دو جزیرے

☆ لاہور میں آٹھ دن کے قیام اور آدھ درجن تقاریب میں بطور مہمان خصوصی شرکت کے بعد مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں نے پنجاب (انڈیا) میں زندگی کی چوتھائی صدی گزارنے کے دوران میں جس رویے سے شعوری طور اجتناب

کیا ہے، وہ رویہ پنجاب (پاکستان) میں ایک تحریک اختیار کر چکا ہے۔ مجھے لاہور میں ہی مختلف اہل کتاب، احباب نے تحفتاً جو کتابیں پیش کیں وہ تعداد میں پچاس سے اوپر تھیں اور ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی لاہور چھاؤنی کی قیام گاہ میں میرے سونے کے کمرے میں، میز پر میرے زیر مطالعہ رہیں۔ میں نے اردو کے بدلتے ہوئے روپ کے آثار نظم میں کچھ کم لیکن نثر میں بہت زیادہ دیکھے۔ ان پنجابی الفاظ کا استعمال تو اب عام ہو گیا ہے، جن کا نعم البدل اردو میں نہیں ہے یا جن کے معانی کی جہتیں اردو کے متبادل الفاظ سے ترسیل کی سطح پر قاری تک نہیں پہنچتیں۔ یہ رویہ اب تحریک کی صورت اختیار کر گیا ہے لیکن بیانیہ میں اضافت اور ترکیب کے لوازم سے مکمل گریز ایک خصوصی امر تھا جس نے مجھے متوجہ کیا۔

☆ پنڈی، اسلام آباد پہنچ کر اس مسئلے پر غور و خوض بھی ہوا اور کچھ دلچسپ باتیں بھی سننے کو ملیں۔ اس بات کے باوجود کہ مجھے سیاسی سطح پر پنجابی سب نیشنلزم Sub Nationalism یا اردو کے غلبے کو لسانی نو آبادیاتی رویہ Linguistic Colonialism کہنے والے لوگ نظر نہیں آئے۔ اردو کے پنجابی نژاد اہل قلم گزشتہ نصف صدی میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر اردو کو پاکستان کے اس خطے میں پنپنا ہے تو اسے اپنا خصوصی لکھنوی، دہلوی یا ''بھارتی'' کردار چھوڑنا ہوگا اور پنجاب کی لسانی حقیقت کو مدنظر رکھ کر اپنے Puritanism کو تلانجلی دیتے ہوئے کم از کم لفظیات کی سطح پر ان پنجابی، پشتو اور بلوچی الفاظ کو قبول کرنا ہوگا جن سے دامن بچا کر چلتے ہوئے اردو نے اپنی ''پاکدامنی'' کا ثبوت دیا ہے۔ انھیں ''اہل زبان'' کے اس رویے سے چڑ تھی جس کے تحت لطیفے کی سطح پر ہی سہی، اس رویے نے علامہ اقبال کو بھی نہیں بخشا۔ حکایت ہے کہ ایک اہل زبان (شاید رشید احمد صدیقی) جب علامہ اقبال سے ملاقات کے بعد لوٹے تو کسی نے ان سے پوچھا کیا گفت و شنید ہوئی، تو آپ نے فرمایا'' کچھ زیادہ نہیں۔ بیشتر وقت میں جی ہاں کرتا رہا اور اقبال ہاں جی، ہاں جی کرتے رہے۔ ——— یہ لطیفہ خود میں اس بات پر دال ہے کہ روایتی نقطہ نظر اس بات کو حتمی طور پر تسلیم کرنے سے کترا تا رہا ہے کہ 'صحیح' 'اردو' کے علاوہ بھی اردو کی کوئی دیگر علاقائی شاخ اپنا الگ ادبی وجود رکھ سکتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر

آغا صاحب سے آٹھ دن' رات کے بارہ ایک بجے تک مختلف موضوعات پر میری گفتگو میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ ایک قدرتی لسانی عمل ہے اور اس سے دامن کشی ممکن نہیں ہے۔ اگر اب تک ایسا ہوا ہے تو Inward Looking رویے نے اردو کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ پنڈی اسلام آباد حلقہ ارباب ذوق کی نشستوں میں، لاہور میں پریس کلب کی خصوصی نشست اور "بزم ہم نفساں" کی نشست میں، میر پور کی نشست میں اور پشاور میں اباسین آرٹ کونسل کی خصوصی نشست اور اپنی پشاور یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں تقریر کے دوران جب راقم الحروف نے اردو کے مستقبل کے تناظر میں اس مسئلے پر بحث کا آغاز کیا تو تقریباً سبھی اہل قلم اس بات پر متفق نظر آئے کہ آنے والی صدی کے پہلے بیس پچیس برسوں میں ہی اردو کی لفظیات میں یہ اضافہ ایک مبارک فال ثابت ہوگا۔

☆ بہر حال اس رویے کی تردید کراچی پہنچتے ہی ہوگئی۔ انجمن ترقی اردو کی خصوصی نشست جو راقم الحروف کی آمد کے سلسلے میں منعقد کی گئی، دو غیر رسمی دعوتیں جو جمیل الدین عالی صاحب نے جمخانہ کلب اور کراچی کلب میں دیں اور جن میں حمایت علی شاعر، سحر انصاری، شوکت صدیقی، فرمان فتح پوری کے علاوہ کچھ دیگر برگزیدہ شخصیتیں بھی موجود تھیں۔ کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں راقم الحروف کی تقریر کے بعد بحث و مباحثہ کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامیات کی پروفیسر نگار سجاد کے دولت کدے پر دعوت اور نشست اور بحث و مباحثہ ڈاکٹر فہیم اعظمی مدیر "صریر" اور احمد ہمیش مدیر "تشکیل" کے دولت کدوں پر نشستوں میں گفت و شنید۔ ان سب کے علاوہ ذاتی سطح پر دو درجن سے اوپر "اردو اسپیکنگ" شاعروں اور نثر نگاروں سے گفتگو نے مجھے جو تاثر دیا، وہ لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد اور پشاور سے کچھ مختلف اور کچھ متضاد تھا۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ ایک طرف کراچی اور دوسری طرف پنجاب کے دیگر شہر، ادبی جزیروں کی طرح ہیں جو ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچانے کے لیے پریس کے مرہون منت ہیں۔ اردو زبان کے اس بدلتے ہوئے منظر نامے سے کراچی کے اہل قلم ناواقف تھے، یہ بات نہیں ہے۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھے لیکن مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ اس سے خوش نہیں تھے۔ ایک دانشور

نے تو یہ بھی کہا۔ ''حضرت زبان میں یہ طوائف الملوکی کیا رنگ لائے گی ۔ اسے دیکھنے سے پہلے آنکھیں بند ہو جائیں تو بہتر ہے۔'' مشفق خواجہ صاحب باغ و بہار شخصیت ہیں ۔ ان کا وہ گھر جو کتابوں ، مخطوطات اور تصویروں کا عجائب گھر ہے ، ہماری بے حد پُر خلوص ملاقات کی مخلوط ''رزم گاہ'' اور ''بزم گاہ'' تھا۔ انھوں نے اپنے کیمرے سے راقم الحروف کی متعدد تصاویر کھینچیں اور بعد میں قریبی ریستوراں میں اپنے ہم زلف کے ساتھ پُر تکلف لنچ بھی کھلایا) جب میں نے اس سلسلے میں ان سے رجوع کیا اور انجمن سے منسلک ایک بزرگ کا مندرجہ بالا ریمارک دہرایا تو انھوں نے کہا۔ ''ان آنکھوں کا بند ہو جانا ہی اچھا ہے۔'' اس گنجلک یا سادہ جملے سے خامہ بگوش مجھ تک کیا پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ جانیں یا اللہ جانے!

☆ لاہور، پنڈی اسلام آباد، پشاور سے مطبوعہ کتب میں یا پنجابی نژاد اہل قلم کی کراچی سے مطبوعہ تصنیفات میں کچھ الفاظ جو میری توجہ کا مرکز بنے اور جو میں خود استعمال کرنے سے کترا تا رہا ہوں۔ نمونہ مشتے از خروارے کے طور پر درج ذیل ہیں

گبھرو، ٹھیار، مُرکی، ٹوٹا، چھلنی، منجی، مدھانی چیتر، ہاڑ، بھدرے، پھنڈی، کھم، مہاٹھ، رمبا، کیچ، تندور گھری، کرتی، بکھانے، بلشکارا، ہلا ہو، واہ بھلا، منہ متھا، شالا، سپنی، چڑی، رُل جانا، مک جانا، بکلی مارنا، خیری آنا، بورجی آئیاں نوں، پھلاہی، ٹاہلی، توت، ہھکڑ بادشاہ، باہی، ڈھولا، پُھن، جانی، تھل، تریلیاں، ترپوسی، گونگلو، ریتا، کفنی، زہر (مؤنث) روٹی شوٹی، گھورا (بمعنی غصے سے دیکھا) رتا لال، سوّ الال، پیار کہانی، نجی سونیا، شوم، وصل شربت ست رنگی ست مصی، بالکا، واری وٹا، اری، کے لیے نی، ارے کے لیے اوئے......

☆ یہ ان الفاظ کی فہرست ہے جو میں نے بجنسہ نظم و نثر کی ان کتابوں سے اخذ کیے جن کی ورق گردانی میں نے سرسری نظر سے کی ۔ ان کے علاوہ وہ سیکڑوں الفاظ ہیں جو آج سے نصف صدی پیشتر کی اردو میں نہیں ملتے لیکن پنجابی معاشرے کے تناظر میں ان کا رواج ناگزیر ہے۔ ''جنگ'' اور ''نوائے وقت'' کے لاہور اور راولپنڈی ایڈیشن بمقابلہ کراچی ایڈیشن اس حقیقت کی زندہ مثال ہیں کہ پنجاب کے اڈیشنوں کی خبروں کی زبان (اور کسی حد تک اداریوں کی زبان بھی) لوکل ''بولی ٹھولی

" سے متاثر ہوئی ہے جبکہ کراچی اڈیشن کی اردو ابھی تک پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے کی اردو ہے اور ابھی تک، پاک دامن ہے۔

شہر فراز

☆امریکہ میں رہتے ہوئے جب بھی مجھے اپنے بچپن کے دوست یونس صابر کا پشاور سے خط ملتا تھا تو دائیں طرف اوپر "پشاور" کے بجائے "شہر فراز" لکھا ہوا دیکھ کر ایک حیرت آمیز خوشی ہوتی تھی لیکن اس میں حیرت کا عنصر زیادہ اور خوشی کا کچھ کم ہوتا تھا۔ فراز اچھے شاعر ہیں لیکن بقول ممتاز مفتی مرحوم "غزل گو شاعروں کا کیا بھروسہ ہے؟ کل تک عبدالحمید عدم، سیف الدین سیف وغیرہ کا طوطی بولتا رہا۔ آج انھیں کون پوچھتا ہے؟" ہندستان اور پاکستان میں کسی ایک برس میں شاید ایک لاکھ سے زائد غزل کے اشعار موزوں کیے جاتے ہوں اور اس جگالی میں کچھ لقمے اچھے بھی ہو سکتے ہیں لیکن چبائے ہوئے لقموں کا کیا بھروسہ کہ کس "عظیم شاعر" کے نعمت خانے سے مستعار لیے گئے ہیں۔ خیر ذکر تھا شہر فراز پشاور کو جو "پُرشاور" ہے یعنی بہادروں کا، سورماؤں کا، مردوں کا شہر ہے۔ ان جنگجو قبیلوں کا شہر ہے، جن کا ایک فرزند پورس (پورشیہ بمعنی بہادر) بھی تھا جس نے سکندرِ اعظم کا مقابلہ کیا تھا۔ پرشاور اور خیبر (سنسکرت "کھشیہ ور" آسان راستہ، درّہ) تین ہزار برس کی تاریخ کا محاصرہ کرتے ہیں۔ فراز دس برس، بیس برس یا اس سے کچھ زیادہ۔ اس تاریخ کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ بہر حال اپنے بچپن کے دوستوں یونس صابر، ارباب یوسف، رجا چشتی، تاج سعید کی دعوت پر میں وہاں پہنچا۔ تو اسی شام اباسین آرٹ کونسل میں، محسن احسان، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، خاطر غزنوی، ماجد سرحدی اور ٹی وی ڈرامہ نگار ڈاکٹر آئیزک کے علاوہ اردو، ہندکو (یعنی پشاوری پنجابی) اور پشتو کے تیس چالیس اہلِ قلم کو اپنا منتظر پایا۔ دوسرے دن پشاور یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں ایم اے اور ایم فل کے اردو طلبہ اور یونی ورسٹی اساتذہ کے روبرو تقریر تھی۔ دونوں تقریبوں میں جو کچھ نکتے ابھر کر سامنے آئے ان سے یہ پتا چلا کہ نوشہرہ اور پشاور (صوبہ سرحد اور کوئٹہ (بلوچستان) پاکستان کے دور افتادہ شہر ہوتے ہوئے بھی ادبی

جوش وخروش میں کسی دوسرے شہر سے پیچھے نہیں ہیں۔

☆ تاج سعید کا سہ ماہی ''جریدہ'' اس لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے کہ برصغیر میں ریڈیو اور ٹی ڈرامے کی صنف پر ایک سیر حاصل خاص نمبر پیش کرنے والا، پشاور سے نکلنے والا یہ واحد جریدہ ہے۔ پشاور اس لحاظ سے بھی ایک معتبر ادبی حیثیت رکھتا ہے کہ خاطر غزنوی، محسن احسان اور فراز پاکستان کے شعری ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں اور موخرالذکر کو آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری یونی ورسٹی نے پیش کی ہے۔ بہرحال ان دو تقاریب میں میری تقریر کا موضوع تقابلی ادب تھا اور اردو کے حوالے سے پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب کے تقابلی مطالعے کے بارے میں جو سوالات پشاور یونی ورٹی کے پٹھان اور قبائلی طلبہ اور طالبات نے مجھ سے کیے اور جس طریقے سے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے اس تقریب کو ایک پُرمعنی مصاحبہ میں بدل کر مجھے دل کھول کر اردو کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بات کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ پاکستان کے ایک بیک واٹر علاقے میں بھی اردو اسی اہتمام سے پڑھائی جاتی ہے جس طرح کراچی جیسے اردو بولنے والے شہر میں، تقابلی ادب کے حوالے سے جب اک طالبہ نے مجھ سے یہ پوچھا کہ اسے ایم فل کی سطح پر پشتو شاعر خوشحال خاں خٹک اور ایک اردو شاعر کے تقابلی مطالعے کا موضوع منتخب کرنے میں شاید دشواری ہو، تو برصغیر کی پوری درسی اور تدریسی زندگی زیرِ بحث آئی کہ کیا وجہ ہے ابھی تک ہم انڈیا اور پاکستان میں اردو ادب کو صرف اردو کے حوالے سے دیکھنے پر بضد ہیں اور علاقائی زبانوں کے ادب سے یا لوک ادب سے کوئی علاقہ رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

☆ پشاور یونی ورسٹی کے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، اپنے قلم کی فراوانی (جس نے انھیں ''کالم کلامیاں'' جیسی ادبی صحافت کی کتاب اور ''گنگا جمنا کے دیس میں'' جیسا سفر نامہ لکھنے کا ظرف دیا ہے) کی وجہ سے شہر کی ادبی زندگی کی روح رواں ہیں۔ کالم نویسی ''پشاور نامہ'' اور ''دل پشوری'' کی وساطت سے تو ہزاروں قارئین تک پہنچتی ہے لیکن ان کی تقاریر بذات خود ان کے کالم نویسی کے فن کی طرح ہی دل پشوری یعنی دل کو خوش کرتی ہیں۔ تاج سعید علیل تھے اور اسپتال میں داخل تھے لیکن

ان کی بیگم زیتون بانو نے جو پشتو کی صف اول کی ادیبہ ہیں فون پر مجھے پشاور آنے پر خوش آمدید کہا۔ گذشتہ نصف صدی سے جن پشاوری احباب سے میری رسم و راہ رہی ہے۔ ان میں کچھ نام سرفہرست ہیں۔ فارغ بخاری تو اب نہیں رہے لیکن بزرگ شاعر میجر یوسف رجا چشتی، یونس صابر کی طرح ہی میرے میزبان تھے۔ محسن احسان اور ماجد سرحدی میرے دو دن کے قیام میں میرے ساتھ ساتھ رہے۔ خاطر غزنوی آرٹ کونسل کی خصوصی نشست میں موجود تھے اور میرے ساتھ بیٹھ کر اور اسٹیج سے میرے بارے میں چند کلمات کہہ کر مجھے عزت بخشی۔ میرے ہر جملے کو، خالص اردو لہجے کو، بات کرنے کے انداز کو، زبان کے اتار چڑھاؤ، الفاظ کے انتخاب اور بیٹھنے، کھڑا ہونے، چلنے اور کھانے پینے کے طور طریقوں کو سراہا گیا۔ ڈاکٹر اعوان نے اپنے کالم "پشاور نامہ" (روزانہ "آج") میں لکھا۔ "ڈاکٹر ستیہ پال آنند یہاں آکر خود بھی حیران ہوئے اور دوسروں کو بھی حیران کر گئے۔ انگریزی ادبیات اور فلسفے کے پی ایچ ڈی، انگریزی، ہندی، اردو اور پنجابی چار زبانوں کے ادیب، شاعر اور مصنف ناول نگار، افسانہ نویس، مترجم اور نقاد صنف غزل کے دشمن اور حریف ساری زندگی نظمیں لکھتے رہے، غالب کے پرستار اقبال کو عظیم شاعر ماننے والے، غیر متعصب، روشن خیال اور عالمی سوچوں کے مالک، پال صاحب پشاور میں صرف تیس گھنٹے ٹھہرے مگر یہاں کے بے تموج ثقافتی جوہڑ میں تموّج پیدا کر گئے۔ انھوں نے جب مدحت رسولؐ میں اپنی نعت سنائی تو کتنی آنکھوں کو پُرنم کر گئے۔ ہمارے ساتھ یونی ورسٹی میں بیٹھ کر انھوں نے موٹے گوشت کے چپلی کباب بڑے ذوق وشوق سے کھائے تو مزید حیران کر گئے۔ ادھر ڈاکٹر آنند تدبر، تہور، فکر و نظر سے معمور ادھر اُن کے کلاس فیلو اور دوست پروفیسر محسن احسان اور پروفیسر خاطر غزنوی پذیرائی کے لیے موجود تھے۔ شہر بھر کے ادیب، دانشور، ادبا اور فضلا چشم براہ تھے۔ وہ پھولوں کی طرح آئے اور مہکار پھیلا کر چلے گئے۔۔ "

کراچی کراچی اور کرچی

☆ حکایت ہے کہ حضرت زکریاؑ دشمنوں سے بچتے بچاتے ایک درخت کے

پاس پہنچے اور پناہ کی درخواست کی۔ درخت نے اپنا مضبوط تنا شق کر دیا اور حضرت زکریا کے اس میں پناہ لیتے ہی تنا پھر ثابت وسالم ہو گیا۔ شومئی قسمت سے ان کے لباس دریدہ کی ایک دھجی تنے کے باہر لٹکتی ہوئی رہ گئی۔ غنیم کو ان کی جائے پناہ کا علم ہوتے ہی درخت پر آری چلانے کا حکم صادر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے تنا کاٹ دیا گیا۔ حضرت زکریا کا جسد خاکی تو وصل سے ہم کنار ہوا ہی، درخت کی زندگی بھی اکارت ہوئی .. کراچی پہنچنے پر اور پہلے دن ہی ڈاکٹر فہیم اعظمی کے دولت کدے پر اخبارات دیکھنے کے بعد یہ حکایت بہت یاد آتی۔ وہیں اسی دن تحریر کردہ میری نظم ''پناہ گزیں'' اس حکایت کی بازیافت اور عہد حاضر کے کراچی شہر پر اس کے اطلاق کا، فارم ایٹ، رکھتی ہے لیکن روزانہ اخبارات کی سرخیوں کے باوجود میں جن علاقوں میں گھومتا رہا، جن لوگوں سے ملتا رہا، جن ادبی اور سماجی تقاریب میں شامل رہا، مجھے کراچی میں درخت کا تنا کٹ جانے کے آثار دکھائی نہیں دیے، کراچی کی گہما گہمی، رونق، بازاروں میں، دکانوں اور فٹ پاتھوں پر، ہوٹلوں اور کلبوں میں، ساحل سمندر پر لوگوں کا ایک جم غفیر، عافیت کی میٹرو پالٹین زندگی گزارتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ وہ کراچی ہے جو میں نے دیکھا۔ شاید زیر زمیں گولی باری، پولس تشدد، قتل وخوں، اغوا اور تاوان کی وارداتوں کا بھی ایک کراچی ہو، لیکن مجھے وہ نظر نہیں آیا۔

☆ تیسرا کراچی ادبی زندگی کا کراچی ہے اور اس کراچی کی ادبی زندگی کی تاریخ کو انجمن ترقی اردو کی تاریخ سے الگ رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ بابائے اردو کا کام کس حد تک آگے بڑھا ہے، اسے انجمن کے دفاتر کتب خانے، مطبوعات اور انجمن کے ذیلی پروگراموں بشمولیت ڈکشنری پراجیکٹ جس کے ڈائریکٹر سحر انصاری صاحب ہیں، کو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ جمیل الدین عالی انجمن کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی شخصیت کی مہران سب پر ثبت کرتے ہیں۔ راقم الحروف تو ایک معمولی اہل قلم تھا لیکن یہ بات سننے میں آئی کہ انجمن کے عہدہ داران شہر میں وسادر سے آنے والے کسی بھی مہمان کے چشم براہ رہتے ہیں تاکہ ان کے خیالات سے مستفید ہوا جا سکے۔ مجھے انجمن کے دفتر میں کئی بار مدعو کیا گیا۔ عالی صاحب اور دیگر ارباب بست وکشا امراؤ طارق صاحب، ادیب سہیل صاحب کے ساتھ ورکنگ لنچ

مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی۔ پرانی و ریدہ کتب اور مخطوطات کی حفاظت کے بارے میں سبھی نے مجھ سے پوچھا کہ مغربی ممالک میں انھیں کیسے مائیکروفش Micro Fische میں منتقل کیا جاتا ہے۔ خدا بخش لائبریری پٹنے کا ذکر کئی بار آیا۔ بے حد مشتاق تھا کہ وہ کمرہ، میز اور کرسی دیکھ سکوں، جس میں بابائے اردو بیٹھتے تھے لیکن مایوسی ہوئی۔ بابائے اردو کے زمانے میں انجمن کا دفتر ایک پرانی بلڈنگ میں تھا۔ انجمن کے میٹنگ ہال میں رہی نشست جس میں مجھے مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا، میرے لیے بے حد افتخار کا باعث تھی۔ چالیس کے لگ بھگ مہمانوں میں دنیائے شعر کی خاتون اول ادا جعفری صاحبہ بھی موجود تھیں۔ ادا آپا سے میری ایک بھرپور ملاقات پہلے امریکہ میں ہو چکی تھی۔ میری تقریر میں، عالمی تناظر میں اردو، تقابلی ادب کے حوالے سے درس و تدریس اور تحقیق، دو بنیادی موضوعات تھے لیکن گفتگو اور بحث مباحثہ صنف غزل پر میرے منافی موقف سے شروع ہوا اور ساختیات پس ساختیات، جدیدیت میں مہمل نگاری کا فروغ اور زوال ہندستان میں اردو کا مستقبل، تارکین وطن کی سائیکی نثری نظم کا جواز وغیرہ سے ہوتا ہوا میری نظموں تک پہنچا اور کہا گیا کہ اردو میں گزشتہ دس برسوں میں تین سو سے زائد نظموں کے خالق نے شاید اردو کے شعری ادب میں ایک نئے وجدان کے چلن کو شروع کیا ہے۔ پروفیسر فرمان فتح پوری اور پروفیسر سحر انصاری کے علاوہ مقتدر اہل قلم، اساتذہ، ادبی جرائد کے مدیران اور اخبار نویسوں نے شرکت کی۔ انجمن کی خصوصی نشست کے مقابلے میں کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں راقم الحروف کی تقریر کے بعد بحث و مباحثہ کچھ تشنہ رہا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور کچھ دیگر سینئر اساتذہ کے ریٹائر ہو جانے کے بعد ڈاکٹر حنیف فوق جیسی معتبر شخصیت کی موجودگی کے باوجود شعبہ کچھ بے جان سا نظر آیا۔ یونی ورسٹی کے کیمپس پر ہی ایک اور رسمی تقریب اور دعوت شعبہ اسلامیات کی پروفیسر نگار سجاد صاحبہ کے دولت کدے پر منعقد ہوئی۔ اس میں بھی موقر اہل قلم نے شرکت کی۔ معروف شاعر اور یونی ورسٹی کے سابقہ پرو وائس چانسلر پیرزادہ قاسم اور ترقی پسند دانشور ڈاکٹر ریاض صدیقی موجود تھے اور راقم الحروف کے بارے میں آفرین و ستائش کے رسمی کلمات کے علاوہ انھوں نے کئی

موضوعات پر سیر حاصل بحث کی۔ ماہنامہ 'پیش رفت' کی مدیرہ سیدہ نقوی نے باتصویر انٹرویو ریکارڈ کیا۔ دو دیگر تقریبات احمد ہمیش مدیر تشکیل، اور ڈاکٹر فہیم اعظمی مدیر 'صریر' (جو کراچی میں قیام کے دوران میرے میزبان بھی تھے) کے دولت کدوں پر ہوئیں۔ یہ اس لحاظ سے زیادہ اہم تھیں کہ ان میں ادبی جرائد کے مدیران کے علاوہ اہل قلم شاعروں اور ادیبوں نے ایک بڑی تعداد میں شرکت کی۔ موخر الذکر تقریب میں لاہور سے آئے ہوئے سلیم اختر صاحب بھی شریک ہوئے اور اردو تنقید کے حوالے سے ایک نہایت پرمغز تقریر کی۔ راغب شکیب مدیر 'ارتکاز' نعیم آروی' مبین مرزا، مدیر مکالمہ، احمد ہمیش، احمد زین الدین، سحر انصاری، شبنم رومانی، حسنین کاظمی، ریحان صدیقی، نگار سجاد، آصف فرخی، ڈاکٹر حنیف فوق اور بیگم فوق، ادیب سہیل، امراؤ طارق، نوش نقوی، انجلا ہمیش، سید معراج جامی اور کئی دوسرے احباب تھے جو شریک ہوئے۔

☆ جوش ملیح آبادی کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے اور آج ہم انھیں کیوں بھلا بیٹھے ہیں؟ جوش صدی تقریبات کے سلسلے میں منعقدہ سیمیناروں کی لڑی میں لنڈن اور انڈیا میں ہوئے سیمیناروں کے بعد کراچی سیمینار میں بھی یہ سعی مسلسل جاری رہی کہ اپنے وقتوں کے اس بے حد مقبول اور بلند آہنگ شاعر کو تاریخ ادب کے صفحات پر زندہ کیا جائے۔ کراچی سیمینار اس لحاظ سے کچھ زیادہ اہم تھا کہ اپنے پیدائشی وطن کے بعد نہ معلوم کن مجبوریوں کے تحت پاکستان میں از سر نو آباد ہونے پر جوش مرحوم کے کچھ برس تو بے حد عمدہ گزرے لیکن رفتہ رفتہ وہ ''کاریڈورز آف پاور'' سے دور ہوتے گئے اور زندگی کے آخری برسوں میں اس بات کے بے حد شاکی رہے کہ انھیں قدم قدم پر ذلیل کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ یہ امر واقعی ہے کہ ان کی موت کی خبر کو بھی سرکاری ذرائع ابلاغ نے ایک سطر میں محیط کر دیا اس لیے ایک پنجابی نژاد اہل قلم کا یہ ارشاد جو انھوں نے راقم الحروف کے ساتھ جوش سیمینار میں کھانے کے وقفے کے دوران کیا بجا ہے کہ ''یہ سیمینار کراچی میں ہی ممکن تھا لاہور یا اسلام آباد میں نہیں!'' دیگر متنازعہ فیہ امور کے علاوہ ایک سوال یہ بھی ابھرا کہ آیا جوش کی Rehabilitation ترقی پسند تحریک کی باز آفرینی اور نو آبادکاری کے مسئلے سے منسلک

ہے؟ اور کیا یہ اقدام جدیدیت کی تحریک کے ماند پڑ جانے کے باعث کھوئے ہوئے علاقے کو واپس قبضے میں لینے کے لیے کیے جا رہے ہیں؟ یہ حسن اتفاق تھا کہ ڈاکٹر حنیف فوق کے ساتھ راقم الحروف بھی جس سیشن میں پریذیڈیم کے ممبر کے طور پر اسٹیج پر تھا، اسی میں چار احباب یعنی پاکستان سے پروفیسر محسن احسان، پروفیسر فرمان فتح پوری نے اور انڈیا سے پروفیسر شارب رودولوی اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الہ آباد) نے اپنے تحقیقی مقالے پڑھے اور راقم الحروف کو بھی ان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کا موقع میسر ہوا۔ شام کو بین اقوامی مشاعرے میں شرکت سے تو میرا پرہیز کرنا ضروری تھا، لیکن اس سیمینار نے پاکستان کے طول و عرض سے آئے ہوئے اکابرین ادب سے ملاقات کے کئی مواقع فراہم کیے۔ بہت سے حضرات دوسرے دن مجھ سے ملنے کے لیے میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ نوجوان افسانہ نگار خاتون شہناز شورو حیدر آباد سندھ سے کراچی صرف مجھ سے ملنے کی خاطر چند گھنٹوں کے لیے تشریف لائیں اور اردو افسانہ کے پاکستانی اور ہندستانی منظر نامے پر بات چیت کی۔

دو جنمے شخص کی کتھا

☆ وہ شخص جو دو بار پیدا ہوا تھا اور جس نے ''اوریکل آف اڈیلفی'' کو ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا کہ وہ Self Same Born ہے۔ جب اپنے پہلے جنم کی تلاش میں اپنے گاؤں (کوٹ سارنگ، ضلع چکوال) پہنچا تو اس نے واقعی اسے ماضی کے گھپ اندھیرے میں اپنی ہتھیلی پر ایک جلتا ہوا دیا رکھے ہوئے گھر کی دہلیز پر انتظار کرتے پایا۔ ماضی اور حال نے سر جوڑ کر کیا باتیں کیں۔ باون برسوں کے انتظار کے بعد کن کن یادوں نے اس کی آنکھوں کو پُرنم کیا۔ گاؤں کی مٹی میں حال اور ماضی کے پُرملن کے آنسوؤں کے موتی کیسے جذب ہوئے۔ سیڑھیوں سے لحظہ بہ لحظہ اترتی ہوئی دھوپ سے کیا باتیں ہوئیں۔ دروازوں نے وا ہو کر اسے کیسے خوش آمدید کہا، ہوا نے اس کے رخسار سہلا کر کیسے اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ بار بار آیا کرے گا۔ یہ ایک دوسری کتھا ہے، جو صرف نظم میں ہی کہی جا سکتی تھی۔

ستیہ پال آنند

(علی محمد فرشی کے لیے)

واپسی

تنگ پتھریلی گلی نے چونک کر آواز دی
شاید وہ ہی ہے!
دھوپ، جو آہستگی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے
بے دم سی، شاید تھک گئی تھی، ایک لحظہ رک گئی
کیا واقعی وہ آ رہا ہے؟
ضعف کی ماری ہوئی بوڑھی ہوا نے پوپلے منہ سے کہا
میں اس کی خوشبو سونگھ سکتی ہوں
وہی نٹ کھٹ ہے، واپس آ رہا ہے!
بوڑھے دروازوں کی آنکھیں بند تھیں
کچھ بھی نظر آتا نہیں، شاید وہی ہو!
اس کے بچپن کا کھلنڈرا دوست
اک کنچا، جو پچھلے ساٹھ برسوں سے
گلی کے ایک کونے میں منوں مٹی کے نیچے سو رہا تھا
کلبلا کر چیخ اٹھا، المدد! کوئی مجھے باہر نکالو!

.. ہاں، وہی ہے، دھوپ بولی، پر وہ بچہ
جس کو میں پہچانتی تھی، آنے والے مرد کے دل میں
کہیں گم ہو گیا ہے

بوڑھے دروازوں نے آنکھیں کھول دیں
پہچانتے ہیں ہم اسے! لڑکا وہی ہے
باپ کی مانند لمبا ہو گیا ہے!
تنگ پتھریلی گلی بولی: "میں کتنی 'پیڑھیوں' سے
ننھے قدموں کے بڑے ہوتے ہوئے سب نقش
اپنے جسم پر سنبھال کر رکھتی رہی ہوں
چیختا کچا منوں مٹی کے نیچے رو دیا۔ میں کیسے نکلوں؟
اور پھر بوڑھی ہوا جو دم بخودی رک گئی تھی
کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ آؤ۔ ذرا دیکھیں
تمھارے گال، آنکھیں، بال، چہرہ تو وہی ہے
اتنی مدت تک کہاں گم ہو گئے تھے؟
اب کہو، آیا کرو گے؟

باون برسوں کے بعد اپنے آبائی گاؤں کوٹ سارنگ، تحصیل تلہ گنگ، ضلع لوال (پاکستان) میں لکھی گئی۔

شاہین
1328 Potter Dr
Manotick ON K4M 1C6

اختیار

بہار کی یہ دل آویز شام
جس کی طرف
قدم اٹھائے ہیں میں نے
کہ اس سے ہاتھ ملاؤں
اور اک شگفتہ شناسائی کی بنا رکھوں
پھر اپنی خانہ بدوشی کی مشترک لے پر
اُسے گلاب بکف خیمۂ جنوں تک لاؤں
کچھ اُس کی خیر خبر پوچھوں
اور کچھ اپنی کہوں
کہوں کہ کتنے ہی پت جھڑ کے موسم آئے گئے
مگر ان آنکھوں کی سحر البیا نیاں نہ گئیں
کہوں کہ گرچہ عناصر نے تہمتیں باندھیں
جنوں زدوں کی مگر سخت جانیاں نہ گئیں
کہوں کہ ایک ہیں اندیشے سب مرے تیرے
کہوں الگ نہیں جینے کے ڈھب مرے تیرے
کہوں کہ ایک سے ہیں روز و شب مرے تیرے
کہوں کہ ملتے ہیں نام و نسب مرے تیرے
کہوں ازل سے جنوں کا روبار ہے اپنا
ورائے جبر بھی اک اختیار ہے اپنا

شمس الرحمٰن فاروقی

سید حامد: اس کی ہر بات دل نشیں اس کا ہر تیر دل کشا٭

جولائی ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا ہم لوگوں نے ہائی اسکول پاس کر کے میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور نام میں لکھایا تھا۔ "ہم لوگوں" سے بطور خاص میری مراد چار دوستوں سے ہے۔ اظہار احمد عثمانی، عبدالحی خاں، ابرار حسین خاں (جو بعد میں ابرار اعظمی بنے) اور میں۔ افسوس کہ اظہار اور عبدالحی اب اس دنیا میں نہیں۔ ان دنوں ہم چاروں کے دل میں ادب کے لیے امنگ اور دنیا کی اصلاح کرنے، دنیا میں کچھ کام کر جانے کی ہوس تھی۔ ہماری صلاحیتوں اور امکانات کا اندازہ لگانا اب مشکل ہے۔ بس اس بات سے کچھ قیاس کر لیجیے کہ میں خود کو چاروں میں کم ترین سمجھتا تھا اور انٹر پاس کرتے کرتے ہم چاروں جیسے تیسے، کچے پکے افسانہ نگار، شاعر اور نقاد بن چکے تھے۔ تین کو چھپنے چھپانے کا روگ بھی لگ چکا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں، خاص کر اردو بولنے والے مسلمانوں اور شمالی ہند کے مسلمانوں پر عجب خوف و ہراس طاری تھا۔ مسلمان طبقے کے بڑے افسر، لیڈر، اور زیادہ تر صاحب ثروت لوگ ایک ایک کر کے پاکستان چلے گئے تھے (میں "بھاگ گئے تھے" لکھتے لکھتے رہ گیا۔ اور چودھری خلیق الزمان کے اچانک، اور اپنے دعووں کے خلاف، پاکستان چلے جانے کو ہم میں سے اکثر نے بھاگنے، یا یہاں کے مسلمانوں کو دیدہ و دانستہ مصیبت میں چھوڑ کر چلے جانے سے تعبیر کیا ہی تھا۔) دور دور تک با اثر، مسلمان دوست مسلمان دکھائی نہ دیتا تھا۔ کانگریسی مسلمان، اور خاص کر مقامی کانگریسی مسلمان لیڈروں کی کوئی وقعت نہ تھی، نہ اپنوں میں اور نہ بیگانوں

٭ اس کی ہر بات دل نشین ہوگی
اس کا ہر تیر دل کشا ہوگا (سید حامد)

میں۔صوبائی اور مرکزی حکومتوں میں جو دو چار مسلمان وزرا تھے، وہ اپنی جگہ پر ہزار موثر اور مسلم دوست رہے ہوں، لیکن ہم لوگوں کو ان کا وجود عدم ایک نظر آتا تھا اور ہمارے ہندو ساتھی اور دوست تو برملا ان سب کو مسلم لیگی اور پاکستانی کہا کرتے تھے۔ مجھے ایک واقعہ نہیں بھولتا۔ عام اہل اسلام اور خاص کر کانگریسی مسلمانوں پر لعن طعن، سب و شتم، اور ہماری طرف سے کم زور جوابات کے دوران ہمارے مخالف ساتھی نے کہا کہ "اور یہ جو ابوالکلام آزاد ہیں، تم ان کی کلائی پکڑ کر دیکھو تو ان کی نبض پر پاکستان ہی لکھا ہوا دیکھو گے۔"

میں اپنے بزرگوں کا حال نہیں جانتا، لیکن ہم لوگوں کے دلوں میں ان دنوں کانگریسی اور جمعیتہ العلمائی مسلمان لیڈروں بلکہ تمام ہی ہندستانی مسلمان لیڈروں (مثلاً کمیونسٹ صاحبان میں ڈاکٹر زین العابدین احمد وغیرہ) کا کوئی احترام نہ تھا۔ مولانا آزاد وغیرہ کی نیت پر ہمیں کوئی شک ہرگز نہ تھا، لیکن ۱۹۴۷ میں اچانک ہندستانی مسلمان جس قعر مذلت، جوئے حقارت میں ڈھکیل دیے گئے تھے، اس سے نکلنے کی راہ ہمارے خیال میں ان لوگوں کو نہ معلوم تھی۔ دو چار مسلمان افسر جو باقی تھے وہ پوری کوشش کرتے تھے کہ ہندوؤں سے نزدیک اور مسلمانوں سے دور رہیں اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے یا کسی مظلوم مسلمان کو انصاف دلانے کے لیے کوشاں ہونے کا الزام ان پر نہ آنے پائے۔ مسلمان افسروں میں یہ حالت بہت دیر تک رہی، اور بعضوں میں آج بھی باقی ہے۔ ان کے خیال میں سیکولر ہونے کے معنی ہیں مسلمان مخالف ہونا۔ سید صدیق حسن جیسوں کو استثنائی امتیاز ضرور حاصل ہے، لیکن عام طور پر ہمارے افسروں کا رنگ مرکزی حکومت کے ایک مسلمان جوائنٹ سکریٹری صاحب کا تھا جن کے مکان پر ۱۹۶۲ کی بھی دیوالی میں دیے جلے تھے، حالانکہ ہند چین جنگ میں ملک کے نقصان عظیم کے ماتم میں اس سال اکثر ہندوؤں نے (کم سے کم دلی میں، جہاں ان دنوں میں برسر کار تھا۔) دیوالی نہیں منائی تھی۔ اس شام میں اپنے ایک افسر اعلا سے ملنے گیا تھا جو محض نام کے ہندو تھے، ورنہ رنگ کے علاوہ وہ ہر بات میں انگریز تھے۔ ان کی کوٹھی پر دیے نہیں جلے تھے لیکن ان کے مسلمان پڑوسی جوائنٹ سکریٹری صاحب نے اپنے گھر پر روشنی کر رکھی تھی۔

انگریزیت کے ولدادہ ہندو افسر کو یہ خوف نہ تھا کہ اگر میں چراغاں نہ کروں گا تو کوئی مجھے انگریز کہہ دے گا لیکن ہمارے مسلمان دوست کو خوف تھا کہ اگر میں نے دیوالی کا دیا نہ جلایا تو کوئی مجھے Anti National کہہ دے گا۔

میں بات کی دھن میں بارہ چودہ برس آگے نکل آیا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ آزادی کے فوراً بعد والے برسوں میں اردو والے مسلمان خاص کر متوسط طبقے کے مسلمان، خود کو بالکل بے دست و پا دیکھتے تھے۔ کسی مسلمان کا ڈپٹی کلکٹر، کلکٹر ہو جانا تو بڑی بات تھی، تحصیلدار، انسپکٹر اور داروغہ ہونا بھی بام عروج پر پہنچنا سمجھا جاتا تھا۔ میرے دو عم زاد بھائی تحصیلدار تھے اور دونوں کا جلد جلد تبادلہ ہوتا، دونوں کو بار بار نائب تحصیل دار بنا کر دور دور بھیج دیا جاتا۔ وہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کا خواب کیا دیکھتے، تحصیلدار کے عہدے پر واپس آجانے کے لیے اللہ آمین کرتے رہتے تھے۔ میرے نانا خان بہادر مولوی محمد نظیر مرحوم مشرقی یوپی کے بڑے آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۴۶ کے الیکشن میں وہ بنارس کے دیہاتی حلقے سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ایم۔ ایل۔ اے ہوگئے۔ وہ پاکستان نہیں گئے اور تاعمر بنارس کے عوام، خاص کر مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے۔ ذاتی اور خاندانی وجاہت کے باوجود آزادی کے بعد ان کا اثر حکومت کے ایوانوں میں بہت کم رہ گیا۔ وہ میرے والد مرحوم کو ان کی جائز اور حق پر مبنی ترقی نہ دلا سکے۔ ۱۹۵۱ میں میرے والد گورکھپور کے ایک دیہات میں سرکاری ڈیوٹی کے دوران فرقہ وارانہ فسادیوں میں پھنس کر بری طرح زخمی ہوئے ور بمشکل ان کی جان بچ سکی۔ میرے نانا مرحوم نے اس وقت کے ڈائرکٹر ایجوکیشن (جو اتفاقاً مسلمان تھے) کو لکھا کہ ان کا تبادلہ انسپکٹر کی نوکری کی جگہ گورنمنٹ اسکول ں کر دیا جائے۔ نانا مرحوم کی سفارش اور دوسری کوششیں اس سلسلے میں ناکام ئیں۔ میرے والد کو مصیبت اور تعب کے بدلے معاوضہ یا علاج معالجہ کیا ملتا محکمہ لیمات سے ہمدردی کا ایک خط بھی نہ آیا۔

ان دنوں ہم لوگوں کے دلوں میں کچھ کام کر جانے، یا ادیب بننے کی ہوس تو ا، لیکن دنیاوی عز و جاہ حاصل کرنے، یونیورسٹی پروفیسر، افسر، ڈاکٹر یا انجینئر بننے ، بارے میں ہمارے کوئی منصوبے نہ تھے۔ منصوبے کہاں سے ہوتے، توقع بلکہ

امید بھی نہ تھی۔ (تقدیر کی ستم ظریفی یہ کہ ہم چاروں میں سب سے خراب مستقبل اظہار عثمانی کا نکلا۔ وہ پاکستان چلا گیا اور کسی معمولی کالج میں لکچرر ہی بن سکا۔ پھر موٹر کار کے حادثے میں اس کی بے وقت موت ہوگئی۔ عبدالحی خاں مشہور ادیب تو نہ بنے، لیکن ڈاکٹر ضرور بن گئے۔ ابرار اعظمی اپنے وطن ہی میں ایک بڑے کالج کے صدر شعبہ تعلیم ہوئے اور جدید شاعروں میں بھی ان کی حیثیت قائم ہوئی۔)

ہمارے استاد غلام مصطفیٰ خاں رشیدی ہم لوگوں کو انگریزی زبان وادب کے نکات سکھاتے اور ہماری نظر میں سب سے زیادہ لائق استاد یا شخص وہی تھا جو انگریزی اچھی لکھے اور روانی سے بول سکے۔ رشیدی صاحب میں یہ دونوں صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے۔ علی گڑھ کی روایات کے اچھے نمایندے اور خوش مذاق شاعر بھی تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان دنوں ہم لوگوں کے لیے غلام مصطفیٰ خاں رشیدی Zolemodel کی حیثیت رکھتے تھے۔

میں نے اتنی تفصیل کچھ تو اس لیے بیان کی ہے کہ یہ باتیں محفوظ ہو جائیں، اور کچھ اس لیے کہ اس طویل پس منظری بیانیہ کے بغیر آپ اس تاثر اور تاثیر کا احساس نہیں کر سکتے جو سید حامد کی شخصیت نے ہم لوگوں کی شخصیت اور افتاد ذہن پر قائم کیا۔ وہ دن ہم لوگوں کی خاص کر میری، اثر پذیری کے دن تھے اور مجھے کسی ایسی ہستی کی سخت کمی محسوس ہوتی تھی جس میں وہ صفات سب موجود ہوں جو میرے والد میرے اندر دیکھنا چاہتے تھے۔ انٹر میڈیٹ فرسٹ ایر کے طالب علم کی بساط ہی کیا، اور پھر ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد کے وہ شب وروز۔ مجھے کہیں سے کوئی توقع نہ تھی کہ اب مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہو سکیں گے جن میں علم، جاہ، وجاہت، سب یکجا ہوں اور اگر شخصیت میں دل آویزی بھی ہو تو کیا پوچھنا تھا۔ ان دنوں ہم لوگوں نے یہ سن کر ایک عجب سنسنی اور افتخار محسوس کیا کہ ایک نوجوان پی۔ سی۔ ایس افسر یہاں ڈپٹی ریجنل فوڈ کنٹرولر ہو کر آئے ہیں۔ وہ نہ صرف مسلمان ہیں، بلکہ پابند صوم وصلوٰۃ بھی ہیں۔ وہ نہ صرف افسر ہیں بلکہ انگریزی اور فارسی دو مضامین میں ایم اے فرسٹ کلاس ہیں۔ وہ نہ صرف دو مضامین میں ایم۔ اے ہیں، بلکہ اعلا درجے کے شاعر بھی ہیں وہ نہ صرف شاعر ہیں بلکہ اسپورٹس مین بھی ہیں اور ہاکی، ٹینس، خوب

ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انتہائی خوب صورت، خوش وضع اور خوش اخلاق شخص ہیں۔ ان کا نام سید حامد ہے۔

سید حامد۔ اس نام میں بھی عجب دلکشی تھی۔ سر سید کے گھرانے جیسا نام تھا، سادہ، مختصر اور معنی خیز۔ سید محمد، سید احمد، سید حامد، سید محمود، یہ سب نام بیک وقت ذہن میں گونج اٹھے۔ ان میں شان محبوبی بھی تھی اور شان جلالی بھی۔ یاد نہیں آتا کہ میں نے سید حامد کو سب سے پہلے کہاں دیکھا، کسی جلسے میں یا کسی بزرگ کے یہاں، جن سے ان کے اور میرے والد مرحوم کے مشترک مراسم تھے۔ اغلب یہ ہے کہ کالج کے کسی جلسے ہی میں دیکھا ہوگا، کیوں کہ سید حامد ہمارے کالج میں بے تکلف آجاتے تھے۔ انھیں اس بات سے کوئی خوف بظاہر نہ تھا کہ جس کالج کے نام کے ساتھ ''اسلامیہ'' لگا ہوا ہے وہاں ان کا آنا جانا ارباب اقتدار کی ناراضگی کا سبب ہوگا۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جس شخص یا جس چیز کے بہت تذکرے ہم نے غائبانہ سن رکھے ہوں، جب اس سے مواجہہ ہوتا ہے تو کسی نہ کسی سطح پر توقعات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ یعنی توقع عام طور پر پوری نہیں ہوتی، یا پھر وہ شخص یا شے اس تصور سے مختلف ہوتی ہے جو ہمارے ذہن یا تخیل نے اس کے بارے میں قائم کیا تھا۔ بعض اوقات تھوڑی بہت رسم وراہ یا مانوسیت کے بعد احساس ہوتا ہے کہ پہلا تاثر مبنی برانصاف نہ تھا۔ تاج محل کو پہلی بار دیکھ کر اکثر لوگوں کو تھوڑی سی مایوسی، تھوڑی سی فریب شکستگی محسوس ہوتی ہے، کہ یہ عمارت دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہلانے کی مستحق تو نہ تھی لیکن ذرا سی دیر دیکھتے رہیں تو پہلے تاثرات سارے کے سارے بیک وقت، اور تیزی سے، منہدم ہونے لگتے ہیں اور تاج محل کی مکمل عمارت ہی نہیں، بلکہ ہر چیز، تفصیل بھی اور مجموعی تاثیر بھی، مسحور کن اور تمام دنیا سے زیادہ دلکش اور حیرت انگیز معلوم ہونے لگتی ہے، اور پھر یہ تاثر تاحیات قائم رہتا ہے اور سیکڑوں بار باز دید کے باوجود زائل نہیں ہوتا۔ (کم از کم میرے ساتھ تو یہی معاملہ ہوا۔) لیکن سید حامد کو میں نے جیسا سوچا اور سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ ان کا قد متوسط سے بہت زیادہ نہ تھا، لیکن چھریرے بدن کے باعث نکلتا ہوا سا لگتا تھا۔ بہت متناسب ناک نقشہ، ذرا بھورا رنگ لیے ہوئے، تھوڑے بہت گھونگر والے بال (اس زمانے میں گریٹا

گاربو Greta Garbo کا اتنا شہرہ تھا کہ ہم لوگ بھی تصویروں کے ذریعہ اس سے صورت آشنا ہو گئے تھے۔ سید حامد کے بالوں کا رنگ اور انداز ہم لوگوں کو گریٹا گاربو سا لگتا تھا۔) متبسم آنکھیں۔ اردو نہایت درست لیکن ذرا فارسی آمیز۔ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے تھے لیکن بڑے اعتماد کے ساتھ۔ جامہ زیبی اور لباس میں نفاست، ان سب پر مستزاد۔ شیروانی بھی پہنتے تھے، حالانکہ مسلمان افسران میں اس کا چلن گھٹ رہا تھا۔ ایک بار میرے والد مرحوم کسی دوست سے ملنے گئے، میں بھی ہم رکاب تھا۔ تھوڑی دیر میں سید حامد بھی آ گئے۔ گرمی کے دن تھے، وہ سفید ٹھنڈی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ ان کی خوش خلقی اور انکسار کا ڈھنگ اور سفید شیروانی کا رنگ دونوں اس گرم موسم میں ٹھنڈے چھینٹے کی طرح معلوم ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد میرے والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ دیکھو شرفا اور بلند مرتبہ لوگوں کے یہ طور ہوتے ہیں۔ لوفروں کا سا انداز نہیں ہوتا۔ میں خود کو لوفر تو نہ سمجھتا تھا (لوفری کی ہمت ہی نہ تھی) لیکن اس بات کا یقین اس وقت مجھے بالکل تھا کہ میں سید حامد کی صوری اور معنوی خوبیوں کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔

کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ سید حامد پی۔ سی۔ ایس سے بڑھ کر آئی۔ اے۔ ایس ہو گئے۔ اس قدر کم عمری میں اس ترقی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے آئی۔ اے۔ ایس کی ہنگامی بھرتی کا امتحان بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا تھا۔ بہت بعد میں، کوئی تیس سال بعد، سنا کہ ان کا تقرر ۱۹۴۶ء کے آئی۔ سی۔ ایس والوں کے ساتھ کا مانا گیا تھا۔ اس طرح وہ طویل مدت تک ہندستان کے بزرگ ترین آئی۔ اے۔ ایس افسر رہے۔ اب یہ بھی تقدیر کی ستم ظریفی اور ہمارے نظام کا کھوٹ نہیں تو اور کیا ہے کہ غیر معمولی اہلیت، اعلا کارکردگی اور مکمل ایمان داری کے ساتھ ساتھ اتنی بزرگی کے باوجود حکومت ہند نے انھیں سکریٹری کا عہدہ نہ دیا۔ میں نے درجنوں آئی۔ اے۔ ایس اور غیر آئی۔ اے۔ ایس سکریٹری صاحبان کے ساتھ کام کیا ہے، یا ان کی

---

۱ انگریزی لفظ Loafer ان دنوں اردو میں بد چلن شخص، خاص کر بد چلن اور بد شوق طالب علم کے لیے بہت مستعمل تھا۔ اب غالباً نہیں بولا جاتا۔ بہت بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انگریزی میں اس کے یہ معنی نہیں تو تعجب اور تھوڑا سا افسوس ہوا، کیوں کہ اس لفظ کے آہنگ میں کچھ بد شوقی کا سا شائبہ ضرور ہے۔

کارکردگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ بڑے افسوس کے ساتھ کہتا ہوں اس اعلا عہدے پر پہنچنے والے اور کئی سال تک کام کرنے والے اکثر حضرات سید حامد کے برابر تو کیا، اوسط درجے کی صلاحیت سے زیادہ کے حامل نہ تھے۔ خیر، سید حامد کی اشک شوئی اس طرح کردی گئی کہ نوکری سے وظیفہ یابی کے بعد انھیں اسٹاف سلیکشن کمیشن حکومت ہند کا چیئرمین بنادیا گیا۔ یہاں عہدہ تو وہی ایڈیشنل سکریٹری کا تھا، لیکن مدت ملازمت چار سال (یعنی باسٹھ کی عمر تک) تھی۔ ایک دو سال وہاں کام کرنے کے بعد سید حامد کو علی گڑھ کا وائس چانسلر بنادیا گیا۔ سرکاری تقرر عام طور پر غلط آدمی کے یا غلط جگہ پر ہوتے ہیں۔ سید حامد کو علی گڑھ کا وائس چانسلر بنایا جانا صحیح آدمی کے صحیح جگہ پر تقرر کی شاذ مثالوں میں سے ایک تھا۔ یہاں قدرت کی یہ مصلحت بھی ظاہر ہوئی کہ اگر وہ سکریٹری مقرر ہو گئے ہوتے تو وائس چانسلری کے لیے غالباً نہ منتخب کیے جاتے اور علی گڑھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے جو ہندستان گیر مقام حاصل کیا، اور قوم و ملت کی جو خدمت انھوں نے علی گڑھ کے ذریعہ انجام دی، وہ ان سے سرانجام نہ ہوتی۔ علی گڑھ نے ان کی خاطر خواہ قدر نہ کی لیکن اس کا شکوہ انھیں غالباً نہیں، اور مجھے تو بالکل نہیں۔ علی گڑھ میں گذشتہ کئی برسوں سے وہی وائس چانسلر مقبول اور ہردل عزیز ہوئے [illegible] جنھوں نے قدم قدم پر مفاہمت کی ہے۔ علی گڑھ کا وائس چانسلر اگر ایمان دار اور لائق ہے تو عموماً نامقبول ہی ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ علی گڑھ کا ہر نئے وائس چانسلر کے ساتھ محدود مدت کا زمانہ عمل ہوتا ہے۔ کسی کے ساتھ دو مہینے، کسی کے ساتھ چار، کسی کے ساتھ چھ اس کے بعد علی گڑھ اور اس کے وائس چانسلر کے درمیان تلخی، فریب شکستگی، داستا کل کل اور باہمی غلط فہمی، ناخوش گواری کا دور شروع ہوتا ہے جو آخر تک قائم رہتا ہے۔

بات کی جھونک میں پھر میں ایک عرصہ طویل کو پھاند گیا۔ سید حامد کو آئی۔ اے۔ ایس کا عہدہ ملا، لیکن وہ گورکھپور ہی میں رہے۔ ہاں ترقی کر کے ڈپٹی ریجنل فوڈ کنٹرولر سے ریجنل فوڈ کنٹرولر ہو گئے۔ ایک بار ان کے دفتر گیا تو دیکھا کہ بڑے سے کمرے میں نیم تاریکی، بلکہ تقریباً تاریکی ہے۔ ہاں سید صاحب کی میز پر ہلکے نیلے شیڈ کے ٹیبل لیمپ کی روشنی پوری طرح پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت

اچھی لگی۔ (اب شک ہوتا ہے کہ یہ ادا تھی یا اس دن کمرے کے زیادہ تر بلب خراب تھے اور بدلے نہیں گئے تھے۔) کئی سال بعد جب میں بھی صاحب دفتر ہوا تو میں نے سید حامد کے اتباع میں اپنے کمرے کی زیادہ تر روشنیاں گل رکھ کر میز کو ٹیبل لیمپ سے منور رکھنا شروع کیا۔ نوجوانی کا جوش، صبح سے رات ڈھلے تک اسی طرح کام کرتا اور سر میں شدید درد لے کر اٹھتا۔ کئی ہفتے بعد خیال آیا کہ شام کا دردسر نیم تاریک کمرے اور آنکھوں کے قریب جھکا جھک کرتے ٹیبل لیمپ سے تو نہیں؟ روشنیاں جلوا کر ٹیبل لیمپ موقوف کیا تو دردسر بھی موقوف ہوگیا۔ اب ڈھلتی عمر میں کمرہ بھی روشن رکھتا ہوں اور ٹیبل لیمپ بھی۔ ورنہ زمانۂ ملازمت میں اس دن کے بعد ہمیشہ کمرہ خوب چمکتا ہوا اور ٹیبل لیمپ سے خالی رکھا۔ یعنی سید حامد سے مماثلت کا ایک اور پہلو ہاتھ سے جاتا رہا۔

میرے والد مرحوم اردو انگریزی ہندی تینوں نہایت خوش خط لکھتے تھے۔ ان کی تادیب اور توجہ کے باعث مجھے بھی خوش خطی میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میں جب بھی اپنی کوئی تحریر انھیں دکھاتا تو زبان کے نکات کے ساتھ وہ سواد خط پر بھی رائے زنی کرتے۔ اس زمانے میں ایک نوجوان عیسائی آئی۔ اے۔ ایس راجا رائے سنگھ محکمہ تعلیم کے اعلا افسروں میں سے تھے اور والد مرحوم کا ان سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ میری انگریزی تحریر دیکھ کر والد مرحوم اکثر کہتے نہ تمھارا خط راجا رائے سنگھ جیسا ہے اور نہ تمھاری انگریزی ان جیسی ہے۔ مراد یہ تھی کہ تم نالائق ہو اور نالائق رہو گے اگر انگریزی میں خوش خط اور خوش سخن نہ ہوئے۔ خوش خط تو میں نہ بن سکا لیکن یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی، اور یک گونہ اطمینان بھی، کہ سید حامد بھی اردو انگریزی میں نہ صرف بدخط تھے، بلکہ ان کا خط بہت بچکانہ اور نوک پلک سے بالکل ناآشنا تھا۔

ہمارے کالج میں مشاعرہ ہوا تو سید حامد نے بھی غزل پڑھی۔ پوری کی پوری غزل مذاق عام سے ہٹی ہوئی، لیکن اس قدر پختہ اور شائستہ جیسے بڑے غلام علی خاں کی آواز۔ اس وقت تو اتنی عقل نہ تھی، لیکن بہت بعد میں محسوس ہوا کہ ناسخ کا سا استادانہ انداز تھا لیکن مضمون ان کے اپنے، بعض شعر مجھے اب تک یاد ہیں۔ افسوس

کہ یہ غزل ان کے مجموعے میں نظر نہ آئی

خوبیٔ بخت کہ اٹھے تو کہاں سے اٹھے

دل سے اٹھنے تھے جو شعلے وہ زباں سے اٹھے

ہم پہ کی بند تو کر دیں گے خرابات خراب

کر کے یہ عزم در پیر مغاں سے اٹھے

پڑھنے کا انداز بھی استادانہ لیکن لپھے ٹھسے سے عاری تھا۔ تحت میں، بہت ٹھہر ٹھہر کر، ہر لفظ کو صحیح اور مناسب آہنگ سے ادا کرتے ہوئے انھوں نے غزل پڑھی۔ وہی انداز اس وقت نظر آیا جب انھوں نے جوش کی رباعیوں پر اپنا طویل مضمون کالج کی ہی کسی محفل میں سنایا تھا۔ مضمون میں انھوں نے جا بجا رباعیاں نقل کی تھیں اور انھیں خوب ہی خوب پڑھا تھا۔ مضمون کے تقریباً اختتام پر انھوں نے کچھ ایسی بات کہی کہ جوش کی کچھ رباعیاں ایسی ہیں کہ عمر خیام بھی ان پر ناز کرتا۔ اس وقت مجھے ایک لذت آمیز استہزاز محسوس ہوا کہ ہماری اردو کا بھی کوئی شاعر اس مرتبے کا ہو سکتا ہے اور کوئی نقاد ایسا بھی ہے جو خیام اور جوش سے اس درجہ واقف ہے کہ بڑے اعتماد سے خیام اور جوش کو اک دوسرے کا ہم پلہ ہونے کا دعوا کر سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد کے دنوں میں جوش کے بارے میں میری رائے بدل گئی، اور اب تو اس درجہ بدل چکی ہے کہ میں انھیں بمشکل شاعر مانتا ہوں۔ یہ بھی الگ بات ہے کہ اب سب جانتے ہیں کہ خیام سے منسوب رباعیوں میں شاید دو ہی چار واقعی خیام کی تصنیف ہیں (ہاں سب ہی رباعیاں اعلا درجے کی ضرور ہیں۔) بنیادی بات یہ ہے کہ مضمون میں اردو فارسی پر مصنف کی یکساں مہارت، اور فارسی سے مرعوب نہ ہونے کی صفت کا ثبوت ملتا تھا۔

گورکھپور کے زمانے کی بہت سی یادیں ہیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ نو عمری کے باعث اثر پذیری کی صلاحیت اس وقت زیادہ تھی، اور کچھ اس وجہ سے کہ ان دنوں میرا حافظہ بہت قوی تھا اور چیزیں بہت آسانی سے یاد ہو جایا کرتی تھیں لیکن میں ان سے صرف نظر کرتا ہوں کہ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم کا رنگ نہ پیدا ہو جائے۔ گورکھپور کے بعد بھی سید حامد سے ہمارے مراسم رہے۔ میرے والد مرحوم

ان کی ترقی مراتب اور عام لیاقت پر ناز کرتے رہے اور میں ان کی نثر و نظم ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا رہا۔ ان کی نثر میں یک گونہ غرابت اور شعر میں فارسی کی بے تکلف آمیزش بعض اوقات گراں گذرتی اور اکثر بھلی لگتی۔ میں نے ''شب خون'' نکالا تو سید حامد نے حوصلہ افزائی کی اور ''وقتاً فوقتاً'' میری فرمایش کی تکمیل میں اپنی نظم اشاعت کے لیے بھیجتے رہے۔ انھوں نے ایک بار کچھ جدید اردو شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور یہاں بھی اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔ افسوس کہ سرکاری نوکری اور کھیل (خاص کر ٹینس اور ہاکی) نے انھیں ادب کی طرف سے کم و بیش غافل رکھا، ورنہ ان کے سب سے نمایاں کارنامے شاید ادب ہی میں ہوتے۔

کچھ تو خود ان کی کم گوئی کے باعث، اور کچھ چھپنے چھپانے سے گریز کی بنا پر سید حامد کا بہت کم کلام دنیا کے سامنے آسکا ہے۔ حتی کہ ان کا مجموعہ ''لمحات'' (۱۹۸۷) بھی نہ صرف نامکمل ہے، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کی ترتیب و تدوین میں کوئی کاوش نہیں کی ہے۔ کتابت کی بڑی غلطیوں کے علاوہ بہت سی غزلیں دو دو بار چھپ گئی ہیں۔ مختصر سا دیباچہ ہے، لیکن فہرست نہیں، کم سے کم دو کاتبوں نے خامہ فرسائی کی تب جا کر کتاب مکمل ہو سکی۔ سرورق نہایت سادہ، بلکہ معمولی، مجموعی حیثیت سے کتاب کی صورت شکل کے لیے پبلشر کو مبارک باد نہیں دی جا سکتی۔ اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ مصنف نے کتاب کی تدوین اور اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ موجودہ زمانے میں، جب مال سے زیادہ اس کا لفافہ اہم ہوتا ہے، اپنے کلام کے تئیں ایسی بے نیازی برت کر سید حامد نے اچھا نہیں کیا۔ مجموعے کے دیباچے میں انھوں نے لکھا تھا کہ میرے پاس غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی ہیں۔ ''اگر وقت ملا اور تحریک ہوئی تو ان کو دوسرے مجموعے کی شکل دے دی جائے گی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ''لمحات'' کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ گوناگوں مصروفیات اور ذمے داریوں کو پوری طرح نبھانے کی مساعی انھیں وقت کیا دیتیں لیکن معلوم ہوتا ہے مصنف کو نظموں کا مجموعہ شائع کرنے کی تحریک بھی نہ ہوئی اور تحریک نہ پیدا ہونے کی بڑی وجہ ''لمحات'' کے بارے میں لوگوں کی خاموشی معلوم ہوتی ہے۔ اس خاموشی کا مجرم میں بھی ہوں، لیکن سید حامد کے کلام پر لکھنا، یا ان کی تنقید کا سیر حاصل

محاکمہ کرنا کوئی فرض کفایہ نہیں کہ صرف میرے کرنے سے ادا ہو جاتا۔ ''لمحات'' اور ''نگار خانہ رقصاں'' پر اتنا کم شاید اس لیے لکھا گیا کہ ہم میں سے اکثر کے ذہنوں میں اتنی وسعت نہیں کہ کسی تہ دار شخصیت کی تمام تہوں کے ساتھ معاملہ کر سکیں۔ سرکاری افسر یا وائس چانسلر کی حیثیت میں سید حامد کے کارناموں کی تعیین قدر آسان تھی، کیونکہ اس میں کچھ محنت نہیں لگتی۔ صرف سنی سنائی باتوں یا تاثراتی انداز میں قائم کی ہوئی رایوں کی روشنی (یا اندھیرے) میں کام چل سکتا ہے۔

سید حامد کوئی بڑے شاعر نہیں ہیں اور ان کے مجموعے میں بہت سی غزلیں مشاعروں یا نشستوں کے لیے اساتذہ قدیم کی طرحوں پر کہی گئی ہیں۔ غالب کی بہت سی زمینوں میں ان کی طبع ایجاد پسند نے شگوفہ کاری کی ہے لیکن یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اکثر غزلیں فرمائشی غزلیں ہیں۔ اگر موقع نہ پیدا ہوتا تو یہ غزلیں بھی نہ پیدا ہوتیں۔ یعنی شعر گوئی اگر سید حامد کے لیے فرصت کا مشغلہ نہیں تو وظیفۂ حیات بھی نہیں لیکن کلام کو دیکھ کر اکثر خیال آتا ہے کہ کاش شاعری ہی اس شخص کا وظیفہ حیات ہوتی۔ شعر و ادب کے میدان میں سید حامد کو غالب اور ناسخ دونوں سے رہنمائی ملی ہے۔ انگریزی کے مطالعے نے ان کی تنقیدی صلاحیت کو جلا بخشی۔ انگریزی انشا پردازی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں وضاحت اور صفائی کلام کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اسی بنا پر ان کی نثر (نامانوس الفاظ کی کثرت کے باوجود) واضح اور آسان رو ہے اور ان کی شاعری میں توازن اور تعمیر کا انداز نمایاں ہے۔ بڑا شاعر تو مدتوں میں پیدا ہوتا ہے، اور اس کی پیدائش میں خود شاعر، اور اس کی زبان کی خوش نصیبی کا بھی حصہ ہوتا ہے، تمام کمیوں اور کوتاہیوں کے باوجود سید حامد قابل مطالعہ اور قابل لحاظ شاعر ہیں۔ ان کو صرف خوش گو یا یا خوش فکر کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔

اوپر میں نے سید حامد کے حوالے سے ناسخ کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے ناسخ کا حوالہ سید حامد کے پڑھنے والوں اور خود سید حامد کو ذرا عجیب سا لگے۔ ناسخ کا سکہ ابھی تک ہمارے یہاں منسوخ بھی ہے لہٰذا ناسخ کی محفل میں بٹھایا جانا سید حامد کو اپنے لیے کوئی اعزاز نہیں، بلکہ اپنے اوپر اعتراض معلوم

ہوسکتا ہے خود ان کا شعر ہے ۔

شعر میں اقبال کا شیدا ہے غالب کا اسیر
حامد بے بہرہ گو منکر نہیں ہے میر کا

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب تو براہ راست ناسخ سے متاثر اور معنوی طور پر ان سے فیض یاب ہیں اور غالب کے حوالے سے اقبال کا سلسلہ بھی ناسخ تک پہنچتا ہے۔ سید حامد اس نسل کے نمایاں فرد ہیں جس کے لیے شاعری اور خاص کر غزل، شاعر کے ذاتی تجربات و محسوسات کا اظہار تھی اور شاعری کی "سچائی" اسی بات پر منحصر تھی کہ شاعر نے "اپنے دل کا حال" اس میں کس حد تک بیان کیا ہے۔ لیکن کلاسیکی روایت سے آگاہی کے باعث سید حامد نے میانہ روی اختیار کی اور اپنی غزل کو مختلف طرح کے مضامین کے بیان اور لہجے کو رواجی "تغزل" کے بجائے عشق کی کیفیات سے لے کر تلقین و تفکر کے آہنگ سے روشن کیا۔ ناسخ سے زیادہ باہمت اور بلند کوش غزل گو اردو میں نہ ہوا۔ خیال بندی، یعنی دور دور سے انوکھے مضامین لاکر غزل میں داخل کرنا، بے تکلف تعقل سے لے کر پر تکلف تجرید تک ہر رنگ کو برت لینا، چھوٹی بحروں میں خود کلامی کا طور برتنا اور عام بحروں میں خطابیہ، بیانیہ، مزاحیہ، تمثیلی، واعظانہ، ہر طرح کا شعر کہہ لینا، یہ ناسخ کے خاص انداز ہیں۔ اگر ناسخ کا دماغ ذرا اور پیچیدہ اور ان کا تعقل اگر ذرا اور دور رس ہوتا تو وہ اور بھی بڑے شاعر ہوتے۔ یہ ضرور ہے کہ ناسخ سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان ہی کی طرح کا مزاج بھی درکار ہے، اور آج اس مزاج کو ہم پست، مصنوعی اور "تغزل" سے عاری کہہ کر ترک کر چکے ہیں، اور یہ بات بھی ہے کہ ہم لوگوں نے ناسخ کو پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ سید حامد کے مجموعہ کلام "لمحات" کے جس صفحے سے اقبال اور غالب کے ذکر پر مبنی مقطع میں نے نقل کیا۔ اس کے اگلے صفحے پر یہ شعر ہے۔

کم ہیں ذروں سے شمس وارض وقمر
وسعت کائنات کیا ہوگی

یہاں مجھے معاً ناسخ یاد آ گئے۔ مضمون بالکل الٹا ہے، لیکن موضوع ایک ہے، لہجہ ایک ہے۔

ترک دنیا میں سوچ کیا ناسخ
کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

جس غزل کا مقطع میں نے اوپر نقل کیا ہے، اس کی زمین کو ہم غالب کے حوالے سے جانتے ہیں، حالانکہ اس میں سودا، اور ناسخ کی بھی غزلیں ہیں، غالب نے تو یقیناً ناسخ کی غزل سامنے رکھی ہوگی یا کم سے کم پڑھی ضرور ہوگی۔ ناسخ کے بعض شعر اس زمین میں حسب ذیل ہیں ۔

وحشت دل ہوں میں دیوانہ تری تاثیر کا
چشم آہو بن گیا حلقہ ہر اک زنجیر کا

پہنچے ہم آتش زبانوں کو ضرر دشمن سے کیا
شمع کو کرتا ہے روشن ترستم گلگیر کا

کون عالم کے مرقع میں ہے مجھ سے بے ثبات
رنگ اڑ جاتا ہے کھنچتے ہی مری تصویر کا

کھیلتا ہوں اس سے مرغان معانی کا شکار
کام وقت فکر لیتا ہوں قلم سے تیر کا

اب سید حامد ملاحظہ ہوں ۔

جور سے گھبرانے والے ہم نہیں ہیں دیکھیے
حوصلہ کب تک جواں رہتا ہے چرخ پیر کا

ناز سے دیکھا ہے خالق نے مٹاتے بارہا
ناخن تدبیر کو لکھا ہوا تقدیر کا

خاک لے کر خاکساری سے ریاضت سے عرق
آرزو کی آنچ دے نسخہ ہے یہ اکسیر کا

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر چہ دماغ کی پیچیدگی اور معنی کی کثرت کے لحاظ سے غالب کی غزل ناسخ اور سید حامد سے بلند تر ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تینوں ایک ہی عالم سے ہیں۔ یقین نہ آئے تو غالب کے بھی چند شعر دیکھ لیجیے۔

شوخی نیرنگ صید وحشت طاؤس ہے
دام سبزے میں ہے پرواز چمن تسخیر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

غالب کا مقطع کامیاب ہے اور ''تسخیر'' کے قافیے والا شعر ضرورت سے زیادہ اختصار اور تجرید کے باعث موثر نہیں لیکن ناسخ کا اثر دونوں شعروں پر نمایاں ہے۔ ہاں بحیثیت مجموعی ناسخ کے اشعار میں روانی زیادہ ہے۔ ناسخ، غالب، اور سید حامد کے شعروں کو بہ آواز بلند پڑھیں تو حیرت انگیز ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ سید حامد کا [illegible] ہے۔

آویزہ ہائے [illegible]ر میں ہیرے جڑے ہوں جیسے

اردو کی شاعری میں الفاظ فارسی کے

اب اس کی روشنی میں یہ اشعار پڑھیئے۔

رقص بسمل کا تماشا دیکھیے کب تک رہے
کر رہے ہیں جان کر اک ضرب کاری سے حذر

ترک کے پندار کی صہبا سے لازم تھا گریز
کیا ہوا کرتے رہے گر بے گساری سے حذر

فربہی میں نفس گویا پیل کا ہم سنگ ہے
باگ ہاتھوں میں نہ ہو ایسی سواری سے حذر

حسرتیں کیا کم تھیں حامد عمر بھر گنتے رہے
مظہر تسکیں نہیں اختر شماری سے حذر

اردو فارسی کی کلاسیکیت صاف نمایاں ہے لیکن زبان وسط بیسویں صدی کی ہے۔ یہ کارنامہ بہت ہی کم لوگوں سے انجام پایا۔

سید حامد کی شخصیت میرے تصور میں ہمیشہ اپنے پورے لوازم وضوابط کے ساتھ جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ بعض لوگ انھیں مسلمان دوست آئی۔اے۔ایس افسر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ بعض لوگ انھیں ملت اسلامیہ کے لیے دردمندوں اور باعمل جان رکھنے والے کارگر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ بعض لوگوں نے انھیں صرف کھیل کے میدان میں پہچانا۔ ہندستان کی ملت اسلامیہ کے سامنے سید حامد کا نام اس زمانے میں کثرت سے آیا جب وہ علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ بہت سے لوگ ان کی شاعرانہ اور ادیبانہ حیثیت سے واقف ہیں۔ بہت سے لوگ انھیں دل

نواز شخصیت، اسلامی حسن اخلاق کا اعلا نمونہ، انکسار اور صلابت کا پیکر سمجھتے ہیں۔ یہ سب باتیں درست ہیں، اور اس کے باوجود کہ میں ان کے ہر وقت کے حاضر باشوں میں نہیں ہوں (وہ حاضر باش قسم کے لوگوں کی ہمت افزائی کرتے بھی نہیں) میں ان کی تمام شخصیتوں کو بیک وقت دیکھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ان کی شخصیت کو اپنے بدو بلوغ سے اٹھتے، بڑھتے اور پھیلتے دیکھا ہے۔ سنائی اور اقبال کے تتبع میں کہی ہوئی ان کی طویل حمدیہ نظم کے بعض اشعار میں ان کی زندگی کے بعض پہلو بے نقاب ہو گئے ہیں۔ ان اشعار سے بہتر کلمۂ تمت اس مضمون کے لیے ممکن نہیں۔

اسے تو نے بچایا گھا گھرا میں غرق ہونے سے
اسے آغوش مادر بن گیا چڑھتا ہوا دریا
کیا مخفی نگاہوں سے گناہوں کو خطاؤں کو
کوئی اچھائی کی اس نے تو اس کو سامنے لایا
ہزاروں کا ہجوم آیا جلانے کے لیے اس کو
مگر تیرا یہ بندہ آگ کا ایندھن نہ بن پایا
بجھے تھے زہر میں سو بار ایسے تیر بھی کھائے
اہانت گالیاں تحقیر خندہ طنز استہزا
وہ شیشہ جس کے چکنا چور ہو جانے کے خدشے تھے
ہجوم سنگ سے وہ کس طرح ثابت نکل آیا
اسے اک قلعے کی دیوار کچھ ٹیڑھی نظر آئی
لگا کر پشت اس نے کر دیا دیوار کو سیدھا
اسے توفیق دی اپنی طبیعت کو بدل ڈالے
جسے سب موم سمجھے تھے پگھل کر بن گیا لوہا
اسے ہر خوف کے احساس سے بے گانگی بخشی
مکدر کر نہیں پایا اسے اندیشۂ فردا

خدا سید حامد کو سلامت رکھے کہ ان کی ایک جان کے ساتھ بہت سی جانیں ہیں۔

ف۔س۔ اعجاز
مدیر "انشا" کلکتہ ۷۳

غزل

خرچ جب ہوگئی جذبوں کی رقم آپ ہی آپ
کھل گیا ہم پہ حسینوں کا بھرم آپ ہی آپ

اب کے روٹھے تو منانے کوئی آیا ہی نہیں
بات بڑھ جائے تو ہو جاتی ہے کم آپ ہی آپ

روز بڑھتا تھا کوئی دستِ طلب اپنی طرف
سر سے ہوتا گیا اک بوجھ بھی کم آپ ہی آپ

ان کے وعدوں پہ کوئی دن تو گزارا کیجیے
آپ بن جائیں گے تصویرِ الم آپ ہی آپ

جیسے بجھتا ہے کوئی پھول شرارا بن کر
حسن کی آنچ بھی ہو جائے گی کم آپ ہی آپ

آبگینوں کی طرح ٹوٹ گیا ٹوٹ گیا
خوابِ یوسف میں زلیخا کا بھرم آپ ہی آپ

دیر تک چھائی رہی ایک اُداسی دل پر
جانے کیا سوچ کے پھر ہنس دیے ہم آپ ہی آپ

میں کہاں آیا ہوں لائے ہیں تری محفل میں
میری وحشت میرے مجبور قدم آپ ہی آپ

کسی فن کار نے اب تک نہ بھلایا غم کو
بھولتا ہے کسی فن کار کو غم آپ ہی آپ

ہم نے اک بار فقط آنکھ اٹھا کر دیکھا
بات کرنے لگے پتھر کے صنم آپ ہی آپ

پروفیسر عبدالحق
شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی

دہلی میں اردو کی صورت حال

(۱۹۴۷ء کے بعد)

اسے اردو کا امتیاز کہیے یا دنیائے لسان کا استعجاب کہ اس زبان کا مولد و مسکن ایک دارالخلافہ رہا ہے جو دو بار تاراج ہوا اور اس کے محافظین در بدری کے ساتھ دوسرے نواح میں ہجرت پر مجبور ہوئے۔ زبان کے ساتھ اردو معاشرت کی تمام ثقافتی سرگرمیاں بھی جائے اماں کی تلاش میں پناہ گزیں رہیں۔ زبان وادب کی ترقی و ترویج کیا ان حالات میں زندگی اور بقا کے آثار بھی معدوم ہو جاتے ہیں۔ محمد بن تغلق نے دیوگیر کو دارالخلافہ قرار دیا اور اہالیانِ دہلی کو بزور شمشیر ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ دہلی ایسی ویران ہوئی کہ گیڈر، بھیڑیے اور جانوران صحرائی کے علاوہ کسی انسان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اردو کا یہ لسانی شیرازہ کارواں کے غبار میں گم ہو گیا۔ دہلی سے دیوگیر تک نقشِ پا کے آثار ہی تاریخ کے صفحات میں ثبت ہو کر رہ گئے۔ اس ابتلا اور آزمائش میں اردو کی معجز نمائی غیر محسوس طور پر اپنے اثر و نفوذ کے موثرات کو بروئے کار لاتی رہی۔ سینکڑوں لسانی حلقے وجود میں آئے۔ دوسرا دلدوز واقعہ ۱۹۴۷ء میں پیش آیا جب اردو کے امین اور ساکنانِ شاہجہاں آباد نے اس خرابے کو خیر باد کہا۔ اور دہلی سے دہ چند بہتر بستیوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اب کی بار زبان کے ساتھ سرمایۂ ادب اور سرچشمۂ ثقافت بے آب و گیاہ وادیوں میں گم ہونے اور اسبابِ سفر کے لٹ جانے کے خطرات سے دو چار ہوا۔ اردو آثار و علائم کے نگہبان دہلی کے در و دیوار، مدرسہ و خانقاہ، مدیر و مصنف، مرد و زن، پیر و جواں سبھی تاراج ہوئے۔ سراسیمگی اور

ہزیمت کی سمیت اور روسیاہی نے ماحول اور معاشرت کو زندہ رہنے کے لیے بشارت کی ایک کرن بھی نہ چھوڑی ۔ فروغِ زبان کے معاون مرکزوں کی بے دست وپائی نے تشویش ناک حالات پیدا کیے۔ دہلی کالج، اینگلو عربک اسکول، جامعہ ملیہ اسلامیہ، فتحپوری اسکول، مدرسۂ امینیہ، مدرسۂ حسین بخش جیسے گہوارۂ دانش کے چراغ بجھنے لگے۔ اردو کی یہ بسی بسائی بستی برسوں لسانی اعجاز کا انتظار کرتی رہی۔ آزادی کی صبح صادق کے ساتھ آبادکاری اور ابنائے وطن کے استحکام نے ایک سنبھالا دیا گو کہ ایوانِ مملکت نے اردو کو سرکاری تحفظ اور عوامی اظہار کے حقوق تسلیم نہ کیے جانے کی مہرِ انکار ثبت کردی تھی۔ جمہوری طرز کی تعداد شماری اردو کے حق میں جواز نہ پیدا کرسکی۔ مگر زبان کی سخت جانی کہیے کہ وہ سسکتی رہی اور لحہ بہ لحہ موت وزیست کی آویزش سے نبرد آزما رہی اور آج تک بقائے حیات کے لیے سرگرم کار ہے۔

شروع کے تقریباً دس پندرہ سال بڑی ابتلا اور افسردگی کے ساتھ گزرے آئین سازی کے بعد اس کی اشاعت ونفاذ کے لیے اعلانات اور موعود بیانات سے فضا کا تکدر قدرے کم ہونے لگا اور امید کی کرن محسوس کی جانے لگی۔ تعلیم پر توجہ اور خواندگی کی شرح میں اضافے نے مادری زبان کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی وزارت میں مختلف تعلیمی کمیشنوں کے قیام اور ان کی سفارشات نے کسی حد تک علاقائی زبانوں میں تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ اردو کو نہ تو ریاست راس آئی اور نہ کوئی علاقہ ہی تفویض کیا گیا۔ دہلی میں سرکاری کام کاج میں مستعمل فارم اور کاغذات کی اشاعت تک اسے سہولت دی گئی۔ وہ بھی بلدیاتی سطح کے معمولی کاغذات یا گلی کوچوں اور شاہراہوں کے سنگ میل اور نشانِ راہ کے بدخط کتابت تک محدود تھی، افہام وتفہیم کے لیے اردو عوام میں رائج تھی۔ اخبار ورسائل، نشریے، نغمے، پردۂ سیمیں کے مکالمے، ادبی محفلوں اور کبھی کبھی ایوانِ نمایندگان میں اشعار کی بازگشت نے اردو کی محافظت کی۔ ۱۹۶۰ء تک یہ صورت حال دیکھی جاسکتی ہے۔ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء کے عام انتخابات نے اردو رائے دہندگان کے درد دل

اور داد و فریاد کے خاموش احتجاج کو سرسری طور پر محسوس کیا۔
سربراہانِ سیاست دلاسائی اور اردو دوستی کے وعدے بھی کرتے رہے۔ مذکورہ اداروں کو مہلت اور نئے مواقع میسر آئے۔ ساتھ ہی چھوٹے موٹے دیگر ادارے بھی وجود میں آئے۔ دہلی یونیورسٹی میں ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اردو کی تاسیس عمل میں آئی۔ پہلے ایک بعد ازاں دو دیگر اساتذہ کا تقرر ہوا۔ جامعہ ملیہ میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اردو ذریعۂ تعلیم ہونے کی وجہ سے بھی تھوڑا سا سہارا ملا۔ اقامتی ادارہ ہونے کی حیثیت سے بھی اردو کو رواج پانے میں آسانی ہوئی۔ آبادی اور بڑھتے ہوئے تعلیمی رجحانات کی وجہ سے مسلم آبادی کے مختلف علاقوں میں پرائمری، مڈل اور سکنڈری اسکول کے مطالبے بڑھنے لگے اور مطالبات کو عملی شکل دی جانے لگی۔ سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے علاوہ بعض نجی نوعیت کے اسکولوں کے ساتھ اوقاف سے متعلق اور دینی مدارس میں اردو کی تدریس بڑھنے لگی۔ کالجوں کی سطح پر بھی کروڑی مل کالج، شری رام کالج، دیال سنگھ کالج، سینٹ اسٹیفنس ماتا سندری مراسلاتی کورس، خالصا کالج، ستیہ وتی کالج میں اردو کے شعبے قائم کیے گئے۔ جامعہ ملیہ کے شعبے میں بھی توسیع ہوئی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں بھی آٹھویں دہائی کے شروع میں شعبہ قائم ہوا۔ اسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایم اے۔ کی تدریس کا آغاز ہوا، وہاں بی اے تک اردو کا بندوبست پہلے سے ہی تھا۔ اس کا پرائمری، مڈل اور ہائر سکنڈری بھی پہلے سے موجود تھا۔ جامعہ کا حلقہ اردو کی ترویج میں پیش پیش تھا۔ اس کا مکتبہ جامعہ جناب شاہد علی خاں کی شب و روز کی سعی کے طفیل اشاعتی سرگرمیوں میں سرفہرست ہے۔ اردو اور ادب کی بیشتر کتابیں اسی مکتبہ کی دین ہیں۔ ہر دل عزیز رسالے "پیامِ تعلیم" "کتاب نما" اور جامعہ بھی اس ادارے کے مشمولات ہیں۔ جامعہ ملیہ کا ایک اور کام بھی لائقِ صد ستایش ہے مراسلاتی سطح پر اردو سکھانے کا کورس جاری کیا گیا اور دور دراز تک شائقینِ اردو کو زبان شناس بنایا گیا۔ یہ کورس ہنوز جاری ہے۔ اسی ساتویں دہائی کے آغاز میں دہلی یونیورسٹی میں مراسلاتی کورس کے ماتحت بی اے

درجات تک اردو میں بھی تدریس کی آسانی فراہم کی گئی۔ بعدازاں اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی میں اردو نصاب فاصلاتی نظام تعلیم کا جزو قرار پایا۔ سرکاری سرپرستی میں این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، نیشنل بک ٹرسٹ، پبلیکیشن ڈویژن، اور ساہتیہ اکیڈمی میں اردو کے اشاعتی شعبے بھی ترقی میں مددگار ثابت ہوئے، اگرچہ ان کا دائرۂ کار بہت ہی محدود تھا، مگر زبان کے پھلنے پھولنے کے لیے کتب ورسائل کی خدمات سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۹۶۹ء میں جشن غالب کے سرکاری اہتمام اور اداروں کی کثرت آرائی نے بھی مہمیز کیا۔ عالمی توجہ سے اردو کو ایک افتخار کا احساس ہوا۔ پھر ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال پر بین اقوامی تقریبات نے خاص و عام میں اردو التفات کی عام فضا پیدا کی۔ جمہوریت کی برکتوں میں مطالبات کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اردو کی بحالی اور جائز مراعات کے لیے ارکان امارت کو بار بار متوجہ کیا جانے لگا۔ خاص طور پر ۱۹۷۲ء کے بعد اردو معاشرے کے اندازِ فکر میں یکسر تبدیلی رونما ہوئی۔ اب وہ بے باکی کے ساتھ لسانی تعصبات اور عدم توجہ کے خلاف برملا کہنے لگا۔ ترقیٔ اردو بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ ایک طرح سے یہ خودمختار ادارہ اردو کی نگہداشت اور فروغ کے لیے خودکفیل قرار دیا گیا مگر یہ بوجوہ اشاعتی ادارہ بن کر رہ گیا تھا جسے اب دو برسوں سے صحیح معنوں میں اردو کا سب سے فعال اور متحرک مرکز کہا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بٹ کی بحیثیت ڈائرکٹر تقرری کے بعد یہ ادارہ ملک کا سب سے فعال اور اردو دنیا کا مرکزِ محسوس بن گیا۔ ڈائرکٹر موصوف کی شب وروز کی سرگرمی اور مستقبل شناس منصوبہ بند کارگزاری باعث طمانیت ہے۔

یہ ادارہ اگرچہ قومی سطح کا ہے۔ مگر دہلی میں قائم کیے جانے کی رعایت سے یہاں ضمناً تذکرے میں آگیا۔ اسی دہائی یعنی ۱۹۸۳ء میں دہلی کا ایک اور رواں دواں ادارہ بھی دہلی اردو اکیڈمی کی صورت میں سامنے آیا۔ انعام واشاعت کے ساتھ درس وتدریس کی ذمہ داری بھی اس ادارے نے رضاکارانہ طور پر قبول کی ہے۔ اشاعت وانعامات سے قطعِ نظر ڈیڑھ سو سے زائد عارضی اردو اساتذہ کا

انتخاب عمل میں آیا جو ایک نیا تجربہ تھا۔ سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورس کے آٹھ مرکز قایم کیے گئے۔ تعلیم بالغان کا ایک سلسلہ بھی قایم کیا گیا۔ اور سو سے زائد کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی، اس طرح اردو اکیڈمی کا فعال رول بہت ہی مستحسن ثابت ہوا۔ غالب صدی کے زمانے میں غالب اکیڈمی اور ایوان غالب جیسے ادارے بھی وجود میں آئے۔ تقریباً اسی زمانے میں اردو گھر کی تعمیر کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا اور انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا۔ یہ اشاعتی کاموں کے علاوہ تحریکی ذمہ داریاں بھی کسی حد تک انجام دینے میں پیش پیش رہا۔ دہلی یونیورسٹی کی سربراہی میں اردو سیکھنے کے لیے سرٹیفکیٹ ڈپلوما اور ایڈوانس کلاسیں قایم کی گئیں۔ یہ ساتویں دہائی کے آغاز کی بات ہے، بعد ازاں ۱۹۷۱ء میں مخطوطہ شناسی، ایم لٹ وغیرہ نصابات پر عمل درآمد شروع ہوا۔ ایک معقول تعداد ریسرچ کے طلبہ کی بھی سامنے آئی اور تحقیق کا کام فروغ علم کا باعث بنا۔ ۱۹۶۷ء میں سالانہ نظام خطبات سے ایک نئے امکان کی طرف توجہ ہوئی۔ طلبہ کی تعداد میں معتد بہ اضافے نے تقویت کے اسباب فراہم کیے۔

دہلی شمالی ہند کا تجارتی مرکز بننے لگا۔ روزگار کے وافر ذرائع وجود میں آئے اور ایک نیا امکان کھلا۔ دفاتر کی روز افزوں فراوانی نے باشندگانِ ہند کو متوجہ کیا، سفارت وسیاحت کے ارتکاز نے بھی بہت سے امکانات روشن کیے۔ صنعت وسیاست کی پذیرائی نے دہلی کو مرکزِ التفات بنا دیا۔ جوق در جوق گروہ مختلف علاقوں سے یہاں اقامت پذیر ہونے لگے۔ خاص طور پر بہار، اتر پردیش کے تعلیم یافتہ اور نیم خواندہ مزدور وملازم نے یہاں کی آبادی کے تناسب میں زبردست تبدیلی پیدا کی۔ آبادیوں کے چھوٹے چھوٹے علاقے وجود میں آئے جن کے سبب مدرسے اور مساجد میں کل وقتی اور جز وقتی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ دی جانے لگی، پرائمری سطح پر اردو کو نئے سرکاری اسکولوں میں بدقت تمام جگہ ملنے لگی۔ جو بہت زیادہ تشفی بخش نہیں تھی اور اس وقت بھی نہیں ہے، مگر حالات کے بدلتے ہوئے جبری تقاضوں نے امید کی کرن پیدا کی۔ چار و ناچار اردو کو بھی اقلِ قلیل

مراعات ملنے لگیں۔ جن کے طفیل اردو کو سنبھالا ملا اور کچھ مواقع میسر آنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسکولوں میں اردو کسی نہ کسی سطح پر رائج ہے اور اردو اسکول باقی ہیں۔ بلکہ اردو میڈیم کے وہ مختصر مراکز جو فتح پوری، اینگلو عربک، مظہر الاسلام، شفیق میموریل، اور قومی اسکول تک محدود تھے توسیع طلب بن گئے۔ اب ان اردو اسکولوں کی تعداد مختلف سطحوں کو ملا کر تقریباً دو سو ہوگئی ہے جن میں پرائمری، مڈل، ہائی اور ہائر سکنڈری زمرے کے ادارے شامل ہیں اور وہ بھی جہاں اردو بہ حیثیت ایک مضمون کے رائج ہے۔ ایک عام جائزے کے مطابق ساٹھ ہزار سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ یہ امر تشویش ناک ہے کہ ان اسکولوں کا معیار تعلیم غیر تشفی بخش ہی نہیں دل دوز بھی ہے۔ کامیاب ہونے والے طلبہ کی تعداد دس، پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں ہو پاتی۔ تمام جتن کے باوجود معلوم نہیں کس کے غمزۂ خوں ریز میں یہ ادارے مبتلائے آلام ہیں۔ اردو میڈیم کے مدارس کی انتظامیہ خاطر خواہ متوجہ نہیں ہے۔ اور اساتذہ کی کارکردگی پر ان کی گرفت بہت کم زور ہے۔ اردو اساتذہ کی بداندیشی اور ان کی غیر سنجیدہ ناکردگی سب سے زیادہ قابلِ افسوس ہے۔ تقریباً نصف اساتذہ دوسرے کاروباری معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔ معاش و معاد کی مسابقت نے بھی تعلیمی توجہ کو ثانوی ترجیحات میں شامل کیا ہے۔ علاوہ ازیں نصابی کتب کی کم یابی اور طلبہ کی بے توجہی بھی اس انحطاط کی ذمہ دار ہے۔ نیز اسکولوں کے فاصلے نقل و رسائل کے محدود ذرائع بھی مانع ہیں۔ صرف اردو میڈیم پر ہی موقوف نہیں، آزادی کے بعد اردو معاشرت کے زیرِ اثر قائم کیے جانے والے انگریزی میڈیم کے اسکولوں کے نتائج بھی دوسرے اداروں سے کہیں زیادہ پیچھے ہیں، خواہ وہ کریسینٹ اسکول ہو یا نیو ہورائزن یا ہمدرد یا رابعہ۔ نتیجتاً اعلیٰ تعلیم کے لیے خواندگی کی شرح کم سے کم ہو جاتی ہے جیسے دہلی یونیورسٹی میں تقریباً ڈھائی لاکھ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ان میں مسلمانوں یا اردو طلبہ کی تعداد ڈیڑھ فیصد سے زیادہ نہیں ہے جو بہت ہی تشویش ناک ہے، جب کہ دہلی میں آبادی کے تناسب سے پچیس فیصد نمایندگی ہے۔ دہلی کی کل آبادی ایک کروڑ ہوگئی ہے۔

سرکاری اعلامیے میں سترہ لاکھ اور ہماری شماریات میں تقریباً پچیس لاکھ سے زائد اردو بولنے والی آبادی موجود ہے۔ایک چوتھائی آبادی کی خواندگی بہت ہی معنی خیز ہے، مگر مادری زبان سے محرومی کی تدبیریں بھی لسانی عصبیت کے آغوش میں پرورش پاتی رہی ہیں۔ پنجابی کو دوسری سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیے جانے اور اردو کو عاق کرنے کی قبیح کوشش بھی ہلاکت سے کم نہ تھی۔ حالات کے جبر نے مجبور کیا کہ موجودہ حکومت اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے کر شاید کچھ تلافی کر سکے۔ یہ فیصلہ بھی من جانب قضا وقدر ہے۔ ہماری کوششوں کو دخل نہیں ہے۔ اگر چہ اس کے خلاف بھی آواز اٹھائی جا رہی ہے کہ اس کے مصلوب آئینی حقوق بحال نہ کیے جائیں۔ اردو کے اثر و آسیب سے بڑے بڑے چیل تن خوف زدہ ہیں۔ یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ اردو بولنے والوں کی یہ نمایندگی کسی اور ریاست میں مفقود ہے۔ جموں و کشمیر کو بوجوہ خاطر میں نہ لایئے۔ دیگر ریاستوں کے مقابل اس وقت دہلی ہی اردو آبادی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ سیاسی و معاشی تناظر میں دہلی کو جو تعلیمی مرکزیت ملی وہ ۱۹۴۷ء کے بعد بڑھتی رہی۔ تعلیم و تدریس کے ساتھ ترسیل و تبلیغ کے وسائل میں بھی اضافہ ہوا۔ اخبار و رسائل نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ دعوت، الجمعیت، ملاپ، پرتاپ، قومی آواز، عوام، ان دنوں، ہم سب کا اخبار، مشرق، راشٹریہ سہارا وغیرہ کبھی گرم جوشی اور کبھی سرد مہری کے ساتھ عوامی ذہن کی آبیاری کرتے رہے۔ گو ان کی اشاعت کا دائرہ بہت محدود ہے اور معیار بھی جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ دیکھیے اردو کونسل کی امداد سے شاید انھیں سہارا ملے اور ان میں تاب و تواں پیدا ہو سکے۔ اس کے برخلاف دہلی کو ماہانہ رسائل کی اشاعت اور حلقۂ اثر کی وسعتوں میں ایک گونہ سبقت حاصل ہے۔ اتنے علمی و ادبی رسائل کسی علاقے یا اسٹیٹ سے شائع نہیں ہوتے جو ملک کے مختلف گوشوں میں بھی مقبول ہوں۔ بیسویں صدی، برہان، شمع، کھلونا، بانو، دین دونیا، خاتونِ مشرق، تحریک، کو بڑی مقبولیت ملی تھی۔ اس میں متواتر اضافہ ہوتا رہا۔ دہلی اردو اکیڈمی کے دونوں رسائل، ایوان اردو، اور امنگ کو جو پذیرائی اور پسندیدگی حاصل ہے وہ

قابلِ رشک ہے۔ کتاب نما، عصری ادب، الرسالہ، جامعہ، آج کل، اردو ادب ذہن جدید، ملی ٹائمز، افکار ملی، اسلام اور عصر جدید، پیش رفت، نیا سفر، اردو دنیا، فکر و تحقیق، سائنس کی دنیا، سائنس، عصری آگہی، وغیرہ بہت سے دوسرے رسائل بھی جاری ہوئے۔ آزادی کے کچھ برسوں بعد اردو میں پاکستان کی پیروی میں ڈائجسٹ شروع ہوئے۔ ہما، ہدیٰ اور دوسرے ڈائجسٹ نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ان کے ساتھ ہی فلمی رسالوں کی بڑی تعداد بھی منظرِ عام پر آئی۔ رسائل واخبار نکلتے بھی رہے اور بند بھی ہوتے رہے مگر تسلسل جاری ہے۔ ان سے بھی قطع نظر دہلی کو اشاعتی اداروں کی خدمات کے طفیل جو اولیت حاصل ہے وہ بے عدیل ہے۔ سرکاری، نیم سرکاری، رضا کارانہ، اشاعتی مرکزوں کے ساتھ نجی اور ذاتی ملکیت کے پبلشرز نے مال و معیشت میں جو سبقت حاصل کی ہے۔ وہ حد درجہ ستایش اور سپاس گزاری کے مستحق ہیں، اردو کونسل، اردو اکیڈمی، ساہتیہ اکیڈمی، نیشنل بک ٹرسٹ، این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی، پبلیکیشن ڈویژن تو سرکاری سرپرستی میں فروغ پا رہے ہیں۔ انجمن ترقی اردو، مکتبہ جامعہ، مکتبہ اسلامی، ندوۃ المصنفین، دہلی یونیورسٹی جیسے خود مختار شعبے بھی اس مہم میں شریکِ سفر ہیں۔ نجی ملکیت کے اشاعتی گھروں میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، عاکف بک ڈپو، تاج پبلشرز، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، سیمانت پرکاشن، ادارہ اشاعت دینیات، الرسالہ، اعتقاد پبلشرز وغیرہ، اور بھی نام اس فہرست میں شامل ہیں۔ خاص بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ادبی اور علمی کتب کے مقابل دینی اور مذہبی کتابوں کی کثرت اشاعت اردو طباعت میں ایک انقلاب آفرین بشارت ہے۔ جس کی توجیہہ آسان نہیں اور تجزیہ کے نتائج پر ہماری نظر بھی نہیں گئی ہے۔ بعض ادارے تو صرف مذہبی موضوعات کے لیے ہی مختص ہیں اور ان کی اشاعتی سرگرمیاں سامنے لائیں تو اردو کی معجز نمائی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ اور اسے ہی اردو کی بقا کا شہ رگ اور شرائین قرار دیا جائے گا۔ تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کتب کی اشاعت ان مذہبی مطبوعات کے سامنے ذرۂ بے مایہ بن کر رہ گئی ہے، ہاں تخلیق میں صرف اقبال کے کلیات اردو کو جو اولیت حاصل ہے وہ

دیوان غالب کو بھی میسر نہیں ہے۔ مگر یہی دو مجموعے بار بار شائع ہو رہے ہیں۔ جن کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ تبلیغی نصاب سب سے زیادہ حیرت خیز اشاعتی کارنامہ ہے اب ادارہ اشاعت دینیات کے علاوہ بھی دوسرے اشاعتی گھر اس کتاب کے کاروبار میں ایک دوسرے کی مات دینے میں مشغول ہیں۔ حکایتِ صحابہ کو بھی اس نصاب کے بعد شمار کیا جاسکتا ہے۔ اردو سے ذرا ہٹ کر گفتگو کی جائے تو بہ قول انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

"The most widely read book in the world"

دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب یعنی قرآن پاک کی طباعت واشاعت میں دہلی کو جو درجہ یا دخل ہے وہ دنیا کے کسی شہر یا علاقے کو نصیب نہ ہوسکا۔ درجنوں ادارے، قومی اور بین اقوامی سطح کے تجارتی مسابقت میں رواں دواں ہیں۔ ملک کو جو بیرونی سرمایہ محصول کے طور پر مل رہا ہے وہ خاصا وقیع اور وافر ہے۔ اس امر سے اس کا اندازہ لگائیں کہ غیر اردو داں ناشر بھی نفع ونعم میں ناز آفریں حیثیت کے مالک بن گئے۔ اس آخری صحف سماوی کی اشاعت سے اردو براہ راست نہ صرف متعلق ہے بلکہ مستفیض ہو رہی ہے۔ حمائل کے ساتھ اردو تراجم بھی بارہا چھپ رہے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو رہے ہیں۔ صرف ایک مثال عرض کر رہا ہوں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کا ذکر نہیں کرتا، ان کے پارہ عم کے اردو ترجمے کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جو علاحدہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ پانچ پانچ ہزار کا ایک ایک اڈیشن نہ جانے کتنی بار شائع ہوچکا ہے۔ یہ شماریات کا مشکل مسئلہ ہے۔ شاہ عبدالقادر رو سے لے کر تازہ ترین تراجم قرآن کی نشرواشاعت کا واحد مرکز دہلی ہے۔ اس سے براہ راست اردو کو تقویت مل رہی ہے۔ دہلی میں اردو اشاعت کے لیے چند پریس بھی قابل ذکر ہیں لبرٹی آرٹ پریس، جے کے آفسیٹ پریس، دعوت پریس، ثمر آفسیٹ پریس، وغیرہ گویا ہر موضوع کی نشرواشاعت میں دہلی ایک مہتم بالشان امتیاز اور افتخار کی مالک ہے۔ ابھی مذہبی موضوعات سے متعلق کتابت وطباعت کا ذکر تھا اب ذرا اس کے

حدود میں اقامت اور استحکام حاصل کرنے والے دینی مدارس و مراکز پر سرسری نظر سے بھی متوجہ ہوں تو مستقبل کے امکانی جہات کا بھی احاطہ ہو سکے گا۔ یہ شہر تقریباً پچاس کیلومیٹر کے حدود میں واقع ہے۔ آزادی کے اعلانیے کے ساتھ فصیلِ شہر کی اردو آبادی اجڑنے اور تاراج ہونے پر مجبور تھی۔ آزادی کی صبح سعادت طلوعِ آفتاب کے ساتھ ادبار اور شب گزیدہ سحر کی سیاہی ساتھ لائی اور نحوست کی تاریکی سب سے پہلے اردو پر اثر انداز ہوئی۔ اپنانے کی جگہ بے گانگی برتنے تسلیم کی جگہ جلاوطن کرنے آئینی استحقاق کی جگہ تقسیم و نفاق کے اہتمام سے پوری فضا مکدر کی گئی گزرگاہ خیال میں اس سلوک کا شائبہ بھی نہ گزرا تھا۔ دنیائے ثقافت یا فلسفہ لسان قاصر ہے کہ کیسے لسانی تنگ دامانی انسانی ذہن کو زیر و زبر کر کے راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے؟ اردو کے اٹھنے اور پنپنے کے آثار معدوم ہو گئے تھے مگر خاکِ اردو کی زرخیزی اور قوت نمو نے مسیحائی کی۔ آبادی کے ارتکاز نے شہر کی قدیم فصیل سے قطع نظر کر کے نئی نئی بستیاں معمور کیں۔ دیکھتے دیکھتے بیرونی شہر کی سرحدوں کے ہر دو جانب چھوٹے بڑے مختلف محلے آباد ہو گئے۔ جو خود شہر کہلانے لگے اوکھلا، ابوالفضل، ذاکر باغ، شاہین باغ، سنگم وہار، مالویہ نگر، حوض رانی، وکاس پوری، سلطان پوری، منگول پوری، علی پور، جہاں گیر پوری، سلیم پور، مصطفیٰ آباد، لونی، جعفر آباد، جیسے پچیسوں نئی گھنی بستیاں وجود میں آئیں۔ جن کے طفیل مساجد اور مدرسے بھی تعمیر کیے گئے۔ ان سب میں تعلیم کا بہت منظم یا مربوط نظام رائج نہ ہونے کے باوجود بھی اردو ہی ذریعۂ تعلیم کے لیے کفیل ہے۔ یہ ادارے جس طرح اردو کی ترویج میں معاون ہیں وہ بے مثل ہے، یہ صرف دہلی پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ پورے ملک میں اردو کو زندہ و پایندہ رکھنے میں مدرسوں کے کارنامے لائق صد ستائش ہیں۔ جن کی بدولت آج اردو ادیب و دانشور، اساتذہ و اکابرین کی صفوں میں ان درس گاہوں سے فارغ افراد و افاضل، کالج کے ایوانوں اور دانش کدوں کے سند یافتہ عالموں کے ہم دوش ہیں اور وہ ایک مستحکم اساس بھی رکھتے ہیں۔
ایک عام جائزے کے مطابق دہلی کے قریہ و شہر میں خورد و کلاں کو ملا کر ڈھائی۔

سے زائد مدرسے بہت ہی موقر اور معتبر خدمت کی انجام دہی میں مصروف کار ہیں۔ پرانے شہر میں تقریباً نوّے مدرسے موجود ہیں۔ جن کے مثبت موثرات سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ اردو کو ان سے جو فیض مل رہا ہے اس کا اعتراف نہ کیا جانا کتمانِ حق ہے۔ اردو صورت حال کو اس سیاق میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرکاری نیم سرپرستی بلکہ سردمہری اور مقدور یا مطالبے سے بہت کم دی جانے والی دلاسائی کے باوجود دارالخلافہ دہلی میں اردو کی فضا نسبتاً بہتر اور بشارت سے بھرپور ہے۔ تاریخی حقایق میں ہے کہ اقلیتی ثقافت ہو یا لسانی گروہ آزمایش وابتلا ان کا مقدر ہوتا ہے اور موج خون سے گزر کر مصافِ زندگی کی کامرانیوں کے لیے پابہ جولاں رہنا ہی اصل حیات وافزایش قرار پاتا ہے۔

اس ریاستی لسانی آئینہ خانے کو ہر گوشۂ رخ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت کم پریشان کن نہیں ہے کہ اعلا درجات یعنی بی اے۔ ایم اے اور ریسرچ میں طلبہ کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے جبکہ دوسرے صوبوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ شاید یہاں مال ومعیشت کے حصول کی خاطر دوسرے مضامین پر زیادہ توجہ ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے دو کالجوں میں آنرس کے درجات میں دو سال سے داخلہ نہیں ہورہا ہے اور شعبہ سکڑتا جارہا ہے۔ اس میں اساتذہ کی کم نظری اور سعی نامشکور کو بھی دخل ہے۔ ایم اے۔ کا حال بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ ہاں نہرو یونیورسٹی میں یہ صورت کافی بہتر ہے۔ سب سے خراب حال جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ہے۔ ایم اے اور ریسرچ دونوں سطح پر تعداد کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے۔ ذہین اور ہونہار طلبہ کی توجہ بھی کم ہوگئی ہے اور جو دلچسپی رکھتے ہیں ان سے ہمارا التفات کم ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ دہلی یونیورسٹی کے ایک کالج میں استاد کی لاپروائی کی وجہ سے شعبہ ہی بند کردیا گیا اور یہ خطرات کئی اداروں پر کابوس بن کر منڈلارہے ہیں دہلی یونیورسٹی کے مراسلاتی کورس میں داخل طلبہ کی ایک بڑی تعداد بے اماں اور بے درماں بھٹکتی رہتی ہے۔ نہ معلم دستیاب ہے اور نہ ہی مراسلت اور مقالے۔ بس رام بھروسے تن بہ تقدیر کی ڈگر پر گاڑی چل رہی ہے۔ اس کورس کی تدریس کے لیے کئی

اساتذہ کی خدمت درکار ہے مگر استاد محترم نہیں چاہتے کہ دوسری آسامیاں پُر کی جائیں اور ان کا بھرم بے نقاب ہوجائے۔ ارباب کار کے جادوئے تاثیر سے انھیں اپنی گردن میں سازِ دلبری کی زنجیر زیادہ بھلی لگتی ہے۔ ایسے ہی دو کالجوں کی استانیاں طلبہ کی کافی تعداد ہونے کے باوجود نہیں چاہتیں کہ دوسرے اساتذہ کا انتخاب عمل میں آئے۔ طلبہ ہوں یا اساتذہ، فن کار ہوں یا ادارے دہلی ہمیشہ سے بیرونی یا ہجرت نشینوں سے آباد رہی ہے۔ ہر محاذ یا منظر نامے میں انھیں کی کثرت آرائی سے اس شہر یا صوبے کی علمی و ادبی ثقافت استصواب حاصل کرے گی۔ جہاں کو ہو یا نہ ہو مگر بہ قول استاد ذوق۔

اے ذوق اس شہر کو ہے زیب اختلاف سے

تعلیم ہو یا تدریس تحقیق ہو یا تنقید براعظم کی نمایندگی کا ارتکاز صرف دہلی میں نظر آئے گا۔ دہلی میں ادبی و تخلیقی صورت حال کا منظر نامہ بھی بڑا ہی حیرت کن ہے تخلیقی جہات کو صدیوں سے سیراب کرنے والی سرزمین کے آب و گل کو کیا ہوا؟ نمو کی قوتیں کس وادی میں کھو گئیں؟ یہ ریگزار عصر حاضر کی تخلیق کو شاید راس نہیں آرہا ہے۔ خاص طور پر شعری فضا تشویش ناک کم مائیگی سے دوچار ہے۔ نثری اصناف میں ایک دو نام بڑے افتخار سے لیے جاسکتے ہیں۔ یعنی فکشن میں عصر رواں کا سب سے بڑا نام اور عظمت وعلویت کی سب سے بڑی علامت قرۃ العین حیدر کو دہلی کی ادبی ارجمندی کا موجب قرار دیا جائے گا۔ کوئی دوسرا نام ان کے ساتھ جوڑا نہیں جاسکتا۔ تاہم افسانے میں جوگیندر پال دہلی کی دوسری شناخت میں نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ ان کے علاوہ دوسرے ناموں کو استقرار حاصل نہیں ہوگا۔ خواہ وہ فحاشی، رکاکت ورذالت کو شیوۂ ہنر گردانیں اور اس ابتذال سے روشناس خلق ہونے کی لاکھ سعی کریں جیسا کہ گذشتہ چند برسوں میں یہاں کے بعض فریب خوردہ فکشن نگاروں نے اعصابی حکمت عملی اپنا کر فن کو سرراہ رسوا کیا ہے۔ ڈرامے میں پروفیسر محمد حسن نے اردو کو اور دہلی کو ایک وقار آگیں امتیاز بخشا ہے۔ فن شعر میں بڑا نام نہیں ہے بڑا کجادرمیان کا بھی فن کار آنکھوں سے

او جھل ہے اور ابھرنے والا بھی نظر نہیں آتا کہ کم سے کم ہماری توقعات کو ہی تسکینِ نظر حاصل ہو۔

مجھے اعتراف ہے کہ یہ تو ایک وہبی شرف ہے جسے بھی مل جائے۔ موجود نہ ہونے پر حیرت روا نہیں ہے۔ میر وغالب کے برعکس جوش قلیل اقامتی ہجرت کے ساتھ دہلی میں کچھ سال رہے۔ اور ایک برگزیدہ شاعر کی حیثیت سے دہلی کی محفلوں میں ممتاز رہے۔ ان کے بعد آج تک دہلی دوریوزہ گری کی صدائے دردناک سے دوچار ہے۔ لب ساقی پر صلا کی تکرار یا تکدر کا سایہ ہنوز گہرا ہے۔ جوش سفر کر کے سرحد پار چلے گئے اور مہاجر کہلائے۔ مقامی شعرا گھروں میں بیٹھے بیٹھے مہاجر بنا دیے گئے۔ بیشہ تخلیق کی تہی دامنی دیکھی نہیں جاتی۔ ان کے بعد بہت ہی پچھلی صفوں میں غلام ربانی تاباں اور شفیع الدین نیر نظر آتے ہیں۔ ان کے بعد سلام مچھلی شہری، عمیق حنفی، شہاب جعفری، حسن نعیم سے کچھ نادیدہ توقعات تھیں۔ عصر رواں میں مخمور سعیدی، عزیز بگھروی، شجاع خاور جیسے دوسرے شعرا کی بالیدگی و برنائی اتمام کو پہنچ چکی ہے۔ کچھ نوجوان بھی صف بہ صف پیراستہ ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی سے خوش گمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت کا میزان فن کے بیش وکم کا فیصلہ کرے گا۔ عہد غالب کے بعد داغ تھے۔ اس درجے کا شاعر بھی ان کے بعد دہلی کی دہلیز پر دستک نہ دے سکا۔ بساط بدلی اور قوت نمو کی تمام زرخیزی شوریت میں تحلیل ہوگئی۔ دہلی شعری تخلیق کے مرگ دوام میں مبتلا ہے۔ کہیں کہیں حرارتِ یک دو نفس کی آس تقویت بخشتی ہے، شاید یہی تخلیقی شرر باری کا باعث بنے۔

تحقیق وتنقید کی صورت حال کسی قدر طمانیت بخش ہے۔ تحقیقی ضابطوں کی حنا بندی کے ساتھ حقایق کی باز آفرینی اور تدوین وترتیب سازی میں مالک رام ڈاکٹر تنویر احمد علوی، رشید حسن خاں پروفیسر نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر خلیق انجم کی خدمات نے پورے ملک کے تناظر کو توسیع طلب بنا دیا ہے۔ ان حضرات کی علمی مہم جوئی سے ابھی امکانات کے مستحکم آثار باقی ہیں۔ ادبی انتقاد میں بھی صورتِ حال گراں مایہ ہے۔ پروفیسر محمد حسن کا نام وجہ تکریم وطمانیت ہے۔ انھوں نے

ادبی وفکری اقدار کی شناخت اور اس کے ممکنہ ابعاد پر بڑی توجہ دی ہے۔ اور فنی موثرات کے سماجی اور تخلیقی رشتوں کی بازآفرینی پر بڑے اہم نکات پیش کیے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لسانیات، اسلوبیات، اور ادبی نظریہ سازی کے امتیازات کے لیے خاص طور پر یاد کیے جائیں گے۔ پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر شمیم حنفی نے نقدادب کی خدمت کی ہے۔ اگرچہ ان حضرات نے فن تنقید پر کوئی کتاب نہیں لکھی جبکہ ان کی یادداشت میں مشرق ومغرب کی شعریات کے اساسی تلازمے محفوظ ہیں۔ کہنے کے لیے دہلی میں ناقدین کی تکثیر بھی ہے اور تنقیدی تفاعل بھی مگر بیشتر حصہ دراساتی ضرورت کے تحت تشریحاتی حصار سے باہر نہیں۔ یہ سرمایہ زیادہ وقیع بھی نہیں ہے مگر یہ متن کی قراءت کی تشویق کے لیے مفید اور ادبی مراجعت کے لیے بہت ہی معاون ہے۔

یہ جائزہ ایک شخصی سعی اور ذاتی اخذِ نتائج کا حاصل ہے۔ اسے کلیہ یا عینیت کا مصدر نہیں کہا جاسکتا۔ میرے تاثرات کی نارسائی اور مفروضات کی ادعائیت یا استنباط کی نفی بھی ممکن ہے۔ مگر یہ عرض کروں گا کہ صورت حال کے بیشتر پہلوؤں کے پیش نظر حالات میں تبدیلی رونما ہورہی ہے اور بہتری کے امکانات ازخود پیدا ہورہے ہیں۔ کیونکہ اس سیاق میں نہ اردو کی کوئی تحریک اٹھی اور نہ پرانی تحریکوں کی تجدید ہوئی۔ اردو کا قافلۂ سخت جاں مصلحتوں اور مملکتوں کی دریابی کے سراب میں گم کردۂ منزل ہے۔ پھر بھی درِ جمہور سے حقوق کی بحالی کی بشارت حدِ امکان سے باہر نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ حقوق یا مطالبات کو منوانے اور موجود جراءتِ جنوں کے اظہار کے لیے ہم تقویم کے کس فردائے قیامت کے منتظر ہیں؟

مجتبیٰ حسین
۲۰۰، انگورا پارٹمنٹس
پٹ پڑگنج، نئی دہلی۔ ۹۲

ذکرِ خیر سیّد حامد کا

(سید حامد صاحب کے چانسلر ہمدرد یونیورسٹی مقرر ہونے کی خوشی میں ۱۱ رستمبر کو دہلی کے اردو گھر میں انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے منعقدہ ایک تہنیتی تقریب میں پڑھی گئی تحریر)

کچھ برس پہلے سابق مرکزی وزیر داخلہ سید سبط رضی کے گھر کوئی تقریب تھی۔ میں اپنی عادت کے مطابق اور سید حامد صاحب اُن کی اپنی عادت کے مطابق تقریب میں بروقت پہنچ گئے۔ کسی نادان کا قول ہے کہ جو اصحاب اپنے عہد کے اعتبار سے قبل از وقت یا بعد از وقت پیدا ہوتے ہیں وہ عموماً جلسوں میں بروقت پہنچ جاتے ہیں۔ میزبان تو خیر موجود تھے ہی لیکن مہمان البتہ خال خال تھے اور تھے بھی تو ایسے مہمان کہ جن سے کم از کم میں تو اپنا منہ چھپانا ضروری تصور کرتا ہوں۔ آزمائش کی اس گھڑی میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دیکھا حامد صاحب دور سے چلے آرہے ہیں۔ جن لوگوں نے سید صاحب کو چلتے ہوئے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ سید صاحب جب سینہ تان کر چلتے ہیں تو اس سے نہ صرف ان کا قد بلند ہو جاتا ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ان کی خودی بھی بلند ہوتی ہوئی دکھائی دے جاتی ہے۔ علامہ اقبال کی طرح وہ صرف خودی کو بلند کر کے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ قد کو بلند کرنا بھی ضروری تصور کرتے ہیں۔ وہ میرے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اتنا ہی کرم فرماتے ہیں جتنا کہ ان کے مزاج کی شائستگی اجازت دیتی ہے۔ اتنا کرم نہیں فرماتے جس کا میں طلبگار یا متمنی ہوتا ہوں۔ میں ان کے پاس گیا تو حسب معمول بڑی شفقت، محبت، خلوص اور نرمی وغیرہ سے پیش آئے۔ ایسی چیزیں اُن کے پاس ہمیشہ وافر مقدار میں موجود ہوتی ہیں۔ ہم دونوں ایک گوشہ میں بیٹھ گئے تو ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے یونہی وقت گزاری کے لیے مخدوم

محی الدین کے ایک عملی مذاق کا قصہ چھیڑ دیا۔ اب جو حامد صاحب اس واقعہ کے ایک ایک پہلو پر بے ساختہ ہنسنے لگے تو میں خود حیران رہ گیا۔ بہت دیر تک ہنستے رہے۔ بعد میں ان کی ہنسی تھمی اور محفل میں کچھ پسندیدہ مہمان آ گئے تو میں کسی اور طرف چلا گیا اور وہ کسی اور طرف۔ کچھ دیر بعد ایک شناسا مل گئے تو انھوں نے بصد اشتیاق مجھ سے پوچھا "ابھی آپ کی باتوں پر جو صاحب یہاں بیٹھے بے ساختہ ہنس رہے [illegible] ساختہ وہ سید حامد تو نہیں تھے؟"۔ میں نے کہا "آپ نے حد کر دی، آپ تو سید صاحب [illegible] طرح جانتے ہیں۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے"۔ بولے "وہ تو میں جانتا ہوں لیکن جس طرح وہ تمھاری باتوں پر دھاڑیں مار مار کر ہنس رہے تھے اس سے شبہ ہوا کہ شاید وہ سید حامد نہ ہوں۔ سنا ہے کہ فرشتے اور سید حامد کبھی نہیں ہنستے"۔ میں نے کہا "خدا کے فضل و کرم سے فرشتوں کو دیکھنے کی نوبت تو خیر اب تک نہیں آئی البتہ سید حامد کو ضرور دیکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ برا وقت آن پڑے تو سید صاحب ہنس بھی لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسی صورتوں میں فرشتے بھی ایسا ہی کرتے ہوں۔"

اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ سید حامد کے بارے میں لوگوں کو کیا کیا بدگمانیاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ نہایت سنجیدہ، متین، بردبار بلکہ گمبھیر انسان ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ ہنسنے سے بالکل عاری ہوں۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا تبسم زیرِ لب اور قہقہہ کے درمیان ایک شائستہ، سلیقہ مند، مہذب اور خوشگوار ہنسی کی حد پر کھڑے ہوئے پایا۔ تبسم کو قہقہہ میں تبدیل نہیں ہونے دیتے۔ کیونکہ ہنسی کے معاملہ میں وہ لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ کبھی غفلت میں خلاف ورزی ہو جائے تو یہ ایک الگ بات ہے۔ ایسی ایر کنڈیشنڈ ہنسی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی۔

سید حامد حکومت ہند کے سینیر آئی اے۔ ایس عہدے دار رہ چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں جاننے کے لیے مجھے دو اور سینیر ترین آئی اے۔ ایس عہدے داروں کی خدمات سے استفادہ کرنا پڑا۔ میری مُراد خواجہ عبدالغفور مرحوم سابق چیف سکریٹری حکومت مہاراشٹر اور ہاشم علی اختر، سابق سکریٹری حکومت آندھرا پردیش سے ہے۔ خواجہ عبدالغفور تو خود مزاح نگار تھے اور آئی اے ایس عہدے دار ہونے کے باوجود بے ساختہ قہقہہ لگانے کو اتنا برا بھی نہیں سمجھتے تھے۔ رشتے میں وہ سید صاحب کے سمدھی بھی ہوتے تھے۔ ان کے فرزند حسن غفور، آئی پی ایس کی شادی سید صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ خواجہ عبدالغفور مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی برس پہلے حسن غفور کی شادی کا جو استقبالیہ دہلی کے "کلارج ہوٹل" میں دیا گیا تھا اس

میں بھی دیکھا کہ خواجہ عبدالغفور تو اپنے دوستوں میں گھرے قہقہے لگانے میں معروف ہیں اور دوسری طرف سید صاحب پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ دُلھن کے والد ہونے کے ناتے شاید انھوں نے عارضی طور پر ایسا سنجیدہ طرز عمل اختیار کر رکھا ہو لیکن بعد کی دو چار محفلوں میں بھی انھیں اسی پوز میں دیکھا تو میں نے غفور صاحب سے پوچھا ''کیا بات ہے کہ سید صاحب ذرا کم ہی ہنستے ہیں''۔ بولے ''تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ خوب ہنستے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ہنسی کی نوعیت الٹی ہوتی ہے یعنی ہم لوگ تو اپنی ہنسی کو اندر سے باہر نکال دیتے ہیں لیکن وہ اپنی ہنسی کو باہر سے اندر کھینچ کر اپنی ذات میں جذب کر لیتے ہیں''۔ اور ان کی اس بات سے میں مطمئن ہو گیا۔

دوسرے آئی۔ اے۔ ایس عہدے دار، جن کی وساطت سے مجھے سید صاحب کو سمجھنے میں مدد ملی، ہاشم علی اختر ہیں جنھوں نے سید حامد صاحب سے علی گڑھ کی وائس چانسلری کا جائزہ حاصل کیا تھا۔ وہ سید صاحب کے بڑے زبردست مدّاح اور معترف ہیں۔ (آئی۔ اے۔ ایس برادری کی بعض مجبوریاں بھی تو ہوتی ہیں)۔ ہاشم علی اختر اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر انھوں نے سید صاحب کی بجائے کسی اور سے علی گڑھ کی وائس چانسلری کا جائزہ حاصل کیا ہوتا تو شاید ان کے لیے یونیورسٹی کو چلانا بہت دشوار ہو جاتا۔ دیکھا جائے تو یوں بھی سید حامد علی گڑھ کے دو حیدرآبادی وائس چانسلروں یعنی پروفیسر علی محمد خسرو اور ہاشم علی اختر کے درمیان ''سینڈوچ'' کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور سینڈوچ بننے کا جو کرب ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ اس وقت تک نہیں لگا سکتے جب تک کہ آپ بسوں کی تین افراد والی نشست پر خود سینڈوچ بن کر بیٹھنے کا تجربہ نہ رکھتے ہوں۔ پروفیسر علی محمد خسرو نے تو اپنے انداز خسروانہ سے یونیورسٹی چلائی لیکن سید حامد ٹھہرے آئی اے۔ ایس عہدے دار۔ وہ سرسید کی یونیورسٹی کو خود سرسید کے بتائے ہوئے راستہ پر چلانے کے خواہشمند تھے۔ بتائیے یہ کتنی غلط بات تھی۔ آپ علی گڑھ کی بات کرتے ہیں۔ بہت لمبا عرصہ گذر جائے تو بعد میں آنے والے ایک عام سیّد کے لیے بھی اپنے پیشرو سیّد کے بتائے ہوئے سیدھے راستہ پر چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یادش بخیر ایک زمانہ کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں کسی نے مشہور کر رکھا تھا کہ اگر خود سرسید بھی دوبارہ پیدا ہو کر علی گڑھ کے وائس چانسلر بن جائیں تو شاید وہ اس یونیورسٹی کو چلا نہ پائیں۔ حالانکہ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایک ہوائی جہاز

چلانے والا سرکار تک چلا سکتا ہے بلکہ ہوائی جہاز سے کہیں زیادہ بہتر طور پر سرکار چلا لیتا ہے لیکن ان دنوں یونیورسٹیوں کو چلانے کے لیے ایک الگ ہی مہارت درکار ہوتی ہے۔ نواب علی یاور جنگ پر جب اُن کے دور وائس چانسلری میں قاتلانہ حملہ ہوا تھا تو غالباً آر۔ کے۔ لکشمن نے ایک کارٹون بنایا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مستقبل میں دانشوروں اور ماہرین تعلیم کو یونیورسٹیوں کا وائس چانسلر نہ بنایا جائے بلکہ اس کام کے لیے پہلوانوں اور باکسروں (Boxers) کی خدمات حاصل کی جائیں۔

وائس چانسلروں کی بات چلی ہے تو ہاشم علی اختر یاد آ گئے جو علی گڑھ کے وائس چانسلر بننے سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ انھوں نے ایک مزے دار لطیفہ بنایا تھا کہ ایک وائس چانسلر مرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہنچا تو اس سے پوچھا گیا کہ وہ نیچے کی دنیا میں کیا کام کرتا تھا۔ وائس چانسلر نے کہا "حضور! ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا"۔ پوچھا گیا "کتنی میعادوں یعنی۔ (Terms) کے لیے؟" جواب ملا "جی صرف ایک میعاد کے لیے" حکم ہوا "اسے جنت میں جانے دو کیونکہ دوزخ کا عذاب یہ نیچے کی دنیا میں پہلے ہی جھیل چکا ہے" حسن اتفاق کہ اس وقت وہاں ایک اور وائس چانسلر جنت میں جانے کے خواہشمندوں کی قطار میں کھڑا تھا جو پہلے وائس چانسلر کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب پہلا وائس چانسلر جنت میں جانے لگا تو دوسرا وائس چانسلر بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ جنت کے داروغہ کی نظر پڑی تو موصوف سے پوچھا "اجی قبلہ! آپ کہاں چلے؟"۔ بولے "جی۔ وہ میں بھی نیچے کی دنیا میں وائس چانسلر رہ چکا ہوں"۔ پوچھا گیا۔ "کتنی میعادوں کے لیے؟" جواب ملا۔ "دو میعادوں کے لیے" اس پر حکم صادر ہوا تب تو اسے لے جا کر دوزخ میں ڈال دو کیونکہ اسے تو دوزخ میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

بہر حال سید حامد نے وائس چانسلری کی اور خوب دھڑلے سے کی۔ دھڑلے کا مطلب یہ کہ جب تک علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے اپنی جان کو ہتھیلی پر سجائے رکھا۔ آج تک کسی نے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھنے کا اتنا لمبا ریکارڈ قائم نہ کیا ہوگا۔ بڑے ہنگامے ہوئے، گولی چلی، مفاد پرستوں کے مفادات پر ضرب کاری لگی۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی بند ہو گئی۔ مگر جب کھلی تو ایسے کھلی کہ بند ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ طلبہ ہیں کہ چپ چاپ پڑھے چلے جا رہے ہیں اور اساتذہ

ہیں کہ پڑھائے چلے جارہے ہیں (پتی نہیں بلکہ سچ مچ کی کتابیں)۔ بظاہر مرنجان مرنج دکھائی دینے والے سید صاحب کے عزم، حوصلے اور پختہ ارادے کی یہ ایک چھوٹی سے مثال تھی جو یونیورسٹی کے حق میں بہت بڑی ثابت ہوئی۔

سید صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ نہایت اصول پرست اور ایماندار آدمی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایمانداری کا کوئی سرٹیفکیٹ اپنے پاس نہیں رکھتے۔ یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پچھلے دنوں احباب کی محفل میں ایک سیاسی رہنما کی دیانت داری اور ایمانداری پر کسی نے انگلی اٹھائی تو مذکورہ رہنما کے حامی نے برملا کہا ''آپ تو ان کی ایمانداری پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتے کیونکہ ان پر اب تک بدعنوانیوں اور گھوٹالوں کے دس مقدمے چل چکے ہیں اور ماشاءاللہ وہ ان سب سے باعزت بری ہو چکے ہیں۔ آپ کو ان کی ایمانداری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے۔''

ہمارے سید صاحب کی ایمانداری میں بس اتنی سی کسر رہ گئی ہے کہ اپنی ایمانداری کا کوئی ثبوت اپنے پاس نہیں رکھتے حالانکہ زمانہ بڑا خراب ہے۔ ثبوت کے بغیر کسی بات کو نہیں مانتا۔ سید صاحب اصول پرست ایسے ہیں کہ کسی دوست کے کام کے لیے ان سے سفارش کرو تو پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ کہیں دوست کے کام سے ان کے کسی دشمن کو نقصان تو نہیں پہنچے گا۔ ایک بار دشمن کی طرف سے سید صاحب مطمئن ہو جائیں تو تب کہیں جا کر وہ دوست کے فائدے کی بات سوچتے ہیں۔ اللہ اللہ کیا اصول پسندی ہے۔ حالانکہ فی زمانہ اصولوں کو توڑنا ہی سب سے اچھا اصول سمجھا جاتا ہے بلکہ جو شخص اصولوں کو نہیں توڑتا لوگ اُسے ہی توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ سید صاحب کسی وجہ سے اب تک نہیں ٹوٹے یہ ایک الگ بات ہے۔ پھر پائیداری بھی تو ایک چیز ہوتی ہے۔ خوب یاد آیا ایک زمانہ میں مجھے احباب کے کاموں کے سلسلہ میں صاحبان اقتدار سے سفارش کرنے کا ہوکا سا تھا۔ دن بھر دوستوں کے کاموں کے لیے مارا مارا پھرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب اپنے لیے مارا مارا پھرتا ہوں۔ جب سید صاحب اسٹاف سلیکشن کمیشن کے صدرنشین تھے تو ایک دوست نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان کے بھائی کے تقرر کے سلسلہ میں سید صاحب سے سفارش کردوں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ سید صاحب سفارش کو ناپسند کرتے ہیں میں

نے اپنے دوست کے بھائی کی سفارش ان سے کردی۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کاغذ میرے ہاتھ سے لے کر رکھ لیا اور حسب عادت کوئی وعدہ نہ فرمایا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے دوست کا تبادلہ تریویندرم ہوگیا اور بعد میں وہ وہاں سے کسی خلیجی ملک میں چلے گئے۔ گویا برسوں ان سے کوئی ربط ضبط نہ رہا۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے۔ ان سے اچانک ملاقات ہوگئی تو دنیا جہان کی باتیں ہوئیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اُن کے بھائی کے تقرر کی بات کو تقریباً بھول چکا تھا۔ خود ہی یاد دلایا" بھئی! آپ کو یاد ہوگا کہ کئی برس پہلے آپ نے میرے بھائی کے سلسلہ میں سید حامد صاحب سے سفارش کی تھی۔" میں نے کہا" مگر میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سید صاحب سفارش کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ میں کیا کرسکتا ہوں"۔ اس پر میرے دوست نے کہا" آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ بھئی! میرے بھائی کا تقرر تو تبھی ہوگیا تھا۔ گردش روزگار نے مہلت ہی نہ دی کہ آپ کو یہ خوشخبری سناتا۔ ماشاء اللہ اب تک اُسے چار ترقیاں بھی مل چکی ہیں۔ کبھی سید صاحب سے ملاقات ہو تو شکریہ ادا کر دیجیے۔" میں نے کہا" بھیا! اب تو تمھارا بھائی چند برسوں میں ریٹائر ہونے والا بھی ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اب تو اس کے ریٹائر ہونے کے بعد ہی سید صاحب کا شکریہ ادا کرنا مناسب ہوگا۔" ڈاکٹر خلیق انجم کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس تہنیتی تقریب کے انعقاد کے ذریعہ مجھے سید صاحب کا شکریہ ادا کرنے کا موقع عطا فرمایا ورنہ میرے دل میں ایک خلش سی رہ جاتی۔ بہر حال یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ سید صاحب کسی کی سفارش نہیں سنتے۔

اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مجھے کتابی چہروں، کتابی باتوں اور کتابی حوالوں سے ہمیشہ اُنس رہا ہے۔ مگر مجھے آج تک ایسا کوئی فرد نہیں ملا جو زبانی گفتگو بھی کرے تو یوں معلوم ہو جیسے کتاب پڑھ کر بول رہا ہے۔ میں نے سید صاحب کے علاوہ کسی اور کو مطبوعہ گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ بخدا جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں، چاہے وہ انگریزی میں ہو یا اردو میں، ایسی نپی تلی، مرصّع اور سجی سجائی زبان بولتے ہیں کہ مجھے تو ان کی تقریر میں جا بجا فل اسٹاپوں اور کاموں (Comas) سے لے کر سیمی کولنوں (SemiColons) تک کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ سید صاحب

کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ جو زبان وہ بولتے ہیں وہی زبان لکھتے بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر دو صورتوں میں ان کے قاری یا ان کے سامع کو بسا اوقات ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے (کم از کم مجھے تو آتی ہے)۔ کتاب پڑھتے وقت ڈکشنری دیکھنے کو میں بُرا نہیں سمجھتا لیکن یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ ایک شخص تقریر کر رہا ہو اور لوگ اس کے سامنے بیٹھے ڈکشنریوں کے صفحات الٹتے پلٹتے رہیں۔ اس سے تقریر کی روانی بھی متاثر ہوتی ہے۔ لگے ہاتھوں اس بات کا انکشاف کرتا چلوں کہ پچھلے دنوں میں نے سید صاحب کا ایک ایسا مضمون پڑھا ہے جسے پڑھنے کے دوران میں مجھے ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس پر میں نے اپنے ایک دوست سے کہا "مجھے لگتا ہے کہ یا تو میری نجی لیاقت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے یا پھر سید صاحب ہی عام فہم مضامین لکھنے لگے ہیں۔ بولے "مجھے تو اول الذکر کا اندیشہ بالکل ہی کم اور آخر الذکر کا امکان زیادہ نظر آتا ہے۔" خدا کرے ایسا ہی ہو۔

سب سے آخر میں اُس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا ذکر اصولاً سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے سید صاحب نہایت بےلوث، بےنیاز اور صوفی منش انسان ہیں ۔ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے نہ تو گورنر بننے کی کوشش کی اور نہ ہی سفیر بننا گوارا کیا۔ حد تو یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں جانے کی کوشش بھی نہیں کی حالانکہ ایرے غیرے تک اب وہاں جانے لگے ہیں بلکہ وہی جا رہے ہیں۔ علی گڑھ کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہوئے تو حکیم عبدالحمید کی سرپرستی میں ہمدرد کے تعلیمی پروگرام سے وابستہ ہو گئے۔ اب ان کی زندگی کا ایک ایک لحہ ملک اور ملت کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف ہوتا ہے اور یہ ان کی کوئی معمولی دین نہیں ہے۔ ایک بار وائس چانسلر بننے کے بعد انھوں نے دوبارہ وائس چانسلر بننا بھی پسند نہ کیا۔ اس لیے کہ ہاشم علی اختر کے بنائے ہوئے لطیفہ کو انھوں نے اپنی گرہ میں کس کر باندھ لیا ہے۔ مانا کہ اب وہ ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہو گئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے ان کی عام تعلیمی تحریکوں اور سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ وائس چانسلری چلانے کے لیے آدمی میں جن بے پناہ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے شاید وہ چانسلری چلانے کے

لیے درکار نہیں ہوتیں بلکہ صلاحیتیوں کے نہ ہونے کو اور بھی مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

سید صاحب نے ملت کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا ہے وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی طرف دھیان دینے کی ہم جیسوں کو کبھی توفیق عطا نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ گھاٹے کا سودا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گھاٹے کے اس سودے میں قوم کا فائدہ مضمر ہے لیکن ہم جیسوں کو قوم کے فائدے سے کیا مطلب۔ خدا تا دیر سید صاحب کو ہمارے درمیان تندرست، توانا اور سلامت رکھے تاکہ ہم لوگ تو پوری بے فکری کے ساتھ کرنسی والی دولت کو سمیٹتے رہیں اور سید صاحب علم کی دولت کو آنے والی نسلوں میں بانٹتے رہیں۔ تقسیم کار ہمیشہ اچھی چیز ہوتی ہے۔ ذرا دیکھیے تو سہی مضمون ختم ہونے لگا ہے تو سید صاحب کے تعلق سے کتنی ہی اچھی اچھی باتیں ذہن میں آنے لگی ہیں مگر وہ جو غالب نے کہا ہے۔ ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

نصرت ظہیر
4/15 کھچڑی پور کالونی، دہلی ۹۱

اردو صحافت کی ڈائریکٹری

مودود علی صدیقی صاحب کی مرتب کی ہوئی اردو اخبارات ورسائل کی ڈائریکٹری . بلکہ ڈکشنری . اس وقت میرے سامنے ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ فوراً سے پیشتر اس پر کوئی تبصرہ کر دوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، تبصرہ کرنا میری کتنی بڑی کمزوری ہے۔ جب بھی کوئی چیز سامنے آجاتی ہے فوراً اس پر تبصرہ کر دیتا ہوں۔ بلکہ کئی بار تو میں نے تبصروں پر بھی تبصرہ کر دیا ہے۔ (اللہ معاف کرے)

بہر حال اس وقت تو مودود صدیقی اور ان کی مرتبہ ڈائریکٹری دونوں ایک ساتھ میرے ذہن پر سوار ہیں اس لیے کیوں نہ بات اول الذکر کے ذکر سے شروع کی جائے۔

مودود صدیقی کے نام سے میں تقریباً پچیس سال پہلے اس وقت آشنا ہوا تھا جب رسالہ ''بیسویں صدی'' کے مالک و مدیر لالہ رام رکھا مل (خوشتر گرامی) نے رسالہ میں اچانک یہ چھاپنا شروع کر دیا کہ اس شخص سے ہوشیار رہیں۔ یہ بیسویں صدی کا بہت سارو پیہ لے کر فرار ہو چکا ہے اور نہایت شاطر آدمی ہے۔

لڑکپن کا زمانہ تھا۔ اور ہم لوگ اردو کے قاری تھے۔ پکّی روشنائی میں لکھے ہر جھوٹ کو سچ مان لیتے تھے۔ اس لیے ذہن نے لالہ جی کا یک طرفہ بیان بھی فوراً قبول کر لیا بلکہ میں اور میرے دوست تو اس قدر محتاط ہو گئے کہ جب بھی دہلی سے کوئی نیا شخص ہمارے شہر میں آتا، اور ہماری اس سے ملاقات ہوتی تو فوراً سب لوگ اپنے سگریٹ کے پاکٹ اور ماچس جیبوں میں چھپا لیتے اور جب یہ پتہ چل جاتا کہ آنے والے کا نام مودود صدیقی نہیں ہے تبھی سلام علیکم کہتے!

پھر کوئی ایک ڈیڑھ سال بعد مودود صاحب کا نام ادبی ماہنامہ ''سو برس'' کے پرنٹر پبلشر کی حیثیت سے پڑھنے میں آیا۔ ذہن نے فوراً کہا . اوہو، تو بیسویں صدی کا بہت سارو پیہ لے کر یہ حضرت اکیسویں صدی میں آگئے ہیں!

''سو برس'' کے مدیر نشتر خانقاہی تھے، اور یہ اس قدر معیاری ادبی رسالہ تھا کہ ''بیسویں صدی'' اس کے آگے ایک بھونڈا مذاق معلوم ہونے لگا۔ ''سو برس'' میں ادب چھپتا جبکہ

''بیسویں صدی'' میں ادیب چھاپے جاتے تھے۔ دراصل لالہ خوشتر گرامی کی ''بیسویں صدی'' بہت سوں کے نزدیک بنیے کی دکان تھی، جس میں ہر تخلیق کار کو اس کی ڈگریوں سے تولا جاتا تھا۔ ہر جاہل ایم اے اور ناخواندہ پی ایچ ڈی اس میں نمایاں طور پر چھپ سکتا تھا!

''سو برس'' اتنی عمدگی سے شائع ہو رہا تھا کہ ہم اس کے ہر شمارے کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے بلکہ چند ماہ بعد تو ہم اس کے اس درجہ عاشق ہو گئے کہ مودود صدیقی کے تعلق سے ہمیں ہر ''شاطر آدمی'' اچھا لگنے لگا۔

تاہم ''سو برس'' کا انجام وہی ہوا جو اردو کے ہر معیاری ادبی جریدے کا ہوتا آیا ہے۔ ڈیڑھ دو برس میں ہی ''سو برس'' بند ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے سے پوچھتے رہ گئے۔ ''تو کیا اس مرتبہ مودود صدیقی خود ہی اپنا بہت سارا روپیہ لے کر بھاگ گئے ہیں؟''

چند سال بعد خادم بھی دہلی منتقل ہو گیا۔ تب پتہ چلا کہ واقعہ کچھ اور تھا لالہ رام رکھا مل، بیسویں صدی کو بیچنا چاہتے تھے اور اس کام میں کچھ روکاوٹیں آ رہی تھیں۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر ان روکاوٹوں کے لیے وہ اپنے منیجر مودود صدیقی کو ذمہ دار سمجھنے لگے۔ بس یہیں سے کچھ بداعتمادی پیدا ہوئی اور انھوں نے کوئی ڈیڑھ ہزار روپے بنک سے جعلی طور پر نکالے جانے کے الزام میں مودود صاحب کے خلاف ایف آئی آر درج کرا دی تھی۔ اسی مودود صدیقی کے خلاف جسے پیار سے ''بیٹا بیٹا'' کہتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی! بہر کیف، تفتیش سے پتہ چلا کہ اس روز تو بنک ہی بند تھا! تب جا کر معاملہ ختم ہوا اور مودود صاحب نے غصہ میں آ کر ''سو برس'' نکال دیا۔ لہٰذا، اس لحاظ سے اردو ادب کی جو خدمت ہوئی اس کا سہرا لالہ خوشتر گرامی کے ہی سر جانا چاہیے کہ نہ وہ مودود صاحب پر جھوٹا الزام لگاتے نہ انھیں غصہ آتا اور نہ ان سے یہ خدمت سرزد ہوتی۔

ان دنوں فکر تونسوی اکثر ان سے کہا کرتے تھے ''یار مودود۔ یہ لالہ مجھے بھی بیٹا بیٹا کہتا ہے۔ ڈرتا ہوں کسی دن جیل نہ بھجوا دے!''

مودود صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۱ء میں ہوئی جب میں ''ملاپ'' میں سب ایڈیٹری فرماتا تھا۔ افسانہ نگار ظہیر کیفی امروہوی اکثر ملاپ کے دفتر میں آتے رہتے تھے، وہی اس ملاقات کا سبب بنے۔ میں نے انھیں بیسویں صدی کے دفتر میں (تب تک وہ دوبارہ منیجر کی حیثیت سے واپس آ چکے تھے) میز کے پیچھے ایک اونچی کرسی پر اس طرح بیٹھے دیکھا کہ سامنے کئی ٹیلی فون رکھے ہیں، کبھی یہ بج رہا ہے کبھی وہ، دائیں بائیں کئی فائلیں اور دوسرے کاغذات سلیقے سے رکھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں فون کا رسیور ہے دوسرے میں قلم۔ کسی سے بات بھی چل رہی ہے۔ فائلیں بھی پڑھی جا رہی ہیں۔ دستخط بھی ہو رہے ہیں۔ سامنے بیٹھے ملاقاتیوں سے حال

چال بھی پوچھا جارہا ہے۔نوکر کو ان کے لیے چاۓ وغیرہ لانے کی ہدایت بھی دی جارہی ہے اور ملاقاتی سے پچھلے ہفتے بروقت نہ آنے کا گلہ بھی کیا جارہا ہے۔

یہ سارے کام وہ ایک ساتھ کرتے تھے اور مجال ہے جو کسی کام میں ذرا بھی گڑ بڑ ہو جائے۔ یقین کیجیے، اگر ان کی جگہ کوئی اور اس طرح کام کرنے بیٹھتا تو جس کا ٹیلی فون آیا ہے اُسے چاۓ لانے کے لیے کہہ دیتا، نوکر پر دستخط کر دیتا اور سامنے بیٹھے شخص سے یہ شکایت کرنے لگتا کہ جناب آپ کی آواز صاف نہیں آرہی ہے۔

مودود صاحب کمپیوٹر کی طرح سب کام کھٹا کھٹ اور ٹھیک ٹھیک کرتے تھے، اور اب بھی کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کوئلے والے انجن کی طرح نہیں جسے دیکھ کر مجھے عموماً عام ہندستانی مسلمان کی زندگی یاد آجاتی ہے کہ اوّل تو چلتا نہیں۔ چلے تو بھک بھک شور کرتا ہے۔ دھواں بھی دیتا ہے اور بھاپ بھی چھوڑتا رہتا ہے۔ مودود صاحب کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ الیکٹرک انجن یاد آتا ہے جو بہت زیادہ کھڑ بڑ کیے بغیر خاموشی سے، ایک دم رفتار پکڑتا ہے اور بڑے سکون واطمینان سے اسٹیشن پر پہنچادیتا ہے۔ نہ ماحول میں دھوئیں کی کثافت پھیلتی ہے نہ شور کی۔ ان کی روز مرہ زندگی کی رفتار میں نے عام لوگوں کے مقابلے میں دوگنی پائی ہے اور میرا خیال ہے کہ پچاس پچپن کی عمر میں وہ کم از کم سو برس تو جی ہی چکے ہوں گے!

مگر اس تیز رفتاری میں بھی وہ ہر معاملہ کو جتنی باریکی سے دیکھتے ہیں اور معمولی جزئیات تک کا جس قدر خیال رکھتے ہیں اسے دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ ایسے شخص کو تو کسی نوادرات کے میوزیم میں رکھ دیا جانا چاہیے تاکہ آنے والی نسلیں دیکھ کر عبرت پکڑ سکیں۔ (بشرطیکہ ان کے پاس دیدۂ عبرت نگاہ ہو!)

یہ باریک بینی مودود صاحب کی تیار کردہ اردو اخبارات ورسائل کی ڈائرکٹری میں بھی جابجا نظر آتی ہے چنانچہ اب تیار ہو جائیے کہ خادم مودود صاحب کا پیچھا چھوڑ کر ان کی ڈائرکٹری کے پیچھے پڑتا ہے۔

ڈائرکٹری کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کا پہلا صفحہ آخر میں چھاپا گیا ہے۔ اس کی وجہ تدوین کی گڑبڑ یا جز بندی کا گھپلا نہیں بلکہ یہ ہے کہ اردو اخباروں کی یہ ڈائرکٹری اردو میں نہیں انگریزی میں شائع ہوئی ہے۔

کئی اردو والوں کے لیے یہ پہلی خوبی ہی پہلا اعتراض ہے۔ ظاہر ہے جنھوں نے تمام عمر دائیں سے بائیں پڑھنے میں گزاری ہو ان کے لیے بائیں سے دائیں کی طرف رجعت ذرا مشکل ہو جاتی ہے۔ دراصل ہم اردو والے اس قدر دایاں پرست ہو گئے ہیں کہ ہمارا بس چلے تو

ہر بائیں کو دایاں کر دیں۔ اردو اخبار، اردو رسالے اور اردو دعوت نامے پڑھ پڑھ کر ہم اس درجہ اردو زدہ ہو جاتے ہیں کہ آکسفورڈ یا چیمبرز کی انگلش ڈکشنری بھی ہاتھ میں لیں تو سوچنے لگتے ہیں، کاش یہ بھی دائیں سے بائیں ہوتی۔

حالانکہ یہ خاصی خطرناک بات ہے۔ دائیں والی چیز کو بائیں سے اور بائیں والی کو دائیں سے پڑھنے میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ ایک صاحب کو کسی شادی کا دعوت نامہ ملا جو اردو میں چھاپا گیا تھا لیکن پروگرام کی تاریخیں اور اوقات انگریزی میں چھاپ دیے گئے۔ حضرت کی عادت تھی بائیں سے دائیں پڑھنے کی۔ چنانچہ کئی صفحوں پر نہایت اہتمام سے چھپے ہوئے اس دعوت نامے کو پڑھ کر وہ ولیمہ کی دعوت میں پہنچ گئے اور جب ولیمہ کھا چکے تو منتظمین سے پوچھنے لگے۔ نکاح کب ہے!

بہرحال ناشرین (آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس) کا کہنا ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر یہ خطرہ مول لیا ہے اور اسے قصداً انگریزی میں شایع کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ڈائریکٹری کا پہلا صفحہ شروع میں چھپتا تو وہ غیر اردو دانوں کی سمجھ میں نہ آتی۔ اسی طرح جس طرح بیشتر اردو دانوں کی سمجھ سے وہ کتابیں باہر رہتی ہیں، جن کا شروع ان کی دانست میں، آخر میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔

اس پہلی خوبی کی جزوی خوبی یہ ہے کہ لکھنؤ کے کسی پندرہ روزہ "آگ" سے شروع اور بہار اردو اکادمی کے دوماہی رسالہ "زبان وادب" پر ختم ہونے والی اس ڈائریکٹری کو پڑھ کر بہت سے اردو والے انگریزی کی الف بے تے ضرور جان جائیں گے اور تھوڑی بہت انھیں بائیں سے دائیں پڑھنے کی بھی عادت ہو جائے گی، جس سے ان کے دائیں پن (Rightism) میں تھوڑا بایاں (Leftism) آنے کی امید بھی کی جا سکتی ہے اور یہ اس جزوی خوبی کی ضمنی خوبی ہوگی!

ڈائریکٹری کو موٹے طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا وہ جس میں اردو کے ان اخبارات و رسائل کا ذکر ہے جنھوں نے اپنا احوال مودود صاحب کو بھیج دیا تھا۔ اور دوسرا وہ جس میں احوال نہ بھیجنے والوں کے نام ہیں۔ اور یقین کیجیے کہ دوسرا حصہ پہلے حصے سے کم از کم دس گنا بڑا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو اخباراوروں کا حال دنیا بھر کو بتا دیتے ہیں لیکن اپنا احوال کسی کو نہیں بتاتے۔

پہلے حصے میں ہر اخبار کے بارے میں اہم معلومات دی گئی ہے۔ مثلاً وہ کتنے دن میں شائع ہوتا ہے، کب سے چھپ رہا ہے، ایڈیٹر پرنٹر وغیرہ کون ہے، اشتہارات کی شرحیں کیا ہیں، تعداد اشاعت کتنی ہے وغیرہ وغیرہ۔

پھر بھی بہت سی معلومات چھوڑ دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر، یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اگر اخبار ہفت روزہ ہے تو وہ کتنے دنوں میں چھپتا ہے یعنی وہ ماہوار ہفت روزہ ہے یا سالانہ ویکلی۔

دراصل اردو میں اخباروں اور رسالوں کے چھپنے کا اپنا الگ ہی وقت ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں اکثر ہفت روزے مہینوں میں اور ماہنامے برسوں میں شائع ہوتے ہیں۔ البتہ روزنامے پوری پابندی سے الیکشن کے دنوں میں روزانہ چھاپے جاتے ہیں۔ بلکہ کئی روزنامے ایسے ہیں کہ چناؤ چل رہے ہوں تو اپنے اندر سے ایک اور روزنامہ نکال دیتے ہیں۔

اسی طرح ڈائریکٹری میں یہ ذکر تو ہے کہ کون سا اخبار کب شروع ہوا مگر اسے بند ہونے کی سعادت کب حاصل ہوگی یا ہونے والی ہے، اس کا اشارہ بالکل نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی نہیں بتایا گیا ہے کہ اخبار کی پالیسی کیا ہے اور وہ کس پارٹی کا حامی ہے؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی کوئی پالیسی ہی نہ ہو۔ موقع دیکھ کر رخ بدلتا رہتا ہو۔ یہ معلومات بھی دے دی گئی ہوتی تو پارٹیوں کے لیے بھی آسان رہتا۔ اخبار بھی فائدے میں رہتے اور اردو قارئین بھی اپنی پالیسی سے میل کھانے والے اخبار بہ آسانی چن لیتے۔

بعض اخباروں کے نام عجیب سے ہیں۔ مثلاً ہفتہ وار نبض شرافت، روزنامہ دکھتی رگ، آخری دنیا، بھیونڈی کی صبح وشام، خوف آخرت، ٹینڈر ڈیٹکلو۔ ایک اخبار ایسا ہے کہ میرا خیال ہے اسے چھاپنے پر سب سے کم خرچ آتا ہوگا اور آپ میں سے بھی کوئی صاحب چاہیں تو اسے بے کھٹکے شائع کر سکتے ہیں۔ اخبار کا نام ہے ''کورا کاغذ''۔ میری سمجھ سے یہ دنیا کا پہلا اخبار ہوگا جو پڑھنے کی بجائے لکھنے کے کام آئے گا۔

ڈائریکٹری میں مودود صاحب نے اخبارات وجرائد سے متعلق بہت سے اعداد وشمار بھی شامل کردیے ہیں جن سے دنیائے صحافت میں اردو کی حیثیت کے بارے میں کئی اہم باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اخباروں کی تعداد کے لحاظ سے ہندی اور انگریزی کے بعد تیسرا نمبر اردو کا ہے اور یہ تعداد لگاتار بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۹۵ میں یہ ۲۴۵۸ تھی، ۱۹۹۶ میں ۲۵۶۷ ہوئی، اور ۱۹۹۹ میں اندزاً ۲۹۷۳ تک پہنچ گئی ہوگی بلکہ کچھ عجب نہیں جو ۲۹۴۱ ہی ہوگئی ہو۔ بہر حال عجیب بات یہ ہے کہ انگریزی اخباروں کی تعداد اور سرکولیشن دونوں میں تیزی سے کمی آرہی ہے اور ان کی شرح نمو منفی ۴۱.۳۵ فیصد ہے۔ اس کے برعکس ہندی کی شرح مثبت ۷.۸۸ فیصد اور اردو کی ۹.۲۳ فیصد ہے۔ چنانچہ جو لوگ اردو کی مرثیہ نگاری میں فضیلت رکھتے ہیں انھیں سوچنا چاہیے، آخر ایسا کیوں ہے کہ اردو نسل ان کے بقول سمٹ رہی ہے اور اردو اخبار لگاتار پھیل رہے ہیں؟

اور بھی بہت سے چیزیں ڈائریکٹری میں شامل ہیں۔ مثلاً، نیوز ایجنسیوں کے پتے، اردو اکادمیوں کی فہرست، اخبارات سے متعلق اہم تنظیموں، اردو نیوز فیچر ایجنسیوں، انڈین نیوز پیپر سوسائٹی کے ممبر اخباروں، ریاستی اطلاعاتی مراکز وغیرہ کی فہرستیں اور اخبار یا رسالہ نکالنے کا مکمل

طریقہ کار۔ اس آخری چیز سے ڈائریکٹری پڑھنے والا سب سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے کیونکہ اس میں اخبار کے رجسٹریشن وڈکلیریشن سے لے کر نیوز پرنٹ حاصل کرنے کے ضابطوں اور درخواست فارموں کے نمونوں تک ہر طرح کی معلومات دے دی گئی۔

تاہم یہ حصہ قارئین کے لیے اور بھی سود مند ثابت ہو سکتا تھا اگر اس میں کچھ اور ضروری معلومات بھی جمع کردی گئی ہوتی۔ مثلاً یہ کہ اخبار کو اپنی پالیسی کس طرح منتخب کرنی چاہیے (ظاہر ہے اردو اخبار کسی پالیسی کے بغیر کیسے نکل سکتا ہے) زیادہ سے زیادہ نیوز پرنٹ حاصل کر کے اسے بلیک میں بیچنے کے کیا طریقے ہیں (یہاں بلیک میں نیوز پرنٹ خریدنے والوں کی فہرست دی جاسکتی تھی) تعداد اشاعت کم رکھ کر بھی، اسے زیادہ سے زیادہ دکھانے اور اے بی سی (آڈٹ بیورو آف سرکولیشن) کو الو بنانے کے لیے کیا ڈھنگ اپنایا جائے، اخبار نکل جائے تو سب ایڈیٹر حضرات کا استحصال کرنے کی آسان ترکیبیں کیا ہیں، خبروں کے ذریعہ کسی کو بلیک میل کرتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ امید ہے مودود صاحب ڈائریکٹری کا آئندہ اڈیشن نکالتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیں گے اور ڈائریکٹری صرف اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے ممبروں تک محدود نہیں رکھی جائے گی بلکہ عام عوام بھی چاہیں تو اسے کم قیمت پر (یا قیمت زیادہ ہو تو کرایہ پر) حاصل کر کے مستفید ہو سکیں گے۔ پھر دیکھیے اردو اخباروں کی تعداد کس تیزی سے بڑھتی ہے۔ اگر دو سال میں ہی اردو صحافت ہندی اور انگریزی صحافت سے آگے نہ نکل جائے تو خادم کا نام بدل کر (کوئی اچھا سا نام) رکھ دیجیے گا!

بہر حال اس سب کے باوجود ڈائریکٹری کی یہ اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے کہ اردو صحافت کے تعلق سے اپنی نوعیت کی یہ پہلی ڈائریکٹری ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے ہمیں اس کے ناشرین جناب م۔ افضل کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جنھیں ناشر کی بجائے ناشرین میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں (اور اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے صدر بھی)

لیکن پوری ڈائریکٹری کو پڑھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں، کہ اتنی محنت، عرق ریزی اور باریک بینی کے ساتھ ڈائریکٹری کو مرتب کرنے والے اردو کے اس خاموش خادم کو کیا ملا ہوگا جس کا نام مودود علی صدیقی ہے۔ اردو کے لیے دن رات ہر طرح سے قدمے سخنے حاضر رہنے والا یہ شخص دامے درمے والی ہستی آج تک کیوں نہیں بن سکا۔ شاید ان کے بارے میں ریلوے انجن والا وہ تجزیہ ٹھیک ہی ہے۔ ریل کا انجن جانے کتنے مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچا دیتا ہے مگر خود کہیں نہیں پہنچتا۔ زندگی بھر ایک پٹری پر دوڑتا رہتا ہے! مودود صاحب کا بھی یہی معاملہ ہے۔

عبدالاحد ساز
زکریا مینور، چوتھا منزلہ
۱۴۹، یوسف مہر علی روڈ
ممبئی۔۴۰۰۰۰۳

غزل

نہ مقامات نہ ترتیب زمانی اپنی
اتفاقات پہ مبنی ہے کہانی اپنی

جم سی جاتی ہے تہہ حرف کسی کرب کی لہر
تھم کے رہ جاتی ہے لفظوں کی روانی اپنی

پھیل جاتی تھی سماعت کی زمینوں میں نمی
تھی کبھی تر سخنی آب رسانی اپنی

اک ستم اور پئے زینت طاق نسیاں
بھول جانے کی تو عادت ہے پرانی اپنی

لاکھ تم ہم کو دباؤ ہم ابھر آئیں گے
سطح ہموار کیسے رہتا ہے پانی اپنی

ماجرا روح کی وحشت کا نجی ہے اے ساز
آگے روداد نہیں ہم کو سنانی اپنی

ذاکر خاں ذاکر
عبدالمجید صاحب (پٹواری)
نزد مسجد توپخانہ
جھالاواڑ (راج) ۳۲۶۰۰۱

غزل

دل کے ٹکڑے اور آنکھوں کی نمی رہ جائے گی
تم نہ آئے تو ادھوری زندگی رہ جائے گی

موت اتنے پیار سے لے گی مجھے آغوش میں
زندگی بے بس کھڑی منھ دیکھتی رہ جائے گی

ڈوب جاؤں گا میں سورج کی طرح جب شام کو
چاند اور تاروں میں میری روشنی رہ جائے گی

ساری دنیا کی کتابوں کے ورق اڑ جائیں گے
دو جہاں میں بس کہانی پیار کی رہ جائے گی

خاک میں مل جاؤں گا اک روز تم بھی دیکھنا
اور تنہا راہ میں آوارگی رہ جائے گی

ہم نہ ہوں گے پھر بھی ذاکر پڑھنے والوں کے لیے
داستاں اپنی کتابوں میں سجی رہ جائے گی

کوثر مظہری
شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

غزل

سکوں تلاش کریں ہم کہاں بتاؤ تو
جہاں میں ہے کوئی کنج اماں بتاؤ تو

کسی ڈگر پہ چلیں ہم وہیں پہنچتے ہیں
ہے کس کا نقش پا ہم میں نہاں بتاؤ تو

الاؤ دل میں ہے لیکن شعور خود ضبطی
کبھی دکھائی دیا ہے دھواں بتاؤں تو

ہمیں تو لگتا ہے سب کچھ بدل گیا صاحب
وہی زمیں ہے وہی آسماں بتاؤ تو

تمھارے واسطے پلکیں بچھا تو سکتے ہیں
کہاں سے لائیں کوئی کہکشاں بتاؤ تو

کوئی تو نسخہ تمھارے حصول کا ہوگا
نہیں زباں سے، اشارے سے ہاں بتاؤ تو

احمد کفیل
۲۲۲۔ای۔ برہمپترا ہاسٹل ۔ جے۔این۔یو۔ نئی دہلی

ساز مستقبل

بجاتا جا رہا ہے وقت ۔ اپنا ساز مستقبل
تو کیوں مایوس ہوتا ہے۔؟
تو کیوں مغموم ہوتا ہے۔؟
حسین یادوں کے جانے سے...
محبت کے ترانے سے...
تری ضد ہے بجا لیکن ۔اسے جانا ہے جانے دے
کھڑا ہے جس جگہ اس وقت
تیری رہ گزر ہے یہ
جہاں تو چاہتا ہے ٹھہرنا ۔۔منزل نہیں ہے یہ
ابھی کتنی ہی زلفیں وقت کی ۔۔ہیں منتظر اپنی
کہ اپنے دست زریں سے...جنھیں شانہ بھی کرنا ہے
تجھے تو سوئے منزل پا بہ جولاں چلتے جانا ہے
حنائی صبح آئے گی ۔۔منور روز و شب ہوں گے
سبھی جھومیں گے گائیں گے
مگر اس ساز محفل میں...اگر مضراب نہ ہوگا
تو پھر وہ خواب کیا ہوگا
یہ عالم ہے تصور کا اگر جاتا ہے جانے دے
یہ بہتر ہے کہ، ماضی کی...سبھی یادیں بھلا دے تو
سرور زندگی ہو یا عذاب زندگی ہو یہ
غرض جو بھی ہو، یہ سوغات اپنے پاس رہنے دے
یہ خورش دل کی ہے اس کو اسی میں ہضم ہونے دے
دبا لے سنگ سینے پر اسے جانا ہے جانے دے

رشید الدین
رشید گلشن سنتوش نگر کالونی،
مہدی پٹنم حیدرآباد۔۲۸

کیا طنز و مزاح ادب کی دوسرے درجہ کی صنف ہے؟

طنز و مزاح اردو ادب کی ایک مشکل اور نازک صنف ہے۔ اس میں لکھنے والے کو بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ اگر بہت زیادہ شوخی دکھائی تو پھکڑ پن اور ابتذال کا الزام عائد ہو جاتا ہے۔ اگر ذرا احتیاط سے کام کیا جائے تو مضمون سپاٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ اردو کی قدرے نئی صنف ہے۔ غزل، مثنوی، افسانے اور ناول سے اس کی عمر کم ہے، یہ انگریزی میں Essay کا متبادل ہے لیکن انگریزی میں یہ بہت ہلکی پھلکی صنف ہے جبکہ اردو میں یہ بہت Sharp ہوتی ہے۔ اس پر زبان کا چٹخارہ بہت مزہ دے جاتا ہے۔ بہت سے طنز و مزاح نگاروں نے اردو میں زبان کے بہتر استعمال سے اچھا طنز و مزاح پیدا کیا ہے۔

اردو میں طنز و مزاح کی ابتدا "اودھ پنچ" سے ہوتی ہے "اودھ پنچ" گروپ نے جہاں اس کی شروعات کی وہیں اس فن پر پھکڑ پن اور ابتذال کا ٹھپہ بھی لگا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس گروپ کے صرف دو ہی افراد ادب میں اپنا مقام بنا سکے۔ ایک شاعر اور دوسرا ادیب۔ شاعر اکبر الہ آبادی ہیں اور نثر نگار رتن ناتھ سرشار، اس گروپ نے طنز و مزاح میں اصلاح سے زیادہ طعن و تشنیع کا استعمال کیا ہے۔ سر سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کا مذاق اڑا کر اس نے اپنا الو سیدھا کیا جبکہ زمانہ نے یہ ثابت کر دیا کہ سر سید نے اردو ادب و زبان اور اسلامی معاشرہ میں کیا رول انجام دیا۔

اوپر میں نے لکھا ہے کہ طنز و مزاح اردو ادب کی ایک مشکل اور نازک صنف ہے۔ کوئی ۴۰ سال سے بھی زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں گورنمنٹ کالج اورنگ آباد میں بی اے

کا طالب علم تھا۔ کالج لائبریری میں کنہیا لال کپور کی کتابیں پڑھ پڑھ کر مجھے بھی طنز و مزاح لکھنے کا شوق پیدا ہو۔ اس زمانہ میں (غالباً) ۱۹۵۶ء کے بعد کی بات ہے کہ مشہور ترقی پسند رسالے ماہنامہ، شاہراہ، دہلی کے ایڈیٹر ظ۔ انصاری مرحوم ہوا کرتے تھے انھوں نے اپنے رسالے میں غزل کے خلاف ایک مہم شروع کی تھی جس سے میں متفق نہیں تھا۔ کیونکہ غزل بہرحال ہماری شاعری کی ایک مقبول اور عمدہ صنف ہے اور باوجود اس کی بعض کمزوریوں کے وہ اردو افسانہ کی طرح ادب میں قبولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ میں نے "غزل کی لے وے" کے عنوان سے ایک طنزیہ و مزاحیہ مضمون اس زمانے کے مشہور ادبی رسالے "ماہنامہ "صبا" (حیدرآباد) کو بھجوایا جسے مشہور صحافی اور ترقی پسند شاعر سلیمان اریب نکالا کرتے تھے۔ یہ وہی "صبا" ہے جس نے آج کے مستند اور مسلمہ نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین پہلی مرتبہ شائع کیے جب کہ یہ مضامین بہت سے اردو کے رسالوں سے واپس آچکے تھے۔

"صبا" گو پابندی وقت سے شائع نہیں ہوتا تھا لیکن ایک معیاری رسالہ تھا اور ماہنامہ "فنکار" ڈائجسٹ (الہ آباد) میں ہر شمارہ میں اس کی نثر و نظم کی ایک سے زائد تخلیقات شامل ہوتی تھیں۔ ایسے رسالے میں کسی نوجوان اور مبتدی کا چھپنا محال تھا لیکن نوجوانی کے جوش اور نئے نئے لکھنے کے شوق میں میں نے مذکورہ بالا مضمون "صبا" کو بھجوادیا۔ سلیمان اریب مرحوم جواب نہ دینے کے معاملہ میں خاصے بدنام تھے لیکن ایک ہفتہ کے بعد ہی ان کا خط آ گیا۔ تحریر انتہائی باریک اور سطریں بھی سیدھی نہیں تھیں۔ یہ ایک پوسٹ کارڈ تھا جس پر "صبا" کا نام اور پتہ چھپا ہوا تھا۔ خط اس وقت کا سانہیں اس لیے خط کا متن و عن مضمون نقل نہیں کر سکتا لیکن مخاطبت اور چند جملے آج بھی یاد ہیں جو کچھ اس طرح تھے۔

"برادرم! آپ کا مضمون ملا۔ اچھا ہے۔ آپ نے اپنے لیے ایک مشکل صنف کا انتخاب کیا ہے لیکن تیور بتا رہے ہیں کہ آیندہ آپ اس صنف میں نام پیدا کر سکتے ہیں۔ مضمون "صبا" میں جسے آپ نے اپنے مضمون میں "وبا" لکھا ہے شائع ہو جائے گا۔" لیکن بعد میں کسی وجہ سے وہ مضمون "صبا" میں شائع نہ ہوسکا۔ غالباً ان کے ترقی پسند

دوستوں نے (جن میں وحید اختر، عوض سعید اور شاذ تمکنت وغیرہ شامل تھے) اس کی اشاعت کی مخالفت کی ہوگی کیونکہ اس زمانے میں شاہراہ ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا اور ظ۔ انصاری ایک معتبر نام۔ میں نے قاہرہ کے نام سے اس پر طنز کیا تھا۔ بعد میں میرے سنجیدہ مضامین ''صبا'' میں شائع ہوئے جن میں ایک مضمون ''فکر اور فنکار'' آج بھی یاد ہے۔ رسالوں کی فائل دیکھوں تو اور بھی مضامین نکل آئیں گے۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ادب کی ایک مشکل صنف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں طنز و مزاح لکھنے والے معدودے چند لوگ گذرے ہیں اور آج بھی یہی حال ہے۔ میرے نہایت قریبی دوست ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کس طرح پچھلے ۳۰ سال سے خالص مزاحیہ رسالہ ''شگوفہ'' نکال رہے ہیں، اس پر مجھے حیرت ہے۔ برسوں پہلے سہام مرزا (جو اصلاً حیدر آبادی ہیں اور کراچی سے اردو میں کئی معیاری رسالے نکالتے ہیں) یہ سن کر سخت متعجب ہوئے کہ حیدر آباد میں ایک ایسا رسالہ ہے جو پابندی سے پچھلے ۳۰ سال سے نکل رہا ہے، جب اس رسالے نے اپنی اشاعت کے ۲۵ سال مکمل کیے تو بمبئی سے شائع ہونے والے ایک قدیم اردو رسالے ماہنامہ ''شاعر'' کے نوجوان ایڈیٹر افتخار امام (تیسری نسل) نے اسے اردو کا واحد یک سخن رسالہ لکھ کر خراج عقیدت پیش کیا۔

طنز و مزاح اردو کی آج بھی ایک مقبول صنف ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اپنے ایک افسانہ نگار دوست نعیم زبیری مرحوم کے ساتھ بات چیت کے دوران ہوا۔ وہ بتا رہے تھے کہ ایک بار حیدر آباد آنے کے لیے وہ نئی دہلی کے اسٹیشن پر آئے۔ پلیٹ فارم پر اور بھی لوگ ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کے بازو ہی ایک موٹے تازے، اونچے پورے، سرخ و سفید، درمیانی عمر کے آدمی ایک بڑے سے لکڑی کے صندوق پر بیٹھے ہیں۔ انھوں نے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ وہ جے ایس سنت سنگھ کے مالک ہیں جن کا کچھ بھلا ہی نام تھا اور صندوق میں کتابیں رکھے وہ کہیں فروخت کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ نعیم زبیری مرحوم نے (جو خود بھی اردو کے صاحب تصنیف افسانہ نگار تھے) ان سے پوچھا جناب آپ ہندستان کے بہت بڑے

کمرشیل ادارہ کے سربراہ ہیں، یہ تو بتایئے کون سی اردو کی آپ کے پاس زیادہ فروخت ہوتی ہیں، اس پر انھوں نے خالص پنجابی لہجے میں بلا تامل جواب دیا۔ ایسا ہے جی کہ اردو میں مذاقیہ کتابیں سب سے زیادہ بکتی ہیں۔ غالباً اردو کے سب سے بڑے ادبی پبلشر مکتبہ جامعہ کے سربراہ کا بھی یہی جواب ہوگا۔

یہ واقعہ یہاں لکھنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ اردو میں مزاحیہ ادب کتنا مقبول ہے لیکن ہمارے بعض نقادوں کا یہ کہنا ہے کہ طنز ومزاح ادب کی دوسرے درجہ کی صنف ہے۔ یہاں پھر ایک واقعہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔ برسوں پہلے کی بات ہے کہ بمبئی کے مشہور طنز ومزاح لکھنے والے بزرگ ادیب یوسف ناظم کے کامپلیکس واقع باندرہ کے میٹرس پران کی کسی کتاب کی رسم اجراء تھی۔ بہت سے اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اس موقع پر اظہار خیال کیا۔ مشہور ترقی پسند شاعر عزیز قیسی نے (جو فلمی رائٹر بن گئے تھے اور مستقل طور پر بمبئی میں ہی مقیم ہو گئے تھے) اپنی تقریر میں کہا کہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین ادب میں دوسرے درجہ کی صنف ہے جس پر یوسف ناظم نے جو اس تقریب کے نوشہ تھے شوشہ چھوڑا کہ اردو میں پہلے درجہ کا ادب لکھا ہی نہیں جارہا ہے۔ اس واقعہ کے راوی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ہیں جو اتفاق سے اس موقع پر موجود تھے۔

اس مضمون کے لکھنے کا مقصد یہی ہے کہ چند نقادوں (سب نہیں) کے اس خیال کو غلط ثابت کیا جائے کہ طنز ومزاح کی صنف دوسرے درجہ کا ادب ہے، اس سے مجھے قطعی اتفاق نہیں۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ میرے ایک سینیر اور نہایت قابل دوست موجود ہیں جو جدید لب ولہجہ کے اچھے شاعر ہیں۔ دوران گفتگو وہ نہایت دلچسپ فقرے چست کرتے رہتے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ " آپ جب اتنی پرلطف گفتگو کرتے ہیں اور بات بے بات پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں تو آپ طنز ومزاح میں طبع آزمائی کیوں نہیں کرتے۔ کہنے لگے۔" رشید صاحب! آپ مجھ جیسے اچھے خاصے شاعر کو مسخرہ کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا، تو گویا آپ طنز ومزاح لکھنے والوں کو مسخرے سمجھتے ہیں۔ بولے دریں چہ شک (یعنی اس میں کیا شک ہے) میں نے

جواباً کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زندہ دلان حیدرآباد کو مسخروں کی ٹولی سمجھتے ہیں۔ انھوں نے دامن بچاتے ہوئے کہا۔ "یہ میں نے کب کہا"۔ میں نے پھر اصرار کیا جب آپ مزاحیہ شاعری کرنے والے کو مسخرہ سمجھتے ہیں تو اس کا صاف مطلب تو یہی ہے بولے اس کا آپ جو چاہے مطلب نکال لیجیے۔" میں نے انھیں پھر رنگ (Ring) میں گھسیٹا" میں آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ زندہ دلان حیدرآباد آپ کی نظر میں مسخروں کی ٹولی ہے" جواب میں ذرا مسکرائے۔ پھر رک کر کہا "off the record" یعنی اسے تحریر میں نہیں لایا جا سکتا، یہ ایک نجی گفتگو ہے۔ میں نے پھر چھیڑا کیا آپ مجھے بھی مسخرہ سمجھتے ہیں۔ جواباً فرمایا آپ نہایت شریف اور قابل آدمی ہیں۔ پھر آپ سنجیدہ بھی تو لکھتے ہیں کبھی قلم کا مزہ بدلنے کے لیے مزاحیہ لکھ لیتے ہیں۔ طنز آپ نہیں لکھ سکتے کیونکہ طنز نگار کے پاس ایک رگ ڈنک مارنے کی ہوتی ہے جس سے آپ محروم ہیں۔ گو آپ کی ایک مزاحیہ مضامین کی کتاب "خواہ مخواہ" شائع ہو چکی ہے لیکن میری نظر میں آپ کی پہلی کتاب "علامہ حیرت بدایونی۔ حیات اور ادبی خدمات" کو اصل کتاب سمجھتا ہوں جسے گیان چند صاحب جیسے نقادوں نے بھی سراہا ہے۔ میں نے انھیں چھیڑنے کے لیے کہا میرا ایک مضامین کا مجموعہ "ذکر رفتگاں بھی ہے" کچھ رک کر کہا ہاں، وہ بھی ہے لیکن اس میں پہلے والی بات نہیں"۔ وہ مرحوم ادبا و شعرا پر نہیں اور آپ نے اس میں ادب بمعنی تعظیم کو بہت ملحوظ رکھا ہے۔ ویسے آپ نے ایک کتاب بچوں کے لیے بھی لکھی ہے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی یعنی حیرت بدایونی کی سی۔ علامہ حیرت بدایونی کی ڈاڑھی کافی بڑی تھی۔ ان کا اشارہ اردو کے اس ایک مشہور شعر کی جانب تھا۔

جناب شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

یہ سب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ میں قارئین کتاب نما سے یہ استفسار کرنا چاہتا ہوں کہ کیا طنز و مزاح ایک دوسرے درجہ کی صنف ہے۔ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو کیا شاہ احمد بخاری پطرس، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور۔ مشتاق احمد یوسفی، اکبرالہ آبادی، ضمیر جعفری، حسین ورنگار، رضا نقوی واہیؔ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین وغیرہ دوسرے درجہ کے ادیب یا شاعر ہیں۔ آپ کا جواب خواہ کچھ ہو لیکن اس سے میرا ضمیر متفق ہوگا اور نہ دل و دماغ۔ یہ بحث خاص طویل بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن میں اسے ختم کرنے سے پہلے اردو کے ایک ممتاز نقاد کی طنز و مزاح کے بارے میں چند سطریں ضرور لکھنا چاہوں گا۔ جسے دنیائے ادب پروفیسر ڈاکٹر گیان چند جین کے نام سے جانتی ہے۔ ''مزاح نگاری سنجیدہ تخلیق سے زیادہ مشکل ہے۔ نفسیاتی تناؤ کے تدارک کے لیے مزاحیہ ادب سے بہتر اور نہیں۔ یہ نسخہ کم خرچ بالانشیں ہے۔ مزاحیہ نثر ہو کہ شاعری' اسے ہنسنے ہنسانے کی چیز نہ سمجھیے۔ یہ ہم عصر زندگی کا آئینہ ہے۔ تنقید و تبصرہ ہے لیکن یہ تبصرہ ہوتا ہے میٹھی چھری کی طرح کہ اس میں خلش نہیں ہوتی۔''

اس رائے کے بعد اپنی بات کی تائید میں میں کسی اور نقاد یا اردو ادب کے ماہر اور عالم و فاضل کی کوئی رائے نقل نہیں کروں گا۔ البتہ اس کی مخالفت میں اگر کسی ادیب، شاعر، نقاد یا عالم، فاضل کی کوئی رائے ہو تو میں اسے پڑھنا پسند کروں گا۔ متفق ہونا یا نہ ہونا میری صوابدید پر ہے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

اے ارشد حسین

''سیاست'' اردو اِی۔میل (E-mail) سروس

اِنفارمیشن ٹکنالوجی کے اس جدید دور میں انٹرنیٹ نے ساری دنیا کو ایک محلّے میں تبدیل کر دیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصّے میں آباد کسی بھی شخص سے چند لمحوں میں رابطہ انٹرنیٹ کے ذریعہ اب ممکن ہے۔ تعلیم، صنعت و تجارت، سماجیات اور سیاسیات، غرض ہر موضوع پر انٹرنیٹ کے ذریعہ معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں اور وہیں ای میل کے ذریعہ اپنے خیالات، مراسلات، تصاویر اور آواز پلک جھپکتے ہی دنیا کے کسی بھی کونے میں پہنچائی جا سکتی ہے۔

انٹرنیٹ پر جہاں انگلش زبان رابطے کے زبان ہے، وہیں دوسری عصری بین اقوامی زبانوں میں معلومات کے حصول اور مراسلت کی سہولتیں موجود ہیں۔ ''اردو'' دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی تیسری اور عالمی زبان ہونے کی وجہ سے انٹرنیٹ پر بھی اردو کا چلن دن بہ دن عام ہوتا جا رہا ہے۔ شعر و ادب، مشاعرے، اخبارات و رسائل، علمی اور مذہبی نوعیت کے ہزاروں ویب سائٹس اردو زبان میں موجود ہیں۔ بہرحال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محبان اردو بلا تفریق ملک و قوم انٹرنیٹ سے منسلک ہوتے ہوئے اردو زبان کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کر رہے ہیں۔ ایسے وقت جبکہ ہماری نئی نسل اردو زبان سے دور ہوتی جا رہی ہے، ادارہ ''سیاست'' نے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے بینر تلے اردو سکھانے کا وسیع نظم کیا ہے چنانچہ جون 1994 سے اب تک ''سیاست کی اردو سکھانے کی مہم سے دو لاکھ چوالیس ہزار تین سو اٹھارہ (2,44,318) افراد نے بلا لحاظ مذہب و ملت استفادہ کیا ہے، اس طرح ''سیاست'' کی اردو سکھانے کی اس مہم کو اردو تاریخ کا درخشاں باب کہا جا سکتا ہے۔ ادارہ ''سیاست'' کی یہ مہم اب علاقائی حد بندیوں کو عبور کرتے ہوئے انٹرنیٹ کے توسط سے ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' اپنی ۵۰ ویں سالگرہ کے موقع پر انٹرنیٹ جیسے عصری مواصلاتی شعبے

میں اردو زبان اور رسم الخط کو عام کرتے ہوئے اردو کو عصری مواصلاتی زبان بنانے کے لیے یونیورسل انٹرپرائز حیدرآباد کے تعاون واشتراک سے اپنی نوعیت کی پہلی اردو ای۔میل سروس کا آغاز کر چکا ہے۔

قارئین ''سیاست'' اور عوام الناس ''سیاست'' کی ای۔میل سروس سے مفت استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔امریکہ کی مشہور کمپنی ''ایوری ون نیٹ کارپوریشن' نے اپنے عصری سرور پر ہر استعمال کنندے کو ۱۶ ایم بی جگہ فراہم کی ہے۔اردو زبان میں مراسلت کے لیے اردو رسم الخط پر مبنی سافٹ ویر س مفت فراہم کیے گئے، جسے 'سیاست' ای۔میل سروس پر اپنے نام کے رجسٹریشن کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے۔استفادہ کنندگان کو محفوظ مراسلت کے لیے پاس ورڈ کوڈ کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔سیاست ای ۔میل سروس کے ذریعہ اردو کے علاوہ انگلش، فارسی اور عربی زبانوں میں بھی مراسلت کی جاسکتی ہے۔،اس کے علاوہ آڈیو ویڈیو کلپس ،مخلوطات اور رنگین تصاویر بھجوانے کی بھی سہولت موجود ہے۔

استعمال کا طریقہ:۔ہم یہاں ''سیاست'' ای۔میل سروس کے استعمال کا طریقہ تحریر کر رہے ہیں۔پھر بھی ''سیاست'' ای میل سروس کے استعمال میں کسی قسم کی دشواری ہو تو مدد کے لیے حسب ذیل ٹیلی فون نمبرات اور ای۔میل پتوں پر بلا جھجک ربط پیدا کریں۔

فون نمبر: 3204066-3204233-3203102 یا

arshadhussain@siasat.com, support@siasat.com,

webmaster@siasat.com

کے پتوں پر ای۔میل دیا جاسکتا ہے۔مقامی حضرات فون نمبرات پر ویب ماسٹر س اے ارشد حسین رمیر مصطفی علی سے رابطہ پیدا کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے اپنے کمپیوٹر کو ٹیلی فون لائن کے ذریعہ انٹرنیٹ سے منسلک کرلیجئے ۔نیٹ اسکیپ یا انٹرنیٹ ایکسپولر پر ''سیاست'' کا ڈیمونیم www.siasat.com تحریر کیجیے۔ جس کے ساتھ ہی آپ ''سیاست'' کے انٹرنیٹ ایڈیشن پر پہنچ جائیں گے۔صفحہ کے بائیں جانب اوپری حصے پر Free-E-Mail تحریر ہوگا۔اس تحریر کو اپنے موز سے دبائیے۔آپ ''سیاست'' کی ای۔میل سروس کے شناختی صفحہ پر پہنچ جائیں گے، جہاں سے آپ کو اپنے نام کے رجسٹریشن

کے علاوہ حفاظتی پاس ورڈ کے ذریعہ سروس میں داخلے کی سہولت حاصل رہے گی۔ اگر آپ یہ سروس پہلی مرتبہ استعمال کر رہے ہوں تو شناختی صفحہ پر موجود Signup تحریر پر اپنا موز دبایئے جس کے ساتھ ہی آپ سروس معاہدے پر پہنچ جائیں گے۔ سروس کے معاہدے کو قبول کرنے کے بعد آپ کا رجسٹریشن فارم اسکرین پر ہوگا۔ رجسٹریشن فارم پر مطلوبہ تمام تفصیلات کو احتیاط کے ساتھ پُر کیجیے۔ ''اسٹریٹ ایڈریس'' والے کالم کو امریکہ میں مقیم حضرات ہی استعمال کریں۔ ہندستانی یا دوسرے ممالک میں قیام پذیر حضرات ''اسٹریٹ ایڈریس'' والے کالم کو پُر کیے بغیر ہی چھوڑ دیں۔ رجسٹریشن فارم پر مطلوبہ تفصیلات پُر کرتے ہوئے آپ اپنی پسند کا ''ای۔میل پتہ'' حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً

gulshan@siasat.com

mustafa@siasat.com

Maktoob@siasat.com

وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ آپ یہاں محفوظ مراسلت کے لیے پاس ورڈ کا بھی انتخاب کر سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ آپ کا پاس ورڈ کم از کم چھ حروف پر مشتمل ہو، مثلاً Arshad یا xyzmno وغیرہ ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھیے کہ پاس ورڈ کوڈ انگریزی کے چھوٹے حروف تہجی a.b c d.e.f.g h وغیرہ میں تحریر ہو۔

''سیاست'' ای۔میل سروس کے پاس ورڈ کی حفاظت کیجیے، تاکہ آپ کی مراسلت کو کوئی اور پڑھ نہ سکے۔ رجسٹرڈ رکن بننے کے بعد اپنے رجسٹرڈ نام اور پاس ورڈ کو شناختی صفحہ پر استعمال کرتے ہوئے آپ اپنے ''اکاؤنٹ باکس'' میں پہنچ جائیں گے۔ یہ آپ کا اپنا ذاتی ''اکاؤنٹ باکس'' ہے جہاں کسی دوسرے شخص کا پہنچنا ناممکن ہے۔ آپ کی مرضی کے بغیر آپ کے اکاؤنٹ باکس پر کوئی نہیں پہنچ سکتا، اس کے لیے پاس ورڈ کوڈ، کی حفاظت بہت اہمیت رکھتی ہے۔

اسی اکاؤنٹ باکس پر خیر مقدمی تحریر کے ساتھ اردو رسم الخط پر مبنی سافٹ ویر ڈاؤن لوڈ کرنے کی مفت سہولت فراہم ہے، اسے ڈاؤن لوڈ کر لیجیے اور ڈاؤن لوڈ کرنے سے قبل تحریری ہدایات پر عمل کیجیے۔ اس طرح آپ اردو زبان میں اپنے مراسلات مطلوبہ اشخاص تک بھیج سکتے ہیں۔

تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔
(صرف مختصر تبصرے ہی جلد شائع ہو سکتے ہیں)

ثنائے محمدؐ (نعتیہ مجموعہ)

مرتب: اقبال بیدار
مبصر: اسعد نظامی
قیمت: ۶۰ روپے
صفحات: ۱۷۶
ناشر: بزم ڈاکٹر اقبال، جہانگیر آباد، بھوپال

بزم ڈاکٹر اقبال، بھوپال اردو کی ترویج و ترقی میں ایک دہائی سے زائد عرصے سے معروف ہے۔ اس بزم کے جنرل سکریٹری اور زیر تبصرہ نعتیہ مجموعے کے مرتب جناب اقبال بیدار بھوپال کے ان فعال افراد میں سے ہیں جو اردو کو عوام سے جوڑنے کی کوشش میں شب و روز لگے رہتے ہیں انھیں بجا طور پر اردو کا بے لوث خادم کہا جا سکتا ہے۔ بیدار صاحب کے جذبے کی صداقت کا ثبوت ایسی کئی ادبی و شعری نشستوں، مشاعروں اور یادگاری مجلسوں سے ملتا ہے جن کا انعقاد اور اجرا ان کی کاوشوں کا مرہون منت ہے اور چونکہ ان پروگراموں کی تکمیل میں انھوں نے اپنے رفقا کے ساتھ ساتھ ہر مذہب اور فرقے کے انسان دوست اور امن پسند افراد کے تعاون اور مشوروں کو شریک رکھا ہے اس لیے انھوں نے قومی یکجہتی کے میدان میں قابل تعریف کام کیا ہے جس کی اس دور میں شدید ضرورت ہے۔

گزشتہ سال ہندستان کی آزادی کے پچاس سال پورے ہونے کی مناسبت سے اقبال صاحب نے ایک یادگاری مجلہ جنگ آزادی میں اردو کا حصہ کے عنوان سے مرتب کیا تھا جسے ملک کے مختلف گوشوں سے داد و تحسین سے نوازا گیا جو اراکین بزم اقبال کے لیے ایک خوش آیند امر ہے۔

نعتیہ مجموعہ ثنائے محمدؐ ہر اعتبار سے دیدہ زیب ہے۔ نعت کی مروجہ تعریفوں اور تعبیروں سے قطع نظر سرورق کی تصویر کے نیچے دیا گیا شعر نعت رسول کی اہمیت اور اس کے تقدس کو ایک عام قاری کے لیے واضح کر دیتا ہے۔

خدا کا ذکر کرے، ذکرِ مصطفیٰ نہ کرے
ہمارے منہ میں ہو ایسی زباں خدا نہ کرے

اس مجموعے میں شامل نعتوں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی شستگی اور تنقیہ۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے مرتب اور ان کے معاونین نے پوری طرح اول تا آخر ملحوظ رکھا ہے یعنی یہ کہ ان اشعار کا انتخاب کیا ہے جن میں اللہ اور اس کے رسولؐ اور اولیاء کرام کے مراتب میں کہیں استخفاف پیدا ہونے نہیں دیا گیا ہے۔ مجموعے کا آغاز حضرت کیف بھوپالی مرحوم کے سورہ فاتحہ کے منظوم ترجمے سے ہوتا ہے۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ اس میں ہمارے دور کے بزرگ شعرا کی نسل کی بھی نمایندگی ہو رہی ہے اور ان کے بعد کی پیڑھی اور پھر نوجوان نسل کی بھی اس مجموعے میں جتنی نعتیں شامل ہیں ان سب میں جذبۂ عقیدت کے ساتھ تخلیقیت کی چاشنی بھی ہے اور اظہار کی ندرت بھی۔ رہبر جونپوری صاحب کا مقدمہ خاصا معلومات افزا ہے۔ انھوں نے کتنی کے ایک غیر مسلم نعت گو گیا پرشاد خودی کا تعارف کرا کے قارئین کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری

مصنف: ڈاکٹر سہیل بیابانی
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۲۵۰ روپے

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

قرۃ العین حیدر اس عہد کی ان نابغہ روزگار شخصیات میں سے ایک ہیں جو اپنے فن کے اوج کمال کو پہنچ چکی ہیں۔ ان کی جامع الکمال ہستی کا جو عالمانہ نقش قائم ہوا ہے وہ بیشتر ان کی ناول نگاری کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے لیکن ناولوں کے ساتھ مصنفہ نے مختصر افسانے کی طرف بھی توجہ دی جس کے کئی مجموعے اشاعت پذیر ہوئے لیکن ناول کے مقابلہ ان کے افسانوی فن کے کمالات کا خاطر خواہ جائزہ نہیں لیا گیا جس سے افسانوں کے حوالے سے ان کی تخلیقی صلاحیت کے درون خانہ کو بے نقاب کیا جا سکے۔ ڈاکٹر سہیل بیابانی نے اس کتاب میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور ان کے ایک ایک افسانے کا بغائر نظر مطالعہ کیا ہے۔ نقد و نظر کے مطالعہ کی سہولت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب اردو افسانے کا پس منظر ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر سہیل بیابانی نے پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، کرشن چندر اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ کی افسانہ نگاری کا جائزہ سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں

کی روشنی میں لیا ہے۔ باب دوم میں قرۃ العین حیدر کے ہمعصر افسانہ نگاروں کا جائزہ اس عہد کی تحریکات، روایات، رجحانات اور انحرافات وغیرہ کی روشنی میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس باب میں پریم چند کے علاوہ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، راما نند ساگر، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، مہندر ناتھ، بلونت سنگھ، جوگندر پال، قاضی عبدالستار، اشفاق احمد، جیلانی بانو، غیاث احمد گدّی، اقبال متین، واجدہ تبسم، شوکت صدیقی، الیاس احمد گدّی، جمیلہ ہاشمی، بلراج مینرا، سریندر پرکاش، شرون کمار ورما، دیویندر اسر، رتن سنگھ، مسیح الحسن رضوی، آمنہ ابوالحسن، صالحہ عابد حسین، انور سجاد، خالدہ اصغر، اقبال مجید، احمد یوسف وغیرہ کی افسانہ نگاری پر سیر حال گفتگو کی ہے۔ یہ تمام افسانہ نگار وہ ہیں جو قرۃ العین حیدر کے گزشتہ چالیس برس کے افسانوی سفر کے معاصر ہیں۔ تیسرے باب میں قرۃ العین حیدر کے افسانوی فن کے آغاز اور ارتقا کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور اسی باب سے کتاب کے اصل موضوع کا سراغ لگتا ہے۔ اس باب میں قرۃ العین حیدر کے تمام افسانوی مجموعوں پر ہر ایک افسانہ کی روشنی میں مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں قرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعے ''ستاروں سے آگے'' سے لے کر پت جھڑ کی آواز تک کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں اس عہد کی ادبی اور فلسفیانہ تحریکات کی روشنی میں قرۃ العین حیدر کے مکتب فکر کو واضح کرنے کی سعی پائی جاتی ہے۔ ''ستاروں سے آگے'' شیشے کے گھر، اور پت جھڑ کی آواز وغیرہ افسانوی مجموعوں کی روشنی میں فاضل افسانہ نگار کے بدلتے ہوئے رجحانات اور پائی جانے والی یکسانیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بارے میں بعض پہلے سے طے شدہ الزامات سے بھی انحراف کیا گیا ہے۔ اسی باب کے دوسرے حصہ میں مصنفہ کے مابعد افسانوی مجموعے ''روشنی کی رفتار'' کے تمام افسانوں کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لے کر گفتگو کی گئی ہے۔ باب چہارم کا عنوان فنی تشکیل و تعمیر ہے جو کتاب کا سب سے طویل ترین باب ہے۔ اس باب میں قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کا جائزہ، فن افسانہ نگاری کے اصولوں کی روشنی میں لیا گیا ہے اور اس کے لیے پلاٹ، کردار، موضوعات، تکنیک اور لسانی عمل وغیرہ الگ الگ عنوانات قائم کر کے ان کے افسانوں کو ان اصولوں پر پرکھا گیا ہے۔ اگرچہ بحث خالص فنی اور موضوع خشک ہے لیکن ڈاکٹر سہیل بیابانی کے انداز تحریر نے اس باب کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ کتاب کا آخری باب اردو افسانے کو قرۃ العین حیدر کی دین ہے۔ اس مختصر باب میں

قرۃ العین حیدر کے سفر افسانہ کا خلاصہ پیش کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے جو زندگی سے وابستگی کی دلیل ہے اور ان کے افسانوں میں مسلسل ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست بھی شامل ہے جن سے اس کتاب کی تیاری میں مدد لی گئی ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا موضوع قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری ہے اور انھوں نے ان کی افسانہ نگاری کا معروضی جائزہ لیا ہے لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ سہیل بیابانی ایک عرصے سے افسانوی ادب اور اس کی تنقید کا مطالعہ کرتے رہے ہیں جس سے ان کے مزاج میں افسانوی تنقید کا مذاق رچ بس گیا ہے۔ وہ اردو افسانہ کی پوری تاریخ پر نظر رکھتے ہیں اور افسانے کے تمام سرمایے کو سامنے رکھ کر اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ اسلوب نگارش کی اس صفت نے اس کتاب کو افسانے کی تنقید کا اجمالی صحیفہ بنادیا ہے۔ ہم ذاتی طور پر ڈاکٹر سہیل بیابانی کو ان کی اس قابل ذکر کاوش پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ کتابت وطباعت عمدہ اور بے داغ ہے۔ کپڑے کی مضبوط جلد کے ساتھ سرورق نہایت سادہ اور بے حد دلکش ہے۔ گہرے نیلگوں رنگ کی زمین پر جلی حروف میں کتاب کا نام اور خفی حرفوں میں مصنف کا نام رقم ہے۔ طلائی قلم نے تحریر کو مزید مجلّی اور دل آویز بنادیا ہے۔ اس انداز کے خوش نما ٹائٹل اردو کتابوں پر کم ہی نظر آتے ہیں۔

صدف

شاعرہ: نسیم مخموری
مبصر: ڈاکٹر محمد نفیس حسن
قیمت: ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

مغرب زدگی اور تہذیب نو کا خمار لیے اردو شاعری بالخصوص شاعرات کے یہاں بھی گزشتہ چند دہائیوں میں انقلاب آفریں، تغیر آزما، بے محابہ و آزادانہ انداز فکر کا ایک طوفان بلاخیز ہے۔ مذہب و اخلاق اور اقدار و روایات پر بے تکان قدامت و رجعت پسندی کا لیبل لگا کر استحصال زن کے دیوانہ وار پروپیگنڈے اور آزادی و مساوات مرد و زن کے پُر جوش سیاسی و تحریکی نعروں نے ہمارے ادب میں بھی خوب گل کھلائے۔ پژمردہ شاخوں کی آبیاری، تراش خراش اور آراستگی کے جوش میں جڑوں کو ہلا دینے والی روش سے ہمارا ادب بھی کیوں پیچھے رہتا۔ گرہی دوراں اور تہذیب نو کے سیلاب نے حیات زن کی تعبیر و تفسیر کے نت نئے پہلو نکال کر ہماری شاعرات کو بھی بالعموم اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں تخیلوں کی

شدت نے شیریں احساس کو ہی پامال کر دیا۔ ان شعری نغمات میں بہ استثنائے چند ''تہذیبِ رسم عاشقی' اور 'پرورش لوح و قلم'' کی بڑی حد تک کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر چہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ زندگی کی مجملہ حیثیت، مختلف مسائل، سماجی و سیاسی منظر نامے، قومی و بین اقوامی صورت حال کو بھی غزل کی تنگنائے میں وسعت و صراحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ جذب دروں کے ساتھ جذب بروں نے بھی خوب جگہ پائی۔

عصر رواں کی غزل کے اس منظر نامے میں نسیم مخموری کے ''صدف'' کے نہاں خانے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تہذیبی میراث اور شعری روایت کا شاید کچھ حصہ باقی ہے۔ پامال حسرتوں کا احساس اور جبر حالات کا غم و غصہ انھیں بغاوت پر نہیں بلکہ محبت کے لیے تیار کرتا ہے جہاں محبت محض آراستگی نہیں استواری ہے، استقامت ہے، نا آسودگی کے احساس کو بھی خوشبوئے نسیم عزت نفس اور تہذیب وفا کے رنگ میں سمو کر نیا عزم و حوصلہ اور ثبات و یقین حاصل کرتی ہے۔ یہ لب و لہجہ خالصتاً ایک عورت کی شناخت ہے، اس کی اپنی آواز ہے، اس کی فطری جبلت، احساسات و جذبات، سماجی و تہذیبی رشتوں اور ان کے تقاضوں کا شریفانہ اظہار ہے۔ اس طرز اظہار میں بالعموم تہذیب شرافت اور صحت مند کردار کی بو باس ہے۔ خوشبوئے نسیم کی چٹکیاں بھی ہیں مگر بے لباسی و بے چہرگی اور نعرہ بازی نہیں۔ یہاں چیخ و پکار ہے نہ آہ و فغاں بلکہ خاموشی کا ایک طوفان ہے جو غیرت و خودداری کے ساتھ اٹھتا چلا آتا ہے۔ خوشبوؤں کا ایک کارواں ہے جس کا مقصد ہے اپنے گلستاں کی آبرو بڑھانا اور نصب العین ہے بہاروں کی طرح زندگی کرنا۔

''خوشبو'' اور ''خاموشی' یہ دو لفظ ''صدف'' میں بکثرت اور بہ تواتر نظر آتے ہیں۔ خوشبو و خامشی کے اس صدف میں ہی دراصل خوشبوئے نسیم ہے جو گلوں کو شگفتگی اور مہک دونوں کا احساس دلاتی ہے نیز یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ نسیم پھول کی مہک ہے اور خوشبو کے بغیر پھول کا تصور اور اس کی قدر و قیمت چہ معنی دارد؟

ع: خوشبو ہی پہچان ہے تیری یہ نہ کہیں کھو جائے نسیم

ظاہر میں ہم خموش سہی بندۂ وفا
چاہت کے پھر بھی اٹھتے ہیں طوفاں کبھی کبھی

نسیم کیسے مہکتے ہوئے چمن میں چلے
گلاب سوکھ چکے ہیں کسی کے بالوں میں

اتنی تو بے قرار کبھی میں ہوئی نہ تھی
کیوں اپنے دائرے سے نکلنا پڑا مجھے

ٹوٹنے کے لیے کیا چیز تھی اک دل کے سوا
اب تو ہر راہ سے بے خوف و خطر جاتے ہیں

احساس مجھ کو جانے کہاں لے کے اڑ گیا
پتوں کے سوکھے ڈھیر جو انگنائی سے اٹھے

ٹیپو شہید

مصنف: شمیم طارق
مبصر: شاہ عالم
صفحات: ۴۰
ملنے کا پتہ: اقراء ایجوکیشن سوسائٹی جلگاؤں

شمیم طارق ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ ان کی تخلیقات اخبار و رسائل میں پابندی سے شائع ہوتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں "ٹیپو شہید" کے نام سے ان کی تالیف منظر عام پر آئی ہے۔ دراصل یہ کتاب روزنامہ "اردو ٹائمز" ممبئی میں قسط وار شائع ہونے والے مضامین کی کتابی شکل ہے۔ بظاہر یہ کتاب بہت چھوٹی ہے مگر مطالعے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ مصنف نے کوزے میں دریا سمونے کی سعی کی ہے۔

'ٹیپو سلطان' جیسی شخصیتیں صدیوں میں جنم لیتی ہیں۔ ان کے کارنامے نہ صرف اس عہد کے لیے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے چراغ راہ کے مثل ہیں۔ آج بھلے ہی ہندستان کے اس مرد مجاہد کے کارناموں کو فراموش کر دیا گیا ہو مگر تاریخ کے اوراق ان کے کارناموں سے آج بھی روشن ہیں۔ ٹیپو سلطان جنھیں شیر میسور کہا جاتا ہے، نے ہندستان کو غلامی سے بچانے کے لیے آخری سانس تک جدوجہد کی اور آخر کار جام شہادت نوش فرمایا۔ اس کتاب میں ان کی زندگی کی بڑی شاندار تصویر پیش کی گئی ہے۔ ٹیپو سلطان کی حکمراں صفات، دور اندیشی، انصاف پسندی، انسان دوستی، دفاعی اور تجارتی شعور، الغرض وہ تمام امور جو ٹیپو شہید کی ذات سے متعلق تھے، نہایت دلکش انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں نہ صرف ٹیپو سلطان کی روشن شخصیت نمایاں ہوتی ہے بلکہ ان کے عہد کے ہندستان کے سیاسی حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شمیم طارق نے ان کے عہد کے تمام حالات و واقعات اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو جتنے واضح اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

شمیم طارق کی یہ کاوش اس لیے قابل ستائش ہے کہ انھوں نے ہماری تاریخ کے ایک اہم باب کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے لیکن جہاں تاریخ کو توڑ مروڑ کر اور غلط انداز میں پیش کیا جا رہا ہو وہاں اس کتاب کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اردو ادب کے ارتقا میں غازی پور کی خدمات

مصنف: ڈاکٹر علی شیر خاں
مبصر: ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
صفحات: ۵۵۰ (قیمت: ۲۵۰/روپے)
ملنے کا پتہ: مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ، کانٹا پوکھر، ڈرائیور کوارٹرس خضر پور، کلکتہ

ڈاکٹر علی شیر خاں نے "اردو ادب کے ارتقا میں غازی پور کی خدمات پر مبسوط مقالہ

تحریر فرمایا اور کتابی صورت میں پیش کر کے عوام الناس کو غازی پور کی اردو خدمات سے متعارف کرایا۔ خاں صاحب نے اپنے والدین کے ساتھ بچپن (صرف سولہ سال کی عمر ہی میں اپنے آبائی وطن غازی پور کو خیر باد کہہ کر کلکتہ میں بود و باش اختیار کر لی تھی اور وہیں بنگلہ زبان کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے لیکن اپنی مادری زبان اردو اور اپنے وطن اصلی کو نہیں بھولے۔ انھوں نے ثانوی تعلیم سے لے کر اعلا تعلیم تک کی سندیں اردو میں حاصل کیں اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صوبائی زبان کے ساتھ اردو کی بقا ترقی کے لیے مولانا آزاد اردو اسکول خضر پور کلکتہ میں قایم کیا اور آج بحیثیت صدر مدرس اپنے فرائض منصبی پورے کرتے ہوئے اردو کو گھر گھر پہنچانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اردو کے ساتھ یہ خدمت ان کی والہانہ محبت کی دلیل ہے۔

غازی پور کی جغرافیائی، تاریخی و تہذیبی شناخت کرانے کے لیے خاں صاحب نے مختلف قسم کی تاریخی کتب، اساطیری روایت اور گورنمنٹ گیزٹس وغیرہ سے استفادہ کیا ہے اور مدلل حوالے دے کر اپنی تحقیق کی بنیاد کو مضبوط بنایا ہے۔ اس سرزمین میں پیدا ہوئے معروف و غیر معروف اردو کے خدمتگاروں کا تعارف ان کی ادبی خدمات کے حوالوں کے ساتھ خاں صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے میں پیش کیا ہے۔ اس کے لیے انھیں سیکڑوں کتابیں، رسائل و اخبارات تلاش کرنے پڑے۔ ان تمام خذف پاروں میں سے انھوں نے جو گوہر آبدار تلاش کیے ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ اس مقالے میں آزادی سے قبل کے اکیانوے شعرا اور انیس نثر نگار اور آزادی کے بعد کے ایک سو انیس شعرا اور اڑتیس نثر نگاروں کا تعارف کرایا ہے۔ اس طرح اس بسیط مقالے میں غازی پور کے ۲۶۷ شعرا و ادبا کے حالات زندگی اور ان کی اردو خدمات کا جائزہ نہایت عرق ریزی سے لیا گیا ہے۔

غازی پور کی وہ سربرآوردہ شخصیتیں جو اپنی بین الملکی خدمات کی وجہ سے مشہور و معروف ہو گئی تھیں ڈاکٹر علی شیر خاں نے ان عبقری شخصیات پر ہی اپنی نگاہ تحقیق مرکوز نہیں کی بلکہ وہاں کے غیر معروف اور گوشۂ تنہائی میں خاموشی سے اردو کی خدمات انجام دینے والے ادبا و شعرا کو بھی ڈھونڈ نکالا ہے اور ان کا خاطر خواہ تعارف کرانے کے جتن کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے میں راہی معصوم رضا (شاعر) مختار احمد انصاری (رہنما) آسی غازی پوری (بزرگ دین) ڈاکٹر عبدالعلیم (ماہر تعلیم) اور علی عباس حسینی (افسانہ نگار) جیسی ہستیوں کے معروف چہروں کے درمیان قاصر غازی پوری (ص ۱۵۰) ظاہر غازی پوری (ص ۲۷۷) اور جمیل احمد صدیقی (ص ۲۹۱) جیسے بیسیوں ''بے چہرہ'' (غیر معروف)

نقوش بھی نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر علی شیر خاں نے غازی پور کے غیر مسلم اردو ادبا و شعرا کا تعارف پیش کر کے ملک کے حالیہ ستم ناک حالات میں قومی اتحاد کی شمع کو جلائے رکھنے کا مستحسن کام کیا ہے۔ انھوں نے آزادی سے پہلے کے ہندو اردو شعرا میں منشی سالک رام سالک، کرپالال عرشی، اور راجندر لال ورمار عنا اور آزادی کے بعد کے شعرا ادبا، میں سومیشور ناتھ مفلس، شری کرشن رائے ہردیش اور نثر نگاروں میں شری چندر ماسٹر مارشیس وغیرہ کے سوانحی حالات اور ان کی اردو خدمات کا اچھا جائزہ لیا ہے۔

کاغذ عمدہ، کتابت اچھی اور جلد بہتر ہے۔ سرورق کی سادگی نگاہ کو متاثر کرتی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساڑھے پانچ سو صفحات کی کتاب کی قیمت صرف ڈھائی سو روپے ہے۔ اردو بہی خواہوں کے درمیان اس کی قبولیت کے لیے میں دعا گو ہوں۔

نظام رامپوری حیات اور شاعری

مرتبہ: ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی
مبصر: ڈاکٹر رحمت یوسف زئی
قیمت: ۹۰/روپے
ناشر: مکتبہ وزیریہ، رامپور

حیدر آباد کی طرح رام پور بھی ادیبوں اور شاعروں کی پناہ گاہ رہا ہے۔ یہاں شعر و ادب کی فضا پروان چڑھانے میں نواب یوسف علی خاں ناظم کی سرپرستی نے اہم کردار ادا کیا۔ نظام رام پوری اسی رام پور کے سرکردہ شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ سید نظام شاہ المتخلص بہ نظام رام پوری (۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳-۱۸۲۴ء) میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد رام پور کے فوجی رسالے سے وابستہ تھے۔ نظام نوجوانی میں ایک طوائف کے عشق میں گرفتار ہوئے اور ہنت عنب کو گلے کا ہار بنالیا لیکن جلد ہی اپنے پیر و مرشد حضرت احمد علی شاہؒ کے حکم پر توبہ کرلی۔ شعر گوئی کی طرف توجہ بھی مرشد ہی کی ہدایت کا نتیجہ تھی۔ نظام فن شعر گوئی میں کامل تھے اور زبان و بیان پر پوری دسترس حاصل تھی۔ ان کی شاعری میں رنگینی حسن و عشق کا پرتو ہے۔ نازک خیالی، رنگینی، ادابندی، جذبات نگاری اور محاکات یا شاعرانہ مصوری نظام کے کلام کی اہم خصوصیت ہے۔

قابل تحسین ہیں وہ لوگ جو اپنے اسلاف کو نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ ان کے کارناموں کو محنت شاقہ کے ذریعے منظر عام پر لانے کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی نے ملک بھر کے محققین اور ناقدین کے گراں قدر مضامین جمع

کر کے "نظام رامپوری، حیات اور شاعری" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی ہے جو دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے اور نظام اس شعر کی وجہ سے شہرت کے آسمان تک پہنچ گئے لیکن اس کتاب میں شامل شاد عارفی کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر کا پہلا مصرع نواب کلب علی خاں المتخلص بہ نواب کی فکر کا نتیجہ تھا۔ شاد عارفی اپنی پندرہ سالہ تحقیق و تلاش کی بنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نواب کلب علی خاں نے پہلا مصرع کسی خاص واقعے سے متاثر ہو کر کہا تھا لیکن گرہ نہ لگ سکی۔ انھوں نے شعرائے دربار سے فرمائش کی کہ اس پر گرہ لگائیں۔ نظام نے دوسرا مصرع لگا کر شعر مکمل کر دیا۔ اس بیساختہ گرہ پر نواب نے اظہار خوشنودی کے طور پر اپنا مصرع بھی نظام کو عطا کر دیا اور پھر نظام نے اس مطلع پر پوری غزل کہہ ڈالی۔

کہا جاتا ہے کہ نظام معاملہ بندی کے استاد تھے اور جرأت و رنگین سے بھی آگے بڑھ گئے تھے لیکن یہ بات پوری طرح درست نہیں۔ نظام کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت محاکات نگاری یا لفظوں کے ذریعے مصوری ہے۔ اردو کے نامور اور بے حد محتاط محقق جناب رشید حسن خاں اس کتاب میں شامل اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ نظام کے ہاں معاملہ بندی سے ہٹ کر "محاکات یا شاعرانہ مصوری کی بعض نہایت عمدہ مثالیں سامنے آتی ہیں جن کو دیکھ کر خوش ذوقی کی آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔" "محاکات" کے علاوہ رشید حسن خاں نے نظام کی مکالماتی شاعری کو ان کا اصلی رنگ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی کی مرتبہ اس کتاب میں جملہ چوبیس مضامین شامل ہیں جو تحقیق و تنقید کی روشنی میں نظام رام پوری کی حیات اور شاعری کا بھرپور جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر اس لیے قابل ذکر ہے کہ اس میں نظام کی حیات کو ناول کے انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔

یہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی نے صرف مضامین جمع کیے اور انھیں کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ ان کا اپنا مضمون بھی کتاب کی ابتدا میں ہی شامل ہے جو بجائے خود تحقیق کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس مضمون کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسی کتاب میں شامل چند اہل علم حضرات کے مضامین میں انھوں نے جو اغلاط محسوس کیں ان کی نشان دہی کرتے ہوئے تصحیح بھی کر دی ہے۔

بودلیر کی نظمیں

مترجم: مظہر مہدی
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ شعر و حکمت ۲/۶۵۹-۳-۶
کپاڈیہ لین حیدر آباد-۴

چارلس بودلیر پیرس کا شاعر اور مصور تھا۔ جدید اردو ادب میں اس کا نام سر فہرست لیا جاتا ہے۔ جدیدیت کے حوالے سے شعر و ادب کی گفتگو بودلیر کے بغیر نا تمام سمجھی جاتی ہے۔ آج کے عہد میں نثری نظم کا رواج اپنے شباب پر ہے لیکن ادبی سرمائے میں نثری نظم کے آغاز کا سہرا بودلیر کے سر ہے۔ بودلیر کی شاعری میں عشق کا تصور جسمانی سے بڑھ کر روحانی زیادہ ہے۔ یہ معلومات ہمیں مظہر مہدی کی ترجمہ کی ہوئی کتاب "بودلیر کی نظمیں" سے فراہم ہوتی ہے۔ جدیدیت کے اس اہم ستون اور صفحہ اول کے شاعر کی نظموں کا ترجمہ ابھی تک اردو زبان میں نہیں ہوا تھا۔ اعجاز احمد، سلیم الرحمان، انوار رضوی اور شمس الرحمان فاروقی کے علاوہ اس کام کا بیڑہ مظہر مہدی نے اٹھایا اور اس کی ساٹھ نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس اور پر اثر ہے۔ بودلیر کی اصل نظموں کے مقابلہ اردو نظمیں کیسی ہیں، اس کا اندازہ تو وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو فرانسیسی زبان جانتے ہیں لیکن یہ اردو نظمیں پڑھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ان میں ایک اپنائیت اور مشرقی انداز محسوس ہوتا ہے اور خیالات اکثر و بیشتر عالم مشرق کے جمالیاتی ذوق سے میل کھاتے ہوئے ہیں۔ صرف زبان اور بعض ناموں کی اجنبیت کہیں کہیں چونکا دیتی ہے۔
مظہر مہدی کی ترجمہ کی ہوئی ایک نظم "مالاباری دوشیزہ کے لیے" کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

ترا خدا تجھے گرم نیلی سرزمین پر پیدا کیا
ترا کام بس اپنے آقا کا حقہ بھرنا
ٹھنڈے پانی، عطریات کے ظروف بھرنا
حملہ آور مچھروں کو بھگانا اس کے بستر سے
جیسے ہی سحر نمودار ہو، درخت گنگناتے
تو چلی جاتی ہے بازار لانے اناس اور کیلے
تمام دن برہنہ پاؤں لیے پھرتی ہے جہاں ضرورت ہو
تری سانسوں میں گم رسیلے نغموں کی چہک

کتاب کا پیش لفظ اور "بودلیر ایک مختصر تعارف" مترجم کتاب مظہر مہدی کا لکھا ہوا ہے۔ جس سے بودلیر کی زندگی اور اس کے نمایاں نگارناموں کا علم ہوتا ہے "بدی کے پھول" "پیرس کا قہر" اور "پیرس مصنوعی جنت" بودلیر کی شعری تصنیفات ہیں۔ کتاب کے سرورق پر بودلیر کی تصویر اور پشت پر بعض فرانسیسی اور اردو داں حضرات کی آراء شامل ہیں۔ کتاب کا کاغذ نہایت عمدہ سفید اور چمکدار ہے۔ کمپوزنگ اور طباعت صاف ستھری ہے۔ کتاب کے آخر میں "اشاریہ" "کتابیات" اور نظموں کے فرانسیسی عنوانات اور پہلی سطر" بھی شامل کتاب ہیں۔ بودلیر کی نظموں کے اردو تراجم کی اس اہم کاوش اور اردو ادب کے سرمایہ میں اس اضافہ پر مظہر مہدی بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کلس

شاعر: اختر پیامی
مرتب: پروفیسر جابر حسین
مبصر: پروفیسر ثوبان فاروقی
قیمت: ۱۰۰/روپے
ناشر: اردو مرکز، عظیم آباد، ۲۴۷، ایم آئی جی، لوہیا نگر پٹنہ۔۲۰
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

حال ہی میں اردو مرکز، عظیم آباد، پٹنہ نے اختر پیامی کا ایک بے حد خوب صورت شعری مجموعہ "کلس" شائع کیا ہے، جو اپنی صوری و معنوی خوبیوں کی بدولت دامن کش دل و نگاہ ہے۔ اختر پیامی کا آبائی وطن بہار ہے، لیکن تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ تا حال وہ کراچی میں مقیم ہیں اور تقریباً عزلت نشینی اور گم نامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعے کے مرتب بہار قانون ساز کاؤنسل کے ادب نواز چیز مین پروفیسر جابر حسین ہیں، جو اختر پیامی کے سگے چھوٹے بھائی ہیں۔ پروفیسر حسین نے بڑی کاوش، لگن اور محبت سے اختر پیامی کی منتشر نظموں کو یکجا کر کے ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے اور بلا شبہ ان کا یہ ایک قابل قدر کارنامہ ہے، کیونکہ اختر پیامی، جن کے جاننے والوں کی تعداد آج ہندستان میں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، اپنے زمانے میں اردو کے مشاہیر شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ایک صاحب طرز شاعر ہونے کے باوجود انھوں نے نمود و نمایش سے عمداً احتراز برتا۔ اسی فطری بے نیازی کے سبب آج تک ان کا کوئی شعری مجموعہ مرتب نہ ہو سکا اور انھیں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ بہر نوع مستحق تھے۔

"کلس" اختر پیامی کی ستر سے زائد نمایندہ نظموں اور قطعات کا دل کش انتخاب ہے۔ اس مجموعے میں اختر پیامی کی معروف اور معرکۃ الآرا طویل نظم "تاریخ" بھی شامل ہے، جو اردو مرکز، عظیم آباد پٹنہ سے ایک علاحدہ کتابی صورت میں پہلے بھی چھپ چکی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مجموعہ ہذا میں غزلوں کا حصہ ناپید ہے۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو اردو میں چھپنے والے عام شعری مجموعوں سے اسے ایک منفرد تشخص عطا کرتا ہے۔

"کلس" کی بیشتر نظموں میں ترقی پسندانہ اثرات کے واضح نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ غیر ملکی تسلط، سامراجیت، طبقہ بندی، عدم مساوات اور جبر واستبداد کے خلاف ستیزہ کار قوتوں کو فروغ دینے کا عزم اور اس میں حسب توفیق عملی شرکت کرنے کا حوصلہ ان نظموں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ نظمیں خواب اور شکست خواب کا عجیب وغریب منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ ان میں ایک رومان انگیز انقلاب کی ولولہ خیزی بھی ہے اور ایک غیر یقینی صورت حال سے پیدا شدہ ربودگی بھی امیدیں بھی، اندیشے بھی، باغیانہ تیور بھی اور شکست خوردگی کا احساس بھی۔ ان نظموں کا اسلوب بالعموم بلند آہنگی، پُر زور خطابت اور تند و تیز جذبات کے خروش کا آئینہ دار ہے لیکن ایک بات جو تقریباً تمام نظموں میں قدرے مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہے شاعر کا کلاسیکی انضباط۔ اختر پیامی ہر نوع کی نظموں میں زبان وبیان کی نفاست وشائستگی کے قائل ہیں چنانچہ وہ نظمیں بھی جو خالصتاً سیاسی نوعیت کی ہیں، اپنے لب ولہجہ کی غیر معمولی شیرینی اور نزاکت کے سبب بھرپور شعریت کی حامل نظر آتی ہیں۔

اختر پیامی کی ان نظموں کی شناخت، جو ان کے ترک وطن اور قیام پاکستان کے بعد کی ہیں اگرچہ دشوار ہے، مگر بعض نظمیں ایک شدید نا تلجائی کیفیت سے مملو ہیں، جنھیں پڑھ کر گمان گزرتا ہے کہ ان نظموں کی تخلیق کے پس پشت کسی "شہر نا پرساں" کے ان چاہے تجربات کارفرما ہوں گے۔ اس نوع کی نظموں میں یادوں کی کسک، روحانی اضطراب، احساس مجبوری، ایک بے کیف سی زندگی بسر کرنے کی مجبوری کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔ "کلس" کی تقریباً تمام نظموں کی فضا حزنیہ ہے، لیکن متذکرہ نظموں میں یہ فضا زیادہ گہری ہو گئی ہے۔

صالح روایات کی پاسداری، زبان وبیان کا بالیدہ شعور، فنی پختگی، خوب صورت پیکر تراشی، قدرت کلام، رموز وعلائم کی تازگی، لب ولہجہ کی شادابی وغیرہ ایسی خوبیاں ہیں جن سے اس مجموعے کی ہر نظم متصف ہے۔ ایسے دور میں جبکہ ہمارے شعرا میں زبان وبیان سے بے اعتنائی کا رویہ عام ہے یہ مجموعہ ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ مجھے یقین ہے ارباب ذوق کے حلقے میں اس مجموعے کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

کھلے خطوط

☆اگست کے شمارے کو "تعلیمی نمبر" کہنا غلط نہ ہوگا۔ مہمان اداریے کے تحت غلام نبی مومن صاحب نے "اردو ذریعہ تعلیم اور اساتذہ کی ذمے داریاں" پر گفتگو کی ہے۔ نرگس فاطمہ صاحبہ نے اردو میڈیم اسکول پر اور سب سے بڑھ کر مجتبیٰ حسین صاحب نے بلا ل مستری کی نمایاں کامیابی پر جاندار و شاندار مضامین لکھے۔ خالص ادبی رسائل میں ادبی موضوعات کے ساتھ ساتھ تعلیمی موضوعات و مسائل پر مضامین جگہ پاجائیں تو اِسے خوشگوار انقلاب کی آمد کہا جاسکتا ہے۔

حکیم عبد الحمید صاحب کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے پُر کرنے کے لیے ایک آدھ صدی تو انتظار کرنا ہوگا۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ جامعہ ہمدرد کی باگ ڈور سید حامد صاحب کے ہاتھوں میں آگئی اُن سے بڑھ کر حمید شناس اور کون ہوسکتا ہے؟

تازہ شمارے میں دلیپ راوتے کا انداز پسند آیا۔ ہمسایہ برادریاں ہمارے تعلق سے کس طرح سوچتی ہیں؟ کن الفاظ سے یاد کرتی ہیں؟ یہ جاننا ضروری ہے۔ اب ضرورت ہے کہ کھل کر بات چیت کی جائے۔ غلط فہمیاں دور ہونا ضروری ہے۔ غیر مسلم احباب بھی اگر اردو پڑھنا شروع کردیں تو اُنھیں معلوم ہوگا کہ ہم بھی قومی مسائل میں اتنی ہی دلچسپی رکھتے ہیں جتنا وہ اپنا حصہ سمجھ بیٹھے ہیں۔

مرحوم حکیم عبدالحمید صاحب کے تعلق سے عبد اللطیف اعظمی اور پروفیسر ظفر احمد نظامی کے مختصر مضامین پڑھنے کے بعد زبان پر مصرعہ آگیا ۔

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مجتبیٰ حسین تو مجتبیٰ حسین ہیں۔ یہ چھ نقطوں والے نصرت ظہیر بھی کچھ کم نہیں۔ مزاحیہ ادب میں کئی بڑوں کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے والا مقام اپنے لیے محفوظ کرلیا ہے۔

صغریٰ مہدی نے آنکھیں نم کروادیں۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔

☆محمد یعقوب الرحمٰن، ایوت محل

. . . .

کتاب نما شمارہ اگست ۹۹ ملا جو اپنے مشمولات کے اعتبار سے بہت مفید اور معلومات افزا ہے۔ نرگس سلطانہ صاحبہ کا مضمون "ہمارے یہ اردو میڈیم اسکول" اور جناب مجتبیٰ حسین صاحب کا "بلال مستری تم نے یہ کیا غضب کیا" خصوصیت کے ساتھ پسند آئے۔ سب سے پہلے بلال مستری کو ان کی شاندار

کامیابی پر صمیم قلب سے مبارکباد پیش ہے جنھوں نے اردو میڈیم سے امتحانات دے کر پورے مہاراشٹر میں اول پوزیشن حاصل کی۔ بلال مستری نے مہاراشٹر ہی میں کیا بلکہ پورے ملک میں اردو کا پرچم لہرایا ہے۔ ان کی کامیابی ان تمام لوگوں کے منہ پر زور دار طمانچہ ہے جو اردو کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں حقیر اور کمتر سمجھتے ہیں۔ شمالی ہند کے طلبہ کو بلال مستری، تنویر بینار، اور زرین انصاری سے جہد مسلسل کا درس لینا چاہیے اور مستقبل میں محنت، لگن اور حسن عمل سے اچھے سے اچھے نتائج کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔

"ہندستان میں ذیابطیس کی وبا" کے عنوان سے ڈاکٹر عابد معز کا مضمون بہت معلوماتی ہے۔ موصوف اس مضمون کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مہلک بیماری کے لاحق ہونے کی وجوہات، تشخیص، اقسام اور اس سے محفوظ رہنے کی تدابیر بھی نہایت آسان زبان میں بیان کی ہیں۔ امید ہے کہ کتاب نما کے قارئین اس سے مستفید ہوسکیں گے۔ ایسے ایسے مفید مضامین کے انتخاب پر آپ کو مبارکباد۔

☆ منیر انجم، سوئی والان، کڑہ گنج، نئی دہلی

کتاب نما کے پچھلے دو شماروں اگست، ستمبر ۱۹۹۹ء غالب کے ایک شعر کی قرأت کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اگست کے شمارہ میں جناب انوار رضوی صاحب نے غالب کے اُس شعر کی صحیح قرأت یہ قرار دی ہے۔

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سرِ نو زندگی ہوکر رہا ہو جائیے

جبکہ ستمبر کے شمارے میں جناب نثار احمد فاروقی صاحب نے اِس قرآت کو صحیح قرار دیا ہے

بیضہ آسا تنگ بال و پر پہ ہے کنج قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

خاکسار نے صحیح قرأت کا ادراک حاصل کرنے کے لیے مولانا حسرت موہانی کی شرح دیوان غالب سے رجوع کیا، اس شرح میں مولانا حسرت موہانی نے غالب کے اس شعر کی یہ قرأت بیان کی ہے۔

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

اس قرأت کا پہلا مصرعہ فاروقی صاحب کی قرأت سے اور دوسرا مصرعہ رضوی صاحب کی قرأت سے اتفاق نہیں کرتا۔

خاکسار سمجھتا ہے کہ مولانا حسرت موہانی صاحب کی بیان کی ہوئی قرأت کو ہی صحیح ہونا چاہیے کیونکہ غالب

نے لفظ تنگ کو اپنے دیوان میں تین بار جگہ دی ہے۔

آہ وہ جرأت فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

شرح اسباب گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں نے زنداں سمجھا

تنگئ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

ان تینوں بار تنگ کو دق ہونا، مجبور ہونا، اور گھبرانے کے معنی میں باندھا گیا ہے اور یہ معنی کسی بھی طرح غالب کے مذکورہ شعر کے اس مصرعہ کی قرأت سے نہیں نکلتے ہیں۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے کنج قفس

لفظ تنگ کو غالبؔ نے اپنے دیوان میں چار جگہ باندھا ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں تنگِ وجود تھا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
تنگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

ہے تنگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
تنگِ پیری ہے جوانی میری

اور ان چاروں جگہ تنگ باعث شرم کو اضافت کے ساتھ باندھا گیا ہے۔ تنگِ وجود، تنگ سجدہ، تنگِ سینہ، تنگ پیری۔ غالب کا یہ اسلوب یا غالب کی یہ ساختیات اس بات کا بھرپور جواز ہے کہ غالب کے مذکورہ شعر کے پہلے مصرعہ کی صحیح قرأت یہ ہونی چاہیے۔

تنگِ بال و پر ہے یہ کنج قفس

چونکہ زندگی ہو کر اردو محاورہ نہیں ہے بلکہ زندہ ہو کر اردو کا محاورہ ہے اس لیے غالبؔ کے مذکورہ شعر کے دوسرے مصرعہ کی قرأت از سرِ نو زندگی ہو کر رہا ہو جایئے۔ نہیں بلکہ از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے۔ ہی صحیح ہے۔

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سرِنو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے

"کنج قفس تو انڈے کی طرح ہے جو میرے بال و پر کے لیے باعث شرم ہے اگر یہاں سے آزاد ہو جاؤں تو جس طرح انڈے سے بچہ نکل کر نئی زندگی شروع کرتا ہے۔ اسی طرح میں بھی از سرِ نو اپنی زندگی کا آغاز کروں۔"

☆ دامی محمد ایڈوکیٹ، کیسر گنج، پورہ حامد حسین مکان نمبر ۲۹، میرٹھ

محترم نثار احمد فاروقی نے میرے

مضمون "غالب کا ایک شعر" (کتاب نما اگست ۹۹) پر دو اعتراضات کیے ہیں کتاب نما ستمبر ۹۹) میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے معروضات کا نوٹس لیا۔ ان کے اعتراضات یہ ہیں۔(۱) زندہ ہونا اختیاری فعل نہیں ہے (۲) زندہ ہونا خلاف محاورہ اردو فارسی ہے۔

بجا درست، عملی دنیا میں زندہ ہونا ممکن نہیں ہے یہ صرف حضرت مسیح کا معجزہ تھا مگر شعر کی دنیا میں آدمی روز مرتا اور جیتا ہے (مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا) مرنے کے بعد محبوب کی مصنوعی اشکباری کا تماشا دیکھتا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

شاعر کی خاک تک محبوب سے روبرو ہو کر گفتگو کر سکتی ہے۔ کلاسیکی غزل میں یہ عام باتیں ہیں اور یہاں تو کہنا یہ ہے کہ آدمی خود اپنا مسیح ہے خود کفیل ہے۔ اس کے بطون میں قوت کا خزانہ ہے۔

دوسرا اعتراض فاروقی صاحب نے محاورے کی بنا پر کیا ہے مگر کیا واقعی غالب اردو زبان کو ذوق اور ناسخ کی طرح مکمل جانتے تھے؟ کیا واقعی وہ محاورہ اردو کے سو فیصد پابند تھے؟ اگر غالب کا اختراعی محاورہ زندہ ہونا یا ہو جا تسلیم کر لیا جائے تو قم باذن اللہ کی دھمک بھی سنی جا سکتی ہے اور آدمی کے خود کفیل ہونے کا نقارہ بھی۔ اصلاح نے جو شعر کا مرتبہ بلند کیا ہے وہی اس کا جواز بھی ہے۔

☆ انور رضوی 28C/A-10 کالکا جی۔ نئی دہلی ۱۹

ادبی تہذیبی خبریں

قومی اتحاد کے فروغ کے لیے

جے دیال ہارمونی ایوارڈ کی تقسیم

پروانہ ردولوی اور پروفیسر مشیر الحسن شامل

نئی دہلی ۲۵ ستمبر (یو این آئی)

قومی اتحاد اور ہم آہنگی کے فروغ میں نمایاں خدمات کے لیے کل یہاں ادیبوں اور صحافیوں کو ۱۹۸۹ء کا ۱۶واں رام کرشن جے دیال ہارمونی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انڈین ایکسپریس کے ایڈیٹر اِن چیف شیکھر گپتا نے ایوارڈ یافتگان کو دس دس ہزار روپے فی کس اور ایک نقرئی لوح پیش کی۔ انعام یافتگان میں بزرگ صحافی پروانہ ردولوی (اردو) تاریخ داں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن (انگریزی)، جے شنکر گپتا (ہندی)، ہومین برگوہین (آسامی) پروفیسر نونیتا دیوسین (بنگلہ)، سی راگھو چارلی (تیلگو) اور ہربھجن سنگھ ہلواروی (پنجابی) شامل ہیں۔

فلم اداکارہ اور ٹی وی شخصیت سمی گریوال کو الیکٹرانک میڈیا کے لیے ایوارڈ دیا گیا۔ وہ تقریب تقسیم ایوارڈ میں شریک نہیں ہو سکیں۔ رضا کار تنظیموں زمرے کا انعام ممبئی کی تنظیم مرکز برا سیکولرازم اور سماجی مطالعات کو دیا گ ۱۵ ہزار روپے کا یہ انعام مرکز کے سر مشہور دانش ور مسٹر اصغر علی انجینئر وصول کیا۔ اس سال کرگل کی لڑائ رپورٹنگ کے لیے دو خصوصی انعام مح برکھا دت اور مسٹر گورو ساونت کو بالتر ٹی وی اور پرنٹ میڈیا کے لیے د گئے۔

حکیم عبد الحمید در حقیقت

علامہ اقبال کے ''مرد کامل ؛

نئی دہلی ۲۵ ستمبر اردو اکادمی دہلی جانب سے آج حکیم عبد الحمید کی شخص اور کارناموں پر ایک سمینار کا انعقا گیا۔ ایک پریس ریلیز کے مطابق سمی افتتاح کرتے ہوئے قومی اقلیتی کم کے چیئر مین پروفیسر سید طاہر محمود ۔ کہ حکیم صاحب نے ہندستانی معاشر پر اپنی خدمات کے ایسے زبردست نق چھوڑے ہیں اور ایسے کارنامے ا دیے ہیں جنھیں بھلایا نہیں جا سک انھوں نے حکیم صاحب کی شخصیت کو ا ذاتی مشاہدات اور تجربات کی روشنی بیان کرتے ہوئے کہا سمندری قلب، ثریائی شعور نظر، ابراہی دس

فردوسی خلوص و عمل ، انسانی غیرت
انائی عصری آگہی ، کو ہساری صبر و
اور طلسماتی قوت ارادی کو اگر یکجا کر
بائے تو اس مرکب پر " شخصیت
ی" کی ایک جھلک کا لیبل لگایا
تا ہے۔

افتتاحی جلسہ کی صدارت کرتے
ئے ہمدرد جامعہ کے چانسلر سید حامد نے
یم صاحب کی منصوبہ بندی اور قوت عمل
بر روشنی ڈالی ۔سید حامد نے کہا کہ
موں کی ترقی کا انحصار صحت اور تعلیم پر
ہے اسی لیے حکیم صاحب نے یہ دونوں
یدان چن لیے اور طے کر لیا کہ جہالت
ے دست وگریباں ہوں گے اور اس پر
اری ضرب لگا کر ہی دم لیں گے۔

اس سے قبل مہمانوں کا استقبال
کرتے ہوئے اکادمی کے وائس چیئر مین
روفیسر اشتیاق عابدی نے سمینار کی غرض
غایت پر روشنی ڈالی ۔سمینار کے پہلے
جلاس کی صدارت حکیم صاحب کے رفیق
کار حکیم اقبال نے کی اور نظامت پروفیسر
ختر الواسع نے کی ۔اس اجلاس میں سید
حامد، پروفیسر محمد شمیم جیرا جپوری
(وائس چانسلر، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی)
پروفیسر علاؤ الدین احمد، (وائس چانسلر،
جامعہ ہمدرد) پروفیسر محمد اقبال (جامعہ
ہمدرد) اور ڈاکٹر اوصاف علی نے مقالات

پیش کیے۔ پروفیسر علاؤ الدین احمد نے کہا
کہ حکیم صاحب حقیقت میں علامہ اقبال
کے "مرد کامل" تھے۔ جناب اوصاف علی
نے حکیم صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کو
بڑے خوبصورت افسانوی انداز میں پیش
کیا۔ پروفیسر محمد اقبال نے حکیم صاحب کو
سادگی ، انکساری اور خوش مزاجی کا پیکر
بتایا۔ سمینار کے دوسرے اجلاس کی
صدارت پروفیسر شمیم جیر اجپوری نے
فرمائی اور نظامت جامعہ ہمدرد کے ڈاکٹر
الطاف اعظمی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں
جن مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالے
پیش کیے ان میں جناب خواجہ حسن ثانی
نظامی ، جناب گلزار دہلوی، جناب زبیر
رضوی جناب خاور ہاشمی ، جناب الطاف
اعظمی اور جناب اسد ادریس اعظمی تھے۔
حکیم صاحب کے صاحبزدگان عبدالمعید
اور حماد صاحبان نے بھی سمینار میں موجود
تھے۔ آخر میں اردو اکادمی کے سکریٹری
منصور احمد عثمانی نے حاضرین کا شکریہ
ادا کیا۔

شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۱۶ ستمبر۔ شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں
روایت کے مطابق اس سال بھی جلسہ
استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں اساتذہ
صاحبان وطلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت
کی ۔اس تقریب کی صدارت صدر شعبۂ

اردو پروفیسر شمیم حنفی نے کی۔ نظامت کے فرائض حقیق اللہ خاں جنرل سکریٹری بزم جامعہ نے انجام دیئے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی صدارتی تقریر میں طالب علموں کی ادبی تخلیقات اور حسن انتظام پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے شعبہ اردو کی تاریخ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نثری خدمات کا ذکر کیا۔ پروفیسر قاضی عبیدا لرحمان ہاشمی نے شعبہ اردو سے وابستہ نوواردان کا خیر مقدم کرتے ہوئے شعبہ اردو کی تعلیم وتہذیب پر اظہار خیال کیا۔ بزم جامعہ کی ایڈوائزر ڈاکٹر صادقہ ذکی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تہذیبی زندگی کے بعض عناصر کی نشاندھی کرتے ہوئے کہا کہ یہ سال رواں کا ابتدائی جلسہ ہے جبکہ آئندہ بھی اس شعبہ میں طالب علموں کی علمی، ادبی محفلیں ہوتی رہیں گی، اس جلسہ میں گذشتہ سال کی عمدہ کارکردگی پر بعض طلبہ وطالبات کو سرٹیفکٹ تقسیم کیے گئے اچھی کوششوں، (تقریر، انشائیہ اور مونو ایکٹنگ) پر صدشعبہ نے طالب علموں کو انعامات سے نوازا۔ اس رنگا رنگ پروگرام میں شعبہ کے جن فنکاروں نے حصہ لیا ان کے نام اس طرح ہیں۔ سرتاج ،سفیان اختر، خالد برکت اللہ۔ مطیع اللہ۔ محمد شاہد۔ سعود احمد محب الدین۔ عبید الرحمٰن، محمد یوسف۔ گل فشاں عاقل۔ شہلا ساجد، طارق حبیب، فہمیدہ خاتون اور محمد ارشد۔

ماریشس میں علامہ اقبال پر بین الاقوامی مذاکرہ

"۲۱ ویں صدی میں اقبال کی معنویت" کے موضوع پر ۶، ۷ر ستمبر ۹۹ء کو مارشیس میں وزارت فنون وثقافت کے بہت ہی فعال ادارے مرکز ثقافت اسلامی کے زیر اہتمام دو روزہ بین اقوامی مذاکرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ صدر جمہوریہ ماریشس جناب قاسم اُتیم نے افتتاحی خطبے میں اقبال کو مفکر، عظیم شاعر اور مشرقی انقلاب کا مشعل بردار کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب احمد رحمت علی ڈائرکٹر نے مہمانوں اور مندوبین کا استقبال۔ جناب محمد وحید چیرمین نے مذاکرے کی غرض وغایت کے علاوہ اقبال کو صاحب ادراک مفکر کہہ کر تعارف پیش کیا۔ وزیر تعلیم، وزیر ثقافت اور اٹارنی جنرل وزیر انصاف جناب عبدالرزاق پیرو بھائی، سبھی حضرات نے اقبال کے شعر وپیغام کو آفاقی اور ابدی قرار دیتے ہوئے اپنے انتہائی پر خلوص جذبات کا اظہار کیا۔ ماریشس کے سب سے کشادہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں تقریباً پانچ ہزار سامعین کے ذوق

وشوق سے لبریز فضا میں یہ مذاکرہ دونوں تک اثر آفریں اور خوشگوار علمی ماحول قائم کرنے میں بے نظیر تھا۔ چھٹے اجلاس میں ملک اور بیرون ملک کے آٹھ اقبال شناسوں نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر مکی مشوت نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر عبدالحق نے اقبال کو انسان دوستی اور اس کی عظمتوں کے لافانی نغموں کا ذکر کرتے ہوئے ادبیات عالم کا سب سے محترم شاہکار قرار دیا۔ ڈاکٹر مس لوڈ امیلا وسیلوا نے نظم "ہمالہ" کی تخلیق وتصوارت پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر سعید احمد درّانی نے مشرق ومغرب کے تناظر میں اقبال کو ناگزیر دہلیز قرار دیا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے اقبال کی معنویت پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے ان کی جینیس کا اعتراف کیا ڈاکٹر شیلا ڈونوف نے "قانون آزادی" سے متعلق مقالہ پڑھا۔ پروفیسر قاسم حیرہ صدر شعبۂ اردو پروفیسر عنایت حسین عیدون اقبال کی معنویت اور ماریشس میں مطالعۂ اقبال کا تفصیلی اور بہت ہی خیال افروز جائزہ پیش کیا۔ جناب عارف چودھری نے مذہبی افکار کی معنویت اور جناب ناز احمد نے اقبال کی معنویت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں ناگزیر مفکر اشاعر قرار دیا۔ سونیر کا اجرا ہوا اور آخری اجلاس میں مندوبین سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چیرمین اور ڈائرکٹر نے اس مذاکرے کو اقبال شناسی کی متعدد سمتوں کی رہ نمائی کا سبب کہتے ہوئے مطالعہ اقبال کو نوع انسانی کی عالم گیر وارثت قرار دیا۔

اردو ٹیچر جمال سرور کو صدر جمہوریہ نے نیشنل ایوارڈ سے نوازا

نئی دہلی ۶ ستمبر۔ ایم سی پرائمری اسکول حویلی اعظم خاں جامع مسجد دہلی کی اردو ٹیچر جمال سرور کو نیشنل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ صدر جمہوریہ کے آر کے نارائنن نے کل یہاں یوم اساتذہ کے موقع پر منعقدہ ایک تقریب میں جمال سرور کو قومی اعزاز سے سرفراز کیا۔ اس برس انعام یافتگان میں سب سے کم عمر کی انعام حاصل کرنے والی دہلی کی پہلی اردو ٹیچر ہیں۔ انھیں ۱۹۹۷ء میں بھی دلی سرکار کا ٹیچر ایوارڈ بھی ملا تھا۔ جبکہ ۱۹۹۶ء میں نگم ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ محترمہ جمال سرور مختلف مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کر چکی ہیں۔ وہ تاریخ اور فارسی میں ایم اے ہیں۔

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کو سنٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ کا انعام

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم شعبہ اردو دہلی

یونی ورسٹی کے استاد اور نئے ادبی منظر نامے کا ایک بے حد فعال نام ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندی میں بھی تراجم کے کام کرتے رہے ہیں۔اس سلسلے میں ان کی تین کتابیں ''ٹوٹا ہوا آدمی''، ''مقدس جیل''، اور ''ایک اور آوارگی'' وغیرہ ہندی میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔چنانچہ ان کے ہندی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے سنٹر ل ہندی ڈائریکٹوریٹ، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی نے انھیں ۲۵، ہزار روپے کے نقد انعام سے نوازنے کا اعلان کیا ہے۔

ہم غم میں برابر کے شریک ہیں

جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کے پرنسپل کو صدمہ

نئی دہلی ۱۷ ستمبر جامعہ ملیہ اسلامیہ سینئر سیکنڈری اسکول کے پرنسپل صابو احمد ملک کے چھوٹے بھائی آفاق احمد ملک مختصر علالت کے بعد جوان العمری میں ۱۵راگست بروز بدھ کانپور میں انتقال کر گئے۔مسجد فتح پوری، دہلی میں ان کے لیے دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لیے دعائے صبر جمیل کی گئی۔

حسرت جے پوری کا انتقال

ہندی فلموں کے مشہور نغمہ نگار حسرت جے پوری کا یہاں کے ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں انتقال ہو گیا۔وہ ۸۱ برس کے تھے۔ڈاکٹروں کے مطابق ان کے گردوں اور جگر دونوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔حسرت جے پوری ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے انھوں نے ۱۹۴۰ء میں فلمی دنیا کی طرف رخ کیا اور ہندی فلموں کے ''شومین' راج کپور کے بینر سے وابستہ ہو گئے۔ان کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے موسیقار نوشاد نے کہا کہ ''حسرت صاحب ایک اچھے انسان اور اردو کے ایک اچھے شاعر تھے۔وہ اپنے گیتوں کے ذریعے لوگوں میں محبت کا جذبہ پیدا کرتے تھے۔وہ آر کے اسٹوڈیو کا آخری ستون تھے وہ اب تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔

مکتبہ اشاعت القرآن اردو بازار دہلی کے منشی رفیق احمد صاحب نہیں ہے

منشی رفیق احمد صاحب ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے اور آج سے تقریباً ۵۰ سال قبل مکتبہ اشاعت القرآن قائم کیا۔اور اس ادارہ کے ذریعے قرآن کریم اور دیگر مذہبی کتب کی نشر و اشاعت کا سلسلہ قائم کیا جو الحمد اللہ ہنوز جاری ہے۔آپ اپنے ادارے کی کتب کے علاوہ دیگر اداروں کی مطبوعات اور مدارس عربیہ روئیداد اور سیدات وغیرہ کی طباعت کی ذمہ داری بھی بخیر و خوبی سر انجام دیتے رہتے تھے۔یہاں تک کہ تقریباً تیس سال تک

دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ "دارالعلوم"
کی طباعت آپ کی زیر نگرانی ہوتی رہی
اور اس دوران ایک مرتبہ بھی رسالہ اپنی
تاریخ اشاعت سے موخر نہیں ہوا۔ آپ
علمی آدمی تھے اور اپنا زیادہ تر وقت دینی
کتب کے مطالعے میں صرف کرتے تھے
یہی وجہ تھی کہ آپ کا مطالعہ بہت وسیع ور
روزہ مرہ کی گفتگو میں مختلف کتب کے
حوالجات کے ساتھ لوگوں کے مسائل اور
مشکلات کے حل پیش کردیا کرتے تھے۔
دینی مدارس کی ترقی کے لیے
ہمیشہ کوشاں رہتے تھے اور اپنی گوناگوں
مصروفیات اور تکالیف کے باوجود وقت
نکال کر مختلف مدارس میں جاتے اور وہاں
کے ارباب حل وعقد سے ان کی ضروریات
معلوم کرتے اور ہر ممکن حد تک ان کو پورا
کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ آج کے
حالات میں دینی مدارس کو قوم کی تعمیر و ترقی
کے لیے سب سے بڑا اور اہم ذریعہ مانتے
تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خود بھی مدارس کی ترقی
کے لیے ہر ممکن اقدام کرتے اور دوسروں
کو بھی اس طرف توجہ دلاتے رہتے۔ علماء
دیوبند سے خاص تعلق۔ یہی وجہ تھی کہ
انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں
جمعیۃ العلماء ہند کے بینر تلے بڑھ چڑھ
کر حصہ لیا لیکن ملک کی آزادی کے بعد
کبھی بھی کوئی مادی یا مالی فائدہ حاصل
کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی مجاہدین
آزادی کو ملنے والی مراعات سے کوئی
فائدہ اٹھایا۔ ہمیشہ یہی کہا کہ ملک آزاد
کرانا تو ہمارا فرض۔ یہ کام ہم نے کسی
دنیاوی صلے کے لیے نہیں کیا۔ آخر ۲۸ر
اگست ۱۹۹۹ء بروز ہفتہ رات تقریباً
ساڑھے آٹھ بجے بوقت نماز عشاء داعی
اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔
پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا راقم
الحروف اور ایک لے پالک بچی شبنم شامل
ہیں۔ قارئین کتاب نما دعاء کریں کہ اللہ
تعالٰی مرحوم کو جنت الفردوس کے اعلا
مقامات سے نوازے۔ اور پسماندگان کو
صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

عزیز احمد، اردو بازار، دہلی

مجلس منتظمہ انجمن ضیاء الاسلام

پبلک لائبریری، کامٹی کا تعزیتی جلسہ

انجمن ضیاء الاسلام پبلک لائبریری،
کھری بازار کامٹی کی مجلس منتظمہ کے
عہدیداران واراکین کا ایک خصوصی
اجلاس بروز جمعرات بتاریخ ۹ر ستمبر ۱۹۹۹ء
بوقت ۱۰ر بجے شب بمقام انجمن ضیاء
الاسلام پبلک لائبریری ہال، زیر صدارت
جناب ظہیر آغائی صاحب (نائب صدر
لائبریری ہذا) منعقد ہوا جس میں مندرجہ
ذیل تعزیتی تجویز اتفاق رائے سے منظور

کی گئی۔

"انجمن ضیاء الاسلام پبلک لائبریری، کامٹی کی مجلس منتظمہ کا یہ خصوصی اجلاس لائبریری کے صدر عالی جناب ماسٹر محمد سعید اختر صاحب کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ موصوف نے مختصر علالت کے بعد بروز جمعرات بتاریخ ۹ ستمبر ۱۹۹۹ء داعی اجل کو لبیک کہا۔

جناب ماسٹر محمد سعید اختر صاحب (۱۹۲۷ء - ۱۹۹۹ء) نے کامٹی، ناگپور اور علی گڑھ میں اپنے تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد ۱۹۵۹ء سے ۱۹۸۹ء تک ربانی ہائی اسکول و جونیئر کالج میں درس وتدریس کے فرائض ادا کیے۔ بعد ازاں ۱۹۹۰ سے تادم آخر مذکورہ بالا ادارے کے سکریٹری کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ مرحوم کی زندگی کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ ادبی، تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے

۱۹۹۳ء میں صدر منتخب ہوئے تو آخر دم تک اپنی اس حیثیت میں لائبریری کے لیے بیش از بیش خدمات انجام دیتے رہے۔ موصوف ہی کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں آج اس لائبریری کا شمار علاقے کی ممتاز اور بہتری لائبریریوں میں ہوتا ہے۔

ہم شہر کا یہ اجلاس بارگاہ ایزدی میں صمیم قلب کے ساتھ دست بدعا ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسان الصدق — مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ ۵/=

نظام رنگ — ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ۔ یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/=

شہیدِ جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مرد درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مرد مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۷۵/=

پرانی بات ہے (سلسلہ وار نظمیں) — زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ

غزل نما — تصحیح و ترتیب ادا جعفری

(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۲۸۰ ۵/۰

ساز سخن — ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے انداز بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔ =/۵

ترجمۂ قرآن — پروفیسر رشید الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش) پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ... کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/

نذرِ مختار — مالک ...

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما صاحب جمہوریہ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جن

Regd. with R.N.I. at No. 4967/60 October, 1999
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما نئی دہلی ۲۵

نومبر ۱۹۹۹ء جلد ۳۹ شمارہ ۱۱

فی پرچہ	8/-
سالانہ	80/-
سرکاری تعلیمی اداروں سے	125/-
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی جہاز)	500/-

اڈیٹر

شاہد علی خان

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

e-mail.maktaba@ndf vsnl net.in

Tele Cum Fax No(011)-6910191

ٹیلیفون نمبر: 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ٦

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

نئی مطبوعات

مولانا آزاد اور مسلم مسائل مشیر الحق مرحوم مرتبہ شہناز انجم 100/-
خوابوں کے مسیحا (افسانے) نعیم کوثر 150/-
آخری نبیؐ (بچوں کے لیے) حبیب احمد خاں قادری 9/-
کوے کی قبر (بچوں کے لیے) حبیب احمد خاں قادری 9/-
سبا کی شہزادی (بچوں کے لیے) حبیب احمد خاں قادری 9/-
ہاروت ماروت (بچوں کے لیے) حبیب احمد خاں قادری 12/-
شاخ زیتون (شعری مجموعہ) رؤف خلش 50/-
روایہ نظر (مضامین) رفعت سروش 100/-
اردو غزل اور تقسیم ہند (تحقیق و تنقید) محمد قمر الحق 100/-
اگلی صدی کے موڑ پر (افسانے) عظیم راہی 100/-
نجومی آپا اطہر پرویز 6/-
نیا سفر مرتبہ سید عاشور کاظمی، علی احمد فاطمی فی شمارہ 60/-
سہ ماہی "سفیر اردو" برطانیہ (رسالہ) انور شیخ نسیم بٹ فی شمارہ 50/-
توقیت غالب (غالبیات) ڈاکٹر کاظم علی خاں 100/-
ادب کا اسلامی تناظر (مذہب) ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی 100/-
آصف علی اور ارونا آصف علی (سوانح) ڈاکٹر خلیق انجم 250/-
ہمارے مضامین حصہ اول (مضمون نویسی) شفیع صدیقی 18/-
ہمارے مضامین حصہ دوم (مضمون نویسی) شفیع صدیقی 24/-
دوست بنیں دوست بنائیں (نفسیات) ڈیل کارنیگی 50/-
کامیابی کا راز (نفسیات) ڈیل کارنیگی 20/-
گفتگو اور تقریر کا فن (نفسیات) ڈیل کارنیگی 35/-
مانیں نہ مانیں (نفسیات) ڈیل کارنیگی 25/-
زندگی کا سفر (نفسیات) ڈیل کارنیگی 20/-
اپنی شخصیت کو پرکشش بنائیں (نفسیات) ڈیل کارنیگی 35/-
اپنی زندگی سے لطف اندوز ہوں (نفسیات) ڈیل کارنیگی 25/-
عمل کا جادو (نفسیات) ڈیل کارنیگی 35/-
پریشان ہونا چھوڑیں جینا سیکھیں (نفسیات) ڈیل کارنیگی 50/-
۳۹ بڑے آدمی (سوانحی خاکے) ڈیل کارنیگی 35/-
میٹھے بول میں جادو ہے (نفسیات) ڈیل کارنیگی 35/-
ترقی کی راہ پر (نفسیات) ڈیل کارنیگی 20/-
اسلام میں بچوں کی آزادانہ پرورش (بچوں کا ادب) مرتبہ شمیم فاروقی 15/-
اسلام میں بچوں کے حقوق (بچوں کا ادب) مرتبہ شمیم فاروقی 15/-
بچوں کی غذا جسمانی اور دماغی صحت (بچوں کا ادب) مرتبہ شمیم فاروقی 15/-
بچوں کی بقا اور نشوونما (بچوں کا ادب) مرتبہ شمیم فاروقی 15/-
ماحول اور حفظان صحت (بچوں کا ادب) 15/-
قرون وسطی کے مسلمان کے سائنسی کارنامے ڈاکٹر قادر لون 30/-
ماہنامہ حجاب رامپور مدیرہ ام صہیب فی شمارہ 10/-
مثنوی لخت جگر ارجمند آرا 160/-
غالب کا فن (غالبیات) ڈاکٹر عبدالمغنی 50/-
Directory Urdu Newspepers and Periodicals مودود صدیقی 300/-

مولانا آزاد اور مسلم مسائل

مصنف۔ ڈاکٹر مشیر الحق شہید مرتبہ۔ شہناز انجم

ڈاکٹر مشیر الحق شہید (سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) کے مولانا آزاد، اقبال پر گرانقدر مضامین کا مجموعہ۔ اس مجموعے کے سبھی مقالات آزاد فہمی اور آزاد شناسی کے لیے بہت ہی مفید اور بصیرت افروز ہیں۔ قیمت۔ 100/- روپے

خوابوں کے مسیحا نعیم کوثر

نعیم کوثر کے حیات افروز اور تہلکہ خیز افسانوں کا پہلا مجموعہ۔ ان افسانوں میں موصوف نے ناانصافی، لوٹ کھسوٹ، اور نفرت پھیلانے والوں کے چہروں سے نقاب الٹ دیے ہیں۔ قیمت۔ 150/- روپے

تصویریں اُجالوں کی پروفیسر نورالحسن نقوی

مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، مولانا آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ ایک درجن سے زیادہ نامور شخصیتوں کے قلمی مرقع۔

قیمت:- 120/- روپے

مہمان مدیر:
ڈاکٹر تابش مہدی
بیت الراضیہ۔ جی ۵؍اے۔ ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اُردو ہے جس کا نام

اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے۔ اس کا تعلق کسی ایک قوم یا مذہب سے کبھی نہیں رہا۔ یہ ہر قوم اور ہر مذہب کے ماننے والوں کی زبان رہی ہے اور ہر قوم اور مذہب کے لوگوں نے اِسے اپنی تہذیب تسلیم کیا ہے۔ اس کی تشکیل، ترویج اور ارتقا میں قدیم ہندستان کے تمام باشندوں نے حصہ لیا ہے۔ یہ اردو زبان کا ایک ایسا امتیاز ہے، جو دوسری کسی بھی زبان کو حاصل نہیں ہے۔

داغ دہلوی نے تقریباً سوا سو سال پہلے کہا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمی جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ مرحوم کا یہ فرمودہ آج بھی صحیح اور درست ہے۔ آج بھی سارے جہاں میں اُردو زبان وتہذیب کی دھوم ہے۔ لیکن گزشتہ نصف صدی سے یہ اپنے ہی گھر میں اپنی بقا اور تحفظ کے لیے نبرد آزما ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا، اِسے کن کن دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑا اور ادبی ولسانی سطح پر یہ کیسے کیسے اوچھے اور شرم ناک حملوں سے دوچار ہوئی؟ اس سے ہم سب بہ خوبی واقف ہیں۔ کبھی یہ کہہ کر فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی گئی کہ اُردو خالص مسلمانوں کی زبان ہے، اس لیے اُردو کا مسئلہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ ہے، کبھی یہ زہر افشانی کی گئی کہ اُردو ہندستان کی زبان نہیں ہے، اس میں ہندستانی عناصر کا فقدان ہے اور اس کی تمام تشبیہات، استعارات اور تلمیحات غیر ملکی ہیں۔ اس لیے آزاد ہندستان میں اس کے لیے کوئی گنجایش نہ ہونی

چاہیے اور جب اُردو اتنی پامرد اور سخت جان ثابت ہوئی کہ وہ اِن سب حملوں کو جھیل لے تو اسے ہندی ہی کی ایک شیلی (اسلوب) قرار دے کر اس کے وجود سے ہی انکار کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اُردو ان تمام مخالفتوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ زندہ رہی بلکہ اس کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی میں اضافہ ہوتا رہا۔

اب اردو برصغیر تک محدود نہیں ہے، بلکہ اب اسے عالمی زبان کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ دنیا کی عظیم زبانوں میں اس کا شمار ہونے لگا ہے۔ عالمی سطح پر یونی ورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔ اگر کہیں کسی وجہ سے اُردو کا شعبہ نہیں قائم ہو سکا ہے تو وہاں اُردو کے حوالے سے کوئی چیئر سرگرم عمل ہے۔ یورپ، امریکا، سعودی عرب اور خلیج کے بڑے بڑے شہروں میں اردو کے مراکز قائم ہیں اور ادبی انجمنیں ہیں۔ ان کے تحت مشاعرے، سمینار اور جلسے ہوتے رہتے ہیں، اردو کے سہ ماہی، ماہانہ اور ہفتہ وار رسائل اور جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ ایک سے زائد روزنامے بھی شائع ہو رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بھی اُردو کے موثر اور دل چسپ پروگرام آتے رہتے ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق اس وقت دنیا میں تقریباً ایک ارب لوگ اردو جانتے، بولتے اور لکھتے ہیں۔

ہندستان کے دو صوبوں، جموں و کشمیر اور ہماچل میں اُردو کو سرکاری حیثیت حاصل ہے، یہاں سارے کام سرکاری سطح پر اردو میں ہو رہے ہیں۔ بہار میں گزشتہ بیس برس سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ دہلی میں دوسری سرکاری زبان ہونے کا اعلان ہو چکا ہے۔ اتر پردیش میں کوشش جاری ہے، یقین ہے کہ بہت جلد کام یابی حاصل ہو جائے گی۔ مہاراشٹرا میں اردو کا مسئلہ روزی روٹی سے نہیں جڑا ہے، تاہم چونکہ وہاں اردو پسند حلقہ منظم اور فعال ہے، اس لیے وہاں اردو کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ تقریباً آٹھ سو ہائی اسکول اور ایک سو سے زائد کالج ایسے ہیں، جن میں ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ حیدرآباد ہندستان کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ یہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ تو نہیں مل سکا ہے لیکن ایک ایسا اردو معاشرہ دیکھنے کو ملتا ہے، جس سے بہ ہر حال اردو تہذیب اور کلچر کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اکثر صوبوں میں سرکاری سطح پر اردو اکادمیاں قائم ہیں اور اردو کے فروغ و ترقی کے لیے مراکز ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو کا وجود اب مشکوک نہیں رہا اور اس کی ترویج و ارتقا کی

کسی نہ کسی درجے میں کوشش ہو رہی ہیں۔ اردو کی مخالفت میں، جس سنسکرت زدہ ہندی کو تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی، وہ ناکام ثابت ہوئی تو اس کو آسان بنایا گیا، جس کے نتیجے میں ہندی میں اردو کے وہ تمام الفاظ واپس ہونے شروع ہو گئے، جنھیں بدیسی قرار دے کر ہندی سے نکال دیا گیا تھا۔

اب اردو کی ترویج و ترقی کی راہ میں وہ عناصر رکاوٹ نہیں ہیں، جنھیں ہم اردو کے بدخواہوں کی فہرست میں شمار کرتے رہے ہیں۔ بلکہ اب اس کے سب سے بڑے ذمے دار اُردو والے ہیں، دانش گاہیں ہیں اور دانش گاہوں کے وہ اساتذہ ہیں، جو اُردو ہی کو زینہ بنا کر ترقیوں کی منزلیں طے کرتے ہیں، وہ ناقدین اور محققین ہیں، جن کی معیشت اُردو سے وابستہ ہے اور وہ ادیب اور صحافی ہیں، جو اردو کی روٹی کھاتے ہیں۔ ہمارے یہ اُردو کے ادیب و دانش ور خود تو اردو کی سفارت کرتے ہیں لیکن ان کے بچے اردو کے الف سے واقف نہیں ہوتے۔ یہ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں داخل کرانے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ یہ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں داخل نہیں کراتے بلکہ انھیں اختیاری مضمون کے طور پر بھی اردو لینے کی ترغیب نہیں دیتے۔ انھیں اپنے اس روّیے پر تاسّف بھی نہیں ہوتا۔ مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نظام تعلیم بناتے ہوئے کہا تھا:

> "ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اِس قدر ثابت نہیں ہوتی، جس قدر کہ ایک غیر زبان میں تحصیل علوم کی مشقت رائگاں سے ثابت ہوتی ہے۔ ہم مشرقی تو وحشی لوگ ہیں اور بربریت میں مبتلا ہیں، لیکن خود تہذیب یافتہ مغربیوں کا کیا شعار ہے، کیا کوئی انگریز اپنے بچے کو تاریخ یا سائنس فرانسیسی یا جرمن زبان میں پڑھواتا ہے؟ کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو جغرافیہ یا ریاضی انگریزی یا روسی زبان میں سکھواتا ہے؟ لیکن ہماری غلامی اور اب ہماری غلامانہ ذہنیت کو دیکھ کر ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے ہندستانی اساتذہ بھی، جو اکثر انگریزی خود بھی اس طرح نہیں جانتے ہیں، جس طرح کہ انگریز جانتے ہیں، ہندستانی بچوں کو

تاریخ ، سائنس ، جغرافیہ اور ریاضی انگریزی زبان میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مولانا محمد علی جوہر کا یہ بیان کم وبیش اسّی سال پہلے کا ہے۔ جب ہندستان آزاد نہیں ہوا تھا۔ یہاں انگریز حکمرانی کررہے تھے۔ اب جب کہ ملک کو آزاد ہوئے پچاس برس ہوگئے، اس کی معنویت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اُس وقت کی صورت حال جوں کی توں باقی ہے۔

اخبارات اور رسائل کے سلسلے میں بھی ہم اردو والوں کا رویہ تشویش ناک ہے۔ گھروں میں ایک سے زائد انگریزی اخبارات اور رسائل آتے ہیں۔ لیکن اردو کا کوئی اخبار یا رسالہ نہیں خریدا جاتا۔ البتہ مفت حاصل کرنے کی کوشش رہتی ہے۔ پوچھنے پر بڑی بے نیازی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اردو رسائل و جرائد کا معیار بہت پست ہے۔ حالانکہ یہ بات بڑی آسانی کے ساتھ سمجھی جاسکتی ہے کہ معیار بلند کرنے والے بھی تو ہم ہی ہیں۔ اگر ہم اسے خریدیں گے نہیں اور تعاون نہیں دیں گے تو معیار کیسے بلند ہوگا۔ صوری اور معنوی دونوں معیاروں کا انحصار اسی پر ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ایسا بھی نہیں ہے کہ اردو کے تمام اخبارات ورسائل کا معیار بہ ہر اعتبار پست ہی ہے۔ ممبئی کے اخبارات میں اردو ٹائمز اور انقلاب، حیدرآباد کے سیاست، رہ نمائے دکن اور منصف، کلکتہ کا آزاد ہند، بنگلور کا سالار اور دہلی کا سہارا یہ وہ اخبارات ہیں، جو اگر انگریزی اخبارات سے بڑھ کر نہیں تو کم تر بھی نہیں ہیں۔

اردو کے دامن کو جہاں فکری اعتبار سے وسیع کرنے کے لیے مغربی ادب سے استفادے کی ضرورت ہے، وہیں بنیادی اعتبار سے وہ عربی وفارسی کی بھی محتاج ہے۔ اردو الفاظ کے صحیح املا اور درست تلفّظ پر عربی وفارسی کی جان کاری کے بغیر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ جامعات کے اساتذہ کا ایک بڑا طبقہ ایسا ہے، جو مغربی علوم میں تو کسی قدر درک رکھتا ہے لیکن عربی وفارسی سے وہ یکسر نابلد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات وہ ایسی غلطیاں کرگزرتا ہے کہ اردو کے حال پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

چوں کہ اساتذہ علمی اعتبار سے لنگڑے ہیں، اس لیے یہ وراثت بھی لنگڑی ہی چھوڑنا چاہتے ہیں۔ جب بھی کسی یونیورسٹی میں اردو کے کسی استاذ کی جگہ خالی ہوتی ہے یہ صلاحیتوں کی بجائے ذاتی تعلقات اور مفادات کو ترجیح دیتے ہیں اور اہل اور ذی صلاحیت امیدواروں کو، موضوع سے ہٹ کر غیر متعلق اور ایران طوران کی باتیں

پوچھ کر انٹرویو میں نروس کر دیتے ہیں اور ایسا نروس کرتے ہیں کہ پھر وہ کسی انٹرویو میں شرکت کی ہمت بہ مشکل ہی کر پاتا ہے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر شفیق جون پوری کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے:

خدا جانے مرے گلشن ترا انجام کیا ہوگا
جسے مالی بناتا ہوں، وہی صیاد ہوتا ہے

بات بہت لمبی ہوگئی اور ابھی بہت کچھ باقی ہے تقریباً تیس برس پہلے میں نے انشائے خلیفہ کا یہ شعر پڑھا تھا:

بہ پایاں آمد ایں دفتر، حکایت ہم چناں باقی
بہ صد دفتر نہ شاید گفت حسب الحال مشتاقی

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ شکوہ و شکایت کا دفتر بند کر کے اردو کی بقا اور تحفّظ کے لیے ہم سب صحیح معنوں میں اردو کے سفیر بن کر سامنے آئیں۔ اپنے گھروں میں اردو زبان، اردو تعلیم اور اردو تہذیب کو عام کریں، اردو کے اسکول کھولیں اور جو اسکول پہلے سے کھلے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ تعاون کریں، طلبہ کی فراہمی میں اسکول والوں کا تعاون کریں، شبینہ و صباحی اردو مکاتب کا نظم کریں، تاکہ جو نوجوان ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مرحلے سے گزر چکے ہیں، وہ بھی اردو سیکھ سکیں، جہاں کہیں سرکاری سطح پر اردو کے مراکز قائم ہیں انھیں تقویت دیں، جامعات میں اردو اسامیوں کے لیے امیدواروں کے بارے میں ذاتی اور گروہی مفادات وتعصّبات سے بلند ہو کر غور کریں اور اردو کے اخبارات و رسائل کو خرید کر اور اشتہارات کے سلسلے میں ان کی مدد کر کے ان کی توسیع اشاعت میں حصہ لیں۔

اس سلسلے کی آخری گزارش یہ ہے کہ ہماری توجہ مطالبات اور اُردو کے سلسلے میں کیے گئے سرکاری وعدوں کی یاد دہانیوں سے زیادہ اپنے فرائض پر ہونی چاہیے۔ یہی ایک زندہ اور با مقصد قوم کی پہچان ہوتی ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے:

یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی اہم کتابیں

مشقی تدریس۔ کیوں اور کیسے؟

ڈاکٹر محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں نے استادوں کی ٹریننگ کے عملی پہلو کی اہمیت کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس کے پیش نظر "مشقی تدریس" پیش کی۔ یہ کتاب آپ کے طویل تجربے، عمیق مطالعے اور تحقیق کا نچوڑ ہے۔ قیمت.-/45روپے

دلی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی

میر آمن سے شاہد احمد دہلوی تک دلی کے قلم کاروں کا جو طویل سلسلہ ہے۔ اشرف صبوحی اس کی نہایت اہم کڑی ہیں۔ ان کی دلی کا مرکز لال قلعہ نہیں، شاہجہاں آباد کے عوام ہیں۔ اس میں کبابی بھی ہیں، بھٹیارے بھی، بوڑھے تکیہ دار بھی ہیں اور رنگ پیر بھی۔ دلی کی ٹکسالی زبان میں لکھے ہوئے یہ دلچسپ خاکے اعلا اور جاندار نثر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ قیمت.-/51روپے

کچھ مولانا آزاد کے بارے مالک رام

مالک رام صاحب نے گذشتہ تیس برسوں میں مولانا آزاد کے بارے میں مختلف موضوعات پر گیارہ مضامین قلمبند کیے تھے۔ یہ کتاب انھیں مضامین کا مجموعہ ہے

قیمت.-/51روپے

جدید افسانہ اور اس کے مسائل

وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔

قیمت:-/36روپے

اپنی ہواؤں کی خوشبو کشمیری لال ذاکر

اس کتاب میں اردو کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور اردو دوستوں کے ہلکے ہلکے نقوش ہیں۔ مکمل تصویریں نہیں۔ مگر ان خاکوں میں آپ کو نرم نرم ہواؤں کی خوشبو ملے گی۔ وہ خوشبو جس کی تمنا آپ کو برسوں سے ہوگی۔ قیمت.-/36روپے

صاحب جی سلطان جی

ڈاکٹر اسلم فرخی

اس کتاب میں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ اور سلاطین دہلی کے تعلقات کا جائزہ تاریخی بنیاد اور مستند تاریخی حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت.-/2[illegible]روپے

سحر کے پہلے اور بعد میرزا سعید الظفر چغتائی

یہ ایک قصبے کی سماجی اور سیاسی تناظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے جس میں مصنف کے بچپن کی کلیاں، سعدی کے گلستاں کی طرح حسین و نوجوان نظر آرہی ہیں۔ دلچسپ جگ بیتی۔ قیمت.-/51روپے

باقر مہدی

ایک کالی نظم

(راجندر سنگھ بیدی کی پندرھویں برسی کے موقع پر!)

تو نے اک سنسار بسیا
کتنے کرداروں کو جیون دان دیا تھا
(عورت۔ بچے۔ بوڑھے!)
سب کے دکھ اپنا کر
سکھ کے سپنے دیکھ نہ پایا۔!

"باپ بکا"- تو قحط پڑا تھا
دھرتی پھٹ جانے کو تھی!

کوئی نہ سمجھا تیرا اشارا
چاروں اور تھا گھور اندھیرا
سب اپنی قسمت کے مارے
ڈھونڈ رہے تھے۔ پتھر - ہیرے

اردو - بھی ایک بھاشا تھی
اب بھی بازاروں میں سنائی دیتی ہے
آج بے چاری اپنی آنسو پی پی کر "زندہ" ہے!

تجھ کو یہ معلوم نہیں ہے
"بھولا"۔ اب معصوم نہیں ہے
لیکن۔ "لاجو"۔ ہر ناری میں
اب تک زندہ ہے!

یاد تیری آتی ہے لیکن
وہ تیزابی وہ بے تابی کم کم ہے
بیدی - مجھ کو معاف کرو
شاید میں بھی تجھ کو بھول رہا ہوں
میں اک تنہا بوڑھا شاعر
یادوں اور سپنوں کے سہارے
"زندہ" ہوں - کیا - ؟

بھارت پر اک "گہن" لگا ہے
ہم سب کو آخر گھیرا ہے
ننگے بچے سڑکوں پر تنہا پھرتے ہیں
اور ان کی بے کس مائیں
"اک چادر میلی سی" ڈھونڈ رہی ہیں

ڈاکٹر عطش درانی (آخری قسط)

اردو صوتیت، نئی املا اور کمپیوٹر تختیاں

اردو کے یہ ۶۴ حروف تہجی کچھ یوں ہیں:۔

۲۔ ا، آ

۱۱۔ ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث،

۱۷۔ ج، جھ، چ، چھ، ح، خ،

۲۲۔ د، دھ، ڈ، ڈھ، ذ،

۲۸۔ ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ،

۳۶۔ س، ش، ص، ض، ط، ظ ع، غ،

۴۴۔ ف، ق، ک، کھ، گ، گھ، ل، لھ،

۵۳۔ مّ، م، مھ، ں، نھ، ن، ل، ن، ٹھ،

۵۷۔ وٓ، و، و، وھ،

۶۰۔ ہ، ۃ، ء،

۶۴۔ ی، ی، ے، یھ،

جہاں تک لغات میں حروف کی تختیاں قائم کرنے کا تعلق ہے، ان میں صرف ایسے حروف چھوڑے جاسکتے ہیں، جن سے الفاظ شروع نہیں ہوتے۔ لیکن خیال رہے کہ رھ سے رھواس (رہنے کا عمل رکیفیت) رُھب (مشت)، ڑ سے ڑنگا (بیل گاڑی کی گھنٹی)، ڑون (ںٹ) نیا حرف تہجی)، ڑھ سے ڑھیڑی (ریڑھی)، ڑھیڑ (ڈھلوان) موجود ہیں۔ البتہ مّ، ں، نھ، ن، ن، ل، وٓ، وٓ، ی، مستثنیٰ ہیں۔
اب اردو ٹائپ اور کمپیوٹر کی تختیوں کے تعلق سے دیکھیں تو ان تمام حروف کے لیے الگ

انھیں قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دو چشمی "ھ" رکھنے والی ہکاری اصوات،
نہ دیکھ" اور جزم (۔) کی علامت رکھنے والے حروف کے لیے علاحدہ خانوں اور کلیدوں
ں ضرورت نہیں۔ یہی علامتیں کافی ہیں جو کلیدی تختے پر جوڑی جاسکتی ہیں اور ضابطہ پلیٹ
(Code Plate) پر ایک منفرد حرف کی صورت اختیار کر سکتی ہیں۔ اس طرح صرف مندرجہ
یل بیالیس حروف یا علامتوں کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے:۔

ا، آ، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح،
خ، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ژ، س، ش، ص، ض،
ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ں،
ن، و، ہ، ھ، ی، ے، ھ،

ان کے ساتھ اگر زبر، زیر، پیش کو نیم مصوتے یا نیم حروف علت (Semi Vowels)
ں کر شامل کرلیں تو یہ تعداد ۴۵ ہو جاتی ہے۔ ہمزہ اضافت "ء" اور زیر اضافت (۔) علاحدہ
ان ہے اور ترتیب کاری میں نہیں آتے اس لیے یہ عام حروف ہمزہ اور زیر ۔ کے علاوہ اور
تزادقرار پائیں گے اور دیگر علامات x، !، ؟، وغیرہ کے ساتھ شریک رہیں گے۔

چونکہ لوکارتم کے انداز پر حرف صحیح حرف زبر، حرف زیر اور حرف پیش الگ الگ ہوں گے،
ں لیے زبر، زیر، پیش کی علامات کے لیے الگ خانوں کی ضرورت درپیش نہیں ہوگی۔ اردو میں
سوتے یا حروف علت (Vowels) چار ہیں۔ ا، و، ی، ے، ان کے ساتھ جب زبر، زیر، پیش
ی نیم مصوتے شامل ہوتے ہیں تو ان کی آواز نئے صوتیے میں بدل جاتی ہے، انھیں حروف لین
ہتے ہیں۔ چونکہ انھیں زبر، زیر، پیش کے ساتھ ظاہر کیا جاسکتا ہے، اس لیے انھیں الگ حرف شمار
ہیں کیا گیا۔ لوکارتم کے اصول کے تحت کمپیوٹر کی ضابطہ تختی میں حروف یوں ہوں گے۔

ا، اَ، اِ، اُ،
آ (باقی درکار نہیں)
ب، بَ، بِ، بُ
پ، پَ، پِ، پُ،
ت، تَ، تِ، تُ
ٹ، ٹَ، ٹِ، ٹُ،
ث، ثَ، ثِ، ثُ،

ج، جَ، جِ، جُ،
چ، چَ، چِ، چُ،
ح، حَ، حِ، حُ،
خ، خَ، خِ، خُ
د، دَ، دِ، دُ،
ڈ، ڈَ، ڈِ، ڈُ،
ذ، ذَ، ذِ، ذُ،
ر، رَ، رِ، رُ،
ڑ، ڑَ، ڑِ، ڑُ،
ز، زَ، زِ، زُ،
ژ، ژَ، ژِ، ژُ،
س، سَ، سِ، سُ،
ش، شَ، شِ، شُ،
ص، صَ، صِ، صُ،
ض، ضَ، ضِ، ضُ،
ط، طَ، طِ، طُ،
ظ، ظَ، ظِ، ظُ،
ع، عَ، عِ، عُ،

غ، غَ، غِ، غُ،
ف، فَ، فِ، فُ،
ق، قَ، قِ، قُ،
ک، کَ، کِ، کُ،
گ، گَ، گِ، گُ،
ل، لَ، لِ، لُ،
م، مَ، مِ، مُ،
ں، (باقی درکار نہیں)
ن، نَ، نِ، نُ،
و، وَ، وِ، وُ،
ہ، ہَ، ہِ، ہُ،
ھ، ھَ، ھِ، ھُ،
ی، یَ، یِ، یُ،
ے (باقی درکار نہیں)
ۂ (ٔ)
ۃ ( )
ؔ (؎)
ؒ (")

مقتدرہ کی معیار بندی کی موجودہ کوششوں میں سے طارق حمید کی "طارق کی تختی" اس کا حل پیش کرتی ہے۔ باقی تختیاں اضافتوں اور اعراب کے چکر میں ہیں، جن کے ساتھ مزید محرک (Engine) لگانا پڑتے ہیں، جو مزید مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اردو اب تکنیکی گھاٹ چڑھ چکی ہے۔ اب اس کے صوتیے، حروف، املا، ترتیب، اصول لسانیات، زبان کی رہنمائی ہماری بول چال اور ادبیات کی روایت نہیں کرے گی بلکہ برقیاتی ٹکنالوجی (اردو کمپیوٹر، ای میل، انٹرنیٹ، اطلاعیات وغیرہ) کرے گی۔ اب زبان کی ترقی (Language Development) اور لسانی منصوبہ بندی (Language Planning) خواہ مجموعی (Corpus) سطح پر ہو، لغاتیات (Lexicology)، یا

اصطلاحیات (Terminology) کے حوالے سے ہو یا مجم نویسی (Thesaurii Building) یا قصر یہ لغت (Dicautom) ہو، جو جدید لسانی ترقی کے لوازم ہیں، ان سب کی رہنمائی شاہراہِ اطلاعیات (Information Highway) کی لوکارتم کرے گی۔

ہمیں اپنی مستقبل کی آئینہ بندی اپنے
ذاتی خیالات اور موضوعی (Subjective)
نظریات سے ہٹ کر جدید معروضیت
(Objectivity) اور تکنیکیت
(Technicality) کی بنیاد پر کرنا ہوگی۔ یہی
زبانوں کی منزل ہے اور یہی اردو کا ہدف۔

اردو کے یہ ۶۴ حروف تہجی کچھ یوں ہیں:۔

۲۔ ا، آ

۱۱۔ ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث،

۱۷۔ ج، جھ، چ، چھ، ح، خ،

۲۲۔ د، دھ، ڈ، ڈھ، ذ،

۲۸۔ ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ،

۳۶۔ س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ،

۴۴۔ ف، ق، ک، کھ، گ، گھ، ل، لھ،

۵۳۔ ﻢ، م، مھ، ں، نھ، ن، ل، ن، نھ،

۵۷۔ وٓ، و، و، وھ،

۶۰۔ ہ، ۃ، ھ،

۶۴۔ ی، ی، ے، ےھ،

ذیل بیالیس حروف یا علامتوں کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے:۔
ا، آ، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح،
خ، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، س، ش، ص، ض،
ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن،
ں، و، ہ، ء، ی، ے، ھ، ۃ ۔

ان کے ساتھ اگر زبر، زیر، پیش کو نیم مصوتے یا نیم حروف علت (Semi Vowels) مان کر شامل کرلیں تو یہ تعداد ۴۵ ہو جاتی ہے۔ ہمزہ اضافت "ۂ" اور زیر اضافت (ـِ) علیحدہ نشان ہے اور ترتیب کاری میں نہیں آتے۔ اس لیے یہ عام حروف ہمزہ اور زیر کے علاوہ اور مستزاد قرار پائیں گے اور دیگر علامات ×، !، ؟، وغیرہ کے ساتھ شریک رہیں گے۔

چونکہ لوکارتم کے انداز پر حرف صحیح حرف زبر، حرف زیر اور حرف پیش الگ الگ ہوں گے، اس لیے زبر، زیر، پیش کی علامات کے لیے الگ خانوں کی ضرورت درپیش نہیں ہوگی۔ اردو میں مصوتے یا حروف علت (Vowels) چار ہیں۔ ا، و، ی، ے، ان کے ساتھ جب زبر، زیر، پیش کے نیم مصوتے شامل ہوتے ہیں تو ان کی آواز نئے صوتیے میں بدل جاتی ہے، انھیں حروف لین کہتے ہیں۔ چونکہ انھیں زبر، زیر، پیش کے ساتھ ظاہر کیا جاسکتا ہے، اس لیے انھیں الگ حرف شمار نہیں کیا گیا۔ لوکارتم کے اصول کے تحت کمپیوٹر کی ضابطہ تختی میں حروف یوں ہوں گے۔

ا، اَ، اِ، اُ،
آ (باقی درکار نہیں)
ب، بَ، بِ، بُ
پ، پَ، پِ، پُ،
ت، تَ، تِ، تُ
ٹ، ٹَ، ٹِ، ٹُ،
ث، ثَ، ثِ، ثُ،
ج، جَ، جِ، جُ،
چ، چَ، چِ، چُ،
ح، حَ، حِ، حُ،
خ، خَ، خِ، خُ
د، دَ، دِ، دُ،
ڈ، ڈَ، ڈِ، ڈُ،
ذ، ذَ، ذِ، ذُ،
ر، رَ، رِ، رُ،
ڑ، ڑَ، ڑِ، ڑُ
ز، زَ، زِ، زُ،
ژ، ژَ، ژِ، ژُ،
س، سَ، سِ، سُ،
ش، شَ، شِ، شُ،

	مـ، مـَ، مـِ، مـُ،
ص، صَ، صِ، صُ،	ں، (باقی درکار نہیں)
ض، ضَ، ضِ، ضُ،	ن، نَ، نِ، نُ،
ط، طَ، طِ، طُ،	و، وَ، وِ، وُ،
ظ، ظَ، ظِ، ظُ،	ہ، ہَ، ہِ، ہُ،
ع، عَ، عِ، عُ،	ھ، ھَ، ھِ، ھُ،
غ، غَ، غِ، غُ،	ی، یَ، یِ، یُ،
ف، فَ، فِ، فُ،	ے(باقی درکار نہیں)
ق، قَ، قِ، قُ،	ء (۴)
ک، کَ، کِ، کُ،	ۃ (۳)
گ، گَ، گِ، گُ،	ـ (۲)
ل، لَ، لِ، لُ،	(۰)

مقتدرہ کی معیار بندی کی موجودہ کوششوں میں سے طارق حمید کی "طارق کی تختی" اس کا حل پیش کرتی ہے۔ باقی تختیاں اضافتوں اور اعراب کے چکر میں ہیں، جن کے ساتھ مزید محرک (Engine) لگانا پڑتے ہیں، جو مزید مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اردو اب تکنیکی گھاٹ چڑھ چکی ہے۔ اب اس کے صوتیے، حروف، املا، ترتیب، اصولِ لسانیات، زبان کی رہنمائی ہماری بول چال اور ادبیات کی روایت نہیں کرے گی بلکہ برقیاتی ٹکنالوجی (اردو کمپیوٹر، ای میل، انٹرنیٹ، اطلاعیات وغیرہ) کرے گی۔ اب زبان کی ترقی (Language Development) اور لسانی منصوبہ بندی (Language Planning) خواہ مجموئی (Corpus) سطح پر ہو، لغاتیات (Lexicology)، یا اصطلاحیات (Terminology) کے حوالے سے ہو یا معجم نویسی (Thesaurii Building) یا قسر یہ لغت (Dicautom) ہو، جو جدید لسانی ترقی کے لوازم ہیں، ان سب کی رہنمائی شاہراہ اطلاعیات (Information Highway) کی لو کا رتم کرے گی۔

(بہ شکریہ اخبار اردو)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

نظام اردو خطبات کا 19واں خطبہ

داستان امیر حمزہ

"داستان، زبانی بیانیہ، بیان کنندہ اور سامعین"
کے عنوان سے

اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۹۸ء میں پیش کیا۔ اب یہ اہم خطبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کر دیا ہے۔

قیمت -/60

فکر انسانی کا سفر ارتقا

پروفیسر خواجہ غلام السیدین

نظام اردو خطبات کا آغاز شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲۵ر فروری ۱۹۶۶ء کو ہوا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا اور صدارت ڈاکٹر سی۔ڈی۔ دیش مکھ وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے فرمائی۔ ملک کے دیدہ ور ماہر تعلیم پروفیسر غلام السیدین نے مندرجہ بالا عنوان پر دو لیکچر دیے جن کا اب تیسرا اڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔

قیمت -/45

غالب کی شخصیت اور شاعری

پروفیسر رشید احمد صدیقی

یہ نظام اردو خطبات کا چوتھا خطبہ ہے جس کو ملک کے مایہ ناز طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی صاحب نے پیش کیا۔

(تیسرا اڈیشن) قیمت -/45

پارہ عم

اردو اور انگریزی میں ترجمہ مع تشریح اور عربی متن

حکیم محمد سعید صاحب نے نوجوانوں کے مرتبہ فکر و علم کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن حکیم کے تیسویں پارے کا آسان اردو اور انگریزی ترجمہ اردو تشریح مع عربی متن پیش کیا ہے۔ انگریزی ترجمہ متجر عالم عبداللہ یوسف علی کا نتیجہ فکر ہے۔ آج کا نونہال خواہ اردو میڈیم کا طالب علم ہو یا انگریزی میڈیم کا 'پارہ عم' کو پڑھنے اور سمجھنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اپنے نونہالوں کو پارہ عم تحفے کے طور پر پیش کیجیے۔

ہدیہ -/45

۱۰۰ ذائقے

شمیم وحید

(نوجوان بچیوں کے لیے)

کھانا پکانا ایک فن ہے اور لڑکیوں کو یہ فن آنا چاہیے۔ کھانا خوش ذائقہ ہو' صحت مند ہو اور خوبصورتی سے پیش کیا جائے تو غذا جزو بدن بن جاتی ہے اس کتاب میں سو کھانے ہیں اور سو ہی ذائقے۔ نوجوان بچیوں کو کھانے پکانے کا فن سیکھنے میں اس سے یقیناً مدد ملے گی۔

قیمت -/60

شمیم حنفی کی نئی کتاب

قاری سے مکالمہ

فکشن' شاعری اور تنقید و تحقیق مضمرات پر مضامین کا مجموعہ۔

قیمت -/150

قیصر تمکین
160, Oaksford, Combran-
NP 446 Un
Great Britain

جعلی ترقی پسندی، یا ہجو ملیح

اردو دنیا میں زیادہ تر اصحاب "یکرخ" قلمکار ہوتے ہیں۔ اگر کسی کا مطالعہ شاعری کے کسی خاص مکتب سے متعلق ہے تو ناول، افسانے اور ڈراما وتنقید پر اس کی نظر کمزور ہوتی ہے۔ بعض ایسے اہل علم بھی ہیں جو اردو ادبیات کے تقریباً ہر پہلو سے واقف ہوتے ہیں۔ کچھ ان سے بھی ذرا بہتر ہوتے ہیں کہ انھیں فارسی یا عربی سے بھی شناسائی ہوتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو یہ تلخ حقیقت منکشف ہوگی کہ ہمارے ادب میں کوئی ایسا صاحب علم وشعور نہیں ہے جو واقعی دانشور کہا جا سکے۔ پاکستان میں تو خیر ہمیشہ سے قحط الرّجال ہے اور اب احمد ندیم قاسمی کے بعد تو عزیز داب اللہ ہی اللہ ہی کا عالم نظر آنے لگے گا۔ لیکن ہندستان میں بھی پڑھے لکھوں میں بس سردار جعفری اور قرۃ العین حیدر ہی ہیں، ممکن ہے کوئی صاحب واقعی کہیں نابغہ ہوں جن کے بارے میں ہمیں علم نہ ہو کیونکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اہل علم عام طور پر گمنام ہی رہتے ہیں۔ طوق زریں تو مخلوق کے دوسرے طبقے کی اجارہ داری بن کر رہ گیا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر آل احمد سرور سے چند منٹوں کی نیاز مندی کا شرف ہی بجائے خود ایک رقومہ ہے۔ ہمیں اپنے حالیہ دورہ علی گڑھ میں یہ سعادت ملی اور آنکھیں کھل گئیں۔ ہم اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور تھے کہ عصر حاضر کے اگر دس بارہ دانشوروں کے نام گنائے جائیں تو ان میں سرور صاحب ایک ممتاز مقام کے حامل ضرور ہوں گے۔

پروفیسر ہنری برنز ڈیلوی نے ایک تصنیف میں دانشوروں کے فقدان کے بارے میں سنجیدگی سے بحث کی ہے جس کے جواب میں "دور جدید کے دانشور" کے نام سے دائیں بازو کے چہیتے صاحب قلم جناب پال جانسن نے ایک اور ضخیم تصنیف داغ دی ہے۔ بات ہمارے خیال سے پھر بھی نہیں بنی۔ اگر ہم دنیا کے ترقی یافتہ ادب پر نظر رکھیں، یہ مرحلہ آج کل ذرائع رسل ورسائل کی سہولتوں کی وجہ سے بہت آسان ہو چکا ہے تو دو ہی چار حقیقی معنوں میں ہمہ جہت دانشور نظر آئیں گے۔ ہمیں ذاتی طور پر اپنی فہرست میں ڈاکٹر گیلبریتھ کا نام سب سے پہلے لینا

پڑے گا۔ ان کے بعد برطانی لیبر پارٹی کے سابق لیڈر مائیکل فوٹ کی سرگرمیاں بیسویں صدی کے زبردست دانشوروں از قسم برٹرنڈرسل کی خدمات کی ہمسر ملیں گی۔ بہر حال بات یہاں زندہ لوگوں کی ہو رہی ہے۔ ان میں اتفاق سے دائیں بازو کے احیاء پسند زیادہ نمایاں ہیں۔ بائیں بازو کے روشن ضمیر اور ترقی پسند لب و لہجے کے حامل اور مسائل حیات کے تقریباً تمام گوشوں پر عمیق نظر رکھنے والے دو ہی چار اصحاب ہیں۔ ان میں گیلبر یتھ اور مائیکل فوٹ کے ساتھ ہی ہمیں آل احمد سرور کا بھی نام لینا پڑے گا۔

سرور صاحب کو عصر حاضر کے تمام مسائل کا محض ادراک ہی نہیں ہے بلکہ وہ علوم انسانی کے تقریباً تمام ہر مسئلے پر ایک سلجھی رائے بھی رکھتے ہیں۔ اقبال کے لفظوں میں ہم انھیں آشنائے راز ہی بلکہ دانائے راز سمجھنے پر مجبور ہیں۔

سرور صاحب کے بارے میں دوسرے اور تیسرے درجے کے ارباب ادب گفتگو کا رخ دوسری پگڈنڈیوں کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ شاہراہ دانش سے ہٹ کر ان امور کے بارے میں ہم نے حسب معمول اپنے ذرائع سے تفتیش کی (ہم اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے وکیلوں اور صحافیوں کی خدمت کرنے والی سراغرساں ایجنسیوں سے رجوع کرتے ہیں۔ اس طرح ذاتی لعائب اور کردار کی بلندی و پستی کے بارے میں بصیرت افروز حقائق معلوم کر لیتے ہیں) ہمیں پتہ چلا کہ سرور صاحب سے خفادہ تمام اصحاب ہیں جنھوں نے کبھی نہ کبھی ان سے کوئی کام نکلوانا چاہا۔ یہ معلوم کر کے واللہ بہت مسرت ہوئی کہ سرور صاحب انتہائی بااصول اور قاعدے قانون کے پابند ہیں۔ محض تعلقات کی بنا پر کسی نااہل کو کوئی عہدہ، ملازمت یا ادبی رتبہ دلانے میں دلچسپی نہیں رکھتے ہیں چنانچہ بقول رشید صدیقی "لڑکا آپ کا ہے، یونی ورسٹی قوم کی ہے اور حکومت ہندوؤں کی ہے" کہہ کر سفارشیں اٹھوانے والے ظاہر ہے سرور صاحب سے خفا رہتے ہیں۔

حصول علم خود ایک مقصد اور انعام ہوتا ہے۔ اہل علم کو غرض اس سے کبھی نہیں ہوتی ہے کہ ان کو کیا ملا یا دنیا نے ان کی کتنی قدر دانی یا ناقدری کی۔ ریگن اور تھیچر کے بازاری نظریات کے تحت یہ سوچنا کہ "فائدہ کیا؟" یا کسی مفقود الاسلاف غزلچی کی طرح یہ رونا کہ "ملا کیا؟" اہل علم کے لیے ابتذال تفکر کے برابر ہوتا ہے۔ ہم ایک جگہ علی سردار جعفری کی (ابتدائی) زندگی کی قربانیوں اور انگریزی ملازمت کی تمام ترغیبات اور پیشکش ٹھکرانے کی تعریف کر رہے تھے تو مرحوم بی سی سی آئی کے ایک مرسڈیز سوار نے ہم کو ہی نہیں بلکہ جعفری صاحب کو بھی اول درجے

کا احمق اور فاتر العقل ثابت کردیا۔اسی طرح سرور صاحب کے بارے میں ایک کتاب میں کچھ محبوں اور مخلصوں نے اپنے جذبات ظاہر کیے ہیں جن میں قابل غور کمال احمد صدیقی کی گہرافشانیاں بھی ہیں۔

سمسون جب قید کرکے لایا گیا۔اس کے سر کے بال منڈا دیے گئے تھے جس سے اس کی طاقت ،سلب ہوچکی تھی تو دربار کے ایک مسخرے خواجہ سرا نے بھی آگے بڑھ کر اس کے گدگدی شروع کردی اور چاروں طرف ہنسی کا طوفان آگیا۔

حال ہی میں ہم ایک دوسرے درجے کے ''غزل باز'' کی خودنوشت پڑھ رہے تھے جس میں تقریباً ہر صفحے پر شکایت تھی کہ اس کے جیسے بقراط اعظم کی زمانے نے کوئی قدر نہ کی اور اسے ''کچھ ملا نہیں۔'' کتاب ختم کرکے ہمیں ذرا غصہ بھی آیا اور اسی عالم میں شاعر اعظم کو ایک خط ٹھونک دیا کہ حضرت واقعی خدمت کرنے والے اپنی خدمات اور'' قربانیوں'' کا رونا نہیں روتے ہیں۔حضرت سید الشہدا کو کیا مل گیا؟۔انھوں نے دربار احدیت میں کوئی شکایت فرمائی شاعر یا تو بہت شریف تھا یا .... ۔کیونکہ ہمارے خط کا جواب اس نے نہیں دیا۔

خیر سرور صاحب کو خراج تحسین ادا کرنے والی اس کتاب میں (جو بڑی ہی تاخیر کے بعد ہماری نظر سے گزری) کمال احمد صدیقی صاحب نے جو مضمون لکھا ہے اس کا مطلب یا تاثر ایسا ہے جو حقائق کی مملکت میں غالبا سیاحتی پروانہ راہداری Transit Visa بھی نہ حاصل کرسکے گا۔ان کا کہنا ہے کہ مدت مدید اور عرصہ بعید کا ذکر ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں سرور صاحب نے ایک مضمون پڑھا۔اہل ادب اور دانشوروں نے کمال صاحب سے درخواست کی کہ وہ بحث کا آغاز کرکے حاضرین کو (جن میں ڈاکٹر علیم، احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی اور شوکت صدیقی وغیرہ شریک تھے) اپنے افکار عالیہ اور استفادی رائے سے بصیرت عطا فرمائیں۔تو ماحصل یہ ہے کہ آل احمد سرور نے ایک رجعت پسند مقالہ پیش کیا اور کمال احمد صدیقی صاحب نے بحیثیت ترقی پسند اور ایک مستند مارکسی دانشور سرور صاحب کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔''

اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ ننگ اسلاف بھی اس جلسے میں موجود تھا (کمال صاحب بہرحال یہ تو پوچھنے کی مقدرت بالکل ہی نہیں رکھتے ہیں کہ ''میاں آپ کی عمر ہی کیا تھی جو آپ ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں موجود تھے۔کمال صاحب اس سے پہلے ہمیں کافی ہاؤس میں دیکھ چکے تھے۔)

ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ سرور صاحب نے ایک پُر مغز مقالہ پیش کیا تھا جس میں خردمندی بھی تھی اور مسائل ادب کی دانائی کا واضح اور بھرپور شعور بھی۔ بحث کی ابتدا ڈاکٹر علیم نے کی تھی پھر احتشام حسین اور ہاشمی صاحب نے بھی تبصرے کیے۔ ان اصحاب نے یقیناً سرور صاحب کی پیش کردہ رائے کو دوسرے نقاط نظر سے بھی دیکھنے کی کوشش کی مگر یہ ایک علمی مسئلہ تھا جس میں ترقی پسندی یا رجعت پسندی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مرحوم ڈاکٹر احسن فاروقی نے بھی اپنے انداز میں کچھ کہا۔ بہت آخر میں منظر سلیم اور مجید پرویز کے بعد کمال صاحب کو لب کشائی کا موقع ملا۔ کمال صاحب ان دنوں بقول عبدالقوی ضیا، سلام مچھلی شہری کے شاگرد تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر سرور صاحب رجعت پسند یا اسلامی ادب وغیرہ کے موئد تھے تو اپنے گھر پر خفیہ پولس کی نگرانی کے باوجود ہر ہفتے ترقی پسندوں کو کیوں جمع کرتے؟ اور اگر کمال احمد صدیقی واقعی ایک باشعور بائیں بازو کے مارکسی ادب دوست تھے تو زندگی بھر سرکاری ملازمت کیوں کرتے رہے؟

پنڈت جواہر لال نہرو کے دور اقتدار میں ہندستان واقعی جمہوریت کے اعلا معیاروں کا نمونہ تھا۔ وہاں وہ آزادیاں حاصل تھیں جو تیسری دنیا کو چھوڑیئے خود امریکہ، روس اور برطانیہ میں بھی نہیں نصیب تھیں۔ ان کے باوجود ترقی پسندوں، مارکسی دانشوروں اور کمیونسٹوں پر ہمہ وقت پولس کی نظر رہتی تھی۔ مرحوم سلام مچھلی شہری ریڈیو میں ملازم تھے، اسی لیے ڈر کے مارے ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں نہیں شریک ہوتے تھے۔ کمال کیسے ترقی پسند اور مارکسی تھے کہ انھیں کشمیر کے حساس علاقے ریڈیو میں نہ صرف ملازمت حاصل تھی بلکہ ترقیاں بھی ملیں؟ (ویسے ایک سخن گسترانہ بات یہ بھی عرض کردیں کہ ہمیں بھی زندگی میں ایک بار سرکاری ملازمت سے پالا پڑا تھا۔ بہت آزاد اور روشن خیال ادارہ تھا لیکن وہاں کے رنگ ڈھنگ کو اپنی ''انانیت'' سے دور دیکھ کر چپکے سے بھاگ نکلے)۔

لکھنؤ میں سرور صاحب کا مکان بیرو روڈ پر تھا۔ مگر ترقی پسند مصنفین کی آمد و رفت سے انھیں بھی کوئی خطرناک ہستی سمجھا جاتا تھا اور جس دن وہاں جلسہ ہوتا تو مکان کے آس پاس پولس والے منڈلاتے رہے۔ ایک بار مرحوم خلیل الرحمان اعظمی ایک جلسے میں شریک تھے پولس ان کے پیچھے تھی۔ اعظمی صاحب کے جلسے کے دوران ہی بنگلے کی دیوار پھاند کر ایک پڑوسی کے گھر سے ہوتے ہوئے غائب ہوگئے۔

مجھے واشگاف انداز میں کہنے دیجیے کہ بہت سے ایسے اصحاب جو آج کل اپنی ترقی پسندی

کی نوبت بجا رہے ہیں، ایک فیشن کے طور پر ترقی پسند بنے ہوئے تھے۔ جب بھی ان حضرات کو ذاتی منفعت، مناصب یا عہدے نصیب ہوئے انھوں نے ادبدا کر ترقی پسندی کی راہ کھوٹی کی۔ اس جعلی ترقی پسندی سے ظاہر ہے مجھے کوئی مطلب نہیں لیکن جب "جہ ولا ورست دزدے۔ الخ کی صورت ہو تو چپ رہنا بھی کم از کم گناہ صغیرہ تو ٹھہرایا ہی جائے گا۔

آل احمد سرور صاحب! ہمارے زمانے میں علی گڑھ جا چکے تھے اس لیے ظاہر ہے ہمیں ان سے نیاز مندی کا وہ شرف نہیں نصیب ہوا جو لکھنؤ یونیورسٹی کے بعض دیگر اہل ادب کو ملا۔ پھر بھی ادب کے ایک ادنا طالب علم کی حیثیت سے ہم ان کے رشحات قلم سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہے۔ آج ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ عصری ادب میں سرور صاحب اردو کی آبرو ہیں۔ کاش کمال صاحب یا دوسرے عہدہ پرست، مصلحت پسند اور مصنوعی ترقی پسند قدرے احتیاط سے بھی کام لیں۔ ادب میں بہت زیادہ دھوم مچانے، نوبت نگاڑے بجانے اور میں اور میرا عہد" کرنے والے عام طور پر "میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا" والی صورت سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔

آخری بہت ہی تلخ بات: سماج میں "کرپشن کا رونا رونے والے اگر سیاسی جوڑ توڑ کرنے اور فرقہ پرستی وعلاقائی عصبیتوں کو ہوا دینے والے نیتاؤں کی تنقیص کرتے وقت کبھی کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال لیا کریں تو کیا برائی ہے۔ سیاسی لیڈر تو ہوتا ہی میکیاولی کا شاگرد ہے لیکن آپ تو ادب میں انسانیت اور آفاقی قدروں وغیرہ کی دہائی دیتے ہیں۔ کیا آپ نے اپنے "دور جلال" میں مجبور ونادار اہل قلم کا استحصال نہیں کیا؟ کیا آپ نے ریوڑیاں بانٹنے کے سلسلے میں نابینا حضرات کی پیروی نہیں کی؟ کیا ایک ہی چمچے کو مختلف ناموں سے چھاپ کر آپ نے معاوضوں کی بارش نہیں کی؟ کیا سچ بولنے والے یا اپنی رائے سے اختلاف کرنے والے ادیبوں کا آپ نے مقاطعہ نہیں کیا؟۔

جو لوگ مر چکے ہیں ان کو تو اللہ بخشے لیکن آج بھی واقعی ہماری صفوں میں کتنے "دیانت دار ترقی پسند ہیں؟

"کتاب نما" تمام خریداروں کو پابندی سے ہر ماہ کے آخری دن میں پوسٹ کیا جاتا ہے۔ محکمہ ڈاک کی نااہلی سے اگر کسی خریدار کو پرچہ آئندہ ماہ کی 15 تاریخ تک نہ ملے تو براہ کرم اپنے خریداری نمبر کا حوالہ دیتے ہوئے دوبارہ طلب فرمائیں۔ (ادارہ)

یوسف ناظم

کچھ خبریں اور کچھ خبریاں

خبریں اور خبریاں پیش کرنے سے پہلے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے اس موضوع پر تھوڑی بہت گفتگو ہو جائے۔ (گفتگو کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ بڑے کام کی چیز ہے اور اگر تہذیب وشائستگی کی حدود میں رہے تو اس سے ذہنوں میں تازگی اور دلوں میں قربت کا احساس پیدا ہوتا ہے) جس موضوع پر ہم آپ سے مخاطب ہونا چاہتے ہیں اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک خبر، خبری کیسے بنتی ہے۔ اس ضمن میں ہمیں علامہ اقبال بھی یاد آجاتے ہیں جنھوں نے شاعروں، افسانہ نویسوں اور صورت گروں کے اعصاب کے بارے میں تو فیصلہ سنا دیا کہ ان لوگوں کے اعصاب پر طبقہ اناث کا قبضہ ہے (یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ خود خواتین کے لیے یہ اطلاع حیرت ناک تھی کیونکہ اقبال سے پہلے کی شاعری میں خاص طور پر غزلیہ شاعری میں خواتین کا ذکر تو آیا ہی نہیں (علامہ اقبال نے بہر حال اپنے فیصلے میں اہل زبان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یا تو اس میں ان کی کوئی مصلحت ہوگی یا وہ سہواً انھیں بھول گئے ہوں گے حالانکہ زبان کی تشکیل وتعمیر اور اس کی قطع وبرید کے اصل ذمے دار تو اہل زبان ہی ہیں اور ان میں بکثرت لسانی، علاقائی اور طبقاتی جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ خاص طور پر تذکیر وتانیث کے نازک مسئلے پر دو مخالف گروہوں میں اچھے خاصے تحریری ذرمیے برپا ہوئے ہیں اور محاوروں، روزمروں اور شعری تراکیب کی صحت وسلاست کے عنوان پر بھی مناسب تعداد میں معرکوں کا انعقاد عمل میں آیا ہے۔ یہ اہل زبان، جو ہماری رائے میں اپنے علم وفضل کی بہتات اور افراط کی بنا پر کوئی مفید کام انجام دے سکتے تھے، زبان کی چند ناشگفتہ کلیوں اور بن کھلے مرجھائے جانے والے غنچوں پر قناعت کر کے رہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل قلم اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آج تک یہ طے نہیں کر سکے کہ جس قلم سے وہ لکھتے ہیں وہ مذکر ہے یا مونث اور حد یہ ہوگئی کہ الفاظ کی تذکیر وتانیث کا مسئلہ، ادب وزبان کے دائرے سے نکل کر شریعت کی حدود میں داخل ہو گیا اور لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ لفظ طلاق کو کس صیغے میں ڈالیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر لوگ پریشان رہتے ہیں کہ کسی طلاق کی واردات کا ذکر کرتے وقت یہ کہیں کہ میاں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دیا یا یہ کہیں کہ طلاق دے دی۔ نتیجہ گو ایک ہی ہوتا ہے لیکن انداز بیان کیا ہونا چاہیے،

یہ مسئلہ ہمیشہ زیر بحث رہے گا۔ ایک صاحب نے جنھیں زبان اور شرح دونوں کا تھوڑا تھوڑا درک ہے یہ مشورہ دیا تھا کہ تین طلاقوں میں سے دو صیغہ تذکیر میں ہوں اور ایک صیغہ تانیث میں تو پھر کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہے گی (اس تقسیم کی انھوں نے شرعی توجیہہ بھی کردی تھی۔) اس قسم کی مثالوں سے بات خواہ مخواہ الجھ جائے گی اس لیے ہم صرف خبر اور خبری کے تعلق سے پوچھنا چاہیں گے کہ خبر میں تو اچھی بری دونوں قسم کی خبریں شامل ہیں۔ قیدی کا آپہنچنا بھی خبر ہے اور قیدی کا چھوٹ جانا بھی خبر ہے۔ اسی لیے فانی نے ان دونوں خبروں کو ایک ہی مصرع میں باندھ کر بات ختم کردی تھی۔ (شاعری میں یہی تو خوبی ہوتی ہے۔ خبر اور خبری کے لیے دو مصرعوں کی ضرورت نہیں پڑتی خبر خود مونث ہے اسے مزید مونث بنانا کیا ضروری ہے۔ صنف کی تبدیلی کی بات تو خیر سننے میں آتی ہے لیکن صنف میں مزید شدت پیدا کرنے کی کوئی خبر دینائے طب سے بھی دنیائے ادب میں نہیں آئی تھی ہم تو لفظ زنانہ سے بھی ایک نیا لفظ، زنانی، پیدا کرنے میں تکلف نہیں کرتے۔ کیا زنانی چپل پہننے سے پاؤں چینی لڑکیوں کے پاؤں کی طرح نازک اور مختصر ہوجاتے ہیں۔ زنانہ لباس تو سمجھ میں آیا لیکن یہ زنانی لباس کس کے استعمال میں آتا ہے۔ طب کی کتابوں میں ہم نے ایک لفظ دیکھا تھا عرق النسا، تو ہم سمجھے تھے یہ کسی نیک دل خاتون کا نام ہے جو ملکہ نور جہاں کے عہد میں ہوں گی اور ملکہ موصوف ہی نے انھیں یہ نام عطا کیا ہوگا۔ کئی دن بعد ہماری یہ خوش فہمی دور ہوتی۔ ویسے طب کی کتابوں میں اور بھی خوبصورت الفاظ پائے جاتے ہیں جیسے لعوق، لبوب، لیکن اہل طب نے ان الفاظ کو ان کی اصلی حالت میں برقرار رکھا، ان کا مونث نہیں بنایا لیکن ادب میں خبر سے خبری؟ یہ لفظ بعض علاقوں میں ایک ایسے شخص کا بھی عرف ہے جو خفیہ طور پر مطلوبہ خبریں پہنچانے کی خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ خبری اصل میں مخبر کا حقاقی ترجمہ ہوتا ہے، خبری کے تعلق سے ایک عام خیال یہ ہے کہ محلے کا مشکوک ترین شخص مشتبہ لوگوں کے کوائف معلوم کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور اس خبری کے پاس کوئی خوش خبری نہیں رہتی۔ (وہ غریب خود بھی کب خوش رہتا ہے)۔

اتمام حجت کی خاطر ہم یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ خوش خبری کے لفظ پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ایک نکتہ ذہن میں آیا تھا وہ ہم نے پیش کردیا ورنہ ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جو کسی اچھی خبر کے لیے صبح سے شام تک، اس دروازے سے اس دروازے اور اس دروازے سے اس دروازے پر گن گن کر دستک دیتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض سادہ خبریں ایسی ہوتی ہیں جن میں خوش خبری کا پہلو بھی شامل رہتا ہے اور بعض خوش خبریوں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے لیے تھوڑی سی زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ اب کچھ خبریں اور کچھ خبریاں:

خبریں: خبروں کے ساتھ مصیبت یہ ہوتی ہے کہ بڑی سے بڑی خبر چند دنوں بعد اپنی اہمیت کھودیتی ہے۔ بس اس کی مدھم سی یاد باقی رہ جاتی ہے اور چونکہ عوام کا حافظہ غیر معمولی طور پر کمزور ہوتا ہے اس لیے اس گزشتہ حادثے واقعے یا سانحے کی یاد تازہ کرنے کی خاطر اس بھولے بسرے واقعے کی سالگرہ منائی جاتی ہے اور اگر اس دن اتفاق سے سرکاری چھٹی ہوئی جس میں بینکوں کا بند ہونا شامل ہوتا ہے تو عوام جو اپنے حافظے پر زیادہ بارڈ النا پسند نہیں کرتے، یا تو گھروں میں بند ہو جاتے ہیں یا گھر بند کر کے کہیں دور چلے جاتے ہیں اتنی دور کہ جہاں وہ جائیں وہاں اس سالگرہ یا برسی کی چھاؤں نہ پڑنی پائے۔ اس طرح یاد منانے میں مرحومین اور مقتولین کی سالگرہ بھی منائی جاتی ہے اور لاؤڈ اسپیکر پر یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر ہمارے فلاں رہنما آج زندہ ہوتے تو وہ ۱۲۱ سال کے ہوتے۔ (آنجہانی رہنما کو ہمارے ہی بزرگوں میں سے کسی نے جلسہ عام میں گولی کا نشانہ بنایا تھا)۔ نہ تو وہ پستول برآمد کیا جاسکا اور نہ اس ماہر نشانہ باز کو جس نے ٹھیک نشانے پر گولی چلائی تھی، (یہ کوئی نہیں سوچتا کہ مقتول رہنما زندہ رہ کر ۱۲۱ سال کی عمر میں کرتے کیا)۔ لیکن یہ ایک مہذب طریقہ ہے مرحومین کو امر بنانے کا۔ خود ہی قاتل اور خود ہی مسیحا بننا ہمارے یہاں ایک طرز عمل ہے۔ اب یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے کہ اس طرز عمل سے زندگی، جنت بھی بنتی ہے یا نہیں۔

ایک تازہ خبر تو یہ ہے کہ چین میں جہاں آبادی ہی آبادی ہے، فوج کے ایک جرنل اور ایک کرنل کو کورٹ مارشل کی تادیبی تقاریب کے اختتام پر پہنچنے کے بعد دونوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے پچھلے دس سالوں میں ملک کے فوجی راز، تائیوان کو مناسب داموں پر فروخت کیے تھے۔ دونوں غیر معمولی حیثیت کے امیر لوگ نکلے لیکن کیا فائدہ۔ چین میں سزائے موت پر کوئی تحدید نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے بعض صورتوں میں یہ سزا یونہی تحفتاً بھی دے دی جاتی ہے۔

ایک اور تازہ ترین خبر جو میڈیکل سائنس (علم طب) کی دنیا سے آئی ہے کافی دردناک ہے۔ خبر میں کہا گیا ہے کہ آیندہ یعنی چند دنوں میں مرد بھی بچے پیدا کرسکیں گے۔ (یہ مرد بچے ہوں گے)۔ آپ نہیں سمجھے ہم بھی یکلخت تھوڑے ہی سمجھ گئے تھے۔ مرد تو آج بھی بچے پیدا کرتے ہیں لیکن بالواسطہ۔ تازہ ترین خبر کے مطابق آیندہ اس عمل میں صرف خدا کا واسطہ ہوگا۔ اب اس سے زیادہ وضاحت ہم کر نہیں سکتے۔ مطلب یہ کہ کر تو سکتے ہیں لیکن کرنا نہیں چاہتے۔ میڈیکل سائنس میں تو حجاب یا تکلف نام کی کوئی چیز ہے نہیں۔ اس علم سے تعلق رکھنے والے لوگ خواہ وہ مرد ہوں یا خاتون، ٹھوس، جامد اور بے لچک قسم کی باتیں کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے لیکن ہم لوگ جن کا تعلق ادب اور ثقافت سے ہے، زیادہ کھل کر بات نہیں کر سکتے۔ یوں بھی

ادب میں ابہام ایہام، اور رمز سے کام لیا جاتا ہے اس لیے اس خبر کو ہم صرف خام خبری کی حد تک رہنے دیں گے۔ لیکن آپ کو اجازت ہے کہ اپنی طرف سے اس میں ضروری نکات اور تفصیلات کا اضافہ کرلیں۔ اتنا ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ آنے والے دن، خاص طور پر مردوں کے لیے بڑے صبر آزما ہوں گے اور انھیں اب معلوم ہوگا کہ کارِ جہاں کتنا دراز ہے۔ اس خبر سے طبقۂ اناث میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اتنی معرکتہ الآرا خبر سنانے کے بعد جی نہیں چاہتا کہ کوئی دوسری خبر آپ کی خدمت میں پیش کی جائے۔ شعر کے دو مصرے تو برابر برابر کے ہو سکتے ہیں لیکن دو مختلف خبریں ہم وزن نہیں ہو سکتیں (یہ ہوتی بھی تو نثر میں ہیں) اس لیے اب ایک خوش خبری۔

خوش خبری: جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا لفظ خبر خود مونث ہے لیکن جب اسے مزید مونث بنایا جاتا ہے تو یہ خبری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

خوشخبری یہ ہے کہ ہمارے ملک کی راجدھانی میں جہاں اسداللہ خاں غالب کے مکان اور شیخ ابراہیم ذوق کے مزار کی دیکھ بھال اور ترمیم کے لیے ہماری سپریم کورٹ کو احکامات جاری کرنے پڑے، اسی دلی میں اردو زبان کو صوبے کی دوسری سرکاری زبان قرار دیے جانے کی بھی تجویز صادر ہو چکی ہے اور عنقریب اس سلسلے میں ایک مسودہ قانون مرتب اور نافذ کیا جانے والا ہے۔ اس زبان کے تعلق سے پچھلے کئی برسوں سے یہ افواہ گشت کر رہی تھی یہ صرف دوسرے درجے کے شہریوں کے استعمال کی زبان ہے لیکن حال میں یہ انکشاف ہوا کہ یہ زبان تو ملک کے بھی باشندے اپنے ذوق کی بنا پر کچھ شوق کی وجہ سے اور کچھ باشندے کسی مجبوری کے تحت الیکشن کے موسم میں) اپنے استعمال میں بھی لا رہے ہیں اس لیے یہ طے کیا گیا کہ اگر اسے دوسری سرکاری زبان کے مرتبے پر ترقی دے دی جائے تو ایک عام تاثر یہ ہوگا کہ اس کے ساتھ انصاف کیا گیا۔ فی الحال ہمارا بھی یہی تاثر ہے۔ اسی لیے ہم نے اس خبر کو خوش خبری کا عنوان دیا ہے۔ بس سوال یہ ہے کہ اس تجویز کا نتیجہ یہ تو نہیں ہوگا کہ سرکاری دفتروں میں اردو داں اشخاص کا جو دیرینہ قحط ہے وہ دور ہو جائے۔ یہ خدشہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ اگر اس زبان میں کسی دفتر میں دادرسی کے لیے کوئی درخواست پیش کی گئی تو کہیں اس کے ساتھ بھی انصاف نہ ہو جائے۔ ہمارے اس طرز بیان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں اس خوش خبری سے خوشی نہیں ہوئی ہے۔ ہوئی ہے اور ضرور ہوئی ہے اور ہم اربابِ اقتدار کی خوشی میں بہر حال شریک، شامل اور نتیجتاً شاداں ہیں۔

اس قسم کی اور بھی خوش خبریاں ہم نے سنبھال کر رکھی ہیں جو رفتہ رفتہ پیش کی جائیں گی۔ احتیاط کا یہی تقاضا ہے۔

مجتبیٰ حسین
۲۰۰، انکورا اپارٹمنٹس، پڑپڑ گنج
دہلی ۱۱۰۰۹۲

جذبی کے لیے ہمارا جذبہ

پچھلے ہفتہ حیدر آباد کے بعض اخبارات میں ایک ادبی تنظیم کی جانب سے ایک تعزیتی قرارداد شائع ہوئی تھی جس میں اردو کے پانچ چھ ادیبوں کے باجماعت گزر جانے پر باجماعت دلی صدمہ کا اظہار کرتے ہوئے اردو والوں کو حسب معمول یہ کہہ کر ڈرایا گیا تھا کہ ان ادیبوں کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہ ہوگا۔ خیر ہم خلا وغیرہ کے پیدا ہونے سے بالکل نہیں ڈرتے کیونکہ ہم خود زندہ رہ کر ادب میں اتنا خلا پیدا کر رہے ہیں کہ کوئی مر کر بھی کیا پیدا کرے گا۔ ہماری عادت ہے کہ جہاں کہیں بھی کسی خبر میں ادیبوں وغیرہ کے نام ایک ساتھ چھپے ہوئے دیکھ لیتے ہیں تو وہاں ہم اپنا نام بھی ضرور تلاش کرتے ہیں۔ تعزیتی قرارداد پڑھ لی تو ہم نے ایک آہ سرد بھر کر اپنے ایک دوست سے شکایت کی اردو والوں کی گروہ بندیوں سے ہم عاجز آچکے ہیں۔ اب اسی تعزیتی قرارداد کو دیکھ لو کہ اس میں پانچ چھ ادیبوں کے ایک ساتھ گزر جانے پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔ اب اگر اس فہرست میں ہمارا نام بھی شامل کر لیا جاتا تو بتائیے اس تنظیم کے منتظمین کا کیا بگڑتا بلکہ ہم تو اُلٹا ان کے حق میں دعائیں دیتے۔" ہمارے دوست نے کہا "تم بھی عجیب آدمی ہو۔ تم تو ابھی زندہ ہو۔ تمہارا ذکر تعزیتی قرارداد میں کیسے آسکتا ہے؟" ہم نے کہا "بھیا! ہماری ساری دلچسپی اس بات میں رہتی ہے کہ ہمارا ذکر کسی نہ کسی عنوان سے ہوتا رہے۔ چاہے یہ ذکر تعزیتی قرارداد میں ہو یا تہنیتی قرارداد میں۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا ہے کہ ہم زندہ ہیں یا مر گئے ہیں"۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

پھر تمہارا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ہم چونکہ زندہ ہیں اس لیے اس تعزیتی قرارداد میں

ہمارا نام شامل نہیں ہے۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ اس تعزیتی قرارداد میں جتنی بھی شخصیتیں شامل ہیں وہ سب کی سب زندہ ہیں۔ مطلب یہ کہ بعض ہستیاں تو ادب میں اپنی تحریروں کے ذریعہ ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں تو دو ایک نام اس فہرست میں ایسے بھی نظر آرہے ہیں جن کی طبعی موت ابھی واقع نہیں ہوئی ہے۔ جب ان کا نام اس فہرست میں موجود ہے تو اس میں بہ آسانی ہمارا نام بھی شامل کیا جاسکتا تھا۔ یہ گروہ بندیوں کا معاملہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے گروہ کے لوگوں کو اچھالتے رہتے ہیں ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ہمیں تو اس تعزیتی قرارداد میں ممتاز ترقی پسند بزرگ شاعر معین احسن جذبی کا نام بھی نظر آرہا ہے جو ان دنوں علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ جذبی صاحب دو سال بعد نوے برس کے ہونے والے ہیں۔ پہلے کم شعر کہتے تھے اب بالکل نہیں کہتے۔ لیکن اس کے باوجود ادب میں ان کا ایک اہم رتبہ ہے۔ علی گڑھ سے ہمارا روزانہ کا ربط رہتا ہے۔ ہمارے بعض احباب رہتے تو علی گڑھ میں ہیں لیکن نوکری کے لیے ہر روز دہلی آجاتے ہیں۔ ہمارے پاس علی گڑھ سے فون بھی اکثر آتے رہتے ہیں۔ ہمارا سب سے پیارا دوست شہریار تو علی گڑھ میں ہی رہتا ہے۔ اگر خدانخواستہ جذبی صاحب سچ مچ اس دنیا سے گزر جاتے تو کوئی نہ کوئی دوست ہمیں اس کی اطلاع ضرور دیتا یا اس کی خبر اخباروں میں ضرور چھپتی۔ تاہم دہلی میں قیام کے دوران ہم نے ایسی کوئی خبر نہیں سنی۔ ہم پرسوں ہی تو دہلی سے حیدرآباد کے لیے چلے ہیں۔ اب ہمارے چوبیس گھنٹوں کے سفر کے دوران میں اگر جذبی صاحب گزر گئے ہوں تو یہ الگ بات ہے۔ لیکن جذبی صاحب کے انتقال سے متعلق تعزیتی قرارداد جن حیدرآبادی اخبارات میں شائع ہوئی ہے وہ خود دو دن پہلے کے ہیں۔ ہم لاکھ بے خبر سہی لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جذبی صاحب اس دنیا سے گزر جائیں اور ہمیں اس کی خبر نہ ہو۔ مانا کہ اردو معاشرہ بے حس ہو چکا ہے لیکن اتنا بے حس بھی نہیں ہو سکتا کہ جذبی جیسے شاعر کے گزر جانے کی تعزیتی قرارداد تو خوشی خوشی اخباروں میں چھپوا دے لیکن ان کے انتقال کی خبر کی اشاعت پر پابندی لگا دے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی شخص کا انتقال بعد میں ہو اور اس سے پہلے اس کی تعزیتی قرارداد منظور ہو جائے۔ کسی تعزیتی قرارداد کو اس وقت تک معتبر نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ اس قرارداد سے متعلق شخصیت کا واقعی انتقال نہ ہو جائے۔ ابھی ہم جذبی کی بے وقت 'تعزیتی قرارداد' کے بارے میں غور کر ہی رہے تھے کہ ہماری نظر دفتر ''سیاست'' میں اپنے رفیق دیرینہ منور علی کی میز پر رکھے ہوئے اور مصطفےٰ شیروانی کے لکھے ہوئے ایک مضمون کے مسودے پر پڑی جس میں اردو والوں کو ''جذبی مرحوم'' کی خدمات سے واقف

کرایا گیا تھا۔ یوں بھی ہمارے ہاں جب تک کہ کوئی ادیب واقعی نہ گزر جائے تب تک اُس کی خدمات کو تسلیم نہ کرنے کی ایک زندہ روایت موجود ہے۔ مصطفےٰ شیروانی کو ہم انسائیکلو پیڈیا" مانتے ہیں۔ وہ معلومات کا ایک ایسا خزانہ ہیں کہ بھلے ہی موضوع ختم ہو جائے لیکن ان کی معلومات ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ ہم نے سوچا کہ جب جذبی کے سلسلہ میں تعزیتی مضامین تک لکھے جانے لگے ہیں تو کیوں نہ علی گڑھ فون کر کے معلوم کرلیا جائے کہ یہ سانحہ آخر ہماری اجازت کے بغیر کب اور کیسے پیش آیا۔ ہم نے اپنے دوست شہر یار کو علی گڑھ فون ملایا اور جذبی صاحب کی خیریت پوچھی تو بولے "وہ تو اچھے ہیں البتہ میں اس وقت پروفیسر مشیر الحسن کے والد کے چہلم کی مجلس سے آرہا ہوں" اس پر ہم نے کہا "بھیا! تم تو مشیر الحسن کے والد کے چہلم سے آرہے ہو لیکن میں جذبی صاحب کے فاتحہ سیوم سے واپس آرہا ہوں"۔ ہنس کر بولے "میں تو ادب کے معاملے میں حیدرآباد اور دکن کی اولیت اور سبقت کو دل و جان سے تسلیم کرتا ہوں۔ آپ لوگ ہر میدان میں ہم سے آگے ہیں۔ اردو کا پہلا نثر نگار تمہارے دکن میں ہوا، پہلا صاحب دیوان شاعر بھی تمہارے شہر کا تھا۔ اگرچہ جذبی صاحب بخیر و عافیت ہیں لیکن انھیں اس دنیا سے رخصت کرنے کے معاملے میں بھی حیدرآبادیوں نے ہم سے بازی مارلی"۔ شہر یار جب کھلے دل کے ساتھ ادب کے حوالہ سے حیدرآباد کی سبقت، اولیت اور عظمت کو ماننا شروع کرتے ہیں تو ہم اپنی روایتی کسر نفسی کی وجہ سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ ہم نے کہا "شہر یار! تم جیسا سخن شناس، مردم شناس، اور عالم آدمی شمال میں کہاں ملے گا۔ یہ تمہاری بڑائی ہے ورنہ شمال میں کون حیدرآبادیوں کی ادبی خدمات کو مانتا ہے"۔ اس پر شہر یار نے کہا "بھیا! میری سخن فہمی اور مردم شناسی کا تقاضہ تو یہ کہ میں تمھیں بھی اردو کا پہلا مزاح نگار مان لوں لیکن کیا کروں دوسرے لوگ نہیں مانتے"۔ ہم نے شہر یار کی ذرہ نوازی بندہ نوازی اور سخن فہمی کا شکریہ ادا کیا اور فون رکھ دیا۔ دوسرے دن ایک تقریب میں ہماری ملاقات اپنے کرم فرما ڈاکٹر سید عبدالمنان سے ہوئی تو انھوں نے اس پس منظر میں ایک پرانا واقعہ سنایا۔ ایک بار کسی نے نظام کالج میں پروفیسر ہارون خان شیروانی کے گزر جانے کی افواہ اڑادی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں پروفیسر ہارون خان شیروانی کے گزر جانے کی اطلاع کوئی معمولی سانحہ نہ تھی۔ وہ ان دنوں نظام کالج میں پڑھاتے تھے۔ چنانچہ کالج کے انتظامیہ نے تعزیتی جلسہ منعقد کیا اور ایک تعزیتی قرارداد بھی منظور کی۔ بعد میں ایک چپراسی کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ اس تعزیتی قرارداد کی نقل پروفیسر ہارون خان شیروانی کے ارکان خاندان کے حوالہ کر آئے۔

چپراسی نے گھر جا کر دستک دی تو اتفاق سے خود پروفیسر ہارون خان شیروانی مرحوم نے دروازہ کھولا۔ مگر جیسے ہی چپراسی نے شیروانی صاحب کو دیکھا چیخ مار کر قرارداد سمیت بھاگ گیا۔ بعد میں واپس آکر اس چپراسی نے کالج کے ارباب مجاز کو بتایا ''پروفیسر صاحب تو جن بن چکے ہیں اور اپنے بارے میں تعزیتی قرارداد کو خود وصول کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا''۔

بہرحال تعزیتی قراردادوں کے سلسلہ میں ہماری عرض یہ ہے کہ تعزیتی قراردادیں ضرور منظور کی جائیں لیکن اسی وقت منظور کی جائیں جب کوئی سچ مچ اس دنیا سے اٹھ جائے۔ اردو والوں کو شاید اس کا علم نہ ہو کہ اب ان کے پاس جو چند بزرگ ہستیاں رہ گئی ہیں وہ ایسی ہیں جن کے اٹھ جانے کے بعد ایسی ہستیاں پھر کبھی پیدا نہ ہوں گی کیونکہ وہ سماجی اور تہذیبی سانچے کب کے ٹوٹ چکے جن سے ایسی ہستیاں بن کر نکلا کرتی تھیں لہٰذا تعزیتی قرارداد دیکھ سمجھ کر منظور کریں۔

چھپتے چھپتے

ادبی جریدے ''افکار'' کی اشاعت معطل ہوگئی

صہبا لکھنوی کی علالت کے بعد رسالے کا دفتر مقفل کر دیا گیا

کراچی ادبی جریدے ''افکار'' کی اشاعت معطل ہوگئی ہے۔ یہ پرچہ صہبا لکھنوی کی ادارت میں گزشتہ ۶۰ برس سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ مالی مشکلات کے باعث پرچے کے دفتر کو مقفل کر دیا گیا ہے۔ صہبا لکھنوی خود شدید علیل ہیں۔ پرچہ ان کی ذاتی دلچسپی کے باعث شائع ہوتا تھا۔ سردست اس کی اشاعت بحال ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔

(بحوالہ ماہنامہ انشعاب ملتان جلد ۱۱/ اکتوبر ۹۹ء شمارہ ۱۰)

نصرت ظہیر
۱۵/۴ کھچڑی پور، دہلی ۹۱

لندن کی بڑی بی!

" ۔ شارٹ ویو میں اکیس پچیس اکتیس اور اکتالیس میٹر بینڈ پر اور میڈیم ویو میں دو سو بارہ میٹر یعنی چودہ سو تیرہ کلو ہرٹز پر یہ بی بی سی لندن ہے۔ اب ہماری اردو نشریات کی تیسری مجلس کا آغاز ہوتا ہے۔"

اترتی چڑھتی ریڈیائی لہروں پر یہ صدا آج بھی جب کانوں میں پڑتی ہے تو وقت جیسے ٹھہر جاتا ہے۔ میں سن رہا ہوں۔

" اس وقت پاکستان میں شام کے آٹھ، ہندستان میں ساڑھے آٹھ، بنگلہ دیش میں رات کے نو اور یہاں لندن کی گھڑیوں میں دن کے چار بجا چاہتے ہیں "

کب سُنی تھی سب سے پہلے یہ آواز؟ بیس، پچیس، تیس نہیں شاید پینتیس برس پہلے بلکہ اس سے بھی تین چار سال پہلے غالباً انسٹھ ساٹھ میں ۔ جب میں مشکل سے پانچ چھے سال کا رہا ہوں گا۔

شام کا کھانا کھا کر سب لوگ ریڈیو کے پاس بیٹھ جاتے۔ بابو جی (والد محترم عبدالعزیز قادری صاحب) جیسے ہی بیٹری سے چلنے والے، مرفی کے اس خوبصورت ریڈیو کا لٹو گھماتے، کمرے میں بیچوں بیچ لٹکتی لالٹین کی روشنی آہستہ آہستہ ڈِم ہو کر غائب ہو جاتی اور ایک پُراسرار اور رنگین دنیا کے دریچے ہم بچوں کے سامنے کھل جاتے۔

بابو جی حسبِ عادت کوئی اچھا سا اسٹیشن ڈھونڈ رہے ہیں۔ ریڈیو کی سوئی دائیں بائیں سرک رہی ہے۔

میرے شانوں میں جیسے پَر نکل آئے ہیں۔ میں اس رنگین دنیا کے سیر کے لیے انجان فضاؤں میں اڑا جا رہا ہوں۔ عجیب دنیا ہے یہ۔ ہر طرف پھول ہی پھول، پھولوں پر منڈلاتی ہوئی رنگ برنگی تتلیاں، تتلیوں کے پَروں کی سرسراہٹ کالے بھونروں کی گھوں

گھوں۔ آسمانی اونچائیوں سے گرتے ہوئے آبشاروں کا شور۔ نیلے پیلے ہرے درختوں پر سنہرے پَروں والی چڑیوں کی چہچہاہٹ۔ سب کچھ مجھے صاف سنائی دے رہا ہے۔ سوئی سرک رہی ہے۔

زرق برق پوشاکوں میں ملبوس لوگ میرے آس پاس سے گزر رہے ہیں۔ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی عجیب عجیب بولیاں، میری سمجھ سے باہر ہیں۔

سوئی سرکتی جارہی ہے۔

''یہ بی بی سی لندن ہے۔''

سوئی رک جاتی ہے۔

''اچھا بھئی خاموش ہوجاؤ!'' بابو جی ایک دم سنجیدہ ہوجاتے ہیں۔

''... اب آپ وقار احمد سے عالمی خبریں سنیے......''

اس کے بعد وہ خوبصورت پراسرار دنیا سمٹنے لگتی ہے۔ پھول، درخت، تتلیاں، آبشار، زرق برق لوگ، دھیرے دھیرے غائب ہوجاتے ہیں۔ ریڈیو ہمیں کیا سنا رہا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بس بیچ بیچ میں بابو جی کا ردِ عمل ضرور سنائی دے رہا ہے۔

''اوہو! بھئی خرشچوف نے یو این او میں امریکہ کو جوتا دکھادیا۔ خدا خیر کرے!''

''یہ خرشچوف کون ہے''؟

''یہ روس ہے۔ بہت بڑا ملک۔''

''وہی جس نے راکٹ اُڑایا تھا؟''

''ہاں وہی۔ اچھا اب چُپ ہوجاؤ۔ کیوبا میں ایٹم بم پہنچ گئے ہیں۔ امریکہ نے ناکہ بندی شروع کردی ہے۔ صدر کینیڈی نے پھر دھمکی دی ہے۔ تیسری عالمی جنگ کبھی بھی چھڑ سکتی ہے۔ خاموش رہو۔''

ہم سہم جاتے ہیں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پھر بھی ڈرے رہتے ہیں۔ جیسے ذرا بھی بولے تو ایٹم بم چل جائے گا۔

یہ بی بی سی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ تب سے اب تک بندۂ ناچیز کو دنیا کی جو معلومات اور نا معلومات حاصل ہوئی ہے، اس میں معلومات والے خانہ میں بڑا حصہ بی بی سی کا ہے اور نا معلومات میں خادم کا اپنا ہاتھ ہے۔ بی بی سی کا نام آتے ہی پتہ نہیں کیوں، مرے ذہن میں کسی پارک کی بینچ پر بیٹھی سوئیٹر بنتی ہوئی ایک بڑی بی کی تصویر ابھر آتی ہے۔

دراصل اپنے ساتھ شروع سے یہ عجیب معاملہ رہا ہے۔ لوگوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے جس چیز کو نہ دیکھا ہو ان کا ذہن خود اس کی ایک تصویر بنا لیتا ہے مگر میرے ذہن میں تو لفظوں کی بھی ایک شکل بن جاتی ہے مثلاً، جھوٹ کو لیجیے۔ یہ لفظ مجھے ایک کالی ہنڈیا کی طرح نظر آتا ہے۔ "سچ" سنتے ہی ذہن کے پردے پر کورے لٹھے کا تھان کھل جاتا ہے۔ لفظ "شعر" کسی سرخ حلقہ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ غزل کسی زعفرانی مشروب سے بھرا گلاس بن جاتی ہے۔

اور لفظ ہی کیوں، حرف بھی رنگ بن جاتے ہیں۔ الف سفید ہے۔ ب کا رنگ بھورا ہے۔ پ گہرے سرخ رنگ کی ہے۔ ت زرد ہے۔ ٹ پارے جیسی چمکیلی ہے۔ ث کا رنگ بینگنی ہے......

الفاظ و حروف کے ساتھ رنگوں اور شکلوں کے اس تعلق کی بنیاد کیا ہے، میں نہیں جانتا۔ اور جاننا چاہتا بھی نہیں۔ ڈر لگا رہتا ہے کہ جان گیا تو یہ رنگ کہیں بھاپ بن کر نہ اڑ جائیں کیونکہ اکثر حقیقتیں، تصور کو ملیا میٹ کر دیتی ہیں۔

بہر حال لندن کی یہ بڑی بی برسوں سے کوئی سوئٹر بنتی چلی آ رہی ہے۔ نہ اُس کا اُون ختم ہوتا ہے نہ سوئٹر مکمل ہوتا ہے پھر بھی گھر کی بڑی بوڑھی کی طرح ہر چھوٹی بڑی بات پر اس کی نظر لگی رہتی ہے۔

لاطینی امریکہ کے کسی چھوٹے سے غیر معروف ملک میں، جس کا نام غالباً خود اس ملک کے لوگ بھی کم جانتے ہوں گے، کسی فوجی ڈکٹیٹر کا تختہ پلٹ گیا ہے۔ اپنے اخباروں میں شاید آپ کو اس کی خبر بھی نظر نہیں آئے گی۔ مگر بی بی سی سنیئے تو وہ اس ڈکٹیٹر کی جڑ بنیاد تک کھود کر نکال لائے گی، کہ فلاں سن میں اس نے فلاں کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کر کے فلاں کو قید میں ڈال دیا تھا۔ اتنے دنوں میں چناؤ کا وعدہ کیا تھا، ملک کی معیشت اس کے دور میں ایسی تھی، حریفوں کی سرگرمیوں کا یہ حال تھا اور آخر میں یہ کہ تازہ بغاوت پر سوویت یونین اور امریکہ کا کیا ردعمل ہے!

ان دنوں ہر معاملہ کی تان اسی پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ یہاں تک کہ کسی ادیب نے کوئی بڑا سا ناول بھی لکھ دیا تو اس میں بھی سوویت یونین اور امریکہ نکل آتے تھے۔ البتہ اب ذرا فرق آ گیا ہے۔ آج کل ہر معاملہ کی تان امریکہ پر ٹوٹتی ہے۔ یہاں تک کہ خود روس کی بھی! اور اگر نہ ٹوٹے تو میاں امریکہ خود توڑ دیتا ہے!

شروع میں "آج کل" اور "سیربین" کے سیاسی تبصروں سے مجھے بڑی الجھن

ہوتی تھی ۔ بھئی، ہانڈورس میں کوئی انقلاب آ گیا ہے تو آیا کرے ۔ ہندستان میں اس سے کون سی قیامت آ جائے گی ۔ سانڈانستا چھاپہ ماروں نے نکاراگوا میں پھر لڑائی چھیڑ دی ہے تو ہم کیا کریں ۔ ہم نے تو ان سے لڑنے بھڑنے کو نہیں کہا تھا ۔ ایتھوپیا میں خشک سالی چل رہی ہے یا کوئی خشک سالہ آ گیا ہے تو ہم کیوں اپنا کھانا پینا حرام کریں ۔ ان باتوں سے میں اُکتا جاتا تھا ۔

لیکن جب بی بی سی کی ہندی اور اردو سروس کے دوسرے پروگرام سننا شروع کیے تو آہستہ آہستہ سارے تعلق سمجھ میں آنے لگے ۔ معلوم ہوا کہ ہانڈورس، اور ہندستان، چھاپہ ماروں اور خشک سالی، ڈکٹیٹری اور انقلاب سب ایک ہی لڑی کی کڑی ہیں ...

ریڈیو اسٹیشن اور بھی تھے ۔ وائس آف امریکہ، ریڈیو جرمنی ۔ ریڈیو ماسکو ریڈیو تاشقند ۔ ریڈیو پیکنگ .... جو طاقتور ٹرانسمیٹروں سے اپنی ایشیائی نشریات برصغیر کی طرف بیم (Beam) کرتے تھے ۔ ان کی فریکوئنسیاں بھی ریڈیو پر نسبتاً آسانی سے مل جاتی تھیں مگر ان سب کو سننے پر ایسا لگتا تھا، جیسے ہمیں ہانک کر کسی خاص سمت میں لے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔

صرف بی بی سی ایک ایسی ریڈیو سروس تھی، جو اپنے سننے والوں کی انگلی تھام کر انھیں ہر سمت میں ٹہلا رہی تھی ۔

یہاں اپنے برصغیر کے ریڈیو اسٹیشنوں کا ذکر میں نے اس لیے نہیں کیا کہ ان کے دو ہی کام تھے ۔ پکے راگ سنانا اور فلمی ریکارڈ بجانا! اور یہ سب جان بوجھ کر کیا جاتا تھا تاکہ سننے والے اپنے گردوپیش کو نہ جان سکیں ۔ اپنے مسئلوں سے نہ آگاہ ہو جائیں ۔ ان کے یہاں دو تین ہی مسئلے تھے ۔ یا تو کسی نے کسی کی ''کلیاں'' مروڑ دی ہے ۔ یا کسی کا ''بازوبند'' ڈھیلا ہے اور بار بار کھل کھل جا رہا ہے!

ہاں کچھ پروگرام خواتین کے لیے کچھ بچوں کے لیے اور کچھ دیہاتی بھائیوں کے لیے ضرور ہوتے تھے ۔ (آج بھی ہوتے ہیں) مگر ان میں بھی بات چولہے چوکے، قصے کہانیوں اور نئی نسل کے بیجوں سے آگے نہیں بڑھتی تھی ۔ عورتوں کا زندگی کے ہر شعبہ میں ہر سطح پر کس طرح استحصال ہو رہا ہے، نفع خور معیشت نے کس طرح بچوں سے ان کا بچپن چھین لیا ہے، اور بے زمینوں کی محنت پر بڑے کسان اور زمیندار کس طرح عیش کر رہے ہیں ۔ یہ معلومات ان اسٹیشنوں سے نہیں ہوتی تھی ۔

میں نے جب بی بی سی پر ''سیر بین'' اور ''آج کل'' کے بعد ''جہاں نما''،

''وشو بھارتی''، ''اندر دھنش''، ''سب رس''، اور ''میزان'' جیسے پروگرام سننا شروع کیے تو علم اور معلومات کی ایک حیرت انگیز دنیا کھل کر سامنے آنے لگی۔
''ہم سے پوچھیے'' بی بی سی ہندی سروس کا ایک ایسا پروگرام تھا جس کا میں پورے ہفتے بے تابی سے انتظار کرتا تھا۔ اس میں قارئین... معاف کیجیے سامعین کوئی بھی سوال پوچھ سکتے تھے۔ مثلاً، افریقہ کے لوگ سیاہ فام کیوں ہوتے ہیں، وقت کیا شئے ہے، آسمان میں کتنے ستارے ہیں وغیرہ۔ کئی لوگ بڑے اٹ پٹے اور بظاہر احمقانہ سوال پوچھ لیتے تھے، جیسے، کتے کی دم ٹیڑھی کیوں ہوتی ہے، ہٹلر کے پاس کتنی جرابیں تھیں، گنجوں کے سر پر بال کیوں نہیں ہوتے، برف اتنی ٹھنڈی کیوں ہوتی ہے، آدمی کے منھ میں بتیس دانت ہی کیوں ہوتے ہیں۔ تینتیس یا اکتیس کیوں نہیں ہوتے
مگر بی بی سی والے بڑی سنجیدگی سے ان سوالوں کا جواب دیتے تھے۔ پورے ہفتے اس پروگرام کی ٹیم لندن کی لائبریریوں اور میوزیموں کی خاک چھانتی، انسائیکلو پیڈیا کے ورق الٹتی، اور ہر سوال کا ایک منطقی اور درست ترین جواب ڈھونڈ کر پیش کرتی تھی۔ ہر جواب اتنا بھرپور، مفصل اور تشفی بخش ہوتا تھا کہ پندرہ منٹ کے پروگرام میں بمشکل دو یا تین سوال ہی شامل ہو پاتے تھے۔ افسوس، اب وہ پروگرام بند ہو گیا ہے۔ جاری ہوتا تو خادم کے پاس اس عرصے میں جو ڈھیروں سوال بے جواب جمع ہو گئے ہیں، ان کا کچھ بوجھ ہلکا کر لیتا۔
بی بی سی کی کم از کم تین خوبیاں ایسی ہیں جو الگ الگ تو دوسری ریڈیو سروسز میں بھی ہوں گی مگر ایک ساتھ صرف بی بی سی میں پائی جاتی ہیں۔ دلکش آواز اور لہجہ، درست تلفظ اور حقیقت بیانی! اور ان تینوں میں بی بی سی کو بلا مبالغہ حرف آخر کہا جا سکتا ہے۔
اپنی آکاشوانی کے دیو کی نندن پانڈے اور سیدہ سلامت علی اور پاکستان کے شکیل احمد کے بعد جتنی بھی ریڈیائی آوازیں مجھے یاد رہ گئی ہیں وہ سب بی بی سی کی ہیں۔ رتنا کر بھارتیہ، ضمیر الدین احمد، آل حسن، سدو بھائی، اونکار ناتھ شریواستو، وقار احمد، شمیم ناصر، یاور عباس، رضا علی عابدی، اچلا سچدیو... کتنے نام گناؤں کئی تو بھول بھی گیا ہوں۔
رتنا کر بھارتیہ کا جوش بھرا انداز، ضمیر الدین احمد کی سنجیدگی، آل حسن (جنھیں پیار سے سب آلے بھائی کہتے تھے) کا خمار آلود شرقی لہجہ، اونکار بھائی کا منفرد اور اپنائیت بھرا طرز بیاں، سدو بھائی (شاہین کلب والے) کی بے ساختہ اداکاری، وقار احمد کا خطابتی

سے زیادہ کتابی انداز کہ ہر لفظ کو اس کے دائروں اور زیر وزبر کیساتھ پورا کرتے ہیں، شمیم پنسر کی شبنمی آواز، یاور عباس کی شفاف بہتے پانی جیسے رواں دواں گفتگو، رضا علی عابدی کا پاک صاف، وضوشدہ لہجہ اور نرم وسبک طرز کلام، اچلا سچدیو کے لہجے کی چمکیلی دھوپ، یہ بھی نام اپنی آوازوں کے زیر وبم کے ساتھ یادداشت اور سماعت پر آج تک نقش ہیں۔ ان میں سے رتنا کر بھارتیہ، ضمیرالدین احمد، آل حسن، سدّ و بھائی اور شمیم پنسر کی آوازیں میں نے بیس پچیس برس سے نہیں سنیں مگر تصور میں آج بھی گونجتی رہتی ہیں۔

پھر آج کل سنائی دینے والی آوازیں بھی کچھ کم نہیں۔ اردو ہندی دونوں کے شہسوار شفیع نقی جامعی، ایک بالکل نئی مگر بے حد دلکش آواز ابھیسار شرما، ٹائمس آف انڈیا والے زبیر احمد، اور ماشاءاللہ ہمارے ''قومی آواز'' کی تربیت یافتہ نصرت جہاں۔

اس برق نما، تیز طرار لڑکی کا ذکر کیے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ ''قومی آواز'' میں چھے ماہ کے اپنے مختصر قیام کے دوران اپنے نام کی وجہ سے وہ میرے لیے اچھی خاصی الجھن کا باعث بن گئی تھیں۔ فون آتے تھے ان کے لیے۔ اور الجھ جاتا تھا میں۔

''ہلو نصرت!''

''جی۔ فرمایئے۔''

''ذرا نصرت سے بات کرائیں میں اس کی فرینڈ بول رہی ہوں۔''

''جی میں بول رہا ہوں۔ آپ کون؟''

''میں کوئی بھی ہوں۔ آپ سے مطلب؟''

''محترمہ میں وہی بول رہا ہوں جس سے آپ بات کرنا چاہتی ہیں۔''

''حد ہوگئی۔ بڑے بے شرم ہیں آپ۔ مان نہ مان خالہ اماں سلام۔ پتہ نہیں کیسے کیسے غنڈے بھر لیے ہیں دفتر میں۔ میں پہلے ہی منع کر رہی تھی۔ مردوں والے دفتر میں کام مت کرو۔''

جو لوگ نصرت جہاں کی خوش فہمی میں مجھ سے ملتے وہ مایوس ہو کر منہ بنا لیتے اور جن کی ملاقات میری غلط فہمی میں نصرت سے ہو جاتی وہ کچھ اور ہی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے۔ راقم برسوں سے تذکیر کے صیغے میں لکھتا آ رہا ہے مگر نام کی وجہ سے کئی لوگوں کو پھر بھی شبہ رہتا ہے کہ یہ لکھتا نہیں لکھتی ہے ایسے ہی کچھ لوگوں نے جب دفتر میں نصرت جہاں کو دیکھا تو ان کا شبہ یقین میں بدل گیا اور کئی تو بڑے خوش بھی ہوئے

کیونکہ تب تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

بہر حال میرا اب بھی یہ حال ہے کہ جب کبھی ان کی تیز طرار دلکش آواز ریڈیو پر سنائی دیتی ہے۔ میں احتیاطاً والیوم کم کر لیتا ہوں!

یہ سب لوگ دنیا بھر کے حالات کی براڈ کاسٹنگ کے کام میں اس قدر پروفیشنل واقع ہوئے ہیں کہ خدا کی پناہ، جب بھی سنیے ان کی باتوں سے کوئی نہ کوئی معلومات نکلتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ اسٹوڈیو سے باہر اپنی زندگی میں یہ لوگ غیر معلوماتی باتیں کس طرح کرتے ہوں گے۔ ایک اناؤنسر دوسرے سے ملتا ہوگا تو چھوٹتے ہی کہتا ہوگا۔

"اخاہ، آپ ہیں کہیے کیسے مزاج ہیں۔ بوسنیا میں تو سب خیریت ہے نا۔"

"جی سب آپ کی دعا، ہے۔ بس ذرا مشرقی تیمور میں کچھ حرارت ہو گئی تھی، اب آپ کی دعاء سے افاقہ ہے۔"

"چلیے اچھا ہوا۔ ورنہ اپنے یہاں تو قیامت ہی آ گئی تھی۔"

"اوہو۔ خدا خیر کرے۔ کیا ہوا؟"

"ارے میاں آج صبح شیو بنا رہا تھا کہ جوہری تجربات پر پابندی کے جامع معاہدے کے بارے میں ہونے والے مذاکرات میں تعطل پیدا ہو گیا"

"اماں نہیں!"

"اماں ہاں! میری تو سنتے ہی بھوک اڑ گئی۔ وہ تو شکر ہے کہ بروقت توجہ چیچنیا کی طرف مبذول ہو گئی۔ ورنہ اس وقت بھی فاقہ چل رہا ہوتا۔ خیر یہ سب چھوڑو۔ کل شام تم نے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا آئے کیوں نہیں۔"

"یار کیا بتاؤں، تمھارا یہاں بنگلہ دیش کے معیاری وقت کے مطابق آٹھ بجے پہنچنا تھا۔ پھر جب میں گھر پہنچا تو خلیج کے بیشتر ملکوں میں پانچ بجے ہوئے تھے۔ اس لیے میں نے ارادہ ملتوی کر دیا اور لندن کے مقامی وقت کے مطابق واپس آ گیا۔"

بی بی سی کے بارے میں اتنی باتیں میرے ذہن میں ہیں کہ ہفتوں اس پر لکھ سکتا ہوں۔ نہ اس کی باتیں ختم ہوں گی نہ مضمون۔ لندن کی اس بڑی بی کی طرح، جو میرے تصور میں باغ کی ایک بینچ پر بی بی سی کی تصویر بن کر بیٹھی ہوئی برسوں سے کوئی سوئٹر بن رہی ہے اور جس کا نہ سوئٹر مکمل ہوتا ہے نہ اون ختم ہوتا ہے۔ لہٰذا میں یہ مضمون ختم کرتا ہوں!

عبداللہ کمال
ابرار الفلاح کالونی
کوسا۔ممبرا (تھانے) 400612

غزل

کس کی آنکھوں کا خواب ہے دنیا
کس جہاں کا سراب ہے دنیا

کون معشوق اس کے پیچھے ہے
کس کے رُخ کا نقاب ہے دنیا

کھیل ہے کس شریر بچے کا
کس کے لب پر حباب ہے دنیا

نہ ملے تو، چبھے رگِ جاں میں
اور ملے، تو عذاب ہے دنیا

کج کلاہی ہے خاک زادوں کی
آسماں کا جواب ہے دنیا

ق

اک طوائف سی خوبصورت ہے
بے وفا ہے، خراب ہے دنیا

دیکھتے ہیں نظر بچا کے سبھی
بیسوا کا شباب ہے دنیا

اپنے بچوں سے چھپ کے پڑھیے اسے
بالغوں کی کتاب ہے دنیا

دشتِ سیر وشکار شیروں کا
میمنوں پر عقاب ہے دنیا

ہم ہیں ایندھن اسی جہنم کے
آتشِ التہاب ہے دنیا

قیس ہوں، کوہ کن ہوں، یا ہو کمالؔ
سب کا لبِّ لُباب ہے دنیا

ڈاکٹر ظفر حمیدی
آم گولہ روڈ مظفر پور۔ بہار

غزل

سلگتے وقت کے ہاتھوں پگھل رہے ہیں ہم
یہ سچ ہے اک نئے سانچے میں ڈھل رہے ہیں ہم

ہے اس کی آنچ میں لذت بھی اور کدورت بھی
ہوس کے شعلے میں مدت سے جل رہے ہیں ہم

کمال ہے مری لغزش کی وضع داری کا
کہ پل صراط پہ جا کر سنبھل رہے ہیں ہم

جو ہم سفر بھی ملا اس کے ساتھ ساتھ چلے
ہمارا کام ہے چلنا سو چل رہے ہیں ہم

درون ذات کی چکنی ڈھلان میں اترے
نتیجہ یہ ہے کہ اب تک پھسل رہے ہیں ہم

خود اپنے عکس میں یہ کس کا عکس دیکھتے ہیں
ایک آئینہ لیے پھر آنکھ مل رہے ہیں ہم

کسی درخت کے سائے میں مل سکے نروان
اسی امید میں گھر سے نکل رہے ہیں ہم

سنا ہے ایک قیامت بھی آنے والی ہے
ابھی یہ حال ہے لمحوں میں پل رہے ہیں ہم

طلسم شیشہ گراں کے فریب کے صدقے
ظفر اب اپنے تکبّر کا سر کچل رہے ہیں ہم

سید بشارت علی
لکچرر شعبہ انگریزی سری وینکٹیشور
ڈگری کالج سوریہ پیٹ، (نلگنڈہ)

اک درانتی

بدن ہمارے
جو تازہ سبزے کی طرح روشن ہیں
اوس کی مئے کو پی کے مستی میں جھومتے ہیں
چمکتے سورج کی کرنیں پل پل
نمو کی لذت جگائے رکھتی ہیں
چاندنی جگمگاہٹوں کو نکھارتی ہے
تو ابر سے پھوٹتی پھواریں
جڑوں میں شادابیوں کے سرچشموں کو توانا
بنائے رکھتی ہیں
اور ہواؤں کے نرم جھونکے
سریلے، لہجے میں لوری گاتے ہیں
اور ہم بھی غنودگی میں یہ بھول جاتے ہیں
اک درانتی کہیں چھپی ہے
جو ہم کو اپنی جڑوں سے
اپنی زمیں سے
پل میں اکھاڑ دے گی

نسیم مخموری
خیاباں B، ۳۰۰ پوسٹ آفس
جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔۲۵

غزل

درد کا درد ہے رسوائی کی رسوائی ہے
میں نے کیا جرم کیا تھا جو سزا پائی ہے

زخم اپنے ہیں تپش اپنی ہے غم اپنے ہیں
اک ترے شہر میں کس کس سے شناسائی ہے

عالم یاس میں ہر ایک شجر سوکھ گیا
ابر آئے کوئی سوکھی میری انگنائی ہے

ٹوٹ جائیں نہ کہیں اتنا تغافل تو نہ کر
ہم نے شیشوں سے بکھرنے کی ادا پائی ہے

میں تمھیں بھول کے جاؤں کہاں تک جاؤں
تم سے وابستہ تو ایک عمر کی رسوائی ہے

شہر در شہر نظر آئیں گے خالی سائے
ابن آدم پہ سوالوں کی گھٹا چھائی ہے

صرف چہرے کو تبسم سے چھپالوں گی نسیم
دل کا کیا ہوگا جہاں یاس کی گہرائی ہے

ملک زادہ جاوید
ٹی۔۲۵ سیکٹر XI نوئیڈا، یوپی

غزل

لہروں لہروں شور بہت ہے
اک مچھلی میں زور بہت ہے

گر سکتا ہے لمحے بھر میں
بیساکھی کمزور بہت ہے

بند کرو کھڑکی دروازے
آج ہوا منہ زور بہت ہے

کان میں روئی ڈال کے نکلو
گھر سے باہر شور بہت ہے

علم کے مانجھے سے کیا حاصل
لفاظی کی ڈور بہت ہے

چھوڑو کیا جاوید سے ملنا
سنتے ہیں وہ بور بہت ہے

اسماعیل منصور

اُردو زبان کے لیے نئی وسعت کا سامان

اُردو کی محققہ شاعرہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے مراٹھی سے اردو میں اہم اور امتیازی نوعیت کے تراجم کا سلسلہ شروع کر کے تین سال کے مختصر عرصے میں مراٹھی نظموں کے دو مجموعات کے تراجم شائع کیے ہیں۔ پہلا ہے ''ماڑھے ودیا پیٹھ'' دلت شاعر نارائن سروے کی چالیس نظموں کا مجموعہ، بہ نام ''میری درس گاہ'' (اشاعت ۱۹۹۵) اور دوسرا بے باک اور انقلابی لہجے کے شاعر منگیش پاڈگاونکر کی اکتالیس نظموں کا مجموعہ بہ نام ''سلام'' (اشاعت ۱۹۹۸ء)

عموماً انفرادی طور پر کسی مجرد فن پارے کو ترجمہ کرنے کا چلن عام ہے لیکن ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے ترجمہ نگاری کو ذولسانی لین دین کے لیے زیادہ با مقصد اور کار آمد بنانے کے تحت اِس قسم کی سہل انگاری سے گریز کرتے ہوئے مراٹھی ادب کے وقیع و وسیع جائزے کے بعد شخصیاتی اور سماجی الگ الگ پس منظر سے دو شعراء اور اُن کے مخصوص و منفرد نوعیت کے مجموعات کا انتخاب کیا۔ اِس اعتبار سے یہ تراجم اپنے اندر ایک وسیع مقصد رکھنے کے علاوہ مراٹھی کی منفرد امتیازی تحریروں کو اُردو میں پیش کرنے کی تحریک کے مترادف ہیں۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی تین دہوں تک اُردو میں تدریس، تحقیق، تالیف، شعر گوئی نثر نگاری سے مستقل طور پر وابستہ ہیں اور اب مہاراشٹر کالج ممبئی میں شعبۂ اُردو کی صدر ہیں۔ ان تمام صلاحیتوں، رفعتوں اور ریاضتوں سے گزرنے اور نکھرنے کے بعد اُنھوں نے مراٹھی سے اُردو میں ترجمہ نگاری کی طرف رُخ کیا ہے۔

مراٹھی سے ادبی رشتہ قائم کرنے کا سبب ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کے لیے صرف یہی نہیں تھا کہ مراٹھی اُن کی ریاستی زبان ہے بلکہ مہاراشٹر کا شہر نجر اُن کا وطن ہے اور اُن کے والد مرحوم شاکر نجرن یصاحب مراٹھی کے اسکالر تھے۔ پھر بھی ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی اُردو ماحول کی پروردہ رہی ہیں اور مراٹھی ترجمہ اُن کے لیے مراٹھی بولنے والے

ردو مترجمین کی طرح کار سہل نہیں تھا۔ اُستاد محترم ڈاکٹر عصمت جاوید صاحب نے بھی
مختصر سے عرصے میں نہ صرف مراٹھی زبان پر دسترس حاصل کر لی تھی بلکہ اُس کی لسانیات
ور ادبیات میں گہری واقفیت بھی۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کی ہمتِ دشوار پسند نے بھی نہ
صرف مراٹھی کے اس محنت طلب کام کو قبول کر لیا بلکہ بہت جلد مراٹھی سے ترجمہ نگاری
میں اپنے لیے ایک نمایاں مقام بھی بنا لیا۔ اُردو کی خدمت کے جذبے کے تحت مراٹھی کی
طرف اُن کی یہ کامیاب پیش رفت اُردو قارئین اور اہل نقد کی ستایش کی مستحق ہے۔

کسی بھی زبان کے ادب میں کیے جانے والے نئے نئے تجربات عالمی ادبی ورثے کا حصہ ہوتے ہیں اور کسی ایک زبان کی حدود میں مقید نہیں رکھے جا سکتے۔ اس اعتبار سے ان تراجم کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔

دونوں تراجم میں کس انوکھے پن اور وسعت کا سامان ہے یہ جاننے سے پہلے اِن تراجم کو زیادہ بامعنی اور کارآمد بنانے کے لیے، انھیں جس اہتمام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اُس کا تذکرہ بھی ضروری ہے، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے قارئین کے لیے درکار ضروری معلومات اور ان کے اشتیاق کا اندازہ کرتے ہوئے تراجم کے ساتھ ساتھ فٹ نوٹ میں وضاحتیں دی ہیں اور دونوں کتابوں کے آغاز میں معلوماتی اور ضروری قسم کے دیباچے شامل کر کے مراٹھی ادب کی پس منظر میں شاعر کے امتیازی مقام کا تعین بھی کیا ہے، مزید یہ کہ اُنھوں نے ادیب کی زندگی، ذاتی معلومات، دیگر تصنیفات اور فنی کارہائے نمایاں کی تفصیلی فہرست بھی دی ہے۔

اُردو میں اِن تراجم کی افادیت کو ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو علی سردار جعفری کا یہ جملہ پیش کرنا کافی ہوگا، کہ "یہ ترجمہ اُردو زبان کے لیے نئی وسعت کا سامان ہے، جو اُنھوں نے مری درس گاہ کے آغاز میں اپنے اظہار خیال بعنوان "ایک حرفِ ستائش" میں پیش کیا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کی ترجمہ نگاری کا مقصد بھی یہی ہے، اس لیے یہ جملہ نہ صرف اس بارے میں اُن کے مطمعِ نظر بلکہ اُن کے دوسرے ترجمہ "سلام" پر بھی صادق آتا ہے۔

"سلام" کے ترجمے کے بارے میں ڈاکٹر شبنم عابدی نے شاعر منگیش پاڈگاؤنکر کی مراٹھی میں تحریر کردہ رائے کتاب کے آخر میں شائع کی ہے جس میں شاعر پاڈگاؤنکر نے اس ترجمے کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے:

(ترجمہ) "یہ ترجمہ مجھے بے حد اثر انگیز محسوس ہوا۔ اصل نظموں کے مفہوم اور

خیال دونوں کے ساتھ اُنھوں نے (ترجمہ نگار نے) بھرپور طریقے پر انصاف کیا ہے۔"

اب ذیل میں اِن شعراء کے کچھ کوائف اور ترجمہ شدہ اُن کی کتابوں کا اجمالی جائزہ پیش خدمت ہے:

"ماز ہے وڈیا پیٹھ" (میری درس گاہ) دلت سماج کے فرد نارائن سُروے کے پانچ مجموعات میں دوسرا ہے اور ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۵ء تک اس کے چھ ایڈیشن کتاب کی مقبولیت کا مظہر ہیں۔ شاعر کی انوکھی شخصیت کا اندازہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کے دیباچے میں پیش کردہ، شاعر کے ذاتی حالات سے ہوتا ہے، جو مختصراً اس طرح ہیں تعلیم چار جماعتوں تک۔ ماں باپ اور سرپرست کے سائے سے محروم، فٹ پاتھ کی زندگی۔ ابتداء میں محنت مزدوری ذریعہ معاش۔ بعد میں کپڑا مل اور اسکول میں چپراسی کی ملازمت۔ مزدور کرداروں اور تحریکوں سے وابستگی۔ شادی۔ پریل کی چال میں رہائش۔ ذاتی محنت سے تحریری صلاحیت کو اُبھارنا اور آخر میں مراٹھی ساہتیہ سمیلن کی صدارت۔

اُسی طرح کتاب کے مشمولات وموضوعات کچھ اس قسم کے ہیں: شاعر کی زبوں حال زندگی کے ذاتی مسائل۔ ان مسائل میں سائنس لیتا رومان۔ مزدوروں، طوائفوں، گودی میں مال اُٹھانے والوں، دیواروں پر پوسٹر چپکانے والے ساتھیوں کے کردار۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے دیباچے میں بعض کرداروں کی خصوصیات کا ذکر بھی کیا ہے۔

سُروے نے ان نظموں میں پسماندہ افراد کی بستیوں کے گلی کوچوں کی مراٹھی زبان استعمال کی ہے۔ بعض جگہ روانی میں ممبئی کی اُردو کے فقرے بھی آگئے ہیں۔ اس الگ نوعیت کی زبان کے علاوہ نظموں کے موضوعات وخیالات کے بارے میں علی سردار جعفری نے اِس انداز سے رائے پیش کی ہے۔

اُن کی (سُروے کی) شاعری اُردو کا تاج محل نہیں۔ یہ زمین کی طرح کھردری اور سچی ہے۔ . . . اِس کا جمالیاتی نظام مختلف ہے اس لیے اس کا لطف کئی بار پڑھنے کے بعد آئے گا۔"

یہ حقیقت ہے کہ ان نظموں کا پس منظر اور کردار اپنے انوکھے پن کی وجہ سے شروع میں نامانوس لگتے ہیں۔ یہ نظمیں حقیقی زندگی کا عکس ہونے کی وجہ سے دلچسپ ہیں اور دوبارہ سہ بارہ پڑھنے پر بھی اکتاہٹ نہیں ہوتی اور پھر رفتہ رفتہ کرداروں اور ماحول سے بھی مانوسیت کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔

مجموعے کی پہلی نظم "میری درس گاہ" شاعر کی بے خانمانی کے درد کی جھلکیاں

پیش کرتی ہے۔ یہ نظم کتاب کا مرکزی خیال لیے ہوئے ہے کہ یہی فٹ پاتھ اور یہی گلیاں شاعر کی ''درس گاہ'' رہی ہیں اور یہیں سے حاصل کیے ہوئے تجربات کی مدد سے وہ حالات کا مقابلہ کرنے اور زبوں حالی سے اُبھرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ نظم کے اختتام میں شاعر نے اسی بات کو اِن الفاظ میں درج کیا ہے:

''جینا ہوگا، اپنا سا کچھ کرنا ہوگا، کبھی مات کھا کر، کبھی مات دے کر۔''

کتاب کی اصل کیفیت کا اندازہ پوری پوری نظموں کے مطالعے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ یہاں صرف دو مثالیں پیش ہیں۔

نظم ''ممبئی'' میں شاعر نے اپنے جیسے غریب مزدوروں کے ایک ''ذاتی تجربے'' کو اس تاثر کے ساتھ درج کیا ہے:

''دوزخ سے بدترین گھروں میں رہ کر حسین شاہرا ہیں بناتے ہیں،
کبھی گشت لگاتے ہوئے سپاہیوں کی لاٹھیوں سے اُٹھائے جاتے ہیں۔''

نظم ''سُن رہے ہو بیٹا'' میں باپ مزدور تحریک کے دوران گرفتار ہو کر دیگر لوگوں کے ساتھ پولیس کی گاڑی میں سوار اپنی چال کے سامنے سے گزرتا ہے اور اپنے سوتے ہوئے بیٹے پر نظر ڈالتا ہے۔ یہ واقعہ نظم میں اِن الفاظ میں درج ہے۔

''تم ماں کی آغوش ...اُس کا آنچل تھامے۔ سو رہے تھے۔
(جاتے جاتے) میں نے اُس کو ہاتھ دِکھایا تب اُس کا روپ...
اُس ''یوم مئی'' کی یاد تازہ کرتا ہوں تو آنکھیں بھر آتی ہیں۔''

اِن نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ نظموں کے پس منظر میں، انھیں لکھنے والے ایک ایسے حوصلہ مند شخص کی موجودگی کا احساس ہوتا رہتا ہے جو سنگینی حالات کا شکوہ کرنے کی بجائے، اُن سے لڑتے ہوئے جینے کا سلیقہ سیکھ رہا ہو۔ علی سردار جعفری نے سروے کی اس صفت کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

''نارائن سُروے ترقی پسند اور انقلابی ہیں اِس لیے اُن کا دل بہت بڑا ہے۔ اور خیالات روشن ہیں'' آگے وہ سروے کے بارے میں یہ دلچسپ جانکاری بھی دیتے ہیں۔

''وہ اُردو زبان اور اُس کی شاعری کے بھی دل دادہ ہیں اور مراٹھی زبان میں اُردو شاعری کے ترجمے کرتے رہتے ہیں۔''

''میری درس گاہ'' کی نظمیں شاعر کی آپ بیتی ہونے کی وجہ سے پُر کشش ہیں۔

ہر نظم مشاہدات کے وسیع کینوس پر کھینچی ہوئی، شاعر کے اطراف بکھری ہوئی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزیات لیے ہوئے ہے۔ اور اِس تصویر کو، اُس کی تمام جزیات کے ساتھ مکمل دیکھنے کے لیے ایک کے بعد ایک، ہر اگلی نظم پڑھنے کی ترغیب ہوتی ہے۔

آخر میں سروے کے بارے میں ڈاکٹر رفیعہ شبنم کی یہ رائے نہایت اہم اور قابل توجہ ہے:

"جدید انداز کی تازہ لفظیات اور انوکھے موضوعات کی وجہ سے سُروے مراٹھی شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔"

سُروے کی مراٹھی نظموں کے تراجم انگریزی اور گجراتی میں بھی ہوئے ہیں۔ انھوں نے کرشن چندر کے افسانوں کا ترجمہ "تین گنڈے آنی سات کتھا" (تین غنڈے اور سات کہانیاں) اور ناولٹ "دادر پل کے بچے" کا ترجمہ "دادر پُلا کھال چی مُلے" کے نام سے مراٹھی میں کیا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کا دوسرا ترجمہ "سلام" مراٹھی کے اعلا تعلیم یافتہ، حقیقت پسندانہ، بے باک اور انقلابی لہجے کے شاعر منگیش پاڈ گاؤنکر کی نظموں کے مجموعے "سلام" کا ترجمہ ہے، سماجی، سیاسی زندگی کے گھناؤنے پہلوؤں کی تصویر کشی کرنے والے استعارات جو پاڈ گاؤنکر کے طباع ذہن کی تخلیق ہیں، "سلام" کی انفرادیت ہیں۔ یہ استعارے اپنے "نشانوں" پر Point-blank فاصلے سے چلائی ہوئی گولیوں کی طرح ہیں، جن کی کاٹ سادگیِ اظہار سے اور گہری ہو جاتی ہے۔ واقعات اور کرداروں کی انوکھے استعاروں میں پیکر کشی بھی "سلام" کی نظموں کی امتیازی خصوصیت ہے۔

پاڈ گاؤنکر کی پیدائش کوکن کے سندھو دُرگ ضلع میں وینگرلا نامی گاؤں میں ۱۹۲۹ میں ہوئی۔ مراٹھی اور سنسکرت میں انھوں نے ممبئی یونیورسٹی سے ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء میں بالترتیب بی۔ اے اور ایم۔ اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور اسکالرشپ بھی پائی۔ 'سلام' اُن کے تیرہ مجموعات میں چھٹا ہے، جس کے ۱۹۷۸ سے ۱۹۹۵ تک چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۵۶ سے ۱۹۹۰ء تک ریڈیو، ٹی۔ وی اور ایچ ایم وی کے لیے اُن کے تقریباً ساٹھ گانے ریکارڈ ہوئے۔ اُن کی دیگر تصنیفات و تالیفات کی فہرست کے ساتھ، امریکی ادب سے کیے ہوئے ان کے سترہ تراجم کی طویل فہرست بھی ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے اپنے دیباچے میں شامل کی ہے۔

منگیش پاڈ گاؤنکر کو اُن کے بعض شعری مجموعات پر مہاراشٹر اور بیرونِ مہاراشٹر

سے اسٹیٹ ایوارڈ بھی ملے ہیں۔ ۱۹۷۸ میں "سلام" پر ملے ہوئے مہاراشٹر اسٹیٹ
ایوارڈ کو انھوں نے اپنے کسی ذاتی نظریے کی بناء پر لوٹا دیا تھا۔ لیکن "سلام" پر ۱۹۸۰ میں
دیے گئے ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ کو اُنھوں نے قبول کیا تھا۔ اس سلسلے میں ساہتیہ اکادمی
کے ۲۷ر فروری ۱۹۸۱ء کی انعامی تقریب میں دیے ہوئے اُن کے مراٹھی خطبۂ
صدارت کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے اپنے ترجمہ کے آغاز میں شامل کیا ہے
جس میں پاڈگاؤنکر نے اپنی شاعری کا عندیہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"موجودہ سماج میں فرد کی آزادی پر حملہ کر کے انسانیت کو قدموں تلے روندنے
والی طاقتیں بڑے سلیقے سے متحد ہوتی جا رہی ہیں۔ ایسے لمحے میں لفظ کو ہتھیار بنانے کے
اس خیال کو سچا ثابت کرنے کے لیے شاعر کو کسی بھی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکانا
ہے۔ آزادی کا یہی جذبہ میری شاعری کا اصل موضوع ہے۔"

مجموعے کی پہلی نظم "سلام" پاڈگاؤنکر کی شاعری کا مقصد اور فن کی جھلک لیے
ہوئے ہیں۔ اس نظم میں کم و بیش نوے بار لفظ "سلام" کا استعمال کیا گیا ہے۔ فنکارانہ
مہارت سے استعمال کیے ہوئے اس لفظ میں پوشیدہ طنز کی دھار کو سادگی بیان اور تیز
کر دیتی ہے۔ مثال کے لیے بطور نمونہ اِدھر اُدھر سے چند چند مصرعے ہی پیش کرنا کافی
ہے۔

"سلام بھائی۔۔۔ سب کو سلام!!
.. ..
مندر کے دیوتاؤں کے جاہ و جلال کو سلام
دیوتاؤں اور دھرم کے ٹھیکے داروں کو سلام
. . ..
یونین کے لیڈروں کو سلام
ہڑتال کو سلام
... .
الیکشن کو سلام
الیکشن کے لیے اکٹھا کیے گئے چندوں کو سلام
کئی کئی ہوتے جو ہاتھ
تو کئی کئی ہاتھوں سے کرتا سلام۔"

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے نظم ''سلام'' پر اپنا پُر اثر اظہار خیال ان الفاظ میں کیا ہے:

''سماج کے پسماندہ طبقے کے افراد کو اعلا طاقت ور اور با اقتدار افراد کے آگے جُھکا کے کیا جانے والا یہ سلام دراصل زوردار تھپڑ ہے سماج کے اُس غیر متوازی نظام کے مُنہ پر جس نے چند اسفلوں کو شرفا کے رزق کا تقسیم کار بنادیا ہے۔''

منگیش پاڈ گاؤنکر کے بقول زندگی کے مختلف مشاہدات سے پیدا ہونے والا ''تخلیق نو کا احساس'' ہی اُن کی شاعری کا محرک ہے، جس کی حفاظت وہ اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں اور ''اُس پر حملہ کرانے والی غنڈہ گردی کے خلاف کڑی سے کڑی شکل میں بلا خوف خطر آواز اُٹھانا'' اُن کی تحریروں کا عین مدعا اور انداز خاص ہے۔

پاڈ گاؤنکر کی نگاہ میں ''حقیقی شاعر کسی مخصوص نظریے کا مُبلغ نہیں ہوگا۔'' اس لیے وہ قاری پر اپنا نظریہ تھوپنے کے خلاف ہیں۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں یہ خاص خوبی موجود ہے کہ اُن کا حقیقت پسندانہ طرز بیان قاری کو اپنا ہم خیال بنانے کی صلاحیت بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

نظم ''سلام'' کے مذکورہ بالا اقتباسات کے علاوہ ذیل میں اس مجموعے کی تین نظموں کے اقتباسات نموتاً پیش ہیں۔

نظم ''تہذیب'' میں موجودہ سیاسی نظام کے مخصوص طریقۂ کار پر طنز ملاحظہ کیجیے۔

''دھمکی باز کامیاب ... چال باز کامیاب۔
اور پھر . طاقت ور سیاسی لیڈر
اِن کامیاب لوگوں کو گردنیں پکڑ کر اُٹھاتے ہیں
اور بٹھادیتے ہیں اُنھیں تہذیبی اداروں کی کرسیوں پر''

سرمایہ داروں کی نسل کے ایک روایتی کردار ''راگھو یار راگھوناتھ'' کی زندگی کا یہ پہلو بھی ملاحظہ کریں:

''چار بیٹے ہوئے (گھر میں) . اُن کے ہاتھ
بے شمار دولت لگی، جو چھوڑ گئے راگھو یار اگھوناتھ
اور باہر کی رکھیلوں کا بھی بھلا کیا
اُن کی اولادوں کے ساتھ۔''

نظم "مرغیاں" میں اہل اقتدار کے ہاتھوں آلہ کار بننے والوں کی تصویر کشی ملاحظہ کیجیے:

"اقتدار والوں نے مل جل کر
جو مرغیاں پالی تھیں
اُنھیں عقیدت مندی کے ساتھ
پرارتھنا کا شور مچاتے ہوئے
میں نے سُنا"

موضوعات کے تنوع کو مزید سامنے لاتے ہوئے ذیل میں بعض نظموں کا سرسری طور پر ذکر کیا جارہا ہے:

نظم "صاحب" میں موجودہ دفتر شاہی کے ایک مانوس کردار "صاحب" کے روزانہ کے معمولات کا بیان "سادگی میں نشتر زنی" کی دلچسپ مثال ہے۔ نظم "تقریب کے بعد" میں آدرشوں کو پامال کرنے والے نمایشی لیڈروں کے ہاتھوں آدرشوں کی مذاق بنا کر رکھنے والی کھوکھلی تقریبات کے حقیقی اور گھناؤنے پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ نظمیں "گدھ"، "باڑھ"، "درندہ" نہ صرف بامعنی عنوانات ہیں بلکہ ان کے دلکش اچھوتے استعارے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مجموعے کی تمام نظمیں زندگی کی گہرائی اور گیرائی کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کے اِن تراجم کی زبان سے متعلق دو اہم پہلوؤں کو ذکر یہاں ضروری ہے۔

اول یہ کہ ان دونوں مراٹھی مجموعات کی نظمیں آزاد نظموں کی ہیئت میں ہیں جن کے اوزان وقوافی مراٹھی میں مستعمل اور روا ہیں لہٰذا ان نظموں کو اُردو عروض کی پابندیوں میں لانے پر اصرار کرنا اوران کے لیے اردو کی نہج کے قوافی کو ضروری قرار دینا یا ان نظموں کے لیے اردو میں مراٹھی انداز کے وزن قوافی کو لازمی سمجھنا غیر مناسب ہے۔

دوم یہ کہ نظموں کے مخصوص پس منظر، زبان اور موضوعات کی بناء پر ان تراجم پر عین لفظی ترجمے کی پابندیوں کی اطلاق بھی غیر ضروری ہے۔ فاضل ترجمہ نگار ڈاکٹر

رفیعہ شبنم عابدی نے نفس مضمون کی صحیح عکاسی کو ترجمے میں اول ومقدم سمجھتے ہوئے لفظی ترجمے سے بھی کام لیا ہے، اور جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے لفظوں اور جملوں کو اپنے الفاظ میں بھی پیش کیا ہے اور ایسا کرنے سے ترجمے میں اردو کے مزاج وانداز کی مانوسیت کا رنگ بھی پیدا ہوا ہے۔

ترجمہ نگاری جیسے عرق ریزی کے کام میں ترجمہ نگار، ترجمے کی اپنی ایک اسکیم کے تحت مناسب زبان انداز، تفصیل واختصار کا انتخاب کرتا ہے جو بحیثیت ترجمہ نگار اس کی اپنی انفرادیت اور اختیار ہے، مختلف مترجمین کے تراجم اپنا اپنا انفرادی رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ دو مترجمین کے تراجم من وعن حرف بہ حرف مماثل ہوں۔

بحیثیت ترجمہ نگار ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کا بھی اپنا انفرادی انداز ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ اُنھوں نے ان تراجم میں خیالات وموضوعات کی صحیح اور دلکش عکاسی بھی کی ہے جیسا کہ ہر ترجمے کا اصل مدعا ہوتا ہے اور اس اعتبار سے یہ دونوں کتابیں ''میری درس گاہ'' اور ''سلام'' ڈاکٹر رفیعہ شبنم کے کامیاب تراجم ہیں اور اُردو کے لیے ان کی افادیت کے پیش نظر ادبی تعلیمی حلقوں میں ان کی خاطر خواہ پذیرائی ضروری ہے۔

آخر میں، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کے ادبی کارناموں کی رفتار ومعیار کو دیکھتے ہوئے اُن سے بجا طور پر یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ ترجمہ نگاری کی اپنی ''بامقصد تحریک'' کو جاری رکھتے ہوئے مراٹھی زبان وادب سے زیادہ قریب آنے کی کوشش کریں گی اور نظم کے ساتھ نثری ترجمے پر بھی توجہ دیتے ہوئے اُردو کے لیے اپنی ان گراں مایہ خدمات کا سلسلہ جاری رکھیں گی۔

ڈاکٹر شرف النہار
سرسید نگر۔ علی گڑھ

مَرڈِھیکر کی شاعری

مراٹھی ادب میں نوساہتیہ کے نام سے جو تحریک چلائی گئی شعری میدان میں اس تحریک کو لبیک کہنے والوں میں سب سے اہم نام "بال سیتا رام، مَرڈھیکر" کا ہے۔ کل ۴۷ برس کی مختصر عمر پانے والے اس شاعر نے اپنی شاعری کا آغاز رومانی نظموں سے کیا جس کی مثال اس کا پہلا شعری مجموعہ "شیشر اگم" ہے جو ۱۹۳۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے کی تمام نظمیں شاعر کے رومانی جذبات واحساسات کو ظاہر کرتی ہیں جس کے بارے میں مشہور ادیب ونقاد ڈاکٹر یونس اگاسکر نے بھی اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ۔ "اس مجموعہ کا نام ہی شاعر کی رومان پسند طبعیت کا غماز ہے۔"

لیکن دوسری جنگ عظیم سے پیدا شدہ حالات نے مرڈھیکر کو رومانی فضا کی سحر انگیزی سے نکال کر حقیقی دنیا میں لا کھڑا کیا جہاں بَربَریت کا بازار گرم تھا، انسانوں کی آہ و بکا تھی اور انسانیت دم توڑتی نظر آرہی تھی۔ گویا جنگ سے پیدا شدہ منفی اثرات نے ہندستان کی عام فضا کو بُری طرح مکدّر کردیا تھا اس دور سے پیدا شدہ نتائج سے انسانی زندگی کے فکر وخیال میں جو تبدیلی رونما ہوئی اس نے انسانی قدار کو متاثر کیا، خانہ جنگی کے اس ماحول سے ادبی دنیا میں بھی انقلاب برپا ہونا یک لازمی عمل تھا۔ کیونکہ شاعر وادیب بھی سماج کا ایک فرد ہوتا ہے چونکہ فکری سطح پر وہ مام انسانوں سے زیادہ حساس واقع ہوا ہے اور معاشرتی وسیاسی سطح پر ہونے والے رحادثہ کو وہ جلد محسوس کرلیتا ہے اور پھر اپنے نوک قلم سے اس کا اظہار بھی کردیتا ہے۔ چنانچہ مرڈھیکر کی ذہنی اور ادبی فکر بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ کی جس کا ثبوت ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ "کانہی رکوتا" ۱۹۴۷ء ہے۔ "کانہی

کِوتا'' کی تمام نظمیں مذکورہ حالات کا صحیح عکس پیش کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔

اس مجموعہ کی نظموں نے آدمی میں رومانی سرشاری کی بجائے انسانی بیداری کی کیفیت پیدا کر دی لیکن اس مجموعہ کے منظر عام پر آتے ہی مرڈھیکر کے طرز اسلوب اور احساس فکر کی قدر دانی کچھ اس طرح ہوئی کہ تنقید نگاروں نے ہنگامہ برپا کرتے ہوئے اس کو فحش نگاری اور جذبات کو مشتعل کرنے والی بے ہودہ شاعری کا نام دیا۔ نتیجتاً سینسر بورڈ نے اس مجموعہ پر پابندی عائد کر دی اور مرڈھیکر پر فحش نگاری کا الزام لگاتے ہوئے مقدمہ چلایا۔ اگر چہ وہ بری ہوئے اور بعد میں یہی مجموعہ مراٹھی ادب میں سُر ریلزم کا پیش خیمہ قرار پایا اور اسی نے نئی مراٹھی شاعری میں مرڈھیکر کی شناخت کو قایم کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ''کاہی'' کوتا' کو ہی نئی مراٹھی شاعری کا سنگِ بنیاد تصور کرتے ہیں۔

مرڈھیکر کا تیسرا اور آخری مجموعہ چالیس نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ بعنوان ''آنکھی کانہی کوتا'' (अंख्ली कांही कविता) ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا جس نے نئی مراٹھی شاعری کی پیش رفت میں بڑا کامیاب رول ادا کیا۔ اسلوب اور طرز بیان کے لحاظ سے مرڈھیکر کی شخصیت کو وزن و وقار بخشنے میں ان کا یہ مجموعہ درخشندہ علامت بن گیا۔

متذکرہ تینوں مجموعوں کے پس منظر میں جب ہم مرڈھیکر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں جو چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کا حقیقت پسندانہ انداز ہے، ان کی شاعری جدیدیت کا نکتہ آغاز کہی جاتی ہے جس میں دوسری جنگ سے پیدا شدہ بھیانک اثرات کی کارفرمائی ہے۔ زندگی کی بے یقینی کا شدید احساس ہے اور جدید عہد کے مشینی تیک نے انسان کی حسّیات کو کس طرح متاثر کیا ہے، انسان کے رویہ اور مزاج میں جو تبدیلی رونما ہوئی اس کا خیال ہی ان کی شاعری کا محرک بنا۔ انھوں نے انسان کے دل کے نہاں خانوں میں جھانک کر ان کے درد کو محسوس کیا اور شاعری کے ذریعہ اس کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے۔

مرڈھیکر کی پوری شاعری تجربہ اور مشاہدے کی شاعری ہے جس میں زندگی کے نصب العین اور مقصدِ حیات کو اولیت حاصل ہے اگر چہ اپنی نظموں کی پیش کش

ں انھوں نے جو انداز اسلوب اختیار کیا ہے وہ دراصل علامتی اور استعاراتی ہے
س کو سمجھنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ ان کی غیر سطحی شاعری، انقلابی آواز
را چھوتے انداز نے مراٹھی شاعری میں کھلبلی تو ضرور مچا دی' باوجود اس کے وہ
اری کو اپنی طرف راغب کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ ان کی نمایندہ نظموں میں
پیپے میں مرا ہوا چوہا"۔ "کئی دنوں سے"۔ "میں ایک چیونٹی"۔ "ابھی تو پھول میں
وشبو ہے" اور کنپت واں وغیرہ ہیں۔

مراٹھی شاعری میں ان کی پہلی نئی نظم "پیپے میں مرا ہوا چوہا" عہد ساز کا درجہ
ھتی ہے جو ۱۹۴۵ء میں تخلیق ہوئی۔ یہ نظم دراصل ممبئی کے شہری کلچر میں انسانی زندگی
ی بے مائیگی کو ظاہر کرتی ہے، جس کو مرڈھیکر نے بڑے ہی خوبصورت رمزیاتی
نداز میں پیش کرتے ہوئے روایت شکنی سے کام لیا ہے۔

مرڈھیکر کی شاعری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اردگرد جو
احول دیکھا اس ماحول سے وہ کبھی فرار حاصل نہ کر سکے' چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سماج
سے حاصل شدہ مواد ہی ان کی شاعری کا محرک بن گیا۔ دولت مندی کی بنیاد پر
نھوں نے جب سماج کے انسانوں کو خانوں میں تقسیم دیکھا، غربت کا معصوم چہرہ
یکھا، مزدور کا استحصال دیکھا اور پیٹ کی خاطر محنت کش طبقے کو جب زندگی اور
موت کے درمیان لڑتے دیکھا تو وہ خاموش نہ رہ سکے اس خاموشی کو توڑتا ہوا ان کا
قلم غریبی یا سرمایہ داری کا طرف دار نہ بنا بلکہ محنت کش طبقے کے اوصافِ عالیہ کو
بیان کرتے ہوئے انھوں نے قاری کو یہ تاثر دینا چاہا کہ محنت ہی انسان کی دولت
طاقت اور عبادت ہے جس کے ذریعہ وہ بلند و برتر مقامات حاصل کر سکتا ہے۔ اس
پس منظر میں مرڈھیکر نے مراٹھی میں جو نظم تخلیق کی وہ ایک مزدور، جو انجن میں کوئلہ
جھونکنے کے کام پر مامور ہے اس کی زندگی سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھی گو کہ یہ نظم کئی
اشعار پر مشتمل ہے لیکن اختصار کے پیشِ نظر ہم چند اشعار کا خلاصہ پیش کرتے
ہوئے ان کے منفرد احساس کو ظاہر کرنا چاہیں گے جس سے مرڈھیکر کے جذبہ فکر کو
سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مرڈھیکر نے اپنے اچھوتے خیال کی پیشکش میں جس کردار کو تراشا وہ ہماری
اور آپ ہی کی دنیا سے مستعار وہ انسان ہے جو محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والا
ایک معمولی مزدور ہے اس کی دنیا سرمایہ دارانہ نظام کو چلانے والے ان انسانوں

سے مختلف ہے جن کے یہاں فارغ البالی ہے، عیش پرستی ہے اور دولت کی حکمرانی ہے گویا دولت ان کی دہلیز کی غلام ہے، اس کے برخلاف محنت کش طبقہ کو روز اوّل سے ہی روٹی کی فکر ہوتی ہے اور یہ سوال ایک سوالیہ نشان بن کر اس کو اپنے حصار میں لیے رہتا ہے، جس کے حصول میں وہ مختلف النوع قسم کی محنت ومزدوری کرنے پر مجبور ہے۔ گویا سماج کا محنت کش طبقہ کس طرح پیٹ کے خاطر زندگی کی جدوجہد میں منہمک ہے اس تاثر کی پیش کش میں شاعر نے ایک ایسے انسان کو خدا کا درجہ دیا ہے جو محنتی ہے، گوشت وپوست کا جیتا جاگتا صنعتی دور کا مزدور ہے وہ اس دنیا میں ہمارے ساتھ رہتا بھی ہے، اٹھتا بیٹھتا چلتا پھرتا بھی ہے اور ہنستا بولتا بھی ہے، شاعر نے اس معمولی انسان کو بھگوان شری کرشن سے تشبیہہ دے کر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ بھگوان مندروں، مسجدوں، گرجا گھروں، کلیساؤں یعنی عبادت خانوں میں نہیں بلکہ جدید دور کا بھگوان محنت کرنے والا انسان ہے کیونکہ محنت انسان کی پوجا ہے۔

نظم کے آغاز میں شاعر نے اس مزدور کے سراپے کو بیان کیا ہے جو انجن میں کوئلہ جھونکنے والا انسان ہے جس کے مضبوط گٹھیلے بازو لوہے کے بنے ہوئے ناگ کے مانند ہیں۔ سانپ، جب حرکت وعمل میں ہوتا ہے تو گھومتا ہوا چلتا ہے۔ بالکل اسی طرح کام کے دوران اس مزدور کے بازوؤں پر اُبھری ہوئی رگیں سانپ کے چلنے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اس کے پیروں کا اُوپری حصہ یعنی رانیں کالے گھنے اندھیرے میں فولادی ساگون (ایک قسم کی مضبوط لکڑی) کے چکنے اور سڈول تنے کے مانند معلوم ہو رہے ہیں۔

کوئلہ پھاوڑے کی مدد سے اُٹھا کر بھٹی میں جھونکتے وقت کا منظر دیکھ کر شاعر اس مزدور سے متاثر ہوتے ہوئے سوچتا ہے کہ وہ اتنا مشکل کام بھی بڑی مہارت وآسانی سے بغیر چوکے تیزی کے ساتھ آرام سے کر رہا ہے، چنانچہ شاعر اس کی فنکاری کا قائل ہو جاتا ہے۔

نظم میں سخت پتھر کے کوئلے اور بھٹی کا ذکر کرنا شاعر کے ایک مخصوص نظریۂ فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ کوئلہ بھٹی میں ڈالنے سے پہلے سخت ہوتا ہے۔ بھٹی کے سفر سے گزرتا ہوا ہی وہ راکھ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گویا کہ کوئلے کے سفر کی ابتدا تا انتہا کہانی ہمیں زندگی کا پیغام دیتی ہے۔ چنانچہ بھٹی کو دنیا اور کوئلہ کو زندگی سے تعبیر کیا جائے تو شاعر کے خیال کو سمجھنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے کہ حرکت وعمل ہی زندگی کی

علامت ہے گویا خود کو فنا کر دینا ہی زندگی کی منزل ہے۔ بالکل اس طرح کہ

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

جب بھٹی میں کوئلہ جلتا ہے تو ایک قسم کی پھٹ پھٹ کی آواز کوئلہ دہکنے کی ہوتی ہے اور کوئلہ دہکنے کے بعد جب آگ شباب پر آ جاتی ہے تو اس کی لو میں ہمیں مختلف قسم کے شیڈس نظر آتے ہیں۔ گویا کام میں منہمک مزدور کا پسینے سے شرابور ہلتا ہوا جسم بھی بھٹی کی روشنی میں چھایا اور پرکاش کا ایک حسین منظر دکھاتے ہوئے لطف اندوزی کا سامان مہیا کر رہا ہے، اور اس کے سر پر بندھا نہایت سفید رومال اس کی پیشانی کے تھوڑے سے پسینے کو جذب کرنے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ یہاں آگ کے شیڈس سے مراد تغیرات زندگی ہے جو دھوپ اور چھاؤں کی طرح انسان کے ساتھ ہے، سفید رومال علامت ہے ان اُجلے پوش انسانوں کی جو مزدور کے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت پر راج کر رہے ہیں۔

شاعر مزدور کے تمام حرکت و عمل کا جائزہ لینے کے بعد پانچویں بند میں یوں کہتا ہے کہ "نئے صنعتی دور کا یہ انسان بڑی محنت اور لگن سے اپنا کام کرنے میں مصروف ہے۔" گویا وہ کام نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جدید دور کا ڈانس کر رہا ہو۔ وہ خاموش، مستقل مصروفِ عمل رہنے سے پسینے میں تر ہو گیا ہے اس وقت، اس کے چہرے کے بھاؤ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ جیسے گوشت پوست کا جیتا جاگتا کالے سنگ مرمر کا کوئی مجسمہ ہے۔

آخیر میں شاعر کہتا ہے کہ۔ "اُوہ۔ وہ کالا کوئلے والا نئے زمانے کا بھگوان ہے اور یہی ہمارا شری کرشن بھگوان ہے۔ ہمارا گری دھر ہے۔" یہاں شاعر کی تخیل پروازی قابل غور ہے اور ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ آخر شاعر نے بھگوان شری کرشن ہی کو استعارہ کے طور پر کیوں استعمال کیا؟ ہندوؤں کے اور بھی بھگوان ہیں، شاعر نے شری کرشن کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ غور کرنے پر ایک بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ مہابھارت کی لڑائی میں شری کرشن نے ارجن کو شستروں سے نہیں بلکہ عقل سے لڑنے کی تعلیم دی تھی اور عقل کی پیروی میں عمل کا شامل ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ شاعر بھی انسان کو دنیا پر حکومت کرنے کے لیے عقل و عمل کی تعلیم دے رہا ہے۔

دوسرے جب ہم معنی کے اعتبار سے غور کرتے ہیں تو شاعر کا نظریہ اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے گری دھر بھگوان کا انتخاب کس مفہوم کے پیش نظ ہے۔ یہاں "گری" بہ معنی "پہاڑ" اور "دھر" بہ معنی "پکڑنے" کے ہیں۔ چنا "گری دھر" کا مطلب ہوا۔ "پہاڑ کو پکڑنے والا۔" یہاں پہاڑ سے مراد لی گئی "پریشانیاں" یعنی پریشانیوں کو پکڑنے والا۔ کون؟ شری کرشن۔

اس نظم کے ذریعہ شاعر جو تاثر دینا چاہتا ہے اس کے لیے یقیناً شری کر سے بہتر کوئی اور بھگوان اس کی دلیلوں کو پیش کرنے کے لیے مناسب نہ تھا اور اپنی دلیل کو باوقار اور پُر اثر بنانے کے لیے ہی شاعر نے بھگوان شری کرشن کو ن کیا۔

اس نظم میں ایک نکتہ اور بھی زیرِ غور ہے جو قاری کو شاعری کے خیال و نظریا سے منحرف کر سکتا ہے وہ یہ کہ انسان کو بھگوان کا درجہ دینا۔ اگرچہ یہاں شا مقصد کچھ اور ہی ہے۔ جدید دور کے انسان کو شری کرشن کے مدِ مقابل لانے برتر و بالا دکھانے کا مقصد اپنے خدا کی تحقیر و توہین کرنا شاعر کا مقصد نہیں بلکہ طاقت کے حوالے سے انسانی جذبات و احساسات کو بیدار کرنا اور محنت و جدو زندگی کا حاصل قرار دینا ہے کیونکہ یہ صنعتی دور بیداری کا دور ہے۔ چنانچہ پوری میں شاعر نے حرکت و عمل کی دعوت دیتے ہوئے، اس کو سراہتے ہوئے اور انسا بھگوان کا درجہ دیتے ہوئے صرف اور صرف انسانی فکر کو حرکت میں لانے کی کو کی ہے۔

مرڈھیکر نے طرزِ اظہار کے فرسودہ طریقوں سے انحراف کرتے ہو نظریے کی تبدیلی کے ساتھ ہیئت و اسلوب اور زبان و بیان کی سطح پر جو نیا اختیار کیا اس نے بلاشبہ مرڈھیکر کو نئی شاعری کی قیادت کا حق ادا کرنے والا شا دیا ہے۔ مراٹھی ادب میں اس کی شاعری نئی جدتوں، نئی ترکیبوں، نئی علامتوں ا شعوری کوششوں کی ترجمان ہے جس نے مراٹھی شاعری میں اُسے انفرادی حیثیا بخشی ہے●

صغریٰ مہدی
عابد ولا۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

(قسط نمبر ۲)

میخانوں کا پتہ

(سفرنامہ مکہ مدینہ شام ایران)

ارے وقت کا پتہ ہی نہیں چلا کہ کہاں اور کیسے گزر گیا، پھر سیڑھیوں سے اتر کر آب زمزم کا چشمہ دیکھا، آب زمزم پیا، منہ دھویا بہت سے نلوں کے ذریعہ آب زمزم سب کو سیراب کرر ہا تھا، لوگ اس کو برتنوں میں بھی بھر رہے تھے، آب زمزم پی کر اور منہ دھو کر عجب تازگی کا احساس ہوا، باہر نکلے تو چپلیں غائب، اس خانے میں کسی اور کی چپل رکھی تھی۔ شاید کوئی بھول گیا ہو کہ سب ایک طرح کی ہی چپلیں ہوتیں ہیں
ہوٹل آئے کھانا کھایا، نماز ادا کی اور پھر سو گئے۔ بہت سے لوگوں نے احرام نہیں کھولا تھا کہ وہ دوبارہ عمرہ کرنا چاہتے تھے، دوسرے دن صبح نماز شب کی اذان سے آنکھ کھل گئی، نماز ادا کی اور چاہا کہ خانہ کعبہ میں فجر کی نماز پڑھیں۔ باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ برابر کے کمرے والے ہمیں بند کر کے جا چکے ہیں کیونکہ تین کمروں کا سوئیٹ تھا۔ خانہ کعبہ کے میناروں کی طرف رخ کر کے دیر تک نمازیں پڑھتے رہے پھر سو گئے، سو کر اٹھے تو دس بج رہے تھے۔ اکیلے ہی باہر نکل گئے۔ یہ بہانہ کر کے کپڑے دھلنے دینا ہے، جو واقعی دینا بھی تھے۔ ہماری شلوار قمیص کو پاکستانی ڈریس لکھنے پر مصر حضرات سے یہ بحث ہوتی رہی کہ پاکستانی نہیں بلکہ ہندستانی لکھو۔ پھر خانۂ کعبہ کے اطراف چکر لگایا، حلیب کی چائے پی، کاغذ کے گلاسوں میں برگر کھایا، پیپسی پی، دکانوں کے سامنے برآمدے میں تھوڑی تھوڑی دور پر کھانے پینے کے اسٹال بنے ہوئے تھے۔ دکانیں بھی کھل گئیں تھیں جو انواع و اقسام کی چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دل چاہا کہ خانہ کعبہ میں چلا جائے مگر کھو جانے کا ڈر بھی اور یہ فکر بھی کہ

حبیبہ بانو فکر مند ہوں گی، سو کمرے میں واپس آ گئے۔

تین بجے شام، شہر مکہ اور مقامات کی زیارت کا پروگرام تھا۔ دو اسٹیشن ویگن میں بھر کر ہم سب لوگ چلے نئے شہر سے نکل کر پرانے شہر رسول اللہؐ کا گھر،

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ

پھر وہ غار جہاں آپ نے ہجرت کے وقت پناہ لی تھی ۔ مزدلفہ میدان عرفات۔ وہ اونچی پہاڑی جس پر بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر جایا جاتا ہے، جہاں حضرت آدمؑ کی دعا قبول ہوئی تھی۔ کنکریاں چننے کا عمل اور پھر ان کو مارنے کا لطف سب لوگوں نے خوب اٹھایا، منظر عباس صاحب بس میں بیٹھے یہ کہتے رہے کہ ارے اپنے اندر کے شیطان کو مارو، اسے زیر کرنے کی ضرورت ہے، پھر غار حرا کا نظارہ نیچے سے کیا۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

اس پہاڑی کے نیچے جو بازار تھا اس کی دکانوں اور ہوٹلوں کا نام حرا پر تھا، حرا ہوٹل حرا ڈرائی کلیننگ، وہاں سے چلے تو ہمارے قافلہ سالار نے ایک امریکن طرز کے مول میں لا کھڑا کیا جو کعبہ کے اطراف ہی میں تھا جہاں سے ہم پیدل اپنے ہوٹل آ گئے۔ شیشے کی بلند و بالا عمارت، ہر چیز شیشے کی ایکسلیٹرز طرح طرح کی امریکن کھانے کی چیزیں سوفٹ ڈرنکس باہر کی چیزوں سے بھری ہوئی دکانیں ہم ایک پر رکے اور کولڈ ڈرنک پی تو ایک عرب نوجوان امریکن ہیروں کے لباس میں مجھے سر ڈھکنے کی تلقین کر رہا تھا جو اکثر بے خیالی میں کھل جاتا تھا۔

اکبر الہ آبادی نے کہا تھا

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

ہم تو کعبہ کے پاس کھڑے خدا کا گھر بھی دیکھ رہے تھے اور اس کی شان بھی، زرا دم لے کر کھانا کھایا اور میں نے سنجیدہ اور حبیبہ نے خانہ کعبہ پہنچ کر نماز ادا کی۔

حجر اسود کو بوسہ دیا اور رات کو بارہ بجے ہوٹل پہنچے۔ آنکھ فجر کی اذان سے کھلی، کھڑکی سے کعبہ کی زیارت کو سر نکالا تو دیکھا ابر رحمت گھرا ہوا تھا لگتا تھا بارش آیا چاہتی ہے نماز پڑھی، تلاوت کی ، دعائیں پڑھیں دعائیں مانگیں۔ لمبی فہرست تھی دعا منگوانے والوں کی، پھر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتے رہے!

آج سب کا خریداری کا موڈ تھا مگر اپنا دل خریداری سے ہٹا ہوا تھا۔ باہر بارش بھی ہو رہی تھی، ہلکی ہلکی بوندا باندی، زیادہ وقت کمرے پر ہی رہے۔ سامان سمیٹا اور پھر ہوٹل کے نیچے ایک دکان سے ایمرجنسی لائٹ خریدی اور اذان والی گھڑی، ان عزیزوں کے لیے جو ایسی کالونیوں میں رہتے ہیں جہاں اذان کی آواز نہیں آتی۔ دیر تک قافلہ سالار کا انتظار کرنے کے بعد ہم دونوں کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ شام ہوتے کعبہ کو گئے۔ الوداعی طواف کے لیے راستہ میں وہ سامان خورد ونوش کے ساتھ دوسری اور چیزیں اور سامان لاتے ہوئے ملے مگر ہم نے ان کو اپنے ساتھ آنے کی تکلیف سے بچا لیا۔ نماز مغرب کے بعد الوداعی طواف کیا ایک نظر صفا اور مروہ پر ڈالی۔ مقام ابراہیم پر نماز ادا کی اور خانہ خدا کو خدا حافظ کیا کہتے بس ایک الوداعی نظر ڈالی اور نکل آئے۔ لوٹتے وقت میں نے اور حبیبہ بیگم نے سوچا کہ کسی پاکستانی ہوٹل میں کھانا کھایا جائے جس کے لیے دس ریال میں اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ کر لے آئی تھی . . ایک ہوٹل مل گیا دس ریال میں قورمے کی ایک پلیٹ اور روٹی اور سلاد مفت، ہم نے فوراً آرڈر دے دیا۔ مزے سے کھانا کھایا اور جب پیسے دیے تو اس نے حیرت سے منہ دیکھ کر کہا کہ یہ ایک ریال ہے!

اب کیا کریں اس نے ہماری حالت دیکھ کر کہا کوئی بات نہیں ہے! نہیں ہم ابھی آپ کو باقی پیسے لا کر دیتے ہیں۔ ہوٹل گئے تو کمرے بند تھے۔ سب باہر تھے اب کیا کریں صبح روانگی تھی حبیبہ کا کہنا تھا کہ صبح دے دیں گے. مجھے یہ خیال تھا کہ صبح نہ معلوم ہوٹل کب کھلے اور ہم کب چلے جائیں اس لیے ہوٹل کے نیچے اس دکان پر پہنچی جہاں سے ایمرجنسی لائٹ لی تھی اور اس سے روئداد بیان کی۔ اس نے فوراً دس ریال دے دیئے اور میں پھر ہوٹل گئی اور پیسے ادا کیے تو جان میں جان آئی، واپس آئی تو ہمارے ساتھی آ گئے تھے، اگلی صبح اذان فجر سے آنکھ کھلی۔ دیر تک

اذان کو سننے کا لطف لیتے رہے کہ خانہ کعبہ کی اذان آخری دفعہ سن رہے تھے،

مکہ سے جدہ پہنچے تو دس بج رہے تھے۔ وہاں سے سیرین ائیر لائنز سے دمشق جانا تھا اور اب ذہن دمشق اور شام میں واقع مزاروں اور مقامات زیارت کا نشہ پھرنے لگا جلدی ہی دمشق پہنچ گئے، چھوٹا سا مگر صاف ستھرائی وضع کا ائیر پورٹ تھا، جہاں دو گھنٹے بیٹھنا پڑا کیونکہ .. ہمارے آنے پر ایجنسی کا آدمی ہمارے پاسپورٹ لے کر گیا اور ویزا لایا، ساتھ میں ایک شاندار بس بھی۔ اب ہم دمشق کے جدید علاقے سے گزر رہے تھے جو کسی بھی ویسٹرن ملک کی طرح لگ رہا تھا۔ لمبی لمبی کشادہ سڑکیں، بلند و بالا عمارات، اس کے بعد پرانے دمشق میں بلایاہ سیدہ زینبؑ پہنچے جہاں حضرت زینبؑ کا مزار ہے، جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف سودا بیچنے والوں کا اژدہام تھا۔ ایجنسی نے جس ہوٹل کا انتظام کیا تھا وہ ہمارے قافلہ سالار نے کسی وجہ سے رد کر دیا اور عین بازار میں ایک روایتی مسافر خانہ میں سرائے میں لا اتارا جو تین منزل پر تھا ... اس مسافر خانے میں ٹھہرنا شروع میں تو ناممکن لگا اور میں نے سوچا کہ ہم اسی ہوٹل میں چلے جائیں، مگر حبیبہ بانو کو پس و پیش میں دیکھ کر میں نے ارادہ ملتوی کیا اور اسی میں کسی نہ کسی طرح رہنے پر خود کو راضی کر لیا۔ صبح اٹھ کر حضرت زینبؓ کے مزار پر حاضری دی، بہت شاندار مقبرہ تھا۔ ایرانی طرز کی عمارت نیلی اور سفید پچی کاری کے در و دیوار، ضریح کی جالی، چاندی سونے کے گنبد تھے۔ ضریح کی ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں تھیں۔ خواتین نے جس میں پاکستانی خواتین بھی شامل تھیں مجلس بپا کر دی اور خوب گریہ و بکاء ہوا، میرے منہ پر تو برابر ناصر جہاں کے سلام کا یہ مصرعہ یاد آ رہا تھا ۔

سلام کرتے ہیں ہم اپنی شاہزادی کو

ایرانی خواتین کمال فاطمہ کی پیشانی چوم رہی تھیں۔ تبرک بانٹے جا رہے تھے سامنے ایک بیز لگا ہوا تھا جس میں عربی میں لکھا ہوا تھا سیدہ زینبؑ کو ان کی والدہ کے یوم ولادت کی مبارک باد دیجیے مگر وہاں مبارک اور خوشی کے بجائے حزن کی کیفیت چاروں طرف چھائی ہوئی تھی، وہ پورا دن ہم نے مزار پر ہی گزارا، البتہ دوپہر کے کھانے کے لیے تھوڑی دیر کو باہر گئے۔ لوگوں کا بے حد مجمع تھا۔ د

وعریض برآمدے کے کونے میں الماریوں میں جوتے رکھنے کا انتظام تھا۔ وہیں پر ٹھنڈے پانی کے فلز رکھے ہوئے تھے۔ کچھ بچے ڈیوٹی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی شرارت کرنے لگتے۔ ہنسی مذاق کرتے مگر اپنی ڈیوٹی ذمے داری سے نبھا رہے تھے۔
رات کو کھانے سے پہلے ہمارے مسافر خانے میں محفل جمی جس میں زوّار صاحب نے زبانی قصیدہ حضرت فاطمہؑ کی شان میں پڑھا۔ منظر عباس صاحب نے آپ کی سیرت پر روشنی ڈالی اور اس کے بعد فیرینی پر نذر ہوئی۔ ہمارا قیام یہاں چھ یوم تھا۔ اس میں شام بھی جانا تھا اور یہاں کی باقی زیارت گاہوں کی زیارت کرنا تھی۔ یہاں پر فرانسیسی اثرات آ رہے تھے۔ Titanic کے اشتہارات جا بجا لگے تھے۔ جینز اور اسکرٹ میں بھی لڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں کی کرنسی کو لیرا کہا جاتا یا سور یا پونڈ۔ زبان کا مسئلہ سخت تھا چیزوں کے دام پوچھو تو یا تو دکان دار انگلیوں کے اشارے سے بتاتے یا کیلکلیٹر پر جوڑ کر اسے سامنے کر دیتے۔ ہمارا مسافر خانہ عین بازار میں تھا۔ ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا، صبح کے وقت سب سے زیادہ ہجوم تندور پر ہوتا جہاں لمبی لمبی روٹیاں پکتی ہوتیں۔ وہاں سے لوگ ان کو خرید کر کاندھوں پر ڈال کر لے جاتے۔ ان میں زیادہ تر ہوٹل والے ہوتے۔ ہر جگہ روٹیوں کی ریل پیل تھی۔ کبھی لوگ سرکے میں پڑے زیتون سے کھاتے، کبھی کھیرے سے، کبھی تربوز سے، ہوٹل باہر سے قصائی کی دکان لگتے جہاں تندور گرم رہتے مگر دوپہر تک سب ٹھنڈے ہو جاتے اور پھر شام ہوتے جلتے اور رات گئے کھلے رہتے۔ لوگ فٹ پاتھ پر بھی نذر جو چھوٹے چھوٹے مجبہ خانوں میں دیتے، نہ دودھ نہ شکر ہوٹل میں روٹی ہر جگہ مفت ملتی۔ ایک نان کے کئی ٹکڑے کر کے ان کو ٹوکریوں میں رکھ دیتے، کبابوں کی مار تھی۔ سیخ کباب ہر جگہ ملتے تھے اور روسٹ مرغ بھی مگر اس کے ساتھ سلاد وافر مقدار میں ہوتی۔ تیسرے دن ہم لوگ صبح ہی شام کے لیے روانہ ہونے پر، پہلے شام کے نئے علاقے سے گزرے اور پھر پرانے شام گئے جہاں بس تو ایک طرف رک گئی۔ ہم لوگ اس بازار شام میں پہنچے جہاں سے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کے خاندان کے لوگوں کو برہنہ پا برہنہ سر زنجیر بستہ کر کے یزید کے دربار میں لے جایا گیا تھا۔ کورڈ مارکیٹ تھی۔ اس کے دو رویہ دکانیں تھیں۔ بازار میں داخل ہونے

سے پہلے ایک شخص الف لیلوی لباس میں ایک بڑا سا نقشین سماوار لے کر ایک نقشین کٹورہ لیے کوئی شربت بیچ رہا تھا۔ بازار طرح طرح کی چیزوں سے پٹا پڑا تھا مگر سب کے ذہنوں میں کوئی اور ہی نقشہ تھا۔ کسی کی توجہ بازار کی طرف نہیں تھی۔ نہ کسی چیز میں کشش محسوس ہو رہی تھی۔ کافی دور چل کر ایک وسیع اور عریض پکی عمارت پر نظر پڑی۔ ہمارے گائڈ مولوی صاحب بتا رہے تھے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے کی عمارت ہے، یہاں ایک کنواں بھی ہے جہاں عیسائی حضرات نوزائیدہ بچوں کو لا کر یہاں کا پانی پلاتے ہیں۔ بڑے سے گیٹ سے ایک برآمدے میں پہنچے۔ وہاں سے کھلے صحن میں جہاں ایک مقام پر جالی لگی تھی۔ یہ مقام وہ تھا جہاں حضرت سید سجادؑ نے خطبہ دیا تھا تھوڑی دور پر پھر اسی طرح کی جالی سے ایک مقام کو گھیر دیا تھا یہ وہ مقام تھا جہاں حضرت زینبؓ نے خطبہ دیا تھا۔ آنگن کو پار کر کے عمارت کے اس حصے میں گئے جہاں اوپر یزید بیٹھتا تھا اور نیچے ایک چبوترہ سا بنا دیا گیا ہے اور چاروں طرف جالی لگا دی گئی ہے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں امام حسینؑ کے خاندان والے کھڑے ہوئے تھے!

مجھے ان کے مرثیے کے بند یاد آ رہے تھے۔

آمد آمد حرم شاہ کی دربار میں ہے
صبح سے جشن کا غل شام کے بازار میں ہے
صحبت عیش و طرب مجلس غدار میں ہے
شور فریاد و بکا عترت اطہار میں ہے
نوبتیں بجتی ہیں دشمن تو خوش ہوتے ہیں
فاطمہ پیٹتی ہیں شیر خدا روتے ہیں
آگے آگے تو ہیں سجاد جھکائے ہوئے سر
پاؤں بیڑی میں، گلا طوق میں، گردن میں رسن
مثل خورشید فلک شرم سے لرزاں ہے بدن
چاک ہے غم میں گریباں قبا تا دامن

بیٹھ جاتے ہیں تو جھنجھلا کے اٹھاتے ہیں لعین
بوڑیاں نیزوں کی شانوں میں چبھاتے ہیں لعین

میں تادیر کھڑی اس منظر کو دیکھتی رہی جس کی منظر کشی ان شعروں میں ہے
تھوڑی دیر بعد برآمدے سے ہوکر اس حجرے میں گئے جو خانۂ عابد کہلاتا ہے اور اسی
طرف سے راستہ اس قید خانہ کو جاتا تھا جہاں یزید نے خاندان رسالت کو قید کیا تھا۔
جب قید خانہ سے یزید حضرت عابدؑ کو بلاتا تھا بات چیت کرنے کو آپ یہاں بیٹھ کر
عبادت کرتے تھے۔ پھر جب یزید کا بلاوا آتا تو آپ عبادت موقوف کرکے اس کے
پاس جاتے۔ آپ اس انتظار کے وقفہ کو بھی عبادت کرکے گزارتے۔ اسی میں ایک
کونے میں ایک جگہ پر جالی لگی تھی۔ وہاں کہا جاتا ہے کہ امام حسینؑ کا سر لا کر رکھا گیا
تھا۔ وہاں سے نکل کر قید خانے گئے جہاں پر ایران حکومت نے بہت خوبصورت
شاندار حضرت سکینہؑ کا مقبرہ بنا دیا ہے۔ جو حضرت رقیہؑ کے نام سے مشہور ہیں
وہاں جا کر ہماری ساتھی خواتین نے مجلس بپا کی اور گریہ وبکا کا سلسلہ شروع ہوا تو
رکنے ہی میں نہیں آتا تھا۔ میرے ذہن میں بھی نوحے کا وہ شعر یاد آرہا تھا کہ۔

زمیں سے تابہ فلک شور ہے زمانے میں
سکینہ مر گئیں گھٹ گھٹ کے قید خانے میں

وہاں سے نکلے تو آنکھیں پُرنم اور دل بھاری تھے۔ دن ڈھلے اور زیارت
گاہوں پر گئے۔ کچھ صحابیوں کے مزاروں پر حضرت ام سلمیٰؓ اور حضرت ام حبیبہؓ کے
مزاروں پر فاتحہ پڑھا۔ اس سے ملحق ایک بہت بڑا قبرستان ہے جہاں حضرت بلالؓ
کی قبر ہے۔ حضرت اُم کلثومؑ حضرت فاطمہ صغریٰؑ اور حضرت فضہؓ کے مزار ہیں۔
ہاں سے چلے تو ایک زیارت گاہ پر گئے جہاں سب شہیدان کربلا کے سر رکھے گئے
تھے اس سے ملا ہوا ایک برآمدہ تھا۔ جہاں حضرت عابدؑ سب خاندان والوں کے
ساتھ بیٹھے تھے۔ سامنے ایک کنواں تھا ہمارے سب ساتھی اس کمرے میں چلے گئے
جہاں شہیدوں کے سر لا کر رکھے گئے تھے۔
سب تو مجلس کرنے لگے، میں اس برآمدے میں آ گئی جہاں مولانا بتا رہے
تھے کہ یہاں بیٹھ کر جناب سجادؑ برابر عبادت کرتے رہتے۔ میرا دل بھر آیا اور میں نے

وضو کر کے نماز پڑھی اور خدا سے بس یہ دعا کی کہ مجھے حضرت سید سجادؑ کے ذوق عبادت کا ایک ذرہ ایک شمہ عطا کر دے۔ وہاں نماز پڑھ کر مجھے بہت لطف آیا... اور ساری تھکن اتر گئی دل کو ایک طمانیت کا احساس ہوا۔ دوسرے دن ہابیلؑ کی قبر دیکھنے جانا تھا۔ کچھ لوگ پہاڑ پر جانے کے خیال سے پریشان تھے۔ میں نے حبیبہ کو منع کیا کہ وہ بھی نہ جائیں کہ وہ ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہیں اور بھی دو ایک لوگ نہیں گئے، اس لیے ذرا نسبتاً چھوٹی بس لی گئی اور ہم لوگ چل پڑے۔ میدانوں سے گذر کر پہاڑوں پر چڑھنا شروع کیا۔ خوبصورت مناظر تھے۔ منظر عباس صاحب مناظر کی باآواز بلند تعریف کر رہے تھے اور خواتین گھبرا رہی تھیں۔ بعض وقت بس بہت تنگ راستے سے گزرتی تھی۔ تو یا علیؑ یا علیؑ کی آوازیں بلند ہوتیں غرض خوب مزہ آیا آخر کو ایک جگہ آبادی نظر آئی۔ وہیں ایک چھوٹی سی عمارت میں وہ قبر تھی۔ ہم نے فاتحہ پڑھا، برآمدے میں نماز عصر ادا کی اور باہر نکلے تو دیکھا بہت سے لوگ شہر سے آکر یہاں پکنک منا رہے تھے۔ بچے کھیل رہے تھے۔ جینز اور بلاؤز میں لڑکیاں گھوم رہی تھیں تھوڑی دیر ہم بھی وہاں ٹہلے اور پھر چل دیئے۔ جو لوگ اوپر چڑھنے سے گھبرا رہے تھے وہ اُترنے میں اس سے زیادہ گھبرائے۔ ہمارے ایک ساتھی محمد رضا تو خفا بھی ہونے لگے۔ بارے اُتر آئے شام کا وقت تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا ہم دیہاتی علاقوں سے گزرتے پھر جگمگاتے شہر میں آ گئے، جہاں روشنیوں سے دن کا سماں تھا ڈرائیور نے ایک مسجد کے قریب بس روک دی اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ پانی لینا ہے، پھر مولانا نے بتایا کہ اندر اندر سیڑھیاں اتر کر ایک کنواں ہے جو حضرت علیؑ نے کھودا تھا، وہاں نلوں کے ذریعے پانی آتا ہے، یہ سننا تھا کہ سب آگے پیچھے بھاگے، سب نے پانی پیا، منہ دھویا، میں نے دیکھا سب تازہ دم تھے۔ وہاں سے چل کر پھر قصباتی آبادی میں آئے، جہاں کی چوڑی گلیوں میں سے گزر کر ہماری بس تھوڑی سی اونچائی پر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ یہاں اصحاب کہف کا غار ہے تھوڑی دور چل کر ایک عمارت آئی۔ اسی کے ایک کونے میں یہ غار تھا۔ جس میں ایک چھوٹے سے دروازے میں ہو کر جاتے ہیں۔ غار میں بجلی کی روشنی ہو رہی تھی ہم سب نے باری باری اس غار کو دیکھا اور قرآن شریف میں

جو اصحاب کہف کا قصہ ہے مع اپنی سب تفصیلات کے یاد آ گیا، نو چندی جمعرات تھی اس لیے گائڈ مولوی صاحب نے کہا کہ آج ضرور حضرت سکینہؑ کے مزار پر جانا چاہیے۔ مگر آج اس قدر رش تھا کہ وہاں داخل ہونا بہت مشکل اور نکلنا اس سے بھی زیادہ کٹھن تھا۔ بہر حال اندر گئے۔ میں نے دور سے فاتحہ پڑھا۔ ..نماز پڑھنے کی کوشش کی جس میں ناکامی ہوئی۔ رات کو نو بجے اپنی جائے رہائش پر پہنچے،

۱۶ را کتوبر کی شام کو ہمیں ایران کے لیے روانہ ہونا تھا اس لیے صبح حضرت زینبؑ کے روضے پر گئے۔ الوداعی نماز پڑھی۔ مجلس ہوئی دو پہر کو سامان باندھا اور پانچ بجے ایمبسی کی گاڑی میں المطار (ائیر پورٹ) روانہ ہو گئے۔ دمشق سے تہران ڈھائی گھنٹے کی اُڑان تھی، ایرانی ہوسٹس کالی عبا اوڑھے بہت مستعدی سے میز بانی کرتی رہی ایک بجے رات کو تہران پہنچے وہاں کے وقت کے مطابق، مگر دن کا سماں تھا۔ مراحل سے گزر کر باہر آئے تو قافلہ سالار نے یہ راز کھولا کہ یہاں رکنا نہیں ہے بس باغ خراساں میں سامان رکھ کر تھوڑا سامان لے کر قم کے لیے روانہ ہونا ہے۔ کچھ لوگ بس میں کچھ ٹیکسی میں باغ خراساں آئے۔ ہم نے تو اپنا سامان وہیں سے ایک سوٹ کیس میں کر لیا تھا... ...دوسرا سوٹ کیس ایک طرف رکھ دیا تو ہوٹل کے مالک نے ایک کمرہ کھول دیا کہ وہاں ذرا آرام کر لیں، باقی لوگ سامان نکالتے اور رکھتے رہے۔ جب قم کے لیے روانہ ہوئے تھے سب نیند سے بے حال مگر میں بس کے پردے ہٹا ہٹا کر باہر کے مناظر دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ ایک جگہ بہشت زہراؑ لکھا دیکھا تو ناصرہ شرما کی ناول کا خیال آیا۔ صبح چھ بجے ہم قم پہنچ گئے۔ خوبصورت سا چھوٹا سا شہر سامنے معصومہ قم کا ایرانی طرز کا مقبرہ نظر آ رہا تھا۔ آگے بڑھے تو کالے کالے عمامے پہنے حضرات جاتے دیکھے۔ پل پار کر، سڑک کو پار کر کے ایک کشادہ گلی میں گئے تو وہاں کے مہمان خانہ سعدی، مہمان خانہ شیرازی . مہمان خانہ طاہری نظر آئے، ساتھ میں مدرسوں کے بورڈ بھی لگے تھے۔ ہمارا پڑاو مہمان خانہ طاہری کے دو بند برآمدوں میں ہوا جس کا باتھ روم وغیرہ مشترک تھا وہ بھی نیچے جا کر کئی سیڑھیاں چڑھ کر۔

یہاں چھولس اور امروہے کے کئی نوجوان زیر تعلیم تھے۔ ان کے رشتہ

داروں اور عزیزوں کو ان کی تلاش ہوئی کہ ان سے قیام وطعام اور زیارات میں مدد لیں۔ وہ سب ان کو فون پر مطلع کرنے چلے گئے کہ ہم آ گئے ہیں۔ میں اور حبیبہ بیگم ناشتے کے بعد نکلے تو بازار کا ایک چکر لگایا، حلویات کی بھرمار تھی۔ حلوۂ قم میں کھا چکی تھی بہت مزے کا ہوتا ہے۔ اپنے حلوہ سوہن سے ملتا جلتا مزہ ہوتا ہے، وہیں ہمیں ایک دو منزلہ ہوٹل ''زیبا'' نظر پڑا۔ وہاں پہنچے تو اس کے مالک نوجوان کمال احمد پہلے تو ہمیں پاکستانی سمجھ کر اکھڑے اکھڑے رہے مگر جب ہم نے کہا ہندی ہیں تو خوش ہو گئے۔ بولے بارک اللہ، بارک اللہ اور بولے موسیٰ بھائی نے آپ کو ہمارا پتہ بتایا ہوگا .... بمبئی کا موسیٰ بھائی ہم نے فوراً کہاں ہاں۔ ہاں وہی۔ حبیبہ میرا منہ دیکھنے لگیں۔ انھوں نے ہمیں ایک کمرہ دکھایا جس میں دو پلنگ بچھے تھے۔ بہت چھوٹا سا بستر بھی صاف تھا۔ ایک میز تھی.. باتھ روم یہاں بھی مشترک تھا مگر کم از کم مردانہ اور زنانہ الگ الگ تھا۔ یہ مہمان خانہ طاہری سے بہت قریب تھا۔ ہم نے اپنے قافلہ سالار سے اجازت بلکہ ان کی مدد سے ایک کمرہ لے لیا پھر نہا دھو کر معصومہ قم کے مزار پر گئے۔ یہاں بہت ہجوم تھا. کئی دروازے تھے، جس دروازے سے گئے تھے وہیں سے واپس آنا تھا، ضریح تک بہت مشکل سے پہنچے۔ نمازیں ادا کیں، مگر شام ہوتے ہوتے مجمع بڑھ رہا تھا۔ وہاں ایک پاکستانی نوجوان لڑکی ملی جو وہاں سے فقہ پڑھنے آئی تھی۔ وہ بتا رہی تھی کہ امام رضا علیہ السلام کی یہ بہن کتنی عالم فاضل تھیں!

...کس طرح آپ لوگوں کو درس دیتی تھیں اور مذہبی مسائل کی گتھیوں کو پانی کر دیتی تھیں۔ ان کے فیض سے یہاں کتنے لوگ علم حاصل کرتے آئے ہیں۔ اس کو عالموں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس پر کچھ حیران نظر آئی کہ ہندستان کے اتنے زائرین یہاں آتے ہیں، دوسرے دن امام زادوں کے مزاروں پر گئے۔ میں کچھ پر اُتری اور کچھ پر نہیں بلکہ وہاں کے بازار اور آنے جانے والوں کو دیکھتی رہی ... چونکہ یہاں بھی زبان کا مسئلہ تھا اس لیے اتر کر ان سے گفتگو کے خیال کو ترک کیا۔

اک شام میں اور حبیبہ ہوٹل کے پاس کسی کھانے کی جگہ کو ڈھونڈ رہے تھے

ایک جگہ نظر آیا " سالن جلو کبابی" ہم نے کہا چلو چلیں ڈھنگ سے کھانا کھائیں گے۔ جلو کبابی سے تو واقف تھے کہ یہ ایک ایرانی ڈش ہوتی ہے۔ ممانی[1] جان نے بتایا تھا کہ بہت مزے کی ہوتی ہے۔ ابلے چاول گرم گرم پر ایک مکھن کی ٹکیہ اور انڈا ڈال کر ملا دیئے ہیں پھر اس پر سیخ کے کباب جنھیں وہ شیش کباب کہتے ہیں رکھ کر سلاد سے کھاتے ہیں ...... بہر حال ہم لوگ سیڑھیاں اتر کر پہنچے۔ ایک ادھیڑ عمر ایرانی بیٹھا تھا اس نے دیوار کی طرف اشارہ کیا جہاں سب کھانوں کی تفصیل مع قسموں کے لکھی تھی مگر سالن کا ذکر نہیں تھا۔ ہم نے جلو کبابی کا آرڈر دیا، کھایا خاصے مزے کی تھی مگر انڈا اور مکھن نہیں تھا۔ بعد میں معلوم کہ سالن کے معنی "ہال" کے ہیں۔ بیضہ مرغ اور تخم مرغ کا کنفیوزن بھی چلتا رہا۔

۱۹ اکتوبر کو صبح ہی بذریعہ بس تہران روانہ ہوئے جہاں بہت ہی اونچی پہاڑی پر حضرت بانو کا مقبرہ تھا ۔ ... تہران کے بازاروں سے گزرتے ہوئے ہم پہاڑی پر بذریعہ بس پہنچے۔ اونچائی پر بس ایسے جا رہی تھی جیسے ہوا میں اڑ رہی ہو۔ نہایت عمدہ سڑک تھی اور ٹریفک بھی کم تھا، بس سے اتر کر بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر مزار پر پہنچے جہاں زیادہ مجمع نہیں تھا۔ خواتین نے فوراً مجلس شروع کر دی ... . مگر حسب عادت مجلس کو مکمل کیے بغیر اٹھنا پڑا۔ امروہے کی بھولی بھالی عورتیں نہایت گریہ وزاری کے ساتھ حضرت شہر بانو کو شہیدان کربلا کا پرسہ دے رہی تھیں اور دل بھر کر مجلس پڑھنے اور گریہ نہ کرنے کا شکوہ کر رہی تھیں۔ قافلہ سالار کو زیادہ سے زیادہ مقامات کی زیارت کرانے کی فکر تھی!

کئی جگہوں کی زیارتوں کے بعد جس میں ایک شہزادی زبیدہ کا مزار بھی تھا ہم ایک امام زادے شاہ عبدالعزیزؒ کے مزار پر پہنچے جو ایک باغ میں واقع تھا جس میں پتھروں کی بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ لوگ یہاں پکنک کو آئے ہوئے تھے۔ نوعمر لڑکیاں جینز اور نئے فیشن کے جوتے پہنے عبا اوڑھے، ہاتھ میں ہاتھ [illegible] لے گھوم رہی تھیں۔ کچھ زیارت کے لیے مزار کی طرف چلے گئے کچھ باغ خراسان روانہ ہو گئے کہ وہاں سے کچھ سامان لانا اور رکھنا تھا۔ میں بس میں بیٹھی باہر کا نظارہ دیکھتی رہی، ڈرائیور جو کہیں چلے گئے تھے آئے اور بس سے نہ اترنے کی وجہ پوچھنے لگے۔ میں

---

[1] ممانی عابد حسین

نے خرابی طبیعت کا عذر کیا تو معاف کر دیا مگر پھر اشارہ کیا، مطلب تھا سر تو ڈھکو، میں نے جلدی سے سر اوڑھ لیا جو اکثر بے خیالی میں کھل جاتا تھا جس کی بدولت دوران سفر بے حد ڈانٹیں کھائیں، ایک دفعہ حبیبہ کا برقعہ لے کر پہنا مگر وہ بھی سرک جاتا اور بال نظر آ جاتے، بال نظر آنا سخت جرم تھا۔ اس میں مکہ کی شرط تھی نہ مدینہ کی نہ عراق نہ ایران کی۔ ہاں سیریا میں اس طرح کی سختی نہ تھی وہاں سے ہم ایران کے جگمگاتے بازاروں سے ہوتے ہوئے ایک قصبہ میں پہنچے جہاں پر امام خمینی کا گھر تھا اور دفتر بھی کانفرنس ہال اور میوزیم ویڈیو پر ان کی بیماری اور موت کا کیسٹ بھی دیکھا، خواتین نے وہاں بھی مجلس بپا کی اور پھر ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ رات ہو چکی تھی مگر دن کا سماں تھا... شہر سے نکل کر بس تیزی سے قم کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں ایک جوشیلے نوجوان کوثر صاحب امام خمینی اور انقلاب ایران کے بارے میں بتاتے رہے کہ وہ کس ایران میں انقلاب لائے ایک دم روشنیاں نظر آنے لگیں۔ ...معلوم ہوا کہ یہ امام خمینی کا مقبرہ ہے بہت شاندار وسیع اور جگمگاتا ہوا۔ باوجود تھکن کے سب اتر گئے۔

کھلے خطوط

ناصرالدین انصار
P O MANA 444106
Distt.Akola

غالب کا ایک شعر

کتاب نما کے سابقہ دو شماروں میں غالب کے ایک شعر کی قرأت پر بحث چلی ہے اور زیر بحث شعر کی قرأت کے دو مختلف نمونوں کی تائید میں اہل علم و نظر کے دو گرانقدر مقالات بھی شائع ہو چکے ہیں۔ شعر کی دونوں قرائتیں اس طرح ہیں۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو کر رہا ہو جایئے!

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے کنج قفس
از سر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے

شعر میں بحث کے جو نکات متعین کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ آیا مصرعہ اولیٰ میں "تنگ بال و پر" درست ہے یا "تنگ بال وپر" اور مصرعہ ثانی میں "زندگی ہو کر رہا ہو جایئے" برمحل ہے کہ "زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے" مناسب محسوس ہوتا ہے۔ اس بحث میں تاریخی ماخذ کو بھی خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔

جناب انوار رضوی صاحب نے شعر کی بحث اٹھاتے ہوئے دیوان غالب کے مختلف ایڈیشنوں سے استناد و استدلال کرتے ہوئے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مصرعہ اولیٰ میں "تنگ بال و پر" اور مصرعہ ثانی میں "زندگی ہو کر رہا ہو جایئے" کے الفاظ و تراکیب غالب کے اصلاح شدہ ہیں جبکہ جناب نثار احمد فاروقی صاحب شعر کی اسی قرأت کو درست سمجھتے ہیں جو دیوان غالب مرتبہ مالک رام و دیگر متداول دواوین میں اس ہیئت میں ملتا ہے۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر یہ ہے کنج قفس
از سر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے

یہاں زیر بحث شعر کو تاریخی ماخذ کے اختلافات اور تحقیقی پہلو سے قطع نظر اس کے اسلوبیاتی پہلو، الفاظ و تراکیب کے مفاہیم پر توجہ دے کر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو نہ صرف یہ کہ شعر کی قرأت و ہیئت سے متعلق رہنمائی ملتی ہے بلکہ شعر کا مفہوم بھی بہتر انداز میں نکل سکتا ہے جو صحیح قرأت اور متن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مصرعہ اولیٰ پر غور کیا جائے تو لفظ "تنگ" کے بیضہ آسا کی مناسبت سے بطور صفت آنے کا احساس ہوتا ہے اور "تنگ بال و پر" کے الفاظ ہی مناسب اور برمحل نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف لفظ "تنگ" کو موقع و محل کی مناسبت سے قبول کرنے میں تکلف ہوتا ہے۔ البتہ مصرعہ ثانی

خصوصی توجہ کا طالب ہے اور اسی میں شعر کی تمام جامعیت و معنویت پوشیدہ نظر آتی ہے

اگر ہم شعر کو اس طرح پڑھیں جیسا کہ دیوان غالب مرتبہ مالک رام و نسخہ گپتا رضا میں موجود ہے اور جس کی فاروقی صاحب نے بھی تائید کی ہے تو شعر کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور شعر کا ایک عام اور سطحی مفہوم تو اجاگر ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کی قرات میں کمی یہ رہ جاتی ہے کہ مصرعہ ثانی کو۔

از سر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے

پڑھنے سے جہاں "لفظ گر" کی موجودگی میں بات، مشروط، سپاٹ اور سطحی ہو جاتی ہے وہیں مفہوم میں یہ اجاگر نہیں ہو پاتا کہ رہا ہونے کا باعث کیا ہے اور کونسی چیز رہائی کا سبب اور باعث ثابت ہو رہی ہے۔ اس طرح یہ تو نہیں کھلتا کہ کس طرح رہا ہو جایئے بلکہ رہائی کے بعد کی حالت منکشف ہوتی ہے۔ پھر اس کی نثر کرنے پر بھی مصرعہ کا مفہوم کوئی خاص اثر پیدا نہیں کرتا۔ لہٰذا مصرعہ ثانی میں " زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے" کی بجائے "زندگی ہو کر رہا ہو جایئے" کے الفاظ زور بیان اور معنویت کے لحاظ سے قدرے بہتر محسوس ہوتے ہیں۔

اگر چہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ زندگی ہونا نہ تو اردو کا محاورہ ہے اور نہ ہی فارسی میں زندگی شدن آتا ہے اور غالباً اسی احساس کے پیش نظر ہمارے یہاں " زندگی ہو کر" کو خلاف محاورہ قرار دے کر " زندگی ہو گر" کو قبول کر لیا گیا ہے اور اسی احساس کو شعر کا مفہوم ملحوظ رکھتے ہوئے شعر کی قرات اور تاویل و تشریح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہاں یہ بات بھی درست ہے کہ اس طرح کے انداز سے شعر کی تعبیر اور تشریح میں کوئی خاص بات مانع نہیں ہوتی لیکن محاورہ ہونے یا نہ ہونے کی بحث کو چھوڑ کر جب ہم شعر کے دوسرے رخ اور الفاظ و ترکیب کے دوسرے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہیں تو " زندگی ہو کر" کے الفاظ زبانی قواعد و محاورہ سے اہم، مناسب اور برمحل محسوس ہوتے ہیں اور شعر کی شعریت و جامعیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

شعر و ادب کے اس اصول سے اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ کسی نثر پارے یا شعر میں اپنی بات پیش کرتے وقت زور بیان کی غرض سے ایک خاص اصول اپنایا جاتا ہے یعنی جب کسی حسین کو حسین کہنے کی بجائے حُسن کہا جاتا ہے یا کسی انصاف پسند کو عادل نہ کہہ کر عدل کہہ دیا جاتا ہے تو بات میں زیادہ جامعیت، معنویت اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ عربی ادب میں " زیدٌ عادلٌ" کی بجائے "زیدٌ عدلٌ" کی ترکیب زور بیان کے نقطۂ نظر سے نہایت معروف ہے۔ لہٰذا زیر بحث شعر میں زندہ ہونا کے معنی میں زندگی ہونا کی ترکیب کو درج بالا اصول کے تناظر میں دیکھا

جائے اور زبان و محاورہ کی بحث سے قطع نظر شعر میں درج بالا اصول کے اطلاق پر توجہ کی جائے تو شعر کی شعریت نکھر آتی ہے اور ایک جامع بات' اجاگر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس پس منظر میں مفہوم اور اسلوب کے لحاظ سے شعر کی حسب ذیل قرأت ہی بہتر معلوم ہوتی ہے۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر یہ ہے کنج قفس

از سر نو زندگی ہو کر رہا ہو جائیے

شعر و ادب کے درج بالا اصول کو نظر میں رکھ جب ہم شعر کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو پہلی بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ غالب نے بیضہ آسا کی صفت کے طور پر ہی لفظ تنگ استعمال کیا ہے لہٰذا بیضہ آسا مصرعہ اولیٰ کی جان ہے جسے کنج قفس کے لیے بطور تشبیہ لایا گیا ہے غالب کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر چہ انڈے کے اندر بھی وہ چوزہ زندہ ہوتا ہے لیکن اس کی وہ زندگی اسیری کی زندگی ہوتی ہے جو اس انڈے کے خول اور قید و بند کے حصار کو توڑنے کے لیے کافی نہیں ہوتی بلکہ قید و بند کے اس حصار کو توڑنے کے لیے اسے احساس و شعور کی ایک ایسی قوت درکار ہوتی ہے جو اوّل تو داخلی اور اندرونی ہو اور جس میں کسی باہری چیز کا عمل دخل نہ ہو تو دوم یہی قوت سراپا زندگی ہو کر اس کی رہائی کا باعث بنے۔ احساس و شعور کی یہی وہ داخلی قوت ہے جو اسے کنج قفس سے رہائی دلا سکتی ہے اور اسی قوت کو غالب ایک جامع مفہوم میں زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح بقول غالب اس کنج قفس سے رہائی کے لیے اندرونی احساس و شعور کی ایک نئی زندگی (قوت) درکار ہے جو اپنے آپ میں سراپا زندگی ہو کر رہائی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ غالب زیر نظر شعر میں گرفتاری سے رہا ہونے کا حوصلہ دیتے ہیں اور اپنے اندر احساس و شعور کی ایک قوت پیدا کرنے کے لیے اُبھارتے ہیں جو ہمیں ذہنی غلامی کی زنجیروں سے رہائی دلانے میں کلیدی کردار ادا کرے اور جب ہم اس طرح کا احساس و شعور اپنے اندر پیدا کر لیں گے تو نہ صرف یہ کہ ہم از سر نو زندہ ہو جائیں گے بلکہ ہمیں پوری زندگی (اپنی اصل صورت میں) مل جائے گی۔ غالب کے اس احساس کو درج ذیل اشعار بھی واضح کرتے ہیں۔

(دیگر شعراء کے اشعار)

قفس کیا اور قفس کی تیلیاں کیا

کسی میں ہمت پرواز بھی ہے

بازوؤں میں ہو طاقت اگر ہم قفس

ٹوٹ جاتی ہیں پرواز کی تیلیاں

قفس کے اے ساده دل اسیر قفس کا در توڑنا تو ممکن

مگر چمن تک پہنچ سکو گے یہ پوچھ لو بال و پر سے پہلے

یہ حقیقت ہے کہ ایک قاری یا شارح

کسی شعر میں ان جذبات واحساسات تک قطعی طور پر نہیں پہنچ سکتا جو شعر کہتے وقت اس شاعر کے رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شعر کی مختلف زاویہ نگاہ اور مختلف انداز سے تشریح وتعبیر کیے جانے سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا، پھر کلام غالب تو اپنی تہہ داری اور معنی ومفہوم وسعت کے لیے مشہور ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر اس مقالے میں قدرے مختلف وتفصیلی انداز میں شرح پیش کی گئی ہے اور غالب کی اس بات کو تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

.. ..

کاوش بدری

5,S k Mohyuddiin Strkeet

Noorulahpet.Ambur 635802

☆اب کی بار کتاب نما کا تازہ شمارہ ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۹۹ء قد آور دانشوروں کے مقالوں سے یادگار بن گیا ہے۔ معاف فرمایئے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا سفرنامہ پاکستان کتاب نما جیسے وقیع اور مقتدر ماہنامہ میں اداریہ کی بجائے اسی نمبر میں کسی اور جگہ کا مستحق تھا۔ غزل دشمنی اردو زبان سے شدید دشمنی کے مترادف ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن صاحب جدید نظم کا زوال ہی زوال ہے۔ شاعری اگر موثر نہ ہو تو وہ نظم سے گئی گزری ٹھہرتی ہے۔ علامہ اقبال کے بعد جو نظمیہ شاعری ہے اس میں جوش صاحب کے بعد علامہ جمیل مظہری کا ایک بڑا نام ہے۔ عمیق حنفی اور حرمت الاکرام کے ہاں بھی قدرت کلام اور عمق فکر کا فقدان ہے حالانکہ انھوں نے طویل نظمیں بھی کہیں۔ غیر اردو مرکز تمل ناڈو میں راقم الحروف نے ایک طویل ترین نظم کاویم صنف مونولاگی میں قو م پسندانہ عناصر اور دراوڑی کلچر کے ساتھ انکشاف ذات پر بحیثیت ادب العالیہ پیش کی جس پر آزادی کے بعد لکھی گئی طویل نظموں کی روشنی میں بہار یونیورسٹی سے انتربھی Phd کرر ہے ہیں۔ ہمعصر تنقید میں سوائے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کسی اور نے ناچیز کی مذکورہ نظم پر بیرونی ممالک میں اظہار خیال نہیں کیا۔ بلراج کومل ہوں یا محمد علوی انھوں نے کسی بڑے Subject کو کبیر داس یا ٹیگور کی طرح Deal نہیں کیا۔ سچ پوچھیے تو آزادی کے بعد ہندستان میں تاریخ، تحقیق، تنقید اور فکشن کو جتنا فروغ حاصل ہے اس قدر شاعری کو نہیں۔ جدید نظم سے کہیں زیادہ کلاسکی جدید غزل کے چودہ طبق روشن ہوگئے ہیں۔ برادرم شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون نمبر ۲۲۹ میں اخبار واذکار کے تحت لکھا ہے کہ۔۔ کون کہتا ہے کے مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ یوپی میں تو ایسا نہیں ہے برطانیہ میں شاید ہو تو ہو' مدیر شاعر جناب افتخار امام صاحب نے تازہ شاعر نمبر ۱۹۹۹ء کے مکتوب کے کالم میں راقم الحروف کے طویل خط پر یوں نوٹ رج کیا ہے کہ "موضوعاتی نظمیں ہی کہاں تخلیق ہورہی ہیں کہ طویل نظموں کی طرف توجہ کی جائے۔ جن شعراء کی قوت شعری پانچ سات

اشعار سے زیادہ نہ ہو یا سو دو سو غزلوں سے آگے جو شعرا نہ جا سکیں ان سے طویل نظموں کی توقع ؟ اب کی بار پروفیسر عبدالحق صاحب کا مقالہ " دہلی میں اردو کی صورت حال " ایک پی ایچ ڈی تھیسس کا درجہ رکھتا ہے۔ موصوف نے بجا لکھا ہے کہ عہد غالب کے بعد داغ تھے، اس درجے کا شاعر بھی ان کے بعد دہلی کی دہلیز پر دستک نہ دے سکا۔ عصر رواں میں نامور شعرا کی بالیدگی و برنائی اتمام کو پہنچ چکی ہے۔ ان دنوں شعرا کے نام ان کی شاعری سے کہیں زیادہ مشہور ہیں ۔ بعض شاعروں کے شیر ہیں تو بعض رسائل کے کاغذی شیر ببر ۔ اختر الایمان نے ڈنکے کی چوٹ کہا تھا کہ۔ " بے دین آدمی اچھی شاعری کر ہی نہیں سکتا (بہ حوالہ ' مقالہ بعنوان اختر الایمان کی شاعری از شمیم حنفی) تازہ کتاب نما میں پروفیسر عبدالحق صاحب کے مقالے میں صفحات نمبر وار نہیں ہیں۔ سید حامد صاحب پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مقالہ جامع اور جاندار ہے۔ کسی عظیم شخصیت پر کوئی لکھنا چاہے تو اس معیار کا لکھے یا خاموش رہ جائے۔ مجتبیٰ صاحب کا مقالہ ذکر خیر سید حامد کا بہ ہر نوع مرصع غزل کی طرح ہے۔ گھر بیٹھے ان دونوں مقالوں کے وسیلے سے میری ذاتی ملاقات بھی گویا سید حامد صاحب سے ہو گئی۔ ادبی تہذیبی خبروں میں ثانی بوعلی ورازی، علامہ اقبال کے مردِ مومن اعلا حضرت حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم اردو اکادمی دہلی کے سمنار کی رپورتاژ پڑھ کر آنکھیں چھلک گئیں۔ کاش میں بھی اس سمنار میں ہوتا !" غالب کا ایک شعر " پر برادرم نثار احمد فاروقی صاحب کا مضمون اور پھر برادرم انوار رضوی صاحب کا گرانقدر خط پڑھ کر مجھے نقش فریادی بن جانا پڑا۔ زیر بحث شعر میں چوزے کو بال و پر کی کشادگی کے لیے یا پھڑ پھڑانے کے لیے بیضہ میں جگہ تنگ ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کنج قفس بھی بیضہ کی طرح تنگ ہے۔ اس جگہ غالب پر و بال کی تنگی کا شاکی ہے تو اپنے ایک دوسرے شعر میں بے پروبالی پر نازاں ہے۔

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

ایک اور جگہ غالب کی تنگی کا رونا یوں ہے ۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے

پروفیسر نثار احمد فاروقی کی تشریح کے برعکس تازہ کتاب نما میں انوار رضوی صاحب کی تشریح شاعرانہ شوخی تحریر کی غماز ہے۔ اگر نثار احمد فاروقی صاحب کی تاویل کے لحاظ سے گر کو قائم رکھتے ہوئے از سرِ نو زندگی ہے گر پڑھا جائے تو غالب تشکیک کا شکار ٹھہرتا ہے اور حیات بعد الممات کا بطلان ہو جاتا ہے۔ گر کا فساد از سر نو زندگی ہو گر میں بھی ہے اور گر رہا ہو جائیے میں بھی ہے۔ پہلے یہ فیصلہ ہو جانا چاہیے لفظ گر رہا ہو جانے کے لیے ہے یا از سر نو زندگی ہو گر کے لیے، مصرع اولیٰ میں بیضہ ہی بال و پر کے لیے تنگ ہے، کنج قفس ہرگز نہیں،

جیل خانہ یا قفس پنجرہ کی طرح اس قدر تنگ نہیں، پنجرہ سے نکل کر چند قفس میں پھڑ پھڑا سکتا ہے۔ مگر کنج قفس میں بھی اس کے بال و پر کی کشادگی بسیار کے لیے اور وہاں سے فرار ہو جانے کی گنجائش کم ہے۔ چونکہ ایک پنجرہ سے نکلا تو دوسرے [illegible] نما کنج قفس میں گرفتار ہوگا۔ بارے جدو جہد کرکے رہا ہو گیا تو از سرِ نو زندگی ہوگی ورنہ شرم کی بات ہے۔

مت سہل ہمیں جانو!......آہ! انور ظہیر خان

اخبار چیوں کے شب و روز عجب گزرتے ہیں جب دنیا میں سورج طلوع ہوتا ہے تو ہم نیند کی دیوی کو رام کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ گزشتہ اتوار کی صبح یہی کوئی ٦ بجے کا عمل رہا ہوگا.... لیمپ بجھا کر آنکھ موندے پڑے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی ... . چونکے اتنی صبح کون؟ ریسیور اٹھایا۔ ادھر سے نعمان صاحب گویا تھے ... ." ندیم .. انور کا انتقال ہو گیا۔" میں ہڑبڑایا۔ ..کون انور؟
ارے بھئی ہمارا تمہارا بھائی انور ظہیر. ....ہئیں؟ .... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کب اور کیسے؟"

ہارٹ اٹیک ہوا ہے ابھی گھنٹہ بھر قبل، میں بس کرلا نکل رہا ہوں۔"

نعمان امام صاحب کو ہم کیا ایک دنیا کلیا تِ ادب (ماہنامہ) اور سبزۂ شرر (شعری مجموعہ) کے حوالے سے جانتی ہے البتہ بہت دنوں بعد ہمیں پتہ چلا کہ یہ شاعر محترم..... انور ظہیر کے حقیقی برادر بزرگ ہیں۔ اس رشتے سے اُن سے ایک اور تعلق خاطر پیدا ہوا۔

بعد ۹ بجے پھر گھنٹی بجی اور اطلاع ملی کہ آج ہی ظہر بعد قریش نگر قبرستان میں تدفین ہوگی۔

ممبرا سے کرلا کا فاصلہ کچھ زیادہ تو نہیں مگر وقت ضرورت ممبرا اسٹیشن سے صحیح سے پر ٹرین مل جائے تو خود کو خوش نصیب جانیے یعنی اُس دن بھی لوکل ٹرین حسب معمول تاخیر سے آئی۔ ہم جب کرلا اسٹیشن اُترے تو ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ دماغ نے سمجھایا کہ "میاں! سیدھے قبرستان چلیے۔"

انور ظہیر کو ہم نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر انصاری کے ہاں (یونیورسٹی کلب ہاؤس میں) دیکھا تھا۔ پھر اُن سے کبھی کبھار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ [illegible] صاحب کے انتقال کے بعد اُن سے کچھ قربت اور اُنس ہوا جس نے دوستی اور برادرانہ رشتہ استوار کیا۔

یقینا انور نے کم عمری میں دنیا سے منہ موڑا مگر اتنی سی عمر میں انھوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ کسی کسی کو ہی اور خال خال ہی مقدر ہوتا ہے: .. اُنھیں آخری کاندھا اور دو مٹھی مٹی دینے کے لیے فضیل جعفری، محمود ایوبی، حسن کمال، علی امام نقوی، یعقوب راہی، یونس اگاسکر، یوسف ناظم، مہدی اعظمی، خورشید نعمانی (یہ دونوں حضرات انور کے استاد رہ چکے ہیں) اور اطہر عزیز ہی نہیں دور قریب کے اکثر اہلِ قلم اور اہلِ علم جمع ہو گئے تھے۔ ہم جیسے دنیاداروں کے نزدیک یہ عمل بھی کسی طور کم نہیں۔

انور ظہیر کا آبائی وطن یوپی کی مشہور ریاست محمود آباد (قصبہ متورہ) مگر انھوں نے ممبئی میں ہی (۲۲ رجون ۱۹۵۴ء کو) آنکھیں کھولیں اور

عروس البلاد میں تعلیم و تربیت ہی نہیں بلکہ پروان بھی چڑھے ۔ دھنک کے سات رنگوں کی طرح انھوں نے اسی شہر سے سات شخصیتوں کو چنا اوران کا خاکہ اُڑایا اور سچ تو یہ بھی ہے کہ اس طرح مرحوم اپنی کتاب میں اپنا خاکہ چھوڑ گئے ہیں۔ نہ جانے کب تک وہ خود اس کے حوالے سے سرگوشی کرتے رہیں کرمت سہل ہمیں جانو!!

انور ظہیر خود ساختہ شخص تھے۔ اپنی محنت سے، لگن سے، جدوجہد سے وہ شخص سے شخصیت کا روپ اختیار کرتے جا رہے تھے کہ اُن کے دل نے اُنھیں دھوکہ دے دیا شکرِ ربی کہ وہ دھوکہ کھا کر رخصت ہوئے کسی کو دھوکہ دے کر نہیں۔

انور ظہیر اپنے ہم عمروں میں نہایت نمایاں شخص تھے۔ ان کی اول و آخر کتاب پڑھیے اور سر دُھنیے، پھر ذرا اردگرد، دور نزدیک نظر دوڑایئے کہ اس درجے کی زبان اور پُر تاثیر بیان آج کتنے قلمکاروں کو میسر ہے!!

مرحوم کی یہ کتاب ۱۹۹۶ء میں شاہد علی خاں صاحب (مکتبہ جامعہ نئی دہلی) نے چھاپی تھی، بس دو سال کے وقفے میں اس کا پاکستانی ایڈیشن ضمیر نیازی صاحب کی خصوصی دلچسپی کے سبب شائع ہو گیا جس میں اردو کے مشہور ادیب اسلم فرخی کا دیباچہ بھی شامل تھا۔

انور بہت خوش تھے اور کیوں نہ خوش ہوتے کہ یوں مقبولیت سب کو کہاں مل پاتی ہے۔ اب جب جب ہم ان کا تصور کرتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہفتے بھر میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ دفتر جاتے ہوئے کرلا میں مشرق (قریش نگر قبرستان) کی طرف نگاہیں نہ اُٹھیں ہوں اور دل سے آنکھوں تک ایک افسردگی اور نمی نہ محسوس ہوئی ہو ۔ ہماری بھاوج اور اُن تین ننھی بی بیوں پر کیا کچھ گزری ہوگی؟!! سوچتے ہیں تو حلق خشک ہونے لگتا ہے ان ناتوانوں نے کیسے اُٹھایا ہوگا اتنا بڑا غم!!

برادرِ بزرگ نعمان امام صاحب کا یہ جملہ ابھی تک گونج رہا ہے "ندیم! یہ کیا ہو گیا، جانے کے تو میرے دن تھے وہ کیسے چلا گیا!" یہ سچ ہے کہ جواں عمری کی موت ہم نے پہلی بار نہیں دیکھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنوں کی یوں رحلت خود اپنی موت سے کم نہیں ہوتی۔

انور ظہیر خاک کے بستر پر مٹی کی چادر اوڑھ چکے۔ اس میں بھی وہ سبقت لے گئے مگر جسے "زندگی کی منزل" کہتے ہیں وہ بھی اُن کے قدموں تلے ہے۔ ان کی تحریر کا ایک ٹکڑا یاد آتا ہے جو اس وقت اپنے آپ میں ایک دلیل محسوس ہوا، سو نقل کیا جاتا ہے کہ یہ آج ہی نہیں آنے والے دنوں میں بھی قرطاسِ ادب پر قولِ دانش کی شکل اختیار کرتا رہے گا۔

"فن کی کوئی منزل نہیں ہوتی لیکن فنکار کی ایک منزل ہوتی ہے۔ فن فنکار کو پیہم حرکت واضطراب اور مسافت میں رکھتا ہے جس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے، وہ وقت کے غبار میں غروب

ہوجاتا ہے جو حوصلہ و ہوس کا نگار خانہ سجائے رکھتا ہے منزل اس کے قدموں میں آرہتی ہے۔"

ندیم صدیقی، ممبئی

ابھی ابھی کتاب نما کا تازہ شمارہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۹۹ء موصول ہوا۔ فوراً ہی پورا شمارہ از اول تا آخر پڑھ ڈالا۔ حسب معمول اس کے سبھی مضامین کافی دلچسپ اور مفید ہیں۔ خاص طور پر مہمان مدیر جناب ڈاکٹر ستیہ پال کا اشاریہ: "پاکستان کا ادبی منظر" عرف "کتھا پاکستان یاترا کی" جو کناڈا سے ارسال کیا گیا ہے جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے سبھی لوگوں نے دلچسپی اور شوق سے پڑھا ہوگا۔ اس کے بعد متعدد کتابوں کے مرتب اور مصنف و مولف جناب شمس الرحمٰن صاحب فاروقی کا مضمون ہے، جس کا عنوان ہے: "سید حامد اس کی ہر بات دل نشین، ہر تیر دل کشا" حاشیہ بھی ہے "اس کی ہر بات دلِ نشیں ہوگی۔ اس کا ہر تیر دل کشا ہوگا۔" (سید حامد) اس کے بعد نظم اور جائزے وغیرہ معمول کے مطابق ہیں۔ غرض پورا رسالہ کافی دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔

عبداللطیف اعظمی، ذاکر نگر، نئی دہلی

غبار کارواں بیگم انیس قدوائی

(نا تمام خودنوشت)

"غبار کارواں میں اس صدی کی ابتدائی دودہائیاں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس میں ہماری معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے بہت نقوش ابھر کر آتے ہیں۔ یہ ایک عام متوسط گھرانے کی ایک عورت کا ادھورا رزمیہ ہے۔

قیمت: =/27 روپے

اپنے پرائے (افسانے) اوم پرکاش بجاج

"اپنے پرائے" کے افسانے پرائے نہیں، اپنے ہیں۔ یہ جن کی کہانیاں ہیں، انھیں ہم جانتے ہیں۔ وہ ہمارے محلے میں ہماری گلی میں بلکہ ہمارے اندر رہتے ہیں۔ دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ قیمت: =/9 روپے

حیات عابد مرتبہ: ڈاکٹر صغرا مہدی

(خودنوشت)

ڈاکٹر سید عابد حسین اپنی خودنوشت کے صرف پانچ باب ہی لکھ سکے۔

اس کو مکمل کرنے کے لیے ڈاکٹر صغرا مہدی نے عابد صاحب کے غیر شائع شدہ مضامین، ان کے انٹرویوز خطوط ان کے دوست احباب سے معلومات اور ان کے وطن واعی پور جاکر کاغذات کے ڈھیر کی مدد سے خاندانی حالات جمع کر کے سوانح مکمل کی۔ یہ صرف خودنوشت ہی نہیں ایک دور کی مستند تاریخ ہے۔

قیمت: =/45 روپے

ادبی تہذیبی خبریں

پندرہ فروری کو "یوم اردو" منائیں

نئی دہلی ۔۸ر فروری شاعر، افسانہ نگار، اور "مسلمانوں کے اقتصادی مسائل اور ان کا حل" کے مصنف سعید سہروردی نے اردو سے وابستہ تمام افراد اور تنظیموں سے اپیل کی ہے کہ وہ ۱۵ر فروری ۱۹۹۹ء کو "یوم اردو" منا کر ۱۵ر فروری ۱۹۵۴ء کی یاد تازہ کریں ۔ ۱۵ر فروری ۱۹۵۴ء کو نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو کا ایک مقتدر افراد پر مشتمل وفد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی قیادت میں ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملا تھا جو اس وقت صدر جمہوریہ تھے، ان کو اردو کو اتر پردیش کی علاقائی زبان قرار دینے کے لیے بیس لاکھ سے زائد دستخطوں سے تاریخ کی ضخیم ترین درخواست پیش کی گئی تھی۔ سعید سہروردی نے محبان اردو سے اپیل کی ہے کہ وہ حکومت کے بجائے عوام سے قریب ہو کر اپنی آواز میں وزن پیدا کریں اور ان کے عزم کا دائرہ صرف اتر پردیش تک محدود نہ ہو بلکہ سارے ملک کو نظر میں رکھ کر جہت اور جد وجہد کی حکمت عملی اختیار کریں۔

۱۵ر فروری ۱۹۹۹ء کو یوم استقلال مان کر اردو زبان کو زندہ رکھنے، اس کے وقار کو بلند کرنے اور دیگر زبانوں سے اس کے ربط کو مضبوط، موثر اور ثمر آور بنانے کا عزم کیا جائے۔

۱۵ر فروری ۱۹۹۹ء "کو یوم احتساب" مان کر اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ اردو کے لیے ہم نے اب تک کیا حاصل کیا ہے اور وہ کون سے خالی گوشے ہیں جن کو پُر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس مقصد کے لیے نئی اردو تحریک کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے وضاحت کی کہ آج جو تنظیمیں اردو کے لیے کام کر رہی ہیں، یہ تحریک ان میں سے کسی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اگر وہ "یوم اردو" اپنے دائرے اور اپنی تنظیم کے ذریعہ منعقد کریں تو خوشی ہوگی۔

نئی اردو تحریک ۔۸ ۲۷۔بی ۲، میوروہار ۔ا ۔ دہلی ۔۹۱

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی تاریخ ساز تھے

۲۹ر ستمبر کو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے بانی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی پر میموریل لکچر کا آغاز ہوا۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر امیر عارفی نے میموریل لکچر کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی میموریل لکچر کا اہتمام ہر سال شعبہ اردو کی جانب سے کیا جائے گا اور اردو زبان

وادب کے کسی اہم مسائل و مباحث پر ہر سال اردو کے کسی نامور ادیب کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی جائے گی ۔ اس میموریل لکچر کے افتتاحی کلمات میں پروفیسر امیر عارفی نے مزید کہا کہ خواجہ احمد فاروقی کی ہمہ جہت شخصیت اور ادبی کارناموں کا مطالعہ کیا جانا باقی ہے۔ اردو زبان اور ادب کی بقا اور تحفظ کے لیے انتہائی نامساعد حالات میں خواجہ صاحب نے جامعات اور جامعات سے باہر جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کو از سرنو سامنے لانے اور نئی نسل کو اس سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے میموریل لکچر کے لیے ان ہی کے ایک شاگرد رشید ڈاکٹر خلیق انجم کو خواجہ صاحب پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت اس لیے بھی دی گئی کیونکہ نہ صرف وہ خواجہ صاحب سے بخوبی واقف رہے ہیں بلکہ انھوں نے ان کے کاموں کو آگے بھی بڑھایا ہے اور آج کی اردو دنیا میں بحیثیت نقاد اور محقق ان کی حیثیت مسلّم ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنا مبسوط اور جامع مقالہ بعنوان "پروفیسر خواجہ احمد فاروقی فن و شخصیت" پیش کیا، اور خواجہ صاحب کی زندگی اور ادبی کارناموں کا بخوبی احاطہ کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں فرمایا کہ خواجہ صاحب کی زندگی ہو یا ادبی تحریر ہر جگہ ترتیب و تنظیم اور نفاست موجود ہے۔ ان کے یہاں ایک سلیقہ مندی تھی جس میں اردو تہذیب جھلکتی تھی ۔ انھوں نے اردو تہذیب وروایات کی جڑیں مضبوط کیں اور اسے آگے بڑھایا۔ دنیا میں ایسی جامع شخصیات کم پیدا ہوتی ہیں۔

اس جلسے کی صدارت جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر اور نامور نقاد جناب صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ خلیق صاحب کا یہ مقالہ انتہائی مبسوط اور ہر اعتبار سے جامع ہے اور واقعی انھوں نے شاگردی کا حق ادا کر دیا اور ان کی شخصیت اور کارناموں کو جس طرح قلم بند کیا وہ انھی کا حصہ ہے۔ شعبہ کے سینئر استاد پروفیسر عتیق اللہ نے شکریہ کے کلمات ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ خواجہ صاحب کی شخصیت یقیناً عبقری ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ سرسید اور رفقائے سرسید کے بعد اور ترقی پسند تحریک سے قبل جن شخصیات نے اردو نثر کو سائنسی معیار و وقار عطا کیا ان میں خواجہ صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ اردو نثر کے جو نمونے خواجہ صاحب کے یہاں مقدمے، تاثرات، یادداشت اور خاکوں کی شکل میں موجود ہیں وہ انتہائی اور استدلالی نثر کی بہترین مثال ہے اور ان دونوں کے درمیان انھوں نے جو تطابق اور تال میل پیدا کیا ہے۔ اس کی نظیر اس عہد کے کسی ادیب

کے یہاں نہیں ملتی ۔ پروفیسر شفیق اللہ نے صدر شعبۂ اردو کو ایک زندہ شخصیت پر میموریل لکچر کا آغاز و افتتاح کرنے پر مبارک باد دی اور اس کے علاوہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم اور دیگر اساتذہ اور شرکائے مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ اس جلسے میں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی و کالج کے اساتذہ کے علاوہ دیگر شعبوں کے اسکالرز اور اساتذہ شریک ہوئے۔

"کہانیاں" کی تقریب رونمائی

ڈاکٹر کیول دھیر اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہماری معاشی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر خلیق انجم نے اردو گھر نئی دہلی میں ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو منعقد ڈاکٹر کیول دھیر کے افسانوں کے مجموعے "کہانیاں" کی تقریب رونمائی میں صدارتی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ "کہانیاں" کی رسم اجراء ڈاکٹر خلیق انجم نے ادا کی ۔ پنجاب سے شائع ہونے والے "پرواز ادب" نے کیول دھیر کا بہت خوب صورت اور جامع نمبر شائع کیا ہے۔ اس کی رسم اجرا یونس دہلوی صاحب نے ادا کی ۔قبل ازیں جناب مخمور سعیدی نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر کیول دھیر کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر دھیر اردو زبان وادب کے حوالے سے جانی پہچانی شخصیت ہے ۔ آزادی کے بعد پنجاب میں اردو زبان وادب اور تہذیب وثقافت کی بقا اور ترویج کے لیے جن لوگوں نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں ان میں کیول دھیر کا نام بہت نمایاں ہے۔

جلسے کے مہمانِ خصوصی جناب جوگندر پال نے کہا کہ نامساعد حالات میں بھی جو لوگ پنجاب میں اردو کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرتے تھے ان جیالوں میں کیول دھیر کا نام بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر کی کہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے طلراج کومل صاحب نے کہا کہ ان کے یہاں سارے مرد وخواتین خوشی کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں ۔ بہت زیادہ پیچیدہ اور گنجلک مسائل کو بھی سادگی سے پیش کر دینے میں کیول دھیر صاحب کو کمال حاصل ہے۔ جناب شین.کاف.نظام نے کہا کہ میں ڈاکٹر کیول دھیر کو کرشن چندر سے بہت قریب پاتا ہوں ۔ انھوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

جناب یونس دہلوی نے کہا کہ اگر ہم اردو زبان کو رواں دواں اور بین اقوامی زبان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں تو اردو والوں کے درمیان کسی طرح کا تعصب نہیں ہونا چاہیے اور ہمیں زبان اور تلفظ کی ادائیگی کی

خامیوں پر جو علاقائی اثرات کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں، سخت گیر رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔

ڈاکٹر کیول دھیر نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج میرے لیے واقعی نہ صرف خوشی بلکہ فخر کا مقام ہے کہ اردو کے سب سے بڑے ادارے انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام میرے افسانوی مجموعے "کہانیاں" کی رسم رونمائی انجام پائی۔ میرے دوستوں نے میرے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ان کی وجہ سے میں سوچنے پر مجبور ہوا کہ میرا اردو سے کیا رشتہ ہے۔ اردو کے احسانات کے تئیں میں زیر بار ہوں ۔ اردو نے مجھے ایک معتبر مقام دیا، انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا۔ یہ اردو ہی ہے جس نے مجھے بہت سے ممالک کے سفر کے مواقع فراہم کیے۔ جلسے کی نظامت جناب شاہد ماہلی نے فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر کیول دھیر اردو کے ممتاز افسانہ نگار ہیں ۔ ان کی کہانیوں کا یہ انتخاب اردو افسانوی ادب میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

آخر میں محترمہ شمیم جہاں صاحبہ نے ڈاکٹر کیول دھیر کو مبارکباد پیش کی اور سبھی مہمان اور تقریب کے شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

اسی کے ساتھ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

محمد عارف خان

پی ایچ۔ڈی۔تفویض

منیر حسین صدیقی کو "محمد حسین محوی صدیقی حیات اور اردو زبان وادب کے خدمات" کے موضوع پر برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے یہ مقالہ ڈاکٹر محمد نعمان خاں صدر شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال کی زیر نگرانی مکمل ہوا ہے۔ جس میں محوی صدیقی کی حیات اور اُن کی ہمہ جہت علمی، ادبی، لسانی، اور شعری خدمات کا جائزہ معروضی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

پاسداران اردو کی جانب سے "شام افسانہ" کا اہتمام

پاسداران اردو پنجاب مالیر کوٹلہ کی جانب سے ایک "شام افسانہ" کا انعقاد کیا گیا ۔شہر کے شعروادب نواز حلقہ کے لوگ جوق در جوق نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ میں محظوظ ہونے کے لیے تشریف لائے۔

پروگرام کی صدارت فرمانے کے لیے پنجابی یونیورسٹی سے جناب ڈاکٹر طارق کفایت اللہ بطور خاص تشریف لائے ۔ جناب ڈاکٹر ڈی ۔ڈی بھٹی نے بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی ۔"شام افسانہ" کے آغاز میں پاسداران اردو کے سر پرست ڈاکٹر زینت اللہ جاوید نے افتتاحیہ کلمات پیش فرمائے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر انوار احمد انصاری نے فرمائی۔

افسانہ نگاروں میں افسانہ خوانی کا آغاز بچوں کے ادب کے تخلیق کار جناب منصور عالم نے اپنا افسانہ ''چوائس'' پیش کیا۔ دوسرے افسانہ نگار جناب محمد حنیف نے 'کالا چشمہ' عنوان کے تحت اپنی کہانی پیش کی۔ تیسرا افسانہ اردو ادب کے مشہور افسانہ نگار جناب بشیر مالیرکوٹلوی نے 'خوشبو کا خوف' سامعین کی نذر کیا۔ ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، اردو ادب کے انشائیہ نگار اور نقاد نے بھی اس موقع پر اپنی ایک خوبصورت کہانی پیش کی۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر بھٹی صاحب نے اردو کہانی کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' جیسے عنوانات پر گفتگو کر کے بحث کے لیے دروازے کھول دیے۔ موصوف کی تقریر کے بعد ناظم نے 'شام افسانہ' میں سامعین اکرام کو گفتگو کے لیے مدعو کیا۔ اردو کے مشہور شاعر جناب خالد کفایت نے اردو کہانی پر اظہار خیال کیا۔ پروگرام کے اختتام پر صاحب صدر نے اپنے خطبہ صدارت سے نوازا اور افسانہ نگاروں، سامعین اور منتظمین کو پروگرام کی کامیابی پر دلی مبارکباد دیتے ہوئے مستقبل قریب میں بھی ایسی تخلیقی کاوشوں کو مزید جاری رکھنے کی تلقین فرمائی۔ جناب ناز بھارتی نے پاسدارانِ اردو پنجاب کی گذشتہ ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے مہمانان گرامی اور سامعین اکرام کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

ایک شام۔ ''شہرِ غزل'' کے نام

نوئیڈا۔ ۱۴راکتوبر کل نوئیڈا کی پر بہار شام تھی جب اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام رفعت سروش کی نئی کتاب ''شہرِ غزل'' کا اجرا عمل میں آیا اور کئی مقتدر ادیبوں نے اس کتاب پر سیر حاصل مضامین پڑھے۔ جلسے کی صدارت ٹریڈ فیر اتھارٹی کے سابق چیرمین جناب موسیٰ رضا صاحب نے فرمائی اور کتاب کی رسم اجرا اردو کے مشہور ادیب انور عظیم کے ہاتھوں سرانجام دی گئی۔ انھوں نے رفعت سروش سے اپنے دیرینہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تخلیقی سرگرمیوں اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی پر روشنی ڈالی اور انھیں ایک باحوصلہ ادیب قرار دیا۔ اس سے قبل جناب ابوالفیض سحر نے اپنے مضمون میں کہا ۔ ''رفعت سروش شعر کے فن کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ عصری حسیت اور عصری بصیرت کے بھی شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں اس کی مثال ہیں۔'' ... پی۔ بی۔ رندسری واستو کے مضمون کا موضوع بہت اچھوتا تھا۔ ''شہر غزل . . رفعت سروش کی نثر کے آئینے میں۔'' انھوں نے بامعنی حوالوں کے ساتھ کہا۔ .. '' شاعر کی خودنوشت۔ پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' ایک کھری خودنوشت ہے، جس کا اثر ''شہر غزل'' پر بھی ہے۔ .. میرا ماضی کیا ہے، اک یادوں کا

جنگل ہے سروش۔ پھول کھلتے ہیں کہیں، کانٹا کہیں چبھ جائے ہے۔"...... مشہور اور بزرگ ترقی پسند شاعر جناب اختر سعید خاں نے بھوپال سے اس موقع کے لیے ایک مضمون بھیجا، جسے ذکی طارق نے پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے لکھا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ رفعت سروش کے اشعار جو رجحانات کے اعتبار سے جدید ہیں، وہ بھی ایک ایسی مانوس اور کلاسیکی اسلوب کی خوشبو میں بسے ہوئے ہیں جو اسی موروثی چھت کے زیر سایہ مہک رہے ہیں جہاں کلاسیکل غزل آج بھی اپنے وزن وقار کے ساتھ آسودہ ہے۔"

اس جلسے کی نظامت نہایت خوش اسلوبی سے گلزار دہلوی نے فرمائی۔ آخر میں چند شعرا نے اپنا اپنا کلام سنایا جن میں شکیل اعظمی (سورت) نسیم مخموری، احمد محفوظ، طفیل چترویدی، معین شاداب، ضمیر حسن دہلوی، کلدیپ گوہر، دلبر نورانی، شبانہ نذیر، ہندسری واستو، گلزار دہلوی، رفعت سروش اور جناب صدر موسیٰ رضا شامل تھے۔

کرناٹک اردو اکادمی انعامات 2000-1999ء

کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کی جنرل کونسل نے اپنی میٹنگ منعقدہ ۵راکتوبر ۱۹۹۹ء میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ درج ذیل اصحاب کو اُن کی خدمات اُردو زبان، وصحافت کے سلسلہ میں کرناٹک اُردو اکادمی کی جانب سے ایوارڈ دیے جائیں۔

(۱) ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر نیشنل کونسل برائے فروغ اُردو حکومت ہند، دہلی (برائے مجموعی خدمات اُردو زبان وادب)

(۲) جناب نعیم اقبال بنگلور (برائے افسانہ وناول نگاری)

(۳) ڈاکٹر شفیع احمد شریف، میسور (صحافت)

(۴) جناب رزاق افسر، میسور (شاعری)

(۵) جناب عبد الرحمٰن گوہر ترکیروی، ضلع چکمگلور (شاعری)

(۶) جناب عبدالخالق، روزنامہ پاسبان بنگلور (صحافت)

(۷) جناب رفیع بھنڈاری، بیجاپور (صحافت)

بانسواڑہ میں آل انڈیا مشاعرہ

۲۶ رستمبر ۱۹۹۹ء کو بانسواڑہ میں ہندو مسلم اتحاد کے اس مشاعرے کی صدارت حضرت قیصر الجعفری نے کی۔ ہندستان کے جن مشہور شعرا حضرات نے شرکت کی ان کے اسم گرامی یہ ہیں: ذاکر خاں ذاکر، ساحر افغانی، پروفیسر قاسم، راحت گوالیاری حضرت بسمل نقشبندی، حضرت قیصر الجعفری، ممتاز راشد، شاہد لطیف، دانش علی گڑھی، منشاء الرحمٰن منشاء، مکیش اجمیری بھی شامل تھے۔ مشاعرے کی نظامت کا فرض انجام دیا آکا شوانی کے افسر جناب اسلم۔

مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے چھوٹے صاحبزادے نجیب الرحمٰن عثمانی کا انتقال پُر ملال

عالم اسلام میں یہ خبر انتہائی رنج و غم کے ساتھ سُنی گئی کہ مفتی نجیب الرحمٰن عثمانی بعارضہ گردہ اور ۲ سال ڈیلاسز پر رہنے کے بعد بالآخر ۲۷ ستمبر ۱۹۹۹ء کو انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم نجیب الرحمٰن عثمانی بڑے ہی ہونہار، خوش اخلاق، ملنسار اور پابند شعائر اسلام تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم اے پاس تھے اور سرکاری ملازم تھے۔ ہر جگہ نیک نام رہے۔ اپنے خاندان اور ملت اسلامیہ کا سر اونچا کرتے رہے۔ اپنے کاموں سے اپنے اوصاف سے اور اپنے اچھے اعمال سے اعلا عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود عجز وانکساری کے پیکر مجسم تھے۔ غرور تکبر سے دُور ہر ضرورت مند کے کام آنے والے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی ہی طرح طبیعت میں بُرد باری کے ساتھ قناعت اور ہر حال میں پروردگار کے شکر گزار تھے۔ علمی دنیا کی مایہ ناز ہستی حضرت مفتی شوکت علی فہمی ایڈیٹر دین ودنیا کی صاحبزادی نیک عفت، زرینہ رحمان ان کے عقدِ زوجیت میں تھیں۔ مفتی شوکت علی فہمی جو اُردو ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتے تھے انھیں اپنے قابل اور غریب پرور داماد نجیب الرحمٰن عثمانی پر بڑا ناز تھا اور وہ اکثر داماد نجیب الرحمٰن عثمانی کا ذکر انتہائی دلی محبت واحترام سے کرتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مفتی نجیب الرحمٰن عثمانیؒ اعزا و اقارب، غریبوں اور ضرورت مند اصحاب کو بھی سخت دکھ وصدمہ ہوا ہے، ان کے بڑے بھائی اور ادارہ ندوۃ المصنفین کے ڈائرکٹر اور رسالہ برہان کے فاضل اڈیٹر جناب مفتی عمید الرحمٰن عثمانی جنھیں اپنے چھوٹے بھائی کی وفات سے سخت دلی رنج وصدمہ پہنچا ہے، ادارہ کتاب نما ان سے اظہار تعزیت کرتا ہے اور بارگاہ عالی میں دعا گو ہے کہ مرحوم نجیب الرحمٰن عثمانی کی بال بال مغفرت فرمائے اور انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور متعلقین وبیوہ زرینہ رحمان، خاندان کے تمام افراد کے ساتھ جناب مفتی عمید الرحمٰن عثمانی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اہل مکتبہ جامعہ اپنے مخلص دوست سے محروم ہوگئے
معروف ادیب پروفیسر انور ظہیر خان ''مت سہل ہمیں جانو'' کے خالق نے ہندوپاک میں یکساں مقبولیت حاصل کی

ممبئی ۱۳ اکتوبر (جاوید جمال الدین)

اپنی پہلی کتاب ''مت سہل ہمیں جانو'' سے

ہندو پاک میں شہرت حاصل کرنے والے ممبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور مہاراشٹر کالج کے ایک سینئر لیکچرار پروفیسر انور ظہیر خان کا اتوار کی صبح حرکت قلب بند ہونے سے کرلا میں واقع ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہو گیا۔

ان کی عمر ۴۵ سال تھی اور پسماندگان میں اہلیہ اور تین بیٹیاں ہیں۔ انور ظہیر کو آج بعد نماز ظہر قریش نگر قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس موقع پر ان کے رشتہ داروں، دوست احباب کے ساتھ ساتھ شہر کی علمی، ادبی، تعلیمی اور اخباری دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد شریک تھے۔ مہاراشٹر کالج میں ۸/اکتوبر کو بعد نماز جمعہ قرآن خوانی ہوگی۔

انور ظہیر کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی جانب سے حال میں فیلوشپ حاصل ہوئی تھی اور وہ دو سال کی رخصت پر جانے والے تھے۔ انھیں مشہور صحافی اور ادیب ظ انصاری سے کافی لگاؤ تھا اور انھوں نے ان پر متعدد مضامین لکھے اور انھیں ہی اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع بنایا تھا۔

مہاراشٹر کالج شعبہ اردو کی صدر ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے بتایا کہ انور ظہیر کا تعلق اتر پردیش کے شہر سیتاپور سے تھا۔ انھوں نے عروس البلاد میں ہی تعلیم حاصل کی اور مہاراشٹر کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد ممبئی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا مہاراشٹر کے ذہین طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ایم اے کے بعد ۱۹۸۵ میں ان کا تقرر ایک لیکچرر کی حیثیت سے مہاراشٹر کالج کے شعبہ اُردو میں ہوا۔ ایک عرصہ تک وہ جونیئر کالج میں اپنے فرائض ادا کرتے رہے اور پھر ڈگری کالج میں ان کا تقرر کیا گیا۔ حال ہی میں یونیورسٹی شعبہ اردو کالینہ میں بھی ان کا تقرر ایم اے کی کلاسوں کے لیے کیا گیا۔

وہ ایک سلجھے ہوئے اور سنجیدہ انسان تھے۔ ان کی تحریروں میں بھی وہی سنجیدگی نظر آتی ہے بلکہ وہ ایک تخلیقی فن کار تھے اور یہی وجہ تھی کہ گزشتہ سال مکتبہ جامعہ نے ان کی کتاب ''مت سہل ہمیں جانو'' شائع کی جس پر ایک دو نہیں بلکہ ۱۵-۲۰ تبصرے شائع ہوئے اور شعراء اور ادباء کے خاکوں پر مشتمل اس کتاب کو ہند و پاک میں برابر مقبولیت حاصل ہوئی اور پاکستان میں کتاب دوبارہ شائع کی گئی جس پر اسلم فرخی نے دیباچہ بھی لکھا۔

انھوں نے اکبر الہ آبادی، نیاز فتحپوری اور جاں نثار اختر پر تنقیدی مضامین لکھے جو مقبول ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ وہ نیا ورق کی مجلس ادارت میں بھی شامل تھے۔

انور ظہیر کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تدفین کے موقع پر حسن

کمال، محمود ایوبی، ساجد رشید، ارتضی نشاط، سلام بن رزاق، انور خان، عنایت اختر، شاہد ندیم، علی امام نقوی، ندیم صدیقی، اعجاز ہندی، اسلم پرویز، اقبال نیازی، نعمان امام، وقار قادری اور مہاراشٹر کالج کے پرنسپل اسحق خولدار سمیت سیکڑوں افراد موجود تھے۔

ادارہ مکتبہ جامعہ اور ماہنامہ کتاب نما پروفیسر انور ظہیر خاں کے انتقال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر کی تلقین فرمائے۔ آمین

اک دیا اور بجھا

مظہر امام صاحب کی اطلاع کے مطابق اردو کے مشہور و ممتاز محقق، ادیب اور خاکہ نگار پروفیسر سید محمد حسنین کا کراچی میں ۱۰/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم اپنی بیٹی سے ملاقات کے لیے کراچی گئے ہوئے تھے۔ حسنین صاحب کی ولادت ۲/اکتوبر ۱۹۲۰ کو پٹنہ میں ہوئی۔ انھوں نے پٹنہ کالج سے اردو میں ایم اے کیا اور بہار یونیورسٹی سے "مرزا محمد علی فدوی" پر پروفیسر کلیم الدین احمد کی زیر نگرانی تحقیقی مقالہ لکھا جس پر انھیں ۱۹۵۶ء میں یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ کہا جاتا ہے کہ بہار میں اردو ادب میں پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری انھیں کو ملی۔ حسنین صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے ادب سے کیا۔ ان کی کہانیاں غنچہ، پھول اور پیام تعلیم وغیرہ میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ "بہار کے نو چراغ" کے نام سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا "مرزا محمد علی فدوی" کے نام سے ان کا تحقیقی مقالہ دو جلدوں میں ۱۹۵۴ میں شائع ہوا۔ انھوں نے ایک ڈرامہ لکھا تھا "برزخ کا مشاعرہ" جس کے دو اڈیشن شائع ہوئے۔ انشایئے پر ان کی کتاب "صنف انشائیہ اور اور انشایئے" کے کئی اڈیشن شائع ہوئے۔ افسانوں، خاکوں اور رپورتاژ پر ان کی کتاب "نیل مرام" ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ "نشاط خاطر" کا پہلا اڈیشن ۱۹۷۶ء اور دوسرا ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ کلیم الدین احمد پر مقالات کا ایک مجموعہ "حیات کلیم" کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

مرحوم کی ساری زندگی درس و تدریس میں گزری، وہ مگدھ یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہوئے تھے اور یہیں ریڈر اور پروفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

ادارہ "مکتبہ جامعہ" مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

رسالہ جامعہ سر سید نمبر
''سرسیدؒ کی معنویت''

مدیر: پروفیسر شمیم حنفی
نائب مدیر: سہیل احمد فاروقی
مبصر: ڈاکٹر عبدالستار
قیمت: ۸۰/- روپے
ناشر: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

سر سید منفرد اور مجتہد دانشور تھے۔ ان کا شمار صف اول کے ادیبوں اور صاحب فکر و نظر میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سماجی، ثقافتی، مذہبی، سیاسی، تاریخی اور دیگر موضوعات پر بڑی ذہانت سے لکھا اور اپنے خیالات و نظریات سے ایک پورے دور کو متاثر اور متحرک کیا۔ انھوں نے اپنے جدید خیالات اور فکر سے اپنے دور کے قدیم اور جدید اہل فکر کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔

انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان کا شاہکار ''تہذیب الاخلاق'' (۱۸۷۰ء) تھا جس نے ادبی صحافت کی قابل رشک معراج حاصل کی۔ ان کے دور کا ہر بڑے سے بڑا ادیب ''تہذیب الاخلاق'' میں چھپنے کے لیے کوشاں رہا۔

رسالہ 'جامعہ' پچھلی نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے اردو ادب کی آبیاری کر رہا ہے۔ اور اب تک تقریباً ایک درجن کے قریب خاص نمبر شائع کر چکا ہے جو تمام اردو ادب اور صحافت کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں۔

''سرسید کی معنویت'' میرے اندازے کے مطابق پچھلے دو برس کی محنت شاقہ سے تیار ہوا ہے۔ اس کے مضمون نگاروں میں پروفیسر آل احمد سرور، سید محمد احمد، مولوی عبدالحق، عنایت اللہ دہلوی، شیخ محمد اکرام، افضال الرحمٰن، الطاف حسین خاں شروانی، سید فرخ جلالی، جواہر لال نہرو (ترجمہ سید عابد حسین) محمد مجیب (ترجمہ محمد مہدی) انور معظم، مشیر الحق ترجمہ اختر الواسع، شوکت

اللہ خاں، ظفر احمد نظامی، شان محمد، ابوالکلام قاسمی، شاہ محمد وسیم، معین الدین، مسرور علی اختر ہاشمی، صفدر امام قادری، سعید الظفر چغتائی، الطاف احمد اعظمی، اشفاق محمد خاں، خورشید اکبر، تجمل حسین خاں اور معصومہ میر ہیں۔

اس رسالہ کے مضمون نگاروں میں اکثر کا شمار ادب کے چوٹی کے اہل قلم میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنے خون جگر سے اردو ادب کی آبیاری کی ہے۔ رسالہ 'جامعہ' کو بین اقوامی برادری میں روشناس کرانے اور موجودہ معیار تک پہنچانے میں اس کے مدیر پروفیسر شمیم حنفی کا بہت اہم کردار رہا ہے۔

رسالہ 'جامعہ' کا تازہ شمارہ ''سرسید کی معنویت'' ۲۹ عنوانات پر مشتمل ہے۔ ''سرسید میموریل سوسائٹی: ایک تجزیہ'' کے عنوان سے پروفیسر آل احمد سرور صاحب کا مضمون قابل قدر ہے۔ اس میں جو مشورے سرور صاحب نے دیے ہیں ان پر عمل کیا جائے تو موجودہ و آیندہ نسلوں کے لیے کار آمد ثابت ہوگا۔ ''سرسید احمد خاں ۱۸۹۸۔۱۸۱۷ء سفر نامہ زندگی کے جستہ جستہ حالات'' کے عنوان سے سید محمد احمد صاحب کا مضمون سرسید کی زندگی کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ اس مضمون میں پیدائش رسم بسم اللہ، مختلف فنون کی تکمیل، فن حدیث و تفسیر، تیراکی اور تیر اندازی کا فن، صحافتی زندگی کا آغاز، شادی، والد کی وفات، ملازمت، تصنیف و تالیف، خطاب، محمڈن ایسوسی ایشن کا قیام، علی گڑھ کالج کا قیام کے علاوہ سرسید احمد خاں کی زندگی میں پیش آنے والے تقریباً تمام واقعات کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ اس مضمون کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان بہت ہی سادہ اور سلیس استعمال کی گئی ہے جسے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام حالات اور واقعات کو زمانی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ مضمون نہایت جامع مدلل اور دلچسپ ہے

''سرسید احمد خاں کی والدہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں سرسید احمد خاں کی والدہ سے متعلق ان واقعات کو پیش کیا گیا ہے جن کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی والدہ نے سیر سید کی کس طرح اصلاح اور تربیت کی، اور اچھے اخلاق سے پیش آنے کی تاکید کی ہے۔ اس مضمون کے ذریعہ سرسید کی والدہ کی شخصیت اور ان کے اخلاقی رجحانات کو پیش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون سے کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے کہ سرسید کی والدہ کیسی عالی خیال، دانش مند، اور نیک طینت بی بی تھیں۔ اور سرسیدؒ کی زندگی پر ان کی والدہ کا کیا اثر پڑا۔

''سرسید احمد خاں'' کے عنوان سے عنایت اللہ دہلوی کا مضمون ہے۔ مضمون کیا ہے، دہلی

سے علی گڑھ اور علی گڑھ سے الہ آباد کا مختصر سفر نامہ ہے۔ اس مضمون میں جس طرح عنایت اللہ صاحب نے ہر ہر چیز پر باریکی سے غور کیا ہے اور وہ بھی آٹھ سال کی عمر میں یہ اپنے آپ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ سرسید احمد خاں کی شخصیت اور رہن سہن کی جس طرح منظر کشی کی ہے وہ بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اتنی کم عمر میں اتنے واقعات کو یاد رکھنا، اسے ہم خداداد صلاحیت ہی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال اس سفر نامے سے بھی سرسید کی شخصیت کے کچھ پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور ان کی طبیعت کا میلان بھی واضح ہوتا ہے۔

''سرسید کا کردار'' کے عنوان سے شیخ محمد اکرام کا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے سرسید کے کردار کو واضح طور پر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے سرسید کی تحریروں کے آئینہ میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اعلا درجے کے کھرے انسان تھے۔ سرسید کے بہت سے نقائص کا راز بھی ان کی دیانتداری، اخلاص اور صاف گوئی میں چھپا ہے۔ اسلام اور بانی اسلام کی محبت جو سرسید کے دل میں تھی اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سرسید کے پاک اور بلند شخصی کیرکٹر پر حرف گیری وہی کرے گا جو حقیقت سے چشم پوشی کرے۔ سرسید کے واقعات زندگی دیکھیں تو خیال آتا ہے کہ یہ مومنانہ سیرت، یہ بے ریائی، بے حرصی اور جرآت اسی خوش نصیب کو میسّر ہو سکتی تھی، جس کا نام سرسید احمد خاں ہے۔

''سرسیدؒ کے ایک معاصر، مولوی مظہر اللہ پھر ایونی'' افضال الرحمٰن صاحب کا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے سرسید کی اس تربیت کی طرف اشارہ کیا ہے جو وہ اپنی اولاد اور گھر کے دیگر افراد کو دیتے تھے۔ اس مضمون میں راس مسعود کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ بڑا ہی دلچسپ اور متاثر کرنے والا ہے۔

''سرسید اور علی گڑھ تحریک کے موافق اور مخالف'' کے عنوان سے سید فرخ جلالی کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں ۱۸۵۷ء کے بعد جو حالات رونما ہوئے ان حالات کا سرسید نے بغور جائزہ لینے کے بعد جو حکمت عملی اپنائی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد، اس کے مقاصد، اور ان مقاصد کو عملی جامعہ پہنانے میں جن حضرات نے حصہ لیا ان کے ناموں۔ کی فہرست بھی پیش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی علی گڑھ کالج کا قیام اور ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت کے بارے بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں لائق مصنف نے سرسید کے موافقوں اور مخالفوں کو موضوع بنایا۔

اور وہ اس میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ سید فرخ جلالی نے موافق اور مخالفین کے ناموں کی

فہرست بھی مضمون میں شامل کی ہے۔ اس مضمون کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مخالفت اور موافقت کے سیلاب نے یہ ثابت کردیا کہ سرسید صراط مستقیم پر تھے۔

"سرسید، اسلام اور مسلمان" کے عنوان سے جواہر لال نہرو کا مضمون (ترجمہ سید عابد حسین) جامع اور مدلل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مسلمانوں کی جو کیفیت تھی اور ذہنی طور پر ان میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کے پُر کرنے میں سرسید نے جو نمایاں کردار ادا کیا اس کی طرف جامع انداز میں اور تاریخی شواہد کی بنیاد پر خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ نہرو جی نے مغلوں سے لے کر فرنگی دورِ حکومت تک مسلمانوں اور ہندوؤں کے حالات بھی مختصر طور پر پیش کیے ہیں۔ مسلمانوں کی فکر، سرکاری ملازمتوں میں ان کی سعی اور مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق ذہنی رجحانات کا ذکر بھی اس مضمون میں ملتا ہے۔ خاص طور پر مغربی تعلیم سے متعلق۔ اس مضمون سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے ہندو، مسلمان اور عیسائیوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی بھی قوی کوشش کی، وہ انھیں ایک ہی قوم تصور کرتے تھے۔ ان کی فلاح کے لیے انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

"سرسید کی مذہبی فکر" کے عنوان سے محمد مجیب صاحب کا مضمون (ترجمہ محمد مہدی) پر کشش ہے۔ اس میں سرسید کی ابتدائی زندگی اور تعلیم کا مختصر بیان ہے۔ اس مضمون کے ذریعہ سرسید کی اس مذہبی فکر کی وضاحت کی گئی ہے جو سرسید کے سفر انگلستان کا موجب بنی اور جس کے نتیجے میں انھوں نے سر ولیم میور کے حضور پر لگائے گئے الزامات کی تردید کی۔ اس مضمون سے سرسید کے سیکولر ذہن رکھنے کے کئی شواہد ملتے ہیں اس مضمون میں سرسید کے مذہبی تفکرات کو واضح طور پر پیش کیا گیا ہے مجیب صاحب سرسید کے تفکرات پیش کرنے میں کافی حد تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

اس رسالہ سے مدیر کے ان جذباتی احساسات کا اظہار بھی ہوتا ہے جو انھیں سرسید احمد خاں سے ہیں کیونکہ اگر مدیر میں جذبہ نہ ہوتا تو رسالہ، مضامین کی اتنی عمدہ ترتیب کے ساتھ شائع نہ ہو پاتا۔

زیر نظر رسالہ جاذب نظر میں ہونے کے ساتھ ساتھ سرسید کی شخصیت اور علمی، ادبی خدمات کا مکمل آئینہ ہے۔ اس کے لیے میں پروفیسر شمیم حنفی صاحب اور سہیل احمد فاروقی صاحب کے ساتھ ساتھ ان تمام علم دوست حضرات کا شکرگزار ہوں جن کی کاوشوں سے یہ رسالہ منظر عام پر آیا۔

رسالہ کا گٹ اپ دیدہ زیب ہے اور قیمت بھی بہت ہی مناسب خوبصورت ٹائٹل اور خوشنما تحریر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

نمک (ناول)

ناول نگار: اقبال مجید
مبصر: ڈاکٹر فرحت فاطمہ
قیمت: ۱۰۰ روپیہ
تقسیم کار: ادارۂ نیا سفر ۶۸ مرزا غالب روڈ۔ الہ آباد۔ ۳

اقبال مجید اردو کے افسانوی ادب میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ "نمک" اقبال مجید کا تازہ ترین ناول ہے جو اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کی جزوی مالی امداد سے شائع کیا گیا ہے۔ اقبال مجید کہانی کہنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے واقعات میں منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول بڑی سبک روی سے آگے بڑھتا ہے۔ انھوں نے اپنے کرداروں کے عادات و اطوار کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار زہرہ خانم کا تعارف ناول کے شروع میں ہی ان الفاظ میں کراتے ہیں۔" نام: زہرہ خانم۔ عرفیت محبوب جان خلق میں محبوب جان اترولہ والی کے نام سے مشہور رہی۔

پیشہ۔ دولت مند سرکاروں میں ارباب نشاط کی ناچ گانے سے دلبستگی۔

فنی فوقیت: رقص میں کتھک اور موسیقی میں واجد علی شاہی عہد میں موزوں کی گئی ٹھمریوں میں تازہ کاری۔ زہرہ خانم ۹۲ برس کی عمر کو پہنچ گئی ہیں چہار دھام دھوم مچا کر جب اپنی ساٹھویں سالگرہ منا چکیں تو سول سروسز کے امتحان میں فضیلت پانے والے گورے چٹے خوبرو پوتے نے دارالاستکبار کے کمرہ نمبر ایک میں برائے تحفظ نام و ناموس انھیں خلقت کے حافظے سے اوجھل کرنے کے لیے نظر بند کر دیا اور پچھلے ۳۲ سال سے وہ کمرہ نمبر ایک میں قید ہیں۔

اقبال مجید کا ناول نمک زہرہ خانم کی آپ بیتی، محاسبہ یا تجزیہ ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار زہرہ خانم پر کیا بیتی، کیا گزری اور اس نے زندگی کو کیسا پایا، یہ ایک چونکا دینے والی کہانی ہے۔ جس میں زندگی کی جدوجہد سے گزرتے ہوئے ایک ایسی عورت کی زندگی کا المیہ بیان کیا گیا ہے جو ایک کمرے میں نظر بند قید تنہائی کاٹتی ہے اور اپنے ماضی کی یادوں میں زندہ ہے " زہرہ خانم کا ماضی جس میں نواب مختار زمن کا پر تکلف دستر خوان تھا اور دستر خوان پر مرغوب کی ماں کی بنائی ہوئی خاصے کی ماش کی کھچڑی جس میں باداموں اور پستوں کو اس نفاست سے کترا گیا تھا کہ چاول اور ماش کی دال کا دھوکا ہو رہا تھا۔ زہرہ خانم اس نعمت کا لقمہ اپنے تصور میں اٹھانے کو ہی تھی

کہ اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور بڑی بہو قہر غضبناک حالت میں اندر گھسی اور زہرہ خانم کی یادوں کا سہرا ٹوٹ گیا۔"

اس ناول کی فضا اور ماحول کو اقبال مجید نے جس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے اسی انداز میں ناول کے کینوس پر پیش کردیا ہے۔ ناول کی فضا تصنع کی شکار نہیں ہے۔ فضا اور ماحول کے بدلتے ہوئے رنگوں میں رشتوں کی شکست وریخت اور جدید وقدیم تہذیبوں کے نسلی تصادم کی قوس قزح پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

اس ناول میں ایسے افراد کی کہانی بیان کی گئی ہے جو ذلتوں کے مارے ہوئے ہیں، جو اندر سے شکستہ اور تنہائی ہیں۔ اور ان کی زندگی کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اپنی یہ قید تنہائی انھوں نے خود سے نہیں انتخاب کی ہے۔ یہ تنہائی تو ان پر حالات نے مسلط کردی ہے۔ یہ تقدیر کے مارے ہوئے اور ستائے ہوئے لوگ ہیں ماضی کی المناک یاد میں جونک کی طرح ان کے حواسوں سے چمٹی ہوئی ہیں۔ اور ان سے چھٹکارہ کسی صورت بھی ممکن نہیں ہے۔ مادی آسایشوں کے باوجود یہ یادیں ان کے اندر اپنے وجود کی آزادی اور اپنے ماضی سے چھٹکارے کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتیں

دارالاشکبار کے مکین اپنی زندگی کی صورت حال سے نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں ان کی جہد مسلسل جاری رہتی ہے اسی لیے ہر ایک اپنے سینے میں اپنا سوز دروں لیے پھرتا ہے اور سب کے سب اپنے ہی دکھوں میں اپنا سراغ پاتے ہیں اور اپنے غموں کی امانت سے دست بردار نہیں ہوتے۔

"زہرہ خانم محرومیت کے شدید کرب سے دوچار ہوکر اپنے آپ سے مخاطب ہوکر کہتی ہے۔" بھرا پُرا گھر ہے لق ودق کمرے ہیں۔ بچوں کی قلقاریوں سے بھرا آنگن، چائے پارٹیوں اور دعوتوں کا شور، زرق برق نئے فیشنوں کے ملبوسات اور ان سب کے درمیان ٹوٹے پھوٹے پالش اترے فرنیچر یا کباڑ کے ڈھیر کی طرح زہرہ خانم۔ میرے مالک زندہ رکھنا تھا تو میری زندگی کے سارے موسم، سارے رنگ اور سارے سُروں کو بے سُر کرکے اس قید تنہائی میں ان بے رحموں کے رحم کرم پر کیوں زندہ رکھا۔"

اقبال مجید تلخ حقائق کا بیان بھی بڑے موثر انداز میں کرتے ہیں۔ یہاں زہرہ خانم کی حال کی زندگی کو حیات ماضی کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ اس میں خاصے کامیاب ہیں۔ انھوں نے فرد اور تہذیبی اقدار کے آپس کے رشتوں کے متعلق بڑا خوبصورت انداز بیان اختیار کیا ہے۔ جذبوں پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ ان کا شعور بڑا منظم اور ان

کے تخلیقی اعتماد کا تاثر بھی زیادہ گہرا اور واضح ہے۔ ان کا تاریخی شعور بھی بڑا نکھرا ہوا ہے وہ اپنی وسیع تاریخی معلومات کے ذریعے اپنے عہد کے ہر قسم کے حالات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ جدید موضوعات میں چھوٹا کمپیوٹر لیپ ٹاپ Lap Top کا استعمال اور جینٹک سائنس Genetic Science کی مدد سے کلوننگ کے ذریعہ انسان کی کاربن کاپی کا اضافہ جیسے موضوعات کو اپنی کہانیوں اور ناولوں میں پیش کر کے انھوں نے اپنے مطالعہ و مشاہدہ کی وسعت اور فنی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ اقبال مجید نے اس ناول "نمک" میں جگہ جگہ معنی خیز اشاروں کے ذریعے زہرہ خانم کے ماضی کی بازیافت کی ہے اور اس کام کے لیے کسی شعر یا نظم کے حوالے سے یا کسی خاص واقعے کی طرف اشارہ کر کے انھوں نے یہ رمزیہ انداز اختیار کیا ہے۔

ناول میں زبان کا روایتی استعمال اور علامتی و تمثیلی پیرایۂ بیان اقبال مجید کے اسلوب کو نئی سمت عطا کرتا ہے۔

زہرہ خانم دنیا سے آخری سفر پر رخصت ہوتے وقت اپنی نواسی کو حسرت سے دیکھ کر آہستہ سے کہتی ہیں "بیٹا زہرہ کا "نمک" اٹھ چکا جو باقی تھا وہ ذائقے کے لیے نہیں زخموں پر چھڑکنے کے لیے ہے۔" اس طرح زہرہ خانم کی پُر الم قید تنہائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور "نمک" کا یہ علامتی انداز حساس قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

توقع ہے کہ اقبال مجید کا یہ ناول "نمک" اردو کے افسانوی ادب میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گا اور ان کے فن کے ارتقا کو سمجھنے میں بھی اس سے خصوصی مدد ملے گی۔

ٹکڑے ٹکڑے چاند

شاعرہ: ثریا صولت حسین
مبصر: لطیف احمد سبحانی

پتہ: صولت حسین، فلیٹ نمبر ۹ ڈی، انمول اپارٹمنٹ میکو سا باغ ناگپور ۴۴۰۰۰۰

دیگر ادبی مراکز کی طرح علاقہ ودربھ بھی اردو زبان و ادب کا ایک اہم مرکز ہے یہاں ہر زمانہ میں اہل علم اور صاحب قلم ہستیاں پیدا ہوتی ہیں جنھوں نے اردو شعر و ادب کی شمع کو جلائے رکھا۔ اس کا ثبوت وہ کتابیں ہیں جو آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔ "ٹکڑے ٹکڑے چاند" ثریا کا شعری مجموعہ ہے جو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے جزوی مالی اشتراک سے اشاعت پذیر ہوا ہے اس میں ایک نعت، ۵۷ غزلیں، اور ۱۳ نظمیں، چند قطعات اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ اس کتاب کا انتساب "اس بڑھیا کے نام ہے جو کبھی چاند پر چرخہ کاتا کرتی تھی۔" ٹکڑے ٹکڑے چاند

کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ وہ لکھتی ہیں کہ "ماہ نو سے ماہ کامل کا روپ دھارتے تک چاند کتنی صورتیں بدلتا ہے اور وہ کتنے ٹکڑوں میں بٹ کر اپنا سفر مکمل کرتا ہوا نظر آتا ہے اور میرا یہی خیال اس عنوان کا محرک بن گیا۔" ابتداء میں ماہر فن عروض حضرت علامہ شارق جمال ناگپوری نے اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"اس مجموعے میں ایسے کئی شعر ہیں جن کی پختگی پر اور صحیح تخلیلی پیکر ہونے پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ثریا نے اپنے تخیل کو وہ الفاظ دیے ہیں جن سے شعر کا حسن نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔"

یہ ثریا کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ جس وقت ایک ادبی تقریب میں "ٹکڑے ٹکڑے چاند" کا اجرا جناب ڈاکٹر خلیق انجم کے دست مبارک سے ہوا اس وقت محترمہ ثریا عارضۂ قلب کی وجہ سے ہسپتال میں زیر علاج تھیں۔ وہ زندگی کو کس انداز نظر اور نقطۂ نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

مرنے کا بھی، بہانہ ملتا نہیں ثریا
جینے کے سب سہارے چھینے گئے ہیں مجھ سے

میں نے مرنے کی اب تو ٹھانی ہے
مجھ کو حاجت نہیں طبیبوں کی

دنیا میں جینے کی خاطر
ہر سانچے میں ڈھلنا ہوگا

کچھ تصویریں ایسی ہوتی ہیں جن کا رنگ پھیکا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں کوئی چمک نہیں ہوتی، رخساروں پر کوئی سرخی نہیں ہوتی لیکن دل میں اتر جاتی ہیں اور اپنا ایک لاثانی نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ یہی خوبی ثریا کی غزلوں میں ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

ہم مجسم تھے غم کا افسانہ
ہم مسرت کی بات کیا کرتے

نیند کانٹوں پہ اُس کو آتی ہے
زندگی میں زر کا جو نہ مارا ہو

غزلوں میں عروضی پختگی ہے۔ بحر اور وزن کے اعتبار سے کہیں خامی نظر نہیں آتی معائب شعری سے پاک اوصاف کلام ہے۔ بے ساختہ پن، بلندی فکر، پرواز خیال، کے ساتھ ایک شعری وفنی افکار سے شعر میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ جذبات کے اظہار میں دلآویزی ہے۔ عام فہم زبان کا استعمال قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتی ہیں۔

شور طوفاں ہے آج ساحل تک
کون لائے خبر سفینوں کی
سبز پتوں سے جھانکتے غنچے
سبھی سلام دیتے ہیں
قلب مخلص تو مری دولت ہے
قدر گہر وہ آشنا جائے

ان کے کلام میں ہماری شاعری کی روایتی آب وتاب بھی نظر آتی ہے۔ کہیں تفسیر صبح وشام بھی ہے، کہیں رومانیت کا رنگ اور کہیں غم جہاں کا عکس بھی ملتا ہے۔ تجربے کی گہرائی، مشاہدے کی قوت جذبات کی رنگینی، فکر واحساس کی لطافت بھی ہے اور تخلیقی عمل میں گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔

انھوں نے نئے نئے موضوعات پر پابند نظمیں بھی لکھی ہیں جس میں ربط اور تسلسل کے ساتھ معنی اور مفہوم کی وسعت بھی ہے۔ پوری نظم پڑھنے کے بعد اس کا مطلب واضح اور صاف سمجھ میں آجاتا ہے اور قاری غور وفکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نظموں میں فکری اٹھان، احساس کی توانائی اور روز مرہ کی زندگی کے نشیب وفراز بھی ہیں۔ پھول داتی، سزا دو مجھے، سفر وسیلۂ ظفر کیا، پیاری سڑک ان کی مشاقی اور ماہرانہ دسترس کی دلیل ہیں۔ پھول داتی بہترین نظم ہے۔ جس میں زندگی، زندگی کے نشیب وفراز، اس کی حقیقت، اس کے مختلف روپ اور رنگ، اس کا اصل چہرہ اور اس کی بدلتی ہوئی رنگت کا ذکر کیا گیا ہے۔

ان کے کلام میں زبان وبیان پر گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ الفاظ ومحاورات کا صحیح استعمال ملتا ہے۔ نہ بھاری بھرکم الفاظ ہیں، نہ بوجھل ترکیبیں، اور نہ ہی ابتذال ورکاکت، کی ناگواری نظر آتی ہے۔ نظم "پیاری سڑک" میں وہ کہتی ہیں۔

میرے دل کو لبھائے یہ پیاری سڑک
دلیس بابل کے جائے یہ پیاری سڑک

دے کے جائے صبا خوشبوئیں گاؤں کی
میرے بھیا کو لائے یہ پیاری سڑک
اُس نے دیکھا ہے چپ رہ کے دل کا جنوں
سولیوں پر چڑھائے یہ پیاری سڑک

خوبصورت گیٹ اپ، سفید دبیز کاغذ، بے داغ روشن طباعت اس شعری مجموعہ کو صرف ساٹھ روپیوں کے عوض خرید کر پڑھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

احساس
(شعری مجموعہ)

شاعر: واصف عابدی
تبصرہ: شیخ سلیم احمد
ناشر: اردو مرکز سہارنپور
قیمت: ساٹھ روپے

''احساس'' واصف عابدی کا ساتواں شعری مجموعہ ہے جو اردو مرکز سہارنپور کے نوجوان اور فعال سکریٹری ہارون صابر کی زیرنگرانی بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ حریم فکر عابدی کا پہلا مجموعہ تھا جو تقریباً چالیس سال پہلے منظر عام پر آیا تھا۔ اسی زمانہ میں یہ مجموعہ میری نظر سے گزرا تھا۔ چاردہائیوں پر محیط یہ شعری ریاضت خود اپنے میں ایک قابل تعریف کارنامہ ہے۔ یہ ایک خاصا طویل سفر ہے۔ اب ان کے یہاں بیان واسلوب کی پختگی اور خیالات کی بوقلمونی کی جلوہ آرائی صاف نظر آتی ہے۔ عابدی کا ساتواں مجموعہ پڑھ کر یہ احساس ابھرتا ہے گویا وہ غالب کے اس شعر کا پیکر بن گئے ہیں:

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شاعر کا خیال ہے فکری اور بامقصد شاعری کا چراغ احساس سے روشن ہوتا ہے اسی لیے انھوں نے اس مجموعہ کو ''احساس'' کا نام دیا ہے۔ یہ بیان درست ہے مگر مکمل نہیں ہے۔ ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اچھی شاعری احساس وجذبہ کی تمازت وآنچ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ شاعری میں خیالات، مشاہدات اور واقعات احساس وجذبہ کی بھٹی میں جل کر دوسرا جنم لیتے ہیں۔

عابدی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر اس مجموعہ میں چند نظمیں بھی شامل ہیں جو ہر صنف سخن

پر ان کی دسترس کا ثبوت ہیں اور عصری تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔ان نظموں میں حمد، نعت و منقبت کے علاوہ کچھ قرآنی آیات اور گیتا کے چند اشلوک کے ترجمے بھی شامل ہیں۔جن شخصیات نے شاعر کو متاثر کیا ہے ان میں پنڈت نہرو، علامہ اقبال، مرزا غالب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔یہ نظمیں بہت فکر انگیز ہیں۔ نہرو سے متعلق ایک شعر دیکھیے:

جواہرات وبا با نثار ہا سب کو محبتوں کی ضیا با نثار ہا سب کو

مرزا غالب کے لیے خراج عقیدت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

محور علم وادب اے نازش اہل عقول
اے معانی کے پیمبر، فکر و دانش کے رسول

علامہ اقبال کو اس شعر سے مخاطب فرماتے ہیں:

شاعر مشرق ہے تو اے صاحب فکر رسا
ڈوب سکتا ہی نہیں سورج تیرے اقبال کا

سانحہ کربلا اردو شاعری کا ایک اہم استعارہ بن گیا۔تاریخ کا یہ باب قربانی اور ایثار کی ایک بے مثال علامت ہے۔اردو کے زیادہ تر شعرا کے یہاں ایسے اشارے کے مل جائیں گے جو اس واقعہ کے درد و کسک کے عکاس ہیں۔اسلام کی تاریخ کا یہ المناک باب آفاقی پیکر بن کر پوری انسانیت کا درد بن گیا ہے، واصف عابدی کے یہاں تو یہ استعارہ گویا ان کے گھر کی روایت ہے جس کی یاد کو وہ مجلسوں کے ذریعہ زندہ رکھتے ہیں۔دیکھیے غیر شعوری طور پر یہ المیہ عابدی صاحب کے شعروں سے کیسے جھانکتا نظر آتا ہے:

پائے مظلوم ہے گرتی ہوئی دیوار نہیں
ظلم کی چیخ ہے زنجیر کی جھنکار نہیں
تاریخ ظلم اس کو چھپائے گی کس طرح
ایک اک صدی کے رخ پہ ہے بکھرا ہوا لہو
اسے تشنہ لبی نے مار ڈالا ہے
وہ دریا کو بھی صحرا بولتا ہے

سانحہ کربلا شعور کی لے بن کر بھی گونج رہا ہے۔ان کے اسلاف کی قربانی کی یہ بے مثال تاریخ صدیوں سے خون بن کر ان کی رگوں میں گردش کر رہی ہے۔اس کا برملا اور بلا واسطہ اظہار کیسے نہ ہوتا:

اندھیرے ظلم کے چھٹنے لگے ہیں
اجالا مل رہا ہے کربلا سے

بندگی سے بھی ہو شان بوترابی آشکار
تیری پیشانی رہے خاک شفا کے دوش پر

پروفیسر مسعود حسن بجا کہتے ہیں کہ غزل فردیات کی شاعری ہے۔ وہ ہندی کی مقبول صنف دوہے کو غزل کا پیش رو مانتے ہیں۔ بلاشبہ غزل سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے جو پتہ مارے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ صدیوں کی حکمت و دانش غزل کے دو مصرعوں میں سمٹ آتی ہے۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں۔ واصف عابدی کے یہاں فردیات کی بہار بھی دیکھیے۔ خاص غزل کے رنگ کے چند نمونے

سروں کے پیڑ کٹنے کا ہے موسم
چمکتے خنجروں کی دھار پڑھنا
کبھی فرصت ملے تم کو تو آکر
میرے گھر کے درو دیوار پڑھنا
میرے اسلاف کی سیرت رہی ہے
کلام حق سر دار پڑھنا

مگر ان اشعار میں بھی کربلا کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اس عنصر نے شعروں کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ "احساس" صوری حسن سے بھی آراستہ ہے۔ عمدہ کاغذ شفاف کتابت۔ سلیقہ و محبت نے گیٹ اپ کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اردو مرکز سہارنپور جس کے لیے مبارکباد کا مستحق ہے۔ حال ہی میں مرکز نے "آبشار" کے نام سے سہارنپور کے شعرا کا تذکرہ شائع کیا تھا جس کی اہل ادب نے کافی پذیرائی کی ہے۔

مطبوعات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

اقبال کا نظریہ شعر اور ان کی شاعری۔ آل احمد سرور -/45

داستان امیر حمزہ شمس الرحمٰن فاروقی -/60

فکر انسانی کا سفر ارتقا خواجہ غلام السیدین -/45

غالب کی شخصیت اور شاعری رشید احمد صدیقی -/45

پانچ جدید شاعر حمید نسیم -/210

قاری سے مکالمہ شمیم حنفی -/150

اعلا تعلیم خطبات ڈاکٹر ذاکر حسین -/120

اردو زبان ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ

مرتبہ پروفیسر صغرا مہدی -/75

فراق دیار شب کا مسافر مرتبہ پروفیسر شمیم حنفی -/150

بیاں اور اختر سعید خاں -/144

لفظوں کی انجمن میں ڈاکٹر سید حامد حسین -/135

تعبیر و تفہیم ڈاکٹر خلیق انجم -/135

معاصرین و متعلقات مولانا ابوالکلام آزاد

عبدالقوی دسنوی -/60

سرسید سے اکبر تک مرتبہ شمیم حنفی -/90

سیاہ فام ادب مرتبہ شمیم حنفی 40/

حامد بگوش کے قلم سے مرتبہ مظفر علی سید 80/

مجلد -/150

انصیں (نفسیاتی مضامین) عبداللہ ولی بخش قادری -/60

جو رہی سو بے خبری رہی خود نوشت ادا جعفری -/200

قلم اور قدم سید حامد -/75

مستقبل کی طرف (خطبات جلسہ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ)

مرتبہ خواجہ محمد شاہد / خالد کمال فاروقی -/150

مولانا ابوالکلام آزاد فکر و نظر کی چند جہتیں

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی -/60

جدید ادبی تحریکات ڈاکٹر سید حامد حسین -/51

صحرا میں لفظ فضیل جعفری -/90

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ ڈاکٹر مومن محی الدین -/45

ٹیلی ویژن نشریات تاریخ تحریر تکنیک انجم عثمانی -/90

انشائے غالب مرتبہ رشید حسن خاں -/60

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ ابراہیم یوسف -/45

تاریخ نگاری قدیم و جدید رجحانات ڈاکٹر سید جمال الدین -/51

انداز گفتگو کیا ہے شمس الرحمٰن فاروقی -/75

دستک اس دروازے پر ڈاکٹر وزیر آغا -/51

سرسید اور روایت کی تجدید مونس رضا / مسعود حسین خاں -/10

تفہیم رشید حسن خاں -/75

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں عبدالقوی دسنوی -/75

کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے نقی حسین جعفری -/51

شناس و شناخت انور صدیقی -/60

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج ڈاکٹر سید ظہور قاسم -/10

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم اختر الواسع -/10

آزمائش کی گھڑی سید حامد (زیر طبع)

حموربی اور بابلی تہذیب و تمدن مالک رام -/75

جام جہاں نما گربچن چندن -/75

اردو ناول میں عورت کا تصور فہمیدہ کبیر -/75

اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خان -/75

تاثر نہ کہ تنقید صدیق الرحمٰن قدوائی -/51

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے طاہر مسعود -/66

تحریریں ڈاکٹر اسلم پرویز -/51

انشائیہ کے خدوخال وزیر آغا -/35

افکار اقبال عبدالسلام خان -/125

تذکرہ ماہ و سال مالک رام -/125

تحقیق نامہ مشفق خواجہ -/125

کتاب	مصنف	قیمت
سحر کے پہلے اور بعد	سید اظفر چغتائی	51/-
پہچان اور پرکھ	پروفیسر آل احمد سرور	51/-
اقبال کا نظریہ خودی	عبدالمغنی	150/-
قلندر رتجل جرات	جمیل جالبی	10/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	وارث علوی	36/-
تاریخ اودھ	قاسم علی سجاد پوری	27/-
ابوالکلام آزاد کا ذہنی سفر	ظ انصاری	33/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	60/-
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں	مالک رام	51/-
لسان الصدق	مولانا ابوالکلام آزاد	75/-
اردو میں کلاسیکی تنقید	پروفیسر عنوان چشتی	48/-
تفہیم و تنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	40/
نذر مختار	مرتبہ مالک رام	101/-
تحقیقی مضامین	مالک رام	60/-
خسرو نامہ	مجیب رضوی	21/-
تحفۃ السرور	مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی	75/-
جائزے	مرتبہ مظفر حنفی	45/-
نذر بجنوری	صدیقہ بیگم	25/-
ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	15/-
الفاظ کا مزاج	غلام ربانی	24/-
تقریر و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	15/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	(زیر طبع)
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	(زیر طبع)
علامتوں کا زوال	انتظار حسین	36/-
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ مالک رام	14/-
تذکرۂ معاصرین سوم	مرتبہ مالک رام	زیر طبع
تذکرۂ معاصرین چہارم	مرتبہ مالک رام	40/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	35/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	30/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	6/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم	ڈاکٹر سلامت اللہ	35/-
اثبات و نفی	شمس الرحمٰن فاروقی	40/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	48/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغرا مہدی	(زیر طبع)
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	12/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	12/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	11/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن ملا	16/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ عبداللطیف اعظمی	12/50
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	7/50
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	22/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ مالک رام	زیر طبع
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	16/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	24/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	5/50
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	ضیاء الحسن فاروقی	4/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	زیر طبع
مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	90/-
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	27/-
باتیں کچھ سریلی سی	داؤد رہبر	36/-
اردو امیز	مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی	36/-
روح تہذیب	خواجہ غلام السیدین	6/-
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	15/-
دبستان آتش	شاہ عبدالسلام	16/-

تعلیم

کتاب	مصنف	قیمت
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	51/-
ڈسپلن کی تعلیم و تربیت	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	90/-
الجھنیں	عبداللہ ولی بخش قادری	0/-
مفکرین تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	20/-
استادوں کی تعلیم و تربیت	مسعود الحق	ریر ط
تعلیم و تعلم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	5/-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	5/-

کتاب	مصنف	قیمت
مشقی تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	45/-
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	21/-
آسان اردو ورک بک	شکیل اختر فاروقی	75/-
تعلیم و تربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	51/-
تعلیم اور رہنمائی	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	35/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں	معین الدین	54/-
ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	33/-
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	36/-
سرسید کی تعلیمی تحریک	اختر الواسع	زیر طبع
تعلیم اور اس کے وسائل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	36/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)	شکیل اختر فاروقی	27/-
تعلیم، نظریہ اور عمل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	36/-
تعلیم فلسفہ اور سماج	ڈاکٹر سلامت اللہ	60/-
بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	زیر طبع
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	18/-
عبارت کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	18/-
انشا اور تلفظ	رشید حسن خاں	12/-
تاریخ کیسے پڑھائیں	مسرور ہاشمی	زیر طبع
بچوں کا آرٹ	عبید الحق	24/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

کتاب	مصنف	قیمت
جو رہی سو بے خبری رہی	خود نوشت ادا جعفری	200/-
دلی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن	15/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	کشمیری لال ذاکر	36/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی	51/-
چند تصویر بتاں	مولانا عبد السلام قدوائی	45/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	پروفیسر آل احمد سرور	8/-
صاحب جی، سلطان جی	ڈاکٹر اسلم پرویز فرخی	20/-
ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	75/-
شہید جستجو	ضیاء الحسن فاروقی	75/-
مولانا آزاد کی کہانی	ڈاکٹر ظفر احمد نظامی	18/0
نظام رنگ" (حضرت نظام الدین اولیا)	ڈاکٹر اسلم فرخی	زیر طبع
حیات جامی	مولانا اسلم جیراجپوری	12/-
نقش ذاکر	مرتبہ عبد الحق خاں	51/-
مالک رام ایک مطالعہ	مرتبہ علی جواد زیدی	50/-
عبد اللطیف اعظمی حیات و خدمات	مرتبہ انور صدیقی	18/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ	مترجم شمیم حنفی	40/-
مجیب صاحب احوال و افکار	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	90/-
حیات عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین)	ڈاکٹر صغرا مہدی	45/-
سلسلہ روز و شب (خود نوشت)	صالحہ عابد حسین	65/-
وحید شاعر اور شخص	مرتبہ یوسف ناظم	25/-
غبار کارواں	بیگم انیس قدوائی	27/-
فراق شخص و شاعر	مرتبہ شمیم حنفی	(زیر طبع)
حیات حافظ	اسلم جیراجپوری	15/-
افکار رومی	مولانا عبد السلام خاں	40/-
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری	پروفیسر ممتاز حسین	(زیر طبع)
مکالمات افلاطون	مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین	زیر طبع
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری	شفیق النساء بیگم	10/-
اب جن کے دیکھنے کو	بیگم انیس قدوائی	12/50
شاد عارفی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مظفر حنفی	24/-
حیات اسماعیل، حیات و خدمات	ڈاکٹر سیفی پریمی	18/-
مفتی صدر الدین آزردہ	عبد الرحمن پرواز اصلاحی	12/-
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	زیر طبع
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	25/-
اشخاص و افکار	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	12/
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	عبد اللطیف اعظمی	زیر طبع
گنجہائے گراں مایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
کیا خوب آدمی تھا	مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین	15/-
قدسیہ زیدی	کرنل بشیر حسین زیدی	زیر طبع
انشاء	مرزا فرحت اللہ بیگ	4/-
روسی ادب اول دوم	پروفیسر محمد مجیب	60/-

طنزیات، مزاحیات

کتاب	مصنف	قیمت
آخر کار	مجتبیٰ حسین	60/-
منجملہ	یوسف ناظم	51/-
خامہ بگوش کے قلم سے	مظفر علی سید مجلد 150/- غیر مجلد 80/-	
فی البدیہہ	یوسف ناظم	45/-

چہرہ در چہرہ	مجتبیٰ حسین	51/-
طنزیات و مضحکات	رشید احمد صدیقی	80/-
گوشے میں قفس کے	دلیپ سنگھ	45/-
فی الحقیقت	یوسف ناظم	45/-
فی الفور	یوسف ناظم	30/-
گول مال	شفیقہ فرحت	18/-
فی الحال	یوسف ناظم	18/-
رانگ نمبر	شفیقہ فرحت	18/-
بالکلیات	یوسف ناظم	18/-
برکت ایک چھینک کی	وجاہت علی سندیلوی	15/-
ذکر خیر	یوسف ناظم	21/-
بے پر کی	حضرت آوارہ	(زیر طبع)
خنداں	رشید احمد صدیقی	36/-
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری)	محمد یوسف پاپا	15/-
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	25/-

طب۔ ایلوپیتھی

طب یونانی اور کلچر	حکیم اشہر قدیر	60/-
فرہنگ اصطلاحات طب	ڈاکٹر اختر امرتسری	45/-
اخلاقیات طبیب	حکیم محمد سعید	20/-
اشارات قلب	پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم	6/-
مرضیات	حکیم نعیم الدین زبیری	75/-
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	ترجمہ نذیر الدین مینائی	25/-
ذیابیطس	ڈاکٹر محمد شعیب اختر	(زیر طبع)

سفرنامے، رپورتاژ

سیر کر دنیا کی غافل	صغرا مہدی	51/-
وسط ایشیا	آصف جیلانی	51/-
کولمبس کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	45/-
پشکن کے دیس میں	جگن ناتھ آزاد	25/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز	بیگم صالحہ عابد حسین	18/-
سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ)	خواجہ غلام السیدین	30/-
رہ نورد شوق	ڈاکٹر سید عابد حسین	14/50-
یادوں کے سائے	شفیق صدیقی	18/-

شعری مجموعے

طراز دوام	اختر سعید خاں	51/-
گاہے گاہے	رولینڈ لارنس	30/-
رنگ، خوشبو، روشنی	قتیل شفائی	80/-
کاسۂ خیال	عبدالمعروف خاں	51/-
میں سمندر ہوں	فرحان سالم	30/-
اسرار خودی (فراموش شدہ ایڈیشن)	شائستہ خاں	75/-
بانگ درا	اقبال	12/-
بال جبریل	اقبال	8/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز	اقبال	8/-
خواب اور خلش	آل احمد سرور	66/-
غبار منزل	غلام ربانی تاباں	45/-
انیس کے ۲۳ غیر مطبوعہ مرثیے	(انیس صدی کمیٹی)	90/-
پرانی بات ہے	زبیر رضوی	30/-
ساز سخن	ادا جعفری	45/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب)	مرتبہ ادا جعفری	75/-
دائروں میں پھیلی لکیر	کشور ناہید	30/-
آنکھ میں سمندر	زاہد ڈار	30/-
آنکھ اور خواب کے درمیان	ندا فاضلی	30/-
رات کے مسافر	انور سجاد	28/-
گداز شب	معین احسن جذبی	40/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	40/-
حرف حرف روشنی	حمایت علی شاعر	35/-
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں)	مترجم کرامت علی کرامت	20/-
وہ ہے	جمیل الدین عالی	12/-
کلیات عرش ملسیانی	مرتبہ مالک رام	75/-
رہرو	ساقی فاروقی	20/-
پتھر کی زبان	فہمیدہ ریاض	15/-

کتاب	مصنف	قیمت
شام کا پہلا تارا	زہرا نگاہ	21/-
مثنوی نہ سپہر (امیر خسرو)	مترجم محمد رفیق عابد زاہدی	زیر طبع
شام شہر یاراں	فیض احمد فیض	زیر طبع
جستہ جستہ	خورشید الاسلام	18/-
گل افشانی گفتار	نشور واحدی	زیر طبع
کرب آگہی	آنند نرائن ملا	10/50
نوائے آوارہ	غلام ربانی تاباں	(زیر طبع)
اردو گیت	ڈاکٹر قیصر جہاں	(زیر طبع)
انتخاب حالی (نیا ایڈیشن)	سفارش حسین رضوی	زیر طبع
شہر آشوب	مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد	8/50
کو بہ کو	سلمان جاں نثار اختر	7/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری)	محمد یوسف پاپا	15/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
ماضی کے ـــ سے	ڈاکٹر شوکت اللہ	75/-
تصوف۔ رسم اور حقیقت	خواجہ حسن ثانی نظامی	زیر طبع
انوار قرآن	پروفیسر نثار احمد فاروقی	30/-
حضرت محمدؐ اور قرآن	ڈاکٹر رفیق زکریا	(زیر طبع)
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	45/-
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	محمود احمد برکاتی	45/-
فرید و فرد فرید	اسلم فرخی	27/-
اسلام میں راسخ الاعتقادی کی راہ	ضیاء الحسن فاروقی	8/-
اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد کا	مرتبہ سید مقبول احمد	8/-
فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل	مولانا مجیب اللہ ندوی	14/-
نقد ملفوظات	نثار احمد فاروقی	65/-
خطبات عیدین	مولانا تقی امینی	21/-
تاریخ اودھ	قاسم علی سجاد پوری	27/-
قدیم ہندوستان کی سیکولر روایت	ڈاکٹر مجیب اشرف	12/-
مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست	پروفیسر مشیر الحق	8/-
ہمارے دینی علوم	مولانا اسلم جیراجپوری	18/-
ترجمہ قرآن منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش	پروفیسر مشیر الحق	8/-
مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات	مولانا حبیب الرحمن شیروانی	8/-
دنیا کے بڑے مذاہب	عماد الحسن آزاد فاروقی	(زیر طبع)
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات	عماد الحسن آزاد فاروقی	40/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک	شمس الرحمن محسنی	50/-
رسول اکرمؐ اور یہود حجاز	سید برکات احمد	40/-
محجوب الارث	مولانا اسلم جیراجپوری	4/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء	عماد الحسن آزاد فاروقی	(زیر طبع)
اسلام دور حاضر میں	مترجم پروفیسر مشیر الحق	36/-
اسلامیات ۔	مالک رام	27/-
عمرو بن عاصؓ	مولانا اسلم جیراجپوری	(زیر طبع)
حضرت جنید بغدادیؒ	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	75/-
روح القرآن	مولانا عبد السلام قدوائی	(زیر طبع)
عشق اور بھگتی	عماد الحسن آزاد فاروقی	(زیر طبع)
عورت اور اسلامی تعلیم	مالک رام	30/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے	عبد السلام قدوائی	زیر طبع
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا	محمود الحسن	15/-
سماجی تبدیلیاں	مترجم قاضی عبید الرحمن	2/-
مذہب اور جدید ذہن	پروفیسر مشیر الحق	(زیر طبع)
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں	ڈاکٹر سالم قدوائی	(زیر طبع)
کتاب و سنت کے جواہر پارے	مولانا جمال الدین اعظمی	(زیر طبع)
مسلمان اور سیکولر ہندوستان	پروفیسر مشیر الحق	(زیر طبع)
اسلامی عقائد و مسائل مذہب	مولانا جمال الدین اعظمی	(زیر طبع)
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی)	ڈاکٹر رشید الوحیدی	25/-
تاریخ الامت، سیرت رسولؐ حصہ اول	مولانا اسلم جیراجپوری	21/-
تاریخ الامت، خلافت راشدہ حصہ دوم	مولانا اسلم جیراجپوری	21/-
تاریخ الامت، خلافت بنی امیہ حصہ سوم	مولانا اسلم جیراجپوری	18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ چہارم	مولانا اسلم جیراجپوری	24/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ پنجم	مولانا اسلم جیراجپوری	27/-
تاریخ الامت، عباسیہ مصر حصہ ششم	مولانا اسلم جیراجپوری	27/-
تاریخ الامت، آل عثمانؓ حصہ ہفتم	مولانا اسلم جیراجپوری	18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ ہشتم	مولانا اسلم جیراجپوری	36/-
فکر اسلامی کی تشکیل جدید	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	30/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز)	قاری محمد اسماعیل	3/-
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں سائز)	قاری محمد اسماعیل	7/-

بکھرے ورق	سنتی کمار چرجی	4/-
مدن قلیند (۱۹۰۱ء-۱۹۸۵ء)	سید محمد عزیز الدین حسین	9/-

ناول

آگے سمندر ہے	انتظار حسین	150/-
جھینی جھینی بینی چدریا	عبدالبسم اللہ	75/-
صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
نوٹوں کی تلاش	ایاز سعید ہاروی	60/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	کشمیری لال ذاکر	48/-
سفر	رابعہ تبسم	27/-
سمندری خزانہ	ماریہ رحمٰن	27/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	ڈاکٹر صغرا مہدی	24/-
مٹی سے ہیرا	سید مقبول احمد	10/-
تذکرہ	انتظار حسین	54/-
ریت کی دیواریں	رفعت سروش	21/-
مجر باول	کشمیری لال ذاکر	33/-
فرار	ظفر پیامی	40/-
ڈوبتے سورج کی کتھا	کشمیری لال ذاکر	36/-
لمحوں میں بکھری زندگی	کشمیری لال ذاکر	18/-
مہکتی بہاریں	کوثر چاند پوری	18/-
راگ بھوپالی	صغرا مہدی	15/-
دھرتی سدا سہاگن	کشمیری لال ذاکر	7/50
پُروائی	صغرا مہدی	9/50
گوری سوئے سیج پر	صالحہ عابد حسین	(زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان	کشمیری لال ذاکر	7/-
ایک مہم دو دل	خالدہ رحمٰن	10/-
اپنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	60/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ	جتندر بلّو	12/-
ایک مٹھی ہندوستان	سید شمیم اشرف	6/-

ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	21/-
آلپس کے گیت مترجم	قرۃ العین حیدر	3/-
چنار کا پتا	سلطان آصف فیضی	3/-
پابہ جولاں	صغرا مہدی	(زیر طبع)
بیوہ	منشی پریم چند	24/-
گئودان (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
میدان عمل (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
یودو کیہ ترجمہ	قرۃ العین حیدر	2/-
شکستِ ناتمام	زہرہ سیدین	2/-
پُر اسرار مقدمہ کافکا	مترجم رحم علی الہاشمی	12/50

افسانے

صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	75/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	45/-
سدا بہار چاندنی	رام لعل	30/-
دل دریا	شرون کمار	25/-
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	18/-
درد دل	ستارہ جعفری	18/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	25/50
نیلی ساری	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	30/-
کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	18/-
ریت سمندر اور جھاگ	ہرچرن چاولہ	12/75
تیوری	امر سنگھ	14/75
قلی نمبر ۳۹۹	وجاہت علی سندیلوی	14/75
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	30/-
اپنے پرائے	اوم پرکاش بجاج	9/-

نئی دھرتی نئے انسان	خواجہ احمد عباس (زیر طبع)	
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی	30/-
واردات	پریم چند	24/-
راستے اور کھڑکیاں	انور خاں	6/-
جو میرے دوراجا کے نہیں	صغرا مہدی	10/-
اپنے دُکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	27/-

ڈرامے

بازار میں نیند	شمیم حنفی	75/-
سلاخ ٹوٹتی ہے	کشمیری لال ذاکر	90/-
الجھاوے	ابراہیم یوسف	51/-
زندگی کی طرف	پروفیسر شمیم حنفی	36/-
زوال کا عروج	مترجم انور عظیم	36/-
مجھے گھر یاد آتا ہے	پروفیسر شمیم حنفی	21/-
انٹی گونی	سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی	9/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	6/-
حبہ خاتون	پروفیسر محمد مجیب	6/-
تاریخ کے آنچل میں	رفعت سروش	18/-
اداس موڑ	ابراہیم یوسف	12/-
انٹنی اور کلوپیٹرا	ولیم شیکسپیئر	16/50
مٹی کا بلاوا	شمیم حنفی	45/-
سات کھیل	راجندر سنگھ بیدی (زیر طبع)	
غالب کون	سید محمد مہدی	8/50
خیال کی دستک	ساگر سرحدی	12/75
دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل (زیر طبع)	
آزمائش	پروفیسر محمد مجیب	6/-
انجام	پروفیسر محمد مجیب	6/-
کھیتی	پروفیسر محمد مجیب	6/-

ہیروئن کی تلاش	پروفیسر محمد مجیب	5/50
پردۂ غفلت	ڈاکٹر سید عابد حسین	9/-
دروازے کھول دو	کرشن چندر	7/50
آئینۂ ایام (بے پرسیطے)	مترجم. خلیق احمد	زیر طبع
نقش آخر	اشتیاق حسین قریشی	2/25
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	ڈاکٹر اخلاق اثر	10/-

اقبالیات

اقبال کا نظریہ شعر اور ان کی شاعری۔	آل احمد سرور	45/-
افکار اقبال	محمد عبد السلام خاں	125/-
اقبال کا نظریہ خودی	عبد المغنی	150/-
اقبال جادو گر ہندی نژاد	عتیق صدیقی	(زیر طبع)
اقبالیات کی تلاش	عبد القوی دسنوی	35/-
نقد اقبال	میکش اکبر آبادی	25/50

غالبیات

غالب کی شخصیت اور شاعری۔	رشید احمد صدیقی	45/-
ذکر غالب	مالک رام	(زیر طبع)
گفتار غالب	مالک رام	48/-
غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	36/-
تلامذۂ غالب	مالک رام	75/-
فسانۂ غالب	مالک رام	زیر طبع
غالب اور شاہان تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	9/50

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر	مرتبہ رشید حسن خاں	24/-
نیرنگ خیال	مالک رام	15/-
یادگار غالب اردو	مالک رام	30/-
یادگار غالب فارسی	مالک رام	9/-

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	16/-
حیات سعدی	مرتبہ رشید حسن خاں	36/-
فسانۂ آزاد (تلخیص)	ڈاکٹر قمر رئیس	75/-
فردوس بریں	عبدالحلیم شرر	24/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ رشید حسن خاں	75/-
انتخاب ناسخ	مرتبہ رشید حسن خاں	51/-
مثنوی بحر المحبت	مرتبہ عبدالماجد دریاآبادی	5/-
شریف زادہ	ڈاکٹر قمر رئیس	20/-
امراؤ جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	28/-
فسانۂ مبتلا	ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی	45/-
توبۃ النصوح	مالک رام	36/-
باغ و بہار	رشید حسن خاں	45/-
ابن الوقت	ڈاکٹر خلیق انجم	75/-
مجالس النساء	صالحہ عابد حسین	24/-
گزشتہ لکھنؤ	رشید حسن خاں	75/-
قصہ حاتم طائی	اطہر پرویز	75/-
انتخاب ولی	مرتبہ ظہیر الدین مدنی	20/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	15/-
انتخاب مراثی انیس و دبیر	رشید حسن خاں	45/-
انتخاب نظیر اکبر آبادی	رشید حسن خاں	30/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	21/-
انتخاب کلام میر	ڈاکٹر محمد حسن	(زیر طبع)
دیوان درد	رشید حسن خاں	30/-
انتخاب سودا	رشید حسن خاں	75/-
انتخاب قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	27/-
انتخاب ذوق	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	24/-
مثنوی سحر البیان	رشید حسن خاں	36/-
مثنوی گلزار نسیم	رشید حسن خاں	16/-
افادات سلیم	ڈاکٹر خلیق انجم	30/-
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ رشید حسن خاں	27/-

جیبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
بیاض مریم	سکندر علی وجد	15/-
لہو پکارتا ہے	سردار جعفری	15/-
پتھر کی دیوار	سردار جعفری	20/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	15/-
آتش گل	جگر مرادآبادی	15/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	7/50
روحانی غزلیں	ثمینہ حجاب	12/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	15/-
ساتواں آنگن	صالحہ عابد حسین	8/-
دھوپ	رابعہ تبسم	5/-
گھر	ماریہ رحمٰن	8/-
واپسی کا سفر	عبداللہ حسین	5/-
راگ بھوپالی	ڈاکٹر صغرا مہدی	7/-
نشیب	عبداللہ حسین	5/-
موت کا بازار	آفتاب ہلالی	8/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

شمارہ	مرتب	قیمت
محبوب حسین جگر نمبر	مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی	75/-
جمنا داس اختر نمبر	مرتبہ. گربچن چندن	90/-
شمس الرحمٰن فاروقی نمبر	مرتبہ احمد محفوظ	80/-
اردو افسانہ بمبئی میں	مرتبہ الیاس شوقی	51/-
مغیث الدین فریدی نمبر	مرتبہ ظہیر احمد صدیقی	45/-
خواجہ حسن نظامی نمبر	مرتبہ نثار احمد فاروقی ریحان احمد عباسی	75/-
عبدالوحید صدیقی نمبر	مرتبہ. پروانہ رودولوی	51/-
غلام ربانی تاباں نمبر	مرتبہ: اجمل اجملی	75/-

کتاب	مرتب / مصنف	قیمت
اختر سعید خاں نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین	51/-
نثار احمد فاروقی نمبر	مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم	51/-
پروفیسر گوپی چند نارنگ نمبر	مرتبہ شہریار/ابوالکلام قاسمی	60/-
ڈاکٹر خلیق انجم نمبر	مرتبہ: ایم حبیب خاں	90/-
خواجہ احمد فاروقی	مرتبہ خلیق انجم	45/-
عابد علی خاں	مرتبہ: مجتبیٰ حسین	45/-
پروفیسر مسعود حسین خاں	ایم حبیب خاں	زیر طبع
ڈاکٹر اجمل اجملی	مرتبہ علی احمد فاطمی/عذرا مجیب	45/-
فرمان فتح پوری نمبر	مرتبہ خلیق انجم	25/-
سردار جعفری نمبر	مرتبہ۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	45/-
صالحہ عابد حسین نمبر	مرتبہ عزیز قریشی	45/-
نئی نظم کا سفر	مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی	45/-
مشرقی علوم والسنہ پر تحقیق	حامد حسین	3/-
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر	کرنل بشیر حسین زیدی	16/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر	(مکتبہ جامعہ)	1/50
مرزا سلامت علی دبیر نمبر	مرتبہ عبدالقوی دسنوی	7/50
جگن ناتھ آزاد نمبر	مرتبہ۔ ایم حبیب خاں	51/-
عرش ملسیانی نمبر	مالک رام	12/50
سکندر علی وجد نمبر	یوسف ناظم	25/-
لغت نویسی کے مسائل نمبر	پروفیسر گوپی چند نارنگ	35/-
عبداللطیف اعظمی نمبر	(مکتبہ جامعہ)	18/-
مشفق خواجہ نمبر	مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم	30/-
جائزے	مرتبہ: مظفر حنفی	45/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

کتاب	مرتب / مصنف	قیمت
تذکیر و تانیث (7 ہزار الفاظ)	جلیل مانک پوری	75/-
معیار اردو	جلیل مانک پوری	21/-
محاورات ہند	مرتب محبوب الرحمٰن فاروقی	51/-
عبارت کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	18/-
انشا اور تلفظ		12/-
پیامی قواعد اردو	طلبہ اڈیشن	3/-
پیامی قواعد اردو	کلاس	6/-
پیامی اردو انگریزی ڈکشنری		21/-
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری		15/-
ہمارے محاورے	سیفی پریمی	12/50
کہاوت اور کہانی	سیفی پریمی	9/-

کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

کتاب	مرتب / مصنف	قیمت
شعور ادب	(مکتبہ جامعہ)	21/-
نیا اردو نصاب اوّل	محمد ذاکر	12/-
آئینہ ادب	ڈاکٹر محی رضا/ڈاکٹر آدم شیخ	21/-
انوار ادب	پروفیسر فصیح الدین/ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی	زیر طبع

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
چیچک	مشتاق احمد	1/-
آستین کا سانپ	محمد حسین حسان	1/-
چاند	محمد حسین حسان	1/-
دیمک	محمد حسین حسان	1/-
کتنی زمین	محمد حسین حسان	1/-

خیموں کے شہر میں (سفرنامہ)

صادقہ ذکی

خیموں کا شہر قاری کو نہ صرف حج بیت اللہ کے مختلف ارکان سے واقف کراتا ہے بلکہ سفر حج کے مناظر، مختلف مقامات کی تاریخی اور مذہبی اہمیت سے بھی آگاہ کرتا ہے۔

قیمت 30/-

مذہبی

- پارہ عم مع اردو، انگریزی ترجمہ و تشریح 45/-
- صراط مستقیم 7/50
- سورۂ رحمٰن (ترجمہ مع تشریح 6/-
- شیخ مخدوم علی فقیہ مہائمی 4/5
- اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں 9/-
- نماز پڑھیے 4/5
- السلام علیکم 7/50
- حضرت یوسف علیہ السلام 4/50
- حدیث کیا ہے 4/-
- حضرت عمر فاروقؓ 6/-
- نقوش سیرتؐ حصہ اوّل 5/-
- نقوش سیرتؐ حصہ دوم 5/-
- نقوش سیرتؐ حصہ سوم 5/-
- نقوش سیرتؐ حصہ چہارم 5/-
- نقوش سیرتؐ حصہ پنجم 5/-
- رسالہ دینیات حصہ اوّل 3/-
- رسالہ دینیات حصہ دوم 4/-
- رسالہ دینیات حصہ سوم 5/-
- رسالہ دینیات حصہ چہارم 5/-
- رسالہ دینیات حصہ پنجم 6/-
- رسالہ دینیات حصہ ششم 6/-
- رسالہ دینیات حصہ ہفتم 6/-
- رسالہ دینیات حصہ ہشتم 6/-

- حضرت آدم علیہ السلام 4/-
- حضرت یحییٰ علیہ السلام 3/-
- بزرگانِ دین 4/-
- امت کی مائیں 4/50
- خوب سیرتؐ حصہ اوّل 6/-
- خوب سیرتؐ حصہ دوم 6/-
- اچھی باتیں 4/50
- رسولؐ اللہ کی صاحبزادیاں 4/50
- سلطان جیؒ 4/50
- سیرت پاک مختصر مختصر 3/-
- کمسن صحابی 6/-
- رحمان کا مہمان 6/-
- اسلام کے جاں نثار 5/-
- نور کے پھول 9/-
- سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 3/50
- حضرت ابو بکر صدیقؓ 6/-
- حضرت عبداللہ بن عمرؓ 3/-
- حضرت طلحہؓ 3/-
- حضرت ابوذر غفاریؓ 3/-
- حضرت سلمان فارسیؓ 3/50
- حضرت عبداللہ بن عباسؓ 3/-
- حضرت محبوب الٰہیؒ 3/50
- حضرت معین الدین چشتیؒ 3/-
- حضرت فرید گنج شکرؒ 3/-
- حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ 3/-
- نیک بیٹیاں 3/50
- حضرت نظام الدین اولیاءؒ 3/-

- حضرت حمزہؓ 3/-
- حضرت عبدالرحمٰن بن عوف 4/50
- حضرت ابوہریرہؓ 4/-
- اللہ کے صفی 2/50
- اللہ کا گھر 4/50
- اللہ کے خلیل 3/50
- رسول پاکؐ کے اخلاق 4/-
- قرآن پاک کیا ہے؟ 7/50
- اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل 6/-
- اسلام کے مشہور سپہ سالار دوم 6/-
- اسلام کے مشہور امیر البحر 9/-
- اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل 7/50
- اسلام کیسے پھیلا حصہ دوم 7/50
- اسلام کیسے شروع ہوا 7/50
- رسول پاکؐ 7/50
- دس جنتی 7/50
- سرکار کا دربار 7/50
- چار یار 9/-
- آں حضرتؐ (اردو) 4/50
- ہمارا دین حصہ اوّل 8/50
- ہمارا دین حصہ دوم 8/50
- ہمارا دین حصہ سوم 8/50
- تحسین القرآن (زیر طبع)
- منہاج القرآن (زیر طبع)
- ائمہ اربعہ (زیر طبع)
- ارکان اسلام 4/-
- عقائد اسلام 4/50
- خلفائے اربعہ 12/-

نبیوں کے قصے 7/50
ہمارے رسولؐ 7/50
مسلمان بیبیاں 6/-
ہمارے نبیؐ (اردو) 4/-
سرکارِ دو عالم 9/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد) 3/-
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں) 7/-

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی 6/-
بچوں کے نظیر اکبر آبادی 6/-
بچوں کے "ظ" انصاری 6/-
بچوں کی آپا جان (گیرڈا فلپس) 6/-
بچوں کی شفیقہ فرحت 4/50
بچوں کے عابد علی خاں 4/-
بچوں کے علی سردار جعفری 4/-
بچوں کے یوسف ناظم 4/-
چارلی چیپلن اور کیتھو اینڈرسن 9/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی 4/-
بچوں کے میر امّن دلی والے 4/50
بچوں کے محمد حسین آزاد 4/-
بچوں کے مرزا غالب 4/-
بچوں کے رنگا رنگ خسروؒ 4/50
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد 4/-
بچوں کے سلطان ٹیپو 4/50
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی 4/50
بچوں کی صالحہ عابد حسین 4/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین 4/-

بچوں کے بابائے اردو
مولوی عبدالحق 4/-50
بچوں کے میرزا ادیب 4/50
بچوں کے غلام السیدین 5/-
بچوں کے اسمٰعیل میرٹھی 21/-
بچوں کے ذاکر صاحب 7/-
واوا نہرو 6/-
اندرا گاندھی کی کہانی 6/-
محمد شفیع الدین نیر 7/50
ہمارے عظیم سائنس داں 9/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں 9/-
مولانا آزاد کی کہانی 18/-
جوہر قابل 4/50
بچوں کے چار بزرگ دوست 3/50
گاندھی بابا کی کہانی 10/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں 2/-
میر انیس 2/-
امیر خسرو 4/50

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات 10/-
کہانی بھی، معلومات بھی 6/-
چیزوں کی کہانی 7/50
یہ کیسا بخار ہے 6/-
آپ کا جسم 6/-
گندا پانی 4/-
کیوں اور کیسے؟ 6/-
سائنس کی دنیا 8/-

کمپیوٹر کیا ہے 8/-
عجائب گھر 10/-
ذرّے کی کہانی 21/-
علاج میرا دشمن 6/-
پرواز کی کہانی 4/50
غذا کی کہانی 3/-
رنگوں کی بستی 5/-
غذائیں دوائیں 8/-
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں 4/50
صحت کے ۹۹ نکتے زیرِ طبع
صحت کی الف بے زیرِ طبع
سنہرے اصول 5/-
پرندوں سے جانوروں تک 4/50
دہلی 2/50
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے) 1/50
سماجی زندگی حصہ سوم 4/90
پیاری قواعد اردو طلبہ کے لیے 3/-
پیاری قواعد اردو (بڑا سائز) 6/-

نظمیں

پھلجھڑیاں 6/-
بچوں کے اسمٰعیل میرٹھی 21/-
بتاشے (نرسری گیت باتصویر) 9/-
مہکتی کلیاں (زیرِ طبع)
ٹوٹے کھلونے 6/50
سہانے ترانے 4/50
بچوں کے افسر 6/-
بچوں کے اقبال 7/50

ننھے منّے بچوں کے لیے

تماشے (باتصویر) 9/-
جاں نثار دوست (باتصویر) 7/50
شیر اور بکری (باتصویر) 9/-
چاند کی بیٹی (باتصویر) 8/-
بھیڑیے کا گانا (باتصویر) 9/-
جادو کی ہنڈیا (باتصویر) 7/50
چالاک بلی (باتصویر) 9/-
دم کٹی لومڑی (باتصویر) 9/-
کوّے کا خواب (باتصویر) 8/50
گدھے نے بجائی بانسری 7/50

بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

الف لیلیٰ کے چار ڈرامے 9/-
ننھی جل پری 7/50
ممتا کی آواز 7/50
جادو نگری 9/-
سنہری جھیل 9/-
خلائی طبیب 8/-
بوقون کا جزیرہ 8/-
جلتا ہوا مکان 5/-
سونے کی چوری 4/-
روشنی ہی روشنی 10/-
خطرناک سگنل پہلا حصہ 10/-
لاش چل پڑی دوسرا حصہ 10/-
کالا جنگل نیلی موت تیسرا حصہ 10/-
خلائی سرنگ چوتھا حصہ 10/-
وہ خلا میں بھٹک گئے پانچواں حصہ 10/-
خلائی مخلوق بستی میں چھٹا حصہ 10/-
موت کی شعاعیں ساتواں حصہ 10/-
خطرناک فارمولا آٹھواں حصہ 10/-
تابوت سمندر میں نواں حصہ 10/-
خلائی مخلوق کا حملہ دسواں حصہ 10/-
عمران کی زندہ لاش گیارہواں حصہ 10/-
شہر پتھر بن گیا بارہواں حصہ 10/-
ایلس کی دنیا 10/50
پتھر کا خرگوش 10/-
سرخ موت 4/50
دنیا کی عجیب و غریب کہانیاں 7/50
انمول کہانیاں 4/50
پتھر کی گڑیا 7/50
ریل کے بچے 4/-
افریشیا کی کہانیاں 9/-
۸۰ دن میں دنیا کا چکر 3/-
ہزاروں خواہشیں 9/-
مونٹی کرسٹو کا نواب 9/-
گلی ور کے تین حیرت انگیز سفر 6/-
جادوئی چقماق کی ڈبیہ 4/50
گیارہ ہنس اور ایک شہزادی 4/-
دادی اماں کی کہانیاں 6/-
سفر کے قصے 5/-
پہاڑی مہم 4/50
تین بندوقچی 10/-
ہم بنے کمانڈو 5/-
ایک تھا مرغا ککڑوں کوں 6/-
پریوں کی کہانیاں 6/-
سمندر کا بادشاہ مارا گیا 4/50
چوں چوں بیگم 4/-
ماسٹر شامت 6/-
تھوڑی تارا تے چاند 4/-
پکڑے گئے 7/50
درویش کا تحفہ 6/-
مورا سے فرار 7/50
بکرے کی تعریف میں 6/-
جھیل کا راز 6/-
قصر صحرا اوّل 7/-
قصر صحرا دوم 10/-
قصر صحرا سوم 8/-
ممتوں کی تباہی 7/50
پیار کا پنچھی 4/-
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش 7/50
پادری کی روح 4/-
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو 4/50
گدھا کہانی 9/-
خفیہ سرنگ 6/-
بڑھیا کی بھینس 4/50
تیس مار خاں 4/50
چالاک خرگوش کی واپسی 15/-
غریب لکڑہارے کی کہانی 9/-
نردولی کا آدم خور 6/-
ہمت کے کرشمے 6/-
خلائی مسافر 6/-
ابو خاں کی بکری 15/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی 6/-

نرالے گویے	4/50	جنگل کی ایک رات	7/50	بہادر	4/50
باتونی کچھوا	4/50	اچھی کہانیاں	3/-	ہرن کے بچے	3/50
جادو کا جھولا	3/-	ہرن کا دل	3/-	اس نے کیا کرنا جانا	3/50
جادو کی سارنگی	3/-	دریائی رانی	3/-	کٹا ہوا ہاتھ	7/50
بدر شہزادی	6/-	گوہر شہزادی	4/50	میگھ نگر کا راجا	(زیر طبع)
سمندری طوفان اور تین لڑکے	6/-	شریر شیرا	3/50	جی دار اور ننھا فرشتہ	(زیر طبع)
ننھا سیاح	8/50	پری رانی	3/-	سرکس	1/50
زیور	6/-	خطرناک سفر	3/50	بندر اور نائی	4/50
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں	6/-	ننھا جبرو	3/50	لومڑی کا گھر	3/50
سام پر کیا گزری	3/50	مرغی کی چار ٹانگیں	4/50	گلا بوچ بیا اور پری زاد	5/-
جگنو کی بیلی	3/-	بابا ناصح	3/-	جادو کا گھر	3/50
چالاک خرگوش کے کارنامے	9/-	سلامہ و صمصامہ	5/-	بی مینڈکی اور کوا	3/50
چور پکڑو	3/50	پہاڑ کی چوٹی پر	6/-	تاک دنا دن تاکے سے	3/50
بہادر علی	8/50	شرارت	4/-	روٹی کس نے پکائی	3/50
خالی ہاتھ	9/-	ننھا فرشتہ	6/-	پھر میں چکھوں کیا خاک	3/50
کھلونگر	7/50	ایک کھلا راز	3/50	پانچ بوتے	3/50
حاجی بغا کی ڈائری	7/50	مچھیرا اور اس کی بیوی	3/50	چیونٹی رانی	3/50
قصہ اژدہا پکڑنے کا	6/-	بھوتوں کا جہاز	7/50	بچوں کی کہانیاں	3/50
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	6/-	ہار کی تلاش	6/-	پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	3/50
ابو علی کا جوتا	6/-	خرگوش کی چال	4/-	پکڑو دم کٹے کو	3/50
ننھا سراغ رساں	6/-	آؤ ڈراما کریں	4/-	مدورانا پردیس چلے	3/50
پراسرار غار	6/-	خرگوش کا سپنا	9/-	ہتو تتو	3/50
ظالم ڈاکو	6/-	نیلا ہیرا	6/50	سرخ جوتے	4/50
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	7/50	ایک پکوڑی تیل میں	(زیر طبع)	پلک نہ مارو	6/-
دلی کی شادی	4/-	شیر خاں	4/-	ایک دیس ایک خون	3/50
رحمت شہزادہ	4/50	بھیڑیے کے بچے	3/-	جادو کے کھیل	(زیر طبع)
اندھے کا بیٹا	4/50	لومڑی کے بچے	3/-	انعامی مقابلہ	(زیر طبع)
پانچ جاسوس	10/-	میاں ڈھینچو کے بچے	4/-	دعوت ملاقی	(زیر طبع)

جیت کس کی؟ 4/-
چینی کی گڑیا (زیر طبع)
بہادر سیاح 4/-
چچا غالب (زیر طبع)
تانیل خاں 3/-
جن حسن عبدالرحمٰن (دوم) 5/-
چوری کی عادت 3/50
غیر ذمہ دار لڑکا (زیر طبع)
جب اور اب (زیر طبع)
سندر چنار 1/50
گلابو چوہیا اور غبارے 1/50
لال مرغی 4/-
چڑیاں 5/-
تین اناڑی 6/-
چپاوت کا آدم خور شیر (زیر طبع)
ننھا ٹٹو 3/-
چنبیلی (زیر طبع)

ہماری درسی کتابیں

اردو قاعدہ 5/-
اردو کی پہلی کتاب 8/-
اردو کی دوسری کتاب 11/-
اردو کی تیسری کتاب 13/-
اردو کی چوتھی کتاب 14/-
اردو کی پانچویں کتاب 17/-
اردو کی چھٹی کتاب 18/-
اردو کی ساتویں کتاب 20/-
اردو کی آٹھویں کتاب 22/-
اردو خوش خطی حصہ اول 4/-
اردو خوش خطی حصہ دوم 4/-
اردو خوش خطی حصہ سوم 4/-
اردو خوش خطی حصہ چہارم 4/-
ہمارا ملک بھارت 19/-
بچوں کی پہلی کتاب 3/-
اردو کی دوسری کتاب (جدید) 13/50
اردو کی تیسری کتاب (جدید) 16/-
اردو کی چوتھی کتاب (جدید) 16/-
ماحول کے ذریعہ تعلیم (اول) برائے درجہ سوم 17/50
ماحول کے ذریعہ تعلیم (دوم) برائے درجہ چہارم 17/50
ماحول کے ذریعہ تعلیم (سوم) برائے درجہ پنجم 17/50
ہمارا وطن اور دنیا برائے درجہ پنجم 17/50
حساب درجہ پنجم کے لیے 17/50

ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا
شخصیت اور خدمات

مرتبہ: ڈاکٹر آدم شیخ

ڈاکٹر جمخانہ والا' انجمن اسلام' ممبئی کے صدر ہیں انھوں نے ایک طویل عرصے سے اپنے آپ کو تعلیمی اور سماجی خدمات کے لیے وقف کر دیا ہے' ممبئی اور مہاراشٹر کے بیشتر علاقوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے نئے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور قدیم تعلیمی اداروں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے میں جو خدمات ڈاکٹر صاحب انجام دے رہے ہیں وہ قابل تعریف ہی نہیں قابل فخر بھی ہیں ڈاکٹر صاحب کے اس طریقۂ کار سے تعلیم کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے حوصلے بلند ہوں گے۔ ڈاکٹر آدم شیخ نے ڈاکٹر جمخانہ والا کی سوانح لکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اس کتاب کو ایسے حضرات بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے جو تعلیم کے خار زار میدانوں میں تعلیم کی روشنی پھیلانے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

قیمت-/250

جیبی کتابیں

کم سے کم قیمت پر اردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پیش کرتی ہیں

کتاب نما کے تمام خریداروں کو پاکٹ بکس پر 15% کمیشن دیا جائے گا اور پچاس روپے زیادہ کی منگانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔

پتھر کی دیوار — علی سردار جعفری
سردار جعفری کی جیل کی نظموں کا مجموعہ۔ قیمت -/20

لہو پکارتا ہے — علی سردار جعفری
سردار جعفری کی انقلابی نظموں کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت -/15

بیاض مریم — سکندر علی وجد
وجد کی تحریروں اور حسین کی تصویروں سے "بیاض مریم" ایک نادر اور نشاط انگیز گلدستہ بن گیا۔ قیمت -/15

ایک خواب اور — علی سردار جعفری
سردار جعفری کے مقبول شعری مجموعے کا چھٹا ایڈیشن۔ -/15

آتش گل (شعری مجموعہ) جگر مرادآبادی
جگر مرادآبادی کا دیوان پر کیف غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت -/15

ساتواں آنگن (ناول) صالحہ عابد حسین
صالحہ عابد حسین کے جادو نگار قلم کا نیا شاہکار ایک دلچسپ انوکھی اور سبق آموز کہانی۔ قیمت -/8

دھوپ (ناول) رابعہ تبسم
ایک ایسی لڑکی کی کہانی جس نے ایک عمر سایوں کی جستجو میں گزار دی اور جب منزل پر پہنچی تو وہاں بھی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ قیمت -/5

گھر (ناول) ماریہ رحمٰن
ایک مغربی لڑکی جس نے ہندستان میں گھر بنایا۔ گھر جو سماجی زندگی کی سب سے چھوٹی، سب سے مضبوط اکائی ہے ایک ایسے گھر کی کہانی جو پلکوں میں چھپے ہوئے آنسوؤں کی زبانی

بیان ہوئی۔ قیمت -/8

واپسی کا سفر (ناول) عبداللہ حسین
سفر زندگی کا دوسرا نام ہے مگر واپسی کا سفر؟ عبداللہ حسین نے واپسی سفر کی کہانی بیان کی ہے۔ قیمت -/5

راگ بھوپالی (ناول) صغرا مہدی
اردو کی بیباک ادیبہ کا نیا ناول۔ صغرا مہدی کے قلم سے نکلی ہوئی ہر کہانی ہر ناول انسانی رشتوں کا ایک نیا آئینہ خانہ ہوتا ہے۔ -/7

نشیب (ناول) عبداللہ حسین
عبداللہ حسین کا قلم نئی وادیوں میں سرگرم سفر ہے "نشیب" اس سفر کا ایک سنگ میل ہے۔ قیمت -/5

موت کا بازار (ناول) آفتاب جلالی
آرزوؤں کا قتل، خوابوں کا قتل، امیدوں کا قتل، یہ سارا معاشرہ ایک قتل گاہ ہے۔ اس کے مجرم؟ "موت کا بازار" ایسے ہر سوال کا جواب ہے۔ قیمت -/8

رومانی غزلیں مرتبہ ثمینہ حجاب
غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ غزل ہمارے جذبات کی دستاویز ہے رومانی غزلوں کا بہترین انتخاب۔ قیمت -/12

انتخاب اکبر الہ آبادی — صدیق الرحمٰن قدوائی
اکبر الہ آبادی کی شاعری سامان ظرافت بھی ہے اور تازیانہ عبرت بھی۔ قیمت -/15

پچھلے پہر (شعری مجموعہ) جاں نثار اختر
اردو کے البیلے رومانی شاعر کے کلام کا جامع انتخاب۔ 7/50

تقسیم کار مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے۔

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت پندرہ روپے (Rs 15/-) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون -/80 روپے ہے) صرف -/75 روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25% اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر 15% کمیشن دیا جائے گا (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جاسکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آئندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

صدر دفتر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

دسمبر ۱۹۹۹ء	جلد ۳۹	شمارہ ۱۲

فی پرچہ 8/:
سالانہ 80/-
سرکاری تعلیمی اداروں سے 125/-
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی جہاز) 500/-

اڈیٹر
شاہد علی خان

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
e-mail maktaba@ndf vsnl net in
Tele Cum Fax No(011)-6910191
ٹیلی فون نمبر: 6910191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں ر غزلیں

طنز و مزاح

افسانہ

سفر نامہ

جائزے

کھلے خطوط اور ادبی تہذیبی خبریں

نئی مطبوعات

علی جواد زیدی۔ حیات شخصیت اور فن (تحقیقی جائزہ) ڈاکٹر شیخ عبدالرحمن انصاری -/200

اپنی ملی (بچوں کی کہانیاں) شتاق کریمی -/20

[illegible] (سوانح) عبدالستار احمد صدیقی امروہوی -/150

گھنے جنگلوں میں (بچوں کا ادب) ریحان احمد عباسی -/15

فارسی ادب کا مطالعہ (تحقیق) ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی -/100

روشنی تو ہونے دو (شعری مجموعہ) ڈاکٹر بشارت قسیم -/100

کالی مائی (ناول) علی امجد -/100

اصلاح نامہ جلد اول (عروض) عنوان چشتی -/100

پیانہ صفات (مضامین) مرتبہ شہپر رسول -/200

مقابل ہے آئینہ (عنوان چشتی کے انٹرویو) مرتبہ شہود عالم آفاقی -/100

معیار افکار (عنوان چشتی پر خصوصی شمارہ) مرتبہ شہود عالم آفاقی -/100

چاند چکور اور چاندنی (مذہبی شاعری) پروفیسر عنوان چشتی -/50

اجالوں کے بیچ (عنوان چشتی کی نثار یکا مجموعہ) مرتبہ سیدہ عنوان چشتی -/40

اصلاح نامہ (جلد اول) (ضمیمہ حصہ اول) پروفیسر عنوان چشتی -/35

عنوان چشتی شخص اور شعور (سوانح) مرتبہ سید عبدالشکور -/100

حضرت علی کرم اللہ وجہہ (منظوم خراج عقیدت) پروفیسر عنوان چشتی -/50

خواب اور تعبیر خواب (منظوم ڈراما) رفعت سروش -/25

مظفر حنفی ایک مطالعہ (مجموعہ مضامین) مرتبہ فیروز مظفر -/350

شوکیس کے بت (شعری مجموعہ) سید معز الدین احمد فاروقی -/75

بس اسٹاپ (اسٹیج ڈرامے) سید معز الدین احمد فاروقی -/50

میر ناصر علی دہلوی حیات و ادبی خدمات (تحقیق) ڈاکٹر عبدالستار -/200

سرورق.........سیدہ جعفر

آشا (ناول) اسلم مسعود اقبال سعید صدیقی -/150

گزرتے روز و شب کے درمیان (افسانے) احمد خاں امن -/30

چراغ رہ وطن (منظوم سوانح حکیم عبدالحمید) ڈاکٹر غلام نبی انجم بہ سید دعائے مغفرت

A Jagan Nath Azad Chronology

By Dr Mohd Asadullah Wani 25/

Iqbal Mind And Art

BY Jagan Nath Azad 300/-

رسائل

تہذیب الاخلاق مدیر [illegible] ابوالکلام قاسمی 6/50

اردو دنیا [illegible] ارشاد ہاشمی

ماہنامہ "گل بوٹے" مدیر فاروق سید فی شمارہ -/20

ماہنامہ "سب رس" (کراچی) مدیر خواجہ حمید الدین شاہد فی شمارہ -/20

ماہنامہ "سب رس" مدیر مغنی تبسم فی شمارہ -/16

ماہنامہ "ہدایت" مدیر اعلا محمد فضل الرحیم مجددی فی شمارہ -/10

سہ ماہی "جہات" مدیر اعلا حامدی کاشمیری فی شمارہ -/50

سہ ماہی "ترسیل" (جولائی تا ستمبر) مدیر ڈاکٹر یونس اگاسکر فی شمارہ -/20

سہ ماہی "مژگان" مدیر اعزازی نجم بلال بھارتی فی شمارہ -/20

"ایوان اردو" حکیم عبدالحمید نمبر مدیر منصور احمد عثمانی -/10

مہمان اداریہ
پروفیسر سیدہ جعفر
لنگر حوض۔ حیدر آباد

آندھرا پردیس میں اُردو کی سرگذشت

فضل علی کمیشن نے جب ریاستی تنظیم جدید کے تحت اپنی رپورٹ پیش کی تھی اور آندھرا تلنگانہ کا مسئلہ زیر غور تھا، تو حیدر آباد کی باشعور اور سربرآوردہ ہستیاں ایسے فیصلے کی متمنی تھیں جو تلنگانہ کے عوام کے لیے بھی قابل قبول ہو۔ حیدر آباد اسٹیٹ کانگرس کی قرار داد کے مطابق ریاست کی لسانی تقسیم ضروری تھی۔ تلنگانہ کی تائید میں ایک اہم ادعا یہ بھی تھا کہ آندھرا کے مقابلے میں تلنگانہ معاشی اور تعلیمی پس ماندگی کا شکار ہے اور یہاں اُردو کا چلن عام ہے جو بصورت دیگر متاثر ہوسکتا ہے۔ اردو والوں کے ایک وفد نے دلی پہنچ کر حکومت کے ارباب اقتدار سے ملاقات کی اور یہ بتایا کہ ریاست آندھرا پردیس کے قیام کے سلسلے میں اُردو زبان کے لیے تحفظات کا حصول ضروری ہے۔ ۱۹۵۶ء میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل نو نے ہندستانی زبانوں کو الگ الگ علاقے تفویض کردیے تھے۔ یکم نومبر ۱۹۵۶ء میں ریاست آندھرا پردیش کا قیام عمل میں آیا۔ قیام آندھرا پردیش کے بعد چیف منسٹر نیلم سنجیوا ریڈی نے اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان قرار دیا اور بعد کے چیف منسٹر بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان تصور کرتے رہے لیکن عملی طور پر ریاست میں اس زبان کی ترویج و اشاعت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ پرائمری اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک طلبہ کی تعداد گھٹنے لگی اور دفتروں، اداروں اور دکانوں سے اُردو کے سائن بورڈ اور اردو تحریریں غائب ہونے لگیں۔ آندھرا پردیس کے عوام کے لیے تلگو سے واقفیت یقیناً ضروری ہے کیونکہ یہ ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ آندھرا پردیس کے اردو داں حضرات اس زبان سے محبت کرتے ہیں۔ آندھرا پردیس میں صورت حال یہ ہوگئی کہ سیاست دانوں نے اردو کے مسائل کو مجمعوں میں اپنی پُر جوش تقریروں کا موضوع ضرور بنایا لیکن ریاست کی

داخلی سیاست ان کی توجہ کا مرکز بنی رہی اور اُردو کے مسائل کو پس پشت ڈال دیا گیا۔

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

آندھرا پردیش میں اپنا قانون سرکاری زبان ہے جس کی دفعہ سات (۷) میں اردو کا ذکر ہے اور اردو کے استعمال کی صورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو کے سرکاری استعمال کے بارے میں مختلف اوقات میں جی او جاری کیے جاتے رہے۔ جناب ونگل راؤ کے دور میں ایک تفصیلی جی او جاری ہوا تھا جس میں سرکاری سطح پر اردو کے استعمال کی وضاحت کی گئی تھی۔ ۲۰ر فروری ۱۹۵۶ء میں آندھرا اور تلنگانہ کے کانگریسی قائدین کے درمیان "شریفانہ معاہدہ" طے پایا تھا۔ یہ معاہدہ چودہ نکات پر مشتمل تھا اس میں اردو کے موقف کی وضاحت کی گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ علاقہ تلنگانہ میں انتظامیہ اور عدلیہ میں اردو کا موقف پانچ سال تک برقرار رکھا جائے گا اور اس مدت کے ختم ہونے پر علاقائی کونسل اردو کے مسائل کا جائزہ لے گی۔ سرکاری ملازمتوں کے سلسلے میں تلگو سے واقفیت پر اصرار نہیں کیا جائے گا لیکن تقرر یافتہ ملازم کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ دو سال کے عرصے میں تلگو کا مقررہ امتحان کامیاب کرلے۔ چھبیس (۲۶) اراکین پر مشتمل ایک علاقائی کمیٹی کے قیام کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔ یہ جی او کس حد تک موثر ثابت ہوا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قانون سرکاری زبان دفعہ سات (۷) کے تحت حکومت کا اعلانیہ یہ تھا کہ "گورنر آندھرا پردیش حکم دیتے ہیں کہ مندرجہ ذیل اغراض کے تحت اردو کو تلگو کے علاوہ بھی استعمال کیا جائے" اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سکریٹریٹ منسٹریل اور عدالتی خدمات پر راست تقرر کے لیے' دو کو علاقائی زبان کی طرح استعمال کیا جائے۔

گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ خدمات کے زبان دوم کے امتحان میں اردو کا امتحان دوسری زبان کے طور پر لیا جائے۔ تلنگانہ کے نو اضلاع اور گنٹور، کرنول اور کڑپہ میں منسٹریل اور جوڈیشیل خدمات کے لیے ملازم کی اردو سے واقفیت کو علاقائی زبان سے واقفیت کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔ اردو درخواستوں کا جواب اردو میں دیا جائے گا۔ ایسے اضلاع میں جہاں اردو بولنے والوں کی آبادی ۱۵ فیصد ہو اہم قوانین، قواعد، ضابطے اور اعلانات اردو زبان میں جاری کیے جائیں۔ ایسے مقامات پر جہاں اردو پڑھنے والوں کی بڑی تعداد ہو سائن بورڈ اردو میں لکھے جائیں۔ ابتدائی اور تحتانوی

مدارس میں جہاں کسی جماعت میں کم از کم دس طلبہ ہوں، اردو میں تعلیم دی جائے۔ تحت کی عدالتوں سے لے کر آندھرا پردیس ہائی کورٹ تک دیوانی اور فوجداری مقدمات میں اردو استعمال کی جائے۔ ریاست آندھرا پردیس میں اردو کے استعمال اور اس کے سرکاری موقف کے بارے میں دوسرا اہم جی او نمبر ۲۷۴ مورخہ جولائی ۱۹۷۷ء ہے جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ ملازمتوں میں بھرتی کے لیے اردو علاقائی زبان تصور کی جائے۔ جہاں تک مدارس میں اردو تدریس کا تعلق ہے، اولیائے طلبہ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتے تھے اور ان کا تصور یہ تھا کہ اگر طالب علم اردو پڑھ بھی لے تو مستقبل میں اس کی ملازمت ایک سوالیہ نشان بنی رہے گی، دوسرے یہ کہ مدارس میں اردو تعلیم و تدریس کے معقول اور خاطر خواہ انتظام کی طرف بھی بہت کم توجہ کی گئی تھی جس سے اردو پڑھنے والا طالب علم دل برداشتہ ہوکر خود اس سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ سطور بالا میں جن دو ''جی او'' کا ذکر کیا گیا ہے ان پر خلوص کے ساتھ عمل کیا جاتا تو اردو کے حق میں مفید ثابت ہوتا۔ ان سرکاری احکام پر عدم عمل آوری کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے ؎

دہر میں نقش وفا وجہ تسلّی نہ ہوا

ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

بالآخر تلگو دیشم حکومت نے ۱۹۹۶ء میں سرکاری زبان کے قانون میں ترمیم منظور کرتے ہوئے اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرلیا۔ ایکٹ نمبر ۲۰ ۱۹۹۶ء (Amendment Iu Qfficial Language Act 1996) کے ذریعے سے ریاست کے آٹھ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا موقف عطا کیا گیا ہے۔ آندھرا پردیس میں نئی نسل کی قابل لحاظ تعداد اردو کے رسم الخط سے ناآشنا ہے۔ یہ صرف ایک ریاست کا مسئلہ نہیں اس کا تعلق پورے ہندستان اور ہر اُس مقام سے ہے جہاں اردو بولنے والی آبادی موجود ہے۔ اس کا حل نہ رومن رسم الخط ہے اور نہ دیوناگری لپی۔ رسم الخط سے زبان کی شناخت قائم ہوتی ہے اور زبان اور اس کے رسم الخط میں جسم و جاں کا ربط و تعلق ہوتا ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے اردو کی ممتاز شخصیتیں اور خود کو مجاہد اردو ثابت کرنے پر مصر حضرات ہمارے رسم الخط کی کوتاہیوں کا بار بار ذکر کرکے اُسے قابل تصحیح ثابت کرنے پر کمربستہ ہیں۔ ابو محمد سحر (بھوپال) جیسے ماہرین رسم الخط کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ یہ نامور ادیب رسم الخط سے دستبرداری کو اردو زبان اور اس کے پورے ادبی

اثاثے کا خاتمہ تصور کرتے ہیں۔ سید حامد نے اردو رسم الخط کی تبدیلی سے پیدا ہونے والے خطرات کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ پرشوتم داس ٹنڈن اور ڈاکٹر سمپورنا نند اردو کو ہندی کی ایک "شیلی" تصور کرلیں، ہمیں اُن سے کوئی جگہ نہیں لیکن جب سردار جعفری دیوناگری اسکرپٹ کو نقطوں کے ساتھ قبول کرنے اور میر وغالب کو شامل نصاب کرنے کے شرائط کی بات کرتے ہیں تو بڑا تعجب ہوتا ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حکومت کی سرپرستی کی کمی کے باوجود اپنے وسائل سے کام لیتے ہوئے علی گڑھ، مالیگاؤں، بھیونڈی، دہلی، کرناٹک، ممبئی اور کلکتہ کی طرح حیدرآباد میں بھی ایسے مدارس اور ادارے موجود ہیں جو مذہب اور زبان دونوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان سے قطع نظر حیدرآباد میں ادبی ٹرسٹ، ادارہ سیاست، ادارہ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کل ہند تعلیمی کمیٹی اور اردو گھر (مغلپورہ) اردو کی ایسی انجمنیں اور ادارے ہیں جو اس زبان کی بقا اور اس کے تحفظ کے لیے کوشاں ہیں اور اپنے انداز میں زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۹ء میں روزنامہ "سیاست" کا پہلا شمارہ منظرعام پر آیا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں ریاست حیدرآباد انڈین یونین میں ضم ہوچکی تھی۔ اس وقت حیدرآباد کے عوام سیاسی اور ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگئے تھے اور جذباتی طور پر ایک عجیب وغریب دور سے گزر رہے تھے۔ انڈین یونین کے فوجی افسروں کے علاوہ ریاستی نظم ونسق میں دخیل سول عہدیداروں کی بڑی تعداد اردو رسم الخط اور اردو میں دفتری مراسلت سے ناواقف تھی اس لیے فطری طور پر اردو داں طبقہ اپنی تہذیب اور زبان کے تحفظ کے بارے میں تردد اور تشکیک کا شکار ہوگیا تھا۔ مختلف دفتروں اور سکریٹریٹ میں اردو کی جگہ انگریزی نے لے لی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کا چارٹر بدل دیا گیا اور اردو ذریعہ تعلیم کا مقام انگلش میڈیم نے لے لیا تھا۔ ان حالات میں اردو داں طبقہ اپنے اردگرد ایک لسانی خلا محسوس کررہا تھا۔ عابد علی خان اور محبوب حسین جگر نے اس سیاسی اور لسانی تناظر میں حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ایسا اخبار جاری کرنے کا منصوبہ تیار کیا جو صحیح خطوط پر عوام کی رہنمائی کا حق ادا کرسکے۔ اس وقت حیدرآباد میں اردو کے متعدد اخبار جاری تھے جن میں نظام گزٹ، شعیب، مشیر دکن، صبح دکن، رعیت اور اقدام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ قاضی عبدالغفار کے "پیام" کا کام اختر حسن کے سپرد کیا گیا تھا لیکن ۱۹۴۹ء میں یہ بند ہوگیا۔ اخبار سیاست نے اردو صحافت کا معیار بلند کیا اور یہ اخبار اردو کے سیکولر کردار کا

ترجمان اور ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ سیاست نے اردو تحریک کو وزن اور وقار عطا کیا۔ ادبی ٹرسٹ، تعلیمی ٹرسٹ اردو گھر اور اردو امتحانات کے ذریعے سے سیاست نے اردو زبان وادب کے فروغ واشاعت میں اہم رول ادا کیا ہے" اردو دانی"، "زبان دانی" اور "انشا" کے امتحانات کا آغاز ۱۹۹۴ء میں ہوا اور اب تک گیارہ مرتبہ امتحانات کا انعقاد عمل میں آیا ہے۔ ان امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے والوں کی تعداد 180474 تک پہنچتی ہے امیدواروں میں یونیورسٹی کے غیر اردو داں پروفیسرز سے لے کر کم عمر بچوں تک سب ہی شامل ہیں۔ ان امتحانات میں اب تک 20000 بیں ہزار غیر اردو داں امیدواروں نے شرکت کی ہے۔ حکومت کی جانب سے اردو اساتذہ کے انتخاب کے لیے جو امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں اس کی کوچنگ کا انتظام بھی ۱۹۹۶ء سے کیا جارہا ہے اور اب تک ایک سو گیارہ (۱۱۱) اساتذہ منتخب ہو چکے ہیں۔ یونانی میڈیسن (B U.M.S) کے امتحانات کے لیے بھی امیدواروں کو تیار کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اسی سال ۱۹۹۹ سے ہوا ہے۔ ایڈیٹر سیاست عابد علی خان نے گرمائی اسکول کا آغاز بھی کیا تھا۔ ایسے طلبہ جو اسکول میں اردو تعلیم سے محروم ہورہے ہیں، اس سے مستفید ہورہے ہیں۔ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے علاوہ اضلاع اندھرا اور پڑوسی ریاست کرناٹک (رائچور، گلبرگہ اور بیدر) اور اسی طرح مہاراشٹر کے اضلاع (ناندیڑ، جالنہ اور بیڑ) تامل ناڈو اور اس کے علاوہ مدھیہ پردیس، اتر پردیس اور کیرالا میں اپنے مراکز قائم کرچکی ہے۔ میٹرک (ایس ایس سی) اردو میڈیم کے طلبہ کے لیے اردو گھر مغلپورہ میں فری کوچنگ کا انتظام کیا گیا ہے جس کے نتائج امید افزا ہیں۔ نومبر ۱۹۹۹ء میں اردو کمپیوٹر کا کوچنگ سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ روزنامہ سیاست بنگلور سے بھی شائع ہورہا ہے اور کرناٹک کے عوام بڑے ذوق وشوق کے ساتھ اس کا مطالعہ کررہے ہیں۔ "کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کی کوششوں کی وجہ سے ریاست میں چار ریذی ڈنشیل اسکول قائم ہوئے ہیں اور اردو ذریعہ تعلیم کا کالج اندراپریہ درشنی قائم ہوا ہے جس سے اردو داں طالبات مستفیض ہورہی ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا جس کے اغراض ومقاصد میں اردو زبان وادب اور اردو تحقیق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے محرک اور بانی سید محی الدین قادری زور تھے۔ اس کی تعمیر کے لیے بیگم محی الدین قادری زور نے ایک ہزار مربع گز زمین کا عطیہ دیا تھا جس پر ۱۹۶۰ء میں ریاستی حکومت اور حکومت ہند کی امداد سے

ایوان اردو کی عمارت تعمیر کی گئی۔ ریاست آندھرا پردیش نے تعمیراتی مقصد کی تکمیل کے لیے پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) عطا کیے تھے۔ اس کے علاوہ اردو کے بہی خواہوں نے بھی حسب حیثیت مالی امداد سے نوازا تھا۔ اس ادارے میں تحقیق کا دائرہ کار قطب شاہی دور سے لے کر عہد حاضر تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں تاریخ، جغرافیہ، ثقافت، فلسفہ، اردو تحقیق اور تنقید پر قابل قدر کام ہوا ہے اور تا حال یہاں سے ۳۴۴ کتابیں طبع ہو چکی ہیں ڈراما، انشائیہ اور بچوں کے ادب پر بھی مفید کام ہوا ہے۔ اور اردو تراجم کی اشاعت بھی عمل میں آئی ہے۔ اس کے کتب خانے میں چالیس ہزار (40000) نایاب کتابیں موجود ہیں اور دکنی، فارسی، عربی اور پنجابی وغیرہ کے مخطوطات کی تعداد تین ہزار (3000) تک پہنچتی ہے۔ تاریخی دستاویزات، فرامین، خطوط، شاہی احکام، پینٹنگس، چارٹ، نقشے اور تصویروں کا قیمتی ذخیرہ ایوان اردو کا گرانقدر اثاثہ ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے ترجمان رسالہ "سب رس" کی اشاعت ۱۹۳۸ میں عمل میں آئی۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے یہاں ۱۹۴۰ء سے اُردو امتحانات منعقد کیے جا رہے ہیں "اردو ماہر" "اردو عالم" اور اردو فاضل" میں کامیاب ہونے والا طالب علم بتدریج زبان و ادب کے مدارج طے کرتا ہوا اچھی استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ یہ امتحانات اضلاع کے مراکز میں بھی منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادارہ ادبیات اردو میں بھی اردو دانی، زبان دانی اور انشا کے امتحانات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اردو عالم اور اردو فاضل عثمانیہ یونیورسٹی اور کاکتیہ یونیورسٹی کے مسلمہ امتحانات ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو نے اردو خطاطی اور کمپیوٹر ٹریننگ کی طرف بھی توجہ کی ہے کیونکہ یہ تربیت اردو طلبہ اور طالبات کے لیے ذریعہ معاش بن سکتی ہے۔

۱۳ ر دسمبر ۱۹۷۵ میں جی او نمبر ۱۳۶۶ کے ذریعے سے اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی گرانٹ دو لاکھ سے اب ایک کروڑ ہو چکی ہے۔ اردو اکیڈمی کے موجودہ صدر جناب نور الحق قادری ایک فعال اور کارکرد شخصیت ہیں۔ اردو اکیڈمی میں اردو شارٹ ہینڈ کی تربیت کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کا امتحان "Board of Technical Education" منعقد کرتا ہے۔ پہلے بیچ میں چودہ امیدوار شامل تھے جن میں سے چھے نے کامیابی حاصل کی۔ اس کے علاوہ ترجمے کے ڈپلوما کی جماعتوں کا بھی اردو اکیڈمی نے اہتمام کیا ہے۔ اکیڈمی کے کمپیوٹر کورس کو "بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن" نے مسلمہ قرار دیا ہے اور اس سے ہر سال خاصی تعداد میں طلبہ مستفید ہو رہے ہیں۔ اردو اکیڈمی

نے جماعت اول سے لے کر میٹرک تک کی قومیائی ہوئی نصابی کتابیں تیار کی ہیں۔ اردو اکیڈمی کی جانب سے نہ صرف معاشی طور پر پس ماندہ طالب علموں کی مدد کی جاتی ہے بلکہ تعلیمی معیار کی بنیاد پر دوسری جماعت سے لے کر پی ایچ ڈی تک کے ریسرچ اسکالروں کو بھی مالی امداد دی جاتی ہے۔

مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی ملک کے اردو داں طبقے کی ایک دیرینہ تمنا تھی۔ اس کا بل پارلیمنٹ میں ۱۹۹۶ میں منظور کیا گیا اور یونیورسٹی کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ ۸ر جنوری ۱۹۹۷ء کو حکومت ہند کے گزٹ میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر کا تقرر عمل میں آیا۔ حیدرآباد میں اس یونیورسٹی کے قیام کا اس لیے بھی فیصلہ کیا گیا تھا کہ یہ شہر نہ صرف اردو کا قدیم ترین مرکز ہے بلکہ یہاں عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو ذریعہ تعلیم کا کامیاب تجربہ کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے والے طلبہ تدریس کی اعلا ترین سطح پر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ اُردو زبان میں ایسی غیر معمولی ترسیلی توانائی اور ابلاغی قوت موجود ہے کہ وہ ہر موضوع کو بڑی سہولت، آسانی اور وضاحت کے ساتھ ادا کر سکتی ہے چنانچہ عثمانیہ یونیورسٹی میں سائنسی مضامین یہاں تک کہ انجینرنگ اور میڈیسن کے لیے بھی اردو ذریعہ تعلیم مروج تھا۔ مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی کے چار اہم نکات یہ ہیں (۱) اردو زبان وادب کی ترویج وترقی (۲) اردو ذریعہ تعلیم سے فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام (۳) روایتی تدریس اور فاصلاتی طرز تعلیم کے ذریعے سے عوام کو تعلیمی سہولتوں کی فراہمی اور (۴) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ۔ اس یونیورسٹی کے وزیٹر صدر جمہوریہ ہیں، چانسلر جناب اندر کمار گجرال اور وائس چانسلر پروفیسر شمیم راجپوری ہیں۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے آغاز کے لیے کتابوں کی فراہمی ضروری تھی جس کے لیے ایک ''یادداشت مفاہمت'' سے مدد لی گئی اور ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی (حیدرآباد) اور اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کی مرتب کردہ کتابوں کو مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کرلیا گیا۔ تعلیمی سال ۱۹۹۸ء، ۹۹ء میں بی اے سال اول میں داخلوں کا اعلان کیا گیا جس میں امتحان اہلیت (Eligibility) کی بنا پر داخلہ دیا گیا تھا۔ بی اے سال اول میں دو ہزار پانچ سو 2500 طلبہ نے داخلہ لیا۔ اس بیچ کے طلبہ کا امتحان نومبر ۱۹۹۹ء میں ہوگا۔ تاحال اس یونیورسٹی میں اہلیت کے دو امتحانات منعقد ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۹ء۔ ۲۰۰۰ء میں بی اے کے ساتھ ساتھ بی کام میں داخلے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ

"غذا اور تغذیہ" سرٹیفکٹ کی تدریس کا بھی اعلان کیا گیا ہے اور اس کورس میں داخلے کی آخری تاریخ ۱۵ دسمبر ۱۹۹۹ء مقرر کی گئی ہے۔ توقع ہے کہ بی اے اور بی کام میں اس سال چار ہزار 4000 تا پانچ ہزار 5000 طلبہ یونیورسٹی میں داخلہ لیں گے۔ اس یونیورسٹی کے تین علاقائی مراکز پٹنہ، دہلی اور بنگلور ہیں۔ یونیورسٹی نے اُنیس (۱۹) اسٹڈی سنٹر یا تدریسی مراکز قائم کیے ہیں جہاں ہر اتوار اور دوسری تعطیلات میں کونسلنگ (Councilling) کی سہولت موجود ہے۔ ان تدریسی مرکزوں کی تعداد آندھرا میں دس، کرناٹک میں چار، مہاراشٹر میں تین، دلی میں ایک اور بہار میں ایک ہے۔ حکومت آندھرا پردیس نے مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی کے لیے دوسوا ایکٹرز مین کا عطیہ دیا ہے جس کی حصار بندی کا کام جاری ہے۔ یونیورسٹی میں تعلیم نسواں کا علاحدہ شعبہ ہے۔ اس کی صورت گری ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اردو یونیورسٹی کو اردو ذریعہ تعلیم کے دو "اسکول" قائم کرنے کی اجازت دی ہے "اسکول آف لنگوئجس اینڈ لنگوائسٹکس اور ماس کمیونیکشن، جرنلزم، کامرس اور بزنس مینجمنٹ کے قیام سے متعلق کام میں پیش رفت ہو رہی ہے۔ بنگلور نے اس یونیورسٹی کو دوا یکٹرز مین کا عطیہ دیا ہے تا کہ یہاں سدرن سنٹر قائم کیا جاسکے۔ حیدرآباد میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ یہاں اردو میڈیم مدارس کی خاصی تعداد موجود ہے اور اسی طرح ریاست میں چالیس جونیر کالج ایسے موجود ہیں جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ حسن فرخ کے بیان کے مطابق جو اردو اکیڈمی کے پبلک ریلیشن آفیسر ہیں، ریاست میں اردو ذریعہ تعلیم کے پانچ سو سے زاید مدارس موجود ہیں اور جونیر کالجوں کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ریاست میں تقریباً ایک لاکھ طلبہ اردو ذریعہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ صرف سری کاکولم میں کوئی اردو ذریعہ تعلیم کا کالج نہیں ہے۔ حیدرآباد کے مختلف کالجوں جیسے ممتاز کالج انوار العلوم کالج اور بعض دوسرے کالجوں میں اردو کی جماعتوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ چار جونیر کالج رہائشی کالج (Resiaential ge) Colle ہیں جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہے۔

تلنگانہ کے اضلاع میں ایک اُردو دان ڈی۔ ای۔ او کا تقرر کیا جاتا ہے۔ رائل سیما اور آندھرا میں ایک ایسا ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس ہر ضلع میں موجود ہوتا ہے جو اردو سے بخوبی واقف ہو۔ ریاست آندھرا پردیس کے irecior of School

Education میں ایک اُردو سیل قائم کیا گیا ہے۔اس میں ایک اردو داں جوائنٹ ڈائرکٹر اور ایک اسپشل آفسر موجود ہوتا ہے۔اسی طرح(S.C.E R.T)ایس سی ای آر ٹی میں بھی اردو کا سیل قائم ہے جہاں اردو کے دو پروفیسروں کا تقرر کیا جاتا ہے۔بی ایڈ، ام ایڈ اور ''اردو پنڈت'' کے لیے اردو کا انتظام موجود ہے اور اُردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ اور طالبات اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔حکومت آندھرا پردیس نے اقلیتوں کے لیے ''روشنی'' کے نام سے موسوم ایک پیکج تیار کرلیا ہے جس میں اردو کے بہتر موقف کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں اردو گھروں کی تعمیر، اردو اساتذہ کی 884 جگہوں کو اندرون دو ماہ پُر کرنے ، حسب ضرورت اسکول ایجوکیشن کمیٹی کے قیام اور تعلیمی والنٹیر وں کے تقرر اور میدک، عادل آباد اور نیلور کے مدارس میں اردو تدریس اور منڈلوں کے پرائمری مدارس میں اردو تعلیم سے متعلق تعیّنات دیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ مزید چار اضلاع یعنی چتور، محبوب نگر، عادل آباد اور کرشنا میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا موقف دینے کی تجویز بھی موجود ہے۔''روشنی پیکج'' کا جی او ابھی جاری نہیں ہوا ہے لیکن توقع ہے کہ مستقبل قریب میں بہت جلد حکومت عوام تک روشنی پہنچائے گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آندھرا پردیس میں اردو کے مسائل پر حکومت اب سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگی ہے۔ صرف احکام جاری کرنے سے اردو کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا بلکہ اس پر مناسب انداز میں عمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

نویدِ صبح جو مل بھی گئی تو کیا حاصل
یہ دیکھنا ہے کہ سورج طلوع کب ہوگا

اردو ادب ۷۷-۱۹۷۶ء میں

مرتب. محمود عالم

کتاب نما کے اس شمارے میں اگست ۱۹۷۶ تا دسمبر ۱۹۷۷ء تک کے اہم علمی و ادبی مضامین کا اشاریہ پیش کیا گیا ہے۔

قیمت:-/3روپے

نظرے خوش گزرے　　بیگم انیس قدوائی

دلچسپ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔اس میں شاعروں پر بھی مضامین ہیں اور ادیبوں پر بھی۔تاریخی حقایق اور نئی تہذیب کا لکچر جو کڑوا کسیلا ہے، مگر ہے فرحت بخش۔

قیمت:-/12روپے

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

رہ نوردِ شوق (سفرنامہ) ڈاکٹر سید عابد حسین

اردو کے نامور ادیب، معلم، مفکر اور دانشور ڈاکٹر سید عابد حسین کے خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے غیر ممالک سے اپنی رفیقِ حیات صالحہ عابد حسین صاحبہ کو لکھے۔ ڈاکٹر صاحب کے غیر ملکی دوروں کے اغراض و مقاصد، پس منظر اور دیگر ضروری کوائف پر روشنی ڈالنے والی اہم دستاویز۔ قیمت: 14/50 روپے

انیٹنی اور کلیو پیٹرا ولیم شیکسپیر

مترجم: ڈاکٹر نجیب الرحمٰن

انگریزی کے شہرۂ آفاق ڈراما نویس اور شاعر، شیکسپیر کا مشہور ڈراما جسے بڑی خوبی سے اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ رواں، بامحاورہ اور برجستہ مکالمے اس ترجمے کی جان ہیں۔ یہ کامیابی سے اسٹیج بھی کیا جا سکتا ہے۔

قیمت: 16/50 روپے

پیامی قواعدِ اردو

قواعد جیسے خشک مضمون کو سمجھنے سمجھانے، اور برتنے کے لیے نہایت آسان زبان میں ترتیب دی ہوئی یہ قواعد اساتذہ اور طلبہ کے لیے نہایت مفید ہے۔

قیمت: 7/50 روپے طلبہ اڈیشن: 4/ روپے

اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سر سید کا مرتبہ سید مقبول احمد

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسے میں پڑھا جانے والا چوتھا سر سید یادگاری خطبہ۔ اس خطبے سے سر سید اور اسلام کی اصلاحی تحریکوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

قیمت: -/8 روپے

راستے اور کھڑکیاں (افسانے) انور خاں

نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں انور خاں کا نام خاصا نمایاں ہے۔ آپ کے افسانوں میں رومان کی چاشنی، تخیل کی چمک اور سماجی مسائل کا حل ملے گا۔ (دوسرا اڈیشن)

قیمت: -/5 روپے

انشاء (نیا اڈیشن) مرزا فرحت اللہ بیگ

شاعری کی دنیا میں انشاء کی ایک ایسی زندگی گزری ہے جو اپنی ابتدا کے لحاظ سے اُس زمانے کے شعرا کے لیے ایک مصیبت اور انتہا کے لحاظ سے دنیا والوں کے لیے ایک عبرت تھی۔

قیمت: -/4 روپے

جو میرے وہ راجا کے نہیں صغرا مہدی

صغرا مہدی کی کہانیاں عورت کے ان پہلوؤں کے گرد گھومتی ہیں جہاں اس کا وجود آزاد نہیں ہے۔ افسانوی ادب میں ایک اہم اضافہ۔ قیمت: -/10 روپے

نیساں اکبرآبادی

قافیہ کیا ہے

قافیہ سے وہ ہم حرکت اور ہم اعراب الفاظ مراد ہیں جو کسی غزل یا نظم کے مصرع اول اور مصرع ثانی میں ردیف سے پہلے لائے جاتے ہیں۔قافیہ کا استعمال ردیف کے بغیر بھی ہوتا ہے۔دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی صوت ایک سی ہو۔ یعنی قافیہ مکتوبی نہیں ملفوظی ہوتا ہے۔اس کے پرکھنے کے لیے کتابت نہیں دیکھی جاتی تلفظِ لفظ دیکھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ وہ ہم اعراب ہوں ۔ یہاں اس بات کو واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حروف بظاہر ایک سی صوت کے معلوم ہوتے ہیں ان کا مخرج مختلف ہے مثلاً ہماری زبان میں ز، ذ، ظ، ض بظاہر ایک سی صوت کے ہیں لیکن اگر قافیہ کے طور پر پیاز، مجاز، لحاظ اور بیاض کو ہم قافیہ سمجھا جائے تو درست نہ ہوگا۔اسی طرح ث، س، ص، ان تینوں حروف کے مخرج بھی الگ ہیں لہٰذا ث کا قافیہ س کے ساتھ یا س کا قافیہ ص کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ت اور ط بھی بظاہر ہم صوت ہیں لیکن ان کا بھی مخرج الگ الگ ہے لہٰذا رات کا قافیہ احتیاط نہیں ہوسکتا۔البتہ الف اور ہائے ہوز کو ہم صوت مان لیا گیا۔لہٰذا جلوہ، نظارہ وغیرہ کا قافیہ تقاضا، تمنا، دریا وغیرہ کیا جاسکتا ہے۔صرف اتنی احتیاط برتنی پڑے گی کہ اگر ہائے ہوز والا لفظ مصرعہ اول اور مصرع ثانی دونوں میں آرہا ہے تو پھر الف والا قافیہ نہیں ہوسکتا۔یہ عطف واضافت کے ساتھ آرہا ہے تو پھر الف کے ساتھ قافیہ غلط گردانا جائے گا۔مثلاً

دیکھا جو نہیں ہے رُخ زیبا کئی دن سے
مشتاق ہے پھر ذوق نظارہ کئی دن سے

یہاں زیبا کا قافیہ اگر چہ ہائے ہوز والے لفظ نظارہ سے کیا گیا ہے لیکن ذوق نظارہ اضافت کی ترکیب کے ساتھ آیا ہے اس لیے لازمی "ۂ" سے لکھنا پڑے گا اور پھر

ہ کا ہی تلفظ کرنا پڑے گا۔الف کا تلفظ غائب ہو جائے گا۔یہ بہت نازک بات ہے۔ اسے سمجھ لینا چاہیے۔

قافیہ سمجھنے کے ضمن میں مبتدی شعرا کو دشواری پیش آتی ہے۔اس کے پیش نظر مجھے اس مضمون کے لکھنے کا خیال آیا۔قدیم اساتذہ نے جنھیں مستند مان لیا گیا ہے اور جو اردو زبان میں قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں انھوں نے بات اور کائنات کا قافیہ ہاتھ اور ساتھ سے کیا ہے اور یہ درست ہے۔اس کی توجیہہ یہ ہے کہ ہاتھ اور ساتھ کے الفاظ میں جو دوچشمی (ھ) ہے وہ ساکن ہے جس کا تلفظ اتنا دب جاتا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظ ت پر ختم ہو گیا اس لیے اسے درست قافیہ سمجھا گیا اور آج بھی شعرا ان کی تقلید میں بات اور رات کا قافیہ ساتھ اور ہاتھ کے ساتھ کر رہے ہیں۔

ایک قسم قافیہ کی اور ہے اور وہ یہ کہ لفظ چاہے ایک ہی املا سے لکھا جائے لیکن اگر مختلف المعنی ہے تو قافیہ درست سمجھا جائے گا۔صرف درست ہی نہیں بلکہ قافیہ کا حسن کہلائے گا۔مثال کے طور پر۔

کیوں اُن کا نام لب پر مرے بار بار ہے
اتنی سی بات ان کی طبیعت پہ بار ہے

یہاں پہلے مصرع میں بھی بار آیا اور دوسرے مصرع میں بھی بار استعمال ہوا لیکن چونکہ پہلا بار تکرار کے معنی میں ہے اور دوسرا بار گراں کے معنی میں ہے اس لیے قافیہ درست بلکہ احسن۔

اساتذہ نے بھی اپنے کلام میں اس قسم کے قافیہ کو جگہ دی ہے، مثالیں پیش کرتا ہوں۔ذوق فرماتے ہیں۔

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو خود ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

پہلے مصرع میں بھی گر ہے جو بیداد کے لفظ کے ساتھ ہے اور دوسرے مصرع میں بھی گر ہے اگر کے معنی میں ہے۔مختلف المعنی ہیں اس لیے ذوق نے اسے جائز سمجھا اور نظم کیا۔ مرزا یاس یگانہ چنگیزی فرماتے ہیں۔

لذّت زندگی مبارکباد
کل کی کیا فکر ہر چہ بادا باد

یہاں بھی وہی انداز ہے۔ معنی مختلف ہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قافیہ میں کتابت نہیں دیکھی جاتی۔ صرف صوت اور آہنگ دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً دشمن، گلشن، دامن وغیرہ کے دیگر قوافی سہواً، عمداً، طوعاً، کرہاً، کرلینا بالکل درست اور جائز ہے۔ اگرچہ گلشن، دامن میں ن ہے اور سہواً، عمداً میں الف لیکن یہاں الف پر دوز بر ہونے کی وجہ سے صوت ن کی ہے اس لیے قافیہ درست۔

کچھ ناتجربہ کار شعرا صوت کے معاملے میں دھوکا کھا جاتے ہیں اور اگر پہلے مصرع میں الف کا قافیہ استعمال ہوا ہے تو دوسرے مصرع میں ع کا قافیہ بھی استعمال کرلیتے ہیں۔ یہ کہہ کر کہ صوت ایک ہے جبکہ الف اور ع کی مختلف صوت ہے لہٰذا باد، یاد کا قافیہ بعد نہیں ہوسکتا۔

کچھ قافیے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں ایک لفظ سے قافیہ اور ردیف دونوں کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر قوافی جام، نام، کام وغیرہ ہوں اور ردیف ''نے'' آدمی ہوتو شاعر جام نے کے مقابلے میں سامنے قافیہ ردیف مشترک لاسکتا ہے کیونکہ صوت ایک سی ہوگئی اگرچہ ردیف اپنی اصلی ہیئت میں نہیں آئی۔ اس قسم کے قافیہ کو قافیہ معمولا کہتے ہیں۔

کچھ الفاظ ایسے ہیں کہ جن کا املا اگرچہ ہائے ہوز پر ختم ہوتا ہو لیکن تلفظ کہیں ''ے'' پر ہوتا ہو اور کہیں واؤ پر مثلاً ''یہ'' اس کو اگر بطور قافیہ کرنا ہو تو کے، نے، سے، وغیرہ الفاظ کے ساتھ کیا جاسکتا ہے کیونکہ ''یہ'' کا تلفظ ''ے'' پر ختم ہوتا ہے ہ کے تلفظ پر نہیں۔

بالکل اسی طرح وہ کا قافیہ دو، لو، کو وغیرہ سے کرسکتے ہیں کہ اس کا تلفظ واؤ پر ختم ہوتا ہے نہ کہ ہ پر۔

اب آگے کھیل مقدر کا آب و دانہ کا
قفس میں خواب تو دیکھا ہے آشیانے کا

اس شعر کو دیکھ کر یا سن کر نافہم حضرات کو یہ گمان ہوسکتا ہے کہ آب ودانا چونکہ ہ سے لکھا گیا اور آشیانے میں ''نے'' ہے اس لیے قافیہ غلط ہے۔ لیکن یہ ان کی کم فہمی اور قافیہ سے ناواقفیت کی بات ہوگی۔ ''آب ودانہ'' لکھا جائے گا اور تلفظ آب ودانے کا ہوگا۔ یہ قافیہ بالکل

درست ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے بہت واضح اور سادہ الفاظ میں ہر قسم کے قافیہ کی نشاندہی کردی ہے۔ اب کسی کے ذہن کو الجھاؤ میں نہیں رہنا چاہیے۔ تاہم اگر کسی صاحب کے ذہن میں کسی قافیہ کے متعلق کچھ استفسار کرنا ہو تو میں حاضر ہوں۔

نامناسب نہ ہوگا اگر کچھ قافیہ کے محاسن و عیوب پر بھی روشنی ڈال دوں۔

شعر میں اگر قافیہ مکرر لایا جائے تو شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

مثلاً

ہم بچائے ہوئے دل جاتے تھے اپنا لیکن
لے گئے مل کے تہاں چھین کے ہنستے ہنستے

اشعار میں قافیہ کا ایک بڑا حسن یہ ہے کہ ایک ہی لفظ سے ردیف اور قافیہ دونوں کا کام لیا جائے۔

مثلاً

دل کی زمیں سے کون سی بہتر زمین ہے
پر جان تو بھی ہو تو عجب سر زمین ہے

معنوی حیثیت سے قافیہ کا ایک حسن یہ ہے کہ شعر کے پہلے ہی مصرع میں مضمون پورا ہو جائے اور بظاہر مصرعہ ثانی میں قافیہ لانے کی ضرورت محسوس نہ ہو لیکن ایسا قافیہ مصرعہ ثانی میں لایا جائے کہ کلام میں زور پیدا ہو جائے۔ مثلاً

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

آیئے اب ذرا چند عیوب قافیہ پر بھی نظر کرلیں۔

عیوب قافیہ

قافیہ میں ایک جگہ اصلی حروف ہو اور دوسری جگہ اصلی حرف نہ ہو تو ایسے قافیہ کو عیب میں شمار کریں گے۔ مثلاً

گالی کے ساتھ لالی کا قافیہ لے آئیں۔ اس میں گالی کی ی اصلی ہے اور لالی کی اصلی نہیں کہ لال سے لالی بنایا گیا ہے۔

دوسرا عیب قافیہ کا یہ ہے کہ قافیہ کے حرکت میں اختلاف ہو جیسے ایک مصرع میں

مسافر ہی لایا جائے اور دوسرے مصرع میں جوہری تو یہ قافیہ کا عیب ہے۔ اس عیب کو اقوئی کہتے ہیں۔

ایطائے جلی

ایسا قافیہ لانا کہ اگر مشترک حروف الگ کر لیے جائیں تو جو باقی حروف بچیں وہ بامعنی ہوں مثلاً دردمند کا قافیہ حاجت مند، گل دان کا قافیہ جزدان کیا جائے تو اس میں ایطائے جلی کا عیب ہے کہ منداور دان الگ کرنے کے بعد بامعنی لفظ بچے درد، حاجت، گل اور جزاور یہ آپس میں ہم صوت نہیں۔

ایطائے خفی

ایسا قافیہ لانا کہ اگر مشترک لفظ الگ کرلیں تو جو لفظ بچیں وہ بامعنی نہ ہوں بلکہ مہمل ہوں جیسے اگر کوئی داناا ور بینا قوانی مطلع میں استعمال کرے تو ایطائے خفی کا عیب ہے۔ اس میں نا الگ کرلیا جائے جو مشترک ہے تو دا اور بی بچتا ہے۔ اسی کا نام ایطائے خفی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ قافیہ اور ردیف کے مشترک حروف کو الگ کرکے دیکھ لیا جائے اور پھر بھی صوت میں ہم آہنگی پائی جائے تو قافیہ درست ورنہ غلط۔ ایک مثال دیتا ہوں اس سے واضح ہو جائے گا۔

گھبرا رہا کا قافیہ اگر کوئی تھرا رہا ہے کرے تو قافیہ کی پرکھ یہ ہے را رہا ہے مشترک ہے اب دونوں جگہ جو حرف بچے انھیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ ہمصوت ہیں یا نہیں۔ گھب اور تھر جو مختلف ہیں لہٰذا گھبرا رہا ہے کا قافیہ مطلع میں تھرا رہا ہے نہیں ہو سکتا۔

اگر مطلع میں کسی حرف یا حروف کی قید ہو تو اس کی پابندی لازمی ہے۔ مثلاً پہلے مصرع میں نظارا اور دوسرے مصرع میں کنارا صرف کیا جائے تو ''را'' کی قید ضروری ہوگی۔ اب تقاضا، تمنا قوانی اس کے ساتھ نہیں آسکتے۔ ہاں اگر پہلے مصرع میں نظارا اور دوسرے مصرع میں کوئی الف والا قافیہ ہو جیسے دنیا، تقاضا تو پھر ہر قسم کا وہ لفظ جس کے آخر میں الف آئے قافیہ ہوگا۔

قافیہ کا ہم اعراب ہونا بھی بہت ضروری ہے جیسا کہ میں ابتدائے مضمون میں کہہ چکا ہوں۔ محفل، منزل کا قافیہ بادل نہیں ہو سکتا کہ محفل اور منزل میں زیر ہے اور بادل میں د پر

زبر۔ صوت بدل جاتی ہے اور قافیہ کا انحصار صوت پر ہے۔ قافیہ کے ساتھ ردیف کا استعمال لازمی نہیں اور اگر ردیف غزل یا نظم میں نہ ہو تو اسے غیر مُردّف کہتے ہیں یعنی ردیف کے بغیر۔ یہ بات ماننی پڑے گی کہ غیر مردّف اشعار میں زور پیدا نہیں ہوتا۔ ردیف سے شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور شعر سامع پر اچھا تاثر چھوڑتا ہے اس لیے عام طور پر شعرا غزلیں عموماً ردیف والی ہی کہتے ہیں۔

غیر مردّف غزلیں کہنے کا رواج بہت کم ہے بشرطیکہ کسی کے قلم میں اتنی طاقت ہو کہ غیر مردّف اشعار سے اپنا سکہ منوا سکے۔

ایک عیب تقابل ردیفین کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر ردیف پہلے مصرع میں بھی آئے مطلع کے علاوہ تو اسے تقابل ردیف کا عیب کہا جائے گا۔ مثلاً محمد زبیر فاروقی شوکت الہ آبادی کا شعر ہے چراغ حرا میں۔

نماز عشق میری یوں ادا ہو
کہ میرا سر ہو ان کا سنگ در ہو

اس نعت میں، در، سر قوافی ہیں اور ہو ردیف۔ چونکہ پہلے مصرع میں بھی ردیف آ گئی اس لیے تقابل ردیف کا عیب ہو گیا۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اگر یہ باتیں جو اس مضمون میں کہی گئیں ہیں یاد رہ جائیں اور شاعران پر عمل پیرا ہو جائے تو بھی بہت کافی ہے۔ یہ مضمون ان لوگوں کی معلومات میں اضافہ کے لیے لکھا گیا ہے جو شاعری کی حسن و قبح سے ناواقف ہیں۔ وہ جان جائیں اور ان کی شاعری بھی اغلاط سے پاک ہو جائے۔ اگر چند لوگوں نے بھی اس مضمون سے فائدہ اٹھا لیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ (بہ شکریہ اخبار اردو)

باقر مہدی

ایک کالی نظم
(اپنے نام)

(اونچے اور متوسط طبقے کے عمر افراد کو Senior Citizens کے نام سے یاد کیا جاتا ہے افسوس ہے کہ میں بھی نچلے متوسط طبقے کا ایک فرد ہوں؟)

راتوں کے سناٹے میں۔ کبھی کبھی
آہٹ آتی جاتی ہے
چیخ سنائی دیتی ہے!
رات و دن۔ ہم لوگوں کے ایک سے ہیں!
شور میں خوف چھپا رہتا ہے
لیکن رات کی تنہائی میں
ہلکی ہلکی چاپ سنائی دیتی ہے!
میں نے باہر جھانک کے دیکھا
شور مچاتی لہریں آپس میں باتیں کرتی تھیں
دور۔ وہ پیلا چاند دیکھ رہا تھا
موت سے میری "یاری" تھی۔ برسوں پہلے
بڈھے بڈھے لوگوں پر وار کی خبریں
سرخی بن کر چھپتی ہیں!
شاید میرے کمرے میں بھی کوئی "قاتل" آیا تھا
میری کتابیں دیکھ کے کتنا حیراں تھا
"یہ میری ساری دولت ہے۔"
وہ بے چارہ معافی مانگ کے چلا گیا
کل اک بوڑھے کے مرنے کی کوئی خبر نہیں چھپے گی!

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

دبستان آتش شاہ عبدالسلام

مجموعی طور پر یہ مقالہ مستند تحقیق کا اچھا نمونہ ہے اور اپنے اندر [illegible]خیزی رکھتا ہے جس سے یقیناً تحقیق کی مزید راہیں کھلیں گی۔

قیمت:-/16 روپے

اپنی اپنی صلیب (نیا اڈیشن) صالحہ عابد حسین

دنیا کی اس چہل پہل میں، ہر انسان اپنے دکھ درد کا بوجھ اپنی اپنی صلیب، اپنے کندھوں پر اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ مگر کوئی کسی کا غم بانٹ نہیں سکتا۔ اسی کا نام زندگی ہے اور اسی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر اس ادب پارے میں ملے گی۔ قیمت:-/60 روپے

رابطہ عامہ عرفان صدیقی

رابطہ عامہ آج ساری دنیا میں ایک ایسے فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کی افادیت اور علمی اہمیت سے انکار کرنا مشکل ہے۔ اس کتاب میں اُردو قاری کو رابطۂ عامہ کے جدید تصور سے روشناس کرایا گیا ہے۔

قیمت:-/5 روپے

پرائی دھرتی، اپنے لوگ (ناول) جتندر بلو

ایک ہندستانی کی کہانی جس نے لندن اور لندن کے رہنے والوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جتندر بلو کا پہلا کامیاب ناول۔

قیمت:-/12 روپے

شاد عارفی، شخصیت اور فن ڈاکٹر مظفر حنفی

شاد عارفی کی طبع رواں نظم و نثر، تخلیق و تنقید اور غیر ثقہ مضامین، کسی میدان میں بند نہ تھی۔ اس کتاب میں اُن کی اِنھی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ شخصیت اور فن کے بیش از بیش پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ -/24 روپے

کربِ آگہی آنند نرائن مُلا

مُلا کا ذہن و شعور، فکر کے روایتی اور رسمی سانچوں سے بے نیاز ہو کر سوچتا ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو اس مجموعے کے مطالعے سے ملے گا۔ قیمت:10/50 روپے

حیاتِ اسماعیل۔ حیات اور خدمات

ڈاکٹر سیفی پریمی

اس تحقیقی مقالے میں اسماعیل میرٹھی کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری اور نثر نویسی کے بارے میں متعدد نئی معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اس مقالے پر موصوف کو دلی یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ -/18 روپے

اختر سعید خاں

شہر غزل پر ایک نظر

شہر غزل کا صفحہ الٹنے سے پہلے رفعت سروش صاحب کا ایک شعر زبان پر آگیا جو کبھی نظر سے گزرا تھا اور یاد کا حصہ بن گیا تھا۔

اپنے دل تباہ کا مجھ کو نہ کچھ ملال تھا
تیرے خیال نے مگر رات رلا رلا دیا

یہ مانوس لہجہ، یہ درد میں ڈوبی ہوئی آواز، یہ دل کی تباہی اور کسی کے خیال کے بارے میں کچھ نہ کہنے کے باوجود سب کچھ کہہ جانا یہی تو اہل غزل کی وہ میراث ہے جس کے ہوتے اس بے یقینی کے دور میں بھی غزل پر سے یقین نہیں اُٹھتا۔ میں نے شہر غزل کا مطالعہ اسی اعتماد کے ساتھ شروع کیا تھا تاہم یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ رفعت سروش ۹۸ء میں بھی غزل کی آبرو کو باقی رکھنے کے حق میں ہیں یا ان کا رویہ بدل گیا۔ یاد آیا کہ اُنھوں نے اپنے مجموعہ کلام میری صدا کا غبار، میں حرف آغاز کے طور پر اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے۔

"میری تمام تر شاعری کے اساس میرے ذاتی تجربات اور مشاہدات ہیں، میں اپنے تجربات کو سماجی زندگی کا آئینہ سمجھتا ہوں اور سماج کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھتا ہوں۔"

بات انوکھی نہیں ہے لیکن سچی ہے اور اس سچ کا اظہار ان کے ہر دور کی نظم و غزل میں پایا جاتا ہے۔ سماجی سچائی یا ذاتی تجربہ کو شعر کا پیرہن عطا کر دینا بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ سماجی مسئلہ ہو یا ذاتی، اسے شعر کی کسوٹی پر کھرا اترنا چاہیے۔

اس اعتراف میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ رفعت سروش کا شعر نصف صدی سے ذاتی اور سماجی مسائل کو اپنے دائرہ کار میں لیے ہوئے ہے اور کسوٹی پر بھی پورا اترا ہے۔

سروش نے جب شعر کو اختیار کیا تو وہ غزل کا نیم کلاسیکی عہد تھا۔ محنت اور سرمایہ کی جنگ، طبقاتی کشمکش، سماجی اور معاشرتی ارتقاء کے مسائل پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے اور ہر وہ ادیب و شاعر جوان مسائل کا شعور رکھتا تھا وہ اپنی قوت تخلیق سے شعر و ادب کے ذریعہ جس حد تک اس سے ممکن تھا ایک نئے نظام کی تشکیل میں مدد دے سکتا تھا، وہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ تھا۔ رفعت سروش کے شعر نے پوری دیانت کے ساتھ اس تحریک کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھا اور جہاں تک ہوسکا اس معیار کو بھی قائم رکھا جسے اصطلاحاً شعریت کہا جاتا ہے۔

۶۵ء کے بعد ان کا شعری سفر جدیدیت سے بھی آنکھیں چار کرتا ہوا گزرا ہے، جدیدیت جو ترقی پسندی کے علی الرغم شعر و ادب میں کسی نظریے اور مقصدیت کی قائل تھی نہ غزل کے حسن بیان اور تاثیر کی۔

مابعد جدیدیت کے نسبتاً کم آزار شیوۂ گفتار کو رفعت سروش، نے مشفقانہ انداز سے دیکھا اور آج بھی ہمدردانہ نظر سے دیکھ لیتے ہیں۔ انھیں پچھلے پچاس ساٹھ سالوں میں غزل کے بدلتے ہوئے آہنگ اور موضوعات سے کم کم ہی سہی نسبت ضرور رہی ہے لیکن چند ایک مثالوں کو چھوڑ کر شہر غزل کی شاعری میں ان کی ذہنی آسودگی کی فضا کلاسیکی انداز بیان ہی میں نظر آتی ہے، انھوں نے جدت طرازی کی نئی نئی عمارتوں میں سیر ضرور کی ہے لیکن غزل کی موروثی حویلی یعنی کلاسیکی روایت سے دست بردار کبھی نہیں ہوئے۔ شاید اس لیے کہ جدید طرز اظہار اور اس کے موضوعات ذہن کے تاروں میں جھنکار تو پیدا کر سکتے ہیں لیکن زندگی کے سب سے بڑے ساز یعنی دل کے تاروں کو مرتعش کر سکتے ہیں نہ جذبات و احساسات کی دنیا کو جگا سکتے ہیں۔

غزل ہر دور میں اپنے کلاسیکی مزاج، اسلوب اور صنفی ہیئت کی وجہ سے سب سے زیادہ مقبول صنف سخن رہی ہے۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ اردو زبان کی مقبولیت میں کلاسیکل غزل کا سب سے بڑا ہاتھ تھا اور آج بھی ہے۔ غزل کی ہیئت ترکیبی میں تبدیلی کی خواہش نہ ماضی میں کامیاب ہوسکی نہ حال میں۔ تاج محل سے زیادہ خوبصورت عمارت اگر بنائی جاسکتی ہے تو ضرور بنائی جائے لیکن تاج محل کی موجودہ تعمیر میں کسی قسم کی ترمیم گوارا کی جاسکتی ہے نہ اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

رفعت سروش ایک ہمہ جہت خود آگاہ شاعر ہیں اس لیے غزل یا شاعری کے ہر

موڑ پر انھوں نے اپنی ژرف نگاہی سے کلاسیکی خصوصیت کے ساتھ کلاسیکی غزل کے مزاج سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے اور شہرِ غزل کے اشعار اس کے شاہد ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے یہ چند اشعار دیکھتے چلیں جو غزل کی جمالیات کا آئینہ ہیں۔

یادوں کے پھول درد کے نغمات لے چلیں شاید یقیں نہ آئے اُنھیں دل کی بات کا
چاند ویران ہے صدیوں سے مرے دل کی طرح زندگی گم ہے خلا میں مری منزل کی طرح
شعور درد، شعور فنا، شعور وفا شعور حسن نے کیا کیا مجھے سکھایا ہے
تمام عمر جو پلکوں پہ بوجھ بن کے رہا اس ایک اشک ندامت سے تھک گیا ہوں میں
بہت قریب ہو تم پھر بھی فاصلہ سا ہے ہمارے بیچ یہ کیسا عجیب رشتہ ہے
اس آئینہ خانے میں اب کون کسے دیکھے یہ عالم حیرت ہے خود اپنا تماشائی

رفعت سروش صاحب کی غزل کا اگلا پڑاؤ ترقی پسند رجحان ہے جہاں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے تھے یہاں تک کہ شعر کو جمالیات کے دائرے میں مقید رکھنا ترقی پسند غزل کے نزدیک ضروری نہ تھا۔ کم ہی ایسے تھے جنھوں نے غزل کی آبرو کو بچائے رکھا۔ ان میں ایک نام رفعت سروش کا بھی ہے۔ خود ان کا قول ہے ع
غزل خیال کے پردے میں مسکراتی ہے۔ اور اپنے اس قول پر وہ ہر دور میں قائم رہے۔ شاذ و نادر ہی ان کے ہاتھوں غزل کی پردہ دری ہوئی ہے۔ شہرِ غزل تک پہنچتے پہنچتے ان کے ترقی پسندانہ روّیہ کا طرزِ اظہار کچھ اور دلکش ہو گیا ہے ۔

جنونِ آگہی کی یادگار چھوڑ جاؤں گا صبا کے لب پہ نغمۂ بہار چھوڑ جاؤں گا
کہاں کہاں بجھاؤ گے مری صدا کی مشعلیں تمام زندگی کو شعلہ بار چھوڑ جاؤں گا
بدلتے رہتے ہیں ہر موڑ پر رفیق سفر غمِ حیات مگر ساتھ ساتھ چلتا ہے
بنائے گا یہ نیا آسمان فکر و نظر غبارِ راہ جو پامال ہو کے اٹھا ہے
چاند اک نقشِ پا کہکشاں رہ گزر ہے ادھورا مگر آگہی کا سفر

ان اشعار کی رجائیت، ایک بہتر نظام حیات کی آرزومندی اور انسانی سربلندی کے لطیف اشارے اُسی زبان، اسی اسلوب انہی علامتوں انہی استعاروں میں ہیں جنھیں ہم کلاسیکیت کہتے آئے ہیں اور جنھیں رفعت سروش نے بڑے سلیقہ سے سنوارا ہے۔
۱۹۷۰ سے کچھ پہلے جدیدیت کے نام سے جو شاعری آندھی کی طرح اردو شاعری کی اعلا اقدار اور قابل قدر ورثہ کو تہس نہس کرنے پر تلی ہوئی تھی رفعت سروش نے پیشانی پر شکن ڈالے بغیر اس انداز گفتگو کو بھی برت کر دیکھا مگر نہ ان کا لہجہ بدلا نہ شعر کی معنویت

پر حرف آیا۔

روشنی میں مجھے نہ لے جاؤ اپنے سایے سے بھی گریزاں ہوں
سر رکھ دے میرے کاندھے پر تنہائی مجھ سے باتیں کر
اس بھرے شہر میں اکیلا ہوں اپنے دل کا اداس نغمہ ہوں
وہ تیز دھوپ ہے کہ پگھلنے لگے ہیں خواب زلفوں کے سائے دیں گے فریب بہار کیا
پوچھتے ہیں وہ مجھ سے میرا نام جیسے میں صرف ایک انساں ہوں

جدیدیت کا یہ ایسا سنبھلا ہوا انداز ہے جسے 'جدیدیت محض' نہیں کہا جا سکتا۔ اس نوع کے اشعار نہ معنی سے بے نیاز ہیں نہ آڑی ترچھی لکیروں کی صورت گری ہیں۔ رفعت سروش کو جس بات نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا وہ ایک پُر اسرار فضا تھی جس میں بے معنی شعر بھی حسین معلوم ہو رہے تھے۔

لفظوں نے پلکیں جھپکائیں تھی معنی بھی معدوم ہوئے لیکن پُر اسرار فضا میں شعر حسیں معلوم ہوئے

لیکن یہ فضا دیر تک قائم نہ رہ سکی اور مابعد جدیدیت کی لہر نے بے معنی پُر اسرار فضا کو مسترد کر دیا۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بحث میں الجھنے کا یہ موقع ہے نہ محل مجھے تو رفعت سروش کے شعری رجحانات اور اسلوب بیان کی جستجو تھی جس کے لیے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اشعار جو رجحانات کے اعتبار سے جدید ہیں وہ بھی ایک ایسے مانوس اور کلاسیکی اسلوب کی خوشبو میں بسے ہوئے ہیں جو اسی موروثی چھت کے زیر سایہ مہک رہے ہیں جہاں کلاسیکل غزل آج بھی اپنے وزن و وقار کے ساتھ آسودہ ہے۔

رفعت سروش کے ادبی کارناموں پر ایک نظر ڈالیے تو کہیں وہ نظم، منظوم ڈرامے اور اوپیرا میں مصروف ہیں تو کہیں نثری ڈرامہ اور ناول میں کہیں بمبئی کی بزم آرائیوں کا ذکر ہے کہیں مضامین کے مجموعوں پر مجموعے ہیں مزید برآں آپ بیتی، ہر جگہ ان کا قلم گل کار ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ مگر کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ ہمہ جہت شخصیت کا شاعر اگر صرف غزل کی طرف متوجہ رہتا تو کیا اسے یہ کہنا پڑتا۔

ناقدوں سے یہ پوچھنا ہے سروش
میں بھی کیا آپ کی نظر میں ہوں

ڈاکٹر حمیرا جلیلی
جلیل منزل۔ نور خاں بازار
حیدر آباد ۲۴

المحبوب مؤلفہ نصیر الدین ہاشمی

ارض دکن کے ان مشاہیر کے درمیان جنھوں نے دکن اور دکنیات پر خصوصاً اور دیگر علمی ادبی موضوعات پر عموماً گرانقدر کام کیا ہے نصیر الدین ہاشمی کا نام خاص توجہ اور نمایاں مقام کا مستحق سمجھا جانا چاہیے۔

نصیر الدین ہاشمی نہ تو کسی جامعہ کی اعلا ڈگری کے حامل تھے اور نہ ہی شعبہ درس و تدریس سے وابستہ۔ اس کے باوجود انھوں نے کام کیا اور بہت کام کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اہل دور میں ارباب علم و ہنر نے ان کی کاوشوں کی پوری طرح پذیرائی نہیں کی۔ ویسے بھی ہاشمی صاحب فطرتاً نہایت درجہ غیور ہونے کے باوجود بہت ہی منکسر المزاج بھی تھے، پر خلوص، نیک نیت۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شبانہ روز محنت اور برسوں کی عرق ریزی سے فائدہ تو بہت سوں نے اٹھایا لیکن اعتراف کسی نے نہ کیا۔ جس ستائش، جس صلہ اور جس مقام کے وہ مستحق تھے وہ انھیں اپنے زمانے میں نہ مل سکا۔ اس بات کا انھیں شدید احساس تو تھا' لیکن اس احساس کو انھوں نے کبھی اپنے پیروں کی بیڑیاں بننے نہیں دیا۔ وہ آگے بڑھتے ہی رہے، بغیر تھکے بغیر رکے۔

نصیر الدین ہاشمی کی علمی و ادبی شخصیت ہفت پہلو رہی ہے۔ انھوں نے تاریخ ادب اور تاریخ دکن پر بھی لکھا اور دکنیات پر بھی۔ سوانحی کتابیں لکھیں تو حیدر آباد کے گلی کوچوں پر قلم اٹھایا۔ اردو مخطوطات کی فہرست ترتیب دینی شروع کی تو یورپ میں دکنی مخطوطات کی اشاعت کے بعد کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سالار جنگ، سنٹرل ریکارڈ آفس اور کتب خانہ جامعہ نظامیہ کے مخطوطات کی فہرست اس قدر دیدہ ریزی کے ساتھ ترتیب دی کہ آج بھی کوئی ریسرچ اسکالر ان سے استفادے کے بغیر تحقیق کی پُر پیچ راہوں پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

خواتین اور خصوصاً خواتین دکن کی علمی و سماجی ترقی سے ہاشمی صاحب کو ہمیشہ ہی خاصی دلچسپی رہی۔ چنانچہ انھوں نے صنف نازک کی ہمت افزائی کے لیے کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ حیدر آباد کی باصلاحیت خواتین پر تعارفی مضامین لکھے۔ ان کی علمی و سماجی خدمات کے سلسلہ

میں چھوٹی سی چھوٹی کاوش کی بھی پُر جوش ستایش کرتے ہوئے ان میں عمل جوش اور لگن پیدا کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ جب ۱۹۴۳ء میں ادارہ تحقیقات قائم کیا تو اسے بھی خواتین دکن سے منسوب کردیا۔

مختلف موضوعات پر ہاشمی صاحب کی کتابیں منظر عام پر آئیں دکنی کلچر نصیر الدین ہاشمی کی آخری کتاب تھی جو ان کے انتقال سے کچھ ہی ماہ قبل شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دور آخر تک روز اول کا سا جوش وولولہ ان میں موجود تھا۔ ان کے کام کرنے کی صلاحیتوں دھن اور لگن میں کسی قسم کا انحطاط واقع نہیں ہوا تھا۔

زیر نظر کتاب المحبوب ہاشمی صاحب کے انتقال کے (۳۲) سال بعد شائع کی گئی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ہاشمی صاحب کے فرزند ڈاکٹر ظہیر الدین ہاشمی کا تحریر کردہ پیش لفظ شامل ہے جس میں انھوں نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ المحبوب ہاشمی صاحب کی پہلی کتاب ہے، دکن میں اردو نہیں جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا رہا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اپنی اس کتاب کو میر عثمان علی خاں کی تیسویں سالگرہ کے موقع پر نظام ہفتم کے نام معنون کرنا چاہتے تھے لیکن سلطان وقت نے نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر المحبوب کی اشاعت کو ممنوع قرار دے دیا لیکن چھ سال بعد اس کے ساتھ اس زیادتی کی تلافی اس طرح کردی کہ سفر یورپ کے لیے ہاشمی صاحب کی درخواست کو منظوری دے دی گئی۔

پیش لفظ کے بعد ڈاکٹر افضل اقبال ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی کا لکھا تعارف ہے، جس میں نصیر الدین ہاشمی کی شخصیت اور ان کے علمی وادبی کارناموں کا بڑی ہی جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ مولف کی لکھی تمہید کو حصہ اول باب اول میں رکھا گیا ہے۔ فصل اول میں مختصر جغرافیہ دکن کے زیر عنوان مملکت آصفیہ کے حدود اربع' یہاں کے مشہور پہاڑوں، دریاؤں کی اہمیت، آب وہوا کی کیفیت کے علاوہ، مشہور تاریخی عمارات، اہم درآمد برآمد نیز ذریعہ آمدورفت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فصل دوم میں خاندانِ آصفیہ کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ چنانچہ میر محبوب علی خاں کے جد امجد میر قمر الدین سے لے کر آصف جاہ خامس نواب میر تہنیت علی خاں بہادر افضل الدولہ آصف جاہ پنجم کے حالاتِ زندگی، ان کے عہد کے اہم واقعات اور ساتھ ہی اہم شخصیتوں سے بھی واقف کروایا گیا ہے۔

فصل سوم میں نواب میر محبوب علی خاں کی تعلیم وتربیت خصوصاً نشانہ بازی، تیر اندازی میں مہارت آصف جاہ ششم کے اتالیق، ہم مکتب اور معالجین کے متعلق بھی دلچسپ معلومات بہم کی گئی ہیں جبکہ فصل چہارم میں اعلاحضرت غفران مکاں کی تخت نشینی کی

روداد نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ اس فصل میں سب سے زیادہ قابل ذکر چیز اس تقریر کی شمولیت ہے جو وائسرائے برٹش گورنمنٹ نے تخت نشینی سے قبل حضور نظام کو مخاطب کرتے ہوئے کی تھی۔

فصل پنجم میں سنین وار ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۲۹ھ تک کے اہم واقعات قلم بند کردیے گئے ہیں۔ اسی فصل میں مقدمہ جیکب کی وضاحت کے علاوہ نظام ہشتم کی ۳۳ ویں سالگرہ کے موقع پر عوام کی جانب سے منعقدہ جشن کا حال بھی مولف نے نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یقیناً قارئین اس حصہ کو نہایت ہی دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ۱۳۱۸ھ کے اہم واقعات کے سلسلہ میں نصیر الدین ہاشمی نے اس فرمان کو بھی شامل کردیا ہے جو حضور نظام نے اپنی سالگرہ کے موقع پر جشن عام کو مخاطب کرتے ہوئے صادر فرمایا تھا۔ یہاں میں اس فرمان کا اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔

"... چونکہ یہ سال قحط کا ہے اور میری غریب رعایا بہت ہی افسوس ناک اثر میں مبتلا ہے۔ میرا دل بحالت موجودہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ وہاں وہ رنج، تعب میں رہیں اور یہاں جلسے ہوتے رہیں۔ لہذا میں اپنے تمام خیر خواہوں سے اس سال یہ اُمید کرتا ہوں کہ وہ جس قدر رقم جلسوں اور روشنی وغیرہ میں خرچ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اس کو سب محتاج خانوں میں دیں گے یا اور کسی طور سے خیرات میں صرف کریں گے پس جس قدر رقم محتاجوں کی امداد میں میری سالگرہ کے نام سے دی جاسکے اس کی اطلاع کو میں اس سال میں اپنی عزیز رعایا و عہدے داروں کا بہترین اڈریس سمجھوں گا۔"

اس فرمان کے ایک ایک لفظ سے ایک ایسے مثالی حکمراں کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جو اپنی رعایا کے لیے ایک دردمند باپ کا دل، ایک شفیق بھائی کا خلوص اور ایک سچے دوست کا جذبہ صادق رکھتا ہے۔ اس زمانے کی یہ حقیقت اس دور میں تو بس ایک خواب وخیال ہی بن کر رہ گئی ہے۔

اسی فصل میں نصیر الدین ہاشمی نے بجواڑہ ریل کا افتتاح معتمد فنانس اور مجلس وزرا کی تشکیل۔ حالی، جرخی اور محبوبیہ سکوں کا رواج دربار کے اہم عہدوں میں مترجم کے علاوہ منتخبہ اصحاب کو عطا کردہ خطابات کی فہرست بھی شامل کردی ہے جس سے اس فصل کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہوگیا ہے۔

فصل ہفتم میں محبوب دکن نظام ششم نواب میر محبوب علی کے انتقال، ان کی تدفین

اپنے محبوب بادشاہ کے سانحہ ارتحال پر عوام کے سوگ وغم کی کیفیت قلم بند کی گئی ہے۔ فصل ہفتم کے اختتام پر ہی میر محبوب علی خاں کی اولاد ان کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کی فہرست بھی شامل کردی گئی ہے۔

کتاب المحبوب کا باب دوم فصل اول اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ نصیرالدین ہاشمی نے عادات واخلاق، دانائی وفراست، سخاوت وفیاضی، رحم دلی، عدل وانصاف، رعایا پروری، تواضع وسادگی جیسے ذیلی عنوانات کے ذریعہ میر محبوب علی خاں کی شخصیت کے قابل قدر پہلوؤں پر بڑی کامیابی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اسی سلسلہ میں جہاں کہیں مولف نے اپنی بات میں وزن اور بیان میں زور پیدا کرنا چاہا ہے وہیں انھوں نے ان تقاریر کے اقتباسات بھی پیش کردیے ہیں جو لارڈ منٹو اور ان کے پیشرو وائسرایان ہند، امرائے ملک، ارکان فوج باقاعدہ اور خود عوام نے موقع موقع سے اپنے دور کے اس بے مثال بادشاہ کی خدمت میں خراج تحسین کے طور پر پیش کرتے ہوئے کی تھیں۔ اسی سلسلہ میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولف نے قارئین کی توجہ اس جانب بھی بار بار مبذول کروائی ہے کہ بادشاہ وقت کو اس بات کا خاص خیال رہا کرتا تھا کہ عوام کی نظروں میں ان کی شخصیت کا جو تاثر، جو امیج بنا ہوا ہے اسے ٹھیس نہ پہنچے چنانچہ جب کبھی حضور نظام کو یہ محسوس ہوتا کہ ان کے کسی خاص فعل وعمل سے ان کی رعایا کے والہانہ جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے تو فوراً ہی فرمان خاص کے ذریعہ ان مصلحتوں کی وضاحت کردیا کرتے جو ان کے کسی خاص اقدامات کے پس منظر میں کارفرما رہا کرتیں۔

کتاب المحبوب کی فصل دوم اس لحاظ سے بڑی اہمیت اختیار کرجاتی ہے۔ مولف نے مذہبی عقائد عنوان کے ذریعہ نظام ششم کی مذہبی وسیع النظری، رواداری، بلند خیالی اور فراخ دلی کے تعلق سے کئی اہم واقعات درج کردیے ہیں۔ اسی سلسلہ میں نصیرالدین ہاشمی نے ان ساری عبادت گاہوں کے اعداد وشمار بھی پیش کردیے ہیں جنھیں معاش مقرر کرتے ہوئے حضور نظام نے نہایت ہی فراخ دلی سے جاگیریں بھی عطا کردی تھیں جن کی تفصیل یوں ہے۔

مسجدیں ۵۸۲
دیول ۳۵۳
درگاہ عاشورہ خانے ۵۳۱۷
دھرم شالے ۱۰۴
گرجے ۲

یہاں پھر ہاشمی صاحب نے عہد محبوبیہ کے برہمنان دکن اور برہمہ کھتریوں کے ان بیانات کے اقتباسات شامل کردیے ہیں جو برہمنوں اور کھتریوں نے اپنے دور کے اس وسیع القلب، بلند نظر اور باظرف بادشاہ کی خدمت میں ہدیہ تشکر کے طور پر پیش کیے تھے۔ میں بھی ان ہی میں سے کچھ حصے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گی۔

برہمنوں کا خراج تحسین

"ہماری قوم کے اشخاص حضرت کے سایہ عدل وانصاف میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں بلا مزاحمت غیرے وبلا مداخلت اورے نہایت امن وآسایش کے ساتھ سرگرم مصروف رہتے ہیں۔" (ص۔۹۷)

برہمہ کھتریوں کا خراج

ہمارے حضور کے زمانے میں قومیت اور مذہب کے تفرقے جو تمدن میں خلل انداز ہوا کرتے تھے اٹھ گئے ہیں۔ اور بہ حسن نیت وتوجہ خداوند عام رعایا کے تمام فرقے آپس میں شیر وشکر کے ساتھ مل گئے۔ ہم نہایت فخر ومباہات کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ اب تک حیدرآباد دکن میں کسی قومی ومذہبی ناگوار تنازعہ کا ایک معاملہ بھی پیش نہیں آیا۔"

(صفحہ۔۹۸)

اپنی رعایا کی فلاح وبہبود اور ان کے آرام وآسایش کے لیے میر محبوب علی خان جن چیزوں کا قیام عمل میں لائے تھے اس کی ایک مختصر فہرست فصل سوم میں شامل کردی گئی ہے جن میں سے چند اہم چیزیں ہیں۔ ٹیلی فون، ریلوے لائن، اخبارات، کلب، انجمنیں، کلوروفام کا استعمال، بیرون ملک طلبہ کو وظائف پر روانہ کرنا، مال گزاری کا جدید نظام، نہروں اور مشینی کارخانوں کا قیام اور مردم شماری وغیرہ۔

فصل چہارم میں مہمان نوازی فصل پنجم میں سیاحت ششم فصل میں صید افگنی ہفتم میں تقریریں، اور فصل ہشتم میں شاعری جیسے عنوانات قائم کرتے ہوئے ہاشمی صاحب نے میر محبوب علی خاں کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

مولف نے فصل ہشتم میں اعلا حضرت غفران مکاں کے کلام کے نمونے پیش کرنے سے قبل لکھا ہے کہ" آپ ہندستان کے مسلم الثبوت شاعر فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد تھے لیکن حیرت ہے کہ ہاشمی صاحب نے اس بات کی کہیں وضاحت نہیں کی کہ داغ

کے انتقال کے بعد میر محبوب علی خاں نے حضرت جلیل مانکپوری کو اپنا استاد مقرر کیا تھا جبکہ حضرت جلیل کی قدر، منزلت دربار محبوبی میں کسی بھی طرح پیش رو استاد حضرت داغ سے کم نہیں تھی۔ حضور نظام نے دیگر مراحمتِ خسروانہ کے علاوہ انھیں جلیل القدر کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ جلیل کا تقرر حسب ذیل مراسلہ کے ذریعہ کیا گیا تھا۔

"مراسلہ محکمہ معتمدی حرفخاصی پیشی خداوندی

واقع ۱۶ رشوال ۱۳۲۷ھ ۲۱ آذر ۱۳۱۹ف نشان ۳۶

منجانب نواب تہورالملک"

المحبوب نصیر الدین ہاشمی کی پہلی ادبی وعلمی کوشش ہے لیکن کئی اعتبار سے قابل قدر ہے۔ ہاشمی صاحب نے نظام ششم کی شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں کو نہایت صدق و خلوص کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلہ میں انھیں جتنا بھی مواد مل سکا ہے اسے نہایت سلیقہ کے ساتھ ترتیب دے دیا ہے۔ انداز بیان بھی ایک نومشق کا سانہیں۔ ہاں دو باتیں ضرور کھٹکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہاشمی صاحب نے سنین تقریباً تمام ہجری کے ایسے دیئے۔ جس سے آج کے قاری کو یقیناً الجھن کا سامنا کرنا پڑے گا اور دوسری بات یہ کہ جہاں جہاں انھوں نے فرمایش اور تقریریں شامل کی ہیں ساتھ ہی ساتھ اگران کے حوالے بھی دے جاتے تو المحبوب کی دستاویزی اہمیت میں بہت اضافہ ہو جاتا۔

بہترین گٹ اپ کی اس کتاب کی قیمت ۹۵ روپے رکھی گئی ہے۔ اس کتاب کو ہر گھر اور خصوصاً ہر لائبریری کی زینت بننا چاہیے۔ میر محبوب علی خاں کی مذہبی رواداری کے تعلق سے جو امیج نصیر الدین ہاشمی نے مستند مواد کے ساتھ پیش کیا ہے وہ آج کے دور میں بڑی ہی اہمیت کا حامل ہے اور اس لائق ہے کہ اس حصہ کو کسی بھی نصابی کتاب میں شامل کیا جائے تا کہ آنے والی نسلوں کو معلوم ہو سکے کہ مذہبی وسیع النظری، فراخ دلی اور اعلاظرفی کی حامل کیسی کیسی شخصیتیں آج وقت کی گرد میں معدوم ہوتی جارہی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک ضروری بات یہ کہ ڈاکٹر ظہیر الدین ہاشمی ہم سب ہی کے شکریہ کے بھی مستحق ہیں اور مبارک باد کے بھی مستحق اس لیے کہ انھیں آداب فرزندی کا لحاظ رہا اور اپنے والد کی کتاب اس قدر اہتمام سے انھوں نے شائع کردی، شکریہ کے مستحق اس لیے کہ اس کتاب کی اشاعت سے اس عہد زریں کی یادیں پھر سے تازہ ہوگئیں جو ہم سب کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

ڈاکٹر صادقہ ذکی
شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۔۲۵

عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
غالب کی تمنا

غالب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس پر جاگیردارانہ نظام کی گہری گرفت تھی۔ ان کے عزیز واقارب کا شمار میرزاؤں اور اکثر نوابوں میں ہوتا تھا۔ غالب کے سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق ان کا نسبی سلسلہ تورابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ یہ سلسلہ بتاتا ہے کہ غالب کے اجداد عروج وزوال کی منطق سے اسی طرح گزرے جیسے کہ تاریخ ساز شخصیتیں انقلابات زمانہ سے دوچار رہتی ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے شاہانہ اور سپاہیانہ زندگی بسر کی۔ لیکن غالب نے قوت بازو کے مقابلہ پر تدبیر اور تخلیق سے کام لیا۔ اس طرح قلم کے بل پر سپاہیانہ [1] زندگی گزاری۔ انھوں نے اپنی پشت سے سلجوقی خاندان کی جو خصوصیات پائی تھیں وہ بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کے فکر وعمل سے ظاہر ہوتی رہیں۔ مرزا غالب کے ایک جدی بزرگ ترسم خاں نے سمرقند میں بودوباش اختیار کر لی تھی۔ ڈیل ڈول اور فکر کے اعتبار سے اس علاقے کے لوگوں کی اپنی ایک شناخت ہے۔ یہ علاقے قدیم دور میں آریاؤں کی گزرگاہ بھی رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے (لیکن حالی کے اس خیال سے غلام رسول مہر نے کچھ اختلاف کیا ہے) وہ پہلے لاہور میں نواب معین الدین اور پھر دہلی میں شاہی دربار سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں انھیں جاگیر کے ساتھ منصب بھی عطا ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے عبداللہ بیگ خاں کی شادی اکبرآباد (آگرہ) کے خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی عزت النساء سے ہوئی۔ جو غالب کی والدہ تھیں۔ غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں فوج کے افسر تھے اور صاحب املاک بھی تھے۔ شہر کے مشہور اشخاص میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ غالب کے والد بطور خانہ داماد سسرال سے وابستہ رہے۔ بچوں کی پرورش بھی یہیں ہوئی۔ غالب

(1) The Indian Muslims,M Mujeeis P486 (London- Gearge Alleun and Undwon Ltd

نے منشی شیونرائن کے نام ایک خط میں اپنی ننھیالی املاک کے متعلق قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس خط میں انھوں نے منشی شیونرائن کے والد سے اپنے بزرگوں کے گہرے مراسم کا اظہار کیا ہے۔ بر سبیلِ تذکرہ ننھیالی مکانات وغیرہ کا ذکر بھی آ گیا۔ غالب کی ننھیال میں آسائشوں کی کوئی کمی نہ تھی یہ امیرانہ اثرات کئی لحاظ سے ان کی شخصیت پر بھی اثر انداز ہوئے۔ بہر حال قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس خوشحالی کے ساتھ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ نے اپنی سپاہیانہ جدوجہد ترک نہیں کی۔ وہ پہلے بحیثیت مہم جو اودھ اور حیدرآباد کی ریاستوں سے وابستہ رہے اور پھر مہاراجا بختاور سنگھ (والئی الور) کی فوج میں رسالدار ہونے کی حیثیت سے راج گڑھ کے مقام پر ایک لڑائی میں مارے گئے۔[1] اسی طرح غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے سسرالی ریاست اور مدد کے باوجود اپنی عملی زندگی کو خیر باد نہیں کہا۔ انھیں نواب احمد بخش خاں (نواب لوہارو) سے دو پرگنے [2] بھی ملے بعد میں یہ جاگیر غالب کی پنشن کا وسیلہ بنی۔ کسی وجہ سے جب اس میں تخفیف ہوئی تو غالب نے اختلاف بھی کیا اور قانون کا سہارا بھی لیا۔ انھیں کلکتہ کا دور دراز سفر بھی کرنا پڑا۔ لیکن اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ملی۔ بطور پنشن ساڑھے سات سو روپے کی سالانہ رقم ان کی طبعی خودداری اور رئیسانہ بانکپن کو قائم رکھنے کے لیے کافی نہ تھی۔ ان کے اخراجات کی کفالت اس سے ممکن نہ تھی۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ غالب کے لیے بے حد تکلیف دہ اور پریشان کن رہا۔ جب دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہوا تو بہت سے لوگ قتل کر دیے گئے۔ جائدادیں ضبط ہو گئیں۔ غالب کی پنشن بھی ضبط ہو گئی۔ دربار کے موقعوں پر جو اعزازات بحیثیت وظیفہ دار کمپنی کی طرف سے انھیں ملتے تھے وہ بھی بند ہو گئے۔ نامساعد حالات میں غالب نے کتابیں لکھیں۔ قصیدے کہے۔ حکام سے مراسلت کی لیکن کوششوں کے باوجود مالی حالات خستہ رہے۔ ریاستی سطح پر درباروں کے وظیفوں اور فتوح سے کسی قدر سہارا مل جاتا تھا۔ وثیقہ داری اس زمانے میں ایک اعزاز کی بات تھی خواہ وہ انگریز سرکار سے رہی ہو یا دوسرے درباروں سے۔ پنشن اور انگریزی دربار کے اعزازات بحال ہونے تک غالب کے ذمے قرض اتنا بڑھ گیا تھا کہ پنشن کی رقم سے اس کی ادائیگی شاید ممکن نہ تھی۔ غالب کے خطوط میں اکثر حالات کی تنگی اور مناصب کی بازیافت کا ذکر آیا ہے۔ ذیل کے ایک خط سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) یہ سانحہ ۱۸۰۱ء میں ہوا مطابق آثار الصنادید۔ سر سید احمد خاں ص ۵۸۹

(۲) مقدمہ اوراق معانی (غالب کے فارسی خطوط) مترجم ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ ص ۱۷، سونکھ۔ سونسا۔

"یوسف مرزا۔ میرا حال کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود ۔۔۔۔ وہ عرق کہ جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں ۔۔۔ دربار میں جاتا تھا۔ خلعت فاخرہ پاتا تھا۔ وہ صورت اب نظر نہیں آتی ۔ نہ مقبول ہوں نہ مردود۔ دو مہینے دن رات خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا ۔۔" (بنام یوسف مرزا۔ اردوئے معلا ص ۳۳۴)

حالات استوار کرنے میں غالب نے بڑے تحمل سے کام لیا۔ یہ بردباری اور عالی حوصلگی ان کی خاندانی اور تہذیبی یافت تھی۔ جو اکثر ان کی ظرافت آمیز گفتگو سے بھی عیاں ہوتی ہے۔ ننھیال کے امیرانہ اثرات ان کی شخصیت کی ساخت میں معاون ہوئے۔ مناصب کی خواہش جسے عام طور پر جاہ طلبی کہہ دیا جاتا ہے غالب کے لیے نئی چاہت نہیں تھی۔ اس کا رشتہ ان کے ماضی سے قائم نظر آتا ہے۔ اور جو تنگی حالات میں ان کی فیاضی، دریا دلی وسعت نظری اور طرز رہائش کی پیہم بچیوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

غالب کے ایک خط [۱] سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سات سال کی عمر سے دہلی آتے جاتے رہے۔ حالی کے خیال کے مطابق دہلی میں ان کے قیام کا زمانہ تقریباً پچاس برس رہا۔ [۲] ممکن ہے اس سے کچھ زیادہ رہا ہو جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ شادی کے بعد انھوں نے باقاعدہ رہائش دہلی میں اختیار کر لی تھی۔ ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی گلی قاسم جان میں بڑی حویلی تھی۔ لیکن وہاں انھوں نے کچھ ہی عرصہ قیام کیا ہے۔ غالب نسبتاً آزادی اور خود مختاری پسند کرتے تھے جو خانہ دامادی میں میسر نہ آتی۔ غالباً اسی لیے کرایہ کے مکانوں کو ترجیح دی۔ ان کی خودداری متواتر مکانات کی تبدیلی کے دشوار ترین مراحل سے دوچار رہی اس میں ان کے معیار رہائش اور سہولتوں کی تلاش کا دخل بھی ہوگا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے نتیجہ میں بعض مرتبہ مکانات کا کرایہ باقاعدگی سے ادا کرنا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔ ان کی سوانحی کتابوں میں کئی سال کی یک مشت ادائیگی کا ذکر بھی آیا ہے۔ غالب کو مکانات کے سلسلہ میں جن مالکان سے واسطہ رہا ان میں نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب شعبان خان، حکیم محمد حسن خاں اور حکیم محمود خاں [۳] کے

---

(۱) خط بنام خواجہ غلام غوث بے خبر۔ عود ہندی ص ۱۹۵

(۲) یادگار غالب۔ ص ۳

(۳) زمانہ غدر میں غالب حکیم محمود خاں کے مکانات میں سے کسی ایک میں تھے۔ حکیم محمود خاں مہاراجا پٹیالہ کے طبیب خاص تھے۔ مہاراجا نے انگریزوں سے یہ وعدہ لیا تھا کہ دہلی پر دوبارہ انگریزی قبضہ کے بعد حکیم محمود خاں سے وابستہ افراد کی رہائش گاہیں لوٹ مار سے محفوظ رہیں گی۔ اس لیے غالب ہنگامہ غدر میں بچ سکے۔

نام لیے جا سکتے ہیں۔ جامع مسجد کے عقب کی رہائش کے بعد غالب عموماً لال کنواں (گلی قاسم جان) اور بلیماران میں رہے۔ غالب کو یہ محلہ اور اس کے کوچے بہت عزیز تھے۔ چنانچہ حویلیوں کی آئے دن کی تبدیلیوں کا عمل انھیں کوچوں کے درمیان رہا۔ ان کا ذکر ان کی خطوط نویسی میں آیا ہے۔ ان سے متعلق تحقیقی کتابوں اور تحقیقی مضامین میں بھی یہ تفصیلات مل جاتی ہیں۔ ذیل میں خطوں سے عبارتیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ان میں غالب کی رہائش گاہوں کا عکس بھی ہے اور حالات بھی معلوم ہوتے ہیں جن سے غالب گزر رہے تھے۔

۱۔ فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر محلہ کا پتہ نہیں ہوتا اور انگریزی خط پر تو مطلق ہوتا ہی نہیں۔ شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھکو آئے' جانے ان کی بلا کہ بلی ماروں کا محلہ کیا چیز ہے ــــــــ! (بنام تفتہ۔ اردوئے معلا۔ ص ۸۰۔ ۸۱)

۲۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا؟ ــ (بنام میر مہدی مجروح، اردوئے معلا۔ ص ۱۸۷)

۳۔ اس محلہ کا نام بلی ماران کا محلہ ہے۔ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے پر رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا' دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے، اور وہ نوکر ہیں راجہ نریندر سنگھ بہادر پٹیالہ کے ــــ (بنام تفتہ۔ اردوئے معلا۔ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء ص ۷۲)

۴۔ کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے ــ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ــــ!" (بنام مرزا علاء الدین خاں۔ اردوئے معلا۔ ۴۱۴)

۵ ــ دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آ گیا۔ جان بچ گئی یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے بہشت ہے اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بلیماران کا (بنام تفتہ۔ اردوئے معلا۔ ص ۶۹)

۶۔ میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرایہ کی حویلی میں رہتا ہوں۔ بالا خانے کا دالان میرے بیٹھنے اٹھنے سونے جاگنے جینے۔ مرنے کا محل اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی ــ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ــ (بنام مرزا تفتہ اردوئے معلا۔ ص ۸۷)

''برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ مینھ گھڑی برسے تو چھت گھنٹا برسے۔ ''اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا یہ پن کال ہے۔''

''اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دیوان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ (بنام مرزا علاؤ الدین خاں۔ اردوئے معلا۔ ص ۴۲۷)

سردی گرمی برسات کوئی ایسی شدت نہیں ہے جو غالب کے مکان سے اس طرح خاموش گزر گئی ہو جس کا احساس غالب کو نہ ہوا ہو یا ان شدتوں کا ذکر ان کے خطوط میں نہ آیا ہو۔ غالب کے مکانات کی تبدیلی کے متعلق حالی لکھتے ہیں۔ ''جب ایک مکان سے جی اکتایا اسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا'' اس جی اکتانے کے کچھ داخلی اور کچھ خارجی اسباب تھے۔ موسم کی شدتوں سے بار بار ایسی تبدیلیاں واقع نہیں ہوتیں دوسرے ناگزیر اسباب بھی تھے۔ جو ان ہجرتوں کو متعین کر رہے تھے غالب نے اپنی نثر و نظم میں ان کی ترجمانی کی ہے۔ فرق اتنا ہو سکتا ہے کہ نثر اپنے قاری کو حقیقت تک براہ راست پہنچا دیتی ہے جب کہ شاعری میں 'واقعیت' قوس وقزح کے سے رنگوں میں متحرک ہو جاتی ہے۔ قاری کا ذہن تخلیقی لہروں کے ارتعاش میں کہیں نہ کہیں اکثر پس منظر کی مدد سے ایک ٹھہراؤ پیدا کر لیتا ہے۔

غالب جن دیوار و در کے درمیان زندگی بسر کر رہے تھے وہ ان کے گذشتہ اور نسبتاً بہت بہتر حالات کے مقابلہ پر ایک آزمائش سے کم نہیں تھے۔ ان کا تصور مکاں غیر معمولی وسعت اور کشادگی کا حامل ہے۔ ان کی تمنا آسمانوں کی بلندیوں پر ایسا مکاں چاہتی ہے جہاں انسانی نگاہ کا سفر لا مکاں کی جانب جاری رہ سکے۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ غالب کی شعریات بھی زندگی کی طرف ان کی منفرد رویہ کی آئینہ دار ہیں۔ کہتے ہیں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

خلا سے نیچے غالب کی بلند نگاہی اور دقتِ نظر کا حال تو یہ ہے کہ

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

جس شخص کے تیور یہ ہوں اس کی 'تمنا' عرش سے میرے بلندیوں پر ایک ایسا مکاں چاہتی ہے۔ جہاں سے لامکاں کی سیر ممکن ہو سکے۔ انسان نے جو مرتبہ پایا ہے اس کے مطابق بلندیوں پر رہنے کا حق بھی اسے ملنا چاہیے۔ غالب کی جولانگاہ زیر آسمان نہیں بالائے آسماں ہے۔ انسان کی بے کنار تمنا کو فنون لطیفہ نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ غالب اپنی بلندیوں کو حد معراج سے گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ گذشتہ فن تعمیر کی ایک فکری دین بھی ہو سکتی ہے۔ سلاطین اپنے قلعوں میں منظر حصار (بالا حصار) بناتے رہے ہیں۔ گولکنڈہ۔ تغلق آباد۔ پرانا قلعہ (شیر منڈل) قطب مینار۔ چاند مینار (دیوگری کے قریب) یہ سب آخر کس تمنا کا اظہار ہیں۔ ایک مرتبہ فرعون نے ہامان سے کہا تھا۔ اے ھامان ایک ایسا اونچا محل بناؤ جہاں سے میں آسمان کے اونچے رستوں میں جا پہنچوں۔ پھر جھانک کر دیکھوں موسیٰ کے معبود کو ۱ فرعون نے یہ بات حضرت موسیٰ کی تضحیک میں کہی تھی۔ اسے رب السماوات والارض پر یقین نہیں تھا۔ انسانی تخیل کس کس زاویہ سے بلندیوں پر پہنچتا ہے۔

غالب ہند ایرانی کلچر (ذہن) کے بڑے نمایندہ شاعر ہیں۔ اور اپنی فکری تعبیرات کے لحاظ سے غیر معمولی۔ غالب ایسے جینیس ہیں جن کی فکر میں ماضی حال مستقبل تینوں زمانوں کی سمائی ہے۔

سوال یہ ہے کہ غالب کو حسب تمنا اور حسب معیار مکان کہاں اور کیسے ملتا ہے۔؟ منشی شیونرائن کے نام ننھیال میں اپنے بچپن کا ذکر رہے ہیں۔

"ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھی چند سیٹھ نے لے لی ہے۔ اس کے دروازہ کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور اس کے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ دو گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔" ۲

غلام حسین خاں یعنی غالب کے نانا کا سکونتی مکان یہی تھا اور یہ محلہ گلاب خانہ کہلاتا تھا۔ بقول مالک رام یہ فارسی زبان کا مرکز تھا۔

غالب کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مرزا رئیس ابن رئیس تھے۔ رئیسوں سے عزیز داریاں تھیں۔ بادشاہوں اور نوابوں کے استاد تھے۔ ان حالات کے باوجود غالب نے ایک جگہ لکھا ہے لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑا کھا رہا ہوں ۳ بہر حال غالب کو جن

---

(۲) اردوئے معلا۔ ص ۲۶۲

(۱) پارہ ۲۴ قس اظلم المومن آیت ۳۶

(۳) غدر میں امراؤ بیگم کے زیورات اور قیمتی سامان جو کالے صاحب کے مکانات میں سے کسی تہہ خانے میں محفوظ کر دیے گئے تھے وہ لوٹ لیے گئے۔ باقی جو کپڑے اور لباس ان کے ساتھ تھے وہ بچے رہے اور حالات کی خرابی میں سہارا بنے۔

نامساعد حالات سے گزرنا پڑا ہے ان کے زیر اثر وہ کہہ سکتے ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالب کی پریشانیوں کا کوئی ایک سلسلہ نہیں تھا۔ دشت کی ویرانیوں کا بھی کوئی ایک طور نہیں ہوتا۔ وحشت خوف، بے ترتیبی۔ شکست وریخت جو طوفانی بارشوں اور آندھیوں میں ہوا کرتی ہے۔ اندھیرے۔ دلدل۔ چٹانیں۔ پتھر۔ چرند پرند خوفناک۔ کیڑے مکوڑے۔ یہاں دشت کے حسن کا نہیں صرف ویرانیوں کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ منظر فصیل شہر سے باہر نہیں۔ اگر اس دور کے سیاسی سماجی حالات اور غالب کے ذاتی مسائل پر نظر کریں تو یہ خود غالب کے دل کی ویرانی کا آئینہ بھی ہو سکتا ہے۔ عموماً دشت کے ساتھ وحشت کا پہلو اور گھر کے ساتھ سکون کا تصور وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن غالب کا گھر گھر نہ ہو کر ویرانیوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ شہرت کے ہاتھوں غالب کے اس زدہ شعر میں ان کے اپنے حالات کی کیسی مشابہت پیدا ہوئی ہے۔ غالب کے بہت سے اشعار ان کی ذاتی بے مقدوری اور حالات کے جبر سے سلیقہ مندانہ مفاہمت کے ترجمان ہیں۔

پرانی بوسیدہ دیواروں پر نمی سے گھاس پیدا ہو جاتی ہے جو در و دیوار کو اور کمزور کر دیتی ہے۔ اس ستم ظریفی حالات سے نباہ کی ایک نئی صورت سامنے آتی ہے۔ ان کا یہ شعر بھی عوام وخواص کی نذر ہو چکا ہے۔

اگ رہا ہے درو دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

بگاڑ سے تعمیر، برائی سے حسن، کمزوری سے توانائی، خزاں سے بہار تعبیر کر لینا غالب کی تخلیقی شخصیت کا اعجاز ہے۔ غالب کی طبیعت کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو کسی قسم کی کمزوری کے حوالے نہیں کر دیتے۔ ان کا تحمل اور تعقل ایک مفید اور پر لطف پہلو سے سہارا حاصل کر لیتا ہے۔ بعض مرتبہ ایک طرف محسوس ہونے والی کمی دوسری جانب کسی غیر معمولی اضافہ کا سبب ہو جاتی ہے۔ غالب کی ایک غزل جس کا مطلع ہے۔

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر درودیوار
نگاہ شوق کو ہیں بال و پر درودیوار

پوری غزل ہی غالب کی نفسیات سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ غالب نے اپنی رہائش یا ساز و سامان کی کمی کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ یہ تہی دستی بھی ان کے فن کی ایک خوش

لطفی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ غالب ایک بڑے فنکار ہیں۔ خود بھی زندگی کی بوالعجبیوں کے تماشائی ہیں اور اپنے قارئین کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں۔

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

انسان کی 'حسرت تعمیر' 'مایوسی' سے کم از کم بہتر ہوتی ہے۔ یہ دونوں تہی دستی اور تہی دامنی کا نتیجہ ہیں۔ اب غم عشق کی غارت گری یا کسی اور نقصان کا کوئی کھٹکا نہیں۔ بعض شخصیات کی آمد پر گھر میں خاک نہیں کا احساس شرمندگی کا موجب بھی ہو جاتا ہے۔ دوسرے شعر میں 'بوریا' محل غور ہے۔ اس لیے کہ بوریا خود ساز و سامان کے فقدان کی علامت ہے۔ آج ہی اس کے نہ ہونے کا احساس کس شدت سے ہوا ہے۔ شایان شان مہمان نوازی تو کجا گھر میں آج بوریا تک نہیں۔

مکان اپنے مکیں کے شوق و ذوق کا ترجمان ہوتا ہے جس پر ہمیشہ اپنے مقدور کی چادر خیمہ زن ہوتی ہے۔ غالب کی زندگی کا کاروبار قرض سے عبارت تھا۔ لیکن دوستداری اور فیاضی میں کوئی کمی نہ تھی۔ غالب بعض مرتبہ اپنی بے سروسامانی کا احساس کرتے ہیں لیکن وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں مہمانوں کی آمد اور روابط ان کے اپنے خلوص کا نتیجہ ہیں۔ ان کے یہاں آنے والوں میں اکثر ریاستوں سے تعلق رکھنے والے نواب' ان کے شاگرد اور عزیز شامل تھے۔ انگریزی حکام کی آمد کی توقع کا اظہار بھی انھوں نے اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ میر سرفراز حسین کے نام میں لکھتے ہیں۔

"وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر کہ وہ میر مہدی آئے۔ وہ یوسف مرزا آئے۔ وہ میدان آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں۔" (اردوئے معلا۔ ص ۱۵۹)

اپنے ماحول سے الگ ہونے کی آرزو شاید ہر فنکار اور دانشور کی ضرورت ہوتی

ہے۔حالات کی ستم ظریفوں ذمے داریوں اور فرائض کی یکسانیت کو اگر ہم ایک ماحول تصور کر لیں تو زندگی اپنی فطری آزادی کے برعکس ایک نظام جبر سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی۔غالب اس جبر کی گرفت سے نجات پانے کی معصوم تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔ جو بے در و دیوار سا اک گھر چاہتی ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کا کوئی نہ ہو

'ہم سخن' اور 'ہم زباں' سے غالب کی ہم عصر علمی و ادبی فضا کا اظہار ہوتا ہے۔جہاں مخالفتیں 'ریشہ دوانیاں' الزام تراشیاں اور سبقتیں یہ سب کچھ ممکن ہوا کرتا ہے۔یہ محض خانگی حالات یا امراؤ بیگم کی معیت سے دور ہونے کی آرزو نہیں ہے۔اس میں ماحول کے لگائے ہوئے بند غم کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

غالب پر ایسے حالات بھی گزرے ہیں جب سیاسی دارو گیر سے بچنے کے لیے وہ صبح سے شام تک اپنے مکان میں قید رہتے تھے۔

غالب کے اجداد کو شاہانہ اور سپاہیانہ زندگی سے واسطہ رہا۔غالب کو بھی زندگی کی کئی سطحوں پر صبر آزما حالات سے سپاہیانہ گزرنا پڑا۔زمانے کی ہر کاری ضرب کو اپنی تدبیر اور تخلیق کے بل پر جھیلا۔یہ تحمل اور بردباری ان کی اپنی خاندانی تہذیبی یافت تھی۔انھوں نے آداب زندگی کو بھی آزادانہ اور شاہانہ (خودمختارانہ) برتا۔اگرچہ کرایہ کے مکانوں اور متعلق مسائل سے دست و گریباں رہے۔لیکن ان کا تصور مکاں پچھلی روایت کا ایک حصہ نہیں بلکہ اسی سے بہت آگے کی چیز ہے۔کلکتہ کے قیام اور مخصوص قیامگاہ نے غالب کے ذہن کو متاثر کیا۔مکاں سے لامکاں کی جانب ان کا ذہنی تخلیقی سفر ان کی اپنی شخصیت کا اعجاز ہے۔

☆☆☆☆

پُراسرار مقدمہ مترجم: رحم علی الہاشمی

یہ فرانز کافکا کے مشہور انگریزی ناول The Trial کا اُردو ترجمہ۔ایک دلچسپ ناول جس میں رومان، تحیر، ایڈونچر اور انسانی نفسیات کی حسین عکاسی کی گئی ہے۔ 12/50 روپے

جستہ جستہ خورشید الاسلام

ڈاکٹر خورشید الاسلام کا شمار اُردو کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے "جستہ جستہ" آپ کی نثری نظموں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔

قیمت:-/18 روپے

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

شام کا پہلا تارا (شعری مجموعہ) زہرا نگاہ

زہرا نگاہ کی شاعری میں آج کی بے چین دنیا کی بے چین روح ہے۔ ان کی نظموں میں نشے سے زیادہ سرر ہے ان میں زندگی کا کرب ڈھلتا ہے لیکن نشاط زیست کے احساس کے ساتھ نغمگی ہے۔ اُس سنجیدگی کے ساتھ جو اچھی شاعری کی جان ہے۔　قیمت -/21 روپے

غلام ربانی تاباںؔ حیات اور شاعری
شفیق النساء قریشی

غلام ربانی تاباںؔ کا شمار اُردو کے ممتاز غزل گو شاعرں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی صدائے بازگشت ہے۔ انھوں نے ''غمِ ذات'' اور غم کائنات کو بڑی خوبی سے ہم آہنگ کیا ہے۔　قیمت -/10 روپے

ریت، سمندر اور جھاگ ہرچرن چاولہ

ہرچرن چاولہ کے ۱۷ دلکش افسانوں کا مجموعہ جن میں ماڈرن مشرقی تہذیب کی اچھائیوں اور بُرائیوں کو بڑے ہی دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسے افسانے جن میں اپنے معاشرے اور وطن کی مٹی کی خوشبو بھی ہر ہر قدم پر آپ کو مہکتی ہوئی محسوس ہوگی۔

قیمت.12/75 روپے

دھرتی سدا سہاگن (ناول) کشمیری لال ذاکر

انسانی رشتوں کی عظمت کی اس داستان میں ناول کے اہم کردار رسم و رواج کی بیڑیوں کو توڑ کر نہ صرف عمر بھر کے لیے ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت کر دیتے ہیں کہ کلچر صرف سائنس کے تجربات سے ہی نہیں، انسانی جذبات کی لطافت سے بھی نمو پاتا ہے۔　قیمت:7/50 روپے

تیوری (افسانے) امر سنگھ

ان افسانوں میں عصرِ حاضر کے انسان کی متعدد جہتی شخصیت، اس کی ذہنی اُفتاد، قلبی کیفیات اور کرب و نشاط کے علاوہ نا مساعد حالات کے خلاف اس کی کش مکش اور نبرد آزمائی کی عکاسی بھر پور جمالیاتی انداز میں کی گئی ہے۔

قیمت:14/75 روپے

قلی نمبر ۳۹۹ وجاہت علی سندیلوی

اردو کے نامور ادیب وجاہت علی سندیلوی کے پندرہ افسانوں کا حسین مجموعہ ایسے افسانے جو ہماری آپ کی جانی پہچانی دُنیا کے وہ مناظر پیش کرتے ہیں جن میں زندگی کی تڑپ بھی ہے اور دلوں کے تاروں کو چھو لینے والی کسک بھی۔

قیمت.14/75 روپے

احمد صغیر صدیقی
A-102 مرجینا کمپلکس
گلشن اقبال B-13۔ کراچی (پاکستان)

ماہیے

☆ پہروں جو ہنسائے گا
دستور پرانا ہے
بچھڑا تو رلائے گا

☆ یہ تن وہ حویلی ہے
جس میں ہیں جہاں تنہا
ہر شام اکیلی ہے

☆ ہیں زخم یہاں اپنے
بیٹھے ہیں سراسیمہ
سب چارہ گراں اپنے

☆ اٹھتا ہے دھواں دل سے
کیا روگ لگا لائے
ہم بھی تری محفل سے

☆ آنکھوں میں نمی رکھنا
سوکھے نہ شجر دل کا
کھیتی یہ ہری رکھنا

☆ اُڑتے ہوئے رنگوں کا
ہر خواب کنارے پر
اک شہر ہے آنکھوں کا

☆ ہے خوب سماں اپنا۔
ٹیڑھی ہے زمیں اپنی
ترچھا ہے مکاں اپنا

☆ اک منظر فردا ہیں
اُترے کوئی کو لبس
ہم اک نئی دنیا ہیں

فراغ روہوی
۶۷۔ مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳

ماہیے

آ بیٹھ ذرا سائیں
بیچ فقیروں کے
جب آ ہی گیا سائیں

دے دے یہ دعا سائیں
پیار ہے جس سے، وہ
ہو جائے بڑا سائیں

کیا بھول گیا سائیں
جنگ و محبت میں
سب کچھ ہے روا سائیں

کیا سوچا گیا سائیں
دکھ تو اِسی کا ہے
سب اُلٹا ہوا سائیں

وہ راہ دکھا سائیں
جس پہ ہمیں چل کر
مل جائے خدا سائیں

خوش ہوگا خدا سائیں
خلق خدا سے تو،
کچھ ربط بڑھا سائیں

کر اُس کی ثنا سائیں
جس نے عطا کی ہے
ہم سب کو انا سائیں

چوکس تو میں تھا سائیں
دل پہ مگر اپنا
کب زور چلا سائیں

مت خون جلا سائیں
عقل کے اندھوں سے
مت بات بڑھا سائیں

سن میرا کہا سائیں
سانپ کے بچوں کو
مت دودھ پلا سائیں

حیدر قریشی
جرمنی

غزل

دل کی حالت کچھ اضطراری ہے
بے قراری سی بے قراری ہے

کوئی تبدیلی چاہیے دل کو
کیسی یکسانیت سی طاری ہے

پہلے دیوی بنایا ہے تجھ کو
پھر تری آرتی اتاری ہے

ہم سزا وارِ وصل ٹھہرے ہیں
غلطی حالانکہ یہ تمھاری ہے

راس آتی نہیں خوشی کوئی
اپنی دکھ درد سے ہی یاری ہے

داؤ پر جو ہمیں لگا بیٹھا
وقت شاید کوئی جواری ہے

ہم نے بھوگا ہے صرف اسے حیدرؔ
ہم نے کب زندگی گزاری ہے

روشن لال روشنؔ
ڈی ۱/۵۶ ڈی ۳۔میر باغ
وارانسی۔یو۔پی

غزل

چراغِ جاں سے غداری نہ کرنا
ہواؤں سے کبھی یاری نہ کرنا

ندامت پھر تمھیں جینے نہ دے گی
کسی کی بھی طرف داری نہ کرنا

ترے اطراف اک آئینہ خانہ
کسی رخ سے بھی ہشیاری نہ کرنا

لہو دینا تو پھر قیمت بھی لینا
ہماری طرح بیگاری نہ کرنا!

فضا دل کی معطر پھر نہ ہوگی
گلابوں کی خریداری نہ کرنا

بُرا کوئی نہیں نادار رہنا
مگر اظہار ناداری نہ کرنا

وہ اگلا وقت وہ احباب داری
عدو کی بھی دل آزاری نہ کرنا

اردو ٹرسٹ

URDU TRUST

Registered Charity NO 1062720/0

Registered Office ,75 Margaret Street, London WIN 7HB

Tel: 0171 631 5263　Fax:0171 436 4754

ٹرسٹ ہذا نے ایک عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

☆ تاریخ　۲۷ فروری ۲۰۰۰ء بروز اتوار

☆ مقام یونیورسٹی آف لندن یونین بلڈنگ، میلٹ اسٹریٹ لندن ڈبلیو سی ا۔

University of London Union (Building) Malet Street. Lodon WC1

موضوع خاص۔ "اردو برصغیر سے باہر یا اردو اپنی نئی بستیوں میں

خصوصی طور سے برطانیہ (مغرب) میں ہماری نئی نسلوں میں اردو کا مستقبل۔"

لہذا مندرجہ ذیل موضوعات پر مضامین یا مقالات متوقع ہوں گے

۱۔ اُردو کی نئی بستیاں اور اردو ادب

۲۔ ادب کلچر

۳۔ برطانیہ میں اردو کی ترقی وترویج کے مسائل اور سرگرمیاں۔

۴۔ مغرب میں ہماری نئی نسلیں اور اردو کی ترقی وترویج کے مسائل، حل اور منصوبے۔

۵۔ مغرب میں نئی نسلوں کو اردو ادب سے متعارف کرانے کے لیے اردو ادب کے انگریزی تراجم کی اہمیت اور افادیت۔

۶۔ اُردو کی نئی بستیوں میں ہمارے ادب اور ثقافت (کلچر) کے احیاء نشو ونما اور فروغ کے مسائل۔ مستقبل اور ان کا حل۔

۷۔ اُردو کا مستقبل تاریخ اردو ادب کی روشنی میں۔

۸۔ عصری تاریخ اردو ادب اور برصغیر سے باہر تخلیق پذیر ہونے والے ادب اور تخلیق کاروں کے کارنامے ومقام کی اس میں اہمیت، افادیت یا محرومیت کا مسئلہ۔

۹۔ اُردو کے رسم الخط کے تحفظ کا مسئلہ بالخصوص اُردو کی نئی بستیوں میں اردو کو متبادل مقامی رسم الخط میں بھی نئی نسلوں کے لیے اردو ادب کو منتقل کرنے کی تجاویز کا تجزیہ اور قابل عمل مشورے۔

۱۰۔ اُردو کو عالمی سطح پر اس کا جائز وصحیح مقام دلانے کی حقیقی جدوجہد اور مسائل وحل۔

آپ سے شرکت کی استدعا ہے۔

چشم براہ

صابر ارشاد عثمانی

معتمد

فیکس نمبر. 0181 6770811

شاہد نجیب آبادی
پوسٹ بکس ۲۶۵۷۲۔ بحرین

غزل

خرام نازِ اُن کا اللہ اللہ، ہے نقش پا ان کا جاودانہ
قدم جہاں رکھ دیا انھوں نے، بنی وہ سجدہ گہہ زمانہ

نہیں جدا تیرا میرا مسلک اے شمع مجبور غم ہیں دونوں
مرا شغل ہے فغاں و نالہ، تیرا شغل گریۂ شبانہ

خدا ہی حافظ ہے اب ہمارا خبر نہیں کس طرف ہے منزل
ہمیں پڑے سوتے رہ گئے اور کارواں ہو گیا روانہ

مرے لیے تیری نگہہ غیظ و غضب بھی ہے باعث تسلی
جہاں پہ بجلی گری تھی ہم پر، وہیں بنائیں گے آشیانہ

ہیں دل میں پنہاں تصوراتِ غلامِ کُسن و حورِ مُحسن
سمجھ میں خاک آئیں گے کسی کے عجب ہیں اسرار زاہدانہ

نہیں موثر نصیحتیں تیری ناصحا! ہاں یہ مانتا ہوں
ہیں عالمانہ و فاضلانہ و کاملانہ و عاقلانہ

ناشاد، اورنگ آبادی
۲۔سی ۵۷۵ اولڈ جنتا کالونی
این، آئی، ٹی۔ فرید آباد

غزل

خود کو اتنی نہ آن بان میں رکھ
سادگی کا لحاظ شان میں رکھ

جنگ لڑنی ہے زندگی سے اگر
تیر کو وقت کی کمان میں رکھ

خون دینے کو سب رہیں تیار
اتنی ملت تو خاندان میں رکھ

آزمائش سے ڈر رہا ہے کیوں
خود کو مصروف امتحان میں رکھ

حُسن اخلاق سے شرافت سے
اپنی توقیر خاندان میں رکھ

ہو سفینے کو سازگار ہوا
زاویہ ایسا بادبان میں رکھ

جب پڑا وقت خون میں نے دیا
نام میرا بھی داستان میں رکھ

موت آنی ہے آئے گی ناشاد
چاہے خود کو کسی مکان میں رکھ

مرتضیٰ خاں

سمجھوتہ

یہ جو اونچا ریت ہے
اس کی دیوار کے سائے میں
ٹھنڈی راحت ہے!
یہ دریا تیرے میرے آنگن کے
ان کی روانی میں محبت ہے
یہ ساون رُت کی بھیگی ہوا ہے
اس کے آنچل میں شفقت ہے
سمندر کی لہریں من سے ٹکرائیں
سورج کی کرنیں رنگوں کو بکھرائیں
چندا کی چاندنی لگے روپہلا کھیت ہے
تیری میری دھرتی کی فطرت ایک ہے!

آؤ مل جل کر بیٹھیں، باتیں کریں
کھینچی لکیروں کو دیوار نہ بننے دیں
جو لکیریں جہاں ہیں وہیں تسلیم کریں!

ہم نے دیکھا ساری لال لکیروں کو
ابھریں، ڈوبیں، بکھریں ٹوٹ گئیں
پھر دیکھا دیوار گری، خوشبو سی اُڑی
دنیا کو نصیحت ملی، محبت کی جیت ہوئی!
لکیروں کو جانے دو! لکیروں کو مسئلہ نہ بناؤ
دیواریں نہ اُٹھاؤ، آسمانوں کو نہ بانٹو
پہاڑوں کو نہ کچلو، دریاؤں کو بہنے دو!

آؤ دوستی کے لیے ہاتھ بڑھاؤ
ہاتھوں کا جڑنا طاقت ہے
باتوں سے دل کو جوڑو
دل کا جڑنا بڑی مسرت ہے
آنکھوں کا پیغام سنو
آنکھوں میں چھپی لگاوٹ ہے
نرمی کی بات کرو
نرمی کی بات شرافت ہے
تمھاری خوش حالی ہماری طاقت ہے
ہماری محبت تمھاری راحت ہے!

ہماری ہوائیں تمھارے کھیتوں میں ناچیں گائیں
تمھارے بادل ہمارے انگنا گھٹا بن کر چھائیں
ہمارے گلی گلیاروں میں رم جھم برکھا برسائیں!

تم ہم سے دور کہاں ہو؟
تم ہمارے پچھواڑے کی بگیا ہو!
ہم تم سے دور کہاں ہیں؟
ہم تمھارا تاروں بھرا آنگن ہیں؟
تمھاری خوشبوئیں ہماری اُور کو آئیں
ہمارے تاروں کی چھائیں تم تک جائیں!
کپاس کا پھول، گیہوں کی بالی، باسمتی کی خوشبو کے دھارے ایک ہیں
ساری بہاریں، ساری رُتیں سارے اندھیارے اجیالے ایک ہیں
آؤ نا مل جل کر بیٹھیں!
دل کھول کے باتیں کر لیں
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے
دل کی بتیاں سن لیں!

بانہوں میں بانہیں ڈال کے
سمجھوتہ کر لیں!!

شبنم فردوس
محلہ پٹی سوتی ہاری
مشرقی چمپارن، بہار

شرارت خواب میں

بیٹھی خوابوں کا جال بنانے میں
محسوس ہوا کوئی پاس کھڑا ہے
پلکیں اٹھیں حیراں تھی میں
دیکھا اسے کچھ گھبرائی میں
اوہ! یہ وہی تھا
جو میری خوابوں میں اکثر آتا تھا
خوابوں میں آکر خوب ستاتا تھا
اوہ اُٹھیک سے میں سنبھلی بھی نہ تھی
کہ شوخی سے وہ یوں بولا
''کیا بات ہے میڈم؟ حیران کیوں ہیں؟
اتنی آپ پریشاں کیوں ہیں؟
خوابوں میں تو آپ ستاتی ہیں
دیکھ مجھے یوں گھبراتی ہیں؟''
کچھ کہنا میں نے چاہا تھا
کہ ممی نے آواز لگائی
''کیوں ڈیر کب تک سوؤ گی
دیکھو اب دھوپ نکل آئی''
معلوم ہوا جب آنکھ کھلی
کہ خوابوں کی یہ دنیا تھی

جمیلہ نشاط
10308 پلاٹ نمبر 283 چوتھی منزل
سیکٹر 6۔ ٹیچرس کالونی۔ سکندر آباد

نظم

یہ کون سا دن ہے
کہ پتھریلی زمین
دھول ہی دھول/دھوپ ہی دھوپ
پھیلا رہی ہے

اُمید کی کائی
ٹوٹی دیوار پر جم گئی ہے
کوئی رفیق، کوئی دوست
کوئی ہمراہ، نہیں کوئی نہیں
تنہائی ٹوٹی دیوار سے چمٹی
رو رہی ہے

وہ
ماں پر بوجھ بنی
بیٹھی تھی
آج
گرتی دیوار سے/ڈھلتی زندگی سے
اُسے جوڑ دیا گیا ہے
ماں کا کلیجہ تو ہلکا ہوا
لیکن
اُس پر
ایک ستّر سالہ شخص
اپنی سوکھی ہڈیوں کا
لعاب ٹپکا رہا ہے

مجتبیٰ حسین
۲۰۰، انکورا اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج، دہلی ۹۲

اردو اخبار خرید کر نہ پڑھیں

بیشتر اردو اخباروں میں آپ کو اس قسم کی عبارتیں اکثر پڑھنے کا موقع ملا ہوگا۔

☆ اردو اخبار خرید کر پڑھیں۔

☆ اردو بولیے، اردو لکھیے اور اردو پڑھیے۔

☆ اردو ہمارا قیمتی اثاثہ ہے۔

ایسی عبارتوں کو لکھنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اردو اخبار خرید کر پڑھنے کی تلقین کرنے والی کسی ایسی عبارت کو پڑھتے وقت اگر آپ اتفاق سے مفت میں ملا ہوا اردو اخبار پڑھنے میں مصروف ہوں تو اسے فوراً پرے پھینک دیں اور سچ مچ اردو اخبار خرید کر لے آئیں اور اسے پڑھنا شروع کر دیں۔ اس کا مقصد یہ بھی نہیں ہوتا کہ آپ واقعی اردو پڑھنا اور لکھنا شروع کر دیں یا اردو کو اپنا قیمتی اثاثہ سمجھ کر کوئی اور اثاثہ جیسے مکان، کھیتی، اور موٹر وغیرہ اپنے پاس نہ رکھیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ اگر آپ کے پاس اردو جیسا قیمتی اثاثہ موجود ہے تو آپ کو کسی اور اثاثے کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل ایسی عبارتیں عموماً خود اخبار کا پیٹ بھرنے کے کام آتی ہیں (اور پیٹ تو بدکار رہتا ہی ہے)

ایسی عبارتیں اسی وقت لکھی جاتی ہیں جب معلوم ہو کہ اخبار کی کاپی پریس میں جانے کے لیے تیار ہے اور کسی صفحہ پر دو چار سطروں کی جگہ باقی رہ گئی ہے تو کاتب ایسی خالی جگہ کو اردو کے اس قیمتی اثاثہ کی مدد سے پُر کرتا ہے جو اسے آسانی سے میسر آجاتا ہے یا پھر اس کام کے لیے اردو کی تہذیبی شناخت کو زحمت دیتا ہے۔ بیشتر کاتب حضرات فطرتاً نہایت نیک، پاکباز، خدا ترس، ایماندار وغیرہ ہوتے ہیں اور "کتابت کی غلطی" کے سوائے زندگی میں ان سے کوئی اور قابل لحاظ غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ کتابت کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ اگر آدمی ایک بار اس پیشہ کو اختیار کر لے تو سدا کے لیے شرافت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ کوئی اور غیر شریفانہ کام (جو ہم میں سے اکثر کرتے رہتے

ہیں) انجام دینے کے قابل نہیں رہ جاتا۔ ایسا شریف آدمی جب چوری، ڈکیتی، رہزنی، اغوا، قتل، غارتگری وغیرہ کی خبریں لکھتے لکھتے بیزار ہو جاتا ہے اور اتنے سارے وافر جرائم کے ارتکاب کے بعد بھی اخبار میں تھوڑی سی جگہ باقی رہ جاتی ہے تو اس کی رگ شرافت پھڑک اٹھتی ہے اور وہ اسے پُر کرنے کے لیے بسا اوقات اخلاقی اور بعض اوقات دینی نعروں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے نیکی جنت کی کنجی ہے۔ قبر کے عذاب سے ڈرو [illegible] عاقبت سنوارو وغیرہ۔ غرض جن باتوں پر عمل کرنا تو بہت دور کی بات ہے جنھیں ہم بالکلیہ فراموش کر چکے ہیں، انھیں نعروں کی شکل دے کر اخبار کی زینت بنا دیا جاتا ہے

رہی اردو اخبار کو خرید کر پڑھنے کی بات تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ان دنوں کوئی بھی چیز (چاہے وہ انگریزی کا اخبار ہی کیوں نہ ہو) بھاؤ تاؤ اور مول تول کے بغیر خریدی نہیں جاتی۔ معاشیات کا یہ ادنیٰ سا اُصول ہے جس پر ہم جیسا کم علم روشنی ڈالے گا بھی تو کتنی ڈالے گا اور کتنی دور تک ڈالے گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گھریلو خواتین بازار سے سبزی خریدنے جاتی ہیں تو پچاس پیسہ کا دھنیا لیتے وقت بھی دکانداروں سے اچھی خاصی بحث کر لیتی ہیں۔ پھر اخبار تو دو روپے کا آتا ہے (چاہے وہ اردو کا ہی کیوں نہ ہو) اسے ویسے ہی کیسے خرید لیں۔ آپ یقین کریں کہ دہلی میں ہمارے ایک پڑوسی ہیں بی ایل شرما۔ انگریزی کا ایک مشہور روزنامہ ہر روز منگاتے ہیں لیکن روز کا اخبار روز ہی خریدتے ہیں اور ماشاءاللہ مول تول کے بعد خریدتے ہیں۔ ہر روز اخبار کے ہاکر سے قیمت کے معاملہ میں ان کی بحث ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اخبار کے انتظامیہ نے اگر روز کے اخبار کی قیمت دو روپے مقرر کر دی ہے تو میں اسے آنکھ بند کر کے کیسے خرید لوں۔ جب تک یہ نہ دیکھ لوں کہ اس دن کے اخبار میں کتنی مالیت کی خبریں آئی ہیں۔ کہیں میرا نقصان تو نہیں ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے اپنے حساب سے ہر خبر کے دام مقرر کر رکھے ہیں۔ اخبار میں دس کروڑ روپے کی مالیت والے گھوٹالے کی خبر ہو تو اس کے پچھتر پیسے دام لگاتے ہیں۔ زنا بالجبر کی خبر کے دس پیسے، قتل کی وارداتوں سے متعلق خبروں کے دام فی قتل کے حساب سے دس پیسے ادا کرتے ہیں۔ (اخباروں کی خوش بختی ہے کہ روزانہ پانچ چھ قتل تو ہو ہی جاتے ہیں)۔ اغوا کی خبر کے پچیس پیسے، موسم کے حال کے دو پیسے اور کارٹون کے پانچ پیسے مقرر کر رکھے ہیں۔ جب تک یہ ہاکر سے اخبار میں چھپی خبروں کی تفصیل نہیں جان لیتے تب تک اخبار کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ہم نے تو ایک دن یہاں تک دیکھا کہ ہاکر اپنے

کمیشن کے پیسوں سے دستبردار ہو کر انھیں دو روپے کا اخبار ایک روپے پچھتر پیسے میں دے کر چلا گیا۔ کہتے ہیں "میں تو شمارے کے حساب سے اخبار نہیں خریدتا۔ خبروں کے حساب سے خریدتا ہوں۔ کسی دن اخبار میں واجبی خبریں نہ ہوں تو میں زائد دام کیوں ادا کروں۔ میں تو پچیس پیسے کی ہری مرچ بھی بھاؤ تاؤ کے بغیر نہیں خریدتا۔ دو روپے کا اخبار آنکھ بند کر کے کیسے خرید لوں۔ چیزوں کے دام تو روز ہی اترتے چڑھتے رہتے ہیں۔ پھر یہ اخبار والے کون ہوتے ہیں جو مہینہ بھر دو روپے کے حساب سے اپنا اخبار مجھے بیچتے ہیں۔ اخباروں کی قیمت ہر روز بدلنی چاہیے۔ اخبار والوں نے اکنامکس نہ پڑھی ہو تو نہ پڑھی ہو لیکن میں نے تو بی۔ اے میں اختیاری مضمون کے طور پر پڑھی ہے۔ اسے کیسے بھول جاؤں۔"

ویسے ہمارے شرما جی کی بات نہایت معقول ہے۔ دور کیوں جائیں ہم خود بھی چیزوں کو خریدنے کے معاملے میں ہر روز بھاؤ تاؤ کرتے رہتے ہیں (یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود مہنگے دام ادا کرتے ہیں) مول تول پر ہمیں وہ لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک خان صاحب لاہور گئے تو انار کلی میں شاپنگ کے ارادے سے نکلے۔ ان کے میزبان نے کہا انار کلی کے بیوپاریوں سے ہوشیار رہو۔ اگر وہ کسی چیز کے دام پچاس روپے بتائیں تو تم اس کے پچیس روپے دینا۔ خان صاحب نے موزے کی ایک جوڑی پسند کی تو دکاندار نے اس کے دام پچاس روپے بتائے۔ خان صاحب نے کہا "مگر میں تو اس کے صرف پچیس روپے دوں گا۔" دکاندار تھا بڑے دل کا آدمی۔ اس نے کہا "حضور آپ ہمارے مہمان ہیں۔ پچیس روپے کی کیا اہمیت ہے۔ آپ تو یہ جوڑی مجھ سے مفت میں لے جائیں۔" اس پر خان صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد فرمایا "اگر مفت میں دینے کی بات ہے تو میں تب بھی دو جوڑی سے کم نہ لوں گا۔" ہمیں یہ لطیفہ اس لیے یاد آیا کہ مفت میں اردو اخبار پڑھنے والوں کو اگر اس لطیفہ کا پتہ چل گیا تو کہیں وہ اخبار والوں سے یہ مطالبہ نہ کر بیٹھیں کہ میاں مفت میں اپنا اخبار پڑھوانا چاہتے ہو تو اخبار کی دو کاپیاں روانہ کیا کرو۔ ایک کاپی کی مدد سے مفت میں اردو اخبار پڑھنا یوں بھی دشوار ہوتا جا رہا ہے کیوں کہ اور لوگ بھی تو قطار باندھے پیچھے کھڑے رہتے ہیں۔ لیجیے ہم بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ اس تحریر کو لکھنے کی ضرورت ہمیں اس لیے پیش آئی کہ کلکتہ کے اردو اخبار "مشرق" میں ایک صاحب اے۔ جی۔ ندر کا ایک درد بھرا مراسلہ کل ہی ہماری نظر سے گزرا ہے۔ (مخفی مباد کلکتہ کے دو اخبار "آزاد ہند" اور "اخبار مشرق" ان کے ایڈیٹروں احمد سعید ملیح آبادی،

وسیم الحق اور احسن مفتاحی کی عنایت سے پچھلے کئی برسوں سے ہمارے پاس مفت آتے ہیں) جی اے نذر نے اظہار افسوس کیا ہے کہ بیشتر اردو والے خرید کر اخبار نہیں پڑھتے۔ اگر خریدتے بھی ہیں تو ایک ہی اخبار کو اتنے سارے لوگ مل کر پڑھتے ہیں کہ اخبار کی سطریں تک دھندلی ہوجاتی ہیں۔ اردو قارئین کی دیگر ضروریات کا خرچ تو آئے دن بڑھتا رہتا ہے اور وہ اس کی پابجائی بھی کرتے رہتے ہیں لیکن اردو اخبار خریدنے کے لیے اُن کے بجٹ میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ یہ خاصا طویل مراسلہ ہے جس کا مقصد اردو والوں کے ضمیر کو جھنجوڑنا ہے (بشرطیکہ یہ جھنجوڑا جاسکے) ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہم خود کو اس معاملہ میں رائے زنی کا اہل نہیں پاتے کیوں کہ خود ہمارے پاس ہندستان کے کئی اردو اخبارات مفت میں آتے ہیں۔ کس منہ سے اردو کے مفت خورے قارئین پر چوٹ کریں۔

جی اے نذر کی باتوں سے ہمیں صد فی صد اتفاق ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگ اب اردو پڑھنے کو ہی کسر شان سمجھنے لگے ہیں۔ (مفت میں اردو اخبار پڑھنے کی بات تو پھر بھی قابل قبول ہے)۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے ہم نے اپنی نئی کتاب کا ایک اعزازی نسخہ اپنے ایک دوست کی خدمت میں پیش کیا تھا (اعزازی نسخہ اس کو کہتے ہیں جو بصد احترام مفت میں کسی کی خدمت میں پیش کیا جائے)۔ کل ہم اپنے دوست کے دفتر گئے تو دیکھا کہ اروندھتی رائے کی انگریزی کتاب "The God of Small Things" کے مطالعہ میں غرق ہیں اور ہنستے چلے جارہے ہیں۔ ہم نے کہا ''بھیا اروندھتی رائے کی یہ کتاب ہم نے بھی پڑھی ہے۔ ہمیں تو اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جس پر ہنسا جاسکے''۔ بولے ''بیوقوف آدمی! میں اروندھتی رائے کی باتوں پر کہاں ہنس رہا ہوں۔ میں تو تمھاری باتوں پر ہنس رہا ہوں۔'' ہم نے حیرت سے پوچھا ''کیا مطلب؟''۔ ہماری تازہ کتاب کو اروندھتی رائے کی کتاب کے سرورق کے برقعے میں سے باہر نکالتے ہوئے بولے۔ ''دیکھو یہ رہی تمھاری کتاب۔ میں نے اس پر اروندھتی رائے کی کتاب کا سرورق معلّق چڑھا رکھا ہے۔ تم جہاندیدہ آدمی ہو۔ جانتے ہو کہ میں گزیٹیڈ عہدیدار ہوں۔ دفتر میں میری بڑی عزت ہے۔ اگر کسی نے مجھے اردو کتاب کو پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو میری کیا عزت رہ جائے گی۔''

اس واقعہ کی روشنی میں اگر کچھ اصحاب کھلم کھلا اردو اخبار پڑھتے ہیں (چاہے وہ مفت میں ہی کیوں نہ ملا ہو) تو ایسے لوگوں کے خلاف کچھ کہنا نہ ہمیں زیب دیتا ہے اور نہ ہی جی اے نذر کو زیب دیتا ہے۔

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

مقصود الٰہی شیخ

یہ بھی کوئی کہانی ہے؟

یہ نہیں ہوتا کوئی تھکا ہارا آئے بستر پر لیٹے، لیٹ کر آنکھیں موند لے پھر چھم کی آواز آئے اور پٹ سے آنکھیں کھولنے پر کوئی سامنے آ کھڑا ہو! گھر کا دروازہ بند ہو۔ آنکھیں بند ہوں۔ بند کمرے میں کوئی کیسے آسکتا ہے؟ ایسا کچھ نہیں ہوتا ۔ یہ احساس کی شدت ہے ۔ انتظار میں کڑھنے کے کرب کی حلاوت ہے ۔ دشت میں تمنا کے دوسرے قدم کا امکان، بس!

یہ بھی نہیں ہوتا آنکھیں کھولنے پر جب سامنے کوئی من بھاؤنی صورت نہ ہو تو کھڑکی سے باہر دیکھنے پر پڑوسی کے صحن میں کھلے لہراتے گل بوٹے نظر آئیں۔ وہ تو نظر نہیں آتے مگر خوبانی اور سیب کے درختوں کی اونچی کھڑی کھڑی شاخیں دید کا سامان بن جاتی ہیں۔ ٹہنیوں پر لٹک رہے سیب اچھے لگتے ہیں۔ سب سے اونچی شاخ بہت بلند اور سیدھی ہے۔ اس کے سامنے ایک اور شاخ دکھائی دے رہی ہے جس کے ساتھ ادھر ادھر دو سیب ہیں۔ شاید انھیں کی وجہ سے اس میں خم ہے۔ کیا اس سیدھی، بالا ترین شاخ میں پھل لگے تو یہ بھی جھک جائے گی؟

پھر نیلا شفاف آسمان ہے۔ دوڑتے لبھاتے بادل ہیں۔ ایک پرندہ دور تک پرواز کرتا نگاہوں سے دور اور دور اوجھل ہو تو منظر کیا سے کیا ہو جاتا ہے؟ محیط خوشگواریت دل میں گدگدی کرتی ہے۔ سامنے پہاڑیوں پر سبزہ متوجہ کرتا ہے۔ کیسی بے ترتیب ہریالی میں ڈوبی دلکش تصویر ہے۔ پیچھے کوئی مصور؟ کہاں چھپا ہے؟ خدایا!

زمین دیکھو تو مٹیالی سطح میں سما جانے کو جی چاہتا ہے! الگ الگ خوب سے خوب تر چہرے، کچھ خاک میں پنہاں، باقی ظاہر اور نمایاں۔ یہ رنگ بھری بستیاں۔ یہ شہر۔ روشنیاں۔ جگ مگ ماحول۔ یہ رونقیں۔ یہ فلک۔ یہ سبزہ۔ یہ جنگل۔ چرندے۔ یہ بادل۔ محو پرواز پرندے۔ یہ رم جھم بارش۔ جھیلیں۔ دریا۔ سمندر۔ یہ شور۔ یہ دشت۔ یہ

صحرا۔ بے تحاشا ہوائیں۔ کبھی ہر سو خاموشیاں۔ خشک وتر پہاڑ۔ آبشاریں۔ آتش فشاں۔ ان سے پھوٹتا لاوا۔ شعلے۔ گرم سیال رنگوں کا حسن۔ بربادی اور حسن؟ ہوتا ہے۔ موت کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ اسی طرح خوشی، خوشی ہے اگر غم بھی اوٹ میں ہو۔ جنگیں ہوتی ہیں۔ فضا میں چراند، ہراند، عجب سی بو پھیل جاتی ہے۔ موت کا سناٹا چھا جاتا ہے۔ بم پھٹتے ہیں۔ شہر اجڑتے ہیں۔ تباہیاں مچتی ہیں۔ لوگ مرتے ہیں۔ اس کرہ ارض کے کسی نہ کسی گوشے میں، خطے میں لڑائی چھڑتی ہے۔ چھیڑی جاتی ہے۔ فساد ہوتا ہے۔ دہشت کا راج ہوتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ کیڑے مکوڑوں کا سا سلوک جاری ہے۔ گاؤں، قصبے۔ شہروں کے شہر تاراج کر دیے جاتے ہیں۔ مکینوں اور مسکینوں کو مسل دیا جاتا ہے۔ سہاگ اجاڑ دیے جاتے ہیں۔ راگوں کو چپ کرا دیا جاتا ہے۔ ساز توڑ دیئے جاتے ہیں۔ گودیں خالی کر دی جاتی ہیں۔ بہنوں کی آبرو لٹتی ہے۔ ماؤں کا وقار واحترام بے دریغ روندا جاتا ہے۔ بوڑھوں کو خوار اور بچوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ جوانوں کو گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے۔ موت کے اعداد و شمار میں بے پناہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے پھر بھی دنیا خالی نہیں ہوتی۔ شرح پیدائش بڑھتی جاتی ہے۔ تبدیلیوں پر تیز تر تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ چاند سورج گہناتے ہیں۔ قیامت نہیں آتی۔ ادھر بہتر برس بعد سورج کو پورا گہن لگا۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ دوبارہ یہی آفتاب اکیانوے سال بعد اندھیرے میں ڈوبے گا۔ نکلے گا۔ کون ہوگا؟ کون نہیں ہوگا؟ دنیا یونہی آباد رہے گی۔

کتنی حسین ہے دنیا۔ روس ختم۔ امریکہ زندہ باد۔ ان گنت دیس ہیں۔ ان میں برے بھلے سبھی موجود ہیں۔

ایک پرشوتم لال ہیں۔ ماتا پتا کی آنکھوں کا تارا!

پرشوتم نے بی اے کیا۔ شیو بنانے لگے تھے۔ بالغ تھے۔ اپنا برا بھلا جانتے تھے۔ تقدیر سے ملازمت بھی مل گئی تھی۔ انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی مگر بے مہار ہونے سے پہلے ماں باپ نے شادی کر دی۔ جیسے یہ دیسی اوشا۔ جوڑ بھدا اور برا نہ تھا۔ ملن کے ساتھ ہی مرضی مل گئی۔ اچھی نبھ رہی تھی۔ دو ایک سال گزرنے پر ان کی ماں کنتی کو فکر لاحق ہوگئی۔ چنتا یہ تھی کہ بہو کو اولاد نہیں۔ خاندان مکمل نہ ہو پائے گا تو پرکھوں کا نام مٹ جائے گا۔ بے اولاد بہو کس کو اچھی لگتی ہے؟ دن رات کنتی اور بابو جی کا اصرار بڑھنے لگا۔ بیٹا دوسری شادی کرلو۔ ہماری بجھتی آنکھوں میں پوتے پوتی کی صورت

دکھا کر نئی جوت جگا دو۔ اوشا اداس رہنے لگی۔ پرشوتم نے دلاسہ دیا کہ اس پر سوتن نہیں لائے گا پر اوشا کے دن کا چین اور رات کی نیند اڑ گئی۔ گھر کا سکھ تتر بتر ہونے ہی والا تھا کہ چمتکار ہو گیا۔ اوشا امید سے ہو گئی۔ وقت سے پہلے ست ماہا جوڑا ہوا۔ لڑکا پیدائش پر ہی چل بسا۔ سب دکھی ہوئے لیکن یہ خوشی تھی کہ بچی بچ گئی۔ نام کومل رکھا گیا۔ دادا دادی جی اٹھے۔ ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ پرشوتم اور اوشا بھی مسرور تھے۔ پھولے نہ سماتے تھے۔ سب بچی کی ٹہل سیوا میں لگ گئے۔ دودھ میں نہلاتے، سونے کا نوالہ کھلاتے! دھیرے دھیرے کمزور سی، منحنی سی کومل ہاتھ پیر نکالنے لگی۔ دادی کہتی بچی بچ نکلی۔ دادی جی اٹھی۔ پرکھوں کی پرم پرا اور نشان بچ گیا۔ کیا خبر دیر سویر دوسرا چمتکار ہو۔ بھگوان لڑکا بھی دے دے! آشاؤں کا کوئی انت ہوتا ہے کیا؟

کنبے کی لاڈلی جیسے جیسے پلی بڑھی۔ نکھرتی گئی۔ لگتا کوملتا کا دوسرا نام یہی لڑکی ہے۔ لڑکی کیا تھی؟ روپ کی پتلی، سندرتا میں ڈھلی مورت تھی اپسرا تھی۔ نین نقش لاجواب! پرشوتم آئینہ دیکھتا اور سوچتا نہ ماں اتنی خوبصورت نہ وہ کسی شمار قطار میں، پھر یہ سوہنی، موہنی کومل کس پر گئی؟ یہ کہنا مشکل تھا اوشا زیادہ جان چھڑکتی ہے کومل پر یا پرشوتم بیٹی کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہے؟

پہلے سب کی کوشش تھی کسی کی نظر نہ لگے، پھر اس پر دھیان رہا کہ لڑکی کسی کی نظر میں نہ آئے۔ ایک ہیرا ان کومل گیا تھا۔ جس کی حفاظت کرتے کرتے پہلے دادی پھر دادا اپنی جان ہار گئے۔ ان کے بعد، مجال ہے ماں باپ نے کسی کو بیٹی پر بری نظر ڈالنے دی ہو۔ مسلمان ہوتے پردہ کراتے۔ ویسے کومل کو ہر طرح کی آزادی تھی۔ دوستوں سے ملتی۔ گھر بلاتی۔ جہاں پرشوتم نہ جا سکتے اوشا ساتھ جاتی۔

ایک روز، معمول کے خلاف کومل نے فون کر کے کہا گھر دیر سے آئے گی پھر یہی معمول بن گیا۔ ایک روز شاید وہی جو پہلے بھی چھوڑ گیا تھا اور پرشوتم دیکھ نہ پائے تھے، کومل کے ساتھ ساتھ اندر آ گیا۔ اشوک کہہ کر تعارف کرایا گیا۔ پرشوتم کے پیروں کی زمین نکل گئی۔ کہاں کومل۔ کہاں یہ اوت کا اوت، بالکل اونٹ، کوئی کل سیدھی نہ بات۔ پرشوتم پراچین ہند کا تھا نہ اشوک ہی تین صدی قبل مسیح کا (اشوک اعظم)۔ کوئی معیار تو ہوتا ہے! کیا نظر آیا اس بدشکل اور بدتمیز میں کومل کو مگر وہ چپ رہا۔ وہیں کھڑے کھڑے باپ بیٹی کے درمیان ایک دیوار اٹھ گئی۔ اوشا نے کہا۔ اشوک سے بیٹھنے کو تو کہو۔ وہ سب بیٹھے۔ ایسے موقعوں پر جو تکلف ہوتا ہے وہ بھی ہوا، پر اشوک کے جانے پر پرشوتم

سے برداشت نہ ہوا۔ زندگی میں پہلی بار گرج کر، کڑک کر اوشا کو کوسا۔ اس کی چاہت کا مرکز یہی دو ہستیاں تھیں۔ اوشا اور کومل۔ سچی بات یہ ہے کہ کومل اس کی ہیر، اس کی جان تھی جس کی حفاظت اس کی ذمے داری تھی۔ کومل کا مستقبل اسے عزیز تھا۔ جان سے پیارا تھا لیکن جب اوشا نے کہا اشوک ان کی بیٹی کی پسند ہے، وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اس حقیقت کو مان لینا چاہیے۔ دخل نہیں دینا چاہیے۔ اشوک اس کی بھی پسند ہے۔ تب پرشوتم ہار گیا۔ مزاحمت چھوڑ دی۔ پسپائی اختیار کی۔ سوچا، کومل آج کل کی لڑکی ہے۔ اپنا برا بھلا جانتی ہے۔ سختی کی، گھر سے بھاگ گئی تو بدنامی ہوگی۔ عزت مٹی میں مل جائے گی۔ قانون جرائم سے نمٹنے کے بجائے لڑکیوں کو تحفظ دینے پر زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ جب اولاد ہی کھوٹی ہو تو کیا ہو سکتا ہے؟ تدبیریں بے کار جاتی ہیں۔

کیا اولاد یوں بدل سکتی ہے؟ ماں باپ سے اس کا حق چھین سکتی ہے؟ کون جواب دیتا؟ حد تو یہ ہے کہ بیوی نے بھی بے اعتنائی دکھائی اور بیٹی کی ہو گئی۔ اس رنگ بدلتی دنیا میں جو نہ بدلے، وہ مورکھ اور نادان ہے پر کوئی کتنا بدلے؟

ایک رات ماں بیٹی اشوک کے ساتھ سنیما جانے کا کہہ کر گئیں تو رات بھر نہ پلٹیں۔ یہ بڑی خلاف معمول بات تھی پھر یہ خلاف معمولی بات نہ رہی۔ بار بار ایسا ہونے لگا۔ پرشوتم اس موڑ پر سمجھوتہ نہ کر پایا۔ چھان بین کی، پتا چلا کومل ماں کے ساتھ موسی کے یہاں جاتی ہے۔ وہاں سے اکیلی دوسری جگہ!!! اشوک شادی شدہ ہے۔ اس کے دو بچے بھی ہیں مگر اب اس کے ساتھ کومل کا میل جول نہیں رہا!!

انکشاف پر، پردہ اٹھنے پر اوشا نے اپنی بیوہ بے اولاد بہن کے ساتھ باہمی خودکشی کی کوشش کی مگر بدنصیب بچالی گئی۔ وہ اب معذور اور اپاہج ہے۔ صفائی ستھرائی سے گئی۔ بول بھی نہیں سکتی۔ بہت علاج معالجہ ہوا۔ پرشوتم اکیلا دیکھ بھال کرتا ہے۔ ایک دو تین پورے چار سال ہو گئے کوئی فرق، کوئی افاقہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ اوشا سے جب بھی ممکن ہوتا ہے اپنے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی مدد سے کمپیوٹر پر ایک ہی فقرہ لکھتی ہے۔ بیٹی کی شادی کر دو۔ پرشوتم ہاں میں سر ہلا کر حامی بھرتا ہے تو اوشا کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

کومل گھر آتی ہے۔ دیر سے آتی ہے۔ روزانہ سویرے سویرے نکل جاتی ہے۔ پرشوتم سے اس کی ملاقات کب ہوتی ہے کہ وہ ماں کی خواہش بیٹی تک پہنچا سکے!

صغریٰ مہدی
عابد ولا، جامعہ نگر نئی دہلی، ۲۵

تیسری قسط

میخانوں کا پتہ

اب کی حبیبہ نے بھی میرے ساتھ وہیں بیٹھے بیٹھے فاتحہ پڑھا۔ اب کوثر جو آئے ہمارے اس فعل پر کہ ہم اترے نہیں کچھ کبیدہ خاطر تھے۔ انھوں نے اور زور شور سے شاہ ایران اور ان کے ساتھیوں پر لعنت و ملامت شروع کر دی اور امام خمینی کی عظمت پر روشنی ڈالنے لگے۔ ۲۰ راکتوبر کو ہمیں ایران سے عراق کو روانہ ہونا تھا مگر شام کو مسجد جمکران میں نماز مغرب ادا کرنی تھی بدھ کا دن تھا۔ اس دن اس مسجد میں دعا کی جاتی ہے۔ عقیدہ ہے کہ وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔ یہ مسجد بارھویں امام سے منسوب ہے کہ کسی مجتہد کو آپ کی بشارت ہوئی اور آپ نے یہاں مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ مسجد اور اس کے اطراف ایک میلا لگا ہوا تھا۔ رنگ برنگ کی چادروں میں عورتیں بچے آئس کریم، طرح طرح کے شربت کھلونے..... مسجد کے اندر بھی بہت رش تھا میں تو اندر جانے کی ہمت ہار رہی تھی مگر ہماری نہایت اکلوتی ساتھی نورز ہرا مجھے ساتھ لے گئیں۔ وہاں تو کندھے سے کندھا چھل رہا تھا۔ ایسی حالت میں جیسے تیسے نماز پڑھی۔ دعا مانگی اور ان کو وہاں چھوڑ کر میں باہر بھاگی۔ جوتے بغل میں تھے۔ باہر نکلی تو پیچھے سے ایک چھڑی پڑی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک مجاور سر کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو دھکا کی میں کھل گیا تھا۔ جلدی سے اوڑھا اور ایک طرف آ کر بیٹھ کر ساتھیوں کا انتظار کرنے لگی۔ ایک ملتا تو دوسرا کھو جاتا تھا۔ جو ملتے تھے وہ کسی اور طرف نکل جاتے۔ منظور گھبرائے گھبرائے گھوم رہے تھے، سب ملے تو بس کھو گئی، سب پریشان کہ سامان بھی اسی میں تھا، خیر بس بھی مل گئی اور آٹھ بجے ہم عراق کو روانہ ہوئے۔ رات بھر چلتے رہے، درمیان میں دو دفعہ بس رکی۔ اُترے تو خاصی سردی تھی۔ بس ڈرائیور اور ان کا ہیلپر نہایت خوش مزاج تھے۔ راستے بھر ہنستے بولتے رہے۔ سیٹیں آرام دہ تھیں۔ بس بڑی تھی سب لوگ ایک ایک سیٹ پر نیم دراز تھے۔

ایران کے بارڈر پر پہنچے تو اذان فجر ہو رہی تھی، نماز ادا کی۔ چائے پی، ناشتہ کیا سامنے عراق کا بارڈر نظر آ رہا تھا، اور بڑی سی صدام حسین کی تصویر لگی تھی، کافی مراحل

ملے ہوئے تو ایک بس سے عراق کے بارڈر پر پہنچے۔ وہاں سے عراق کی بس لے کر بارڈر کے اندر داخل ہوئے جہاں ایک پاکستانی زائرین کی بس پہلے سے کھڑی تھی، نو بج رہے تھے، ٹریول ایجنٹ کے نمائندے کا انتظار تھا، کافی دیر بعد وہ آئے تو کچھ انتظامی مسائل پیدا ہو گئے، نہ کھانا نہ پینا بس بیٹھے بیٹھے سہ پہر ہو گئی۔ اسی کے ساتھ وہاں کے عملے کی عطر کی فرمائش بھی تھی۔ بارڈر پر کچھ الجھنیں ہوئیں۔ اس طرح پانچ بجے کے قریب ہم لوگ بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔ عراق تاریخ اسلام کا مرکز ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ یہاں بہت سی زیارت گاہیں ہیں۔ یہاں سال بھر مسلم زائرین آتے رہتے، ان میں شیعہ حضرات کی تعداد یقیناً زیادہ ہوتی ہے۔ پچھلے چند سالوں سے عراق کی حالت سقیم ہو گئی ہے اور اس کے ثبوت قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ ہم بغداد جا رہے تھے جو دجلہ کے دونوں طرف واقع ہے، آمد و رفت کے لیے کئی پل ہیں۔ دجلہ کے کنارے کاظمین ہے جہاں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام امام تقی کے مزار ہیں.....بہت بڑی ایرانی طرز کی عمارت ہے جس کے سبز گنبد دور سے ہی نظر آجاتے ہیں۔ ہم نو بجے بغداد پہنچے پورا شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا بازار میں رونق تھی۔ ہمارے ٹریول ایجنٹ کے نمائندے ہمیں ہوٹل لے گئے جو عین بازار کے درمیان تھا۔ اچھا خاصا ہوٹل تھا، اب ہمیں ایران سے چلے ۳۰ رگھنٹے ہونے کو تھے۔ تھکن اور بھوک سے برا حال تھا، تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ نماز ادا کی اور پھر سو گئے،

نماز فجر کے وقت آنکھ کھلی نماز ادا کی اور پھر سو گئے۔ اٹھے تو نو بج رہے تھے۔ دیر تک سوچتے رہے کیا واقعی ہم بغداد میں ہیں جو دنیا کا بہت ہی پرانا شہر ہے، جو تہذیب کا گہوارہ ہے، علم و ادب کا مرکز ہے جو شہر بار بار لوٹا گیا اور بار بار بسا، یہاں دجلہ اور فرات کا سنگم ہے، عراق ہی تو ہے جہاں شداد اور نمرود نے خدائی کا دعوا کیا تھا۔ اسی نے الف لیلہ کی کہانیاں سنائی ہیں۔

ناشتہ کر کے کاظمین تشریف گئے، بے حد مجمع تھا دونوں مزاروں پر فاتحہ پڑھا، زیارت پڑھی، نماز ادا کی اور پھر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ یہاں بھی مزار کے ایک طرف عورتیں تھیں اور دوسری طرف مرد، ایک عجب بات یہ دیکھی کہ یہاں خواتین مہندی بانٹ رہی تھیں بطور تبرک اور خواتین لگا رہی تھیں۔ وہ جمعرات کا دن تھا اور قافلے والوں کی خواہش اور قافلہ سالار کی کوشش یہ تھی کہ اس رات کو امام حسینؑ اور حضرت عباسؓ کی زیارت کی جائے چنانچہ کھانے کے بعد ہم اسی بس میں ٹریول ایجنٹ کے نمائندے کی سربراہی میں روانہ ہوئے،

بس والے نے اردو کیسٹ بھی لگا رکھے تھے چنانچہ جیسے ہی ہم آبادی سے نکلے یہ کیسٹ بجنا شروع ہو گیا..... کربلا چلو...... کربلا چلو........ ہماری بس چلی جا رہی تھی کبھی آبادی آجاتی کبھی ویران علاقہ آجاتا، جیسے جیسے آگے بڑھتے دیہاتی ماحول اور کچے گھر بڑھتے گئے، کربلا کے خیال کے ساتھ کربلا کے واقعات یاد آنے لگے اور ساتھ نوحے اور مرثیوں کے بند، سامنے فرات بہہ رہا تھا، شام کے کوئی ساڑھے چھ یا سات بجے کربلا میں داخل ہوئے، تھوڑی دور چلے تو امام حسینؓ کے مزار کے گنبد نظر آنے لگے ٹھہرنے کا انتظام امام حسینؓ کے روضہ کے قریب تھا مگر وہاں بے تحاشا ہجوم تھا۔ دور دور سے لوگ نو چندی جمعرات کی وجہ سے زیارت کے لیے آئے تھے۔ اس قدر مجمع تھا کہ بس چل نہیں رینگ رہی تھی۔ ہمارا جس ہوٹل میں انتظام تھا وہاں ان لوگوں نے اور لوگوں کو ٹھہرایا تھا اس لیے کہ ہمیں پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ دوسرے ہوٹل کے تلاش ہوئی ایک رات اور ایک دن کے لیے ایک ہوٹل میں جگہ ملی، نماز پڑھی چائے پی اور باہر نکلے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ پہلے امام حسینؓ کے مزار پر جائیں گے مگر ہماری ساتھی خواتین کا کہنا تھا کہ نہیں مولانا نے کہا کہ زائرین کربلا پہلے حضرت عباسؓ کے مزار پر حاضری دیں اور پھر ان کے مزار پر آئیں، چنانچہ حضرت عباسؓ کے مزار کی طرف رخ کیا جو بہت دور نہیں، مجمع یہاں کچھ زیادہ ہی تھا، میری ہمت جواب دے رہی تھی، میں سوچ رہی تھی کہ اس بھیڑ اور دھکم پیل میں کیا زیارت ہوگی، مگر ساتھی خواتین کی ہمت دیکھ کر میں بھی اس بھیڑ میں گھسی اور دھکوں دھکوں ہی میں حضرت عباسؓ کی ضریح کے سامنے تھے۔ باہر ہی سے زیارت پڑھی اندر گھسے مگر وہاں قریب پہنچنے کا موقع نہ ملا کہ حضرات و خواتین ضریح کی جالی پکڑے گریہ وزاری کر رہے تھے ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ مرثیہ کے اشعار یاد آنے لگے۔

عباسؓ علی قبلۂ ارباب وفا ہے
خورشید بسر کرم و لطف عطا ہے
ثابت قدم جادۂ تسلیم و رضا ہے
شمشیر خدا ہے خلف شیر خدا ہے

اسی کے ساتھ وہ نوحہ بھی

عباس علم جب پائیں گے اور مشک سکینہ لائے گی
عباس تمہاری قربانی دنیا کو وفا سکھلائے گی

"اے بھنو تم بھی نہ پہنچ پائیں ضریح تک" میں چونک پڑی دیکھا تو ہماری ساتھی تصویر زہرا کھڑی کہہ رہی تھی..... پھر قبل اس کے میں جواب دیتی.... بولیں اور کیا بھئی حضرت عباسؑ کب چاہیں ہیں کہ ہم اپنے ہاتھ پیر توڑ وائیں، مگر تو چندی تھی بس زرا ضریح چوم لیتے۔ میں نے کہا بس آپ یہاں آگئیں آپ کی حاضری ہوگئی، میں نے انھیں سمجھایا تو وہ مطمئن ہوگئیں۔ پھر دھکوں دھکوں میں ہم باہر آگئے، سب کے کھونے اور ملنے کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ وہاں ملنا کمال تھا اور کھونا بالکل نارمل تھا، کافی دیر بعد امام حسینؑ کے مزار پر پہنچے وہی نیلی پچی کاری سونے چاندی کے گنبد آپ کی ضریح کے برابر ہی آپ کے صاحبزادوں حضرت علی اکبر اور حضرت علی اصغر کی ضریحیں ہیں..... تھوڑا ہٹ کر ایک ضریح ہے وہاں سب شہیدان کربلا دفن ہیں۔ برآمدے میں رسول خدا کے صحابی حبیبؓ ابن مظاہر کی چھوٹی سی ضریح ہے اور اسی سے ملا ہوا۔ ایک دروازہ تھا اس کے اندر وہ جگہ تھی جو امام حسینؑ کا مقام شہادت ہے!

اس رات تو ہم بمشکل امام حسینؑ کی ضریح تک پہنچ سکے۔ زیارت پڑھی۔ دیر تک وہاں کھڑے اور باقی لوگ دھکم پیل کر کے آگے بڑھتے گئے۔ نماز پڑھنا بھی ممکن نہیں تھا نماز بھی باہر آکر پڑھی، دوسرے دن پھر دوسرے ہوٹل میں منتقل ہوئے جو کافی اچھا تھا اور کربلا کے اطراف مختلف زیارت گاہوں کی زیارت کرنے نکلے، حضرت حرؓ کا روضہ حضرت عونؓ و محمدؓ اور حضرت مسلمؓ کے صاحبزادوں کے روضے چھوٹے چھوٹے گاؤں پھٹے حال بچے اور عورتیں جگہ جگہ کھجوروں کے ڈھیر، روضوں کے باہر طرح طرح کی چیزیں بکتی ہوئی..... ان زیارات کے بعد ہوٹل میں آکر تھوڑی دیر آرام کیا۔ نماز ظہر کے بعد پھر کربلا کی مقامی زیارت کو نکلے، مقام علیؓ اکبر مقام علی اصغرؓ یعنی آپ دونوں کے قتل گاہ جس پر چھوٹے چھوٹے کمرے بنا لیے گئے ہیں، گلیوں میں سے ہوکر عین آبادی میں یہ جگہیں ہیں جہاں زائرین کو پہچان کر پیسے مانگنے لگتے ہیں بلکہ چمٹ جاتے ہیں۔ ہاتھوں سے پیسے جھپٹ لیتے ہیں۔ یہیں نہیں گھروں میں کام کرتے کرتے پھٹے حال عورتیں ٹاٹوں کے پردے پکڑ کر جو دروازوں پر لٹکے ہوتے ہیں پیسے مانگتی ہیں۔ بڑا دردناک منظر ہوتا ہے اور ان مناظر کو دیکھ کر جو تکلیف کا احساس ہوتا ہے، وہ زیارت گاہوں پر جو کیفیت ہونی چاہیے وہ اسی میں گم ہو جاتی ہیں،

کربلا میں امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے روضے کے قریب ایک مسجد ہے جو امام زمانہ (بارہویں امام) سے منسوب ہے، وہاں نماز مغرب ادا کی۔ وہاں سے زیادہ تر

لوگ باغ امام جعفر صادقؑ دیکھنے چلے گئے۔ ہم میں سے کچھ لوگ پاس میں بہتی علقمہ کے کنارے بیٹھ گئے، شام ہو رہی تھی کربلا کا میدان تھا وہاں صدیقہ بیگم نے اپنی خوبصورت آواز میں نوحہ پڑھا اور میری زبان...... پر بھی بے اختیار نجم آفندی کا نوحہ جو بچپن سے سنتے آئے ہیں آ گیا۔

عاشور کی وہ شام وہ دن بولتا ہے
غم کا وہ کائنات پہ پردہ پڑا ہوا
سر اس طرف حسینؑ کا نیزے پہ جلوہ گر
مغرب میں آفتاب اُدھر ڈوبتا ہوا
تشبیہ لبوں خون کی ندی چڑھی ہوئی
پانی لب فرات سے منہ موڑتا ہوا
تہذیب لاش اصغر ناداں پہ نوحہ گر
انسانیت کا شرم سے چہرہ چھپا ہوا

سب کے آنکھوں میں آنسو تھے اور دل اداس تھا۔ وہاں باقی ساتھیوں کے آنے کے بعد ہم آبادی سے گزرتے ہوئے اس جگہ گئے جہاں امام حسینؑ کے خیام برپا ہوا۔ وہاں بھی عمارت بن گئی ہے اور مختلف جگہیں مختلف لوگوں سے منسوب ہیں جیسے خیمۂ عباسؑ، خیمہ قاسم، وہاں عشاء کی نماز پڑھی۔ پھر ٹیلہ زینبؑ کی زیارت جو بالکل بازار کے بیچ میں ہے جہاں آپ امام حسینؑ کے قتل کے بعد بے قراری میں خیمہ سے باہر نکل آئی تھیں اور قتل گاہ سامنے تھی، ایرانی حکومت نے اس جگہ کو بھی محفوظ کر دیا ہے۔

۲۵/ اکتوبر کو صبح ہی سامرہ جانے کی تیاری تھی۔ کربلا سے بغداد اور بغداد سے سامرہ جو موصل کے راستے میں ہے جہاں امام حسن عسکریؑ اور امام علیؑ الہادی کے مزارات ہیں، اسی عمارت میں ایک تہ خانہ ہے جہاں سے کہا جاتا ہے کہ بارہویں امام غائب ہو گئے تھے، اس زیارت کے بعد میں نے اور حبیبہ بانو نے بازار کا چکر لگایا۔ آئس کریم کھائی، یہ بستی ہندستان، پاکستان، کے قصباتی جگہوں سے بہت مشابہہ تھی مگر یہاں مانگنے والے نہیں تھے۔ لوگ تھے مگر بہت زیادہ نہیں، پانچ بجے وہاں سے واپسی ہوئی، رات کو ڈنر ہماری ٹریول ایجنٹ مسز کی طرف سے تھا، کھانا اچھا تھا..... میزبان بھی کالے لباس میں ڈنر کے لیے موجود تھیں۔ ہوٹل بھی اچھا خاصا تھا۔ کھانے اور قہوہ کے بعد اپنی میزبان سے رخصت ہو کر ہم لوگ ۱۲ بجے رات کو کربلا پہنچے ۲۶/ اکتوبر کی صبح ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا اکیلے ہی روضہ پر جا کر نماز پڑھی جائے اور اطمینان سے زیارت کی جائے۔

باقی آئندہ

گزشتہ نصف صدی میں اسلامی فکر کے ارتقاء کی دستاویز

۳۰ سال سے اسلام کے امن و عالم گیر اخوت کے پیغام کی اشاعت، جدید زمانے اور ذہن کے تقاضوں کے مطابق اسلام کے تعارف، مفاہمت بین المذاہب کے لیے وقف

اسلام اور عصر جدید

اڈیٹر
پروفیسر اختر الواسع

کا خصوصی شمارہ (نمائندہ انتخاب ۱۹۶۹ تا ۱۹۹۹ء)

ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید علی نقی النقوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا تقی امینی، پروفیسر سید حسین نصر، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر سید مقبول احمد، خواجہ حسن ثانی نظامی، مولانا عبدالسلام قدوائی، پروفیسر مشیر الحق، پروفیسر انور صدیقی، کی فکر انگیز تحریروں کے ساتھ

اس شمارے کی قیمت -/50 روپے ...... جریدے کے مکمل اشاریہ کے ساتھ -/70 روپے
سالانہ خریداروں کے لیے مفت

	فی شمارہ	سالانہ	
قیمت اندرون ملک	30 روپے	100 روپے	(عام ڈاک سے)
	50 روپے	180 روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	40 روپے	150 روپے	(عام ڈاک سے)
	55 روپے	200 روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	6 امریکی ڈالر	20 امریکی ڈالر	(عام ڈاک سے)
	12 امریکی ڈالر	40 امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ممالک ...... 1200 روپے ...... (رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش ...... 2000 روپے ...... (رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک ...... 350 امریکی ڈالر ...... (رجسٹرڈ ڈاک سے)

ناشر: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵
رابطہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

جائزے

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔
(صرف مختصر تبصرے ہی جلد شائع ہو سکتے ہیں)

مہاتما بدھ کی حکایتیں

مصنف: پال کاروس
ترجمہ: مسعود فاروقی
مبصر: پروانہ ردولوی
قیمت: ۵۰ اروپے
ناشر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

زیر تبصرہ کتاب Gospel of Buddha کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب عالمی پیمانہ پر عموماً اور بودھ حلقوں میں خصوصاً بہت مقبول ہے کیونکہ اس میں بودھ مذہب اور مہاتما بدھ کی حکایات کو ان کے حقیقی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اسی خوبی کی وجہ سے اسے جاپان اور سری لنکا کے بودھ مندروں اور بودھ اسکولوں کے نصاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ جاپانی، چینی، جرمن، روسی، فرانسیسی، اطالوی، سامی اور مشرق کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے اور یہ تراجم شائع بھی ہو چکے ہیں۔

اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ مسعود فاروقی نے کیا ہے اور اسے مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات کے پبلی کیشنز ڈویژن نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ترجمہ نہایت رواں اور شستہ ہے جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بودھ عقائد کی بنیادی خوبیوں کو ادبی زبان کے لباس میں پیش کیا گیا ہے اور بعض شاعروں کے کلام میں بودھ تعلیمات پر جن گوشوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر استفادہ کیا گیا ہے ان کی وہی اصطلاحات سامنے آگئی ہیں جو اردو شاعری بالخصوص غزل کی شاعری میں نہایت جمیل انداز میں استعمال ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر گوتم بدھ کی یہ تعلیم کہ "اس دنیا میں ہر طرف دکھ ہی دکھ ہیں بلکہ دکھ اور درد ہی کا نام دنیا ہے۔" یا گوتم بدھ کا یہ قول کہ "جتنے بھی عناصر ہیں وہ سب منتشر ہو جائیں گے" یا ان کا یہ پیغام کہ "اے تم جو زندگی کے دیوانے ہو جان لو کہ فنا ہی میں بقاء مضمر

ہے۔" اور ان کی یہ بشارت کہ "سبھی مرکبات پھر سے منتشر ہو جائیں گے۔ یہ تکونی دنیا ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ ہماری شخصیت بکھر جائے گی۔"

ان اقوال ہی کی طرح گوتم بدھ کا یہ قول بھی اردو شاعری میں بار بار استعمال ہوا ہے کہ "خودی کو فنا کرنا ہی نجات ہے، آگہی حاصل کرنے کی شرط خودی کی نیستی ہے" ان کے اس قول نے بھی اردو شاعری کے حسن میں اضافہ کیا ہے کہ "جدھر بھی دیکھو ہر طرف بھاگ دوڑ ہے، جدو جہد ہے، عیش و عشرت کی تلاش، درد اور موت کے تصور سے بھی فرار، مگر ساتھ ہی خواہشات کی آگ بھی سلگتی رہتی ہے۔"

میں یہاں ان تمام اشعار کو نہ پیش کروں گا جو گوتم بدھ کے مذکورہ بالا اقوال، تصورات، نظریات اور خیالات کے پیکروں کی شکل میں اردو شاعری میں بہت آسانی کے ساتھ تلاش کیے جا سکتے ہیں بالخصوص میر، غالب، مومن، ذوق اور بیسویں صدی کے بیشتر صف اول کے شعراء جیسے فانی اصغر، حسرت، جگر، ذوق اور شہر یار وغیرہ کی غزلوں کے اشعار کو ضرب المثل بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قاری خود ہی اس کتاب کو پڑھ کر ان اشعار تک ذہنی رسائی حاصل کر سکتا ہے جو گوتم بدھ کی تعلیمات کے تناظر میں لکھے گئے ہیں مگر ابھی تک تحقیق کے اس پہلو کی زد میں نہیں آئے ہیں جس کی روشنی میں مندرجہ ذیل اشعار کو میں نے پڑھا اور سمجھا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشان ہونا

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اٹھ نہیں سکتا

یہ تنگ نائے دہر نہیں منزل فراغ
غافل نہ پاؤں حرص کے پھیلا سکیڑ تو

نہیں ثبات بلندی عزوشاں کے لیے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لیے

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ وپے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

یہ تمام اشعار گوتم بدھ کی تعلیمات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر مسعود فاروقی کے ترجمہ کی زبان سلیس اور ادبی نہ ہوتی تو مہاتما بدھ کی حکایتیں پڑھنے کا اور ان اشعار کی جانب ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔

مسعود فاروقی کے ساتھ ہی پبلی کیشنز ڈویژن کی بھی تعریف کرنے کا جی چاہتا ہے جس نے اردو کے مذہبی ادب میں ایک انمول اضافہ کیا ہے۔

زاویہ نظر

مصنف: رفعت سروش
مبصر: ڈاکٹر رضیہ حامد
قیمت: ۱۰۰ روپے
پبلیشر: نورنگ کتاب گھر اے ۸۰ سیکٹر ۲۷ نوئیڈا

رفعت سروش اردو ادب کی فعال شخصیت ہیں۔ نظم ہو یا نثر ڈراما ہو یا اوپیرا غزل ہو یا طویل نظم انھوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں نئے نئے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ زاویہ نظر سے پہلے نثر میں ان کی کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں اور اہل ادب وقارئین کی پسندیدگی کے ساتھ ادب میں اضافہ کا باعث بنی ہیں۔

زاویہ نظر رفعت سروش کے مختلف اوقات میں لکھے گئے ۱۴ مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون "حب الوطنی کا استعارہ، حالی" ہے، رفعت سروش نے حالی کی شاعری سے مختلف نظموں اور غزلوں کے اشعار سے ان کی وطن دوستی کو واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

قوم و وطن کی محبت حالی کے دل میں اس طرح بسی ہوئی ہے جیسے فولاد میں جوہر (ص ۷)

"سید ذوالفقار علی بخاری بے مثال براڈ کاسٹر" لکھتے ہوئے رفعت سروش کی تحریر میں سرشاری کی کیفیت در آئی ہے۔ رفعت سروش خود ایک بہترین براڈ کاسٹر رہے ہیں اور سید

ذوالفقار علی بخاری نے بذات خود ان کا انتخاب کیا تھا۔ بخاری صاحب کو براڈ کاسٹنگ میں کمال حاصل تھا وہ آواز بدلنے پر قدرت رکھتے تھے۔

فراق گورکھپوری پر اس کتاب میں دو مضمون شامل ہیں۔ پہلے مضمون فراق کی شخصیت وشاعری پر بات کرتے ہوئے غزل، نظم درباعی سے مثالیں پیش کی ہیں اور فراق کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ دوسرے مضمون میں فراق کی نظم آدھی رات کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

رفعت سروش نے اپنے مضمون درشن کی غزل، میں دہلی کے بزرگ صوفی مہاراج درشن سنگھ کی کتاب متاع نور پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ اور ان کے مسلک حیات ونظریہ شاعری کو متاع نور کے شعروں سے مثالیں دے کر قاری کو ان کی شاعری کے راز ہائے پنہاں سے روشناس کیا ہے۔

'خواجہ احمد فاروقی' پر رفعت سروش کا مضمون ان کی عملی زندگی اردو دوستی، حب الوطنی، دہلی یونیورسٹی کے معمار، نقاد اور بکھرایوں کے خواجہ سے جستہ جستہ ملاقات کراتا ہے۔

الوداع او پندر ناتھ اشک اور رام لال کی یاد میں یہ مضامین رفعت سروش نے اپنے دونوں ہم عصر دوستوں کے انتقال پر قلمبند کیے ہیں اور ان کے ساتھ گزرے ایام کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اختر الایمان پر اس کتاب میں دو مضمون شامل ہیں۔ ایک مضمون یادوں پر مشتمل ہے اور دوسرے مضمون 'ایک لڑکا یتیم خانہ سے ایوان فلم تک، اختر الایمان کی نظم نگاری پر ہے۔

'لالہ' مہیشو ردیال متحدہ کلچر کی علامت، ایک تاثراتی مضمون ہے جس میں دہلی کی گنگا جمنی تہذیب جھلملاتی نظر آتی ہے۔

'' کچھ یادیں راجستھان کی، اور شیش محل کا شہر، مضامین میں رفعت سروش نے وہاں کے مشاعرے، ادبی فضا اور مختلف ادبی شخصیات کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے اور ایک دو جملوں میں پوری شخصیت کا خاکہ کھینچ دیا ہے۔

کتاب کا آخری مضمون 'الیکٹرانک میڈیا' بنتے بگڑتے خدوحال، ہے رفعت سروش کی زندگی کا بیشتر حصہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ریڈیو کے ذریعے اردو شعروادب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان شخصیات کے چند نام بھی لکھے ہیں جو ریڈیو کے اسٹاف میں شامل تھے اور اپنے وقت کے مشہور ادیب وشاعر گردانے جاتے

تھے۔ ریڈیو کی ابتدا پھر ٹیلی ویژن پروگرام اور دوردرشن کے ابتدائی زمانہ کا ذکر ہے۔ آگے چل کر ان پروگراموں میں در آئی برائیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

رفعت سروش کی تحریر اپنے قاری کو باندھے رکھتی ہے۔ ''زاویہ نظر'' سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہونے کے ساتھ اس کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ یہ کتاب ہر لائبریری کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ کتاب خوبصورت مجلد آفسیٹ پر طبع ہوئی ہے۔

مجلس ممنون

مرتب: پروفیسر آفاق احمد
مبصر: محسن بھوپالی
قیمت: ۱۰۰ روپے
ناشر: علامہ اقبال ادبی مرکز، بھوپال

مجلس ممنون، ممنون حسن خاں کی خدمات کے اعتراف میں ان کے ہم عصروں، احباب اور مداحوں کے لکھے گئے ان مضامین، منظوم تاثرات اور تعزیت ناموں کے علاوہ ممنون صاحب کے مضامین، تحریروں اور علامہ اقبال کے ان کے نام یادگار خطوط پر مشتمل ایک اہم مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کو فاضل ادیب ونقاد پروفیسر آفاق احمد صاحب نے بڑی کاوش اور خوش اسلوبی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ حرف آغاز میں اشاعت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

''اقبال کے عاشق صادق ممنون حسن خاں صاحب کی یادوں کو تروتازہ رکھنے اور اقبالیات کے فروغ میں ان کی کاوشوں کا اعتراف کرنے کے لیے مجلس ممنون، آراستہ کی جارہی ہے۔ اس مجلس میں اکثر وبیشتر وہ صاحب دل اور اہل قلم ممنون صاحب کے بارے میں باتیں کرتے نظر آئیں گے جو نہ صرف ممنون صاحب سے بے پناہ محبت کرتے تھے بلکہ برصغیر میں اقبالیات کا اجالا پھیلانے کے لیے ان کی شب وروز کی مصروفیات جن کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں تھیں۔''

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مجموعے میں دیگر اہل قلم کے علاوہ جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر گیان چند، نثار احمد فاروقی اور سید مظفر حسین برنی کے مضامین بھی شامل ہیں جو خصوصی مطالعے کے متقاضی ہیں۔ ان سربرآوردہ اہل قلم نے نہ صرف یہ کہ ممنون حسن خاں کی شخصیت کے مختلف گوشوں، ادبی سرگرمیوں اور اقبالیات کے سلسلے میں ان کی کوششوں پر روشنی ڈالی ہے بلکہ بعض ایسے نکات بھی اٹھائے ہیں جن پر تحقیقی انداز میں سوچنے اور تنقیدی سطح پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

علامہ اقبال کے دوران قیام بھوپال میں ممنون حسن خاں نے ان کی جس تندہی اور عقیدت مندانہ انداز میں خدمات انجام دیں اور اس عظیم شاعر کی قربت سے فیض اٹھایا وہ برصغیر ہندستان کے معدودے چند خوش نصیب افراد کے ہی حصے میں آیا ہوگا جس کا واضح اعتراف وہ خطوط ہیں جو علامہ اقبال نے انھیں لکھے۔ ان خطوط میں ممنون حسن خاں کی شخصیت مکتوب الیہ کے علاوہ ایک معتمد اور راز دار کی صورت میں ابھر کر سامنے آتی ہے اور بقول شاعر:

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ممنون حسن خاں نے اپنی عمر کا طویل حصہ بھوپال کی ادبی فضا کو نکھارنے اور سنوارنے والے اہل علم وفضل ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں گزارا تھا۔ انھوں نے ان میں سے بہت سوں کی اعانت اور پذیرائی بھی کی تھی چنانچہ "مجلس ممنون" میں اختر سعید خاں، عزیز قریشی، دیوی سرن، وغیرہم کی تحریریں ان کے دلوں کی گہرائیوں سے نکل کر کاغذ پر نقش ہوگئی ہیں۔ یہ تحریریں محبت خلوص اور سب سے بڑھ کر اس عقیدت کی آئینہ دار ہیں جو ان حضرات کو پاپا میاں سے تھیں۔ ممنون حسن خاں کے سعادت مند فرزند فتح اللہ خاں کا مضمون میرے پاپا ایک طرح سے سوانحی خاکہ بھی ہے اور تاثراتی مضمون بھی۔ پاپا میاں کے خاندانی پس منظر، ان کی زندگی کے مختلف ادوار، ان کی عادات، رویوں اور آخری سفر کی تفصیلات کی وجہ سے اسے "مجلس ممنون" کا کلیدی مضمون کہا جا سکتا ہے۔ ملکہ نسیم کے انٹرویو سے ہمیں ممنون حسن خاں کے افکار وخیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ عابد اختر کا مرثیہ کرب شاہین، عقیدت مندانہ اظہار، سلاست اور روانی کے باعث رثائی ادب کے مخزن میں ایک اہم اضافہ ہے۔

"مجلس ممنون" میں عنوان حسن خان کی اپنی تحریروں کی شمولیت سے مجموعے کی ادبی اہمیت اور افادیت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ یہ تحریریں اگر ایک طرف اقبال سے متعلق ان کی حد درجہ عقیدت اور بے انتہا انکساری کی ترجمان ہیں تو دوسری طرف اقبالیات کے باب میں تاریخی اور اہم واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

"مجلس ممنون" ممنون حسن خاں کی شخصیت اور خدمات کے بارے میں ان کے ہم عصروں کے تاثرات اور مضامین پر مشتمل ایک اہم کتاب تو ہے ہی لیکن یہ اقبالیات میں ایک طرح سے اضافے کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس امر کی

ضرورت اور بڑھ جاتی ہے کہ ممنون حسن خاں کی زندگی، شخصیت اور علمی وادبی خدمات پر تنقیدی اور تحقیقی بنیاد پر الگ سے ایک مبسوط مقالہ لکھوایا جائے۔ اس خواہش کا اظہار ڈاکٹر گیان چند نے بھی اپنے مقالے بعنوان ''ممنون حسن خاں مدح وقدح کی روشنی میں (مشمولہ ''مجلس ممنون'') میں کیا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے اس قدر اور اضافہ کروں گا کہ یہ کام بھی علامہ اقبال ادبی مرکز کے ذریعے کرایا جائے اور اس مقالے کو شایان شان طریقے سے کتابی صورت میں شائع کرایا جائے۔

دو دی دروازے

انتخاب وترجمہ: منیر الدین احمد
مبصر: ڈاکٹر وسیم بیگم
قیمت: ۱۰۰ روپے
پبلشر: معیار پبلی کیشنز، کے ۳۰۲/۳ تاج انکلیو، دہلی۔ ۳۱

زیر تبصرہ کتاب ''دو دی دروازے'' جرمن شاعر وولفگانگ بیشلر کی نظموں کا ترجمہ ہے۔ جس کو منیر الدین احمد نے ایک اچھے تخلیقی ترجمے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ بیشلر کی ان نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک حقیقت پسند شاعر ہے جس نے پرانی روایتوں کو توڑا اور ان کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران بیشلر کی عمر سترہ سال تھی اور اس نے اس چھوٹی سی عمر میں جرمنی کی طرف سے جنگ میں حصہ لیا جب وہ جنگ سے واپس لوٹا تو اس وقت اس کے جسم کے ساتھ اس کے ذہن میں بھی شکست وریخت واقع ہو چکی تھی۔

اس مجموعے کی زیادہ تر نظمیں بیشلر کی زندگی کے دردناک واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بیشلر نے ان نظموں میں ان حادثوں اور یادوں کو دہرایا ہے جن کو سوچ کر اس کی روح آج بھی کانپ اٹھتی ہے۔ یہ نظمیں زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور حقائق کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں اسی لیے قاری ان نظموں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔

منیر الدین احمد نے ''دو دی دروازے'' میں بیشلر کی چار قسم کی نظموں کو پیش کیا ہے۔ پہلے زمرے میں وہ نظمیں ہیں جس میں بیشلر دوسری جنگ عظیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی وبربادی سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ ان میں ''شب بسری، ۱۹۵۱ء کی راتیں، خانہ جنگی، دھرتی ابھی تک لرز رہی ہے'' اہم نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔ دوسری طرح کی نظمیں وہ ہیں جس میں بیشلر نے اپنے معاشرے میں ہونے والی برائیوں پر سخت تنقید کی ہے۔ اس میں ''پل لفٹ، ممانعت، قبرستان گمشندہ بیٹا'' وغیرہ خاص نظمیں ہیں۔

یا ان کو وہ چیز بھی نصیب نہیں آئی
جو ان کے ماں باپ کو ملی تھی
ایک قبر، ایک پتھر
[illegible] پہ ایک ستارہ
گھاس پات اور پھولوں کی ایک کیاری
جن کی زیارت کو اب صرف بھیڑیں آتی ہیں "قبرستان"

تیسری قسم کی نظمیں وہ ہیں جس میں شاعر نے عورت کو ایک ساتھی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ایسا ساتھی جو اس کے غم و مسرت میں برابر کا شریک ہے۔ اس میں دو بدلیاں، خاوند کے نام، اس قدر دور، دیوی، دریا، جھٹپٹے میں قابل داد اور لایق دید نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔

اس کے بعد وہ نظمیں آتی ہیں جس میں ہیشلر قدرتی مناظر اور فطرت سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے یا پھر اپنے آپ کو اس دنیا میں بالکل اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں "مرڈے، جھیل، شاخیں، پت جھڑ، ڈپریشن، اہم کہی جا سکتی ہیں۔

منیر الدین احمد نے ہیشلر کی نظموں کا بڑی ہنرمندی سے ترجمہ کیا ہے انھوں نے ہندی اور انگریزی کے الفاظ کو بے تکلف استعمال کیا ہے۔ اس پر بھی کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ قاری کو کھٹکتے ہیں جیسے ویک اینڈ، ڈپریشن، ٹیرلیس وغیرہ اس کے علاوہ چند نظموں کے عنوانات غیر دلچسپ ہیں اور کانوں کو بھلے معلوم نہیں ہوتے جیسے "مسدودا کھاڑ، مردے" روتھ وغیرہ۔

منیر الدین احمد اپنے ان نظموں کے ترجمے میں کامیاب تو نظر آتے ہیں لیکن قاری کوئی فیصلہ اس لیے نہیں کر سکتا کہ اس کے سامنے ہیشلر کی اپنی نظمیں موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس مجموعے کی ابتدا میں نظموں کی کوئی فہرست نہیں دی جس سے پڑھنے والے کو مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان نظموں کے ذریعے ہمیں جرمن شاعری کے کچھ رجحانات کا بھی پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی اردو ادب جرمن لٹریچر کے نئے موضوعات اور نئے میلانات سے بھی روشناس ہوتا ہے منیر الدین احمد کا ہیشلر کی نظموں کا یہ انتخاب و ترجمہ قابل ستائش ہے۔

رنگ وبو کی سرزمین

مصنف: شام بارک پوری
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۴۰ روپے
ناشر: لیکچر پیلس کھلنا (بنگلہ دیش)

"رنگ وبو کی سرزمین" شام بارک پوری کا سفر نامہ ہے۔ اس کو کلچرل اکیڈمی اقبال روڈ نے ڈھاکہ سے شائع کیا ہے۔ رنگ وبو کی سرزمین کو "بنگلہ دیش کی سرزمین میں اردو کا پہلا سفر نامہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ شام بارک پوری اردو کی لگ بھگ ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں جن میں افسانے، ناول ناولٹ، سفر نامے اور مضامین کے مجموعے وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح وہ اردو کے معتبر اہل قلم ہیں اور اپنا ایک مقام حاصل کر چکے ہیں۔ سفر ان کا شعار ہے۔ انور سدید صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ ہر وقت سفر میں رہتے ہیں، کبھی گھر آتے ہیں تو بستر نہیں کھولتے کہ خدا جانے کب سفر کی صدا پر جانا پڑے"

اس طرح انھیں اگر بنگلہ دیش کا ابن بطوطہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ "رنگ وبو کی سرزمین" ان کے تھائی لینڈ، ملیشیا اور سنگاپور کے سفر کی داستان ہے۔ جس میں انھوں نے گھر بیٹھے ان مقامات کی سیر کرائی ہے۔ ان کی نظر حالات اور مقامات کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لے کر بڑی بڑی اشیا بھی پر رہتی ہے اور یہ سفر نامہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری شام بارک پوری کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ اس پر ان کا انداز تحریر اتنا دلچسپ اور دل نشین ہے کہ کتاب کا کوئی صفحہ کہیں سے پڑھنا شروع کر دیں تو پوری کتاب پڑھے بغیر چین نہ آئے۔ زبان کی لطافت صفائی اور برجستگی نے بعض جگہ منظر نگاری کے ایسے مرقع تیار کر دیے ہیں کہ کتاب اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ حسن ومحبت کے بعض عجیب واقعات نے کتاب کو اور بھی زیادہ لطف انگیز بنا دیا ہے۔ غرض رنگ وبو کی سرزمین سے ہمیں شام بارک پوری کی مہارت علیہ۔ ادبی ذوق پاکیزہ مذاق اور انسانی دردمندی کا علم ہوتا ہے۔ امید ہے ان کا یہ علمی وادبی سفر ان کے ملکی وغیر ملکی سفر کی طرح جاری رہے گا۔ سرورق کے آخری صفحہ پر مصنف کی خوبصورت تصویر ہے اور صفحہ اول کو ان ممالک کی کچھ تہذیبی تصویروں سے سجایا گیا ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ اردو کے سفر ناموں میں اضافی حیثیت رکھتا ہے۔

میر ناصر علی حیات وادبی خدمات

مصنف: ڈاکٹر عبدالستار
مبصر: کوثر مظہری قیمت: ۲۰۰ روپے
رابطہ: ۲۰۱۶، گلی قاسم جان، لال کنواں، دہلی۔۶

ڈاکٹر عبدالستار نے میر ناصر علی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا تھا جس میں قطع و برید کرنے کے بعد اب کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس مقالے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ نثر کے میدان میں کام کرنے والے کم ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار نے بڑی ہی جانفشانی اور تحقیقی بصیرت کے ساتھ میر ناصر علی کی زندگی اور ان کے کارناموں کو اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ ابتدائیہ اور اختتامیہ کے علاوہ اس میں چھ ابواب ہیں جو اس طرح ہیں۔

باب (اول): حیات وشخصیت خان بہادر، میر ناصر علی، باب دوم: میر ناصر علی کی ادبی زندگی باب سوم: میر ناصر علی کی مضمون نگاری، باب چہارم: میر ناصر علی کی انشائیہ نگاری، باب پنجم: میر ناصر علی کی صحافت نگاری، باب ششم: میر ناصر علی کا اسلوب بیان۔

ڈاکٹر عبدالستار نے ابتدائیہ میں لکھا ہے:

''اس کتاب میں ان کی شخصیت اور ادب کے ان گوشوں کو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تعلق سرسید تحریک کے ادبی مقاصد کے خلاف ابھر کر سامنے آنے والے ایک نئے اور پراثر ادبی میلان سے ہے جسے اصطلاح میں عام طور پر ادب لطیف کہا جاتا ہے۔ اس ادبی میلان کی ترجمانی تاریخی اعتبار سے سب سے پہلے میر ناصر علی ہی کے ہاں ہوئی۔'' (ص ۱۱)

ڈاکٹر عبدالستار نے ''ادب لطیف'' کے تعلق سے بڑا اہم انکشاف کیا ہے۔ میر ناصر علی کا زمانہ غالب کے عہد سے لے کر بیسویں صدی کی دوسری دہائی کو محیط ہے اور یہ عہد کئی اعتبار سے بالخصوص تاریخی وتہذیبی علمی وادبی کارناموں اور تبدیلیوں نیز تجربات نو کا عہد تھا۔ ڈاکٹر عبدالستار نے میر ناصر علی کی شخصیت اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس صدی کی دہلوی تہذیب اور روایات کی بازیافت کی ہے۔

اس کتاب کی قدر و قیمت اس اعتبار سے بہت ہوگی کہ میر ناصر علی کی تحریروں اور ان کے افکار میں سرسید تحریک کی نفی کے عناصر موجود ہیں۔ مثالوں سے ڈاکٹر عبدالستار نے دونوں نمایندہ شخصیتوں سرسید اور میر ناصر علی کی تحریروں اور تحریکوں پر روشنی ڈالی ہے اور معروضی نکتہ نظر سے جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ایسے ماحول میں میر ناصر علی (اور دیگر رومانی ادیبوں) نے اپنی کاوشوں سے ادب کو اس کی ایک اہم خصوصیت (یعنی لطف وانبساط پیدا کرنا) کو قایم کیا۔ گویا رومانوی تحریک ایک طرح علی گڑھ تحریک کا ایک رد عمل تھی۔ (ص ۲۲۹)

نام کتاب	**آصف علی اور ارونا آصف علی**
مصنف	خلیق انجم
اشاعت .	۱۹۹۹ء
قیمت .	۳۵۰روپے
ناشر :	انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار .	محمد عارف خاں

بیرسٹر آصف علی اور ارونا آصف علی اُن مجاہدینِ آزادی میں سے ہیں جن کی جدو جہد آزادی میں عظیم قربانیاں ہیں۔ آصف علی تحریکِ آزادی کے اُن رہنماؤں میں سے ہیں جنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے ساتھ آزادی کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اپنا سب کچھ ملک اور قوم پر نچھاور کر دیا۔ اسی طرح محترمہ ارونا آصف علی نے ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑو تحریک" میں جو اہم ترین رول ادا کیا تھا وہ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کی تاریخ کا اہم ترین حصہ ہے۔ اسی لیے گاندھی جی انھیں "ہندوستان چھوڑو تحریک" کی ہیروئن کہا کرتے تھے۔ لیکن اتنی عظیم جدو جہد اور قربانیوں کے باوجود آزادی کے ان جیالے سورماؤں سے آج شاید بہتوں کو واقفیت نہ ہو کہ آصف علی کون تھے اور ان کی کیا خدمات تھیں؟ ارونا کون تھیں اور اُن کے کارنامے کیا تھے؟ یہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے جیسا کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کتاب کے "حرفِ آغاز" میں بتایا ہے کہ دہلی کے نہرو میوزیم لائبریری میں اگر مجاہدینِ آزادی پر مواد تلاش کیا جائے تو مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور اندرا گاندھی وغیرہ پر بے شمار کتابیں مل جائیں گی لیکن آصف علی پر صرف دو کتابیں ملیں گی۔ ایک تو آصف علی کی لکھی ہوئی اپنی کتاب Memoirs اور دوسری چونسٹھ صفحات پر مشتمل سد ھیر پنت کی کتاب Asaf Ali, Patriot and Humanist۔ اس لحاظ سے اتنے عظیم مجاہد آزادی کا جس نے اپنے آپ کو ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور اس کے لیے ہر ممکن قربانی دی، ہم نے کوئی حق ادا نہیں کیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم قابلِ صد آفریں ہیں کہ انھوں نے ایک ایسی عظیم شخصیت کے تمام پہلوؤں سے نئی نسل کو واقف کرانے کی کوشش کی جنھیں لوگ فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں آصف علی کی سوانح اور خاندانی کوائف کے علاوہ اُن کی سیاسی زندگی اور خلافت تحریک کے حوالے سے بہت جامع اور معلومات افزا بحث کی گئی ہے اور ان کی پہلو دار شخصیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے وہ یہ کہ آصف علی نے بہت شستہ غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ رباعیاں بھی لکھی ہیں اور ترجمے بھی کیے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے "آصف علی بحیثیت ادیب و شاعر" کے موضوع پر جس شرح و بسط کے ساتھ روشنی

ڈالی ہے، وہ بہت قابلِ قدر ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم اردو کے ممتاز اور صفِ اوّل کے محقق اور ادیب ہیں۔ اب تک ان کی پچاس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کے اصل موضوعات غالبؔ اور دہلی ہیں۔ غالبؔ پر ان کی سات آٹھ کتابیں ہیں جن میں "غالبؔ کے خطوط" (چار جلدوں میں) اردو کا مثالی اور قابلِ تقلید کارنامہ ہے جس کی زبردست پذیرائی ہوئی اور غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ غالبیات میں ڈاکٹر انجم نے اب تک [illegible] کیے تھے وہ بھی ان کی سرخروئی و سرفرازی کے لیے کافی تھے لیکن اس کارنامے نے انھیں غالب شناسوں کی صفِ اوّل تک پہنچا دیا ہے۔ ڈاکٹر انجم کا دوسرا موضوع دہلی ہے۔ جب وہ دہلی اردو اکادمی کی اشاعتی کمیٹی کے چیئرمین تھے تو دو سال کی مدت میں دہلی کے موضوع پر انھوں نے تقریباً پندرہ کتابیں مرتب کرا کے شائع کیں۔ دہلی کے موضوع پر خود ان کی کئی کتابیں ہیں لیکن سب سے اہم اور معرکۃ الآرا کام سرسید احمد خاں کی "آثار الصنادید" ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے غیر معمولی محنت اور دیدہ ریزی سے اس کتاب کو مرتب کیا اور اس کے حواشی اور تعلیقات لکھ کر تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ دہلی کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں اب تک جتنی کتابیں ہیں ان میں سب سے اہم کتاب یہی "آثار الصنادید" ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "آصف علی اور ارونا آصف علی" کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کی ہندوستان کی سیاست اور جنگِ آزادی کے واقعات پر ڈاکٹر خلیق انجم کی کتنی گہری نظر ہے۔ انھوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ تحریکِ آزادی کے دو اہم ستون آصف علی اور ارونا آصف علی کی شخصیت اور خدمات پر ایک جامع اور مبسوط کتاب لکھ کر تاریخ کے ایک اہم باب کو محفوظ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم واقعی ایسے لوگوں میں سے ہیں جو بزرگوں اور اسلاف کے کارناموں کو اجاگر کرتے رہے ہیں اور ان کا ایک ہی مشن اور غرض و غایت ہے کہ سیکولرازم، قومی یک جہتی اور انسانیت نوازی فروغ پائیں اور اسی کی ایک کڑی ہے پرانی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کی بقا اور قیام۔ وہ اپنے اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم جیسی فعال اور متحرک شخصیت سے یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ وہ تحریکِ آزادی کی اُن گمنام ہستیوں کے کارناموں سے بھی روشناس کرائیں گے جنھیں ہم میں سے اکثر نے فراموش کر دیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کھلے خطوط

غالب کے شعر کی صحیح قرأت

غالب ہی کے نہیں بلکہ کسی بھی شاعر کے شعر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے اس کی صحیح قرأت پر غور کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ شرح نگار ایسے اندھیروں میں بھٹکتا ہے کہ پھر اُس کے لیے صحیح مفہوم کی تلاش بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔ "کتاب نما" اگست ۱۹۹۹ء میں انوار رضوی صاحب بھی ایسی ہی غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ انھوں نے دیوانِ غالب کے نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ مطبع نظامی کانپور (۱۸۶۲ء) سے لے کر دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام (۱۹۷۹ء) تک متعدد نسخوں کی چھان پھٹک کرنے کے باوجود شعر کی قرأت غلط کی ہے اور اس کا مفہوم تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ شعر کی جو قرأت انھوں نے تحریر کی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

اس قرأت سے غالب کے شعر میں تین نقص پیدا ہوگئے ہیں۔ پہلا نقص ہے "تنگِ بال و پر" دوسرا ہے "یہ" اور تیسرا بڑا نقص ہے "زندگی ہو گر"۔ ایسی حالت میں شعر کا مفہوم تلاش کرنا بھی بے معنی ثابت ہوا اور نثار احمد فاروقی صاحب کو اس کا خلاصہ کرنا پڑا لیکن تکمیل ان کے خلاصے سے بھی نہیں ہو سکی۔ فاروقی صاحب نے دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام میں جو قرأت غالب کے شعر کی تحریر کی گئی ہے، اسے صحیح مانا ہے۔ وہ قرأت کچھ اس طرح ہے۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر یہ ہے کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے
(کتاب نما ستمبر ۱۹۹۹ء)

اس قرأت کے مطابق فاروقی صاحب نے شعر کا مفہوم کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ "غالب نے "بیضہ آسا" کی تشبیہ کنجِ قفس کے لیے استعمال کی ہے۔ چوزہ جب تک انڈے کے اندر بند ہوتا ہے (اگر چوزہ زندہ ہوتا ہے) اُس کے بال و پر کام نہیں آتے۔ وہ اڑنا تو کیا پھڑ پھڑا بھی نہیں سکتا جب وہ انڈے کی تنگ فضا سے نکل کر باہر کی دنیا میں آتا ہے تو اسے گویا نئی زندگی ملتی ہے جو بیضے کے اندر والی زندگی سے مختلف ہوتی ہے اور اب اس کے بال و پر کو بھی کشادگی نصیب ہوتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ ہم قفس میں ایسے پڑے ہیں جیسے ایک چوزہ انڈے کے اندر ہوتا ہے۔ یہاں بال و پر کے کھلنے کی کوئی گنجائش نہیں اگر ہم رہا ہو جائیں تو گویا نئی زندگی مل جائے گی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ فاروقی

صاحب نے بڑی حد تک غالب کے شعر کو
سمجھنے اور اس کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش
کی ہے لیکن قرأت میں اب بھی بال سے
باریک خامی رہ گئی ہے۔ یہ خامی دیوان
غالب کامل نسخہ گپتا رضا [illegible] کر دور ہو جاتی
ہے۔ اس میں شعر کی قرأت اس طرح درج
ہے (ص۔۲۴۱)

بیضہ آسا، ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے

مالک رام نے جو شعر کی قرأت لکھی
ہے وہ تین ٹکڑوں میں ہے جبکہ کالی داس گپتا
رضا کی تحریر کردہ قرأت چار ٹکڑوں میں ہے
اور یہی سب سے زیادہ معتبر ہے۔ بیضہ آسا
کے بعد (،) نہایت ضروری ہے جو مالک
رام کی قرأت میں نہیں ہے۔

اب شعر کے مفہوم پر اگر غور کریں تو
نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اس شعر میں غالب
نے ''از سرِ نو'' کہہ کر زبردست معنویت پیدا
کر دی ہے اور ''گر رہا ہو جایئے'' نے اس
معنویت کو تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ غالب
کے کئی اشعار ایسے ہیں جن میں ''گر'' ''اگر''
اور ''وگرنہ'' نے شعر میں وہ معنی پیدا کر دیے
ہیں کہ ان کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔
فاروقی صاحب نے جو شرح بیان کی ہے اس
میں چوزے کی زندگی پر زور دیا گیا ہے جو
مفہوم کی معنویت پر اثر انداز ہوا ہے۔

شعر کا اصل مفہوم یہ ہے کہ بیضہ آسا
یعنی انڈے کی مانند کنج قفس اس قدر تنگ
ہے کہ میرے بال و پر سمٹ کر رہ گئے ہیں
اس سے پہلے میرا عالم یہ تھا کہ میں زمین
و آسمان ایک کیے رہتا تھا۔ ایسی میری پرواز
تھی۔ لیکن جب سے قید ہوا ہوں کنج قفس
نے انڈے کی طرح میرے بال و پر سمیٹ
دیے ہیں۔ میری زندگی کی از سرِ نو شروعات
ہو سکتی ہے اگر میں اس کنج قفس سے رہا
ہو جاؤں لیکن غالب نے ''گر رہا ہو جایئے''
کہہ کر رہائی کے امکانات کو اُدھر میں لٹکتا
چھوڑ دیا ہے یعنی یہ رہائی ممکن بھی ہے اور
نہیں بھی۔ زیادہ تر امکان یہی ہے کہ اب
رہائی ہونے کی نہیں ہے۔ رہائی کے امکان کو
خارج کرنے والا خیال غالب نے اپنے
ایک اور شعر میں بھی بیان کیا ہے۔ وہ شعر
ملاحظہ ہو۔

قید حیات و بند غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی ، غم سے نجات پائے کیوں؟

دراصل فاروقی صاحب نے ''از سر
نو'' پر دھیان ہی نہیں دیا۔ چوزے کی زندگی
دوبارہ شروع نہیں ہوتی جبکہ غالب نے
اپنے شعر میں زندگی کے از سرِ نو شروع
ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور پھر یہ اشارہ
بھی کر دیا ہے'' گر رہا ہو جایئے۔ حالانکہ
ایسے آثار اب نظر نہیں آ رہے ہیں۔ غالب
نے اس کا خلاصہ اپنے دوسرے شعر میں
صاف طور پر کر دیا ہے کہ قید حیات میں

نجات ممکن ہی نہیں ہے اس میں رہائی تو مر کر ہی ملتی ہے۔

فاروقی صاحب نے بعض دوسرے اشعار پر بھی غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب کی تمام شرحیں پڑھنے کے بعد چھان پھٹک کر "تفہیم غالب" میں غالب کے مخصوص ۱۳۹ اشعار پر بحث کی ہے۔ اس کے مطالعہ کے دوران خادم نے ان میں سے ۵۰ اشعار ایسے پائے جن پر مزید لکھا جا سکتا تھا۔ وہ کام میں نے کیا ہے۔ ان میں سے چند اشعار کی بحث میں خاص طور سے پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ غالب کے اشعار کو سمجھنا کس قدر مشکل ہے اور بڑے بڑے علم وادب کے شناور اسے سمجھنے میں کس طرح چوک جاتے ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

اس شعر میں غالب کی انا پرستی کا مظاہرہ بالکل صاف ہے لیکن اس تیور کا بیان کم ہی ہوا ہے، زیادہ تر شرح نگاروں نے غالب کی بے بسی اور محرومی کا ذکر کیا ہے جو غالب کی تخلیق کے ساتھ ناانصافی ہے۔ مثال کے طور پر اب تک اس شعر کی شرح نظم طباطبائی، حسرت موہانی، بیخود دہلوی، مولانا حالی، یوسف سلیم چشتی اور شمس الرحمٰن فاروقی تک نے کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ مجھ پر لعنت ہے کہ میں پتھر نہیں ہوں، اگر ہوتا تو تیرے در پر دائم پڑا رہنے کی سعادت نصیب ہو سکتی تھی۔

زرا سوچئے انسان کی عظمت کو جاننے سمجھنے اور اُس پر ناز کرنے والا غالب جیسا شاعر کیا اس قدر بے بس اور بے غیرت ہو سکتا ہے کہ وہ خود پر لعنت بھیجنے لگے اور ایک معمولی راہ کے پتھر کی زندگی قبول کرنے کے لیے بیقرار ہو اُٹھے؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ایک بے حس وحرکت پتھر کو خود سے زیادہ اہمیت غالب دے ہی نہیں سکتا۔ اس طرح کی شرح لکھنے والوں نے دراصل غالب کے تیور پر غور نہیں کیا۔ نہ ہی شعر کی قرأت پر دھیان دیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے "تفہیم غالب" میں بیخود موہانی کی پیروی کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "میرے زندگی جو انسانی ہونے کے باعث کم دوام رکھتی ہے کس قابل ہے؟ کاش میں پتھر ہوتا تو مجھے تیرے در پر سینکڑوں سال پڑے رہنے کی سعادت نصیب ہوتی۔" اس کی مثال یوں دی گئی ہے کہ سنگی مجسمے ہزاروں سال نہیں تو سینکڑوں برس قائم رہتے ہیں۔ غور وفکر کی بات یہ ہے کہ غالب زندگی پرست تھا، مجسموں میں زندگی نہیں ہوتی وہ تو بے حس

وحرکت ہوتے ہیں ۔ اُن کی طرفداری غالب نہیں کر سکتا۔

دراصل اس شعر میں "دائم" اور "پتھر" کے الفاظ نے ہر ایک شرح نگار کو خاصا پریشان کیا ہے۔ اس شعر کی شرح غالب کے مزاج اور تیور کے مطابق [illegible] ہوگی "اے میرے محبوب تو نے مجھے آخر کیا سمجھ رکھا ہے؟ میں انسان ہوں، کوئی پتھر نہیں ہوں جو تیرے در پر دائم پڑا رہوں۔ میں اُس پتھر کی زندگی پر لعنت بھیجتا ہوں جو بے حس وحرکت کسی مجبور و بے بس کی طرح تیرے در پر پڑا ہوا ہے اور ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ میں مجبور و بے بس نہیں ہوں میری زندگی ایک آزاد انسان کی زندگی ہے جو اپنی مرضی سے کہیں بھی آجا سکتا ہے۔ اے میرے محبوب! تجھ سے عشق کرنے کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ ایک پتھر کی طرح دائم ترے قدموں میں پڑا رہوں اور تو مجھے ٹھوکریں مارتا رہے انسان کی زندگی عزووقار اور ایک پتھر کی بے بسی کی معنویت کا یہ بے مثال شعر غالبؔ کا ایک ایسا شاہکار ہے جسے سمجھنے کے لیے غالب کے مزاج، تیور، دل و دماغ کو سمجھنا نہایت ضروری ہے ورنہ اس راہ سے گزرنے میں شرح نگار کی عقل پر پتھر پڑنے میں دیر نہیں لگتی ہے۔

غالبؔ کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

بظاہر شعر بہت سادہ اور آسان نظر آتا ہے لیکن اس کا مفہوم اتنا آسان نہیں ہے کہ جلد سمجھ میں آجائے۔ شعر کی شروعات "پھر" سے ہوئی ہے۔ "پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا" یہ دیدۂ تر دوبارہ کیوں یاد آیا، اس کی وجہ دوسرے مصرعے میں دی گئی ہے اس لیے کہ دل جگر تشنۂ فریاد آیا ہے۔ اب شعر کی شرح پر غور کریں، وہ دل جو" جگر تشنہ" تھا یعنی وہ دل جو جگر کا لہو پیتا رہتا تھا اب فریاد کرنے لگا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جگر میں جتنا لہو تھا وہ سب اب ختم ہو چکا ہے پیاسا دل وہ تمام لہو پی چکا ہے اور اب بھی پیاسا ہے۔ اب بھی اس کی طلب برقرار ہے۔ اب اس کی تشنگی بجھانے کی ایک ہی صورت ہے کہ دیدۂ تر سے اس کو سیراب کیا جائے اس لیے شاعر دیدۂ تر کو یاد کر رہا ہے۔ یعنی جگر کا لہو ختم ہو چکنے کے بعد اس کے پاس آنسو رہ گئے ہیں جن سے دل کی پیاس بجھائی جا سکتی ہے۔

غالبؔ کا ایک اور ایسا ہی شعر ملاحظہ ہو۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

غالبؔ اپنے شعر میں جو بھی لفظ استعمال کرتا ہے اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ بھرتی کے الفاظ غالبؔ کے اشعار میں بالکل بھی نہیں ملتے ہیں۔ زیرِ بحث شعر میں غالب نے "پیالہ و ساغر" باندھا ہے۔ سوال

یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پیالہ کہہ دیا تو ساغر کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ دونوں کے معنی عام طور پر ایک ہی ہیں لیکن غالب نے اس میں ایک خاص بات پیدا کی ہے۔

اس شعر کی خوبی "پیالہ وساغر" ہی میں ہے۔ اس کے لیے ان دونوں الفاظ کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ دراصل پیالہ سے یہاں مراد کی وہ عام پیالہ ہے جس کا استعمال گھر گھر میں عام طور پر کیا جاتا ہے، اس میں کوئی بھی چیز رکھی جا سکتی ہے۔ جبکہ ساغر سے مراد وہ مخصوص پیالہ ہے جس میں شراب بھر کر پی جاتی ہے۔ عام پیالے کو کبھی ساغر نہیں کہا جاتا۔ اس میں غالب کی دانشوری چھپی ہوئی ہے، لفظ کے مفہوم کی وضاحت چھپی ہوئی ہے جس کا بیان اب تک کسی شرح نگار نے نہیں کیا۔

غالب کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ جو بظاہر سادہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں بھی بڑی تہداری ہے شعر ہے۔

جاناپڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ تری رہگزر کو میں

اس شعر کی شرح لکھنے والوں نے اسے محض عاشق و معشوق کے مضمون کی حد تک ہی سوچا ہے۔ غالب کی وسعت و عظمت کا خیال کسی کو نہیں آیا۔ آیئے عاشق و معشوق کے دائرے سے ذرا باہر نکل کر اسے ذرا وسیع پیمانے پر سوچیں۔

اس میں ایک نیا نکتہ یہ نکل سکتا ہے کہ اے خدا جب سے تری گلی سے میں آشنا ہوا ہوں اور یہاں مرا آنا جانا ہوا ہے میں نے تیرے راز و نیاز کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ اب بھی سب باتیں سمجھانے کے لیے مجھے اُن لوگوں کے در پر بار بار جانا پڑ رہا ہے جو تجھے مانتے نہیں ہیں اور تیرے راز و نیاز سے بے خبر ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب میں گناہ اور ثواب کے بارے میں امتیاز کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ اب جبکہ یہ سب جان چکا ہوں اور خدا پرست بن چکا ہوں میں بار بار اُس در پر جاتا ہوں جہاں میرا رقیب یعنی شیطان موجود ہے اس لیے کہ مجھے گناہ میں لذّت کا احساس ہونے لگا ہے۔ اس شعر میں جو تضاد ہے وہی شعر کا اصل حُسن ہے۔ ایسا حُسن غالب کی شاعری میں جا بہ جا جلوہ افروز ہے۔

غالب کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

اس کی شرح بیخود موہانی اور شمس الرحمٰن فاروقی نے آدھی ادھوری ہی بیان کی ہے۔ دراصل یہ حضرات "صنم پرستوں" اور "بتون کے معنی ڈھونڈنے ہی میں رہ گئے۔ غالب کی ذہانت اس بات کی ہمیشہ قائل رہی ہے کہ جہاں کہیں بھی ایک ہی معنی کے دو لفظ

اس نے استعمال کیے ہیں انھیں الگ الگ معنی ضرور دے دیے ہیں۔ اس شعر میں بھی "صنم" کے معنی محبوب سے لیے ہیں جبکہ "بت" سے غالب کی مراد پتھر کی مورت ہے
اب اگر شرح پر غور کریں تو غالب کہتا ہے اے میرے محبوب تو ہی بتا کہ تیرے چاہنے والوں کا گزارا اس حالت میں کیونکر ہوسکتا ہے جبکہ تو نے بتوں کی خو اپنالی ہے، پتھر کی مورت کی طرح خموشی اختیار کر لی ہے۔ تجھ پر اپنے محبوب کے چاہنے والوں کی آہ وزاری کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا ہے۔ عشق کا مزہ تو تب ہی ہے جب دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔ ورنہ اپنے محبوب کے چاہنے والوں کا گزارا اس دنیا میں مشکل ہو جائے گا۔ دراصل غالب کے اشعار میں اتنی تہداری ہے کہ یہ کہنا ہی پڑتا ہے۔
شعر میرا ہے برنگ گل صدا برگ چمن
دیکھنے والے نے ہر لطفِ نظر سے دیکھا

☆ابراہیم اشک، ۲۳۷، جے نواس شانتی نگر، کرلا ویسٹ، ممبئی، ۷

. . .

غالب کا ایک شعر قرأت اور مفہوم

"کتاب نما" ماہ اکتوبر پیش نظر ہے بہ عنوان "کھلے خطوط" صفحہ ۹۵ پر جناب وصی محمد ایڈوکیٹ ساکن میرٹھ نظر نواز ہوا۔ غالب کے ایک شعر کی قرأت پر بحث یا حجت واہ سبحان اللہ، وصی محمد صاحب کی غالب شناسی لائق تحسین، اچھی کوشش ہے۔ میں ان کی تلاش اور بحث سے اتفاق کرتا ہوں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ان کی بالغ نظری کی داد دینا اہل علم کے لیے مناسب اور ہر دانش جو کے لیے لازم ہے بلکہ واجب! بہت عمدہ اور باوضاحت بحث ہے مگر شعر کا مفہوم بیان کرنے میں یا شرح کرنے میں موصوف بُری طرح ناکام رہے۔ غالب یا کسی بھی عظیم اور اعلا مرتبت یا کلاسک شاعر کا شعر درست پڑھنا الگ بات ہے اور شعر کا مطلب سمجھنا یا شرح لکھنا بالکل الگ چیز ہے شعر فہمی ایک خدا داد صلاحیت بھی ہے اور اس کے لیے فہم وادراک کی بھی ضرورت ہے۔ ذہن کا رسا اور فکر میں بلندی ہونا چاہیے نیز علم لغات، قواعد، عروض و بلاغت میں عبور، تاریخ سے واقفیت اور حالات پر گہری نظر بھی ہونا چاہیے۔
بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایے
کنج قفس تو انڈے کی طرح ہے جو میرے بال و پر کے لیے باعث شرم ہے۔ اگر یہاں سے آزاد ہو جاؤں تو جس طرح انڈے سے بچہ سے نکل کر نئی زندگی شروع کرتا ہے اسی طرح میں بھی از سرِ نو زندگی کا آغاز کروں۔ (وصی محمد صاحب)
یہ بڑی مُہملِ تشریح۔ پیدا تو ہو چکے

اب کس سے آزادی چاہتے ہو زندگی سے،
پھر تو خودکشی لازم، آدمی کو مرغ کے چوزہ
سے مشابہ کرنا اچھی بات نہیں۔ کم وبیش اسی
طرح کچھ دوسرے شارح بھی بات کرتے
ہیں مثلاً باقر، یوسف سلیم، اور حسرت وغیرہ۔

میرے خیال میں یہ شعر غالب نے
دار فانی سے دار بقا کی طرف متوجہ کرنے
کے لیے کہا ہے۔ چونکہ انسان کی زندگی دو
ہیں اور دنیا بھی دو ہیں۔ ایک زندگی اس بے
ثبات اور فانی دنیا کی، اور ایک ہمیشگی اور دوام
والی عقبا کی زندگی، جس کی ابتدا و آغاز بعد
از مرگ ہوگی! غالب نے آسمان کو زمین پر
جھکا دیکھا جیسا پیالہ ڈھکا ہوا ہے تو اس دنیا کو
بیضا آسا بتایا، یعنی دنیا انڈے کی مانند ہے
بے جان انڈے سے چوزہ برآمد ہوتا ہے
اسی طرح بے جان زمین سے انواع واقسام
کے انعام اور نباتات کا وجود ہوتا ہے۔ خود
انسان کی خاکی جزو خاک ہے۔ غالب کہتا
ہے میں خلیفۃ الارض ہوں، زمین وآسمان
میرے لیے اور میں مجبور، بے کس، بے نوا
مشکلات میں گھرا، بے بس، کیوں حرص
وہوس کی زندگی نفسانی خواہشات میں
گرفتار، انا پسندی، اور تن آسانی میں مبتلا۔
اگر میں طمع، نفس اور انا پسندی سے آزادی
حاصل کرلوں، عبدیت اور اطاعت کی زندگی
اختیار کرلوں تو وہ ایک دوسری زندگی ہوگی،
از سرِ نو زندگی ہوگی اور وہی بہتر، افضل اور
اعلا ہوگی، اور وہ دوسری زندگی بھی آسان
وخوش کن ہوگی!

مختصراً یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر
تو اس دنیا کے خول میں بند رہا۔ بیضا کا چوزہ
یا کنویں کا میڈک بنا رہے گا تو یہ انسان اور
انسانیت کا شرف نہیں بلکہ شرم اور ذلت ہے
ہاں اگر نفس کے حصار سے باہر آتا اور
عیش کو چھوڑ کر آزادی حاصل کرلی تو یہ ایک
دوسری زندگی کی ابتدا اور آغاز ہوگا۔ یہ
روحانی زندگی اتقا اور ارتقا کی باعث ہوگی۔
اس زندگی اور اس دنیا کی حد بے حساب
وسعت ورفعت بے اندازہ اور درجہ، کمال پر
ہوگی۔ یہ آدمیت کا شرف ہوگا۔

مجھے اقبالؔ کا ایک شعر یاد آگیا

عشق کی ایک جست نے ہی کردیا قصہ تمام
اس زمین وآسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

مجھے ارباب ذوق اور اہل علم کے جواب کا
انتظار رہے گا۔

☆ ثاقب صدیقی واحد حسین، میڈیکل روڈ، علی گڑھ

. . . .

تھوڑی ہی مدت سے سہی مگر ماہ
''کتاب نما'' کا پابند قاری ہوں کیونکہ پہلے
اردو زبان سے واقفیت ہی نہیں تھی۔ اب
جب مطالعہ کرتا ہوں تو مجتبیٰ حسین کا کالم بے
حد دلکش اور فرحت بخش لگتا ہے۔ طنز ومزاح
کی شکل میں ان کا کالم نہایت معلوماتی ہوتا

ہے۔ ان کے کالم میں ادبی چاشنی بھی رہتی ہے اور بھرپور طنز و مزاح بھی رہتا ہے۔ ماہ اکتوبر کا کالم ذکر سید حامد میں، سید حامد جیسی ممتاز ہستی کے قریب جانے کا موقع فراہم ہوتا ہے اور مزاح کا بھی لطف ملتا ہے۔ شاید ہی ان کی شخصیت کا کوئی پہلو اچھوتا رہا ہو۔

نصرت ظہیر بھی اعلا درجے کے مزاح نگار ہیں۔ ان کا بھی کالم طنز و مزاح کے علاوہ دیگر مواودوں سے معمور رہتا ہے جو قاری میں حس جمال پیدا کرتا ہے۔ ماہ اکتوبر کے کتاب نما میں ہی طنز و مزاح کے ایک اور موضوع پر ایک مضمون طنز و مزاح ادب کی دوسرے درجہ کی صنف سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ خود مضمون نگار فرماتے ہیں کہ طنز و مزاح اردو ادب کی ایک مشکل اور نازک صنف ہے لکھنے والے کو بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے "مری بھی حقیر رائے یہی ہے کہ جو تخلیق قاری میں احساس حسن پیدا کرے، سوچ فکر کی دعوت دے، زندگی میں رنگ و امنگ بھرے، وہی اچھا ادب ہے، طنز و مزاح بھی یہی کام کرتا ہے۔ ایسی بھی بات نہیں کہ طنز و مزاح نگار کی زندگی ہشاش وبشاش ہوتی ہے اس لیے طنز و مزاح کو تخلیق کرتا ہے۔ زندگی کی کڑواہٹوں سے واقف ہوے، بغیر کوئی طنز و مزاح سے پرُ ادب نہیں لکھا جاسکتا ہے۔ وہ خود روتا ہے اوروں کو ہنساتا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں ایک شخص علاج کے واسطے ماہر نفسیات کے پاس گیا۔ اس نے بتایا کہ تمام سہولیات کے باوجود میں خوش نہیں رہتا۔ مجھے ہنسی نہیں آتی۔ مجھے خوش کرنے کا کوئی نسخہ تجویز کیجیے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ آپ تو فلاں سرکس کے جوکر کے پاس جائیں وہ چاہے کتنا ہی مغموم آدمی ہو اسے ہنسا دیتا ہے۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ بدقسمتی سے میں ہی اس سرکس کا جوکر ہوں۔"

☆اشوک کارائے۔ ڈائریکٹر آف اکاونٹس (پوسٹل) پٹنہ

ماہ اکتوبر ۹۹ء کے "کتاب نما" کے شمارے میں　　رشید الدین صاحب کا تحریر کردہ مضمون بعنوان، کیا طنز و مزاح ادب کی دوسرے درجہ کی صنف ہے؟" نظر سے گزرا۔ مضمون نگار نے اس موضوع پر استفسار کی خواہش بھی کی ہے۔ اس حوالے سے کچھ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے تو میں اس بات پر اتفاق نہیں کرتا کہ طنز و مزاح کو ایک صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ خالص طنزیہ و مزاحیہ نثر اور شاعری کو طنزیہ و مزاحیہ ادب کہا جاسکتا

ہے۔ ادب کی صنف نہیں کیونکہ طنز ومزاح کی کوئی باقاعدہ ہیئت نہیں ہوتی اس لیے اسے صنف کی بجائے فن یا اسلوب کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ طنز ومزاح مشکل اور نازک فن ہے اور پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ مصنف کی تھوڑی سی لغزش بھی اسے اپنے مقام سے گرا سکتی ہے جس سے تخلیق یا تو ہجو کی صورت اختیار کرلے گی یا پھر پھکڑپن یا ابتذال کی حد میں داخل ہوجائے گی۔ اس میں فنکار کو اول تا آخر ایک توازن قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے اس میدان میں آنے کے لیے بڑی ہی دیدہ وری درکار رہوتی ہے اور بہت سنبھل سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے بہت کم ادبا و شعراء فنِ طنز ومزاح نگاری کی جانب مائل ہوئے ہیں۔

اب یہ بات غور طلب ہے کہ جو فن بہت مشکل بھی ہو اور اتنا ہی نازک بھی ہو اور عام ادیب کے بس کی بات بھی نہ ہو اس کو دوسرے درجے کا فن کہنا سراسر ناانصافی ہے بلکہ اسے تو درجہ اول کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ طنز ومزاح لکھنے والا فنکار خود روتا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے یقیناً وہ اول درجہ کا فنکار ہے۔ ظاہر ہے طنز ومزاحیہ ادب کی حیثیت بھی ادب میں اول درجے کی ہونی چاہیے۔

دوسرے درجے کے ادب کا خطاب طنز ومزاح کو ان نام نہاد طنز ومزاح نگاروں خصوصاً شعراء حضرات کی وجہ سے ملا ہے جو اس مشکل فن کو ایک کھیل سمجھ بیٹھے ہیں۔ میرے خیال میں طنز ومزاح کا اعلا و ارفع سرمایہ اردو نثر میں پایا جاتا ہے۔ شاید اس کی یہی وجہ ہے کہ شاعری کے مقابلہ میں نثر میں فنکاروں کو زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور بین اقوامی شہرت کے حامل بھی ہوئے ہیں۔ یہ بات رشید الدین صاحب بھی بخوبی جانتے ہوں گے کیونکہ وہ خود بھی نثر میں طنز ومزاح لکھنے والے اچھے ادیب ہیں۔ میں نے ان کے کئی مضامین ماہنامہ "شگوفہ" حیدرآباد میں پڑھے ہیں۔

موصوف نے اپنے مضمون کے دوسرے پیرے کے آغاز میں "اودھ پنچ" کو "اُودھ پنچ" لکھا ہے جبکہ اس پرچے کا نام "اودھ پنچ" تھا جو ۱۸۷۷ء میں لکھنو سے منشی سجاد حسین کی ادارت میں نکلا تھا۔ مضمون کے آخر میں مضمون نگار نے کچھ نمایندے طنز ومزاح نگاروں کے اسمائے گرامی لکھے ہیں جن میں رشید احمد صدیقی کا اسمِ گرامی مفقود ہے۔ طنز ومزاح کی دنیا میں یہ نام بہت بڑا ہے۔ باقی احمد شاہ بخاری پطرس کا نام شاہ احمد بخاری پطرس لکھا گیا جو کہ غلط ہے۔ اسی

طرح حسین ورنگار کی جگہ دلاور فگار حسین ہونا چاہیے۔

☆ڈاکٹر انور احمد انصاری نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز مالیر کوٹلہ (پنجاب)

..

نومبر کا "کتاب نما" نظر نواز ہوا۔ کتاب نما کی افادیت کا کیا کہنا۔ سبھی مضامین فکر انگیز اور معلوماتی ہیں۔ شعری حصہ بھی کافی کامیاب ہے۔ طنز و مزاح میں یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین اور نصرت ظہیر کا مقلت پسند آیا۔ ادبی تہذیبی خبروں کے تحت جناب سعید سہروردی صاحب نے ۱۵ر فروری ۲۰۰۰ء کو یوم اردو منانے کی اپیل اردو تنظیموں کے ذمے دار اصحاب سے کی ہے۔ غلطی سے کتاب نما میں ۱۵ر فروری ۱۹۹۹ء چھپ گیا ہے جبکہ ۲۰۰۰ ہونا چاہیے تھا۔ اس میں گنجائش ہے اگلے شمارے میں اس غلطی کی تلافی کر دیں۔ نوازش ہوگی۔ انجمن ترقی اردو کی آواز پر گورکھپور میں انجمن معراج ادب نے ۱۵ر فروری ۱۹۵۴ء کو شاندار طور پر یوم اردو منایا تھا۔ انشاء اللہ ۱۵ر فروری ۲۰۰۰ء کو یوم استقلال مان کر اردو زبان کو زندہ رکھنے اور دیگر زبانوں سے اس کے ربط کو مضبوط بنانے کے لیے انجمن معراج ادب گورکھپور کا پورا عزم ہے۔

☆دلشاد لاری، ۱۰۲ آواس وکاس کالونی، گورکھپور

ادبی خبریں

نئی دہلی ۵؍ نومبر: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی غالب انعامات سب کمیٹی نے اردو کے پانچ اہم اور معتبر اہل قلم کو غالب انعامات برائے ۱۹۹۹ء منتخب کیا ہے، جن کے اسمائے گرامی اور انعامات کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) فخر الدین علی احمد غالب انعام، برائے تنقید وتحقیق، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی (۲) غالب انعام، برائے اُردو نثر، پروفیسر نثار احمد فاروقی، (۳) غالب انعام، برائے اُردو شاعری، پروفیسر شہر یار (۴) ہم سب غالب انعام، برائے اردو ڈراما، جناب ظہیر انور صاحب، (۵) غالب انعام، برائے مجموعی ادبی خدمات، پروفیسر مسعود حسین خاں۔ یہ انعامات مبلغ ۲۵ ہزار روپے نقد، ایک تمغہ اور سند پر مشتمل ہے۔ یہ تمام انعامات بین اقوامی غالب سمینار کے افتتاحی اجلاس میں ۳؍ دسمبر ۱۹۹۹ء کو تقسیم کیے جائیں گے۔

ہندستان میں اعلا تعلیم کی صورت حال تشویشناک ہوتی جارہی ہے / سید حامد

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں حسب روایت اس سال بھی ''نظام اردو خطبات'' کا اہتمام ۲۷؍ اکتوبر ۱۹۹۹ء صبح دس بجے ''ٹیگور ہال (آرٹس فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی) میں کیا گیا۔ ''نظام اردو خطبات'' کے تحت سید حامد صاحب، چانسلر ہمدرد یونیورسٹی نے ''ہندستان میں اعلا تعلیم کی سرگزشت'' کے موضوع پر اپنا خطبہ پیش کیا۔

اپنی تعارفی تقریر میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر امیر عارفی نے شعبے کے قیام سے لے کر اب تک کی کاوشوں کا مختصراً ذکر کیا۔ خواجہ احمد فاروقی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ برصغیر میں شعبے کو جو مقام حاصل ہے وہ خواجہ صاحب کی اردو سے محبت اور کوششوں کا ثمرہ ہے۔

سید حامد صاحب نے اپنے خطبے میں ''ہندستان میں اعلا تعلیم کی سرگزشت'' زیرعنوان خطبے میں مروج تعلیم کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اعلا تعلیم کے ہمہ جہت پہلو، اس کے اغراض ومقاصد اور مختلف مراحل پر روشنی ڈالی اور عملی اور غیر عملی پہلوؤں پر بے باکانہ اظہار خیال کیا۔

انھوں نے یونیورسٹیوں میں سیاسی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آج یونیورسٹیوں میں ٹیچرس یونینیں ہوں کہ اسٹوڈنٹ یونین دونوں کی صورت ٹریڈ یونین کی سی ہوگئی ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے حوالے سے کہا کہ یہ ادارہ بالکل

بیوروکریٹس ہو گیا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر وی آر مہتہ نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہمارے قومی بجٹ میں تعلیم کی مد پر خصوصی توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ قومی بجٹ میں اول تو تعلیم کو اس کا خاطر خواہ حصہ نہیں ملتا اور اس پر ستم یہ کہ جب بھی قومی اخراجات میں تخفیف کا سوال اٹھتا ہے تو سب سے پہلے تعلیم ہی کی مد میں کٹوتی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے صورت حال مزید بگڑ جاتی ہے۔

خطبے کے آخر میں پروفیسر شمیم نکہت نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شمس الرحمٰن فاروقی کا یادگار لیکچر

۲۱ ر اکتوبر جامعہ ملیہ اسلامیہ، شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ پروگرام میں ممتاز نقاد جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب نے ''اردو تاریخ نویسی میں تعصبات'' کے عنوان سے بھر پور علمی گفتگو کرتے ہوئے چند ایسے پہلوؤں کی نشاندہی کی جن کی جانب سنجیدگی سے توجہ کرنے میں ہم اکثر کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے بہت تفصیل کے ساتھ اردو ادب کی نشو ونما اور ترویج وترقی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے بعض مورخوں نے شعوری طور پر کچھ بندھے ٹکے نظریات قائم کر لیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ چیزیں ہمارے مزاج اور شعور کا حصہ بنتی چلی گئیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج ہم انہی باتوں کو سند کا درجہ دیتے ہیں اور اس کی تردید کے لیے کسی قسم کی تاویل سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ فاروقی صاحب نے اس بات پر بہ طور خاص زور دیا کہ ایک عرصے تک اردو ادب میں تاریخ نویسی کا فقدان رہا اور جب اس سلسلے میں پیش رفت ہوئی بھی تو بعض تعصبات کی بنا پر مقصد کے حصول میں کامیابی نہیں مل پائی۔

فاروقی صاحب کی طویل گفتگو کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا جس میں معروف نقاد محمود ہاشمی، جناب عراق حسین زیدی (صدر شعبہ فارسی) جناب نقی حسین جعفری (صدر شعبہ انگریزی) اور جناب خالد محمود (شعبہ اردو) نے حصہ لیا۔ فاروقی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں تمام سوالوں کے تشفی بخش جواب دیے۔ ڈاکٹر صادقہ ذکی نے بڑے سلیقے سے نظامت کے فرائض انجام دیے اور صدر جلسہ پروفیسر شمیم حنفی نے فاروقی صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ شعبہ اردو نے وقفے وقفے سے اس نوعیت کی یادگار گفتگو کا اہتمام کیا ہے اور عنقریب ہی اس سلسلے کی توسیع کی جائے گی۔

اراکین انجمن ترقی اردو (ہند) بھلائی درگ

سرپرست (۱) جناب ریاض الدین صاحب (۲) جناب انعام اشرف صاحب (۳) جناب عبدالغنی صاحب
صدر رام پرکاش کپور صاحب، نائب صدر جناب نواب رونق جمال صاحب، جناب راجکمار شرما صاحب، سکریٹری جناب مرزا محبوب بیگ صاحب، نائب سکریٹری جناب عبد الحفیظ صاحب، خازن جناب جمیل احمد ناصر صاحب، رکن جناب مرزا مسعود بیگ صاحب۔ (۲) جناب سلیم اللہ صاحب، (۳) جناب آر۔ سونی صاحب، لائبریری و آفس کا پتہ :۔ مرزا محبوب بیگ صاحب، جامع مسجد کالونی سڑک نمبر ا سیکٹر ۶ درگ (ایم پی)

شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تاخیر سے موصولہ اطلاع کے مطابق پروفیسر اصغر عباس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اپنے عہدے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ پروفیسر اصغر عباس کا خاص موضوع مطالعہ علی گڑھ اور سرسید ہے، پروفیسر اصغر عباس نے عہدے کا چارج پروفیسر ابوالکلام قاسمی سے لیا ہے۔
پروفیسر عتیق اللہ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی کے صدر ۲ر نومبر ۱۹۹۹ء ۔ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، پروفیسر وی۔ آر مہتہ نے پروفیسر عتیق اللہ کو شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی کا صدر مقرر کیا ہے۔ انھوں نے ۲ر نومبر ۹۹ء کو اپنی صدارت کا چارج سنبھال لیا ہے۔ اس دن اسٹاف کونسل شعبۂ اردو کے اساتذہ، ریسرچ اسکالر، طلبہ اور طالبات کے علاوہ دوسرے حضرات نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی ۔ اس موقع پر شعبہ کے سینئر اساتذہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ پروفیسر صادق نے اس شعبہ کی عظمت اور وقار پر روشنی ڈالی اور کہا کہ پروفیسر عتیق صاحب نظر اور صاحب بصیرت عالم ہیں ۔ امید ہے کہ وہ شعبہ اردو کی گزشتہ روایات کو قائم رکھیں گے ۔ پروفیسر عبدالحق نے ہدیۂ تبریک پیش کیا اور پروفیسر عتیق اللہ کی تخلیقی اور ناقدانہ خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ادب اور انتظامیہ کو ملانے کی ذمے داری سونپی گئی ہے ۔ توقع ہے وہ ایک کامیاب منتظم بھی ثابت ہوں گے۔ پروفیسر شمیم نکہت نے اپنی تقریر میں پروفیسر عتیق اللہ کو پرزور الفاظ میں خوش آمدید کہا اور حاضرین کا شکریہ بھی ادا کیا۔ پروفیسر امیر عارفی نے اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ کو مبارک باد پیش کی۔ اس طرح یہ استقبالیہ جلسہ نئی امنگوں اور نئے تقاضوں کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ جلسہ کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر علی جاوید نے انجام دیے۔ (توقیر احمد خاں)

عذرا پروین شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی میں

مورخہ ۲؍ نومبر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی میں ہندستان کی معروف شاعرہ عذرا پروین کو استقبالیہ دیا گیا۔ صدر شعبہ [illegible]تیق اللہ صاحب نے عذرا پروین [illegible]عارف کراتے ہوئے اردو میں شاعرات کی شعری روایت پر روشنی ڈالی، اور عذرا پروین کی شاعری کو "مذہبی وانخیت کے خلاف آواز قرار دیا"۔ عذرا پروین نے اپنی کئی نظمیں اور غزلیں سنائیں، ان کی نظموں میں رابعہ بصری، خاندان، سب لائق ہیں۔ اور "موسم" کو خاص طور سے پسند کیا گیا۔ پروفیسر صادق نے ان نظموں پر اظہار خیال فرمایا اور کہا کہ ہندستان میں وہ شاعرات جو اپنے انفرادی لب ولہجہ کی وجہ سے شناخت قائم کر رہی ہیں ان میں ایک نمایاں نام عذرا پروین کا بھی ہے۔ (توقیر احمد خاں)

پروفیسر فضل امام کو ہندی ساہتیہ سمیلن کا اعلا ادبی اعزاز

الہ آباد۔ ہندی ساہتیہ سمیلن پریاگ نے اردو اور ہندی کے معتبر دانشور نقاد اور محقق کو ان کے ہندی زبان وادب میں گراں قدر اضافہ کے لیے اپنے سب سے بڑے ادبی اعزاز "ودیا واچسپتی" (ڈی۔ لٹ۔ (ہندی)) سے نوازا ہے۔ پروفیسر فضل امام ان معتبر ناقدین اور محققین میں ہیں جن کو اردو عربی، فارسی کے علاوہ ہندی، سنسکرت اور علاقائی زبان وادب پر دسترس حاصل ہے۔ ہندی زبان وادب میں ان کی دس سے زیادہ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں

مظہر امام آفاقی شخصیت کے مالک ہیں: گجرال

نئی دہلی ۔۲۷؍ اکتوبر آج شام غالب اکیڈمی میں رابطہ میگزین کے مظہر امام نمبر کا اجراء سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال کے ہاتھوں ہوا۔ اس نمبر میں مظہر امام کی علمی وادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اردو اکادمی کے تعاون سے منعقد رسم اجراء کی اس تقریب میں بولتے ہوئے مسٹر گجرال نے کہا کہ مظہر امام اردو ادب میں ایک عالمگیر وآفاقی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی خدمات اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے جس پر اردو والوں کو ناز ہے۔

تقریب کے صدر اور قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین پروفیسر طاہر محمود نے مظہر امام کی ادبی کاوشوں کو ایک انمول سرمایہ قرار دیا۔ اردو کے معروف شاعر وادیب رفعت سروش نے کہا کہ مردہ پرست معاشرہ میں زندہ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں پر خصوصی نمبر نکالنا ایک لائق تحسین قدم ہے کیونکہ جو لوگ مسلسل ۵۰۔۶۰ سال سے اردو زبان وادب کی خدمت کر رہے ہیں ان کا اعتراف ان کی زندگی میں ہونا ایک اچھی

روایت ہے۔

رسم اجراء کی اس تقریب میں قومی اردو کونسل کے چیئرمین حمید اللہ بھٹ، رابطہ میگزین کے ایڈیٹر نذرالااسلام نظمی کے علاوہ دوسری ادبی شخصیات بھی موجود تھیں۔

جوگندر پال مدھیہ پردیش حکومت کے ''اقبال سمان'' سے سرفراز

نئی دہلی، ۲۷/اکتوبر (یو این آئی)

اردو کے مشہور افسانہ نگار جوگندر پال کو حکومت مدھیہ پردیش نے اس سال کے اقبال سمان سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۷۵ سالہ مصنف کی کتابیں کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ راجدھانی میں حال ہی میں ان کے یوم پیدائش پر منعقدہ تقریب میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کی کتاب 'جوگندر پال، ذکر، فکر اور فن' جاری کی گئی۔ اس تقریب کا اہتمام آتھرز گلڈ آف انڈیا اور غالب اکیڈمی نے کیا تھا۔

کتاب کے اجراء کے بعد مصنف کی زندگی اور فن پر ایک مذاکرے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جس میں مشہور ادیبوں قرۃ العین حیدر، کملیشور اور گوپی چند نارنگ نے کہا کہ جوگندر پال نے اردو ادب کو نئی زندگی دی ہے۔ کملیشور نے اعلان کیا کہ وہ اپنی ایک نئی کہانی جوگندر پال کی نذر کریں گے۔ جوگندر پال اس موقع پر اپنی اہلیہ کرشنا پال کے ساتھ موجود تھے جنھوں نے ان کی کئی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔

ماہنامہ ''انشاء'' کی جانب سے مقصود الٰہی شیخ کو کلکتہ میں استقبالیہ

پچھلے دنوں شمالی برطانیہ سے نامور افسانہ نگار اور صحافی سابق مدیر ہفت روزہ راوی (بریڈفورڈ) جناب مقصود الٰہی شیخ اپنی بیگم محترمہ فریدہ شیخ کے ہمراہ کلکتہ تشریف لائے۔ کلکتہ کے قلمکاروں نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ ۳۰/اکتوبر بروز سنیچر ماہنامہ انشاء نے مقصود الٰہی شیخ صاحب اور ان کی بیگم کو استقبالیہ دیا جس میں شیخ صاحب کے ناولٹ'' دل اک بند کلی'' کے ہندستانی اڈیشن کا اجرا ممتاز و منفرد شاعر جناب عین رشید کے ہاتھوں ہوا۔ تقریب کی صدارت جناب احمد سعید ملیح آبادی مدیر روزنامہ ''آزاد ہند'' نے فرمائی۔ پرویز سلیمان خورشید نے بطور مہمان شرکت کی۔ نظامت کے فرائض مدیر انشاء ف۔س۔ اعجاز نے انجام دیے۔ ناظم استقبالیہ نے صحافت اور افسانہ نگار کے حوالے سے مقصود الٰہی شیخ کی خدمات کا جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ شیخ صاحب نے ۲۶ سال شمالی برطانیہ میں اپنے اخبار'' راوی'' کے ذریعہ وہاں کے ایشیائی تارکین وطن کی زبان اور تہذیب کی بے مثال خدمت انجام دی ہے۔ وہ ۷۰ء سے جسٹس آف پیس کے منصب اعزازی پر

بھی فائز ہیں۔ ف۔س۔ اعجاز نے مقصود الٰہی شیخ کی افسانہ نگاری کے بنیادی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں ایک تجربہ کار اور منفرد انداز افسانہ نگار قرار دیا۔ پرویز سلیمان خورشید نے "دل اک بند کلی" پر ایک جامع اور مبسوط مقالہ پڑھا جسے سامعین نے بے حد سراہا۔ عین رشید نے ناولٹ کا محدود جائزہ اور سعدیہ جو پاکستان کے گجرات سے انگلینڈ میں جا بسی ہے کا ایک رُخا تنقیدی احتساب پیش کیا۔ بقول عین رشید یہ لڑکی "ایم چھو کیم چھو" والی گجراتی لڑکی ہے جو سینٹر میں انگلینڈ پہنچی۔ اگر "ایم چھو کیم چھو" والے گاندھی اور جناح پیدا نہ ہوتے تو ہندستان دو ٹکروں میں تقسیم ہونے سے بچ جاتا۔ ف۔س۔ اعجاز نے ناول پر گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی کہ ناول نگار نے سعدیہ کو مین اسٹریم سے الگ تو دکھایا ہی ہے، ساری کہانی اسی لیے بن پائی ہے کہ سعدیہ اپنے معاشرے سے کٹ جاتی ہے کیونکہ اس کا معاشرہ اس سے صحیح برتاؤ نہیں کرتا۔ جب ہم تاریخ لے کر آگے بڑھتے ہیں تو سامنے روشنی اور پیچھے اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ شاعر اوم پرکاش کنول سیالکوٹی نے عین رشید صاحب کی توجہ اس جانب دلائی کہ سعدیہ پاکستان کے گجرات سے تعلق رکھتی ہے جو وہاں کے پنجاب کا حصہ ہے۔ سعدیہ ہندستان کے گجرات کی نہیں ہے اور اس کی بولی گجراتی نہیں بلکہ پشاوری ہے۔ صدر جلسہ جناب احمد سعید ملیح آبادی نے مقصود الٰہی شیخ کو کلکتہ میں خوش آمدید کہتے ہوئے اردو صحافت کے مشترکہ مسائل پر روشنی ڈالی اور اردو قارئین کی کمی پر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ انھوں نے شیخ صاحب کے ناول "دل اک بند کلی" کے پلاٹ اور مختلف کرداروں۔ مظہر فیروز۔ شوکت گنڈیری والا اور رابرٹ کا تجزیہ کیا۔ انھوں نے ناول کے اسلوب اور مختصر مختصر مکالموں کو مقصود الٰہی شیخ کا خاص تحریری وصف قرار دیا۔

تقریب کے آغاز میں رسم گلپوشی کے بعد "انشا" کی جانب سے شیخ صاحب کو ف۔س۔ اعجاز نے شال اور مسز فریدہ شیخ کو آسیہ فیروز نے ایک بنگالی Stole پیش کیا۔ صدر محفل کی تقریر سے پہلے مقصود الٰہی شیخ نے اپنی تازہ ترین کہانی "برسورے نینوا مورے" پڑھی جو ان کی پچھلی تمام کہانیوں سے مختلف ہے۔ اس کہانی کی بہت پذیرائی ہوئی۔ شیخ صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کلکتہ کے لوگ اور احباب انھیں بہت پسند آئے۔ کلکتہ وہ کبھی نہیں بھولیں گے۔

سرونج ضلع ودیشہ ایم۔ پی میں یوم سرسید پر سیمینار کا انعقاد

سرونج: عظیم مصلح قوم و ماہر تعلیم

سرسید احمد خاص کے یوم پیدائش پر مسلم نوجوان کمیٹی سرونج کے زیر اہتمام حبیبیہ اسکول میں ایک سمینار منعقد کیا گیا۔ ابتداء میں "مدرسہ تعلیم القرآن: کے طالب علم محمد اویس نے قرآن کریم کی تلاوت کی، اس کے بعد حبیبیہ اسکول کی طالبات نے حمد ونعت پیش کیں۔ سید ارشد حسین نے "حالات حاضرہ میں سرسید کی تعلیمی و معاشرتی افکار کی معنویت" کے موضوع پر انتہائی مبسوط مقالہ پڑھا۔ یہ مقالہ بھی بہت پسند کیا گیا۔ جناب عبدالماجد خاں نے "سرسید کی نظر میں تعلیم کے ساتھ تربیت کی اہمیت" پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ حبیبیہ اسکول کے سینئر استاد جناب عبدالسلام انصاری صاحب نے غدر سے پہلے سرسید کے خیالات اور غدر کے بعد ان کے افکار ونظریات سے آئی تبدیلیوں کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید کی کتب "آثار الصنادید" اور "اسباب بغاوت ہند" کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ مہمان خصوصی شہر کے بزرگ مدرس وشاعر جناب مقبول عالم اظہر صاحب نے فرمایا کہ سرسید صرف عمل پر یقین رکھتے تھے، اور آج مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ان کی عملی کاوشوں کا بین ثبوت موجود ہے۔ جناب سرور علی خان صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ سرسید کی آواز تھی کہ مسلمان قرآن اور سائنس دونوں کی تعلیم حاصل کریں اور کسی بھی میدان میں دنیا سے پیچھے نہ رہیں۔ انھوں نے تمنا کی کہ آج پھر کوئی سرسید پیدا ہو جو تعلیمی ترقی اور اصلاح معاشرے کا علمبردار بنے۔ سمینار کی نظامت کے فرائض سید ارشد حسین نے انجام دیے، جناب نعیم اطہر صاحب نے حاضرین سمینار کا شکریہ ادا کیا۔ شرکائے سمینار میں جناب عطا اللہ صاحب، جناب حافظ سردار احمد صاحب، جناب عبدالحمید صاحب، جناب شبر حسین صاحب، جناب شفیق سرونجی ایڈیٹر سہ ماہی "دلکش" جناب سلیمان آذر صاحب، جناب سرور اقبال صاحب، جناب نذیر احسن صاحب، جناب رؤف صدیقی صاحب، جناب نجم الدین صاحب جے پوری، جناب متین بیگ صاحب ٹونکی، جناب عمران بیگ صاحب، جناب عبدالحسیب صاحب، جناب فہیم بیگ صاحب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اندور میں: "حرف غزل" کے اجراء پر سمینار اور مشاعرہ

مشہور شاعر جناب صابر گوالیاری کے شعری مجموعہ "حرف غزل" کے اجراء پر ہندی ساہتیہ سمیتی کے ہال میں ایک سمینار منعقد کیا گیا۔ صابر صاحب کی غزل گوئی پر پروفیسر اے۔ اے عباسی (سابق وائس چانسلر، دیوی اہلیہ بائی یونیورسٹی، اندور، ڈاکٹر نریندر ناتھ ویرمنی (سابق ڈی جی پی)

ڈاکٹر فیروز احمد (صدر شعبہ اردو، راجستھان یونیورسٹی جے پور، ہارون رشید خاں پرنسپل، سینٹرل اسکول، کیپٹ قاسم رسا (گوالیار)، حاجی انیس دہلوی، ڈاکٹر مختار شمیم نے اظہار خیال فرمایا۔

ازاں بعد ایک کامیاب مشاعرہ منعقد ہوا۔ حاجی انیس دہلوی نے صدارت کی۔ نظامت کے فرائض محمد اقبال ٹھیکیدار نے ادا کیے۔

اردو اکادمی ضلع کونسل کی صبیحہ شاہد رکن نامزد

علی گڑھ ۱۷ نومبر (نامہ نگار)

حکومت اتر پردیش نے صبیحہ شاہد کو اردو اکادمی کی ضلع کونسل کا رکن نامزد کیا ہے۔ اس سلسلے میں اکادمی کی چیر پرسن ڈاکٹر شمیم رضوی نے صبیحہ شاہد کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ ان کے تعاون اور مفید مشوروں سے اردو اکادمی کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوگا۔

شعبۂ اردو جامعہ میں انور معظم اور جیلانی بانو کا استقبال

نئی دہلی ۱۷ نومبر، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے حیدرآباد سے آئے ہوئے مشہور ادیب انور معظم اور مشہور ادیبہ جیلانی بانو کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر صادقہ ذکی نے تعارفی خاکہ پیش کیا جس میں انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ جیلانی بانو کے تخلیقی سفر کی مختلف جہتوں سے روشناس کرایا۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر شمیم حنفی نے مختلف حوالوں سے جیلانی بانو کی شخصیت اور ان کے انفرادی فن پر بڑی صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ جیلانی بانو نے بہ طور خاص اپنے اس موقف کا اظہار کیا کہ ان کا فن کبھی کسی مخصوص دائرے میں مقید نہیں رہا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی کہانیوں کا تانا بانا عورت، سماج، استحصال اور فنون لطیفہ سے متعلق پہلوؤں سے منسلک ہے۔ پروفیسر نقی حسین جعفری، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، احمد محفوظ، ہاراں رحمان، شکیل جہانگیری اور راشد انور راشد نے سوالات کیے اور نہایت خوشگوار ماحول میں یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

نیشنل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی رجسٹر نمبر ۴۹۴۸

آفس:۔ گرومی وارڈ پوسد ضلع ایوت محل (مہاراشٹر)

پوسد: اس لائبریری کے کے وجود میں آنے کا مقصد اردو کی بقا اور ترقی ہے۔ اس لائبریری کے ممبران خلوص کے ساتھ لائبریری کو اپنے علاقے کی مثالی لائبریری بنانے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو پائے۔ اہل ثروت اور

ایسے ادارے جو اردو کی ترقی دل و جان سے چاہتے ہوں ان سے مالی مدد اور کتابوں کے تحفے لائبریری کو مل سکیں تو لائبریری اور اس کے ممبران ان کے شکر گزار ہوں گے۔

اُردو، کوچنگ سینٹر میں شام غزل

۱۳ر نومبر ۹۹ء کو اردو، کوچنگ سینٹر، جامعہ نگر، نئی دہلی میں ایک 'شام غزل' منعقد ہوئی جس میں مشہور گلوکارہ محترمہ مدھو متابوس نے پرانے اور نئے شعراء کی غزلیں سنا کر سامعین کو بے حد محظوظ کیا۔ نیز استاد ہلال احمد خاں مرحوم کے صاحبزادے اکمل ہلال اور تسنیم جمال نے بھی غزلیں پیش کیں۔ اس محفل میں پروفیسر مجیب رضوی، ڈاکٹر سکرتا پال کمار، پروفیسر شاہین عثمانی، پروفیسر صغرا مہدی، محترمہ زرینہ بھٹی، جناب غلام حیدر، جناب اقبال مہدی زیدی، محترمہ عذرا مجیب، جناب اوراک بھٹی نے اپنی موجودگی سے رونق بخشی، ان کے علاوہ سینٹر میں زیر تعلیم خواتین وحضرات نے بھی شرکت کی۔

سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر شکیل اختر فاروقی نے بتایا کہا کہ اُردو، کوچنگ سینٹر کی ابتدا اصل میں اردو سیکھنے سکھانے کی غرض سے ہوئی ہے۔ جہاں کتابوں، ویڈیو فلم اور کمپیوٹر کے ذریعے اردو سکھانے کا انتظام ہے اور اردو سے دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ادبی اور ثقافتی نشستیں بھی منعقد کی جاتی ہے۔ 'شام غزل' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کچھ عرصہ قبل پروفیسر جوگندر پال (مشہور افسانہ نگار) پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی اور جناب اقبال مہدی زیدی اردو سینٹر تشریف لائے تھے۔ ایک نشست میں جناب گلشن کمرانہ، جناب اوراک بھٹی اور محترمہ زرینہ بھٹی نے زیر تعلیم لوگوں سے اردو زبان کے حال و مستقبل پر مفید گفتگو کی۔ سینٹر میں تشریف لائے مہمانوں نے سینٹر کے کاموں کو بے حد پسند فرمایا اور امید ظاہر کی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ یہاں آکر اردو سیکھیں گے اور فیض اٹھائیں گے۔

شیموگہ میں قرآن مجید کے منظوم تراجم کی رسم اجراء اور سمینار

شیموگہ ۱۰ راکتوبر ڈاکٹر حنیف سیف ہاشمی کی تصنیف "قرآن مجید کے منظوم اردو تراجم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ" کی رسم اجراء کے سلسلے میں بزم ادب کے زیر اہتمام نیشنل لا کالج ہال میں ایک سمینار منعقد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت ڈاکٹر فہمیدہ بیگم سابق ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو نئی دہلی نے کی۔ جلسہ کی کارروائی کا آغاز سورۂ فاتحہ کی تلاوت سے ہوا۔ اس کے بعد اسی سورۃ کا حضرت رشید بیدری کا منظوم ترجمہ سیدہ تبصرہ نے

حضرت سیماب اکبرآبادی کا منظوم ترجمہ صبا آفریں اور کیف بھوپالی کا منظوم ترجمہ صالحہ کوثر نے نہایت دردآویز ترنم کے ساتھ پڑھ کر محفل پر ایک وجدانی کیفیت طاری کردی۔ جناب محمد عارف اللہ لکچرر نے حمد باری تعالی اور نعت شریف سنائی۔ مجیب الرحمٰن لکچرر کی استقبالیہ تقریر کے بعد تقدس مآب حضرت خواجہ سید شاہ اسد اللہ حسینی صاحب نظامی چشتی قادری بلبہاری کے مقدس ہاتھوں سے متذکرہ کتاب کی تقریب رونمائی عمل میں آئی۔ اس کتاب کی پہلی جلد الحاج عبدالجبار خان تریکرہ نے پانچ سو روپے میں دوسری جلد شوکت علی خاں Zsak مرچنٹ بنگلور نے دو ہزارروپے میں اور تیسری جلد صدر جلسہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے ایک سوایک روپے میں حاصل کی۔ رسم اجراء کے بعد سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر آر۔ آر کلکرنی پرنسپل سہیادری آرٹس کالج نے ڈاکٹر حنیف سیف ہاشمی کے تحقیقی کام کی قدروقعت پر روشنی ڈالتے ہوئے سامیول جانسن کے حوالے سے کہا کہ مقدس قرآن حکیم نہ نثر ہے نہ نظم اور نہ ہی تاریخ ہے اور نہ سوانحی ادب بلکہ یہ دونوں کا حسین اور نظر افروز مجموعہ ہے۔ سمینار کے مہمان خصوصی جناب مجیب احمد لینڈ آرکیوزشن آفیسر سوڈا نے اسلام کی روحانی اور اخلاقی اقدار پر سیر حاصل بحث کی۔

ساتھ ہی قرآن حکیم کے علمی، ادبی اور جمالیاتی قدروں کا جائزہ بھی لیا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے کہا کہ ڈاکٹر حنیف سیف ہاشمی کا یہ تحقیقی کام اردو ادب میں ایک اضافہ ہے جو مستقبل کے اسکالرس کے لیے ایک تمہید کا کام دے گا۔ سمینار کی ابتداء میں صبیحہ بانو لکچرر آزاد پی یو کالج برائے اناث شیموگہ نے مصنف اور تصنیف کے عنوان سے ڈاکٹر حنیف سیف ہاشمی کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ موصوف نے قرآن مجید کے منظوم تراجم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کر کے قرآنی تراجم منظوم کے گلہائے رنگ رنگ کی عطر بیزیوں سے ہمارے مشام ادب ودیں کو معطر معنبر کردیا ہے۔ یہ تحقیقی کاوش اردو ادب میں منفرد بھی ہے اور گراں قدر بھی۔ حسینہ پروین ایم۔ اے نے کتاب کے کچھ منتخب اقتباسات پڑھے۔ ریاست کرناٹک کے معروف شاعر اعجاز احسنی نے اپنی نظم قرآن معجزہ ہے سنائی۔ مہمان مقالہ نگار جناب ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی سابق پروفیسر صدر شعبۂ اردو شنکر آچاریہ یونیورسٹی کیرالا کا وقیع مقالہ بعنوان" قرآن حکیم کے منظوم اردو تراجم کے مسائل" جناب قاری ثناءاللہ صاحب لکچرر نے پڑھا۔ اس مقالہ میں جناب ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی صاحب نے قرآنی منظوم تراجم کے مسائل پر بڑی گیرائی اور گہرائی

کے ساتھ روشنی ڈالی ۔ جناب اصغر علی چک منگلوری نے بڑے موثر اور دلکش انداز میں نظامت کے فرائض انجام دئے ۔ جناب شہاب الدین کے شکریہ پر سمینار اختتام کو پہنچا۔

پروفیسر انور ظہیر خان کے لیے مہاراشٹر کالج میں تعزیتی جلسہ، مرحوم کی خدمات، اور شفقت کو پرنم آنکھوں کا خراج عقیدت

ممبئی مہاراشٹر کالج کے شعبہ اردو کے سینئر لیکچرار پروفیسر انور ظہیر خان کی یاد میں کالج کی طرف سے تعزیتی جلسہ کا اہتمام ہوا۔ مہاراشٹر کالج کے صدر ڈاکٹر رفیق زکریا نے اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر انور ظہیر کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی کتاب ''مت سہل ہمیں جانو'' کی نثر کی خوب تعریف کی آ۔ ۔ نے انور ظہیر کو ایک بہترین استاد اور ایک۔ انشر نگار کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر زکریا نے اس بات سے انکار کیا کہ کالج انتظامیہ انور ظہیر کی تنخواہ کے اضافہ کے معاملہ میں پس و پیش کرتا رہا۔ ڈاکٹر رفیق زکریا نے سمیع خطیب کی طرف سے انور ظہیر کی یاد میں ۵ ہزار روپے کا ایک انعام شروع کرنے کا اعلان کیا۔ علاوہ ازیں سمیع خطیب نے انور ظہیر کی تعلیمی اور علمی خدمات کے پیش نظر ان کی بچیوں کے تعلیمی اخراجات کو برداشت کرنے کی پیش کش کی۔ سمیع خطیب نے انور ظہیر کے برتاؤ اور وضع داری کی تعریف کرتے ہوئے مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا فرمائی۔

مہاراشٹر کالج کے پرنسپل سید اسحاق علی حوالدار نے پرنم آنکھوں سے پروفیسر انور ظہیر سے اپنی قربت اور محبت کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ان کی موت کی خبر سن کر جس کیفیت سے میں گزرا ہوں اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں ۔ پرنسپل حوالدار نے انور ظہیر کی تعلیمی زندگی کے دوران پیش آنے والے اتار چڑھاؤ تعلیمی اور تقریری مقابلوں میں ان کی پیش قدمی کا ذکر کیا۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے انور ظہیر کی نثر ''مت سہل ہمیں جانو'' کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گو کہ وہ میرے شاگرد تھے لیکن آگے چل کر استاد اور شاگرد کا رشتہ دوستی میں تبدیل ہوا۔ آپ نے طالب علموں سے کہا کہ وہ مرحوم کے نقش قدم پر چل کر انھیں صحیح طور پر خراج عقیدت پیش کر سکتے ہیں ۔ مہاراشٹر کالج شعبہ اردو کی صدر ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں وہ اور جلسہ گاہ کے شرکاء آبدیدہ ہو گئے ۔ آپ نے کہا کہ میں نے اپنا چھوٹا بھائی اور بہت اچھا ساتھی کھو دیا ہے۔ کئی معاملات میں انور نے میری رہنمائی بھی کی ہے۔ آپ نے کہا کہ انور سے پہلے

میری ملاقات ان کی آواز سے ہوئی جب وہ آل انڈیا ریڈیو سے جاں نثار اختر پر مضمون پڑھ رہے تھے، مجھے یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ ایک طالب علم جاں نثار اختر پر اچھا مضمون لکھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم نے کہا کہ انور بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ ستاروں کو چھونے اور آسمان پر کمند ڈالنے کی فکر میں رہتے تھے۔ وہ کچھ ایسا کرنا چاہتے تھے جس سے ان کی خوب پذیرائی ہو۔ آپ نے کہا کہ ان کی پہلی کتاب سے ادبی دنیا میں جو تہلکہ مچا اس سے کچھ لوگ حسد بھی کرنے لگے تھے۔ اس کی انھیں کوئی پرواہ نہیں تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں اکثر انور سے کہتی کہ آپ کی زبان زمین سے جڑی ہوئی ہے لیکن یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انور خود اتنی جلدی ہمیشہ کے لیے زمین سے جڑ جائیں گے۔ اس موقع پر مہاراشٹر کالج کے سابق پرنسپل اے اے غنی کے تعزیتی پیغام کو وائس پرنسپل شکیل ہزرک نے پڑھ کر سنایا۔ جلسہ کی نظامت جمیل کامل نے کی۔

ہم غم میں برابر کے شریک ہیں

الحاج حکیم مولانا محمد مصطفےٰ قیصر القاسمی کا انتقال

انتہائی رنج وغم کے ساتھ یہ خبر جانکاہ دی جارہی ہے کہ الحاج حکیم مولانا محمد مصطفےٰ قیصر القاسمی بلیاوی نے ۲۵ ستمبر ۹۹ء شام ۵ بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہزاروں متعلقین وغم گساروں نے اپنی نمناک واشکبار آنکھوں سے انھیں مقامی قبرستان میں سپرد خاک کیا۔ مرحوم کی عمر ۶۵ سال تھی اور وہ ۱۸ دینی وعلمی کتابوں کے مصنف تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد لکھنو سے تکمیل طب اور پنجاب سے ایم ایس پی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ روزنامہ ''محاذ'' (کلکتہ) کے ایڈیٹر اور ماہنامہ ''حدیث مصطفےٰ''، جریدہ ''الہام'' کے سرپرست اور ادارہ اشاعت حدیث وحامی دواخانہ کے مالک ونگراں تھے۔ ۶۰ء میں علاقے میں ایک عظیم دینی درس گاہ مدرسہ عربیہ حنفیہ قاسم العلوم قائم کیا جہاں سے آج بھی تشنگان علم دین سیراب ہورہے ہیں۔

ہمارے بھائی مرحوم ایک حساس طبیعت، عالم دین کے علاوہ کامل طبیب بھی تھے۔ ان کا دل خدمت خلق وخدمت دین سے سرشار تھا اور آخری وقت تک تصنیف وتالیف اور تبلیغ دین سے وابستہ رہے۔ عنقریب فن طب سے متعلق ان کی تصنیف ''حکیم حاذق'' منظر عام پر آرہی ہے۔ جناب والا قارئین سے ایصال ثواب ودعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

حامی دواخانہ ،مونگیر

مایہ ناز طنز و مزاح نگار کرنل محمد خاں کا انتقال

نئی دہلی ۔۱۶ر نومبر ۔ اردو کے مشہور و معروف پاکستانی طنز و مزاح نگار کرنل محمد خاں کا طویل علالت کے بعد ۲۲ر اکتوبر کو انتقال ہوگیا ۔ان کے انتقال کی اطلاع ماہنامہ شگوفہ کے مدیر ڈاکٹر مصطفےٰ کمال نے دی۔

کرنل محمد خاں اردو کے صف اول کے طنز و مزاح نگار تھے اور پاکستان کی طرح ہندستان میں بھی بے حد مقبول تھے ۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ''بزم آرائیاں'' اور ''بہ سلامت روی'' بے حد مشہور ہوے مگر سب سے زیادہ شہرت انھیں اپنے سفر نامہ ''بجنگ آمد'' سے حاصل ہوئی جسے اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں ''کلاسک'' کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔
معروف مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے کرنل محمد خاں کے انتقال کو اردو زبان و ادب کے لیے ایک عظیم نقصان سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ مزاحیہ ادب میں اس خلاء کا پُر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔

مشہور صحافی محمد سلیمان صابر کا انتقال

دہلی اردو کے مشہور صحافی ، مجاہد آزادی اور ''قومی آواز'' نئی دہلی کے سابق چیف سب اڈیٹر جناب محمد سلیمان صابر ۸۲ سال کی عمر میں ۵ر نومبر کو رام منوہر لوہیا اسپتال میں انتقال کر گئے ۔ وہ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے ہفت روزہ جریدہ ''ترجمان'' دہلی کے بھی مدیر اعلا تھے ۔ان کی تدفین ان کے آبائی وطن پلکھوا میں کی گئی۔

جناب محمد سلیمان صابر بہت نیک ، ملنسار اور بیباک صحافی تھے ۔ وہ انگریزی استبداد اور فرنگی استعمار کے خلاف پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے۔جناب محمد سلیمان صابر یوپی کے قصبہ پلکھوا میں پیدا ہوئے تھے ۔تعلیم و تربیت کے مرحلے سے فراغت کے بعد صحافت سے وابستہ ہوگئے ۔تقسیم وطن سے قبل وہ روزنامہ اخبار ''جنگ'' دہلی سے وابستہ رہے ۔پھر جمعیۃ علمائے ہند کے آرگن ''الجمعیۃ'' سے منسلک رہے اور ساری زندگی قلمی جہاد میں گزاری۔اخبار ''الجمعیۃ'' روزنامہ ''قومی آواز'' ، ''مشرقی آواز'' ، ''عوام'' اور ''نئی دنیا'' جیسے وقیع اخباروں سے وابستگی کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی پر بھی ان کے تبصرے ، تجزیے اور مقالات کو اہمیت حاصل تھی ۔مرحوم کے پس ماندگان میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

ڈراما نگار ابراہیم یوسف نہیں رہے

بھوپال ۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب اور ڈراما نگار جناب ابراہیم یوسف کا ۳۱ر اکتوبر ۱۹۹۹ء کو بھوپال میں انتقال ہو گیا۔ ابراہیم یوسف صاحب ۱۰ر مئی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے تھے ۔ انھوں نے اردو اور پولیٹیکل سائنس سے ایم ۔ اے کیا اور پھر بی ۔ ایڈ بھی کیا۔ وہ اردو کے صفِ اول کے ڈراما نگاروں میں تھے۔ ان کے ڈراموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ چند کے نام ہیں ان کا پہلا ڈراموں کا مجموعہ" سوکھے درخت" ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ۔ جب کہ" طنزیہ ڈرامے" ۱۹۷۴ء میں،" دھوئیں کے آنچل" ۱۹۷۶ء میں،" پانچ چھ ڈرامے" ۱۹۷۸ء اور اُداس موڑ ۱۹۸۳ء میں شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہوئے ۔ ڈراموں کے علاوہ آپ کی کئی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں ۔ ان کا ایک ناول" آبلے اور منزلیں" کے نام سے ۱۹۵۳ء میں چھپا۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اتر پردیش اردو اکادمی اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے انعامات واعزازات سے نوازا۔

راز صاحب کا انتقال

۴ر نومبر کو علی گڑھ میں مشہور عالم راز صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مشہور عالم راز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دفتری امور سے وابستہ رہے لیکن علمی وادبی دنیا سے تعلق قائم تھا۔ ان کے مضامین" تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے۔

بچوں کے لیے انھوں نے اپنی زبان کی کہانیوں کا عمدہ ترجمہ کیا تھا۔ اس طرح اپنے والد راز چاند پوری صاحب کا کلام بھی اشاعت کا منتظر تھا کہ پیغام اجل آپہنچا۔ حق تعالیٰ مغفرت کرے ۔ دوست نوازی اور طلبہ وطالبات کی مالی امداد کرنے کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔

☆ یعقوب الرحمٰن، ایوت محل

مکتبہ جامعہ کے پرانے کارکن حبیب احمد خاں قادری کو صدمہ

اے، اے، امروہی کا انتقال

۶ر نومبر ۱۹۹۹ء کو احسان علی صاحب امروہوی کا انتقال ہو گیا مرحوم بہت ہی ہمدرد اور ملنسار آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

(ادارہ" کتاب نما" مرحوم کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔)

☆ حبیب احمد خاں شبنم قادری، نئی دہلی ۲۵

مطبوعات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

اقبال کا نظریہ شعر اور ان کی شاعری۔ آل احمد سرور -/45
داستان امیر حمزہ — شمس الرحمٰن فاروقی -/60
فکر انسانی کا سفر ارتقا — خواجہ غلام السیدین -/45
غالب کی شخصیت اور شاعری — رشید احمد صدیقی -/45
پانچ جدید شاعر — حمید نسیم -/210
قاری سے مکالمہ — شمیم حنفی -/150
اعلا تعلیم — خطبات ڈاکٹر ذاکر حسین -/120
اردو زبان ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ
مرتبہ پروفیسر صغرا مہدی -/75
فراق دیار شب کا مسافر — مرتبہ پروفیسر شمیم حنفی -/150
یہاں اور — اختر سعید خاں -/144
لفظوں کی انجمن میں — ڈاکٹر سید حامد حسین -/135
تعبیر و تفہیم — ڈاکٹر خلیق انجم -/135
معاصرین و متعلقات مولانا ابوالکلام آزاد
عبدالقوی دسنوی -/60
سرسید سے اکبر تک — مرتبہ شمیم حنفی -/90
سیاہ فام ادب — مرتبہ شمیم حنفی -/40
خامہ بگوش کے قلم سے — مرتبہ مظفر علی سید -/80
مجلد -/150
الجھنیں (نفسیاتی مضامین) — عبداللہ ولی بخش قادری -/60
جو رہی سو بے خبری رہی خود نوشت — ادا جعفری -/200
قلم اور قدم — سید حامد -/75
مستقبل کی طرف (خطبات جلسہ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ)
مرتبہ خواجہ محمد شاہد / خالد کمال فاروقی -/150

مولانا ابوالکلام آزاد فکر و نظر کی چند جہتیں
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی -/60
جدید ادبی تحریکات — ڈاکٹر سید حامد حسین -/51
صحرا میں لفظ — فضیل جعفری -/90
فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر مومن محی الدین -/45
ٹیلی ویژن نشریات تاریخ تحریر تکنیک — انجم عثمانی -/90
انشائے غالب — مرتبہ رشید حسن خاں -/60
اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ — ابراہیم یوسف -/45
تاریخ نگاری قدیم و جدید رجحانات — ڈاکٹر سید جمال الدین -/51
انداز گفتگو کیا ہے — شمس الرحمٰن فاروقی -/75
دستک اس دروازے پر — ڈاکٹر وزیر آغا -/51
سرسید اور روایت کی تجدید — مونس رضا / مسعود حسین خاں -/10
تفہیم — رشید حسن خان -/75
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں — عبدالقوی دسنوی -/75
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے — تقی حسین جعفری -/51
شناس و شناخت — انور صدیقی -/60
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج — ڈاکٹر سید ظہور قاسم -/10
سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم — اختر الواسع -/10
آزمائش کی گھڑی — سید حامد (زیر طبع)
عربی اور بابلی تہذیب و تمدن — مالک رام -/75
جام جہاں نما — گربچن چندن -/75
اردو ناول میں عورت کا تصور — فہمیدہ کبیر -/75
امراؤ خودی (فراموش شدہ ایڈیشن) — شائستہ خان -/75
جائزہ کہ تنقید — صدیق الرحمٰن قدوائی -/51
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے — طاہر مسعود -/66
تحریریں — ڈاکٹر اسلم پرویز -/51
انشائیے کے خدوخال — وزیر آغا -/35
فکر اقبال — عبدالسلام خان -/125
تذکرہ ماہ و سال — مالک رام -/125
تحقیق نامہ — مشفق خواجہ -/125

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
سحر کے پہلے اور بعد	سید اظفر چغتائی	51/-
پہچان اور پرکھ	پروفیسر آل احمد سرور	51/-
اقبال کا نظریہ خودی	عبدالمغنی	150/-
قلندر بخش جرأت	جمیل جالبی	10/-
جدید [illegible] اور اس کے مسائل	وارث علوی	36/-
تاریخ [illegible]	قاسم علی [illegible] پوری	27/-
ابوالکلام آزاد کا ذہنی سفر	ظ انصاری	33/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	60/-
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں	مالک رام	51/-
لسان الصدق	مولانا ابوالکلام آزاد	75/-
اردو میں کلاسیکی تنقید	پروفیسر عنوان چشتی	48/-
تفہیم و تنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	40/
نذر مختار	مرتبہ مالک رام	101/-
تحقیقی مضامین	مالک رام	60/-
خسرو نامہ	مجیب رضوی	21/-
تحفۃ السرور	مرتبہ شمس الرحمن فاروقی	75/-
جائزے	مرتبہ مظفر حنفی	45/-
نقد بجنوری	صدیقہ بیگم	25/-
ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	15/-
الفاظ کا مزاج	غلام ربانی	24/-
تقریر و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	15/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	(زیر طبع)
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمن فاروقی	(زیر طبع)
علامت کا زوال	انتظار حسین	36/-
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ مالک رام	14/-
تذکرۂ معاصرین سوم	مرتبہ مالک رام	زیر طبع
تذکرۂ معاصرین چہارم	مرتبہ مالک رام	40/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	35/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	30/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	6/-
تحلیل نفسی کے [illegible]	ڈاکٹر سلامت اللہ	35/-
اثبات و نفی	شمس الرحمن فاروقی	40/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	48/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغرا مہدی	(زیر طبع)
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	12/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	12/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	11/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن ملا	16/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ عبداللطیف اعظمی	12/50
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	7/50
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	22/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ مالک رام	زیر طبع
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	16/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	24/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	5/50
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	ضیاء الحسن فاروقی	4/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	زیر طبع
مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	90/-
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	27/-
باتیں کچھ سریلی سی	وقار رہبر	38'
اردو اسٹیج	مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی	38/-
روح تہذیب	خواجہ غلام السیدین	6/-
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	15/-
دبستان آتش	شاہ عبدالسلام	16/-

تعلیم

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	51/-
ڈسپلن کی تعلیم و تربیت	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	90/-
الجھنیں	عبداللہ ولی بخش قادری	60/-
مفکرین تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	120/-
استادوں کی تعلیم و تربیت	مسعود الحق	زیر طبع
تعلیم و تعلم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	75/-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	45/-

کتاب	مصنف	قیمت
مشقی تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	45/-
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	21/-
آسان اردو ورک بک	شکیل اختر فاروقی	75/-
تعلیم و تربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	51/-
تعلیم اور رہنمائی	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	35/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں	معین الدین	54/-
ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	33/-
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	36/-
سرسید کی تعلیمی تحریک	اختر الواسع	زیر طبع
تعلیم اور اس کے وسائل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	36/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)	شکیل اختر فاروقی	27/-
تعلیم، نظریہ اور عمل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	36/-
تعلیم فلسفہ اور سماج	ڈاکٹر سلامت اللہ	60/-
بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	زیر طبع
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	18/-
عبارت کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	18/-
انشا اور تلفظ	رشید حسن خاں	12/-
تاریخ کیسے پڑھائیں	سرور ہاشمی	زیر طبع
بچوں کا آرٹ	عبد الحق	24/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

کتاب	مصنف	قیمت
جو رہی سو بے خبری رہی	خود نوشت ادا جعفری	200/-
دلی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن	15/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	کشمیری لال ذاکر	36/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی	51/-
چند تصویر بتاں	مولانا عبد السلام قدوائی	45/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	پروفیسر آل احمد سرور	8/-
صاحب جی، سلطان جی	ڈاکٹر اسلم فرخی	20/-
ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	75/-
شہید جستجو	ضیاء الحسن فاروقی	75/-
مولانا آزاد کی کہانی	ڈاکٹر ظفر احمد نظامی	18/0
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاء)	ڈاکٹر اسلم فرخی	زیر طبع
حیات جامی	مولانا اسلم جیراجپوری	12/-

کتاب	مصنف	قیمت
نقش ذاکر	مرتبہ عبد الحق خاں	51/-
مالک رام ایک مطالعہ	مرتبہ علی جواد زیدی	50/-
عبد اللطیف اعظمی حیات و خدمات	مرتبہ انور صدیقی	18/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ	مترجم شمیم حنفی	40/-
مجیب صاحب احوال و افکار	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	90/-
حیات عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین)	ڈاکٹر صغرا مہدی	45/-
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت)	صالحہ عابد حسین	65/-
وحید شاعر اور شخص	مرتبہ یوسف ناظم	25/-
غبار کارواں	بیگم انیس قدوائی	27/-
فراق شخص و شاعر	مرتبہ شمیم حنفی	(زیر طبع)
حیات حافظ	اسلم جیراجپوری	15/-
افکار رومی	مولانا عبد السلام خاں	40/-
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری	پروفیسر ممتاز حسین	(زیر طبع)
مکالمات افلاطون	مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین	زیر طبع
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری	شفیق النساء بیگم	10/-
اب جن کے دیکھنے کو	بیگم انیس قدوائی	12/50
شاد عارفی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مظفر حنفی	24/-
حیات اسماعیل حیات و خدمات	ڈاکٹر سیفی پریمی	18/-
مفتی صدر الدین آزردہ	عبد الرحمن پرواز اصلاحی	12/-
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	زیر طبع
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	25/-
اشفاق و افکار	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	12/
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	عبد اللطیف اعظمی	زیر طبع
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
کیا خوب آدمی تھا	مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین	15/-
قدسیہ زیدی	کرنل بشیر حسین زیدی	زیر طبع
انشاء	مرزا فرحت اللہ بیگ	4/-
روسی ادب جلد دوم	پروفیسر محمد مجیب	60/-

طنزیات، مزاحیات

کتاب	مصنف	قیمت
آخر کار	مجتبیٰ حسین	60/-
مجملہ	یوسف ناظم	51/-
خامہ بگوش کے قلم سے	مظفر علی سید	مجلد 150/- غیر مجلد 80/-
فی البدیہہ	یوسف ناظم	45/-

شام کا پہلا تارا زہرا نگاہ 21/-
مثنوی نہ سپہر (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق مارہروی زیر طبع
شام شہریاراں فیض احمد فیض زیر طبع
جستہ جستہ خورشید الاسلام 18/-
گل باختلاف گفتار نشور واحدی زیر طبع
کرب آگہی آنند نرائن ملا 10/50
نوائے آوارہ غلام ربانی تاباں (زیر طبع)
اردو گیت ڈاکٹر قیصر جہاں (زیر طبع)
انتخاب حالی (نیا ایڈیشن) صادق حسین رضوی زیر طبع
شہر آشوب مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد 8/50
کو بہ کو سلطان جہاں نثار اختر 7/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری) مجموعہ سے پیا 15/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

ماضی کے ـ ـ ـ ڈاکٹر شوکت اللہ 75/-
تصوف۔ رسم اور حقیقت خواجہ حسن ثانی نظامی زیر طبع
انوار قرآن پروفیسر نثار احمد فاروقی 30/-
حضرت محمد اور قرآن ڈاکٹر رفیق زکریا (زیر طبع)
مسلمانوں کا تعلیمی نظام ضیاء الحسن فاروقی 45/-
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان محمود احمد برکاتی 45/-
فرید و فرد فرید اسلم فرخی 27/-
اسلام میں رد تاریخ الاعتقادی کی راہ ضیاء الحسن فاروقی 8/-
اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد کا۔ مرتبہ سید مقبول احمد 8/-
فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل مولانا مجیب اللہ ندوی 14/-
نقد ملفوظات نثار احمد فاروقی 65/-
خطبات عیدین مولانا تقی امینی 21/-
تاریخ اودھ نجم الغنی رامپوری 27/-
قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات ڈاکٹر مجیب اشرف 12/-
مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست پروفیسر مشیر الحق 8/-
ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری 18/-
ترجمہ قرآن منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش
پروفیسر مشیر الحق 8/-
مسلمانان ہند۔ عصر حاضر کے مطالبات مولانا فضل الرحمن شیروانی 8/-

دنیا کے بڑے مذہب عماد الحسن آزاد فاروقی (زیر طبع)
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات عماد الحسن آزاد فاروقی 40/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک شمس الرحمن محسنی 50/-
رسول اکرم اور یہود حجاز سید برکات احمد 40/-
محجوب الارث مولانا اسلم جیراجپوری 4/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء عماد الحسن آزاد فاروقی (زیر طبع)
اسلام دور حاضر میں مترجم پروفیسر مشیر الحق 38/-
اسلامیات ۔ مالک رام 27/-
عمرو بن عاص مولانا اسلم جیراجپوری (زیر طبع)
حضرت جنید بغدادی پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی 75/-
روح القرآن مولانا عبدالسلام قدوائی (زیر طبع)
عشق اور بندگی عماد الحسن آزاد فاروقی (زیر طبع)
عورت اور اسلامی تعلیم مالک رام 30/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے عبدالسلام قدوائی زیر طبع
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا محمود الحسن 15/-
سماجی تبدیلیاں مترجم قاضی عبیدالرحمن 2/-
مذہب اور جدید ذہن پروفیسر مشیر الحق (زیر طبع)
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ڈاکٹر سالم قدوائی (زیر طبع)
کتاب و سنت کے جواہر پارے مولانا جمال الدین اعظمی (زیر طبع)
مسلمان اور سیکولر ہندوستان پروفیسر مشیر الحق (زیر طبع)
اسلامی عقائد و مسائل مذہب مولانا جمال الدین اعظمی (زیر طبع)
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) ڈاکٹر رشید الوحیدی 25/-
تاریخ ملت، سیرت رسولؐ حصہ اول مولانا اسلم جیراجپوری 21/-
تاریخ الامت، خلافت راشدہ حصہ دوم مولانا اسلم جیراجپوری 21/-
تاریخ الامت، خلافت بنی امیہ حصہ سوم مولانا اسلم جیراجپوری 18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ چہارم مولانا اسلم جیراجپوری 24/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ پنجم مولانا اسلم جیراجپوری 27/-
تاریخ الامت، عباسیہ مصر حصہ ششم مولانا اسلم جیراجپوری 27/-
تاریخ الامت، آل عثمان حصہ ہفتم مولانا اسلم جیراجپوری 18/-
تاریخ الامت، عباسیہ حصہ ہشتم مولانا اسلم جیراجپوری 36/-
فکر اسلامی کی تشکیل جدید پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی 30/-
قاعدہ میسر نا القرآن (خورد سائز) قاری محمد اسماعیل 3/-
قاعدہ میسر نا القرآن (کلاں سائز) قاری محمد اسماعیل 7/-

ٹکڑے ورق	سنتی کمار چڑجی	4/-
ہرجائیڈ (۱۹۹۱،۸۵،۳۴)	سید محمد عز الدین حسین	9/-

ناول

آگے سمندر ہے	انتظار حسین	150/-
جھینی جھینی بینی چدریا	عبدل بسم اللہ	75/-
صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
تولوں کی تلاش	لیاز سید ہاردی	60/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	کشمیری لال ذاکر	48/-
سفر	رابعہ تبسم	27/-
سمندری خزانہ	ماریہ رحمٰن	27/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	ڈاکٹر صغرا مہدی	24/-
مٹی سے ہیرا	سید مقبول احمد	10/-
تذکرہ	انتظار حسین	54-/
ریت کی دیواریں	رفعت سروش	21/-
بنجر بادل	کشمیری لال ذاکر	33/-
فرار	ظفر پیامی	40/-
ڈوبتے سورج کی کتھا	کشمیری لال ذاکر	36/-
لمحوں میں بکھری زندگی	کشمیری لال ذاکر	18/-
بہکی بہاریں	کوثر چاند پوری	18/-
راگ بھوپالی	صغرا مہدی	15/-
دھرتی سدا سہاگن	کشمیری لال ذاکر	7/50
پُروائی	صغرا مہدی	9/50
گوری سوئے سیج پر	صالحہ عابد حسین	(زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان	کشمیری لال ذاکر	7/-
ایک جسم دو دل	خالد رحمٰن	10/-
اپنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	60/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ	جتندر بلو	12/-
ایک مٹھی ہندستان	سید شمیم اشرف	6/-

ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	21/-
آلپس کے گیت مترجم	قرۃ العین حیدر	3/-
چنار کا پتا	سلطان آصف فیضی	3/-
پا بہ جولاں	صغرا مہدی	(زیر طبع)
بیوہ	منشی پریم چند	24/-
گئودان (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
میدانِ عمل (نیا ایڈیشن)	منشی پریم چند	75/-
پودو کیہ ترجمہ	قرۃ العین حیدر	2/-
شکستِ ناتمام	زہرہ سیدین	2/-
پُراسرار مقدمہ کافکا	مترجمہ محمد علی الہاشمی	12/50

افسانے

صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	75/-
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	75/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	45/-
سدا بہار چاندنی	رام لعل	30/-
دل دریا	شرون کمار	25/-
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	18/-
دردِ دل	ستارہ جعفری	18/-
کچی پودھ	راجندر سنگھ بیدی	25/50
نیلی ساری	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	30/-
کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	18/-
ریت سمندر اور جھاگ	ہرچرن چاولہ	12/75
تیوری	امر سنگھ	14/75
قتل نمبر ۳۹۹	وجاہت علی سندیلوی	14/75
وانتہ ودام	راجندر سنگھ بیدی	30/-
اپنے پرائے	اوم پرکاش بجاج	9/-

کتاب	مصنف	قیمت
نئی دھرتی نئے انسان	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی	30/-
واردات	پریم چند	24/-
راستے اور کھڑکیاں	انور خاں	6/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں	صغرا مہدی	10/-
اپنے دکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	27/-

ڈرامے

کتاب	مصنف	قیمت
بازار میں نیند	شمیم حنفی	75/-
سلاخ ٹوٹتی ہے	کشمیری لال ذاکر	90/-
الجھاوے	ابراہیم یوسف	51/-
زندگی کی طرف	پروفیسر شمیم حنفی	36/-
زوال کا عروج	مترجم. انور عظیم	36/-
مجھے گھر یاد آتا ہے	پروفیسر شمیم حنفی	21/-
انٹی گونی	سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی	9/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	6/-
حبہ خاتون	پروفیسر محمد مجیب	6/-
تاریخ کے آنچل میں	رفعت سروش	18/-
اداس موڑ	ابراہیم یوسف	12/-
انٹنی اور کلوپیٹرا	ولیم شیکسپیر	16/50
مٹی کا بلاوا	شمیم حنفی	45/-
سات کھیل	راجندر سنگھ بیدی	(زیر طبع)
غالب کون	سید محمد مہدی	8/50
خیال کی دستک	ساگر سرحدی	12/75
دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل	(زیر طبع)
آزمائش	پروفیسر محمد مجیب	6/-
انجام	پروفیسر محمد مجیب	6/-
کھیتی	پروفیسر محمد مجیب	6/-

کتاب	مصنف	قیمت
ہیروئن کی تلاش	پروفیسر محمد مجیب	5/50
پردۂ غفلت	ڈاکٹر سید عابد حسین	9/-
دروازے کھول دو	کرشن چندر	7/50
آئینۂ ایام (جے پریسٹلے)	مترجم. خلیق احمد	زیر طبع
نقش آخر	اشتیاق حسین قریشی	2/25
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	ڈاکٹر اخلاق اثر	10/-

اقبالیات

کتاب	مصنف	قیمت
اقبال کا نظریہ شعر اور ان کی شاعری۔	آل احمد سرور	45/-
افکار اقبال	محمد عبدالسلام خاں	125/-
اقبال کا نظریہ خودی	عبدالمغنی	150/-
اقبال جادوگر ہندی نژاد	عتیق صدیقی	(زیر طبع)
اقبالیات کی تلاش	عبدالقوی دسنوی	35/-
نقد اقبال	میکش اکبرآبادی	25/50

غالبیات

کتاب	مصنف	قیمت
غالب کی شخصیت اور شاعری۔	رشید احمد صدیقی	45/-
ذکر غالب	مالک رام	(زیر طبع)
گفتار غالب	مالک رام	48/-
غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	36/-
تلامذۂ غالب	مالک رام	75/-
فسانۂ غالب	مالک رام	زیر طبع
غالب اور شاہان تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	9/50

معیاری سیریز

کتاب	مصنف	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	مرتبہ: رشید حسن خاں	24/-
نیرنگ خیال	مالک رام	15/-
یادگار غالب اردو	مالک رام	30/-
یادگار غالب فارسی	مالک رام	9/-

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	16/-
حیات سعدی	مرتبہ: رشید حسن خاں	36/-
فسانۂ آزاد (تلخیص)	ڈاکٹر قمر رئیس	75/-
فردوس بریں	عبدالحلیم شرر	24/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ رشید حسن خاں	75/-
انتخاب ناسخ	مرتبہ رشید حسن خاں	51/-
مثنوی بحر المحبت	مرتبہ عبدالماجد دریاآبادی	5/-
شریف زادہ	ڈاکٹر قمر رئیس	20/-
امراؤ جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	28/-
فسانۂ مبتلا	ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی	45/-
توبۃ النصوح	مالک رام	36/-
باغ و بہار	رشید حسن خاں	45/-
ابن الوقت	ڈاکٹر خلیق انجم	75/-
مجالس النساء	صالحہ عابد حسین	24/-
گزشتہ لکھنؤ	رشید حسن خاں	75/-
قصہ حاتم طائی	اطہر پرویز	75/-
انتخاب ولی	مرتبہ ظہیر الدین مدنی	20/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن	15/-
انتخاب مراثی انیس و دبیر	رشید حسن خاں	45/-
انتخاب نظیر اکبر آبادی	رشید حسن خاں	30/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	21/-
انتخاب کلام میر	ڈاکٹر محمد حسن	(زیر طبع)
دیوان درد	رشید حسن خاں	30/-
انتخاب سودا	رشید حسن خاں	75/-
انتخاب قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	27/-
انتخاب ذوق	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	24/-
مثنوی سحر البیان	رشید حسن خاں	36/-
مثنوی گلزار نسیم	رشید حسن خاں	16/-
افادات سلیم	ڈاکٹر خلیق انجم	30/-
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ: رشید حسن خاں	27/-

جیبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
ریاض مریم	سکندر علی وجد	15/-
لہو پکارتا ہے	سردار جعفری	15/-
پتھر کی دیوار	سردار جعفری	20/-
ایک خواب اور	علی سردار جعفری	15/-
آتش گل	جگر مرادآبادی	15/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	7/50
رومانی غزلیں	ثمینہ حجاب	12/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	15/-
ساتواں آنگن	صالحہ عابد حسین	8/-
دھوپ	رابعہ تبسم	5/-
گھر	ماریہ رحمٰن	8/-
واپسی کا سفر	عبداللہ حسین	5/-
راگ بھوپالی	ڈاکٹر صغرا مہدی	7/-
نشیب	عبداللہ حسین	5/-
موت کا بازار	آفتاب ہلالی	8/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

شمارہ	مرتب	قیمت
محبوب حسین جگر نمبر	مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی	75/-
جمناداس اختر نمبر	مرتبہ: گربچن چندن	90/-
شمس الرحمٰن فاروقی نمبر	مرتبہ: احمد محفوظ	80/-
اردو افسانہ بمبئی میں	مرتبہ: الیاس شوقی	51/-
مغیث الدین فریدی نمبر	مرتبہ: ظہیر احمد صدیقی	45/-
خواجہ حسن نظامی نمبر	مرتبہ: نثار احمد فاروقی، ریحان احمد عباسی	75/-
عبدالوحید صدیقی نمبر	مرتبہ: پروانہ ردولوی	51/-
غلام ربانی تاباں نمبر	مرتبہ: اجمل اجملی	75/-

اختر سعید خاں نمبر مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین -/51

نثار احمد فاروقی نمبر مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم -/51

پروفیسر گوپی چند نارنگ نمبر مرتبہ: شہریار / ابوالکلام قاسمی -/60

ڈاکٹر خلیق انجم نمبر مرتبہ: ایم حبیب خاں -/90

خواجہ احمد فاروقی مرتبہ: خلیق انجم -/45

عابد علی خاں مرتبہ: مجتبیٰ حسین -/45

پروفیسر مسعود حسین خاں ایم حبیب خاں زیر طبع

ڈاکٹر اجمل اجملی مرتبہ: علی احمد فاطمی / عذرا حبیب -/45

فرمان فتح پوری نمبر مرتبہ: خلیق انجم -/25

سردار جعفری نمبر مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی -/45

صالحہ عابد حسین نمبر مرتبہ: عزیز قریشی -/45

نئی نظم کا سفر مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی -/45

مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق حامد حسین -/3

ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر کرنل بشیر حسین زیدی -/16

مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر (مکتبہ جامعہ) 1/50

مرزا سلامت علی دبیر نمبر مرتبہ: عبدالقوی دسنوی 7/50

جگن ناتھ آزاد نمبر مرتبہ: ایم حبیب خاں -/51

عرش ملسیانی نمبر مالک رام 12/50

سکندر علی وجد نمبر یوسف ناظم -/25

لغت نویسی کے مسائل نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ -/35

عبداللطیف اعظمی نمبر (مکتبہ جامعہ) -/18

مشفق خواجہ نمبر مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم -/30

جائزے مرتبہ: مظفر حنفی -/45

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

تذکیر و تانیث (۷ ہزار الفاظ) جلیل مانک پوری -/75

معیار اردو جلیل مانک پوری -/21

محاورات ہند مرتب محبوب الرحمٰن فاروقی -/51

عبارت کیسے لکھیں رشید حسن خاں -/18

انشا و رحلفظ -/12

بیامی قواعد اردو طلبہ ایڈیشن -/3

بیامی قواعد اردو کلاں -/6

بیامی اردو انگریزی ڈکشنری -/21

بیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری -/15

ہمارے محاورے سیفی پریمی 12/50

کہاوت اور کہانی سیفی پریمی -/9

کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب (مکتبہ جامعہ) -/21

نیا اردو نصاب اوّل محمد ذاکر -/12

آئینہ ادب ڈاکٹر محی رضا / ڈاکٹر آدم شیخ -/21

انوار ادب پروفیسر فصیح الدین / ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی زیر طبع

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

چیچک مشتاق احمد -/1

آستین کا سانپ محمد حسین حسان -/1

چاند محمد حسین حسان -/1

دیمک محمد حسین حسان -/1

کتنی زمین محمد حسین حسان -/1

خیموں کے شہر میں (سفرنامہ)

صادقہ ذکی

خیموں کا شہر قاری کو نہ صرف حج بیت اللہ کے مختلف ارکان سے واقف کراتا ہے بلکہ سفر حج کے مناظر، مختلف مقامات کی تاریخی اور مذہبی اہمیت سے بھی آگاہ کرتا ہے۔

قیمت -/30

مذہبی

کتاب	قیمت
پارہ عم مع اردو و انگریزی ترجمہ و تشریح	45/-
صراط مستقیم	7/50
سورۂ رحمٰن (ترجمہ مع تشریح)	6/-
شیخ مخدوم علی فقیہہ مہائمی	4/5
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں	9/-
نماز پڑھیے	4/5
السلام علیکم	7/50
حضرت یوسف علیہ السلام	4/50
حدیث کیا ہے	4/-
حضرت عمر فاروقؓ	6/-
نقوش سیرتؐ حصہ اوّل	5/-
نقوش سیرتؐ حصہ دوم	5/-
نقوش سیرتؐ حصہ سوم	5/-
نقوش سیرتؐ حصہ چہارم	5/-
نقوش سیرتؐ حصہ پنجم	5/-
رسالہ دینیات حصہ اوّل	3/-
رسالہ دینیات حصہ دوم	4/-
رسالہ دینیات حصہ سوم	5/-
رسالہ دینیات حصہ چہارم	5/-
رسالہ دینیات حصہ پنجم	6/-
رسالہ دینیات حصہ ششم	6/-
رسالہ دینیات حصہ ہفتم	6/-
رسالہ دینیات حصہ ہشتم	6/-
حضرت آدم علیہ السلام	4/-
حضرت یحییٰ علیہ السلام	3/-
بزرگانِ دین	4/-
امت کی مائی	4/50
خوب سیرتؐ حصہ اوّل	6/-
خوب سیرتؐ حصہ دوم	6/-
اچھی باتیں	4/50
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	4/50
سلطان جی	4/50
سیرت پاک مختصر مختصر	3/-
کمسن صحابی	6/-
رحمان کا مہمان	6/-
اسلام کے جاں نثار	5/-
نور کے پھول	9/-
سب سے بڑے انسان	
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	3/50
حضرت ابوبکر صدیقؓ	6/-
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	3/-
حضرت طلحہؓ	3/-
حضرت ابوذر غفاریؓ	3/-
حضرت سلمان فارسیؓ	3/50
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	3/-
حضرت محبوب الٰہیؒ	3/50
حضرت معین الدین چشتیؒ	3/-
حضرت فرید گنج شکرؒ	3/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	3/-
نیک بیٹیاں	3/50
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	3/-
حضرت حمزہؓ	3/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	4/50
حضرت ابوہریرہؓ	4/-
اللہ کے صفی	2/50
اللہ کا گھر	4/50
اللہ کے خلیلؑ	3/50
رسول پاکؐ کے اخلاق	4/-
قرآن پاک کیا ہے؟	7/50
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل	6/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار دوم	6/-
اسلام کے مشہور امیر البحر	9/-
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل	7/50
اسلام کیسے پھیلا حصہ دوم	7/50
اسلام کیسے شروع ہوا	7/50
رسول پاکؐ	7/50
دس جنتی	7/50
سرکار کا دربار	7/50
چار یار	9/-
آں حضرتؐ (اردو)	4/50
ہمارا دین حصہ اوّل	8/50
ہمارا دین حصہ دوم	8/50
ہمارا دین حصہ سوم	8/50
تحسین القرآن	(زیر طبع)
منہاج القرآن	(زیر طبع)
ائمہ اربعہ	(زیر طبع)
ارکان اسلام	4/-
عقائد اسلام	4/50
خلفائے اربعہ	12/-

نبیوں کے قصے 7/50
ہمارے رسولؐ 7/50
مسلمان بیبیاں 6/-
ہمارے نبیؐ (اردو) 4/-
سرکارؐ دو عالم 9/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد) 3/-
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں) 7/-

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی 6/-
بچوں کے نظیر اکبر آبادی 6/-
بچوں کے "ظ" انصاری 6/-
بچوں کی آپا جان (گیرڈا فلپس) 6/-
بچوں کی شفیقہ فرحت 4/50
بچوں کے عابد علی خاں 4/-
بچوں کے علی سردار جعفری 4/-
بچوں کے یوسف ناظم 4/-
چارلی چیپلن اور ہینس اینڈرسن 9/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی 4/-
بچوں کے میر امن دلی والے 4/50
بچوں کے محمد حسین آزاد 4/-
بچوں کے مرزا غالب 4/-
بچوں کے رنگارنگ خسروؒ 4/50
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد 4/-
بچوں کے سلطان جیؒ 4/50
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی 4/50
بچوں کی صالحہ عابد حسین 4/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین 4/-

بچوں کے بابائے اردو
مولوی عبدالحق 4/-50
بچوں کے میرزا ادیب 4/50
بچوں کے غلام السیدین 5/-
بچوں کے اسمٰعیل میرٹھی 21/-
بچوں کے ذاکر صاحب 7/-
واہ نہرو 6/-
اندرا گاندھی کی کہانی 6/-
محمد شفیع الدین نیر 7/50
ہمارے عظیم سائنس داں 9/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں 9/-
مولانا آزاد کی کہانی 18/-
جوہر قاب 4/50
بچوں کے چار بزرگ دوست 3/50
گاندھی بابا کی کہانی 10/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں 2/-
میر انیس 2/-
امیر خسرو 4/50

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات 10/-
کہانی بھی، معلومات بھی 6/-
چیزوں کی کہانی 7/50
یہ کیسا بخار ہے 6/-
آپ کا جسم 6/-
گندا پانی 4/-
کیوں اور کیسے؟ 6/-
سائنس کی دنیا 8/-

کمپیوٹر کیا ہے 8/-
عجائب گھر 10/-
ذرّے کی کہانی 21/-
علاج میرا دشمن 6/-
پرواز کی کہانی 4/50
غذا کی کہانی 3/-
رنگوں کی بستی 5/-
غذائیں دوائیں 8/-
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں 4/50
صحت کے ۹۹ نکتے زیر طبع
صحت کی الف بے زیر طبع
سنہرے اصول 5/-
پرندوں سے جانوروں تک 4/50
دہلی 2/50
انوکھا عجائب خانہ (دو حصے) 1/50
سماجی زندگی حصہ سوم 4/90
بنیادی قواعد اردو طلبہ کے لیے 3/-
بنیادی قواعد اردو (بڑا سائز) 6/-

نظمیں

پھلجھڑیاں 6/-
بچوں کے اسمٰعیل میرٹھی 21/-
بتاشے (نرسری گیت باتصویر) 9/-
مہکتی کلیاں (زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے 6/50
سہانے ترانے 4/50
بچوں کے افسر 6/-
بچوں کے اقبال 7/50

ننھے منے بچوں کے لیے

- تماشے (باتصویر) 9/-
- جان ڈاردوست (باتصویر) 7/50
- شیر اور بکری (باتصویر) 9/-
- چاند کی بیٹی (باتصویر) 8/-
- بھیڑیے کا گانا (باتصویر) 9/-
- جادو کی ہنڈیا (باتصویر) 7/50
- چالاک بلی (باتصویر) 9/-
- دم کٹی لومڑی (باتصویر) 9/-
- کوّے کا خواب (باتصویر) 8/50
- گدھے نے بجائی بانسری 7/50

بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

- الف لیلیٰ کے چار ڈرامے 9/-
- ننھی جل پری 7/50
- ممتا کی آواز 7/50
- جادو نگری 9/-
- سنہری جھیل 9/-
- خلائی طبیب 8/-
- پلوٹون کا جزیرہ 8/-
- بنتا ہوا مکان 5/-
- سونے کی چوری 4/-
- روشنی ہی روشنی 10/-
- خطرناک سگنل پہلا حصہ 10/-
- لاش چل پڑی دوسرا حصہ 10/-
- کالا جنگل نیلی موت تیسرا حصہ 10/-
- خلائی سرنگ چوتھا حصہ 10/-
- وہ خلا میں بھٹک گئے پانچواں حصہ 10/-
- خلائی مخلوق بستی میں چھٹا حصہ 10/-
- موت کی شعاعیں ساتواں حصہ 10/-
- خطرناک ہار سوا آٹھواں حصہ 10/-
- تابوت سمندر میں نواں حصہ 10/-
- خلائی مخلوق کا حملہ دسواں حصہ 10/-
- عمران کی زندہ لاش گیارہواں حصہ 10/-
- شہر پتھر بن گیا بارہواں حصہ 10/-
- ایلس کی دنیا 10/50
- پتھر کا خرگوش 10/-
- سرخ موت 4/50
- دنیا کی عجیب و غریب کہانیاں 7/50
- انمول کہانیاں 4/50
- پتھر کی گڑیا 7/50
- ریل کے بچے 4/-
- افریشیا کی کہانیاں 9/-
- ۸۰ دن میں دنیا کا چکر 3/-
- ہزاروں خواہشیں 9/-
- مونٹی کرسٹو کا نواب 9/-
- گلیور کے تین حیرت انگیز سفر 6/-
- جادوئی چٹان کی ڈبیہ 4/50
- گیارہ ہنس اور ایک شہزادی 4/-
- دادی اماں کی کہانیاں 6/-
- سفر کے قصے 5/-
- پہاڑی مہم 4/50
- تین بندوقچی 10/-
- ہم بنے کانڈو 5/-
- ایک تھا مرغا گڑو کوں 6/-
- پریوں کی کہانیاں 6/-
- سمندر کا بادشاہ مارا گیا 4/50
- چوں چوں بیگم 4/-
- ماسٹر شامت 6/-
- تھوڑی تارا تے چاند 4/-
- پکڑے گئے 7/50
- درویش کا تحفہ 6/-
- موراسے فرار 7/50
- بکرے کی تعریف میں 6/-
- جھیل کا راز 6/-
- قصر صحرا اوّل 7/-
- قصر صحرا دوم 10/-
- قصر صحرا سوم 8/-
- ممتوں کی تباہی 7/50
- پیار کا پنچھی 4/-
- ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش 7/50
- پادری کی روح 4/-
- ٹھگ نے سکھا ٹھگ کو 4/50
- گدھا کہانی 9/-
- خفیہ سرنگ 6/-
- بڑھیا کی بھینس 4/50
- تیس مار خاں 4/50
- چالاک خرگوش کی واپسی 15/-
- غریب لکڑہارے کی کہانی 9/-
- زرودی کا آدم خور 6/-
- ہمت کے کرشمے 6/-
- خلائی مسافر 6/-
- ابو خاں کی بکری 15/-
- ایک غوطہ خور کی آپ بیتی 6/-

نرالے گویے	4/50	جنگل کی ایک رات	7/50	بہادر	4/50
باتونی کچھوا	4/50	اچھی کہانیاں	3/-	ہرن کے بچے	3/50
جادو کا جھولا	3/-	ہرن کا دل	3/-	اس نے کیا کر نہ جانا	3/50
جادو کی سارنگی	3/-	دریا کی رانی	3/-	کٹا ہوا ہاتھ	7/50
بدر شہزادی	6/-	گوہر شہزادی	4/50	میگھ نگر کا راجا	(زیرِ طبع)
سمندری طوفان اور تین لڑکے	6/-	شریر شیرا	3/50	جی دار اور ننھا فرشتہ	(زیرِ طبع)
ننھا سیاح	8/50	پری رانی	3/-	سرکس	1/50
زیور	6/-	خطرناک سفر	3/50	بندر اور نائی	4/50
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں	6/-	ننھا جمہرو	3/50	لومڑی کا گھر	3/50
سام پر کیا گزری	3/50	مرغی کی چار ٹانگیں	4/50	گلابو چوہیا اور پری زاد	5/-
جگنو کی بلی	3/-	بابا ناسح	3/-	جادو کا گھر	3/50
چالاک خرگوش کے کارنامے	9/-	سلامہ و صمصامہ	5/-	بی مینڈکی اور کوا	3/50
چور پکڑو	3/50	پہاڑ کی چوٹی پر	6/-	تاک دنادن تاکے سے	3/50
بہادر علی	8/50	شرارت	4/-	روٹی کس نے پکائی	3/50
خالی ہاتھ	9/-	ننھا فرشتہ	6/-	گھر میں چکوں کیا خاک	3/50
کھلونا نگر	7/50	ایک کھلا راز	3/50	پانچ بونے	3/50
حاجی بسبا کی ڈائری	7/50	مچھیرا اور اس کی بیوی	3/50	چیونٹی رانی	3/50
قصہ اژدھا پکڑنے کا	6/-	بھوتوں کا جہاز	7/50	بچوں کی کہانیاں	3/50
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	6/-	ہار کی تلاش	6/-	پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	3/50
ابو علی کا جوتا	6/-	خرگوش کی چال	4/-	پکڑو دم کتے کو	3/50
ننھا سراغ رساں	6/-	آؤ دعا کریں	4/-	مدورانا پردیس چلے	3/50
پُر اسرار غار	6/-	خرگوش کا سپنا	9/-	ہتو ختو	3/50
ظالم ڈاکو	6/-	نیلا ہیرا	6/50	سرخ جوتے	4/50
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	7/50	ایک کچوری جیل میں	(زیرِ طبع)	پلک سے مارو	6/-
دلّی کی شادی	4/-	شیر خاں	4/-	ایک دیس ایک خون	3/50
رحمت شہزادہ	4/50	بھیڑیے کے بچے	3/-	جادو کے کھیل	(زیرِ طبع)
اندھے کا بیٹا	4/50	لومڑی کے بچے	3/-	انعامی مقابلہ	(زیرِ طبع)
پانچ جاسوس	10/-	میاں ڈھینچو کے بچے	4/-	دعوت ملاقی	(زیرِ طبع)

جیبی کتابیں

کم سے کم قیمت پر اردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پیش کرتی ہیں

کتاب نما کے تمام خریداروں کو پاکٹ بکس پر 15% کمیشن دیا جائے گا اور پچاس روپے زیادہ کی منگانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔

پتھر کی دیوار علی سردار جعفری

سردار جعفری کی جیل کی نظموں کا مجموعہ قیمت-/20

لہو پکارتا ہے علی سردار جعفری

سردار جعفری کی انقلابی نظموں کا تازہ ترین مجموعہ قیمت-/15

بیاض مریم سکندر علی وجد

وجد کی تحریروں اور حسین کی تصویروں سے "بیاض مریم" ایک نادر اور نشاط انگیز گلدستہ بن گیا۔ قیمت-/15

ایک خواب اور علی سردار جعفری

سردار جعفری کے مقبول شعری مجموعے کا چھٹا اڈیشن۔ -/15

آتش گل (شعری مجموعہ) جگر مرادآبادی

جگر مرادآبادی کا دیوان پر کیف غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت -/15

ساتواں آنگن (ناول) صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین کے جادو نگار قلم کا نیا شاہکار ایک دلچسپ انوکھی اور سبق آموز کہانی۔ قیمت-/8

دھوپ (ناول) رابعہ تبسم

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جس نے ایک عمر سایوں کی جستجو میں گزار دی اور جب منزل پر پہنچی تو وہاں بھی دھوپ بچھی ہوئی تھی۔ قیمت-/5

گھر (ناول) ماریہ رحمٰن

ایک مغربی لڑکی جس نے ہندستان میں گھر بنایا۔ گھر جو سماجی زندگی کی سب سے چھوٹی مگر سب سے مضبوط اکائی ہے ایک ایسے گھر کی کہانی جو پلکوں میں چھپے ہوئے آنسوؤں کی زبانی

بیان ہوئی۔ قیمت-/8

واپسی کا سفر (ناول) عبداللہ حسین

سفر زندگی کا دوسرا نام ہے مگر واپسی کا سفر؟ عبداللہ حسین نے واپسی سفر کی کہانی بیان کی ہے۔ قیمت-/5

راگ بھوپالی (ناول) صغرا مہدی

اردو کی بیباک ادیبہ کا نیا ناول۔ صغرا مہدی کے قلم سے نکلی ہوئی ہر کہانی ہر ناول انسانی رشتوں کا ایک نیا آئینہ خانہ ہوتا ہے۔ -/7

نشیب (ناول) عبداللہ حسین

عبداللہ حسین کا قلم نئی وادیوں میں سرگرم سفر ہے "نشیب" اس سفر کا ایک سنگ میل ہے۔ قیمت-/5

موت کا بازار (ناول) آفتاب جلالی

آدرشوں کا قتل، خوابوں کا قتل، امیدوں کا قتل، یہ سارا معاشرہ ایک قتل گاہ ہے۔ اس کے مجرم؟ "موت کا بازار" ایسے ہر سوال کا جواب ہے۔ قیمت-/8

رومانی غزلیں مرتبہ ثمینہ حجاب

غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ غزل ہمارے جذبات کی دستاویز ہے رومانی غزلوں کا بہترین انتخاب۔ قیمت-/12

انتخاب اکبر الہ آبادی صدیق الرحمٰن قدوائی

اکبر الہ آبادی کی شاعری سامان ظرافت بھی ہے اور تازیانہ عبرت بھی۔ قیمت-/15

پچھلے پہر (شعری مجموعہ) جاں نثار اختر

اردو کے البیلے رومانی شاعر کے کلام کا جامع انتخاب۔ 7/50

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے۔
ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں
گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں
پیش کر سکیں۔

قواعد و ضوابط

1۔ بک کلب کی فیس رکنیت پندرہ روپے (Rs.15/-) ہے۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی
ضرورت نہیں۔ فیس کی رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ زر تعاون -/80 روپے ہے)
صرف -/75 روپے سالانہ زر تعاون لیا جائے گا۔

3۔ ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25% اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو
کی کتابوں کی خریداری پر 15% کمیشن دیا جائے گا (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا
ضروری ہوگا)

4۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جاسکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کا ممبر نہیں
بن سکتی۔

5۔ ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6۔ کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر
پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا
آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ممبئی [illegible]
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ [illegible]

Regd. with R.N.I. at No. 4967/60 December, 1999
Regd. No. DL 16016/99
Licence No. U(SE)-22/99 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025